

(ترجمہ و تشریح)

جلد اوّل

تخریج احادیث

امام بخاری قدس اللہ سرہ العزیز ۲۵۶ھ

عربی شرح

علامہ ابن ابی جمرہ مالکی اندلسیؒ

۶۹۹ھ

اردو ترجمہ و تشریحی فوائد

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

۱۳۹۴ھ

زیر نگرانی

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

۱۳۶۲ھ

احادیث شریفہ سے مسائل سلوک و تصوف، مسائل اخلاق و آداب اور مسائل فقہ کے استنباط پر وہ گرانمایہ کتاب جو ہر دور میں علماء، صوفیاء اور دیندار حضرات کی توجہ کا متفقہ طور پر مرکز رہی ہے۔ بخاری شریف کی منتخب احادیث کی بے نظیر شرح



بخاری شریف کی منتخب احادیث کا ترجمہ اور بے مثل تشریح

رحمۃ القدوس ترجمہ شرح بہجۃ النفوس



(ترجمہ و تشریح)

تخریج احادیث

امام بخاری قدس اللہ سرہ العزیز ۲۵۶ھ

زیر نگرانی	اردو ترجمہ و تشریحی فوائد	عربی شرح
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ۱۳۶۲ھ	حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رح	علامہ ابن ابی جمرہ مالکی اندلسی ۶۹۹ھ

جلد اول

ابن ابی جمرہ

احادیث شریفہ سے مسائل سلوک و تصوف، مسائل اخلاق و آداب اور مسائل فقہ کے استنباط پر وہ گرانمایہ کتاب جو ہر دور میں علماء، صوفیاء اور دیندار حضرات کی توجہ کا متفقہ طور پر مرکز رہی ہے۔ بخاری شریف کی منتخب احادیث کی بے نظیر شرح

ناشر

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم   امابعد

اللہ رب العزت کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہم اپنی ناکسی کے باوجود بخاری شریف کی احادیث کی وہ نادر و گرانمایہ شرح آپ کے سامنے اردو میں پیش کر رہے ہیں جس کی تعریف و توصیف میں تمام علماء و صوفیہ رطب اللسان رہے ہیں۔ یہ کتاب جو درحقیقت بخاری شریف کا ایک طرح سے خلاصہ اور تشریح ہے اپنے وقت کے مشہور امام علامہ ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ (۶۹۵ھ) نے تالیف فرمائی۔

اس کتاب کی اہمیت اور عظمت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فتح الباری شرح صحیح البخاری کے مصنف، نامور عالم اور فقید المثال محقق حافظ ابن حجر عسقلانی اس کتاب کے حوالے جا بجا اپنی کتاب میں پیش کرتے ہیں۔

احادیث سے مسائل سلوک و تصوف اور مسائل اخلاق و آداب کے استنباط پر اپنی نوعیت کی منفرد اور لازوال کتاب ہے، یہ کتاب ہر دور میں ہی اہل علم و عمل بزرگوں کی منظور نظر رہی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ اس کتاب کے بہت بڑے مداح تھے اور انہیں کے حکم پر مشہور محدث اور حدیث کی مشہور کتاب اعلاء السنن ۱۸ جلدوں کے مصنف مولانا ظفر احمد عثمانی نے اس کتاب کا خوبصورت اور آسان اردو میں ترجمہ کیا اور جا بجا اپنے گرانقدر فوائد کا بھی اضافہ فرمایا۔

یہ کتاب تقسیم سے قبل طبع ہوئی تھی مگر شائقین کی کثرت کی وجہ سے جلد ہی ناپید ہوگئی تھی۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس کتاب کو دوبارہ اور پہلے سے بہتر انداز سے چھاپنے کی سعادت ہمارے حصہ میں آئی اور اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اصل کتاب میں ہم نے کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا البتہ وہ ذیلی عنوانات جو سابقہ ایڈیشن میں صفحے سے باہر درج تھے اب صفحہ میں لے لئے گئے ہیں اور مکمل فہرست کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کتاب کی اشاعت کا ثواب والد ماجد مولانا محمد نکھم کھیم رحمتہ اللہ علیہ اور جد امجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہٗ کو پہنچا کر ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے۔ آمین

اس کتاب سے استفادہ کرنیوالے حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اپنی دعوات صالحہ میں یاد رکھیں والسلام

ناشرین

(اشرف برادرز)

محمود اشرف ، مسعود اشرف ، سعود اشرف

ادارہ اسلامیات، لاہور



فہرست

رحمت القدوس جلد اوّل

مضمون	صفحہ
مضمون	صفحہ

فہرست

رحمۃ القدوس (انتخاب بخاری) جلد دوم



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمت القدوس
ترجمہ
بہجت النفوس

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ و اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک لہ الحمد ولا نعبد الا ایاہ و اشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ و رسولہ الذی اتخذہ اللہ خلیلا وحبیبا واصطفاہ صلی اللہ تعالیٰ وسلم علیہ وعلی آلہ و اصحابہ وکل من تبعہ واقتفاہ

اما بعد

جب یہ احقر کتاب البحر المورود مؤلفہ قطب ربانی علامہ عبدالوہاب بن احمد بن علی الشعرانی کے ترجمہ سے فارغ ہوگیا جو رسالہ شہریہ النور میں الدر المنضود کے نام سے عرصہ تک شائع ہوتا رہا اور ماہ رجب ۱۳۵۴ھ میں تکمیل کو پہنچ گیا ہے تو دل میں خود بخود خیال آیا کہ اس کے بعد کسی دوسرے مفید مضمون کا سلسلہ شروع کیا جائے تو اچھا ہے چنانچہ مختلف خیالات

دل میں گذرتے رہے مگر کسی ایک پر دل کو قرار نہ ہوا، اسی اثناء میں
میری منجلی لڑکی جو ۸، ۹ مہینہ سے بعارضۂ حمی لازمہ علیل تھی شعبان ۱۳۵۴ھ
میں زیادہ علیل ہو گئی اور ۲۶ر شعبان ۱۳۵۴ھ کو اتوار کے دن ۷، ۸ بجے صبح
کے درمیان اس نے اس دار فنا سے دار البقا کیطرف انتقال کیا اور اپنی مفارقت
کا صدمہ والدین کے دل و جگر پر چھوڑ دیا

فانا للّٰہ وانا الیہ راجعون، غفر اللّٰہ لھا ورفع درجاتھا و
تقبل حسناتھا ورزقنا الصبر الجمیل،

اس صدمۂ جانکاہ سے قرار و سکون رخصت ہوا تو وہ خیال جو پہلے ہی غیر
مستقر تھا عدم استقرار کے ساتھ مضمحل بھی ہو گیا کہ دفعۃً ایک روز
جب کمترین ناچیز مجلس بابرکت سراپا خیر و رحمت میں بخدمت حضرت
اقدس سیدی سندی مولائی و مرشدی ملاذی و معتمدی ظل اللہ علی العالمین
حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم حاضر تھا
حضرت نے کتاب بھجۃ النفوس مؤلفہ امام مقتدی محدث حافظ
ابو محمد عبداللہ بن ابی جمرۃ الازدی الاندلسی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ فرمایا
کہ یہ کتاب بہت عمدہ ہے جسمیں علامہ موصوف نے احادیث نبویہ کی شرح
کرتے ہوئے احادیث سے مسائل تصوف کا استنباط فرمایا ہے اور میرا دل
چاہتا ہے کہ کوئی اس کتاب کا ترجمہ کر دے۔

حضرت کے اس ارشاد سراپا رشاد سے قلب مضطر میں داعیہ پیدا ہوا کہ
الدر المنضود کے اختتام کے بعد جو مضمون جدید لکھنے کا خیال تھا کہ
اس کے لئے اسی کتاب مبارک کو متعین کر لینا چاہیئے جسمیں چند فائدے
ہوں گے، اولاً حضرت اقدس کی تمنا پوری ہو گی جن کی شان یہ ہے ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مراد متقیں

حضرتؒ کی تمنا مجھ جیسے ناکارہ کے ہاتھوں پوری ہو جائے تو کیا عجب ہے،
کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ٹھکانے لگا دے۔

ثانیاً یہ کہ اہل اللہ کی تمنا جس کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی مدد اسکی ساتھ ہوتی ہے تو اس تالیف میں انشاء اللہ غیبی امداد میرے ساتھ ہوگی اور امید ہے کہ دولتِ اخلاص بھی نصیب ہو جائیگی جس پر مدارِ کار ہے۔"

ثالثاً یہ کہ صدمۂ جانکاہ کے سکون میں اس سے مدد ملے گی کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ شغلِ قرآن و حدیث اور ارشاداتِ اہل اللہ سے قلب کو سکون ہوتا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

رابعاً یہ کہ حضرتؒ حکیم الامت دامت برکاتہم نے کتاب عنوانات التصوف کے آخر میں بعنوان تبصیر و تبشیر جو ایک اعلان فرمایا ہے اس سے ناظرین کتاب مذکور کو کتاب بہجۃ النفوس کے مطالعہ کا اشتیاق پیدا ہوا ہوگا اور عربی نہ جاننے والوں کو اس کے ترجمہ کا انتظار ہوگا تو اس کتاب کے ترجمہ کی تقدیم بہت سے اصحاب قلوب کے اشتیاق کی تکمیل اور کلفت انتظار کی دافع ہوگی؛ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تیمناً و تبرکاً اس مقام پر حضرتؒ کے اس اعلان کو بلفظہ نقل کر دیا جائے تاکہ ناظرین میں سے اگر کسی کی نظر سے نہ گذرا ہو تو وہ بھی حضرتؒ کے ارشاد سے اس کتاب کی عظمت و جلالت کا اندازہ کرلیں، و ہذا لفظہ ادام اللہ ظلہ،۔

تبصیر و تبشیر

ایک کتاب بہجۃ النفوس نظر سے گذری جو مختصر البخاری کی شرح ہے جو حضرت ماتن نے خود لکھی ہے متن بحذف اسانید و مکررات احادیثِ بخاری کی تلخیص ہے اور شرح میں احادیث سے اور

کہیں کہیں آیات سے بھی مثل مسائل علم ظاہری کے بکثرت مسائل علم باطنی بھی مستنبط کئے ہیں۔ فتح الباری میں کتاب کا جا بجا حوالہ اس کے مستند ہونے کیلئے کافی دلیل ہے، چونکہ عنوانات التصوف کے ماخذ اور اس کتاب کا ایک حصہ ہمرنگ ہیں اس لئے اس فن کے شائقین کیلئے اس کا اعلام کر دیا گیا۔

اشرف علی ثامن ربیع الاول ۱۳۵۳ ھ

اب خدا کا نام لیکر ترجمہ شروع کرتا ہوں اور بطور مقدمہ کے چند امور سے ناظرین کو مطلع کرنا چاہتا ہوں جن کا ترجمہ میں التزام کرنے کا ارادہ ہے۔

اوّل

یہ کہ اس وقت پوری کتاب کے ترجمہ کا ارادہ نہیں بلکہ صرف اس حصہ کا ترجمہ کیا جائے گا جس میں مسائل تصوف کا استنباط احادیث نبویہ یا آیاتِ قرآنیہ سے کیا گیا ہے۔

دوم

یہ کہ ترتیب ترجمہ کی اسطرح ہوگی کہ اوّلاً حدیث متن کا مع حوالۂ باب کے ترجمہ ہوگا اس کے بعد بعنوان شرح اس حصہ شرح کا ترجمہ ہوگا جس میں مسائل تصوف کا استنباط مذکور ہے اس ترجمہ کے بعد اگر کسی مضمون کی تفصیل و توضیح کی حاجت ہوگی تو اس کو بعنوان ف لکھا جائے گا۔

سوم

یہ کہ کتاب بہجۃ النفوس میں جتنے مسائل حدیث سے مستنبط کئے گئے ہیں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو نمبر وار ذکر کیا ہے اسی طرح ترجمہ میں بھی ہر مسئلہ کو نمبر وار بیان کیا جائے گا مگر چونکہ ترجمہ میں

صرف مسائل تصوف کو لیا گیا ہے اس لئے ترجمہ کا نمبر اصل کتاب کے نمبر کے موافق نہ ہوگا مگر ہر مسئلہ کے بعد اصل کتاب کا نمبر لفظوں میں مع ابتدار وانتہار عبارتِ اصل کے مختصراً لکھ دیا جائے گا تاکہ اگر کوئی اصل سے مراجعت کرنا چاہے تو اس کو دشواری پیش نہ آئے۔

چہارم

یہ کہ احادیث متن کی صحت کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ سب احادیث صحیح بخاری کی احادیث ہیں جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے لقب سے ممتاز ہے اور اس سے ناظرین کو اندازہ ہوگا کہ جو لوگ باوجود سب کچھ پڑھ لینے کے بھی علم تصوف کے منکر ہیں وہ بخاری شریف کو بھی سمجھ کر نہیں پڑھتے صرف دورہ ہی کر لیتے ہیں اگر وہ قرآن و حدیث کو سمجھ کر پڑھتے تو ہرگز اس علم کا انکار نہ کرتے نہ اہل تصوف پہ اعتراض کرتے

پنجم

یہ کہ کتاب بہجۃ النفوس جو مختصر البخاری کی شرح ہے اس کے مصنف بہت بڑے امام ہیں جن کا تذکرہ خاتمۃ الحفاظ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب حسن المحاضرہ میں اور علامہ ابو العباس سیدی احمد بن احمد بن عمر بن محمد اقیت نے کتاب نیل الابتہاج بتطریز الدیباج میں (جو کتاب الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علمار المذہب (المالکی) کا تکملہ ہے اور اسی کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے) اور علامہ عبد الوہاب شعرانی نے کتاب الطبقات الکبریٰ میں بیان فرمایا ہے، چونکہ تراجم اسمار رجال کا علم جماعت علمار کیساتھ مخصوص ہے اس لئے ان کتابوں کی اصل عبارت اس جگہ عربی میں بلا ترجمہ نقل کی جاتی ہے۔ اگر ناظرین اہل علم میں سے کسی کو مصنف کا تذکرہ کسی اور کتاب میں بھی مل جائے تو درخواست ہے کہ مترجم کو اس سے مطلع فرمائیں تاکہ اس کو بھی خاتمہ کتاب میں ملحق کر دیا جائے۔

قال الحافظ السيوطيؒ فی ذکر من کان بمصر من الصلحاء
والزهاد والصوفية الامام ابو محمد بن ابی جمرة
المقری المالکی العالم البارع الناسك قال ابن کثیر
کان قوالا بالحق امارا بالمعروف توفی بمصر فی ذی القعدۃ
سنة خمس وتسعین وستمأة (حسن المحاضرة ص ۲۳۳ ج ۱)
وقال العلامة ابو العباس احمد بابا فی نیل الابتهاج عبد الله
بن ابی جمرة ابو محمد الولی القدوة العارف بالله
الزاهد الصالح الامام العلامة المقری المشهور مؤلف
مختصر البخاری وشرحه بهجة النفوس فی سفرین له
کرامات عدیدة رأیتها مجموعة فی کراریس مع اخباره
عن الابرار ارباب القلوب، ناهیك من حاله وکراماته
ما ذکر انه قال یوما بحمد الله تعالیٰ انه لم یعص الله
قط، اخذ عنه صاحب المدخل ونقل عنه کثیرا فی
کتابه توفی نفعنا الله به سنة تسع وتسعین وستمأة
اھ ملخصاً (ص ۱۳۰)
وقال القطب الربانی العلامة عبد الوهاب الشعرانی
فی الطبقات له ومنهم الشیخ عبد الله بن ابی جمرة
الاندلسی المرسی رحمة الله "الامام القدوة الربانی
رضی الله عنه قدم مصر وله زاویة بخط جامع المقسم
وکان ذا تمسك بآثار النبی صلی الله علیه وسلم و
حالة وجمعیة علی العبادة وشهرة کبیرة بالاخلاص
والاستعداد للموت والفرار من الناس وانجماع عنهم
الا فی الجمع وابتلی بالانکار علیه حین قال إنه یری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقظۃً وبیناً فہم و قام علیہ بعض الناس فانقطع فی بیتہ الی ان مات سنۃ تسع وتسعین وستمائۃ صد ۱۲۲

ششم

کتاب بہجۃ النفوس کے مستند ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں اس کے مضامین جا بجا ذکر فرماتے ہیں اور صاحب مدخل نے جا بجا حضرت مصنف کے اقوال مدخل میں نقل فرمائے ہیں بلکہ کتاب مدخل کی تصنیف کا سبب بھی حضرت مصنف کا امر وارشاد ہی بتلایا ہے وھذا لفظہ

وبعد فانی کنت کثیرا ما اسمع سیدی الشیخ العمدۃ العالم العامل المحقق القدوۃ ابا محمد عبد اللہ بن ابی جمرۃ یقول وددت انہ لو کان من الفقہاء من لیس لہ شغل الا ان یعلم الناس مقاصد ھم فی اعمالھم ویقعد الی التدریس فی اعمال النیات لیس الا ، اوکلاما ھذا معناہ فانہ ما اتی علی کثیر من الناس الا من تضییع النیات فقد رأنی ذکرت لبعض ما کان یجری عندہ من بعض الفوائد فی ذلک لبعض الاخوات فطلب ان اجمع لہ شیئاً لکی یعرف تصرفہ فی نیتہ وعبادتہ وعلمہ وتسببہ الخ (ج ۱ صد ۲) .

ہفتم

حضرت مصنف نے ایک مقدمہ تو متن مختصر البخاری کا تحریر فرمایا ہے دوسرا مقدمہ بہجۃ النفوس کا تحریر فرمایا ہے جو شرح ہے۔ ان دونوں مقدموں میں سے اول کا تو پورا ترجمہ کیا جائے گا اور دوسرے کا پورا ترجمہ نہیں کیا جائے گا بلکہ مختصر طور پر ضروری مضامین لے لئے جائیں گے جن کی

ضرورت عام ہے اور جو مضامین اہل علم کے لئے مخصوص ہیں اُن کو ترک کر دیا جائے گا کہ وہ اصل کتاب سے خود معلوم کر سکتے ہیں۔

هشتم

اس وقت تک ہمارے پاس کتاب بہجۃ النفوس کی صرف دو جلدیں پہنچی ہیں جن میں سو حدیثوں کی شرح ہے، اور مقدمۂ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ متن مختصر البخاری میں تین سو احادیث کے قریب ہیں۔ اگر بقیہ شرح بھی دستیاب ہو گئی تو انشاء اللہ اس کے بھی حصۂ تصوف کا ترجمہ کر دیا جائے گا، ورنہ جس قدر موجود ہے وہ بھی انشاء اللہ بہت کافی ہے۔

وها انا اشرع فی المقصود متوکلاً علی ربی انه رحیم ودود بیده ازمة التوفیق والخیر والجود "رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر"

ترجمہ مقدمہ مختصر البخاری

الحمد للہ حق حمدہٖ۔ والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا
محمد الخیرۃ من خلقہ وعلی صحابۃ المختارین بصحبتہ وبعدُ

چونکہ حدیث نبوی اور اس کا حفظ اللہ تعالیٰ کی (رضا کی) طرف قریب تر وسیلہ ہے جیسا کہ ان کے آثار سے معلوم ہوتا ہے جو اس کے متعلق وارد ہیں، من جملہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جو شخص میری امت تک ایک حدیث پہنچادے جس سے کسی سنت کو رواج دے یا بدعت کو رد کر دے اس کیلئے جنت ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ
• جو شخص میری امت (کو پہنچانے) کیلئے ایک حدیث یاد کرے
اس کے لئے اکہتر (۷۱) نبیوں صدیقوں کا ثواب ہے۔

اس بارہ میں اور بھی بہت آثار ہیں اور میں نے دیکھا کہ باوجود کتب احادیث کی کثرت کے ہمتیں اُن کے حفظ سے بوجہ سندوں (کی طوالت) کے قاصر ہیں تو میں نے سوچا کہ کتب احادیث میں سے ایسی کتاب کو لوں جو سب سے زیادہ صحیح ہو اور اس میں سے حسب ضرورت کچھ حدیثیں منتخب کروں اور سندوں (کو حذف کر کے اس) کا اختصار کر دوں بجز (صحابی) راوی حدیث کے (نام کے) کہ اس سے تو چارہ ہی نہیں، اسطرح اس کا اختصار کرنا آسان ہوگا اور انشاء اللہ اس سے بہت فائدہ ہوگا، تو میرا ارادہ یہ ہوا کہ وہ کتاب (جس کا اختصار کیا جائے صحیح) بخاری ہو کیونکہ وہ (حدیث کی) سب کتابوں میں زیادہ صحیح ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ بڑے بزرگوں میں سے ہیں۔

اور مستجاب الدعوت بھی تھے (انکی دُعا قبول ہوتی تھی) اور انہوں نے اس کتاب کے پڑھنے والے کیلئے دعا بھی کی ہے۔

مجھ سے ایک قاضی نے جو صاحب معرفت اور (طلب حدیث میں) صاحب رحلت (و سیاحت) تھے، اُن بزرگوں سے نقل کرتے ہوئے جن کی فضیلت (و بزرگی) مسلّم تھی بوقت ملاقات فرمایا کہ امام بخاری کی کتاب کسی مصیبت کے وقت پڑھی جائے تو مصیبت ضرور دور ہو جاتی ہے اور کشتی میں ساتھ لیکر سوار ہوا جائے تو کبھی غرق نہیں ہوتی، پس میں نے برکت حدیث کیساتھ ان برکتوں کو بھی لینا چاہا کیونکہ اس وقت دلوں کو زنگ لگ گیا ہے کیا عجب ہے کہ اللہ کا فضل ہو جائے اور تاریکی زنگ دور ہو جائے، اور شاید (نفسانی) خواہشوں کی مصیبتیں جو اوپر تلے دلوں پر چھائی ہوئی ہیں جاتی رہیں اور امید ہے کہ ان عظیم الشان حدیثوں کے محفوظ کر لینے سے (دلوں کی کشتیاں) بدعتوں اور گناہوں کے سمندروں میں غرق ہونے سے بچ جائیں گی، پس اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جب یہ منتخب حدیثیں پوری ہو گئیں تو (شمار میں) کچھ کم تین سو حدیثیں تھیں، جن میں سب سے اوّل یہ حدیث تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا کس طرح ہوئی اور سب سے آخر وہ حدیث تھی جس میں جنتیوں کے جنت میں جانے اور اللہ تعالیٰ کا اُن پر اپنی دائمی رضا کے ساتھ انعام فرمانے کا ذکر ہے، تو میں نے اس ترتیب کے موافق اس کا نام جمع النهاية فى بدء الخير والغاية رکھا (جو بعد میں مختصر البخاری کے نام سے مشہور ہوئی)، اور میں نے ان حدیثوں کو عنوانات ابواب مقرر کر کے الگ الگ نہیں کیا۔ اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور اس کے پڑھنے والوں اور سننے والوں کو خیر کی ابتدا مع انتہا کے کامل طور سے عطا فرمائیں، بس اب ہم

خداوند کریم مالکِ عرشِ عظیم سے سوال کرتے ہیں کہ اپنے فضل سے اِن حدیثوں کو ہمارے دلوں کیلئے جلا اور دین کی بیماریوں سے شفاء بنا دیں کہ اُن کے سوا (ہمارا مالک اور) پروردگار کوئی نہیں۔"

وصلی اللہ علی سیدنا محمد
خاتم النبیین والحمد للہ رب العلمین



خلاصہ مقدمہ

بہجۃ النفوس

اما بعد ہم نے اپنی کتاب مسمی بہ جمع النہایۃ فی بدأ الخیر والغایۃ
کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ اس
کتاب کے فوائد بہت زیادہ ہیں اور اس کی خوبیاں عام ہیں، اور
میں نے اس خیال سے کہ ایک خیر کے بعد دوسری خیر حاصل کروں
ان فوائد کے بیان کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا تاکہ وہ کتاب بمنزلہ اصل کے
ہو اور یہ (شرح) بمنزلہ شاخ اور پھل کے ہو کیونکہ پھلوں سے پورا
فائدہ اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ان کو توڑ لیا جائے، اور تاکہ اس کتاب
کے یاد کرنے والوں کو فائدہ کی بلکہ ان فوائد کی قدر معلوم ہو جو اس کے اندر
موجود ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو ہر ہر فائدہ کیلئے جس پر ایک
حدیث دلالت کرتی ہے الگ باب باندھا ہے اور اسی واسطے وہ ایک
حدیث کو بعض دفعہ چند ابواب میں بار بار ذکر کرتے ہیں اور بعض دفعہ
حدیث کے ٹکڑے کر کے ہر باب میں بقدر ضرورت ایک حصہ لاتے ہیں،
میں نے یوں مناسب سمجھا کہ ان حدیثوں میں سے جو (مختصر ہیں) جمع
کی گئی ہیں ہر حدیث کو ایک باب قرار دوں اور (واقعی) وہ باب ہی ہے
اور بڑا باب ہے، جسکی کنجی ظاہر حدیث (اور اس کے الفاظ) ہیں اور جو
الواب (فقہیہ) اس سے نکلتے ہیں وہ سب راستے ہیں جو اسی دروازہ
کے تابع ہیں، پھر میں نے حدیث کے (پوشیدہ) الفاظ کو تلاش کیا تاکہ

ان شیریں اور غایت درجہ شیریں الفاظ کی برکتوں سے وہ نور حاصل کروں جس سے دل کی جہالتوں کی پیاس بجھے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی لفظ کی زیادتی یا کمی کسی مفید معنی ہی کے واسطے ہوتی ہے، کیونکہ آپ خواہش (نفس) سے نہیں بولتے تھے۔ اسی لئے اکثر علماء نے فرمایا ہے کہ حدیث کو فاء اور واو کے ساتھ نقل کرنا چاہیئے (کہ جہاں واو ہو وہاں واو لایا جائے جہاں فاء ہو وہاں فاء، ایک کی جگہ دوسرا حرف نہ لایا جائے گو معنی نہ بدلیں) جیسا کتاب عزیز (قرآن شریف) کو نقل کیا جاتا ہے، اور ایک جماعت نے علماء میں سے یہ بھی فرمایا ہے کہ حدیث کو بالمعنیٰ روایت کرنا بھی جائز ہے (کہ معنی محفوظ رہیں گو الفاظ بدل جائیں) لیکن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تو یہ حالت تھی کہ جب اُن کو کسی لفظ کے صیغہ میں کچھ شبہ ہو جاتا اگرچہ اس سے معنی پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا اس کو بھی یہ کہہ کر ظاہر کر دیتے تھے کہ میرا گمان یوں ہے، میرا خیال یہ ہے، (کہ حضور نے اس طرح فرمایا یا اسطرح) اور اس کا سبب بجز دو باتوں کے اور کچھ نہ تھا، ایک تو نقل کی سچائی، دوسرے اس خاص لفظ کی برکت کو محفوظ رکھنا (جو حضور کی زبان سے نکلا ہے) تاکہ وہ برکت فوت نہ ہو۔ اسی کی نظیر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حکایت ہے کہ انہوں نے حج کے راستہ میں ایک مقام پر اپنی اونٹنی کو چکر دیا کسی نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا وجہ تو میں نہیں جانتا مگر میں نے (اس مقام پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے تو میں نے بھی ویسی کیا جو آپ نے کیا تھا، غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اور آپ کے جملہ افعال صحابہ کے نزدیک سراپا برکات و انوار تھے اور کیوں نہ ہوں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی ترغیب دی اور تنبیہ فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ـــــ

"فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت فرمائے گا۔"

(اسمیں عموم کے ساتھ اتباع کا حکم ہے) اور عموم کیساتھ حکم اتباع کا مقتضی یہ ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بات میں خواہ فعل ہو یا قول پورا اتباع کیا جائے اور حضرات صحابہ سے اس قسم کے واقعات بہت منقول ہیں جو تلاش کرنیوالے کو مل جائیں گے، رہے آئمہ دین سو وہ بھی حدیث نبوی کا بڑا احترام فرماتے تھے حتیٰ کہ وہ اُن کے نزدیک قرآن ہی کے مثل تھی اس کے الفاظ وحروف سے بھی (قرآن کی طرح) احکام کا استنباط فرماتے تھے اور کیسے احکام کا؟ جن سے دفتر بھرے ہوئے ہیں اور اسی پر اپنے مذاہب کی بنیادیں قائم فرماتے تھے، احترام حدیث کا تو یہ حال تھا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ (ایک دفعہ) خلیفۂ (وقت) ان کے مکان پر حاضر ہوا تو آپنے گھر سے نکلنے میں دیر کی، جب باہر تشریف لائے تو خلیفہ نے عرض کیا اے مالک! تم ہمیشہ امراؤ (خلفاء) کو ذلیل ہی کرتے ہو، فرمایا نہیں بخدا، مگر (دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ) میں نے آپ کی آواز سنی تو یہ سمجھا کہ آپ کا میرے پاس آنا صرف اس لئے ہوا ہے کہ حدیث (نبوی) کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا ہے اور میں اس وقت بے وضو تھا مجھے گوارا نہ ہوا کہ حدیث (نبوی) کے متعلق بے وضو گفتگو کروں، اس لئے میں نے وضو کی اور فوراً باہر آگیا اس کے سوا مجھے کچھ نہیں (کہ دیر ہوئی یا سویرا) نیز امام مالک سے یہ بھی منقول ہے کہ جب طلبہ اُن کو درس دینے کیلئے (گھر سے) بلاتے تو دریافت فرماتے کہ تم کیا پڑھنا چاہتے ہو، اگر وہ یہ کہتے کہ فقہ (پڑھنا) چاہتے ہیں تو اسی حالت میں باہر آجاتے جس حالت میں اس وقت ہوتے اور اگر یہ اطلاع دی جاتی کہ حدیث (پڑھنا) چاہتے ہیں تو اچھی طرح وضو کرتے خوشبو لگاتے، عمدہ سے عمدہ لباس پہنتے، مشک واگر کی دھونی

لیتے پھر حدیث (پڑھانے) کیلئے بیٹھتے، اس قسم کے واقعات اُن سے بکثرت منقول ہیں اور چونکہ وہ حدیث نبوی کی (اس درجہ) تعظیم کرتے تھے اِسی لئے اُن کا نام امیر المومنین فی الحدیث رکھا گیا۔ رہا حدیث کے الفاظ سے احکام کا استنباط کرنا اور اس کے فوائد کی تلاش میں رہنا تو اس کی مثال یہ ہے کہ امام مالک رح ع سے منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة سے تین مسئلے مستنبط فرمائے ہیں (جن کو اہل علم اصل کتاب سے سمجھ سکتے ہیں) اور اس قسم کی مثالیں امام مالک سے اور ان کے سوا دوسرے ائمہ سے بکثرت منقول ہیں جو تلاش کرنیوالے کو مل سکتی ہیں غرض میرا دل ہمیشہ اس بات کا مشتاق رہا جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ مختصر البخاری کی شرح کروں اور فوائد حدیث کو بیان کروں اور) ایک خبر کو دوسری خبر کے ساتھ ملاؤں، اسی سوچ اور فکر میں دن گذرتے گئے یہاں تک کہ مجھ سے ایک شخص نے جو اصل (کتاب) کو پڑھ چکا تھا درخواست کی کہ ان معانی و مطالب کو ظاہر کردوں جو دل میں چھپے ہوئے ہیں، تو میں نے اسکی درخواست اس امید پر منظور کی کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اور اسے اور جو اس کتاب کو بعد میں پڑھے اور تصدیق و رقت قلب سے، پڑھے اِس کے ذریعہ نفع دیں، (لپس اب معلوم کرو کہ) یہ کتاب شریعت کے فرائض و سنن و مستحبات و آداب و احکام کے بہت سے موتیوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، نیز اس میں علم

ع چونکہ مصنف رح مالکی ہے اس لئے امام مالک ہی کے استنباط کو مثال میں بیان فرمایا ورنہ تمام آئمہ مجتہدین کی یہی حالت ہے کہ حدیث نبوی کے لفظ لفظ سے مسائل کا استنباط فرماتے اور ان کے اشارات و دلالات سے احکام کا استخراج کرتے ہیں ۱۲ ظ

حقیقت پر حقیقت (وواقعیت) کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے، اور علم حقیقت و شریعت کو جمع کرنے کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے (کیونکہ جو حقیقت شریعت پر منطبق نہ ہو وہ زندقہ ہے) نیز ان طرق ناجیہ کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کی طرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (اس ارشاد میں) اشارہ فرمایا ہے (کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے جن میں نجات پانے والا فرقہ وہ ہے جو اس راستہ پر چلے جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب) اور ان کے مخالف طریقوں پر بھی اشارہ کیا گیا اور ان سے ڈرایا گیا ہے، اور بعض دفعہ میں نے اُن مسائل پر جو ایک حدیث سے معلوم ہوئے آیاتِ (قرآنیہ) اور اس کے مناسب دوسری احادیث سے بھی استدلال کیا ہے جو اسکی مؤید ہیں، جن میں سے بعض کی تو الفاظ سے ہی تائید ہوتی ہے اور بعض کی معانی سے، اور اس کے بعد کچھ حکایات بھی بیان کر دی ہیں تاکہ (ناظرین کا) ذہن تیز ہو اور مقصود واضح ہو جائے۔ اور بعض دفعہ کسی کسی جگہ میں نے نفس کو غفلت پر (زجرو) توبیخ کرنے کی ہدایت کی ہے کہ شاید گمراہی سے باز آجائے۔ نیز میں نے اس کتاب میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ اور ان کے آداب اور حسن عبارت اور نقل کی احتیاط اور حسن خطاب پر بھی تنبیہ کی ہے اور اس سے جو آداب شرعیہ مستنبط ہوتے ہیں ان کو بھی بتلایا ہے جبکہ الفاظ حدیث میں ان امور سے تعرض ہو، کیونکہ ان امور میں سے کسی کو غفلت کیساتھ چھوڑ دینا مناسب نہیں اس لئے کہ یہی حضرات (اللہ کے) برگزیدہ اور مقرب بندے اور منتخب اور بلند درجے والے ہیں۔ علماء نے حق تعالیٰ کے ارشاد ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی (جو کوئی رسول کی مخالفت کرے بعد ازیں کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی اور مؤمنین کے راستہ کے سوا دوسرا راستہ اختیار کریگا ہم اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیں گے جو اس نے اختیار

کی ہے اور جہنم میں جھونک دیں گے، کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ مؤمنین سے
مراد حضرات صحابہ اور قرنِ اوّل (کے مسلمان) ہیں، دوسرے یہ کہ یہی وہ
حضرات ہیں جن سے بلا واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب
بالمواجہہ ہوا ہے اور انہوں نے خوبصورتی کیساتھ سوال کر کے ان اشکالات
سے تسلی حاصل کی جو ان کے دلوں میں واقع ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان کو بہترین جواب دیا اور اچھی طرح حقیقت کو واضح فرما دیا، صحابہؓ
نے اس کو سُنا اور سمجھا، اس پر عمل کیا اور اچھی طرح عمل کیا، محفوظ کیا
اور ضبط کے ساتھ یاد رکھا پھر (دوسروں کے سامنے) نقل کیا اور سچائی
کے ساتھ نقل کیا، پس اُن کے لئے بڑی فضیلت ہے کیونکہ انہی کے
ذریعہ سے ہمارا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ سے پھر
حق جل وعلا کے سلسلہ سے ملا پس اُن کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ اُن کے
حق کے لحاظ سے بھی اور سبقت کی وجہ سے بھی، اللہ تعالیٰ اُن کو بہترین
جزاء عطا فرمائے جو کسی محسن کو عطا کی گئی ہو اور ان کے الفاظ کیونکر چھوڑے
جا سکتے ہیں حالانکہ ہم نے اُن کے حق واجب کا دسواں حصہ بھی بیان
نہیں کیا، اور اگر کوئی ملحد (بددین) اُن پر اعتراض کرے اور اس
نعمت کی ناشکری کرے جو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے ذریعہ سے ہم کو
عطا فرمائی ہے تو اس کا منشا اس کا جہل اور سوءِ فہم اور قلت ایمان
ہے (اور کچھ نہیں) کیونکہ اگر اُن پر بھی تنقیص کا کوئی شائبہ پہنچ سکتا
ہے تو دین کا کوئی پایہ قائم نہیں رہ سکتا، وہی تو ہم تک (دین کے) پہنچانے
والے ہیں اگر یہ مقدس ناقل بھی مجروح ہو گئی توعـــہ احادیث و آیات کا معاملہ

عـــہ اس تقریر سے اُن لوگوں کو سبق لینا چاہیئے جو حدیث۔ انکار کرتے ہیں
اور حضرات صحابہ اور محدثین کرام کی محنت و مشقت کا احسان۔
نہیں مانتے ۱۲ ظ

خطرناک ہو جائے گا جس سے تمام مخلوق تباہ ہو جائیگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کے بعد اور وحی نہیں آسکتی (اب اگر اس وحی میں بھی شک و شبہ کو دخل ہو گیا تو مخلوق کا کہاں ٹھکانا رہے گا) حق تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں لانذرکم بہ ومن بلغ (کہ اے رسول فرما دیجیئے کہ یہ قرآن مجھ پر اس لیئے نازل کیا گیا ہے کہ تم کو بھی ڈراؤں اور ان لوگوں کو بھی جن کے پاس یہ پہنچ جائے) اور مبلغ (وناقل) کا عادل (ومعتبر) ہونا تبلیغ کی صحت کیلئے (پہلی) شرط ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں اُن میں سے جس کے بھی پیچھے ہو گے راستہ پالوگے) اور (ظاہر ہے) کہ ہر ستارہ میں چمک اور روشنی ضرور ہے (تو ہر صحابی کا صاحب نور ہونا لازم ہے) اللہ تعالیٰ ہم کو صحابہ کے ساتھ محبت رکھنے والوں اور اُن کے طریقہ پر چلنے والوں میں سے کرے (آمین) اور باایں ہمہ میں اپنے کو لغزشوں سے بری نہیں سمجھتا مگر میں نے اس (تصنیف کے) معاملہ میں اپنا پیشوا (اور نمونہ) حضرت عبداللہ بن عباس کے ایک ارشاد کو بنایا ہے جب اُن سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو مہینہ بھر تک آپنے جواب نہ دیا لوگوں نے عرض کیا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی! آپکے سوا اس مسئلہ کا جواب دینے والا ہمارے پاس کوئی نہیں، فرمایا اب جبکہ تم نے تقاضہ کیا ہے تو میں (جواب دینے کی) کوشش کروں گا اگر درست ہوا تو اللہ کی طرف سے فضل ورحمت سمجھو اور غلط ہوا تو میری اور شیطان کی طرف سے سمجھو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سچے ہیں (ہماری غلطی کو آپ کیطرف منسوب نہ کرو۔ پس میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اُن کے اصحاب کو اپنے مقصود کے لیئے اللہ کی طرف وسیلہ بنا لیا اور اس کتاب کا نام بھجۃ النفوس وتحلیھا بمعرفۃ مالھا وما علیھا تجویز کیا ہے اور میں اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ وھو حسبی ونعم الوکیل

باب اوّل

حدیث بدأ الوحیٰ

حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اولاً وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے ہوئی کہ آپ سوتے ہوئے جو خواب بھی دیکھتے اس کا ظہور ایسا ہوتا جیسا صبح کی پو پھٹتی ہے پھر آپ کو خلوت سے محبت دی گئی، آپ غارِ حرا میں خلوت گزیں ہونے اور اس میں کئی کئی رات مسلسل عبادت کرتے اور اس زمانۂ خلوت کیلئے توشہ (کھانے پینے کا سامان) ساتھ لے آتے پھر سامان ختم ہوجاتا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس جاتے اور اتنے ہی دنوں کیلئے اور توشہ لے آتے یہاں تک کہ آپ کے پاس غارِ حرا ہی میں (پیغام) حق آ پہنچا فرشتہ آپ کے سامنے آیا اور اس نے کہا پڑھیئے، آپ نے فرمایا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں، حضور فرماتے ہیں کہ (اس جواب پر) فرشتہ نے مجھے پکڑا اور (سینے سے لگا کر) زور سے دبایا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہونے لگی تو چھوڑ دیا اور پھر کہا پڑھیئے میں نے (وہی جملہ اب بھی) کہا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپ فرماتے ہیں کہ (اس جواب پر) مجھے پھر اس نے پکڑا اور دوبارہ زور سے دبایا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہونے لگی تو چھوڑ دیا اور پھر کہا پڑھیئے میں نے پھر وہی کہا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں تو اس نے اس دفعہ بھی پکڑا اور سہ بارہ زور سے دبایا پھر چھوڑ کر کہا

اقرأ باسم ربك الذی خلق ۝ خلق الانسان من علق

اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم)
پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کو سیکر اس حالت میں واپس ہوئے کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا اور حضرت خدیجہ کے پاس پہنچ کر فرمایا مجھے کمبل اڑھادو، کمبل اڑھادو، چنانچہ انہوں نے کمبل اوڑھا دیا (اور آپ کمبل اوڑھ کر کچھ دیر لیٹے رہے) یہاں تک کہ گھبراہٹ دور ہوگئی تو آپ نے حضرت خدیجہ سے فرمایا کہ مجھے تو اپنی جان کا اندیشہ ہوگیا ہے (کیونکہ وحی کا ثقل بہت ہوتا ہے حضور نے عمر بھر اس کو محسوس کیا ہے تو پہلے دن جس قدر ثقل ہوا ہوگا اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے ؟ حضور کو اس ثقل ہی کی وجہ سے اپنی جان کا خطرہ ہوا) حضرت خدیجہ نے عرض کیا ہرگز نہیں خدا کی قسم! وہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے، اپاہجوں کا بوجھ اٹھاتے، ناداروں کو کمانے (کھانے) کے قابل بناتے مہمان کی میزبانی کرتے اور قابل امداد حادثات میں مدد فرماتے ہیں، اس کے بعد حضرت خدیجہ آپ کو ساتھ لیکر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس گئیں جو حضرت خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے اور زمانہ جاہلیت میں نصرانی بن گئے تھے، عبرانی زبان میں لکھنے پر قادر تھے چنانچہ انجیل کا جتنا حصہ مقدر ہوتا عبرانی میں لکھ لیتے تھے، اس وقت وہ بہت بوڑھے اور نابینا ہوگئے تھے، حضرت خدیجہ نے کہا اے ابن عم! ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ تو سنو! ورقہ نے حضور سے کہا میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بیان کردیا جس پر ورقہ نے کہا یہ تو وہی معزز فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا۔ کاش! میں اس وقت جوان ہوتا (جب کہ آپ کو تبلیغ کا حکم دیا جائے گا۔) کاش میں اس وقت تک زندہ ہی رہتا جب آپ کو آپ کی قوم (مکہ سے) نکال دیگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(تعجب سے) فرمایا! کیا یہ لوگ مجھے نکالنے والے ہیں؟ (حالانکہ اس وقت تک وہ میرا بڑا احترام کرتے اور صادق امین کے نام سے پکارتے ہیں) ورقہ نے کہا ہاں، (آج تک) کوئی بھی اپنی قوم کے پاس یہ چیز نہیں لایا جو آپ لائے ہیں مگر اس کے ساتھ دشمنی ضرور کی گئی اور اگر میں نے وہ دن پایا جو آپ کو پیش آنے والا ہے تو آپ کی پوری مدد کروں گا۔ مگر ورقہ کو اس کے بعد زیادہ دن نہ گذرے کہ وفات پا گئے، اور (کچھ دنوں کے لئے) وحی رک گئی (تاکہ آپ کو اس کا اشتیاق بڑھے)۔

ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فترت وحی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن میں چلا جا رہا تھا اچانک آسمان کیطرف سے میں نے ایک آواز سنی، اوپر کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، مجھے (یہ منظر دیکھ کر) ڈر لگا تو (گھر کو) واپس ہوا اور حضرت خدیجہ سے کہا مجھے گرم کپڑا اوڑھا دو، کمبل اوڑھا دو۔ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں

یا ایھا المدثر قم فانذر و ربك فکبر و ثیابك فطھر والرجز فاھجر ولا تمنن تستکثر و لربك فاصبر

اس کے بعد وحی کا دریا جوش میں آ گیا اور پے در پے آنے لگی۔

شرح یہ حدیث فوائد کثیرہ پر مشتمل ہے جن میں احکام بھی ہیں، آداب بھی اور قواعد ایمان میں سے بہت سے قواعد اور سلوک و ترقی کے مقامات کی معرفت بھی، اور ان مطالب و معانی ہی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث حضرت عائشہ سے بیان فرمائی تاکہ وہ دوسروں تک اسے پہنچا دیں اور اُن کو ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ترقی کا طریقہ

معلوم ہو، اور ان فوائد کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کو بیان فرمایا اور لوگوں نے اُن سے روایت کی، اور ہم انشاء اللہ حسب توفیق الٰہی ان میں سے کسی قدر پر تنبیہ و اشارہ کریں گے۔

۱- **ہدایت امر وہبی ہے کسبی نہیں** حدیث کا یہ لفظ کہ "پھر آپ کو خلوت کی محبت دی گئی (اس بناء پر کہ یہ صیغہ اس پر دال ہے کہ یہ محبت کسی دینے والے نے دی، خود نہیں ہو گئی) اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت محض اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کسی انسان وغیرہ کا اس میں دخل نہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں ابتداء ہی سے یہ بھلائی لکھدی تھی، آپ کے ساتھ کوئی ترغیب دینے والا نہ تھا۔

خلوت کی حقیقت خلوت کے معنی ہیں کہ انسان اکیلا ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی چیز کی محبت دی گئی جو آپ کی شریعت میں عبادت کی جڑ اور عبادت کا اعلیٰ فرد ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خلوت بڑی عبادت ہے، غرض خلوت خود ایک عبادت ہے اور اگر اس کے ساتھ کوئی اور طاعت بھی مل جائے (مثلاً ذکر و فکر وغیرہ) تو وہ تعبد ہے اور نور علی نور ہے"

(الوجہ الثالث قولها ثم حبب الیہ الخلاء الی قولہ فھو نور علی نور)

ف ہدایت کی دو قسمیں ہیں ایک راستہ معلوم کرنا دوسرے راستہ پر پڑ جانا پہلی قسم اختیاری ہے جو انسان کو اسباب و دلائل میں غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری وہبی ہے۔ حضرت مصنف نے اسی دوسری قسم کے متعلق فرمایا ہے کہ کسی انسان کو اس میں دخل نہیں مگر عادت الٰہی یہ ہے کہ جو شخص صدق طلب اور کوشش کے ساتھ راستہ معلوم کر لیتا ہے اس کو راستہ پر چلنے کی بھی توفیق ہو جاتی ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا اور عالم اسباب میں جملہ اسباب کی یہی حالت ہے کہ اسباب پر تو انسان کو کچھ اختیار حاصل ہے مگر مسببات پر

اختیار حاصل نہیں وہ محض وہبی ہے جیسے زراعت کرنا انسان کے اختیار میں ہے مگر بیج کا بارآور ہونا اس کے اختیار میں نہیں مگر عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ جو زراعت باقاعدہ کرتا ہے اس کو ثمرہ مل ہی جاتا ہے۔

ف حضرت مصنف کا یہ ارشاد کہ خلوت خود عبادت ہے اور اگر اس کے ساتھ کوئی اور طاعت بھی مل جائے تو نور علی نور ہے، یہ وہ بات ہے جو حضرت حکیم الامت نے بارہا بیان فرمائی ہے کہ اگر کسی سے کچھ بھی کام نہ ہو سکے تو کم از کم ایک وقت روزانہ ایسا مقرر کرے جس میں سب سے الگ ہو کر خاموش بیٹھا رہا کرے انشاء اللہ یہ بھی اسکو راستہ پر لگا دے گا۔"

۲۔ تبتل کلی خلاف سنت ہے

حضرت عائشہؓ کا ارشاد کہ ، پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس جاتے اور اتنے ہی دنوں کیلئے توشہ لے آتے، اس بات کی دلیل ہے کہ (مخلوق سے) بالکل الگ ہو جانا اور (بیوی بچوں سے) ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہو جانا سنت نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار (حرار) میں اس طرح گوشہ نشینی اختیار نہیں کی کہ گھر والوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہو بلکہ آپ صرف چند دنوں کے لئے عبادت کرنے وہاں جاتے پھر گھر والوں کی ضروریات کیلئے واپس آجاتے پھر (کچھ دنوں) کے لئے وہاں تشریف لے جاتے ؛

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں تبتل (و انقطاع کلی) سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

لا رھبانیۃ فی الاسلام

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

(کہ نکاح ہی نہ کیا جائے اور مخلوق سے بالکل الگ تھلگ رہا جائے) اور یہ ممانعت ان لوگوں سے متعلق ہے جو رہبانیت کو سنت (اور ثواب) سمجھ کر اختیار کریں اور جو شخص اس لئے بے نکاح رہے کہ اس کو نکاح

قدرت ہی نہیں یا تو اس وجہ سے کہ اس کے پاس (نان ونفقہ) کی گنجائش نہیں یا اس وجہ سے کہ نکاح اس کو موافق نہیں وہ اس ممانعت کے تحت میں داخل نہیں، (الوجہ الثامن من قولہ فیہ دلیل علی ان المتبتل الکلی والانقطاع الی اللہ ثم الی قولہ فلا یدخل تحت ھذا النھی)

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو بیوی بچوں کے تعلق کو تصوف کے خلاف سمجھتے اور اُن سے بے تعلقی کو خلوت اور یکسوئی کیلئے شرط سمجھتے ہیں ۱۲

۳- حقوق واجبہ ادا کرنے کے بعد ہی خلوت ہو سکتی ہے

یہ ارشاد اس کی بھی دلیل ہے کہ عبادت حقوق واجبہ کو پوری طرح ادا کرنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کے پاس اُن کے حقوق ادا کرنے ہی کو (خلوت سے) واپس آتے تھے اسی طرح دوسرے حقوق واجبہ کا ادا کرنا اور پوری طرح ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد مستحبات میں مشغول ہونا چاہیئے (الوجہ التاسع فیہ دلیل علی ان العبادۃ لا تکون الا بعد اعطاء الحقوق الی قولہ وحینئذ یرجع الی مندوبات)

ف خلاصہ یہ کہ حقوق واجبہ کو تلف کر کے خلوت و عبادت کرنا حقیقت میں عبادت نہیں بلکہ ہلاکت ہے گو ظاہر بیں اس کو عبادت سمجھتے ہوں ۱۲۔

۴- طریق تربیت دوسرے طریقوں سے افضل ہے

اس ارشاد میں اسکی دلیل بھی ہے کہ مرید کے لئے (طریق) تربیت (کہ تدریجاً ترقی کرے) دوسرے طریقوں سے افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اول (سچے) خواب سے ہوئی پھر ترقی فرماتے گئے یہاں تک کہ درجۂ کمال کو پہنچ گئے اور (ظاہر ہے کہ) رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم افضل البشر ہیں پس اگر تربیت کے سوا کوئی دوسرا طریقہ افضل ہوتا تو آپ اس کے زیادہ مستحق تھے۔

(الوجہ الثانی عشر فیہ دلیل علی ان التربیۃ للمریدین افضل من غیرھا الی قولہ لکان اولی بہ من غیرہ)

ف اس سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو شیخ کی ایک نظر میں صاحب نسبت ہونے کے متمنی ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کامیابی کا یہ طریقہ افضل نہیں بلکہ افضل یہی ہے کہ تربیت کے طریقہ سے کامیابی حاصل ہو (وھذا ھو ذوق مشائخنا سیما حکیم الامت منھم)

۵۔ مبتدی کیلئے خلوت ہی مناسب ہے

اس ارشاد میں اس کی بھی دلیل ہے کہ مبتدی کے لئے خلوت اور گوشہ نشینی ہی بہتر ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا امر میں اکیلے ہی رہتے تھے اور جب اس انتہا پر پہنچ گئے جو آپ کے لئے مقدر تھی پھر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ گھر والوں کے درمیان رہ کر ہی عبادت کرتے تھے۔ اب آپ کی یہ حالت ہو گئی کہ سجدہ کے وقت گھر والوں کا پیر دبا دیتے تاکہ وہ اپنا پیر سمیٹ لیں (اور سجدہ کے لئے جگہ ہو جائے) اور ابتداً میں آپ نے اس پر قناعت نہیں فرمائی کہ گھر میں رہ کر گھر والوں سے یکسو رہیں بلکہ غار کی طرف تشریف لے جاتے تھے جیسا اوپر گذرا۔

(الوجہ الثالث عشر فیہ دلیل علی ان الاولی باھل البدایۃ الخلوۃ والاعتزال الی قولہ حتی خرج الی الغار)

ف خلاصہ یہ کہ خلوت در انجمن مبتدی کے لئے مناسب نہیں بلکہ اس کو خلوت کاملہ کی ضرورت ہے۔ خلوت در انجمن منتہی کا درجہ ہے اس کو اہل و عیال اور احباب کی صحبت توجہ الی اللہ سے مانع نہیں ہوتی، مگر منتہی کو بھی دن رات میں ایک وقت خلوت کاملہ کیلئے مقرر کرنا چاہیئے۔

(لقوله تعالیٰ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد بلوغہ درجۃ الکمال واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا بعد قولہ ان لک فی النہار سبحا طویلا)

۶۔ خلوت کمال عبادات اور صلاح دین میں معین ہے اس حدیث میں اسکی بھی دلیل ہے کہ خلوت سے انسان کو کمال عبادت اور دین کی درستی میں مدد ملتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں سے الگ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے اور خلوت میں رہنے لگے اسی وقت آپ کو یہ خیر عظیم (یعنی نبوت) حاصل ہوئی پس جو شخص بھی آپ کے موافق عمل کریگا اس کو خیر حاصل ہوگی اور مقامات ولایت میں سے اللہ تعالیٰ نے جو درجہ بھی اس کے لئے مقدر فرمایا ہے اس پر پہنچ جائے گا۔ (الوجہ الرابع عشر فیہ دلیل علی ان الخلوۃ اعون للانسان علی تعبدہ الی قولہ بحسب ما قسم اللہ من مقامات الولایۃ

۷۔ خلوت کیلئے توشہ ساتھ لیجانا سنت ہے حدیث میں اس کی بھی دلیل ہے کہ جائے اعتکاف یا خلوت گاہ یا مقام مراقبہ میں داخل ہونے وقت توشہ ساتھ لینے کی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلوت کی عبادت کیلئے کھانے پینے کا اتنا سامان لیجایا کرتے تھے جس سے مدت قیام میں زندگی کا سہارا ہو، اور اس میں حکمت یہ ہے کہ توشہ ساتھ لیکر جانے میں صفت عبدیت اور اپنی احتیاج وضعف کا اظہار ہے، کیونکہ انسان کو ان امور کی طاقت بجز اللہ سبحانہ کی اعانت کے کبھی حاصل نہیں ہوسکتی اور بدون توشہ کے جانے میں ایک گونہ دعویٰ کی شان ہے اگرچہ زبان سے کچھ نہ کہا جائے اور نہ دل سے نیت کی جائے تو ایسا کرنیوالے پر اندیشہ ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی کی ذات کے حوالہ نہ کردیں پھر وہ اپنا ارادہ

پورا کرنے سے عاجز ہو جائے جو اس راستہ میں اس نے کیا تھا، اسی لئے
بعض حضرات صوفیہ شدت اتباع سنت کی وجہ سے اپنی خلوت گاہ
میں داخل ہونے کے وقت ایک روٹی ساتھ لے لیتے تھے۔ اور اس کو اپنے
تکیہ کے نیچے رکھ دیتے اور کئی کئی دن تک مسلسل روزہ رکھتے اور روٹی میں
سے کچھ نہ کھاتے، کسی مرید نے ان کی یہ حالت دیکھ لی تو اس نے تکیہ
کے نیچے سے روٹی نکال لی، ایک دن شیخ نے روٹی کو تلاش کیا اور
(تکیہ کے نیچے) نہ پایا تو مریدوں پر بہت جھلائے اور ان کی اس حرکت
پر بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ جب آپ کو اس کی ضرورت
نہیں (اور بدوں کچھ کھائے پیئے مسلسل روزے رکھ لیتے ہیں) تو اس
روٹی کو یہاں کس لئے رکھتے ہیں؟ فرمایا کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ قوت
جو میرے اندر دیکھتے ہو میری ذاتی قوت ہے؟ (ہرگز نہیں) بلکہ محض اللہ تعالیٰ
کا فضل و احسان ہے۔ اب بتلاؤ اگر میں (اپنی اصلی حالت کو بھول جاؤں (اور) حالت
بشریت ہی کی طرف لوٹا دیا جاؤں تو (اس وقت) میں کیا کروں گا؟ (کیا اس وقت
بھی بدون کھائے پیئے روزہ رکھ لوں گا ہرگز نہیں) غرض وہ (بزرگ) اپنے ضعف
کی حالت کا اور عادتاً جتنی قدرت انسان کو دی گئی ہے اس کا لحاظ کر کے کام
کرتے اور اس کے سوا جو کچھ (ظاہر) ہوتا اس کو اپنے اوپر اللہ کا فضل (و احسان)
سمجھتے تھے، اور ان سب حالات میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع
کرتے تھے جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے نیز اس میں ایک اور
بھی حکمت ہے وہ یہ کہ توشہ ساتھ لے کر جانے میں (پریشانی) کا سد باب ہے
کیونکہ جب توشہ آپ کے سامنے ہوگا تو نفس کو کوئی انتظار اور تعلق (باقی) نہ رہیگا
حدیث میں آیا ہے کہ جب انسان کے پاس قوت ہوتی ہے تو اس کو اطمینان نصیب
ہو جاتا ہے، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ حلال طریقہ سے روزی مل سکے ورنہ اللہ
روزی دینے والا ہے اور بڑی قدرت والا ہے (وہ غیب سے روزی دیں گے اور

اس صورت میں توشہ لینے کی ضرورت نہیں) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب قاعدہ کے موافق روزی نہ ملتی تو اپنے پیٹ پر بھوک کی وجہ سے تین تین پتھر باندھ لیتے تھے اور توشہ کا سامان کرنے کی اصلاً کوشش نہ فرماتے بلکہ اس کا خیال بھی نہ فرماتے : (الوجہ الخامس عشر فی دلیل علی التسبب فی الزاد الی قولہ ولا ینظر الیہ)

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو ترکِ اسباب کو شرطِ تصوف سمجھتے اور مشغولیٔ اسباب کو مانعِ طریق سمجھتے ہیں ۱۲

۸- اپنے گھر والوں کو جائے خلوت سے مطلع کر دینا چاہیئے حدیث میں اس کی بھی دلیل ہے کہ انسان جب عبادت کے لئے باہر جائے تو اپنے گھر والوں کو اور متعلقین کو اس جگہ کی اطلاع کر دے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غارِ (حرا) کی طرف جاتے تو آپ کے گھر والوں کو جگہ کی بھی خبر ہوتی تھی اور اس بات کی بھی کہ آپ کس لئے وہاں جا رہے ہیں اور اسمیں چند حکمتیں ہیں (ایک) یہ کہ اس کو اور اس کے گھر والوں کو کسی بیماری یا حادثہ وغیرہ کا پیش آجانا ہر وقت ممکن ہے تو اگر گھر والوں کو اس کی جگہ معلوم ہوگی تو ایسے عوارض پیش آنے کے وقت اُن کو اس کے پاس جانے میں سہولت ہوگی (دوم) یہ کہ گھر والوں کو اپنی جگہ (اور اپنا ارادہ) بتلانے سے اُن کو خوشی پہنچے گی اور پریشانی دور ہوگی ورنہ وہ مختلف مقامات کی طرف خیال دوڑائیں گے جہاں اس کا جانا ممکن (و محتمل) ہے تو اُن کو خبر کر دینے میں اس پریشانی کا ازالہ ہو جائیگا اور خوشی اس واسطے ہوگی کہ اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ عبادت کے لئے سب سے الگ رہنا چاہتے اور عبادت میں مشغول ہونا چاہتے ہیں (کسی دشمن وغیرہ کے خوف سے جنگلوں میں نہیں چھپتے) اور مسلمان کو (خصوصاً گھر والوں کو) خوش کرنے میں جس قدر ثواب اجر ہے معلوم ہے (سوم) یہ کہ اسمیں اپنے گھر والوں

اور دوستوں کو بھی خلوت و عبادت کی دعوت (اور ترغیب) ہے اگرچہ (صراحت
کیا تھا) اُن سے کچھ نہ کہا جائے کیونکہ جو کام بار بار کسی کے سامنے کیا جاتا ہے تو عام
عادت یہ ہے کہ اس کے دل کو بھی حرکت ہوتی (اور اس کا شوق اور رغبت پیدا)
ہوتی ہے (چہارم) یہ کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ عبادت کے واسطے
گوشہ نشین ہے اور اسی میں لگا ہوا ہے تو جو کوئی اس سے تعلق رکھنا چاہے گا اسی
قاعدہ کے موافق تعلق رکھے گا اور اس کے کام میں خلل انداز نہ ہوگا اور جو کوئی اس طریقہ
پر نہ رہنا چاہے گا وہ اس سے تعلق ہی نہ رکھے گا تو یہ اس سے بچا رہے گا اور اس کے
اختلاط اور صحبت سے جو تشویش لاحق ہوتی وہ بھی نہ ہوگی (الوجه السادس عشر
فيه دليل على ان المرأ اذا خرج لتعبد، ان يعلم اهله الى قوله وزال عنه ما
يلحقه من التشويش في مخالطته)

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو ذکر و شغل میں مشغول ہو
کر اپنے گھر والوں کو پریشان کرتے ہیں اور ان کی راحت کا سامان نہیں کرتے اُن
کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا تصوف جوگیوں کا تصوف ہے۔ شریعت اسلامیہ اور
سنت محمدیہ کے ہرگز موافق نہیں۔

۹۔ اسباب معاش میں تھوڑی سی مشغولی قاطع عبادت نہیں

حدیث میں اسکی بھی دلیل ہے کہ
ضروریات (بشریہ) میں تھوڑی سی مشغولی عبادت کیلئے قاطع (اور مضر) نہیں
ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت
روز تک مسلسل عبادت کرنے کیلئے باہر تشریف لیجاتے اور واپسی کے متعلق یہ
نہیں بیان کیا کہ بہت دنوں کیلئے واپس ہوتے تھے ۱۲) جس سے معلوم ہوا کہ واپسی
تھوڑی مدت کیلئے ہوتی تھی اور قلیل کثیر کے تابع ہوتا ہے، پھر آپ کا عبادت کیلئے
دوبارہ لوٹ جانا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس ضرورت میں مشغول رہتے ہوئے
بھی جس کی وجہ سے گھر تشریف لائے تھے آپکا دل عبادت ہی میں اٹکا رہتا تھا۔

تو آپ ہمیشہ عبادت ہی میں رہتے تھے، جیسے معتکف حاجت بشریہ کیلئے نکلنا اور کھانا خریدنے جاتا ہے مگر اعتکاف کی حرمت (وعزت) اس کے ساتھ قائم رہتی ہے اور یہی کہا جاتا ہے کہ وہ (مسجد سے باہر جانے کے وقت بھی) معتکف اور (اللہ کی طرف) متوجہ ہے اگرچہ اس وقت وہ دوسرے کاموں میں مشغول ہوا ہے جن کا ابھی ذکر ہوا۔

ہمارے اس قول کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) عرش کے سایہ میں پناہ دیں گے جبکہ سایہ عرش کے سوا اور کسی جگہ سایہ نہ ہوگا، منجملہ اُن کے ایک وہ شخص ہے جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے، تو (دیکھو) اس شخص کو (ضرورت کے وقت) مسجد سے باہر جانا مضر نہیں ہوا کیونکہ دل اسی سے اٹکا ہوا تھا اور اس کو کتنی بڑی خبر (اور کیسا درجہ اور کیسی عزت) دی گئی اسی وجہ سے اہل تصوف ہر حال میں اپنے دلوں کو حضور (دائم) اور داد کے ساتھ آباد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ کسی مباح کام میں مشغول ہوں یا خلوت میں (بیٹھے) ہوں، پھر چونکہ اُن کا باطن صاف ہو گیا ہے تو اُن کا نام بھی صوفیہ (یا صوفی) ہو گیا جو کہ صفا سے مشتق ہے (الوجہ السابع عشر فیہ دلیل علی ان الشغل الیسیر الضروری لا یکون قاطعا للعبادۃ الی قولہ وھو مشتق من الصفاء)

۱۰۔ حدیث کا یہ لفظ کہ فرشتہ نے مجھے پکڑا اور زور سے دبایا، اس بات کی دلیل ہے کہ کسی کو (سینہ) سے لگا کر دبانا اس کے باطن میں ایک نورانی قوت پیدا کر دیتا ہے جو تمام بدن میں پھیل جاتی ہے اور جو چیز القاء کی جائے اس کے تحمل میں معین ہوتی ہے (جبکہ دبانے والا صاحب نور اور صاحب قوت روحانیہ ہو) کیونکہ جس وقت جبریل علیہ السلام کا بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ سے مل گیا تو آپ کے اندر اس کے اثر سے

یہی بات پیدا ہو گئی کہ آپ نے اس (وحی) کا تحمل کیا جو آپ پر القاء کی گئی اور فرشتہ کی باتیں سننے کے لئے (استقلال کے ساتھ) کھڑے رہے اور اس دولت کو آپ کے وارثوں میں سے اہل تصوف نے پالیا ہے جو (حضور کے) متبع اور محقق ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ سے منقول ہے کہ ان کے پاس کچھ لوگ اعتراض کی غرض سے آئے تو انہوں نے جواب دینے سے انکار کیا .... اور اس وقت ان کے پاس ایک عام آدمی بکریاں چرانے والا موجود تھا شیخ نے اس کو بلا کر سینہ سے لگایا پھر کہا تم ان لوگوں کے سوالات کا جواب دے دو، چنانچہ اس شخص نے جواب دیا اور بلیغ جواب دیا لوگوں نے پھر اس کے سامنے کچھ سوالات پیش کئے وہ ان کا جواب بھی تفصیل اور منع اور اعجاز کے ساتھ دیتا رہا یہاں تک کہ تمام علماء کو جو اس وقت موجود تھے گفتگو میں بند کر دیا۔ شیخ نے اس کو پھر بلایا اور سینہ سے لگالیا تو جیسا پہلے جاہل تھا ویسا ہی ہو گیا کہ کسی بات کا بھی علم نہ رہا، وہ کہنے لگا اے حضرت! اہل اللہ تو جب کوئی چیز دیدیا کرتے ہیں اس کو واپس نہیں لیا کرتے فرمایا ہاں بات تو یہی ہے مگر تجھ کو اس طریق سے کچھ مناسبت نہیں (یعنی تجھ کو یہ دولت تیری طلب پر نہیں دی گئی تھی بلکہ علماء کی تنبیہ کے لئے بلا طلب دی گئی تھی اس لئے ضرورت رفع ہو جانے کے بعد واپس لے لی گئی) پھر اس کو (اس کے درجہ کے مناسب) خیر کی بشارت دی اور جو فرمایا تھا وہی ہوا تو جب ایک انسان کے دوسرے انسان کو گلے لگانے میں یہ اثر ہوا حالانکہ وہ (حضور کا) وارث تھا تو جس وقت خود مورث اعلیٰ (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کا بدن روح الامین کے بدن سے ملا ہو گا۔ کیسا کچھ اثر ہوا ہو گا (اس کو خود ہی سمجھ لو) (الوجہ الثلاثون) و فیہ دلیل علی ان اتصال جرم الغاط بالمغط الی قولہ بجسد الروح الامین۔

ف قلت وھذا ھو الحق فی حکمۃ غط جبرئیل للنبی صلی اللہ

علیہ وسلم وضمہ الیہ واما ما قیل من انہ علیہ السلام ضمہ الیہ تادیبا لہ وان شدۃ الغطات مبالغۃ فی التادیب فدعوی مجردۃ لا دلیل علیہا فی لفظ الحدیث لاحتمال ان یکون الضم لان یحدث فی باطنہ صلی اللہ علیہ وسلم قوۃ نوریۃ منتعشۃ تکون عونا علی حمل ما یلقی الیہ وشدۃ الغطۃ تدریجاً لحمل الثقل لان کلام اللہ تعالیٰ حین نزولہ ثقیل یشہد لذلک قولہ عز وجل انا سنلقی الیک قولاً ثقیلا" واذ کان الفعل محتملا لوجہین یجب حملہ علی الوجہ الذی یلیق بشان الرسول علیہ صلوٰۃ اللہ وسلامہ ما ھبت الدبور والقبول ومن این لنا ان نقول ان جبریل کان معلما ومؤدبا لہ صلے اللہ علیہ وسلم ولم یدل علی ذلک دلیل والذی نبت بالآیات والآثار انما ھو کونہ رسولا وسفیرا محضا وان اللہ تعالیٰ کان ھو معلما لرسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ومؤدبا لہ کما ورد فی الحدیث علمنی ربی فاحسن تادیبی والعجب من الشارح انہ مع علمہ بان حکمۃ الغط انما ھو احداث قوۃ نوریۃ فی باطنہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف اتبع غیرہ من الشراح فی حملہ ذلک علی التادیب فی الوجہ الخامس والعشرین من فوائد ھذا الحدیث وقد کنت ترجمت ھذین الوجہین اولا ثم ضربت علیہما ولم ارض بان یقف علی ذلک العوام فیتوحشوا منہ وقد امرنا بان نکلم الناس علی قدر عقولہم وفہمہم واللہ یتولی ھداک ۱۲ ظ

۱۱۔ مجاہدۂ نفس کے بعد ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے

حدیث میں صوفیہ کے اس قول کی دلیل ہے کہ تحلیہ (بالحاء المحملہ) عـہ تخلیہ (بالخاء المعجمہ) عـہ کے بعد ہی ہوا کرتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً تخلیہ (اور مجاہدہ) اختیار فرمایا۔

عـہ یعنی کامیابی اور وصول الی اللہ ۱۲

عـہ مجاہدۂ نفس ۱۲

یہاں تک کہ آپ کی کوشش اور طاقت ختم ہوگئی، پھر چونکہ آپ کا تخلیہ دوسروں کے تخلیہ سے افضل واشرف تھا اور انسان اس درجہ کے مناسب تخلیہ سے عاجز ہے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو اپنے (سینہ سے) چمٹا کر دبایا یہاں تک کہ آپ کو اس تخلیہ کے لائق تخلیہ حاصل ہوگیا (جو آپ کو عطا ہونے والا تھا) اسی واسطے آپ فرماتے ہیں حتی بلغ منی الجھد (کہ فرشتہ نے مجھ کو اتنا دبایا کہ مجھے تکلیف ہونے لگی) غرض جبریل کا آپ کو دبانا تخلیہ (کی تکمیل) ہی (کیلئے) تھا یہاں تک کہ آپ مجاہدۂ نفس کے انتہائی مقام پر پہنچ گئے اور وحی کا آپ کی طرف القاء ہونا یہ تحلیہ تھا (اور چونکہ آپ کی وحی دوسروں کی وحی سے افضل ہے جس کی دلیل قرآن کا اعجاز اور قیامت تک اس کا محفوظ رہنا ہے تو آپ کا تحلیہ دوسروں کے تحلیہ سے افضل واکمل و اشرف ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ جو شخص طریق (باطن) میں تربیت اور تدریج کے ساتھ داخل ہوا ہو وہ اس شخص سے افضل ہے جو دوسرے طریقوں سے داخل ہوا کیونکہ یہ سب معاملات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے تربیت اور تدریج ہی کے طور پر تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اسی وقت ترقی فرماتے تھے جبکہ پہلے مقام کے ادب کو مستحکم فرما لیتے اور اس کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتے اور جن فوائد پر وہ مشتمل ہے اس سے بخوبی واقف ہو جاتے اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں لوگوں کو اسی شخص سے زیادہ نفع پہنچا ہے جس نے تربیت کے طریقہ پر کمال حاصل کیا اور جو شخص اس طریقہ کے سوا کسی اور طریق سے چلا ہو اس سے بہت کم لوگوں کو فائدہ ہوا (الوجہ الثانی ذالشدثون فیہ دلیل لاھل الصوفۃ حیث یقولون ان التخلی لا یکون الا بعد التخلی الیٰ قولہ وقل من ینتفع علی من یکون دخولہ بغیر ذلک)

ف تخلیہ اور تحلیہ تصوف کے اصطلاحی الفاظ ہیں تخلیہ مجاہدہ

نفس کو کہتے ہیں اور تحلیہ مشاہدہ اور حصول مقامات کو، پھر طریق باطن میں داخل ہونے والوں کی تین قسمیں ہیں بعضے اولاً مجاہدہ کرتے ہیں پھر مشاہدہ سے کامیاب ہوتے ہیں یہ طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے مشابہ ہے اور چشتیہ کا طریقہ یہی ہے بعض لوگ اولاً مشاہدہ میں مشغول ہوتے ہیں پھر مجاہدہ کرتے ہیں یہ طریقہ نقشبندیہ کا ہے اور بعضے تخلیہ و تحلیہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں اور آجکل کے محققین طریق کار کا دستور العمل یہی ہے جس کو اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ آجکل لوگوں کی عمریں کم ہیں اور اذکار و اشغال زیادہ ہیں تخلیہ و تحلیہ کی الگ الگ تکمیل کا اُن کو وقت نہیں ملتا اور مقصود تمام طرق سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ چشتیہ کا اصلی طریقہ سنت نبویہ کے زیادہ موافق ہے ۱۲

۱۲- مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں ایک کسبی ایک وھبی حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ تخلیہ (یعنی مجاہدہ) کی دو قسمیں ہیں ایک کسبی (اختیاری) دوسرے وہ جو اللہ سبحانہ کی طرف سے (بلا اختیار عبد) فائض ہو تخلیہ کسبیہ تو جیسا اوپر گذر چکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار میں خلوت و عبادت اختیار کی، اور تخلیہ وہبیہ وہ ہے جس کے متعلق اس وقت گفتگو ہو رہی ہے یعنی (جبریل علیہ السلام کا آپ کو) سینہ سے لگانا اور دبانا۔ پھر سالکین میں سے بعض تو وہ ہیں جن کا تخلیہ کسبی ہی ہوتا ہے وہبی نہیں ہوتا اور بعض وہ ہیں جن کا تخلیہ صرف وہبی ہوتا ہے کسبی نہیں ہوتا جیسے ابراہیم بن ادہم اور فضیل بن عیاض وغیرہما، اور بعضوں کے لئے دونوں قسم کا تخلیہ جمع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اختیار سے بھی مجاہدہ کرتے ہیں اور غیب سے بھی اُن پر مجاہدہ فائض ہوتا ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (معاملہ) کیا گیا اور ایسے بہت ہیں اور یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں (الوجہ الرابع و الثلاثون فیہ دلیل علی ان التخلی علی ضربین مکتسب و فیض من اللہ سبحٰنہ

الیٰ قولہ وھو فضل اللہ یوتیہ من یشاء)

ف خلاصہ یہ کہ مجاہدہ اس طریق میں لازم ہے بدون اس کے کامیابی نہیں ہوتی خواہ مجاہدہ باختیار خود کیا جائے یا غیب سے فائز ہو یا دونوں طریقے جمع ہو جائیں پس اگر کسی کو بدون مجاہدہ کے کامیاب دیکھا جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس پر غیب سے مجاہدہ فائض ہوا ہے۔

۱۳۔ مخاطب سے اولاً ایسی گفتگو کی جائے جو جلدی اسکی سمجھ میں آجائے جبرئیل علیہ السلام کا (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہنا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھیئے یعنی اپنے رب کا نام لیا کیجئے (جس نے آپ کو پیدا کیا اور انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا) اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب سے اولاً ایسی گفتگو کرنا چاہیئے جو اس کی سمجھ میں جلدی آجائے جس کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو اور بحث (و تامل) کی حاجت نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً اس بات پر متوجہ کیا ہے کہ خود اپنی پیدائش میں غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا اور کیسی حکمت اور خوبصورتی کے ساتھ قطرۂ آب سے جیتا جاگتا آدمی بنا دیا اور یہ نہیں فرمایا کہ خدا نے آسمانوں، زمینوں اور ستاروں وغیرہ کو پیدا کیا، بلکہ ان باتوں کو بعد میں بیان فرمایا جبکہ حضور کو اپنی ذات اور اپنے حالات کا پوری طرح علم ہو گیا اور مدد الٰہی سے وہ بات حاصل ہو گئی جس سے تمام چیزوں پر (عقل کا) تسلط ہو جاتا ہے (کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے اسے سب چیزوں کا پہچاننا سہل ہے اپنی ذات کی معرفت سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد جملہ عالم کی معرفت آسان ہے۔ (الوحدۃ الخامس والثلاثون قول جبریل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اقرأ باسم ربک الی قولہ وحصل لہ من المادۃ الالٰہیۃ ما یتسلط بہ علی ذلک۔)

ف اس سے صوفیہ کی تائید ہو گئی جو مراقبات کی بہت تعلیم کرتے ہیں اور فہم مخاطب کی پوری رعایت کرتے ہیں اگرچہ مراقبہ خلقت انسان کی تعلیم آج کل کم کیا جاتی ہے مگر ضرورت ہے کہ اس پر توجہ کی جائے کیونکہ معرفت کا یہ بہت بڑا دروازہ ہے ۔

۱۴۔ فکر تمام اعمال سے افضل ہے: اس میں اس کی بھی دلیل ہے کہ فکر اور سوچ تمام اعمال (کی روح اور سب) سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد خلق الانسان من علق (کہ انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا) ایسے مضمون پر مشتمل ہے جس کے اندر غور وفکر کی ضرورت ہے تاکہ مخاطب کو اس کے ذریعہ سے (وجود باری کا) علم قطعی اور پختہ یقین اور سچا ایمان حاصل ہو جائے اور (ظاہر ہے کہ) غور وفکر کے بعد جو ایمان وتصدیق حاصل ہو وہ سرسری ایمان جیسا نہیں (بلکہ اس سے افضل واکمل ہے) اسی حقیقت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ کہ ایک ساعت کی غور وفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے اور ایک روایت میں ہے خیر من عبادۃ الدھر کہ زمانہ بھر کی عبادت سے افضل ہے ۔ کیونکہ جب انسان غور وفکر سے کام لیتا ہے تو اس کا ایمان قوی ہو جاتا ہے اور حق ظاہر وواضح ہو جاتا ہے اور جس قدر فکر گہرا ہو گا اسی قدر ایمان قوی ہو گا اسی وجہ سے بعض بزرگوں نے (اپنے مریدوں سے) فرمایا ہے کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ خلوت اور یکسوئی کے ساتھ آئینۂ فکر پر ہمیشہ نظر جمائے رکھنا اسی وقت تمہارے سامنے حق ظاہر ہو گا (الوجہ السادس والثلاثون فیہ دلیل علی ان الفکرۃ افضل الاعمال الی قولہ فھناک یبین لک الحق)

ف ۔ اس میں بھی صوفیہ کی تائید ہے کیونکہ اُن کو فکر کا اہتمام بہت زیادہ ہے اور اسی سے ان کو علمائے اہل ظاہر کے مقابلہ میں امتیاز حاصل ہے ، علماء ظاہر عبادات واذکار میں فکر سے کام نہیں لیتے اسی طرح مبدا و معاد کا مراقبہ نہیں

کرتے اور صوفیہ بدون فکر اور توجہ قلب کے کسی عمل کو صحیح نہیں سمجھتے اور یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو طریق باطن میں داخل ہونے کے بعد بھی بے فکری اور بے پرواہی سے کام لیتے اور مشائخ کو پریشان کرتے ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس طریق میں تیقظ اور بیداری شرط اولین ہے بے فکری کیساتھ یہ راستہ طے نہیں ہوسکتا ہے

طرق العشق کلہا آداب

ادبوا النفس ایہا الاصحاب!

رزقنا اللہ تعالیٰ وجمیع الطالبین الفکر والحضور الدائم والتیقظ والادب وختم لنا بالحسنیٰ ۱۲

(۱۵) صفات عظمت و جلال کیساتھ صفات رحمت و لطف و کرم کو بھی سوچنا چاہیئے

اس میں اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال میں تفکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم اور احسان کو بھی سوچنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد خلق الانسان من علق کے معنی تو ابھی گذر چکے کہ اللہ تعالیٰ نے اسمیں جس مضمون کو بیان فرمایا ہے اس میں غور کیا جائے اور یہ (فکر) عظمت و جلال (کے غلبہ) کو مقتضی ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا اقرأ وربك الاكرم پڑھیئے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے اور یہ نام اُن تمام ناموں کے معانی پر مشتمل ہے جو (اللہ تعالیٰ کے) لطف واحسان کو ظاہر کرتے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنے فضل کے صدقہ سے ہمارے ساتھ اسی کے موافق معاملہ فرمائیں، اور تنہا اللہ تعالیٰ کی عظمت میں فکر کرنا اور اس کے مقابل صفات کو نہ سوچنا جو ممنوع ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ جو شخص تنہا عظمت ہی میں فکر کرتا ہے اس پر اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ فکر اس کو ہلاکت کے سمندر یعنی یاس اور ناامیدی میں نہ پہنچا دے اور جب

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت و احسان کو بھی سوچے گا تو اس سے مامون رہے گا (الوجہ السابع والثلاثون فیہ دلیل علی ان المتفکر فی عظمت اللہ الی قولہ امن من ذلک)

ف۔ صوفیۂ محققین کو اس کا بہت زیادہ اہتمام ہے کہ صفات عظمت و جلال اور صفات لطف و کرم دونوں کا ساتھ ساتھ مطالعہ کیا جائے تاکہ نہ دلیری اور بیباکی پیدا ہو نہ یاس اور ناامیدی ۱۲

۱۶۔ تکلیف کے وقت دوا کرنا سنت ہے

حدیث میں اس کی بھی دلیل ہے کہ جس کو کوئی تکلیف پیش آئے اس کو اپنی عادت کے مطابق دوا (اور تدبیر و علاج کرنا چاہیے) جب تک اس میں کوئی حرام چیز نہ ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب خوف کا اثر ہوا تو آپ نے گرمی حاصل کرنے کی تدبیر کی جس کے (ایسے وقت میں) آپ عادی تھے۔ چنانچہ فرمایا مجھے کمبل اڑھا دو، کمبل اوڑھا دو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے تداوی کل نفس بما اعتادت، ہر شخص اپنی عادت کے موافق علاج کرے۔ (الوجہ الثامن والثلاثون فیہ دلیل علی ان من اصابہ امر فلہ ان یتداوی الی قولہ تداوی کل نفس بما اعتادت)

ف۔ بعض لوگ دوا اور علاج کو توکل کے خلاف سمجھتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی متوکل نہیں ہو سکتا جب آپ نے دوا اور علاج سے پرہیز نہیں کیا تو اس کو خلاف توکل ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

۱۷۔ کلام میں اختصار مطلوب ہے

حدیث کا یہ لفظ کہ آپ نے جو کچھ دیکھا تھا درقہ سے بیان فرما دیا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ کلام میں اختصار ہی مطلوب اور بہتر ہے۔ کیونکہ

حضرت عائشہ نے فرشتہ کے ساتھ جو قصہ آپ کو پیش آیا تھا پہلے بیان کر دیا تھا پھر اس کی طرف ضمیر لوٹا کر اشارہ فرما دیا تھا اور قصہ کا دوبارہ ذکر کرنے اور گفتگو کو طول دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ جملہ اہل عرب کی فصیح گفتگو میں سے ایک ہے (یا یہ کہ اہل عرب کی فصیح گفتگو کا یہی طریقہ ہے) (الوجہ الاربعون قولہا فاخبرھا الخبر الی قولہ وھو من فصیح کلام العرب)

ف صوفیہ کو آداب کلام کا بہت اہتمام ہے فضول اور زائد از کار باتوں سے بہت احتیاط کرتے اور اختصار کلام کی تاکید کرتے ہیں بشرطیکہ ایسا اختصار نہ ہو جو مقصود ہی کو ادا نہ کرے ۱۲

۱۸- واقعات مہمہ کو اپنے گھر والوں اور مخلص دوستوں سے بیان کر دینا جائز ہے

حدیث میں اسکی بھی دلیل ہے کہ آدمی کو جب کوئی امر مہم (مہتم بالشان واقعہ) پیش آئے تو اس کو جائز ہے کہ اس کو اپنے گھر والوں اور عقیدت مند دوستوں سے بیان کر دے بشرطیکہ وہ دیندار اور صاحب عقل ہوں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ واقعہ (فرشتہ کے آنے اور دبانے اور وحی لانے کا) پیش آیا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کو بیان فرما دیا اور حضرت خدیجہ کا درجہ دین اور درستیٔ رائے اور عقل صائب میں جو کچھ ہے وہ کسی سے مخفی نہیں (الوجہ الخامس والاربعون فیہ دلیل علی ان المرء اذا اصابہ امر مھم الی قولہ بحیث لا یخفی)

۱۹- اہم واقعات میں اہل علم و عقل سے رجوع کرنا چاہیے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو جب کوئی اہم واقعہ پیش آئے تو اہل علم اور اہل عقل سے اس کو دریافت کرے (اگرچہ وہ اپنے سے چھوٹے ہی ہوں) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو جب یہ واقعہ پیش آیا تو آپ ورقہ کے پاس تشریف لے گئے سو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ عالم اور سب سے افضل تھے (الوجہ السابع والثلاثون فیہ دلیل علی ان المرأ اذا وقع له واقع الی قوله وافضلھم بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

ف اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ورقہ حضرت صدیق اکبر سے بھی افضل تھے کیونکہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورقہ کے پاس تشریف لے گئے اس وقت تک حضرت صدیق کو آپ نے اسلام کی دعوت ہی نہ دی تھی پھر جس وقت حضرت صدیق کو اسلام کی دعوت دی گئی اور وہ ایمان لے آئے تو وہ سب سے افضل ہو گئے کیونکہ ورقہ کے متعلق علماء میں اختلاف ہے کہ انہوں نے حکم تبلیغ سے پہلے جو آپ کی نبوت کی تصدیق کی ہے وہ ایمان کیلئے کافی تھی یا نہیں؟ اور حضرت صدیق کے کمالِ ایمان پر اور اس بات پر کہ وہ انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں علماء امت کا اتفاق ہے۔

ف اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرنا اور اہم واقعات میں اُن سے رجوع کرنا حضرات صوفیہ کا خاص طریقہ ہے۔

۲۰۔ تعریف میں مبالغہ نہ کرنا چاہئے حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی کی تعریف کی جائے تو انہی صفات حمیدہ کو بیان کیا جائے جو اس کے اندر موجود ہیں اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جائے، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ورقہ کے اسی قدر محامد بیان فرمائے جو اُن کے اندر موجود تھے زیادہ کچھ نہیں فرمایا (الوجہ التاسع والاربعون فیہ دلیل علی ان من وصف امرا الی قوله ولم تزد علیہا)

ف اہل طریق نے اس کی بہت تاکید کی ہے کہ کسی کی تعریف میں مبالغہ نہ کرنا چاہیئے۔

۲۱۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انسان کو کسی بزرگ کے پاس جانے کی حاجت ہو تو کسی رہنما کو آگے کرے اگر مل سکے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورقہ کے پاس تنہا نہیں تشریف لے گئے بلکہ حضرت خدیجہ کو ساتھ لیا جن کی ورقہ سے قرابت تھی۔ (الوجه الحادی والخمسون فيه دليل على ان المرأ اذا عرضت له حاجة الى قوله التي هي من قرابة ورقة)

ف۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ رہنما کے ذریعہ سے گفتگو میں سہولت ہو گی اور کوئی بات خلاف مزاج پیش نہ آئے گی۔

۲۲۔ بزرگوں کے سامنے چھوٹوں کو احتیاط سے گفتگو کرنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگوں کے سامنے چھوٹوں کو احتیاط کے ساتھ گفتگو کرنا اور سب کے درجہ اور رتبہ کا حق ادا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت خدیجہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کا لحاظ کرکے ورقہ سے یوں کہا کہ "اپنے بھتیجے کا قصہ تو سنو! اس میں آپ کے منصب کو محفوظ رکھا گیا، کیونکہ عرب کا عام قاعدہ یہ ہے کہ بڑے کو باپ اور برابر والے کو بھائی اور چھوٹے کو بیٹا کہا کرتے ہیں مگر (حضرت خدیجہ نے اس قاعدہ کو چھوڑ کر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھتیجے کا لفظ اختیار کیا کیونکہ اس میں آپ کی زیادہ عزت تھی، اگر وہ (عام قاعدہ کے موافق) یوں کہتیں کہ اپنے بیٹے کی بات سنو! تو ورقہ کا درجہ آپ کے درجہ سے بہت بڑھ جاتا کیونکہ بیٹے کا درجہ باپ سے بہت کم ہے اور اگر یوں کہتیں کہ اپنے بھائی کی بات سنو تو یہ بھی ٹھیک نہ ہوتا کیونکہ محاورۂ عرب میں بھائی کا لفظ برابر والے کے لئے بولا جاتا ہے (اور ورقہ عمر میں حضور سے زیادہ تھے) تو دیکھو) حضرت خدیجہ نے کلام میں (کیسی) احتیاط کی اور ہر ایک کے درجہ کا حق (کس خوبی سے) ادا کیا

کیونکہ خطاب کے موقعہ پر اہل عرب کی عادت یہ ہے معزز کم عمر کو بھتیجا کہہ کر پکارتے ہیں (اس میں اس کی عزت کا بھی لحاظ ہوتا ہے اور کم عمری کا بھی) کیونکہ چچا کا حق بھتیجے پر اتنا نہیں ہوتا جتنا باپ کا بیٹے پر ہوتا ہے

(الوجہ الثانی والخمسون فیہ دلیل علی ان من کان صغیرا بین اھل الفضل الی قولہ لان العم لیس لہ حق علی ابن اخیہ مثل ابنہ)

ف صوفیہ کو بھی گفتگو میں احتیاط کا بہت اہتمام ہے اس سے اہل ظاہر کو سبق لینا چاہئے۔

۲۳۔ صاحب واقعہ کو اپنا واقعہ خود بیان کرنا چاہئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کو واقعہ پیش آیا ہو عالم کے سامنے وہ خود ہی اس کو بیان کرے دوسرا بیان نہ کرے کیونکہ حضرت خدیجہ نے ورقہ سے یوں کہا ” ذرا اپنے بھتیجے کی بات تو سنو! حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے واقعہ بیان فرما چکے تھے (اُن کو سب کچھ معلوم تھا، اگر بیان کرنا چاہتیں تو کر سکتیں تھیں مگر) انہوں نے خود نہیں بیان کیا بلکہ (اس کام کو) صاحب واقعہ کے حوالہ کیا۔ چنانچہ اس کے بعد ورقہ نے حضور سے دریافت کیا تو آپ نے خود سارا واقعہ بیان فرمایا۔

(الوجہ الرابع والخمسون فیہ دلیل علی ان الواقع اذا وقع لہ مرئ الی قولہ واحالت علی صاحب القضیۃ)

ف یہ بھی آداب کلام میں سے ایک ادب ہے کہ صاحب واقعہ خود واقعہ کو بیان کرے۔

۲۴۔ انسان اپنے لئے خیر کی تمنا کر سکتا ہے

حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ انسان اپنے لئے خیر کی تمنا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ورقہ نے اس بات کی تمنا کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت (اور تبلیغ) کے وقت جوان ہوتے۔

(الوجہ السادس والخمسون فیہ دلیل علی ان الانسان یتمنی الخیر لنفسہ ثم ذکر اختلاف العلماء فی ایمان ورقہ فمن قائل یقول لم یحصل لہ الایمان بعد لانہ لم یبلغ عمرہ زمن الرسالۃ ومن قائل یقول قد حصل لہ الایمان وھو الاظہر الی آخر ماقال)

ف اور یہ تمنا آیت لا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض کے خلاف نہیں کیونکہ مقصود جوانی کی تمنا نہ تھی (جو کہ غیر اختیاری ہے) بلکہ نصرت رسول کی تمنا تھی جو کہ امر اختیاری ہے، اور تمنا کے احکام کی تفصیل بیان القرآن سے آیت مذکورہ کے تحت میں ملاحظہ ہو ۱۲

۲۵- قانون عادت پر حکم لگانا جائز ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص کسی چیز سے واقف ہوتا ہے وہ قانون عادت کے موافق اس کے انجام کو پہچان لیتا ہے اور اس کو جائز ہے کہ مقدمات (اور مبادی) کو دیکھ کر انجام کے متعلق حکم لگادے، کیونکہ ورقہ کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت (و نبوت) عطا ہوئی ہے تو وہ سمجھ گئے کہ آپ (وطن سے) ضرور نکالے جائیں گے، انہوں نے مقدمات کی صحت سے انتہا (اور انجام) کی حقیقت کو معلوم کر لیا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ تھی جو کسی رسول میں مختلف نہیں ہوئی جیسا ورقہ نے بیان کیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ (قانون) عادت کے موافق حکم لگا دینا جائز ہے بشرطیکہ اس سے کسی امر دینی میں اختلال واقع نہ ہو ذکرہ الشارح فی الوجہ الرابع والاربعین ثم اعادہ فی الوجہ السابع والخمسین ھھنا)

ف حضرات صوفیہ بھی کسی کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق مقدمات کو دیکھ کر حکم لگا دیتے ہیں جیسا طالبین سے مخفی نہیں پس ان پر اعتراض کی گنجائش نہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ مشائخ کے ایسے احکام ظنی ہوتے ہیں قطعی نہیں ہوتے؛

۲۶- واقعات ملکوت کا انکشاف تربیت اور تقویت ایمان کا سبب ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کہ "میں نے نگاہ اوپر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا" اللہ تعالیٰ کی قدرتوں میں سے ایک قدرت کا اظہار ہے جب وہ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس سے کہہ دیتے ہیں ہوجا، وہ ہوجاتا ہے، تو جیسا اللہ تعالیٰ نے زمین کو بنی آدم کے لئے فرش بنایا ہے کہ جس طرح چاہتے ہیں اس میں چلتے پھرتے (اور کام کرتے) ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کے لئے ہوا کو (فرش) بنادیا ہے وہ جس طرح چاہتے ہیں اس میں چلتے پھرتے (اور کام کرتے) ہیں جس نے زمین کو زمین پر چلنے والوں کے لئے تھام رکھا ہے وہی ہوا کو اور اس کے اوپر چلنے والوں کو تھامتا ہے، اس کی قدرت میں علت اور معلول کچھ نہیں مگر یہ حقیقت (لوگوں کی) نگاہوں سے مخفی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ منظر صرف آپ کی تربیت اور ترقی کے لئے دکھلایا گیا تھا تاکہ آپ کا ایمان اور یقین قوی ہوجائے اور علم الیقین عین الیقین بن جائے اور یہی طریقہ حضور کے مبارک وارثوں کے لئے جاری ہے، جب وہ اس قسم کے واقعات (بطور کشف کے) دیکھتے ہیں۔ اُن کا ایمان قوی ہوجاتا اور یقین کو ترقی ہوجاتی ہے جس سے ان کی تربیت اور مقامات ولایت میں ترقی ہوتی ہے۔

(الوجہ الثانی والستون قولہ علیہ السلام فرفعت بصری الی قولہ وترقیا فی مقامات الولایۃ)

ف مگر ایسے انکشافات کے درپے ہونا اور اُن کے نہ ہونے سے غمگین ہونا ممنوع ہے کیونکہ یہ امور مقاصد میں سے نہیں ہیں اور نہ انسان کے اختیار کو ان میں دخل، اور غیر اختیاری امور کے درپے ہونا پریشانی کا سبب ہے، اگر کسی کو اس قسم کے واقعات پیش آجائیں اور وہ ان کے وقوع کو نعمت سمجھے اور جس کو پیش نہ آئیں وہ عدم وقوع کو نعمت سمجھے اور کام میں لگا رہے اور رصدا غم ہلاکر ہے کیونکہ مقصود

ان پر موقوف نہیں ۱۲

۲۷۔ عمل کرو اور کثرت عمل پر نظر نہ کرو

اللہ تعالیٰ کے ارشاد ولا تمنن تستکثر میں (ایک تفسیر پر)

صوفیہ کے اس قول کی دلیل ہے کہ (ہر وقت) کام میں لگا رہنا اور توجہ اور حضور دائم کیساتھ رہنا چاہیئے ادھر ادھر التفات نہ کرنا چاہیئے کیونکہ جب اپنے عمل کی کثرت (و زیادت) پر نظر کرنا سستی (اور کسل) پیدا کر دیتا ہے جیسا اوپر مذکور ہوا (یعنی ۶۷ میں جس کا ترجمہ نہیں کیا گیا) تو عمل کے سوا اور چیزوں پر نظر کرنا کیا کچھ ہو گا (اس سے تو یقیناً سستی اور کوتاہی زیادہ ہو گی۔ اسی طرح ان کا یہ قول بھی ہے کہ الوقت سیف (وقت ایک تلوار ہے) مطلب یہ ہے کہ وقت کو کام کر کے ختم کرو اس کو (بیکار) ٹالو گے تو وہ تم کو ختم کر دے گا، اور (ادھر ادھر التفات کرنا) اس واسطے (بھی منع ہے) کہ حظوظ (نفس) اور کثرتِ عمل پر نظر کرنا ہلاکت ہے۔ اور جب سالک اسباب ہلاکت کی طرف متوجہ ہوتا ہے ہلاک ہو جاتا ہے۔ (الوجہ الثامن والستون فیہ دلیل لاھل الصوفیۃ فی قولھم باستصحاب العمل الیٰ قولہ کان ھالکا ۱۲)

ف آیت ولا تمنن تستکثر کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ اپنے صدقہ کو زیادہ سمجھ کر احسان نہ جتلاؤ، ایک قول یہ ہے کہ اس غرض سے کسی کو ہدیہ نہ دو کہ اس کے عوض میں زیادہ آئے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ اپنے عمل کو زیادہ سمجھ کر عبادت کو قطع نہ کرو، شارح نے وجہ سابع و ستون میں ان سب اقوال کو بیان فرمایا ہے، اور صوفیہ کا یہ قول جو یہاں مذکور ہوا تیسری تفسیر سے مؤید ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب دوم

حدیث حلاوۃ الایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
تین چیزیں جس میں ہوں اس نے ایمان کی حلاوت پالی،
(ایک) یہ کہ اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ اس کو محبوب ہوں اور
(دوسرے) یہ کہ جس آدمی سے محبت کرے صرف اللہ ہی کے واسطے محبت کرے
اور (تیسرے) یہ کہ کفر کی طرف لوٹنے (اور اس میں مبتلا ہونے) سے ایسا گھبرائے
جیسا آگ میں ڈالے جانے سے گھبراتا ہے۔

شرح

یہ حدیث صاف طور سے بتلاتی ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو
حلاوت کیساتھ ہو دوسرے وہ جو بدون حلاوت کے ہو، اور اسی کے قریب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ایمان دو ہیں ایک وہ جس کا حاصل کرنے والا
جہنم میں داخل نہ ہوگا اور (دوسرا) وہ جس کا حاصل کرنیوالا جہنم میں ہمیشہ نہیں
رہیگا (یا لیتنی عرفت من اخرجہ) پس جس ایمان کا حاصل کرنیوالا جہنم میں داخل
ہی نہ ہوگا یہ وہی ایمان ہے جو حلاوت کیساتھ ہو اور جس ایمان کا حاصل کرنے والا
جہنم میں ہمیشہ نہ رہے گا یہ وہ ہے جو بغیر حلاوت کے ہو (اب ہم حدیث کے
فوائد پر گفتگو کرتے ہیں۔

۲۸- حلاوتِ ایمان حسی ہے محض عقلی نہیں

جس حلاوت کا یہاں ذکر ہے
علماء میں اس کے متعلق اختلاف

ہے کہ یہ حلاوت حسی ہے یا معنوی،

ایک جماعت نے جو کہ فقہا ہیں اس کو معنوی (اور غیر محسوس) پر محمول کیا ہے اور ایک جماعت نے لفظ (حدیث) کو ظاہر پر رکھا اس میں تاویل نہیں کی اور حلاوت کو حسی (حلاوت ہی) پر محمول کیا ہے یہ (حضرات) صوفیہ ہیں اور اس مسئلہ میں حق ان ہی کیساتھ ہے واللہ اعلم، کیونکہ (حلاوت اور شیرینی سے محاورات میں حسی حلاوت ہی متبادر ہوتی ہے تو) انہوں نے جو مطلب سمجھا ہے اس میں حدیث کے لفظ کو ظاہر پہ رکھا (گیا) ہے کوئی تاویل نہیں کی (گئی) اور جب تک ظاہر لفظ کیخلاف کوئی دلیل نہ ہو اس وقت تک بہتر یہی ہے کہ حدیث کو ظاہر پہ رکھا جائے تاویل نہ کی جائے، اور صوفیہ نے جو مطلب بیان کیا ہے اس کی تائید حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین اور اہل معاملات کے احوال سے ہوتی ہے چنانچہ اس کے متعلق جو حکایات منقول ہیں ان میں سے ایک حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ جب اُن کو کفر پہ مجبور کرنے کیلئے گرم پتھر پہ لٹا کر سخت سے سخت تکلیف دی گئی تو وہ احد احد ہی کہتے رہے کیونکہ عذاب کی تلخی ایمان کی حلاوت کیساتھ مل کر فنا ہوگئی تھی (وہ حلاوتِ ایمان کی چاشنی میں ایسے مست تھے کہ عذاب کی تلخی محسوس نہ ہوئی) اسی طرح ان کے انتقال کیوقت گھر والے تو واکرباہ (ہائے مصیبت) پکار رہے تھے اور وہ واطرباہ (ہائے خوشی) کہہ رہے اور یوں فرما رہے تھے غداً القی الاحبۃ محمداً وحزبہ، کل کو میں (اپنے) دوستوں سے ملوں گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت سے ملاقات کروں گا، تو (دیکھو) موت کی تلخی حلاوت لقا سے جو کہ (حقیقت میں ایمان کی حلاوت تھی مل گئی (اور فنا ہوگئی) تھی اس لئے وہ موت کے وقت خوش تھے اور دوسرے رو رہے تھے، دوسرے ایک اور صحابی کا واقعہ (حدیث میں آتا) ہے کہ رات کو چوروں نے اُن کا گھوڑا کھول لیا اس وقت وہ نماز میں تھے اور چور کو گھوڑا لیجاتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا مگر نماز کو نہیں توڑا، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں جس (مزہ) میں تھا وہ اس سے زیادہ

قیمتی تھا۔ اور وہ (مزہ) کیا تھا؟ وہ حلاوت ہی تو تھی جو اس وقت اُن کو (نماز) میں محسوس ہو رہی تھی، تیسرے دو صحابیوں کا واقعہ ہے (جو صحیح حدیث میں وارد ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک غزوہ میں (ایک گھاٹی پر) لشکر اسلام کی حراست (اور پہرہ) کے لیے متعین فرمایا تھا تو اُن میں سے ایک تو (اپنے ساتھی کی اجازت سے) سو گئے اور دوسرے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے " یہ نماز ہی میں تھے کہ دشمن کی طرف سے جاسوس آیا اور اس نے کمان میں تیر رکھ کر ان کے مارا جو (ٹھیک نشانہ پر لگا) اور صحابی کے بدن میں پیوست ہو گیا صحابی نے (تیر کو نکال کر پھینک دیا مگر نماز کو قطع نہ کیا بدستور اسی میں مشغول رہے۔ جاسوس نے دوسرا تیر مارا وہ بھی ان کے جسم میں پیوست ہو گیا " مگر نماز کو نہ توڑا۔ اس نے تیسرا تیر مارا وہ بھی ان کے لگا تو اس وقت (نماز ختم کی اور اب) انہوں نے اپنے ساتھی کو جگا کر فرمایا اگر مجھے مسلمانوں پر خطرہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں نماز کو (ابھی) ختم نہ کرتا (بلکہ اور طول دیتا) اس کا سبب بجز اس کے سوا اور کیا تھا کہ اُن کو نماز میں بہت زیادہ حلاوت محسوس ہو رہی تھی جس نے تیروں کی (سوزش اور) کلفت کو زائل کر دیا تھا اور اہل معاملات سے تو اس قسم کے بہت واقعات منقول ہیں جن کے ذکر سے کلام طویل ہو جائے گا اور جتنے واقعات ہم نے بیان کر دیئے ہیں (اثبات مدعی کیلئے) یہی (بہت) کافی ہیں (اس لئے ہم کلام کو طول دینا نہیں چاہتے)

الوجه الاول الحلاوة المذكورة هل هى محسوسة الى قوله وفيما ذكرناه كفاية.

ف حضرات صوفیہ کے نزدیک یہ مسئلہ بدیہی اور نہایت بدیہی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر سلاطین دنیا کو اس دولت کا پتہ لگ جائے جو ہمارے پاس ہے تو وہ تلواریں لیکر ہم پر چڑھ آئیں اور اس کو چھیننے کی کوشش کریں، اُن کو ذکر اللہ اور حضور دائم اور معرفت الٰہی میں ایسی حلاوت محسوس ہوتی ہے کہ

دنیا کی کسی چیز میں وہ حلاوت نہیں ملتی، ذکر اللہ اور طاعت اُن کی طبیعت ثانیہ اور غذا بن جاتی ہے۔ پس یہ حدیث ہی طریق تصوف کے اثبات میں تنہا کافی ہے۔ کیونکہ حلاوت ایمان کے مطلوب ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اور یہ حلاوت بدون طریق تصوف اور محبت صوفیہ کے نصیب نہیں ہوتی جس کو شک ہو وہ ہر دروازہ پہ جا کر دیکھ لے یہ دولت اس کو صوفیہ کے سوا کسی کے پاس نہ ملے گی اس وقت وہ اس قول کی تصدیق کرے گا ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

۲۹- اللہ اور رسول کے ساتھ محبت کی علامت حب فی اللہ اور نفرت عن الکفر ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جو تین باتیں بیان فرمائی ہیں وہ سب (در حقیقت) پہلی ہی بات کی طرف راجع ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ محبوب ہوں، کیونکہ اللہ اور رسول کی محبت کو وہ باتیں لازم ہیں جو بعد میں ذکر کی گئی ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد جو دو باتیں بیان فرمائی ہیں اُن کے ذکر سے فائدہ اور مقصود یہ ہے کہ جو کوئی اللہ اور رسول کی محبت کا دعویٰ کرے اس کو ان دو موقعوں پر اپنے نفس کا امتحان کرنا چاہئے، اگر کسی سے محبت ہو تو دیکھے کہ اس سے کیوں محبت کرتا ہے؟

اور (یہ سوچے کہ) اگر اس کو کفر پر مجبور کیا گیا (نعوذ باللہ منہ) تو اس وقت اس کے نفس کی کیا حالت ہو گی؟ کیونکہ بعض دفعہ نفس میں اللہ اور رسول کی محبت کا دعویٰ پیدا ہو جاتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دو علامتیں بیان فرما دی ہیں جو دعویٰ اور حقیقت میں

فرق کو ظاہر کرتی ہیں اور اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین

"اللہ پہ بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو"

(یہاں بھی توکل کو بطور علامت ایمان کے بیان کیا گیا ہے) کیونکہ ایمان کی حقیقت یہی ہے کہ مومن اپنے پروردگار پر جملہ امور میں بھروسہ اور اعتماد رکھے، اگر یہ بات نہیں تو وہ محض دعویٰ ہے اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کرے اور ان دو علامتوں میں سچا نہ نکلے تو اس کی محبت محض دعویٰ ہے جس میں حقیقت نہیں ہے۔ (الوجہ الثانی قولہ علیہ السلام ان یکون اللہ و رسولہ احب الیہ الی قولہ فھو دعوی لا حقیقۃ)

ف یہ بات مشاہد ہے کہ صرف اللہ کے لئے کسی سے محبت کرنا صوفیہ کرام میں زیادہ ہے ورنہ عام طور سے لوگوں میں جو محبت دیکھی جاتی ہے وہ کسی غرض کی وجہ سے ہوتی ہے، حب فی اللہ، کا وجود زیادہ تر صوفیہ ہی میں ہے پس اس سے بھی صوفیہ کے طریق کی تائید ہوتی ہے۔

ف جب اللہ اور رسول کی محبت کی علامت حب فی اللہ ہے تو شیخ کو لازم ہے کہ کسی کو سلسلہ میں داخل کرنے سے پہلے اس بات کو جانچ لے کہ اس کو شیخ سے محض اللہ واسطے تعلق محبت ہے یا اور کسی غرض کی وجہ سے ہے، کیونکہ بعض لوگ مقاصد دنیا میں کامیاب ہونے کے لئے بھی سلسلہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں، اگر کسی کو محض اللہ کیلئے شیخ سے تعلق محبت نہ ہو بلکہ کسی اور وجہ سے ہو اس کو داخل سلسلہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اللہ اور رسول کا طالب بن کر نہیں آیا بلکہ دنیا کا طالب ہو کر آیا ہے۔

۳۰- ایمان کا پھل عمل ہے اور عمل کی پختگی اتباعِ سنت ہے اور پختگی کے بعد ہی پھل میں حلاوت آسکتی ہے

حلاوت ایمان کی حقیقت کمال ایمان ہے اور کمالِ ایمان کی علامت وہی ہے جو حدیث میں بیان کی گئی ہے (یعنی کسی سے اللہ واسطے محبت کرنا اور کفر سے ایسا گھبرانا جیسا آگ میں ڈالے جانے سے گھبراتا ہے) اور پھل میں شیرینی اسی وقت آتی ہے جب وہ پختہ ہو جائے پس ایمان کا پھل عمل تو ہے اور عمل کی پختگی اتباع سنت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کا عمل قبول نہیں فرماتے جب تک پختہ نہ ہو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ، اور عمل کی پختگی کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ریا اور بدعت سے پاک صاف رکھے پس عمل کا خلاف سنت ہونا اس کے لئے ایک آفت ہے جو پختگی سے مانع ہے اور جب پھل پختہ ہی نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ شیرینی کے درجہ تک بھی نہ پہنچے گا۔ غرض جب عمل میں کوئی آفت آجائے گی (خواہ ریا سے یا مخالفت سنت سے) تو وہ پختہ نہ ہوگا (اور جب پختہ نہ ہوگا) تو قبول بھی نہ ہوگا، چنانچہ بعض عوام اسی دائرہ کے اندر ہیں کیونکہ وہ سنت سے جاہل ہیں اگرچہ ان میں سے بعضوں کو علوم کا دعویٰ ہے مگر جس علم کا عالم سنت (نبویہ) سے جاہل ہو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے، ان من العلم لجہلا کہ بعض علم بھی جہل ہے، اور پوری پختگی (اور عمدگی) تو خاص ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اور عمل کی کمال عمدگی یہ ہے کہ محض اللہ اور رسول کی محبت کی وجہ سے عمل کیا جائے اور کوئی غرض نہ ہو جیسا اس حدیث میں وارد ہوا، اس وقت اس کے عمل کی (اللہ تعالیٰ کے یہاں) قدر کی جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ (اپنے خاص بندوں کی نسبت) فرماتے

ہیں انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا، (کہ وہ مسکینوں یتیموں کو اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کھانا کھلاتے اور یوں کہتے ہیں کہ ہم تم کو صرف اللہ کے لئے کھانا دیتے ہیں تم سے کوئی بدلہ یا شکریہ نہیں چاہتے) (الوجہ الثالث یود علی الحدیث سوال وفیہ حلاوۃ الایمان عبارۃ عن کمالہ الی قولہ انما نطعمکم لوجہ اللہ، وترجمۃ ملخصاً)

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو بدون عمل ہی کے کمال ایمان کے مدعی ہیں، نیز ان کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو عمل میں اتباع سنت کا اہتمام نہیں کرتے، ان لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایمان کا پھل عمل ہے اور درخت اپنے پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ جس درخت پر پھل نہ آئے گو وہ بالکل بیکار نہیں مگر زیادہ کارآمد بھی نہیں پس ایمان بلا عمل دوسری قسم کا ایمان ہے جس سے یہ شخص ہمیشہ کے لئے تو جہنم میں نہ رہے گا مگر یہ بھی ضرور نہیں کہ جہنم میں داخل ہی نہ ہو الا ان یشاء اللہ اور جو عمل سنت کے موافق نہ ہو وہ پھل اور شیریں نہیں ہوسکتا اس لئے جس کو حلاوت ایمان حاصل کرنا ہو اس کو اتباع سنت کا اہتمام کرنا اور بدعات سے بچنا چاہیئے۔ آج کل بہت کم لوگ ہیں جو بدعات سے محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے آمین!

۳۱۔ حضرات سلف کا ایمان اتباع شریعت ہی کی وجہ سے کامل تھا

حضرات سلف کا ایمان اسی لئے کامل تھا کہ وہ (شریعت کی) امر و نہی کا اتباع کرتے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے اور باہم ایک دوسرے کی خیرخواہی کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ کسی سے ملتے تو یوں کہتے تھے "آؤ ایمان حاصل کریں" (وہ آپس میں باتیں کرنے

کو ایمان سمجھتے تھے، تو اُن کے ایمان کا درخت عمدگی اور شیرینی میں انتہائی درجہ کو پہنچ گیا تھا، اور آج کل تو یہ باتیں مفقود ہو گئیں اور اسی بات کا ظہور ہو گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی (کہ آدمی اس وقت تو ایسے ہیں جیسے پھل والا درخت اور عنقریب ایسے ہو جائیں گے جیسے کانٹوں والا درخت) سو واقعی وہ کانٹوں والے درخت ہی ہو گئے کیونکہ انہوں نے امر و نہی کا اتباع چھوڑ دیا اور آپس میں ایک دوسرے کی خیر خواہی چھوڑ دی، اُن کے دلوں میں کھوٹ آ گیا، اب خیر خواہی کی جگہ کھوٹ نے اور اتباع شریعت کی جگہ مخالفت نے لے لی، اور لوگوں کی عام حالت یہ ہو گئی کہ اُن میں سوائے کلمہ گو ہونے کے ایمان کی کوئی شان باقی نہ رہی، کلمہ پڑھ لینے کے سوا اُن کے جتنے بھی کام ہیں مقتضائے ایمان کے خلاف ہیں پس جڑ تو باقی رہ گئی مگر پھل یعنی عمل ضائع ہو گیا۔ جیسے پھل دالے درخت کی جگہ جھڑ بیری کا درخت رکھ دیا گیا ہو کہ پہلا درخت تو پھل دیتا اور حلاوت بخشتا تھا اور دوسرا کانٹے ہی اگاتا ہے آج کل عام مسلمانوں کی تو یہی حالت ہے بجز شاذ و نادر تھوڑے سے آدمیوں کے (کہ وہ سلف کے طریقہ پر قائم ہیں) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا یزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق الى قيام الساعة لا يضرهم من خالفهم میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہیگی کسی کی مخالفت سے اس کو نقصان نہ پہنچے گا، پس یہ جماعت جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اس کے ایمان کا درخت ہمیشہ بار آور اور اس کا پھل غایت درجہ شیریں رہیگا جیسا حضرات سلف رضی اللہ عنہم کا ایمان تھا، اور اگر (دنیا میں) ان کا وجود نہ ہوتا تو آسمان (بارش کا) ایک قطرہ نہ برساتا اور (زمین سے) ذرا سی بھی سبزی نہ اُگتی اور اُن لوگوں کیوجہ سے جن کا اوپر ذکر آیا ہے (عالم میں) تباہی آ جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی خاطر سے اور ان کی رفعت ظاہر کرنے کیلئے ان سچے ایمان

والوں کی وجہ سے دوسروں کو بھی مہلت دیدیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے ہم کو بھی اپنے اولیاء میں داخل کردیں۔ (قولہ اول من تقدم من السلف کان ایما نھم کاملا بتتبعھم الاوامر والنھی الی قولہ جعلنا اللہ من اولیائہ بمنہ وبیمنہ)

ف کمال اتباع شریعت ہی کا دوسرا نام طریقت ہے، کیونکہ طریقت کا مقصود عمل کو ریا وغیرہ سے پاک کرکے اخلاص کی دولت حاصل کرنا اور حلاوت ایمان سے کامیاب ہونا ہے اور معلوم ہوچکا ہے کہ حلاوت ایمان بدون اتباع شریعت اور کمال اتباع سنت کے حاصل نہیں ہوسکتی، پس یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو شریعت کو طریقت سے اور طریقت کو شریعت سے جدا سمجھتے ہیں ۔

باب ۳

حَدِيْثُ الْبَيْعَةِ

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ سے) فرمایا مجھ سے بیعت کرو اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اور (کسی پر) ایسا بہتان نہ باندھو گے جو گھڑ کے گھڑ لیا جائے، اور اچھی باتوں میں میری نافرمانی نہ کرو گے پس جو کوئی اس (عہد) کو پورا کرے گا اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور جو ان (گناہوں) میں سے کسی کا ارتکاب کریگا اگر دنیا ہی میں اس کو سزا دے دی گئی تو وہ اس کے (گناہوں کے) لئے کفارہ ہے اور جس نے ان (گناہوں) میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے خواہ اس کو معاف کر دیں یا عذاب کر دیں، پس ہم نے اسی پر آپ سے بیعت کی۔''

۳۲- شرح — بیعت کی حقیقت اور اس کی اقسام

بیعت ایک قسم کا عہد ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک بیعت عامہ دوسرے بیعت خاصہ۔ بیعت عامہ کی پھر دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بدون کسی شرط کے صحیح ہے۔ دوسرے وہ جو چند شرطوں کے بعد صحیح ہے

جو بیعت بدون کسی شرط کے صحیح ہے اس کی مثال باپ کی ولایت ہے بیٹے پر، مرد کی اپنی بیوی پر اور غلاموں پر (کیونکہ بیٹے کا بیٹا ہونا عورت کا بیوی ہونا، غلام کا غلام ہونا باپ اور شوہر اور آقا کی ولایت کو مستلزم ہے۔ پس یہ بھی ایک عہد ہے جس کے حقوق کا ادا کرنا اُن کے ذمہ ہے۔)

اور یہ ولایت (باپ اور شوہر اور آقا کو) اللہ تعالیٰ کے حکم سے حاصل ہے، اس لئے اس میں شرطوں کی ضرورت نہیں اور اس کا بیان حدیث کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ کی شرح میں آئے گا اور جو بیعت عامہ بدون شرطوں کے صحیح نہیں اس کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو بذات خود ثابت ہے اور شرطوں سے اس کی تاکید ہو جاتی ہے اور کسی وجہ سے حکمت الٰہی اس کی مقتضی ہوئی دوسری وہ جو بذاتِ خود ثابت ہے اور شرطوں سے ایک حق کی تاکید ہو جاتی اور دوسرا حق بڑھ جاتا ہے اور تیسری وہ جو بدون شرطوں کے صحیح نہیں بلکہ شرط ہی سے اس کا وجود ہوتا ہے، پہلی قسم کی مثالیں بیعت الست بربکم ہے (جو عالم ارواح میں تمام آدمیوں سے لی گئی ہے) کیونکہ خود ربوبیت ہی سے بندگی (کا حق بندوں) پر ثابت ہو چکا تھا (عہد لینے کی ضرورت نہیں تھی) مگر اس بیعت سے جو اس وقت لی گئی حق مؤکد ہو گیا، اور کسی وجہ سے حکمت (الٰہی) اس کی مقتضی ہوئی اور وہ حکمت (ایک تو) یہ تھی کہ اس کی بیعت پر بندوں کا مکلف ہونا موقوف تھا کہ احکام کی بجا آوری پر (اُن کو) ثواب دیا جائے اور مخالفت پر عذاب دیا جائے (رہا یہ کہ بندوں کا مکلف ہونا اس پر کیوں موقوف رکھا گیا تو اس میں) محض شرعی علت ہے عقلی یا منطقی نہیں، (اس کے سوا جو اور حکمتیں ہوں گی ہم اُن کا احاطہ نہیں کر سکتے)

دوسری قسم کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنا ہے، کیونکہ جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا تو اسی سے آپ کی بیعت

(سب پر) ثابت ہوگئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے النبی اولی بالمومنین من انفسھم کہ نبی کا مسلمانوں پر اُن کی جانوں سے زیادہ حق ہے تو (دیکھو) اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُن کی جانوں سے بھی مقدم کر دیا ہے (تو آپ کا حق خود بخود ہم پر ثابت ہو چکا) پھر (لوگوں کا) حضور سے بیعت کرنا آپ کی رسالت کی تصدیق اور آپ کے احکام کا انقیاد (ظاہر کرنے کے لئے) تھا اور لوگوں کا آپ کی تصدیق کرنا اسی بیعت کی تاکید ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے (تمام بندوں کے ذمہ) آپ کیلئے ثابت کر دی ہے۔

اور تیسری قسم کی مثال خلیفہ اسلام کی بیعت ہے اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ خلیفہ کسی کو اپنے بعد خلافت کیلئے نامزد کر دے جیسا حضرت صدیق نے حضرت عمر کو نامزد کر دیا تھا دوسرے یہ کہ خلیفہ کی موت کے بعد مسلمان کسی پر اتفاق کر لیں جیسا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان پر اتفاق کیا اور یہ حکم قیامت تک کیلئے ثابت ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین میری سنت کو اور خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوط پکڑو' (یہ تو بیعت عامہ کی تفصیل تھی) اور بیعت خاصہ وہ ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مسلمانوں کی) ہر جماعت کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ جب وہ سفر کیا کریں تو کسی کو اپنا امیر بنا لیا کریں اور اسی کے حکم میں ہر وہ کام ہے جو اس کے مشابہ ہو۔ کیونکہ یہ بیعت ایک خاص درجہ سے ہے اور اس کا نفع جو کچھ ہے بیعت عامہ کے منافع سے معلوم ہو جائے گا۔ جن کو انشاء اللہ ہم بیان کریں گے، کیونکہ بیعت خاصہ کو بیعت عامہ کے ساتھ (خاص) مشابہت ہے، رہی بیعت کی حقیقت تو ظاہر ہے کہ

یہ منجملہ (معاملات) بیوع کے ایک بیع ہے (جس کے معنی ہیں بیچنا، فروخت کر دینا) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایعونی فرمایا ہے عاھدونی نہیں فرمایا اور اس لفظ کے معنی میں غلامی کے کسی قدر اوصاف پائے جاتے ہیں جن کو ہم بیان کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ اور جب یہ بیعت منجملہ بیوع کے ایک بیع ہے تو اب اس کی ضرورت ہے کہ مبیع کو متعین کیا جائے اور ثمن کو بتلایا جائے (کہ بیعت میں کس چیز کو بیچا جاتا ہے اور اس کے عوض میں ثمن کیا ملتا ہے؟)

پس (معلوم کرنا چاہیئے کہ) اس جگہ مبیع تو نفس کا اختیار ہے کہ (بیعت کرنے والا) اپنے اختیار (وارادہ) کو فنا کر دے اور جس سے بیعت کر رہا ہے اپنے کو اس کے حوالہ کر دے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق اس میں جو چاہے تصرف کرے۔ اور یہ ایک قسم کی غلامی ہے کیونکہ آقا غلام کی ذات کا مالک بن جاتا ہے جس کے بعد غلام کا کوئی اختیار اور تصرف باقی نہیں رہتا کیونکہ جو شخص کسی کی ذات کا مالک ہوتا ہے اس کے تمام منافع کا مالک ہو جاتا ہے، پس بیعت کرنیوالا اطاعت و انقیاد میں غلام کے مشابہ ہے، مگر اس کا مال اسی کی ملکیت رہتا ہے صاحب بیعت کی ملک نہیں ہو جاتا کیونکہ یہ شخص صرف اطاعت و انقیاد میں غلام کے مشابہ ہے، جملہ احکام میں نہیں، رہا ثمن (اور معاوضہ) تو وہ جنت ہے بشرطیکہ بیعت (کے حق) کو پوری طرح ادا کر دیا جائے کیونکہ بیعت عقبہ کے موقعہ پر جب صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اُن کو اس بیعت کے عوض کیا ملیگا؟ تو آپ نے فرمایا 'جنت'، صحابہ نے عرض کیا کہ ہم (اس پر) راضی ہیں اور بیعت کو نہیں توڑیں گے (بلکہ اس کا حق ادا کریں گے) غرض شارح علیہ السلام نے بیع اور مبیع اور ثمن سب کچھ بتلا دیا ہے اور یہی حکم ہر اس بیعت کا ہے جو حضور کے بعد (کسی سے) شریعت کے موافق کی جائے کہ اس کا

ثمن بھی جنت ہی ہے، جبکہ اس کو توڑا نہ جائے۔ کیونکہ ہر بیعت، بیعت رسول کی تجدید وتاکید ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنا اللہ عزوجل سے بیعت کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے ان الذین یبایعونك انما یبایعون الله کہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ (در حقیقت) اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بیعت کرنا بیعت الست بربکم کا ایفا اور اسی کی تاکید ہے (قوله فی الوجه الاول فاما النواعها فعلی ضربین الی قوله وفاء وتاکید لبیعة الست بربکم ملخصاً)

ف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعتِ مسافرین کو جو حکم دیا ہے کہ کسی ایک کو اپنا امیر بنالیا کریں۔ یہ بیعتِ صوفیہ کی دلیل ہے کیونکہ سالکین طریق بھی ایک سفر میں ہیں اور بڑے سفر میں ہیں جو سفر ظاہر سے اہم اور بہت اہم ہے، پس جب سفر ظاہر میں کسی کو امیر بنانا سنت ماثور ہا ہے تو اس سے اہم سفر میں کسی کو امام بنانا خلاف سنت کیونکر ہوسکتا ہے۔

ف جب بیعت کی حقیقت معلوم ہوگئی کہ وہ منجملہ بیوع کے ایک بیع ہے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیعت طریق کے لئے ہاتھ میں ہاتھ لینا ضروری نہیں بلکہ مرید اور شیخ کی طرف سے زبانی معاہدہ کافی ہے۔ باقی اس میں شک نہیں کہ حضور نے صحابہ سے جس وقت بھی بیعت لی ہے، خواہ بیعت اسلام ہو یا بیعت جہاد یا بیعت اتباع احکام وہ ہاتھ میں لیکر واقع ہوئی ہے اس لئے مشائخ نے بھی یہی صورت اختیار کی مگر صورت بیعت کو لازم اور مقصود سمجھ لینا اور اصل مقصود کو پس پشت ڈال دینا سخت غلطی ہے جس میں آج کل لوگ مبتلا ہیں۔

ف جب یہ معلوم ہو چکا کہ بیعت ایک قسم کی غلامی ہے تو ضرور ہے

کہ اس میں جلدی نہ کی جائے۔ مرید کو اس وقت بیعت کا ارادہ کرنا چاہیے جب اس کا نفس شیخ کی غلامی کیلئے پوری طرح تیار ہو جائے اور شیخ کو اس وقت بیعت لینا چاہیئے جب اس کو اطمینان ہو جائے کہ یہ شخص اطاعت و انقیاد کیلئے آمادہ ہو چکا ہے۔

ف شیخ کو مرید میں تصرف کا حق شریعت کی حدود کے اندر ہے اس سے زیادہ نہیں پس جو لوگ مریدوں کے مال کو اپنا مال ان کی بیبیوں کو اپنی باندیاں سمجھتے ہیں وہ جاہل اور گمراہ کن ہیں۔

ف جب یہ معلوم ہو چکا کہ سالکین کی بیعت شیخ کے ہاتھ پر ایسی ہے جیسے جماعتِ مسافرین اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیتی ہے تو ضرور ہے کہ بیعت ہونیوالا یہ بات جانتا ہو کہ وہ کس لئے شیخ کو اپنا امام بنا رہا ہے اور بیعت لینے والا طریق سے پوری طرح واقف ہو اس کی منازل و ضروریات کو اچھی طرح جانتا ہو تاکہ جماعت کو سیدھے راستہ پر لے چلے۔

قل ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی
و سبحٰن اللہ و ما انا من المشرکین

۳۳۔ توحیدِ کامل حاصل کرنا چاہیئے اور کسی کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہ سمجھنا چاہیئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کرو گے، عام لفظ ہے کیونکہ شئی ہر چھوٹی بڑی چیز کو شامل ہے، اور اس لفظ کے عموم پر عمل کرنے ہی سے فرقۂ ناجیہ محمدیہ کو دوسرے فرقوں میں سے امتیاز حاصل ہوا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں تو بہتر۷۲ فرقے ہو گئے تھے اور میری امت میں تہتر۷۳ فرقے ہوں گے جن میں سے سوا ایک کے جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہو گا او

سب جہنمی ہیں، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیعت کے موقعہ پر اس فرقہ کی علامتیں بتلا دی ہیں تاکہ حضور کا اور آپ کے اصحاب کا طریقہ واضح ہو جائے کیونکہ ــــــــــــــــــــ

ــــ (اولاً) حضرات صحابہ ہی کو اس بیعت (کی شرائط) کا مخاطب بنایا گیا ہے (تو یقیناً وہ اسی راستہ پر تھے جو یہاں بیان کیا گیا ہے) پس اس سے فرقۂ ناجیہ کا پتہ لگ گیا کہ جس نے اس لفظ کو حقیقی عموم پر باقی رکھنے میں صحابہ کا اتباع کیا وہ تو اُن کے راستہ پر ہے اور اگر اس میں تخصیص کی خواہ قلیل ہو یا کثیر وہ اُن کا مخالف ہے اور جس درجہ کی تخصیص ہو گی اسی درجہ کی مخالفت ہو گی۔

(الوجہ الثانی قولہ علیہ السلام علی ان لا تشرکوا باللہ شیئًا ھذا لفظ عام الی قولہ قلیلا کان او کثیرا)۔

ف شارح نے اس مقام پر بہت تفصیل کے ساتھ اُن تمام فرقوں کا رد کیا ہے جو توحید اسلامی میں فلسفہ کے اثر سے خلل ڈالتے ہیں اس کے بعد توحید اسلامی اور عقیدۂ اہل سنت کو وضاحت سے بیان فرمایا اور دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے ہم نے اس تفصیل کو سر دست چھوڑ دیا ہے کیونکہ ہمارا مقصود اس وقت صرف مسائل تصوف کا انتخاب ہے مگر خلاصہ کے طور پر اتنا بتلا دینا ضروری ہے کہ محققین صوفیہ کمال توحید کی تعلیم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی برابر اور اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے نہ وہ حلول کے قائل ہیں نہ اتحاد کے، نہ وہ جبریہ ہیں نہ قدریہ، نہ معتزلہ، اور فلاسفہ کی طرح عقل پرست ہیں وہ اُسی صاف اور سیدھے راستہ پر

چلتے ہیں جو حضرات صحابہ کا طریقہ ہے۔

ف بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم غیب اور حاضر و ناظر سمجھتے ہیں اور بعض لوگ اولیاء اللہ میں ایسی قدرت مانتے ہیں کہ وہ بدون اللہ تعالیٰ کی اجازت اور مرضی کے بھی جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں۔ گویا کارخانۂ قدرت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سب توحید سے دور اور شرک سے قریب تر ہیں۔

"لیس کمثلہ شیئ و من ذا الذی لیشفع عندہ الا باذنہ و ماتفعلون الا ان یشاء اللہ"

ان کو تصوف کی ہوا بھی نہیں لگی کیونکہ تصوف کمالِ اتباع شریعت کا نام ہے اور شریعت نے کمال توحید کی تعلیم کی ہے جس سے یہ لوگ کوسوں دور ہیں۔

باب چہارم

حدیث قتال المسلمین

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لیکر لڑنے پر آمادہ ہوں تو قاتل اور مقتول (دونوں) جہنم میں جائیں گے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! قاتل (کا) یہ (مآل تو ظاہر) ہے مگر مقتول کا یہ حال کیوں ہے؟ فرمایا اس لئے کہ وہ بھی اپنے ساتھی کے قتل پر حریص اور آمادہ تھا۔

۴۳۔ شرح: فسادنیت اور افعال قلب پر بھی مواخذہ ہوتا ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتول اپنی حرص اور فساد نیت کی وجہ سے جہنم کا مستحق ہوا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حرص بھی ایک عمل ہے جس میں (بعض دفعہ) فسادنیت شامل ہو جاتی ہے (اور بڑے وبال کا باعث بن جاتی ہے) پس مقتول قاتل کے ساتھ ان دونوں صفتوں میں شامل ہو گیا (یعنی قاتل ہونے میں بھی اور جہنمی ہونے میں بھی) کیونکہ انسان کی قدرت میں جتنا تھا وہ دونوں کر چکے (۱) کسی کی عمر کو باقی رکھنا یا ختم کر دینا یہ انسان کی قدرت میں نہیں اور مقتول بھی تو قاتل کی عمر ختم کر چکا کیونکہ وہ اس کے قتل پر حریص اور آمادہ تھا (اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ظلم کی دو قسمیں ہیں ایک حسی جو محسوس طریقہ

پر فعل سے ظاہر ہو دوسرے معنوی جو نیت اور ارادہ کے درجہ میں ہو ظلم
حسی کے احکام تو فقہ میں مذکور ہیں اور شارح نے بھی اس سے کسی قدر تعرض
کیا ہے) ہاں ظلم معنوی کے متعلق گفتگو باقی ہے اور وہ اس مقام کے مناسب
ہے تو (سمجھنا چاہیئے کہ) اس کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ محض نیت ہی کا درجہ
ہو عملاً ظلم کا صدور نہ ہو نہ ظلم کا سبب بنا ہو۔ دوسرے یہ کہ نیت کے
ساتھ عملاً بھی ظلم کا صدور ہوا یا اس کا سبب بنا (مگر ظلم محسوس نہیں ہوتا)
قسم اول کی مثال حسد اور بغض اور تمام بری نیتیں ہیں جن سے شرعاً
منع کیا گیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباداللہ
اخوانا،

باہم حسد اور بغض نہ کرو ایک دوسرے سے منہ موڑ کر نہ چلو اور اے
اللہ کے بندو! بھائی بن کر رہو۔

تو یہ بری نیتیں مال و آبرو کی طرح نہیں ہیں کہ ظالم و مظلوم دونوں کا
حساب کر لیا جائے اور جس کی زیادتی ہو اس سے بدلہ لے لیا جائے بلکہ یہ
(باہم حسد و بغض رکھنے والے) دونوں قاتل و مقتول کی طرح ہیں ان دونوں کو
معاً عذاب ہوگا اور ایک کا عذاب دوسرے کے عذاب کو کچھ کم نہ کرے گا کیونکہ
خیر و شر میں باطنی امور (اور قلبی ارادہ و نیت) کا اثر ظاہری افعال سے
زیادہ ہے اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جسم
میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو
جاتا ہے اور وہ بگڑتا ہے تو سارا بدن بگڑتا ہے، سن لو وہ دل ہے،
(اگر دل خراب ہوگا تو بدن کے سارے افعال بگڑ جائیں گے) اور دل سے
مراد یہ عضو نہیں (جس کو اطباء دل کہتے ہیں) بلکہ وہ نیت و ارادہ مراد ہے)
جو دل کے اندر ہوتا ہے۔ اس کی زیادہ توضیح و تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے فرمایا کہ اگر تم سے ہو سکے کہ ہر صبح اور ہر شام تمہارے اوپر ایسی حالت میں آئے کہ دل میں کسی کی طرف سے کھوٹ نہ ہو تو ایسا ضرور کرو پھر فرمایا برخوردار من ! یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے گویا مجھے زندہ کر دیا اور جس نے مجھے زندہ کیا وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس نے اس حال میں صبح و شام کی کہ کسی پر ظلم کی نیت نہیں رکھتا اس کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں' اور اس کی ضد (اور خلاف صورت) کے متعلق ارشاد ہے

من غشنا فلیس منا

"جس نے ہم سے (یعنی مسلمانوں سے) فریب کیا وہ ہم میں سے نہیں"

اور جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچانا چاہے گا، اللہ تعالیٰ اس کو ضرر پہنچائیں گے اور جو کسی مسلمان سے فریب کریگا اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمائیں گے اس بارہ میں آیتیں اور حدیثیں بہت ہیں اور جو ظلم نیت اور عمل (دونوں) کیساتھ ہو اس کی مثال قطع رحم ہے (یعنی رشتہ قرابت کو توڑنا کیونکہ جب دو آدمی باہم قطع رحم کریں گے تو ہر ایک اس وعید کا مستحق ہو گا جو اس کے متعلق وارد ہو گا، اور یہ عذر نہیں چل سکتا کہ پہلے دوسرے نے قطع رحم کیا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

تصل من قطعک تعطی من حرمك

جو تم سے قطع تعلق کرے اس سے ملو جو تم کو نہ دے اس کو دو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو رحم نے عرض کیا کہ قطعیت (یعنی قطع تعلق) سے پناہ مانگنے والے کا ٹھکانا آپ ہی ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ جو تجھ کو ملائے گا میں اس کو (اپنے سے) ملاؤں گا

جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو (اپنے سے) الگ کر دوں گا، کہا بیشک اے پروردگار! (میں اس پر راضی ہوں) فرمایا تو بس تیرے واسطے یہی ہے، اور جو ظلم نیت سے ہو اور عمل سے نہ ہو مگر ظلم کا سبب بنا ہو اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے ساتھ دھوکہ اور فریب کرنے کی کوشش کرے یا اس کو رنج دینا (اور تکلیف پہنچانا) چاہے اگرچہ اس کو وہ تکلیف نہیں پہنچی جس کا اس نے قصد کیا تھا، کیونکہ نیت کا فاسد کرنا اور (ظلم کا) سبب بننا دونوں یکساں ممنوع (اور حرام) ہیں خواہ کسی کو تکلیف پہنچے یا نہ پہنچے تو یہ بھی انہی کے برابر ہے جن کا ذکر اوپر گذرا کسی کا ظلم دوسرے سے کم نہیں کیونکہ ہر ایک نے اپنے بھائی (مسلمان کو ایذا دینے) کے لئے در پردہ ایسی کوشش کی جس سے شرعاً منع کیا گیا ہے یعنی نیت فاسد کی اور برائی کا سبب بنا، اسی لئے اُن بزرگ علماء عاملین نے جن کو نور بصیرت عطا ہوا ہے گنہگاروں کی ذات سے بغض نہیں رکھا بلکہ وہ صرف اُن کے افعال سے بغض رکھتے تھے جن سے شریعت نے منع کیا اور مذمت کی ہے اور گنہگاروں کی ذات پر اُن کو ترس آتا تھا کہ تقدیر سے وہ ان گناہوں میں مبتلا ہو گئے اور اپنی ذات پر اندیشہ رکھتے تھے کہ مبادا اُن کو یہ ابتلاء پیش نہ آ جائے (کیونکہ انبیاء کے سوا معصوم کوئی نہیں ہر شخص کا ہر گناہ میں مبتلا ہو جانا محتمل ہے) پس یہ حضرات بغض بھی رکھتے تھے کیونکہ اس کا اُن کو (شریعت کی طرف سے) حکم کیا گیا ہے) اور ترس بھی کھاتے تھے کیونکہ گنہگاروں کی سرشت ہی میں یہ گناہ رکھا ہوا تھا اور اس اندیشہ سے کہ کبھی خود اُن میں مبتلا نہ ہو جائیں ڈرتے بھی تھے اور اس (مضمون) پر تنبیہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے ولا تأخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ (کہ تم کو زنا کاروں پر حد قائم کرنے میں شفقت مانع نہ ہو) یعنی جو شفقت بوجہ ایمان کے

تمہاری طبیعت میں پیدا ہوگئی ہے وہ تم کو ان حدود کے ضائع کرنے پہ نہ ابھار نے پائے جن کے قائم کرنے کا تم کو مکلف (وما مور) کیا گیا ہے (سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے گنہگاروں کی ذات پر شفقت کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس بات سے منع فرمایا ہے کہ شفقت کی وجہ سے حدود و احکام کو ضائع کیا جائے اور (ان دونوں باتوں کے جمع کرنے کی) توفیق دینے والا اللہ ہی ہے۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے ندا ند جام و سندان باختن

قوله الوجه فی الوجه الرابع فاعلمهم انه استوجب ذلك بحرصه وقوله فی الوجه الثامن وبقی الكلام ههنا علی الظلم المعنوی الی قوله والله الموفق)

ف یہ امراض قلوب ہی تو وہ ہیں جن کے ازالہ کا اہتمام صوفیہ کرام فرماتے ہیں اور اسی کے لئے مجاہدات کئے جاتے ہیں کیونکہ فطری امور آسانی سے نہیں بدلا کرتے جبل گردد جبلت نگردد، اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ تکبر حسد، بغض، کینہ، فساد نیت و ارادہ وغیرہ شرعاً حرام ہیں اور آیات و حدیث میں بکثرت ان پر وعید وارد ہے، پھر دیکھنا ہے کہ ان کے ازالہ کے طریق کا کس طرح انکار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو یہ دعویٰ ہو کہ بدون اس طریق کے بھی جو صوفیہ نے بیان فرمایا ہے۔ ان امراض کا ازالہ ہوسکتا ہے تو وہ بیان کرے اور بتلائیے کہ وہ کون سا طریقہ ہے یقیناً وہ کوئی طریقہ بیان نہ کر سکے گا۔ اور مجبوراً طریق صوفیہ کی تصدیق کریگا۔

ف الفاظ حدیث بظاہر عام ہیں مگر بالاجماع مراد خاص صورت ہے جب کہ قاتل و مقتول دونوں ناحق پر ہوں اور عمداً قتل پر آمادہ ہے ہوں کیونکہ اگر دو مسلمان طریقۂ جنگ سیکھنے کیلئے تلواروں سے مشق کر رہے ہوں اور غلطی سے

ایک قتل ہو جائے تو یہ صورت وعید حدیث میں داخل نہیں بلکہ اس کو قتل خطا کہا جائے گا اسی طرح اگر ایک حق پر ہو اور دوسرا ناحق پر مثلاً چور یا ڈاکو نے کسی کا مال چھیننے یا چرانے کیلئے حملہ کیا اور دوسرے نے اپنے مال کی حفاظت کیلئے مقابلہ اور مدافعت سے کام لیا تو اگر چور یا ڈاکو مارا گیا تو وہ بدترین مقتول ہوگا اور قاتل پر وعید نہ ہوگی اور دوسرا مارا گیا تو وہ شہید ہوگا اور قاتل جہنمی ہوگا

اسی طرح اگر خلیفۂ اسلام سے کسی نے بغاوت کی اور بغاوت کی کوئی معقول وجہ نہیں اس صورت میں اگر خلیفۂ اسلام باغی کو قتل کردے تو قاتل پر کوئی الزام نہیں اور مقتول گنہگار ہے، اور اگر بغاوت کی معقول وجہ ہے اور باغی کے نزدیک خلیفۂ اسلام کی خلافت شرعاً صحیح نہ تھی اور خلیفۂ اسلام کے نزدیک اس کی خلافت شرعاً صحیح تھی اس صورت میں دونوں اس وعید میں داخل نہ ہوں گے جو یہاں مذکور ہے، جیسا حضرات صحابہ کرام میں جنگ باہم ہوئی ہے اور دونوں جماعتیں شہادت حدیث کے مطابق جنتی تھیں تو اُن کا قتال عموم حدیث کے تحت میں داخل نہ تھا، غرض حدیث میں قتال کی وہ خاص صورت مراد ہے جبکہ قاتل و مقتول دونوں نے ایک دوسرے کے قتل کا ارادہ محض ظلم اور تعدی کی وجہ سے بدون کسی حق یا تاویل و شبہ کے کیا خوب سمجھ لو۔

(وهذا التفصيل مما قد نبه عليه الشارح وانما ذكرناه في الفوائد لخروجه عما نحن بصدده من مسائل التصوف ولم نر بدًا من التنبيه عليه لكونه من مزال الاقدام ۱۲)

باب پنجم

حدیث لیلۃ القدر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لیلۃ القدر میں بوجہ ایمان اور طلب ثواب کے قیام کرے اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

شرح یہ حدیث صاف طور سے شب قدر کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے اور اس کے متعلق چند باتیں بیان کرنی ہیں۔

۲۵۔ نماز عشاء کے بعد نوافل پڑھ لینا بھی قیام لیل ہے

حدیث کا یہ لفظ، جو لیلۃ القدر میں قیام کرے اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ پوری رات کا قیام مراد ہو یا کسی خاص حصہ کا، اگر خاص حصہ کا قیام مراد ہے تو اس میں بھی دو احتمال ہیں ایک یہ کہ قیام رمضان کی طرح اول شب کا قیام مراد ہو جو نماز عشاء کے بعد ہوتا ہے (کیونکہ احادیث میں قیام رمضان کی جو فضیلت و تاکید وارد ہے حضرات صحابہ نے اس کو اول شب میں بعد عشاء کے تراویح کی صورت سے ادا کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عشاء کے بعد نماز پڑھنے کو بھی قیام لیل کہا جاتا ہے کیونکہ صحابہ سے زیادہ حضور کی مراد کون سمجھ سکتا ہے) دوسرے یہ کہ آخر شب کا قیام مراد ہو جسے تہجد کہتے ہیں اور حضور نے توسعاً (مجازاً) اس کو قیام سے تعبیر کر دیا جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے قم اللیل الا قلیلا کہ رات کو قیام کیجئے سوائے تھوڑے حصہ کے اور اس (قیام) سے مراد تہجد ہے کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام (کچھ دیر)

سونے کے بعد ہی ہوتا تھا[ع] اور لغت میں اسی کا نام تہجد ہے اور جس قیام میں اس قیّد کا ضعف ہے اس میں یہ سب احتمالات (جاری) ہیں مگر زیادہ ظاہر واللہ اعلم یہ ہے کہ اس سے مراد تہجد ہے جو سونے کے بعد ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو اختیار کر لیا اور آپ کا دائمی عمل یوں ہی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی صورت اختیار فرماتے تھے جو افضل و اولیٰ اور سب سے راجح ہو، اگر اس کے سوا کوئی صورت افضل ہوتی تو آپ اسی کو اختیار فرماتے اور مفضول (وادنیٰ) کو چھوڑ دیتے" (الوجه الاول قوله علیه السلام من يصل الى قوله وقت المنتظر)

ف اس سے معلوم ہوا کہ عشاء کے بعد کچھ نماز نفل پڑھ لینے سے بھی قیام لیل ادا ہو جاتا ہے اس پر حضرت حکیم الامت نے بار ہا تنبیہ فرمائی ہے اور بہت لوگ اس سے غافل ہیں اور یہ غفلت بعض دفعہ اُن کو ثواب تہجد سے محروم کر دیتی ہے جبکہ رات کو آنکھ کھلنے کا بھروسہ نہ ہو ۱۲

(۳۶) سُنت کے موافق گیارہ یا تیرہ رکعات کے ساتھ تہجد پڑھنا (تہجد میں) ساری رات نماز پڑھنے سے افضل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام گیارہ رکعات یا تیرہ رکعات کیساتھ باختلاف روایات ثابت ہوا ہے آپ رمضان یا غیر رمضان میں اس پر زیادتی نہیں فرماتے تھے۔ ثواب والی یہ ہے کہ شب قدر میں اتنا قیام کفایت کا ادنیٰ درجہ ہے یا انتہائی اعلیٰ درجہ ہے۔ سو یہ ظاہر ہے کہ قیام (شب قدر) کا انتہائی درجہ یہی ہے جو حضور سے ثابت ہے) جس کی دو دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات مقدسہ کے لئے اعلیٰ اور بہتر صورت ہی اختیار فرماتے تھے اعلیٰ درجہ کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ اختیار نہ فرماتے تھے دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کیساتھ قیام کرے تو وہ دونوں اس کو کافی ہیں اور ایک روایت میں سورۂ آل عمران کے آخر کا ذکر ہے اور کافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دو آیتیں قیام لیل سے کفایت کریں گی اور اس شخص کو تہجد گذار کہا جائیگا اور جب ہم نے یہ مان لیا کہ اس کو تہجد حاصل ہو گیا جس کو (حدیث میں) قیام لیل کہا گیا ہے تو ان دو آیتوں کو دو رکعتوں میں پڑھنے ہی سے اس کو وہ ثواب مل گیا جو ایسے ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے جن میں شب قدر نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شب قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے (پس) قیام شب قدر کا ادنیٰ درجہ تو یہ ہوا کہ سورۂ بقر یا آل عمران کی دو آیتوں سے دو رکعتیں پڑھ لی جائیں

[ع] قلت ولی فیه نظر لحدیث عائشة فی الصحیح من کل اللیل قد اوتر کان یوتر اوله واوسطه ثم انتهی وتره الی السحر ای آخر اللیل اوکما قالت وللمراد باعتبار قیام اللیل وکان صلی الله علیه وسلم یجعل آخر صلوته باللیل وترا کما امر به فافهم ۱۲ ظ

اور جو درجہ حضورؐ نے اختیار فرمایا ہے وہ اعلیٰ درجہ ہے) اگر کسی کو یہ شبہ ہو گیا کہ گیارہ یا تیرہ رکعتیں انتہائی درجۂ کمال کو کیونکر پہنچ سکتی ہیں حالانکہ بعض لوگ اس سے بھی زیادہ قیام کرتے اور رات بھر نماز پڑھتے ہیں تو رات بھر قیام کرنے والے سے وہ شخص کیونکر افضل ہو جائیگا جس نے گیارہ یا تیرہ رکعت ہی سے قیام کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک گیارہ یا تیرہ رکعت سے قیام کرنے والا رات بھر نماز پڑھنے والے سے افضل ہے۔ کی دلیل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث ہے (جو آئندہ آئے گی) اور اس حدیث کی شرح میں بھی اس سوال کا جواب آئیگا جس کو شوق ہو اس مقام کا مطالعہ کرے اور جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت آپ کا درجہ، آپ کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس قدر بلند ہے۔ اور آپ کی وجہ سے آپ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس امت پہ کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے واسطے (شب قدر) میں تہجد کی دو دو رکعتوں کا ثواب ایک ہزار مہینہ کی دشوار تر عبادت یعنی (ہزار مہینے تک) جہاد کرنے سے بھی افضل کر دیا ہے جن کی مقدار تیس ہزار دن اور تیس ہزار رات ہوتی ہے جس کا مجموعہ ساٹھ ہزار کا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو اپنی نعمت کے شکر کی توفیق دے اور اس نعمت کا اہل بنائے اور اپنے فضل سے اس نعمت کے حاصل کرنے پہ ہماری مدد فرمائے (آمین) اور اسی کے مثل امت محمدیہ پہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل و احسان جس کے حاصل کرنے میں کچھ بھی دقت نہیں یہ ہے، (خدا ہم کو اس امت کے صلحا میں داخل فرمائے) کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننے لگو تو شمار نہ کر سکوگے، اور دوسرا ارشاد یہ ہے لئن شکرتم لازیدنکم اگر تم شکر کروگے تو میں تم پر نعمتوں کو زیادہ کر دوں گا اس میں اللہ تعالیٰ نے نعمت کے بڑھانے کا وعدہ شکر پہ موقوف کیا ہے اور بیشمار نعمتوں کا شکر ادا کرنا بہت دشوار تھا تو) اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کوئی ہر صبح اور ہر شام یوں کہہ لیا کرے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ اللھم ما اصبح بی او امسیٰ بی من نعمۃ فمنک وحدک لا شریک لک لک الحمد ولک الشکر اس نے اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں کا شکر ادا کر دیا جو اس پر (فائض) ہوئی ہیں تو اس فضل عظیم کو (تو) دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہمارے تھوڑے سے لفظوں کو بیشمار نعمتوں کا شکر بہ قرار دیکر اور اسی پہ ہمارے لئے نعمت بڑھانے کا ذمہ لے لیا۔

(قولہ قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان ما ثبت عنہ من الاحدی عشرۃ رکعۃ الی قولہ وضمن لنا المزید)

ف کیا اب بھی کسی کا منہ ہے جو صوفیہ کے طریق کو خلاف سنت کہہ سکے، تم نے دیکھا کہ محققین صوفیہ ملت بھر نماز پڑھنے سے گیارہ یا تیرہ رکعات کے ساتھ تہجد کو افضل سمجھتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا اور بعض روایات میں جو اس سے زیادہ کا ثبوت ہے وہ بطور معمول کے نہ تھا جیسا ان روایات کے الفاظ سے واضح ہے ۱۲

۳۷۔ عمل کے وقت تصحیح نیت اور استحضار ایمان مطلوب ہے

حدیث کا یہ لفظ لوجہ ایمان اور طلب ثواب کے، اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کا استحضار ہر جزو عمل کیساتھ مطلوب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر بشارت بیان فرمائی ہے کہ شب قدر کا قیام تصحیح نیت کے ساتھ کیا جائے (یعنی صرف ایمان اور طلب ثواب کی وجہ سے قیام ہو اور کوئی غرض نہ ہو) پھر علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے بعض کا قول ہے کہ یہ استحضار ہر وقت ضروری ہے اور بعض کا قول ہے کہ مشروع عمل شروع کرنے کے وقت ضروری ہے اور عمل کے ہر جزو کے ساتھ استحضار ہونا کمال عمل کی شرط ہے جمہور اس پر ہیں اور یہ لفظ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ عمل کے وقت) ایمان کے استحضار سے ایمان کو ترقی ہوتی ہے کیونکہ مسلمان کو تو پہلے ہی سے ایمان حاصل ہے پس عمل کے وقت اس کو نیت میں حاضر کر لینا ترقی کا قائم مقام ہے۔

(قولہ الوجہ الرابع عشر فیہ دلیل علی ان استصحاب الایمان مطلوب والوجہ الخامس عشر فیہ دلیل علی ان استحضار الایمان زیادۃ الی قولہ قام مقام الزیادۃ)

ف صوفیہ کو تصحیح نیت کا بہت اہتمام ہے اور اسی سے ان کو علماء ظاہر سے امتیاز حاصل ہے علماء ظاہر کو اعمال قلب کا اہتمام نہیں پس یہ حدیث صوفیہ کی مؤید ہے۔

ف۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طلب ثواب صحت نیت کے منافی نہیں اس باب میں

جمہور صوفیہ بھی نصوص کے خلاف چلے ہیں چنانچہ عام طور سے اُن کے کلام میں یہ مضمون ملتا ہے کہ عارف کو طالب ثواب اور طالب جنت نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ طالب رضا ہونا چاہیئے مگر جب کہ جنت محبوب کی ایک نعمت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ بندے اس نعمت کی طرف رغبت کریں جیسا لمثل ھذا فلیعمل العاملون وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون ٥ سے ظاہر ہے تو جنت کی طلب عین محبوب کی طلب ہے ہاں اگر جنت کی طلب محض حظ نفس کیلئے ہو محبوب کی نعمت سمجھ کر نہ ہو تو بیشک یہ طلب معرفت کے منافی ہوگی۔

۳۸۔ عمل کا بڑا ثواب مغفرت ہے اس سے بڑھ کر کوئی جزا نہیں

حدیث سے یہ لفظ کہ اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال کا اصل ثواب اور اعلیٰ ثمرہ مغفرت ہے (کہ گناہ معاف ہو جائیں گے) کیونکہ شب قدر کے قیام کا ثواب مغفرت ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ قیام ہزار مہینوں کے اس عمل سے افضل ہے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کی صورت سے ہو (پس اگر مغفرت سے بڑھ کر کوئی ثواب ہوتا تو اتنے بڑے عمل پہ اسی کو مرتب کیا جاتا اس سے معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ کوئی ثواب نہیں) کیونکہ مغفرت ہی سب کی اصل ہے اور ہلاکت سے نجات دینے والی یہی ایک چیز ہے اور اگر کسی وقت رحمت کے ساتھ مغفرت نہ ہو تو (بندے کا) ہلاک ہونا ممکن ہے، اور اسی درجہ کہ مغفرت میں یہ خصوصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مغفرت ہی کے ساتھ مخصوص و سرفراز فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے لیغفر اللہ لک ما تقدم من ذنبک وما تأخر اس کے سوا اور کوئی ثواب بیان نہیں فرمایا۔ غرض عقل و نقل (دونوں) اس بات کو بتلاتے ہیں کہ انسان کو جو نعمتیں بھی عطا کی جائیں اُن میں سب سے افضل مغفرت ہے کیونکہ اگر اس کی نیکیاں زیادہ ہو جائیں تو کثیر بھی یہ احتمال رہیگا کہ نجات ہوگی یا نہ ہوگی اور جس کی مغفرت ہوگئی اس پر کسی قسم کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے گا (الوجہ السابع عشر قولہ علیہ السلام غفر لہ ما تقدم الی قولہ لم یبق علیہ شئی یخاف منہ)

۳۹۔ ایمان سب اعمال سے اعلیٰ ہے

حدیث میں اس کی بھی دلیل ہے کہ ایمان تمام اعمال سے اعلیٰ (اور بڑھ کر) ہے کیونکہ اگر شب قدر کا قیام اور ایمان

سے خالی ہوا تو یہ ثواب نہ ملے گا جس کا اوپر ذکر آچکا اور جب ایمان کے انوار بھی اس کے ساتھ شامل ہوں تو اس کے عوض میں اعلیٰ درجہ کا ثواب ملیگا جو کہ مغفرت ہے اللھمّ اجعلنا ممن غفرت لہ فی الدارین بلا محنۃ انک جواد کریم (قولہ الوجہ الثامن عشر فیہ دلیل علی ان الایمان اعلی الاعمال الی قولہ جواد کریم)

ف صوفیہ کا یہ خاص مذاق ہے وہ دولت ایمان کو سب سے بڑھ کر سمجھتے اور اس کی تکمیل کا اہتمام کرتے ہیں۔

ف اس مقام سے علماء ظاہر کو بھی سبق لینا چاہئے اور طالبان سلوک کو بھی کہ اصل چیز مغفرت ہے بندہ کو اسی کا طالب ہونا چاہئے درجات عالیہ کا طالب ہونا چاہئے جس کو مغفرت حاصل ہوگئی اس کو سب کچھ مل گیا حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم فرمایا کرتے تھے کہ درجات کی تمنا اہل درجات کو مبارک ہو ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ جہنم سے نجات ہوجائے چاہے پھر جنتیوں کی جوتیوں ہی میں جگہ ملے۔

باب ششم

حدیث ان الدین یسر

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دین آسان ہے اور ہرگز کوئی شخص سختی (اور مبالغہ) کے ساتھ دین پر غالب ہونے کا ارادہ نہ کریگا مگر دین ہی اس کو ہرا دیگا، پس سیدھے چلو، قریب قریب ہو اور خوشخبری حاصل کرو اور صبح و شام کیو نت سے اور کسی قدر رات کے آخری حصہ سے (کام میں) سہارا لو۔

شرح دین آسان ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "دین آسان ہے" چند وجوہ کو محتمل ہے اور ہر وجہ کے لحاظ سے حدیث کی شرح اخیر تک مختلف ہوگی پس ہم ہر وجہ پر الگ کلام کریں گے اور ایک وجہ کے موافق حدیث کی شرح پوری کر کے دوسری وجہ پر کلام کریں گے (علیٰ ہذا القیاس) چنانچہ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حضور نے جو دین کو آسان فرمایا ہے تو ممکن ہے کہ دین سے ایمان مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسلام مراد ہو اور ممکن ہے کہ دونوں مراد ہوں۔ ایمان تو تصدیق کا نام ہے (کہ دل سے توحید و رسالت کو مان لے) اور اسلام انقیاد (اور اطاعت) کا نام ہے (کہ احکام شرعیہ کو بجا لائے) اور زیادہ ظاہر یہی ہے کہ دونوں مراد ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولکن قولوا اسلمنا اور اس کے بعد فرمایا ہے ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (کہ جب تک ایمان دل کے اندر نہ ہو ایمان کا دعویٰ نہ کرو بلکہ اسلام کا اقرار کرو) تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ظاہر (اسلام) کو قبول نہیں فرمایا کیونکہ باطن میں تصدیق نہ تھی نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار کہ منافقوں کا ٹھکانا جہنم کا سب سے نیچا طبقہ ہے تو باوجودیکہ منافقین نے ظاہر میں اطاعت کر لی

تھی جس کا نام اسلام ہے مگر اُن کے پاس ایمان نہ تھا اس لئے اسلام نے اُن کو کچھ نفع نہ دیا اسی طرح اس کے عکس کو سمجھ لو (کہ ایمان بھی بدون اسلام کے نافع نہیں ہوتا) اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام اور ایمان آپس میں لازم و ملزوم ہیں تو دین سے یہاں دونوں ہی مراد ہیں۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ ان دونوں کی سہولت کو بیان کیا جائے، بس ایمان کے آسان ہونے کیلئے تو جاریکی مشہور حدیث کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باندی سے دریافت فرمایا اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا آسمان میں پھر پوچھا اور میں کون ہوں؟ کہا آپ اللہ کے رسول ہیں، اس پر حضور نے اس کے مالک سے فرمایا اس کو آزاد کردو یہ مومنہ ہے تو دیکھو حضور نے اس کو اتنی بات پر مومنہ قرار دیا کہ اس نے آپ کے رسول ہونے کا اقرار کرلیا اور اللہ تعالیٰ کو موجود اور قاہر و حاکم مان لیا تھا کیونکہ اس نے آسمان کیطرف اشارہ کیا تھا اور اہل عرب بلندی و رفعت کو اسی طرح ظاہر کیا کرتے ہیں اور بلندی و رفعت کے لئے قہر و غلبہ لازم ہے (تو آسمان کی طرف اشارہ کرکے اس نے اللہ تعالیٰ کے قاہر و غالب ہونے کا اقرار کیا تھا) اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مکان میں ہیں جیسا بعض ملحدوں نے سمجھا ہے۔ تعالیٰ اللّٰہ عن ذالک علوا کبیرا اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور منزہ ہیں کیونکہ لغت اور محاورہ عرب کے موافق حدیث کا کوئی لفظ اس پر دلالت نہیں کرتا، اور اسی حدیث کی بنا پر بعض اہل سنت نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بعض صفات سے ناواقف ہو وہ کافر نہیں اور یہ بات صحیح اور بہت صاف ہے کیونکہ اگر اس قول کو نہ مانا جائے تو عام مسلمانوں کی تکفیر لازم آئیگی اور صحابہ و سلف صالحین کا اجماع ہے کہ ان کا ایمان صحیح ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا ارشاد ہے نحن امۃ امیۃ لا نقرأ ولا نکتب، ہم ان پڑھ امت ہیں لکھے پڑھے نہیں ہیں (اور جب آپ کی امت ان پڑھ ہے تو وہ اُن علوم کی مکلف نہیں ہو سکتی جو پڑھے لکھوں کو بھی دشواری سے حاصل ہوتے ہیں) اور اس کے تحت میں وہ لوگ داخل نہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کیطرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اُن کے لئے زیبا نہیں (کیونکہ ان پڑھ ہونے کا یہ اثر تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم نہ ہو اور یہ اثر نہیں ہو سکتا کہ ذات باری کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنے لگے جو اس کی شایانِ شان نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت تمام قلوب میں بالخصوص مسلمانوں کے

دلوں میں فطرۃً موجود ہے اس لئے جاہل سے جاہل بھی تمام عیوب سے ذات باری کو منزہ سمجھتا ہے۔
غرض جب ایمان کیلئے اتنی بات کافی ہے (جو حدیث جاریہ میں مذکور ہے) تو بلاشک وہ آسان
ہے۔ رہا اسلام تو اس کے آسان ہونے کیلئے ضمام بن ثعلبہ کی مشہور حدیث کافی ہے کہ انہوں
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کو دریافت کیا تو آپ نے فرمایا رات دن میں پانچ
نمازیں پڑھنا، کہا کیا میرے ذمہ اس کے سوا بھی کچھ نماز ہے، فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تم
اپنی خوشی سے پڑھو (تو اختیار ہے) پھر حضور نے فرمایا اور رمضان کے روزے رکھنا کہا
کیا میرے ذمہ اس کے سوا بھی کچھ روزے ہیں، فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم اپنی خوشی سے رکھو پھر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور زکوٰۃ دینا، کہا کہ میرے ذمہ اس کے سوا بھی کچھ
(صدقہ) ہے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم اپنی خوشی سے دو (اور حج کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ اس
وقت تک حج فرض نہ ہوا تھا لیکن حدیث جبریل میں اسلام ہی کے بیان میں حج کا ذکر موجود ہے)
راوی کہتے ہیں کہ یہ شخص یوں کہتا ہوا لوٹا کہ خدا کی قسم میں نہ اس سے زیادہ کروں گا نہ اس میں
کمی کروں گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ اپنی بات کا سچا نکلا تو فلاح کو پہنچ
گیا اور فلاح پانے والا وہ ہے جو آخرت میں اپنی مراد کو پہنچ جائے تو جب اسلام کیلئے اتنی ہی مقدار
کافی ہے اور اتنا کام کرنے والا بھی فلاح کو پہنچنے والا ہے تو بلاشک اسلام آسان ہے۔

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو دین کو دشوار سمجھتے ہیں اور اُن واعظوں کی
بھی غلطی ظاہر ہوگئی جو بال کی کھال نکال کر عوام کے سامنے دین کو دشوار طریقے سے بیان کرتے ہیں،
باقی اس کا یہ مطلب نہیں کہ دین میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے سوا اور کوئی حکم نہیں ہے کیونکہ اس
سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نماز کیلئے وضو لازمی ہے اور پاکی ناپاکی کے مسائل جاننے کی بھی ضرورت ہے نیز نماز کیلئے
بدن ڈھانکنا ضروری ہے جس کے واسطے کپڑا خریدنا ہوگا تو بیع وشراء کے احکام جاننا بھی ضروری ہیں کیونکہ
حرام کمائی کے لباس سے نماز قبول نہیں ہوتی اسی طرح حج اور زکوٰۃ مالدار پر واجب ہیں اس کے لئے بھی
احکام مال کا جاننا ضروری ہے کیونکہ حرام مال سے نہ حج قبول ہوتا ہے نہ زکوٰۃ مگر ان احکام کا جاننا کچھ دشوار
نہیں ہے کیونکہ بحمداللہ ہر زمانہ میں علماء موجود رہتے ہیں اور ہر بستی کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنی
بستی میں ایک عالم ضرور رکھیں تو اس سے پوچھ پوچھ کر سارے احکام معلوم ہو سکتے ہیں یا ہر شخص کو

کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی چاہے کہ بدون علمائے دیانت کئے ہی دین آجائے تو اس طرح زمانہ بھی نہیں آسکتی بلکہ دنیا کا کوئی کام بھی بدون کسی استاد کے نہیں آسکتا، اگر پوچھنے اور سیکھنے کا نام ہی دشواری ہے تو دین سے زیادہ دنیا دشوار ہے خوب سمجھ لو۔

ف محققین صوفیہ بالخصوص مجددین امت کا یہ خاص مذاق ہے کہ وہ دین کو آسان سے آسان صورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس زمانہ میں حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا تھانوی دامت برکاتہم وطال بقاہم نے دین کے ہر شعبہ کو بالخصوص طریق سلوک کو جس آسان صورت میں ظاہر فرمایا ہے غالباً اس کی نظیر صدیوں سے بھی نہ دیکھی گئی ہوگی۔

ف اسلام کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے درحقیقت انہی میں سارا دین موجود ہے بشرطیکہ ان کو صحیح طور سے ادا کیا جائے، اگر ایمان کامل کے ساتھ نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج ہی کو ہم اچھی طرح ادا کرنے لگیں تو یقیناً انہی سے ہمارے اخلاق بھی مہذب ہو جائیں گے معاملات بھی درست ہو جائیں اور دلوں کے کھوٹ بھی نکل جائیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم ان کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے صرف نام کر دیتے ہیں تو ہمارا دین بھی برائے نام ہی ہوتا ہے، ان ہی چیزوں کو اچھی طرح ادا کرنے کا نام تصوف ہے جس کو نامعلوم لوگوں نے کیا سے کیا سمجھ لیا ہے۔

۴۱۔ مجاہدہ اگر مبالغہ اور مغالبہ کی حد تک نہ ہو تو ممنوع نہیں بلکہ مطلوب ہے،

حدیث کا یہ لفظ کہ "ہرگز کوئی سختی کیسا تھ دین پر غالب ہونے کا ارادہ نہ کریگا مگر دین ہی اس کو ہرا دیگا" اس بات کو بتلاتا ہے کہ جو شخص دین میں اتنی محنت کرے جو مبالغہ کی حد کو نہ پہنچے تو وہ اس ممانعت سے خارج اور قسم محمود میں داخل ہے کیونکہ یہ تو (درحقیقت) دین کی مضبوطی اور ہمت اور درجہ کی بلندی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف وفی کل خیر

مضبوط مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے اور یوں سب ہی اچھے ہیں

اس حدیث نے بتلا دیا کہ ضعیف کا درجہ قوی سے کم ہے، اگرچہ ضعیف کو بھی اتنی خیر حاصل ہے جو اسکی خلاصی کیلئے کافی ہے جبکہ ایمان کی اس مقدار کو پورا کرے جس کے بدون چارہ نہیں، جیسا

اوپر بیان کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی باوجود ضعیف ہونے کے افضلیت (اور بہتری) سے خارج نہیں کیا مگر اس مضمون سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ (دین میں) مطلوب کمال ہی ہے جس کا نام قوت اور ترقی ہے، ہاں اگر کوئی شخص درجہ کمال سے عاجز ہو تو اس کو کسی قدر نیچے درجہ کی طرف لوٹنا چاہئے جو اس کی طاقت (اور ہمت) کے مناسب ہو اور درجۂ کمال تک پہنچنے میں مبالغہ اور مغالبہ کی عمر سے بچنا چاہئے کیونکہ (اس صورت میں) دین اس کو ہرا دیگا جیسا اوپر بیان کیا گیا مثلاً اگر کوئی شخص ایمان اور اسلام میں جو کہ دین کے دو پہلو ہیں تعمق (اور تکلف) سے کام لے تو یقیناً دین اس کو عاجز کر دیگا کیونکہ اسکی عمر ختم ہو جائیگی اور دونوں میں سے کسی ایک کا دسواں حصہ بھی پورا نہ کر سکے گا مثال کے طور پر ایمان ہی کو لے لیں اگر کوئی یہ ارادہ کرے کہ بغیر تقلید کے محض (اپنی عقل سے) ایمان حاصل کرنا چاہیئے اور اس کے بعد وہ استدلال و استنباط (اور دلائل و مقدمات کی چھان بین) میں مشغول ہو تو اس کی عمر ختم ہو جائیگی اور مقصود تک پہنچ سکے گا چنانچہ اس مقام پر رئیس المحققین ابوالمعالی (ابن الجوینی) رحمۃ اللہ علیہ نے عجز کا اقرار کر لیا ہے، معتبر طریقہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے اہل اسلام کو اور ان کے علوم (نقلیہ) کو (ایک طرف) چھوڑ کر بڑے سمندر میں قدم ڈالا (یعنی تحقیق عقلی کے سمندر میں داخل ہوا) اور اس مقام پر غوطہ لگایا جس سے مسلمانوں کو (شریعت میں) منع کیا گیا ہے (یعنی ذات و صفات باری کی تحقیق عقل سے شروع کی) اور یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ میں تقلید سے بھاگتا اور خود (اپنی عقل سے) حق کو پانا چاہتا تھا مگر اب میں ان سب باتوں سے ہٹ کر سچی بات کی طرف واپس آگیا ہوں (کہ تحقیق عقل سے حق کو کوئی نہیں پا سکتا بلکہ اتباع رسول ہی سے پا سکتا ہے) اور ابن جوینی کا ناس ہو (یہ خود اپنی بابت فرماتے ہیں کہ میں نے فضول وقت ضائع کیا) تو جب رئیس المحققین کا یہ قول ہے جس نے بغیر تقلید کے حق کو معلوم کرنا چاہا تھا اور اس کو اپنے عجز کا اقرار ہے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو ان کے بعد اس قسم کا ارادہ کرتے ہیں ایسے ہی اگر کوئی یہ ارادہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کے جو حقوق بندوں پر ہیں اُن کو پوری طرح ادا کرنا چاہئے تو اس کی عمر ختم ہو جائیگی اور اس کا دسواں حصہ بھی ادا نہ کر سکے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز میں فرماتے ہیں

یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا اُن سے ڈرنے کا حق ہے

اور یہ وہ چیز ہے کہ انسان اس کا تو تھوڑا حصہ ہی ادا کر کے رہ جاتا ہے پورا تو اس سے کیا ادا ہوگا) اور اسکی توضیح کیلئے (حضرت) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث کافی ہے کہ انہوں نے رات بھر نماز پڑھنے اور ہر دن روزہ رکھنے کا ارادہ کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کو اس کی طاقت نہیں، یہ تو دین کی دو باتوں کی حالت ہے (کہ انسان اُن کو بھی اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا) تو دین کے بقیہ اجزاء کو عظمت (خداوندی) کے لائق کیونکر ادا کر سکیگا، پس لامحالہ اس پر یہ بات صادق آگئی کہ دین اسکو ہرا دیگا تو خلاصی کا طریقہ اور بہتر صورت یہی ہے کہ (دین کا) درجہ کمال اس طرح حاصل کیا جائے کہ زیادہ مبالغہ نہ ہونے پائے چنانچہ ایمان میں تو اسکی صورت یہ ہے کہ پہلے یقین اور تصدیق کیساتھ شریعت کے موافق ایمان حاصل کیا جائے اور (دل سے) تمام شکوک و شبہات کو دور کیا جائے جب یہ بنیاد مضبوط اور پختہ ہو جائے تو اسکے بعد دلائل (توحید) میں اس طریقہ سے غور و فکر کیا جائے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حکم کیا ہے کہ آسمان اور زمین کی مخلوقات میں تامل کرے تاکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل قائم ہو اسی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ آسمان کے ستاروں کو اُن کی مختلف حالتوں کو سورج کو اور چاند کو اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کو اور اس کے سوا دوسری باتوں کو جو انکے اندر پائی جاتی ہیں) غور سے دیکھئے، نیز زمین کے مختلف حصوں میں غور کرے جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ زمین کے مختلف قطعات آس پاس ہیں اور انگوروں کے باغات اور کھیتیاں اور کھجوریں ہیں جن میں سے بعض اوپر جا کر دو تنے والی ہو جاتی ہیں اور بعض ایک ہی تنہ والی ہو جاتی ہیں (تو کیا یہ قدرت کی نشانیاں نہیں ہیں کہ ایک ہی زمین سے کہیں کچھ پیدا ہو رہا ہے کہیں کچھ؟ یہی زمین کی مٹی کہیں انگور بن جاتی ہے، کہیں انار؟ کسی جگہ پھول بن جاتی ہے کسی جگہ گیہوں اور جو کوئی زمین عمدہ ہے کوئی بنجر) اسی طرح پانیوں کو دیکھو کوئی شیریں ہے کوئی شور، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ھذا عذب فرات سائغ شرابہ وھذا ملح اجاج، و من کل تاکلون لحما طریا وتستخرجون حلیۃ تلبسونھا وتری الفلک فیہ مواخر، یہ ایک پانی تو میٹھا ہے اور بہت شیریں جس کا پینا خوشگوار ہے اور دوسرا پانی نمکین ہے

اور بہت تلخ اور ہر ایک سے تم (مچھلی کا) تازہ گوشت کھاتے اور (موتیوں کا) زیور نکالتے ہو جو تمہارے پہننے کے کام آتا ہے اور تم اس میں کشتیوں کو پانی چیرتے ہوئے چلتی دیکھتے ہو اسیطرح زمین کے پھلوں میں غور کرو اور اُن کے مزوں کا اختلاف دیکھو حالانکہ اُن کو ایک ہی پانی دیا جاتا ہے اور ایک ہی قطعہ میں اُگتے ہیں (مگر اسپر بھی کوئی پھل میٹھا ہے کوئی کھٹا کسی کا رنگ کیسا ہے کسی کا کیسا!) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تسقی بماء واحد ونفضل بعضها علی بعض فی الاکل کہ بعضے پھل ایک ہی پانی سے (ایک ہی قطعہ زمین میں) سیراب کئے جاتے ہیں مگر ہم ایک کو دوسرے پر مزے میں فوقیت دیتے ہیں، استدلال و نظر (و فکر) کا یہ طریقہ کمال ایمان (حاصل کرنے) کیلئے کافی ہے جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل (ابراہیم) علیہ السلام کو علم الیقین عطا کرنے کیلئے یہی طریقہ اختیار کیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں وکذلک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض ولیکون من الموقنین اور ہم اسی طرح ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمینوں کی مخلوقات دکھاتے ہیں تاکہ (وہ ان میں غور کریں) اور یقین والوں میں سے ہو جائیں اور اسی علم کیطرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے تعلموا الیقین فانی اتعلم یقین کا درجہ حاصل کرو کیونکہ میں بھی اس کو حاصل کرتا ہوں۔ اب جو شخص اس حد سے جو علم الیقین تک پہنچا دینے کیلئے کافی ہے آگے بڑھنا چاہے وہ مبالغہ کی حد میں داخل ہوگا جو اسکی طاقت سے باہر ہے پس لامحالہ دین اس کو ہرا دیگا، یا تو اس وجہ سے کہ دلائل بکثرت ہیں اور (عمر کا) زمانہ کم ہے یا اس وجہ سے کہ اس کو (دلائل میں) شک اور شبہ پیش آجائیگا (تو علم الیقین حاصل نہ کرسکیگا) اور اسلام میں (مبالغہ کی حد سے بچنے کی) صورت یہ ہے کہ اول فرض کو ہر پہلو سے پوری طرح ادا کرے، جب اس میں کامیاب ہو جائے تو اپنی ہمت کے موافق مستحبات میں مشغول ہو اور کسی ایک واجب یا ایک مستحب میں اتنا غلو نہ کرے کہ دوسرے میں خلل ڈالدے کیونکہ اعمال میں مبالغہ کی یہی صورت ہے جس کا انجام خسارہ ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف سے دستگیری فرمائیں اور توبہ کی توفیق دیدیں۔ اسکی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دن ملے اور دریافت کیا

کہ یا رسول اللہ! آپ کس چیز کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں؟ فرمایا میں عقل کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں (یعنی مجھ کو ایسی شریعت دی گئی ہے جس پر چلنے کیلئے عقل وفہم کی ضرورت ہے) عرض کیا یا رسول اللہ اور ہمارے پاس (اتنی) عقل کہاں ہے؟ فرمایا عقل کی تو کوئی حد نہیں ہے (اور عقل کامل کا حاصل کرنا واقعی دشوار ہے) لیکن جو شخص اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھے اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھے اس کو عاقل کہا جائیگا، پھر اگر اس میں کوشش کرتا رہا ہو تو اس کو عابد کہا جائیگا اور اگر عبادت میں کوشش کرتا رہا تو اس کو جواد (اور باہمت) کہا جائیگا (اس سے معلوم ہوا کہ عبادت میں کوشش اسی وقت محمود ہے جبکہ علم اور عقل کے ساتھ ہو) اب اگر کوئی شخص بدون عقل کی رہنمائی کے جو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے اتباع واحتیاط کا پتہ دیتی ہے عبادت میں کوشش کرنے اور نیک کاموں میں جوانمردی دکھلانے لگے تو یہ ان لوگوں میں داخل ہوگا جن کی کوشش دنیوی زندگی ہی میں برباد ہوگئی ہے مگر وہ یہی گمان کئے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں (کیونکہ ایسا شخص اپنی بےعقلی کی وجہ سے یقیناً عبادت میں گڑبڑ کریگا اور بعض دفعہ کسی ایک مستحب کے لئے بہت سے فرائض وواجبات کو برباد کریگا) اسیطرح اگر کوئی یہ چاہے کہ تمام عبادات کو ہر پہلو سے پوری طرح حد کمال پر پہنچا دے تو یہ بھی مبالغہ اور غلو میں مبتلا ہو کر دین سے ہار جائے گا دو وجہ سے، ایک تو یہ کہ بندہ اس سے عاجز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہت دوڑنے والا نہ راستہ طے کرتا ہے نہ سواری کو زندہ چھوڑتا ہے کیونکہ طاقت بشریہ اس کی متحمل نہیں ہے (کہ ہمیشہ ہر زمانہ میں ایک ہی حالت پر رہے تو یقیناً زیادہ محنت سے اسکی صحت برباد ہوگی اور ایک دن بالکل بیکار ومعطل ہو جائیگا) دوسرے یہ کہ بعض دفعہ ایک ہی وقت یا اکثر اوقات میں بہت سے واجبات اور متعدد مستحبات اس کے سامنے جمع ہو جائیں گے اور یہ اُن سب کو ادا نہ کر سکے گا بلکہ کسی ایک ہی کو بجا لائیگا اسوقت اسوجہ سے کہ اس نے اپنے دل میں ایک بات ٹھان لی تھی (کہ دین کا پورا حق ادا کرونگا) دین اس (پر) غالب ہوگا اور (اس) کو ہرا دے گا بس دین میں کمال کی یہی صورت ہے کہ اول ان چیزوں کو لے جن کیطرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور بقیہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے جو کچھ بیان کیا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ، اسکے موافق عمل کرے (قوله الوجه الثاني قوله صلی اللہ علیہ وسلم ولن

یشاد المدین احداً الی قولہ علی ما سیشاقی انشاء اللہ تعالیٰ)

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو مجاہدہ کو مطلقاً مذموم سمجھتے اور صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ مجاہدہ اسی وقت مذموم ہے جبکہ حد اعتدال سے خارج اور مبالغہ میں داخل ہو ورنہ محمود اور مطلوب ہے اور بدون مجاہدہ کے کمال دین حاصل نہیں ہو سکتا، جیسا حدیث اول کی شرح میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

ف نیز اُن لوگوں کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو دلائل عقلیہ فلسفیہ سے ذات و صفات باری کو معلوم کرنا چاہتے ہیں اُن کو جان لینا چاہیئے کہ اس طریقہ سے ایمان کامل حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ سیدھا راستہ وہی ہے جو شریعت نے بتلایا ہے کہ اول تقلید سے شریعت کے موافق عقائد کو پختہ اور صحیح کیا جائے اس کے بعد ملکوت سموات و مخلوقات ارض میں تامل و تفکر کیا جائے اور واقعہ یہ ہے کہ جب سے اسلام میں فلسفہ آیا ہے اسی وقت سے مسلمانوں کے عقائد میں کمزوری آگئی اور وہ جوش مذہبی ٹھنڈا ہوگیا جو اسلاف میں کامل درجہ پر تھا۔

ف یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ عقل سلیم کے عین مطابق ہے مگر سلامتِ عقل فلسفہ یا سائنس سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عقلاء کی صحبت اور شریعت پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے جب انسان شریعت پر چلنا شروع کرتا ہے تو عمل کی برکت سے اس پر تمام احکام کی حکمتیں منکشف ہوتی چلی جاتی ہیں جس کو شک ہو وہ اہل عقبیٰ یعنی حضرات صوفیہ کرام کی صحبت میں رہ کر اور اُن کی تعلیم پر عمل کر کے تجربہ کر لے۔

ف انسان کو اس کی کوشش نہ کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کے لائق عبادت ہو بلکہ یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنی ہمت اور طاقت اور شانِ بشریت کے مطابق کام ہو جائے۔ شانِ خداوندی کے لائق کون کام کر سکتا ہے؟ اور کس چیز سے یہ حق ادا ہو سکتا ہے؟ ؎

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیرِ خویش | عذر بدرگاہِ خدا آورد
ورنہ سزاوارِ خداوندیش | کس نتواند کہ بجا آورد

حدیث میں ہے اللهم لا احصی ثناء علیك انت کما اثنیت علی نفسك اور اسی لئے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام طاقت و ہمت کے موافق کام

کرنے کے بعد بھی اپنی عبادت کو کسی درجہ میں شمار نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ تقصیر کا اعتراف کرتے رہتے تھے کیونکہ شانِ ربوبیت کا پورا حق کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا اور یہی وہ چیز ہے جس نے بڑے بڑے عابدین و زاہدین کو حد تواضع و عجز سے باہر نہیں جانے دیا، ہاں کوئی ابلیس کی طرح نادان ہو تو وہ بیعقلی اور حماقت کی وجہ سے اپنی عبادت پر ناز کرنے لگتا ہے اور یہ تکبر اس کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

۴۲۔ حدِ اعتدال پر رہنا ہی کمال ہے اور اسی پر بشارتِ کامیابی کا استحقاق ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فسددوا وقاربوا سیدھے چلو اور قریب قریب رہو اس میں دو احتمال ہیں، ممکن ہے کہ دونوں کا ایک ہی مطلب ہو اور ممکن ہے کہ ہر لفظ جدا معنی کیلئے ہو، پہلی صورت میں تو دونوں کا حاصل یہ ہے کہ متوسط حالت کو اختیار کیا جائے اور دوسری صورت میں سیدھا چلنے کا تو یہی مطلب ہوگا کہ درمیانی حالت پر رہا جائے اور درمیانی حالت یہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو بتلائی تھی کہ روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، رات کو اٹھو بھی اور سوؤ بھی، کیونکہ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے، اس کے بعد عموم کے ساتھ یوں فرمایا واعط لکل ذی حق حقہٗ اور ہر حقدار کو اس کا حق پہنچاؤ، پس سیدھا چلنا تو یہ ہوا کہ انسان تمام امور میں اسی قاعدہ پر چلے جو فرائض و مستحبات کیلئے مقرر ہے نہ کسی ایک جانب میں فنا ہو نہ دوسری جانب میں کوتاہی کرے اور قریب قریب چلنے کا مطلب ہے کہ اگر کوئی حد اعتدال پر نہ رہ سکے اور کسی عذر کی بنا پر اس سے عاجز ہو تو وہ اس کے قریب قریب ہی رہے، کیونکہ قریب کا بھی وہی حکم ہے جو اصل کا ہے مگر شرط یہ ہے کہ قریب قریب رہنے کی حالت میں کسی واجب کے اندر خلل واقع نہ ہو کیونکہ واجب میں کوتاہی کرنا کسی حال میں جائز نہیں اور کوئی مستحب اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا بلکہ کسی کو حد اعتدال کے قریب بھی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ واجبات کو ہر پہلو سے پوری طرح ادا کر چکا ہو اس کے بعد

اپنی استطاعت کے موافق کسی مستحب میں مشغول ہوا ہو، مگر کسی عذر کی وجہ سے جیسے بیماری وغیرہ حد اعتدال سے پہنچنے سے رہ گیا ہو اس صورت میں کہا جائیگا کہ یہ اعتدال کے قریب ہے، اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اپنی کتاب میں ان دونوں جماعتوں کا تذکرہ فرمایا ہے یعنی اُن کا بھی جو حد اعتدال پر قائم رہتے ہیں اور ان کا بھی جو قریب قریب چلتے ہیں چنانچہ پہلی جماعت کے بارہ میں ارشاد ہے والسابقون السابقون اولئک المقربون اور سبقت کرنیوالے تو سبقت ہی کرنیوالے ہیں یہ لوگ مقرب ہیں' اور دوسری جماعت کیمتعلق جو اس درجہ کو نہیں پہنچ سکے مگر قریب قریب ہیں ارشاد ہے ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم وندخلکم مدخلا کریما اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو جن سے تم کو منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی خطاؤں سے چشم پوشی کریں گے اور تم کو عزت کے درجہ پر پہنچا دیں گے۔ ہم اس مضمون کو یعنی درجۂ اعتدال اور اس کے قریب درجہ کو ایک مثال سے واضح کر دینا چاہتے ہیں تاکہ جلدی سمجھ میں آجائے مثلاً کوئی طالب طلب علم کیلئے آئے اور اس بات کی کوشش کرے کہ عالم بنکر علماً میں داخل ہو جائے تو اگر وہ اس ارادہ میں کامیاب ہو گیا تو سبحان اللہ وہ تو اہل کمال میں داخل ہو گیا یہ تو حدِ اعتدال ہے اور اگر اس میں ناکام رہا تو اس کو علم کا کچھ حصہ اپنی ہمت کے موافق حاصل کر لینا چاہیئے جاہل نہ رہنا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم علم (دین) کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اس صورت میں یہ شخص حد اعتدال سے تو عاجز رہا مگر اس کے قریب قریب رہا، اسی طرح نفل عبادت میں فرائض کو پوری طرح ادا کرنے کے بعد مشغول ہو، اب اگر اتنی ہمت ہو کہ عابدین میں شامل ہو جائے تو ہمت کرے (اور عابد زاہد بن جائے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں کہ بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے کام کرتا ہے (یعنی اب میں اس کے تمام اعضا کی حفاظت کرتا ہوں کہ اُن سے کوئی کام میری مرضی کیخلاف نہ ہونے پائے بلکہ جو کام ہو میرے حکم کے تحت ہو) اور اگر عابدین کے درجہ میں داخل ہونے سے عاجز ہو تو نفل عبادت سے کچھ حصہ لیکر اپنے کو اس سے بالکل کورا نہ

دیکھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ قیامت کے دن بندہ کی نماز کو اول دیکھا جائے گا اگر پوری ہوئی تو خیر اور اگر کچھ کمی رہی تو اللہ تعالیٰ (فرشتوں سے) فرمائیں گے دیکھو اگر اس کے پاس کچھ نفل نمازیں ہوں تو فرائض کی کمی کو اُن سے پورا کر دو اسی طرح تمام فرائض کیساتھ معاملہ ہوگا کہ جس فرض میں کمی رہی ہوگی اسکی ہم جنس نفل سے کمی کو پورا کر دیا جائے گا تو جو شخص محض فرائض ہی پر اکتفا کرے اور تقویٰ کے اس مرتبہ کو بالکل چھوڑ دے جسکی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے تو اس پر یہ اندیشہ ہے کہ قیامت میں فرائض کی کمی پوری نہ ہو اور عذاب کا مستحق ہو جائے۔ اس مضمون پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خواب دیکھا (جو حدیث میں پورا بیان کیا گیا ہے جس کا ایک جزو یہ ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا سر پھوڑا جا رہا ہے (یا اس کے سر کو لوہے کی کنگھی سے چیرا جا رہا ہے) حضور نے پوچھا یہ کون ہے؟ جواب دیا گیا یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم دیا تھا تو یہ رات کو اس سے غافل ہو کر سوتا رہا اور دن میں اس پر عمل نہ کیا اسکے ساتھ قیامت تک یہی معاملہ ہوتا رہے گا اور یہ بات معلوم ہے کہ رات کو اٹھنا اور تہجد میں قرآن پڑھنا واجب نہیں پھر اس کو عین واجب کے ترک پر کیوں عذاب ہوا؟ حالانکہ عذاب ترک واجب پر ہی ہوا کرتا ہے یا واجب میں خلل ڈالنے پر (ترک مستحب پر نہیں ہوتا) مگر بات یہ ہے کہ رات کا اٹھنا اگرچہ مستحب تھا لیکن اس شخص کو اسی مستحب ہی نے عذاب سے بچا دیا کیونکہ اس سے واجب کی کمی پوری ہو جاتی تو در اصل) واجب میں خلل ڈالنے ہی کی وجہ سے عذاب ہوا تفصیل اسکی یہ ہے کہ جب دن میں قرآن پر عمل نہ کیا تو واجب میں خلل ڈالا پھر اس نے مستحب کام بھی نہ کیا یعنی رات کو نہ اٹھا جس سے فرض کی کمی کو پورا کر دیا جاتا (تو عذاب کا مستحق ہوا) پس حقیقت میں تو عذاب صرف ترک واجب پر ہوا مگر ظاہر میں دونوں پر ہوا (ترک مستحب پر بھی اور ترک واجب پر بھی) اسی طرح اگر کوئی بقدر ضرورت ایمان حاصل کرنے کے بعد علم الیقین کا درجہ حاصل کرنے کی ہمت رکھے تو اس کو یہ درجہ حاصل کرنا چاہیے اور اگر اس سے عاجز ہو جائے تو کچھ حصہ ضرور حاصل کر لے اپنے کو اس سے بالکل کورا نہ رکھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یقین حاصل کرتے رہو کیونکہ میں بھی اسکو حاصل کر رہا ہوں اور غالباً اب ہم تسدیدا و رتقرب کی حقیقت پر کافی طور سے اشارہ کر چکے ہیں اس لئے اب زیادہ تفصیل نہیں کرنا چاہیے بلکہ

حدیث کے دوسرے معانی پر کلام شروع کرتے ہیں کہ اس تفسیر کی بناء پر حضورؐ کے ارشاد وابشروا اور خوشخبری حاصل کرو میں بشارت کے دو درجے ہیں ایک وہ جسکی حد معلوم ہے کہ قبول اعمال اور اُن پر ثواب ملنے کی امید وارد ہوا اور یہ ثواب ثابت ہے جیسا حضورؐ کے ارشادات سے معلوم ہو چکا ہے اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو ذرہ برابر نیکی کریگا اس کے ثواب کو دیکھ لیگا اور دیکھنے میں محدود ہی آسکتا ہے اور ایک درجہ بشارت کا وہ ہے جس کی حد معلوم نہیں اور یہ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں وعدہ فرمایا ہے ویزیدھم من فضلہ اور اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے فضل سے بھی زیادہ دیں گے سو اس زیادتی کی حد معلوم نہیں ہاں اتنا معلوم ہے کہ زیادتی ہوگی اور اس میں اس بات پر بھی اشارہ ہے کہ بشارت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو عمل کرنیوالے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت کا ذکر عمل کے بعد کیا ہے کہ پہلے سیدھے چلنے اور قریب قریب رہنے کا حکم دیا اس کے بعد اُن لوگوں کو بشارت دی جو اس کے موافق عمل کریں اور یہ ایسا ہے جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولئک یرجون رحمۃ اللہ ط کہ جن لوگوں نے اللہ کے راستہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا کہ جو لوگ یہ اعمال بجا لائیں گے وہی رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں اسی طرح یہاں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو سیدھے چلیں گے اور قریب رہیں گے وہی بشارت حاصل کریں گے۔ (قولہ فی الوجہ الاول الوجہ الثالث قولہ علیہ السلام فسددوا وقاربوا والوجہ الرابع قولہ وابشروا الیٰ قولہ ھوالذی یستبشر

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو بدون عمل ہی کے کامیابی کے امیدوار ہیں حالانکہ قرآن وحدیث میں بشارت کو عمل پر مرتب کیا گیا ہے۔

ف۔ اسباب نجات میں کوتاہی کرنے کو بھی بعض اسباب عذاب میں شمار کرلیا جاتا ہے جیسے کسی شخص کو سزا جیل ہو جائے اور جیلر سے اس کا سبب دریافت کرے تو وہ کہتا ہے کہ اس نے عدالت کی توہین کی تھی اور گورنمنٹ کو کوئی زبردست سفارش بھی میسر نہ ہوئی اسلئے جیل میں داخل ہوا، تو حالانکہ زبردست سفارش کا حاصل نہ کرنا کوئی جرم نہیں مگر چونکہ سفارش بھی بعض دفعہ

نجات کا سبب ہوجاتی ہے اس لئے اس کے ترک کو اسباب عذاب میں بیان کیا جاتا ہے اسی طرح عالم بے عمل کو دراصل ترک عمل پر عذاب ہوتا ہے مگر چونکہ رات کو اٹھ کر نماز میں قرآن پڑھنے سے قیامت کے دن وہ اسکی شفاعت کرتا ہے جو اسباب نجات میں سے ایک بڑا سبب ہے تو اس کے ترک کو بھی مجازاً اسباب عذاب میں شمار کر لیا گیا خوب سمجھ لو ۔

۴۳ ۔ صبح و شام اور پچھلی رات میں عمل کا اہتمام کرو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ صبح و شام اور کسی قدر پچھلی رات میں کام کرنے سے سہارا لو ۔ اس میں استعانت دو طرح سے ہے ایک تو اس وقت کی عمدگی اور خوبی سے دوسرا ان اوقات کے عمل سے ۔ وقت سے استعانت کی وجہ تو یہ ہے کہ دن کے ابتدائی اور آخری حصہ میں ہوا معتدل ہوتی اور نفس کو نشاط ہوتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ان دونوں وقتوں کا عمل دوسرے اوقات کے عمل سے زیادہ عمدہ اور پاکیزہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھئے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کرتے ہیں اور اس کی رضا کے طالب ہیں نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبانی سب کو یہ ارشاد فرمایا ہے ۔ اذكرني ساعة بعد الصبح وساعة بعد العصر اكفك ما بينهما کہ اے ابن آدم! تو مجھے کچھ دیر صبح کے بعد اور کچھ دیر عصر کے بعد یاد کر لیا کر! تو ان دونوں کے درمیانی حصہ کا تیرے لئے میں خود ضامن ہوں گا اور رات کا آخری حصہ بھی ایسا ہی ہے کہ اس وقت ہمیشہ بدن میں زیادہ قوت ہوتی ہے کیونکہ نیند اور غذا کے ہضم سے راحت و آرام لے چکتا ہے اور اس وقت دل کو یکسوئی اور نشاط بھی زیادہ ہوتا ہے اور اس کی فضیلت بھی بہت وارد ہے جس میں سے ایک یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا پروردگار ہر رات اور ایک روایت میں ہے کہ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں آسمان اوّل کی طرف نزول فرماتا اور بندوں کو اس طرح خطاب

فرماتا ہے کوئی دعا کرنیوالا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کوئی مغفرت چاہنے والا ہے کہ میں اسکی مغفرت کردوں، کوئی توبہ کرنیوالا ہے کہ میں اسکی توبہ قبول کروں پس جب اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری حصہ میں اس طرح بندوں کو پکارتے ہیں تو اب یہ محال ہے کہ اس وقت کوئی دعا کرے یا توبہ یا استغفار کرے اور اسکی درخواست رد ہوجائے کیونکہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے، اور یہاں نزول سے مراد فضل و احسان و رحمت کیساتھ متوجہ ہونا ہے حلول یا انتقال (مکانی) کیساتھ نزول مراد نہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہیں) اور استعانت بالعمل کا یہ مطلب ہے کہ ان اوقات کو مختلف قسم کی طاعات سے آباد کیا جائے اور جب یہ اوقات طاعات میں مشغول ہوں گے تو اب صرف وہی اوقات باقی رہ جائیں گے جو راحت کیواسطے مقرر کئے گئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمایا ہے

یا ایہا الذین آمنوا لیستأذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرات من قبل صلاۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظہیرۃ ومن بعد صلاۃ العشاء ثلث عورات لکم۔

اے ایمان والو! تمہارے غلاموں اور نابالغ لڑکوں کو تین وقتوں میں اجازت لیکر آنا چاہیے

۱۔ فجر کی نماز سے پہلے

۲۔ اور جب دوپہر کو تم اپنے کپڑے اتار دو

۳۔ اور عشاء کی نماز کے بعد

یہ تین اوقات تمہارے پردہ کے ہیں، پس اب اس حدیث کا مطلب ایسا ہی ہوا جیسا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے روحوا القلوب ساعۃ بعد ساعۃ کہ (اپنے) دلوں کو کچھ کچھ دیر کے بعد راحت دیا کرو مگر اس حدیث میں جس کی ہم شرح کر رہے ہیں حضورؐ نے اُن اوقات کی تعیین بھی فرمادی ہے جو عبادت کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں یعنی ان کی عبادت دوسرے اوقات کی عبادت سے افضل قرار دی گئی ہے (قولہ فی الوجہ الاول الوجہ الخامس قولہ علیہ السلام واستعینوا بالغدوۃ الیٰ قولہ

ای جعلت العبادۃ فیھا افضل من سائر الاوقات)

ف حضرات صوفیہ کو ان اوقات میں عبادت و ذکر کا خاص اہتمام ہے جیسا جاننے والے جانتے ہیں کیا اب بھی طریق صوفیہ کا انکار کیا جائے گا؟

ف اس حدیث سے اور اسکی شرح میں جو احادیث مذکور ہوتی ہیں اُن سے محققین صوفیہ کی تائید ہوتی ہے جو عبادات و مجاہدات میں اعتدال کی تعلیم فرماتے اور مبالغہ اور غلو سے منع فرماتے ہیں کیونکہ غلو کا انجام تعطل ہے یا ایک مستحب کیلئے بہت سے واجبات و فرائض کو برباد کرنے

۴۴۔ فراغ قلب اور اوقات نشاط کو غنیمت سمجھو

ہماری تقریر سے دو باتیں مستنبط ہوئیں ایک یہ کہ نفس کے نشاط اور فراغ (و یکسوئی) کو غنیمت سمجھنا چاہیئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اسکو صاف طور سے بیان فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے اغتنم خمسا قبل خمس وعد فیھا فراغک قبل شغلک وصحتک قبل سقمک کہ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو اسی میں یہ ہے کہ فراغت کو مشغولی سے پہلے اور تندرستی کو بیماری سے پہلے غنیمت سمجھو دوسرے یہ کہ وقت کے حسن و اعتدال کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے کیونکہ اس سے عبادت میں مدد ملتی ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ابردوا بالصلوٰۃ (کہ گرمی کے زمانہ میں ظہر کی نماز کو ٹھنڈے وقت میں ادا کرو) (قولہ فی الوجہ الخامس من الوجہ الاول فعلی ما ذکرنا من التعلیل یترتب علیہ من الفقہ وجھان الی قولہ ابردوا بالصلوٰۃ)

ف فراغ و یکسوئی اور اوقات نشاط کو غنیمت سمجھنا اور اس کا اہتمام کرنا حضرات صوفیہ کا خاص مذاق ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ٭ بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے ۱۲

۴۵۔ سلوک باطن میں تدریج کیساتھ تربیت ہونا چاہیئے

اس وقت تک پہلی وجہ کے موافق گفتگو تھی اب دوسری وجہ کے موافق حدیث کی شرح کرتے ہیں وہ یہ کہ دین کے آسان ہونے سے یہ مراد ہو کہ جن اعمال کے بجالانے پہ نجات کا وعدہ اور خلاصی پانے کی ضمانت ہے وہ آسان ہیں (کیونکہ یہ اعمال مفروضہ ہیں) جو تم پہ فرض کئے گئے ہیں

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا دلن یشاد الدین احد الا غلبہ کہ سختی کے ساتھ ہرگز کوئی دین کا مقابلہ نہ کریگا مگر دین اس کو ہرا دیگا، یہ مطلب ہوگا کہ مستحبات میں اتنا غلو نہ کرو کہ فرائض میں خلل واقع ہو جائے تو اس صورت میں دین تم کو ہرا دیگا اور دینداری کا درجہ نہ پاسکو گے جیسا بعض لوگ ایک طرف سے کسی ایک ہی مستحب کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور دوسری طرف واجب کو چھوڑ بیٹھتے ہیں اسی طرح بعضوں کو پاکی (ناپاکی) میں ایسا وسوسہ دامن گیر ہو جاتا ہے کہ آخر کار فرائض میں کوتاہی ہونے لگتی ہے (مثلاً نماز کا وقت جا رہا ہے یا جماعت فوت ہو رہی ہے اور اس وہمی کا وضو ہی پورا نہیں ہوتا) اسی طرح بقیہ عبادات نافلہ کا حال ہے کہ اگر اُن میں تعمق اور تکلف سے کام لیا گیا تو فرائض میں خلل واقع ہوگا اس صورت میں دین اس پر غالب ہوگا اور یہ ہار جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی جو اصل چیز تھی اسی کو اس نے بگاڑا ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ جڑ کو کمزور کر کے شاخوں سے قرب حاصل کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ارشاد فرماتے ہیں کہ "قرب حاصل کرنے والے کسی چیز سے بھی ہرگز میرے مقرب نہیں بن سکتے جو فرائض سے زیادہ مجھے محبوب ہو اس کے بعد بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے پکڑتا ہے"۔ اس میں اس بات پر بھی اشارہ ہے کہ (طالب کو) سلوک اور ترقی (باطن) میں تدریج کے ساتھ بڑھنا چاہیئے اور پہلے ہی (قدم پر) رات دن عبادات نافلہ میں سختی کے ساتھ مشغول ہونے سے رکنا چاہیئے جو شخص ابتدائی حالت میں ایسا کریگا یقیناً دین اس کو ہرا دیگا کیونکہ جو راستہ اس نے اختیار کیا ہے نفس ابھی اس کا عادی نہیں ہوا ہے چنانچہ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن صبح کی نماز میں سلیمان بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ کو نہ پایا، دوسرے دن انکی والدہ ام شفا پر گذر ہوا تو اُن سے دریافت کیا کہ میں نے سلیمان کو صبح کی نماز میں نہیں دیکھا (کیا بات ہے) کہا وہ رات بھر نماز پڑھتے رہے پھر نیند غالب ہو گئی (اس لئے نماز سے رہ گئے) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے تو صبح کی نماز جماعت سے ادا کرنا قیام لیل سے زیادہ محبوب ہے۔ تو دیکھو حضرت عمرؓ نے جماعت کی نماز کو رات بھر کے تہجد سے افضل قرار دیا حالانکہ قیام لیل میں جو فضیلت ہے معلوم ہے مگر چونکہ رات کو اٹھنا مستحب تھا اور اس کی وجہ سے فرض کی ایک

فضیلت عہ میں خلل واقع ہوا تو حضرت عمرؓ نے اس کو پسند نہ فرمایا (بلکہ کراہت ظاہر کی) اگر وہ رات کے ایک حصہ میں نفلیں پڑھتے اور ایک حصہ میں سوتے اور نماز جماعت سے ادا کرتے تو درجہ کمال حاصل کر لیتے اور کسی ضروری فضیلت میں نقصان واقع کر کے مغلوب نہ ہوتے، غرض جب آدمی اپنے نفس کیساتھ نرمی کا برتاؤ کرے اور عبادات نافلہ کا (تدریجاً) اپنے کو عادی بنائے یہاں تک کہ جتنا کام اس نے اختیار کیا ہے وہ اسکی عادت اور طبیعت ثانیہ بن جائے تو عبادت اسکے لئے آسان ہو جائے گی اور انتہائی درجہ پر پہنچ کر بھی اسے کچھ مشقت معلوم نہ ہوگی بلکہ ایسا معلوم ہوگا کہ جیسا اس نے کچھ بھی زیادہ کام نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت سماد رحمۃ اللہ سے جو (مؤلف) رسالہ کے مشائخ میں سے ہے منقول ہے کہ ان کی نفل عبادت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ وہ اپنی دکان میں خرید و فروخت کرنے کے ساتھ روزانہ ہزار رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔

اور اس بنا پر فسددوا و قاربوا میں قاربوا کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمت کے قریب قریب رہو یعنی جان توڑ کر کوشش نہ کرو جو مبالغہ کی حد کو نہ پہنچ جائے ورنہ دین تم کو عاجز کر دیگا اور سددوا کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کی کوشش اپنی جسمانی طاقت و ہمت اور مزاج کیموافق ہونا چاہیئے اور اسی بات کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے بہت سے عابد تباہ ہو گئے ہیں کیونکہ وہ شروع ہی سے ان اہل نہایت کاملین کا مقابلہ کرنے لگتے ہیں جو ان کے مثل نہیں ہیں (بلکہ ان سے اعلیٰ درجہ پر ہیں مگر یہ لوگ انہی جیسے کام کرتے ہیں اور انہی کے طریقہ پر چلنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جلدی ہی کام کو جواب دیکر رہ جاتے ہیں کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس کی مشابہت اور برابری کا انہوں نے ارادہ کیا تھا وہ طاقت جسمانی اور اعتدال مزاج میں ان سے بڑھا ہوا تھا اور (اگر برابر یا کم بھی تھا تو) اس نے تدریجی ترقی سلوک کیساتھ اپنے کو اس درجہ کا عادی بنایا تھا جو اس وقت اس کو حاصل ہے یہاں تک کہ عبادت کا یہ درجہ اس کی عادت ثانیہ اور مزاج بن گیا جیسا حضرت سماد کا واقعہ ہم نے بیان کیا ہے اور اسی لئے میں بن رزق رحمہ اللہ نے جو دونوں طریقوں

عہ حنفیہ کے قریب جماعت سنت موکدہ قریب واجب ہے اور دوسرے ائمہ کے نزدیک سنت ہے چونکہ شارح مالکی ہیں اسلئے جماعت کو فضیلت کے درجہ میں رکھا ورنہ حنفیہ کے نزدیک اس کا درجہ فضیلت سے زیادہ ہے ۱۲ ظ

کے امام نے فرمایا ہے کہ اے مبتدیو! تم منتہیوں کی مشابہت اور برابری سے بچو اور بہت بچو کیونکہ وہاں ایسے مقامات ہیں کہ تم اُن میں (ابھی) پختہ نہیں ہوئے ہو۔

پس اب وہ طریقہ جس سے مبتدی انشاء اللہ مقصود کو پہنچ سکتا اور کامیاب بن سکتا ہے یہ ہے کہ اول پانچ نمازوں کو جو اس پر فرض ہیں اور آسان بھی ہیں واجبات اور مستحبات کیساتھ پختگی سے ادا کرے انکی پوری محافظت اور مداومت کرے جب یہ اسکی طبیعت ثانیہ بن جائے تو اس کے بعد نرمی اور اعتدال کیساتھ نوافل شروع کرے جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے (قولہ فی الوجہ الثالث من الوجہ الثانی ولن یشاد الدین احد الا غلبہ ای لئے نوغلوا فی المندوبات الی قولہ فی الوجہ الرابع منہ علی ما اشرنا الیہ فی النوافل)

ف بعض لوگ صوفیہ کے مجاہدات و ریاضات و کثرت عبادات کو دیکھ کر اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ یہ مبالغہ کی حد میں داخل ہے اور بدعت ہے اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ حد مبالغہ اور بدعت میں وہ کثرت عبادت و ریاضت داخل ہے جو نفس پر زیادہ مشقت کا سبب ہو اور اگر کوئی تدریجاً عبادت میں ترقی کرے کہ نفس کو زیادہ مشقت نہ ہو اور حقوق واجبہ میں بھی خلل نہ ہو تو یہ ہرگز بدعت نہیں کیونکہ حضرات صحابہ اور تابعین میں بھی بعض حضرات نے بہت زیادہ عبادت و ریاضت کی ہے چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیا کرتے تھے اسی طرح حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے بھی ایسے واقعات منقول ہیں بھلا جسکی آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہو جس کو عبادت میں بجائے مشقت و کلفت کے حلاوت و طمانیت حاصل ہوتی ہو اور حقوق واجبہ کا ادا کرنا راحت قلب کا سبب ہو اور اس میں کوتاہی کرنے سے دل بے چین ہو جاتا ہو اس کیلئے کثرت عبادت و ریاضت کو کیونکر مذموم کہا جا سکتا ہے۔

۴۶۔ کسی حال پر مداومت نصیب ہو جانا بھی ترقی ہے

اس تفسیر کی بنا پر حضورؐ کے ارشاد

والبشروا (خوشخبری حاصل کرو) کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جب کسی نے فرض کے بعد بقدر ہمت نفل کو بھی اختیار کیا تو اس کو ترقی کی خوشخبری حاصل کرنا چاہیئے یعنی اس کو خوش ہونا چاہیئے کہ آئندہ اعمال میں اور ترقی ہوگی اسی حد پر نہ رہے گا) کیونکہ بشارت کامل درجہ۔

یہی ہے (کہ ترقی کی بشارت دی جائے) یہاں تک کہ اعمال مرضیہ اور مقامات بلند پر اپنی امید کے موافق پہنچ جائے، حقیقی بشارت وہی ہے جو آئندہ کے متعلق ہو اور حالت موجودہ جس بات کا وعدہ کیا گیا ہو اس کا بیان کرنا مجازاً بشارت ہے حقیقتاً بشارت نہیں حقیقی بشارت کی مثال یہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن مالک کو دی تھی جبکہ وہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے پر معتوب ہوئے پھر اُن کی توبہ قبول کی گئی تو حضور نے فرمایا اے کعب! خوشخبری حاصل کرو ایسا دن نصیب ہونے کی جو تمہاری زندگی کے تمام دنوں سے بہتر ہے، کیونکہ اس وقت حضور کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے بعد ان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو گا اس لئے فرمایا کہ یہ دن تمہاری زندگی کے تمام دنوں سے افضل ہے چنانچہ اس کے بعد ان سے کوئی خطا یا مخالفت سرزد نہیں ہوئی بلکہ صدق (حال) اور عبادت (و اعمال) پر جمے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بہترین حالت پر اُن کو اُٹھا لیا (اور حسن مآل بدرجہ کمال نصیب ہوا) اور اسی لئے اہل سلوک نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی مقام پر پہنچ کر ادب کے ساتھ اس پر جما رہے تو وہ اس سے اعلیٰ مقام پر ترقی کرتا ہے اور جب تک اسکی حالت یہ رہیگی (کہ ہر مقام کے ادب کو محفوظ رکھے) ہمیشہ ترقی کرتا رہیگا یہاں تک کہ مقامات عالیہ کی انتہا پر (اپنی لیاقت کے موافق) پہنچ جائے گا، صوفیہ کا یہ ارشاد اس بشارت پر ہی مبنی ہے جیسا ہم نے بیان کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب آدمی فرض کو پوری طرح ادا کرتا اور جتنی نفل میسر ہو اس پر اپنے کو جمائے رکھتا اور مداومت کرتا ہے تو خود یہ مداومت بھی ترقی ہے اور اسی پر وہ بشارت کا مستحق ہے اس مطلب کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوسرے ارشاد سے ہوتی ہے جبکہ آپ کو دو بھائیوں کی اطلاع دی گئی جن میں ایک دوسرے سے چالیس دن پہلے (جہاد میں شہید ہو کر) مر گیا تھا اور دوسرا چالیس دن بعد اپنے گھر میں بستر پر مر گیا) تو لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پہلے کی فضیلت ظاہر کی اور یوں کہا کہ خدا اس کو بھی پہلے کیساتھ ملا دے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوسرے نے جو (پہلے کے بعد) بہت سی نمازیں پڑھی ہیں تم کو کیا خبر کہ ان نمازوں نے اسکو کہاں پہنچا دیا نماز کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے دروازہ پر آب شیریں کی لبریز نہر بہتی ہو، اور وہ اسمیں روزانہ پانچ دفعہ غوطہ لگاتا ہو تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اسکے بدن پر کچھ بھی میل رہ جائیگا؟

اسی لئے اہل سلوک نے فرمایا ہے کہ کسی حال پر مداومت رکھنا بھی ترقی اور زیادتی ہے اُن کا یہ ارشاد اسی حدیث پر مبنی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی"

(قولہ الوجہ الخامس من الوجہ الثانی قولہ علیہ السلام روالبشر والی قولہ عملا بالحدیث الذی اوردناہ)

۴۷۔ ابتدا میں کام کا جوش ہوتا ہے پھر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے

اس تفسیر کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیٔ من الدلجۃ کا مطلب یہ ہوگا کہ صبح کے وقت سے مدد لو یعنی چاشت کی نماز پڑھو اور شام کے وقت سے سہارا لو یعنی ظہر و عصر کے درمیان نفلیں پڑھو اور کسی قدر رات کے آخری حصہ سے مدد لو یعنی آخر رات میں تہجد پڑھا کرو اور حضور نے رات کے متعلق کسی قدر اسلئے فرمایا کہ رات کا آخری حصہ ایک ایسا جزو ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درجۂ افضلیت کی تعیین ایک حدیث میں کردی ہے کہ بہترین نماز (تہجد) داؤد علیہ السلام کی نماز ہے وہ آدھی رات سوتے اور ایک تہائی میں نماز پڑھتے اور چھٹے حصہ میں پھر سو رہتے تو یہ حد اور تعیین تو درجۂ افضلیت کی ہے کہ جس کو فضیلت کا درجہ لینا ہو وہ ایسا کرے مگر اس وقت درجۂ کفایت میں گفتگو ہے جس سے استعانت اور مدد حاصل ہو سکے اور اس درجہ کو محدود نہیں کیا جا سکتا کہ وہ رات کا کتنا حصہ ہو دسواں یا بیسواں یا کم زیادہ) اب اگر کوئی فضیلت کی صورت اختیار کر سکے تو سبحان اللہ ورنہ درجۂ کفایت ہی کو لے لے جس سے مدد اور سہارا مل سکے حضور کا اس درجہ کی تعیین نہ فرمانا یہ امت پر توسع اور آسانی کیلئے ہے کیونکہ یہ وقت نیند اور عذر کا وقت ہے (اس میں اگر درجۂ کفایت کو محدود کر دیا جاتا تو ہر شخص کو عمل آسان نہ ہوتا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ حضور ان اوقات کو مختلف قسم کی عبادات سے معمور رکھنے کی ترغیب دے رہے ہیں کیونکہ اس سے مدد اور سہارا ملتا ہے اور جس چیز سے مدد ملتی ہو اسے چھوڑنا نہیں چاہیئے ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ شخص مراد کو نہ پہنچ سکے گا اسی لئے بہتر یہ ہے کہ اول آسان اور سہل طریقے سے کام شروع کرے اور اسی طرح کام کرتا رہے تاکہ استعانت

اور مدد سے محروم نہ رہے پھر اگر درجۂ کمال کی ہمت پائے تو اس کو بھی ہاتھ سے نہ دے اور اگر کوئی شغل یا مرض اس سے مانع ہو تو درجۂ کفایت کو ہرگز نہ چھوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کو ایک دوسری حدیث میں صاف طور سے بیان فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے لکل عابد شراھۃ ولکل شراھۃ فترۃ فطوبی لمن کانت فترتہ الی سنۃ، ہر عابد کو (ابتدا میں کام کا) ایک جوش ہوتا ہے اور ہر جوش (کسی وقت) ٹھنڈا پڑجاتا ہے پس مبارک ہے وہ جس کا جوش سنت کے موافق ٹھنڈا ہو اور سنت کے موافق جوش کا ٹھنڈا ہونا یہی ہے جس کی طرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ ان نفوٹے سے وقتوں میں کچھ نفل عبادت کر لیا کرے پس اے سبحان اللہ! حضور کے ذریعہ اور آپ کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے ہم پر کیسا احسان فرمایا ہے؟

اور اس میں اہل سلوک و اہل تربیت (کے اس معمول) کی دلیل ہے کہ وہ ابتدا میں رات اور دن کی نفلوں کو دو دو رکعت سے شروع کرنا پسند کرتے ہیں اس کے بعد جتنی ہمت اور نشاط پائے بڑھاتا رہے (مگر ابتدا میں اپنے ذمہ دو رکعت سے زیادہ لازم نہ کرے) تاکہ درجۂ استغنائت و کفایت سے محروم نہ رہے جیسا ابھی بیان ہوا، یہاں تک کہ تدریجاً مراد کو پہنچ جائے کیونکہ جو شخص ان اوقات میں اپنی ہمت کے موافق عبادت کریگا وہ جتنا چاہے مراتب عالیہ میں ترقی کر سکے گا اور اس کو کچھ تعب نہ ہوگا اور اس طرح وہ ہمیشہ زیادت (عبادت) کیساتھ ترقی کرتا اور نقصان کو چھوڑتا رہے گا یہاں تک کہ اس انتہائی درجہ پر پہنچ جائے گا جو انسانی حالت کا مقتضا ہے۔ قولہ الوجہ السادس من الوجہ الثانی قولہ علیہ السلام واستعینوا بالغدوۃ الی قولہ الی نہایۃ ما تقتضیہ حال البشریۃ ملخصاً)

ف سالکین طریق کو اس مقام سے سبق لینا چاہیئے کہ ابتدا میں کام کا جتنا جوش ہوتا ہے وہ ہمیشہ نہیں رہا کرتا پس لازم ہے کہ ابتدا میں سہل اور آسان طریقہ اختیار کیا جائے اور تدریجاً ترقی کی جائے ابتدا میں زیادہ جوش سے کام کرنا اور بعد میں کم کر دینا بہتر نہیں ہے اور اگر کوئی عذر لاحق ہو تو ان خاص اوقات میں جن کا حدیث میں ذکر آیا ہے کم از کم دو رکعتیں نفل کی ضرور پڑھ لیا کریں کہ اس سے ترقی میں مدد ملتی ہے۔

۴۸ ۔ ہمیشہ عزیمت ہی پر اصرار نہ کرو بلکہ ضرورت کے وقت رخصت پر بھی عمل کرو

تیسری توجیہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الدین یسر کا یہ مطلب ہو کہ جو دین تم کو دیا گیا ہے وہ ادیان سابقہ کی نسبت سے آسان ہے تم کو انہی احکام کا مکلف کیا گیا ہے جو تمہاری طاقت کے موافق ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے وہ دشواریاں اٹھادی ہیں جو پہلی امتوں کے اوپر تھیں چنانچہ ان کے لئے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ بنا دیا گیا، مثال کے طور پر یہ (دیکھو) کہ ہمارے واسطے (گناہوں سے پاک ہونے کیلئے) توبہ کو مشروع کیا گیا ہے جس کی حقیقت ندامت اور استغفار اور (آئندہ کو) گناہ سے رک جانا ہے اور پہلی (بعض) امتوں کیلئے توبہ کا طریقہ قتل تھا اسی طرح نجاست ظاہرہ سے پاک ہونے کیلئے ہمارے واسطے دھونا اور نہانا مقرر کیا گیا ہے اور پہلے[ع] لوگوں کے لئے ناپاک چیز کترنا اور کاٹنا تھا ۔

ع‌ قلت و لفظ الشارح نفسه وكذلك ايضاً النجاسة طهارتها لنا بالغسل ولمن قبلنا بالقطع والمقراض الخ واصله ماورد في الحديث عند ابن ماجة عن عبد الرحمن بن حسنة ان النبي صلى الله عليه وسلم قال كان بنو اسرائيل اذا اصابهم البول قرضوه بالمقاريض فنهاهم رجل منهم فعذب في قبره واخرج الحاكم وصححه عن ابي موسى ان النبي صلى الله عليه وسلم قال ان بني اسرائيل كان اذا اصاب احدهم البول قرضه بالمقراض كذا في الخصائص الكبرى للسيوطي (ص ۲۱ ج ۲) وحديث عبد الرحمن بن حسنة رواه ابن حبان في صحيحه ايضاً كما في الترغيب (ص ۳۶) وكل ذلك لا دلالة فيه على كونهم مامورين بقرض ماتنجس من البدن واعضاءه بل الظاهر حمله على قطع ماتنجس من الثياب وامثالها يؤيده مارواه الطبراني في الكبير عن ابي موسى مرفوعاً في حديث طويل فقال ان صاحب بني اسرائيل كان اشد على البول منكم كان معه مقراض فاذا اصاب ثوبه شئ من البول قصه ذكره الهيثمي في مجمع الزوائد (ص ۵۸ ج ۱) وقال فيه علي بن عاصم وكان كثير الخطاء والغلط وينبه على

اسی طرح قسم کا کفارہ ہمارے واسطے شروع ہوا ہے۔ پہلی امتوں کیواسطے نہ تھا۔ اسی طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) غلطه فلا يرجع اه قلت ومع ذلك فقد اثنى عليه يعقوب
بن شيبة وقال قد كان رحمه الله من اهل الدين والصلاح والخير البارع وشديد
التوقي وقال وكيع مازلنا نعرفه بالخير وقال الذهلي قلت لاحمد في علي بن عاصم
وذكرت له خطاءه فقال احمد كان حماد بن سلمة يخطئ خطاء كبيرا واومى احمد
بيده ولم ير بالرواية عنه بأساً كذا في تهذيب التهذيب (ص٣٤٥ ج٧) فالرجل
حسن الحديث وليس بمتروك ولا ممن اجمع على جرحه، وقد اختار صاحب التفسير
المظهري رحمه الله تعالى حمل القطع والقرض على قطع الثياب قرضا كما يظهر
من ترجمة تفسيره بالهندية (ص٦٦ ج٢) نعم قد ورد عند ابن ابي شيبة في المصنف
عن عائشة قالت دخلت على امرأة من اليهود فقالت ان عذاب القبر من البول
قلت كذبت قالت بلى انه ليقرض منه الجلد والثوب فقال النبي صلى الله عليه
وسلم صدقت كذا في الخصائص الكبرى (ص٣١١ ج٢) قلت لعائشة رضي الله عنها حديث
في عذاب القبر غير هذا اخرجه الشيخان بطريق مسروق عنها ان يهودية دخلت
عليها فذكرت عذاب القبر فقالت لها اعاذك الله من عذاب القبر فسألت
عائشة الرسول الله صلى الله عليه وسلم عن عذاب القبر فقال نعم عذاب القبر
قالت عائشة رضي الله عنها فما رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد صلى صلاة الا تعوذ
من عذاب القبر وجمع الحافظ طرقه في الفتح (ص١٨٦-١٨٧ ج٣) فلم يذكر هذه الزيادة التي
وقعت عند ابن ابي شيبة في مصنفه، فان صح الحديث فليس فيه ما يوجب حمله
على قرض الجلد من الجسم لاحتمال ان يكون المراد به قطع الجلد من النعل ومن
الفرو الذي هو من جنس اللباس حمله على ذلك شيخ شيخنا مولانا السيد احمد الدهلوي
رحمه الله تعالى المدرس المدرسة العالية بديوبند وبتعين حمله على ذلك لوجوه
الاول ان قرض الجلد لم يرد مرفوعاً في حديث غيره ولم يرد فيه ايضاً من قول
النبي صلى الله عليه وسلم وانما ورد من قول اليهودية وقوله صلى الله عليه وسلم صدقت

راجع الی اخبار ہا بعذاب القبر فقط کما یدل علی ذلک ما فی لفظ الصحیح من قوله نعم عذاب القبر الی جمیع ما اخبرت به والثانی ان الجلد لم یرد مبینا فی حدیث ما علی ما ادی الیه نظری بان المراد به جلد البدن وقد ورد فی حدیث ابی موسی التصریح

بان صاحب بنی اسرائیل انما کان یقص ثوبه من البول فینبغی حمل الجلد علی مایلائم الثوب وهو ما ذکرناه من جلود النعال والفرد ونحوها والثالث ان حمله علی جلد البدن غیر معقول المعنی لکونه واخل فی تکلیف مالا یطاق کما هو الظاهر وقال الجصاص فی تفسیر قوله تعالیٰ لا یکلف الله نفسا الا وسعها فیه نص علی ان الله تعالیٰ لا یکلف احدا مالا یقدر علیه ولا یطیقه ولو کلف احدا مالا یقدر علیه ولا یستطیعه لکان مکلفا له ما لیس فی وسعه، ولم تختلف الامة فی ان الله لا یجوز ان یکلف الزمن المشی والاعمی البصر والاقطع الیدین البطش لانه لا یقدر علیه ولا یستطیع فعله ولا خلاف فی ذلک بین الامة وقد وردت السنة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ان من لم یستطع الصلاۃ قائما فغیر مکلف للقیام فیها ومن لم یستطع القعود فیها فغیر مکلف للقعود بل یصلیها علی جنب یومی ایماء لانه غیر قادر علیها الا علی هذا الوجه ونص التنزیل قد اسقط التکلیف عمن لا یقدر علی الفعل ولا یطیقه، وزعم قوم جهال نسبت الی الله فعل السفه والعبث فزعموا ان کل ما امر به احد من اهل التکلیف اونهی عنه فالمامور به غیر مقدور علی فعله والمنهی عنه غیر مقدور علی ترکه و قد اکذب الله قیلهم بما نص علیه من انه لا یکلف الله نفسا الا وسعها مع ما قد دلت علیه العقول من قبح تکلیف مالا یطاق وان العالم بالقبیح المستغنی عن فعله لا یقع منه فعل القبیح اھ (ص ۵۳۰-۵۲۸ ج ۱) قلت ویمکن ان یحمل قول هذا القائل علی نفی القدرۃ الحقیقیة المرادۃ فی قوله لا حول ولا قوۃ الا بالله فیستقیم الکلام ولا یرد علیه ما اورد فافهم، وبالجملة فان الله تعالیٰ قد نفی التکلیف

واسطے جائز ہے پہلے لوگوں کیلئے جائز نہ تھا، اس کے سوا اور بہت سے احکام ہیں رحمت ہیں اس امت پر بہت آسانی کی گئی ہے) اور اگر اللہ تعالیٰ ہم کو طاقت سے زیادہ کا مکلف کر دیتے تو یہ بھی جائز تھا کیونکہ وہ حاکم اور قاہر ہیں اُن کے حکم کو رد کرنیوالا کون ہے ؟ لیکن محض اپنے فضل و احسان سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو عافیت (اور راحت) عطا فرمائی کہ انہی احکام کا مکلف کیا جو ہماری طاقت کے موافق ہیں چنانچہ فرماتے ہیں لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت وہمت سے زیادہ کا مکلف نہیں فرماتے اور کسی شخص کو قدر وسعت (وہمت) سے زیادہ کا مکلف نہیں فرماتے اور جو شخص قدر وسعت کا مکلف کیا گیا ہو (یقیناً) وہ اس کے لئے آسان ہوگا، اسکی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری بھول چوک اور دل[ع] کے وسوسوں کو معاف فرمادیا ہے (اسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بما لا یطاق عن کل نفس علی ما یقتضیہ عموم قولہ نفسا الواقع فی حیز النفی فلا یجوز القول بکون الامم السالفۃ مکلفۃ بما لیس فی وسعہا ظاہرا او یجب حمل کل ما ورد فی تفسیر الاصر الذی کان علیہم علی ما یمکن دخولہ فی الوسع والطاقۃ، نعم کانوا قد کلفوا باحکام ھی اشد واثقل مما کلفنا بہ ولکنہا کانت فی وسعہم لکونہم اقویاء منا واللہ تعالیٰ اعلم۔

ولا ریب ان الدین الذی تدینا بہ یسر لا حرج فیہ اصلا فان نبینا صلی اللہ علیہ وسلم قد جاءنا بالحنفیۃ السمحۃ البیضاء التی لیلہا ونہارہا سواء وقال تعالیٰ ما جعل علیکم فی الدین من حرج، فالحمد للہ الذی بنعمتہ وعزتہ وجلالہ تتم الصلحت وصلی اللہ تعالیٰ علی افضل الکائنات واشرف المخلوقات سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ وذریتہ وازواجہ الطیبات الطاہرات صلوٰۃ دائمۃ مؤبدۃ تنسیق الغایات ۱۲ ظ

ع قلت واصلہ ما ورد فی الحدیث عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تجاوز عن امتی ما وسوست بہ صدورھا ما لم تعمل بہ او تتکلم متفق علیہ (مشکوٰۃ ص۹) وفی لفظ لہما ان اللہ تجاوز لی عن امتی ما حدثت

طرح کوئی زبردستی ہم سے ناجائز کام لے (تو گناہ زبردستی کرنے والے پر ہوگا ہمارے

ع زبردستی کی تفصیل کتب فقہ سے معلوم کی جائے اور یہ بھی کہ زبردستی کی صورت میں انسان کون سے ناجائز کام کر سکتا ہے اس کو عام نہ سمجھنا چاہیئے ۱۲ ظ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) به انفسها مالم تتكلم او تعمل به كذا فى الخصائص للسيوطى (ص۲۱۰ ج۲) وفيه ايضاً اخرج احمد وابن حبان والحاكم وابن ماجه عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله وضع عن امتى الخطاء والنسيان وما استكرهوا عليه "

وفيه ايضاً اخرج الفريابى فى تفسيره عن محمد بن كعب قال مابعث الله تعالىٰ من نبى ولا ارسل من رسول انزل عليه الكتاب الا انزل الله عليه هذه الآية وان تبدوا ما فى انفسكم او تخفوه يحاسبكم به الله الآية، فكانت الامم تأتى على انبيائها ورسلها ويقولون لو اخذ بما تحدث به انفسنا ولم تعمله جوارحنا فيكفرون ويضلون فلما نزلت على النبى صلى الله عليه وسلم اشتد على المسلمين ما اشتد على الامم قبلهم فقالوا يا رسول الله ايؤاخذ بما تحدث به انفسنا ولم تعمله جوارحنا قال نعم فاسمعوا واطيعوا واطلبوا الى ربكم فذلك قوله تعالىٰ آمن الرسول الآية فوضع الله عنهم حديث النفس الا ما عملت الجوارح لها ما كسبت من خير وعليها ما اكتسبت من شر اھ (ص۲۱۰ ج۲) والكلام ههنا من وجوه، الاولىٰ ان التجاوز عن الوسوسة والخطاء والنسيان مختص بهذه الامة ام يعمها وغيرها من الامم والثانية ان كان ذلك مما اختصت به هذه الامة وكانت الامم قبلها يؤاخذون بما وسوست به صدورها او بما اتت به خطاء او نسياناً فهل ليس ذلك منافيا لقوله تعالىٰ لا يكلف الله نفسا الا وسعها، والثالثة ان لم يكن ذلك منافيا له فهل الاحتراز عن

اوپہ نہ ہوگا) اسی طرح نماز میں کھڑا ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھنے کی اجازت ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) الوسوسۃ والخطاء والنسیان مما یدخل فی اختیار العبد،

والجواب اما عن الاولیٰ فالظاہر اختصاص ہذہ الامۃ بذلک کما یشعر بہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تجاوز عن امتی الخ فان المتبادر منہ عدم التجاوز عن الامم غیرھا ومن ھنا عدہ السیوطی من الخصائص حیث قال باب اختصاص النبی صلی اللہ علیہ وسلم بان امتہ وضع عنہم الاصر الذی کان علی الامم قبلھم واحل لھم کثیرا مما شدد علی من قبلھم ولم یجعل علیھم فی الدین من حرج ورفع عنھم المؤاخذۃ بالخطاء والنسیان وحدیث النفس (ص۲۰۹ ج۲) واما عن الثانیۃ فان المؤاخذۃ بحدیث النفس والخطاء والنسیان لیس منافیاً لقولہ تعالیٰ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا واما عن الثالثۃ فان الاحتراز عن حدیث النفس وتوابعھا مما یدخل فی اختیار العبد، اما عن الخطاء والنسیان فلان منشارھما الغفلۃ وعدم التیقظ والاحتراز عن ذلک فی وسع العبد لان التیقظ والتذکر لیس خارجاً عن اختیارہ ومن ھنا صرح الشیخ ابن ابی جمرۃ رحمہ اللہ تعالیٰ بان العارفین الکمل قد ارتفعوا عن الخطاء والنسیان ولکن ذلک مما یتعسر علی العامۃ وقت اشتغالھم بامور الدنیا فلا یکادون ان یظفروا بالاستحضار الدائم والتیقظ والحال ھذہ فلاجل التعذر والحرج تجاوز اللہ عن ھذہ الامۃ الخطأ والنسیان واما عن حدیث النفس فلان اعمال القلب لہا درجات عدیدۃ ذکرہ الامام الغزالی قدس اللہ سرہ فی الاحیاء (ص۳۶ ج۳) وبینھما شیخنا اطال اللہ بقاءہ فی رسالۃ المصححۃ فی حکم الوسوسۃ وھی جزء من رسالۃ المسماۃ بالتشرف باحسن بیان وھذا نصہ قال الحفنی ان المراتب خمسۃ ھاجس وخاطر وحدیث نفس وھم وعزم، فالشیٔ اذا وقع فی القلب ابتداءً ولم یمل فی النفس

بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھنے کی اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اشارہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سمی هاجساً فاذا كان هو فقط ودفعه من اول
الامر لم يحتج الى المراتب التي بعده فاذا جال اي تردد في نفسه بعد
وقوعه ابتداءً ولم يتحدث بفعل ولا عدمه سمي خاطراً فاذا حدثته نفسه
بان يفعله اولا يفعل على حد سواء من غير ترجيح لاحدهما على الآخر
سمي حديث النفس فهذه الثلاثة لا عقاب عليها ان كانت في الشر ولا
ثواب عليها ان كانت في الخير فاذا فعل ذلك عوقب او اثيب على الفعل لا
على الهاجس والخاطر وحديث النفس فاذا حدثته نفسه بالفعل وعدمه
مع ترجيح الفعل لكن ليس ترجيحاً قوياً بل هو مرجوح كالوهم سمي هماً
فهذا يثاب عليه ان كان في الخير ولا يعاقب عليه ان كان في الشر كما
في الحديث فاذا قوي ترجيح الفعل حتى صار جازماً مصمماً لا يقدر على
الترك سمي عزماً فهذا يثاب عليه ان كان في الخير ويعاقب عليه ان كان
في الشر قلت والوسوسة عام لجميع المراتب الثلثة الهاجس والخاطر وحديث
النفس ومجموع اقسامها غير مؤاخذ به وعدم المؤاخذة على حديث النفس
بالحديث الصحيح وعلى الباقيين بالاولى لانه اذا انتفى حديث النفس انتفى
ما قبله بالاولى، وان خالجك ان الحكم بانتفاء حديث النفس يتوقف
على كون المراد به في الحديث ما اصطلحتم عليه وهذا لا دليل عليه
فاعلم بان هذا الاصطلاح عين اللغة والنصوص محمولة على اللغة ما لم
يطرأ عليها اصطلاح شرعي ولم يطرأ فيحمل على ما ذكرنا فافهم والسر
في عدم المؤاخذة على الهاجس انه ليس من فعله وانما هو شيء ورد عليه
لا قدرة له عليه ولا صنع والخاطر الذي بعده وان كان قادراً على دفعه
بصرف الهاجس اول وروده ولكنه لما كان دون حديث النفس وهو مرفوع
بالحديث كان مرفوعاً بالاولى كما ذكرنا وبهذا انحل اشكال عويص وهو

سے نماز ادا کرنے کی اجازت ہے اسی طرح پانی نہ ملے تو تیمم کی اور سفر کی حالت میں
روزہ نہ رکھنے اور نماز میں قصر کرنے کی اجازت ہے اس کے سوا اور بہت سی سہولتیں ہیں
جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سہولتوں کے متعلق
فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا عزیمتوں پر عمل کرنے کو پسند کرتے ہیں اسی طرح یہ بھی
چاہتے ہیں کہ اُن کی رخصتوں پر عمل کیا جائے (یہ نعمت پر نعمت ہے ورنہ قیاس کا مقتضا
یہ تھا کہ رخصت پر عمل کرنا صرف جائز ہوتا، مستحب اور محبوب نہ ہوتا کیونکہ اس کو
ہماری سہولت کیلئے مقرر کیا گیا ہے حکم اصلی کے طور پر مقرر نہیں کیا گیا مگر اللہ تعالیٰ
کو ہماری راحت بھی محبوب ہے اس لئے عذر کیوقت رخصت پر عمل کرنا بھی اُن کو محبوب ہے) اس
تفسیر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ولن یشاد الدین احد الا غلبہ کا مطلب یہ
ہوگا کہ جو شخص اپنے اوپر سختی کرے اور عزیمتوں پر اصرار کرے اور عذر کیوقت رخصتوں کو چھوڑ دے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان الکلیات الشرعیۃ والقواعد العقلیۃ تقتضی المواخذۃ
علی الاختیاری وعدم المواخذۃ علی غیر الاختیاری فالاختصاص بھذہ الامۃ المرحومۃ
من بین الامم ان کان باعتبار غیر الاختیاری من المراتب المذکورۃ یلزم تکلیف
الامم السابقۃ بغیر الاختیاری وان کان باعتبار الاختیاری فما الفرق بین
اختیاری واختیاری حیث یواخذ علی العزم ولا یواخذ علی حدیث النفس مع
اشتراکھما فی کونھما اختیاریین، ووجہ الانحلال ان الاختصاص باعتبار
الاختیاری والفرق بین العزم وبین الخاطر وحدیث النفس ان الخاطر وکذا حدیث النفس
وان کان دفعہ اختیاریا لکنہ یحتاج الی قصد الدفع وکثیرا ما یقع الذھول عن
ھذا القصد فیجر الاول الی الثانی والثالث فالمواخذۃ علیہ لا ینافی الکلیات
الشرعیۃ لکن الرحمۃ الالٰھیۃ قد خصت ھذہ الامۃ بالعفو عنہ کوضع
الاصر والاغلال التی کانت علی السابقین فھذہ المرتبۃ اختیاریۃ لکن فیھا شدۃ
فکانت من الاصر والاغلال واما العزم فلا یحتاج الصاحب الیہ کذلک وانما یحدث
[illegible] مستقلا [illegible] حدیث النفس والعزم فھذا سر العفو ھو الاقتضاء

وہ دین کا مقابلہ کرنے والا ہوگا اور جب دین کا مقابلہ کرے گا تو یقیناً وہ اس کو

للذهول ومدار المؤاخذة هو العزم المستقل فلو حدث نفسه بالمعصية بعزم مستقل وان لم يعزم (فعل) تلك المعصية كالا لتذاذ بصورة الاجنبية قصداً فالظاهر انه يواخذ عليه وهذا الالتذاذ داخل عندى فى عموم حديث والنفس تمنى وتشتهى فى رواية والقلب يهوى ويتمنى روى الاول الشيخان والثانى مسلم اه مختصرا (ص ۲۷، ۲۹) وحاصله ان الالتذاذ بصورة الاجنبية داخل فى معاصى القلب كالحسد والبغضاء والحقد والكبر ونحوها فانها توجب الاثم ويؤاخذ عليها اذا كانت فى درجة العزم وان لم يظهر اثرها فى عمل الجوارح وقال الامام المجتهد ابن دقيق العيد فى شرح عمدة الاحكام فى قوله صلى الله عليه وسلم من توضأ نحو وضوئى هذا ثم صلى ركعتين لا يحدث فيهما نفسه غفر له ما تقدم من ذنبه ما نصه قوله يحدث فيهما نفسه اشارة الى الخواطر والوساوس الواردة على النفس وهى على قسمين احدهما ما يهجم هجما يتعذر دفعه عن النفس، والثانى ما تسترسل معه النفس ويمكن دفعه وقطعه فيمكن ان يحمل الحديث على هذا النوع الثانى فيخرج عنه النوع الاول لعسر اعتباره ويشهد لذلك لفظة يحدث نفسه فانه يقتضى تكسبا منه وتفعلا لهذا الحديث، ويمكن ان يحمل على النوعين معاً الا ان العسر انما يجب دفعه عما يتعلق بالتكاليف والحديث انما يقتضى ترتب ثواب مخصوص على عمل مخصوص فمن حصل له ذلك العمل حصل له ذلك الثواب ومن لا فلا، وليس ذلك من باب التكاليف حتى يلزم دفع العسر عنه، نعم لا بد وان تكون تلك الحالة ممكنة الحصول اعنى الوصف المرتب عليه الثواب المخصوص، والامر كذلك فان المتجردين عن شواغل الدنيا الذين غلب ذكر الله عز وجل على قلوبهم وغمرها تحصل لهم تلك الحالة وقد حكى عن بعضهم ذلك اه (ص ۳۹/۱۲) و

گھبرا دے گا، مثلاً کوئی شخص جائز طریقہ سے قسم نہ کھاتے بلکہ مکہ تک پیادہ پا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حاصلہ ان دفع الوساوس بنوعیہا ممکن الحصول ویکون النوع الاول منہما وینبغی تسمیتہا بدرجۃ الحدوث یتعسر دفعہ عن النفس والعسر یجب دفعہ عما یتعلق بالتکالیف فلا یصح القول بکون الامم السالفۃ مکلفین بہذہ الدرجۃ بل الذی یصح القول بکونہم مکلفین بہ انما ہو الدرجۃ الثانیۃ وہی الوساوس التی تسترسل معہا النفس وینبغی تسمیتہا بدرجۃ البقاء، وہذا ہو ما قالہ شیخنا ادام اللہ ظلہ ان الوسوسۃ فی درجۃ الحدوث لم یکلف بدفعہا احد من الامم لکونہا من غیر اختیار العبد وفی درجۃ البقاء کلفت الامم السابقۃ بدفعہا ولم تکلف ہذہ الامۃ رحمۃ ولطفاً ومناً او انما کلفت بان لا یعزم علی المعصیۃ ظاہرۃ کانت او باطنۃ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وقال الامام الغزالی فی بیان ما یؤاخذ بہ العبد من وساوس القلوب وہمہا وخواطرہا وما یعفی عنہ ما نصہ اعلم ان ہذا امر غامض وقد وردت فیہ آیات واخبار متعارضۃ یلتبس طریق الجمع بینہما الا علی سماسرۃ العلماء بالشرع فقد روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم عفی عن امتی ما حدثت بہ نفوسہا ما لم تتکلم بہ او تعمل بہ (متفق علیہ، بلفظ ان اللہ تجاوز لامتی) وقال ابو ہریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ یقول للحفظۃ اذا ہم عبدی بسیئۃ فلا تکتبوہا فان عملہا فاکتبوہا سیئۃ و من ہم بحسنۃ لم یعملہا فاکتبوہا حسنۃ فان عملہا فاکتبوہا عشرا اخرجہ البخاری ومسلم، وہو دلیل علی العفو عن عمل القلب وہمہ بالسیئۃ فاما ما یدل علی المؤاخذۃ فقولہ سبحانہ ان تبدوا ما فی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انفسکم او تخفوہ یحاسبکم به الله، وقوله تعالیٰ ان السمع والبصر والفواد کل ذلک کان عنه مسئولا فدل على ان عمل الفواد کعمل السمع والبصر فلا یعفی عنه وقوله تعالیٰ: ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه، وقوله تعالیٰ ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم والحق عندنا فی هذه المسئلة لا یوقف علیه ما لم تقع الاحاطة بتفصیل اعمال القلوب من مبدأ ظهورها الی ان یظهر العمل علی الجوارح فذکر المراتب الخمسة التی ذکرها الحنفی باختلاف ما فانه جعلها اربع مراتب وسمی الاولی بالخاطر مرة وبحدیث النفس اخری والثانیة بالمیل ای هیجان الرغبة والثالثة بحکم القلب ای الاعتقاد والرابعة بالهم وتصمیم العزم، ثم قال اما الخاطر فلا یؤاخذ به لانه لا یدخل تحت الاختیار وکذلک المیل وهیجان الرغبة وهی المراد بقوله صلی الله علیه وسلم عفی عن امتی ما حدثت به انفسها فحدیث النفس عبارة عن الخواطر التی تعرض فی النفس ولا یتبعها عزم علی الفعل فاما الهم والعزم فلا یسمی حدیث النفس واما الثالث وهو الاعتقاد وحکم القلب بانه ینبغی ان یفعل فهذا تردد بین ان یکون اختیاریا او اضطراریا فالاختیاری منه یؤاخذ به (کالالتذاذ بصورة الاجنبیة عمداً) والاضطراری لا یؤاخذ به واما الرابع وهو الهم بالفعل فانه مؤاخذ به الا انه ان لم یفعل فان کان قد ترکه خوفا من الله تعالیٰ وندما علی همه کتبت له حسنة وان تعوق الفعل بعائق او ترکه بعذر لا خوفا من الله کتبت علیه سیئة فان همه فعل من القلب اختیاری وقد قال صلی الله علیه وسلم انما یحشر الناس علی نیاتهم (اسناده حسن وعند مسلم عن عائشة یبعثهم الله علی نیاتهم) ونحن نعلم ان من عزم لیلا علی ان یصبح لیقتل مسلما او یزنی بامرأة فمات تلک اللیلة مات.

بلکہ پانی ہی سے وضو کرنا چاہے یا بیماری کی حالت میں کھڑا ہو کر ہی نماز پڑھنے کا ارادہ کرے وغیرہ وغیرہ غرض ہر پہلو میں درجہ کمال ہی کو اختیار کرنا چاہیے اور رخصتوں کو چھوڑ دے تو یہ شخص دین کا سختی سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے اور اس صورت میں محض اس وجہ سے کہ اس نے ایک ثبات دل میں ٹھان لی ہے دین سے عاجز ہو جائیگا اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے جنہوں نے پہلی امتوں میں سے ایسا کیا تھا، چنانچہ ارشاد ہے

قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھا بغیر علم و حرموا ما رزقھم اللہ افتراء علی اللہ قد ضلوا و ما کانوا مھتدین

"وہ لوگ ہلاکت میں مبتلا ہو گئے جنہوں نے اُن چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جو اللہ نے اُن کو عطا فرمائی تھیں گمراہ ہو گئے اور سیدھے راستہ پر چلنے والوں میں نہ رہے"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مصرا و عشر علی نیتہ وقد ھم بسیئۃ" ولم یعملھا والدلیل القاطع فیہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا التقی المسلمان بسیفیھما فالقاتل والمقتول فی النار قیل یارسول اللہ ھذا القاتل فما بال المقتول قال لانہ اراد قتل صاحبہ (متفق علیہ) و ھذا نص فی انہ صار بمجرد الارادۃ من اھل النار مع انہ قتل مظلوما فکیف یظن ان النیۃ لا یؤاخذ بھا بل کل ھم دخل تحت اختیار العبد فھو مواخذ بہ الا ان یکفر بحسنۃ و نقضہ بالندم حسنۃ" ایضاً و اما الخواطر وحدیث النفس و ھیجان الرغبۃ فکل ذلک لا یدخل تحت الاختیار فالمواخذۃ بہ تکلیف مالا یطاق و کیف لا یواخذ باعمال القلب والکبر والعجب والریاء والنفاق والحسد وجملۃ الخبائث من اعمال القلب بل السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولاً اھ ملخص (ص۳۵، ۳۶، ۳۷ ج ۳) وما ذکرہ شیخنا عن الحفنی الصق بالاحادیث و اجمع لھا فتدبر" ۱۲ ظ

اس کے بعد فسددوا وقاربوا کا یہ مطلب ہوا کہ اول تو کوشش اور ہمت سے درجۂ احتیاط کے قریب رہو اور احتیاط کا درجہ یہ ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور جو کام تمہارے ذمہ ہیں اُن سے فراغت حاصل کرکے مراتب عالیہ اور بہترین حالت کی طرف بڑھتے رہو پھر اگر کسی وقت کمزوری یا غفلت پیش آئے یا کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو سیدھے ہو جاؤ۔

یعنی (ایسی حالت سے) خلاصی پانے کے جو طریقے بتلائے گئے ہیں اور (بیماری و کمزوری اور غفلت کیوقت) جو رخصتیں تم کو دی گئی ہیں اُن کو اختیار کرکے اپنی حالت کو درست کرو (اگر گناہ ہو گیا ہو تو توبہ کرو، اگر غفلت طاری ہوئی ہو استغفار کرو اور بیماری کی حالت ہو تو سہولت پر عمل کرو) کیونکہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہیں (وہ گناہ اور غفلت کی خطا کو معاف فرمادیں گے) اس صورت میں وابشروا کا یہ مطلب ہوگا کہ (رخصتوں پر عمل کرکے) خوش رہو کہ وہ بھی تم کو نجات دلانے والی اور رضائے مولا تک پہنچانے والی اور انجام بخیر کرنیوالی ہیں (یہ نہ سمجھو کہ یہ باتیں عزیمت ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں رخصت سے حاصل نہیں ہو سکتیں) اس مضمون کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔

رب ذنب ادخل صاحبہ الجنۃ

بعض گناہ بھی انسان کو جنت میں پہنچا دیتا ہے

مطلب یہ کہ بعض دفعہ وہ گناہ توبہ کا سبب بنتا ہے اور خالص توبہ نصیب ہو جاتی ہے تو وہ جنت میں پہنچانے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کی زیادہ وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک بزرگ پر ایک دن خوف کا غلبہ ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کسی حق میں تقصیر ہوگئی تھی پھر اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت نے (ان پر) تجلی کی تو خوف کے ساتھ وسعت رحمت نے امید کو بھی ملا دیا (اور ان کی حالت درست ہوئی) اس وقت (بطور الہام کے) ان سے کہا

بھی ہیں اور امید بھی دلاتے ہیں، اور جس سے ہم مغفرت کرتے ہیں اس کو اپنے سے دور کر دیتے اور غفلت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اس تفسیر کی بناء پر واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیٔ من الدلجۃ

کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص ان اوقات میں یعنی صبح شام اور اخیر رات میں اعمال عبادت پر مواظبت کرے گا اس کو غیب سے ان اعمال کی طاعات پر مدد دی جائے گی جو اس نے اختیار کئے ہیں اور دین کے اندر جو دشواری اسکو پیش آئیگی آسان کر دی جائیگی اور ایمان میں قوت عطا کی جائے گی، اس وقت معلوم ہوگا کہ اس پر کس قدر لطف کیا گیا اور اسکے ساتھ کس قسم کے معاملہ کا ارادہ کیا گیا اور جب آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدا کا معاملہ اسکے ساتھ کیسا ہے تو یہ عبادت پر مدد کا بہت بڑا سبب بن جاتا ہے کیونکہ اس سے کام آسان ہو جاتا اور ہمتیں مقامات عالیہ کیطرف بڑھنے لگتی ہیں اور اسی وجہ سے کہ ان اوقات کا رغبت سے معمول رکھنا ان برکات کا موجب ہے بعض محققین نے فرمایا ہے کہ میں تم کو خلوت میں آئینۂ فکر پر منظر جمائے دیکھنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ اسی وقت تم پر حق واضح ہوگا اور جس پر حق واضح ہو جاتا ہے اس سے اتباع حق کی اور اہل حق بننے کی امید کی جا سکتی ہے ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں بھی حق کو حق ظاہر کر کے دکھلا دے اور اس کے اتباع کی توفیق دے (آمین)

اس مقام کے کچھ مناسب یہ حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ویل لمن غلبت آحادہ عشراتہ بڑی خرابی ہے اس شخص کی جس کی اکائیوں دہائیوں پر غالب ہوں مطلب یہ کہ گناہ نیکیوں سے زیادہ ہوں کیونکہ نیکیاں تو اللہ کے فضل سے ایک کی دس اور (بعض دفعہ) ستر اور سات سو بھی ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ جسکو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ عطا فرماتے ہیں اور گناہ ایک کا ایک ہی رہتا ہے،

مگر افسوس اس فضل عظیم کے بعد بھی انسان بیچارہ اپنی ذات سے غفلت کرتا اور کام کرنے سے گھبراتا ہے اور اپنے واسطے کوئی راستہ نہیں پاتا یا تو اس وجہ سے کہ دین میں غلو کرتا ہے یا اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتا اور برباد ہونے والوں کے ساتھ اس طرح برباد ہو جاتا ہے کہ اس کو خبر بھی نہیں ہوتی اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

حاسبوا قبل ان تحاسبوا

اپنے نفس کا خود محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کیا جائے

بعض کتابوں میں یہ قول حضرت عمرؓ سے منقول ہے حدیث مرفوع نہیں ہے) تو جو شخص اپنی ذات سے غافل ہو جائے اور اپنے ذمہ حد سے زیادہ کام لازم کرلے یا نفس کی نگہداشت میں غفلت کرنے لگے وہ ایسی ہی سخت وعید کا مستحق ہے (جو حدیث میں وارد ہے) اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں اور تمہیں اس سے محفوظ رکھے، پس عاقل کو چاہیئے کہ اپنی مدد اسی طریقہ سے کرتا رہے جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے اور میزان شریعت کو سامنے رکھ کر محاسبہ نفس سے غفلت نہ کرے اور دین میں غلو بھی نہ کرے تاکہ ان اسباب ہلاکت سے بچا رہے جن کا ابھی ذکر ہوا۔ (قوله الوجه الثالث ص ۲۶ الى قوله لئلا يهلك باحد هذه الوجوه)

ف یہاں سے اُن انگریزی خوانوں کی غلطی واضح ہوگئی جنہوں نے الدین یسر کا لفظ ہی یاد کرلیا ہے اور اس کے معنی کی خبر نہیں انہوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ دین میں نہ ارادہ کی ضرورت ہے نہ ہمت کی نہ علم کی نہ اسباب اعانت کی، اُن کو اس مقام میں غور کرنا چاہیئے کہ علماء نے اس حدیث کے کتنے مطالب بیان کئے ہیں حضرت شارح نے دین کے آسان ہونے کی بارہ تفسیریں بیان کی ہیں جن میں سے تین کا ذکر ہو چکا باقی آئندہ آئیں گی مگر ہم سب کا استیعاب نہ کریں گے کیونکہ ہمیں اس وقت صرف وہ مضامین لینا ہیں جن سے مسائل تصوف کی تائید ہوتی ہے۔

ف اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کو بھی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں فرمایا تھا اُن کے قویٰ ہم سے اچھے تھے اسلئے اُن کی شریعت میں اُن کی قوت کے موافق ہم سے زیادہ سخت احکام تھے باقی اسمیں شک نہیں کہ امت محمدیہ پر سہولت، اور آسانی بہت کی گئی ہے جیسا اوپر معلوم ہوا۔

ف سالکین طریق کو اس مقام سے معلوم ہو گیا کہ امت محمدیہ کو ہر پریشانی اور ضیق سے نکلنے کا راستہ بتادیا گیا ہے پس کسی وقت یاس اور ناامیدی کو راہ نہ دینا چاہیئے، اگر طریق میں غفلت یا خطا ہو جائے تو نجات کا راستہ معلوم کرکے رخصت پر عمل کرنا اور حالت کو درست کرلینا چاہیئے اس کے بعد شوق اور

جوش کو تازہ کر کے پھر بدستور کام میں لگنا اور پریشانی کو بھول جانا چاہیئے
وھذا مما نبہ علیہ سیدی حکیم الامت دام مجدہ مرارا ۔

۷۹۔ اللہ تعالیٰ جہل کے ساتھ کسی کی عبادت قبول نہیں فرماتے اس لئے علم حاصل کرنا ضروری ہے یا علماء سے پوچھ کر کام کرنا

ایک تفسیر حدیث کی یہ ہے کہ دین اس شخص کو آسان ہے جو اس کو اچھی طرح جان لے پہچان لے کیونکہ جو دین سے غافل ہوگا اس کو دشواری کا سامنا ہوگا اس تفسیر پر حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تحصیل علوم دین کی ترغیب دے رہے ہیں کہ کتاب اللہ اور سنت کے موافق اس کو حاصل کیا جائے اور لن یشاد الدین احد الا غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص کتاب اللہ اور سنت کے سوا محض عقل سے یا اور طریقہ سے اس کو حاصل کرنا چاہے گا دین اس پر دشوار ہوجائیگا۔ کیونکہ اس صورت میں مقام حق تک پہنچنا دشوار ہے اور مقام حقیقت کا تو احتمال ہی احتمال ہے پس یہ شخص خسارہ کی پونجی لیکر واپس ہوگا

خسر الدنیا والاخرۃ ۔ دنیا بھی برباد اور آخرت بھی

اس صورت میں سددوا وقاربوا کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنی حالت کو درست رکھو اور درستی کی صورت یہ ہے کہ دین کو اور اسکے احکام کو اچھی طرح معلوم کر کے اس کے موافق عمل اور اتباع کرو۔ اس مضمون کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم

"علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"۔

علماء محققین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ انسان پر جو عمل واجب ہے اس کا علم حاصل کرنا بھی واجب ہے کیونکہ جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کو پوری طرح ادا کرنا بدون اس کی حدود اور قواعد جانے ممکن نہیں اور جو شخص بدون علم کے عمل کرے پھر اتفاق سے اس کا عمل شریعت کے مطابق ہی ہوجائے تو علماء نے اس کے بارہ میں اختلاف کیا ہے بعض کا قول ہے

کہ اس کو عمل کا ثواب ملے گا کیونکہ اس نے حکم کو ادا کر دیا اور جو حکم کو بجا لائے وہ ثواب کا مستحق ہے
بعض کا قول ہے کہ اس کو گناہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ جہل کے ساتھ کسی کی عبادت قبول نہیں فرماتے
اور اس کو علم کے بعد ہی عمل پر پیش قدمی کرنا جائز تھی، جہل کیساتھ جائز نہ تھی، کیوں کہ
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

فَسْئَلُوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون

اگر تم کو علم نہ ہو تو اہل علم سے دریافت کرو

جب اس نے بغیر علم کے عمل پر پیش قدمی کی تو حکم کے خلاف کیا اور جو شخص حکم کی مخالفت
کرے، گنہگار ہے (اسلئے یہ شخص بھی گنہگار ہے گو اتفاق سے اس کا عمل شریعت کے موافق
ہو گیا ہے) اور بعض کا قول ہے کہ اس کو نہ ثواب ملے گا نہ عذاب ہوگا، عذاب تو اس لئے نہیں
کہ عملاً اس نے کسی ممنوع کا ارتکاب نہیں کیا اور چونکہ حکم یہ تھا کہ بدون علم کے عمل پر پیشقدمی
نہ کرے اور اس نے ایسا نہیں کیا تو ثواب کا مستحق نہ ہوگا (غرض بدون علم کے عمل کرنا
خطرہ سے خالی نہیں اگر عمل شریعت کیخلاف ہوا تو اتفاقاً گنہگار ہے اور شریعت کے موافق
ہو جب بھی فرض سے سبکدوش ہونے میں کلام ہے پس حالت کی درستی بدون تحصیل علم
کے نہیں ہو سکتی)

اور اگر کوئی تحصیل علم کیساتھ اپنی حالت کو درست کرنے سے عاجز ہو تو اس کو قریب
کا درجہ حاصل کرنا چاہیئے یعنی اہل علم سے پوچھ کر عمل کرنا چاہیئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے
فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں انما شفاء العی السوال کہ ناواقف کو پوچھنے ہی سے شفا حاصل ہوتی ہے
اس کے بعد ابشروا کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص یہ راستہ اختیار کرلے (یعنی تحصیل علم
میں مشغول ہو جائے) اسے خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کو رفعت
دیں گے اور ایسی جگہ سے درجہ پر پہنچائیں گے جہاں اس کا گمان بھی نہ تھا، بشرطیکہ خالص
اللہ کے واسطے تحصیل علم میں مشغول ہوا ہو اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔

تكفل الله برزق طالب العلم

اللہ تعالیٰ نے طالب علم کے رزق کا ذمہ لے لیا ہے

اور اللہ تعالیٰ نے تو ساری ہی مخلوق کے رزق کا ذمہ لے لیا ہے، مگر اس بات کے بیان کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ طالب علم کو بشارت اور خوشخبری سنانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر سے روزی تلاش کرنے کی مشقت و محنت دور کر دی اور رزق (کا دروازہ) بدون کسی مشقت کے اس کے لئے کھول دیا ہے کہ اب وہ اس کے پاس خود پہنچے گا اسے خود کچھ نہ کرنا پڑے گا، اسکی زیادہ وضاحت حضورؐ کے اس قول سے ہوتی ہے

اذا ابتدع بدعة في الدين كيد الدين فعليكم بمعالم الدين واطلبوا من الله الرزق قيل وما معالم الدين قال مجالس الحلال والحرام

"جس وقت دین میں بدعتیں داخل کی جانے لگیں اس وقت دین میں دھوکہ ہونے لگیگا پس تم دین کے نشانات کو لازم پکڑو اور رزق اللہ سے مانگو"

عرض کیا گیا کہ دین کے نشانات کیا ہیں فرمایا حرام وحلال بیان کئے جانے کی مجلسیں"

اس تفسیر پر حضورؐ کے ارشاد واستعينوا بالغدوة والروحة وشئ من الدلجة کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص ان اوقات (یعنی صبح و شام اور پچھلی رات کے کچھ حصہ) کو نفل عبادت سے اخلاص و صدق کے ساتھ معمور کرے گا اللہ تعالیٰ تحصیل علم میں اسکی مدد اور علم کے اندر فہم عطا فرمائیں گے اور اسکی بصیرت کو منور کر دیں گے جن لوگوں نے اخلاص و صدق کے ساتھ اس پر عمل کیا ہے، انہوں نے اس کا تجربہ کر لیا اور اس دولت کو پالیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا وان الله لمع المحسنين

جو لوگ ہمارے راستہ میں کوشش کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستوں کی
ہدایت کر دیتے ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ اخلاص کرنیوالوں کیساتھ ہے

(قولہ الوجہ الرابع الی قولہ وان اللّٰہ لمع المحسنین ــــــ)

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو بدون علم شریعت صوفی بننا چاہتے اور تصوف کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کو جان لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ جہل کے ساتھ کسی عبادت کو قبول نہیں فرماتے اس لئے بدون علم شریعت کے تصوف حاصل نہیں ہو سکتا۔

ف علم شریعت حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ قرآن و حدیث کو باقاعدہ پڑھا جائے کہ اول زبان عربی کے قواعد سیکھے جائیں پھر استاد سے قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا جائے، دوسرے یہ کہ علماء سے پوچھ کر عمل کیا جائے اور تیسری صورت جو آج کل نکالی گئی ہے کہ قرآن و حدیث کا اردو ترجمہ دیکھ کر بعض لوگ اپنے کو قرآن و حدیث کا عالم سمجھنے لگتے ہیں یہ غلط ہے کیونکہ محض ترجمہ دیکھنے سے علم حاصل نہیں ہو سکتا جیسا قانون یا طب کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر کوئی وکیل یا طبیب و ڈاکٹر نہیں بن سکتا،

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی بھی ظاہر ہو گئی جو طالبان علم دین پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ کھانے کمانے کا ذریعہ چھوڑ کر قوم کے ٹکڑوں پر پڑے رہتے ہیں اُن کو جان لینا چاہیئے کہ یہ لوگ قوم کے ٹکڑوں پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری پہ پڑے رہتے ہیں جس کا دل چاہے وہ اپنا ہاتھ روک لے اور دیکھے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو رزق دیتا ہے یا نہیں؛

ف یہاں سے طالبان علوم دین کو بھی سبق لینا چاہیئے کہ تحصیل علم میں غنیمت اس وقت مدد ہوتی ہے جبکہ صبح و شام اور رات کے پچھلے حصہ میں تھوڑی سی عبادت اپنے ذمہ لازم کر لی جائے۔ آج کل طلباء اس سے غافل ہیں اسی لئے مدارس میں قلت آمد کی عام شکایت ہے اور اسی لئے طلبہ کو نور بصیرت بھی پہلے جیسا حاصل نہیں ہوتا فعلیکم بمعالم الدین واطلبوا الرزق من اللّٰہ۔

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو گئی جو طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم میں دنیوی علوم کو بھی داخل کرتے اور ان کو بھی علم سمجھتے ہیں اُن کو جان لینا چاہیئے کہ یہ علوم اس حدیث کا ہرگز مصداق نہیں، بلکہ یہ علوم جہل کا مصداق ہیں کیونکہ جو شخص دنیا بھر سے خبردار ہو اور اپنے سے بے خبر ہو اسکو عالم نہیں کہا جاسکتا علم وہی ہے جس سے انسان کو اوّلاً اپنا علم حاصل ہو کہ مبداء و معاد اور ذات و صفات خالق کی خبر ہو اور خالق نے جو احکام اس کے متعلق کہے ہیں اُن سے خبردار ہو اور یہ بات علوم دنیا سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ اُن کا خاصہ ہے کہ جتنی اُن میں ترقی کریگا اتنا ہی اپنے سے بیخبر ہوگا جس کو شک ہو تجربہ کر کے دیکھ لے ۔

۵۰۔ متفق علیہ مسائل پر عمل کی عادت کرنا چاہیئے اور اختلافی صورت پر ضرورت میں عمل کیا جائے

ایک توجیہ حدیث کی یہ ہے کہ الدین یسر کا مطلب یہ ہو کہ جن احکام کا تم کو نص قطعی سے مکلف کیا گیا ہے جن میں تاویل کی گنجائش نہیں وہ آسان ہیں اور ایسے احکام تھوڑے ہی ہیں زیادہ تو احکام تو ایسی نصوص سے ثابت ہیں جو تاویل کا احتمال رکھتی ہیں اور جب تاویل کو قبول کرنیوالی نصوص زیادہ ہیں تو یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے اپنے بندوں پر وسعت اور سہولت ہے، (اس کے بعد شارح نے چند مسائل بطور مثال کے بیان فرمائے ہیں جو نصوص محتملہ سے ثابت ہیں اور مجتہدین نے اُن کی تاویل میں اختلاف کیا ہے) اور احکام میں جو علماء کا اختلاف ہے اس کا سبب یہی ہے کہ جس آیت یا حدیث سے وہ ثابت ہیں اسمیں مختلف وجوہ کا احتمال ہے اور یہ اختلاف امت کیلئے وسعت و رحمت ہے، (کہ ضرورت کیوقت اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں) ایک بڑے بزرگ جن سے میں ملا ہوں فرماتے تھے کہ مشہور قول کے سوا کسی قول پر عمل کرنا یا فتویٰ دینا جائز نہیں، اختلاف علماء سے اس وقت فائدہ اٹھانا چاہیئے جب کسی ایسی مہم میں گرفتار ہو جائے جس کی تلافی مشہور قول سے نہ ہوسکے اس وقت کسی

ایک قول کیموافق اس مہم کو حل کیا جائے کیونکہ اجماع کی مخالفت (اور حرام قطعی کے ارتکاب) سے یہ صورت بہتر ہے اور واللہ ان بزرگ نے یہ بات بہت اچھی کہی کیونکہ اس طریقہ سے تمام تاویلات اور اختلافات پر عمل ہو سکتا ہے کہ اول درجہ کمال کو اختیار کیا جائے (جسمیں کسی کا اختلاف نہیں) اسی کا نام قوت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف وفی کل خیر

کہ مؤمن قوی مومن ضعیف سے افضل ہے اور یوں سب ہی اچھے ہیں، اور اگر (کسی وقت) درجۂ کمال پر عمل دشوار ہو تو اختلافی صورت کو لیلے اور سہولت پر عمل کرے، اس طرح محرمات کے اور اس کے درمیان بڑی روک ہو جائے گی، کیونکہ کسی وقت درجۂ کمال پر عمل دشوار ہو تو اس کے سامنے ایسی صورت بھی ہوگی جس کی طرف رجوع کر سکے اور اجماع کی مخالفت سے بچ سکے اور جو شخص پہلے ہی رخصتوں پر عمل کرنے کا عادی ہوگا اگر اس کو کسی وقت دشواری کا سامنا ہوا تو وہ حرام (اور ناجائز) کے ارتکاب سے نہ بچ سکے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محفوظ چراگاہ یہ محرمات ہیں (جن سے بندوں کو منع کیا گیا ہے) اور جو شخص محفوظ چراگاہ کے آس پاس چکر لگائے گا وہ ایک دن اس کے اندر بھی پہنچ جائیگا۔ اس لئے انسان کو محرمات سے دور ہی رہنا چاہیئے جس کی صورت یہی ہے کہ بدون مجبوری کی رخصت پر عمل نہ کرے)

اس تفسیر پر لن یشاد الدین احد الا غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص ہر مسئلہ میں اجماع (اور اتفاق) ہی پر عمل کرنا چاہے گا دین سے گھبرا جائے گا کیونکہ زیادہ مسائل ایسے ملیں گے جن پر اجماع منعقد نہیں ہوا اور سددوا وقاربوا میں سداد کے دو معنی ہوں گے ایک یہ کہ حضرات صحابہ اور قرون اول کے مسلمانوں کا طریق عمل اختیار کر کے حالت کو درست کیا جائے، کیونکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم

تمام آدمیوں سے بہتر میرے زمانہ کے آدمی ہیں پھر وہ جو اُن کے بعد ہیں پھر وہ جو ان کے بعد ہیں۔

دوسرے یہ کہ اختلافی مسائل میں دلیل سے جو قول قوی اور راجح ہو اس کو اختیار کیا جائے اور سختی اور آسانی کی دونوں جانبوں میں شاذ اور ضعیف اقوال کیطرف التفات نہ کیا جائے، بلکہ درمیانی قول کو لینا چاہیئے جیسا ایک خلیفہ نے (جو غالباً خلیفہ منصور عباسی ہیں) امام مالک سے جبکہ انہوں نے کتاب موطا لکھنے کا ارادہ کیا فرمایا تھا کہ "عبداللہ بن عمرؓ کی تشدید اور عبداللہ بن عباسؓ کی رخصتوں کو چھوڑ دو اسکے بعد جو چاہو لکھو" امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ بات سنکر میں خلیفہ کے پاس سے فقیہ بن کر نکلا، اور قریب قریب اسکے یہ معنی ہوں گے کہ اگر کسی وقت بوجہ عذر کے قوی اور راجح قول پر یا قرون اول کے طریقہ پر عمل نہ کر سکے تو مختلف اقوال میں سے کسی قول پر عمل کرے نہ تو شدت کے پہلو پر اصرار کرے، نہ بلا عذر کی رخصتوں پر عمل کی عادت کرے"

اس مضمون کی تائید کیلئے یہ روایت کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر ملی کہ ایک شخص مدینہ میں دین کی مشکل باتوں اور مشکل حدیثوں کی تفسیر معلوم کرنے آیا ہے آپنے اس کو بلایا اور پوچھا تو کون ہے؟ اس نے نام بتلایا تو فرمایا اور میرا نام عمر بن خطاب ہے یہ کہہ کر کھجور کی ایک قمچی ہاتھ میں لی اور اس کے سر پر مارنے لگے اتنا مارا کہ سر سے خون بہنے لگا اور برابر یہ فرماتے رہے کہ میں عمر بن خطاب ہوں، اُس نے عرض کیا اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اب میرے سر میں سے وہ بات نکل گئی ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس شخص کو سزا دینا یہ صرف اسلئے تھا کہ جو کوئی اس قسم کی باتوں کو تلاش کرتا ہے وہ عموماً دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا تو شدت کی

جانب اختیار کر لیتا ہے تو دین سے گھبرا جاتا ہے یا رخصتوں کا پہلو لے لیتا ہے تو یہ محرمات میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور قرب کا راستہ چھوٹ جاتا ہے اس تفسیر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص یہ طریقہ (یعنی حضرات صحابہ اور قرون اول کا طرز عمل) اختیار کرے اس کو خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دشواری کے وقت آسانی اور تنگی کے وقت فراخی عطا فرمائیں گے، اسکی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ط

"اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے دشواری سے نکلنے کا راستہ بنا دیں گے اور ایسی جگہ سے رزق دیں گے جہاں اس کا گمان بھی نہ جا سکتا تھا"

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی تائید کرتا ہے

ومن یتق اللہ یکفر عنہ سیئاتہ ویعظم لہ اجرا ہ

اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں سے درگذر فرمائینگے اور اس کو بڑا اجر دیں گے۔

اور اس بشارت سے زیادہ دوسری بشارت یہ حاصل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو متقین میں داخل کر دیا اور اس بشارت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہی بعض لوگ دنیوی تنگی پیش آنے کے وقت مکروہات و محرمات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یوں کہنے لگتے ہیں کہ ہم ان مکروہات و محرمات کے ارتکاب پر مجبور ہیں (بدون اس کے کام نہیں چل سکتا) کیونکہ وہ اپنے نزدیک کوئی اور ذریعہ (معاش کا) نہیں پاتے سوا اس ذریعہ کے جس میں لگے ہوتے ہیں۔

معصیت سے رزق تلاش کرنا قرب قیامت کی علامت ہے

اور یہ باتیں قرب قیامت کا پتہ دیتی

ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من اشراط الساعۃ طلب الرزق بالمعاصی

"قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گناہوں کے ذریعہ سے
رزق تلاش کیا جائے"

اللہ تعالیٰ ہمکو اس اندھے پن اور گمراہی سے محفوظ رکھے۔

بھلا اس پورے اندھے پن اور لازوال بہرے پن کو تو دیکھو گویا ان لوگوں نے کبھی اس بشارت کو سنا اور سمجھا ہی نہیں اور شاید انہوں نے قرآن کو بھی نہیں دیکھا اور نہ اُن دو آیتوں کو سنا جو اوپر ذکر کی گئی ہیں اور شاید انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نہیں سنا

لا ینال ما عند اللہ الا بطاعۃ اللہ

کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے اس کو اللہ کی اطاعت ہی سے لیا جا سکتا ہے (یعنی مسلمان کو اللہ کی نعمتیں طاعت ہی سے مل سکتی ہیں معصیت سے نہیں مل سکتیں) یہ سب نصوص اس بات کو بتلاتی ہیں کہ جس نے بدون طاعت کے رزق کو تلاش کیا اس نے بے طریقے تلاش کیا اور جو کسی چیز کو بے طریقے تلاش کرے گا پریشانی میں مبتلا ہوگا اور خسارہ کی پونجی لیکر واپس ہوگا۔

اب ہم سلف کے بعض واقعات بطور نمونہ کے بیان کرتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے پروردگار کی طاعت سے رزق کو تلاش کرتے تھے تاکہ مقصود پر تنبیہ ہوجائے،
منجملہ ان واقعات کے ایک یہ ہے کہ ایک بزرگ عیال دار تھے کسی وقت ان کو تنگی پیش آئی اور کچھ میسر نہ ہوا تو دل میں خیال آیا کہ اللہ کی طاعت میں لگنا چاہیئے یہی رزق کا بڑا وسیلہ ہے چنانچہ ایک ویران مسجد میں پہنچے اس کی صفائی کی اور وہیں عبادت میں مشغول ہوگئے، صبح کو گھر سے نکلتے اور گھر والوں سے یہ کہہ جاتے کہ روزی کی تلاش میں جا رہا ہوں شام کو واپس آتے اور گھر والے پوچھتے کہ مزدوری کہاں ہے تو ان کو یہ جواب دیتے کہ جس کا میں نے کام کیا ہے وہ بڑا سخی ہے مجھے اس سے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے

خود ہی دے دیگا، اسیطرح کئی دن گذر گئے، ایک رات عادت کے موافق گھر آ رہے تھے کہ قریب پہنچ کر عمدہ عمدہ کھانوں کی خوشبو آئی ان کو تعجب ہوا کیونکہ اپنے ہمسایوں کی حالت معلوم تھی کہ وہ ایسے قیمتی کھانے نہیں پکا سکتے جب گھر کے اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہیں سے خوشبو مہک رہی ہے، اب تو اور زیادہ تعجب ہوا، پھر دیکھا تو گھر میں کھانا اور سالن کے علاوہ کپڑا اور روپیہ بھی (بہت کچھ) ہے اور گھر والے بھی عمدہ کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اُن سے دریافت کیا کہ یہ سامان کہاں سے آیا؟ تو کہا جس کریم کی آپ خدمت کرتے ہیں اس نے ہی یہ سب سامان بھیجا ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں اور یہ بھی کہلا کر بھیجا ہے کہ خدمت موقوف نہ کرنا، (بدستور کام میں لگے رہنا) کہا بہت اچھا، تو دیکھو جو شخص طریقے سے کسی چیز کو تلاش کرتا ہے اس کی کوشش کس طرح کامیاب ہوتی اور وہ کیونکر اپنی مراد کو پہنچتا ہے۔

اس تفسیر پر واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیئ من الدلجۃ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات و توجہات) کا استقبال کرو، اس وقت اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا لطف بہت زیادہ اور احسان بہت عام پاؤ گے اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے

اذا سالت فاسأل اللہ

جب مانگو اللہ ہی سے مانگو

نیز آپ کا ارشاد ہے۔

تعرضوا للنفحات اللہ — اللہ تعالیٰ کی تجلیات و توجہات کا استقبال کرتے رہو

نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبانی (حدیث قدسی میں) فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں آسمان دنیا پر تجلی فرماتے اور یوں ارشاد فرماتے ہیں، کوئی توبہ کرنے والا ہے کہ میں اس پر نظر عنایت کروں؟ کوئی مغفرت چاہنے والا ہے کہ میں اسکی مغفرت کروں؟ کوئی مانگنے والا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود یہ فرمائیں اور اس وقت کوئی شخص مغفرت

کی درخواست کرے یا توبہ کرے یا کچھ مانگے اور محروم رہ جائے، اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے پوری امید رکھتے ہوئے تو یہ محال ہے؟

ہم چاہتے ہیں کہ اس کے متعلق بھی سلف کے کچھ واقعات پر اشارہ کر دیں تاکہ اس سے ہمارے مقصود پر روشنی پڑ جائے، منجملہ ان کے یہ ہے کہ ایک ظالم مفسد کسی اسلامی قلعہ پر پہنچا اور اس کے باشندوں کو اتنا پریشان کیا کہ انہوں نے اسے کچھ رشوت دینے کا ارادہ کر لیا، مگر بعض لوگوں نے کہا کہ جب تک فلاں شخص سے جو ان کے نزدیک بزرگ اور سیدھے راستہ پر جما ہوا تھا مشورہ نہ کر لیا جائے اس وقت تک کچھ نہ دینا چاہیے۔ چنانچہ اس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا تم کو یہ بات کسی طرح جائز نہیں کہ اپنی گردنوں کا مالک ایسے شخص کو بناؤ جو شریعت کی مخالفت کرتا اور ناحق خونریزی کرتا ہے، یہ بات اس ظالم تک بھی پہنچ گئی تو اس نے دھمکی دیکر کہلا کر بھیجا کہ کیا تم کو میری پکڑ اور میری جوانی کی خبر نہیں؟ شیخ نے جواب میں کہلا بھیجا کیا تم کو میرے بڑھاپے اور رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے اور اخیر رات میں اس سے دعا کرنے کی خبر نہیں؟

اس جواب کو سنکر ظالم پر رعب طاری ہو گیا اور اس وقت ظلم سے باز آ گیا ان اوقات کی بزرگی بڑھانے اور ان پر محافظت کی مزید تاکید کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوٰة الدنيا

اپنے نفس کو ان لوگوں کی صحبت میں جمائے رکھو جو اپنے پروردگار کو صبح و شام یاد کرتے ہیں اسکی رضا کے طالب ہیں اور (اے مخاطب) تیری آنکھیں حیات دنیا کی رونق (و زیبائش) کی طلب میں ان سے نہ ہٹنے پائیں (یعنی دنیا کی زینت پر فریفتہ ہو کر اہل اللہ سے منہ موڑ کر اہل دنیا کیساتھ نہ ہو جانا) تو جو کوئی

ان اوقات کا طلبگار اور ان کا نگران رہیگا وہ (دین کے) جس راستہ پر بھی چل رہا ہوگا (خواہ علم ظاہر ہو یا سلوک باطن) اس میں اس کی مدد کی جائے گی، پھر بشارت پر مزید بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

والذین اھتدوا زادھم ھدی وآتاھم تقواھم
اور جو لوگ ہدایت پاگئے اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت میں ترقی دیتے اور (انکی لیاقت کے موافق) کمال دین عطا فرمادیتے ہیں (تقویٰ کمال دین ہی کا نام ہے)

اے سبحان اللہ! یہ کیسی بشارت ہے جس سے کام کرنیوالوں معرفت والوں کے دل خوش ہوگئے، توفیق والوں کی روحیں تازہ ہوگئیں، ڈرنے والوں کا غم دور ہو گیا اور سبقت کرنیوالوں کے قدم آگے بڑھنے لگے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے فضل سے ان نعمتوں کا ایک حصہ اپنے فضل کے مناسب عطا فرمائیں (آمین)

قولہ الوجہ الخامس الی قولہ منحنا اللہ منہا من فضلہ مایلیق بفضلہ۔

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو دنیوی ترقی کیلئے کفار کے طریقے پر چلنا چاہتے ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمان کو معصیت سے ترقی نہیں ہوسکتی اس کو اطاعت اور اتباع شریعت ہی سے ترقی نصیب ہوسکتی ہے، سود اور رشوت وغیرہ سے مسلمان کو فلاح نہیں ہوسکتی۔ ان کو اپنی ترقی کیلئے شریعت کے وہ اصول اختیار کرنا چاہئیں جن کو انہوں نے چھوڑ دیا تو کمزور ہوگئے اور غیروں نے اختیار کیا تو وہ قوی ہوگئے۔ یعنی باہمی اتحاد واتفاق اور پابندی وقت، جفاکشی، محنت تجارت، زراعت، بیکاری سے نفرت، صنعت وحرفت سے رغبت، باہمی اخلاص و محبت وغیرہ اسکے ساتھ فرائض الٰہی کی پابندی خدا کی اطاعت کو بھی شامل کرکے دیکھیں کہ ان کو دوسری قوموں سے زیادہ ترقی ہوتی ہے یا نہیں اسکے سوا جو طریقے بھی ترقی کے

ہیں اُن سے کفار کو ترقی ہو سکتی ہے مسلمانوں کو نہیں ہو سکتی۔

۱۵۔ تسلیم و انقیاد سے دین آسان ہو جاتا ہے

ایک تفسیر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الدین یسر کا یہ مطلب ہو کہ تم سے جس چیز کا مطالبہ ہے یعنی حکم الٰہی کے سامنے گردن جھکا دینا اور مان لینا وہ آسان ہے (گو عمل دشوار ہو) اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ جس وقت آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ نازل ہوئی (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہو خواہ تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے) تو (یہ آیت صحابہ پر گراں گذری (کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ غیر اختیاری وسوسوں پر بھی مواخذہ ہو گا جن سے بچنا آسان نہیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کی طرح نہ بنو (جنہوں نے کہا تھا سمعنا وعصینا کہ ہم نے حکم خداوندی کو سُن تو لیا مگر مانیں گے نہیں) بلکہ یوں کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ انہوں نے نازل فرمایا اس کو مان لیا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی

امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمؤمنون کل
آمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد
من رسلہ وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر
لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا

(جسمیں حضرات صحابہ کی اطاعت وانقیاد و تسلیم کی تعریف کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین اللہ پر اور اس کے نازل کردہ حکم پر ایمان لائے سب کے سب اللہ پر اس کے فرشتوں پر اسکی کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان لائے کہ ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور یوں بھی کہا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا، اے اللہ ہمارے گناہ معاف فرمادے آپ ہی کی طرف ٹھکانہ ہے اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں فرماتے،، اس میں صحابہؓ کا

اطمینان کردیا گیا کہ غیر اختیاری وساوس پر مؤاخذہ نہ ہوگا) تو صحابہ کو اتنی بڑی کامیابی انقیاد و تسلیم ہی کی وجہ سے نصیب ہوئی کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم کو مان لیا اور اسکے سامنے گردن جھکادی، اور انقیاد و تسلیم بلاشک آسان ہے کیونکہ اس کا تعلق صرف دل سے ہے کچھ ہاتھ پیر چلانا نہیں پڑتے :

اس تفسیر پر لن یشاد الدین احد الا غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص تقدیر پر راضی نہ ہو اور جو کچھ اس پر فرض کیا گیا ہے اس کو نہ مانے اس کے آگے گردن نہ جھکائے اور جن باتوں کا اُن کو مکلف کیا گیا ہے ان کو مشقت اور تکلیف سمجھے تو اس نے دین کو دشوار سمجھا اور جو دین کو دشوار سمجھے گا وہ دین سے گھبرا جائے گا جیسا بنی اسرائیل کا واقعہ ہے کہ جب اُن کو جہاد کا حکم دیا گیا انکار کر بیٹھے اور اپنے نبی سے صاف کہہ دیا اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون کہ آپ اور آپ کے پروردگار چلے جائیں اور دونوں خود ہی جہاد کرلیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، جب وہ حکم الٰہی پر رضا نہ ہوئے اور اسکے آگے گردن نہ جھکائی تو اُن پر سختی کی گئی اور وادی تیہ میں چالیس سال تک چلتے رہے یہاں تک کہ بڑی عمر والے سب فنا ہوگئے اور چھوٹی عمر والے بڑے ہوگئے (تو اُن کو دولت جہاد سے حصہ ملا) اسکی زیادہ وضاحت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کرتا ہے۔

ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ ط واولئک ھم المھتدون ۵

(اور ہم تم کو ضرور ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور جان و مال اور پھلوں کے نقصان سے اور بشارت دیدو اُن صبر کرنیوالوں کو جن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کے پاس جانیوالے ہیں ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایتیں نازل ہونگی ہیں اور رحمت بھی اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں،)

تو جس کو تقدیر پر یقین اور اسکے ظہور کے وقت صبر نصیب ہو گیا اس کا اجر بڑھ جاتا ہے اور اس کیساتھ لطف کا معاملہ کیا جاتا ہے اور اگر دل تنگ اور ناراض ہوا تو گنہگار ہوگا اور مقدر تو ٹل ہی نہیں سکتا۔ تقدیر میں جو کچھ ہے پورا ہو کر رہے گا خواہ کوئی راضی ہو یا ناراض ہو۔ اگر راضی رہا تو ثواب ملیگا جو مصیبت کا نعم البدل ہے ناراض ہوا تو اس سے بھی گیا اور مصیبت کی مصیبت سر رہی اسی واسطے حدیث میں آیا ہے فانما المحروم من حرم الثواب کہ پورا بے نصیب تو وہی ہے جو ثواب سے محروم رہ جائے، اس نے دین کو دشوار سمجھا تو دین سے گھبرا گیا۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اس تفسیر پر سددوا وقاربوا میں سددوا کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے آپ کو تسلیم وانقیاد پر جما کر حالت درست کرو اور قریب رہنے کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس مقام پر نہ پہنچ سکو تو اس کے قریب ہی رہو کیونکہ قریب کا حکم بھی وہی ہے جو اصل کا حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ابشروا میں بشارت کے یہ معنی ہوں گے کہ جو شخص یہ طریقہ اختیار کرے اور اپنے دل کو تسلیم وانقیاد پر جمائے اسکو ان نعمتوں کی بشارت حاصل کرنا چاہیئے جو آیت مذکورہ کے بقیہ حصہ میں مذکور ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملته على الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا على القوم الكفرين ٥

اے ہمارے پروردگار ہم سے بھول چوک پر مواخذہ نہ کیجئے اور ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ لادیئے جو ہم سے پہلوں پر لادا گیا اے ہمارے پروردگار اور ہمارے اوپر ایسی مشقت بھی نہ ڈالئے جسکی ہم کو طاقت نہیں اور ہم سے درگذر کیجئے ہماری مغفرت کر دیجئے ہمارا اوپر رحم کیجئے آپ ہی ہمارے مولیٰ اور کارساز ہیں پس کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کیجئے

یعنی جو تسلیم وانقیاد سے کام لیگا اس کو دین میں اصلاً دشواری پیش نہ آئیگی دین اس کے حق میں پہلوں ہلکا ہو جائے گا اور عفو ومغفرت ورحمت ونصرت سے نوازا جائیگا۔ اور اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد واستعینوا بالغدوة والروحة وشئ من الدلجة

میں استعانت کے معنی یہ ہونگے کہ جس شخص کو ان چیزوں پر عمل دشوار معلوم ہو جن کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کو رب جلیل کے دروازہ پر ان خاص اوقات میں کھڑا ہونا چاہئے جو شخص اس پر مداومت کریگا اسکو غیب سے نفس کے مقابلہ میں مدد پہنچا ئیگی اور کامیابی اور فتحمندی نصیب ہو گی اس استعانت کو برباد کرنے کی وجہ سے ہی بعض لوگوں پر اس کا نفس غالب ہو گیا ہے، اسی لئے اُن کو انقیاد و تسلیم نصیب نہیں ہوتا جس کا اُن سے مطالبہ کیا گیا ہے، وہ اپنے نفس کے ہاتھوں میں دیدیئے گئے ہیں (جسطرح وہ نچاتا ہے ناچتے ہیں) کیونکہ انہوں نے اس طریقہ سے اللہ کی مدد حاصل نہیں کی جو ان کیواسطے مقرر کیا گیا تھا اور یہ مضمون ایسا ہی ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ایک دفعہ فتنوں سے خبردار کیا تھا تو انہوں نے دریافت کیا کہ اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اس وقت ایمان اور اعمال صالحہ کی پناہ لینا چاہئیے اور فتنے تو آجکل بہت بڑھ گئے اور بڑھتے جارہے ہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہوں نے صحیح علاج اختیار کیا ہو جو ان سے نجات پانے میں معین تھا، تو لامحالہ اس کا انجام یہی ہونا تھا کہ ہلاک ہونے والے زیادہ ہیں اور نجات پانے والے بہت کم کیونکہ جس بات کا حکم دیا گیا تھا اس پر عمل کم ہو رہا ہے۔ پس اے مسکین! عمل میں جلدی کر اور موت کے آنے اور مصیبتوں کے گھیر لینے سے پہلے سستی کو چھوڑ دے ورنہ تجھ سے کہا جائے گا کہ تو نے تو گرمی کے زمانہ میں دودھ کو ضائع کر دیا ہے (اب جاڑوں میں کیا چاہتا ہے؟

(قولہ الوجہ السادس الی قولہ فی الصیف ضیعت اللبن)

ف جانوروں کا دودھ گرمی میں بڑھتا اور سردی میں کم ہو جاتا ہے اب اگر کسی نے گرمی کے زمانہ میں جانور کو بھوکا مارا اور دودھ سے محروم رہا تو سردی کے زمانہ میں اسکو ہرگز دودھ کی امید نہ رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح زندگی میں انسان کیلئے عمل کرنے اور ثواب حاصل کرنے کا موقعہ ہے۔ موت کے بعد عمل نہیں ہو سکتا جس نے زندگی کو سستی میں برباد کر دیا اس کو موت کے بعد عمل اور ثواب کی امید نہ رکھنا چاہئیے۔

ف اس مقام سے اُن لوگوں کو سبق لینا چاہئیے جو آج کل مسلمانوں کی کمزوری کو دیکھ کر فکرمند ہیں اور ترقی کے وسائل تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں مگر اس صحیح علاج کو

اختیار نہیں کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے، دوسری قوموں سے مدد کے طالب ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل نہیں کرتے، حالانکہ مسلمانوں کو ہمیشہ اللہ کی مدد سے کامیابی ہوتی ہے، غیروں کی مدد سے کامیابی نہیں ہوئی اور اگر کبھی قرن اول کے مسلمانوں نے غیروں کو اپنے ساتھ لیا ہے تو اپنا ماتحت اور تابع بنا کر ساتھ لیا ہے نہ کہ مساوی یا متبوع بنا کر جیسا آج کل ہو رہا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار

ف جو لوگ دین کو دشوار سمجھتے ہیں اُن کو جان لینا چاہیئے کہ اس دشواری کا سبب صرف یہ ہے کہ اُن کو تسلیم و انقیاد حاصل نہیں وہ اللہ و رسول کے حکم کے آگے گردن نہیں جھکاتے اور عقائد اسلامیہ کو دل سے نہیں مانتے ان پر یقین نہیں رکھتے بلکہ شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں، اگر وہ اذعان و تسلیم و انقیاد سے کام لیتے اور شکوک و شبہات کو دل سے نکال کر ان خاص اوقات میں جن کا حدیث میں ذکر ہے کچھ کام کرتے تو دین اُن کے لئے پھول سا ہلکا ہو جاتا اور اصلاً دشواری پیش نہ آتی۔

۵۲۔ احکام الٰہی کی تعمیل میں جلدی کرو، تشدد اور سہولت کیطرف التفات نہ کرو

ایک تفسیر یہ ہے کہ دین کے آسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تشدد اور رخصت دونوں میں سے کسی میں غلو نہ کیا جائے بلکہ (اگر کسی حدیث یا قرآن کی آیت میں مختلف توجیہات ہوں تو جو ظاہر اور قریب ہو اسکو اختیار کر کے عمل میں جلدی کرے ادھر ادھر التفات نہ کرے اور جب شریعت کی مراد یہ ہے کہ امتثالِ امر میں جلدی کی جائے ادھر ادھر التفات نہ کیا جائے تو وہ بلا شک آسان ہے (دشواری اسی وقت پیش آتی ہے جب تعمق اور غلو کیا جائے) اس صورت میں ولن یشاد الدین احد الا غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کوئی اپنے اوپر سختی کریگا یا تو تعمق اور تشدد کر کے یا دین میں لا پرواہی کر کے اللہ تعالیٰ اس کے اوپر سختی کریں گے، جیسا بنی اسرائیل کی حکایت ہے کہ اُن کو ایک گائے کے ذبح کا حکم دیا گیا تھا اگر وہ اس حکم کی تعمیل میں جلدی کرتے اور کوئی سی ایک گائے ذبح کر دیتے اسکی کیفیت وغیرہ دریافت نہ کرتے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی مگر انہوں نے اپنے اوپر

سختی کی اسکی صفت اور کیفیت اور رنگ دریافت کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ کیطرف سے بھی اُن پر سختی
کی گئی (کہ اسکی عمر اور رنگ اور حالت وکیفیت کی تعیین کردی گئی پھر جو اسکو تلاش کیا گیا
تو مدت تک ویسی گائے نہ ملی اور ملی بھی تو ایک آدمی کے پاس ایک ہی ملی، خریدنے کی گفتگو کی گئی
تو اس نے انکار کردیا بہت اصرار کیا تو بیچنے پر راضی ہوا۔ اور کھال بھر کر سونا اور چاندی دیکر
اس گائے کو خرید اگیا ایک روایت میں ہے کہ دس مرتبہ کھال بھر کر سونا چاندی دیا گیا غرض
انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ کی طرف سے بھی سختی کی گئی، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
سلم کو زیادہ سوالات سے نفرت تھی اور بہت سوال کرنیوالے کی مذمت فرماتے تھے کیونکہ اس
صورت میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے سختی ہونے کا اندیشہ تھا۔ اسی وجہ سے حضرات صحابہ رضی اللہ
عنہم اس بات کی تمنا کیا کرتے تھے کہ حضور کے پاس کوئی اجنبی مسافر آئے اور سوال کرے اور ہم
جواب سنیں (حضور کا)، کیونکہ اجنبی مسافر کے سوالات پر غیب سے سختی نہ ہوتی تھی، اجنبی آدمی
آداب سے ناواقف اور احکام سے بیخبر ہوتا ہے اسکے زیادہ سوالات سے حضور کو گرانی نہ ہوتی تھی
تو اللہ تعالیٰ کیطرف سے بھی سختی کا معاملہ نہ ہوتا تھا) اور یہ اندیشہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
حیات ہی تک تھا کیونکہ اسوقت نئے نئے احکام رات دن آتے رہتے تھے جب حضور صلعم
پاک صاف اپنے اللہ کے پاس پہنچ گئے یہ اندیشہ جاتا رہا (کیونکہ اب نیا حکم نہیں آ
سکتا دین مکمل ہوچکا تو ہماری تشدید پر اللہ تعالیٰ کیطرف سے سختی کا اندیشہ نہیں رہا
مگر بعض لوگوں میں اس کا کچھ نمونہ باقی رہ گیا ہے اور وہ بھی بہت ہے، چنانچہ اسی قسم
کا ایک شعبہ وسوسہ اور وہم ہے جو بعض لوگوں کو کسی عبادت میں اتنا پیش آتا ہے
کہ حکم شریعت میں خلل ڈالنے لگتے ہیں ایسا وہمی آدمی عبادت میں گمراہی پر جما رہتا ہے اور
سمجھتا یہ ہے کہ میں اچھا کام کر رہا ہوں، حضرت یمن بن رزق رحمہ اللہ نے جو دونوں
طریقوں کے امام ہیں فرمایا ہے کہ شیطان جب کسی کے عقیدہ میں شبہ اور شک ڈالنے
سے عاجز ہوجاتا ہے تو اسکو گناہوں کی ترغیب دیتا ہے اگر اسمیں کامیاب ہوگیا تو
مقصود حاصل ہوگیا اگر اس پر قادر نہ ہوا تو عبادت میں اسقدر وسوسہ اور وہم ڈالنا
شروع کرتا ہے کہ شریعت کے احکام میں خلل پڑنے لگے اگر اسمیں کامیاب ہوگیا تو

اسی قناعت پر کر کے چھوڑ دیتا اور اسکو عبادت کی رغبت دلانا اور بلند آواز سے
بلاتا ہے، اسکے بعد اگر کوئی دوسرا شریر شیطان اسے بہکانے آتا ہے اس سے کہہ دیتا
ہے کہ تو اسکے پیچھے نہ پڑ، یہ میرا ہی کام کر رہا ہے اور میری منشا کیمطابق گمراہی میں چل رہا
ہے تو دیکھو اس شخص نے دین کو سختی کیساتھ لیا تو دین سے عاجز ہو گیا اور خسارہ کی
پونجی لیکر واپس ہوا اس اندھے پن اور گمراہی سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اس صورت
میں فسددوا وقاربوا کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنی حالت کو کمال اتباع سنت کے ساتھ
درست کرو اور اگر بدرجۂ کمال اتباع سنت نہ ہوسکے تو اسکے قریب ہی رہو اور یہ
بھی نہ ہوسکے تو مجاہدہ کر کے نفس کو اس پہ آمادہ کرو، وماذا بعد الحق الا الضلال
اور حق کے بعد تو گمراہی کے سوا کچھ نہیں (جو شخص مجاہدہ کر کے سنت کے قریب رہنے کی بھی
کوشش نہ کرے وہ کسی طرح گمراہی سے نہیں بچ سکتا) اسکے بعد وابشروا کا مطلب یہ
ہے کہ اگر تم نے اس حکم پر عمل کر لیا تو خوش رہو اور بشارت حاصل کرو کہ مجاہدہ کیساتھ
ہی خیر اور ہدایت کے راستے تمہارے آسان ہو جائیں گے۔ اس مضمون کی تائید اللہ تعالیٰ کے
اس ارشاد سے ہوتی ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا جو لوگ
ہمارے واسطے مجاہدہ کرتے ہیں ہم انکو اپنے راستوں پر لگا دیتے ہیں اور واستعینوا
بالغدوة والروحة وشیٔ من الدلجة کا مطلب ہے کہ ان اوقات میں دروازہ
کھٹکھٹانے کی پابندی کرو اور مصائب و فتن نازل ہونے کیوقت اس کا خیال رکھو کیونکہ
نجات کا راستہ یہی ہے اسی راستہ سے عالم خفیات (باری تعالیٰ) کی مدد تمہاری دستگیری
کریگی، اسکی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے من
فتح له فی الدعاء فقد فتحت له ابواب الخیرات جس کا دل دعا میں کھل گیا
اس کے لئے خیرات کے دروازے کھل جاتے ہیں، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
اللہ تعالیٰ کیطرف سے فرمایا ہے من شغله ذکری عن مسئلتی اعطیته
افضل ما اعطی السائلین جو شخص میری یاد میں مانگنے اور دعا کرنے سے رہ جائے
(یعنی یاد الٰہی میں ایسا مشغول ہو کر دعا کی مہلت نہ ملے) میں اس کو مانگنے والوں سے

بھی زیادہ دیتا ہوں، (قولہ الوجہ السابع الیٰ قولہ افضل ما اعطی السائلین)

۵۳۔ توقع اور تجویز کم کرنے سے دین میں مدد ملتی ہے

ایک تفسیر یہ ہے کہ دین کے آسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ کیلئے توقع اور تجویز کم کردو تو دین آسان ہے کیونکہ توقع اور تجویز کم کرنا بھی اُن اسباب میں سے ہے جو دین میں معین و مددگار ہیں اسکے ذریعے دین آسان ہو جاتا ہے، تفصیل اسکی یہ ہے کہ جب توقع اور تجویز کم کی جاتی ہے تو حرص کم ہو جاتی ہے اور زہد آسان ہو جاتا ہے اور عمل ہلکا ہو جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک حدیث میں) اس مضمون کو صاف صاف بیان فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے

اذا اصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء واذا امسيت فلا تحدث نفسك بالصباح

کہ جب صبح ہو تو اپنے دل سے شام کے متعلق باتیں نہ کرو اور جب شام ہو تو اپنے دل سے صبح کے متعلق باتیں نہ کرو (کہ ایسا کریں گے اور یوں کریں گے کہ اس توقع اور تجویز ہی سے حرص کو ترقی ہوتی اور دل پریشان ہوتا اور دین پر عمل دشوار ہو جاتا ہے) روایت ہے کہ (حضرت سیدنا) عیسیٰ علیہ (وعلیٰ نبینا) الصلوٰۃ والسلام نے اثنائے سیاحت میں ایک بڈھے کو باغ کی خدمت کرتے ہوئے دیکھا۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو (اس کی حالت پر) تعجب ہوا کہ بڑھاپا آگیا اور کمائی کی پھر بھی اتنی حرص ہے، آپ کو یہ تعجب ہی ہوا تھا کہ اس نے فوراً پھاوڑا ہاتھ سے رکھدیا اور عبادت میں مشغول ہو کر مختلف قسم کے نیک کاموں میں لگ گیا، ایک مدت تک ایسی حالت پر رہا اسکے بعد پھر باغ کی خدمت میں پہلے کیطرح مشغول ہو گیا (حضرت) عیسیٰ علیہ السلام کو اس حالت پر پہلے سے بھی زیادہ تعجب ہوا تو بڈھے سے دریافت فرمایا کہ تو نے باغ کی خدمت کیوں چھوڑ دی تھی اور اب دوبارہ شروع کیوں کر دی؟ اس نے کہا پہلے تو میں اس لئے خدمت کر رہا تھا کہ دنیا میں طبعی طور پر انسان کو اپنی ضروریات کیلئے کمانے کھانے کا فکر ہوتا ہی ہے

پھر مجھے اپنے بڑھاپے کا خیال آگیا کہ موت کا وقت نزدیک ہے تو میں نے (اپنے دل سے) کہا کہ مجھے دوسری کیواسطے محنت ومشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے سب کام چھوڑ دیا اور آخرت کی تیاری شروع کی پھر دل میں یہ خطرہ آیا کہ شاید میری عمر دراز ہو جائے تو دوسروں کا محتاج ہونا پڑیگا تو میں پھر اپنی پہلی حالت پہ لوٹ آیا اور شغل معاش کو اس شغل عبادت پر ترجیح دی جسے اختیار کر چکا تھا (اس واقعہ سے توقع اور تجویز کی حقیقت اور اسکے آثار پہ روشنی پڑگئی ہوگی) اور اللہ تعالیٰ کی عادت اپنے اولیاء کے ساتھ یوں ہی ہے کہ اُن پہ عمل آسان اور عبادت میں مشغول ہو کر طریق عمل طے کرنا اور اسمیں لگا رہنا اسی واسطے سہل ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی توقع اور تجویز اور امید کو کم کر دیا ہے، اسی وجہ سے ان کو وہ کام آسان ہے جو دوسروں کو دشوار ہے اور اسی بات پہ متنبہ کرنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جبکہ انہوں نے ایک مہینہ کے ادھار پہ کوئی چیز خریدی ہا بیچی تھی فرمایا تھا ان اسامۃ لطویل الامل اسامہ کی توقع اور امید تو بہت لمبی ہے۔ اس صورت میں لن یشاد الدین احد الا غلبہ کے یہ معنی ہوں گے کہ جس کی توقع اور تجویز لمبی ہوگی وہ سستی اور کسل میں مبتلا ہوگا تو دین سے عاجز ہو جائے گا کیونکہ ایسا آدمی آج کا کام کل پر اور کل کے کام کو پرسوں پہ ٹالا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ آج کا کام پورا ہوتا ہے نہ آئندہ کا) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی آخری وصیت یہ تھی کہ اے شخص! کل کی فکر آج نہ کر اگر تو زندہ رہا تو اللہ تعالیٰ (کل کو) نیا رزق عطا فرمائیں گے اور مرگیا تو اپنے وقت کو اسی فکر میں مشغول نہ کر جس تک پہنچنا ہی نہ ہوگا اور اسی دروازہ کے کھولنے سے بہت لوگ برباد ہوگئے ہیں اس صورت میں فسددوا وقاربوا کا یہ مطلب ہوگا کہ اپنے دلوں کو توقع اور امید کے کم کرنے پر جما دو کہ یہی پوری درستی ہے اور اگر اس کا درجہ اعلیٰ حاصل نہ کرسکو تو تیسری ہی کا درجہ حاصل کرلو، دور نہ جاؤ ورنہ پیچھے رہ جاؤ گے اور پیچھے رہنے والا محروم ہوتا ہے۔ اور ابشروا کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم نے اس نصیحت کو قبول

کرلیا اور اس پر عمل کیا تو دنیا اور دین دونوں کی درستی کی بشارت حاصل کرو اس کے بعد واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشئ من الدلجۃ کے معنی وہی ہیں جو پہلے بیان ہوئے کہ ان اوقات میں عمل کا اہتمام کرو کیونکہ اس سے تم کو توقع اور تجویز کے کم کرنے پر مدد ملے گی قولہ الوجہ الثامن الی قولہ کالکلام علی الوجہ قبلہ)

ف بہت لوگوں کو طول امل نے دینداری سے روک رکھا ہے وہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دنیا کے فلاں فلاں کام پورے ہو جائیں تو دین کے کاموں میں مشغول ہوں کسی کو جائداد پیدا کرنے کا انتظار ہے کسی کو بیٹے اور بیٹی کی شادی سے فارغ ہونے کا خیال ہے، کوئی پنشن کا وقت قریب آنے کا منتظر ہے، لیکن اُن کو یہ خیال نہیں آتا کہ موت کا وقت متعین نہیں ہے، نہ معلوم کس وقت پیامِ اجل آجائے اور ساری تجویزیں دل کی دل میں رہ جائیں۔ اس لئے عاقل وہ ہے جو صبح کو شام کے متعلق تجویز نہ کرے اور شام کو صبح کے متعلق کوئی امید قائم نہ کرے، بلکہ زندگی کا جو لمحہ بھی نصیب ہے، اس کو غنیمت جان کر دین کا کام بھی اس میں پورا کرے اور دنیا کا بھی، اسی کا نام قصرِ امل ہے اور دوسری حالت کا نام طول امل، حدیثوں میں طولِ امل کی بہت مذمت آئی ہے کہ آدمی آئندہ کے متعلق توقعات اور تجویزات قائم کرتا رہے حالانکہ اس کو آئندہ کی کچھ خبر بھی نہیں کہ کیا ہوگا؟

(۵۴) مقامِ رضا حاصل کرو یا صبر میں پختہ رہو تو دین آسان ہے

ایک تفسیر یہ ہے کہ دین رضا سے آسان ہوتا ہے کیونکہ یہ بھی مقامات عالیہ تک پہنچنے کا بڑا سبب اور سالکین کے درجات میں بڑا مقام ہے، جس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ اے برخوردار! اگر تم اللہ کے لئے کامل رضا کے ساتھ عمل کر سکو تو ضرور کرو، ورنہ ناگوار امور پر صبر ہی کرو کہ اس میں بھی بڑی خیر ہے۔

اس صورت میں ولن یشاد الدین احد الا غلبہ کا یہ مطلب ہوگا کہ جو شخص

تقدیر پر راضی نہ ہو بلکہ ناراضی کا اظہار کرے اس نے دین کو دشوار راستہ سے لینا چاہا ہے تو دین اسکو ہرادیگا۔ اسی لئے اہل سلوک میں سے ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ تقدیریں تو چلتی رہیں (اور پوری ہوکر رہیں گی) اب اگر تو راضی رہا تو وہ چلیں گی۔ اور تجھ کو ثواب دے جائیں گی اور ناراض ہوا تو وہ پھر بھی چلیں گی مگر تجھ کو گناہ دئیے جائیں گے۔ اس صورت میں یہ شخص دین سے عاجز ہوگیا کیونکہ تقدیر پر راضی نہ ہونے کی وجہ سے گناہ ہوا،

اور فسددوا وقاربوا کا یہ مطلب ہے کہ اپنی حالت کو کمال رضا اختیار کرکے درست کرو اور اگر ایسا نہ کرسکو تو اس کے قریب ہی رہو اور قریب رہنا یہ ہے کہ (تقدیر پر) صبر کرو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ابھی گذرا ہے کہ آپ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ ناگوار امور پر صبر کرنے میں بھی بہت خیر ہے، اور (مقام) رضا کا نتیجہ اور ثمرہ تکالیف اور مصائب کے اجتماع ہی کے وقت ظاہر ہوتا ہے راحت اور امید برآری کیوقت ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ اس پر تو ہر شخص راضی ہوتا ہے پس تکلیف اور مصیبت کے وقت نفس کا امتحان کرنا چاہئے کہ اس کو رضا حاصل ہے یا نہیں، راحت و آرام کی حالت میں صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، اس کے بعد وابشروا کے یہ معنی ہیں کہ جس شخص نے طریقہ رضا یا طریقہ صبر کو اختیار کرلیا ہو اسے اپنی کوشش کی کامیابی اور مراد پر فتح یابی کی بشارت حاصل کرنا چاہئے جو ہر شخص کو اسکی رضا اور صبر کے موافق نصیب ہوگی، پھر اس کو اس بشارت کے علاوہ ایک بڑی بشارت اور دی جاتی ہے جو الفاظ حدیث کی بشارت سے زیادہ ہے، اور یہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے اندر مذکور ہے۔ و یزیدھم من فضلہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیں گے اور جب یہ زیادتی اللہ کے فضل کے موافق ہوگی تو کتنی بڑی بشارت ہوئی (اس کو خود ہی سمجھ لو) اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو بھی اس روایت کا وہ حصہ عطا فرمائیں جو اُن کے فضل کے مناسب ہے اور واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیٔ

من الدلجة کا وہی مطلب ہے، جو پہلے مذکور ہوا کہ ان اوقات میں عمل کا اہتمام کرنا چاہیئے تاکہ حصول رضا میں عینت مدد ہو قول الحجۃ اللہ امام الی قولہ منحنا اللہ سبحانہ منہا من فضلہ ما یلیق بفضلہ"

ف اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دین اس شخص کو آسان ہے جسے اللہ و رسول کی محبت حاصل ہے کیونکہ محبت کے بعد محبوب کا کوئی حکم اور کوئی فعل ناگوار نہیں ہوتا

از محبت تلخہا شیریں بود

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دین کو دشوار کہتے ہیں وہ دنیا مردار کیلئے اتنی مشقتیں برداشت کرتے ہیں کہ دین میں اس کا دسواں حصہ بھی مشقت نہیں اور اگر کسی پر ان کا دل آجائے تو اس کے لئے تو سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں مال بھی، آبرو اور عزت بھی اور جان بھی اور اس میں ان کو کچھ مشقت محسوس نہیں ہوتی، ان لوگوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ دین ان کو اسی واسطے مشکل نظر آتا ہے کہ اللہ و رسول کی محبت دل میں نہیں آئی، اس دولت کو اہل محبت متبعین سنت کی صحبت میں رہ کر حاصل کرلیں تو دین بالکل آسان نظر آئیگا ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

۵۵۔ یقین کامل ہوجائے تو دین آسان ہے

ایک تفسیر یہ ہے کہ دین اس شخص کو آسان ہے جس کو یقین حاصل ہو، کیونکہ یقین بھی درجات و مقامات عالیہ تک پہنچنے کا بڑا سبب ہے جسکی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ :

"ابوبکر کو زیادہ نماز روزہ کی وجہ سے تم پر فضیلت حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہوئی جو اُن کے دل میں جمی ہوئی ہے"

اور اُن کے دل میں جو بات جمی ہوئی تھی وہ قوت یقین ہی تو تھی، ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ اسی کی وجہ سے اعلیٰ مقام پر پہنچے اور اسی بات سے جو اُن کے دل میں تھی دوسروں پر فضیلت لے گئے ان کو اعمال بدنیہ میں زیادہ مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی اور یہ بلاشک آسان ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے تاکہ امت کیلئے دین آسان ہو جائے چنانچہ فرمایا ہے تعلموا الیقین فانی اتعلمہٗ یقین حاصل کرو کیونکہ میں بھی اس کو حاصل کرتا ہوں اور جس یقین کے حاصل کرنے کی حضور نے ترغیب دی ہے وہ کسبی ہے کیونکہ یقین کی دو قسمیں ہیں ایک وہبی، دوسرے کسبی، تو حضور نے اس جگہ اس یقین پر اشارہ فرمایا ہے جسکی تحصیل میں بندہ کی تدبیر اور کوشش مفید ہو سکتی ہے اور اسکی تحصیل کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم وجود میں اپنے احکام تکوینی جو کچھ ظاہر فرمائے ہیں اُن میں تامل اور غور کرے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ کبھی کسی طرح پر جاری ہوتا ہے کبھی کسی طرح اور صورت ایک ہی ہوتی ہے (مثلاً دو آدمی ایک ساتھ ہی پڑھتے ہیں اور امتحان دیتے اور پاس ہوتے ہیں مگر ایک کو ملازمت مل جاتی ہے ایک کو نہیں، دو آدمی پاس پاس ایک ہی مال کی دکان کرتے ہیں مگر ایک کو نفع ہے ایک کو نقصان، وعلیٰ ہٰذا القیاس) اسی طرح انسان کبھی ایک بات کو ترجیح دیتا اور پسند کرتا ہے پھر تھوڑی ہی دیر میں اسکی ضد کو ترجیح دیتا ہے۔ ان باریکیوں ہی میں غور کرنے کی وجہ سے تو اولیاء صالحین کے یقین میں ترقی اور ایمان میں پختگی ہوتی ہے چنانچہ ایک بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو کس بات سے پہچانا فرمایا ارادہ وعزم کے ٹوٹنے (اور بدلنے) سے اسی طرح ملکوت سموات وارض (آسمان وزمین کی مخلوقات) میں نظر کرکے یقین حاصل کرنا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے لئے قوت یقین کا سبب قرار دیا تھا، بعض علماء نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے ارشاد فرمایا ہے کہ

تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ الدھر

ایک ساعت کی فکر کرنا زمانہ بھر کی عبادت سے افضل ہے

کیونکہ ان چیزوں میں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، کچھ دیر فکر کرنے سے ایسا یقین حاصل ہوتا ہے جو زمانہ بھر کی عبادت سے بھی حاصل نہیں ہوتا (اگر فکر سے خالی ہو) پھر (یقین کے بعد) اسکو دین (کا ہر کام) آسان ہوجاتا ہے اگرچہ (فی نفسہ) دشوار ہی ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل یقین کو اسی صفت کیساتھ اپنی کتاب میں موصوف فرمایا ہے :

(الذین قال لھم الناس) ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل فانقلبوا بنعمۃ من اللہ لم یمسسھم سوء واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم ہ

"جب لوگوں نے ان سے کہا کہ تمہارے مقابلہ کیلئے دشمنوں نے بہت لوگوں کو جمع کیا ہے اُن سے ڈرو تو اس بات سے ان کے ایمان میں (اور بھی) ترقی ہوگئی اور انہوں نے کہا ہم کو اللہ بس ہے اور وہ اچھا کارساز ہے تو اب وہ اللہ کی نعمت کے ساتھ اس حالت میں واپس ہوئے کہ اُن کو ذرا تکلیف نہیں چھوئی اور اللہ کی رضامندی کے تابع رہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے"

تو دیکھو! جب اللہ پر بھروسہ کرنے سے اُن کا یقین مضبوط ہوگیا تو (دشمنوں کی) خبر کا رعب اُن کے دل سے جاتا رہا اور اسکے بعد اللہ کے فضل عظیم کیساتھ دنیا و آخرت کی نعمتیں لیکر واپس ہوئے اور اس ساعت کی برکت سے جسمیں انہوں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا اور قوت یقین کیساتھ اسی پر بھروسہ کیا تھا دونوں جہان میں کامیاب ہوگئے۔

اس صورت میں ولن یشاد الدین احد الا غلبہ کا یہ مطلب ہوگا کہ جس کا یقین ضعیف ہو اور اسکی تقویت کے اسباب بھی اختیار نہ کرے وہ دین کو دشوار طریقہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے اور جو دشوار طریقہ سے دین کو لینا چاہے گا وہ اس سے ہار جائے گا۔

اور ہارنے کی صورت یہ ہوگی کہ نفس اور شیطان کے دھوکوں اور اندیشوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی یہی حالت قرآن میں بیان فرمائی ہے

یعدھم و یمنیھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا ○

"شیطان ان سے وعدے کرتا اور ان کو امیدیں دلاتا ہے اور شیطان کے وعدے وعید نرے دھوکے ہیں" اور کچھ نہیں۔

اس کے بعد فسدد وا وقاربوا کا یہ مطلب ہے کہ یقین کا اعلیٰ درجہ حاصل کرو اور اسی کے موافق عمل کرو، اگر درجۂ کمال پر قادر نہ ہو سکو تو بالکل محروم بھی نہ رہو قریب کا درجہ ہی حاصل کر لو ورنہ دین تم کو دشوار ہو جائے گا اور جس کو دین پر چلنا دشوار ہو گیا وہ خسارہ اور گمراہی لیکر ہی واپس ہوگا۔ نعوذ باللہ من ذلک

اور ابشروا کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم نے یقین کا وہ درجہ حاصل کر لیا جو کسب و اختیار سے اُن اسباب کے ذریعہ جن کا اوپر ذکر ہوا حاصل ہو سکتا ہے تو یقین وہبی کی بشارت حاصل کرو کہ اسکے بعد تم کو یقین کا درجہ حاصل ہوتا جو محض اللہ کی عطا اور وہب سے ہی مل سکتا ہے کسب و اختیار کو اس میں دخل نہیں۔

اور واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیئ من الدلجۃ کے وہی معنی ہیں جو پہلے مذکور ہوئے کہ اوقات میں عمل کر کے مدد اور سہارا لو۔ ان اوقات میں اللہ کی طرف التجا کرو کیا عجب ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہمارے دل میں ان چیزوں سے عبث حاصل کرنے کا خیال ڈالدیں جن سے یقین کو قوت حاصل ہوتی ہے، اور توفیق خاص سے تائید فرمائیں اور اس کے بعد ہم کو دوسری قسم کا یقین عطا فرمائیں جو کسب سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ فیض اور وہب سے ہی عطا ہوتا ہے تو جس شخص پر یقین کا ہر درجہ دشوار ہو جائے اور اس سے بالکل محروم ہو جائے یا کوئی درجہ حاصل ہو گیا ہو مگر وہ اسمیں ترقی کا طالب ہے تو اسے ان خاص اوقات میں (کریم کے) دروازہ پر کھڑا ہونا چاہیئے اسکی کوشش کامیاب اور مراد پوری ہوگی، کیونکہ خبر دینے والا (رسول) سچا ہے اور جس کے حوالہ (معاملہ) کیا گیا ہے وہ کریم ہے کہ وعدہ خلافی

نہیں کرنا (پھر نا کامی کی کوئی وجہ نہیں (قولہ الوجہ العاشر الی قولہ وہو لا یخلف المیعاد)

ف آجکل بہت لوگ دین کو دشوار بتلاتے ہیں اُن کو اس مقام سے سبق لینا چاہیئے کہ اس دشواری کا منشا ضعف یقین ہے کہ لوگوں کو دین کی تعلیم پر یقین نہیں رہا وہ ثواب عذاب اور جنت و دوزخ کو ڈھکوسلا سمجھتے ہیں پھر ظاہر ہے جس شخص کو ثمرات اعمال کا یقین نہیں اس کو اعمال شرعیہ دشوار نظر آئیں گے تو اور کیا ہوگا؟ دیکھو اگر کسی شخص کو اس بات کا یقین ہو کہ فلاں کام کرنے سے مجھے ایک لاکھ روپیہ ملے گا اس کو یہ کام دشوار نہ ہوگا اور جس کو محض احتمال اور وہم ہی ہو یقین نہ ہو اسکو دشواری کا سامنا ہوگا۔ حضرات سلف صالحین کو دین اسی واسطے آسان تھا کہ اُن کو قرآن و حدیث کے وعدے وعیدوں پر پورا یقین تھا، اب اس زمانۂ نیچریت میں لوگوں کو وہ یقین نہیں رہا تو دین دشوار نظر آنے لگا فاعتبروا یا اولی الابصار

۵۶- نفسانی خواہشوں پر غالب آجاؤ تو دین آسان ہے

ایک تفسیر یہ ہے کہ دین اس شخص کو آسان ہے جو نفس کے حظوظ کو چھوڑ کر اپنے مولیٰ کے سامنے اس کو ڈالدے کیونکہ نفس کا اپنے حظوظ اور خواہشوں کو طلب کرنا اور انقیاد و اطاعت چھوڑ دینا ہی بڑا حجاب ہے کیونکہ نفس جس چیز کی طرف بھی مائل ہوتا ہے اسکو خراب کر دیتا ہے مگر جس کو اللہ تعالیٰ اس کی شر سے محفوظ کر دے (وہ خرابی سے بچ جاتا ہے) پس نفس کو مطیع و منقاد بنا کر دبانا اور اس کی خواہشوں کو پورا نہ کرنا اسی کو آسان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اس کام کو آسان کر دیں۔

ایک بزرگ سے کسی نے وصول (الی اللہ) کا طریقہ دریافت کیا تو فرمایا اپنے نفس کو چھوڑ دو بس تم واصل ہو گئے (یعنی اس کی خواہشوں کو پورا نہ کرو بلکہ اس کی مخالفت کرو تو وصول میں دیر نہ ہوگی) اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ولن یشاد الدین احد الا غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص خواہش

نفس کے موافق کام کرے اور اسکی امیدوں آرزوؤں کو پورا کریگا اور اس کو مطیع و منقاد نہ بنائے گا وہ دین کو دشوار طریقہ سے لینا چاہتا ہے اور جو دشوار طریقہ سے دین کو حاصل کرنا چاہے گا دین اسکو ہرا دیگا کیونکہ حجاب نفس کی وجہ سے یہ شخص اُن بھلائیوں سے محروم ہو جائے گا جو اطاعت و انقیاد کی حالت میں لطف و مدد الٰہی کی صورت میں اس کے لئے تیار کی جاتیں اور ۔سددوا وقاربوا کا مطلب یہ ہو گا کہ حظوظِ نفس کو ایک دم چھوڑ کر عمل کرو نفس کو ان باتوں سے ہٹاؤ اور خالق جل و علا کے سپرد کر دو تو کامیاب ہو جاؤ گے ۔ اور اگر اس پر قدرت نہ ہو اور نفس تم پر غالب ہو تو ریاضات و مجاہدات اختیار کرو تاکہ وہ حالت میسر ہو جائے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے (یعنی نفس مطیع و منقاد اور اسکی خواہشیں مغلوب ہو جائیں ۔

اور وابشروا کے یہ معنی ہیں کہ اگر تم نے اس طریقہ پر عمل کیا تو خوشخبری حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے نفس سے زیادہ مہربان اور اس سے زیادہ تمہارے واسطے بہتر ہیں وہ یقیناً تمہاری امیدوں اور آرزوؤں کو پورا کر دیں گے اور کیوں نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں :

وکان بالمؤمنین رحیما

وہ مومنوں پر بہت مہربان ہیں

نیز فرماتے ہیں :

یبشرھم ربھم برحمۃ منہ و رضوان وجنات لھم فیھا نعیم مقیم خالدین فیھا ابدا ط ان اللہ عندہ اجر عظیم ٥

اُن کا پروردگار ان کو بشارت دیتا ہے اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسی جنتوں کی جن میں ہمیشہ کی راحت ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے بلاشک اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا اجر ہے ۔

نیز ارشاد ہے

واما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی

اور لیکن جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے خوف کیا اور اس خوف کی وجہ سے نفس کی خواہش کو روک لیا تو بیشک اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

اور واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشیئ من الدلجۃ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان اوقات سے مدد لو انکی نگہداشت رکھو تو جس چیز کا تم سے مطالبہ کیا گیا ہے اسمیں تمہاری مدد کیجائیگی اور تم اپنے رب کی رضامندی سے کامیاب ہو جاؤ گے، تو کیا کوئی مستعد ہے؟ جو مدد کے زمانہ کو پہلے اس سے کہ ہاتھ سے جاتا رہے غنیمت سمجھے (اور اگر اب غنیمت نہ سمجھا تو) پھر اسکے نفس سے جو کچھ کوتاہی اس باب میں ہوگی اسکی تلافی نہ کر سکے گا۔ (قولہ الوجہ الحادی عشر الی قولہ ثم لا یجد لنفسہ علی ما فرط فیہ اقالۃ)

ف نفسانی خواہشیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جو شریعت کے موافق ہیں جیسے بقدر ضرورت کھانے پینے پہننے کی خواہشیں یا نکاح کی رغبت یہ تو حقوق نفس ہیں جن کا پورا کرنا ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ہے ان لنفسك عليك حقا کہ تیرے نفس کا بھی تیرے اوپر کچھ حق ہے، دوسری وہ جو شریعت کے خلاف ہیں ان کا نام حظوظ نفس ہے اور انہی کو قرآن و حدیث میں ہوائے نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے اور انہی کے ترک کا حکم ہے، پس حقوق نفس اور حظوظ نفس کو کسی محقق عالم سے دریافت کر کے حقوق کو ادا کرنا اور حظوظ کو ترک کرنا چاہیئے۔ صوفیہ کرام نے جو مخالفت نفس کی تاکید کی ہے اس سے مخالفت حظوظ ہی مراد ہے نہ کہ مخالفت حقوق، خوب سمجھ لو۔

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ دین مقصود نہی سے آسان ہوتا ہے کیونکہ نفسانی خواہشوں پر قابو یافتہ ہونے کا طریقہ اسی سے معلوم ہوتا ہے اور مشائخ طریق کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے

۵۷۔ دولت اخلاص حاصل کرو کہ دین اسی سے آسان ہوتا ہے۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ دین اس وقت آسان ہے جبکہ اللہ کیلئے خالص ہو، اللہ ہی کے واسطے، اللہ ہی کی وجہ سے (اس کو اختیار کیا گیا) ہو کہ انسان مولیٰ تعالیٰ شانہ کے حق کی تعظیم کیلئے عمل کرے اور کوئی غرض نہ ہو جب ایسا کرے گا تو دین اس پر آسان ہوجائیگا کیونکہ اسوقت یہ شخص طاعت میں حلاوت پائے گا اور حلاوت کیوجہ سے وہ اس پر خفیف اور آسان ہوجائیگی، بلکہ اسکی غذا بن جاویگی (کہ اب بدون طاعت و عبادت کے چین ہی نہ آئیگا) پس وہ باطن میں فرشتہ اور ظاہر میں انسان ہوگا، اسی لئے اہل سلوک میں سے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اہل دنیا مسکین (اور قابل رحم) ہیں کہ دنیا سے چلے گئے اور اسکی راحت کا مزہ بھی نہ چکھا، کسی نے عرض کیا کہ دنیا کی راحت کیا ہے؟ فرمایا حلاوت طاعت، اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی طرف (بندوں کو) بلایا اور اسکی ترغیب دی ہے چنانچہ ارشاد ہے: ایاك نعبد و ایاك نستعین (کہ ہمارے سامنے یوں عرض کیا کرو کہ اے اللہ ہم صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور اخلاص اسی کا تو نام ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور اسی کے واسطے اسی کی وجہ سے کیجائے) پھر اللہ تعالیٰ نے زیادہ ترغیب کیلئے ہر رکعت میں اس کے پڑھنے کا حکم دیا تاکہ حال بن جائے اور جب اللہ تعالیٰ مددگار اور ہادی ہونگے تو لطف و عنایت کے ساتھ اسکو درجات عالیہ کیطرف اٹھالیں گے اور کرامت و احسان کا تاج پہنادیں گے۔ اور لن یشاد الدین احد الا غلبہ کا یہ مطلب ہوگا کہ جو شخص دین میں اپنے ہی نفس پر اعتماد کرے اور اللہ تعالیٰ سے لگاؤ پیدا نہ کرے نہ اس سے مدد مانگے وہ دین کو دشوار طریقہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے اور جو دشوار طریقہ سے دین کو لینا چاہے گا وہ دین سے ہار جائے گا کیونکہ اس پر نفس کے عیوب ظاہر ہونگے اور ان سے نکلنے کا راستہ نہ ملے گا، پھر اس وقت دو حالتوں میں سے ایک کا سامنا ہوگا اور یہ (دونوں حالتیں ایسی ہیں کہ) ان میں سے ایک، بھی کسی کے اندر پائی جائے تو اسکی علامت ہلاکت کی ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے

لطف اور درگزر سے کسی کی دستگیری فرمائیں (تو اور بات ہے) وہ دو حالتیں یہ ہیں
یا تو اپنی امید تک نہ پہنچنے کی وجہ سے یاس اور ناامیدی میں مبتلا ہوگا اور جب
اس صفت سے موصوف ہوگا تو اس پر ہلاکت کا سخت اندیشہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے فرمایا ہے لو کنت معجلا عقوبة لعجلتها
علی القانطین من رحمتی (اگر میں جلدی سزا دیا کرتا تو اپنی رحمت سے ناامید
ہونیوالوں پر جلد عذاب بھیجتا، اور یا جس حال میں اس وقت ہے اسی پر راضی ہوگا
اسی پر جا رہیگا اور اس حالت میں خطرہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فما
اصبرهم علی النار کہ یہ لوگ دوزخ پر کیسے دلیر ہیں، مفسرین نے اسکی تفسیر میں
فرمایا ہے کہ یہ لوگ اُن اعمال پر جو جہنم میں پہنچا نیوالے ہیں بڑے دلیر ہیں تو درحقیقت
جہنم پر دلیر ہیں "۔ اور یہ ایسا ہے جیسا حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ان الذین یأکلون
اموال الیتامی ظلما انما یأکلون فی بطونهم نارا (کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق
کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں (اور کچھ نہیں) حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ
وہ تو مزیدار کھانا کھاتے ہیں مگر جب اس کا انجام جہنم میں پہنچنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے
اس کھانے کو ہی آگ بتلایا، اس کے بعد فسددوا وقاربوا کا یہ مطلب ہے کہ اپنی نفسانی اور
ذاتی حالت کو درست رکھو اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے لگاؤ رکھو اپنے تمام معاملات میں
اسی سے مدد مانگو، اگر یہ درجہ درستی حال کا حاصل نہ کر سکو تو اس کے قریب ہی کا درجہ
حاصل کر لو اور اس درجہ تک پہنچنے کیلئے ریاضت ومجاہدہ اختیار کرو، اور لمبی مہلت
ملنے سے دھوکہ نہ کھانا (کہ ابھی تو بہت عمر باقی ہے اخیر وقت میں دین دار بن جائیں گے)
کہیں تم سے آخرت میں یوں نہ کہا جائے اولم نعمرکم ما یتذکر فیه من تذکر
وجاءکم النذیر (کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جسمیں سمجھنے والا سمجھ سکتا تھا
اور تمہارے پاس ڈرانیوالا بھی پہنچ چکا تھا)
اس کے بعد وابشروا کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم
کر لیا اور اسکے آگے گردن جھکا دی تو خوشخبری حاصل کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنی امید

کے موافق (مہربان وکارساز) پاؤ گے اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی ارشاد فرماتے ہیں انا عند ظن عبدی بی میں اپنے بندے کے گمان کیساتھ ہوں جیسا گمان بھی وہ میرے ساتھ رکھے" اور واستعینوا باللہ وقۃ والروحۃ و شئ من الدلجۃ کا مطلب ہے کہ ان خاص اوقات سے مدد لو۔ ان میں عمل کرنا اور مولیٰ کے دروازہ پر کھڑے ہونے کو غنیمت سمجھو، تمہاری مدد کی جائیگی اور دشوار کام آسان ہو جائے گا۔

اور جو شخص اس طریقہ پر عمل کریگا اس کو پہلی بشارت سے زیادہ دوسری بشارت حاصل ہوگی کیونکہ اعانت خود ایک بشارت ہے، اور ایک بشارت پہلے دی جا چکی ہے، غرض یہاں چند بشارتیں ہیں اور خبر دینے والا سچا ہے اور جس کو طلب کیا جا رہا ہے وہ غنی و کریم ہے کہ نیک کام کرنیوالوں کی کوشش قبول فرماتا اور برے کام کرنیوالوں سے درگذر کرتا ہے تو کیا کوئی سچا بندہ ہے؟ اور اس جیسی ہی بشارت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اشارۃً مذکور ہے

الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل ۞ الم یجعل کیدھم فی تضلیل ۞ وارسل علیھم طیرا ابابیل ۞ ترمیھم بحجارۃ من سجیل ۞ فجعلھم کعصف ماکول ۞

"(اے انسان) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کیساتھ کیا کیا؟ کیا اُنکی تدبیر کو غلط نہیں کر دیا؟ کہ ان پر پرندوں کی جماعتوں کو مسلط کیا جو پکی مٹی کی پتھریاں ان پر برسا رہی تھیں پھر اُن کو ایسا کر دیا جیسا کھایا ہوا بھوسہ"

جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانیوالا ہوں، اس پر فرشتوں نے کہا کیا آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائیں گے جو اس میں فساد کریگا اور خون بہائیگا، تو حق تعالیٰ اُن سے ناراض ہو گئے پس فرشتے (اللہ کے غضب سے) گھبرا گئے اور انہوں نے سات دفعہ عرش کا طواف کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی مغفرت فرمادی اور خطا معاف کر دی، پھر فرمایا کہ زمین میں ایک گھر بناؤ جسکے گرد گنہگار انسان سات دفعہ طواف کیا کریں گے جیسا تم نے عرش کا طواف

کیا تو میں ان کی مغفرت کر دیا کرونگا اور اُن پر رحم کرونگا جیسا تم پر کیا" فرشتوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور مکہ میں خانہ کعبہ فرشتوں کے ہاتھوں تیار ہو گیا) پھر جب طوفان آیا تو اسکو اٹھا لیا گیا اور بنیاد باقی رہ گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو تعمیر بیت اللہ کا حکم دیا اور فرمایا کہ لوگوں کو (اس کا حج کرنے کیلئے) بلاؤ، آواز دینا تمہارا کام ہے اور آواز کا پہنچانا ہمارا کام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی آواز تمام آدمیوں کو پہنچا دی جن کے متعلق علم الٰہی میں حج مقدر ہو چکا تھا (انہوں نے اس آواز پر لبیک کہی) خواہ ماؤں کے رحم میں تھے یا باپوں کی پشت میں، پھر جب ہاتھی والے (ابرہہ گورنر حبشہ نے جو اس وقت شاہ حبشہ کی طرف سے یمن پر متعین تھا) اس گھر کے گرانے کا ارادہ کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی مغفرت و رحمت کا سبب بنایا تھا اور یوں چاہا کہ لوگوں کو بیت اللہ سے ہٹا کر اس گھر کے حج پر مائل کرے جو اس نے بنایا تھا اور (بیت اللہ کے گرانے کو بڑا لشکر ساتھ لیکر مکہ کیطرف بڑھا) اس کا لشکر بڑا زبردست تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ وہ کیا جو اس سورت میں مذکور ہے۔ جسکی تفسیر میں علماء نے لکھا ہے جس وقت حد حرم میں ہاتھیوں نے قدم رکھا آگے نہ بڑھ سکے اور خانہ کعبہ کیطرف منہ کر کے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے زمین پر ادھر لشکر والے ہاتھیوں کو مار مار کر اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے ادھر سمندر کی طرف سے ٹڈی دل جانور اپنی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لیکر پہنچ گئے اور لشکر پر برسانا شروع کر دیں جسکے کنکری لگی فوراً ہلاک ہوا اور بدن نیلا پڑ گیا تمام لشکر میں صرف ایک آدمی زندہ بچا جس نے اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر یمن کا رخ کیا وہاں پہنچ کر اس نے خبر دی اور اسی وقت ایک جانور نے اسکو بھی کنکری مار کر ہلاک کر دیا ۱۲)

اس خبر کے دینے کا نتیجہ اور فائدہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت رحمت اور مخلوق پر ان کے لطف و کرم کو معلوم کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس قصے کے ضمن میں (بطور اشارہ کے) یوں فرماتے ہیں کہ اے گنہگار مومن! میری قدرت کا نشان دیکھ! کہ جس شخص نے میری رحمت کا اثر تجھ سے قطع کرنا چاہا تھا میں نے اس کو کیونکر برباد کیا؟ باوجودیکہ تو میرے

ساتھ سرکشی سے پیش آنا اور میری نعمتوں سے نافرمانیوں میں مدد لینا ہے، دیکھ میں اس حالت میں تیرے ساتھ کیسا ہوا اور سمجھ! کہ اگر تو میری طرف متوجہ ہو اور میرے احکام کو بجا لانے لگے، میری کتاب کا اتباع کرے، میرے نبی کی سنت پر چلے تو پھر میں تیرے ساتھ کیسا ہوں گا" کیا اس وقت جبکہ تو اپنے کو میرے حوالے کردے گا کوئی تجھے ضرر پہنچا سکتا یا کوئی مصیبت تجھ پر ڈال سکتا ہے، یا میں تیری مدد چھوڑ سکتا یا تجھے دوسروں کا محتاج کرسکتا ہوں، (ہرگز نہیں)

تو میری طرف متوجہ ہو، مجھے اپنے اوپر مہربان، اپنے حال پر کرم فرما، اپنا حامی اور مددگار پائے گا۔ کیا تونے میرا یہ خطاب نہیں سنا

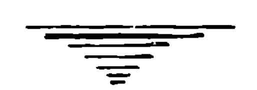
وکان حقا علینا نصر المؤمنین مومنوں کی مدد کرنا ہمارے ذمہ پر حق ہے

پس مجھ سے مدد مانگ میں تیری مدد کروں گا، میری طرف تضرع وزاری کر میں تجھ پر رحم کروں گا۔ میں تجھ سے زیادہ تجھ پر مہربان اور تجھ سے زیادہ تیری مدد پر قادر ہوں جس نے اس بشارت میں غور کیا اور اسکو سمجھ لیا اور اس کے موافق عمل کیا اس نے اس کو سچ اور برحق ہی پایا چنانچہ میں نے ایک درویش کو دیکھا جن کی عمر سو برس سے اوپر تھی وہ فرماتے تھے کہ جب سے میں نے اپنے شیخ کو دیکھا ہے کسی سے کوئی حاجت طلب نہیں کی، لوگوں نے اسکی حقیقت دریافت کی تو فرمایا کہ میرے شیخ نے مجھے ایک وصیت کی تھی کہ" اپنی حاجت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا، پس جب میں کسی حاجت کا ارادہ کرتا ہوں دعا کیلئے اپنے ہاتھ پھیلا دیتا ہوں اور اللہ سے اس کو مانگتا ہوں، اگر وہ میرے حق میں بہتر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو پورا کردیتے ہیں اور بہتر نہیں ہوتی تو مجھ سے دور کردیتے ہیں۔ (قوله الوجه الثانی نشأ الی قوله وان کانت نعم البعد ها عنی)

ف اس مقام سے اُن لوگوں کو سبق لینا چاہیئے جو تصوف کے منکر ہیں وہ خوب سمجھ لیں کہ دین اخلاص سے آسان ہوتا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ دولت اخلاص صوفیہ ہی کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے بلکہ تصوف حصول اخلاص ہی کا نام ہے اسی کو نسبت لیسان

کہتے ہیں اور اسی کے واسطے اہل سلوک اذکار و اشغال و مراقبات کرتے ہیں۔

ف شیخ نے الدین یسر کی جتنی تفسیریں اس مقام پر بیان فرمائی ہیں حدیث میں ان کا مجموعہ بھی مراد ہو سکتا ہے، چنانچہ شیخ نے خود اس احتمال کو ظاہر فرمایا ہے پس دین اس شخص کو آسان ہے جس کو یہ باتیں حاصل ہوں جو بارہ تفسیروں میں اوپر مذکور ہوئی ہیں مگر افسوس ہے کہ لوگ اسباب سہولت کو تو اختیار نہیں کرتے اور خواہ مخواہ دین کو دشوار سمجھتے ہیں، ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر کام کی سہولت کے کچھ اسباب ہوتے ہیں اگر ان اسباب کو اختیار نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی کام بھی آسان نہیں ہو سکتا اسی طرح سہولت دین کے بھی اسباب ہیں جو اس مقام پر مذکور ہیں ان کو اختیار کیا جائے اس کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ دین آسان ہے یا نہیں۔



باب ہفتم



وفد عبدالقیس

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قبیلۂ عبدالقیس کا وفد جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا یہ کس قوم کے آدمی ہیں یا فرمایا یہ وفد کون لوگ ہیں؟ انہوں نے عرض کیا (خاندان) ربیعہ کے افراد ہیں، فرمایا اس قوم یا اس وفد کو مرحبا ہے کہ نہ ذلیل ہوئے نہ پشیمان (کیونکہ یہ لوگ خود بخود اسلام لے آئے تھے لشکر اسلام کو ان پر جہاد کی نوبت نہیں آئی) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم لوگ آپ کے پاس بجز اس ماہ محترم (رجب) کے اور کسی وقت نہیں آسکتے، ہمارے اور آپ کے درمیان یہ قبیلہ یعنی خاندان قریش کے کفار (حائل) ہیں اس لئے ہم کو کوئی (ایسی جامع اور) فیصلہ کن بات بتلا دیجئے جس سے ہم دوسروں کو بھی مطلع کردیں اور اس کی وجہ سے جنت میں پہنچ جائیں، ان لوگوں نے پینے کی چیزوں کو بھی دریافت کیا تھا، تو حضور نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے منع فرمایا (سب سے پہلے) ان کو اللہ وحدہٗ پر ایمان لانے کا حکم دیا، اور فرمایا جانتے ہو کہ اللہ وحدہٗ پر ایمان لانا کیا ہے؟

انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اسکے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، فرمایا (اللہ وحدہٗ پر ایمان لانا) اس بات کی گواہی دینا (ہے) کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز کی پابندی کرنا، زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا، اور (اس بات کا بھی حکم دیتا ہوں کہ) غنیمت کا پانچواں حصہ (بیت المال کو) دیا کرنا، اور اُن کو چار چیزوں سے منع فرمایا (ایک) زرد رنگ کی مٹکی (دوسرے) کدو کا برتن (تیسرے) کھجور کی کھدی ہوئی لکڑی کا برتن (چوتھے) وہ برتن جس پر روغن زفت ملا گیا ہو اور کبھی راوی نے یہ کہا کہ جس پر روغن قار ملا گیا ہو یعنی اُن چیزوں سے منع فرمایا جو اِن برتنوں میں پی جاتی ہیں) اور فرمایا کہ ان کو محفوظ کر لو اور اِن لوگوں کو بھی اطلاع کر دو جو تمہارے پیچھے ہیں۔

شرح حدیث کی دلالت اس بات پر ظاہر ہے کہ جن چار باتوں کا حکم دیا گیا وہ واجب ہیں اور جن چار چیزوں سے منع کیا گیا اُن کا ترک ضروری ہے، نیز ان باتوں کے محفوظ کرنے اور ان کی تبلیغ کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔

۵۸۔ آنیوالے کا نام اور شخصیت دریافت کرنا سنت ہے، حدیث میں اس بات کی دلیل

ہے کہ جس کا ارادہ کر کے کوئی آوے تو سنت یہ ہے کہ وہ آنیوالے کی شخصیت دریافت کرے تاکہ اس کو پہچان لے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلے کے آدمیوں سے جب وہ آپ کے پاس حاضر ہوئے دریافت کیا تھا (کہ یہ کس قوم کے آدمی ہیں) یہاں تک کہ آپ نے اُن کو پہچان لیا (قوله فيه دليل على ان من السنة سوال المقصود الى قوله حتى عرفها)

ف محققین صوفیہ کا عمل اس حدیث کے موافق ہے مگر آج کل کچھ ایسا مذاق بدلا ہے کہ اس قسم کے سوالات سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے اور سوال کرنے والے کی شکایت کرتے ہیں کہ ہم کو اجنبی سمجھا، ان لوگوں کو جان لینا چاہیئے کہ آنے والے کی شخصیت دریافت کرنا سنت ہے اور اس سے متوحش ہونا سراسر عجمیت ہے۔

۵۹۔ ہر شخص کو اس کے درجہ پر رکھو

حدیث سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اسکے مرتبہ پر رکھنا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ سوال اسی غرض سے تھا کہ آنے والے کی شخصیت معلوم کر کے اس کے ساتھ اس کے درجہ کے موافق سلوک کیا جائے۔ ایک دوسری حدیث میں حضور نے اس مضمون کو صاف طور سے ارشاد فرمایا ہے

انزلوا الناس علی منازلھم

کہ لوگوں کو اُنکے درجہ پر رکھو

حضور نے جس بات کو اس حدیث میں قولاً بیان فرمایا ہے اس کو اس حدیث میں جسکی ہم شرح کر رہے ہیں عملاً ظاہر کر دیا اور جب انسان آنیوالے کو پہچانے گا نہیں تو نا ممکن ہے کہ اسکی ساتھ اسکے درجہ کے موافق برتاؤ کر سکے (اور پہچاننے کی صورت یہی ہے کہ اس سے اسکی شخصیت دریافت کی جائے) اسی لئے (حضرات) خلفاء راشدین رضی اللہ تعالٰی علیہم کے پاس جب کوئی مسجد میں بیٹھتا تو وہ اس سے دریافت کیا کرتے تھے کہ تمہارے پاس قرآن کا کتنا حصہ ہے، یعنی کتنا قرآن یاد ہے۔ اسکی وجہ صرف یہی تھی کہ ہر شخص سے اسکے درجہ کے موافق برتاؤ کیا جائے، کیونکہ اُن کے نزدیک فضیلت کا معیار یہی تھا کہ قرآن کا جتنا حصہ کسی کو یاد ہو (اسی قدر فضیلت حاصل ہوگی) الوجہ الثالث قولہ فی ھذا من الفقہ ان ینزل کل انسان منزلتہ الی قولہ بحسب ما یکون عندھم من القرآن۔

ف۔ کیا آجکل کے مسلمان اس سے سبق لیں گے؟ کہ حضرات صحابہ کے نزدیک فضیلت کا معیار کیا تھا اور آجکل مسلمانوں کے نزدیک معیار فضیلت کیا رہ گیا ہے؟ افسوس آجکل تو بعضے نام کے مسلمان قرآن کی تعلیم اور اس کے حفظ کو بیکار ہی سمجھنے لگے، اُن کے دل میں اہل قرآن کی عظمت کیا خاک ہوتی اُلٹا اُن کو ذلیل سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک تو معیار فضیلت روپیہ پیسہ ہے جو بڑا مالدار ہے وہ معزز ہے، جو مال میں کم ہے وہ ذلیل ہے، ان کو سمجھ لینا چاہیئے

کہ حضرات اصحابہ وسلف صالحین نے کتاب الٰہی کی عظمت کی تھی تو خدا نے بھی اُن کو وہ عظمت دی جس کی نظیر زمانہ کی آنکھوں نے کبھی نہ دیکھی تھی، جب سے مسلمانوں نے کتاب الٰہی کی عظمت اپنے دلوں سے کم کردی خدا نے بھی ان کی عزت و عظمت لوگوں کے دلوں سے کم کردی۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ≈

تو اگر مسلمان اپنے بھلے دن چاہتے ہیں تو کتاب اللہ کی عظمت کریں۔

۶۰ حضور کا وفد کو مرحبا کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ آنیوالوں کو مانوس کرنا چاہئے مگر مانوس کرنے کیلئے ایسی ہی بات کہی جائے جو متکلم کی حالت کے مطابق ہو، تاکہ آنے والے کو میزبان سے کسی ایسی چیز کی طمع نہ ہو جو اس کی قدرت سے باہر ہے۔ چنانچہ حضور نے ان آنے والوں سے ایسی ہی بات فرمائی جو آپکے پاس ظاہراً باطناً ہر طرح موجود تھی، یعنی مکان واخلاص کی وسعت، (قولہ الوجہ السادس قولہ صلے اللہ علیہ وسلم مرحبا بالقوم او بالوفد الی قولہ حسا و معنیً)

ف اس ادب پر حضرات صوفیہ کا عمل سب سے زیادہ ہے وہ آنے والے کو مانوس بھی کرتے ہیں اور اپنی وسعت کے مطابق مانوس کرتے ہیں۔

۶۱۔ اللہ کیطرف متوجہ ہو جاؤ اسی سے حسن حال نصیب ہوتا ہے

حضور کا یہ ارشاد غیر خزایا ولا ندامی کہ یہ لوگ نہ رسوا ہوئے نہ پشیمان اس میں ان لوگوں کو بشارت تھی کہ اسوقت بھی ان کے سب مقاصد پورے ہوئے اور آئندہ بھی مسرت اور خوشی حاصل ہوگی، کیونکہ ندامت اور پشیمانی زیادہ تر آخر میں ہوتی ہے، ابتدار میں تو کسی کام کی رغبت کیوجہ سے اُن چیزوں کا فائدہ نظر سے مخفی رہتا ہے جو اسکی وجہ سے چھوٹ گئی ہیں جب کام پورا ہو جاتا ہے اسوقت ان چیزوں پہ نظر ہوتی ہے جو اسکی وجہ سے فوت ہو گئی تھیں اب یا ندامت ہوتی ہے (اگر فوت شدہ فائدہ قیمتی نظر آیا) یا خوشی ہوتی ہے (اگر حاصل شدہ فائدہ زیادہ ہوا) تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو خیر عاجل اور خیر آجل دونوں کی اطلاع دیدی کہ اُن کو بھلائی اور خوشی ہمیشہ حاصل رہے گی، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کیواسطے کوئی کام کرتا ہے اس کو اسیطرح ہمیشہ خوشی اور فراخی حاصل ہوتی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من ترك شيئًا لله عوضه الله خيرا منه من حيث لا يحتسب ،

جو شخص اللہ کے واسطے کسی چیز کو چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں اس سے بہتر چیز ایسی جگہ سے عطا فرماتے ہیں جہاں اس کا گمان بھی نہ جا سکتا تھا۔

پس جو کوئی کسی ایک جہت کو اللہ کیواسطے چھوڑتا ہے وہ اسکے عوض دوسری جہت کا ارادہ کرتا ہے اور اللہ کا تو خوبصورت وعدہ ہی بڑی دولت ہے۔ اسمیں کبھی ناکامی کا سامنا نہیں ہوتا۔ ندامت اور رنج و ناکامی کا سامنا تو اسی پہلو میں ہوتا ہے جو اللہ کی جہت کے سوا ہو،

اور اس میں اہل تصوف کے اس عمل کی دلیل ہے کہ وہ اللہ کے سوا سب کو چھوڑ کر اللہ ہی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کیونکہ اسی سے حسنِ حال نصیب ہوتا ہے اس وقت بھی اور آئندہ بھی (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)

۶۲۔ جب کسی حق واجب سے انسان عاجز ہو تو اسکو اپنے عجز کا سبب بتلانا چاہئے

وفد کا یہ قول کہ ہمارے اور آپکے درمیان یہ قبیلہ یعنی کفار قریش حائل ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ انسان جب کسی حق واجب یا مستحب کے ادا کرنے سے عاجز ہو تو اسکی وجہ بتلانا چاہیئے چنانچہ ان لوگوں نے اپنا عذر ظاہر کر دیا جسکی وجہ سے وہ حضورؐ کے پاس (جلد جلد) نہیں آسکتے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ مومن تھے کیونکہ انہوں نے قریش کو کافر کہا، اگر یہ خود مومن نہ ہوتے تو ان کو کافر نہ کہتے (قوله الوجه السابع عشر الى قوله لما سموا هم كفاراً)

۶۳- توفیق کا مدار محض تقدیر پر ہے

اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ توفیق کا مدار محض تقدیر پر ہے جسمیں قرب نسب اور قرب مکان وقرب زمان کو دخل نہیں، چنانچہ قبیلۂ مضر (خاندان قریش حضور سے) زیادہ قریب تھے وہ تو (مدت تک ایمان سے) محروم رہے اور ربیعہ دور تھے وہ (جلدی) کامیاب ہو گئے اسی لئے جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر کامیابی صورت شکل سے ہوا کرتی تو بلال حبشی سعادت سے بہرہ ور اور ابولہب قرشی محروم نہ ہوتا

(قوله الوجه التاسع عشر فيه دليل على ان القدرة تخصيص بالقدرة الى قوله وحرم ابولهب القرشي")

ف- یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو اسی بات پر قناعت کئے ہوئے ہیں کہ ہم بزرگوں کی اولاد میں ہیں اور اُنکے طریقہ پر نہیں چلتے اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کامیابی کا مدار نسب اور خاندان پر نہیں ہے بلکہ ایمان واعمال صالحہ پر ہے جسکو یہ دولت عطا ہو جائے وہی کامیاب ہے اور اسمیں شک نہیں کہ اہل نسب کو یہ دولت عطا ہو جائے تو وہ دوسروں سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں چنانچہ قریش میں سے جن حضرات کو یہ دولت عطا ہوئی اُن کا درجہ دوسروں سے بڑھ گیا حضرات خلفاء راشدین وعشرہ مبشرہ قریش ہی میں سے تھے۔

۶۴- عمل بھی دخول جنت کا سبب ہے

حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ دخول جنت کا سبب اعمال ہی ہیں اور اسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معارض نہ سمجھا جائے لن يدخل احد بعمله الجنة قالو ولا انت يارسول الله قال ولا انا الا ان يتغمدني الله بفضله ورحمته کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی داخل نہ ہوگا، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اور آپ بھی نہیں؟ فرمایا میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل و رحمت میں لے لے" دونوں حدیثوں میں کوئی منافات اور تعارض نہیں، وجہ تطبیق یہ ہے کہ جس حدیث کی ہم شرح کر رہے ہیں اسکے مخاطب عوام ہیں کیونکہ حکمت کا مقتضیٰ یہی ہے (کہ ہر چیز کیلئے ظاہر میں کوئی سبب ہو) اور اللہ تعالیٰ کی

عادت مستمرہ یہ ہے کہ عوام کو مقتضائے حکمت ہی کے موافق خطاب فرماتے ہیں چنانچہ قرآن اس سے بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون کہ جنت میں داخل ہو جاؤ اُن اعمال کے سبب جو تم دنیا میں کیا کرتے تھے، کسی جگہ بما عملتم ہے اور کہیں بما کنتم تصنعون، بما کسبتم، بما اسلفتم، بما کنتم تفعلون وغیرہ بہت سی آیات ہیں جن میں عمل کو دخولِ جنت کا سبب بتلایا گیا ہے، اور دوسری حدیث کے مخاطب خواص ہیں جو توحید میں منہمک اور قدرتِ حق کی حقیقت سے باخبر ہیں، اگر یہ حدیث ان لوگوں کے سامنے بیان کیجائے جو قدرت کی حقیقت سے بے خبر ہیں تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ وہ مقتضائے حکمت کو چھوڑ بیٹھیں گے اور مقتضائے حکمت پر عمل چھوڑ دینا بالاجماع کفر ہے اگرچہ قدرت پر بھروسہ ہی ہو اور مقتضائے حکمت پر عمل کرنا عین ایمان ہے اگرچہ قدرتِ حق سے ناواقف ہو۔ یہ شخص حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق ہوگا لھم قدم صدق عند ربھم کہ اُن کے واسطے انکے رب کے پاس مقامِ صدق ہے اور درجۂ نہایت و کمال یہ ہے کہ دونوں کو جمع کیا جائے یعنی عمل کو درست کر کے مقتضائے حکمت پر عمل کیا جائے اور عظمت قدرت کو پیش نظر رکھ کر معاملہ قدرت کے حوالہ کیا جائے، اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ عمل تو اُس شخص جیسا کرو جو عمل ہی پر رہائی کا مدار سمجھتا ہے اور توکل اس جیسا کرو جو توکل ہی کو رہائی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس طریقہ پر عمل کرنے ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یعقوب علیہ السلام کی تعریف کی ہے چنانچہ ارشاد ہے وانہ لذو علم لما علمناہ اور واقعی وہ ہماری تعلیم کی وجہ سے بڑے علم والے تھے، کیونکہ انہوں نے حقیقت اور شریعت دونوں کو جمع کر دیا تھا جس کا بیان اپنے موقعہ پر اسی کتاب میں انشاء اللہ آئے گا (قولہ الوحید الثالث والعشرون قولھم وندخل بہ الجنة الی قولہ وابینہ فی موضعہ من داخل الکتاب انشاء اللہ تعالیٰ)

ف ان دو حدیثوں میں جو شارح نے تطبیق دی ہے اس کا حاصل یہ ہے

کہ عمل کو دخول جنت میں ویسا ہی دخل ہے جیسا اسباب کو مسببات میں دخل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ سبب مسبب کے لئے علت تامہ نہیں ہوتا بلکہ علت تامہ حق تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہے، مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ بندہ جب اسباب کو اختیار کرتا ہے اسی وقت مسبب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارادہ متعلق ہوتا ہے کیونکہ دنیا دار الامتحان ہے یہاں بعض حکمتوں کی وجہ سے بلا واسطہ اسباب کے ارادۂ حق کا تعلق نہیں ہوتا وہاں کبھی بطور خرق عادت کے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ مسبب بدون سبب کے پیدا ہو جائے جس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ سبب خود مؤثر نہیں بلکہ ارادۂ حق مؤثر ہے مگر خرق عادت کا ظہور شاذ ونادر ہے، عام قاعدہ یہی ہے کہ سبب کے بعد مسبب کے ساتھ ارادۂ حق کا تعلق ہوتا ہے، مثلاً زراعت سے غلہ پیدا ہونا نکاح سے اولاد کا ہونا، تجارت سے سرمایہ کو ترقی ہونا دوا دارو سے مرض کو شفا ہونا، کھانے پینے سے بھوک پیاس کا زائل ہونا وغیرہ وغیرہ یہ اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے جو عموماً اسیطرح چل رہا ہے کہ اسباب کے بعد مسببات کا ظہور ہوتا ہے مگر تجربہ اور عقل شاہد ہے کہ یہ اسباب خود مؤثر نہیں ہیں بلکہ مؤثر حقیقی مشیت خداوندی ہے کیونکہ اسباب خود مؤثر ہوتے تو مسببات کا کبھی اُن سے تخلف نہ ہوتا حالانکہ بعض دفعہ تخلف بھی ہو جاتا ہے، لیکن اس پر بھی ان اسباب کو بیکار کوئی نہیں سمجھتا کیونکہ تخلف شاذ ونادر ہے اسی طرح سمجھو کہ دخول جنت کیلئے علت تامہ تو حق تعالیٰ کا ارادہ ہے مگر سبب ظاہری بندہ کا عمل ہے اور جیسا دنیا میں کبھی مسبب بدون سبب کے ہو جاتا اور سبب سے مسبب کا تخلف ہو جاتا ہے اسیطرح ممکن ہے کہ کوئی بدون عمل کے جنت میں پہنچ جائیگا اور کوئی عمل کے بعد بھی نہ پہنچے کیونکہ علت مؤثرہ خود عمل نہیں بلکہ فضل ہے مگر اس حقیقت پر نظر کر کے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عمل کی ضرورت نہیں یا وہ بیکار ہے کیونکہ عام قاعدہ اور عادت مستمرہ یہی ہے کہ بندہ عمل کے بعد ہی جنت میں جاتا ہے جیسا کہ اسباب و مسببات کے سلسلہ میں عادۃ اللہ اسیطرح ہے پس جس شخص نے حقیقت کیساتھ اس حکمت کو بھی سمجھ لیا ہے جسکی وجہ سے مسببات کو اسباب کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے، وہ نہ عمل کو بیکار سمجھتا ہے نہ اپنے عمل پر ناز کرتا ہے یہ تو کلام شارح کی توجیہ

اور توضیح مخفی، مگر سہل بات یہ ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے دخول جنت کا سبب وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہو اور اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق کوئی بھی عمل نہیں کر سکتا اس لئے جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہیں جا سکتا اور فضل و کرم کا قانون یہ ہے کہ بندہ اپنی شان کے لائق عمل کرے تو جنت میں پہنچ جائیگا اسلئے ہر شخص محض فضل خداوندی سے جنت میں جائے گا خوب سمجھ لو ۱۲

۶۵ ہر شخص کو وہی بات بتلائی جائے جو اس وقت اس پر واجب ہے،

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص کو وہی بات بتلائی جائے جو اس وقت اس پر واجب ہے، اس کے سوا کسی اور کا بتلانا ضروری نہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو وہی باتیں بتلائیں جو اس وقت اُن پر واجب تھیں اُن کے علاوہ کچھ نہیں بیان فرمایا (چونکہ یہ لوگ اہل جہاد تھے اس لئے غنیمت کا خمس یعنی پانچواں حصہ بیت المال کو ادا کرنے کی تاکید فرمائی اور حج اُن کے ذمہ نہ تھا کیونکہ کفار و قریش درمیان میں حائل تھے اس لئے حج کا ذکر نہیں فرمایا) اگرچہ بعد میں وہ اُن کے ذمہ لازم ہوگا، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ حدیث طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (علم کا طلب کرنا ہر مسلمان کے ذمہ فرض ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جو کام اس وقت اس کے ذمہ ضروری ہے اس کا علم حاصل کرنا فرض ہے (قولہ الوجہ السادس والثلاثون فی ھذا دلیل علی ان یخبر کل انسان بما ھو واجب علیہ الی قولہ تعلم ما ھو واجب علیہ فی وقتہ)

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو علم ہی کو مقصود سمجھتے ہیں عمل کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ اصل مقصود عمل ہے اور اسی واسطے علم فرض ہے کہ عمل کا وسیلہ ہے کہ عمل بدون علم کے نہیں ہو سکتا ؛

۶۶ - فرائض کا اہتمام سب سے پہلے کرنا چاہیئے اور فرائض میں اہم کو مقدم کیا جائے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اول فرائض کا اہتمام کرنا چاہیئے اور فرائض میں سے بھی اول اُن کا جو زیادہ ضروری اور مؤکد ہیں پھر اُن کا جو اُن کے بعد ہیں کیونکہ فرائض بہت ہیں جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان فرائض کو جو اس حدیث میں مذکور ہیں دوسرے فرائض پر فضیلت دی ہے اور جس کو دوسروں پر فضیلت دی جائے اس کا اہتمام زیادہ ضروری ہے اگرچہ فی نفسہ سب کا اہتمام ہی واجب ہے، حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فروع کا درجہ اصول کے بعد کا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے ایمان کو بیان فرمایا حالانکہ مخاطب پہلے سے مؤمن تھے اس کے بعد اعمال کو بیان فرمایا ہے جس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ بدون ایمان کے اعمال معتبر نہیں ہوتے ۔

قولہ الوجہ التاسع والثلاثون فی ھذا دلیل علی انہ یبدأ اولا بالفرائض الی قولہ مع ان المحافظۃ علی الکل واجبۃ)

ف - یہ ایک بڑا باب ہے تصوف کا جو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سب سے پہلے اہم واقدم کا اہتمام کیا جائے اور فرائض کو واجبات پر اصول کو فروع پر واجبات کو مستحبات و نوافل پر مقدم کرنا چاہیئے آج کل بہت لوگ اس سے غافل ہیں ۔

۶۷ - علم دیگر اعمال سے افضل ہے

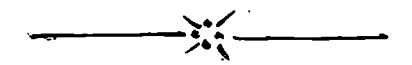
حدیث سے علم کی فضیلت بھی دوسرے اعمال پر ثابت ہوئی کیونکہ اس قسم کے احکام واصول علم ہی کے ذریعہ معلوم ہوسکتے ہیں ان کے نہ جاننے ہی سے عمل میں خلل واقع ہوتا ہے اور جب عمل میں خلل ہو یا اس کو چھوڑ دیا جائے تو دخول جنت سے محرومی ہوگی اور بلاکت کا سامنا ہوگا، اللہ ہم کو اس سے بچائے ، نیز حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کا علم تمام علوم سے افضل ہے کیونکہ اس قسم کی باتیں کتاب و سنت ہی سے معلوم ہوتی ہیں ۔ اور وہی علم قطعی ہے اسی کے ذریعہ خلاصی ہوتی ہے ۔

ف۔ افسوس ہے کہ آجکل اہل تصوف نے بھی علم کتاب سنت کیساتھ بے اعتنائی کر رکھی ہے تم دیکھو گے کہ بہت لوگ تصوف کے مدعی ہیں مگر قرآن و سنت سے جاہل ہیں فالی اللہ المشتکی

۶۸۔ حفاظت علم ضروری ہے اسکی وصیت کرنا چاہیئے

حضور کا یہ ارشاد کہ ان باتوں کو یاد کر لو اور دوسروں کو بھی ان سے خبردار کر دو، اس بات کی دلیل ہے کہ علم کا یاد کرنا ضروری ہے اور اسکی وصیت کرنا چاہیئے نیز اسمیں علم کے پھیلانے اور بیان کرنے کی بھی ترغیب ہے، اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ علم میں نیابت جائز ہے (یعنی احکام شرعیہ پہنچانے کیلئے عالم کسی کو اپنا نائب بنا سکتا ہے۔ قولہ الوجہ التاسع والاربعون قولہ علیہ السلام احفظوھن الی قولہ جواز النیابۃ فی العلم)

ف۔ اس سے بعض حضرات صوفیہ کے اس عمل کی اصل معلوم ہوئی جو اپنے ملفوظات و مواعظ کے ضبط کا اہتمام فرماتے ہیں کیونکہ اُن کے اقوال کتاب سنت کے موافق اور اسی کی تشریح کرنیوالے ہوتے ہیں۔



باب ہشتم

حدیث

احتساب النفقة علی الاهل

(عبداللہ) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مرد اپنے گھر والوں کو ثواب کی نیت سے نان و نفقہ دے تو وہ اس کے لئے صدقہ اور موجب ثواب ہوگا۔

شرح حدیث کا مدلول ظاہری تو یہ ہے کہ ثواب سمجھ کر خرچ کرنا صدقہ ہے اب ہم دیگر فوائد پر کلام کرتے ہیں (جو بطور اشارہ کے مفہوم ہوتے ہیں)

۶۹۔ عمل کا درجہ حسن نیت سے بلند ہو جاتا ہے،

حدیث سے معلوم ہوا کہ ثواب کی نیت کر کے عمل کرنے سے عمل کا درجہ بڑھ جاتا ہے اور ثواب زیادہ ہوتا ہے) اسمیں صوفیہ کے اس طریقہ کی دلیل ہے کہ وہ اچھی نیت کر کے اپنے افعال کا درجہ بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، خواہ فرض و واجب ہو یا مستحب چنانچہ فرض و واجب میں تو ایمان و احتساب کو شامل کر لیتے ہیں (یعنی عمل سے پہلے دل میں یہ بات حاضر کر لیتے ہیں کہ ہمیں اس کام کے فرض و واجب ہونے کا یقین اور اس پر ایمان ہے پھر ثواب کی نیت کو بھی اس میں

شامل کر لیتے ہیں) اور مستحب میں اس سے بھی زیادہ اہتمام کرتے ہیں کہ پہلے اس کی نذر کر لیتے ہیں تاکہ مستحب کے درجہ سے بڑھ کر ان کے ذمہ واجب ہو جائے اور وجوب کے بعد اس میں ایمان اور نیت ثواب کو شامل کر لیتے ہیں اور مباح کو اس نیت سے اختیار کرتے ہیں کہ اس سے طاعات میں مدد ملے گی (مثلاً بیوی بچوں اور دوستوں سے ہنسی مذاق کرکے طبیعت کو نشاط ہوگا افسردگی دور ہوگی تو عبادات اور طاعات کیلئے دل تازہ ہو جائے گا) تو وہ مباح مستحب بن جاتا ہے اسکے بعد اسمیں بھی ایمان اور نیت ثواب کو شامل کر لیتے ہیں، اس طرح اُن کے اعمال کا درجہ بلند ہو جاتا اور ہمتیں بڑھ جاتی ہیں اور اسی حقیقت کی وجہ سے اُن کا قدم دوسروں سے آگے رہتا ہے اگرچہ ظاہر میں اُن کے اور دوسروں کے اعمال یکساں اور برابر ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

ان اللہ لا ینظر الی صورکم ولکن ینظر الی قلوبکم

"اللہ تعالیٰ تمہاری اور تمہارے اعمال کی صورتوں پر نظر نہیں فرماتے بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتے ہیں"

(قولہ الوجہ الخامس فہذا دلیل لاھل الصفۃ الی قولہ ولکن ینظر الی قلوبکم)

ف: مستحب کی نذر کرنا اور اسکو اپنے ذمہ لازم کر لینا اگرچہ جائز ہے مگر خلاف سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ سے اس کا ثبوت نہیں، اسی لئے فقہاء حنفیہ اسکو پسند نہیں کرتے، شارح مالکی ہیں ممکن ہے اُن کے مذہب میں کراہت نہ ہو، مگر ی بہتری اُسی میں ہے جو سنت کے موافق ہو اسلئے مستحب میں صرف ایمان اور نیت ثواب کا شامل کر لینا کافی ہے، نذر کی ضرورت نہیں۔

ف: بعض بزرگوں کا ارشاد ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی ایک لاکھ رکعت سے افضل ہے، اس تقریر سے اُن کے ارشاد کی تائید ہوگی، نیز یہ حدیث

بھی اسکی تائید کرتی ہے جسمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے صحابی کا ایک مد خیرات کرنا (جسکی مقدار تین پاؤ کے قریب ہوتی ہے) دوسروں کے احد پہاڑ کی برابر سونا خیرات کرنے سے افضل ہے۔ اس فضیلت کا منشا حسن نیت اور خلوص و معرفت ہی تو ہے جس سے معلوم ہوا کہ اخلاص اور معرفت سے عمل کا درجہ بڑھ جاتا ہے خوب سمجھ لو۔"

۷۰۔ عمل میں حسن نیت کا اہتمام نفس پر گراں ہے، اس لئے ثواب زیادہ ہوتا ہے

صدقہ سے مراد یہاں ثواب ہے کیونکہ خود صدقہ دینے میں تو کچھ فائدہ نہیں بلکہ فائدہ ثواب میں ہے جو صدقہ پر مرتب ہوتا ہے اور یہ ثواب جس کا یہاں ذکر ہے تنہا اس عمل کا ثواب نہیں بلکہ نفقہ کے ثواب سے زیادہ یہ دوسرا ثواب ہے، کیونکہ (بیوی بچوں کا) نفقہ تو (شرعاً) اسکے ذمہ واجب ہے اور جو شخص واجب کو ادا کرتا ہے اسے امتثال امر (یعنی بجا آوری کا حکم) کی وجہ سے ضرور ثواب ملتا ہے پھر ایمان اور احتساب کے شامل کر لینے سے اس کو دوسرا ثواب زیادہ ملا شاید اس پر کسی کو یہ اشکال ہو کہ ایمان و احتساب کے شامل کر لینے سے یہ ثواب کیوں ملا حالانکہ اس میں نہ کچھ تعب ہے نہ مشقت نہ اسمیں ہاتھ پیر چلتے ہیں نہ کچھ کرنا پڑتا ہے؟ سو جواب یہ ہے کہ اگر اسکو خلاف قیاس کہا جائے جب تو گفتگو کی ضرورت ہی نہیں" اور اگر قیاس کے موافق کہا جائے تو وجہ یہ ہے کہ قلب بھی ایک مستقل عضو ہے اور اسمیں نیت کا ان طریقوں سے جو اوپر مذکور ہوئے) حاضر کرنا نفس پر گراں ہوتا ہے اور نفس پر جتنی گرانی[ع] ہوتی ہے اسی قدر ثواب بڑھتا ہے جس کی دلیل حق تعالیٰ

ع گرانی سے مراد وہ گرانی ہے جو بضرورت ہو، بلا ضرورت نفس پر گرانی ڈالنے سے ثواب نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک مسجد میں جانے کے دو راستے ہیں ایک قریب دوسرا بعید تو خواہ مخواہ دور کا راستہ اختیار کرنا موجب ثواب نہ ہوگا ۱۲ ظ

کا یہ ارشاد ہے

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستوں کی ضرور ہدایت کر دیتے ہیں"

اور نفس پر تعب و مشقت کی جتنی انواع ہیں اُن میں سے ہر نوع مجاہدہ ہے جیسا پہلے ایک حدیث میں گذر چکا ہے۔

دوسرے یہ کہ عمل کیوقت ایمان اور نیت ثواب کا حاضر کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

خیر الاعمال ما تقدمته النیة اعمال میں بہتر وہ عمل ہے جس سے پہلے نیت ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیت کرنے کو عمل کیلئے بہتر فرمایا ہے اور جب یہ بہتر ہے تو بدون نیت کے بھی عمل درست اور صحیح ہے، زیادہ تر علماء کا یہی مذہب ہے۔ مگر یہ تمام اعمال کیلئے عام قاعدہ نہیں بلکہ بعض اعمال بدون نیت کے صحیح ہیں اور بعض نہیں جیسا قواعد شرعیہ کا مقتضا ہے کیونکہ اعمال مختلف قسم کے ہیں بعض واجب ہیں بعض مستحب پھر مستحب میں بعض وہ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی کئے جا سکتے ہیں بعض وہ ہیں جو کبھی اللہ کے واسطے کئے جاتے ہیں کبھی غیر اللہ کے واسطے پس واجب میں تو نیت کا حاضر کرنا ضروری ہے کیونکہ واجبات کے حدود و صفات اور نام وغیرہ مقرر ہیں تو نیت کے ساتھ اُن کی تعیین لازم ہے ورنہ عمل باطل ہوگا، مثال کے طور پر فرض نمازوں کو لے لو کہ اُن کے نام اور صفات وحدود وغیرہ مقرر ہیں پس عمل کیوقت نماز کو متعین کرنا ضروری ہے تاکہ دوسری نمازوں سے امتیاز ہو جائے اسی وجہ سے تحریمہ کے وقت نیت نماز ضروری ہے اور امام شافعیؒ کے مذہب میں نماز کی نیت پانچ شرطوں سے ہوتی ہے۔

۱۔ نماز کی تعیین

۲۔ اس کے فرض و واجب سمجھنے کا اعتقاد

۳۔ نماز ادا کرنے کیلئے عمل کا ارادہ کرنا

۴۔ اس وقت ایمان کو پیش نظر رکھنا

۵۔ تحریمہ کے ساتھ متصل ہونا

باقی امام مالک رحمہ اللہ سے اس کے متعلق کچھ منقول نہیں، اسی لئے اُن کے اصحاب اس مسئلہ میں بہت اختلاف رکھتے ہیں بعض تو امام شافعیؒ کیطرح (ان سب باتوں کو نیت میں) شرط کرتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اگر تحریمہ سے کچھ پہلے ان اوصاف کے ساتھ نیت ہو جائے تو کافی ہے، اور بعض کا قول ہے کہ بس اس خاص نماز کا ارادہ کرنا کافی ہے اس سے زیادہ اوصاف کی رعایت کرنا موجب کمال ہے (لازم و ضروری اور صحت کا موقوف علیہ نہیں) اور اس مسئلہ میں امام مالک کا ظاہر مذہب یہی ہے کیونکہ اگر یہ (صفات جو امام شافعی نے نیت کیلئے بیان کی ہے) واجب ہوتی اور وہ اس کو بیان نہ کرتے تو اُن کا امام ہونا درست نہ ہوتا حالانکہ اُن کی امامت پر اجماع ہو چکا ہے اسیطرح رکعات (نماز) اور وقت کی تعیین میں بھی اختلاف ہے (کہ نیت کے وقت اسکی بھی ضرورت ہے، یا نہیں حنفیہ کا مذہب اس باب میں یہ ہے کہ نیت فرض کیساتھ وقت کی تعیین تو ضروری ہے رکعات کی تعیین ضروری نہیں، اس سے زیادہ جو اوصاف مذکور ہوئے ہیں اُن کی رعایت بہتر ہے لازم نہیں ہاں نیت کا تحریمہ سے متصل ہونا ضروری ہے) اور یہ سب باتیں کتب فقہ میں مذکور ہیں، اسی طرح کفارۂ قسم و کفارۂ ظہار۔ اور صدقۂ واجبہ وغیرہ تمام واجبات میں اگر اس واجب کی نیت نہ کی جائیگی تو کچھ نفع نہ ہوگا دوبارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

اور جو مستحب کہ صرف اللہ ہی کیواسطے کیا جاتا ہے اس کا بدون نیت کے ادا کرنا بھی کافی ہے جیسے کوئی دو رکعت نفل پڑھنے کے لئے کھڑا ہو تو اس کو ان دو رکعتوں کا ثواب مل جائے گا اگرچہ نیت (دل میں) حاضر نہ ہو (مگر حنفیہ کے نزدیک کم از کم اتنی نیت ضروری ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں گو نفل کی نیت حاضر نہ ہو ہاں پہلے سے نیت کر لینا افضل ہے اور جو مستحب کبھی اللہ کے واسطے کیا جاتا ہے کبھی غیر اللہ کے واسطے اس میں نیت

کا پہلے سے حاضر کرنا ضروری ہے تاکہ عمل اللہ کیواسطے خالص ہوجائے جیسے جمعہ کا غسل اُن لوگوں کے قول پر جو اس کو سنت کہتے ہیں کیونکہ غسل کبھی ثواب کے واسطے کیا جاتا ہے کبھی ٹھنڈک اور صفائی حاصل کرنے کے واسطے، تو نیت کرنا ضروری ہے تاکہ فعل مباح اور فعل عبادت میں فرق ہوجائے (اگر بدون نیت کے غسل کیا جائیگا تو غسل جمعہ کا ثواب حاصل نہ ہوگا۔ قولہ علیہ السلام فهو له صدقة الصدقة ههنا بمعنی الاجر الى قوله فى الوجه الثامن نيفرق بين المباح والتعبد)

ف نیت کا اہتمام صوفیہ کو جس قدر ہے کسی کو غالباً نہ ہوگا وہ مباحات کو بھی حسن نیت سے مستحب بنا لیتے ہیں اور اس طرح مباحات میں بھی ثواب حاصل کرتے رہتے ہیں، نماز کی نیت میں امام شافعیؒ نے جن اوصاف کو شرط قرار دیا ہے۔ ان کی رعایت حنفیہ کو بھی کر لینا چاہیئے تاکہ نماز بدرجۂ کمال ادا ہو کیونکہ گو ان سب کی رعایت مذہب حنفی میں لازم نہیں مگر مستحب ہونے میں بھی شبہ نہیں اسی واسطے میں نے اس قول کا پورا ترجمہ کردیا ہے حالانکہ اس سے کسی خاص مسئلہ تصوف کی تائید واضح نہیں

۱۱۔ عمل ظاہر سے عمل باطن کے افضل ہونے کا راز

ممکن ہے یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ اعمال باطن میں اتنا بڑا ثواب کیوں رکھا گیا جو اعمال ظاہر کے ثواب سے زیادہ ہے

پھر اعمال ظاہر کے صحیح ہونے کا ذریعہ بھی عمل باطن ہی کو مقرر کیا گیا ہے ؟ جواب یہ ہے کہ اگر یہ امر تعبدی (یعنی خلاف قیاس) ہے تو گفتگو کا موقع ہی نہیں اور اگر قیاسی عقلی ہے تو بیشک (وجہ) بتلانے کی ضرورت ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم کہ ایک حکمت کلی کی وجہ سے ایسا کیا گیا وہ حکمت یہ ہے کہ تمام نعمتوں اور جملہ عبادتوں میں سب سے بڑا درجہ ایمان کا ہے اور ایمان کا محل قلب ہے تو جو عمل اس محل سے صادر ہوگا جو ایمان کا ظرف ہے وہ دوسرے اعمال سے برتر و اعلیٰ ہوگا، اس بیان کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست

ہو جاتا ہے تمام بدن درست ہو جاتا ہے جب وہ بگڑتا ہے تمام جسم بگڑ جاتا ہے، سنو وہ دل ہے، پس دل کی درستی دوسرے اعضاء کی درستی سے زیادہ اہم ہے اور اس کی خرابی دوسروں کی خرابی سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ تمام اعضا دل ہی کے تابع ہیں"۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اُن لوگوں میں سے کریں جنہوں نے اللہ کے فضل سے اپنا ظاہر بھی درست کر لیا ہے اور باطن بھی (آمین) قولہ الحدیث التاسع لقائل ان یقول لم جعل تحت اعمال الباطن ھذا الباب الی قولہ متمن اصلح منہ الظاھر والباطن جمیعًا)

ف صوفیہ کو اصلاح قلب کا جس قدر اہتمام ہے ظاہر ہے بلکہ تصوف کا جزو اعظم ہی اصلاح قلب ہے مگر یہ جان لینا چاہئے کہ اصلاح باطن بدون اصلاح ظاہر کے نہیں ہو سکتی جیسا اصلاح ظاہر بدون اصلاح باطن نہیں ہو سکتی تو جو لوگ بدون اصلاح ظاہر کے اصلاح قلب کے مدعی ہیں وہ یقیناً جھوٹے ہیں، اعمال شرعیہ کو چھوڑ کر نہ قلب کی اصلاح ہو سکتی ہے نہ تصوف حاصل ہو سکتا ہے، تصوف یہ ہے کہ اعمال شرعیہ کی پابندی اس طرح کی جائے کہ ہر کام خلوص دل سے اور پوری توجہ سے ادا ہو محض رسم یا عادت یا دنیوی غرض سے نہ ہو عمل کے وقت اور عمل کے بعد دل میں تواضع پیدا ہو تکبر یا عجب و ریا پیدا نہ ہو خوب سمجھ لو ۱۲

باب ہفتم



مَن يُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَيْرًا يُّفَقِّھْهُ فِی الدِّين

بخاری رضی اللہ عنہ نے (تعلیقاً) روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں اور علم تو طلب کے (اور سیکھنے سے) ہی حاصل ہوتا ہے۔

شرح حدیث کا ظاہری مدلول تو یہ ہے کہ خیر کا حاصل ہونا فقہ پر موقوف ہے، اور یہ کہ علم سیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے فوائد پر گفتگو چند وجوہ سے ہے۔

۷۲۔ فقہ کی حقیقت اور اسکی فضیلت

فقہ کے معنی لغۃً سمجھنا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے فَقِہ

ع تعلیق یہ ہے کہ کسی حدیث کو بلا سند بیان کیا جائے، امام بخاری نے تراجم ابواب میں بعض احادیث بلا سند بیان فرمائی ہیں ان کو تعلیقات بخاری کہا جاتا ہے ان میں جن احادیث کو صیغہ جزم کیساتھ روایت کیا گیا ہے وہ تو صحیح ہیں اور جن کو صیغہ جزم سے نہیں بیان کیا گیا ان میں بعض صحیح ہیں بعض حسن اور کوئی ضعیف بھی ہے ۱۲ ظ

فلانٌ یعنی وہ سمجھ گیا ہے، نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں

فمال ھؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا

ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایک بات بھی نہیں سمجھ سکتے

اور یہاں فہم میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ فہم فی احکام اللہ مراد ہو (یعنی احکام الٰہی کو سمجھنا) دوسرے یہ کہ فہم عن اللہ مراد ہو (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہم حاصل ہونا) اگر معنی اول مراد ہیں تو حدیث کے اگلے جملہ میں اس اجمال کی تفسیر ہوگی کیونکہ اس میں بتلایا گیا ہے کہ علم سیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے اور قاعدہ ہے کہ جب کلام میں مطلق و مقید جمع ہوں تو مطلق کو مقید پر حمل کیا جاتا ہے اور یہ فہم (یعنی احکام الٰہی کی فہم) سیکھنے ہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے اگلے جملہ میں بیان فرمایا ہے۔ پس طالب کو چاہیئے کہ اول کتابوں کا صحیح مطالعہ اور حفظ و ضبط اختیار کرے، جب ایسا کریگا تو خود اسی عمل پر اس کو ثواب ملے گا بشرطیکہ عمل خالص اللہ کے واسطے ہو کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے اور اس صورت میں اس کا ثواب وہ ہوگا جو معتبر ناقل کا ثواب ہوتا ہے اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

رب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ

کہ بعض فقہ کے یاد کرنیوالے اپنے سے زیادہ سمجھدار کو فقہ پہنچاتے ہیں، اسی طرح حج وداع میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

الا فلیبلغ الشاھد الغائب فلعل بعض من یبلغہ ان یکون أوعی لہ من بعض من سمعہ

سنو! جو یہاں حاضر ہے اسکو چاہیئے کہ غائب کو پہنچا دے کیونکہ ممکن ہے جن لوگوں کو یہ علم پہنچایا جائیگا وہ بعضے سننے والوں سے زیادہ اسکی نگہداشت کرنے والے ہوں۔"

یعنی وہ اس پر زیادہ عمل کرنیوالے ہوں پھر ان چیزوں کی تحصیل کے بعد

جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا اور ان پر عمل کرنے کے بعد اس کو حقیقی فقہ حاصل ہوگا اور وہ ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کے ساتھ یا اس کے ذریعہ اللہ کی قدرت سے دین کی فہم حاصل ہوتی ہے، اسی لئے امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ کثرت روایت کا نام علم نہیں بلکہ علم ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتے ہیں کیونکہ قلت فہم کیساتھ روایات حفظ کر لینے والوں میں عمل بہت کم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے کمثل الحمار یحمل اسفارا (کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر کتابیں لدی ہوں) اور اسی شرط کے فوت کرنے کی وجہ سے جو اس فقہ حقیقی کے حصول کا سبب ہے بہت لوگوں کی جو اپنے زعم میں چند کتابیں یاد کر لینے یا شروح کا مطالعہ کرنے سے علم کے مدعی بن گئے ہیں یہ حالت ہے کہ جب وہ کوئی ایسا مطلب سنتے ہیں جو اپنی یاد کی ہوئی یا مطالعہ کی ہوئی کتابوں میں منقول نہ دیکھا ہو تو اس کا بالکل ہی انکار کر دیتے ہیں اور دلیل میں یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو کسی کو اس کا قائل نہیں سنا اور اگر کسی کتاب میں ایسا مسئلہ دیکھ پاتے جس کے یہ خود قائل ہیں تو اگرچہ نقل میں غلطی ہو گئی ہو یا مصنف کو اشتباہ ہو گیا ہو اس کو فوراً قبول اور تسلیم کر لیتے اور کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ تو منقول ہے فلاں کتاب میں لکھا ہوا اور فلاں مصنف کا بیان کیا ہوا) ہے یہ سب کچھ محض اس وجہ سے ہے کہ ان کو خود وہ نور حاصل نہیں جس سے قرآن و حدیث کو سمجھتے (بس دوسروں ہی کے سہارے چلتے ہیں) کیونکہ انہوں نے وہ فضا حاصل نہیں کی جس پر نور چمکتا ہے اور گو بعضوں نے ظاہر میں یہ فضا حاصل کی ہے یعنی علم منقول جس کا اوپر ذکر ہوا مگر پھر بھی نور سے اسلئے محروم ہیں کہ یا تو ان کا عمل غیر اللہ کیلئے تھا اور اس صورت میں نور ان کیلئے حرام ہے (یعنی دشوار ہے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اعمال میں سے کوئی عمل متاع دنیا حاصل کرنے کیلئے اختیار کریگا وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو پانچ سو برس کی مسافت سے سونگھی جاتی ہے، یا ان کو اپنی نقل اور روایت ہی

سے عجب ہونے لگا کہ وہ اسی کو علم کی غایت سمجھ گئے اور اپنے کو علماء میں شمار کرنے لگے اور اس دعوے کی وجہ سے نور سے محروم رہ گئے، اگر اس مسکین (مدعی) کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہوتی (اور اپنا درجہ پہچان لیتا کہ وہ صرف ناقل کے خطاب کا مستحق ہے۔ بشرطیکہ اس کی صحیح نقل بھی ہوتی ہو تو اپنے نقصِ حال اور کمزوری کا اعتراف کر لیتا اور اس اعتراف پر یہ امید کی جا سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے کچھ نور سے اپنے فضل سے عطا فرما دیتے اور جس کو نور سے کچھ حصہ مل جائے اس کے لئے توفیق مزید اور ترقی کی بھی امید ہے یہاں تک کہ اُن اہل خشیت کے ساتھ ملحق ہو جائے جن کا اوپر ذکر ہوا، غرض آجکل کے مدعیانِ علم کی حالت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ اُن کے پاس ہے سب کا سب منقول ہی ہے اصول بھی کتابوں ہی میں ہیں اور شروح بھی کتابیں ہی ہیں جو ان پر لدی ہوئی ہیں اور یہی تو وہ چیز ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مذمت فرمائی جس کے ساتھ توفیق شاذ و نادر ہی شامل ہوتی ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں اس اندھے پن اور گمراہی سے اور اگر فقہ سے مراد دوسری صورت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہم کا حاصل ہونا تو یہ حدیث اپنے مفہوم میں مستقل ہوگی اور دوسری حدیث جو بعد میں آتی ہے مستقل ہوگی کیونکہ اس سے فہم عن اللہ مراد ہے اور دوسری سے احکامِ الٰہی کی فہم مراد ہے اور دو حدیثوں کا الگ الگ دو معنوں پر محمول ہونا ایک معنی پر محمول ہونے سے زیادہ مفید اور زیادہ ظاہر ہے۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ جس حدیث سے ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں اس میں فقہ سے مراد دونوں معنی ہوں اور اگلی حدیث ان دونوں میں سے ایک کی موکد ہو اور یہ صورت بھی ظاہر و واضح ہے کیونکہ احکامِ الٰہی کا سمجھنا زیادہ ضروری ہے اور یہ فہم نورِ الہام سے حاصل ہوتی ہے اور نورِ سنت سے حاصل ہوتا ہے جیسا حدیث بیعت کی شرح میں ہم نے اس پر اشارہ کر دیا ہے اور یہ نور اہل تحقیق ہی کو حاصل ہوتا ہے جو صدق و اخلاص اور ہدایت و نور اور حکمت و برہان سے آراستہ ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھایا تو سمجھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چاہا تو انہوں نے

ارادہ کیا، یہی اللہ کے برگزیدہ مکرم ہیں اور زمین میں خدا کی آنکھیں ہیں جیسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق فرمایا تھا کہ زمین کی مخلوقات میں سے کچھ لوگ اللہ کی آنکھیں ہیں انہی میں سے علی بھی ہیں۔ نیز حضرت عمر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہم ایسی مشکل سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں جس کے حل کیلئے علی رضی اللہ موجود نہ ہوں، حالانکہ حضرات خلفاء رسب کے سب ہی سرتاپا عیون تھے مگر ان میں سے ہر ایک دوسرے کو اپنے سے بڑھاتا تھا کیونکہ وہ اپنے کو سب سے کم سمجھتے اور اپنے ساتھیوں کی اُن فضائل کی بناء پر جن سے اللہ نے اُن کو مخصوص کیا تھا تعظیم کرتے تھے یہی شان حضرات تابعین کی ہے جنہوں نے اخلاص کیساتھ اُن کی پیروی کی اور قیامت تک کرتے رہیں گے، غرض جس شخص کو اللہ تعالیٰ کیطرف سے فہم حاصل ہو گیا وہ اللہ کے احکام کو بھی سمجھ لیتا ہے مگر اس کا عکس لازم نہیں کہ جس کو احکام کی فہم حاصل ہو اس کو فہم عن اللہ بھی حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی مخلوق میں سے منتخب کیا تو انہوں نے بھی اللہ کو تمام مخلوق اور جملہ ماسوا پر ترجیح دی۔ پس وہ اللہ کے ساتھ ہیں اور بلا شرکت غیرے اسی کے واسطے ہیں اور کسی پر التفات نہیں کرتے ہم اللہ سے ان بزرگوں کی حرمت کے طفیل درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے حال پر بھی کرم فرمائیں جیسا اُن پر کرم فرمایا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی پروردگار نہیں (اور حقیر کو عزیز کر دینا اُن پر کچھ دشوار نہیں)

(قوله الوجه الثالث الفقه هو الفهم يقال فقه فلان اذا فهم الى قوله ان يمن علينا بما من عليهم (۲ رب سوا ٤)

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم کتابی لفظی، دوسرا علم وہبی حقیقی، علم کتابی پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے اور علم وہبی اتباع سنت اور تقویٰ و اخلاص سے حاصل ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ علم وہبی کے واسطے علم کتابی کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ امر عادۃ اللہ کیخلاف ہے اللہ تعالیٰ کی عادت مستمرہ یہی ہے کہ علم وہبی اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس نے اول علم کتابی حاصل کیا ہو اور سنت کے موافق خلوص و تقویٰ کیساتھ اس پر عمل کیا ہو، بدون اس کے علم وہبی عادۃً

حاصل نہیں ہوتا۔ الاناذ ًاوالنادر کالمعدوم، پس جو لوگ بدون علم کتابی کی تحصیل کے اپنے لئے علم وہبی کے مدعی ہوں اُن کے علوم کو کتاب و سنت اور سلف صالحین کے علوم سے ملا کر دیکھنا چاہیئے۔ اگر سلف کے علوم سے موافق ہوں اور کتاب و سنت کیخلاف نہ ہوں تو ان کو اولیاء امتیین میں شمار کیا جائے گا جن کی شان یہ ہوتی ہے کہ احکام آلہیہ کو علماء سے دریافت کرتا اور ان کی تعظیم کا حق ادا کرتے ہیں اور جس جاہل کے اقوال کتاب و سنت کیخلاف ہوں علوم سلف کے موافق نہ ہوں اور اعمال میں اتباع سنت کی بجائے ابتداع کی شان ہو اس کو علم وہبی کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی اس کی باتوں کو مجنون کی بڑ اور جاہل کی بکواس سمجھنا چاہیئے ایسے ہی لوگوں نے اپنی بکواس کو علوم و اسرار بنانے کیلئے عوام کے دلوں میں یہ غلط خیال جمانے کی کوشش کی ہے کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان رہزنان ایمان سے بچائے۔ آمین۔

۳۷۔ جس کو علم عطا کیا گیا اس کو خیر عظیم عطا ہو گئی

اس تقریر پر یہ بات بھی مرتب ہوئی کہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسموں میں سے کسی ایک قسم کے ساتھ احسان فرمایا ہے (خواہ علم کتابی عطا فرمادیا ہو یا علم وہبی) اس کو خوش ہونا چاہیئے کہ خیر عظیم اور فضل عمیم عطا ہوا ہو۔ کیونکہ شارع علیہ السلام نے عطائے علم و فقہ کو اس بات کی علامت قرار دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا اور خیر کو اس کے لئے مہیا کر دیا ہے اور یہ لوگ بشارت کے کیوں مستحق نہ ہوں؟ جبکہ انہی کی برکت سے اللہ تعالیٰ بارش بھیجتے اور قحط کو دفع کرتے اور بستیوں پر اور بندوں پر رحم فرماتے ہیں

(قولہ الوجہ الرابع بترتیب علی ھذا من الفقۃ الی قولہ و یرحم البلاد والعباد)

ف انقلاب زمانہ تو دیکھو کہ آجکل علماء کو انگریزی خوانوں نے مسلمانوں کی

تباہی و بربادی کا سبب قرار دیا ہے اور ایک جماعت نے تو اس بات کا بیڑا اٹھایا ہے کہ مسلمانوں کو علماء سے متنفر کر کے بالکل اس سے منقطع کر دے، اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ علماء سے جنگ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ ہے صحیح حدیث میں وارد ہے

من آذی لی ولیا فقد آذنتہ بالحرب

جو میرے ولی کو ایذا دے میں اس کو اپنی طرف سے اعلان جنگ دیتا ہوں

اور جس کو اللہ تعالیٰ اعلان جنگ دیں اس کو اپنا ٹھکانا ڈھونڈھ لینا چاہیئے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ آج کل بعض جہلا بھی عمامہ، جبہ اور سند لیکر علماء بن گئے ہیں لیکن چند مکاروں کی وجہ سے ساری جماعت کو بدنام کرنا کہاں کا عدل وانصاف ہے! جھوٹے اور سچے ہر جماعت میں ہوا کرتے ہیں اور ہوتے آئے ہیں مگر جھوٹوں کی وجہ سے سچوں کو بدنام کرنا جہل وحماقت نہیں تو اور کیا ہے، فالی اللّٰہ المشتکی اگر وہ کسی عالم کو خلاف شریعت عمل کرتے دیکھیں تو خاص اسی کو الزام دے سکتے ہیں کہ یہ شخص عالم نہیں بلکہ جاہل ہے، ساری جماعت کو الزام دینا یقیناً عقل ونقل وقانون و انصاف کے سراسر خلاف ہے۔ ان لوگوں کو جان لینا چاہیئے کہ چاند کے طلوع ہونے پر کتے ہمیشہ بھونکا کرتے ہیں مگر اس سے چاند کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا، کتے ہی اپنا گلا پھاڑ کر رہ جاتے ہیں ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

۴، علم وہی ہے جس سے خیر کی طرف رہنمائی ہو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ارشاد انما العلم بالتعلم میں حصر کے لئے حرف انما اس واسطے لایا گیا تاکہ بتلا دیا جائے کہ علم تک رسائی سیکھنے اور حاصل کرنے ہی سے ہوسکتی ہے اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں جو شخص اس کے سوا کوئی طریقہ اختیار کریگا وہ راستہ

سے کھویا جائے گا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اور تعلم پہ الف لام
اس لئے داخل فرمایا تاکہ بتلا دیا جائے کہ علم وہی ہے جو خیر کی علامت ہو
نیکی کیطرف رہنما ہو) کیونکہ دنیا میں علوم بہت ہیں آپنے الف لام داخل فرماکر جو
تعیین اور تخصیص کے لئے لغت میں موضوع ہے اس خاص علم نافع پر تنبیہ فرمادی
جس کا ہم سے ارادہ کیا گیا ہے، اگر کوئی یوں کہے کہ الف لام تو کبھی جنس کے لئے بھی
ہوتا ہے اس سے کہا جائے گا کہ یہاں جنس کیلئے ہونا جائز نہیں کیونکہ علوم شرائع
وعلوم انبیا آدم علیہ السلام سے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کے سب علوم
اللہ تعالیٰ کیطرف سے انبیاء علیہم السلام تک پہنچے ہیں خواہ فرشتہ کیواسطہ سے
پہنچے ہوں یا بلا واسطہ جیسا بھی حکمت کا تقاضا ہوا چنانچہ قواعد شرائع سے سب
باتیں معلوم ہو چکی ہیں پھر افراد امت ان علوم کو انبیاء علیہم السلام سے لیتے اور
حاصل کرتے رہے، پس علوم انبیاء کی اصل اور بنیاد نقل پہ ہے اور جب اس کی بنیاد
نقل پہ ہے تو الف لام یہاں عہد و تخصیص کے سوا کسی اور معنی کے لئے نہیں ہو سکتا
کیونکہ یہاں علم سے مراد علم شرعی ہے اور علم شرعی کے سوا جو اور علوم ہیں اُن کی
اصل اور بنیاد نقل پہ نہیں بلکہ رائے اور فکر پہ ہے جن میں سے بعض رائیں تو شرعاً
حد جواز میں ہیں اور بعض شرعاً ممنوع ہیں اسی علت کی وجہ سے کہ دنیا میں علوم
بکثرت ہیں اور ان میں سے بعض ممنوع بھی ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ شارع کے
اس کلام میں الف و لام جنس کیلئے ہو بلکہ تخصیص و تعیین کے لئے ہونا ضروری ہے
اور جس علم پہ یہاں اشارہ کیا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایکدوسری حدیث
میں اس کو صاف طور سے بیان فرمادیا ہے چنانچہ ارشاد ہے

ترکت فیکم الثقلین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللّٰہ
و عترتی اھل بیتی

میں نے تمہارے پاس دو قیمتی چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان کو
مضبوط تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے، کتاب اللہ اور میرے اہل بیت

میرا خاندان (کیونکہ خاندان نبوت کے ذریعہ سے حضورؐ کے ارشادات و معمولات و حالات کا علم ہوگا جس سے کتاب اللہ کی شرح میں مدد ملتی ہے) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان چند علوم کی تصریح بھی فرمادی ہے جو ثقلین سے مستفاد ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

تعلموا الفرائض فانها من دینکم وهی اول ما ینسی

فرائض کو سیکھو کیونکہ وہ تمہارے دین کا جزو ہے اور یہی سب سے پہلے بھلا دیا جائے گا۔

نیز ارشاد ہے:

تعلموا الفرائض وعلموها الناس فانی امرا مقبوض

فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھلاؤ کیونکہ میری وفات ہونیوالی ہے۔

نیز ارشاد ہے:

وان العلم یقبض من بعدی حتی ان الاثنین یختلفان فی الفریضة ولا یجد ان من یفصل بینهما

علم میرے بعد سمیٹ لیا جائیگا (یعنی فنا ہو جائے گا)، یہاں تک کہ دو آدمی کسی معاملہ میں جھگڑیں گے اور کوئی فیصلہ کرنیوالا نہ پائیں گے

غرض علم خاص وہی ہے جو شریعت سے معلوم ہو چکا ہو یا اہل اسلامیہ کی ایسی عادت سے جسمیں شرعاً کوئی خرابی نہیں جو علوم شریعت سے پہچانے جاتے ہیں وہ تو وہ ہیں جنکی تبلیغ کا حج وداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر فرمایا ہے اور جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یسروا ولا تعسروا — آسانی کرو سختی نہ کرو

جس میں تعلیم کے اندر نرمی کرنے کا حکم ہے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انما انا قاسم واللہ یعطی میں تو تقسیم کرنیوالا ہوں اور اللہ ہی دیتا ہے جسکی شرح اگلی حدیث میں آئے گی۔

اور جو علوم عادت سے معلوم کئے جاتے وہ ایسے ہیں جیسے بچوں کا استاد ان کو ہجا سکھلاتا ہے حروف کی پہچان بتلاتا ہے اس کے بعد قرآن پڑھاتا پھر لغت بتلاتا ہے تاکہ لوگ اپنے پروردگار کا کلام اور اپنے رسول کی حدیث پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں اور اسکے سوا جو علوم اور اصطلاحات ایجاد کی گئی ہیں جن کو دلائل شریعت جائز نہیں کہتے وہ سب ممنوع ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی بھی تصریح فرمادی ہے چنانچہ ارشاد ہے

یأتی فی آخر الزمان قوم یحدثونکم بما لا تعرفون
انتم ولا آباءکم فخذوا ما تعرفون ودعوا ما تنکرون
آخر زمانہ میں بعض لوگ تمہارے سامنے ایسی باتیں بیان کریں گے
جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے بھی نہیں جانی پس اُن باتوں کو
لے لو جن کو تم پہچانتے ہو اور اُن کو چھوڑ دو جن کو نہیں پہچانتے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فقہ اور فہم حقیقی علم منقول کی تحصیل کے بعد یا اسکی ساتھ ساتھ ہی حاصل ہو سکتا ہے ، بدون اس کے حاصل نہیں ہو سکتا جیسا ہم نے پہلے بیان کیا ہے کیونکہ اصل تو وہی ہے فقہ اور فہم اس کی فرع ہے ۔ اسی لئے حدیث میں ایک کو دوسرے پر واو کی ساتھ عطف کیا گیا جو کہ دو چیزوں میں مساوات اور شرکت کو مقتضی ہے اللہ تعالیٰ ہم کو دونوں کا پورا حصہ اپنے فضل سے عطا فرمائیں ، آمین قولہ الوجہ السادس قولہ علیہ السلام ہ وانما العلم بالتعلم الی قولہ فی الوجہ السابع او زعنا اللہ من کلیھما اوفر نصیب بمنہ ا

ف ۱ ۔ اس مقام سے ہمارے اس قول کی تائید ہو گئی جو فائدہ سابقہ میں گذر چکا ہے کہ علم وہبی بدون علم منقول کے عادتاً حاصل نہیں ہو سکتا

ف ۲ ۔ اس مقام سے اُن لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو گئی جو فضائل علم کی احادیث کو مطلق علم کی فضیلت پر محمول کر کے علوم دنیا کیلئے بھی ان فضائل کو

ثابت کرتے اور تعلیم انگریزی وغیرہ کی تاکید و ضرورت کے لئے طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم واطلبوا العلم ولو بالصین پڑھ دیا کرتے ہیں اُن کو جان لینا چاہیئے کہ شارع کی زبان پر علوم دنیا کے حق میں لفظ علم نہیں آسکتا بلکہ ان کی نسبت تو شارع علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے ان من العلم لجھلا کہ بعض علم جہل ہوتا ہے، علم وہی ہے جو انسان کو خدا کی طرف لیجائے اور معرفت حق کی رہنمائی کرے اس کے سوا جتنے علوم اہل دنیا کی نظر میں ہیں شارع کے نزدیک سراسر جہل ہیں ؎

جز یادِ دوست ہرچہ کنی عمر ضائع ست
جز حرفِ عشق ہرچہ بخوانی بطالت ست
سعدی بشوی نقش دوئی راز لوحِ دل
علمے کہ رہ حق نماید جہالت ست

باب ۵۵ دہم

حدیث

مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا

البخاری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
من سلك طريقا يطلب به علما سهل الله له طريقا الى الجنة
(ترجمہ) بخاری رضی اللہ عنہ (تعلیقا) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی راستہ میں طلب علم کی غرض سے داخل ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیں گے۔

شرح حدیث کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کام کا اس غرض سے ارادہ کرے کہ اس سے طلب علم میں مدد و اعانت ہو گی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت تک پہنچنا آسان کر دیں گے۔

(۷۵) جو چیز نیکی میں معین ہو وہ بھی خیر ہے یہاں سلوک سے مراد دخول ہے جیسا اللہ تعالیٰ کے ارشاد ما سلككم فی سقر اور ارشاد نبوی لو سلكوا جحر ضب لسلكتموہ میں سلوک سے مراد دخول ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس جگہ جو ثمرہ مذکور ہے وہ طلب علم کے طریق میں داخل ہونے کے لئے مخصوص ہے یا اس کے سوا ہر نیک کام کو عام ہے ظاہر عموم ہے کیونکہ شریعت میں اسکی نظائر بہت ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا يقضى القاضى حين يقضى وهو غضبان

"قاضی کو غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرنا چاہیئے۔" (یہ حکم قاضی ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر فیصلہ کرنیوالے کے لئے عام ہے) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ینفق علی عیالہ یحتسبھا" "جو شخص اپنے بال بچوں پر طلب ثواب کی نیت سے خرچ کرے وہ اس کے لئے صدقہ ہے" (یہ حکم بھی جملہ ابواب برّ کو عام ہے) جیسا پہلے اس کلام پر گذر چکا اور جب یہ حکم عام مان لیا گیا تو اس سے یہ فقہی مسئلہ معلوم ہوا کہ جو چیز خیر میں معین ہو وہ بھی خیر ہے۔ اس کی تصریح بعض نصوص میں آچکی ہے چنانچہ مجاہد کے بارہ میں وارد ہوا ہے کہ اس کی نیند بھی عبادت ہے کیونکہ اس سے جہاد میں مدد ملتی ہے۔ مگر یہ حکم کلی نہیں بلکہ دو شرطوں کے ساتھ مقید ہے۔ ایک یہ کہ جس سے مدد و اعانت لی جا رہی ہو وہ شرعاً جائز ہو حرام و مکروہ نہ ہو اسکی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جبکہ آپ سے ایک شخص نے اپنے لئے وصیت کی درخواست کی تو حضور نے فرمایا ایسی بات (کبھی) نہ کہو جس سے قیامت کے دن معذرت کرنا پڑے۔"

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کو تنگدستی کی وجہ سے فاقہ کی نوبت پہنچی اور عبادات میں تعب ہونے لگا پھر ان کو کچھ دودھ ہدیہ میں ملا جو حلال اور طیب طریقہ سے نہیں آیا تھا یہ اس کے پینے سے رک گئے ان کی والدہ نے فرمایا کہ دودھ پی لو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دیں گے فرمایا مجھے اس کے نہ پینے ہی میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہے تو دیکھو یہ بزرگ اس دودھ کے پینے سے کس طرح باز رہے حالانکہ اس سے ان کے مقصود میں بظاہر مدد مل سکتی تھی مگر چونکہ اس میں کسی قدر کراہت بھی تھی اس لئے اقدام نہ کیا کیونکہ بہ نسبت فائدہ کے اسمیں خسارہ زیادہ تھا بلکہ (درحقیقت) وہ فائدہ سے بالکل ہی خالی تھا کیونکہ طاعت پر تو حلال (خالص) ہی سے مدد ملتی ہے، دوسری شرط یہ ہے کہ اس معین کو اختیار کرتے ہوئے طلب علم یا اور کسی نیک کام میں مدد و اعانت حاصل کرنے کی نیت بھی ہو کیونکہ فعل مباح سے نہ کچھ ثواب ہوتا ہے نہ جنت کیطرف قرب ہوتا ہے جب تک اس سے طاعت پر مدد و اعانت کی نیت نہ کی جاوے۔

پس جن چیزوں سے طلب علم وغیرہ میں مدد حاصل کرنے کی نیت کی جاوے خواہ فرض ہو یا مستحب اس سے مستحب کا ثواب بھی ملے گا اور جنت کی طرف قرب بھی زیادہ ہو جائیگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طریقاً کو نکرہ استعمال فرمایا ہے اور نکرہ فرض و مستحب اور مباح کو عام ہے اور چوتھی صورت (یعنی حرام یا مکروہ سے مدد لینا) تو ممنوع ہے۔ (پس وہ اس عموم سے خارج ہے)

اور کیا فرض میں بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اس سے طلب علم یا کسی نیک کام میں مدد کی نیت کی جاوے تو فرض کا بھی ثواب ملے گا اور اس نیت کی وجہ سے جنت کی طرف زیادہ قرب بھی حاصل ہو؟ فقہا کا مشہور مذہب تو اس صورت کو منع کرتا ہے مگر حدیث کا لفظ عام جواز کو مقتضی ہے تو جو شخص اختلاف سے بچنا اور نص حدیث پر عمل کرنا چاہیئے تاکہ زیادہ ثواب ملے وہ اس طرح اس صورت میں نیت کرے جس طرح جمعہ کے دن جنابت کا غسل کرنیوالا نیت کرتا ہے تو وہ اختلاف سے بچنے کے لئے یوں نیت کرتا ہے کہ میرا غسل تو جنابت کے لئے ہے اور امید ہے کہ غسل جمعہ کی طرف سے بھی یہ مجھے کافی ہو جائے گا اس طریقہ (سے نیت کرنے) میں اختلاف سے بھی بچاؤ ہو جاتا ہے اور لفظ حدیث کا اتباع اور اس پر عمل بھی ہو جاتا ہے۔ (قوله الوجه الاول قوله عليه السلام من سلك طريقا السلوك بمعنى الدخول الى قوله و يكون متبعا للفظ الحديث عاملا عليه)

(۷۶) طلب علم اور تحصیل علم دونوں علم حقیقی کے اسباب ہیں

یطلب بہ علما میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ طلب علم سے تحصیل علم اور اس میں مشغول ہونا مراد ہو دوسرے یہ کہ علم کا اہتمام اور اس میں کوشش کرنا مراد ہو جس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے " تعلموا العلم فان تعلمه لله حسنة و طلبه عبادة " " علم حاصل کرو کیونکہ اللہ کے واسطے علم حاصل کرنا نیکی ہے اور اس کی طلب عبادت ہے " اس ارشاد میں حضور نے تعلم اور طلب علم میں فرق کیا ہے اور

نفس طلب کو تعلم محض سے اعلیٰ قرار دیا ہے کیونکہ حضور نے طلب کو تو عبادت سے تشبیہ دی ہے اور تعلم کو جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہو حسنہ قرار دیا ہے اور حسنہ کو عبادت متضمن ہوتی ہے (اس لئے عبادت حسنہ سے اعلیٰ ہے) اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ یہاں وسیلہ مقصود سے کیوں افضل ہو گیا حالانکہ معاملہ برعکس ہونا چاہیئے تھا جیسا قواعد شریعت و قوانین عبادت سے معلوم ہو چکا ہے کہ مقصود وسیلہ سے افضل ہوتا ہے) جواب یہ ہے کہ مقصود کو وسیلہ سے کم رتبہ یا اس کے مساوی نہیں کیا گیا (بلکہ دو وسیلوں میں سے ایک کو اعلیٰ ایک کو ادنیٰ بتلایا گیا) ہے کیونکہ (علم) مقصود تو وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ قلوب میں القاء فرماتے ہیں جیسا علماء سے ہم نے (اوپر) نقل کیا ہے اور پڑھنا پڑھانا روایت اور نقل تو اس نور کی تحصیل کا سبب ہے جس سے علم (حقیقی) حاصل ہوتا ہے۔ جیسا امام مالک کا ارشاد پہلے گذر چکا کہ علم کثرت روایت کا نام نہیں خلاصہ یہ کہ یہاں جن دو چیزوں کا ذکر ہے وہ دونوں اس نور کی تحصیل کے اسباب میں سے ہیں (مقصود ان میں سے ایک بھی نہیں) اور چونکہ ان میں سے ایک نفس پر زیادہ گراں اور دشوار ہے یعنی کوشش اور اہتمام اس کو عبادت کا درجہ دیا گیا جسمیں نفس پر مشقت اور مجاہدہ ہے اور دوسرا آسان ہے یعنی پڑھنا پڑھانا اس کو حسنہ قرار دیا گیا اور شارع علیہ السلام کا یہ ارشاد اس باب میں صریح ہے جو علماء سے اوپر نقل کیا گیا ہے کہ علم کثرت روایت کا نام نہیں حدیث کا بقیہ حصہ یہ ہے:

ومذاکرته تسبیح وتعلیمه لمن لا یعلمه صدقة وبذله لاهله قربة، لانه معالم الحلال والحرام منازل سبل اهل الجنة والانیس فی الوحشة والصاحب فی الغربة والمحدث فی الخلوة والدلیل علی السراء والضراء والسلاح علی الاعداء والذین عند الاخلاء یرفع الله به اقواما ویجعلهم فی الخیر قادة وائمة تقتبس آثارهم

يقتدى بافعالهم وينتهى الى رأيهم ترغب الملائكة فى خلتهم وباجنحتها تمسحهم ويستغفرلهم كل رطب ويابس حتى الحيتان فى البحر وهوامه، وسباع البر وانعامه، لان العلم حياة القلوب من الجهل ومصباح الابصار من الظلمة بالعلم تبلغ منازل الاخيار والدرجات العليا فى الدنيا والآخرة والتفكر فيه يعدل بالصيام ومدارسته بالقيام وبه توصل الارحام ويعرف الحلال والحرام والعلم امام العمل والعمل تابعه فيلهمه السعداء ويحرمه الاشقياء

علمی مذاکرہ تسبیح ہے (یعنی علمی مذاکرہ و تکرار کا وہی ثواب ہے جو ذاکر و شاغل کی تسبیح و ذکر کا ثواب ہے پس یہ نہ سمجھو کہ تحصیل علم میں مشغول ہونے والے ذاکر نہیں یا وہ ذاکرین سے کم ہیں بشرطیکہ نیت خالص ہو) اور جاہلوں کو علم دینا صدقہ ہے اور جو اس کے اہل ہیں ان پر اچھی طرح علم کی بارش کرنا قربت و طاعت ہے۔ کیونکہ علم ہی حلال و حرام کے نشان قائم کرنیوالا ہے اور اہل جنت کے راستوں کی منزل ہے۔ علم وحشت و پریشانی کا انیس اور غربت و بیکسی کا ساتھی اور خلوت میں باتیں کرنیوالا اور راحت و غم کا بتلانے والا، دشمن کے مقابلہ میں زبردست ہتھیار اور دوستوں کے سامنے زینت بخشنے والا، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے بعض لوگوں کو بلندی و رفعت عطا فرماتا اور ان کو خیر کا مقتدا و امام بنا دیتا ہے جن کے آثار سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور افعال کی اقتداء کی جاتی ہے اور ان کی رائے پر (معاملات مہمہ کا) آخری فیصلہ کیا جاتا ہے ملائکہ ان کی دوستی کی خواہش کرتے اور اپنے پروں کو ان سے چھواتے ہیں اور تمام خشک و تر مخلوقات ان کے لئے استغفار کرتی ہے۔

حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں اور کیڑے اور جنگل کے درندے اور چوپائے بھی کیونکہ علم (موت) جہل سے دلوں کو زندہ کرتا اور تاریکی دور کرکے بصیرتوں کو روشنی

بخشتا ہے ، علم سے ہی نیک بندوں کے مقامات تک رسائی ہوتی اور دنیا و آخرت میں درجات عالیہ حاصل ہوتے ہیں۔ علمی باتوں میں فکر و غور کرنا روزہ کے برابر اور ان کا پڑھنا پڑھانا شب بیداری کے مساوی ہے۔ علم ہی سے صلہ رحمی کی جاتی ہے اور حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے۔ علم عمل کا امام ہے اور عمل اس کا مقتدی اس لئے نیک بختوں ہی کے دل میں علم کا شوق ڈالا جاتا ہے ، بدبخت اس سے محروم رہتے ہیں (ترجمہ حدیث کا پورا ہوا) اور یہ تمام خوبیاں اور نعمتیں اسی وقت حاصل ہوتی ہیں جبکہ دو شرطیں پائی جائیں اور پوری طرح پائی جائیں (یعنی اول تحصیل علم کے لئے اہتمام اور کوشش کرنا پھر تحصیل علم میں لگ جانا) اس کے بعد یہ تمام بھلائیاں خود ہی ان دو شرطوں کے پیچھے پیچھے ہوں گی۔ اس حدیث کو صاحب حلیہ نے روایت کیا ہے اور اگر کوئی حجتی اس حدیث کے ضعف کا بہانہ ڈھونڈے تو اس سے کہہ دیا جائے کہ استاذ سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح بتلایا ہے (قولہ الوجہ الثانی قولہ علیہ السلام یطلب بہ علما الی قولہ فی الوجہ الرابع صحح اسنادہ الاستاذ سمرقندی رحمہ اللہ)

(۷۷) جہنم سے نجات ہو جانا بھی بڑی کامیابی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیں گے ، کسی ثواب یا حسنہ کا ذکر نہیں فرمایا جیسا اس حدیث میں بیان فرمایا ہے جس کو ہم نے بروایت حلیہ ذکر کیا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر حسنہ سے مراد ثواب ہے اور تسہیل سے مراد حصول علم کا راستہ آسان کرنا (جو دخول جنت کا سبب ہے) تو اس صورت میں حسنہ کا درجہ تسہیل سے بڑھا ہوا ہے اور تسہیل سے مراد وصول جنت کا آسان کرنا ہے تو اس صورت میں تسہیل کا درجہ حسنہ سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ جنت کے قریب بندہ جبھی پہنچ سکتا ہے جبکہ جہنم سے بچا لیا جائے اور جہنم سے بچ جانا بہت سی حسنات سے افضل ہے جن کے

ساتھ میں جہنم میں جانا پڑے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اور کچھ بھی نہ ہو صرف جہنم سے نجات مل جائے تو یہی بڑی کامیابی ہے پس تسہیل جنت کا درجہ حسنہ سے بلند و برتر ہوا۔ (الوجہ الخامس قولہ علیہ السلام سہل اللہ علیہ طریقا الی الجنۃ الی قولہ فیکون التسہیل ارفع من الحسنۃ وافضل)

ف ہمارے حکیم الامت دام مجدہم کا مذاق بعینہ یہی ہے فرماتے تھے کہ مجھے درجات عالیہ کی ہوس نہیں بس اتنا چاہتا ہوں کہ جہنم سے نجات ہو جائے پھر چاہے اہل جنت کی جوتیوں ہی میں جگہ مل جائے الحمد للہ کہ اس مذاق کی تائید حدیث سے بھی ہو گئی۔

(۸۷) علم شریعت کا طالب اللہ تعالیٰ کی پناہ میں ہے

یہ ثواب جو اس عمل (یعنی طلب علم) پر مرتب کیا گیا ہے اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ صرف آخرت کے ساتھ مخصوص ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کو عام ہو اگر ہم اس حدیث کے لفظ کو دیکھیں تو یہ ثواب آخرت ہی کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتا ہے اور اگر دوسری احادیث پر نظر کریں تو اس کو دنیا و آخرت دونوں کے لئے عام کہہ سکتے ہیں اور زیادہ ظاہر یہی ہے جس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

"من خرج الی المسجد لیعلم خیراً اولیتعلمہ کان فی ذمۃ اللہ فان مات ادخلہ اللہ الجنۃ وان رجع کان کالمجاھد رجع بالاجر والغنیمۃ"

"جو شخص مسجد کی طرف اس واسطے جائے کہ اچھی باتیں بتلائے گا یا سیکھے گا وہ اللہ کی پناہ میں ہو گا۔ اگر اس حال میں مر جائے تو اللہ اس کو جنت میں داخل کریگا اور اگر واپس آئے گا تو مجاہد کیطرح ثواب غنیمت لیکر لوٹے گا۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرما دی ہے کہ اس کو دنیا میں بھی یہ ثواب ملے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ اور ذمہ داری میں ہوگا تو اب اس کے سوا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کہ طلب علم پر جو ثواب عطا ہوتا ہے وہ دنیا و آخرت دونوں کو عام ہے مگر یہ اسی وقت ہے جبکہ علم مخصوص یعنی علوم شریعت کو طلب کیا جائے جسکی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (الف لام عہد سے) اشارہ فرمایا ہے اور طلب بھی اللہ کے لئے خالص ہو اور اخلاص اور حقیقت فقہ کا حاصل ہونا ہی تو بڑی چیز ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے۔ اور اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں کا مجموعہ حاصل ہو جائے تو حقیقی سعادت نصیب ہوگئی کیونکہ ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ اگر یہ وصف کسی میں پایا جائے تو اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص کے ساتھ استدراج کا برتاؤ نہیں ہوگا۔ اور نہ پیچھے کو لوٹے گا۔ (بلکہ اس کا خاتمہ اچھا ہوگا اور بے کھٹکے جنت میں جائیگا)۔ اس کے قریب وہ بات ہے جو ھرقل نے کہی تھی اور وہ سچی اور کھلی ہوئی بات ہے کہ ایمان جب دل کے اندر پیوست ہو جاتا ہے پھر اس میں سے نہیں نکلتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل واحسان سے یہ دونوں باتیں ہم کو عطا فرمائیں (قولہ الوجہ السابع ھذا الثواب المذکور علی ھذا الفعل احتمل ان یراد بہ الآخرۃ الی قولہ من اللہ علینا بمجموعھما بمنہ و یمنہ)

ف اس مقام سے اہل علم کو سبق لینا چاہیئے کہ جب وہ اللہ کی پناہ اور ذمہ داری میں ہیں پھر معاش کی طرف سے کیوں پریشان ہوتے ہیں ان کو اخلاص کے ساتھ علم حاصل کرنا اور علم حقیقی کے لئے سعی کرنا چاہیئے اور امر معاش کی طرف سے بےفکر رہنا چاہیئے۔ ۱۲ ظ

ف طلب علم میں اخلاص کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ امر معاش کی پریشانی نہ ہو جس شخص کو معاش کے متعلق پریشان دیکھا جائے سمجھ لو کہ اس نے اخلاص نیت کے ساتھ علم حاصل نہیں کیا۔

ف: اخلاص فی العلم کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کے وسیلہ سے بارگاہ الٰہی میں عرض معروض کر سکے۔ جس شخص نے اخلاص کے ساتھ علم حاصل نہیں کیا وہ اپنے علم کے وسیلہ سے دعا کی جرأت نہیں کر سکتا۔ قالہ العلامۃ عبد الوہاب الشعرانی۔

ف: حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد تعلیم و تعلم کی خاص جگہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ تعلیم باجرت نہ ہو اور علوم شرعیہ کے سوا کسی اور علم کی تعلیم نہ ہو۔

باب یازدہم ۱۱

حدیث
قیام الامت المحمدیۃ علی الحق الی یوم القیامت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں اور میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی کوئی مخالف اس کو ضرر نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔

شرح ظاہر حدیث تین احکام پر دلالت کرتا ہے۔ ایک خیر کا تفقہ فی الدین پر معلق و موقوف ہونا۔ دوسرے اعطا کا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے لئے بلا شرکت غیرے مخصوص ہونا۔ تیسرے یہ کہ اس امت میں سے کچھ لوگ قیامت تک حق پر رہیں گے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے ان کی مخالفت کرنے والا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور اس میں چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۹۷) **مبارک ہے وہ جس کے ہاتھوں سے خیر کا سلسلہ جاری ہو** حضور کا یہ ارشاد کہ میں تو تقسیم کرنیوالا ہوں دینے والا اللہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور اللہ کے نزدیک آپکے مرتبہ کی عظمت و بلندی کی بڑی دلیل ہے کیوں کہ

جس خیرِ عظیم سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر رحم فرمایا ہے اس کی تقسیم کو آپ کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں نے خیر کو پیدا کیا اور اس کے اہل اور قابل طبائع کو بھی پیدا کیا پس مبارک ہیں وہ جن کو میں نے خیر کے لئے پیدا کیا اور خیر کو ان کے لئے پیدا کیا اور ان کے ہاتھوں سے خیر کے سلسلہ کو جاری کیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں میں جن کے ہاتھوں خیر کے سلسلہ کو جاری کیا گیا ہے سب سے افضل اور بزرگ تر ہیں (الوجہ الثانی قولہ علیہ السلام انما انا قاسم الی قولہ ھو اجل من اجری الخیر علی یدیہ)

ف پس جس کے ہاتھ سے کوئی سلسلہ خیر ظاہری یا باطنی جاری ہوا ہو اس کو اللہ کی اس نعمت سے خوش ہونا چاہیئے مگر ناز نہ کرے اپنا کمال نہ سمجھے بلکہ جان لینا چاہیئے کہ یہ سب اللہ کا فضل ہے اگر وہ بجائے اس کے دوسرے کو خیر کے لئے پیدا کر دیتے تو جو سلسلہ اس کے ہاتھ سے جاری ہوا دوسرے کے ہاتھ سے جاری ہو جاتا وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم

۸۰ عطا صرف اللہ کے قبضہ میں ہے، رسول اور خلفاءِ رسول محض تقسیم کرنیوالے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات مقدسہ کا نام قاسم کیوں رکھا ہے حالانکہ قاسم اس کو کہتے ہیں جو کوئی مخصوص شئے خاص لوگوں پر تقسیم کرتا ہو، جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات مقدسہ کا نام قاسم اس حقیقت کی وجہ سے رکھا ہے جس کا بیان اوپر گذر چکا کہ اللہ تعالیٰ نے اس خیر کو آپ کے ہاتھوں سے تقسیم کیا ہے جس سے مسلمانوں پر رحمت نازل ہوئی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کو پوری طرح واضح طور پر بیان فرما دیا پھر حدود کی تعیین فرمائی اور اچھے کاموں کی ترغیب دی اور برے کاموں سے ڈرایا کہ جو ایسا کریگا اس کو یہ صلہ ملے گا۔

اور جو ایسا کریگا اس پر یہ وبال ہو گا جیسا احادیث میں وارد ہے اور محسوس اشیاء کی تقسیم کرنیوالا بھی یہی کرتا ہے۔ جیسا فرضی تقسیم کرنیوالا ہر شخص کا حصہ مقرر کر دیتا اور اس کے حق کی مقدار اور جملہ لوازم کو بیان کر دیتا ہے تو حضور کا یہ کلام عجیب و غریب تشبیہ اور فصیح تر تمثیل پر مشتمل ہے پھر دیکھو جس فرضی کے ذمہ حق دار کو حق پہنچا دینا نہیں صرف حق کی مقدار بتلانا ہے اور پہنچانا اس کا کام ہے، جس کے ہاتھوں میں امر و نہی اور حکومت و سلطنت ہے اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات مقدسہ کے بارے میں خبر دی ہے کہ آپ تو تقسیم کرنیوالے ہیں اور اس تقسیم کو نافذ کرنیوالے اور دینے والے اللہ تعالیٰ جل جلالہ ہیں۔ وہی معطی ہیں وہی مانع ہیں (جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں جسے چاہتے ہیں محروم کر دیتے ہیں) کیونکہ تمام معاملات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ کی قضا و قدر ہی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جا بجا اس حقیقت کی تصریح فرمائی ہے اور صاف صاف بیان فرمادیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

لیس علیک ھداھم ولکن اللہ یھدی من یشاء "آپ کے ذمہ ان کو راستہ پر لگا دینا نہیں بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے راستہ پر لگا دیتا ہے آپ کا کام راستہ بتلانا ہے۔" نیز ارشاد ہے:۔

انما انت نذیر "پس آپ تو ڈرانے والے ہیں" نیز ارشاد باری ہے:۔

ولو شاء ربک لجعل الناس امۃ واحدۃ ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذلک خلقھم "اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی طریقہ پر کر دیتا مگر وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوا ان کے جن پر آپ کے پروردگار نے رحم فرما دیا اور اس اختلاف ہی کے واسطے ان کو پیدا کیا۔"

نیز ارشاد ہے

ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدیٰ "اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتے

اس کے سوا اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

یہ حقیقت ظہور میں آچکی اور حسی طور سے اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہدایت کے راستے یکساں طور پر بیان فرماتے ہیں کسی خاص جماعت کے ساتھ اس کو مخصوص نہیں فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جس کو چاہا تصدیق و اتباع کی توفیق دی اور اپنے عدل سے جس کو چاہا محروم کر دیا اور اپنی حکمت سے جس کو چاہا ایک حصہ کے قبول کی ہدایت کی اور ایک حصہ سے محروم کر دیا (قولہ الوجہ الثالث لقائل ان یقول لم سعی علیہ السلام نفسہ الی قولہ والاعراض عن بعض)

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو القاء نسبت کو مشائخ کے اختیار میں سمجھتے ہیں کہ وہ جس کو چاہیں ولی بنا دیں جس کو چاہیں محروم کر دیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں یہ بات نہیں تو اوروں کا کیا ذکر ہے بات یہ ہے کہ مشائخ کے اختیار میں راستہ بتلانے سے زیادہ کچھ نہیں مگر سنت اللہ یہ ہے کہ جو لوگ مشائخ کا اتباع کرتے اور ان کو راضی رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لئے راستہ کھول دیتے ہیں من اطاع امیری فقد اطاعنی و من اطاعنی فقد اطاع اللہ اور اتباع مشائخ کی ضرورت اس لئے ہے کہ اتباع رسول بدوں اس کے حاصل نہیں ہوتا مشائخ کا تعلق رسول اللہ کے ساتھ ایسا ہے جیسا جج کلکٹر اور کمشنر کا تعلق وائسرائے سے ہے جس طرح وائسرائے کی اطاعت اس کے ماتحت حکام کی مخالفت کر کے حاصل نہیں ہو سکتی اسی طرح رسول اللہ کی اطاعت خلفاء رسول کی مخالفت کر کے حاصل نہیں ہو سکتی امید ہے کہ یہ مثال اہل فہم کے لئے کافی ہو گئی ہو گی۔

(۸۱) مثال کے ذریعہ سے مقصود کی توضیح کرنا چاہیئے

حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ عالم کو احکام کی تقریر کرتے ہوئے مثالیں بیان کرنا چاہئیں یہاں تک کہ مخاطب مراد کو

سمجھ جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات مقدسہ کو قاسم سے تشبیہ دی ہے (جس میں چند حقائق کی طرف اشارہ ہے) جیسا ابھی بیان ہوا اور اسی وجہ سے امام مالک نے بیان فرمایا ہے بالمعانی استعبدنا لا بالالفاظ ہم کو معانی سے غلام بنایا گیا ہے نہ الفاظ سے اور اسی لئے ذات النطاقین (حضرت اسماء رضی اللہ عنہما) نے معلم سے فرمایا جب اپنے بچہ کو تعلیم قرآن کے لئے اس کے حوالے کیا ادبہ و احسن تادیبہ والرحمٰن علم القرآن اس کی نگہداشت کرو اور اچھی طرح نگہداشت کرو اور قرآن تو (جس کو سکھلایا) رحمٰن ہی نے سکھلایا ہے، یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھے ہوئے تھے کہ دینے والا کون ہے؟ اور حکمت کا معاملہ اشیاء میں کس طرح ہے؟ پس اولاد کو معلم کے حوالے کرنا مقتضائے حکمت ہے یہ نہیں کہ علم کا عطا کرنا معلم کے ہاتھوں میں ہے) اور جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں وہ ہمیشہ بچے کی قلت حفظ اور ہر کوتاہی کو معلم کے قصور کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ ان کا خیال صحیح نہیں (یہ بھی ممکن ہے کہ معلم نے تعلیم میں کوتاہی نہ کی ہو اور بچہ کو علم نہ آتا ہو) کیونکہ محروم کرنیوالا اور دینے والا تو تمام اشیاء کا خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی، رزق ہو یا علم اللہ جل جلالہٗ ہے بس بندہ کا فرض منصبی یہ ہے کہ حکمت کا اتباع کرے اسباب کو کام میں لائے اور نتیجہ کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرے۔

الوجہ الرابع فی ھذا دلیل علی ان للعالم ان یضرب الامثال

ف حضرات صوفیہ امثال کے بادشاہ ہیں وہ غامض سے غامض علوم و معارف کو مثالوں میں اسطرح بیان کرتے ہیں کہ معانی معقولہ محسوس و مشاہد معلوم ہونے لگتے ہیں اور یہ میراث اُن کو کمال اتباع رسول سے حاصل ہوئی ہے۔

(۸۲) اسباب میں خود کوئی تاثیر نہیں مگر اُن کا اختیار کرنا ضروری ہے

حدیث سے دو علمی مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ اسباب میں بالذات خود کوئی تاثیر نہیں بلکہ قدرت کی مشیت نے جتنا اثر ان میں رکھ دیا اتنا ہی ہے دوسرے یہ کہ اسباب (کے اختیار کرنے) کی

ضرورت ہے کیونکہ مقتضائے حکمت یہی ہے اور حکمت کو چھوڑنا مخالفت عناد میں داخل ہے۔

ف یہی وہ بات ہے جس کو متکلمین اشاعرہ نے علم کلام میں بیان فرمایا ہے اور یہ مسئلہ اشاعرہ کے کمال ایمان اور کمال اتباع نصوص کی دلیل ہے مگر افسوس بعض لوگوں نے جن کے ایمان پر فلسفہ نے غلبہ پالیا ہے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے اشاعرہ کا بہت مضحکہ اڑایا اور یہ کہا کہ اشاعرہ سلسلۂ اسباب و مسببات و علل و معلولات ہی کے منکر ہیں، پھر انکی توہین و تحقیر کے لئے جو منہ میں آیا کہا اور جو دل میں آیا لکھ مارا، حالانکہ یہ حضرات نہ سلسلۂ اسباب و مسببات کے منکر ہیں نہ سلسلۂ علل و معلولات کے، اُن کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جس کو تم سبب یا علت کہتے ہو اس میں خود کوئی تاثیر نہیں بلکہ سبب یا علت پر مسبب یا معلول کا ترتب حق تعالیٰ کے حکم و ارادہ سے ہوتا ہے، یہ نہیں کہ خلق علت و سبب کے بعد مسبب و معلول خود بخود پیدا ہو جائے جیسا فلاسفہ کا دعویٰ ہے کہ اُن کے نزدیک تخلل جعل بین اللازم والملزوم باطل اور جعل سبب و علت ہی وجود مسبب و معلول کیلئے کافی ہے حضرات اشاعرہ اگر سلسلۂ اسباب و علل کے منکر ہوتے تو اختیار اسباب کو ضروری اور ترک اسباب کو ناجائز اور داخل عناد و مخالفت کیوں کہتے؟ الیس منکم رجل رشید؟

(۸۳) اسباب دین اور اسباب دنیا کا فرق

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ شریعت نے اعمال صالحہ کی تو تاکید کی ہے اور رغبت دلائی چنانچہ تفقہ فی الدین بھی اُن کا ایک فرد ہے اور دنیا کی مذمت کی اور اس کے اسباب سے بے رغبتی کی تعلیم دی اور زہد کی بہت تاکید کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لن تموت نفس حتی تستکمل رزقها فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب کوئی شخص ہرگز نہ مریگا جب تک اپنا رزق پورا نہ کرلے پس اللہ سے ڈرو اور طلب دنیا میں اجمال سے کام لو (جب اسباب کا اختیار کرنا حکمت کا مقتضاء ہے تو اسباب دنیا سے بے رغبتی کی تعلیم کیوں دی گئی) جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے ترک اسباب دنیا کی تعلیم نہیں دی بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اسباب دنیا میں اجمال سے کام لو زیادہ حرص اور انہماک سے کام نہ لو کیونکہ) اس عالم میں رزق مقسوم (اور مقدر) ہو چکا اور اسکی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے

لی ہے جیسا آیات واحادیث سے معلوم ہو چکا ہے تو شارع علیہ السلام نے اسی وجہ سے اسباب دنیا میں بے رغبتی کی تعلیم دی کہ ایمان کا مقتضیٰ یہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں (مسلمانوں کی صفت بیان کرتے ہوئے) ارشاد فرماتے ہیں یؤمنون بالغیب کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور (اسباب دنیا میں حرص کرنا ایمان کے لئے آفت اور تصدیق کی کمزوری اور تحصیل حاصل میں (بلا وجہ) مشقت وتعب (کا سبب) ہے اور (ثمرات آخرت کی ذمہ داری نہیں کی گئی بلکہ اُن کو اختیاراً اسباب پر موقوف رکھا گیا ہے اور) اسباب (آخرت یعنی) اعمال صالحہ کے اختیار کرنے میں ایمان کو قوت اور حکم الٰہی کی موافقت ہے اور اسکے ساتھ (دنیا سے محرومی بھی نہیں ہوتی بلکہ) جتنا رزق دنیا میں اسکے لئے مقدر ہو چکا ہے وہ یقیناً اس کے پاس پہنچ کر رہے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من بدأ بحظہ من آخرتہ ما ارادہ ولم یفتہ من دنیاہ ما قسم لہ، جو شخص اپنی آخرت کے حصہ کو دنیا پر مقدم کرے گا وہ آخرت سے اپنی مراد پالے گا اور دنیا سے جتنا حصہ اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے وہ بھی فوت نہ ہوگا، آیات و احادیث اس مضمون میں بکثرت وارد ہیں اور اس میں رغبت کرنا حقیقی ایمان ہے اور جو چیز ایمان کی حقیقت یا اس کے لوازم میں سے ہو اس کا اختیار کرنیوالا ثواب کا مستحق ہوگا اور اس کے کام کی قدر کی جائے گی اور اس کی مثال مجتہد جیسی ہوگی کہ اگر اس کا اجتہاد صحیح ہو جائے تو دوہرا ثواب ملتا ہے اور اجتہاد میں غلطی ہو جائے تو ایک ثواب ملتا ہے کیونکہ وہ (اپنی طرف سے) اسباب اجتہاد میں کوشش خرچ کر چکا پھر بھی خطا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی محنت کو ضائع نہیں فرماتے کیونکہ اس نے اپنی سی کوشش میں کوتاہی نہیں کی بخلاف اس شخص کے جو جہالت کے ساتھ کام کرتا ہے کہ اس کو ثواب نہیں ملتا گو عمل درست ہی ہو جائے، ظاہر اور صحیح قول یہی ہے الوجہ السادس لقائل ان یقول قد حضت الشریعۃ وندبت فی اعمال البر الی قولہ علی اظہر الوجوہ واولاھا

ف یہاں سے سالکین طریق کو سبق لینا چاہیئے کہ طالب آخرت کسی حال میں

محروم نہیں اگر کامیاب ہوا تو دوہرے ثواب کا مستحق ہے، ناکام ہوا تو ایک ثواب کہیں نہیں گیا، مگر شرط یہ ہے کہ طلب قاعدہ کے موافق ہو، جہل کے ساتھ طلب میں کچھ ثواب نہیں، اس لئے طالب آخرت کو لازم ہے کہ جو کام بھی کرے پہلے اس کا علم حاصل کرلے اور یہاں سے اُن جہلاء صوفیہ کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو طلب آخرت کیلئے علم کی ضرورت نہیں سمجھتے ۔"

(۸۴) زہد بدون تقویٰ کے آسان نہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زہد بدون تقویٰ کے آسان نہیں ہوتا

کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے فاتقوا اللّٰہ واجملوا فی الطلب اللہ سے ڈرو اور دنیا کی طلب میں اجمال سے کام لو، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے واتقوا اللّٰہ ویعلمکم اللّٰہ اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو تعلیم دے گا دونوں جگہ واوٴ حالیہ ہے (جس سے معلوم ہوا کہ علم بھی بدون تقویٰ کے حاصل نہیں ہوتا اور جو علم بدون تقویٰ کے حاصل ہوتا ہے وہ علم ہی نہیں ہے حقیقی نہیں کیونکہ حقیقی علم تو ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ قلب میں پیدا کردیتے ہیں اور وہ بدون تقویٰ کے حاصل نہیں ہوتا) پس (تمام اعمال صالحہ کی اصل تقویٰ ہے جب یہ کسی کا حال بن جاتا ہے تو زہد خود بخود شوق سے آجاتا ہے، اسی وجہ سے صوفیاء دوسروں سے زیادہ زاہد ..... اور زیادہ تارک اسباب ہیں کیوں کہ اُن کا تقویٰ دوسروں سے بڑھا ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لو توکلتم علی اللّٰہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا و تروح بطانا

"اگر تم اللہ پر توکل کرتے جیسا توکل کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس طرح رزق دیتے جس طرح پرندوں کو دیتے ہیں کہ وہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر آتے ہیں۔"

اس پر بعض لوگوں نے جن پر طلب دنیا کی حرص غالب تھی یہ کہا کہ پرندوں کا ہوا میں اڑنا بھی رزق حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور سبب ہے تو اس حدیث میں

اخت یا اسباب کی ترغیب ہے، (نہ ترک اسباب کی) اور یہ گفتگو محض لچر ہے بعض اہل تحقیق نے اس کا تسلی بخش جواب دیا ہے اور وہی حق ہے جس میں کچھ شبہ نہیں، انہوں نے فرمایا کہ پرندہ کا اڑنا اس کا طبعی فعل ہے طلب رزق کے واسطے نہیں بس اس کا یہ فعل ایسا ہے جیسا رعشہ والے کے ہاتھ کی حرکت دونوں میں کچھ فرق نہیں اس لئے اس پر کوئی حکم لگانا صحیح نہیں، اس محقق نے اس بات کو سمجھا ہے کہ شارح علیہ السلام نے تمام حیوانات میں سے پرندوں کا ذکر خاص طور سے کیوں کیا ؟ وجہ یہ ہے کہ دیگر حیوانات یعنی وحوش و حشرات اسباب معاش کی تلاش میں رہتے ہیں چنانچہ چرنیوالے جانوروں کو تم ہمیشہ اس حال میں دیکھوگے کہ وہ سرسبز زمین کو تلاش کرتے اور خشک زمین کو چھوڑتے ہوں گے، خشک زمین میں ان کو کبھی نہ دیکھو گے اور شکاری جانوروں کو شکار کی تلاش میں پاؤ گے کہ خوشبو سونگھ کر اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ شکار ہاتھ آجائے تو چونکہ اور حیوانات تلاش اسباب میں بنی آدم کے مشابہ ہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو چھوڑ کر پرندوں کا ذکر فرمایا جو ہوا میں اڑتے ہیں، اور (ظاہر ہے کہ) ہوا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جس کا قصد کیا جائے نہ دانہ ہے جو چگ لیا جائے نہ کوئی چیز ہے جس کو چر لیا جائے وہاں تو ہوا اور روشنی کے سوا کچھ نہیں، پرندے اسی میں پھرتے اور گشت لگاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُن کا رزق اُن کے پاس پہنچ جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ ان کو رزق کے پاس پہنچا دیتا ہے اسی حقیقت کی وجہ سے حضور نے پرندوں کو ذکر کیلئے مخصوص فرمایا دوسرے حیوانات کا ذکر نہیں کیا اگرچہ وہ بھی سب کے سب صبح کو بھوکے جنگل جاتے اور شام کو پیٹ بھر کر آتے ہیں (الوجہ السابع فی ھذا دلیل علی ان الزھد لا یسہل الا بالتقوی الی قولہ تغدوا خماصا وتروح بطانا)“

ف اس جواب میں چند اشکالات ہیں جو اہل فہم پر مخفی نہیں اس لئے یوں کہنا چاہیئے کہ بیشک طیران بھی ایک درجہ میں تسبب ہے مگر وہ اس درجہ اجمال سے زیادہ نہیں جس کا حدیث میں حکم ہے حضور کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو توکل کما حقہ حاصل ہوتا تو رزق کی طرف سے ایسے بےفکر ہو جاتے جیسے پرندے بےفکر ہیں کہ ان کو کل کے واسطے ذخیرہ جمع کرنے کی حرص نہیں وہ اللہ کے بھروسے صبح کو بھوکے اڑتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آجاتے ہیں اور گویہ بات دوسرے حیوانات کے اندر بھی موجود ہے مگر اُن میں جو انساع

سے مانوس ہیں انکی غذا انسان خود مہیا کرتا ہے اور جو وحشی ہیں وہ انسان کے سامنے نہیں رہتے اسلئے
اُنکی حالت کا پورا مشاہدہ نہیں ہوتا، اور پرندے خواہ مانوس ہوں یا وحشی اُنکی حالت کا انسان کو مشاہدہ
ہے اسلئے خصوصیت کیساتھ ان کا ذکر کیا گیا واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۸۵) اس امت میں ایک ایک جماعت دین کے ایک ایک شعبہ کو سنبھالتی رہیگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کہ یہ امت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہیگی دو احتمال
ہیں کہ امت سے مراد عام امت ہو یا خاص افراد اگر خاص افراد مراد ہیں تو کچھ اشکال نہیں کیونکہ اہل عرب
بعض سے کل اور کل سے بعض کا قصد کیا کرتے ہیں، دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانے
کے فتنوں سے جو خبر دی ہے کہ علم اٹھ جائیگا جہالت اور ظلم کا غلبہ ہوگا وغیرہ وغیرہ وہ سب اخبار کی
جنس سے ہیں اور یہ حدیث بھی جسکی ہم شرح کر رہے ہیں خبر ہی ہے اور اخبار میں نسخ ہو نہیں سکتا اب اگر اس حدیث
کو خصوص پر محمول کیا جائے تو اسکے معارض جتنی احادیث ہیں سب اپنی جگہ پر صحیح رہیں گی منجملہ اُن کے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے افترقت بنواسرائیل علی اثنین وسبعین فرقۃ و
ستفترق امتی علی ثلاثۃ وسبعین فرقۃ کلھا فی النار الا واحدۃ کہ بنی اسرائیل تو بہتر[۲]
فرقوں میں منقسم ہوئے تھے اور میری امت میں تہتر[۳] فرقے ہوں گے جن میں سوا ایک کے اور سب جہنم میں جائینگے
تو یہی ایک فرقہ جسکی اس حدیث میں خبر دی گئی ہے وہی اس امت کا مصداق ہے جسکے متعلق یہاں
گفتگو ہو رہی ہے (کہ وہ قیامت تک اللہ کے حکم پر رہے گی) بعض روایات کے الفاظ اس مطلب میں صریح
ہیں چنانچہ آپ کا ارشاد ہے لاتزال طائفۃ من ھذہ الامۃ کہ اس امت میں سے ایک جماعت
ہمیشہ حق پر رہیگی، جس کا مطلب بعض علماء نے اسطرح بیان کیا ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اللہ کی مرضی
کیموافق علم کا حق ادا کرتی رہیگی اسیطرح اہل حقیقت میں ایک جماعت ہوگی (جو حقیقت کا حق ادا کریگی)
اور ایسے ہی اعمال صالحہ بجالانیوالوں کی ایک جماعت ہوگی غرض انواع خیر میں سے خواہ علم ہو یا حال ہو یا
حقیقت مراک) ہر نوع کو بجالانے والی مسلمانوں کی ایک جماعت ہوگی جو اس نوع کے بجالانے میں مشغول ہوگی۔
کوئی مخالف اُن کو ضرر نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور اگر امت سے مراد عام امت ہو جب بھی کچھ
اشکال نہیں کیونکہ (اس صورت میں امت سے مراد حقیقی امت ہے، اور) امت حقیقیہ وہی ہے جو اس صفت سے

موصوف ہو جس کا حدیث میں ذکر ہے اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں مراد ہے امتی کلہا فی الجنۃ کہ میری ساری امت جنتی ہے" یعنی امت حقیقیہ جو آپکے راستہ اور طریقہ پر چلتی ہے انکے علاوہ جو اور لوگ آپکی امت کہلاتے وہ اللہ کی مشیت اور مرضی کے حوالہ ہیں جن میں سے بعض تو آپ کی امت میں اصلا نہ ہوں گے یہ وہ ہیں جن کو خاتمہ کیوقت بدل دیا جائے (اور اسلام سے ہٹا دیئے جائیں) گا اللہ تعالی ہمیں اس سے بچائے اور بعض وہ ہیں جن کو قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سحقا سحقا (دور ہو جاؤ، دور ہو جاؤ) فرمائیں گے، ان کے اندر ایمان کا کوئی (ظاہری) حصہ ہوگا اسی لئے وہ اس امت کی علامت پر اٹھائے جائیں گے (اور ان کے باطن میں ایمان نہ ہوگا اسلئے حضور ان کو دھتکار دیں گے اور غالباً یہ وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام لے آئے تھے اور حضور کی وفات کے بعد مرتد ہوگئے) اور بعض وہ ہیں جن کی دستگیری حضور کی شفاعت کریگی بعد ازاں کہ وہ اپنی قسمت کے موافق سخت پریشانی برداشت کر چکیں گے (شفاعت کی وجہ سے عذاب سے بچ جائیں گے) جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اختبأت شفاعتی لاھل الکبائر من امتی میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے بڑے گنہگاروں کے واسطے چھپا کر رکھا ہے اور بعض وہ ہیں جن کو ان کے گناہوں کے موافق قسم قسم کے عذابوں کا سامنا ہوگا (پھر شفاعت کے ذریعہ جہنم سے نکالے جائیں گے) کیونکہ بہت سی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ گناہوں کی ہر نوع کے لئے جدا عذاب ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے یا اس کے قریب کچھ اور الفاظ ہیں" الوجہ الثامن قولہ علیہ السلام ولن تزال ھذہ الامۃ الی قولہ اوعانی معناہ "

ف لا یزال طائفۃ من امتی کی شرح میں علماء نے جو کچھ فرمایا ہے وہ تقسیم عمل پر صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ ہر نوع خیر کا حق ادا کرنیوالی ایک ایک جماعت علیحدہ علیحدہ ہوگی، یہ نہیں کہ ہر جماعت تمام انواع خیر میں مشغول ہوگی، پس یہاں سے انکی غلطی واضح ہوگی جو علماء اور مشائخ کو بھی سیاسیات میں شریک ہونے کا مشورہ دیتے ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر جماعت سب کاموں میں مشغول نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہوگا تو کوئی کام بھی پوری طرح انجام کو نہیں پہنچیگا، تقسیم عمل ترقی کا معیار ہے بدون اس کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اور یہ گفتگو تو اس صورت میں ہے جبکہ سیاسیات ملکیہ شریعت اسلامیہ کیموافق ہوں اور شریعت کے خلاف ہوں تو انکو انواع میں شمار کرنا ہی حماقت

ہے جیسا آجکل سیاسیاتِ ہند میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مفتی اور مولانا ایسے جلسوں کی صدارت
کرتے ہیں جنمیں ہندوؤں کی نوجوان لڑکیاں ساڑھیاں باندھے گلے کھولے ہوئے اسٹیج پر تقریریں کرتی
اور گانا گاتی ہیں اور بڑے بڑے مدرسوں کے علماء اور طلبہ ہندو لیڈروں کے استقبال کو اسٹیشن
پر جاتے ہیں اور جب وہاں ملاقات کا موقع نہیں ملتا تو فرودگاہ پر ملنے جاتے ہیں ایبتغون عندھم
العزۃ فان اللہ العزۃ جمیعا ط ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　　اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

(۸۶) کثرت سے بھاگو اور قلت کی طرف مائل ہو

حدیث میں اسکی بھی دلیل ہے کہ باطل کو غلبہ ہوگا اور اہل باطل کی کثرت ہوگی

کیونکہ جب ایک جماعت کے سوا حق پر کوئی نہ ہوگا تو باقی سب گمراہی پر ہوں گے، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب
میں اس جماعت کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں (الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت، وقلیل ما ھم)
کہ ایمان والے تھوڑے ہی ہوں گے اور ارشاد ہے فماذا بعد الحق الا الضلال کہ حق کے بعد
گمراہی کے سوا کیا ہے؟ جب ایک جماعت میں حق پایا گیا تو اسکے سوا جو کچھ ہے باطل ہی باطل ہے
اب اگر تو عقل رکھتا ہے تو کثرت سے بھاگ اور قلت کیطرف مائل ہو، سلامتی سے کامیاب ہو
جائیگا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بدأ الاسلام غریبا و سیعود
غریبا فطوبی للغرباء من امتی اسلام بے سروسامانی کے ساتھ شروع ہوا اور اخیر میں بھی بے سروسامان
ہو جائے گا پس میری امت میں بے سروسامان جماعت کے لئے خوشخبری ہے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ
آپکی امت کے یہ غرباء اور بے سروسامان لوگ کون ہیں؟ فرمایا وہ جو لوگوں کے بگڑنے کے وقت درست
رہیں گے۔

ف اس مقام پر اہل سیاست کو غور کرنا چاہیئے جو کثرت کا راگ گاتے پھرتے اور کثرت رائے کو اصول
شریعت میں ٹھونستے اور اس پر فیصلہ کا مدار رکھنا چاہتے ہیں، وہ دیکھیں کہ احادیث نبویہ سے کیا
معلوم ہوتا ہے اور علماء سلف نے اُن سے کیا سمجھا ہے؟ فھل من مدکر؟

(۸۷) اہل حق کو مخالفین کی مخالفت کا اندیشہ نہ کرنا چاہیئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد

لا یضرھم من خالفھم کہ اُن کا مخالف ان کو ضرر نہ پہنچا سکے گا، تین احتمال رکھتا ہے ایک یہ کہ قائم بالامر کی ذات مراد ہو کہ کوئی شخص ان کی ذات کو ضرر پہنچانے پر قادر نہ ہوگا دوسرے یہ کہ اگر وہ مخالفین کے پاس یا اُن کے درمیان بیٹھے ہوں اور اس وجہ سے انکی اصلاحی کوششیں پوری طرح کامیاب نہ ہوتی ہوں تو، مخالفین کی مخالفت سے اُنکے عمل کو ضرر نہ پہنچے گا ان کا عمل مقبول ہوگا اور ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی (بلکہ اجر میں ترقی ہوگی کما دلت علیہ النصوص) تیسرے یہ کہ اس مخالفت سے نہ اُن کو ضرر ہوگا نہ انکے عمل کو نقصان پہنچے گا اور یہی مطلب زیادہ ظاہر ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وکان حقا علینا نصر المومنین کی مدد ہمارے ذمہ ہے۔ نیز ارشاد ہے لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم جب تم ہدایت پر ہو تو گمراہ ہونیوالے تمکو ضرر نہیں پہنچا سکتے ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد ؛ چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

اور اسمیں اُن لوگوں کیلئے بڑی بشارت ہے جو اس صفت سے موصوف ہوں جو اس حدیث میں مذکور ہے کہ اُن کو ضرر کا کچھ اندیشہ نہ کرنا چاہیئے اگرچہ مخالفین کتنے ہی زیادہ ہوں اس شخص کا دل ہمیشہ مطمئن اور سینہ ہمیشہ منشرح ہوگا کیونکہ مخبر صادق ہے اور جسکی طرف سے خبر دے رہا ہے وہ عالم وقادر ہے، اس مضمون پر اللہ تعالیٰ نے بھی متنبہ فرمایا اور صراحتہً اس کو بیان فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے وکان حقا علینا نصر المومنین جیسا ابھی ذکر ہوا اور جن مومنین کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد کو محض اپنے فضل سے لازم کیا ہے وہ وہی ہیں جن کی صفت اس حدیث میں بیان کی گئی ہے (یعنی اللہ کے حکم پر قائم رہنے والے) اسی لئے بعض بزرگوں نے یعنی شیخ احمد زروق رحمہ اللہ نے فرمایا ہے اذا وافقت الشریعۃ ولاحظت الحقیقۃ فلا تبالی وان خالف رأیک جمیع الخلیقۃ جب تم شریعت کیمطابق چل رہے ہو اور حقیقت تمہارے پیش نظر ہو پھر کچھ پروا نہ کرو اگرچہ تمام مخلوق تمہاری رائے کی مخالفت کرتی ہو" الوجہ الثالث عشر قولہ علیہ السلام لا یضرھم من خالفھم والوجہ الرابع عشر فی ھذا بشارۃ عظیمۃ الیٰ قولہ وان خالف رأیک جمیع الخلیقۃ"

ف اس مقام سے سالکین و عارفین کو سبق لینا چاہیئے کہ جب وہ شریعت کیموافق چل رہے ہوں اور حقیقت پیش نظر ہو پھر کسی مخالف کی مخالفت کی ان کو پرواہ نہ ہونا چاہیئے، انشاء اللہ وہی کامیاب اور

غالب ہوں گے اور مخالفین ناکام اور مغلوب ہوں گے۔

(۸۸) موت سے خوش ہونا اور اشتیاق کیساتھ اس کا انتظار کرنا چاہیئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد حتی یاتی امر اللہ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے، دو احتمال رکھتا ہے ایک یہ کہ حکم الٰہی سے مراد قیامت ہو، دوسرے یہ کہ بڑی بڑی نشانیاں مراد ہوں جو قیامت کے قریب ظاہر ہوں گی یعنی عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے دین کو زندہ کریں گے اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے وہ زندہ رہیں گے اور وفات پاکر مسلمانوں کے درمیان دفن ہوں گے پھر ان کے بعد تھوڑے عرصہ تک مسلمان باقی رہیں گے پھر ان کی حالت میں خلل واقع ہونے لگے گا اور ترقی کریگا جب یہ خلل حد سے گذر جائے گا تو اللہ تعالیٰ عرش کے نیچے سے ایک نرم نازک ہوا بھیجیں گے جو تمام مسلمانوں کی روحیں قبض کرے گی قرآن کو اٹھا لیا جائے گا اور اسوقت بجز بدترین مخلوق کے (دنیا میں) کوئی نہ رہے گا، شیطان ان کے پاس آئیگا اور گمراہی میں مبتلا کر کے جاہلیت سابقہ کیطرف لوٹا دیگا اور صوفیہ نے بطور اشارہ کے حدیث سے یہ بھی سمجھا ہے کہ امر اللہ عام ہے مگر مراد خاص ہے یعنی یہانتک کہ اللہ کا وہ حکم آجائے جو ہر ایک کے ساتھ بلا شرکت غیرے الگ الگ متعلق ہوتا ہے یعنی موت تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی مخالف کی مخالفت ان کو ضرر نہ دے سکیگی یہاں تک کہ بہترین حالت پر ان کو موت آجائے اس وقت اللہ کے وعدہ جمیل سے اُن کے سینے کھلے ہوتے (اور قلوب مطمئن ہوں گے اور خوشی کے ساتھ موت کا اسطرح انتظار کرینگے جیسا کوئی غائب اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے (اور گھر والے اس کا انتظار خوشی کے ساتھ کرتے اور اسکے اشتیاق میں گن گن کر دن گذارتے ہیں) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی موت سے خوشی عطا فرمائیں اور اپنے فضل و کرم سے اس دن کو تمام دنوں سے اچھا اور بہتر بنا دیں (آمین)" الوجہ الخامس عشر والوجہ الثامن عشر الی قولہ وجعل یومہ خیرا یامنا بمنہ وبمنہ

ف ۔ حدیث میں ہے من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ، جو اللہ سے ملنے کا مشتاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنے کے مشتاق ہوتے ہیں اور مشاہدہ ہے کہ یہ اشتیاق لقاء صوفیہ کرام میں سب سے زیادہ ہے، گو جان دینے پر ان سے زیادہ دوسرے لوگ آمادہ ہوں، مگر اسکا نام اشتیاق لقاء

نہیں ورنہ خودکشی کرنیوالے اور وطن وناموس پر جان دینے والے کافر بھی اسی صفت میں داخل ہو جائینگے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ان لوگوں کو اشتیاق لقاء کی ہوا بھی نہیں لگی، پس جان دینے پر آمادہ ہونا اشتیاق لقاء کی دلیل نہیں بلکہ اسکی بڑی دلیل وہ عشق ومعرفت ہے جو ہروقت اللہ تعالیٰ کیطرف دل کو متوجہ رکھتی اور دنیا کو جیل خانہ اور آخرت کو وطنِ اصلی کی صورت دکھائی دیتی ہے اور عشق ومعرفت الٰہی کی دلیل کثرت ذکر اللہ وکمال اتباع سنت نبویہ ہے اور بس قل ان صلواتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین اللھم اجعل خیر عملی خواتیمہ وخیر ایامی یوم القائک ذیہ یا ولی الاسلام واھلہ ثبتنی بہ حتی القاک امین امین

ف ۔ اس حدیث سے امت محمدیہ کا تمام امتوں سے افضل ہونا بھی معلوم ہوا کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس امت کو قیامت تک اپنے دین پر قائم رکھیں گے دین میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا اور نہ یہ امت شریعت الٰہیہ کے سوا کسی دوسری شئے کو دین قرار دیگی، بخلاف دوسری امتوں کے کہ وہ اپنے دین کو بدلتی رہتی ہیں اور ایک امت کا دور ختم ہونے کے بعد دوسری امت اسکی جگہ لیتی رہی، نیز اس میں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی اور علو منزلت عنداللہ پر بھی دلالت ہے کیونکہ امت کے شرف اور فضیلت کا سبب آپ ہی کا شرف اور رفعت قدر ہے آپ ہی کی وجہ سے امت کو یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی ہے اللہ تعالیٰ ہم کو آپکا سچا امتی بنائیں اور آپ کی سنت کے اتباع کی کامل توفیق عطا فرمائیں "انہ ولی کریم وھذہ الفائدۃ قد نبہ علیھا الشارح قدس سرہ ادخلتھا فی الفوائد لخروجھا عما نحن بصددہ فی ترجمۃ الکتاب واللہ الموافق للصواب"



۱۲
باب دوازدہم

حدیث

سؤال القبر و فتنتہ

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور اسکی ثنا بیان کی پھر فرمایا کہ جو کچھ میں (اب تک) نہیں دکھلایا گیا تھا آج میں نے اس مقام میں اسکو دیکھ لیا ہے یہاں تک کہ جنت اور دوزخ کو بھی دیکھ لیا پھر میری طرف وحی کی گئی کہ تم لوگ اپنی قبروں میں آزمائے جاؤ گے مثل یا قریب فتنہ مسیح دجال کے (راوی کا بیان ہے) کہ میں نہیں جانتا کہ حضرت اسماء نے کونسا لفظ فرمایا، کہا جائیگا کہ اس شخص کے متعلق تو کیا جانتا ہے؟ تو مومن یا موقن (میں نہیں جانتا کہ حضرت اسماء نے کون سا لفظ فرمایا) کہیگا وہ محمد رسول اللہ ہیں ہمارے پاس روشن آیات اور ہدایت لیکر آئے تو ہم نے آپکی بات کو مانا اور آپکا اتباع کیا تین بار کہے گا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) تو اس سے کہا جائے گا تو چین سے سو تا رہ ہم کو معلوم تھا کہ بیشک تو آپ پر یقین رکھنے والا ہے رہا منافق یا شک کرنیوالا (میں نہیں جانتا کہ حضرت اسماء نے کونسا لفظ فرمایا) وہ کہے گا میں کچھ نہیں جانتا میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تو میں بھی وہی کہنے لگا۔

شرح ظاہر حدیث فتنۂ قبر اور سوال قبر پر دلالت کرتا ہے اور اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۸۹) امور مہمہ کو حمد و ثنا اور درود شریف سے شروع کرنا چاہیئے حدیث سے معلوم ہوا کہ امور مہمہ کو

اللہ کی حمد سے شروع کرنا چاہیئے کیونکہ یہ تقریر جس کو آپ نے حمد سے شروع کیا تھا بہت مہتم بالشان تھی اسوقت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز کسوف سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف وعظ و نصیحت کیلئے متوجہ ہوئے تھے، اور مہتم بالشان امور میں آپ کی یہی عادت تھی کہ ان کے شروع میں اول حمد الٰہی کرتے تھے چنانچہ خطبۂ نکاح میں بھی یہی سنت ہے کیونکہ وہ بھی مہتم بالشان کام ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فعل سے بھی اس کا ثبوت ہے اور صحابہ کے طرز عمل سے بھی ؟

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حمد کے بعد ثنا بھی سنت ہے حضور نے اس کی ترغیب دی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل یہی تھا آپ کا اور صحابہ کا دائمی معمول اسی پر مستقر تھا اور حمد و ثنا پر اکتفا کرنا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات خاص کے لئے ہے اور دوسروں کیلئے اس کی ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کا اضافہ بھی ضروری ہے کیونکہ آپ کا ارشاد ہے:

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء من بعدی

"میری سنت کو مضبوطی سے تھامو اور ان خلفاء کی سنت کو بھی جو میرے بعد ہوں گے"

اور حضرات خلفاء اور تمام صحابہ اللہ عزوجل کی حمد و ثناء کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھی بھیجتے تھے الوجہ الاول قولہا حمد اللہ والوجہ الثانی قولہا واثنی علیہ الی قولہ بعد الحمد والثناء علی اللہ عزوجل۔

ف: اس سنت کی طرف سے نو تعلیم یافتہ جماعت نے تو اعراض کلی اختیار کیا ہی تھا تم دیکھو گے کہ اپنی کتابوں اور رسالوں کو حمد و ثنا اور درود شریف کے ساتھ شروع کرنے سے ان کو عار ہے مگر افسوس کہ انکی تقلید علماء نے بھی شروع کر دی ہے، اب انکے مقالات و رسائل بھی اس سنت سے خالی ہونے لگے،

فالی اللہ المشتکی

(۹۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام غیب کا علم نہ تھا بلکہ بعض کا علم تھا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ما من شئی لم اکن اریتہ الا رأیتہ فی مقامی ھذا سے معلوم ہوا کہ اس وقت سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جملہ مغیبات کا مشاہدہ نہیں کیا تھا بلکہ بعض کا مشاہدہ کیا تھا اور اس وقت اس مقام میں آپ کو تمام مغیبات کا پورا مشاہدہ ہو گیا، اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ ما من شئی لم اکن اریتہ الا رأیتہ فی مقامی ھذا

سے آپکی مراد (حقیقۃً) تمام مغیبات ہیں یا وہ جنکے بتلانے کی امت کو ضرورت ہو یا آپکی ذات مقدسہ کو انکے مشاہدہ کی حاجت تھی؟ جواب یہ ہے کہ لفظ حدیث تو دونوں کو متحمل ہے مگر بظاہر مراد دوسری صورت ہے اور پہلا احتمال صحیح نہیں جسکی عدم صحت کی دلیل کتاب اللہ کی آیات اور سنت نبویہ کی دوسری احادیث میں موجود ہے، کتاب اللہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللّٰہ

"کہہ دیجئے کہ جتنے لوگ آسمان و زمین کے اندر ہیں ان میں سے غیب کو کوئی بھی نہیں جانتا سوا اللہ کے"

اور حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

مفاتیح الغیب خمس لا یعلمھن الا اللّٰہ لا یعلم ما تغیض الارحام الا اللّٰہ ولا یعلم ما فی غد الا اللّٰہ ولا یعلم متی یاتی المطر احد الا اللّٰہ ولا تدری نفس بای ارض تموت الا اللّٰہ ولا یعلم متی تقوم الساعۃ الا اللّٰہ"

غیب کی پانچ کنجیاں ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کسی کو خبر نہیں کہ عورت کے رحم میں کیا کمی ہوتی ہے اور کیا بیشی اور کل کو جو کچھ ہوگا اسکی خبر بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی (یعنی قطعی اور یقینی علم کسی کو نہیں ہوسکتا باقی آثار سے تخمینہ اور حساب لگا لینا دوسری بات ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کس زمین میں اسکو موت آئیگی اور کسی کو پتہ نہیں قیامت کب آئیگی سوا اللہ کے" اور یہ تو غیب کی کنجیاں ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ غیب کا دروازہ ان کے بعد کھلتا ہے اور جب ان پر خدا کے سوا کسی کی دسترس نہیں تو ثابت ہوا کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں انبیاء و رسل کو جو کچھ مغیبات کا علم ہوتا ہے اسمیں ایک حصہ تو وہ ہے جو واقع میں غیب نہیں بلکہ محسوس و مشاہد ہے جیسے جنت و دوزخ، فرشتے اور عالم ملکوت کے عجائبات کہ یہ سب درا صل محسوس و مشاہد ہیں مغیب نہیں ہیں مگر عوام کی نظروں سے اسلئے پوشیدہ ہیں کہ ان کا نور بصیرت ناقص ہے انبیاء و رسل کا نور بصر اور نور بصیرت کامل ہوتا ہے وہ ان کا مشاہدہ کر لیتے ہیں تو اسکی ایسی مثال ہوئی جیسے ایک شخص کے پاس دوربین ہے وہ اسکے ذریعے سے دور کی چیزوں کو صاف دیکھ لیتا ہے دوسروں کے پاس دوربین نہیں وہ ان کو نہیں دیکھ سکتے مگر ظاہر ہے کہ دوربین والا بھی محسوس و مشاہد ہی کو دیکھتا ہے مغیب کو نہیں دیکھتا"

اور ایک حصہ وہ ہے جو واقعی غیب ہے اس کا علم انبیاء و رسل کو صرف اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے ہوتا ہے خود ان کے حواس عقلیہ و قلبیہ و بصریہ ان کا مشاہدہ نہیں کرتے اور اس کا نام علم غیب نہیں ہے بلکہ تعلیم غیب ہے و شتان بینہما

دوسرے اس قول کو تمام غیوب پر محمول کرنا ممکن بھی نہیں کیونکہ اس سے خالق اور مخلوق کی مساوات (صفت علم میں) لازم آتی ہے جو عقلاً محال ہے، نیز اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کل یوم ھو فی شان ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے اور اشیاء (مخلوقہ میں) بعض تو بنی آدم کی پیدائش سے بھی پہلے واقع ہو چکی ہیں اور بعض ان کی موت کے بعد واقع ہونگی تو ان سب کا مجموعی یا تفصیلی علم کسی مخلوق کیلئے ثابت ہونا) عقل و نقل دونوں اعتبار سے محال ہے، الوجہ الثالث قولہ علیہ السلام ما من شئی لم اکن اریتہ الی قولہ مستحیل من طریق العقل والنقل

ف اس زمانہ کے جاہل صوفیوں کو اس مقام سے سبق لینا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم غیب کہتے ہیں اور صوفیہ محققین کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ لوگ رسول کا ادب نہیں کرتے ان جاہلوں کے نزدیک رسول کا ادب یہ ہے کہ ان کو خدا کے برابر کر دیا جائے تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا " ان لوگوں کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیئے کہ محققین سلف کا عقیدہ اس باب میں کیا ہے؟ علامہ ابن ابی جمرہ کا درجہ صوفیۂ محققین اور علما محدثین میں جو کچھ ہے وہ ان کے ترجمہ سے ظاہر ہے جو کتاب کے شروع میں لکھ دیا گیا ہے اتنا بڑا محقق اور محدث صاف کہرہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جملہ مغیبات کا علم حاصل ہونا عقلاً اور نقلاً ہر طرح محال اور ناممکن ہے آپ کو صرف بعض غیوب کا علم حاصل تھا جس کی امت کو یا ذات مقدسہ کو حاجت تھی جملہ غیوب کا علم حاصل نہ تھا، یہی وہ بات ہے جس کی ہمارے اکابر نے تصریح فرمائی تو ایوان بدعت میں زلزلہ آگیا اور تکفیر کے گولے برسنے لگے و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

(۹۱) علوم کشفیہ مقصود نہیں بلکہ علوم وحی مقصود ہیں

حدیث سے یہی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جس قدر مغیبات کا مشاہدہ کرایا گیا تھا ان سب کی خبر امت کو دینا آپ کے

ذمہ ضرور نہ تھا بلکہ آپ کو اختیار تھا کہ سب کو بیان کردیں یا بعض کو بیان کریں اور بعض کو بیان نہ کریں بخلاف وحی کے اس کا تمام بیان کرنا آپکے ذمہ لازم تھا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن چیزوں کا مشاہدہ اس مقام پر ہوا تھا آپ نے ان میں سے صرف بعض کا پتہ دیا تھا یعنی جنت و دوزخ کا، باقی سے سکوت کیا اور وحی میں آپ ایسا نہیں کر سکتے بلکہ اس کو کامل و مکمل جس طرح نازل ہوتی اسیطرح بیان فرماتے تھے، اور اسمیں حکمت واللہ اعلم یہ ہے کہ مشاہدات غیبیہ میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر کسی اور کا مطلع ہونا ممکن نہیں نہ کسی اور میں اتنی طاقت ہے بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ نے خاص قوت و مدد سے آپ کی امداد فرمائی ہے، بخلاف وحی کے کہ وہ اسی انداز پر نازل ہوتی ہے جس کی تلقی (اور تحصیل) کی امت کو قدرت ہے۔

ف اس سے معلوم ہوا کہ علوم کشفیہ کو قرب میں دخل نہیں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مشاہدات غیبیہ کو امت سے بیان کر دیتے آپنے قرب الٰہی کے تمام طرق بیان فرما دیئے ہیں کسی بات کو مخفی نہیں رکھا، قرب میں علوم وحی کو دخل ہے اسی لئے آپنے علوم وحی کو بتمامہ بجنسہ بیان فرما دیا ہے پس سالکین کو علوم وحی کا اہتمام کرنا چاہیئے علوم کشفیہ کے درپے نہ ہونا چاہیئے جب علوم وحی کے اتباع سے بندہ کو قرب حاصل ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اسکی استعداد کے موافق علوم کشفیہ بھی عطا فرما دیتے ہیں اور یہ بھی لازم و ضروری نہیں کیونکہ باتفاق امت صحابہ تمام امت سے افضل ہیں مگر حضرات صحابہ سے علوم کشفیہ منقول نہیں صرف علوم وحی منقول ہیں علوم کشفیہ زیادہ تر اولیاء متاخرین سے منقول ہیں خوب سمجھ لو۔

(۹۲) قدرت الٰہی نہ عقل کی پابند ہے نہ قیاس کی تابع

حدیث میں اللہ تعالیٰ کی عظمت قدرت پر بھی دلالت ہے اور یہ کہ قدرت نہ عقل انسانی کی پابند ہے نہ اسکے قیاس پر چلتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کو یہاں سے (یعنی دنیا سے) تو دیکھ لیا اور شب معراج میں نہیں دیکھا اسوقت صرف سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا جو جنت میں داخل نہیں جیسا معراج کی حدیث میں اس کا بیان آئیگا انشاء اللہ تعالیٰ نیز ان دو نہروں کو دیکھا جو سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکلتی اور جنت کیطرف جاتی ہیں، تو یہ اس بات کی بڑی دلیل ہے

کہ قدرت جس چیز کو چاہتی ہے چھپا دیتی ہے خواہ اس کے درمیان کوئی واسطہ اور فاصلہ ہو یا نہ ہو،
اور جس چیز کو چاہتی ہے ظاہر کر دیتی ہے خواہ وہ حجاب میں ہو یا بے حجاب ہو اور اس حقیقت کے ظاہر ہونے
پر فائدہ یہ مرتب ہوا کہ اس کے جاننے سے عادات پر التفات چھوٹ جاتا اور ایمان مضبوط ہو جاتا
ہے اور جب آدمی قدرت الٰہی کی عظمت کا یقین کر لیتا ہے کہ یہ واقعہ بھی اسی کا ایک نمونہ ہے
تو کسی چیز کے حاصل ہونے یا جاتے رہنے سے غم اور ناز کرنا چھوڑ دیتا ہے اسوقت مؤمن کا دل اپنے
مولیٰ کی بارگاہ سے لو لگانے اور ماسوا سے بے التفات ہو جانے کے لئے کھلتا ہے اور اپنے ہاتھ سے
اشیاء میں جو کچھ تصرف کرتا ہے اس پر (اصلا) بھروسہ نہیں کرتا بلکہ محض مقتضائے حکمت کو باقی رکھنے
کے لئے اسباب سے کام لیتا اور اپنے ہاتھوں سے تصرف کرتا ہے الوجہ العاشر والوجہ الحادی
عشر الخ قولہ بل ابتاءً لآثار الحکمۃ"

ف عظمت قدرت کا انکشاف بڑی دولت ہے جو سالکین کا مقصود اعلیٰ ہے اور اس کا
طریقہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ حدیث و قرآن کو سمجھ کر پڑھا جائے ذکر اللہ کی کثرت کی جائے بالخصوص
لا الٰہ الا اللہ اور سنت نبویہ کا اتباع کیا جائے اس کی برکت سے عظمت قدرت کا انکشاف
بہت جلد ہو جاتا ہے۔

(۹۳) ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ممکن ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد یقال ما علمک بھذا الرجل کہا جائیگا کہ اس
شخص کی نسبت تو کیا جانتا ہے اس شخص سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہے
اور مردہ کو آپ کا دیدار معائنہ و مشاہدہ سے ہوگا اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت قدرت کی دلیل ہے
کیونکہ لوگ ایک ہی وقت میں مختلف اور دور دراز اطراف عالم میں مرتے ہیں اور سب کے سب حضور
کو اپنے پاس دیکھیں گے کیونکہ اہل عرب لفظ ھذا کو اشارۂ قریب ہی کیواسطے استعمال کرتے ہیں نیز
اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ ایک وقت میں مختلف اقطار عالم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
سلم کو مختلف صورتوں میں دیکھنا ممکن نہیں کیونکہ اول تو جیسا ہم نے ابھی بیان کیا قدرت سے یہ کچھ
بعید نہیں دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من رآنی فی المنام فقد رآنی حقا

جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے سچ مچ مجھے ہی دیکھا ہے (کیونکہ شیطان آپ کی صورت نہیں بنا سکتا) تو جو شخص حضور کی رویت کا منکر ہے وہ اس حدیث کی تکذیب کرتا اور قدرت کو پابند کرتا ہے جو کسی چیز کی پابند نہیں نہ کسی حد اور قیاس کی تابع نیز اس میں اُن لوگوں کی دلیل ہے جو ایک وقت میں اطراف عالم میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دیدار کو ممکن اور جائز سمجھتے ہیں ان کی دلیل نقل سے تو یہی حدیث ہے جس کو ہم بیان کر رہے ہیں اور عقلی دلیل یہ ہے کہ اُن کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس آئینہ کے مشابہ ہے جس میں ہر شخص اپنی اچھی بُری شکل دیکھ لیتا ہے اور آئینہ اپنے اس حسن پر رہتا ہے جو اسکے اندر ہے اس میں تغیر نہیں آتا" الوجہ العشرون الیٰ قولہ فی الوجہ الثانی والعشرین علی حالتہا من الحسن لم تتبدل :

ف اس حدیث سے ہمارے بزرگوں نے اشتیاق موت کا سبق بھی حاصل کیا ہے کہ جب مرنے کے بعد قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوگی اور آپ کا دیدار نصیب ہوگا تو ایسی موت پر ہزار زندگیاں قربان، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو پڑھاتے ہوئے جب یہ مضمون بیان فرماتے تو یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

کشتئے کہ عشق دارد نہ گذارد ت بدیں ساں | بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(۳۴) کرامات اولیاء حق ہیں

اس حدیث میں کرامت اولیاء کے حق ہونے کی بھی دلیل ہے کہ وہ دور دراز کی اشیاء پر مطلع ہو جاتے اور کھلی آنکھوں ان کو اپنے پاس دیکھتے ہیں اور چند قدم اٹھا کر لمبی سے لمبی مسافت کو طے کر لیتے ہیں کیونکہ جس قدرت نے یہ سب کچھ کر دکھلایا جس کا حدیث میں بیان ہے کہ حضور نے اس عالم میں رہتے ہوئے جنت اور دوزخ کا معائنہ فرمایا اور ان کو اپنے سامنے قریب دیکھا حالانکہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش کے نیچے ہے عرش الٰہی اسکی چھت ہے اور دوزخ اسفل السافلین میں بحر اعظم کے نیچے ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اولیاء کو اشیاء بعیدہ یا مسافت طویلہ تک ذرا سی دیر میں پہنچا دیا ہے اسی واسطے بعض اولیاء نے فرمایا ہے کہ دنیا مومن کا ایک قدم ہے اسیطرح باوجود کثافت بدن کے ان کا قلوب پر مطلع ہو جانا بھی ممکن ہے کیونکہ حدیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ جواہر اجسام خود اپنی ذات سے کسی شئے کی رویت سے حاجب نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا میں رہتے ہوئے جنت و دوزخ کو کیونکر دیکھ لیتے جن میں سے ایک ساتویں آسمانوں کے اوپر
چہار دیواری گھری ہوئی ہے اور ایک اسفل السافلین میں بحر اعظم کے نیچے ہے جیسا ابھی بیان ہوا
نیز میت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں کیونکر دیکھ سکتا حالانکہ آپ کے اور میت کے درمیان زمین
اور پہاڑوں کی دیواریں حائل ہیں اور زمین تمام جواہر سے زیادہ کثیف ہے وھذا مما
نبہ علیہ الشارح فی الوجہ التاسع) ایک بزرگ کی جو اس کرامت سے ممتاز تھے
حکایت ہے کہ وہ اپنے احباب کی ساتھ ایک مقام پر بیٹھے ہوئے تھے مجلس میں ایک عام شخص بھی آ
گیا جو ان کی جماعت میں داخل نہ تھا بزرگ کے خدام میں سے ایک شخص نے اس عامی کے قلب
پر نظر کی تو کچھ اچھی حالت نہ دیکھی جب یہ عامی مجلس سے چلا گیا تو بزرگ نے اس خادم سے فرمایا
جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس کو واپس کرو کیونکہ تمہارے سوا دوسروں نے بھی تمہاری اس حرکت کو
دیکھ لیا ہے اور اگر اس شخص کو یہاں برداشت نہ کیا جائے گا تو مردان طریق میں اور کہاں اسکی
قدر ہوگی ہمارا مطلب یہ تھا کہ جس شخص کو کشف قلوب کی کرامت حاصل ہو اس کو بڑا حوصلہ مند
ہونا چاہیئے کہ اگر کسی کے دل کی حالت اچھی نہ معلوم ہو تو اسکو حقیر سمجھ کر نظروں سے نہ گرائے بلکہ
اسکی حالت درست کرنے کی کوشش کرے توجہ سے بھی اور دعا سے بھی اور تبلیغ و نصیحت سے بھی
اور جس کا حوصلہ اس درجہ کا نہ ہو وہ اس کرامت کا اہل نہیں اسی لئے بزرگ نے اس مرید کی
کرامت کو سلب کر لیا جس کے بعد وہ کشف قلوب کے قابل نہ رہا ۱۲)

اس حدیث سے بہت سی مجمل احادیث اور مشکل مسائل کی تفسیر و توضیح ہو گئی جو سننے کیساتھ
بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن موت کو اہل جنت
و اہل جہنم کے سامنے لایا جائیگا اور وہ سب اس کو پہچان لیں گے اسی طرح قیامت کے دن مسلمان
خاص تجلی سے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیں گے وہ فرمائیں گے میں تمہارا رب ہوں تو یہ کہیں گے بیشک آپ
ہمارے رب ہیں حالانکہ بہتوں نے اس وقت سے پہلے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا نہ پہچانا تھا تو جسطرح
مومن قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی پہچان لیگا اسی طرح یہاں سمجھ لو اور اس معرفت
کی فرع یہ بھی ہے کہ بعض اولیاء کو اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ وہ بعض مسائل فقہیہ کا جواب سوال سنتے
ہی معلوم کر لیتے ہیں حالانکہ پہلے سے ان مسائل کا ان کو کچھ علم بھی نہیں ہوتا پھر کتابوں میں دیکھا

جاتا ہے تو بعینہٖ انکے قول کیموافق (جواب) نکلتا ہے اور اس قسم کے بہت سے اشکالات ہیں جو اس حدیث سے حل ہو گئے یہ سب کے سب اسی قاعدہ کیموافق جس کا ذکر ہو چکا قدرت کے تحت میں ہیں اسلئے ان میں کچھ بھی اشکال نہیں کیونکہ قدرت جو چاہتی ہے اور جسطرح چاہتی ہے کرتی ہے الوجہ الخامس والعشرون والسادس والعشرون الی قولہ لان القدرۃ تا نصنع ماشآء کیف شاءت۔

ف بحمداللہ ہم نے اپنے اکابر میں اس شان کا مشاہدہ کیا ہے کہ سوال سنتے ہی جواب ان کے دل میں آجاتا ہے پھر کتابوں میں وہی نکلتا ہے جو ان کے دل میں آیا تھا، حضرت حکیم الامت دام مجدہم فرماتے تھے کہ جس شخص کو یہ دولت نصیب ہو جائے کہ اس کے دل میں سوال سن کر وہی جواب آئے جو کتابوں سے تلاش کے بعد نکلتا ہے اس کو اجتہاد سے کچھ حصہ مل گیا یہ مطلب نہیں کہ وہ مجتہد ہو گیا بلکہ اسکو اجتہاد کا ایسا ہی جزو سمجھنا چاہیئے جیسا حدیث میں رویائے صادقہ کو نبوت کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے کیونکہ اجتہاد بھی اسی وقت کے کمال کا نام ہے جب اسکی شادیگر آلات اجتہاد بھی پوری طرح میسر ہوں؛

اجتہاد محض حفظِ روایات کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جو مجتہد کے دل میں اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہر مسئلہ کا صحیح جواب اول اپنے ذوق سے معلوم کر لیتا ہے مگر اس پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتا جب تک حدیث مرفوع یا قول صحابی یا اقوال سلف سے موافقت نہ ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء　　　بے کتاب و بے معین و اوستا

ف یہ دولت تقویٰ اور اتباع سنت اور کثرتِ ذکر و صحبت مشائخ اہل قلوب سے جلد میسر ہوتی ہے محض درس و تدریس اور کتب بینی سے یہ دولت حاصل نہیں ہوتی مگر یہ کہ استاد جامع بین الظاہر والباطن ہو تو اسکی صحبت سے بھی یہ نور میسر ہو جاتا ہے۔

(۹۵) سچی بات بدلا نہیں کرتی

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سچی بات بدلا نہیں کرتی گو صاحب حق کا کتنی ہی بار امتحان کیا جائے کیونکہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ میت سے تین بار سوال کیا جائیگا تو مومن چونکہ حق پر ہوگا وہ فرشتوں کے تین بار سوال لوٹانے سے گھبرائیگا نہیں بلکہ ایک ہی جواب پر جما رہے گا کیونکہ اس کو اپنے حق پر ہونے کا یقین ہوگا۔

اگر جواب صحیح نہ ہوتا تو دوسری بار یا تیسری بار سوال کے دوہرانے سے گھبرا جاتا اور گھبرا کر پہلے جواب سے ہٹ جاتا کہ شاید یہ جواب ٹھیک نہیں تھا اس لئے سوال دوبارہ کیا گیا اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا

اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اسمیں بہت اختلاف پاتے

(کیونکہ اس صورت میں قرآن کا بنانے والا جھوٹا ہوتا اور جھوٹے کی باتیں مختلف ہوتی ہیں اور دروغ گو را حافظہ نباشد ۱۲) غرض جو بات اللہ کے پاس سے (اللہ کی طرف سے) ہوگی وہ حق ہوگی اور حق مختلف ہوتا ہے نہ متبدل و متغیر "الوجہ الثانی والثلثون فی ھذہ الدلیل علی ان الحق لا یتبدل الی قولہ والحق لا اختلاف فیہ ولا یتبدل"

ف ایک حدیث صحیح میں جسکی حاکم نے مستدرک میں تخریج کی ہے کسی قوم کے مبتلائے فتنہ ہونے کی علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ جس چیز کو پہلے حلال سمجھا جاتا تھا اسکو حرام سمجھنے لگیں اور جس کو پہلے حرام سمجھتے تھے اسکو حلال سمجھنے لگیں پس علمائے اہل سنت کو ان احادیث سے سبق لینا اور اپنی حالت پر غور کرنا چاہیئے کہ مسائل و احکام میں یہ اختلاف و تبدیل جو ان کے ہاتھوں ہو رہی ہے کس بات کا پتہ دے رہی ہے؟

ف اس حدیث سے سالکین کو بھی سبق لینا چاہیئے کہ حالات و واردات میں سے اسی کو حقانی سمجھیں جو قائم رہے متغیر و متبدل نہ ہو یعنی اس کا اثر باقی رہے گو غلبہ نہ رہے کیونکہ حال یا وارد کا غلبہ جیسا غلبہ ابتداء میں ہوتا ہے بعد میں ویسا نہیں رہتا اور اسمیں بھی حکمت ہے ورنہ انسان دوسرے کاموں سے معطل ہو جائے لیکن جو حال یا وارد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے وہ زوال غلبہ کے بعد اپنا اثر چھوڑ دیتا اور مقام بن جاتا ہے اور کیفیات نفسانیہ زوال غلبہ کیساتھ اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتیں، اہل بصیرت اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ حالت قبض میں کیفیات نفسانیہ ہی زائل ہوتی ہیں حالات و واردات رحمانیہ کو زوال نہیں ہوتا ان کا اثر باقی رہتا ہے۔

رزقنا اللہ وایاکم الثبات علی الحق ورزقنا الصدق فی الاقوال والاحوال والاعمال کلھا بمنہ وکرمہ انہ جواد کریم"

(۹۶) عقل وفہم اسباب سے نہیں بلکہ اللہ کی عطا سے نصیب ہوتی ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فہم وتمیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیز ہے جس کو چاہتے ہیں کسی مقدمہ یا سبب کے ذریعہ یا بدون مقدمہ اور سبب کے عطا کر دیتے ہیں کیونکہ اس امت میں زیادہ تر افراد وہ ہیں جو علم سے اس قدر سیراب نہیں ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات کو علم کے ذریعہ پہچان لیں (چنانچہ مشاہدہ ہے) کہ ایسے افراد بہت کم ہیں پھر بھی باوجود حضور کی ذات وصفات سے ناواقف ہونے کے مسلمان جب حضور کو قبر میں دیکھیں گے دیکھتے ہی کہدیں گے یہ محمد رسول اللہ ہیں اُن سے تین دفعہ سوال کیا جائے گا پھر بھی وہ اس بات سے نہ ہٹیں گے ان کو یقین ہوگا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہی حق ہے، یہ اس بات کی بڑی دلیل ہے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے کہ اس حدیث سے بعض احادیث اور بعض مسائل بلکہ بعض آیات سے بھی اشکال رفع ہو گیا کیونکہ جس قدرت کے تحت میں یہ بات داخل ہے جس کا اس حدیث میں ذکر ہے وہ اس قسم کی سب باتوں پر قادر ہے

اتباع کیساتھ بعض صفات الٰہیہ سے جاہل ہونا مضر نہیں اور ترک اتباع کیساتھ دلائل وبراہین کی معرفت مفید نہیں

اس حدیث سے اہل سنت کے اس قول کی بھی تائید ہو گئی کہ اتباع امرونہی کے ساتھ دلیل وبرہان سے اللہ تعالیٰ کی معرفت مفید نہیں کیونکہ مسلمانوں میں بعض تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے واقف ہیں اور بعضے ناواقف ہیں مگر سب کے سب حضور کو دیکھتے ہی پہچان لیں گے اور خوب پہچان لیں گے کہ تین دفعہ ان سے سوال کیا جائیگا اور ہر دفعہ یہی جواب دیں گے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس جواب سے نہیں ہٹیں گے، اور منافقوں میں سے بعض نے دنیا میں حضور کو دیکھا تھا اور اچھی طرح پہچان لیا تھا مگر جب اس معرفت کے فائدہ کا وقت آیا تو معرفت جہل سے بدل گئی اس کا سبب بجز اسکے اور کیا تھا کہ مسلمانوں نے حضور کے طریقہ کا اتباع کیا تھا اور منافقوں نے اتباع نہ کیا تھا تو ان کا علم جہل سے بدل گیا اور ظاہری معرفت نے کچھ بھی نفع نہ دیا اسی طرح جو لوگ فلاسفہ کی طرح دلائل وبراہین سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور

شریعت کا اتباع نہیں کرتے قیامت میں یہ معرفت ان کو نفع نہ دیگی بلکہ بہت سے جاہل
مسلمان اتباع شریعت کی بدولت اُن سے اعلیٰ وارفع ہوں گے۔ پس کوئی ہے جو غفلت
سے بیدار ہو کر تحصیل اخلاص و صدق پر آمادہ ہو اور اپنی رہائی کا راستہ اختیار کرے؟ الوجہ
الثالث والثلاثون والرابع والثلاثون فی ھذا دلیل لاھل السنۃ الی قولہ
لیسلک محجۃ خلاصۃ "

ف اس سے سالکین وعارفین کو سبق لینا چاہیئے کسی کو اپنی فہم و معرفت پر ناز نہ کرنا
چاہیئے یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں اور سچی معرفت وہ ہے جو مرنے کے
بعد قبر میں اور حشر میں کام دے جس کی دنیا میں کسی کو خبر نہیں ؎

تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

(۹۷) اہل یقین غلطی سے محفوظ اور خطرات سے مامون رہیں گے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یقین والے سوال
قبر کے موقعہ پر جواب میں غلطی سے محفوظ اور اس مقام پر جن خطرات و فتن کا اندیشہ ہے اُن سے
مامون رہیں گے۔ پس مقام یقین حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ صوفیا اس
مقام میں دوسروں سے زیادہ راسخ ہیں، رہا مؤمن کا حال تو وہ بقیہ حدیث کی شرح میں آئے گا
انشاء اللہ تعالیٰ (جس کا ترجمہ نہیں کیا گیا) الوجہ الحادی والاربعون فی ھذا دلیل علی ان
الموقنین محفوظون الی قولہ واما المؤمن نسأتی بیانہ فی باقی الحدیث انشاء اللہ تعالیٰ

(۹۸) ایمان کو قوی یقین کو مضبوط اور سفر آخرت کا سامان کرنا چاہیئے

مجموعہ حدیث پر دو عملی فائدے مرتب ہوئے ایک یہ کہ اس سے ایمان کو قوت اور یقین کو رسوخ اور
کمال حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس حدیث میں عظمت قدرت اور عظمت قادر پر بہت زیادہ دلالت
ہے جیسا کئی بار ہم نے بتلایا ہے، دوسرے کوچ کے لئے سامان کرنے اور اپنی نجات کا راستہ
اختیار کرنے اور دنیا میں جتنی بھی فرصت انسان کو ملے اس کیلئے کوشش کرنے کی ہدایت ہے
کیونکہ اس حدیث میں موت کی خبریں اور نجات وغیرہ کے طریقوں کا بیان بہت کچھ ہے پس کیا کوئی

اپنی جان چھڑانے کو مستعد ہے ؟ قبر میں اترنے سے پہلے، کیونکہ جب ڈرا دیا گیا ہے تو پھر کسی قسم کا عذر نفع نہ دیگا۔ الوجہ السادس والاربعون بترتیب علی جمع هذا الحديث الى قوله لانه لم ينفع الاعتذار مع تقدم الانذار ۔

ف اس حدیث اور اس قسم کی تمام احادیث سے یہ فوائد صوفیہ اہل باطن ہی کو حاصل ہوتے ہیں اور وہی سفر آخرت کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں ظاہر بینوں یا سیاست دانوں کو ان فوائد کی ہوا بھی نہیں لگتی اور یہ دلیل ہے حضرات صوفیہ کے حق پر ہونے کی کہ ان کو حدیث و قرآن کی صحیح فہم اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جعلنا الله وایاکم من حزبه وحزب حبيبه"

ف حدیث سے صحابہ و تابعین کی احتیاط فی الروایۃ ظاہر ہے کیونکہ فقط مثل اور قریب اور لفظ مؤمن و موقن اور منافق و مرتاب کے معانی میں کچھ تفاوت نہیں ہے مگر چونکہ راوی کو اس میں شک تھا کہ حضرت اسماء نے کون سا لفظ اختیار کیا تو اس نے اپنے تردد کو ظاہر کر دیا کہ یہ لفظ تھا یا وہ ان دونوں میں سے ایک تھا، کیا اب بھی کسی کو رواۃ حدیث کی عدالت اور حدیث کی حجیت میں کچھ کلام ہو سکتا ہے ؟ ومن لم يجعل الله له نورا فما له من نور



حدیث

اسعد الناس من قال لا الٰہ الا اللہ

(حضرت) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کے دن آپ کی شفاعت سے زیادہ کامیاب کون ہوگا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوہریرہ! میں جانتا تھا کہ اس بات کو تم سے پہلے کوئی مجھ سے نہ پوچھے گا کیونکہ میں حدیث کیساتھ تمہارے شوق (اور شغف) کو دیکھ رہا ہوں، قیامت کے دن میری شفاعت سے زیادہ کامیاب وہ ہوگا جس نے لا الٰہ الا اللہ خالص دل سے کہا ہوگا۔

شرح ظاہر حدیث اس بات کو بتلا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے قیامت کے دن زیادہ کامیاب وہ ہوگا جس نے خالص دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہوگا اور اس کے متعلق چند ضروری باتیں قابل ذکر ہیں۔

(۹۹) سوال سے پہلے مخاطب کا نام لینا چاہیئے حدیث سے معلوم ہوا کہ سوال سے پہلے مخاطب (مسئول) کا نام لینا چاہیئے اور اگر اس کے نام و القاب متعدد ہوں تو جو ان میں سب سے اعلیٰ اور اس کو سب سے زیادہ محبوب ہو اسی کو اختیار کرنا چاہیئے بشرطیکہ وہ نام شریعت کے موافق ہو، کیونکہ صحابی نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنا چاہا تو پہلے آپ کا نام لیکر آپ کو پکارا پھر سوال کیا (چھوٹتے ہی سوال شروع نہیں کر دیا) اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور القاب

متعدد تھے تو ان میں جو سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ حضور کو محبوب تھا یعنی رسول اللہ اس سے آپ کو پکارا (اور اس طرح سوال سے پہلے حضور کو اپنی طرف متوجہ کیا)

سوال کے وقت تکلف اور تملق سے باتیں نہ کرنا چاہئیں

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ (شیخ یا مربی سے) کوئی بات دریافت کرنے کے وقت التماس اور چاپلوسی (اور تکلف نہ کرنا چاہیئے کیونکہ صحابی نے حضورؐ کا اسم گرامی لینے کے بعد اپنی حاجت ہی بیان کردی کوئی اور بات التماس یا تکلف کی نہیں کی"

محبت اتباع میں ہے باتوں میں نہیں

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت (آپکے) اتباع میں ہے باتوں میں نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر محبت تھی وہ معلوم و متیقن ہے اور اتباع (رسول) میں بھی جو درجہ اُن کا ہے کسی سے مخفی نہیں مگر (بایں همه) اس موقعہ پر انہوں نے جب حضور کو پکارا تو آپکے مشہور نام پر کچھ اضافہ نہیں کیا اور اسی صفت میں تمام صحابہ یعنی مہاجرین و انصار اور حضورؐ کے خاص عشاق سب ایسے ہی تھے۔ (سب یا رسول اللہ کے سوا کچھ نہ کہتے تھے) باوجود اس قدر کامل محبت کے کسی سے منقول نہیں کہ انہوں نے ایک دن بھی حضورؐ کے نام میں مبالغہ کیا ہو اور یہ بات ان کے حالات سے بالیقین معلوم ہو چکی ہے کہ یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم میں کوتاہی نہ کرتے تھے (پس ثابت ہوا کہ سادگی سے نام لینا خلاف ادب نہیں اور نام لینے میں مبالغہ کرنا تعظیم و تکریم کے لئے لازم نہیں)

حدیث میں صوفیہ کے اس طرز کی بھی دلیل ہے کہ وہ محبوب کے ذکر سے کلام شروع کرنے کو پسند کرتے اور فرماتے ہیں کہ اسطرح کلام شروع کرنے سے دل روشن ہو جاتا ہے اور سیدھے راستہ کی ہدایت ہوتی ہے اور اس سے ہمیشہ فائدے حاصل ہوتے اور خوشیاں نصیب ہوتی ہیں کیونکہ آدمی جب اپنے سب سے زیادہ محبوب کا نام لیگا تو اس سے اسکی مسرت دوچند اور بشارت ترقی پذیر ہوگی جیسا آئندہ (مفصل بیان) آئے گا۔

اس مضمون کی زیادہ وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پیر

میں کچھ تکلیف ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ اسکو دراز نہیں کر سکتے تھے، کسی طبیب سے حال بیان کیا تو اس نے کہا کہ اپنے سب سے زیادہ محبوب کا نام لیکر اس کو دراز کرو کھل جائے گا چنانچہ انہوں نے اسی وقت وا محمداہ کہا تو فوراً ہاتھ کھل گیا۔ جب اطباء ظاہر امراض ظاہرہ میں محبوب کے نام کی تاثیر کے قائل ہیں تو اطبائے باطن اگر شفائے ظاہر و باطن میں اسکے قائل ہوں تو کیا تعجب ہے؟

الوجہ الاول والثانی والثالث والرابع الی قولہ فنادی وامحمداہ فامتدت یدہ"

(۱۰۰) معیارِ فضیلت قوتِ ایمان ہے کثرتِ عمل نہیں

حدیث سے (آنحضرت) صحابہ کی قوتِ ایمان اور فضیلت بھی معلوم ہوئی کیونکہ شفاعت سے کامیاب (و ناکام) کو وہی دریافت کر سکتا ہے جس کا ایمان شفاعت پر کامل اور تصدیق مضبوط ہو اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ما فضلکم ابوبکر بصوم ولا صلوٰۃ ولکن بشئ وقر فی صدرہ "ابوبکر (صدیق) کو تم پر نماز روزہ سے فضیلت حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس چیز سے جو اُن کے دل میں جمی ہوئی ہے"

اور صدیق اکبر کے دل میں جو بات تھی وہ قوتِ ایمان اور یقین ہی تو ہے اسی طرح تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو دوسروں پر اسی چیز سے فضیلت حاصل ہے جو ان کے دل میں تھی اور جو کوئی محروم یا مرتد ہوا وہ ایمان اور تصدیق کی کمزوری ہی سے محروم و مرتد ہوا کیونکہ جس کا ایمان کمزور ہوتا ہے وہ معاملات آخرت اور قدرت حق کی کیفیت دریافت کرنے کے درپئے ہوتا ہے اور جب کیفیت سمجھ میں نہیں آتی تو دین سے ایسا نکل آتا ہے جیسا تیر نشانہ سے اور اس بیچارہ کو اپنی اس حالت کی خبر بھی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل سے آزمائش اور ابتلاء سے بچائے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سعادت کی طلب اور اس کا اہتمام کرنا اور اس کے حصول کے طریقوں کو کام میں لانا چاہیئے کیونکہ جو شخص سعادت کا راستہ معلوم کرے گا اور اسکے سوا دوسرے راستوں کو چھوڑ دیگا اور اسی واسطے وہ اس راستہ کو دریافت کریگا الوجہ السابع والثامن فیہ دلیل علی قوۃ ایمان الصحابۃ الی قولہ فلذلک یسأل عنہا"

ف یہاں سے قوت ایمان اور یقین کا درجہ معلوم ہوگیا کہ اسی پر مدار فضیلت ہے، اسی لئے حضرات صوفیہ اعمال ظاہرہ سے زیادہ تقویت ایمان اور تکمیل یقین کا اہتمام کرتے ہیں تم دیکھو گے کہ محققین صوفیہ عام زاہدوں عابدوں سے زیادہ نمازیں نہیں پڑھتے مگر ان کی قوت ایمان دوسروں سے زیادہ ہے۔

(۱۰۱) معاملات آخرت قیاس و عقل سے بالاتر ہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ معاملات آخرت میں قیاس اور عقل و اجتہاد کو دخل نہیں کیونکہ قیامت کی دونوں شفاعتوں کا علم تھا اور یہ بھی دلائل سے ان کو معلوم تھا کہ شفاعت سے زیادہ کامیاب کون ہے اور ناکام کون ہے، کیونکہ شفاعت کا علم حاصل ہونے کے بعد اس کا علم ضروری ہے لیکن انہوں نے اس علم پر التفات نہیں کیا جو ان تمام واقعات سے دلالۃً حاصل تھا بلکہ شارع علیہ السلام سے صراحۃً اس کو دریافت کیا اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کے نزدیک یہ بات طے شدہ تھی کہ اس باب میں نقل کے سوا کسی شے کو دخل نہیں الوجہ الحادی عشر فی هذا دلیل علی ان امور الآخرۃ لا تؤخذ بالعقل الی قولہ لا یسوغ فیہ غیر النقل کما تقدم"

ف پس امور آخرت کے اثبات میں دلائل عقلیہ سے کام نہ لینا چاہیئے بلکہ دلائل نقلیہ سے ان کو ثابت کرنا چاہیئے۔

(۱۰۲) مخاطب کا دل خوش کرنا سنت ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جواب دینے سے پہلے سائل کا دل خوش کرنا سنت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب سے پہلے یہ فرمایا کہ اے ابوہریرہؓ میں جانتا تھا کہ تم سے پہلے اس حدیث کو مجھ سے کوئی نہ پوچھے گا۔ اور اس بات سے صحابی کا دل خوش ہونے میں راز یہ ہے کہ یہ بات حضورؐ اس وقت تک نہیں فرما سکتے جب تک صحابی کے شوق و شغف کا مشاہدہ نہ فرمائیں اور شوق حدیث کا علم اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ حضورؐ ہمیشہ انکی طرف متوجہ رہتے اور ان کے اقوال و افعال پر نگاہ رکھتے ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی ایک کو ایک نگاہ دیکھ لینا ہی صحابہ کے لئے خوشی کا بڑا سرمایہ تھا

توجس بات اور دن ہر وقت حضور کی توجہ ہو اسکی خوشی کا کیا پوچھنا ؟ الوجہ الرابع عشر فی ھذا دلیل علیٰ ان من السنۃ ادخال السرور والی قولہ فکیف بھا فی مرۃ واللیالی والایام۔

ف یہ حکم اس وقت ہے جبکہ سائل نے کام کی بات پوچھی ہو اور اگر فضول بات پوچھی ہو تو اسکے متعلق دوسری سنت یہ ہے کہ ناراضی کا اظہار کیا جائے چنانچہ حدیث میں ہے کان یکرہ المسئلۃ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سوال سے ناگواری ہوتی تھی یعنی فضول سوال سے خوب سمجھ لو۔

(۱۰۳) مخاطب کی خوشی میں اضافہ کرنا سنت ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشی پر خوشی کا اضافہ کرنا زیادہ مناسب ہے اس سے مسرت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی ہی بات پر سکوت فرماتے کہ میں جانتا تھا کہ تم سے پہلے اس حدیث کو کوئی نہ پوچھے گا تو صحابی کے خوش ہونے کو اتنا ہی کافی تھا مگر جب آپ نے اس کا سبب بھی بتلا دیا کہ میں تمہارے شوق کو دیکھ رہا ہوں تو اس سے مسرت پر مسرت کا اضافہ ہو گیا اور یہ ایسا ہی ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سردار وفد عبدالقیس سے فرمایا تھا فیک خصلتان یحبھما اللہ ورسولہ قال یا رسول اللہ ذلک شئی اتصنعہ انا او شئی جبلنی اللہ علیہ قال بل شئی جبلک اللہ علیہ فقال الحمد للہ الذی جبلنی علی خصلتین یحبھما اللہ ورسولہ تمہارے اندر دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں ان خصلتوں کو بہ تکلف اپنے اندر پیدا کرتا ہوں یا اللہ تعالیٰ نے میری فطرت میں انکو رکھدیا ہے فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری فطرت میں ان کو رکھا ہے، کہا اللہ کا شکر ہے جس نے میری فطرت میں ایسی دو خصلتیں رکھدی ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں، اسی کی نظیر وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مومنین کے متعلق بیان فرمائی ہے کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو ان سے کہا جائیگا ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون، بما کنتم تکسبون، بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ

کہ جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے سبب جو تم نے کئے تھے جو تم اپنے اختیار سے کرتے تھے جو تم نے گذشتہ ایام میں پہلے سے ذخیرہ کئے تھے" یہ سب باتیں ان کی خوشی بڑھانے اور مسرت کو ترقی دینے کے لئے کہی جائیں گی، ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل واحسان کے صدقہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو بھی اپنے کرم سے یہ دولت عطا فرمائیں (الوجہ السادس عشر فیہ دلیل علی ان اتباع المسرۃ بالمسرۃ اولیٰ، الی قولہ نسأل اللہ بمنہ ان یمن علینا بذلک بکرمہ)

ف یہاں سے ان مشائخ کے طرز تربیت کی تائید ہو گئی جو سالکین کی ہمت بڑھاتے اور ان کے حالات محمودہ پر مسرت ظاہر کرکے ترقی کیطرف بڑھاتے ہیں اور تجربہ شاہد ہے کہ یہ طرز زیادہ مفید ہے"

(۱۰۴) جواب دیتے ہوئے مخاطب کا نام لیکر خطاب کرنا بھی سنت ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جواب دینے کے وقت سائل کا نام لینا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب سے پہلے حضرت ابوہریرہ کا نام لیکر ان کو خطاب فرمایا، اسمیں بظاہر دو فائدے ہیں ایک یہ کہ نام لیکر خطاب کرنے سے مخاطب کی طبیعت مجتمع اور یکسو ہو جاتی ہے عام خطاب میں یہ بات نہیں ہوتی اس کے بعد جو کچھ اس سے کہا جائیگا اس کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریگا، اسی کی نظیر یہ واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت معاذ بن جبل حضور کے ساتھ اونٹنی پر سوار تھے تو آپ نے تین دفعہ ان کو یا معاذ کہہ کر پکارا جس کے جواب میں ہر دفعہ وہ لبیک یارسول اللہ وسعدیک کہتے رہے) تین بار پکارنے کے بعد آپ نے وہ بات ارشاد فرمائی جو ان سے کہنا چاہتے تھے، یہ کیوں کیا گیا؟ محض اس لئے کہ جو بات ان سے کہنا تھی وہ اس کے سننے کو اچھی طرح تیار ہو جائیں اور کان لگا کر سنیں۔

دوسرے نام لیکر پکارنے میں مخاطب کا دل خوش کرنا ہے کیونکہ بزرگ جب اپنے چھوٹے کو نام لیکر پکارتے ہیں تو اس سے اس کو فرحت اور نشاط ہوتا ہے کیونکہ یہ خاص تعلق کی دلیل ہے پھر سید الاولین والآخرین کا ان مبارک ہستیوں کو پکارنا جن کی محبت حضور کے ساتھ تواتر سے ثابت ہے جو حضور کی ایک ایک نگاہ اور ادنیٰ سی توجہ کو بھی باعث برکت سمجھتے

مجھے کیا کچھ موجب نشاط و سرور) ہوگا؟ اس کا اندازہ عشاق ہی کر سکتے ہیں) اسکی تائید اس قصہ سے ہوتی ہے جو اوپر بیان کیا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہاتھ یا پیر میں تکلیف ہوگئی تھی تو طبیب نے کہا کہ اپنے سب سے زیادہ محبوب کا نام لیکر اس کو کھولو انہوں نے وا محمداہ کہا اور ہاتھ کھل گیا۔ الوجہ السابع عشر فی دلیل علی تسمیۃ السائل عند رد الجواب الیٰ قولہ وقد تقدم ذکرھا فی الحدیث قبل ھذا

ف بزرگوں کے مختلف مذاق ہیں بعضے اپنے خدام کو نام لیکر نہیں پکارتے بلکہ القاب سے پکارتے ہیں اور خطوط میں بھی تعظیمی القاب تحریر فرماتے ہیں مگر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے چھوٹوں کا نام لیا کرتے اور تعظیمی القاب استعمال نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس سے محبت اور تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ نام نہ لینے اور تعظیمی القاب سے یاد کرنے میں اجنبیت مترشح ہوتی ہے حضرت حکیم الامت دام مجدہم کا بھی یہی مذاق ہے اور بحمداللہ یہ مذاق سنت کے موافق ہے۔

(۱۰۵) جو بات زیادہ مفید ہو اس کو مقدم کیا جائے

حدیث سے معلوم ہوا کہ سائل کے حق میں جو بات زیادہ مفید ہو اسے مقدم کرنا چاہئے اگرچہ اس نے اس کو دریافت بھی نہ کیا ہو نیز معلوم ہوا کہ جو بات کسی شخص کے ساتھ مخصوص ہو اس کا جاننا عام احکام کے جاننے سے مقدم ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب سے پہلے جو سائل وغیرہ سب کے لئے عام ہے۔ اس بات کو بیان فرمایا جو سوال کنندہ کے ساتھ مخصوص اور اس کے حق میں زیادہ مفید اور اس کے لئے باعث مسرت تھی الوجہ التاسع عشر فیہ دلیل علی تقدیم الاولیٰ فی حق السائل الی قولہ ومایسر بہ۔

(۱۰۶) حسن افعال سے حسن حال پر استدلال درست ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کے حسن حال پر اسکے افعال سے استدلال کرنا درست ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کی حالت حسنہ پر ان کے عمل ظاہر سے استدلال فرمایا لعنی

حرص و شوق حدیث سے اور حرص منجملہ اعمال کے ایک عمل ہے پس ثابت ہوا کہ اعمال سے حسن حال پر استدلال کرنا استدلال بالقول سے اولیٰ ہے کیونکہ قول میں تو مجاز کا بھی احتمال ہے اور فعل میں یہ احتمال نہیں (دوسرے قول میں تصنع اور بناوٹ بھی ہوسکتی ہے اور عمل میں تصنع مدت تک نہیں چل سکتا) الوجہ العشرون فیہ دلیل علی جواز الاستدلال علی حال المرأ بفعلہ الیٰ قولہ والفعل لیس کذلک

ف حضرات مشائخ کی تعلیم یہی ہے کہ شیخ کامل کو اس کے عمل سے پہچانو، باتوں سے نہ پہچانو، کیونکہ باتیں تو سن سنا کر یا کتابوں سے یاد کر کے بھی ہوسکتی ہیں مگر عمل پر سنت تصنع اور بناوٹ سے نہیں ہوسکتا جب تک دل میں اتباع سنت کا اہتمام نہ ہو، بناوٹ کا قلعہ زیادہ دیر پا نہیں ہوتا اس لئے جلوت و خلوت میں ہر طرح شیخ کے عمل کو دیکھ کر انتخاب کرے نیز اولیاء معروفین کی شہادت کو بھی دیکھے کہ وہ اس کے بارہ میں کیسا گمان رکھتے ہیں۔

(۱۰۷) علوم حکمت کو اہل ہی سے بیان کرنا اور وقت پر بیان کرنا سنت ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ علوم حکمت کو اہل اور لائق ہی سے بیان کرنا سنت ہے اور یہ کہ اس قسم کی باتیں وقت ہی پر بیان کی جائیں بے وقت نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کی فضیلت کو اسی وقت ظاہر فرمایا جب انہوں نے اس حدیث کو جس سے بہت سے بندگان کرام غفلت کر جاتے ہیں دریافت کیا الوجہ الثانی و العشرون فیہ دلیل علی ان السنۃ فی الحکمۃ ان لا تلقے الا لاھلھا الی قولہ قد یغفل عنہ کثیر من السادۃ الفضلاء

ف حضرات مشائخ کا اس سنت پر عمل ہے۔

(۱۰۸) کسی کے عمل کی تعریف کا مضائقہ نہیں ذات کی مدح نہ کرو

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صاحب عمل کے عمل کی تعریف کرنا بہتر اور مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کی تعریف فرمائی اور ان کو حدیث کا زیادہ شوق بتلایا اس عمل کی وجہ سے جو ان سے صادر ہوا تھا یعنی حدیث کا شوق، بخلاف مدح ذات کے کہ وہ ممنوع ہے، اور فرق دونوں میں یہ ہے کہ عمل کی مدح سے تو صاحب عمل کو اس عمل کا شوق اور اہتمام زیادہ ہو جاتا ہے اور ذات کی مدح سے عجب اور خود رائی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے الوجہ السادس والعشرون فیہ دلیل علی ان مدح العمل لصاحبہ مندوب الیہ الحی قولہ یخاف منہ العجب والالتفات

ف حضرات صوفیہ کا عمل اسی کے موافق ہے

(۱۰۹) اہل اللہ میں تمام صفات کمال موجود ہوتی ہیں مگر جس میں کوئی صفت دوسروں سے کسی قدر زیادہ ہو وہ اسی صفت سے ممتاز ہو جاتا ہے

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے شوق کے ساتھ ان صحابی کو ہی کیوں مخصوص فرمایا حالانکہ حدیث کا شوق تو تمام صحابہ کو تھا جیسا ان کے حالات و واقعات سے معلوم ہے کہ سب کے سب حدیث کی بہت حرص اور تعظیم و محبت رکھتے تھے جواب یہ ہے کہ واقعی سب صحابہ ایسے ہی تھے مگر اس باب میں ان صحابی کو کچھ فوقیت حاصل تھی جس کی وضاحت اس روایت سے ہوتی ہے جس میں خود حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ میرے انصاری بھائی تو بعض اوقات اپنے باغوں کی دیکھ بھال میں رہتے تھے اور مہاجرین بازاروں میں کسب معاش کے لئے مشغول رہتے تھے اور میں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پڑا رہتا تھا اس لئے مجھے وہ باتیں یاد کرنے کا موقع ملتا تھا جن کا دوسروں کو موقع نہ ملتا تھا اسی فوقیت کی وجہ سے کہ وہ ہر وقت حضورؐ کے پاس رہتے تھے ان کو یہ بزرگی حاصل ہوئی اور ہر چند کہ ان کی طرح دوسرے صحابہ بھی اس امر کے بہت شائق و راغب رہتے (کہ حضورؐ کی باتیں سنیں) چنانچہ تم ان کے واقعات میں دیکھو گے کہ وہ ہر نیک کام کی طرف سبقت کرتے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے مگر اس حالت میں اگر کسی

کو نیک کام میں دوسروں سے ذرا بھی فوقیت حاصل ہو جاتی تو اس نیک کام کے طریقہ کو اسی کی طرف منسوب کر دیا جاتا اور اسی کو اس طریقہ کا امام کہا جاتا ہے، یہی حال ان بزرگوں کا ہے جو قیامت تک اخلاص کیساتھ ان کا اتباع کرنیوالے ہیں، اس تقریر کی توضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔

انا مدینة السخاء و ابوبکر بابها انا مدینة الشجاعة وعمر بابها وانا مدینة الحیاء وعثمان بابها وانا مدینة العلم وعلی بابها

"میں سخاوت کا شہر ہوں ابوبکر اس کا دروازہ ہیں، میں شجاعت کا مخزن ہوں عمر اس کا دروازہ ہیں میں حیاء کا منبع ہوں عثمان اس کا دروازہ ہیں میں علم کا خزانہ ہوں علی اس کا دروازہ ہیں (اس حدیث کا اخیر جزو انا مدینة العلم وعلی بابها لوگوں کی زبان پر مشہور ہے مگر محدثین کو اسی کی صحت میں کلام ہے پوری حدیث کا جو کچھ حال ہوگا اسی سے سمجھ لیا جائے) پس ہرچند کہ چاروں حضرات کے اندر یہ تمام صفات موجود تھیں مگر ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر کسی ایک صفت میں ذرا سی فوقیت حاصل تھی تو وہ صفت ان ہی کی طرف منسوب ہو گئی۔ اس میں صوفیاء کے لئے بڑی دلیل ہے کہ چونکہ وہ بھی قطع علائق اور تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف مشتاق رہتے ہیں دوسروں سے بڑھے ہوئے اور صفاء باطن سے بدرجۂ کمال ممتاز ہیں اس لئے صفاء اور صفوت کی صفت سے مخصوص ہو گئے اور ان کا لقب صوفی ہو گیا حالانکہ سب مسلمانوں میں صفاء باطن کا کوئی درجہ یقیناً موجود ہے کیونکہ ایمان صفاء کو مقتضی ہے مگر صوفیہ کو اس باب میں خاص درجہ حاصل ہے اس لئے یہ صفت انہی کے ساتھ مخصوص کر دی گئی دوسروں کے لئے استعمال نہیں کی گئی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو بھی ان کی برکات سے حصہ عطا فرمائے آمین

الوجه الثامن والعشرون والتاسع عشرون من قوله لقائل ان یقول لم خص علیه السلام هذا بالحرص الی قوله اعاد الله علینا من برکتهم بمنه ویمنه

ف جب حضرات صحابہ و اولیاء کرام کی یہ شان ہے کہ ان کا ہر فرد تمام صفات محمودہ کا جامع ہوتا ہے تو یقیناً انبیاء کا مقام اس سے بھی اعلیٰ وارفع ہوگا اب ان لوگوں کی جہالت و

حماقت کا اندازہ کرو جو اپنی سیرتوں میں لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام میں رحم کا مادہ نہ تھا موسیٰ علیہ السلام میں طاقت ضبط نہ تھی عیسیٰ علیہ السلام میں سلطنت و تمدن کا سلیقہ نہ تھا نعوذ باللہ من ھذہ الھذیانات و نستغفرہ من جمیع السیئات

(۱۱۰) جس کے ایمان میں کچھ بھی آمیزش ہوگی وہ حضور کی شفاعت سے محروم ہوگا

حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ایمان میں کچھ بھی شائبہ آمیزش کا ہوگا وہ حضور کی شفاعت سے زیادہ کامیاب نہ ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ کامیاب ہونے کے لئے اخلاص کی شرط بیان فرمائی ہے اور اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تھوڑی یا بہت کچھ بھی آمیزش نہ ہو۔

دل سے لا الٰہ الا اللہ کہنا کافی نہیں زبان سے کہنا ضروری ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کے دل میں ایمان ہو اور اس نے زبان سے ایمان کا اظہار نہ کیا ہو وہ بھی کامیاب نہ ہوگا نہ اس کو اس خاص شفاعت سے حصہ ملے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے تلفظ کی شرط لگا دی ہے اور جب یہ شرط نہ پائی جائے مشروط بھی نہ پایا جائے گا قولہ فی الوجہ الواحد والثلاثین والوجہ الثانی والثلاثین فیہ دلیل علی ان من خالط ایمانہ شائبۃ لا یسعد بہ وفیہ دلیل علی ان من اعتقد الایمان دون النطق بہ الی قولہ والشرط اذا عدم عدم المشروط

ف صوفیہ کرام کو اخلاص عمل کا جس قدر اہتمام ہے ظاہر ہے کہ ان کی تمام تر کوشش اخلاص ہی کے واسطے ہے نیز صوفیہ کو ذکر لا الٰہ الا اللہ کی تکثیر کا بھی اہتمام ہے ذکر نفی اثبات اسی کا نام ہے اور اسی کی تکمیل سے ان کے نزدیک مقامات کی تکمیل ہوتی ہے پس صوفیہ اس حدیث کے موافق شفاعت نبویہ سے زیادہ کامیاب ہیں جعلنا اللہ وایاکم من اسعد الناس بھا نیز اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ذکر قلبی تنہا کافی نہیں بلکہ اسکے ساتھ ذکر لسانی کی بھی ضرورت ہے

ف یہ جو کہا گیا ہے کہ جس کے دل میں ایمان ہو مگر زبان سے اس نے لا الٰہ الا اللہ نہ کہا ہو تو وہ حضور کی شفاعت سے حصہ نہ پائیگا یہ اس پر مبنی ہے کہ قول کو تلفظ باللسان کیساتھ خاص کہا جائے اور اگر کلام قلبی کو بھی عام کہا جائے تو ایسے شخص کا شفاعت سے محروم ہونا لازم نہیں ہے

"ان الکلام لفی الفؤاد و انما جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا"

اور یہ گفتگو اس شخص کے بارہ میں ہے جس نے بدون کسی عذر کے اظہار ایمان میں سستی کی ہو اور اگر کسی عذر کی وجہ سے ایمان کو ظاہر نہ کر سکا اور اسی حالت میں مرگیا تو راجح اور ظاہر یہ ہے کہ وہ عنداللہ ماجور ہوگا اور شفاعت نبویہ سے محروم نہ ہوگا۔

وھذا مما نبہ علیہ الشارح نفسہ واحتج بقولہ تعالیٰ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان

باب ۱۴ چہاردہم

حدیث

رفع العلم بقبض العلما

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ علم کو اسطرح نہ سمیٹیں گے کہ اس کو بندوں کے دلوں سے چھین لیں گے بلکہ علماء کو وفات دیکر علم کو دنیا سے چھین لیں گے یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہیگا لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے ان سے احکام شرعیہ کے متعلق سوال کیا جائیگا تو وہ بغیر علم ہی کے فتویٰ دیں گے پس خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

شرح حدیث سے ظاہر ہورہا ہے کہ علم آہستہ آہستہ کم ہوگا ایک دم سے زائل نہ ہوگا اس کے متعلق چند وجوہ بیان کے قابل ہیں۔

(۱۱۱) علم شریعت کے سوا کسی علم کو ہدایت نہیں کہا جاسکتا یہاں دو احتمال ہیں کہ علم سے مراد عام ہو یا خاص، مگر قرینۂ مقام سے ظاہر ہے کہ خاص علم یعنی علم شرعی مراد ہے کیونکہ حضور نے فرمایا ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے اور ظاہر ہے کہ علوم شرعیہ ہی سے ہدایت ہوتی ہے اُن سے سوا کسی علم کو اطلاق کے ساتھ ہدایت نہیں کیا جا سکتا بلکہ قید لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مقام پر علم سے مراد کتاب اللہ اور حدیث نبوی کی فہم ہے

علم درحقیقت نورِ قلب کا نام ہے اور جبتک قرآن دنیا میں موجود ہے نورِ قلب بھی کسی نہ کسی میں ضرور باقی رہیگا

یہاں ایک سوال واقع ہوتا ہے کہ یہ حدیث ظاہر میں اس حدیث کے معارض ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کیمتعلق مروی ہے کہ قرآن دفعتہً اٹھالیا جائیگا عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کیا ہم نے اس کو اپنے سینوں میں محفوظ اور مصاحف میں قلم بند نہیں کر لیا اور اپنے بیٹوں اور عورتوں کو نہیں سکھلایا؟ (پھر اس حالت میں دفعتہً کیسے اٹھالیا جائیگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک رات ایسی آئیگی جس میں قرآن سینوں اور مصاحف میں سے اٹھالیا جائیگا نہ سینوں میں کچھ باقی رہیگا نہ مصاحف میں (یعنی قلوب سے اور کاغذ میں سے قرآن کے حروف غائب ہو جائیں گے) پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا • اور اگر ہم چاہیں تو اس قرآن کو چھین لیں جو آپ کیطرف ہم نے وحی کیا ہے پھر ~~تمہارے لئے اس بارے میں قرآن کے واپس لانے کے لئے تم کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ گے~~ ...

جواب یہ ہے کہ دونوں میں کچھ تعارض نہیں کیونکہ ہم نے علماء کے حوالہ سے اوپر بیان کیا ہے کہ علم اس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ قلوب میں پیدا کرتے ہیں اسی نور سے کتاب اللہ اور حدیث نبوی کی فہم حاصل ہوتی ہے اس حقیقت سے کتاب اور حدیث ناطق ہے اور دونوں نے اس مضمون کو بیان کیا ہے چنانچہ کتاب اللہ میں ارشاد ہے ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم • اگر یہ لوگ معاملہ کو رسول اللہ اور اولی الامر کیطرف واپس کرتے تو ان میں جو لوگ حقیقت تک پہنچنے والے ہیں وہ اس کو سمجھ جاتے،، اور قرآن کے معانی اور اس کے احکام نور ہی کے ذریعہ تو سمجھے جاتے ہیں (ورنہ فہم زبان میں تو سب اہل زبان مساوی تھے) اگر یہ نور مفقود ہو جائے تو گمراہی پھیل جائیگی اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے بچائے " اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم ایسے زمانہ میں ہو جس میں فقہا یعنی قرآن کے سمجھنے والے زیادہ ہیں قراء تھوڑے ہیں اس زمانہ میں قرآن کے حدود و احکام کی حفاظت کی جاتی ہے حروف کا زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا، پھر فرمایا اور عنقریب لوگوں پر ایک

زمانہ ایسا آئیگا جس میں فقہا یعنی قرآن کے سمجھنے والے تھوڑے ہوں گے قراء زیادہ ہوں گے اس زمانہ میں قرآن کے حروف کی تو حفاظت کی جائیگی اور اس کے حدود و احکام کو ضائع کر دیا جائے گا تو دیکھو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پہلے لوگوں کو سمجھدار فرمایا اور دوسروں کو ناسمجھ بتلایا حالانکہ یہ دوسرے حروف کے ضبط و حفظ میں اُن سے بڑھے ہوئے ہیں مگر آپ نے اس بات کو ان کی مذمت میں بیان فرمایا ہے کیونکہ وہ احکام کو نہیں سمجھتے تو اب بتلاؤ وہ کیا چیز ہے جو اُن کے پاس تھی اور ان کے پاس نہیں؟) اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک نور تھا جو اُن کے پاس تھا اور ان کے پاس نہیں رہا پس یہ کین ویسے ہی ناقل و حامل رہ گئے جیسے پہلی امتوں کے بعض لوگوں کا حال اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے کمثل الحمار یحمل اسفارا کہ وہ گدھوں کی طرح ہیں جن پر کتابیں لدی ہوئی ہیں' افسوس یہ حالت اس وقت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے، کیونکہ آجکل کتابیں بھی زیادہ ہیں اور کتابوں کے ناقل بھی بہت ہیں، مگر ایسا شخص شاذ و نادر ہی ملیگا جس کے پاس اس علم کا کچھ حصہ ہو جس کا نام نور ہے، پس یہ علم وہ ہے جو آہستہ آہستہ سمیٹا جائے گا یہ روز بروز تھوڑا تھوڑا اٹھا جائیگا یہاں تک کہ ایک دن مصحف ہی اٹھا لیا جائیگا اور جب مصحف اٹھ جائیگا تو نور کا وہ حصہ بھی دنیا سے اُٹھ جائیگا جو کم ہونے ہوتے) ان کے پاس باقی رہ گیا تھا اس کے بعد مخلوق گمراہی میں بھٹکتی اور راہ حق سے بھٹکتی رہے گی حالانکہ احکام ان کے پاس کتابوں میں لکھے ہوئے ہوں گے (کیونکہ مصحف کے اٹھنے سے تمام کتابوں کا اٹھ جانا لازم نہیں مگر نور کے فقدان اور اصل کے جاتے رہنے سے وہ ان احکام کو سمجھ ہی نہ سکیں گے پس اصل کے باقی رہنے تک اس بات کی بشارت ہے کہ نور بھی دنیا میں باقی رہیگا گو تھوڑا ہی ہو۔

الوجہ الثانی الالف واللام فی ھذا العلم المذکور یحتمل والوجہ الثالث لقائل ان یقول ظاھر الحدیث معارض لما روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الکتاب العزیز الی قولہ ففی بقاء الاصل بشارۃ ببقاء ذلک النور وان قل "

ف اصل سے مراد قرآن ہے پس جب تک قرآن دنیا میں موجود ہے" علم حقیقی یعنی نور بھی دنیا میں باقی رہیگا۔ اس نور کو کبھی روحانیت سے اور اس کے مقابل کو مادیت سے تعبیر

کیاجاتا ہے، آجکل تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ قلوب میں وہ روحانیت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی بلکہ مادیت غالب ہو رہی ہے مگر کسی کو اصل حقیقت کی طرف التفات نہیں ہوتا کہ روحانیت کا سرچشمہ کہاں ہے؟ سو معلوم کرلینا چاہیئے کہ روحانیت اور نور کا سرچشمہ قرآن ہے مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ ہونا اور اسکے احکام و حدود کا پابند ہونا چاہیئے جس قدر اس سے غفلت کی جائیگی اسی قدر روحانیت میں کمی اور مادیت کا غلبہ ہوگا عوام کی کیا شکایت کی جائے افسوس تو یہ ہے کہ آجکل خواص کو بھی قرآن کیطرف توجہ کم ہے ایک زمانہ میں تو قرآن کے سمجھنے والے زیادہ تھے اس وقت بھی مسلمانوں کی حالت اسوقت سے بہتر تھی اب تیسرا زمانہ ہے کہ قرآن کے سمجھنے والے بھی کم ہیں اور پڑھنے والے بھی کم، اس کے بعد کس چیز کا انتظار ہے؟ کیا ہم لوگ اپنی اس بے توجہی اور غفلت سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کی ضرورت نہیں رہی اس کو اٹھالیا جائے؟ اللہ اللہ! اس وقت کے تصور سے بھی کلیجہ نکلا جاتا ہے اور جان لبوں پر آجاتی ہے، مسلمانو! اللہ کی کتاب سے غفلت اور بے توجہی کا اظہار نہ کرو بخدا اگر یہ قرآن اٹھالیا گیا تو دنیا میں مسلمانوں کی کچھ بھی ہستی اور قیمت نہ رہے گی، سنبھلو سنبھلو اور اللہ کی کتاب کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

(۱۱۲) ایک عالم بزرگ کی وفات کے بعد دوسرا جوان کا قائم مقام ہوتا ہے وہ ہر طرح سے پہلے جیسا نہیں ہوتا نہ اس کمی کو پورا کرتا ہے جو پہلے کے فقدان سے ہوئی

اگر ایک عالم کی وفات ہو جائے اور اسکی جگہ دوسرا لیلے تو کیا وہ پہلے کی مثل ہوگا؟ اور اس کمی کو پورا کردیگا جو پہلے کی وفات سے عالم اسلام میں آگئی تھی یا نہیں؟ اس حدیث کے ظاہر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہیں نہ یہ اس کے مثل ہوگا نہ کمی کو پورا کریگا، مگر بظاہر اسکے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے اذا مات العالم ثلمت فی الاسلام ثلمۃ لا یسدھا الا عالم آخر جب عالم مرتا ہے تو اسلام میں ایک رخنہ پیدا ہو جاتا ہے جس کو کوئی دوسرا عالم ہی بند کرسکتا ہے، مگر درحقیقت دونوں میں کچھ تعارض نہیں، کیونکہ پہلے کے مرنے کے بعد جب

دوسرا اس کا قائم مقام بن کر رخنہ کو بند کردیگا تو بداہتہً معلوم ہے کہ وہ ہر حیثیت سے پہلے کی برابر نہ ہوگا کیونکہ پیوند لگا کپڑا سالم کپڑے کے برابر نہیں ہوسکتا اگرچہ ستر بدن دونوں سے حاصل ہوجاتا ہے اور گو پیوند لگانیوالے میں کچھ نقصان اور کمی بھی نہ ہو اس نے کتنی ہی ہشیاری سے رفو کیا ہو مگر پھر بھی پہچاننے والے فرق کو محسوس کر لیتے ہیں، یہ ایسی بات ہے جس کا حسا مشاہدہ کیا جاتا ہے، خصوصاً جب ہم یہ کہیں کہ علم ایک نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ قلوب میں پیدا فرماتے ہیں جیسا آئمہ دین کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا ہے تو اس کا نقص تو بداہتہً مشاہد ہے، کیونکہ حضرات صحابہ کا نور تابعین کے نور جیسا نہ تھا بلکہ ان سے کامل و اکمل تھا اور تابعین کا نور تبع تابعین کے نور جیسا نہ تھا اسی طرح قرناً بعد قرن دیکھتے چلے جاؤ تم کو نظر آئیگا کہ ہر زمانہ میں کوئی چیز اٹھتی اور کم ہوتی رہی ہے اور اسی حقیقت کی وجہ سے پہلے علم لوگوں کے سینوں میں تھا پھر اوراق و کتب میں منتقل ہوا مگر اسکی کنجیاں لوگوں کے سینوں میں رہیں، پھر کتابیں اور دفتر تو بہت ہوگئے کنجیاں کم ہوگئیں اور اگر کوئی کنجی ملتی بھی تو سیدھی شاذ و نادر ہی ہوتی پھر یہ حال ہوگیا کہ علوم شرعیہ قرآن و حدیث تو سوار کے پیالہ کیطرح (پس پشت) ہوگئے اور تھوڑی سی توجہ بعض علوم فرعیہ میں رہ گئی (یعنی کتب فقہ اور فتاوی میں وہ بھی اسلئے کہ مفتی یا قاضی کا عہدہ مل جائیگا) اور زیادہ توجہ علم مناظرہ، منطق، علم نجوم اور علم سائنس وغیرہ وغیرہ کی طرف منعطف ہوگئی اسوقت لوگوں نے ممنوع کا ارتکاب اختیار کیا اور ان کی رسم بدایسی پڑ کر ٹھہر گئی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا تجعلونی کقدح الراکب مجھے سوار کے پیالہ کیطرح پس پشت نہ کردینا (سوار اپنے پیالہ اور لوٹے وغیرہ کو پیچھے ہی لٹکایا کرتا ہے) تو ان لوگوں نے باوجود ممانعت کے ایسا ہی کرکے دکھایا کہ قرآن وحدیث کو پس پشت ڈال دیا اور دوسرے علوم کے پیچھے پڑ گئے پھر یہ لوگ ان بیہودہ علوم کو حاصل کرکے ذین الٰہی میں گفتگو کرنے اور علماء اسلام پر اعتراض کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں (ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم) پس دنیا میں اگر کوئی رونے والا ہے تو وہ علم اور اہل علم کی موت کا اور دین کے زوال و ضعف کا نوحہ کرے فانا للہ وانا الیہ راجعون

غرض جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت الٰہی کی طرف انتقال کیا ہے اسی وقت سے علم میں نقص شروع ہو گیا ہے اور اسیطرح کمی ہوتی رہے گی یہاں تک کہ قرآن اٹھا لیا جائیگا بعض حضرات صحابہ نے اس امر کی تصریح بھی فرمادی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر کے ہم نے ہاتھ بھی نہ جھاڑے تھے کہ اپنے دلوں کو متغیر پایا اور ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اپنے دلوں میں نقصان محسوس کیا مگر اس نقص کو اس وقت اہل قلوب کے سوا کوئی نہ پہچانتا تھا یہی حال اس صدی کے بعد دوسری صدی میں رہا اسیطرح تیسری صدی میں بھی جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی ہے کہ یہ خیرالقرون ہیں تو اس خیرالقرون میں علم اندر اندر گھٹ رہا تھا مگر ظاہر میں بڑھ رہا تھا کیونکہ علماء کی کثرت تھی کتابوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور اس حقیقت کو جسکی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اہل قلوب کے سوا کوئی نہ پہچانتا تھا (عام لوگ مسرور تھے کہ کثرت کتب کثرت علماء اور کثرت مدارس مسلمانوں کی علمی اور تمدنی ترقی کا پتہ دے رہی ہے مگر اہل دل دیکھ رہے تھے کہ علم دل سے زبان پر اور زبان سے کاغذ پر آرہا ہے دیکھنے میں سب کچھ ہے مگر دل ویسے نہیں جیسے پہلے تھے) اسی لئے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ (اپنے زمانہ کے علمائے سے) فرماتے تھے کہ میں ایک دن میں تمہاری زبان سے بار بار ایسی بہت باتیں سن لیتا ہوں جن کی تم کو پروا بھی نہیں ہوتی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم ان کو موبقات (مہلکات یعنی تباہ کن) خیال کرتے تھے یا اس کے قریب قریب کچھ اور فرمایا پھر تیسری صدی کے بعد تو اس نقص کو عام طور پر سب ہی نے محسوس کر لیا اور اب تو ایسا ظاہر و روشن ہو گیا جیسا دوپہر کو آفتاب جس کے آس پاس بادل بھی نہ ہو

ف حضرت شارح کے زمانہ میں جو لوگ بیہودہ علوم حاصل کرنے کے بعد دین الٰہی میں کلام کرنے کی جرأت کرتے تھے کیونکہ اس وقت علم مناظرہ، منطق، سائنس، نجوم، طب وغیرہ تمام علوم کا خزانہ عربی زبان ہی میں تھا، ان علوم کی تحصیل کرنیوالوں کو اگرچہ قرآن وحدیث کی فہم و معرفت حاصل نہ ہوتی تھی مگر عربی زبان پر حاوی ہو جانے کی وجہ سے کسی قدر قرب اور مناسبت حاصل ہو جاتا تھا جب اس پر ان کو دین الٰہی میں گفتگو کرنے کا حق نہ تھا کیونکہ وہ قرآن وحدیث کو پس پشت ڈالے ہوئے تھے باقاعدہ ان کو حاصل نہ کرتے تھے تو انصاف سے کہو جن لوگوں

نے سائنس و جغرافیہ وغیرہ علوم کو دنیا کو انگریزی میں پڑھا ہو عربی زبان پہ حاوی ہونا تو کیا ادنی مناسبت بھی پیدا نہ کی ہو۔ ان کو دخل در معقول کا کیا حق ہے؟ مگر ہندوستان میں تم دیکھو گے کہ بہت سے ملحد بے دین محض اس وجہ سے کہ کسی انگریزی کالج نے ان کو بی اے یا ایم اے کی ڈگری دیدی ہے یا کسی طرح سے گورنمنٹ کیطرف سے شمس العلماء کا ان کو خطاب مل گیا ہے یا اخبار کے ایڈیٹر بن گئے ہیں دین میں اجتہاد کے مدعی اور علماء اسلام پر اعتراض کرنے میں پیش پیش ہیں وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون

(۱۱۳) متاخرین کا علم متقدمین کے برابر نہیں ہو سکتا

اس مقام پر یہ سوال بھی وارد ہوتا ہے کہ یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہے جو پہلے گذر چکی کہ یہ امت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی مخالف اس کو ضرر نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ علم سمیٹ لیا جائیگا اور جب علم جاتا رہا تو اس کی جگہ جہل رہیگا جس کا لازمی نتیجہ گمراہی ہے جیسا خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ہی سے واضح ہے، جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں بھی کوئی تعارض نہیں کیونکہ حدیث سابق کا مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت اس امت میں ایسی ضرور رہے گی جو اس حق واجب کو ادا کرتی رہیگی جو شرعاً اس پر لازم ہوگا اس میں کوتاہی نہ کرے گی مگر ادائے حق واجب سے یہ لازم نہیں کہ اس جماعت کا علم سلف کے برابر ہو کیونکہ علم جس نور کا نام ہے وہ ان کے پاس ویسا نہ ہوگا جیسا ان سے پہلے بزرگوں میں تھا، اس مضمون کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا "تم ایسے زمانہ میں ہو جس میں کوئی مامور بہ یعنی حکم شرعی کا دسواں حصہ بھی چھوڑیگا تو ہلاک و برباد ہو جائیگا اور ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں کوئی مامور بہ کا دسواں حصہ بھی ادا کردے گا تو نجات پالیگا"، اور یہ دسواں مستحبات کا مراد ہے فرائض و واجبات کا نہیں کیونکہ فرض تو اول و آخر ہر زمانہ میں یکساں مطلوب ہے پس یہاں مامور بہ سے مراد وہ نیک اعمال ہیں جو فرض و واجب کے علاوہ ہیں کیونکہ دین تو سارا ہی مطلوب ہے فرض بھی، مستحب بھی، آداب بھی اور نفل بھی رہیں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ مستحبات

کو ماموربہ کیسے کہہ دیا گیا ؟) اور سلف اوّل یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ان تمام چیزوں کو پوری طرح بجالانے کی پوری کوشش کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن سے ایسا ہی چاہتے اور اسی کی ان کو ترغیب دیتے تھے کہ فرض کو تمام آدابِ مستحبات و سنن کے ساتھ کامل مکمل ادا کریں۔ چنانچہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار یہ ارادہ کیا کہ جو لوگ نماز کی جماعت میں حاضر نہیں ہوتے ان کے گھر پھونک دیں حالانکہ ہر شخص کے لئے جماعت میں حاضر ہونا مستحب ہے؏ (فرض واجب نہیں) اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ وہ نماز میں صفوں کو سیدھا کرنے کا بہت اہتمام کرتے اور لوگوں کو اسکی تاکید کرتے تھے حالانکہ نماز میں صف کا سیدھا کرنا مستحب ہے، غرض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ان باتوں کی دوسروں کی بھی تاکید کے ساتھ ترغیب دیتے اور خود بھی بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے تاکہ ان میں سے کسی بات میں کمی اور کوتاہی نہ ہو اور جو حدان کے واسطے مقرر کی گئی ہے اس کے تارک نہ قرار پائیں باقی آج کل تو ایسا متصور نہیں کیونکہ اعمال میں بدعات و منکرات بکثرت شامل ہوگئے ہیں جن میں سے دسواں حصہ بھی بڑی کوشش کے بعد خالص نکل سکتا ہے اور خالص ہونے کا یہ مطلب ہے کہ عمل اسی صورت پر واقع ہو جس صورت سے شریعت نے مقرر اور طلب کیا تھا کہ اس میں کسی بدعت اور منکر کا شمول نہ ہو، (اب تم خود سمجھ لو کہ ایسا عمل آجکل کیونکر ہو سکتا ہے) مثال کے طور پر جنازہ کے ساتھ ہونا، جنازہ کی نماز پڑھنا یا کسی شادی میں شریک ہونا یا اس کے مشابہ کوئی کام لیلو تو ہر شخص کو بہت کم شریعت کیموافق عمل کرنے پر قادر پاؤگے کیونکہ ان میں بیہودہ بدعتیں اور تباہ کن منکرات بہت کچھ شامل

؏ یہ استدلال شوافع اور مالکیہ کے مذہب پر تام ہے حنفیہ کے مذہب پر تام نہیں کیونکہ حنفیہ کے نزدیک جماعت سے نماز پڑھنا ہر شخص پر جسے کوئی عذر شرعی نہ ہو واجب ہے، مگر اصل مقصود کو اسی دلیل کے تام نہ ہونے سے کچھ ضرر نہیں کیونکہ بعض متفق علیہ مستحب کے ترک پر بھی حضور کا عتاب ثابت ہے ۱۲ ظ

ہو گئے ہیں جن سے شاذ و نادر ہی کوئی بچ سکتا ہے پس ان لوگوں کا دس میں سے نو حصوں کو چھوڑنا اس وجہ سے نہیں کہ ان کو نو حصوں سے اعراض ہے یا ان میں رغبت نہیں اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ ناجی نہ ہوتے بلکہ اس کا سبب وہ ہے جو ہم نے ابھی بتلایا ہے کہ بدعات و منکرات کا شمول اعمال میں اس درجہ ہو جائے گا کہ اعمال کا ان سے خالص طریقہ پر ادا ہونا دشوار ہو گا) پس جس جماعت کی نسبت حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ وہ حق پر رہیگی اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے حق واجب میں کمی نہ کریگی اور اگر ان کو واجب ہی ناقص ملا ہو تو اسمیں ان کا کیا قصور ؟

الوجه السادس لقائل ان يقول هٰذا الحديث معارض لقوله عليه السلام لن تزال هٰذه الامة الى قوله انها لا تنقص مما يلزمها شيئاً "

ف حدیث کی شرح میں علامہ امام نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دسواں حصہ کمیات کے اعتبار سے مراد نہیں بلکہ کیفیات کے اعتبار سے مراد ہے، یہ مطلب نہیں کہ اخیر زمانہ میں فرائض و واجبات کی مقدار یا عدد پہلے سے کم ہو جائیگا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس کیفیت کا ملہ اور درجہ عالیہ پر فرائض کے ادا کرنے کا بندہ سے شریعت نے مطالبہ کیا ہے اس کیفیت کا دسواں حصہ بھی اخیر زمانہ میں ادا ہو جائے تو نجات کے لئے کافی ہو گا کیونکہ اخیر زمانہ میں قلوب میں نور بھی کم ہو گا مشاغل دنیا سے بیفکری بھی کم ہو گی پریشانی اور فتنہ کی کثرت بھی ہو گی ایسی حالت میں ہر عمل کو اعلیٰ کیفیات پر ادا کرنا دشوار ہو گا وہ اگر دسواں حصہ بھی بجا لائیں تو قبول عمل کے لئے کافی ہو گا ۔

(۱۱۴) اللہ تک پہنچنے کا راستہ ہر شخص کے لئے جدا ہے

حدیث سے اہل قول کے اس قول کی بھی تائید ہو گئی عدد الطرق الى الله عز وجل على عدد الانفاس کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستوں کی شمار مخلوق کے سانسوں کی شمار کے موافق ہے (یعنی ہر شخص کے لئے وصول کا راستہ جدا ہے) کیونکہ ہر شخص کی حالت ہر جہت سے دوسرے کی حالت جیسی نہیں ہوتی اگرچہ دونوں کی حالتوں میں بظاہر کچھ مشابہت ہو پھر بھی کچھ نہ کچھ فرق ضرور

ہوگا چنانچہ حسًا یہ امر مشاہد ہے کہ دو بھائی بھی ہر جہت سے متوافق الحال نہیں ہوتے پس آدمیوں کی شکل وصورت و پیدائش اور وضع میں یکساں ہے مگر حقیقی مشابہت اور موافقت میں یکسانیت نہیں بلکہ باہم تفاوت ہے کیونکہ ہر شخص کسی خاص صفت کیساتھ موصوف ہونے میں دوسروں سے ممتاز ضرور ہوتا ہے اگرچہ اکثر صفات میں ان کے موافق ہی ہو اور ایک انسان ہی کیا تمام حیوانات کا یہی حال ہے کہ ہر نوع کے افراد وضع خلقت میں تو یکساں ہوتے ہیں مگر حقیقی مشابہت وموافقت میں یکساں نہیں ہوتے، پاک ہے وہ جس نے اپنی عظیم الشان قدرت کے آثار عجیبہ غریب حکمت کیساتھ تمام مخلوقات میں ظاہر فرمائے ہیں اور اس حقیقت ہی کی وجہ سے جس پر ہم نے اشارہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس مضمون میں تامل اور غور کرنے کا حوالہ دیا ہے کہ اس سے اللہ کی وحدانیت پر استدلال کرنا چاہیئے، چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے

سنریھم ایاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق

"ہم ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں گے آفاق عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن حق ہے"

قولہ فی الوجہ السابع بعد بیان الحکمۃ فی نقص العلم ولذلک قال اھل التحقیق عدد الطریق الی اللہ الی قولہ حتی تیبین لھم انہ الحق "

ف حدیث سے اس مضمون کی تائید اسطرح ہوئی کہ حضور نے صحابہ سے فرمایا کہ تم ایسے زمانہ میں ہو جس میں مامور بہ کا دسواں حصہ چھوڑنا باعث ہلاکت ہے اور ایک زمانہ آئیگا جسمیں دسواں حصہ لیجانا موجب نجات ہوگا اس سے صاف ظاہر ہے کہ سب کے لئے وصول کا ایک طریقہ نہیں ورنہ ہر زمانہ میں وہی حکم ہوتا ہے جو صحابہ کے لئے تھا حالانکہ ایسا نہیں ہے "۔

ف شیخ محقق وہی ہے جو ہر شخص کو اس راستہ سے لیجائے جو اسکے لئے مناسب ہے، یہ نہیں کہ سب کو ایک ہی وظیفہ بتلایا کرے اور ایک ہی سبق پڑھایا کرے۔

(۱۱۵) جبتک دنیا میں ایک بھی صاحب حق رہیگا خطرناک گمراہی سے امن رہیگا

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک جماعت مذکو زمین سے جو ہر زمانہ میں حق پر رہیگی، ایک شخص بھی زندہ رہیگا اس وقت تک خطرناک گمراہی کا وقوع نہ ہوگا، کیونکہ اس جماعت کی شان یہ ہے کہ وہ علم سے متمسک اور عمل سے متصف ہوگی تو جب تک ایک عالم بھی حق پر رہیگا گمراہی سے ضرر نہ پہنچیگا گو اس کا کتنا ہی غلبہ ہو کیونکہ اس ایک عالم کی وجہ سے جو حق پر قائم ہے، گمراہی پر امت کا اتفاق نہ ہو سکے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

لن تجتمع امتی علی ضلالۃ

"میری امت گمراہی پر ہرگز اتفاق نہ کر سکے گی"

اور گمراہی کے غلبہ میں اور گمراہی پر اجتماع میں بڑا فرق ہے، کیونکہ اجتماع علی الضلال تو جڑ کاٹنے والی چیز ہے، اللہ اپنے فضل سے ہم کو اس سے بچائے رکھے، اس مضمون کی توضیح و تفصیل اس روایت سے ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کسی بستی پر گذرا جسے اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا تھا اس نے عرض کیا اے رب! آپ نے ان لوگوں کو کیونکر ہلاک کر دیا حالانکہ ان میں ایک نیک آدمی بھی تھا جس کو میں پہچانتا تھا اور آپ کا قانون ہے کہ جب تک بستی میں ایک بھی اللہ والا ہوگا بستی ہلاک نہ ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسکی طرف وحی بھیجی (اگر وہ پیغمبر تھے یا الہام کیا اگر ولی تھے) کہ اس نے میرے واسطے کبھی ایک دن بھی غیرت ایمان کا اظہار نہ کیا تھا اس لئے وہ ظاہر ہی میں نیک تھا واقع میں نیک نہ تھا کیونکہ جو شخص واقعی نیک ہوتا ہے وہ اللہ کی نافرمانیوں کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا بلکہ یا امر بالمعروف کرتا ہے اور اسکی قدرت نہیں ہوتی تو بستی کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کی بھی قدرت نہیں ہوتی تو اہل باطل کی موافقت اور مخالطت تو وہ ہرگز نہیں کر سکتا بلکہ اہل باطل سے اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کر کے الگ ہو جاتا ہے ۱۲

پس حدیث نے بتلا دیا کہ اس شخص کا اہل باطل کے ساتھ موافقت کرنا بستی کی

ہلاکت کا سبب ہوا، اگرچہ وہ حق سے واقف تھا، اور اگر وہ ان کی مخالفت کرتا تو نہ خود ہلاک ہوتا نہ دوسرے ہلاک ہوتے۔

قولہ الوجہ الثامن قولہ علیہ السلام حتی اذا لم یبق عالم اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا فیہ دلیل علی ان الضلال المخوف لا یقع مہما بقی من الطائفۃ المذکورۃ واحد الی قولہ ولو خالفہم ما ہلک وما ہلکوا۔

ف پس علم و عمل کا اہتمام کرو اور اظہار حق سے اہل باطل کے سامنے باز نہ رہو باطل کی موافقت کبھی نہ کرو مگر تکبر سے بچو تواضع اور خلوص سے کام کرو ۱۲

(۱۱۶) دنیا میں راحت سے زیادہ مصیبت ہے، اس مضمون میں حکمت اور عبرت کا بھی ایک پہلو ہے

وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس دنیا کو تغیر و فنا کے واسطے بنایا ہے تو مقتضائے حکمت کی وجہ سے ہر چیز کو اسی نسبت سے محل زوال و نقص پذیر بنا دیا، چنانچہ دنیا میں علم اور ایمان ہی سب چیزوں سے زیادہ قیمتی ہیں مگر ان کو بھی نقص لاحق ہوتا ہے یہاں تک کہ ایک دن بالکل ہی زائل ہو جائیں گے، غرض اس دار کی علت اس کے باشندوں کو بھی لگی اور اسکی ہر چیز کو لگ رہی ہے۔

اس مضمون میں دنیا سے بے رغبتی اور اس سے قطع تعلق کی بھی ترغیب ہے کہ جب دنیا و ما فیہا نقصان اور زوال ہی کے لئے ہے تو اسکی کس چیز میں رغبت کی جائے اور کس چیز کے واسطے تعب برداشت کیا جائے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دار فانی کی مصیبت یہاں کی خیر اور راحت سے زیادہ ہے کیونکہ جب علم اور ایمان ہی میں کمی آنے لگی اور یہی دو چیزیں خیر و برکت کا سرچشمہ ہیں تو ان کی ضد یعنی کفر و جہل کا غلبہ ہوگا اور یہی تمام شر و رکا سبب بلکہ سچ یہ ہے کہ یہی دونوں عین شر ہیں، یہاں سے ایک علمی مسئلہ مستنبط ہوا کہ عاقل کو دنیا و ما فیہا کی طرف توجہ اور التفات سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے کیونکہ جب اسکی خیر کم ہوتی جاتی ہے اور شر بڑھتی جاتی ہے تو خیر کا

وجود نادر ہوگا اور شر کا وجود بہت ہوگا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر آخرت اپنے بقا کیساتھ کچی مٹی سے بنی ہوئی ہوتی اور دنیا اپنے فنا کے ساتھ چاندی سونے سے بنی ہوتی تو وہ رغبت کے قابل ہوتی اگرچہ ٹھیکرا تھی کیونکہ باقی رہنے والی ہے اور یہ بے رغبتی کی مستحق ہوتی اگرچہ چاندی تھی کیونکہ فنا ہونیوالی ہے اور جب معاملہ برعکس ہے کہ دنیا فنا کیساتھ ٹھیکرا بھی ہے اور آخرت بقا کے ساتھ چاندی سے بھی اعلیٰ ہے تو اب کیا ہونا چاہیئے؟ (اس کو خود ہی سوچ لو)

الوجہ التاسع والعاشر والحادی عشر والثانی عشر من قولہ فی ھذا المعنی وجہ من الحکمۃ والاعتبار الیٰ قولہ فکیف والامر بضد ذلک

ف حدیث سے یہ علوم اخذ کرنا صوفیہ کے ساتھ مخصوص ہے اور زہد عن الدنیا کا بھی جس قدر اہتمام ان کو ہے کسی جماعت کو نہیں بشرطیکہ صوفی صوفی ہو نقال محض نہ ہو ۱۲

(۱۷) سچی ریاست علم حقیقی سے حاصل ہوتی ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حقیقی ریاست علم ہی سے حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ علم حقیقی ہو یعنی اللہ کے لئے خالص اور کتاب و سنت کے موافق ہو اور جاہل کی ریاست حقیقی ریاست نہیں بلکہ اس مصرعہ کے مصداق ہے کہ ؎

ست ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ جب تک عالم لوگوں کے درمیان رہیگا اسکی وجہ سے خیر باقی رہے گی۔ اور جب اسکی جگہ جاہل لیلیگا تو گمراہی اور ہلاکت واقع ہوگی اور اس کا سبب ظاہر ہے کچھ مخفی بات نہیں کیونکہ تمام لوگ ہر وقت اور ہر حالت میں عالم کے محتاج ہیں تاکہ ان کو خدا کا راستہ بتلائے اللہ کے اوامر و نواہی ان کے سامنے بیان کرے تو جیسا خدا سے بندہ کو کسی وقت استغنا نہیں اسی طرح اس کے احکام بتانیوالوں سے بھی استغنا نہیں ہوسکتا ۱۲) بخلاف جاہل کے کہ اسکی طرف لوگوں کو ایسی احتیاج نہیں اسکی طرف بعض لوگوں کو کسی وقت اس کام کی بناء پر احتیاج ہوتی ہے جسکی وجہ سے وہ سردار بنا ہوا ہے اور بعضوں کو ذرا بھی احتیاج نہیں ہوتی اور اہل

احتیاج کو بھی، بعض اوقات اسکی حاجت نہیں ہوتی اور ایسے حالات اور ایسے ہی افراد زیادہ ہیں کیونکہ جاہل تو کسی دنیوی فوقیت کی وجہ سے سردار بنتا ہے تو اس کی طرف دنیا والوں یعنی مالداروں کو ہی احتیاج ہوگی اور مالدار خصوصاً مسلمان دنیا میں کم ہوتے ہیں غربار زیادہ ہیں تو زیادہ کو جاہل سے استغنا ہوگا اور عالم دین کیوجہ سے سردار بنتا ہے اور دین غریبوں میں زیادہ ہوتا ہے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہے پس غربار تو طلب دین کی وجہ سے سب کے سب عالم کے محتاج ہیں اور اہل دنیا بھی جب ان کے دل میں دین کی طلب پیدا ہوتی ہے اسکی طرف محتاج ہوتے ہیں پس عالم سے کوئی مستغنی نہ ہوا اور جاہل سے زیادہ لوگ مستغنی ہیں اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

نعم الرجل العالم ان احتیج الیہ نفع و ان استغنی عنہ اغنی نفسہ

وہ عالم بھی کیسا اچھا آدمی ہے کہ اگر اسکی طرف لوگ حاجت لیکر آئیں تو نفع پہنچائے اور اس سے مستغنی ہوں تو یہ بھی اپنے کو ان سے مستغنی کر دے۔

غنا سے مراد اللہ عزوجل کی ساتھ غنا ہے (یعنی اللہ پر نظر کر کے سب سے مستغنی اور بیفکر ہو جائے) یہی ہے اصلی اور حقیقی ریاست، مگر آج کل علم حقیقی حاصل کرنیوالے کہاں جو کسی کو حقیقی ریاست نصیب ہو الا نادراً والنادر کالمعدوم) اب تو اس بات کا ظہور ہونے لگا ہے جو رسول برحق صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ لوگ بدون علم کے سردار بن گئے پھر ان سے فتویٰ لیا جاتا ہے اور وہ بدون علم کے فتویٰ دیکر خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں تو اس بیچارہ مسکین کو غفلت سے بیدار اور مدہوشی سے ہوشیار ہو جانا اور اس سخت مصیبت سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیئے جو اس کے سر پر آگئی ہے۔

الوجہ الثالث عشر فیہ دلیل علی ان حقیقۃ الریاسۃ لا تکون الا بالعلم الی قولہ ولیحذر من ھذا الامر العظیم الذی حل بہ

ف ۔ یہ حقیقی ہیلست محض علم کتابی اور رسمی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ علم حقیقی سے حاصل ہوتی ہے اور علم حقیقی ایک نور کا نام ہے جو دل میں اللہ تعالیٰ کیطرف سے ڈالا جاتا ہے اور وہ عادتاً بدون صحبت اہل اللہ کے حاصل نہیں ہوتا پس اس سے طریق صوفیہ کی تائید ظاہر ہے

(۱۱۸) **معیار شرعی کیخلاف جو حالت ہوگی کبھی نافع نہ ہوگی** حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کو بدون سردار کے چارہ نہیں حکمت اسی کو مقتضی ہے چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے کہ دنیا سے عالم کے ناپید ہونے پر لوگ اپنے کو ویسا ہی بے سرا نہ دکھیں گے بلکہ جماعت اہل علم کے علاوہ دوسری جماعتوں میں سے جو ظاہر میں ان کے مشابہ ہونگی کسی کو سردار بنالیں گے اور گمراہی میں مبتلا ہوں گے کیونکہ ؎

اذا کان الغراب دلیل قوم — سیھدیھم طریق الھالکینا
گر بہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند — این چنین ارکان دولت ملک را ویران کنند

جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دیدی ہے ؛

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی چیز کو قانون شریعت اور معیار شرعی کے خلاف حاصل کرنا مفید نہیں ہوتا بلکہ اس سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے، کیونکہ عوام نے ان جاہلوں کو اسی فائدہ ارشاد و ہدایت کے لئے اپنا امام اور سردار بنایئں گے جو ان علماء سے حاصل ہوتا تھا جن کی صورت اور نقل انہوں نے اتاری ہے مگر چونکہ ان میں وہ شرطیں موجود نہ تھیں جن کو شریعت نے پختگی کے ساتھ بیان کیا ہے تو اب بجائے مقصود کے اسکی ضد کا ظہور ہوا یعنی گمراہی کا۔

الوجہ الرابع عشر و الخامس عشر من قولہ فیہ دلیل علی انہ لا بد للناس من رؤس الی قولہ جاء ھم اذ ذالک ضد ما ارادوہ وھو الضلال

(۱۱۹) **علم پڑھ کر نہیں چل سکتا** حدیث سے ان لوگوں کے قول کی بھی تائید ہو رہی ہے جو یوں

کہتے ہیں کہ عالم کے ذمہ قبل سوال و طلب کے تعلیم واجب نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فسئلوا فافتوا کہ ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فتویٰ دیا تو فتویٰ اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ سوال واقع نہیں ہوا۔

نیز حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دہوکہ عالم پر نہیں چل سکتا اور جاہلوں ہی پر چلتا ہے کیونکہ عوام نے ان جاہلوں کو اسی واسطے سردار بنالیا کہ وہ کتابوں کے پڑھنے اور دیکھنے میں اہل علم کے مشابہ تھے جب لوگوں نے ان کے پاس وہ چیز دیکھی جو علامتاً علم حقیقی کی جو ایک نوع ہے علامت تھی انہوں نے ان کو بھی حقیقی سردار سمجھ لیا اور ان پر دہوکہ چل گیا اور علما کے اوپر اس قسم کی بناوٹ سے دہوکہ نہیں چل سکتا کیونکہ عالم تو باتوں ہی سے پہچان لیتا ہے کہ مخاطب واقعی عالم ہے یا محض شکل و صورت بنا کر نقال ہے (۱)

اسی واسطے یمن بن رزق رحمہ اللہ نے فرمایا ہے

لقلۃ العقلاء لم یعرف الحمقی

"عقلمندوں کی قلت کیوجہ سے بیوقوف نہیں پہچانے گئے"

اور یہ حقیقت اسوقت بہت نمایاں ہوگئی ہے چنانچہ بعض لوگ نحو، اصول، منطق، علم کلام، فلسفہ، طبیعت وغیرہ پڑھ کر سرداری کا دعویٰ کرنے لگے اور ان علوم کو حاصل کر کے ہی وہ اللہ کے دین میں فتویٰ دینا چاہتے ہیں، ان کی مسخ شدہ عقول میں یہ سودا اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ ان میں سے بعضے بزعم خود اجتہاد کے داعی ہیں اور پہلے بزرگوں اور اماموں کو خطا پر بتلاتے ہیں، جس کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں نے سلف کے کلام کو نہیں سمجھا اور ان سے بدگمانی رکھتے ہیں اگر ان کے ساتھ اچھا گمان ہوتا تو ان کی برکت سے وہ بات حاصل ہو جاتی جس سے ان کا کلام سمجھ لیتے پس اس بیہودہ جماعت اور دوزخی گروہ سے بہت بچو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت سے امت کو بہت ڈرایا ہے اور اس کی حالت کو بھی پوری طرح بیان فرما دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے

یأتی فی آخر الزمان اقوام یحدثونکم بما لم تعرفوا انتم ولا آباءکم

او کما قال علیہ السلام

"آخر زمانہ میں کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو تمہارے سامنے ایسی باتیں بیان کریں گے جن کو نہ تم نے کبھی دیکھا جانا تھا نہ تمہارے باپ دادوں نے یا جسطرح بھی حضورؐ نے فرمایا ہو (مضمون یہی ہے) پس جس بات کو تم جانتے ہو اسی پر رہو اور جو نئی بات معلوم ہو اسکو چھوڑ دو اور اپنی ذات خاص کا فکر کرو (دوسروں کی فکر میں نہ پڑو) کیونکہ آج کل نصیحت کے سننے والے کم ہیں تم کسی کو نصیحت کرو گے تو وہ تمکو ہی بدنام کرنے کے در پئے ہو جائیگا

الوجه السادس عشر والسابع عشر من قوله فيه دليل لمن يقول بان العلم لا يلزمه التعليم قبل السوال الى قوله وعليك بخواصة نفسك

ف علامہ ابن ابی جمرہ کے زمانہ میں تو لوگ نحو و اصول اور منطق و فلسفہ و علم کلام ہی پڑھ کر مدعی ریاست علم اور طالب منصب اجتہاد بنتے تھے مگر اس زمانہ کی حالت دیکھو کہ انگریزی کالجوں اور انگریزوں کے دفتروں اور بے دین ماسٹروں کی صحبت میں رہ کر بی اے ایم اے یا ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے یا کسی ماہواری رسالہ یا روزنامہ اخبار کی ایڈیٹری کر کے ہی ہر شخص پھولا نہیں سماتا اور جامۂ اجتہاد سے باہر ہوا جاتا ہے، ان کا جادو عوام پر اور زیادہ تر انگریزی طلبا اور انگریزی خواں طبقہ پر خوب چلتا ہے، کیونکہ ان کے پاس کھرے کھوٹے کے انتخاب کا کوئی معیار نہیں ہے یہ تو کتاب کی دیدہ زیبی اور چکنے کاغذ اور لچھے دار مزہ دار باتوں اور فقروں ہی سے مصنف کی قابلیت کا اندازہ کرتے ہیں، اگر یہ باتیں کسی کافر میں جمع ہو جائیں تو یہ لوگ اسکو بھی امام بنانے کو تیار ہو جائیں گے، آخر قادیانی کذاب کے ماننے والے کون ہیں؟ اور گاندھی کی تعریف کرنے والے مسلمان کہاں سے آئے تھے اور گاندھی کے بعد جواہر لال کو امام بنانے والے اسٹیشنوں پر اس کا استقبال کرنیوالے مسلمان تو اب بھی آپ کو منظر آتے ہوں گے، جب غلبۂ جہل کی یہ صورت ہے تو سوچو ان کے سامنے اگر دجال بھی آجائے تو اس کے ساتھ یہ کیا برتاؤ کرینگے؟ غالباً وہی جو قادیانی اور گاندھی اور جواہر لال کے ساتھ ہوا اور اس وقت ہو رہا ہے شاید کوئی کہے کہ ان کو علماء کیطرح سردار کس نے بنایا؟ مگر تم مسلمانوں کی حالت دیکھو گے تو خود کہو گے کہ علماء سے بھی زیادہ درجہ ان کو دیدیا گیا تھا اور دیا گیا ہے، سادہ لوح مسلمان ان

کو مسلمانوں کا سیاسی خیرخواہ اور خیرخواہی کے راستوں کو علماء سے زیادہ جاننے والا سمجھتے ہیں اور اس دھوکہ میں عوام کو اُن علماء نے ڈالا ہے جو ان ہندوؤں کی تعظیم بجالانے ان کو جلسوں کا صدر بناتے اور اسٹیشنوں پر ان کا استقبال کرتے اور ان کی تعریف میں قصیدہ خوانی کرتے اور یہی وہ علماء ہیں جو مسلمانوں کے سامنے ان باتوں کو دین بتلاتے ہیں جن کو آج تک مسلمانوں نے دین نہ سمجھا تھا کوئی سود کو حلال کرنا چاہتا ہے، کوئی میموں کو سر بازار نیم عریاں دیکھ کر مسلمانوں کی شریف عورتوں کو بھی پردہ سے نکالنا اور کلب گھر میں ساتھ لیجانا چاہتا ہے کوئی تصویر کشی کو جائز کہتا اور قرآن تک میں تصویریں ٹھونسنا چاہتا ہے، کوئی الیکشن میں کوشش کرنے اور ووٹروں کے پاس مارا مارا پھرنے کو دین میں داخل کرنا چاہتا ہے، کوئی کھدر پہننے کو واجب اور ولایتی کپڑوں کو حرام بتاتا ہے، مگر ولائتی عینک اور ولائتی دوا اور ولائتی موٹر جوتہ کو حرام نہیں کہتا اور نہ ولائتی ریل اور تار سے انتفاع کو حرام بتلاتا ہے، کوئی ہندو لیڈروں کے استقبال اور پیشوائی کو یہ کہہ کر دین کا کام بتلاتا ہے کہ انگریزوں کا دشمن کتا اور سور بھی ہوگا تو ہم اس کی عزت کریں گے، گو وہ خدا اور رسول کا بھی سخت دشمن کیوں نہ ہو؟ ہندوؤں کے جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کی ترغیب دیتے ہیں گو نیم عریاں عورتوں کی تقریریں بھی سننا پڑے اور ان سے نظر بچانا بھی دشوار ہو، مسلمان ان باتوں کو دیکھ کر خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ باتیں دین اور ثواب کدھر سے ہوگئیں جن کو آج تک وہ گناہ اور حرام سمجھے ہوئے تھے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

(۱۲۰) غلط فتوے پر عمل کرنیوالا بھی مفتی کی طرح گمراہ ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص غلط فتوے پر عمل کرتا ہے اس کو بھی ویسا ہی گناہ ہوتا ہے جیسا مفتی کو ہوتا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوام کو بھی اسی طرح گمراہ بتلایا ہے جسطرح ان کے مفتیوں کو گمراہ اور گمراہ کن بتلایا ہے دونوں اس باب میں برابر ہیں اسکی تائید اور وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ حضور نے اسکی ضد کی بابت ارشاد فرمایا ہے کہ عالم اور متعلم دونوں ثواب میں شریک ہیں۔

الوجہ التاسع عشر فیہ دلیل علی ان من عمل بفتوی علی غیر وجہھا یلحقہ من

۔الاثم الی قولہ العالم والمتعلم شریکان فی الاجر

ف یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پیر کے گمراہ ہونے سے مرید بھی گمراہ اور گناہگار ہوگا یہ جو مشہور ہے کہ پیر کی پیری سے کام اسکے عمل سے کیا کام یہ پیر جیوں کی گھڑت ہے جب مرید کو اپنے پیر کا گمراہ بدعتی اور بدعمل ہونا ثابت ہوجائے اسکے ذمہ لازم ہے کہ اسکی بیعت کو توڑ کر کسی محقق شیخ کو تلاش کرے۔

۱۲۱ جاہل کسی گمراہی میں مبتلا ہوجانے کیوقت اپنے جہل کیوجہ سے معذور نہ قرار دیا جائے گا

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جاہل کسی مذہب یا گناہ میں مبتلا ہوجانے کے وقت اپنے جہل کی وجہ سے معذور نہیں قرار دیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عوام کو بھی گمراہ بتلایا ہے جنہوں نے فتوے حاصل کرنے کے لئے اہل کو نہیں پایا بلکہ نا اہلوں سے فتویٰ لیکر کیا، جیسا ان فتویٰ دینے والوں کو گمراہ بتلایا جائے حالانکہ یہ عوام بیچارے معاملہ سے ناواقف اور جاہل تھے ان کو اتنا علم ہی نہ تھا جس سے صحیح اور غلط فتوے میں امتیاز کرسکتے پس اے پریشان پھرنے والے ہدایت کے راستہ کیطرف چلا آ پہلے اس سے کہ دروازہ بند ہوجائے اور تو محروم رہ جائے، الوجہ العشرون فیہ دلیل علی ان الجاھل لا یعذر بجھلہ الی قولہ قبل سبقہا الحرمان بغلق الباب

ف عوام کو غلط فتویٰ پر عمل کرنے سے گناہ اس وقت ہوگا جبکہ وہ دین کی باتیں دریافت کرنے کے واسطے عالم محقق کی تلاش میں کوتاہی کریں کہ جس سے جی چاہا فتویٰ لے لیا خواہ وہ عالم محقق ہو یا نہ ہو، رہا یہ کہ عوام کو کسی کا عالم محقق ہونا کیسے معلوم ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے طبیب کا حاذق ہونا اور وکیل کا لائق ہونا ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ جب کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے تو لوگوں سے دریافت کرتے اور مشورہ کرتے ہیں کہ علاج کس کا کرنا چاہیئے اور جب کوئی مقدمہ درپیش ہوتا ہے تو دوستوں سے مقدمہ بازوں سے مشورہ کرکے لائق سے لائق وکیل اور بیرسٹر تلاش کیا جاتا ہے اسیطرح اگر

مسلمانوں کو دین کا فکر اور تلاش ہو تو تحقیق اور دریافت حال سے عالم محقق ان کو ضرور دستیاب ہو جائیگا اور جب تک مسلمانوں کو دین کا فکر ہوگا علماء محققین کا وجود دنیا میں ضرور رہیگا اور جب دین سے عام طور پر بےفکری ہو جائیگی اس وقت علمائے محققین کا وجود دنیا میں نہ رہیگا جہلا ہی مفتی اور سردار ہوں گے اس وقت مفتیوں کو تو غلط فتوے دینے کا گناہ ہوگا اور عوام کو دین سے بےفکری کا جسکی بدولت جہلا کو مفتی بننے کا موقعہ ملا، پس سب کے سب گمراہی کے وبال میں مبتلا ہوں گے، خوب سمجھ لو، واللہ اعلم بالصواب، یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو علم دین کی تحصیل کو ضروری نہیں سمجھتے صرف دنیوی علوم ہی کے درپے اور اسی کی ضرورت پر زور دیتے ہیں یہ کھلی دلیل ہے دین سے بےفکری کی۔

باب پانزدہم

حدیث

الحساب والعرض

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہیں روایت ہے کہ جب وہ کوئی ایسی بات سنتیں جو ان کی سمجھ میں نہ آتی تو اس کو دوبارہ دریافت کرتیں یہاں تک کہ سمجھ میں آجائے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ جس سے حساب لیا جائیگا وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا (یا رسول اللہ) کیا اللہ تعالیٰ یوں نہیں فرماتے فسوف یحاسب حسابا یسیرا (کہ جسکو نامۂ اعمال ہاتھ میں دیا جائیگا اس سے حساب آسانی کیساتھ لیا جائیگا جس سے معلوم ہوا کہ بعضے ایسے بھی ہیں جن سے حساب لیا جائے گا مگر عذاب نہ ہوگا) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو صرف پیشی ہوگی (جسکو برائے نام حساب کہدیا گیا) لیکن جس سے نکتہ چینی کے ساتھ حساب لیا جائے گا (کہ عرفاً اسی کو محاسبہ کہتے ہیں) وہ ہلاک ہوجائے گا۔

شرح ظاہر حدیث بتلارہا ہے کہ ہلاکت مناقشہ کے ساتھ ہوگی اور اس کے متعلق چند باتیں بیان کرنے کی ہیں۔

۱۲۲ حساب کتاب کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ جس سے حساب لیا جائیگا وہ مبتلائے

عذاب ہوگا عام ہے یا خاص؟ ظاہر یہ ہے کہ خاص ہے کیونکہ بعد میں آپ نے اس کو منافقین کے ساتھ مخصوص فرمادیا ہے، اور مختلف احادیث کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حساب کی چند قسمیں ہیں جن میں سے ایک تو عرض ہے جیسا اسی حدیث میں مذکور ہے اور اسکی مفصل کیفیت دوسری حدیث میں اس طرح وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ سے مخفی طور پر حساب لیں گے اپنا دامن رحمت اس پر ڈال دیں گے اور فرمائیں گے میرے بندے! تو نے فلاں دن ایسا کیا، فلاں وقت ایسا کیا، بندہ کو اقرار کے سوا کچھ چارہ نہ ہوگا یہاں تک کہ وہ سمجھ لیگا کہ میں ہلاک ہوا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میرے بندے! میں نے تیرے گناہوں کو دنیا میں تو چھپایا اور آج بخشتا ہوں پھر ملائکہ کو حکم ہوگا کہ میرے بندے کو جنت میں لے جاؤ، اس کو دیکھ کر اہل حشر کہیں گے کہ یہ بندہ کیسا اچھا ہے جس نے کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی، یہ تفصیل ہے اس پیشی کی جس کو یہاں مجملاً بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ (واقعی برائے نام) پیشی ہے جس میں عذاب کچھ نہیں، دوسری قسم کا حساب ان لوگوں کا ہے جنہوں نے کچھ اچھے کام کئے کچھ برے، تو ان کی نیکیاں برے کاموں کے مقابلہ میں کردی جائیں گی جس سے نیکیاں اور گناہ برابر ہو جائیں گے اور ایمان باقی رہ جائے گا جسکی بدولت جنت میں پہنچ جائیں گے یہ بھی پیشی ہی کی ایک قسم ہے۔ ایک قسم حساب کی یہ ہے کہ (نیکیاں گناہوں سے کم رہ جائیں اور) کچھ گناہ ان کے ذمہ رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت کے لئے کسی کو کھڑا کردیں گے، یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے ساتھ لطف کا معاملہ ہوگا۔

اور اس قسم میں سے وہ لوگ بھی ہیں جن کے اوپر گناہ صغیرہ تھے ان کے ساتھ بھی لطف کا معاملہ ہوگا اور صغائر معاف کردئیے جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ جمیل اس کو شامل ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیأتکم

اگر تم اُن بڑے گناہوں سے بچتے رہو جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ معاف کردیں گے دوسرے کچھ اور ہیں جن کے اوپر کبیرہ اور صغیرہ دونوں

قسم کے گناہوں کے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیں گے کہ ان کے صغائر کو نیکیوں سے بدل دو جب وہ یہ معاملہ دیکھیں گے تو اس امید پر کہ کبائر بھی نیکیوں سے بدل دیئے جائیں عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! ہمارے تو کچھ بڑے بڑے گناہ بھی تھے جن کو ہم یہاں لکھا ہوا نہیں دیکھتے (اس پر کبائر بھی نیکیوں سے بدل دیئے جائیں گے) ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے فاولئك یبدل اللہ سیئاتھم حسنات کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے گناہ نیکیوں سے بدل دیئے جائیں گے، یہ بھی اُن لوگوں میں سے ہیں جن پر فضل کیا جائیگا۔

دوسرا وہ ہیں جن کی نیکیاں گناہوں پر راجح ہوں گی یہ لوگ فلاح پانے والے ہیں دوسرے اور ہیں جن سے قبر سے لیکر جنت کے محلوں میں پہنچنے تک اصلاً حساب نہ ہوگا جیسا آثار میں وارد ہوا ہے مثل شہداء وغیرہ کے اور بعضے وہ ہیں جن سے باقاعدہ مناقشہ کیساتھ حساب لیا جائیگا یہ لوگ ہلاک ہوں گے یعنی مبتلائے عذاب ہوں گے کیونکہ ہلاکت بمعنی عدم کا وہاں تحقق نہ ہوگا اور یہ ایسا ہی ہے جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ویأتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت ط اس کے پاس ہر طرف سے موت آئیگی مگر وہ مرے گا نہیں یعنی اس کو ایسی مصیبت پیش آئیگی کہ دنیا میں ایسی مصیبت آتی تو مرجاتا لیکن وہ وہاں ہر طرف سے وہ موت کی برابر مصیبت جھیلے گا اور مرے گا نہیں اسی طرح ہلاکت کو سمجھ لو۔

اور جو لوگ وہاں ہلاک یعنی مبتلائے عذاب ہوں گے ان کے بھی مختلف درجے ہیں ہر شخص کو اپنی حالت کے موافق ہلاکت کا سامنا ہوگا۔

الوجہ الاول قولہ علیہ السلام من حوسب عذب ھل ھو علی عمومہ او علی الخصوص الی قولہ کل شخص بقدر حالہ۔

ف ہر چند کہ اس مضمون میں کوئی مسئلہ تصوف کا مذکور نہیں مگر چونکہ سالکین کو مراقبہ حساب عموماً نافع ہوتا ہے اس لئے اس کا ترجمہ کردیا گیا اور حدیث صحیح میں وارد ہے انا عند ظن عبدی بی میں اپنے بندے کے گمان کیساتھ ہوں یعنی جیسا گمان

بندہ اللہ کے ساتھ قائم کرلے گا ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ ہوگا، علامہ شعرانی اس
حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اگر تم اللہ کے ساتھ یہ گمان رکھو گے کہ تم کو بلا حساب
جنت میں داخل کردیں گے تو انشاء اللہ تمہارے ساتھ یہی معاملہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ
سے امید ہے کہ وہ ہم کو بدون حساب کے جنت میں پہنچادیں گے۔
اللہم حقق ظننا بک وتفضل علینا برحمتک یا ارحم الراحمین

(۱۲۳) سنت یہ ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو دوبارہ پوچھا جائے

حدیث سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ جو شخص کوئی ایسی بات سنے جو اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کو دوبارہ پوچھنا چاہئے یہاں تک کہ سمجھ میں آجائے، یہ بات حدیث کے اس لفظ سے معلوم ہوئی۔

کانت لا تسمع شیئا لا تعرفہ الا راجعت فیہ حتی تعرف

کہ حضرت عائشہ کسی بات کو سنتیں اور سمجھ میں نہ آتی تو اس کو دوبارہ دریافت فرماتی یہاں تک کہ سمجھ جاتیں تو اگر یہ طریقہ سنت اسلام سے نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس پر برقرار نہ رکھتے اور حضرت عائشہؓ وہ ہیں جن کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خذوا عنها شطر دینکم کہ تم عائشہ سے دین کا آدھا حصہ لیلو

(پس حضرت عائشہؓ خلاف دین کوئی کام نہیں کرسکتیں) مگر یہ سنت سب کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کے لئے ہے جن میں مراجعت کی اہلیت ہو ورنہ عوام کا منصب تو صرف سوال کرنے کا ہے جیسا بعض احادیث کے ضمن میں پہلے گذر چکا، جواب کے بعد مراجعت کا ان کو حق نہیں)

الوجہ الثانی فیہ دلیل علی ان من السنۃ ان من سمع شیئا الی قولہ انما العوام وظیفتہم السوال کما تقدم فی الاحادیث قبل،

ف یہاں سے ان جاہلوں کی غلطی واضح ہوگئی جو علماء کے ذمہ اپنی ہر بات کا جواب لازم سمجھتے ہیں، ان کو جان لینا چاہئے کہ عوام کا منصب اس سے زیادہ نہیں کہ جو بات نہ

معلوم ہو اس کو محقق عالم سے دریافت کرلیں اگر سوال ضرورت کا ہوگا اس کا جواب دیا جائیگا اور فضول ہوگا تو کہہ دیا جائیگا کہ یہ سوال بیکار ہے اور جواب دینے کی ضرورت نہیں عوام کو اس پر اعتراض اور شبہ کرنے کا حق نہیں یہ حق اہل علم کو ہے۔ البتہ اگر کسی عالم کے جواب سے تسلی نہ ہوئی ہو تو دوسرے عالم سے پوچھا جاسکتا ہے، اور شیخ کے ساتھ بھی مرید کو مراجعت کا حق اسی وقت ہے جبکہ مرید اہل اور صاحب علم ہو اور شیخ نے اس کو مراجعت کی اجازت دے رکھی ہو ورنہ اس کے ساتھ بحث و مباحثہ نہ کرے کسی دوسرے محقق سے دریافت کرکے اپنا اطمینان کرلیں۔

(۱۲۴) مراجعت حسنِ ادب کے ساتھ ہونا چاہئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مراجعت حسن ادب کے ساتھ ہونا چاہئے کیونکہ حضرت عائشہ نے یوں عرض کیا اولیس یقول اللہ تعالیٰ فسوف یحاسب حسابا یسیرا، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ بعض کا حساب آسان لیا جائیگا" انہوں نے انکار اور اعتراض کی صورت ظاہر نہیں کی بلکہ آیت کو پیش کردیا جس سے بظاہر حدیث کو تعارض تھا، تاکہ اس طرح ان کو نفقہ کی بہت سی باتیں معلوم ہوجائیں جن میں سے ایک تو یہی بات تھی کہ آیت کی تفسیر حضور سے معلوم ہوجائے جو سب سے زیادہ اسکے مطلب کو بخوبی جاننے والے ہیں دوسرے آیت میں اور حضور کے ارشاد میں تطبیق کی صورت معلوم ہوجائے گی چنانچہ ان کی مراد پوری ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کا مطلب بھی بتلا دیا اور آیت و حدیث میں تطبیق کی صورت بھی بیان فرمادی۔"

الوجہ الثالث ان تکون المراجعۃ بحسن الادب الی قولہ و کیفیۃ الجمع بین الآی والحدیث۔

ف مراجعت کا حسن ادب کیساتھ ہونا بھی شرط لازم ہے اور اسی کے فوت ہونے سے انسان مراجعت کا اہل نہیں ہوتا، بعض لوگ اعتراض اور استخفاف کے ساتھ مراجعت کرتے ہیں جس سے بعض دفعہ عالم یا شیخ کی تحقیر ہوتی ہے اور بعض دفعہ

احکام الٰہیہ کی توہین ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کو جواب نہیں دیا گیا اب یہ لوگ اپنی
خطا کو تو دیکھتے نہیں علماء اور مشائخ کو بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کو جواب
دینا نہیں آتا یہ کسی سے نہ کہیں گے کہ ہم کو سوال کرنا نہیں آتا۔

(۱۲۵) استاد اور شیخ کے سامنے خود مستقل بن جانا ممنوع ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معلم اور شیخ کے سامنے خود مستقل بن جانا اور کسی نئے
مسئلہ میں رائے قائم کر لینا ممنوع ہے، تاویل اور اجتہاد میں استقلال کا حق معلم کی
غیبت میں ہے، یہ مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا ارشاد سن کر آپ کے سامنے آیت کو پیش کیا اور حضور کے ہوتے ہوئے خود کوئی
رائے قائم نہیں کی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شارع بھی ہیں اور معلم بھی، پھر
تشریع کا منصب تو آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور تعلیم کی میراث دوسروں کو بھی پہنچی ہے
پس جو حقوق تشریع کی بنا پر حضور کو حاصل ہیں وہ تو دوسروں کو حاصل نہیں اور جو حقوق
معلم ہونے کی وجہ سے آپ کے لئے ہیں وہ آپ کے خلفاء کے بھی حقوق ہیں جو منصب
تعلیم کی وجہ سے ان کو حاصل ہیں۔

الوجه الخامس يؤخذ منه ان الاستبداد مع حضور المعلم ممنوع
الى قوله والتعليم موروث عنه

ف اسی ادب کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ ہمارے اکابر نے اپنے مشائخ کی حیات
میں کسی کو اپنا مرید نہیں بنایا بلکہ جس کو بیعت کیا وکالۃً شیخ کی طرف سے بیعت
کیا اسی طرح مشائخ کی حیات میں کسی کو خود خلافت نہیں دی بلکہ جس کو اجازت کا
اہل سمجھا شیخ کی خدمت میں بھیج دیا کہ اسکو دیکھ لیا جائے اگر اہل ہو تو خلافت دیدی
جائے نیز استاد اور شیخ کے ہوتے ہوئے کسی سائل کو مسئلہ بتلانا یا سالک کو ذکر
شغل بتلانا بھی خلاف ادب ہے یہ کام غیبت میں ہونے چاہئیں شیخ یا استاد کے
سامنے بدون حکم کے خود پیش قدمی نہیں کرنی چاہئے ۱۲

(۱۲۶) تحقیق ہی سے انسان سردار بنتا ہے جہل سے نہیں بنتا

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ جب کوئی ایسی بات سنتیں جو ان کی سمجھ میں نہ آتی تو اس کے متعلق دوبارہ مراجعت اور تحقیق کرتیں یہ حکم جملہ امور کو عام ہے خواہ دنیوی ہو یا اخروی؟ یا صرف امور آخرت ہی کے ساتھ خاص ہے، جواب یہ ہے کہ یہ حکم عام ہے کیونکہ تحقیق کا شوق خصائل حمیدہ اور اخلاق عالیہ میں سے ہے جس سے انسان کو سرداری اور بلندی حاصل ہوتی ہے چنانچہ حضرت سیدہ صدیقہ انہی لوگوں میں سے ہیں جن کو مرتبہ عالیہ اور سرداری کا بلند درجہ حاصل تھا اور مثل مشہور ہے قیمۃ المرأ ما یحسن آدمی کی قیمت یہی ہے کہ جو کام کرے اچھی طرح کرے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ملاقات ایک اعرابی سے ہوئی تو آپ کو اسکی حالت پر تعجب ہوا، اس سے دریافت فرمایا کہ یہ حالت تجھ کو کس بات سے حاصل ہوئی اس نے کہا کہ میں جب کوئی ایسی بات سنتا جس کا مجھے علم نہ ہوتا تو اسکی تحقیق کرتا تھا یہاں تک کہ اچھی طرح سمجھ جاتا اور جس چیز کا مجھے علم ہوتا اسے ایسے شخص کو نہیں بتلاتا تھا جو اس کے سمجھنے کا اہل نہیں، حضرت علی نے فرمایا کہ واقعی تو اس بات سے سرداری کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔ علماء نے فرمایا ہے

من درس رأس ومن عرف ارتفع

جو پڑھتا ہے وہ سردار بن جاتا ہے اور جو معرفت حاصل کر لیتا ہے بلند ہو جاتا ہے یہاں ایک بات سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ حدیث میں مراجعت کا ذکر ہے انکار یا اعتراض کا لفظ نہیں ہے کیونکہ مراجعت کا حاصل تو یہ ہے کہ اس بات میں تردد اور شبہ کا اظہار کیا جائے تاکہ دوسرا حق اور باطل کو اچھی طرح واضح کر دے اور انکار یہ ہے کہ اس کو ایکدم سے رد کر دیا جائے اور جس کو عقل ہوگی وہ ایسی بات کو جو اسکی سمجھ میں ابھی نہیں آئی ہے مطلقاً رد نہ کرے گا جب تک اس کی تحقیق نہ کر لے اور حق و باطل کو اچھی طرح نہ سمجھ جائے کیونکہ ممکن ہے اس میں کوئی جزو حق ہو یا کوئی منفعت ہو اگر ابھی

کوئی جزو حق ہوا یا کوئی منفعت ہوئی تو اس کو مان لیا جائیگا ورنہ سمجھنے کے بعد رد کردیگا، جہل کی حالت میں کسی بات کو رد کرنا بھی جہل و نادانی کی علامت ہے کیونکہ بعض دفعہ اس میں کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کو اسکی خبر نہیں تو اس کا رد کرنا اور حقیقت سے جاہل رہنا اس منفعت سے محرومی کا سبب ہوگا اس لئے حضرات علماء نے فرمایا ہے۔

من جہل شیئا عاداہ (والناس اعداء ما جہلوا)

جو جس بات سے جاہل ہوتا ہے اس کا دشمن ہوتا ہے یہ تو اس وقت ہے جبکہ وہ بات کلام نبوت سے نہ ہو (کہ اس کو بدوں سمجھے بوجھے رد کرنے میں مصلحت اور منفعت سے محرومی اور اپنی نادانی کا اظہار ہے) اور اگر کلام نبوت سے ہو تو اس میں مراجعت اور تحقیق اس لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر جو فوائد اور حکمتیں اور انوار ہیں ان کا علم ہوجائے کیونکہ وہ تو سراسر خیر ہی خیر ہے اس لئے اس کا سنتے ہی رد کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ سمجھنے کے بعد بھی اس کی رد جائز نہیں ہاں تحقیق کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دوسری حدیث اسکے خلاف صحیح ہے یا یہ منسوخ ہے۔ اگر نسخ ثابت ہو یا اس کا محمل یہ ہے اور دوسری حدیث کا محمل یہ ہے خوب سمجھ لو

قولہ فی الوجہ الثامن ویرد ھنا سؤال الی قولہ لانہ خیر کلہ

(۱۲۷) آج کل کا بحث و مناظرہ بہت بُرا ہے

حدیث میں اس بحث و مناظرہ کی ممانعت پر بھی دلیل ہے جو آج کل بعض لوگوں میں رائج ہے کیونکہ ان لوگوں کا قصد سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ خصم کو لاجواب اور خاموش کردیا جائے چنانچہ ان کا جواب خصم کے مقابلہ میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم اس بات کو نہیں مانتے یا دلیل کا فلاں مقدمہ ممنوع ہے، حالانکہ وہ خصم کے قول کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھے اور آداب مناظرہ سے جاہل ہونے کی وجہ سے فائدہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر حضرات علماء کا ارشاد ہے کہ ہم کسی سے مناظرہ کرتے ہوئے یہ نہیں چاہتے تھے کہ حق ہماری ہی زبان سے نکلے بلکہ ہمارا قصد یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ حق کو ظاہر کر دیں خواہ ہماری زبان سے ظاہر ہو یا دوسرے کی زبان سے کیونکہ حکمت مسلمان کا گمشدہ مال ہے وہ جس کے ہاتھ سے بھی مل جائے خوشی کی بات ہے اور جو شخص اپنے مقابل کی بات کو بدون سمجھے رد کرتا ہے اس پر نفد کی رو سے دو مفسدے مرتب ہوتے ہیں کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو مقابل کی بات حق تھی جس کو لا نسلم اور ممنوع کہہ کر رد کر دیا گیا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت میں ہے

یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم

کہ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور یہ حرام و ممنوع ہے یا اس کی بات غلط اور منکر تھی جس کو بدون سمجھے رد کر دیا گیا اور منکر کا بدلنا یا رد کرنا معرفت کے بعد ہی جائز ہے یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ منکر کی تغییر اور تغلیط اسی وقت جائز ہے جبکہ اس کا منکر ہونا معلوم ہو جائے تو یہ انکار کرنے والا ان دو صورتوں پر کیونکر جرأت کرتا ہے حالانکہ ان میں جو کچھ خطرہ ہے ظاہر ہے خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ حظ نفس اور غلبہ اور فخر کی طلب بھی شامل ہو، اس وقت تو یہ شقاوت در شقاوت کے سوا کچھ نہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو اس سے بچائیں ۔

اسی کے قریب ایک اور صورت ہے جس کو ہم لوگ آجکل عقلمندی اور ہشیاری سمجھتے ہیں حالانکہ وہ بہت بری حالت ہے وہ یہ کہ کسی محقق کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے علم کا کوئی خاص حصہ عطا فرمایا ہو جس کو دوسرے نہیں جانتے ان کیساتھ بعض لوگ اس علم میں اس غرض سے بحث کرتے ہیں تاکہ ان کو یہ بتلا دیں کہ ہم بھی اس فن کو جانتے ہیں اور یہ ارادہ نہیں تھا کہ ان کے سامنے اپنے کو پست کر دیں اور یوں کہیں کہ حضرت ہم کو یہ مسئلہ بتلا دیجئے تو اس میں چند وجوہ سے خطرہ ہے ایک تو جھوٹ بولنے کا کیونکہ یہ بحث کرنے والا زبان حال سے یہ بتلاتا ہے کہ

میں اس علم کو جانتا ہوں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کو اس کی ہوا بھی نہیں
لگی دوسرے اپنے سے زیادہ علم والے کی تنقیص تیسرے اس علم اور اس مسئلہ کی تحقیر
حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے
کوئی علم عطا فرمایا ہے اسکی تحقیر نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسکو علم دیا ہے
تو اس کو حقیر نہیں بنایا بلکہ معظم و مکرم بنایا ہے اور جس کو خدا نے عظمت دی اسکو
حقیر کرنا بڑا سنگین جرم ہے نیز آئمۂ دین کا ارشاد ہے کہ جس کو تم تعلیم دو اسکے ساتھ
بھی تواضع کرو اور جس سے علم حاصل کرو اس کے سامنے بھی تواضع کرو کیونکہ تواضع
علم کا ادب ہے اور جو شخص علم کے ادب کو چھوڑتا ہے وہ بہت کم کامیاب ہوتا ہے
یا علم کو علم کے طریقہ پر حاصل نہیں کر سکتا بلکہ اس سے محروم رہ جاتا ہے تو دیکھو
حدیث کا یہ جملہ کیسا عمدہ ہے کہ جس بات کو حضرت عائشہ نہ سمجھتیں اس میں دوبارہ
مراجعت کرتیں جس سے معلوم ہوا کہ مراجعت انکار کو بھی شامل ہے مگر مقصود
انکار نہیں بلکہ معرفت مقصود تھی پھر جب وہ مراجعت کے بعد حقیقت کو سمجھ جاتیں
تو خاموش ہو جاتیں غرض ان کا مقصود یہ تھا جو کہ سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے مگر جن
لوگوں کا اوپر ذکر ہوا ان کے نزدیک تو بس فائدہ یہی ہے کہ لا اسلم او رممنوع کہہ کر
خصم کو بند کر دیا جائے تاکہ لوگ یوں کہیں کہ فلاں نے فلاں کو بند کر دیا یا اسے
خاموش اور لاجواب کر دیا فانا للہ وانا الیہ راجعون کیسا قلب حقیقت
ہوا ہے کہ معروف منکر ہو گیا اور منکر معروف (اچھی بات بری اور بری بات اچھی
ہو گئی زمانہ ہی بدل گیا حقائق میں انقلاب ہو گیا۔

فالى الله المشتكى - الوجه التاسع فيه دليل على منع بعض البحوث
الى قوله وردا لمعروف منكرا والمنكر معروفا

(۱۲۸) زبان کی احتیاط کرو، وہ بات کرو جس سے قیامت میں معذرت نہ کرنا پڑے

اس حدیث میں صوفیاء کی ایک حالت پر بھی اشارہ ہے کیونکہ یہ مناقشہ ہی وہ چیز ہے جس نے ان کو متاع دنیا سے بے رغبتی پر ابھارا ہے (یعنی سختیٔ حساب قیامت ہی کے خوف سے وہ دنیا کے تعلقات اور ساز و سامان سے الگ تھلگ رہتے ہیں کیونکہ جتنا کوئی دنیا میں پھنسے گا اتنا ہی حساب طویل ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں اس طرف صاف طور سے اشارہ فرمایا ہے جب ایک شخص نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے مگر لمبی چوڑی نہ ہو آپ نے فرمایا "ایسی بات نہ کہو جس سے قیامت میں تم کو معذرت کرنا پڑے" تو حضرات صوفیہ نے بات کرنے میں اس وصیت پر عمل کیا تاکہ ان کی ہر بات سچی ہو اور ان کا حساب درگذر اور چشم پوشی کے طور پر ہو (مناقشہ اور نکتہ چینی کی صورت سے نہ ہو) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان لوگوں میں سے کرے جن سے درگذر ہوا اور انہی کے کامیاب راستے اور سیدھے طریقہ پر چلائے (آمین)

الوجه الحادی عشر فی الحدیث اشارة صوفیة الی قوله و سلك بنا مسلکهم الرشید و منهجهم السدید

ف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو زبان کی حفاظت کا حکم فرمایا کیونکہ عام طور پر لوگ زبان کے گناہ کو گناہ نہیں سمجھتے تو جیسے زبان کی حفاظت کا اس قدر اہتمام ہے تو دوسرے اعضاء کی حفاظت کو اسی پر قیاس کر لیا جائے، مطلب یہ کہ ہے کوئی کام ایسا نہ کرو جس سے قیامت کے دن معذرت

کرنا پڑے، سبحان اللہ، حضور کو اللہ تعالیٰ نے کیسی بلاغت اور جوامع الکلم عطا فرمائے ہیں کہ دو لفظوں میں وہ بات ارشاد فرمائی جس کی شرح کے لیے دفتر بھی ناکافی ہے۔

ف حضرات صوفیہ نے جملہ اعضاء کی حفاظت کے لئے تین چیزوں کی حفاظت پر زیادہ زور دیا ہے یعنی آنکھ، کان، اور زبان کی حفاظت" تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص ان تینوں کو خلاف شرعی امور سے بچا لیگا وہ تمام اعضاء کی حفاظت بخوبی کرسکے گا اور جو ان کی حفاظت نہیں کرتا اس کو ذکر و شغل اور مجاہدات و مراقبات بھی کچھ نفع نہیں دیتے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

باب شانزدہم

حدیث

القتال فی سبیل اللہ

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! جہاد فی سبیل اللہ کسے کہتے ہیں؟ کیونکہ ہمارے میں سے بعض تو (کفار کے ظلم و ستم پر) غصہ کی وجہ سے لڑائی میں حصہ لیتے ہیں اور بعض حمیت قومی کی وجہ سے لڑتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی طرف سر اٹھا کر فرمایا راوی کہتے ہیں کہ آپ نے سر اس لئے اٹھایا کہ وہ شخص کھڑا ہوا تھا کہ جو شخص اس غرض سے جہاد کرے کہ اللہ کا بول بالا ہو اسی کا جہاد اللہ کے راستہ میں ہے۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ اللہ کے راستہ میں جہاد اسی نیت سے ہو سکتا ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو اور کسی نیت یا غرض سے نہیں ہو سکتا، اور اس کے متعلق چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۲۹) ضرورت کے وقت چھوٹے کا بڑے کو پکارنا جائز ہے

حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ چھوٹے کا بڑے کو پکارنا کسی ضرورت کے یا مشکل کے وقت جائز ہے کیونکہ اس اعرابی نے صحابہ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو یا رسول اللہ کہہ کر پکارا اور آپ سے سوال کیا اور صحابہ کرام اس وقت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل تھے پھر کسی نے بھی اس اعرابی کے سب کے درمیان آواز بلند کرنے پر انکار نہیں کیا، نہ اس بات پر انکار کیا کہ اس نے سب کو چھوڑ کر خود اپنی حاجت سے متعلق کیوں سوال کیا اور کسی مقرب بارگاہ کو واسطہ کیوں نہ بنایا) اگر یہ امور جائز نہ ہوتی تو شارع علیہ السلام اس کی کسی بات پر سکوت نہ فرماتے (بلکہ جواب دینے سے پہلے غلطیوں پر متنبہ فرماتے کہ بات کرنے کا یہ طریقہ نہیں جو تو نے اختیار کیا)

۲ الوجہ الثانی فیہ دلیل علی جواز مناداۃ المفضول للفاضل الی قولہ لما اقرہ الشارع علیہ السلام علی شئ من ذلک

ف حضرات صوفیہ کا یہی طریقہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اپنے سے بات کرنے کا موقعہ دیتے ہیں کسی واسطے کے ذریعے سے بات کرنے پر مجبور نہیں کرتے، نیز وہ اس سے بھی ناراض نہیں ہوتے کہ کوئی ان کا نام لیکر پکارے یا بلند آواز سے خطاب کرے بشرطیکہ محبت و ادب کو ہاتھ سے نہ دے۔

(۱۳۰) اپنے اعمال میں جو علتیں اور خرابیاں معلوم ہوں ان کو ظاہر کرنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اعمال میں جو علتیں اور نفسانی اغراض واقع ہوتی ہوں جاننے والے کو ان کو ظاہر کرنا چاہیئے تاکہ مخاطب ان میں سے غرض فاسد اور غرض صالح کو الگ الگ بتلا دے چنانچہ اس اعرابی نے اول تو یہ کہا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کسے کہتے ہیں؟ اس کے بعد لڑائی کی ان تمام صورتوں کو ظاہر کر دیا جن کی بناء پر لڑائی کرنے کی عرب کو عادت تھی۔

الوجہ الثالث قولہ ما القتال فی سبیل اللہ فیہ دلیل علی ابداء العلل الی قولہ کانت عادۃ العرب یقاتلون علیہا

ف عرب کے ان پڑھ دیہاتی بھی حضور کے زمانہ میں سوال کرنے کا ادب جانتے تھے

اور آج کل پڑھے لکھے تعلیم یافتہ بھی بات کرنے کا سلیقہ نہیں رکھتے چنانچہ عموماً ان کا سوال ناقص ہوتا ہے جس سے دوسروں کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ سوال کی وجہ کیا ہے اور اس سوال کی ضرورت کیوں ہوئی؟ اور بہت لوگ اس جہل میں گرفتار ہیں کہ شیخ کے سامنے امراض نفسانی کے اظہار کی ضرورت ہی نہیں وہ خود ہی نورِ بصیرت سے سب کچھ معلوم کر لیں گے۔ حضرات صحابہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عالم غیب نہ سمجھتے تھے بلکہ اپنے اعمال کی خرابیاں صاف صاف عرض کر کے احکام معلوم کرتے تھے، یہ لوگ مشائخ کو عالم الغیب سمجھ کر بیفکر بنے بیٹھے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون یاد رکھو کہ شیخ کے نورِ بصیرت کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں کے عیوب و امراض پر مطلع ہوا کرے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ امراض کا علم ہونے کے بعد ان کی اصلاح کا صحیح طریق اور بہترین علاج تجویز کرے ۱۲ ظ

(۱۳۱) اعمال ظاہرہ کی خصوصیت کا مدار نیت پر ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال ظاہرہ کی خصوصیت نیت ہی پر مبنی ہے (یعنی اگر نیت درست ہے تو اعمال ظاہرہ درست ہیں ورنہ ظاہر کا اعتبار نہیں، یہ بات اس سے معلوم ہوئی کہ جب سائل نے ان صورتوں کو جن پر لوگ لڑائی میں حصہ لیتے تھے شمار کیا تو حضور نے فرمایا کہ اعتبار نیت کا ہے ظاہری صورت کا نہیں۔

یہاں ایک بات قابل تحقیق ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ جو شخص اس غرض سے لڑتا ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو کسی اور غرض سے نہیں لڑتا جن کا حدیث میں ذکر ہے وہی اللہ کے راستہ میں ہے۔

درجات خلوص کی تحقیق

تو کیا اللہ کے راستہ میں جہاد اسی وقت ہوگا جبکہ ماسوا کا بالکل قصد نہ ہو مقصود اللہ کے سوا کچھ نہ ہو، یا یہ کہ جب اصل کا مقصد اللہ کا بول بالا کرنا ہو تو دوسرے مقاصد کی پرواہ نہ کی جائیگی، اگر کسی درجہ میں ان کا بھی قصد ہو، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال

کیا گیا کہ ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کو مسجد کی طرف جاتا ہوا دیکھیں اور یہ نہیں چاہتا کہ اسکو بازار کی طرف جاتا ہوا دیکھیں تو فرمایا یہ خواہش مضر نہ ہوگی جبکہ عمل خالص اللہ کے واسطے شروع کیا جائے پس جواب کا حاصل یہ ہے کہ عمل میں چند صورتوں کا احتمال ہے جنمیں سے ہر صورت کا حکم جدا ہے، ایک صورت تو جو کہ بالاتفاق سب سے اعلیٰ ہے یہ ہے کہ عمل خالص اللہ کے واسطے ہو اور اللہ کے سوا کسی چیز کا ۔۔۔۔۔ اس میں شمول نہ ہو، دوسرے یہ کہ جہاد کا ولولہ پیدا کرنیوالی تو اللہ کے سوا کوئی دوسری چیز تھی جن کا حدیث میں ذکر ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور بات ہو مثلاً طبعی عادت نے جہاد پر برانگیختہ کیا ہو پھر جہاد شروع کرتے وقت یہ شخص نیت کو تمام خیالات سے خالی کرکے اللہ تعالیٰ کا بول بالا کرنے کے لیے خالص کرلے تو یہ بھی حدیث کی تصریح کے موافق اللہ ہی کے واسطے ہے کیونکہ ارادہ کو برانگیختہ کرنیوالی چیز پر اسی وقت التفات کیا جاتا ہے جبکہ وہ عمل کے وقت تک موجود رہے یہاں تک کہ عمل اسی کی وجہ سے اور اسی کے واسطے ہو اور اگر عمل کے وقت تک موجود نہ رہے تو اس پر التفات نہ کیا جائیگا کیونکہ اعتبار اقرب فالاقرب کا ہے تو جو نیت عمل سے متصل ہوگی عمل کو اسی کے تابع کیا جائیگا بعد کے تابع نہ کیا جائیگا) تیسرے یہ کہ جہاد دوسری اغراض کے لئے بھی ہو اور اللہ کے لئے بھی ہو (دونوں نیتیں عمل کے ساتھ موجود ہوں) تو یہ اللہ کے واسطے کسی درجہ میں بھی نہیں کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جب عمل میں غیر اللہ کی شرکت ہو تو قیامت کے دن اللہ جل جلالہ اس کے عامل سے فرمائیں گے کہ میں سب سے زیادہ شرکت سے غنی ہوں جاؤ میرے غیر سے ثواب مانگو (جس کو میرے ساتھ عمل میں تم نے شریک کیا تھا) چوتھی صورت یہ ہے کہ جہاد ان ہی اغراض میں سے کسی غرض کے لئے ہو جن کا اوپر ذکر ہوا ان کے سوا کوئی غرض نہ ہو تو اس شخص کو اس کے فعل اور نیت کیموافق گناہ ہوگا یا اگر قواعد شرع کے موافق نیت مباح تھی تو فعل مباح ہوگا باقی ثواب کسی صورت میں نہ ہوگا جبکہ اللہ کا بول بالا کرنے کی نیت نہ تھی،

الوجه الثامن فيه دليل على ان تخصيص الذكر لا يكون الا بالنيات

الی قولہ بحسب قواعد الشرع فی کل قضیۃ

ف ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کا ارشاد ہے ریا ہمیشہ ریا نہیں رہتی اول ریا ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت ہو جاتی ہے اور حضرت سیدی حکیم الامت دام مجدہم کا ارشاد ہے کہ عمل کے ساتھ نیت کے تین درجے ہیں بشرط شئے، بشرط لا شئے، لا بشرط شئے، تیسرا درجہ بھی خلوص میں شامل ہے مگر ادنیٰ درجہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عمل کے وقت کوئی نیت حاضر ہو اللہ کے لئے عمل کی ماسوا کے لئے بلکہ خالی الذہن ہو کر بطور عادت کے عمل کیا جائے اور پہلا درجہ مضر ہے اگر ماسوا اللہ بشرط شئے کے درجہ میں ہو یعنی ماسوا اللہ کا قصد کیا جائے اور اگر اللہ کے لئے عمل کا قصد کیا جائے اور وہی بشرط شئے کے درجہ میں ہو اور ماسوای اللہ شروع ہی سے بشرط لا شئے کے درجہ میں ہو یعنی اسکی نفی کردی جائے تو یہ خلوص کا اعلیٰ درجہ ہے اور اگر ماسویٰ اللہ اولاً بشرط شئے کے درجہ میں تھا پھر اس کی نفی کر دی گئی اور بشرط لا شئے کے درجہ میں ہو گیا تو یہ بھی خلوص میں داخل ہے مگر یہ درجہ متوسط ہے۔ امید ہے کہ اہل علم اس کو سمجھ جائیں گے۔ بہرحال خلوص کے منافی صرف ایک صورت ہے کہ ماسوا اللہ مقصود ہو اور عمل کے وقت تک مقصود رہے اور وسوسہ قصد میں داخل نہیں، اگر قصد اللہ کے لئے ہو اور ماسویٰ اللہ وسوسہ کے درجہ میں ہو وہ اصلاً مضر نہیں کیونکہ وسوسہ غیر اختیاری ہے و لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا، پھر فرمایا کہ ریا خود کسی کو نہیں لپٹتی بلکہ لپٹانے سے لپٹتی ہے، اگر کوئی خود ماسویٰ اللہ کا قصد نہ کرے لیکن وسوسہ ماسوا اللہ کا آتا ہو تو یہ ریا نہیں خوب سمجھ لو۔

وھذا مما تفرد بتحقیقہ فی ھذا العصر فللّٰہ درہ من حکیم واللّٰہ تعالیٰ اعلم ویؤیدہ کلام ابن ابی جمرۃ ایضاً کما لا یخفی علی الفطن العارف

(۱۳۲) جواب کے وقت سائل کیطرف متوجہ ہوکر بات کرنا سنت ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سنت یہ ہے کہ جس سے کچھ سوال کیا جائے وہ جواب کے وقت سائل کی طرف منہ کرکے بات کرے کیونکہ صحابی نے کہا ہے کہ حضور نے سائل کیطرف سر اٹھا کر دیکھا، پھر صحابی نے اسکی وجہ بتلائی کہ آپنے سر اس لئے اٹھایا کہ سائل کھڑا ہوا تھا:

الوجہ التاسع فیہ دلیل علی ان من السنۃ ان یواجہ المسئول السائل بوجہ الی قولہ انما رفع الیہ رأسہ لانہ کان قائماً

(۱۳۳) وقار سے رہنا سنت ہے، کہ کسی عضو سے بے فائدہ بے ضرورت کام نہ لیا جائے

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار پر بھی دلالت ہے اور یہ کہ حضرات صحابہ کو حضور کے وقار کا علم تھا کہ آپ بے فائدہ بدون ضرورت کے کسی طرف التفات نہ فرماتے تھے اگر یہ بات نہ ہوتی تو راوی کو اس علت کے بیان کی ضرورت نہ ہوتی جسکی وجہ سے حضور نے سر اٹھایا تھا کہ سائل کھڑا ہوا تھا اور اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے اعضا کی حفاظت کرنا چاہیئے کہ بیفائدہ بدون ضرورت کے اُن سے کام نہ لیا جائے۔

الوجہ الحادی عشر والثانی عشر فیہ دلیل علی وقار النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی قولہ لما تقدم فی تعلیل رفع راسہ علیہ السلام

ف حضرات صوفیہ کو اس کا بہت اہتمام ہے جیسا مشاہد ہے۔

(۱۳۴) جب کوئی ایسی بات کہی جائے جو معروف کے خلاف ہو تو اس پر دلیل قائم کرنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب خبر دینے والا کوئی ایسی بات بیان کرے جو

لوگوں کے نزدیک معروف نہ ہو تو اسکو اپنی بات پر دلیل قائم کرنا چاہیئے جس کے بعد لوگ اس کی تصدیق کر سکیں چنانچہ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اٹھانے کی وجہ بیان کردی کہ سائل کھڑا تھا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید صحابہ ان کی بات کو قبول نہ کرتے یا ماننے میں توقف کرتے کیونکہ ان کا علم ان کیخلاف تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا ضرورت کے ایسا نہیں کرتے تھے تو راوی نے علت کو اس لئے بیان کیا کہ ان کی حدیث کی تصدیق سے ایک قاعدہ شرعیہ کی بنیاد قائم ہوئی تھی کہ اگر سائل نے کھڑے ہو کر سوال کیا ہو تو جواب میں سر اٹھا کر اسکی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ پس انہوں نے اس شرعی مصلحت کی وجہ سے احتیاط پر عمل کیا تھا اپنے نفس کیوجہ سے ایسا نہیں کیا

الوجہ الثالث عشر فیہ دلیل علی ان المخبر اذا اخبر بشئ لا یعرف الی قولہ لا من اجل نفسہ

(۱۳۵) کھڑے ہو کر سوال کرنا مسئلہ پوچھنا جائز ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سوال (یعنی دریافت کرنا) ہر حالت میں جائز ہے، بیٹھ کر بھی کھڑے ہو کر بھی کیونکہ صحابی کا اس جگہ یہ کہنا کہ سائل نے کھڑے ہو کر سوال کیا تھا یا حضور کے سر اٹھانے کی علت میں اس کو ظاہر کرنا بتلا رہا ہے کہ کھڑے ہو کر دریافت کرنا بھی جائز ہے مگر اسی کیساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ عام دستور بیٹھ کر سوال کرنا تھا، بہر حال جب اس موقعہ پر صحابی نے قیام کا ذکر کیا ہے تو اس سے ہر حالت میں سوال کی اجازت معلوم ہو گئی اور اگر عام دستور کھڑے ہو کر دریافت کرنے کا ہوتا تو اس جگہ قیام کا ذکر بیفائدہ ہوتا اور صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے منزہ ہیں (وہ فضول باتیں نہیں کیا کرتے تھے)

الوجہ الرابع عشر فیہ دلیل علی جواز السوال علی کل الاحوال الی قولہ والصحابۃ رضی اللہ عنہم منزھون عن ذلک

ف لیکن اگر قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ کھڑے ہو کر بات کرنے سے مخاطب پر

گرانی ہوگی تو بیٹھ کر ہی بات کرنا چاہیئے کیونکہ بلا وجہ کسی کے دل پر بوجھ ڈالنا ممنوع ہے

فضول باتیں نہ کرنا چاہیئیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ فضول باتیں نہیں کرتے تھے بلکہ جو بات کرتے ضرورت اور حاجت کیموافق کرتے تھے، حضرات صوفیہ کو بھی حفظ لسان کا بہت اہتمام ہے بعض اکابر طریق نے ادنیٰ سی فضول بات پر برسوں ندامت و استغفار کیا ہے قال العارف

چشم بند و گوش بند و لب ببند گر نہ بینی نور حق بر ما بخند

آنکھ کان اور زبان کی حفاظت مثمر انوار و برکات ہے اور ان میں بے احتیاطی سالب انوار و موجب ظلمات ہے۔ اللھم احفظنا

(۱۳۶) صوفیہ کو مجاہدہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کا قصد کرنا چاہیئے

اس جگہ ایک صوفیانہ اشارہ بھی ہے کیونکہ صوفیہ بھی جہاد میں مشغول ہیں یعنی جہاد نفس میں اور یہی بڑا جہاد ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے جب آپ ایک غزوہ سے واپس ہوئے تو صحابہ سے فرمایا ھبطتم من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر کہ تم اب جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف اتر آئے ہو، غرض جہاد اکبر نفس سے جہاد

ع عن جابر قال قدم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قوم غزاۃ فقال قدمتم خیر مقدم من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر مجاہدۃ العبد ہواہ رواہ الدیلمی وعن ابی ذر قال قلت یا رسول اللہ ای الجہاد افضل قال ان یجاہد الرجل نفسہ وہواہ رواہ ابن النجار، کذا فی کنز العمال ص ۲۶۳ ج ۲ قلت وہذا وان لم نعرف صحتہ من حیث الاسناد فلہ مؤید من قولہ صلی اللہ علیہ وسلم والمجاہد من جاہد نفسہ فی طاعۃ اللہ رواہ الحاکم وصححہ کما فی شرح الاحیاء للعراقی ص ۱۷۱ ج ۲

کرنا ہے، پس ان کا یہ جہاد بھی اسی واسطے ہونا چاہیئے کہ اللہ کا بول بالا ہو اور اسکی صفات غالب ہوں، جیسا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بیان فرمایا ہے

لا یزال العبد یتقرب الیّ بالنوافل حتی احبہ فاذا احببتہ

کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ

ویدہ التی یبطش بھا

" بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب برابر حاصل کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب اس کو محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ لیتا دیتا ہے "

یعنی جب بندہ مراد و محبوب بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام اعضاء کو مخالفت و معصیت سے محفوظ کر دیتے ہیں اب اس کے اعضاء سے وہی کام ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے پس یہ مقام حاصل کرنے کے لئے مجاہدہ کرنا چاہیئے اور اسی کو مقصود بنانا چاہیئے۔ حضرات فضلا اور محققین صوفیہ کا یہی طریق ہے، اور بعض جہلا جو یہ کہتے ہیں کہ ہم پے در پے روزے اور مجاہدات اس لئے کرتے ہیں کہ کچھ خرق عادات اور کرامات حاصل ہو جائیں۔ یہ لوگ محققین کے نزدیک نرے جاہل ہیں اور بعض نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مصداق ہیں

ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف

کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی عبادت ایک کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں یعنی ان کا مقصود اللہ کی عبادت نہیں بلکہ دنیوی غرض ہے اگر وہ حاصل ہو گئی تو خوش ہوتے ہیں اور وہ نہ ملی یا کسی مصیبت کا سامنا ہو گیا تو الٹے ہی لوٹ جاتے ہیں پھر نہ نماز رہتی ہے نہ روزہ بھلا اس صورت میں مجاہدہ اور عبادت سے کیا فائدہ؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں

مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم

"اللہ تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا لیں گے اگر تم شکر کرتے رہو اور ایمان پر رہو"
جس سے معلوم ہوا کہ عذاب سے بچانے والی دو چیزیں ہیں ایمان اور شکر، کشف و کرامات کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو بھی پیش نظر رکھو

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

(جو لوگ ہمارے واسطے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کے لئے اپنے راستے کھول دیتے ہیں)

تو تم پر اس بات کی حقیقت واضح ہو جائیگی جو میں نے تم کو بتلائی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ مقصود تحصیل شکر و ایمان ہے، اسی کا قصد کرنا چاہیئے اور جو شخص خالص اللہ کے واسطے مجاہدہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسی پر اپنا راستہ کھول دیتے ہیں یعنی مقامات قرب میں ترقی عطا فرماتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے واسطے مجاہدہ نہ کرے کسی اور غرض سے مجاہدہ نہ کرے اس کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے قرب کے راستے نہیں کھولتے پس طالب خدا کو صرف اسی کے لئے مجاہدہ کرنا چاہیئے کسی غرض سے نہ کرنا چاہیئے۔

وفقنا اللہ لذلک بمنہ اھ الوجہ السابع عشر ھذا اشارۃ صوفیۃ لان الجہاد عندھم ھو جہاد النفس

دنیا کے لئے جہاد ممنوع ہے صرف دین کیلئے ہی جہاد ہو سکتا ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا کے لئے جہاد ممنوع ہے۔ جہاد شرعی وہ ہے جو محض دین کے لئے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسا جہاد صرف مسلمان اور ان میں بھی صرف مخلصین کر سکتے ہیں۔ پس جس جہاد میں کافر و مسلم دونوں شریک ہوں وہ جہاد شرعی نہیں بلکہ دنیوی جدوجہد ہے۔ کیونکہ کفار اعلاء کلمۃ اللہ اور دین اسلام کے لئے جہاد نہیں کر سکتے، البتہ اگر غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہو کفار ان کے تابع اور ماتحت ہوں تو اس صورت میں اسلامی جہاد دونوں

سے مل کر بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اعتبار غالب کا ہے مغلوب کالعدم ہے اور جہاں غلبہ کفار کو ہو وہاں دونوں کی شرکت سے اسلامی جہاد نہیں ہو سکتا، پس جو شخص اس صورت کو بھی اسلامی جہاد بتلائے وہ مسلمانوں کو دھوکہ دیتا ہے خوب سمجھ لو۔

ف کشف و کرامات کو ولایت میں کچھ دخل نہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کشف و کرامات و خرق عادات کو ولایت و قرب میں کچھ دخل نہیں۔ نہ یہ امور مقاصد شریعت سے ہیں پس جو لوگ اذکار و اشغال و مراقبات میں ان چیزوں کے قصد سے مشغول ہو جاتے ہیں وہ طالب حق نہیں بلکہ طالب دنیا ہیں، اور سلوک میں زیادہ پریشانی سالکین کو انہی چیزوں کے حاصل نہ ہونے سے ہوتی ہے حالانکہ ان کا طالب و منتظر ہونا ہی خود سلوک کے منافی ہے خوب سمجھ لو۔

باب ہفدہم ۱۷

حدیث

الرجل یخیل الیہ انہ یجد ریحا

وھو فی الصلوۃ

عباد بن تمیم رضی اللہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کا حکم دریافت کیا جس کو نماز میں یہ خیال بار بار آتا ہے کہ وہ کچھ ہوا یا ریح کا اثر پاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک آواز نہ سنے یا بدبو نہ پائے نماز پڑھنے سے نہ ہٹے بلکہ برابر نماز میں مشغول رہے۔

شرح ظاہر حدیث اس پر دال ہے کہ جس شخص کو کسی شے کا خیال و وسوسہ آتا ہو وہ نماز کو قطع نہ کرے جب تک آواز یا بدبو نہ پائے۔ اس کے متعلق چند باتیں بیان کرنے کی ہیں۔

(۱۳۷) حضور کے وقت عوارض بشریت پر التفات نہ کرنا چاہیئے

حدیث میں لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جب بندہ دربار عالی کی طرف متوجہ ہو تو اسکو بشریت اور عوارض بشریت پر التفات نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ نقصان حال کی دلیل

ہے، ہاں اگر کوئی ایسی بات پیش آئے جس پر یقین ہو جائے تو وہ حکم ربانی ہوگا جس پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب پاخانہ کے تقاضہ کے وقت نماز سے منع فرمایا ہے تاکہ بارگاہ خداوندی کی طرف متوجہ ہونے کے وقت عوارض بشریت پر التفات نہ ہو۔

قوله الوجه الرابع هذا اشارة لطيفة الى قوله مع مدافعة الاخبثين

(۱۳۸) خطرۂ قلیلہ معاف ہے، اور نماز میں اصلاح نماز کے متعلق دل سے باتیں کرنا جائز ہے

حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ تھوڑا سا خطرہ جس سے نماز میں تشویش ہو جائے معاف ہے دوسرے یہ کہ نماز کے وقت دل میں ایسے امور کیمتعلق باتیں کرنا جو اصلاح نماز سے تعلق رکھتے ہیں جائز ہے، یہ بات حضور کے اس ارشاد سے معلوم ہوئی یخیل الیہ انہ یجد الشئی کہ اس کو خیال ہوتا ہے کہ وہ کچھ ہوا یا ریح کا شبہ پاتا ہے کیونکہ جب اس کو اس قسم کا خیال آئیگا تو اس سے شرعاً کہا جائے گا کہ اس معاملہ میں غور کر کہ تجھے اس کے متعلق کیا حکم ہے اور کیا حکم دیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حکم معلوم کرنے کے لئے یہ سب کچھ سوچنا حدیث النفس ہی تو ہے اور مناسب ہے کہ اس حکم کو دوسرے عوارض میں بھی جاری کیا جائے جو نماز میں اس کو پیش آئیں کہ وہ ان میں بھی غور کرے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ان کے متعلق کیا ہے؟ تاکہ حکم کے موافق نماز سے فارغ ہو، اسی لئے اہل علم نے فرمایا ہے کہ سہو کے ساتھ ایک نماز بدون سہو کے ستر نمازوں سے افضل ہے سوال کیا گیا یہ کیوں کر؟ فرمایا اس لئے کہ نماز بغیر سہو کے ہو تو احتمال ہے کہ قبول ہو یا نہ ہو اور سہو کے ساتھ ہو جسکی تلافی سجدۂ سہو سے کی گئی ہو، تو لسان شریعت سے فیصلہ ہو چکا ہے کہ اس نے شیطان کی ناک رگڑ دی جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے پس یہ نماز ترغیم شیطان ہوگی

اور جو چیز شیطان کی ناک رگڑنے والی ہو اس کے ساتھ رضائے رحمان کی امید کی جاتی ہے
پس اس حیثیت سے یہ نماز دوسری نمازوں سے بڑھ گئی (مترجم کہتا ہے کہ یہ فضیلت جزئی
ہے اور فضیلت جزئی مفضول میں بھی ہو سکتی ہے پس یہ لازم نہیں کہ سہو کی نماز حیثیت
سے بدون سہو کی نماز سے افضل ہو کیونکہ حضور تام کے لحاظ سے بدون سہو کی نماز افضل ہے
خوب سمجھ لو، اور اگر کبھی سہو نماز میں ہو جائے تو دلگیر نہ ہو کیونکہ اسکی فضیلت کے لئے
بھی ایک وجہ موجود ہے ۱۲

الوجہ الخامس فی ھذا من الفقہ جهان الی قولہ فضلت غیرھا بتلک
الصفۃ"

(۱۳۹) حدیث میں علم شرعی کی فضیلت پر بھی دلالت ہے کیونکہ یہ باتیں علم ہی سے
حاصل ہو سکتی ہیں اسی طرح یہ حکم تمام احکام میں جاری کیا جائے گا کہ بندہ تمام
کاموں میں اولاً شریعت کے موافق اخلاص کا مامور ہے، پھر اگر کوئی عارض پیش آجائے
جس سے اخلاص میں خلل کا شبہ ہو جائے تو شریعت کے لحاظ سے اس میں غور کرے
اور جس بات کا شرعاً مامور ہو اس پر عمل کرے اور یہ سب عبادت ہی عبادت ہے،
الوجہ السادس۔ فی ھذا اشارۃ الی فضل العلم الشرعی الی قولہ وذلک
کلہ عبادۃ۔

(۱۴۰) حدیث میں اہل قلوب کے لئے جو شکوک و وساوس پر اصلاً التفات نہ کرے

صاحب باطن ہیں اس پر بھی اشارہ ہے کہ شکوک اور عوارض و وساوس پر اصلاً التفات نہ
کریں خواہ زیادہ ہوں یا کم اسی لئے فرماتے ہیں کہ ان الملتفت ھالک التفات کرنے
والا تباہ ہو جاتا ہے۔

الوجہ الحادی عشر فیہ من الاشارۃ لاھل القلوب الی قولہ ان الملتفت
ھالک"

(۱۴۱) وساوس سے حالت خاص میں تنزل نہیں ہوتا

حدیث میں ان لوگوں کے لئے اس امر کی بشارت بھی ہے کہ عوارض و وساوس کا دفع کرنا خاص حالت سے نہیں نکالتا بلکہ وساوس کے بعد بھی وہی قرب حاصل رہتا ہے جو پہلے حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان لوگوں میں سے کریں جن کو اللہ تعالیٰ نے خیر کے ساتھ مخصوص فرمایا اور خاص اپنا بنالیا کہ اللہ کے سوا کوئی پروردگار نہیں

قوله الوجه الرابع عشر فيه ايضا بشارة لهم الى قوله لا رب سواه

ف اخیر کے دونوں نمبروں میں دفع وساوس کا عجیب علاج بتلایا گیا ہے کہ ان پر التفات نہ کرے۔ حضرت حکیم الامت دام مجدہم کی بھی یہی تحقیق ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ اس سے بہتر کوئی علاج نہیں دفع وساوس کے لئے جتنی تدبیریں اس کے سوا کی جاتی ہیں سب اس شعر کا مصداق ہیں ؎

تڑپو گے جتنا جال کے اندر … جال گھسے گا کھال کے اندر

پس ذاکرین و شاغلین کو وساوس کی بالکل پرواہ نہ کرنی چاہیئے نہ ان کے دفع کا اہتمام کریں نہ از خود لائیں، اپنی طرف سے ذکر کی طرف متوجہ رہنے کا اہتمام کریں اسکے بعد بلا قصد و اختیار کے جو وساوس آئیں ان کی طرف اصلاً التفات نہ کریں اور اس بشارت سے دل کو مطمئن کریں کہ وساوس کی وجہ سے خاص حالت میں نقصان یا تنزل نہیں ہوتا کیونکہ یہ امر اختیار سے باہر ہے اور امر غیر اختیاری مضر نہیں ہوا کرتا ۱۲ مترجم۔

باب شانزدہم

حدیث

البول والاستنجاء والشرب

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی پیشاب کرے تو اپنے عضو کو دائیں ہاتھ سے نہ پکڑے نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرے اور جب پانی پئے تو برتن میں سانس نہ لے۔

شرح حدیث میں بظاہر تین احکام ہیں

۱۔ یہ کہ عضو مخصوص کو دائیں ہاتھ سے نہ پکڑے۔

۲۔ دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرے۔

۳۔ برتن میں سانس نہ لے۔

اس کے متعلق چند فوائد ہیں۔

(۱۴۲) دایاں ہاتھ اچھے کاموں کیلئے ہے اور بایاں اسکی ضد کیلئے ہے

چونکہ دایاں ہاتھ کھانے پینے اور اس کے مناسب (اچھے) کاموں کے لئے موضوع کیا گیا ہے تو بایاں ہاتھ اسکی ضد یعنی فضلات اور اس کے مناسب

چیزوں کے لئے مقرر کردیا گیا، چنانچہ عضو مخصوص کو چھونا اور استنجا کرنا اسی قبیل سے ہے۔ اس لئے اسکو بائیں ہاتھ سے مخصوص کیا گیا اور دائیں ہاتھ سے منع کر دیا گیا) نیز

چونکہ آخرت میں اہل یمین جنتی ہوں گے تو دنیا میں بھی اس نوع کے لئے دائیں جانب موضوع کی گئی اور آخرت میں اہل شمال گناہگار اور دوزخی ہوں گے تو یہاں بھی بائیں جانب ان چیزوں کیلئے کی گئی جو گناہوں سے پیدا ہوتی ہیں اور جو ان سے مشابہ ہوں کیونکہ انسان سے جب پہلے پہل خطا کا صدور ہوا تو اس سے پیشاب پاخانہ پیدا ہوا اور اسی وقت سے انسان کو یہ تقاضہ لاحق ہوا اس سے پہلے نہ اس کو پیشاب آتا تھا نہ پاخانہ صرف پسینہ خوشبودار آتا تھا جس سے غذا تحلیل ہو جاتی تھی اور جنت میں جانے کے بعد پھر یہی اصل حالت عود کر آئے گی چنانچہ خواب کی تعبیر دینے والے اس شخص کو جو خواب میں پیشاب پاخانہ وغیرہ دیکھے یہی تعبیر دیتے ہیں کہ یہ خواب معاصی کے صدور پر دلالت کرتا ہے۔

قولہ لان الیمین لما جعل للاکل والشرب الی قولہ انہا دالۃ علی المعاصی

(۱۴۳) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاور شئ کو اسی کا حکم دیا جاتا ہے یعنی جو چیز دوسری چیز کے قریب ہو اس کا حکم وہی ہوگا جو دوسری شئے کا ہے۔ یہ مسئلہ حضور کے اس ارشاد سے ماخوذ ہے۔

اذا بال احدکم فلا یاخذن ذکرہ بیمینہ

جب کوئی پیشاب کرے تو اپنے عضو کو دائیں ہاتھ سے نہ پکڑے، چونکہ اس وقت عضو کو پیشاب سے قرب تھا تو دائیں ہاتھ سے اس کا چھونا ممنوع ہوا، اس کے سوا دوسرے اوقات میں اس سے منع نہیں کیا گیا چنانچہ کسی نے اس ذکر کی بابت حضور سے سوال کیا کہ اس عضو کے چھونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں، تو آپ نے فرمایا هل هو الا بضعۃ منك کہ وہ بھی تو تیرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے معلوم ہوا

کو بائیں کا چھونا ایسا ہی ہے جیسا بقیہ اجزاء بدن کا چھونا، اور بائیں اشارات کیلئے ہے کہ خبیث چیزیں بائیں ہاتھ سے متعلق ہیں اہل معرفت نے فرمایا ہے کہ خاطر شیطان بائیں طرف سے آتا ہے یعنی دل کی بائیں جانب سے، تو اب اسکی ضرورت ہے کہ دل کی بائیں جانب معلوم کی جائے کہ وہ کس طرف ہے تو عارفین کے نزدیک شمال قلب شمال جسم کی مخالف جانب میں ہے کیونکہ یہ حضرات وجہ قلب سے دل کا وہ دروازہ مراد لیتے ہیں جو غیبی چیزوں کے لئے دل کے اندر کھلا ہوا ہے۔ اسی دروازہ سے یمین قلب سے ان کو مکاشفات و کرامات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کے سوا ان سب چیزوں کا بھی جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیا کو مقتضائے حکمت کے موافق مخصوص فرمایا ہے جیسا دلائل شرعیہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ (بہر حال دل کی دائیں جانب بدن کی بائیں سمت میں ہے اور بائیں جانب بدن کی دائیں طرف ہے) بعض ناواقفوں نے جن کو اس حقیقت کی خبر نہیں یہ لفظ سن کر کہ خاطر شیطان بائیں جانب سے آتا ہے اور فرشتہ دائیں طرف سے آتا ہے اسکو جسم کی بناوٹ پر محمول کر لیا (یعنی دل کی دائیں بائیں جانب کو بدن کی سمتوں پر قیاس کیا) تو ان پر معاملہ منعکس ہو گیا، کیونکہ عارفین کے نزدیک خواطر کی چار قسمیں ہیں، ملکی و شیطانی یہ دونوں تو ان جوانب سے آتی ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا اور نفسانی خواطر دل کے سامنے سے آتے ہیں اور خاطر ربانی دل کے اندر سے آتا ہے۔

قوله فيه دليل على ان مجاورالشئ يعطى حكمه الى قوله وربانى وهو من داخل القلب



۱۹
بابِ نوزدہم

حدیث

الرأفۃ بالحیوان

ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک کتے کو دیکھا کہ پیاس کی شدت میں تر مٹی کھا رہا ہے تو اس شخص نے اپنا موزہ نکالا اور اس میں پانی بھر بھر کر اسکو پلانے لگا یہاں تک کہ اس کو سیراب کر دیا اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی قدر کی اور اسکو اتنی سی بات پر جنت میں داخل کر دیا۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ اس شخص کو ایک کتے کے سیراب کرنے پر جنت میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے متعلق چند باتیں بیان کرنے کی ہیں۔

(۱۴۴) حاجت اور ضرورت ہر ایک کو خلاف عادت پر مجبور کر دیتی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حاجت اور ضرورت ہر جاندار کو خواہ عاقل ہو یا غیر عاقل عادت مالوفہ سے باہر کر دیتی ہے اور خلاف عادت فعل پر مجبور کر دیتی ہے یہ اس سے معلوم ہوا کہ کتا تر مٹی چاٹ رہا تھا کیونکہ اس میں بھی کچھ

اثر پانی کا موجود تھا، اور اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی شئے دو۔ رے کے قریب ہوتو
اس سے مفقود ہونے کی حالت میں عقلاً وطبعاً قریب کو اسی کا حکم دیا جائیگا عقلاً
تو یہ بات علم عقل اور شرع میں بہت جگہ آچکی ہے اور طبعاً کا ثبوت اس مقام پر
موجود ہے۔ کیونکہ کتے اور تمام حیوانات انسان وجن کے سوا عقل سے کورے ہیں
لیکن اپنے منافع کی معرفت طبعاً ان کو حاصل ہے۔ جس چیز میں نفع اپنا دیکھتے ہیں اس
سے مانوس ہوتے ہیں اگر وہ نہ ملے اور اس کے قریب قریب کوئی دوسری شئے مل جائے تو
اسی کو کام میں لاتے ہیں، جیسا یہاں مذکور ہے کہ کتا تر مٹی چاٹ رہا تھا کیونکہ اس کو
پانی سے ٹھنڈک ملتی تھی جب پانی نہ ملا اور تر مٹی میں اس کے قریب قریب تراوٹ ملی
اسی کو استعمال کرنے لگا اور مٹی کے ثقل کی پرواہ نہ کی،

ضرورت کے وقت ثقیل شئی خفیف اور استغنا کے وقت خفیف گراں ہوجاتی ہے

اس سے علم حکمت کا یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت ثقیل شئے بھی خفیف ہوجاتی ہے اس کے لئے یہ عکس لازم ہے کہ استغنار کے وقت خفیف شئے بھی گراں ہوتی ہے اسی لئے
اہل حقیقت پر مجاہدہ گراں نہیں بلکہ (پھولوں) ہلکا ہے کیونکہ وہ اپنے مولا کے محتاج ہیں
اور اس احتیاج سے پوری طرح رنگے ہوئے ہیں، اہل دنیا پر مجاہدہ گراں ہے کیونکہ
ان کو دنیا سے محبت ہے اور اسی کی احتیاج ان کے نزدیک زیادہ ہے، عبادت
ان کو دشوار ہے جس سے اہل معرفت راحت ولذت پاتے ہیں اور ان کو عبادت آسان
ہے کیونکہ ان کو اس دولت کی خبر ہے جو عبادت کے اندر ہے اسی لئے حق تعالیٰ اپنی
کتاب میں فرماتے ہیں۔ وانہا لکبیرۃ الا علی الخشعین نماز واقعی بڑی گراں
ہے مگر ان پر جو خشوع والے ہیں۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کے ساتھ لطف کا معاملہ

فرماتے ہیں، دیکھو کتے کے دل میں ڈال دیا کہ تر مٹی چاٹنے لگے تا کہ اس کی حالت کو دیکھ کر کسی کو اس پر رحم آجائے اور پانی پلا دے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مخلوق کو راحت پہنچانا بہترین صفات میں سے ہے یہ اس سے اخذ کیا گیا کہ اس معمولی کام پر بہت بڑا ثواب دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا کہ مسلمان اس صفت کو اختیار کریں جس سے قرب بڑھتا ہے۔

قوله فيه دليل على ان الحاجة تخرج الحيوان الى قوله لينا سئ المومنون بهذه الصفة المقربة

ف راحت رسانی خلق جس کا نام ایثار ہے حضرات صوفیہ کا خاص شعار ہے مگر افسوس آجکل چند وظائف و معمولات کا نام تصوف رہ گیا ہے اصلی صفات کا اہتمام نہیں رہا حسن معاشرت جو راحت رسانی کی بنیاد ہے ایسی متروک ہوئی ہے گویا کبھی مسلمان کے گھر میں تھی ہی نہیں حالانکہ قرآن و حدیث کے اوراق اس کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائیں کہ غیروں کی تقلید چھوڑ کر احکام خدا و رسول کا اتباع کریں کہ بخدا ساری فلاح دنیا و آخرت کی اسی میں ہے۔ مسلمانوں کو بدون اس کے ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی۔

(۱۴۵) تعریض و کنایہ تصریح کے برابر ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی بات کو تعریضاً اور کنایۃً بیان کرنا تصریح کرنے کے برابر ہے جیسا امام مالک نے فرمایا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کی جو خبر دی ہے دو حال سے خالی نہیں یا تو یوں ہی بلا فائدہ خبر دیدی نعوذ باللہ اس کا تو خطرہ بھی کسی کے دل پر نہیں گذر سکتا اور جس کے دل میں ایسا وسوسہ گذرے اور وہ اس کو مان لے وہ تو مسلمان بھی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وما ينطق عن الهوى (یہ رسول خواہش نفس سے بات نہیں کرتے) اور یہ کلمہ تمام اقوال کو عام ہے یا یہ خبر کسی ایک فائدہ کو یا بہت سے فوائد کے

لیے بیان کی گئی ہے اور یہ حق ہے تو اب ان فوائد کا جو ہم نے اوپر بیان کئے اور جو آئندہ بیان کریں گے اسی حدیث سے ظہور ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں ہمارے سامنے بہت سے قصے بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب ان کے قصوں میں عبرت ہے عقلمندوں کے لئے وکلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت بہ فؤادک اور یہ رسولوں کے سب کچھ واقعات ہم آپ کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ کے دل کو مضبوط کردیں، اور فرمایا ہے ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے اللہ کو بھلادیا تو خدا نے ان کو اپنی جانوں سے ہی غافل بنادیا نیز فرمایا ہے

اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم

کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ ان کو نظر آجاتا کہ ان سے پہلے (کافروں) کا کیسا انجام ہوا۔

اسی لئے فقہا نے فرمایا ہے کہ قصص قرآنی میں ضمناً اسکے مقتضا کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے اسیطرح امثال کو سمجھ لو اسی لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وما یعقلھا الا العالمون ان مثالوں کو عالموں کے سوا کوئی نہیں سمجھتا

فیہ دلیل لما لک الذی یقول الی قولہ وما یعقلھا الا العالمون

ف کنایہ اور تعریض کا صراحت کی برابر یا اس سے بھی بلیغ تر ہونا اہل بلاغت کے نزدیک مسلم ہے مگر اسمیں شک نہیں کہ اس کو سمجھنے والے ہی سمجھتے ہیں، سب لوگ نہیں سمجھ سکتے اس لئے حدود و قصاص میں جہاں سخت احتیاط لازم ہے تعریض وکنایہ کا اعتبار نہیں کیا گیا اسی طرح باب طلاق میں الفاظ کنایہ سے بدون نیت متکلم یا دلالت حال سے وقوع طلاق کا حکم نہ کیا جائیگا۔ باقی استنباط احکام میں تعریض وکنایہ اور منطوق وصریح سب برابر ہیں جس طرح منطوق کلام سے مسائل کا استنباط ہوتا ہے اسی طرح

تعریض حواشارہ سے بھی استنباط احکام ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ تعارض کے وقت صریح کو کنایہ پر ترجیح ہوگی۔

ف حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے ہیں کہ جملہ خبریہ سے ہمیشہ انشا مقصود ہوتا ہے اور جس خبر سے انشاء مطلوب ہو وہ مہمل ہے۔ پس کلام شارع میں تو کوئی خبر انشار سے خالی نہیں ہوسکتی ہاں عام لوگوں کے کلام میں خالی ہوسکتی ہے جو مہمل کلام سے احتراز کو ضروری نہیں سمجھتے۔

ف جب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ قصص و امثال قرآن میں ان کے مقتضا کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے تو اب سمجھو کہ تصوف کے مسائل زیادہ تر قصص و امثال ہی کے ضمن میں مذکور ہیں تو جو لوگ علم تصوف کو قرآن وحدیث سے غیر ثابت کرتے ہیں وہ اپنے ہی نفس کو ملامت کریں کہ انہوں نے قرآن کے بہت بڑے حصہ کو چھوڑ رکھا ہے کیونکہ احکام فقہیہ کی آیات تو پانچ سو کے قریب ہیں۔ بقیہ ساڑھے پانچ ہزار آیات میں تصوف اور علم عقائد ہی کا تو بیان ہے جس کو اس کا نمونہ دیکھنا ہو وہ حضرت حکیم الامت دام مجدہم کا رسالہ مسائل السلوک عن کلام ملک الملوک مطالعہ کریں۔

(۱۴۶) خیر متعدی بہت بڑی قربت ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیر متعدی جس کا نفع دوسروں کو بھی پہنچے بہت بڑی قربت ہے کیونکہ ایک معمولی احسان پر جو ایسے جانور کے ساتھ کیا گیا تھا جس کے قتل کا شریعت نے ہم کو حکم دیا ہے اتنی عمدہ جزا دی گئی کہ اس پانی پلانے والے کو اتنی سی بات پر جنت میں بھیج دیا گیا تو کسی عاقل مکلف انسان کے ساتھ احسان کرنے کا رتبہ کیا ہوگا اور کسی نیک آدمی کے ساتھ سلوک کرنا تو کیسا کچھ ہوگا اگر اس کا تتبع کرو گے تو اس میں بہت سے درجے نکل سکتے ہیں اسی طرح قیاس کرتے چلو مثلاً اجنبی کے ساتھ احسان کرنے کا یہ ثواب ہے تو قرابت داروں کے ساتھ کیسا ہوگا پھر عام قرابت داروں کے ساتھ یہ درجہ ہے تو خاص قرابت داروں کے ساتھ کیا کچھ ہوگا

فیہ دلیل علی ان من اکبر القرب الخیر المتعدی الی قولہ ولی ھذا افتن ۔

(۱۴۶) نفع متعدی نفع لازم سے اس وقت افضل ہے جبکہ ضرر لازم کو مستلزم نہ ہو

یہ مقولہ مشہور ہے کہ نفع متعدی نفع لازم سے افضل ہے مگر یہ جب ہے کہ نفع متعدی ضرر لازم کو مستلزم نہ ہو، یعنی اپنے دین کو نقصان پہنچاکر دوسروں کو نفع پہنچانا مستحسن نہیں بلکہ مذموم ہے۔ مثلاً بعض لوگ خدمت خلق میں اپنے اوقات کو برباد کر لیتے ہیں اور بعض دفعہ واجبات و فرائض میں خلل ڈال دیتے ہیں بعض لوگ دوسروں کی دلجوئی میں اپنی صحت کو برباد کر لیتے ہیں کہ جب تک دوسرے مجلس سے نہ اٹھیں یہ بھی ان کی خاطر سے منقبض رہتے ہیں خواہ اپنا کا معمول فوت ہو یا نیند کا معمول برباد ہو یا تہجد اور صبح کی نماز فوت ہو وغیرہ وغیرہ تو یہ صورت نفع متعدی کی محمود نہیں، خوب سمجھ لو۔

(۱۴۷) اعمال خیر میں سے کوئی عمل بیکار نہیں

اس حدیث میں تمام اعمال خیر کی ترغیب ہے کہ ہر نیک کام کا اہتمام کرو کسی کام کو معمولی سمجھ کر نہ چھوڑو کیونکہ کیا خبر ہے کہ کس عمل سے سعادت اور نجات میسر ہو جائے دیکھو اس واقعہ میں ایک معمولی عمل سے کتنی بڑی سعادت مل گئی کہ جنت میں پہنچ گیا تو اعمال خیر میں سے کوئی عمل ضائع اور بیکار نہیں۔

فیہ دلیل علی التخصیص علی جمیع اعمال الخیر الی قولہ فلا یضیع منھا شئی ۔

(۱۴۸) اخلاص ھی سے ثواب بڑھتا ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اخلاص ہی سے اجر کے بڑھنے

کا سبب ہے، یہ بات اس حدیث کے واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہوگی کہ یہ شخص جنگل میں تھا وہاں اس نے کتے کو پانی پلایا جہاں اس کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا حقیقت میں اس کا فعل خالص اللہ کے لئے تھا اسکی زیادہ توضیح رسول اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو صدقۃ السر کے بارہ میں وارد ہوا ہے حتی لا تعلم شمالہ ما تنفق یمینہ بہترین صدقہ وہ ہے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا خرچ کیا۔

فیہ دلیل علی ان الاخلاص الیٰ قولہ حتی لا تعلم شمالہ ما تنفق یمینہ

۱۴۹ کمال عمل ھی سے اجر کامل ہوتا ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کمال اجر کمال عمل سے ہوتا ہے کیونکہ حضور نے فرمایا ہے کہ اس نے اس کتے کو پانی پلایا یہاں تک کہ سیراب کردیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عمل کی قدر کی یعنی جب اس نے اس کو سیراب کردیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر اپنا انعام کامل کردیا کہ جنت میں پہنچادیا اور کمال اجر یہی ہے کہ بندہ جنت میں پہنچ جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الخیر کلہ بحذافیرہ فی الجنۃ کہ خیر تو کامل مکمل پوری طرح جنت ہی میں ہے (اس سے بڑھ کر اور کیا انعام ہوگا) فیہ دلیل علی ان کمال الاجر یکون بکمال العمل الیٰ قولہ الخیر کلہ بحذافیرہ فی الجنۃ۔

صلاح آخرت سے دنیا کے بگڑنے کی پرواہ نہ کرنا چاہئیے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دار آخرت کے سنوارنے میں دنیا بگڑتی ہو تو بگڑنے دو، دیکھو اس شخص نے اپنے موزہ میں پانی بھر بھر کر پلایا حالانکہ موزہ پانی سے خراب ہوجاتا ہے مگر چونکہ اس میں آخرت کی درستی تھی تو یہ خرابی عین صلاح تھی۔

بڑوں کو چھوٹوں کیلئے مشقت برداشت کرنا چاہئیے

نیز حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

بڑوں کو چھوٹوں کے لئے مشقت برداشت کرنا چاہیئے جب وہ ان کے محتاج ہوں، دیکھو اس شخص نے کتے کو پانی پلانے کے لئے مشقت برداشت کی جب کہ اس کو خدمت کا محتاج دیکھا۔ مولیٰ تعالیٰ شانہ نے اس تعب کو قبول کر کے اس پر احسان فرمایا اور ظاہر ہے کہ انسان تمام جانداروں سے افضل ہے بجز فرشتوں کے کہ ان کے متعلق اختلاف ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ خواص بشر خواص ملائکہ سے افضل ہیں اور عامۂ مومنین عامہ ملائکہ سے افضل ہیں واللہ اعلم

ویؤخذ منہ تغلیب فساد ھذا الدار، الیٰ قولہ ماعدا الملائکۃ ففیھم خلاف۔

ف۔ امام احمد اور حاکم نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے من احب دنیاہ اضر باخرتہ ومن احب آخرتہ اضر بدنیاہ فاٰثروا ما یبقی علی ما یفنیٰ قال الشیخ حدیث صحیح ص۲۹۱ ج ۳ العزیزی۔ جو اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچائے گا اور جو اپنی آخرت سے محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا۔ پس باقی کو فانی پر ترجیح دو۔ حضرات صوفیہ کا عمل اس حدیث پر سب سے زیادہ ہے اور یہی زہد کا پہلا قدم ہے، ہاں اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ محبت دنیا کی ممانعت ہے کسب دنیا کی ممانعت نہیں اور کسب دنیا بدون محبت کے بھی ہو سکتی ہے جسکی علامت یہ ہے کہ خلاف شریعت کسی صورت سے دنیا ملتی ہو تو اس صورت سے ہرگز دنیا نہ کمائے اور جائز طریقہ سے دنیا کما کر زکوٰۃ و حج وغیرہ سے غفلت نہ کرے اور ضرورت دینی میں بھی حسب موقع مال خرچ کرتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

باب بست ونہم

حدیث

النعاس في الصلوٰة

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی نماز پڑھتے ہوئے اونگھنے لگے تو اسکو چاہیئے کہ سو جائے یہاں تک کہ نیند جاتی رہے کیونکہ ممکن ہے اگر وہ اونگھتے ہوئے نماز پڑھتا رہا تو شاید وہ استغفار کی جگہ اپنے آپ کو برا بھلا کہے اور خبر بھی نہ ہو۔

شرح ظاہر حدیث کا حاصل نیند کی حالت میں نماز پڑھنے سے ممانعت ہے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۵۰) عالم کو از خود تعلیم دینے کا بھی حق ہے گو اس سے سوال بھی نہ کیا گیا ہو

اس میں ان لوگوں کے لئے دلیل ہے جو یوں کہتے ہیں کہ عالم کو یہ حق ہے کہ از خود دوسروں کو تعلیم دے گو اس سے سوال بھی نہ کیا گیا ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اذا نعس احدکم ابتدائی کلام ہے کسی سوال کے جواب میں نہیں۔

قولہ فیہ دلیل لمن یقول ان للعالم الی قولہ دون ان یسأل

ف: اس سے ان مشائخ کے طرز عمل کی تائید ہوتی ہے جو از خود طالبین کو تعلیم و تنبیہ کرتے رہتے ہیں خواہ وہ اپنے حالات کی اطلاع کریں نہ کریں۔

(۱۵۱) نماز میں دعا قبول ہوتی ہے

حدیث میں یہ بھی احتمال ہے کہ برا بھلا کہنے سے مراد دشنام عرفی نہ ہو اپنے کو بددعا دینا ہو تو اس کا مزید پہلے سے بھی زیادہ ہوگا کیونکہ گالی دینے سے تو نماز ہی فاسد ہوتی اور اب اسکی ساتھ ایک اور یہ بھی شامل ہو جائیگی کہ نماز کی ساعت میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے تو یہ بددعا اسکی ہلاکت کا سبب بن جائیگی۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل و مال کو کوسنے سے منع فرمایا ہے (کہ شاید قبول کی گھڑی ہو اور اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت کا سامان ہو جائے۔

قولہ واحتمل وجہا اخر ان یکون السب ھنا بمعنی الدعاء علی نفسہ الیٰ قولہ نہی علیہ السلام ان یدعو احد علی اھلہ ومالہ

ف: لوگ عموماً نماز کے بعد دعا کا اہتمام کرتے ہیں حالانکہ نماز کے اندر دعا زیادہ قبول ہوتی ہے اس کا اہتمام زیادہ کرنا چاہیئے مگر نماز کے اندر دعا ماثور ہونا چاہیئے مخترع نہ ہونا چاہیئے۔

(۱۵۲) اپنے کلام اور جملہ افعال کی نگہداشت لازم ہے

حدیث سے بہت سے علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ کہ انسان کو اپنے کلام کی اور تمام افعال کی نگہداشت کرنا چاہیئے کہ کوئی بات اور کوئی کام غفلت کی حالت میں سرزد نہ ہو مبادا اسکی ہلاکت کا سبب ہو جائے اور اسے خبر بھی نہ ہو اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی بعض دفعہ کوئی برا کلمہ زبان سے نکالتا ہے جسکی پروا بھی نہیں کرتا مگر اس کی وجہ سے جہنم میں ستر سال کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔

قولہ یترتب علیٰ ذلک من الفقہ وجوہ الیٰ قولہ یھوی بھا فی النار سبعین خریفاً۔

(۱۵۳) محل قرب میں ترکِ ادب بدتمیزی ہے

حدیث میں ایک صوفیانہ اشارہ ہے

کہ محل قرب (و زمان قرب) میں آداب (قرب کا ترک کرنا بدتمیزی ہے یہ اشارہ حضورؐ کے قول لعلہ یسب نفسہ سے ماخوذ ہے، کیونکہ نماز محل قرب ہے، اور محل قرب میں گالی دینا اور بُرا بھلا کہنا بدتمیزی کی بات ہے یہاں ایک سوال وارد ہوگا وہ یہ کہ احادیث سے ثابت ہے کہ) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نماز سے پہلے بیٹھے بیٹھے سوجاتے تھے یہاں تک کہ ان کے سر نیند کی وجہ سے ادھر ادھر جھکنے لگے تھے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو صحابہ نماز پڑھنے لگتے جس سے ظاہر یہ ہے کہ وہ نیند کی حالت میں نماز پڑھتے تھے حالانکہ ابھی کہا گیا ہے کہ محل قرب میں غفلت کرنا بدتمیزی ہے۔ جواب یہ ہے کہ حضرات صحابہ نماز کے اندر نہیں اونگھتے تھے ان کی نیند اور غفلت نماز کی اقامت سے بالکل جاتی رہتی تھی کیونکہ اقامت کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے نیند اور غفلت دور ہو جاتی اور قلب نماز کی طرف متوجہ اور حاضر ہو جاتا ہے کیونکہ مؤذن جب اللہ اکبر، اللہ اکبر کہتا ہے ایمان کا لشکر جوش میں آجاتا ہے اور غفلتوں سے بیدار ہو جاتا ہے جس کے مختلف درجے ہیں۔ جب اشہد ان لا الہ الا اللہ کہتا ہے قلب منور ہو جاتا ہے اور اللہ کی مدد پہنچ جاتی ہے۔ اشہد ان محمد الرسول اللہ کہتا ہے تو یقین کی ٹھنڈک حاصل ہو جاتی اور رحمت پھیل جاتی ہے؛ حی علی الصلوٰۃ کہتا ہے تو عزم میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے حی علی الفلاح سے کوشش اور حسن عبادت میں تازہ روح پڑ جاتی ہے۔ اللہ اکبر اللہ اکبر سے دوبارہ عظمت الٰہیہ کا استحضار ہو جاتا اور ہیبت طاری ہو جاتی ہے لا الہ الا اللہ سے جان اللہ کے حوالے ہو جاتی ہے اور تمام اوہام دل سے نکل جاتے ہیں باطن کی سمت تکرار ہیبت واخلاص سے کامل ہو جاتی ہے اور ظاہر اذعان وتسلیم اور انقیاد سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسان اس حالت سے پوری طرح آراستہ ہو گیا جیسا ہم نے بیان کیا تو نیند دوبارہ اس کے پاس نہیں آسکتی اور اگر پھر بھی غفلت کے

جھونکے نے اس کو دبایا تو نیند کی آفت طاری ہو جائیگی ۔ احکام شریعت معاملہ قربت یعنی نماز کی بندش کو کھولدیں گے اور سو رہنے کی اجازت دی جائیگی اور نیند کی مصیبت سے خلاصی پانے کے بعد پوری طرح وضو وغیرہ کر کے اس فرض کو ادا کرنے کی تاکید کی جائے گی جو اس کے ذمہ ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الصلوٰۃ فرمایا ہے (یعنی سونے کے لئے اس کو امر کیا گیا ہے جسے نماز کے اندر نیند آوے) قبل الصلوٰۃ نہیں فرمایا (کہ اگر نماز سے پہلے نیند آرہی ہو نماز کے اندر نہ آتی ہو جب بھی سو رہے پس حضرات صحابہ کی حالت اس سے خارج ہے کیونکہ وہ نماز سے پہلے اونگھتے تھے نماز کے اندر نہیں اونگھتے تھے۔

ف۔ اقامت صلوٰۃ کے وقت ان باتوں پر توجہ کرنا چاہیئے جو اس مقام پر مذکور ہیں کہ ان کے استحضار سے نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہوگی۔ غفلت دور ہو جائے گی اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن میں جو بار بار اقیموا الصلوٰۃ فرمایا گیا ہے اس سے یہی اقامت مراد ہے جس کے لئے اقامت صلوٰۃ موضوع ہے کہ توجہ اور حضور اور خشوع کے ساتھ نماز پڑھو غافل اور بے خبر ہو کر نماز نہ پڑھو۔

(۱۵۴) طاعت میں کوئی ناگوار چیز نہ ملانی چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طاعت میں کوئی ناگوار چیز نہ ملانی چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کوئی اونگھتے ہوئے نماز پڑھے گا تو شاید وہ استغفار کی جگہ اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگے تو اس وقت نماز چھوڑنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ مبادا نیند کی حالت میں بلا ارادہ کوئی بات بیجا نکل جائے تو ارادہ کے ساتھ ایسا کرنا کیسا کچھ ہوگا؟ اور یہاں سے علمی مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ نماز میں حالاً و مقالاً حضور قلب کی بہت زیادہ تاکید ہے۔ اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے ان اللہ لا یقبل صلوٰۃ امرأحتی یکون قلبہ مع جوارحہ اللہ تعالیٰ کسی کی نماز اس وقت تک قبول نہیں فرماتے جب تک اس کا دل اعضاء کے ساتھ نہ ہو (یعنی جو کچھ ظاہر میں کرتا ہے وہی

باطن میں ہو قیام کی حالت میں دل پر یہ اثر ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوں رکوع میں یہ اثر ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ ان کے سامنے جھک جاؤں سجدہ میں یہ حالت ہو کہ دل اللہ تعالیٰ کے سامنے پگھل جائے، اپنی ہستی کو ان کے سامنے قربان کر دے)

قولہ الوجہ الثامن فیہ دلیل علی ان لا یخالط الطاعۃ مکروہ الیٰ قولہ حتی یکون قلبہ مع جوارحہ

ف نماز میں حضور قلب اور درجۂ احسان حاصل کرنا حضرات صوفیہ کا خاص امتیاز ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ یہ دولت ان ہی اصحاب کی صحبت اور تعلیم سے حاصل ہوتی ہے تو کیا اب بھی علم تصوف سے انکار کیا جائیگا ؟

ف اس مقام پر ایک فقہی بحث بھی ہے جس پر شارح نے متنبہ فرمایا ہے مگر چونکہ وہ تصوف کا مسئلہ نہیں اس لئے اس کو فوائد میں لکھا جاتا ہے وہ یہ کہ نماز سے پہلے سونا جائز ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ سونا دو حال سے خالی نہیں یا تو دن کو ہوگا یا رات کو سو دن کو تو نماز سے پہلے سونا جائز ہے۔ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور عادت طبیعت کا بھی یہی مقتضی ہے، حدیث تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو قیلولہ کے بارہ میں وارد ہوا ہے قیلوا فان الشیاطین لا تقیل (قیلولہ کیا کرو کیونکہ شیاطین دوپہر کو نہیں سوتے۔ نیز ایک حدیث میں ہے استعینوا بالقیلولۃ علی قیام اللیل کہ قیلولہ سے رات کو اٹھنے کیلئے مدد لو) اور قیلولہ وقت ظہر کے قریب ہی ہوتا ہے اور طبعی عادت بھی یہ ہے کہ دن کو آدمی زیادہ دیر تک نہیں سوتا کیونکہ دن کام کے لئے بنایا گیا ہے اسلئے دن میں گہری نیند عادتاً نہیں آتی، جیسا رات کو کوئی زیادہ دیر تک نہیں جاگ سکتا کیونکہ رات سکون کیلئے بنائی گئی ہے اور حکیم مطلق کی حکمت نے جس چیز کو طبائع میں مستحکم کر دیا ہے وہ بدون کسی خاص سبب کے نہیں بدلا کرتی الا نادراً والنادر کالمعدوم اور کسی وقت عادت کیخلاف کسی امر کا ظہور بھی قدرت کا اثر ہے جیسا عادات و اطوار کا ارتباط و استحکام حکمت الٰہیہ کا اثر ہے اور اسی پر احکام مرتب ہوا کرتے ہیں۔ اور خرق عادت سے قدرت کے کمال پر

استدلال کیا جاتا ہے جو کہ ایمان کی بنیاد ہے جس پر جملہ احکام کا مدار ہے ، رہا رات کو نماز سے پہلے سونا مثلاً مغرب و عشاء کے درمیان سونا سو اس کے متعلق ان بڑے بڑے علماء سے جن سے میں ملا ہوں مجھے یہ پہنچا ہے اور ان کو بھی اپنے بڑوں سے یہی پہنچا ہے کہ جو شخص مغرب عشاء کے درمیان کسی ضرورت سے سونا چاہیے دو حال سے خالی نہیں یا تو عشاء کی نماز کے لئے کوئی جگانیوالا اسکو میسر ہے یا نہیں ، اگر کوئی جگانے والا موجود ہو تو اس کو سونا جائز ہے اور اگر جگانیوالا کوئی نہ ہو مگر اسکو اپنے متعلق تجربہ اور عادت کی وجہ سے یہ یقین ہو کہ وقت پر بیدار ہو جائیگا تب بھی سونا جائز ہے ۔ اور اگر گمان غالب یہ ہو کہ وقت پر بیدار نہ ہوگا بلکہ وقت کے بعد بیدار ہوگا یا اسکو اپنی عادت کی خبر ہی نہیں اس حالت میں سونا جائز نہیں چونکہ یہ مضمون ضروری تھا اس لئے بیان کر دیا گیا گو اس حدیث میں اس مسئلہ سے تعرض نہیں کیا گیا ۔

ف حضرت مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں بھی مہمانوں کو مغرب و عشاء کے درمیان سونے کی اجازت تھی کیونکہ وہاں عشاء کی نماز کے لئے جگانیوالا مقرر تھا ،

مصنف عبدالرزاق میں بسند صحیح نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بسا اوقات نماز عشاء سے پہلے سو رہتے تھے اور فرما دیتے تھے کہ نماز کے وقت مجھ کو جگا دینا ، پس صحاح میں ابو برزہ اسلمی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے جو یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کے پہلے سونے سے منع فرمایا یا اس کو نا پسند فرمایا ہے اس کا محمل وہ صورت ہے جبکہ جگانیوالا کوئی نہ ہو واللہ تعالیٰ اعلم

(۱۵۵) تیقظ اور حزم کی تاکید

حدیث میں اسطرف بھی اشارہ ہے کہ تیقظ اور حزم سے کام لینا چاہیئے ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مبادی غفلت ہی میں جس کا نام اونگھ ہے اور جسکی انتہا گہری نیند ہے کہ زبان سے نکلی ہوئی بات کی خبر بھی نہ ہو عمل طاعت کے

ع؎ تفصیل دلائل حدیثیہ کے لئے اعلاء السنن جلد ۲ ملاحظہ ہو ۔ ۱۲

چھوڑ دینے کا امر فرمایا ہے۔ مبادا اس میں خلل واقع ہو جائے تو اس سے زیادہ غفلت کا کیا حال ہوگا۔ اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ المومن کیس حذر فطن، مومن ہشیار، چوکنا اور سمجھ دار ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض صوفیہ کی یہ حالت تھی کہ جب وہ اپنے اہل و عیال اور جانوروں کے اخلاق یا عادات میں ذرا بھی خرابی دیکھتے تو فوراً توبہ اور اطاعت کی طرف سبقت کرتے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہماری کسی کوتاہی کی وجہ سے ان کی عادات و اخلاق میں یہ تغیر ہوا ہے اور اپنے نفس کی مخفی حالتوں کو ٹٹولتے کہ شاید ہمارے نفس میں کوئی تغیر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اس غفلت پر متنبہ ہو جاتے جوان سے سرزد ہوئی تھی تو اسکی اصلاح کر لیتے اور اسکی اصلاح کے ساتھ ہی حالت درست ہو جاتی چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ دنیا کی باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے دل میں دنیا کا کوئی خطرہ آیا تو اس کے بعد ہی ایک سپاہی دروازہ پہ آیا اور اندر آنے کی اجازت چاہی اجازت دیدی گئی اور وہ اندر آکر سامنے بیٹھ گیا اور دنیوی معاملات میں گفتگو کرنے لگا۔ شیخ کو اس پر تعجب ہوا کہ آج دنیا کے معاملات کا یہ جھگڑا میرے پیچھے کہاں سے لگا اور یہ شخص میرے پاس کیوں آیا تو انہوں نے اپنے نفس کو ٹٹولا کہ یہ بلا کہاں سے آئی دفعتہً اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ فلاں خطرہ کیوجہ سے جو تمہارے دل میں دنیا کیمتعلق آیا تھا ایسا ہوا انہوں نے فوراً اس خطرے سے توبہ استغفار کیا۔ اس کے بعد فوراً ہی سپاہی کھڑا ہوگیا اور چل دیا، اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتے جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں

یہ تو اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی نیند اور غفلت کا حکم تھا۔ رہی اہل دنیا کی نیند تو اس سے بیداری تو موت ہی کے وقت ہوگی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

الناس نیام فاذا ماتوا انتبہوا

لوگ سوتے ہیں جب مریں گے اس وقت بیدار ہونگے

کیونکہ وہ اس وقت حق کو دیکھ لیں گے اور حقائق کا مشاہدہ کریں گے، پس اہل دنیا کی نیند تو سراسر جہل اور غلبۂ شہوت اور غفلت ہے مگر جسکو اللہ تعالیٰ علم عطا فرماویں اور بیدار کردیں لہٰذا یہ وہ لوگ ہیں جو کوشش میں لگے ہوئے اور مستعد ہیں اور صدق اور تصدیق سے سرفراز ہوچکے ہیں جیسا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین میں کچھ زیادتی نہ ہو اور یہی شان ان حضرات کی ہے جو اخلاص کیساتھ حضرات صحابہ کا اتباع قیامت تک کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان حضرات کے طفیل بدون کسی مشقت کے ان میں سے کردے۔ آمین

قولہ فی اشارۃ الی التیقظ والحزم الیٰ قولہ جعلنا اللہ فیھم بلا محنۃ بحرمتھم عندہ

ف تیقظ اور حزم طریق تصوف میں بہت ضروری ہے۔ حضرات صوفیا اسکی بہت تاکید فرماتے ہیں کیونکہ غفلت اور بےفکری کیساتھ نہ دنیا کا کوئی کام ہو سکتا ہے نہ دین کا، نیز طالب حق کو جو اللہ تعالیٰ کا محب ہے کسی وقت بھی محبوب سے غفلت کی گنجائش نہیں مبادا کوئی ایسی حرکت سرزد ہوجائے جو محبوب کی ناراضگی کا سبب بن جائے۔ پس اسکو ہر وقت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور راضی رکھنے کی فکر ضروری ہے۔ اگر اس فکر میں کمی ہے تو محبت اور طلب میں کمی ہوگی اور جتنی طلب میں کمی ہوگی اسی قدر مقصود کے حصول میں دیر ہوگی۔

(۱۵۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حتی یذھب عنہ النوم کہ نیند کا غلبہ زائل ہونے تک اسکو سو رہنا چاہیئے حکمت پر عمل کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حکمت الٰہی یوں ہی جاری ہے کہ نیند بدون سکون حاصل کئے نہیں جاتی یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جو اس کے جانے کے لئے مقدر ہے۔ اس وقت یہ خود بخود جاتی رہتی ہے جیسے خود ہی بدون بلائے آئی تھی، اور نیند کے آنے جانے میں بڑی قدرت کا اظہار ہے کہ انسان ابھی ابھی اس حالت میں تھا کہ اس کا دماغ اور تمام قویٰ فکریہ وعملیہ مجتمع تھے، کام کے لئے مستعد تھے، دفعتہً نیند آگئی اور سب قویٰ معطل ہوگئے اس کو خبر

بھی نہیں ہوتی کہ نیند کب اور کہاں سے آگئی بعض اوقات اس کو نیند کا آنا پسند بھی نہیں ہوتا بلکہ ناگوار ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی کسی منفعت یا حاجت کو حاصل کرنا چاہتا تھا جس سے نیند مانع ہوگئی اور اس میں مخلوق کے سراپا عاجز و محتاج ہونے کی دلیل بھی ہے کہ انسان اپنے حرص اور دعوے کی بناء پر بعض مقاصد کی تحصیل میں لگا ہوا ہوتا ہے کہ دفعتہً ایسی چیز اس پر مسلط ہو جاتی ہے جس کو وہ دفع نہیں کر سکتا بلکہ اپنی ساری حرص اور احتیاط اور تحفظ کو چھوڑ کر مجبوراً اس کے سامنے سر جھکا دیتا ہے

قل من یکلؤکم باللیل والنہار من الرحمٰن

فرما دیجئے کہ رات اور دن میں تم کو رحمٰن سے کون بچا سکتا ہے

(کوئی نہیں کیونکہ اس کے سامنے سب عاجز و محتاج ہیں) الغرض نیند اور بھول دونوں مخلوق کے نقص اور احتیاج پر شاہد ہیں جس پر نیند مسلط ہوتی ہے اور یاد کی ہوئی چیزوں کو بھول جاتا ہو اس کو قدرت اور کمال کا دعوے کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ اسی لئے علماء نے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خوبصورت بنایا پھر اس پر نیند اور بھول کو مسلط فرما دیا اس وقت اس کے سارے کمالات سلب ہو جاتے ہیں پھر جب بیدار ہوتا ہے تو بدستور حرص میں لگ جاتا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اسیطرح شب و روز یہی معاملہ ہوتا رہتا ہے اور انسان اپنے دعوی پر قائم رہتا ہے گویا وہ بیٹھا یا سویا ہی نہیں تھا۔ وفی انفسکم افلا تبصرون تمہاری ذات میں بھی قدرت الٰہیہ کی نشانیاں موجود ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ دلوں پر غفلت کا زنگ لگ گیا ہے۔ یہاں تک کہ بصیرت کی نگاہ خفاش بن گئی کہ ان نشانیوں کے آفتاب کو نہیں دیکھ سکتی۔

اور یہیں سے اہل تصوف کی فضیلت دوسروں پر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے جب ان حالات کا مطالعہ کیا یعنی نیند کی حالت کا موت کے مشابہ ہونا مشاہد ہوگیا اگرچہ یہ حضرات دوسروں سے کم سوتے ہیں تو اب وہ اپنی ذات کے لئے کسی نفع یا ضرر کا اپنے کو مالک نہیں سمجھتے بلکہ اپنے کو مردہ بدست زندہ سمجھتے ہیں۔ پس انہوں نے بیداری میں بھی اپنے اوپر

تفویض و انقیاد کو لازم کر لیا یعنی نیند کیوقت جوان کا حال ہوتا ہے وہی بیداری میں بھی ان کا حال رہتا ہے کیونکہ انہوں نے استصحاب حال پر حکم لگایا اور یہی اہل علم کا بھی قول ہے وہ بھی استصحاب حال کو حجت کہتے ہیں تو وہ اس حالت کے زیادہ مستحق تھے کہ بیداری میں ان کا وہی حال ہوتا ہے جو نیند میں ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ علما ظاہر کے اوپر اسباب شہوات کا زیادہ غلبہ ہے اس لئے وہ باتوں ہی کے فقیہ بن گئے حقیقت کے فقیہ نہ بنے کیونکہ ان کو باتوں کی حلاوت نے فقہ حال سے روک دیا اس لئے وہ فقیہ الحال نہ بنے اور بھلا قباحت حال کے ساتھ محض باتیں بنانا بھی کچھ قیمت رکھتا ہے، ہرگز نہیں یہ تو نرا کھوٹ ہے جیسے کسوٹی پر پرکھنے کے وقت ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

الوجہ الحادی عشر فیہ دلیل علے عجز المخلوق الیٰ قولہ صاحبھا بیدہ عند محل الانتقاد

ف استصحاب حال فقہا کی خاص اصطلاح ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر شی کو اسکی پہلی حالت پر باقی رکھنا چاہیئے جبتک کسی دلیل سے حالت سابقہ کا بدل جانا ثابت نہ ہو، مثلاً کسی شئے کا ابتدا اسلام میں حلال ہونا ثابت ہو تو اس کو بعد میں بھی حلال کہا جائیگا جب تک کسی دلیل سے بعد میں حرام ہونا ثابت نہ ہو اس قاعدہ کا مقتضا یہ تھا کہ جب انسان نیند کے اندر مثل مردہ ہو جاتا ہے تو اسکو بیداری کے بعد بھی اپنے کو مردہ ہی سمجھنا چاہیئے جب تک کسی دلیل سے یہ ثابت نہ ہو کہ بیداری کے بعد وہ مردہ نہیں رہا بلکہ زندہ ہو گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بیداری کے بعد بھی دراصل مردہ ہی ہے کیونکہ وہ اپنے لئے کسی نفع یا ضرر کا مالک نہیں بلکہ ھر وقت اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج ہے بدون اللہ کی مدد کے نہ وہ اپنے کو کوئی نفع دے سکتا ہے نہ ضرر سے بچ سکتا ہے۔ پس حقیقت میں انسان بیداری کی حالت میں بھی تقریباً ویسا ہی مردہ ہے جیسا نیند کی حالت میں ہوتا ہے پس جو لوگ استصحاب حال کو زبان سے حجت کہتے ہیں اگر یہ ان کا حال نہ بن جاتا تو وہ بیداری میں بھی اسی طرح تفویض و انقیاد سے کام لیتے جیسا نیند میں اپنے کو اللہ کے حوالہ کر کے خود کو عاجز و بیچارہ سمجھ لیتے ہیں مگر ان کا فقہ اور علم محض زبانی ہے فقہ باطنی ان

کو حاصل نہیں اسلئے ان کی حالت نیند اور بیداری میں یکساں نہیں رہتی یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ شریعت مقدسہ نے خود نیند اور بیداری میں فرق کیا ہے چنانچہ نیند کی حالت میں انسان مکلف نہیں رہتا اگر نماز قضا ہو جائے گناہ نہیں ہوتا نیند میں طلاق کا لفظ زبان سے نکل جائے تو اس سے بیوی پہ طلاق واقع نہیں ہوتی اور بیداری کے احکام اس کے برعکس ہیں۔ پھر علماء ظاہر نے اگر دونوں میں فرق کیا تو کیا گناہ کیا؟ بلکہ دونوں کو یکساں سمجھنا شریعت کے ان مسائل سے غلط معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات صوفیہ کا یہ مطلب نہیں کہ نیند اور بیداری تمام وجوہ سے یکساں ہے اور دونوں کے احکام میں اصلاً فرق نہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف احتیاج میں دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ کیونکہ اگر انسان خدا کا محتاج نہ ہوتا اور خود اپنے لئے نفع و ضرر کا مالک مختار ہوتا تو نیند کی حالت میں ایسا عاجز و مجبور ہرگز نہ ہوتا بلکہ نیند کو اپنے اوپر سے دفع کرنے کی اسکو قدرت ہوتی مگر جب وہ نیند کو اپنے سے دفع نہیں کر سکتا اور نیند میں اسکی ساری طاقتیں سلب اور تمام قوتیں معطل ہو جاتی ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ بیداری کی حالت میں جو اسکو اپنے اندر کچھ اختیار اور قدرت اور طاقت نظر آتی ہے یہ اس کے قبضہ کی چیز نہیں بلکہ یہ تمام چیزیں اللہ کی دی ہوئی ہیں اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں وہ جب تک چاہیں اس کو طاقت اور اختیار دیں اور جب چاہیں چھین لیں چنانچہ روزانہ گردش لیل و نہار اور بیداری اور نیند کے تکرار سے اسکو یہی سبق دیا جاتا ہے۔ پس عاقل وہ ہے کہ نیند کی حالت کو بیداری میں نہ بھولے اور یاد رکھے کہ جس نے نیند میں تمام طاقتیں مجھ سے چھین لی ہیں اسی نے بیداری میں یہ طاقتیں مجھے واپس دی ہیں یہ میرے گھر کی دولت نہیں بلکہ اللہ کے خزانہ رحمت سے مجھے عطا ہوئی ہیں اور میں بیداری کی حالت میں بھی اسکے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں ہوا بلکہ اسی طرح اس کے قبضہ میں ہوں جس طرح نیند کی حالت میں تھا۔ یہ مطلب ہے، بیداری اور نیند کی حالت کے یکساں ہونے کا جو شخص اسکو سمجھ لیگا وہ بیداری کی حالت میں اپنی قدرت و اختیار کو اللہ کی نعمت سمجھ کر اس کا شکر کریگا اپنے کسی کمال پر ناز نہ کریگا اور جو اس سے

غافل ہوگا وہ نیند کی حالت میں تو جماد کی طرح مردہ ہوگا اور بیدار ہو کر اپنے کمالات کو ذاتی کمالات سمجھے گا ان پر ناز کرے گا تکبر کریگا اور اسکو بھول جائیگا کہ رات کو پھر نیند آنے والی ہے جو میرے تمام کمالات کو سلب کر کے مجھے جماد کی طرح مردہ بنادیگی، نیز جو شخص اس حقیقت کو پیش نظر رکھے گا وہ بیداری میں اپنی قوت اختیار و عقل وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں صرف نہ کریگا کیونکہ وہ سمجھ چکا ہے کہ یہ جو کچھ قدرت و اختیار میرے اندر بحالت بیداری نظر آرہا ہے یہ خدا تعالیٰ کی عطا ہے اور خدا تعالیٰ کی عطا سے اسی کی نافرمانی میں کام لینا بڑی بے حیائی اور بے غیرتی کی بات ہے خوب سمجھ لو ۱۲ مترجم

(۱۵۸) نیند بھی اللہ کی بڑی رحمت ہے

اس میں اللہ تعالیٰ کے لطف عظیم پر بھی دلالت ہے کہ اس کا لطف و کرم تمام بندوں کے شامل حال ہے نیک ہوں یا بد مکلف ہوں یا غیر مکلف کیونکہ نیند تو سب کے بدن کے لئے راحت ہے، اگر ان کی کسی ضرورت کی وجہ سے نیند کو روک دیا جایا کرتا تو بعض دنیا کے حریص تو عمر بھر بھی نیند کو نہ بلاتے اور اس میں ان کی ہلاکت و بربادی تھی کہ رات دن بدن سے اور دماغ سے کام لیتے کسی وقت ان کو آرام نہ دیتے تو پچاس برس میں مرنے والا پچاس ہفتوں یا پچاس دنوں میں ہی ختم ہو جاتا، اس لئے اللہ تعالیٰ سبحانہٗ خود ہی نیند کو بھیجتے ہیں کسی مقرب فرشتے وغیرہ کو بھی اس میں واسطہ نہیں بناتے چنانچہ ارشاد ہے وھو الذی یتوفاکم باللیل وہی تو ہے جو تم کو رات کے وقت نیند کے ذریعہ وفات دے دیتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نیند کو بندوں کے اختیار پر چھوڑ دیتے تو یہ صورت بندوں کے لئے رحمت نہ ہوتی بلکہ عذاب ہو جاتی جیسا اوپر مفصل معلوم ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ کا خود ہی نیند کو بھیجنا سراسر نعمت اور رحمت ہی رحمت ہے جس سے کوئی مخلوق محروم نہیں مطیع و عاصی سب ہی اس رحمت سے حصہ لے رہے ہیں۔

الوجہ الثانی عشر فیہ دلیل علیٰ عظم لطف المولیٰ الیٰ قولہ وھو الذی یتوفاکم باللیل۔

ف جو لوگ دوپہر کو یا رات کو یہ سمجھ کر سوتے ہیں کہ نیند بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جیسا روٹی اور پانی اسکی نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اسکی بے قدری اور ناشکری نہ کرنا چاہیئے ان کو نیند کی حالت میں بھی ثواب ملتا ہے ان کی نیند دوسروں کی بیداری سے افضل ہے۔ پس اگر تم کسی عارف کو نیند کا اہتمام کرتے دیکھو تو اس سے بدگمان نہ ہو کہ یہ نیند کا کیوں اہتمام کرتا ہے بیداری کا اہتمام کیوں نہیں کرتا تم کو کیا معلوم ہے کہ وہ نیند کا اہتمام کیا سمجھ کر کر رہا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ عارف نیند کا اہتمام اسی حد تک کریگا جس حد تک صحت کے لئے اسکی ضرورت ہے اس سے زیادہ نہ کریگا جو اس سے زیادہ اہتمام کرے وہ عارف نہیں بلکہ بندۂ نفس ہے اور یہاں سے ان سالکین کی غلطی واضح ہوگئی جو شب بیداری ہی کو نعمت سمجھتے ہیں۔ ۱۲ مترجم

(۱۵۹) اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادت سے مستغنی ہیں

اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادت سے مستغنی ہیں اور اس سے پاک ہیں کہ نافرمان کی نافرمانی ان کو کچھ نقصان پہنچا سکے گی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ خود ہی بلاواسطہ اپنے نافرمان بندوں پر ان کی نافرمانی کو دیکھتے ہوئے یہ راحت کی نیند نہ بھیجتے اور کام کرنیوالوں کے کام میں نیند کی وجہ سے خلل نہ ڈالتے جبکہ ان کے عمل سے خدا ہی کا نفع تھا، خدا تعالیٰ اس سے بہت بلند و برتر ہے وہ اس سے پاک ہے کہ کسی کے عمل سے اسکو نفع ہو یا کسی کی نافرمانی سے نقصان ہو) وہ اپنے بندوں پر کیسے مہربان ہیں کہ دشمنوں اور نافرمانوں کو بھی آرام پہنچاتے ہیں اور ان سے کس قدر مستغنی ہیں کہ کسی عمل اور عبادت سے ان کا کچھ نفع نہیں نفع جو کچھ ہے بندہ ہی کا ہے اسی لئے حق تعالیٰ جب یہ دیکھتے ہیں کہ بندہ کام کر کے تھک گیا ہے اس پر خود ہی نیند کو مسلط کر دیتے اور اسکے عمل کو کچھ دیر کے لئے معطل کر دیتے ہیں تاکہ صحت حاصل کر کے اپنی صحت کو بحال رکھ سکیں۔

قولہ الوجہ الثالث عشر فیہ دلیل علی استغناء اللہ تعالیٰ عن عبادۃ العباد الیٰ قولہ ما ارحمہ بعبیدہٖ واغناہ عنھم

ف اللہ تعالیٰ کی صفت استغنا وہ صفت ہے جس کی وجہ سے مسلمان کو باوجود اپنی کوتاہی اور فروگذاشت کے رحمت و مغفرت کی امید رہتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری عبادت پر میرے مولیٰ کا کوئی نفع یا غرض موقوف نہیں اور میری معصیت سے ان کا کچھ نقصان نہیں ہوا نفع یا نقصان جو کچھ ہے وہ میرا ہی ہے تو اللہ تعالیٰ میرے اوپر ان آقاؤں کیطرح غصہ نہ کریں گے جن کا نفع نقصان نوکر کی خدمت یا نافرمانی سے وابستہ ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا غصہ ایسا ہوگا جیسا مہربان طبیب کا غصہ مریض پر ہوتا ہے جسکی اطاعت یا نافرمانی سے طبیب کا نفع و نقصان وابستہ نہیں ہوتا یا اس مہربان بادشاہ کی طرح جو اسکول کے طلبہ پر غصہ ہوتا ہے کہ وہ اسکول کے امتحان میں فیل کیوں ہوتے اور دونوں میں جو فرق ہے وہ کسی عاقل پر مخفی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی صفت استغنا سے مسلمان کو رحمت کا امیدوار ہونا چاہیئے مگر افسوس کہ بعض نادان اس صفت کو قہر کے معنے میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کی جوان موت پر لوگ افسوس کرتے ہیں کہ ہائے کیسا جوان مرگیا بیوی بچوں کا کچھ لطف نہ پایا دنیا کی بہار نہ دیکھی تو بعضے بوجھ بجھکڑ اس موقعہ پر فرمایا کرتے ہیں کہ بھائی اللہ کی ذات بڑی بے پروا ہے، اس موقعہ پر اللہ کو بے پرواہ کہنے کے معنے یہ ہیں کہ ان کو کسی پر رحم نہیں نہ کسی کی مصلحت کا لحاظ ہے۔ استغفر اللہ نعوذ باللہ

اللہ تعالیٰ سے زیادہ رحیم کون ہوگا ؟ کہ سو سال کے گنہگار اور ہزار سال کے نافرمان کافر کو بھی ایک منٹ میں استغفر اللہ اور لا الٰہ الا اللہ کہنے سے ایسا پاک کردیتے ہیں کہ گویا اس نے کچھ کیا ہی نہ تھا اور ان سے زیادہ کون مہربان ہوگا جو دوست دشمن سب کو روزی دیتے اور میٹھی نیند سلاتے ہیں اور سوتے ہوئے اپنے بندوں کی اس طرح حفاظت فرماتے ہیں کہ ماں باپ بھی ایسی حفاظت نہیں کرسکتے اور ان سے زیادہ بندوں کی مصلحت کا کون لحاظ کرے گا۔ جس نے ہوا پانی کو جس پر جان دار

کا مدار ہے سب کے لئے مفت کر دیا اور نیند کو اپنے قبضہ میں رکھا ہے۔ بندے کے اختیار میں نہیں دیا۔ رہا کسی کا بچپن یا جوانی میں مرجانا تو اس کو نادان لوگ خلاف مصلحت سمجھتے ہوں تو سمجھا کریں، اللہ تعالیٰ اس کی مصلحت کو تم سے زیادہ سمجھتے ہیں ایک مصلحت تو یہی ظاہر ہے کہ اگر جوانوں کو موت نہ آیا کرتی بوڑھے ہی مرا کرتے تو جوان موت سے بے فکر ہو کر وہ حرکتیں کیا کرتے کہ تمام عالم فساد سے بھر جاتا۔ جوانوں کو نیک اعمال کی طرف رغبت بھی کم ہوتی کہ ابھی کیا جلدی پڑی ہے بڑھاپے میں اللہ کو راضی کرلیں گے۔

مگر اب ہر شخص کو موت کا ڈر لگا ہوا ہے تو جوان بھی بہت ایسے ہیں جن کو طاعات کا اہتمام اور معاصی سے اندیشہ ہے۔ ہر روز توبہ اور استغفار کی ضرورت ان کے دل میں جمی ہوئی ہے کہ شاید کل ہی موت آ جائے تو گناہ سے پاک ہو کر آئے اور اگر بچوں کو موت نہ آیا کرتی بلکہ جتنے بچے پیدا ہوتے سب ہی زندہ رہا کرتے تو آج دنیا میں بسنے کو جگہ بھی نہ ملتی کیونکہ پیدائش کا سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ باوجود شرح اموات زیادہ ہونے کے بھی لوگوں کو دنیا تنگ نظر آتی ہے اور نہ معلوم اس میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنی مصلحتیں ہوں گی غرض اللہ تعالیٰ کے مستغنی ہونے کے معنے یہ ہیں کہ ان کو کسی کی عبادت کی ضرورت نہیں نہ ان کا اس سے کوئی نفع اور نہ کسی کی معصیت سے ان کا کوئی نقصان خوب سمجھ لو ۱۲ مترجم

خاتمہ مشتمل بر نصیحت

حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ میں ہدایت کی طرف نا سمجھ لوگوں کو کتنا پکار رہا ہوں اور عقل کے بہروں کو کس قدر نصیحت کر رہا ہوں مگر وہ خواہش پہ فریفتہ ہیں، حالانکہ خواہش پر جما رہنا

باوجود ضعف کے، جسم کے لئے بیماری ہی بیماری ہے۔ پس اپنے دین کے
بیمار بدن کو خالص توبہ کا دروازہ کھٹکھٹانے سے تندرست بنا۔

کیونکہ کمزور بدن میں بیماریوں کا جمع ہونا سل اور دق ہے اور
وہ تجھ کو ہلاک کر دیگا۔ تیرا بھلا ہو تو بیدار ہے یا سو رہا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں غفلت کی نیند سے بیدار کرے اور
ہمارے دلوں کو نسیم محبت سے حیات بخشے اور ہمارے دین کے کمزور حواس
کو طاعت کی تریاق سے قوت دے کہ وہی فضل فرمانے والا احسان کرنیوالا ہے
۔



باب بست ویکم ۲۱

حدیث

غسل المنی من الثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے سے منی کو دھویا کرتی تھیں پھر فرماتی ہیں کہ میں کپڑے میں اس کا دھبہ یا چند دھبے دیکھتی تھی۔

شرح ظاہر حدیث بتلاتا ہے کہ منی کو دھونا چاہیئے اور اس کا دھونا بتلاتا ہے کہ منی ناپاک ہے اور یہی امام مالکؒ اور ان کے اتباعؒ کا مذہب ہے، (حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے) اور اس حدیث پر چند وجوہ سے گفتگو ہے۔

(۱۶۰) ضرورت شرعیہ کے موقع پر شرمناک امور کا تذکرہ جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جس چیز کے تذکرہ سے شرم لاحق ہوتی ہو ضرورت کے وقت اس کا تذکرہ جائز ہے، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے منی کا ذکر فرمایا ہے حالانکہ اس کا ذکر شرمناک ہے کیونکہ وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے جس کو قرآن اور حدیث نے کنایۃً بیان کیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے ھن لباس لکم و انتم[عہ]

عہ اس سے حالت مباشرت کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

لباس لہن عورتیں تمہارا لباس ہیں تم ان کا لباس ہو اور حدیث میں ہے۔ حتیٰ تذوقی عسیلتہ و یذوق عسیلتک[عہ] یہاں تک کہ تو اس کا مزہ لے لے اور وہ تیرا مزہ لے لے، لیکن حضرت عائشہ نے احکام کی توضیح کے لئے اس کا ذکر صاف صاف فرما دیا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

نعم النساء نساء الانصار لم یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین۔

کیسی اچھی عورتیں ہیں انصار کی عورتیں کہ ان کو حیاء (و شرم) دین کی سمجھ حاصل کرنے سے مانع نہیں ہوتی۔

قولہ الوجہ الثالث دلیل علیٰ جواز ذکر ما یخجل ذکرہ الیٰ قولہ ان یتفقھن فی الدین

ف: بعض صوفیہ کے کلام میں فحش حکایات اور فحش امثال جو وارد ہیں ان کا یہی محمل ہے کہ ان حکایات و امثال سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ بہت ضروری بات تھی اور اس کے لئے اس سے بہتر عنوان سمجھانے کی نہ تھی اور مسائل شرعیہ میں منی یا ہمبستری اور حیض و نفاس کا ذکر تو جس ضرورت سے کیا جاتا ہے اس پر یہ حدیث پوری روشنی ڈالتی ہے اور اس قسم کی حدیثیں ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں، پس اگر بہشتی زیور میں ایسے مسائل کا ذکر آ گیا ہے جن کی عورتوں کو سخت ضرورت پڑتی ہے تو کیا جرم ہوا مگر جن کو دین کی ضرورت اور اس کا اہتمام ہی نہ ہو وہ اسکے متعلق جو چاہیں کہیں مگر دل میں یہ سوچ لیں کہ وہ ان احادیث اور کتب فقہ کے متعلق کیا کہیں گے جن سے بہشتی زیور میں یہ مسائل لئے

[عہ] یہ ایک عورت کے مقدمہ میں ہے جس کو پہلے شوہر نے تین طلاق دے دی تھی اور وہ دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس سے طلاق لے کر پہلے شوہر کے نکاح میں جانا چاہتی تھی حضور نے فرمایا کہ دوسرے شوہر سے علیحدگی اسوقت تک معتبر نہ ہوگی جب تک وہ ہمبستری کے بعد طلاق نہ دے اگر اس سے پہلے طلاق ہوئی تو دوسرے شوہر سے نکاح درست نہ ہوگا

گئے کیونکہ اگر ہندوستان کی عورتیں ان کو نہیں سمجھتی ہیں تو عرب اور مصر و شام کی عورتیں تو ان کو ویسا ہی سمجھتی ہیں جیسا ہندوستان کی عورتیں بہشتی زیور کو۔ اللہ تعالیٰ ان معترضین کو ہدایت دے کہ ہنر بھی ان کی نظر میں عیب ہی معلوم ہوتا ہے ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

(۱۶۱) پاکی ناپاکی کے معاملہ میں شریعت نے سہولت رکھی ہے

کاوش کو پسند نہیں کیا

حدیث میں نجاسات کے معاملہ میں سہولت اور تیسیر پر بھی دلالت ہے اور یہ کہ ہم اسی بات سے مکلف ہیں جو ہم کو نظر آجائے اور نفس کو احتمالات کے درپے نہ ہونا چاہیے کیونکہ حضرت عائشہ کپڑے کا وہی حصہ دھوتی تھیں جہاں منی نظر آتی حالانکہ یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ شاید کپڑے میں کسی اور جگہ بھی لگ گئی ہو اور نظر نہ آئی ہو اس احتمال پہ سارا کپڑا دھونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا) اسکی زیادہ توضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہوتی ہے

النضح طہور لا شک فیہ

اشک کی جگہ پر پانی کا چھڑک دینا بھی پاک کر دیتا ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ اس جگہ پانی چھڑکنے کا اس کے سوا کیا فائدہ ہے کہ دل کی کھٹک جاتی رہے اور جس ناپاکی کا یقین نہیں ہے وہ معاف ہو جائے کیونکہ ناپاکی اگر کپڑے کے اس حصہ کو لگ چکی ہے تو محض پانی چھڑکنے سے وہ زائل نہیں ہو سکتی جب تک اچھی طرح دھو کر نچوڑا نہ جائے اور اگر نہیں لگی تھی تو پانی چھڑکنے سے پاکی میں کچھ زیادتی نہیں ہوئی۔

قولہ الوجہ الرابع فیہ دلیل علی التیسیر فی امر النجاسات الی قولہ فلیس المہار یزید فی طہارتہ شیئًا

ف حاصل یہ ہوا کہ جس جگہ ناپاکی لگنے کا یقین ہو جائے اس کو اچھی طرح دھو دینا چاہیے جہاں شبہ ہو وہاں معمولی طور سے پانی چھڑک دینا چاہیے تاکہ دل کی کھٹک دور ہو جائے

یہاں سے ان صوفیوں کی غلطی واضح ہوگئی جو پاکی ناپاکی کے معاملہ میں بہت کاوش کرتے ہیں ذرا سے شبہ میں سارے کپڑے کو دھوتے اور تمام بدن کو گھڑوں پانی سے پاک کرتے ہیں اس کاوش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وسوسہ اور وہم بڑھ جاتا ہے تو بعض دفعہ بلکہ اکثر اوقات ان وہمیوں کو جماعت کی نماز بھی نہیں ملتی اور بعض کی تو نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔

خدا اس جہل سے بچائے اور وسوسہ اور وہم کو کسی پر مسلط نہ کرے کہ ایسا شخص ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ کبھی حلاوت کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا شیطان نے ان کا ناک میں دم کر رکھا ہے مگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑا کام کر رہے ہیں ہم سے زیادہ کسی کو طہارت کا اہتمام نہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس غلو نے ان کو نماز کی حلاوت ہی سے محروم کر دیا ہے جس کے لئے وضو اور غسل وغیرہ شرط کے درجہ میں ہیں۔ پس شرط کا اتنا اہتمام جس سے اصل مقصود ہی جاتا رہے کہاں کی بزرگی ہے ۱۲ مترجم

عورت کو شوہر کی خدمت کرنا جائز ہے

(۱۶۲) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شوہر کو بیوی سے خدمت لینا یا عورت کو شوہر کی خدمت کرنا جائز ہے جب کہ وہ خوشی سے کرے گو وہ کیسی ہی معزز خاندان کی ہو، یہ مسئلہ حدیث کے اس لفظ سے ماخوذ ہے کنت اغسل یعنی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں حضور کا کپڑا دھویا کرتی تھی اور ظاہر ہے کہ کپڑا دھونا خدمت ہی میں داخل ہے اور حضرت عائشہ کو جیسی رفعت حاصل تھی وہ ظاہر ہے۔

قولہ الوجہ السابع فیہ دلیل علی خدمۃ المرأۃ زوجہا الی قولہ وای رفعۃ مثل رفعۃ ھذہ السیدۃ۔

ف صوفیہ کا مذاق اس باب میں مختلف ہے بعضے اپنی بیویوں سے خدمت لینا گوارا کرتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ وہ خوشی سے خدمت کرتی ہیں۔

بعضے اس کو گوارا نہیں کرتے کو وہ جانتے ہیں کہ بیوی خوشی سے خدمت کرتی ہے مگر احتیاطاً اس سے پرہیز کرتے ہیں کہ شاید کسی وقت گرانی ہو اور شرما شرمی خدمت کرے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو اپنی خدمت کو بیوی کے ذمہ واجب سمجھتے ہیں حالانکہ بیوی خدمت کے لئے نہیں بلکہ محض انس حاصل کرنے اور استمتاع کے لئے ہے۔

قال تعالیٰ ھن لباس لکم وانتم لباس لھن
وقولہ خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا
الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ۱۲ مترجم



باب بست ودوم ۲۲

حدیث

غسل دم المحیض

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ہم میں سے کسی کو حیض آتا تو حیض ختم ہونے کے بعد پاکی کے وقت وہ خون کو اپنے کپڑے سے کھرچ دیتی پھر اس کو دھو ڈالتی اور باقی کپڑے پر پانی چھڑک دیتی پھر اس میں نماز پڑھتی۔

شرح ظاہر حدیث خونِ حیض کے دھونے کو بتلا رہا ہے جس سے اس کا ناپاک ہونا معلوم ہوا اور یہ کہ جس کپڑے میں عورت کو حیض ہوا ہو اس میں دھونے کے نماز پڑھ سکتی ہے۔ اس حدیث پر چند وجوہ سے گفتگو ہے:

(۱۶۳) یہ ارشاد کہ خون کو کپڑے سے کھرچ دیتی، اس لئے ہوا کہ خون کو کپڑے سے چھڑانے کا یہ طریقہ آسان ہے۔ چنانچہ مشاہد ہے۔ کیونکہ دلدار نجاست کا اوّل کھرچ دینا بہتر ہونا زیادہ مفید ہے۔ اگر کھرچنے سے پہلے اس پر پانی بہایا جائے گا تو کپڑے میں ناپاکی زیادہ پھیل جائے گی اور اس پر چند فقہی مسائل مرتب ہوتے ہیں

منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ دلدار ناپاکی کے دھونے کا بہترین طریقہ بلکہ سنت یہ ہے کہ دھونے سے پہلے اس کو کھرچ دیا جائے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام امور میں سنت یہ ہے کہ آسان طریقہ اختیار کیا جائے چونکہ یہ صورت نجاست دور کرنے کی آسان صورت تھی اس لئے حضرت عائشہ نے اس کو اختیار فرمایا اور دوسروں کو بھی بتلا دیا تاکہ اس میں انکی اقتدا کی جائے، اسکی تائید ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار الیسر ھما مالم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی دو صورتوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے دونوں میں سے آسان کو پسند فرمایا بشرطیکہ گناہ نہ ہو اور اگر گناہ ہوتی تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے تھے۔

الوجہ الرابع قولہا ثم تقرض الدم والوجہ الخامس یؤخذ منہ ان السنۃ فی الامور ان یؤخذ بالایسر الیٰ قولہ کان ابعد الناس منہ

ف یہاں ایک شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ جب حضور کو دو صورتوں کا من جانب اللہ اختیار دیدیا گیا تو ان میں سے کسی کا گناہ ہونا کیونکر ممکن ہے ورنہ لازم آئے گا کہ حق تعالیٰ نے گناہ کا بھی اختیار دیا۔ جواب یہ ہے کہ بعض دفعہ کوئی صورت خود تو گناہ نہیں ہوتی مگر گناہ کی طرف مفضی ہوجاتی ہے حضور اس سے بھی دور رہتے تھے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت حضور کا امتحان لیا گیا ہو اور امتحان کے وقت دونوں صورتیں جائز ہوں مگر آئندہ ان میں سے ایک صورت گناہ ہوکر میں داخل ہونیوالی ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی دور رہتے تھے جیسا حدیث میں

ہے کہ شب معراج میں آپ کے سامنے دو پیالے پیش کئے گئے ایک میں دودھ تھا ایک میں شراب تھی اور اس وقت تک شراب حرام نہ تھی مگر حضور نے دودھ کو اختیار فرمایا شراب کو واپس فرمادیا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ف یہاں یہ شبہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے

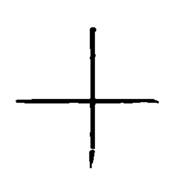
افضل العبادات احمزھا و فی النھایۃ لابن الاثیر عن ابن عباس بلفظ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای الاعمال افضل قال احمزھا ای اقواھا و اشدھا کذا فی المقاصد الحسنۃ ص۳۳

یعنی اعمال میں افضل وہ ہے جو زیادہ دشوار اور سخت ہو، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آسان کو کیوں اختیار فرماتے ۔

اگر یہ حدیث[ع] ثابت ہو تو جواب یہ ہے کہ آسان کام بھی ہر وقت آسان نہیں ہوتا بعض وقت دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح جماعت سے نماز پڑھنا فی نفسہ آسان ہے مگر بعض دفعہ سردی وغیرہ کی وجہ سے دشوار ہو جاتا ہے۔ پس سردی کا وضو گرمی کے وضو سے افضل ہے ۔ اسیطرح سردی کے موسم میں عشاء و صبح کی جماعت گرمی کی جماعت سے افضل ہے ۔ خلاصہ یہ کہ آسان کام بھی پابندی کی وجہ سے بعض اوقات دشوار ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس عمل کو اختیار فرما لیتے تھے اس کی پوری پابندی فرماتے تھے خواہ نفس کو راحت ہو یا تکلیف، پس تکلیف کی حالت میں معمولات کی پابندی کرنا راحت کی پابندی سے افضل ہے ۔ پس اعمال میں دشوار اور سخت کا افضل ہونا یا اس معنی ہے کہ عمل کی پابندی کرنا افضل ہے کیونکہ پابندی نفس کو گراں ہے گو عمل آسان ہی ہو ۔ دوسرے یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ مقاصد میں

عہ اس حدیث کے ثبوت میں کلام ہے جیسا مقاصد حسنہ میں مذکور ہے ۱۲ ظ

تو افضل وہ ہے جو دشوار اور شاق ہو اور وسائل میں افضل وہ ہے جو آسان ہو کیونکہ وسائل خود مقصود نہیں ہوتے مثلاً سردی کے موسم میں حمام کے اندر گرم پانی بھی موجود ہے اور حوض میں ٹھنڈا پانی بھی موجود ہے تو اس وقت گرم پانی سے وضو کرنا افضل ہے خواہ مخواہ ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہر سردی میں کھڑا ہو کر تہجد پڑھنا دشوار ہے اور بیٹھ کر پڑھنا آسان ہے تو یہاں کھڑا ہو کر پڑھنا افضل ہے کیونکہ نماز مقاصد میں سے ہے واللہ تعالیٰ اعلم والجواب الثانی من افاضات حضرۃ سیدی حکیم الامۃ دام مجدہ وعلاہ۔



باب بست و سوم ۲۳

حدیث

كيفية الاغتسال من الحيض

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک انصاری عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ حیض کے بعد میں کیونکر غسل کروں فرمایا نہانے کے بعد کپڑے کے ٹکڑے کو مشک سے آلودہ کرکے اس سے صفائی کر لیا کرو، تین بار فرمایا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرما گئے اور اپنا منہ منہ پھیر لیا یا منہ پھیر کر فرمایا کہ اس سے صفائی کر لیا کرو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں پھر میں نے اس عورت کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب اسکو سمجھا دیا۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ خون حیض میں خاص قسم کی بدبو ہوتی ہے جو نہا پانی سے زائل نہیں ہوتی بلکہ اسکے لئے مشک وغیرہ کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور مشک خصوصیت کیساتھ رحم کے لئے مقوی بھی ہے اس حدیث میں چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۶۴) جہاں توضیح کی ضرورت ہو وہاں صفائی سے حکم شرعی بیان کیا جائے شرم نہ کی جائے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جن چیزوں کا حکم بدون وضاحت کے معلوم نہ ہو سکتا ہو ضرورت کی وجہ سے اس کو مجبوراً بیان کیا جائے گا اگرچہ اس کے ذکر سے شرم آتی ہو یا اس کا ذکر ناگوار ہو۔

قولہ الوجہ الثالث فیہ دلیل علی ان الامور التی لا یمکن معرفۃ الحکم فیھا الیٰ قولہ فلا بد من اجل الضرورۃ

ف حضرات صوفیا اس سنت پر عامل ہیں وہ ضرورت کے مقام پر عرفی شرم کی رعایت نہیں فرماتے بلکہ احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحیٔ بڈہانوی رحمۃ اللہ علیہ سفر میں بہلی پر سوار تھے۔ آپ کی اہلیہ بھی ہمراہ تھیں نماز کا وقت آیا تو بیوی کو بہلی سے اتارا اور برقعہ پہنا کر نماز پڑھائی پھر با آواز بلند فرمایا کہ صاحبو! یہ عبدالحیٔ کی بیوی ہے دیکھ لو نماز کے واسطے اتری ہے یہ کہنا تھا کہ سارے قافلہ کی عورتیں بہلیوں سے اتر اتر کر زمین پر نماز پڑھنے لگیں ورنہ سب گاڑی ہی میں نماز پڑھ لیتیں زمین پر نہ اترتیں۔ پس گو مولانا کا یہ فرمانا کہ یہ عبدالحیٔ کی بیوی ہے دیکھ لو عرفاً شرمناک تھا مگر ضرورت تبلیغ احکام کے لئے آپ نے اس کو گوارا فرمایا۔

(۱۶۵) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑوں کے سامنے چھوٹوں کا کسی کو تعلیم و تلقین کرنا جائز ہے لیکن یہ اس وقت ہونا چاہیئے جبکہ بڑے نے حکم بتلا دیا ہو مگر مخاطب نہ سمجھا ہو تو چھوٹا اس کو سمجھا دے تو یہ دراصل ان کی خدمت کی قسم سے ہوگا خصوصاً ایسی بات میں جس کی تفصیل سے بڑے کو شرم آتی ہو اور چھوٹے کو شرم نہ آتی ہو کیونکہ عورتیں آپس میں باتیں کرتے ہوئے نہیں شرماتیں جیسا مردوں سے بعض باتوں میں شرماتی ہیں۔

قوله الوجه السابع یوخذ منه تعلیم المفضول بین یدی الفاضل الی قوله کما یقع من حدیث انس الخ

(۱۶۵) انسان کو اپنے عیوب چھپانے چاہئیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے عیوب چھپانے چاہئیں اگرچہ وہ فطری ہی کیوں نہ ہوں یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ پوچھنے والی کو یہ ارشاد فرمایا کہ خون حیض کی بدبو کو مشک کے ذریعہ سے دور کرنا چاہئے حالانکہ یہ بدبو فطری اور غیر اختیاری ہے اس کو بھی خوشبو چھپانے کا حکم ہوا مگر اس میں شرعاً یہ قید بھی ہے کہ عیب کا چھپانا اسی طریقہ سے ہو جس کی شریعت اجازت دے مکر وفریب یا جھوٹ اور ناجائز طریقہ سے نہ ہو کہ اسکی اجازت نہیں۔ ہمارے اس قول کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو آپ نے ایک شخص کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا

اذا غضبت فاسکت کہ جب تم کو غصہ آیا کرے خاموش ہو جایا کرو۔

کیونکہ غصہ عیب ہے اور خاموشی اس کے لئے پردہ ہے یہ نہیں فرمایا کہ جب تم کو غصہ آیا کرے تو غصہ کا اقرار نہ کرو بلکہ انکار کر دیا کرو یا اپنی بات کو بنایا کرو کیونکہ یہ طریقہ ناجائز ہے اور اگر تلاش کرو گے تو شریعت میں تم کو اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی جن میں جائز طریقہ سے عیب کو چھپانے کا حکم ہے۔ اسی لئے حضرات صوفیہ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے نفس کی طرفداری نہیں کرتے اسکی خواہش کو پورا نہیں کرتے کیونکہ عقلاء کے نزدیک نفس کی خواہشیں عیب میں داخل ہیں تو اس عیب کو اس طرح چھپایا کہ نفس کی حمایت نہ کی اور اس کی خواہش پوری نہ کی یہاں تک کہ بعض بزرگوں کی نسبت نقل کیا گیا ہے کہ کسی نے ان کو گالی دی تو بات کو ٹال گئے۔ اس نے کہا میں آپ ہی کو تو کہہ رہا ہوں بزرگ

نے فرمایا کہ میں بھی تجھ ہی کو ٹال رہا ہوں اس قسم کی باتیں بزرگوں سے بہت منقول ہیں

قولہ الوجہ الثامن منہ دلیل علی ان المرأ مطلوب منہ ستر عیوبہ

الی قولہ وھذا عنھم کثیر۔

ف: یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو لوگوں کے سامنے اپنے گناہوں

کا تذکرہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب خدا سے پردہ نہیں تو مخلوق سے کیا پردہ اور

یہ نہیں سمجھتے کہ خدا ہی نے پردہ کا بھی حکم دیا ہے۔ اگر پہلے تم نے ایک گناہ کیا تھا

تو اسکو ظاہر کرکے دوسرا گناہ کیا اس لئے مخلوق سے پردہ کی ضرورت ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے گناہ اسکے

سامنے گنائیں گے اور وہ اقرار کریگا اور سمجھے گا کہ میں ہلاک ہوگیا پھر اللہ تعالیٰ

فرمائیں گے کہ جاؤ میں نے دنیا میں تمہاری پردہ پوشی کی رسوا نہیں کیا یہاں

بھی پردہ پوشی کرتا ہوں اور سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔

پھر حکم ہوگا کہ اس کو جنت میں لیجاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں پر پردہ

پڑا رہنا بھی بڑی نعمت ہے تو یہ کتنی بے حیائی ہے کہ انسان خود ہی اپنا پردہ کھولتا

پھرے۔ جب شریعت نے فطری عیوب کو چھپانے کا بھی حکم دیا ہے تو اختیاری

گناہ کا ظاہر کرنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟

ف: عیوب کو چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت ان کو ظاہر نہ کیا جائے

ضرورت کے موقعہ پر ظاہر کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً کسی کے پردہ کی جگہ پر زخم ہو

یا دمل ہو تو جراح یا ڈاکٹر کے سامنے اس کو کھولنا جائز ہے اسی طرح کسی کے

دل میں دنیا کی محبت یا گناہوں کی رغبت ہے یا حرص وحسد وکبر وریا کا

مرض ہے تو شیخ مصلح کے سامنے اظہار کی اجازت ہے بلکہ ضرورت ہے لیکن اس

کے سامنے صرف مرض کو ظاہر کرنا چاہیئے۔ واقعات کو ظاہر نہ کیا جائے مثلاً یوں نہ کہے

کہ میرے دل میں گناہوں کی رغبت ہے اس لئے میں نے ایسے ایسے کام کئے اور فلاں

سے یوں کیا فلاں کے ساتھ اسطرح تعلق رکھا کیونکہ امراض کے بتلانے میں واقعات

کی تفصیل کو کچھ دخل نہیں صرف اجمالی بیان کافی ہے۔ البتہ اگر شیخ اس مرض کا درجہ معلوم کرنے کے لئے تفصیل دریافت کرے اور اسکی ضرورت سمجھے تو اسوقت تفصیل کی بھی اجازت ہے جیسا جراح کے سامنے پردہ کی جگہ کا زخم کھولنا جائز ہے۔ خوب سمجھ لو ۱۲ مترجم

ف اپنے نفس کی طرفداری کرنا سخت مرض ہے ایسا شخص کبھی اصلاح نفس سے کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ وہ شیخ کے سامنے بھی اپنے عیوب کی تاویل کرتا ہے اور غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔ مرد وہ ہے جو ہمیشہ اپنے نفس سے بدگمان رہے اسکی طرفداری نہ کرے اور غلطی کا اعتراف کرنے میں ذرا تامل نہ کرے۔ علماء ظاہر اور طلبہ میں اپنی بات کی پچ اور نفس کی طرفداری کا مرض زیادہ ہوتا ہے الا من عصمہ اللہ تم دیکھو گے کہ بہت سے علماء اس وقت ہندوستان میں اپنی سیاسی غلطی کو سمجھ چکے ہیں، ان کا ضمیر جانتا ہے کہ جس راہ وہ چل رہے ہیں اسلام اور مسلمانوں کے لئے سخت مضر ہے وہ مسلمانوں سے کٹ کر مشرکوں میں جا ملے ہیں اپنی اسلامی جماعت کو بدنام کرتے ہیں اور کافروں کی جماعت کو قوت پہنچا رہے ہیں اور جس آزادی کا راگ وہ گا رہے ہیں اسکی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ اکثریت آزاد ہوگی اور اقلیت غلام۔ یعنی مشرکین آزاد ہوں گے اور مسلمان محکوم و غلام ہوں گے مگر بات کی پچ اور نفس کی طرفداری ان کو حق کی طرف آنے سے مانع ہے

فالی اللہ المشتکی



باب بست وچہارم ۲۴

حدیث

خلق الجنین فی بطن امہ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے رحم پر ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے جب اس میں مرد کا نطفہ پہنچتا ہے، وہ کہتا ہے اے رب نطفہ ہے، اے رب علقہ[ع] بن گیا ہے، اے رب مضغہ[ع] بن گیا ہے پھر جب اللہ تعالیٰ اسکی خلقت کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو فرشتہ عرض کرتا ہے اے رب لڑکا ہے یا لڑکی، بد بخت ہے یا نیک بخت پھر پوچھتا ہے رزق کی مقدار کیا ہے، پھر پوچھتا ہے عمر کتنی ہے، پس یہ سب اسکی ماں کے پیٹ ہی میں لکھ دیا جاتا ہے۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ اللہ عزوجل نے رحم پر ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کو جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں بچہ کی ہر حالت کی اطلاع کرتا ہے جب وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اسکی کمال پیدائش تک پورا ہو جائے اس پر

ع جما ہوا خون ۱۲

ع گوشت کی بوٹی ۱۲

چند وجوہ سے گفتگو ہے۔

(۱۶۶) اللہ تعالیٰ کا لطف اس وقت ہمارے شامل تھا جب ہمیں اپنی خبر بھی نہ تھی

اس حدیث میں دلائل ایمان اگر غور کرو گے بہت ہیں۔ رہا اس سوال کا جواب کہ ان امور کی ہمیں خبر دینے میں کیا حکمت ہے اور اس پر کیا احکام شرعیہ مرتب ہوتے ہیں؟ تو من جملہ اور حکمتوں کے ایک یہ ہے کہ اس میں ہماری ابتداء پیدائش کو اور ہمارے ضعف کو بتلایا گیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ہمارے اوپر کیسا لطف و کرم ہے اور اس کے الطاف کس طرح ہم کو گھیرے ہوئے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کرام کو تمام احوال میں ہمارے لئے مسخر فرمادیا ہے (یعنی ان کو ہمارے کام میں لگا رکھا ہے) ہماری عقل و شعور کی حالت میں بھی اور بے عقلی و عدم شعور کی حالت میں بھی چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے۔

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ

اللہ نے تمہارے لئے ان چیزوں کو مسخر فرمادیا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور زمینوں میں (یعنی سب کو) اپنے احسان و فضل سے (تمہارے کام میں لگا رکھا ہے) اس میں لطیف پیرایہ سے بندہ کو عبادت کی طرف بلایا گیا ہے اور اس کے لئے دلوں کو کھول دیا گیا ہے کیونکہ جب بندہ دیکھتا ہے کہ اس جلیل الشان آقا کا جو غنی اور مستغنی ہے مجھ پر اس قدر لطف و کرم ہے تو عبادت اس پر آسان ہو جاتی اور اس بادشاہ کے دربار میں پہنچنے کی طلب اور رغبت پیدا ہوتی ہے جس نے ایسے وقت میں اس کو معزز فرمایا ہے جب یہ اپنے آقا کو جانتا بھی نہ تھا نہ اس کی عبادت کرتا تھا پھر اب کیا کچھ لطف ہوگا جب یہ اسکی عبادت کرتا ہے اور اس کے بعد جب حق تعالیٰ کا یہ ارشاد سنتا ہے

ان الذین امنوا وعملوا الصلحت اولئک ھم خیر البریۃ

کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے یہی تمام مخلوق سے بہتر ہیں
تو حیا اور محبت اور اشتیاق و رغبت و ہیبت سے پگھل جاتا ہے۔

قولہ الوجہ الثالث فیہ من الادلۃ الایمانیۃ اذا تاملت جمل کثیرۃ
الیٰ قولہ ذاب حیاء وحبا و اشتیاقا ورغبۃ وھیبۃ"

ف مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف او ناگفتۂ ما می شنود

اللہ تعالیٰ کی عنایات و الطاف ہمارے اوپر اس وقت سے ہیں جب کہ ہم
کو اپنی خبر بھی نہ تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کو اپنی پوری خبر اب بھی نہیں،
کیونکہ انسان جسم کا نام نہیں بلکہ روح کا نام ہے اور روح کی حقیقت کسی کو آج تک
معلوم نہیں یہ ایک سربستہ راز ہے جسکی خبر انبیاء علیہ السلام کو ہو تو ہو بس
اللہ ہی کو ہماری حقیقت کی خبر ہے اور وہی اپنی مہربانی سے ہماری تمام ضروریات کا
انتظام فرماتے ہیں مگر انسان کس قدر غافل ہے کہ دنیا بھر کو راضی کرنے کی فکر میں
ہے اپنے مولا کو راضی کرنے کی فکر نہیں کرتا جس نے اس کو پیدا کیا۔ اور اس کے اندر
روح ڈالی جسکی وجہ سے تمام عالم پر اسکی حکومت ہے مگر یہ نادان سمجھتا ہے کہ میں اپنی
عقل اور تدبیر سے سب کچھ کرتا ہوں حالانکہ اس کو اب تک یہ بھی خبر نہیں کہ عقل
ہے کیا چیز اور وہ کیونکر اسکی رہنمائی کرتی ہے ؎

انت کالریح ونحن کالغبا عینھا تخفی وغبراھا جھار

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم حملہ شاں از باد باشد دمبدم

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد ہر کہ ناپیداست یارب کم مباد

اے ازدل ما۔ یہ مضمون تصوف اور سلوک کی جڑ ہے سالکین کو ہر وقت اسے
پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

(۱۶۷) انسان کی پیدائش جن طبقات سے گذر کر ہوتی ہے اسمیں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت کا ظہور ہے

ان تغیرات وادوار میں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہماری پیدائش کو شروع کیا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہمارے اندر اور تمام مخلوقات کے اندر ظاہر ہوتی ہے اور عقل کی رسائی کو اس قدرت کے ادراک سے روک دیا گیا ہے سوا اس حصہ کے جس تک رسائی اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور جس کی یہ قدرت ہے اس نے اپنی ذات وصفات کے احاطہ سے مخلوق کی امید کو قطع کر دیا ہے

تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا

اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک اور بلند ہے جو ظالم لوگ کہتے ہیں

کہ بعض لوگ اس کے لئے جہت ومکان وغیرہ صفات اجسام ثابت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ ان مخفی تغیرات میں جو بحالت نطفہ انسان پر طاری ہوتے ہیں اور اس حالت میں جو عقل وبلوغ اور حد تکلیف کو پہنچنے کے بعد ہوتی ہے کیا نسبت ہے؟ اس وقت یہ صورت حیوانیہ انسانیہ ہڈی اور مغز اور گوشت پوست اور رگوں بالوں اور جگر اور قوت اور عقل وفکر وشہوت اور ہر قسم کے تصرف اور پکڑنے کی طاقت پر اور ان تمام چیزوں پر جو حسن صنعت کو ظاہر کرتی ہیں مشتمل ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم

ہم نے انسان کو سب سے اچھی شکل وصورت میں پیدا کیا ہے. پھر اس پہلی حالت کو دوسری حالت سے اور پہلی پیدائش کو اس دوسری صورت سے کیا نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ پھلوں کی بابت فرماتے ہیں جب کہ وہ اچھی طرح پک جائیں

انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ

"دیکھو درخت کے پھل کو جب وہ پھل دیتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو"
مطلب یہ کہ ہے پھل کو اس حالت میں دیکھو جب وہ درخت سے نکلتا ہے
پھر اس وقت بھی دیکھو جب وہ اچھی طرح پک جاتا ہے تاکہ اس حالت کو پہلی
حالت سے اور درخت سے اگنے کی حالت سے کیا نسبت ہے۔ ہمارے مشاہدہ
میں تو یہ دونوں حالتیں متباین ہیں ایک کو دوسری سے کچھ بھی نسبت نہیں۔

پس گویا اللہ تعالیٰ اپنے نذر دار کلام کے مدلول سے یوں فرماتے ہیں کہ کیا تم
کو اتنی بھی خبر نہیں کہ یہ سب کچھ محض قدرت حق سے ہوا ہے نہ درخت کی جڑ سے
ہوا نہ پانی سے۔ پس اس کو دیکھو جس کی قدرت سے سب کچھ ہوا اسی کی طرف جھکو،
اسی کی اطاعت کرو (اسی کے حوالہ اپنے آپ کو کردو) پھر اس کے بعد بڑھاپے کی
حالت آتی ہے تو سارا معاملہ الٹ جاتا ہے، قوت ضعف سے بدل جاتی اور
تمام احوال میں کمال کی جگہ نقصان آجاتا ہے۔ باوجودیکہ جسم اپنی بناوٹ پہ
ہی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حالت کی خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے

ثم جعل من بعد قوۃ ضعفاً وشیبۃ

پھر اللہ نے قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا (انسان پر) مسلط کر دیا

عبرت لینے والوں نے اس سے عبرت لی نصیحت قبول کرنیوالوں نے نصیحت حاصل
کی اور غفلت والے جہالت کی تاریکیوں ہی میں رہ گئے ان کو بجز خواہش نفس
کے کچھ نظر نہیں آتا علوم و معارف کے بارہ میں وہ ایسے ہیں جیسے گدھا کتابیں کمر
پر لادے ہو، اور بعضوں کی تو یہ حالت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔

ان هم الا کالانعام بل هم اضل

کہ وہ بالکل جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بیوقوف اسی لئے اللہ جل جلالہ
فرماتے ہیں

وکاین من اٰیۃ فی السمٰوٰت والارض یمرون علیھا
وھم عنھا معرضون

"آسمانوں اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ لوگ گذرتے ہیں منہ پھیرتے ہوئے (بے رخی کرتے ہوئے) یعنی غافل ہو کر گذرتے ہیں (ان نشانیوں سے عبرت حاصل نہیں کرتے)

قولہ فی الوجہ الثامن و یترتب علی ھذا الاخبار بھذہ التطویرات الی قولہ ای غافلون

ف انسان کی ابتدائے خلقت ایسی عجیب ہے، کہ اگر روزمرہ مشاہدہ میں نہ آیا کرتی تو لوگ دور دور سے بچہ کو دیکھنے آیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی وحی میں اسی کی طرف ہم کو متوجہ کیا ہے

اقرأ باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق

اپنے رب کا نام لیکر پڑھو جس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا، انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا۔

ہر مسلمان کو عموماً اور سالکین کو خصوصاً ان حالات و تغیرات و تطورات میں غور کرنا اور ان سے عبرت حاصل کر کے معرفت کو ترقی دینا چاہیئے۔ اللہ اللہ انسان ابتدار میں کیا ہوتا ہے اور جوانی میں کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ پھر اس غفلت کو بھی دیکھو کہ انسان کتنی جلدی اپنی ابتدار کو بھول جاتا ہے اور جوانی کے غرور و تکبر میں مبتلا ہو کر خدا سے بالکل بے رُخ بن جاتا ہے گویا ان تلون میں تبدیل ہی نہیں!

اے انسان سوچ کہ تو اللہ کے ہاتھوں پیدا ہو کر پرورش پا کر کس پر جان فدا کرتا ہے اور کس کو بھولتا ہے؟ زمین و آسمان تیری اس غفلت کو دیکھ کر یوں کہتے ہیں ؎

وکنت اظن ان جبال رضوی ... تزول وان حبك لا يزول

ولكن القلوب لها انقلاب ... وحالات ابن آدم تستحيل

ہمارا تو یہ خیال تھا کہ پہاڑ ٹل جائیں گے مگر خدا کے ساتھ جو تجھے محبت ہے وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے گی مگر تجربہ نے بتلا دیا کہ قلوب میں بھی انقلاب ہوتا ہے اور

انسان کی حالتیں بدل جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو اس انقلاب اور تغیر سے محفوظ رکھے آمین

اللھم انی اعوذبک من الحور بعد الکور ومن العمی بعد الھدی بحرمۃ نبیک نبی الرحمۃ سید الوری صلے اللہ علیہ علیٰ الہ واصحابہ مصابیح الدجیٰ ومفاتیح الھدیٰ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا ۱۲ مترجم

(۱۶۸) رزق اور عمر مقدر ہو چکی ہے اس لئے رزق کے بارہ میں اجمالی کوشش کافی ہے کاوش نہ کرے

حدیث میں رزق اور عمر کا ذکر علی الترتیب سب سے آخر میں آیا ہے اس میں حکمت واللہ اعلم یہ ہے کہ فرشتہ اول تو بچہ کی صورت بنانے میں مشغول ہوتا ہے اور جیسا حکیم مطلق کو منظور ہوتا ہے اسی کے موافق شقاوت یا سعادت کے ساتھ اس کو بناتا ہے اسکے بعد رزق اور عمر کا ذکر آخر میں آیا ہے، یہ ترتیب عجیب ہے، جو مقتضائے حکمت کے موافق ہے کیونکہ ارادۂ حق میں اہم اور مقدم انسان کی پیدائش اور بناوٹ ہے تو اول اس کا ذکر کیا گیا اسی پر بچہ کا لڑکا یا لڑکی ہونا متفرع ہے اور دوسری صفات بھی مثلاً حسین ہونا بدشکل ہونا وغیرہ اور اسی پر شقاوت و سعادت طاری ہوتی ہے پھر رزق کا درجہ ہے جو موت سے مقدم ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

لن تموت نفس حتی تستکمل رزقھا فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب

ہرگز کسی کو موت نہ آئے گی جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ کرلے پس اللہ سے ڈرو اور طلب رزق میں اجمال سے کام لو (زیادہ کاوش نہ کرو)

اس کے بعد موت کا درجہ ہے تو اس کو سب سے آخر میں بیان کیا گیا، پس جب معاملہ نمٹ چکا ہے تو طلب رزق میں یا حرص کیسی ؟ کام تمام ہو چکا ہے نہ گھٹ سکتا ہے نہ بڑھ سکتا ہے، رزق اور عمر اور سعادت وغیرہ کا وہی حال ہے جو تذکیر و تانیث یعنی لڑکا اور لڑکی ہونے کا کہ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اس حقیقت کے سمجھ جانے ہی سے حضرات صوفیہ کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے وہ کسی چیز پر التفات نہیں کرتے اسی پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں جو ان کے اندر تصرف کر رہا اور ان پر لطف و کرم فرما رہا ہے جیسا دوسروں کو ذکوریت کے مبدل بہ انوثت ہونے کی طمع نہیں ہوتی نہ یہ تمنا ہوتی ہے کہ ذکوریت و انوثت باہم مل جائیں اسی طرح صوفیہ کو رزق اور عمر کے بارہ میں کوئی تمنا نہیں ہوتی نہ سعادت و شقاوت میں تبدیلی کی طمع ہوتی ہے وہ تو بس اس کام میں مشغول رہتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا گیا ہے۔ وہ اللہ کی عبادت و طاعت میں لگے رہتے ہیں قبول و نا قبول، سعادت یا شقاوت اور جنت و دوزخ سے ان کو کچھ بحث نہیں یہاں تک کہ بعض صوفیہ نے فرمایا ہے کہ اگر میں نے اللہ کی عبادت جہنم کے خوف یا جنت کی رغبت سے کی ہو تو اللہ تعالیٰ میرا حشر فرعون و ہامان کے ساتھ کرے بلکہ میں تو ان کی عبادت محض اس لئے کرتا ہوں کہ وہی عبادت کے لائق ہیں، سمجھدار کے لئے یہی بات حق بھی ہے اس کے متعلق بنی اسرائیل کے ایک عابد کا قصہ کافی ہے جس کو اس زمانہ کے نبی نے وحی الٰہی سے اطلاع دی تھی کہ وہ جہنم والوں میں سے ہے تو اس نے پہلے سے زیادہ عبادت بڑھادی اس پر اللہ تعالیٰ نے اس نبی پر دوبارہ وحی نازل فرمائی کہ اس عابد سے کہہ دو کہ جو اسکے جی میں آئے کرے وہ جنت میں شامل کر دیا گیا۔ اس نے پہلی وحی پر اپنے آپ کو ذلیل سمجھا اور عبادات سے نظر اٹھا کے اللہ کے فضل و کرم کا امیدوار بن گیا تھا اور رزق کے معاملہ میں بعض بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جب درویش اپنی معاش ہی پر نظر کرتا ہے کہ آج کتنے روپے پاس ہیں کل کو کہاں سے آنے کی امید ہے تو اسکی طریقت کا اللہ ہی حافظ ہے یعنی

اس کو طریق باطن کا حاصل ہونا دشوار ہے اس کے متعلق وہ حالت کافی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن بھوکا رہوں تو عاجزی ظاہر کروں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں تو شکر کروں (یعنی حضور نے دنیا کے خزانوں کو پسند نہیں فرمایا بلکہ شان توکل کو اختیار فرمایا یمن بن رزق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جب ماضی لوٹ نہیں سکتا اور مقدر بدل نہیں سکتا تو فکر کے بوجھ کو گردن سے پھینک دینا ہی سعادت عاجلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے ان لوگوں میں شامل کر دیں جو سعادت اور حمایت وحفاظت اور فہم وعمل وقبول سے سرفراز ہوئے اللہ کے سوا کوئی پروردگار نہیں وہی یہ دولتیں عطا فرمائیں تو کام بن جائیگا ورنہ دوسرا کون ہے یہ دولتیں عطا کر سکے۔

قولہ الوجہ العاشر فما الرزق فی الاجل الیٰ قولہ لا رب سواہ

ف مسئلہ قدر کی توضیح اور اہل حال و اہل مقام کے اقوال کی تشریح

یہ جو کہا گیا ہے کہ صوفیہ کو شقاوت وسعادت میں تبدیلی کی طمع نہیں ہوتی نہ ان کو جنت ودوزخ سے بحث ہوتی ہے یہ اہل حال کی باتیں ہیں ہم جیسوں کو ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں ہم کو تو اللہ تعالیٰ سے ہر وقت یہی دعا کرنا چاہیئے کہ اگر خدانہ کردہ ہماری تقدیر میں شقاوت ہو تو اپنے فضل وکرم سے اسکو مبدل بہ سعادت کر دیجئے اور اللہ تعالیٰ کو یہ کچھ دشوار نہیں دیکھو عابد بنی اسرائیل کے قصہ میں ہی اس کا ظہور ہو چکا ہے کہ اول اس کے متعلق یہ وحی آئی ہے کہ وہ جہنمی ہے کتنی ہی عبادت کرے اس کے لئے جہنم مقدر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے شقاوت کو سعادت سے بدل دیا اور دوبارہ وحی نازل ہوئی کہ اسکو جنتی کر دیا گیا، یہ ضرور ہے کہ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے جیسا کہ لڑکی کا لڑکا بن جانا اور لڑکے کا لڑکی بن جانا شاذونادر ہے مگر محال نہیں چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ مرد

عورت اور عورت مرد بن گئی اس لئے ناامید نہ ہونا چاہیئے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت ایمان سے مشرف فرمایا اور مسلمان گھرانے میں پیدا فرمایا ہے اس کے لئے تو بظاہر سعادت ہی مقدر ہے شقاوت مقدر ہوتی تو کسی کافر کے گھر پیدا ہوتا امید کے لئے یہی بات کافی ہے البتہ بے فکری کی کسی کو اجازت نہیں ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے اس لئے نہ خدا کی رحمت سے مایوس ہو نہ اس کی پکڑ سے بیفکر ہو

۵ غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را — در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش

ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ ارشاد فرمایا جف القلم بما ھو کائن جو کچھ ہونیوالا ہے قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے تو صحابہ نے عرض کیا ففیم العمل یا رسول اللہ پھر اب عمل کی کیا ضرورت رہی جو مقدر ہو چکا وہی ہو کر رہے گا حضور نے فرمایا اعملوا فکل میسر لما خلق لہ کام ضرور کرتے رہو کیونکہ جس کو جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے وہی کام آسان کر دیا جاتا ہے پس جس کے لئے طاعات آسان کر دی گئیں اس کو خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو سعادت کے لئے پیدا کیا ہے اور جس کے لئے گناہ آسان کر دیئے گئے کہ معاصی سے اس کو نفرت وانقباض نہیں ہوتا اس کو ڈرنا چاہیئے کہیں شقاوت کے لئے پیدا نہ کیا گیا ہو اور ڈر کر گناہوں سے توبہ کرنا اور طاعات کا اہتمام کرنا چاہیئے کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے جس کی اخیر حالت اچھی ہے وہ کامیاب ہے جس کی اخیر حالت بُری ہے اس پر ناکامی کا اندیشہ ہے -

جعلنا اللّٰہ ممن سعد فی بطن امہ وختم لنا بالحسنیٰ

آمین ۱۲ مترجم

ف مسئلہ قدر پر اشکال وجواب

یہاں یہ سوال ہوگا کہ جب تقدیر کے بعد بھی عمل کی

ضرورت ہے تو تعتدیر کا مسئلہ بیان کرنے سے کیا فائدہ ؟ جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان دنیوی معاملات میں ناکامی کے وقت زیادہ غمزدہ اور رنجیدہ نہ ہو بلکہ دل کو تسلی دے لے کہ مقدر یوں ہی تھا، تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جو طالب علم انتہائی محنت اور مشقت برداشت کرنے کے بعد بھی امتحان میں ناکام ہوتا ہے یا جو شخص اپنے کسی بیمار عزیز کی دوا دارو میں پوری کوشش ختم کر کے ناکام ہو جاتا ہے اس کی تسلی مسئلہ تقدیر ہی سے ہوتی ہے جو شخص اس مسئلہ کا معتقد نہ ہو گا وہ اکثر ایسے مواقع میں خودکشی کر لیتا ہے، نیز یہ فائدہ بھی ہے کہ انسان کامیابی کے بعد اپنے اوپر نظر نہ کرے بلکہ خدا پر نظر کرے کہ اللہ نے میرے مقدر میں کامیابی رکھی تھی اس لئے کامیاب ہوا خود کچھ نہیں کر سکتا تھا اگر مسئلہ تقدیر سامنے نہ ہو تو کامیابی کے بعد انسان فرعون بے سامان اور پورا شیطان بن جائے اور بھی نہ معلوم اسمیں کتنی حکمتیں ہیں جن کو اللہ ہی جانتا ہے بندہ اس کے اسرار کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

(ز) مسئلہ قدر ہمت کو پست نہیں کرتا بلکہ بلند کرتا ہے

یہاں سے ان لوگوں کی حماقت بھی واضح ہو گئی جو یہ کہا کرتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر نے مسلمانوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں یہ خود کچھ نہیں کرتے بس تقدیر کے بھروسہ پر بیٹھے رہتے ہیں کہ مقدر میں ہو گا تو کام خود ھی ہو جائے گا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ نے ہمتیں پست نہیں کیں بلکہ جہالت و ضعف ایمان نے ہمتیں پست کی ہیں اگر اس مسئلہ میں ہمتیں پست کرنے کی خاصیت ہوتی تو حضرات صحابہ و تابعین و تبع تابعین سب سے زیادہ پست ہمت ہوتے کیونکہ ان کا ایمان تقدیر پر سب سے زیادہ مضبوط تھا مگر تاریخ شاہد ہے کہ ان کی برابر بلند ہمت زمانہ کی آنکھوں نے آج تک دیکھا ہی نہیں پس یوں کہنا چاہیئے کہ مسئلہ تقدیر تو ہمت بلند کرتا ہے مگر جہل اور غفلت اور ضعف ایمان اس کو پست کر دیتا ہے کیونکہ اوپر معلوم

ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ تقدیر بیان فرمانے کے بعد عمل کی تاکید فرمائی ہے اور یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ جس شخص کا تقدیر پر ایمان ہوگا اس کی نظر اسباب و تدابیر پر نہ ہوگی بلکہ اللہ پر اور اللہ کی قدرت پر نظر ہوگی تو وہ معمولی سامان اور تدابیر کو بھی کامیابی کے لئے کافی سمجھ کر اللہ کے نام پر کھڑا ہو جائیگا نہ وہ اپنی قلت سے گھبرائے گا نہ سامان کی کمی سے اندیشہ لائیگا چنانچہ صحابہ کے واقعات اس پر شاہد عدل ہیں کہ بعض دفعہ تین ہزار نے دو لاکھ کا مقابلہ کیا اور ساٹھ آدمیوں نے ساٹھ ہزار کا منہ پھیر دیا اور جس کی نظر تقدیر پر نہ ہوگی محض تدبیر پر ہوگی وہ اس وقت تک ہمت بلند نہیں کر سکتا جب تک سامان پوری طرح کامل و مکمل نہ ہو۔

باب بست و پنجم

حدیث

جواز الصلوٰۃ فی السفینۃ

حضرت جابر بن عبداللہ و ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دونوں نے کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور حسن بصری رضی کا قول ہے کہ جب تک ساتھیوں کو مشقت و تکلیف نہ ہو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا چاہیئے اور کشتی کے ساتھ قبلہ کی طرف گھومتا رہنا چاہیئے ورنہ بیٹھ کر نماز پڑھو۔

شرح

افعال صحابہ حجت ہیں

ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا فعل حجت ہے کیونکہ وہ کوئی عمل بدون شارح علیہ السلام کے بتلائے نہیں کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا علم تھا چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور کو ان فتنوں کی اطلاع دی جو صحابہ کے زمانہ میں ہونے والے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پہ وحی بھیجی کہ آپ کے اصحاب میرے نزدیک ستاروں کی مانند ہیں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اصحابی مثل النجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم

میرے صحابہ کی مثال ستاروں جیسی ہے تم جسکی اقتدا کرلوگے ہدایت پالوگے
مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی اقتدا میری اقتدا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ہی امام الہدی ہیں۔ غرض حضرات صحابہ کوئی کام ایسا نہیں کرتے جو حضور کی
سنت کے خلاف ہو تو ان کے جملہ افعال بمنزلہ روایت کے ہیں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے ایسے ہی ان کے اقوال بھی۔ اسی لئے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ
کشتی میں نماز کھڑے ہو کر پڑھو جب تک تمہارے ساتھیوں پر مشقت نہ ہو۔

مشقت کی تفسیر

مگر مشقت سے مراد مطلق مشقت نہیں جس سے کچھ تنگی
یا تغیر خاطر پیدا ہو کیونکہ اگر یہ معنی لئے گئے تو اس کا یہ
مطلب ہوگا کہ سمندر میں سوار ہوتے ہی نماز بالکل چھوڑ دی جائے جیسا آج کل بہت
سے جاہل کرتے ہیں کیونکہ کشتی میں سوار ہونے کے بعد کچھ مشقت تو نماز میں ضرور ہوتی
ہے۔ حالانکہ ایسا کرنا اتفاقاً حرام ہے بلکہ مشقت کا مطلب یہ ہے کہ طوفان اور تموج
بحر اور ہوا کی تیزی کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے کشتی کے غرق ہونے کا اندیشہ
ہو یا سبب ہلاکت میں زیادت کا احتمال غالب ہو یا اسی کے قریب اور کوئی اندیشہ
ہو یا اس وجہ سے کھڑا ہونا دشوار ہو کہ اسکی وجہ سے عورتوں پر اس طرح نظر پڑے گی
جو شرعاً جائز نہیں دراں حالیکہ سوار ہونے سے پہلے تم کو اس کا علم نہ تھا کہ ایسا
واقعہ پیش آئیگا کیونکہ اگر کسی کو پہلے سے یہ بات معلوم ہو کہ سمندر میں سفر
کرنے سے وہ پوری طرح احکام شرعیہ کو بجا نہ لا سکے گا تو اسکو سمندر کا سفر جائز
نہیں، چنانچہ علماء نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو اپنی عادت معلوم ہو کہ اس کو
جہاز میں چکر آتا ہے جس سے نماز چھوٹ جاتی یا اس میں خلل واقع ہوتا ہے
اس کو سمندر کا سفر جائز نہیں۔ امام مالک کا یہی مذہب ہے۔ غرض یہ دو صورتیں
یا ان کے مشابہ کوئی صورت کشتی میں پیش آئے اور سوار ہوتے ہوئے ان کا احتمال
نہ تھا تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے جبکہ کھڑے ہونے کی قدرت نہ ہو۔

مطلب ہے مشقت کا کیونکہ علماء تشویش کا اطلاق اسی حالت پر کرتے ہیں
جو شرعاً تشویش ہو جس پر کوئی خاص حکم مرتب ہوتا ہو مطلق پریشانی کو تشویش
یا مشقت نہیں کہتے۔ بخلاف صوفیہ کے کہ وہ ہر اس پریشانی کو جس سے قلب میں

صوفیہ کے نزدیک تشویش عام ہے

تغیر آجائے تشویش کہہ دیتے
ہیں چھوٹی ہو یا بڑی (مگر
ان کی اصطلاح پر احکام شرعیہ مرتب نہیں ہوتے احکام
شرعیہ اسی تشویش پر مرتب ہوتے ہیں جس سے ناقابل برداشت مشقت لاحق ہو)

قوله الحديث يدل على ان فعل الصحابة رضى الله عنهم
حجة الى قوله فانهم يطلقون التشويش على كل شئى
يتغير به الخاطر قل اوجل

ف حضرات صوفیہ افعال واقوال صحابہ سے بہت احتجاج کرتے ہیں اسلئے
اس مسئلہ کو تصوف کے مسائل میں داخل کیا گیا ہے اور اس باب میں فقہاء، حنفیہ
ومالکیہ وحنابلہ کا بھی وہی مسلک ہے جو حضرات صوفیہ کا ہے۔ امام شافعیؒ کا
بھی قدیم مسلک یہی ہے جدید میں اختلاف ہے۔

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو حج نفل کا بہت شوق رکھتے ہیں
مگر جہاز میں نمازیں برباد کرتے ہیں جس شخص کو اپنی عادت معلوم ہو کہ جہاز میں
مجھے چکر آتا ہے جس سے نمازیں برباد یا قضا ہوتی ہیں اس کو حج فرض پر اکتفا کرنا چاہیئے
حج نفل کے لئے فرض نمازوں کو تباہ نہ کرنا چاہیئے۔

(۱۶۹) سمندر کا سفر جائز ہے اور ظاہری اور باطنی سمندروں کو طے کرنے کی شرط

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سمندر کا سفر جائز
ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ سمندر کا سفر

مطلقاً جائز ہے یا صرف تاجر اور غازی کے لئے جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ حاجی اور غازی کے سوا سب کو سمندر کے سفر سے منع فرماتے اور یوں کہتے تھے کہ سمندر بڑی مخلوق ہے جس پر کمزور مخلوق سوار ہوتی ہے اور سفر کرتی ہے اگر کتاب اللہ کی ایک آیت نہ ہوتی تو میں سمندر کا سفر کرنے والوں کو درّہ سے مارتا غالباً وہ آیت

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقنا
ھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علی کثیر ممن خلقنا
تفضیلا ﴿پ۱۵﴾

ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے سمندر کے سفر کو اپنی نعمتوں میں شمار فرمایا ہے اور اس آیت کی وجہ سے حضرت عمر کا سمندر میں سفر کرنیوالوں کو سزا دینے سے رُک جانا اسکی دلیل ہے کہ یہ سفر مطلقاً "حرام وممنوع نہیں ہے ورنہ سزا سے رکنے کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ ہر ممنوع وحرام کے ارتکاب پر خلیفہ کو تعزیر کا حق حاصل ہے، ہاں بلا ضرورت شرعیہ کے اس سفر کا خلاف اولیٰ ہونا ظاہر ہے۔ غرض سمندر کا سفر بجز اس صورت کے جائز نہیں جو حالت کے اعتبار سے بھی مشروع ہو اور زمانہ کے اعتبار سے بھی۔ زمانہ کے اعتبار سے مشروع ہونا تو یہ ہے کہ طوفان کا زمانہ نہ ہو کہ ایسی حالت میں سمندر کا سفر جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من رکب البحر فی ارتجاجہ فقد برئ من الذمۃ

جو تلاطم کے زمانہ میں سمندر کا سفر کرے وہ ذمہ سے باہر ہے
(یعنی خدا اسکی حفاظت کا ذمہ دار نہیں)

اور حالت کے اعتبار سے مشروع ہونا یہ ہے کہ کشتی اور جہاز کی حالت اور کیفیت وغیرہ کو دیکھا جائے اور اس قسم کی کشتی اور جہاز پر سوار ہو جس پر

عادت کے موافق سب سوار ہوتے ہیں جو عموماً سمندروں میں چلنے کے قابل ہیں چھوٹے اور بہت ہلکے جہاز پر سوار نہ ہو اگر جہاز ایسا نہ ہو جو عادتاً سمندر میں چلنے کے لائق ہو تو اس میں بیٹھنے والے اور سوار ہونیوالے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے والے ہوں گے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے پر جو وعید آئی ہے معلوم ہے، یہ تو ظاہری سمندر کے سفر کا حکم تھا جس کو عام طور پر سمندر کہا جاتا ہے، اب رہے باطنی سمندر جن کو بزرگ لوگوں نے بیان فرمایا ہے تو ان میں سے جس سمندر کا سفر جائز ہے اس میں سنت کے موافق سفر کرنا چاہیئے چنانچہ باطنی سمندر سات ہیں۔

۱۔ بحر دنیا
۲۔ بحر ہوی
۳۔ بحر شہوات
۴۔ بحر نفس
۵۔ بحر علم
۶۔ بحر معرفت
۷۔ بحر توحید

پس دنیا کا ساحل تو آخرت ہے اس کو امر و نہی کی کشتی پر سوار ہو کر طے کیا جاتا ہے اور اس کا سامان مختلف قسم کی عبادات ہیں اس میں سفر کرنے کا وقت وہ ہے جبکہ تلاطم نہ ہو اور دنیا کا تلاطم یہ ہے کہ فتنوں کا ظہور ہو اس وقت کے لئے شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنے گھر کا ٹاٹ بن جاؤ یا کسی درخت کی کھو میں جا بسو لوگوں سے الگ ہو جاؤ یہاں تک کہ اسی حالت میں تم کو موت آجائے اور ظاہر ہے کہ جو شخص سب سے الگ ہو کر گوشہ نشین ہو جائے گا وہ دنیا کے سمندر کو طے نہیں کر رہا کیونکہ وہ تو دنیا سے الگ ہو چکا ہے اس سمندر کی ہوائیں عزائم اور ہمتیں ہیں ہمت کی قوت ہی کے موافق اس سمندر میں تمہاری کشتی چلے گی اور اس کشتی

کا سراعقل ہے۔ پس عقل ہی کے اندازہ پر کشتی کی رفتار میں پختگی ہوگی اور ایسے ملاح تمہاری خاطر ہیں یعنی دل میں اگر الی باتیں پس ان کی خوبی ہی کے موافق کشتی کی سلامتی ہوگی اور اس کا بادبان علم ہے پس تمہارے علم ہی کے اندازہ پر کشتی کا رخ اچھی طرح پھرے گا اور اس کا سامان تمہارے علم کی پونجی ہے پس اس سمندر کو پار کرنا کشتی اور اس کے ملازموں کی عمدگی کے اندازہ پر ہوگا۔ اگر کشتی عمدہ اور ملاح بھی اچھے ہوئے تو خوبی کے ساتھ پار ہو جاؤ گے ورنہ دشواری کا سامنا ہوگا۔)

اور نفع یا خسارہ پونجی کے موافق ہوگا اگر اعمال اچھے ہوئے نفع ہوگا ورنہ خسارہ ہوگا)

رہا بحر ہوی تو وہ خطرناک سمندر ہے اور اس میں سوار ہونا سفر کرنا ممنوع ہے بلکہ مہلک ہے اس لئے اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بحر شہوات تو اس سمندر میں تلاطم بہت ہے اسکے جتنے حصہ کے طے کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے اس میں بھی دنیا و آخرت کی اس قدر پریشانیاں ہیں جن کا ادنیٰ حصہ بھی بیان میں نہیں آسکتا، اگرچہ وہ مستحبات میں داخل ہے اور وہ بیوی سے جماع کرنا ہے، اس کے اندر وہ پریشانیاں ہیں جو بال بچوں کے لئے روزی حاصل کرنے میں ہر شخص کو پیش آسکتی ہیں جو بعض اوقات بعض لوگوں کے لئے محرمات میں مبتلا ہونے کا سبب بن جاتی ہیں اور وہ بہانہ یہ کرتے ہیں کہ ہمارے پیچھے بال بچے لگے ہوئے ہیں جو کھانے کو مانگتے ہیں حلال روزی ان کو کافی نہیں ہوتی اب حرام طریقہ سے روزی حاصل نہ کریں تو کیا کریں ہم کو اس سے چارہ ہی نہیں۔ پھر آخرت میں اہل و عیال کے حقوق کی بابت اس سے باز پرس ہوگی (وہ الگ) کیونکہ یہ اس کی حفاظت میں ہیں۔

وکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کا ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اسکی ذمہ داری کے متعلق سوال ہوگا

پھر اسکے ذمہ لڑکوں کا نان ونفقہ لازم ہوتا ہے جب تک کہ وہ بالغ ہوں اور لڑکیوں کا نفقہ اس وقت تک لازم ہے جب تک ان کی شادی ہو، اور یہ سب کچھ ایک شہوت (جماع) کا نتیجہ ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی پریشانیاں ہیں اگر غور کیا جائے اس شہوت ہی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

تعس عبد الدینار تعس عبد الدرھم تعس عبد الخمیصۃ
تعس عبد بطنہ تعس عبد فرجہ

ہلاک ہوگیا دینار کا بندہ، درہم کا بندہ، شال کا بندہ، پیٹ کا بندہ، اور شرمگاہ کا بندہ

جس کو ان ہی چیزوں کی رات دن فکر ہے اگر یہ اسکی مرضی موافق ملتی ہیں تو خدا سے خوش رہتا ہے ورنہ خدا کی شکائتیں کرتا پھرتا ہے۔ اگر یہ شہوت نہ ہوتی جس نے ان تمام پریشانیوں کے لئے انسان کو آمادہ کیا ہے تو وہ آزادی سے نکل کر شہوتوں کی غلامی میں نہ پھنستا۔ پھر یہ تمام مل کر خاص مقام قرب تک پہنچنے سے روک دیتی ہیں کیونکہ بزرگوں نے فرمایا ہے

ترك الشهوات قرع الباب
شہوتوں کے چھوڑنے ہی سے یہ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے
نیز علماء نے اللہ جل جلالہٗ کے اس ارشاد

اولئك الذين امتحن الله قلوبهم للتقوىٰ
یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوی کے لئے خالص کردیا ہے

کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ان سے شہوتوں کو نکال دیا ہے (بیوی بچوں کے تعلقات اسی وقت مقام قرب سے مانع ہوتے ہیں جب انسان حدود شریعت سے تجاوز

کرنے لگے اور اتباع سنت کے ہاتھ سے دیدے ورنہ عیال دار کی دو رکعتیں مجرد کی ستر رکعتوں سے افضل ہیں کیونکہ نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور رہبانیت بدعت ہے اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں اپنی بیویوں سے مشغول ہوتا ہوں حالانکہ مجھے ان کی طرف شہوت نہیں ہوتی لوگوں نے عرض کیا یا امیرالمومنین پھر آپ کیوں مشغول ہوتے ہیں ؟ فرمایا (محض) اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ میری پشت سے کوئی اولاد پیدا فرمادیں جس سے سیدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن دوسری امتوں پر اپنی امت کی کثرت ظاہر فرمائیں تو دیکھو حضرت عمر کی یہ شہوت جو انسانی شہوتوں میں سب سے بڑی شہوت ہے کس طرح خاص عبادت بن گئی ہے پھر اور شہوتوں کا تو کیا پوچھنا ؟ اسکی تائید اللہ جل جلالہ کا یہ ارشاد کرتا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔

لا یزال العبد یتقرب الیّ بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ و یدہ التی یبطش بہا

بندہ نوافل کے ذریعے سے برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے سنتا ہے اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے ۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے پکڑتا ہے ۔

علماء طریق نے اسکی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس کا ہر عضو اللہ کی ساتھ اور اللہ کے لئے ہی کام کرتا ہے ۔ شہوات نفس جاتی رہتی ہیں یعنی اس کا ہر کام رضا الٰہی کے موافق ہونے لگتا ہے خواہش نفس سے کوئی کام نہیں کرتا ۔

ف شہوت نفس کے لئے حاجات کا پورا کرنا نیت عبادت کیساتھ پورا کرنے سے افضل ہے

شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو عارف شہوت نفس کے ساتھ بیوی سے مشغول ہوتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو بدون شہوت کے محض اولاد حاصل کرنے کے لئے مشغول ہوتا ہے کیونکہ پہلا شخص اپنی عجز و احتیاج کا مشاہدہ کرتا ہے اس میں عبدیت زیادہ ہے اور دوسرے شخص میں شان استغنا ہے اس میں عبدیت زیادہ نہیں اسی طرح جو شخص کھانا اس لئے کھاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف کو دور کرنے اور پانی اس لئے پیتا ہے کہ پیاس کو بجھاوے وہ اس سے افضل ہے جو کھانے پینے میں یہ نیت کرتا ہے کہ اس سے طاعات کے لئے قوت حاصل ہوگی۔ سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ

میں کہتا ہوں کہ یہ افضلیت اسی صورت میں ہے جبکہ دوسرا شخص مشاہدہ عجز و احتیاج سے محروم ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بابت یہ وہم نہیں ہو سکتا اس لئے ان سے وہ عارف افضل نہیں جو بیوی سے شہوت پوری کرنے کو مشغول ہوتا ہے اور میرے خیال میں حضرت عمر کے قول مذکور کا وہ مطلب نہیں جو حضرت مصنف نے سمجھا ہے کہ ان کو شہوت بالکل نہ ہوتی تھی محض تحصیل اولاد کے لئے جماع کیا کرتے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بعض دفعہ بیوی کی طرف میلان نہ ہوتا خواہش نہ ہوتی پھر بھی وہ اس سے مشغول ہوتے تاکہ اللہ تعالیٰ کوئی اولاد عطا فرمادیں جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوں یعنی اس خیال سے وہ اپنے اندر شہوت پیدا کرتے تاکہ بیوی کا حق ادا ہو جاوے اس میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جن کو اسلامی اور قومی خدمتوں میں زیادہ مشغولی کی وجہ سے یا ذکر اللہ میں زیادہ مشغول رہنے کی وجہ سے یا غلبہ خوف و خشیت سے بیوی کی طرف التفات نہ ہوتا ہو کہ ان کو بیوی کے حق سے غافل نہ ہونا چاہیئے اگر ان کو

خود شہوت کا تقاضا نہ ہو تو بیوی کے حق کا تقاضا ہونا چاہیئے یہ بھی نہ ہو تو یہ تقاضا ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی کثرت سے قیامت کے دن خوش ہوں گے پس جو لوگ محض اپنی شہوت کے منتظر رہتے ہیں اور جب تک ان کو شہوت نہ ہو بیوی کے پاس نہیں جاتے گو اس کو کتنی ہی خواہش ہو وہ غلطی پر ہیں کیونکہ بیوی کا خواہش کا پورا کرنا بھی مرد کے ذمہ واجب ہے ۱۲ مترجم

رہا بحر نفس تو یہ سمندر بے پایاں ہے جس کی انتہا کی ہم کو خبر نہیں مگر اس پر سوار ہونا تمام سواریوں سے بڑھ کر ہے بشرطیکہ کشتی شریعت کے موافق ہے کہ اخلاص کی لکڑیوں سے بنائی گئی ہو اور اسکے ملاح اور خدام تواضع واحتیاج سے آراستہ ہوں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اوحی الی ان تواضعوا ولا یفخر بعضکم علی بعض

میری طرف اللہ نے وحی بھیجی ہے کہ تم سب باہم تواضع اختیار کرو
ایک دوسرے پر فخر نہ کرے۔

بحر نفس میں سفر کرنے اور اس کو طے کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو سب سے کمتر جانے اور اس کے ملّاح بھی الجلے سے بنے ہوں کیونکہ یہی کامیابی کی علامت ہے اور اس میں سوار ہونیوالوں کی پونجی تقویٰ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ

اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ تم کو خود کامیابی کے راستے بتلا دینگے

اگر اس طرح بحر نفس پر کوئی سوار ہوا تو اس میں اس قدر نفع اور فائدہ پائے گا جس کو بجز کریم وہاب کے کوئی نہیں جانتا۔

رہا بحر علم سو اس کا بھی وہی حال ہے جو بحر نفس میں گذر چکا مگر اس سمندر کے طے کرنے والے کو اس میں زیادہ مدت تک قیام کی ضرورت ہے یہاں تک کہ اسکی بصیرت کی نگاہ قوی ہو جائے اور نفس کی خواہش کو دیکھنے لگے کہ کس عمل میں خواہش

نفس کی آمیزش ہوئی اور کون سا کام خالص اللہ کے لئے ہوا تو علم اور نفس کی ترکیب سے اس کو خاص قوت حاصل ہوگی وہ انوار و عجائب اور حکمتیں نظر آئیں گی جن کو دوسرا نہیں دیکھ سکتا مگر ان حقائق کو دیکھنے کے بعد اس سمندر میں دیر تک قیام کی ضرورت ہے تاکہ تہذیب نفس حاصل ہو جائے اور یقین میں ترقی ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

تعلموا الیقین فانی اتعلمه

یقین حاصل کرتے رہو کیونکہ میں بھی اسکو حاصل کرتا رہتا ہوں

(یعنی اس میں برابر ترقی کرتے رہو ایک حد پہ نہ ٹھہرو)

دریا بحر معرفت تو یہ بہت بڑا اور عظیم الشان سمندر ہے اس میں پہلے سمندر سے بھی زیادہ فوائد ہیں اس میں بھی اسیطرح سوار ہوتے ہیں جس طرح اس سے پہلے سمندر میں سوار ہونے کا طریقہ بتلایا ہے مگر اس میں سفر کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ بحر علم کا پانی ساتھ لے لیا جائے مبادا اس سمندر کی سخت گرم ہواؤں سے جان ہلاک ہو جائے کیونکہ اس سمندر کو طے کرنے والے اکثر اسی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں کہ ان کی ساتھ دریائے علم کا پانی نہیں تھا۔ اس سمندر میں اچھی اچھی چیزیں اور موتی اور جواہرات اور اسرار تو اس قدر ہیں جو بحر علم میں نہیں پائے جاتے مگر جو شخص دریائے علم کا پانی ساتھ نہ لے اس کے لئے خطرات بھی اس قدر ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ بعض دفعہ اس سمندر کو طے کرنے والا ابتلاء میں خاص درجہ پہ ہوتا ہے پھر بدترین حالات کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

دریا بحر توحید تو اس کو بھی اس طریق پہ طے کیا جاتا ہے جو پہلے دو سمندروں کے لئے بیان کیا گیا ہے ہاں اس میں ایک بات یہ زیادہ ہے کہ اس کو طے کرنیوالا شریعت کے مضبوط پہاڑوں کی چوٹیوں کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دے جب کبھی اس پہ کوئی نامعلوم ہوا چلے جس کی حقیقت اور کنہ معلوم نہ ہو اور اس سے بچنے کی کوئی تدبیر پاس نہ ہو فوراً شریعت کے پہاڑ کی چوٹی پر آ جائے ورنہ غرق

ہو جائیگا، اسی وجہ سے بہت لوگ اس سمندر میں غرق ہو گئے ہیں کہ انہوں نے بحر توحید کی نامعلوم تند ہواؤں سے بچنے کے لئے جبل شریعت کی پناہ نہیں لی اور برابر آگے بڑھتے رہے جس کا انجام یہ ہوا کہ ایمان کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہلاک ہو گئے اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں اور اگر علم شریعت کے پہاڑ کی طرف لوٹ آتے اور ان کی عقل ٹھکانے آجاتی اس وقت ان ہواؤں کے فائدے معلوم ہوجاتے جو بحر توحید میں دیکھے تھے اور دونوں ہواؤں کے ملنے سے جو عمدہ مزاج دین کی حقیقت اور صورت سے ترکیب پاتا اس سے وہ فائدہ حاصل ہوتا جس کو بیان کرنے والے بیان نہیں کر سکتے پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ان تمام مبارک سمندروں کو بوجہ احسن طے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں پھر وہ سنت کے پہاڑوں پر بھی جما رہے یعنی اتباع سنت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ دے وہ ایسا بزرگ ہوگا کہ اس جیسا ایک شخص بھی کسی اقلیم میں ہو تو ساری مخلوق پر اسکی برکت سے اللہ کی رحمت ہوگی اور جو شخص ان میں سے ایک ہی سمندر کو عمدگی کے ساتھ طے کرلے اس کو بھی جو کوئی دیکھ لے گا اللہ تعالیٰ اسکی آنکھیں ٹھنڈی کر دے گا خود اس کا تو کیا پوچھنا کیونکہ اس کی زیارت کرنے والوں کو محض زیارت ہی سے بہت کچھ خیر و برکت عطا ہوگی بشرطیکہ زیارت قاعدہ کے موافق ہو امتحان یا عناد کی ساتھ نہ ہو کیونکہ بیقاعدہ زیارت تو اگر نبی اور رسول کی بھی کی جائے تو خاک نفع نہ ہوگا دیکھو ابوجہل نے بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے مگر کیا اس کو کچھ نفع ہوا؟ خاک بھی نہیں کیونکہ وہ حضور کے پاس عناد اور بغض کے ساتھ آتا تھا خوب سمجھ لو اور جو شخص ان سمندروں میں سے کسی کو بُرے طریقہ سے طے کرے گا اس کے لئے غالب ہلاکت ہی ہے اور جو اس کو دیکھے گا یا اس کے پاس رہیگا۔

عہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر وحدت الوجود کا انکشاف ہوا اور جہل کی وجہ سے اتحاد یا حلول کے قائل ہو گئے تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا ۱۲ ظ

اس پر فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس باب کی تفصیل بہت طویل ہے مگر انشاءاللہ میں اسکے متعلق ایک مختصر کتاب لکھوں گا جس میں اس سے زیادہ مبسوط کلام ہوگا اور ہم ہر سمندر کے خطرات بھی اللہ کی مدد سے اس میں بیان کر دیں گے اللہ تعالیٰ ہم کو ان لوگوں میں سے کرے جن کو اللہ نے محفوظ رکھا اور علم عطا فرمایا اور اپنے فضل سے اس دولت کے ساتھ کامیاب بنایا

قولہ الوجہ الثالث فیہ من الفقہ جواز رکوب البحر الیٰ قولہ جعلنا اللہ ممن حماہ وعلمہ واسعدہ بہ بمنہ

ف ان مقامات کی جن کو حضرت مصنف نے سمندروں سے تعبیر فرمایا ہے تفصیل کرنا تو اس کا کام ہے جس نے ان کو طے کیا ہو کو تفصیل سے کچھ فائدہ بھی نہیں کیونکہ یہ مقامات عمل سے حاصل ہوتے ہیں اور مشاہدہ ہی سے سمجھ میں آتے ہیں بدون عمل اور مشاہدہ کے محض باتوں سے نہ حاصل ہوتے ہیں نہ سمجھ میں آتے ہیں ہاں ڈرتے ڈرتے ایک بات کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حضرت مصنف نے دو سمندروں کا ذکر چھوڑ دیا ہے یعنی بحر ذکر و بحر فکر کا۔ بحر دنیا کے متعلق تو معلوم ہو چکا ہے کہ اسکو سب ہی طے کرتے ہیں اور بحری ہوی کا طے کرنا ممنوع ہے اور بحر شہوات کو بھی تقریباً سب طے کرتے ہیں مگر بہت کم ایسے ہیں جو اس تلاطم سے محفوظ رہتے ہوں الا من عصمہ اللہ اور بحر نفس لطیفۂ نفس کی لو ساطت سے طے ہوتا ہے اور بحر علم لطیفۂ قلب سے متعلق ہے بحر ذکر لطیفۂ روح سے وابستہ ہے اور بحر فکر لطیفۂ سر کے ذریعہ طے ہوتا ہے اور بحر معرفت لطیفۂ خفی سے اور بحر توحید لطیفۂ اخفیٰ سے متعلق ہے یہ ایک اجمالی اشارہ ہے۔ تفصیل اس شخص کو خود معلوم ہو جائیگی جس نے لطائف ستہ کی تفصیلی سیر کی ہے اور سلامتی کا طریقہ یہ ہے کہ انسان عقائد و علوم و اعمال میں سنت کا اتباع کا رہے کہ ان سمندروں کو طے کرنے کے ساتھ اور اسکے بعد بھی اتباع کی ہر وقت ضرورت ہے پس جو

شخص اتباع سنت میں راسخ ہے وہ تمام دولتوں سے مالامال ہے۔
اتباع سنت میں پختہ ہو جانے سے وہ تمام انوار و برکات و درجات حاصل
ہو جاتے ہیں جو تفصیل وار ہر سمندر کو طے کرنے سے حاصل ہوتے گو اس
شخص کو خبر بھی نہ ہو کہ یہ انوار و برکات اور یہ اسرار کس مقام اور کس سمندر کی
موج سے آرہے ہیں۔

رزقنا اللہ وایاکم اتباع ھذا النبی الکریم
علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم وختم لنا ولکم
بالحسنی انہ ھو البر الرحیم ۱۲ مترجم

باب بست و ششم ۲۶

حدیث

جواز التحرز من حر الحصباء فی السجود

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو ہم میں سے بعض لوگ سجدہ کی جگہ شدت گرمی کی وجہ سے کپڑے کا کچھ حصہ کر لیتے تھے

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں تھوڑا سا کام کر لینا ایسی تکلیف کو دفع کرنے کے لئے جس سے پریشانی لاحق ہوتی ہو جائز ہے۔

(۱۷۰) مشائخ کے افعال واقوال کا اتباع اور اسکی اصل

حدیث کا یہ لفظ کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا بھی بیان ہے کیونکہ صحابہ حضور کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے یہ فعل کرتے تھے اور حضور کا ارشاد ہے

انی اراکم من وراء ظھری کما اراکم امامی

میں تم کو اپنے پیچھے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں

تو حضور کا ان کے اس فعل کو برقرار رکھنا اس پر انکار نہ فرمانا حضور کی طرف سے اس بات کا حکم ہے کہ یہ فعل ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے اور کسی حکم کی تقریر فعلی تقریر قولی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار افعال و اقوال دونوں میں یکساں حکم رکھتی۔

اور کیا حضور کے سوا دوسروں کا بھی یہی حکم ہے یا دوسروں کے افعال کی اقتدار اس وقت تک نہ کی جائے گی جب تک زبان شریعت سے اس کا قابل اعتبار ہونا معلوم نہ ہو جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنی ذات سے قطعاً معصوم ہیں اور دوسروں کی عصمت معلوم نہیں ہو سکتی لسان شریعت کا تو یہی فیصلہ ہے کہ دوسرا اس باب میں حضور جیسے نہیں ہیں لیکن بعض اہل طریق کی رائے ہے کہ اپنے مشائخ کا بھی افعال و اقوال میں اتباع کرنا چاہیئے کیوں کہ ان کو اپنے مشائخ کے ساتھ حسن ظن ہوتا ہے کہ ان کا کوئی فعل و قول شریعت کے خلاف نہیں ہوتا۔

اسی طرح مبتدی اور عامی کو عالم کے ساتھ یہی برتاؤ کرنا چاہیئے کیونکہ ان لوگوں کو شریعت کی تو کچھ خبر نہیں پس ان کے لئے اپنی ہوائے نفس کے اتباع سے عالم کا اتباع ہی زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔ مجھ سے میرے بعض مشائخ نے بیان فرمایا کہ وہ اپنے شیخ کی خدمت ان کے مرض موت میں کر رہے تھے ان کو جلدی جلدی پیشاب کی حاجت ہوتی اس لئے ایک دفعہ وہ پیشاب کے تقاضے سے گھبرائے ہوئے تیزی کے ساتھ بیت الخلا میں گئے اور قضائے حاجت کے بعد مجھے آواز دی کہ پانی لاؤ۔ پھر باہر آکر فرمایا عزیز من! بیت الخلا میں بات کرنا جائز نہیں ہے، مگر میں نے ضرورت کی وجہ سے ایسا کیا ہے کیونکہ میں شدت تقاضہ کی وجہ سے تم سے بات کرنے کی بھی فرصت نہ پاتا تھا۔ ان بزرگ نے باہر آکر یہ بات اس لئے فرمائی کہ وہ جانتے تھے کہ یہ شخص میری اقتدا کرتا ہے، میرے ہر قول کو شریعت کے مطابق

سمجھتا ہے ایسا نہ ہو کہ بیت الخلاء میں بات کرنے کو بھی مطلقاً جائز سمجھ لے۔
یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے بھی ماخوذ ہوتا ہے جبکہ انہوں نے اہل بیت میں سے کسی کو حالت احرام میں رنگین کپڑا پہنے ہوئے دیکھا تو اس کپڑے کے اتار دینے کا حکم دیا حالانکہ اس کا حالت احرام میں پہننا جائز تھا کیونکہ وہ زرد مٹی سے رنگا ہوا تھا جیسا حدیث میں اسکی تصریح ہے مگر اس کا رنگ زعفرانی رنگ سے ملتا جلتا تھا اور زعفران میں رنگا ہوا کپڑا احرام میں پہننا جائز نہیں۔

اسی لئے حضرت عمر نے اسے الگ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا۔

اے جماعت اہل بیت تم امت کے پیشوا ہو لوگ تمہاری اقتداء کرتے ہیں اس لئے تم کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے عوام غلطی میں پڑیں تو حضرت عمر نے اس حکم کی یہ علت بیان فرمائی کہ ان حضرات کے افعال کا بھی ویسا ہی اتباع کیا جاتا ہے جیسا ان کے اقوال کا اتباع کیا جاتا ہے۔

اس سے صوفیہ کے اس معمول کی اصل نکل آئی کہ وہ اپنے مشائخ کے افعال و اقوال کا اتباع کرتے ہیں۔ اسی لئے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ عالم اگر با عمل ہوتا ہے تو لوگ اسکے علم کا اتباع کرتے ہیں اور بے عمل ہوتا ہے تو صرف اس کے عمل کا اتباع کرتے ہیں علم کا اتباع نہیں کرتے وہ اپنی تقریر اور وعظ میں جو چاہے حدیث قرآن سے بیان کرے لوگ اس پہ کان نہ دھریں گے بلکہ اس کے اعمال کو دیکھ کر اعمال ہی کا اتباع کریں گے تو اس کے علم سے نہ اسکو نفع ہوا نہ دوسروں کو فائدہ ہوا، یوں ہی برباد گیا

اعاذنا اللہ من علم بلا عمل

اور چونکہ آج کل بعض علماء میں بدعملی اور اتباع شہوات نے راہ پالیا ہے تو عوام کی حالت بھی بگڑ گئی ہے کیونکہ وہ ان ہی علماء کے افعال کا اتباع کرتے ہیں اور اگر کوئی عالم اپنے علم پر بھی عمل کرتا ہے اور ایسے بہت

کم ہیں تو عوام ان کا اتباع نہیں کرتے بلکہ ان کو زہد خشک اور تشدید یعنی سخت روی سے بدنام کرتے اور یوں کہتے ہیں کہ دین تو آسان ہے ان ملانوں نے خواہ مخواہ اسکو دشوار کر دیا ہے۔ بہر حال عالم بے عمل خود تو بگڑتا ہی ہے اس کی وجہ سے عوام بھی بگڑ جاتے ہیں۔

اور اس حالت میں یہ عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے تحت میں داخل ہو جاتا ہے۔

موت العالم ثلمة فی الاسلام

عالم کی موت اسلام میں ایک رخنہ ہے

اس سے مراد بدعملی کی موت ہے کیونکہ اسکی ظاہری موت تو باطنی موت سے اچھی ہے۔ ظاہری موت تنہا اتنی مضر نہیں کیونکہ وہ اس کے فضائل و آثار چھوڑ جاتی ہے جن کا لوگ اتباع کرتے ہیں اور باطنی موت واقعی بڑا رخنہ ہے کیونکہ اس حالت میں یہ شخص دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے دروازہ سے ہٹا دیتا ہے، جس سے اس پر سخت ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ اللہ جل جلالہٗ فرماتے ہیں

انا اللہ لا الہ الا انا خلقت الشر وخلقت لہ اھلا فالویل

ع مگر یہ نہیں سمجھنے کہ دین کے آسان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منہ کا نوالہ ہے کہ رکھا اور نگل لیا دین کا آسان ہونا ایسا ہی ہے جیسا روٹی کھانا اور پانی پینا تو کیا روٹی کھانے کے لئے کچھ کرنا نہیں پڑتا پانی پینے کے لئے پانی لانے اور کنویں پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی؟ دین کا آسان ہونا ایسا ہی ہے جیسا لکھنا آسان ہے مگر کیا آدمی ایک دن میں خوشنویس بن سکتا ہے؟ کیا اس کے لئے ارادہ محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی؟

یقیناً ہوتی ہے۔ اسی طرح دین بھی ارادہ اور ہمت اور چند روزہ محنت کے بعد آسان ہو جاتا ہے خوب سمجھ لو ۱۲ منہ

لمن خلقته للشر واجریت الشر علی یدیہ

"میں ہی معبود ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے شر
کو پیدا کیا ہے اور کچھ لوگوں کو اس کے واسطے پیدا کیا ہے پس
ہلاکت ہے اس کے لئے جس کو میں نے شر کے لئے پیدا کیا
اور شر کو اس کے ہاتھوں جاری کیا" تو اس عالم بے عمل نے اپنے ساتھ بھی
برائی کی اور دوسروں کو بھی اپنی اقتدار کی وجہ سے شر کی طرف کھینچا اور یہاں
سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں یا اثر
مانتے ہیں یا اس کی وجہ سے نیک کاموں کی اشاعت ہوتی ہے اسے اپنے نیک
اعمال کا بیان کرنا جائز ہے تاکہ دوسرے بھی ویسے ہی کام کریں۔

بزرگوں کے حالات ہم جنسوں میں بیان کرنے چاہئیں

عوام کے سامنے بلا ضرورت بیان نہ کرنے چاہئیں

اسی لئے حضرات صوفیہ نے فرمایا ہے کہ بزرگوں پر جو حالات طاری
ہوتے ہیں ان کو اپنے ہم جنسوں میں بیان کرنا جائز ہے جن میں ترقی کی
اہلیت ہو (جو بزرگوں کو مانتے اور ان کا اتباع کرتے ہیں ۔ عوام کے سامنے
بیان کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ کوئی مجبوری آن پڑے جس کی وجہ سے بیان کرنا
ضروری ہو جائے تو اور بات ہے ۔

جیسا ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ دریا کے کنارے کنارے چل رہے
تھے دفعتہً ایک کشتی پر نظر پڑی جس میں وہاں کے حاکم کے لئے شراب لدی
ہوئی تھی اور وہ حاکم ایسا ظالم تھا جس کے مقابلہ کی کسی کو تاب نہ تھی، جس وقت
کشتی نے لنگر ڈالا یہ بزرگ اس پر ایک لاٹھی ہاتھ میں لے کر چڑھ گئے اور

جتنے مٹکے شراب سے بھرے ہوئے تھے ایک ایک کر کے سب کو توڑنا شروع کر دیا کشتی والوں میں کسی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے سامنے آتا اور ان کو روک سکتا یہاں تک کہ تمام مٹکے پھوڑ دیئے صرف ایک مٹکا چھوڑ دیا اور واپس آگئے۔ کشتی والے حاکم کے پاس پہنچے اور اس کو واقعہ کی اطلاع دی حاکم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون شخص تھا جس نے میری چیز پر ہاتھ ڈالا اور یوں بیساختہ اپنا کام کر گذرا پھر اس نے ایک مٹکا کیوں چھوڑ دیا۔

اگر اس نے اللہ کے واسطے یہ کام کیا تھا تو ایک مٹکا چھوڑنے کی کیا وجہ تھی اس میں بھی تو شراب ہی تھی جس کا پینا حرام ہے غرض اس نے ان کے پیچھے آدمی دوڑایا اور بلا بھیجا اور جب وہ حاضر ہو گئے تو پوچھا یہ تم نے کیا کیا اور کیوں کیا ؟

فرمایا جو میرے جی میں آیا میں نے کر دیا اب جو تیرے دل میں آئے کر ڈال، کہا اور تم نے ایک مٹکا کیوں چھوڑ دیا ؟

فرمایا ابتداء میں تو مجھے غیرت اسلام نے اس پر مجبور کیا تھا تو میں نے کشتی میں گھس کر حکم الٰہی کی تعمیل کے لئے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا جب ایک باقی رہ گیا تو میرا نفس پھولنے لگا اور کہنے لگا کہ تو نے بڑا بہادری کا کام کیا کہ ایسے منکر کو بدل ڈالا اور ایسے گناہ کو مٹایا جس کے مٹانے کی کسی کو جرأت نہ تھی)

اس وقت مجھے اندیشہ ہوا کہ اس خیال کے آنے کے بعد اس مٹکے کو توڑنے میں حظ نفس شامل ہوگا اس لئے میں نے اس کو چھوڑ دیا اس تقریر کا جو خلوص سے بھری ہوئی تھی ایسا اثر ہوا کہ بیساختہ حاکم کی زبان سے نکلا کہ اس شخص سے کچھ تعرض نہ کیا جائے یہ جو چاہیں کریں ان کے درمیان اور ہمارے درمیان کوئی معاملہ نہ ہوگا (گویا اس وقت سے وہ باقاعدہ محتسب بنائے گئے کہ

جو کام شریعت کے خلاف دیکھیں اس کو مٹا دیں تو ان بزرگ نے جو کچھ اپنا راز ظاہر کیا اس ضرورت کی وجہ سے کیا جو ان کو پیش آئی تھی اس لئے یہ خودستائی میں داخل نہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں ممانعت فرمائی ہے۔

ولا تزکوا انفسکم

کہ اپنے نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو

اپنے منہ سے تعریف نہ کیا کرو۔ ان بزرگ نے اپنا تزکیہ نہیں کیا بلکہ مجبوری کی وجہ سے پورا واقعہ بیان کر دیا تو ایسی مجبوری کے موقعہ پر سالکین کو اپنے واردات اور واقعات بیان کر دینے کی اجازت ہے۔ بلا ضرورت ایسا نہ کرنا چاہیئے ۱۲





باب بست و ہفتم ۲۷

حدیث

كراهة النخامة فی المسجد

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی دیوار میں بلغم لگا ہوا دیکھا تو اس کو اپنے ہاتھ سے (اور ایک روایت میں ہے چھڑی سے) کھرچ دیا اور اس سے آپ نے ناگواری ظاہر فرمائی یا اس سے آپ کی ناگواری اور گرانی لوگوں کو محسوس ہوئی اور فرمایا کہ جب کوئی شخص کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے تو اپنے پروردگار سے باتیں کرتا ہے یا یہ فرمایا کہ اس کا پروردگار اس کے سامنے ہوتا ہے پس قبلہ کی جانب ہرگز نہ تھوکنا چاہیئے بلکہ بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوک دے یا اس طرح کرے اور آپ نے اپنی چادر کا کنارہ پکڑ کر اس میں تھوکا اور چادر کے ایک حصہ کو دوسرے پر رگڑ دیا۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ نمازی کو قبلہ کی جانب میں تھوکنا (سنکنا) مکروہ ہے اور قدم کے نیچے اور بائیں جانب اور چادرہ کے کنارہ میں رگڑ دینا جائز ہے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۷۱) استغراق و مراقبہ سے تعمیل احکام کی نگہداشت افضل ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد کی دیوار قبلہ میں بلغم کو دیکھنا بتلاتا ہے

کہ حضور مسجد میں داخل ہو کر دائیں بائیں اور سامنے ہر طرف نظر دوڑاتے تھے اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ آپ اسی حالت حضور دتوجہ تی و مراقبہ میں مشغول رہا کرتے جو آپ کی اصلی حالت تھی تو ان چیزوں کو نہ دیکھتے اس سے یہ علمی مسئلہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد کی حالت میں نظر کرنا تعظیم مسجد کے طریقہ پر تھا، کیونکہ مسجد کو مولائے جلیل (حق سبحانہ) کیطرف نسبت حاصل ہے کہ اسکی عبادت کیلئے وقف ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی کے تحت میں بھی تھی آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا اور جس چیز میں انسان متصرف ہو خواہ مال ہو یا اہل وعیال یا اور کوئی صورت تصرفات کی قسم سے ہو اگرچہ اسکی نگہداشت کا نفع اسی کیطرف عود کرتا ہو مگر اس میں ثواب بھی ملتا ہے یعنی جبکہ وہ اسکی نگہداشت اس وجہ سے کرتا ہو کہ وہ اس کا منجانب اللہ مکلف کیا گیا ہو اگرچہ اس شے کی منفعت عام ہی ہو مثلاً امام المسلمین کے ذمہ مساجد کی اور شاہراہ عام کی اور جو ان جیسی چیزیں ہیں (اوقات دستقایا و مدارس وغیرہ) سب کی نگہداشت واجب ہے، اور نفع ان کا عام ہے (امام ہی کیساتھ مخصوص نہیں) چنانچہ مساجد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فی بیوت اذن اللہ ان ترفع (لوگ صبح شام تسبیح کرتے ہیں ایسے گھروں میں جنکی رفعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے) علماء نے فرمایا ہے کہ مساجد کی رفعت یہ ہے کہ ان کی حفاظت اور نگہداشت کی جائے (یہ مطلب ہے کہ ان کی عمارات بلند کی جائیں) اور حفاظت کیلئے ان کی دیکھ بھال ضروری ہے تاکہ اس میں کوئی خرابی واقع نہ ہو اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان احکام کے شارع ہیں تو آپ سب سے زیادہ ان کی بجا آوری پر فریفتہ تھے اب وہ توجہ بیدا فرع ہو گئی جو ہم نے بیان کی ہے اور اسکی ترغیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہو گئی عرضت علی اجور امتی حتی القذاۃ یخرجہا الرجل من المسجد میرے سامنے میری امت کے اعمال کے ثواب پیش کئے گئے یہاں تک کہ اس تنکے کا ثواب بھی جسکو آدمی مسجد سے نکال دے۔

مساجد کی حفاظت و احترام کی تاکید

اس میں مسجد کی نگہداشت اور اسکے اہتمام کی ترغیب ہے کیونکہ ایسی چیزیں

زنا کاری وغیرہ غور و تامل ہی سے نظر آسکتی ہیں، اس سے یہ فقہی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ امام
کو مسجد میں داخل ہونے کے بعد سجدہ کی حالت پر اہتمام و تعظیم کی نیت سے التفات اور توجہ
کرنا چاہیے مبادا اس میں کوئی نئی بات ہو کہ جس کے ازالہ کی ضرورت ہو تو اس پر اس کو ثواب ملے گا
یا کوئی گندگی یا کلفت کی چیز ہو تو اس کو الگ کردے یہ بھی اچھی نیت ہے اور جو شخص بھلائی کی
نیت کریگا اسکو اس نیت پر ثواب ملیگا بالخصوص جبکہ وہ نیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے
موافق ہو اس حالت میں تو اس کے ثواب کا کیا پوچھنا، اور کیا اس قسم کی نگہداشت اور دیکھ بھال گھر والے
کو اپنے گھر میں بھی کرنا چاہیے؟ کیونکہ وہ بھی اس کا نگران اور محافظ ہے تو جو علت ہم نے اولاً بیان کی ہے
اس کا مقتضا تو یہی ہے کہ اسکو بھی گھر کی دیکھ بھال رکھنا چاہیے) کیونکہ دونوں کا ایک ہی باب ہے، ایک ہی علت کے تحت میں
دونوں داخل ہیں البتہ مسجد کے متعلق یہ حکم زیادہ مؤکد ہے بوجہ انکی تعظیم کے کہ وہ شعائر اسلام میں داخل ہیں
اور شعائر کی تعظیم قرآن کی رو سے تقویٰ کا ایک فرد ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ومن یعظم
شعائر اللہ فانها من تقوی القلوب اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ
اسکے قلبی تقویٰ کی دلیل ہے مگر مسجدوں کی تعظیم ایسی نہ ہونی چاہیے جیسی اہل کتاب یہود و
نصاریٰ اپنے گرجاؤں اور کلیساؤں کی تعظیم عمارت اور نقش آرائی سے کرتے ہیں کیوں کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس کو علامات قیامت میں شمار کیا
ہے اور ہمارے زمانہ میں اس کا ظہور ہو گیا ہے کہ مسجدوں کی عمارات کو نقش و نگار اور کپڑوں
(پردوں) سے آراستہ کرنے لگے ہیں پھر ان میں آمدنی وصول کرنے اور کھانے پینے شور و شغب
کرنے خرید و فروخت کرنے کے لئے آتے ہیں اور یہ اس طریقہ کے خلاف ہے جو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کا تھا اس زمانہ میں مسجدوں کو ان خرافات سے پاک رکھا
جاتا تھا اور نماز و ذکر و تلاوت قرآن و تبلیغ احکام و فصل قضایا کے لئے مخصوص کیا جاتا تھا
پس مسلمانوں کو چاہیے کہ مساجد کو خرافات دنیا سے پاک رکھیں اور ان کی تعظیم بجا لائیں بے حرمتی
نہ کریں اگر مسلمان شعائر اللہ کی عظمت نہ کریں گے تو ان کی بھی دنیا میں کچھ عظمت باقی نہ رہیگی
جیسا آجکل مشاہدہ میں آرہا ہے ۱۲) ایک بزرگ نے کسی شخص کو مسجد میں تھوکتے ہوئے دیکھا فرمایا
گناہ کا کام نہ کر اس نے جواب دیا کہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسکو دفن کردیا جائے بزرگ موصوف
رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو تم کو گناہ سے روکتا ہوں اور تم جواب میں کفارہ کا ذکر کرتے ہو کیا تم

کو خبر نہیں کہ گناہ سے بچنا مغفرت طلب کرنے اور توبہ کرنے سے افضل و مقدم ہے میں نے ایک عالم کو جو علم و فتویٰ میں مقتدا تھے دیکھا کہ وہ مسجد میں بیٹھے ہوئے اس باغیچہ میں بھی تھوکنا پسند نہ کرتے تھے جو مسجد کے قریب تھا حالانکہ وہ مسجد کے فنا میں بھی داخل نہ تھا اور وہ مسجد کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے تھے پھر بھی مسجد میں بیٹھ کر باغیچہ میں نہ تھوکتے بلکہ مسجد سے باہر آ کر تھوکتے تھے تاکہ تھوکنے کی ابتدا بھی مسجد سے نہ ہو اگرچہ بلغم وغیرہ مسجد میں بیٹھ کر تھوکنے سے بھی مسجد میں نہ گر سکتا تھا مگر یہ اندیشہ ضرور تھا کہ کچھ حصہ مسجد میں گر جائے گو سوئی کے ناکہ کے برابر ہی ہو اور کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسجد ہی میں گر جائے باہر نہ جائے اور جو حدیث ہم نے بیان کی ہے وہ اس سے ممانعت پر شاہد ہے (مراد یہ حدیث ہے النخامة فی المسجد خطیئة وکفارتها دفنها کہ مسجد میں بلغم وغیرہ ڈالنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ دفن کر دینا ہے جس سے مطلقاً مسجد میں تھوکنے یا سنکنے کی ممانعت ہے) تو مجھے ان کا مسجد کے ساتھ یہ ادب و احترام بہت پسند آیا

قوله الوجه الاول رویته علیه السلام النخامة فی القبلة الی فاعجبنی ذلك الاحترام منه

ف اس تقریب سے معلوم ہوا کہ ہر وقت استغراق اور مراقبہ میں رہنا کمال نہیں بلکہ کمال یہ ہے کہ ہر وقت کے متعلق جو احکام شریعت کی طرف سے وارد ہوں ان کی نگہداشت رکھی جائے اور جن چیزوں کی نگرانی و خبر گیری انسان کے ذمہ ہے ان کی دیکھ بھال کرتا رہے مگر اس کا منشا حظ نفس نہ ہو بلکہ تعمیل حکم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کا مکلف کیا ہے عارف اور غیر عارف میں فرق یہی ہے غیر عارف اپنے نفس کی اہل و عیال و مال کی نگہداشت محض حظ نفس کے لئے کرتا ہے تعمیل حکم کا اس کو خیال بھی نہیں آتا اور عارف یہ سب کام تعمیل حکم کے لئے کرتا ہے نفس کے لئے غفلت کیساتھ کام نہیں کرتا قال القائل ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را
کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

ہم نے اپنے اکابر کو اسی طریق پر پایا ہے کہ وہ ہر دم استغراق میں نہیں رہتے بلکہ تعمیل احکام میں مشغول رہتے ہیں۔

ف: حدیث سے مساجد کے احترام کی بھی تاکید معلوم ہوئی افسوس آجکل عام طور پر اسی باب میں کوتاہی ہونے لگی ہے مساجد کے اندر دنیا بھر کے قصے اور فضول بکواس کی جاتی ہے بعض بے ادب تھوکنے میں بھی احتیاط نہیں کرتے ہم نے اپنے اکابر کو اس باب میں بہت محتاط پایا ہے مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت اقدس شیخ مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہ بریلی ایک مدرسہ کے جلسہ میں تشریف لے گئے جلسہ کی جگہ ایسے مقام پر تھی جہاں مسجد میں کو ہو کر جانا پڑتا تھا اور لوگ بے تکلف ہو کر جلسہ میں جا رہے تھے حضرت اقدس کو یہ خبر نہ تھی کہ جلسہ مسجد سے باہر ہوگا مسجد میں داخل ہونے کے بعد جب مجمع کو مسجد سے باہر دیکھا تو فرمایا کہ تم نے تو مسجد کو راستہ اور گذرگاہ بنالیا۔ بھائی تھوڑی دیر مسجد میں ٹھہر جاؤ کچھ ذکر اور تسبیح یا نماز یہاں پڑھ لو کچھ دیر بعد جلسہ میں چلیں گے چنانچہ حضرت نے اور حضرت کے خدام نے اسیطرح کیا فھکذا فلیکن احترام المساجد بیوت اللہ

(۲۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی صفائی کا خود اپنے ہاتھ سے اہتمام فرمایا ہے جسمیں آپ کی تواضع کا ثبوت ہے

حدیث کے اس لفظ میں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے ہاتھ سے کھرچ دیا چند علمی مسائل ہیں ایک یہ کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کا ثبوت ہے کہ حضور نے مسجد کی صفائی کا خود اپنے ہاتھ سے اہتمام فرمایا کسی دوسرے کو حکم نہیں دیا حالانکہ ہزاروں خدام موجود تھے دوسرے یہ کہ لوگوں کو بری بات سے منع کرنے کا یہ طریقہ زیادہ مؤثر ہے اور اسمیں مسجد کا احترام بھی کمال درجہ تھا کہ حضور نے اپنے دست مبارک سے تھوک اور بلغم کو اس مسجد کی دیوار سے صاف کیا ایک روایت میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے اس جگہ مشک بھی لگا دیا تھا۔ تیسرے یہ کہ نیک کام کرنیوالے کو یہ نہ چاہیئے کہ کسی نیک کام کو معمولی سمجھ کر چھوڑ دے (بلکہ ہر کام کیطرف پیش قدمی کرنا چاہیئے کیا خبر ہے اللہ تعالیٰ کو کونسا کام پسند آجائے کیونکہ جب مسجد سے تنکا نکالنے پر بھی ثواب ملتا ہے تو اس کام کا کیا پوچھنا؟ جس کا حضور نے اس قدر اہتمام فرمایا اسی کی نظیر وہ ہے جو بعض صحابہ کے

کیشتعلقہ منقول ہے کہ ایک غزوہ میں دو باپ بیٹوں نے اس بات کیلئے قرعہ اندازی کی کہ دونوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کون جائے؟ تو بیٹے کا نام قرعہ میں نکلا باپ نے کہا بیٹا اس غزوہ میں تو اپنی جگہ مجھے جانے دے بیٹے نے کہا ابا جان یہ تو جنت لینے کا معاملہ ہے اس میں اپنے اوپر میں آپ کو ترجیح نہ دوں گا چنانچہ وہی گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شہید ؑ ہو گیا۔

نیسرا اس میں تمام نیکیوں کے اکتساب کی ترغیب ہے، اگر چہ اس شخص کو ضرورت بھی نہ ہو حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں ولا تمنن تستکثر جس کی تفسیر میں بعض علماء نے فرمایا ہے کہ نیکی کرنے سے کم نہ بنو اور یہ نہ کہو کہ میرے پاس تو بہت نیکیاں ہیں جو مجھے کافی ہیں اور اس میں خطاب تو

ع ان حضرات کی شہادت کا کیا کہنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اللہ کے لئے اپنی جان نثار کرتے تھے اور گویا مرتے ہوئے حضور سے بزبان حال عرض کرتے تھے

بجرم عشق توام می کشند و غوغا ئیست   تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ئیست

انکی شہادت کا کیا پوچھنا جن کے جذبۂ شہادت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ تھے۔ اللہ اللہ حضرات صحابہ کو اللہ و رسول سے کیسی سچی محبت تھی کہ ان کے اپنے بچے اور نوجوان بھی شوق شہادت میں بوڑھوں اور پختہ کاروں سے پیش پیش تھے جنگ بدر میں ابوجہل کے قاتل دو نوجوان بچے ہی تھے حضرت سعد بن ابی وقاص کے چھوٹے بھائی عمر بن سعد سولہ سالہ نوجوان جنگ بدر کے موقعہ پر لشکر کی پیشی کیوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے چھپتے پھرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ حضور کی نظر پڑ جائے اور بچہ سمجھ کر لشکر سے الگ کر دیں حضرت سعد نے حضور سے ان کا حال عرض کیا تو آپ نے اجازت دیدی اس وقت ان کی خوشی کی کچھ انتہا نہ تھی خوشی خوشی بدن پر ہتھیار سجائے تو تلوار زمین پر گھسٹنے لگی اس کو بصورت سنبھال کرادنچا کرتے جاتے تھے با آخر اسی شوق اور تیزی میں جنگ کے وقت بڑے بڑے بہادروں کی مقابلہ میں جا ڈٹے اور ایک دو کو مارنے پر بس نہ کیا برابر بڑھتے چلے گئے اور شہید ہو گئے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں میں پھر یہ جذبۂ شوق شہادت پیدا فرما دیں تو ہمارے دن پھر جائیں مگر یاد رکھو یہ جذبہ اسلامی جھنڈے کے نیچے پیدا ہو سکتا ہے کفر کے جھنڈے تلے نہیں پیدا ہو سکتا جس میں کفر کی اسلام پر حکومت ہے ۱۲ ظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد امت کو تعلیم دینا ہے۔

قولہ وحکھا بیدہ فیہ من الفقہ وجوہ الی قولہ الخطاب فیہ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والمراد امتہ۔

(۱۷۳) مخالفت شریعت سے مسلمان کو تغیر ہونا چاہیئے

حدیث کا یہ لفظ کہ

اس سے آپ نے ناگواری ظاہر فرمائی یا آپ کی ناگواری لوگوں کو محسوس ہوئی اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ مومن جب کوئی ناگوار چیز دیکھتا ہے تو اس سے اسکو تغیر ہوتا ہے اور یہ تغیر اس کے ایمان کی مقدار کے موافق ہوتا ہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان سب سے زیادہ کامل تھا اس لئے اس ناگوار چیز سے آپ کو تغیر ہوا اور چونکہ وہ تغیر آپ کے چہرہ پر ظاہر ہوا اس مقام پر گفتگو ہو سکتی ہے کہ حضور کو تغیر اس وجہ سے ہوا کہ قبلہ کی بیحرمتی کی گئی تھی یا اس وجہ سے ہوا کہ اس حرکت کرنیوالے کو گناہ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنی طبیعت سے تمام عالم پر رحمت فرماتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فلا تذھب نفسک علیھم حسرات کہ ان کافروں پر حسرت اور رنج کر کے آپ کی جان نہ جاتی رہے تو مومنین کے ساتھ آپ کی رحمت کا کیا حال ہوگا؟ اور یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں باتوں کا مجموعہ سبب تغیر ہو اور یہی زیادہ ظاہر ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ حرمات الٰہیہ کی بیحرمتی کے موقع پر ان میں تغیر پیدا ہو جائے۔

جب کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پیش آئے اس وقت بھی سننے والے یا دیکھنے والے کی طبیعت میں تغیر پیدا ہونا چاہیئے

اور جب کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پیش آئے اس وقت بھی بالخصوص جبکہ وہ مصیبت دینی ہو کیونکہ یہ تو بہت بڑا خسارہ ہے اور اگر دین و دنیا دونوں میں مصیبت ہو تو اس کا کیا پوچھنا اس وقت تو زیادہ تغیر ہونا چاہیئے اور ان ہی مبارک صفات کی وجہ سے حضرات صوفیہ دوسروں پر سبقت لے گئے ہیں چنانچہ اسی کے موافق ایک بزرگ کی حکایت ہے

کہ بعض معاملات میں ایک شخص ان کا شریک تھا ایک دن اسکو بلایا گیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ وہ تو گناہ میں مبتلا ہے فرمایا میرا ساتھی اس حالت میں ہے اور میں زندہ ہوں پھر فوراً وضو کیا اور خلوت خانہ میں داخل ہو گئے اور یہ عہد کر لیا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اس کے بارہ میں میری سفارش منظور نہ فرمائیں گے باہر نہ آؤں گا۔ اس کے بعد وہ شریک گناہ سے فارغ ہوا تو کسی نے اس کو اطلاع کی کہ تم کو تمہارے شریک نے بلایا ہے وہ آیا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ وہ تو تیری ہی وجہ سے خلوت خانہ میں داخل ہو گئے ہیں یہ سن کر اس پر اثر ہوا اور کہنے لگا کہ ان سے کہدو اب باہر آجائیں میں قسم کھاتا ہوں کہ بخدا اب سے یہ حرکت نہ کرونگا پھر اس نے توبہ کی اور اسکی حالت اچھی ہو گئی۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ حدیث میں زجر کامل کے لئے کراہت (ناگواری) کا اظہار فرمایا ہو تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ دین کے ضروری احکام میں سے ہے، اس قسم کی مکروہات دیکھنے پر ہم کو بھی کراہت ظاہر کرنا چاہیئے یہی سنت ہے، ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آپ کو طبع مبارک کی وجہ سے طبعی طور پر بلا اختیار ناگواری پیش آئی ہو اور آپ نے اسمیں کچھ زیادت بالقصد فرمائی ہو تاکہ ہر شخص اس معاملہ میں آپ کی اقتداء کرے جس کو طبعاً ناگواری پیدا ہو وہ بھی اور جس کو طبعاً ناگواری نہ ہو وہ بھی تمام احتمالات میں یہ احتمال زیادہ ظاہر ہے۔

احکام الٰہی کی بے حرمتی کے موقعہ پر طبیعت میں ناگواری پیدا ہونا علاماتِ ایمان میں سے ہے

اور اس سے یہ مسئلہ ماخوذ ہو گا کہ ایسے مواقع پر طبیعت میں ناگواری کا پیدا ہونا ایمان کی علامت ہے چنانچہ ایک دوسری حدیث میں جو تغییر منکر کے متعلق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی تصریح فرمائی ہے کہ جس کو امر منکر کے مٹانے کی طاقت نہ ہو وہ قلب سے اس کو مٹائے (یعنی دل میں اس سے کراہت کرے اور اس کے زوال کی دعا کرے) وذلك اضعف الایمان حضور فرماتے ہیں اور یہ ایمان کا ادنی درجہ ہے۔

مواقع مذکورہ میں ناگواری زیادہ ہونا سنت ہے

اوراس ناگواری میں زیادتی ہونا سنت ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ہے۔

الوجه الثالث قوله ورئی منه کراهة الی قوله وتکون الزیادة فیه سنة واقتداء به صلی الله علیه وسلم

ف خلاصہ یہ کہ جب مسلمانوں پر کوئی دینی یا دنیوی مصیبت نازل ہونے کی خبر سنی جائے یا کوئی شخص برملا احکام الٰہیہ کی مخالفت کرے اس وقت دوسرے مسلمانوں کے دل کو بے حس نہ رہنا چاہیے بلکہ ان کی طبیعت میں تغیر پیدا ہونا چاہیے۔ پہلی صورت میں یہ تغیر شفقت کے رنگ میں ہوگا جیسا ایک حکایت کے ضمن میں گذرچکا ہے کیونکہ ان بزرگ کے سامنے اس شخص نے گناہ کا ارتکاب نہ کیا تھا بلکہ ان کو خبر پہنچی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ بےچین ہوگئے اوراس کے لئے دعا میں مشغول ہوگئے دوسری صورت میں یہ تغیر کراہت اور ناگواری اور غصہ کی صورت میں ہوگا جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی دیوار میں تھوک سنک دیکھ کر کراہت اور غصہ کا اظہار فرمایا یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو اولیاء اللہ سے ہر وقت شفقت اور نرمی ہی کے منتظر ومتمنی رہتے ہیں اور اگر وہ کسی بیجا حرکت پر ناگواری اور غصہ کا اظہار کریں تو اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تو اخلاق محمدیہ کے خلاف ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ احکام الٰہیہ کی مخالفت اور بےغیرتی کے موقع پر کراہت و ناگواری کا اظہار بھی اخلاق محمدیہ میں سے ہے۔ علماء اسلام نے اسکو سنت اور اقتداء نبوی میں داخل کیا ہے خصوصاً جب کوئی شخص اپنے کو اصلاح نفس کے لئے کسی کے سپرد کرنا چاہتا ہو اس کو تو شفقت ونرمی کی خواہش کا وسوسہ بھی دل میں نہ لانا چاہیئے کیونکہ اصلاح نفس آسان نہیں ہے اس کے لئے بڑے بڑے مجاہدات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب شیخ مصلح کو اختیار ہے خواہ اس سے مجاہدات شاقہ کرالے یا محض زجر و توبیخ سے ہی اصلاح کردے، اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں طالب اصلاح کا زیادہ نفع ہے کہ سہل مجاہدہ سے کام بن گیا مگر اس کی قدر وہی کرتا ہے جو واقع میں طالب ہے

ورنہ ناکام کے طالب اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ گھبرا جاتے ہیں سو ان کو مولانا رومی کا یہ ارشاد غور سے پڑھنا چاہیئے ؎

چوں بہر نسخے گریزانی ز عشق — تو بجز نامے چہ می دانی ز عشق

(۱۷۴) نماز میں حق تعالیٰ سے مناجات کی حقیقت

حدیث کا یہ لفظ کہ جب کوئی نماز پڑھتا ہے تو اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے الخ اس میں یہ سوال ہوگا کہ اس مناجات کی حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ لغۃً مناجات یہ ہے کہ دو آدمیوں یا دو سے زیادہ کے درمیان خفیہ بات چیت ہو اور یہاں تو بات کرنیوالا ایک ہی ہے (یعنی ظاہر میں صرف نمازی ہی تنہا بات کرنیوالا ہے تو مناجات کیونکر ہوگی، اس حقیقت کو ایک بزرگ نے بیان فرمایا ہے جو علم اور اتباع سنت میں مقتدا تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ کس حالت میں ہیں؟ میں اچھی حالت میں ہوں۔ میں عبادت میں دو حالتوں کے درمیان ہوں کبھی اپنی تسبیح اور دعا سے میں اپنے مولا کے ساتھ باتیں کرتا ہوں کبھی وہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں جبکہ میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتا ہوں کہ اس وقت پڑھنے والا تو میں ہوتا ہوں اور مجھ سے خطاب کرنیوالے وہ ہوتے ہیں۔

الوجہ الرابع قولہ اذا قام یصلی فانما یناجی ربہ الی قولہ وھو المخاطب لی

ف ان بزرگ نے جو یہ فرمایا ہے کہ تلاوت کتاب اللہ کے وقت پڑھنے والا تو میں ہوتا ہوں اور مجھ سے خطاب کرنیوالے وہ ہوتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ اپنے کسی غلام یا نوکر کو کچھ ہدایتیں لکھ کر دے کہ ان کو پڑھ لو اور ان کے موافق عمل کرو تو یہ شخص جس وقت وہ ہدایتیں پڑھے گا اس وقت پڑھنے والا تو وہ ہوگا مگر اس سے خطاب کرنے والا بادشاہ ہوگا کیونکہ اس میں اس قسم کی باتیں ہوں گی کہ تم کو یہ کرنا چاہیئے اس طرح چلنا چاہیئے فلاں بات سے بچنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ اور یہ خطاب تمام تر بادشاہ کی طرف سے ہے یہی حال نمازی کا ہے جس وقت وہ نماز میں یا نماز کے علاوہ کسی وقت قرآن کی تلاوت کرتا ہے اس وقت پڑھنے والا تو وہ ہے مگر اس سے خطاب کرنیوالے حق تعالیٰ ہیں کیونکہ قرآن

میں جو کچھ بھی ہے بندوں کے لئے ہدایات ہی تو ہیں کہ تم کو یہ کرنا چاہیئے وہ نہ کرنا چاہیئے اللہ کے خاص بندوں کے طریقہ پہ چلنا چاہیئے مردودوں کے راستہ سے دور رہنا چاہیئے۔ پہلی صورت میں تم کو یہ انعام و اجر ملے گا۔ دوسری صورت میں سخت عذاب و مصیبت کا سامنا ہوگا وغیرہ وغیرہ

ف بعض اہل حال کو تلاوت قرآن کے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے بھی حق تعالیٰ ہیں اور خطاب کرنے والے بھی ہیں اور درمیان میں بندہ کی حالت وہ ہے جو شجرہ موسیٰ کی حالت تھی جبکہ ان کو درخت میں سے آواز آئی تھی انی انا اللہ رب العالمین کہ میں ہوں اللہ تمام جہانوں کا پالنے والا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت خطاب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا اور کہنے والے بھی وہی تھے درخت کا اس میں کچھ بھی دخل اس کے سوا نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر آواز پیدا کر دی تھی اسی طرح بعض دفعہ عارف کی حالت تلاوت قرآن کے وقت ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا اسکی ہستی درمیان سے غائب ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر آواز پیدا کر دی ہے جس سے یہ خود نہیں بول رہا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کلام فرمارہے ہیں وہی خطاب فرمارہے ہیں اس کا اس میں کچھ دخل نہیں، یہ حالت جب ترقی پاتی ہے تو ذکر میں بھی اس کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود نہیں بول رہا بلکہ اس کے اندر آواز پیدا کر دی گئی ہے اللہ تعالیٰ خود ہی اپنا ذکر فرمارہے ہیں جس پر یہ حالت طاری ہو اس کو اس وقت شیخ کے پاس رہنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اس کو حدود سے باہر نہ ہونے دے، اگر بندہ اس حالت میں حدود پہ قائم رہا تو ایسے عالی مقام تک ترقی ہوگی جس کا اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا اور جو اس حالت میں حدود سے نکل گیا اس کے لئے خطرہ ہے اگر اس کے ارادہ اور قصد کو کچھ بھی حد سے نکلنے میں دخل ہوا۔

حفظنا اللہ وایاکم من کل شرور و رزقنا الثبات علی السنۃ النبویۃ و الصراط المستقیم ؏

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است ۔ ہشیار و گوش را بہ پیام[ع] سروش دار

ع پیام سروش سے مراد وحی الٰہی ہے قالہ سیدی حکیم الامت دام مجدہ و علاہ ۱۲ ظ

ف: اس مقام پر دل میں تقاضا ہے کہ نماز کی مناجات کو ذرا کھول کر بیان کر دیا جائے کیا عجب ہے کہ کسی کو اس سے نفع ہو اور وہ اس ناکارہ روسیاہ کیلئے دعا کر دے اور مجھے اس پر عمل کی توفیق ہو پس سمجھنا چاہیئے کہ نماز کے وقت عارفین کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ یقین کیساتھ یہ سمجھ کر کھڑے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ ہم نماز میں کہتے ہیں اس کو سن رہے ہیں اور ہر بات کا اس کے مناسب جواب دے رہے ہیں چنانچہ جس وقت وہ نماز کے لئے دونوں ہاتھ اٹھا کر تکبیر تحریمہ کہتے ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کبرنی عبدی وذھل عما سوای میرے بندے نے میری بڑائی کو پہچان لیا اور میرے ماسوا سے الگ ہو گیا۔ جب وہ ثناء پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں حمدنی عبدی میرے بندے نے میری حمد کی جب وہ کہتا ہے الرحمن الرحیم حق تعالیٰ فرماتے ہیں اثنی علی عبدی میرے بندہ نے میری ثنا کی جب وہ کہتا ہے مالک یوم الدین حق تعالیٰ فرماتے ہیں مجدنی عبدی میرے بندہ نے میری بندگی بیان کی جب وہ کہتا ہے ایاک نعبد وایاک نستعین حق تعالیٰ فرماتے ہیں ھذا بینی وبین عبدی یہ بات میرے درمیان اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے (یعنی بندہ کی عبادت تو میرے لئے ہے اور میری مدد اس کے لئے ہے) جب وہ کہتا ہے اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین تو حق فرماتے ہیں ھذا لعبدی ولعبدی ما سال یہ میرے بندے کی درخواست ہے اور جو وہ مانگتا ہے میں نے اس کو دیدیا۔ جب وہ اس کے بعد قرآن کی کوئی سورت پڑھتا ہے تو فرماتے ہیں فتحت لعبدی الابواب معرفتی ھدایتی میں نے اپنے بندے کے لئے معرفت وہدایت کے دروازے کھول دیئے جب وہ تکبیر کہتا ہوا رکوع کرتا ہے تو وہ فرماتے ہیں کبرنی عبدی وعرف عظمۃ صفاتی فرکع لی میرے بندے نے میری بڑائی کا اقرار کر لیا اور میری عظمت صفات کی معرفت حاصل کر کے میرے سامنے جھک گیا، جب وہ سمع اللہ لمن

حمدہ ربنا ولک الحمد کہتا ہے تو فرماتے ہیں سمعت لعبدی وقبلت حمدہ میں نے اپنے بندے کی بات کو سن لیا اور اسکی حمد کو قبول کیا، جب وہ تکبیر کہتا ہوا سجدہ کرتا ہے تو فرماتے ہیں کبرنی عبدی وعرف علو ذاتی فسجد لی میرے بندے نے میری بڑائی کا اقرار کیا اور میری علو ذات کی معرفت حاصل کر کے سجدہ میں گر گیا جب وہ تکبیر کہتا ہوا سجدہ سے سر اٹھاتا ہے فرماتے ہیں کبرنی عبدی وعرف عجزہ عن ادراکی میرے بندے نے میری بڑائی کا اقرار کیا اور میری ذات کے ادراک سے اپنی عجز و کمزوری کو جان لیا جب دوبارہ سجدہ کرتا ہے فرماتے ہیں کبرنی عبدی وسجد لی تقربا الیّ میرے بندے نے بڑائی کا اقرار کیا اور مجھ سے قرب حاصل کرنے کے لئے پھر سجدہ کیا۔ جب تکبیر کہتا ہوا دوسری رکعت میں کھڑا ہوتا ہے فرماتے ہیں کبرنی عبدی وتقرب الیّ میرے بندے نے میری بڑائی کا اقرار کیا اور مجھ سے قرب حاصل کر لیا پھر فاتحہ اور رکوع و قومہ وسجدہ میں وہی معاملہ ہوتا ہے جو رکعت اولی میں ہوتا ہے جب وہ دوسری رکعت میں التحیات کے لئے بیٹھتا ہے تو فرماتے ہیں وصل عبدی الی مجلس قربی فحیانی بتحیتی وحیّا اہل مجلسی بتحیتہم وشھد لی بشہادۃ الحق میرا بندہ میری مجلس قرب میں پہنچ گیا اور میری شان کے مناسب تحیۃ اور تعظیم بجالایا اور میری مجلس والوں کا بھی ان کے درجے کے مناسب ادب کیا اور میرے سامنے سچی شہادت پیش کی۔ قعدہ اخیرہ میں جب التحیات کے بعد جب درود شریف پڑھتا ہے تو فرماتے ہیں توسل الیّ عبدی بحبیبی وخلیلی میرے بندہ نے میرے حبیب اور خلیل کو وسیلہ بنایا اس کے بعد جب وہ دعا کرتا ہے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں ما جزاء عبد وفی عمله اس بندہ کی جزا کیا ہے جو اپنا کام پورا کر دے ملائکہ عرض کرتے ہیں ربنا جزاءہ ان یوفی اجرہ اس کی جزا یہ ہے کہ اس کو پورا اجر دیا جائے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں اشھدوا فقد غفرت لعبدی واستجبت دعاءہ وادخلتہ فی عبادی الصالحین گواہ رہو میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا اس کی دعا و عبادت قبول کی

اوراس کو اپنے لائق بندوں میں داخل کر لیا، اس کے بعد بندہ خوشی خوشی دائیں بائیں فرشتوں کو اور دوستوں کو سلام کرتا ہے گویا اپنی کامیابی کی بشارت سناتا ہے اس تفصیلی مناجات میں سورۂ فاتحہ کے اندر جو کچھ لکھا گیا ہے کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں وہ تو حدیث صحیح کا مضمون ہے اور بقیہ حالات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں وہ قلبی واردات ہیں جو انشاء اللہ حدیث انا عند ظن عبدی کے تحت میں داخل ہیں۔

رزقنا اللہ وایاکم تمام الصلوٰۃ وتمام رضوانہ وختم لنا بالحسنیٰ آمین

(۱۷۵) قرآن کلام اللہ ہے، جب قاری قرآن پڑھتا ہے اللہ کا کلام پڑھتا ہے اگرچہ پڑھنا قاری کا فعل ہے

حدیث کا یہ لفظ کہ نمازی اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے، اہل سنت کی دلیل ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور قرات قاری کا فعل ہے اور جو کچھ وہ پڑھتا ہے وہ اللہ کا کلام ہے قاری کا کلام نہیں اور صفت موصوف سے جدا نہیں ہوتی (تو جس وقت بندہ قرآن پڑھتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کلام فرماتے ہیں) اس صورت میں نماز حقیقتہً مناجات ہوگی کیونکہ وہ قرات قرآن اور تسبیح و دعا پر مشتمل ہے۔ جس میں تسبیح و دعا تو بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی جناب میں (عرض و معروض) ہے اور قرات قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو خطاب ہے، اسی لئے بعض اہل اہل صفا اور مبارک حالات والوں نے کہا ہے کہ جب وہ حضور کامل کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں تو اس وقت قوت یقین اور تصدیق کامل کی وجہ سے حروف کی حرکات کے دائرہ سے نکل جاتے اور بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کا کلام بلا صوت و حروف کے سنتے ہیں اور اس حالت کو اہل ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں جو حدود سنت کے موافق سلوک طے کرتے ہیں مگر ایسے بہت کم ہیں۔

الوجہ الخامس قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فانما یناجی دلیل لاھل السنۃ

الیٰ قولہ وقلیل ماھم۔

ف:۔ اس مقام کی طرف اشارہ اوپر گذر چکا ہے ملاحظہ فرمایا جائے۔

(۱۷۶) اللہ تعالیٰ جسم اور حلول سے پاک ہیں اور اس جملہ کا فائدہ کہ اللہ تعالیٰ نمازی کے اور قبلہ کے درمیان ہوتے ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اس کا رب اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے۔ اہل تجسیم و اہل حلول کے بطلان دعوٰی کی دلیل ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ حلول اور تحیز اللہ تعالیٰ شانہ کے حق میں محال ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ جل جلالہ ان کے قول کے موافق (معاذ اللہ) عرش پر حلول کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہاں بھی ہوتے اور نمازی کے اور اس کے قبلہ کے درمیان بھی ہوتے اور سوچو تو سہی کہ ایک ہی زمانہ میں زمین کے مختلف اقطار و جوانب میں مختلف جہات میں کتنے نمازی (نماز میں مشغول) ہوتے ہیں اگر حق تعالیٰ ہر جگہ حلول و تجسم کے ساتھ موجود ہوں گے تو یا ذات خداوندی میں تعدد لازم آئیگا کہ خدا ایک نہیں بلکہ بہت سے ہیں یا اس کی ذات میں تقسیم جاری ہوگی (کہ خدا کا کچھ حصہ کسی جگہ ہے کچھ حصہ کسی جگہ ہے) اور یہ ہمارے نزدیک بھی اور ان کے نزدیک بھی بالاتفاق محال ہے۔ پس تاویل سے چارہ نہ ملا تو جیسے ہم تاویل بیان کرتے ہیں اسیطرح دوسری حدیثوں اور آیتوں میں بھی تاویل کریں گے۔ اس اجمالی اشارہ کے بعد اب ہم یہ تبلاتے ہیں کہ اس لفظ میں فائدہ کیا ہے کہ کہ اس کا رب نمازی کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے تو اس میں بطور کنایہ کے بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خیر و برکت نمازی کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو پوری طرح احاطہ کئے ہوئے ہیں کیونکہ جب وہ نمازی کے اور قبلہ کے درمیان ہیں تو اس کی حرکت و سکون ان سے پوشیدہ نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ونحن اقرب الیہ من حبل الورید ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اسی احاطہ سے کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو محیط ہیں جزئیات کو بھی کلیات کو بھی قریب

کو بھی بعید کو بھی مخفی کو بھی علانیہ کو بھی، غرض تمام جہانوں کو یکساں طور پر محیط ہیں اللہ سبحانہ سے ان کی کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں۔

ف: بعض لوگوں کو بعض آیات واحادیث سے یہ شبہ ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اسی طرح بیٹھے ہیں جس طرح انسان تخت پر بیٹھتا ہے۔ یہ اعتقاد باطل اور غلط ہے بہت سے جاہل صوفی اس غلطی میں مبتلا ہیں اور بعض کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کی صورت میں حلول کر لیتے ہیں جیسا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نصاریٰ کا عقیدہ ہے۔ یہ اعتقاد بھی توحید کے خلاف اور غلط ہے اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے پاک اور منزہ ہیں جسطرح ہم ان کی ذات کے ادراک سے عاجز ہیں ان کی صفات کی حقیقت سمجھنے سے بھی قاصر ہیں اور جتنا اپنی سمجھ کے موافق ہم سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بھی وراء الوراء ہیں صوفی کو اپنا اعتقاد اہل سنت کے موافق درست رکھنا چاہیئے کہ اس کے سوا جتنے اعتقادات ہیں باطل و غلط ہیں۔

(۱۷۷) اللہ تعالیٰ جہت و مکان سے منزہ ہیں اور تعیین قبلہ کی حکمت

اس ارشاد میں حکمت یہ ہے کہ عبادت کرنیوالا چونکہ حادث ہے مکان میں مقید ہے اور معبود برحق حدوث اور مکان سے منزہ ہے تو اس فانی محتاج کو ذات قدیم جلیل سے قرب ممکن نہ تھا خصوصاً جبکہ وہ عابدوں کی عبادت سے مستغنی بھی ہے اور یہی اس کی عبادت کے محتاج ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے عبادت کرنیوالوں کے لئے عبادت کی جہت اور کچھ علامات ان کے حدوث کے مناسب متعین کر دیں اور ان کو اپنی ذات جلیلہ کی طرف منسوب کر دیا جس سے ان علامات کو بھی شرف و رفعت عطا کی گئی اور بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس عبادت (ناقصہ) کو ان سے قبول فرما لیا اور اس کی وجہ سے ان سے راضی ہوگئے اسی لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

کہ تم جس طرف بھی منہ کر لو اللہ کی ذات ادھر ہی ہے

شان نزول یہ ہے کہ جب قبلہ بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کیطرف محول کیا گیا اور
کچھ لوگ بیت المقدس کیطرف نماز پڑھتے ہوئے انتقال کر گئے بیت اللہ الحرام کیطرف
نماز پڑھنے کا ان کو موقعہ نہ ملا توان کے خاندان والوں پر ان کی یہ حالت گراں ہوئی کیونکہ
ان کے خیال میں دیوار کعبہ مقصود تھی رجس کیطرف استقبال کا ان کو موقع نہ ملا تو اللہ
تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

تم جسطرف بھی منہ کرو اللہ کی ذات ادھر ہی ہے

مطلب یہ ہے کہ تم نے جس طرف رُخ کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا قصد کیا اور اس کے
حکم کی تابعداری کی ادھر ہی تم اس کو پاؤ گے یعنی ہر حالت میں وہ تم پر فضل واحسان
فرمائیں گے تمہارے اعمال کو قبول فرمائیں گے اوران کا اچھا بدلہ دیں گے کیونکہ مقصود
کوئی خاص جہت یا خاص دیوار نہیں بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کا امتثال اور تابعداری ہے
توجو لوگ بیت المقدس کیطرف استقبال کرتے ہوئے فوت ہو گئے ان کے ثواب
میں کچھ کمی نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت وہی حکم تھا جسکی انہوں نے تعمیل کی تو چونکہ
اس جہت (قبلہ) کی نسبت اللہ تعالیٰ کیطرف کر دی گئی ہے تو حکمت کا مقتضا یہ ہے
کہ اس کا کامل احترام واجب یا مستحب ہو (نہ اس کی ذات کی وجہ سے بلکہ) اسکی
وجہ سے جس کی طرف اسکی نسبت کی گئی ہے اسی کو بعض عشاق نے کہا ہے

وما حب الدیار شغفن قلبی

ولکن حب من سکن الدیار

منازل کی محبت نے مجھ کو فریفتہ نہیں کیا بلکہ اس کی محبت نے جوان منازل کے اندر ہے
تو ایک مخلوق کی وجہ سے دوسری مخلوق محبوب ہوجاتی ہے اور محبوب کے نزول کے منازل بھی
معظم ہو جاتے ہیں اسی لئے محققین اس اضافت شریفہ کی وجہ سے اس اضافت کے
تمام نشانوں کی تعظیم کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اہل معاملات کو رجن کا معاملہ اللہ سے
درست ہے) ہر نوع کی عبادت سے ایسی لذت و راحت حاصل ہوتی ہے جیسی اہل دنیا

کو شہوت سے لذت حاصل ہوتی ہے چونکہ مسجد کو بھی اس نسبت شریفہ کی وجہ سے ایک خاص حرمت حاصل ہے اسلئے خلاف حرمت افعال سے کراہت اور ممانعت وارد ہوئی اور اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات ہوتی (جیسے اہل حلول کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کعبہ میں یا مسجد میں حلول کئے ہوتے ہیں) تو اس کی سزا ضرب یا قتل ہوتی (محض کراہت اور ممانعت پر اکتفا نہ کیا جاتا) اس تحقیق سے بھی اس حجت کی تائید ہوگئی جو ہم نے اہل حلول و اہل تجسیم کے مقابلہ میں بیان کی ہے۔

تعالی اللّٰہ عن ذلک علوا کبیرًا ، قولہ الوجہ السابع منہ من الحکمۃ ان العبادۃ لما کانت من محدث متحیز الی قولہ تعالی اللّٰہ عن ذلک علوا کبیرا۔

ف بعض معاندین نے اہل اسلام پر اعتراض کیا ہے کہ وہ ہم کو بت پرستی سے منع کرتے ہیں اور خود کعبہ کی پرستش کرتے ہیں، اس کا جواب مفصل دیکھنا ہو تو رسالہ قبلہ نما مؤلفہ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ میں ملاحظہ کیا جاوے۔ نیز رسالہ اشرف الجواب حصہ اول کا بھی مطالعہ کیا جاوے۔

مختصر جواب یہ ہے کہ جو جس کی عبادت کرتا ہے وہ اس کی عبادت سے انکار نہیں کر سکتا اور مسلمان صاف کہتے ہیں کہ ہم کعبۃ اللہ کی پرستش نہیں کرتے نہ اس کو معبود سمجھتے ہیں نہ اس کی ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو عابد معبود سے کیا کرتا ہے پس مسلمانوں پر عبادت کعبہ کا الزام محض بہتان و اتہام ہے، اسلام کا مسئلہ ہے کہ جو شخص کعبہ کو معبود سمجھ کر اسی کو سجدہ کا قصد کرے وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک ہے۔ اب مسلمانوں کا جو برتاؤ کعبہ کے ساتھ ہے وہ بھی ملاحظہ ہو مسلمان کعبہ میں داخل ہوتے ہیں ضرورت کے وقت اس کی چھت پر بھی چڑھتے ہیں جس میں اس کے اوپر پاؤں رکھے جاتے ہیں اور کوئی عابد اپنے معبود پر پاؤں نہیں رکھ سکتا نماز کے بعد مسلمان کعبہ کی طرف پشت کر لیتے ہیں بعض کعبہ سے کمر لگا کر اللہ کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں اور کوئی عابد اپنے معبود سے کمر لگا کر نہیں بیٹھ سکتا، بعض دفعہ کعبہ کی از سر نو تعمیر کرلے منہدم بھی کیا گیا اس وقت کعبہ کا کچھ حصہ زمین پر نہ تھا مگر نماز اس

وقت بھی ہونی رہی موقوف نہیں ہوئی جو اسکی صاف دلیل ہے کہ کعبہ معبود نہیں ورنہ کعبہ کی عدم موجودگی میں عبادت بھی موقوف ہو جاتی ۔ بس مسلمانوں کو کعبہ سے صرف اتنا تعلق ہے کہ نماز میں اسکی طرف منہ کرتے ہیں مگر کسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا اس کے معبود ہونے کو مستلزم نہیں دیکھو مسجدوں میں عام طور سے ایک دو نہیں چار پانچ صفیں نمازیوں کی ہوتی ہیں جن میں دوسری صف والوں کا منہ پہلی صف والوں کی طرف ہوتا ہے اور تیسری صف والوں کا دوسری صف والوں کی طرف تو کیا پہلی صف والے ان کے معبود ہو گئے ؟ ہرگز نہیں ، آدمی جس طرف بھی منہ کرے گا اس کے سامنے کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہوگی تو معلوم ہوا کہ نماز میں کسی چیز کا سامنے ہونا معبودیت کو مستلزم نہیں بلکہ معبودیت کے لئے قصد عبادت ضروری ہے سو اس کو مسلمانوں کی نماز دیکھ کر معلوم کر لیا جائے کہ اس کے جملہ اذکار وادعیہ میں کہیں بھی کعبہ کی عبادت کا ذکر نہیں آتا بلکہ اول سے اخیر تک اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا ذکر آتا ہے ۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین

اے اللہ ! ہم صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں

رہا یہ کہ مسلمان کعبہ کی طرف منہ کیوں کرتے ہیں سو اس سوال کا کسی کو حق نہیں لیکن تبرعاً ہم اس کا بھی جواب دیتے ہیں کہ زمین میں سب سے پہلے عبادت گاہ کعبہ ہے اس لئے مسلمانوں کو نماز میں اس کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا تاکہ ہر شخص اپنی رائے سے اپنا الگ قبلہ تجویز نہ کرے کہ اس میں نزاع کا بھی احتمال تھا اور نہ رد معبودین کا بھی اور قدیم عبادت گاہ کو قبلہ بنانے میں یہ تمام احتمالات مرتفع تھے نیز اس میں کسی خاص جہت کی تخصیص و ترجیح بھی باقی نہ رہتی تھی اگر کوئی شخص ہوائی جہاز پر سوار ہو کر تمام عالم کے مسلمانوں کو نماز کے وقت دیکھے تو کسی کو مغرب کی طرف نماز پڑھتا ہوا پائے گا کسی کو مشرق کی طرف کسی کو جنوب کی طرف کسی کو شمال کی طرف جس سے صاف معلوم ہو جائیگا کہ مسلمانوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی خاص جہت مخصوص نہیں اینما تولوا فثم وجہ اللہ ، تم جس طرف بھی منہ کر لو اللہ کی ذات ادھر ہی ہے پھر چونکہ نماز اللہ تعالیٰ

کی عظیم الشان عبادت ہے اور کعبہ قبلۂ نماز ہے تو اس نسبت و اضافت کی وجہ سے کعبہ کا احترام لازم ہوا مگر احترام سے معبودیت لازم نہیں احترام تو انبیاءؑ علیہم السلام اور قرآن کریم کا بھی واجب ہے مگر ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کا معبود نہیں بلکہ سب جانتے ہیں کہ ان کا احترام محض اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی وجہ سے ہے سو درحقیقت یہ ان کا احترام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کا احترام ہے، رہا حجر اسود کو چومنا سو یہ بھی عبادت نہیں بلکہ محبت کا بوسہ ہے جیسا اپنے بیوی بچوں کو چوما کرتے ہیں۔ رہا یہ کہ اس سے محبت کیوں ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حجر اسود جنت کا پتھر ہے۔ عالم آخرت کی نشانی اور یادگار ہے اور مسلمانوں کو آخرت سے جو اُن کا اصلی وطن ہے محبت ہے اور وطن کی چیز محبوب ہوتی ہے اس لئے حجر اسود ان کو محبوب ہے، خوب سمجھ لو۔



باب بست و ہشتم

حدیث

حُبُّہٗ صلی اللہ علیہ وسلم التیامن

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیامن کو یعنی دائیں طرف سے شروع کرنے کو اپنے ہر کام میں پسند کرتے تھے جہاں تک ہو سکتا، پاکی میں بھی، کنگھی کرنے میں بھی اور جوتہ پہننے میں بھی۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا محبوب تھا اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۷۸) دین کا ہر جزو مطلوب ہے، فرض بھی نفل بھی مستحب بھی

حدیث سے معلوم ہوا کہ عدم استطاعت ترک مستحب کے لئے عذر ہے یعنی اگر استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے مستحب فوت ہو جائے تو یہ شخص معذور ہے (مثلاً کسی کے دائیں ہاتھ میں زخم ہو چوٹ ہو اس لئے بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہو) اور جب فرائض میں بھی عدم استطاعت عذر ہے تو مستحباب میں بدرجہ اولیٰ۔ رہا یہ سوال کہ پھر حضرت عائشہ نے مستحب میں اس کو کس لئے ذکر کیا جبکہ فرائض میں بھی اس کا عذر ہونا معلوم تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مستحباب کی بجا آوری کی تاکید مقصود

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مستحب سے وہی شے مانع ہوسکتی تھی جو فرض سے
مانع ہوسکتی ہے کیونکہ دین سب کا سب یکساں مطلوب ہے، فرض بھی نفل بھی مستحب
بھی ہر ایک اپنے اپنے درجہ میں مقصود ہے کسی کو بلا وجہ نہیں چھوڑا جا سکتا اور یہ علم
فقہ کا عظیم الشان قاعدہ ہے پہلے بھی اس کی نظیر گذر چکی ہے۔

قولہ الوجہ الثانی فیہ دلیل علی ان عدم الاستطاعۃ عذر فی
ترك المستحب الی قولہ وقد تقدم مثلہ

ف یہاں سے مومنین کے اس مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ وہ مستحبات کا بھی
اہتمام فرماتے ہیں بلا عذر ان کو ترک نہیں کرتے لیکن اس کی ساتھ یہ قید ضروری ہے کہ ہر چیز
اپنے درجہ پر رہے درجہ سے آگے نہ بڑھنے پائے جس کی طرف شارح نے اشارہ بھی کر دیا
ہے پس اگر کسی وقت کسی مستحب کو اس کے درجہ سے بڑھا کر واجب سمجھ لیا جائے یعنی
عوام اس کے ساتھ واجب کا سا معاملہ کرنے لگیں مثلاً تارک پر ملامت وطعن کرنے
لگیں اور اس کی بجا آوری کے لئے دیگر احکام کو فوت کرنے لگیں مثلاً قرض کر کے اس
کو پورا کریں وغیرہ وغیرہ تو ایسی حالت میں اس مستحب کا اہتمام نہ کیا جائے بلکہ اس کے
اہتمام سے روکا جائے گا اور یہ حقیقت میں مستحب سے روکنا نہ ہوگا بلکہ ابتداع سے
روکنا ہوگا خوب سمجھ لو۔

(۱۷۹) تعلیم اور بیان میں اولاً اجمال پھر تفصیل ہونا چاہیئے

حضرت عائشہ رضؓ نے اول تو مجملاً یہ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام میں تیامن
کو پسند کرتے تھے پھر تین کاموں کو بطور مثال کے ذکر فرمایا اس میں اس اجمال کی تفصیل ہے
کیونکہ انہوں نے پاکی کا ذکر فرمایا ہے جو مفروضات میں اعلیٰ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ پاکی آدھا ایمان ہے پھر کنگھی کا ذکر کیا جو سنن زوائد
میں زیادہ مؤکد ہے پھر جوتہ پہننے کا ذکر فرمایا جو مباحات میں سب سے بڑھ کر ہے تو
بتلا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام فرائض اور مستحبات اور مباحات میں

یہی حالت تھی کہ سب میں تیامن کو پسند فرماتے تھے۔ اس سے یہ علمی مسئلہ مستنبط ہوا کہ تعلیم اور بیان میں اولاً اجمال سے کام لینا تاکہ یاد کرنا سہل ہو پھر تفصیل اور تقسیم سے کام لینا تاکہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے بہترین طریقہ ہے۔

قولہ الوجہ الرابع فیہ زوال الالتباس الی قولہ والتقسیم بعد من اجل التفہیم

ف۔ آداب کلام کی رعایت کرنا حضرات صوفیہ کا خاص مذاق ہے جسکی تائید حضرات صحابہ کے طرز کلام سے ہوتی ہے جو سب سے زیادہ متبع سنت تھے۔

(۱۸۰) جس چیز کو اللہ نے ترجیح دی ہے اس کو ترجیح دینا چاہیئے

اس میں حکمت کیا تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ اس میں اس شے کی ترجیح کا اظہار تھا جس کو خدائے حکیم نے اپنی حکمت سے ترجیح دی ہے واللہ اعلم

تفصیل اس کی یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یمین کو دائیں جانب کو فضیلت دی ہے اور اہل یمین کو بھی فضیلت دی ہے ان کی تعریف فرمائی ہے چنانچہ اہل جنت کو بھی اہل یمین کہا گیا ہے اور جہنمیوں کو اصحاب شمال تو حضور کو اس چیز سے محبت تھی جس کو علیم حکیم نے ترجیح دی ہے اور یہ محبت درحقیقت تعظیم شعائر کی انتہا پر پہنچنے کی دلیل ہے کہ قلب مبارک کو اس سے خاص شغف تھا اسی لئے ہر کام میں ترجیح یمین کا اہتمام فرماتے تھے اور یہ امر قوت ایمان پر دال ہے تو جس شخص کو اپنے دل میں اس محبت یمین کا احساس ہو۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے محبت تھی تو اس کو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور اگر کسی کو اپنے دل میں اس محبت کا احساس نہ ہو اسے حضور کا اتباع کرنا اور اس محبت کی تحصیل کے اسباب پر عمل کرنا اور محبین کے ساتھ تشبہ کرنا چاہیئے کہ اس سے بھی عمل صالح کی محبت دل میں پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے بعض حکماء نے فرمایا ہے

ان التشبہ بالکرام فلاح

بزرگوں کے ساتھ تشبہ کرنا بھی کامیابی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے کھیعص (سورہ مریم) کا سجدہ تلاوت کر کے سجدہ کیا فرمایا یہ تو سجدہ ہے مگر رونا کہاں ہے یہ اس لئے فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جب اللہ کے نیک بندوں کے سامنے اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں روتے ہوئے اس مقام پر امت محمدیہ کو ان حضرات کی تقلید و اتباع میں سجدہ کا حکم ہے کہ تم بھی ان کی طرح سجدہ میں گر جاؤ۔ عبداللہ بن عباس نے متنبہ فرمایا کہ علماء کی تقلید کامل جب ہوگی کہ سجدہ کے ساتھ رونا بھی ہو کیونکہ وہ حضرات روتے ہوئے سجدہ میں گرتے تھے اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنا لو کہ یہ تو اپنے اختیار میں ہے اگر رونا اختیار میں نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اہل خیر کے ساتھ تشبہ کرنا صلحاء کی صورت بنانا خیر ہے جب کہ ان کی محبت اس تشبہ کا منشا ہو اور محبت اللہ عزوجل کے واسطے ہو کسی اور غرض سے نہ ہو اور اسی قیاس عکس کے طور پر یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل شر کیساتھ تشبہ کرنا شر ہے اسکی تائید اس سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کے تشبہ سے منع فرمایا ہے چنانچہ قیاس مؤید بالحدیث ہوگیا نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من تشبہ بقوم فھو منھم

جو جس جماعت سے تشبہ کریگا وہ ان ہی میں شمار ہوگا

یہ حدیث اپنے عموم سے تشبہ باہل الخیر و تشبہ باہل الشر دونوں کو شامل ہے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل سے صلحاء کی مشابہت عطا فرمائے حالاً بھی اور مقالاً بھی

قولہ الوجہ الرابع واما الحکمۃ فی کونہ صلی اللہ علیہ وسلم یحبہ و فی الوجہ الخامس یترتب علی ذلک من الفقہ ان التشبہ باھل الخیر من الخیر الی قولہ من اللہ علینا باحوالھم حالاً و مقالاً

مسئلہ تشبہ حضرات صوفیہ کو اہل خیر کے تشبہ کا جسقدر اہتمام ہے ظاہر ہے اسیطرح اہل شر کے تشبہ سے بھی وہ بہت احتراز کرتے ہیں افسوس ہے کہ

آج کل بعض علماء نے اس میں بہت کوتاہی اختیار کر رکھی ہے انگریزوں سے نفرت کا دعویٰ

ہے مگر انگریزیت سے محبت ہے۔ رزولیوشن، الیکشن، ووٹ، کثرت رائے پر فیصلہ ان کے جلسوں کا شعار ہے۔ تقریر کا رنگ بھی بدل گیا قال اللہ وقال الرسول کی جگہ جغرافیہ حساب اور آٹے دال کا بھاؤ رہ گیا اور بعض طلب کو دیکھ کر ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ طالبان علوم دینیہ ہیں، لباس کی وضع، گفتگو کا طریقہ مجلسوں کی ہیئت یہ بتلاتی ہے کہ ان کو علم دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں اناللہ وانا الیہ راجعون یہ ہے تشبہ کا اثر جو ظاہر سے باطن میں سرایت کرتا اور دل کو تباہ و برباد کر دیتا ہے یہ تو تشبہ اہل شر کا نتیجہ تھا۔ تشبہ اہل خیر کا یہ اثر ہے کہ بہت لوگ اولاً بزرگوں کی نقل ریا سے کرتے تھے ان ہی جیسا لباس ان ہی جیسی وضع اور تسبیح و سجادہ اختیار کرتے تھے رفتہ رفتہ ریا عادت ہوگئی اور عادت عبادت ہوگئی پھر خلوص پیدا ہوا تو مس خام کو کندن بنادیا ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ریا کار صوفی کو بھی برا نہ کہو کیونکہ گو وہ ریا میں مبتلا ہے مگر اس عیب کے ساتھ اس میں ایک ہنر بھی ہے کہ اہل اللہ کی عظمت اس کے دل میں ہے کیونکہ انسان اسی کیساتھ تشبہ کرتا ہے جسکی عظمت اسکے دل میں ہوتی ہے اگر اس کے دل میں اہل اللہ کی عظمت نہ ہوتی تو وہ ان کی وضع اختیار نہ کرتا بلکہ اہل دنیا کی وضع اختیار کرتا اھ اس سے ان علماء کو جو اہل شر کی وضع اختیار کرتے ہیں متنبہ ہونا چاہیئے کہ ان کے دل میں اہل دنیا کی عظمت ہے اہل دین کی عظمت نہیں جب ہی تو وہ اہل دین کی وضع چھوڑ کر اہل دنیا کی وضع اختیار کرتے ہیں اور اس کا مذموم ہونا بدیہی ہے

وقانا اللہ وایاکم عذاب السموم

باب بست ونہم ۲۹

حدیث

المسافر اذا قدم من سفرہ یبدأ بالمسجد

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو مسجد سے ابتدا کرتے اس میں پہلے جاتے اور نماز پڑھتے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ مسافر جب سفر سے واپس آئے تو سنت یہ ہے کہ گھر میں جانے سے پہلے مسجد میں جائے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۸۱) **سفر سے واپسی پر اوّل مسجد میں جانا چاہیئے** اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کو شہر میں ایسے وقت داخل نہ ہونا چاہیئے جس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ اس وقت نماز نہ ہو سکے گی جس کے لئے مسجد میں جایا جاتا ہے اور اگر مسافر سنت کے موافق سفر کرے گا تو وہ اپنے شہر میں ایسے ہی وقت داخل ہوگا جس میں نماز جائز ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے جب واپس تشریف لاتے تو مدینہ میں چاشت کے وقت داخل ہوا کرتے تھے اور اس سے منع فرماتے تھے۔۔۔۔۔ رات کے وقت اپنے گھر والوں کے پاس پہنچے نیز جب آپ سفر کیلئے

تشریف لیجاتے اس وقت بھی مسجد میں نماز پڑھ کر شہر سے نکلتے تھے اب اگر یہ فعل محض تعبدی تھا جس کی کوئی عقلی علت نہیں جب تو کسی بحث کی ضرورت نہیں اور اگر معقول المعنی تھا جس کی کوئی عقلی علت بھی ہے تو اس میں حکمت واللہ اعلم یہ تھی کہ یہ عمل مسجد اور نماز سے برکت حاصل کرنے اور اپنی احتیاج ظاہر کرنے کے لئے تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کے لئے شہر سے نکلتے تو یوں فرمایا کرتے تھے۔

(اللھم) انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل والمال

اے اللہ! سفر میں آپ ہی میرے ساتھی ہیں اور میرے پیچھے گھر بار کے بھی آپ ہی محافظ ہیں۔

اور آپ کا سفر جہاد یا حج کے سوا کسی اور کام کے لئے نہ ہوتا تھا اور طاعات میں اللہ تعالیٰ کی معیت ضرور ہوتی ہے مگر پھر بھی آپ حصول معیت کے لئے دعا فرماتے تھے۔ اور واپسی کے وقت شہر میں داخل ہو کر یہ فرماتے تھے۔

آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ

ہم گھر کو واپس آگئے ہم توبہ کرنے والے ہیں، بندگی کرنیوالے ہیں اپنے پروردگار کی حمد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا اپنے بندہ کی مدد کی اور کفار کی جماعتوں کو تنہا شکست دیدی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کلمات کو سفر میں جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے بلند آواز سے کہنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق اور التجا اور جملہ اقوال وافعال میں مخلوق سے بیزاری اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ظاہر کرنے کے لئے تھا اسی طرح آپ عملاً بھی اللہ کے گھر کی فضیلت تمام مکانوں پر ظاہر کرتے تھے کہ جاتے ہوئے مسجد سے سفر شروع کرتے اور واپس ہوتے ہوئے اول مسجد میں داخل

ہوتے تھے تاکہ حال قول کے موافق ہو، عمل گفتار کے مطابق ہو۔

مومن کا عمل قول کا مصدق ہونا چاہیئے

یہاں سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ مومن کو ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کا عمل قول کی تصدیق کرے ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ عمل قول کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کی مذمت کی ہے جن کا عمل قول کی تصدیق نہیں کرتا۔ چنانچہ ارشاد ہے

یا ایہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون (کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون)

اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو (اللہ کے نزدیک یہ حالت بہت بڑی ہے کہ ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو)

الوجہ الاول اذا کان فی الاوقات المنھی عنہا الی قولہ فی الوجہ الثانی لم تقولون ما لا تفعلون

عالم بے عمل کو وعظ نہ ترک کرنا چاہیئے بلکہ بدعملی کو ترک کرنا چاہیئے

اس آیت سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا ہے کہ بدون عمل کے عالم کو وعظ جائز نہیں ہے اور حضرت مصنف کے کلام سے بھی یہ شبہ ہو سکتا ہے مگر حکم شرعی یہ نہیں ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر مستقل فرض ہے اور عمل دوسرا فرض ہے، ایک فرض کے ترک سے دوسرے فرض کا ترک لازم نہیں ہو سکتا پس عالم بے عمل پر وعظ کہنا بھی فرض ہے اور خود عمل کرنا بھی فرض ہے اگر وہ خود عمل نہ کرے تو اس سے ترک وعظ جائز نہ ہوگا بلکہ اس حالت میں وعظ ترک کریگا تو دو فرضوں کا تارک ہوگا اور وعظ کہتا ہے تو صرف ایک ہی فرض کا تارک ہوگا اور تجربہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی برکت سے کچھ دنوں میں اسے توفیق عمل بھی ہو جاتی ہے بعض دفعہ سامعین میں کوئی مقبول بندہ ہوتا ہے اس کی دعا و توجہ سے واعظ بھی صاحب عمل

ہو کر اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جاتا ہے اور اس آیت میں قول سے مراد دعوت نہیں بلکہ دعویٰ ہے مطلب یہ کہ ایسا دعویٰ نہ کرو جس پر عمل نہ کرسکو اور بدون کام کئے شیخی نہ مارو کہ ہم نے یوں کیا اور وہ کیا حالانکہ کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ معنی نہیں کہ ایسی بات کی دعوت بھی نہ دو جس پر تم عمل نہیں کرتے۔

قول کا اطلاق جسطرح دعوت پر ہوتا ہے دعوی پر بھی ہوتا ہے اور یہاں دعویٰ ہی مراد ہے جس کی دلیل آیت کا شان نزول ہے۔

روی عن ابن عباس ومجاهد انها نزلت فی قوم قالوا لو علمنا احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ لسارعنا الیه فلما انزل فرض الجهاد تثاقلوا عنه وقال قتادة نزلت فی قوم کانوا یقولون جاهدنا وابلینا ولم یفعلوا وقال الحسن نزلت فی المنافقین وسماهم بالایمان لاظهارهم له ص ۴۲۲ ج ۳

(احکام القرآن للجصاص) اور آیت اتأمرون الناس بالبر وتنسون انفسکم میں محل انکار تنسون انفسکم ہے تامرون الناس بالبر محل انکار نہیں مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہ ہونا چاہیئے یہ مطلب نہیں کہ بے عمل کو وعظ نہ کہنا چاہیئے اور دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔

وهذا من افادات سیدی حکیم الامت دام مجدهم وعلاهم۔

(۱۸۲) تبرک بالاشیا المحترمہ کی دلیل

حدیث میں ان چیزوں سے برکت حاصل کرنے کی بھی دلیل ہے جن کی حرمت اور رفعت شریعت میں ثابت ہے مگر برکت حاصل کرنے کا طریقہ شریعت کے موافق ہونا چاہیئے برکت حاصل کرنے کی دلیل تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپسی کے وقت تبرک کے لئے مسجد سے ابتدا فرماتے تھے اسی کے حکم میں مرو مشئے ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی وجہ خیر و

برکت کی رکھی ہو اور اس کی دلیل کہ تبرک کا طریقہ شریعت کے موافق ہونا چاہیئے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں عشر نماز ہی پڑھتے تھے جس کی وجہ سے مسجد کو رفعت حاصل ہے اس کی دیواروں کو چومتے نہ تھے نہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر سر جھکاتے نہ ہاتھ اٹھاتے تھے اسی طرح دوسری چیزوں میں لازم ہے کہ ان کی تعظیم کرنا اور برکت حاصل کرنا شریعت کے قاعدہ پر ہونا چاہیئے اسی لئے حضرات صوفیہ ان چیزوں کا بہت احترام کرتے ہیں جن کی حرمت شریعت نے ظاہر کی ہے اور ان کا یہ احترام شریعت کے موافق ہی ہوتا ہے حدود کے تجاوز کے ساتھ نہیں ہوتا چنانچہ ایک بزرگ سے منقول ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو بھول کر بایاں پیر پہلے مسجد میں رکھ دیا حالانکہ سنت یہ ہے کہ دایاں پیر اول رکھا جائے تو وہ اپنی اس حرکت پر اللہ تعالیٰ سے شرما کر بیہوش ہو کر گر پڑے کیونکہ ان سے مسجد میں داخل ہونے کی سنت فوت ہو گئی اور اس کی مخالفت ہو گئی تھی کہ سنت یہ ہے کہ مسجد میں جاتے ہوئے اول دایاں پیر رکھا جائے اور علماء کا ارشاد ہے کہ جو شخص بھولے سے بایاں پیر پہلے رکھ دے اس کو چاہیئے کہ بایاں پیر مسجد سے نکال کر دائیں کو آگے بڑھائے کیونکہ بھول کی جانب میں وہ معذور ہے تو دیکھو ان بزرگ کے دل میں مسجد کا احترام کیسا تھا کہ بائیں پیر کو آگے کرنے سے بیہوش ہو گئے حالانکہ شریعت کے نزدیک وہ اس فعل میں معذور تھے کہ بھول سے ایسا ہو گیا تھا قصداً نہ ہوا تھا تو اور کاموں میں جو فرائض و واجبات کی قسم سے ہیں اور ان کا کیا حال ہوگا جب ایک سنت کے بھول جانے کا ان پر ایسا اثر ہوتا تھا اللہ تعالیٰ ہم کو ان چیزوں کی توفیق عطا فرمائیں جو اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائی ہیں اور اس دولت سے ہم کو بھی کامیاب فرمائیں آمین۔

قولہ الوجہ الرابع فی الحدیث دلیل علی التبرک بکل ما جعلت لہ حرمۃ الی قولہ

واسعد نا بہ بمنہ

ف صوفیہ میں بزرگوں کے تبرکات کے احترام کا دستور ہے کسی بزرگ کا خرقہ کسی جگہ محفوظ ہے تو اس کی زیارت کرائی جاتی ہے کسی بزرگ کی تسبیح و سجادہ کی

زیارت کرائی جاتی ہے اور اس میں عام طور سے حدود سے تجاوز کیا جاتا ہے کہیں اس کے لئے عرس ہوتا ہے کہیں اس پر نذرانہ لیا جاتا ہے۔ بعض ان تبرکات کو سجدہ کرتے ہیں ایسا تبرک و احترام شریعت کے خلاف ہے یہاں یہ مسئلہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مشائخ سے جب ان کے معتقدین تبرک مانگتے ہیں تو ان مشائخ کا اپنی کسی چیز کو بابرکت سمجھنا اور تبرک کے طور پر مریدوں کو دینا حرام ہے ان کو تو محض تطییب قلب مسلم کی نیت کرنا چاہیئے کہ ایک شخص نے سوال کیا ہے اس کا سوال پورا کر دینے سے اس کا دل خوش ہوگا رد کرنے سے دل شکنی ہوگی اور اپنے کو بابرکت سمجھنا اور اپنی کسی چیز کو تبرک کے طور پر دینا تو صریح تکبر و عجب اور نری جہالت ہے۔

٭٭٭

باب سی و سوم

حدیث

صلوٰۃ الملئکۃ علی المصلی ما دام فی مصلاہ

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فرشتے تم میں سے ہر شخص کو دعا دیتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنی نماز کی جگہ میں رہے جہاں اس نے نماز پڑھی تھی جب تک وضو کو نہ توڑے یوں کہتے رہتے ہیں اے اللہ اسکی مغفرت فرما اے اللہ اس پر رحم فرما۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ فرشتے برابر نمازی کو دعا دیتے رہتے ہیں جب تک اس جگہ میں رہے جہاں اس نے نماز پڑھی تھی اسکے لئے استغفار کرتے اور رحمت طلب کرتے ہیں اس پر چند وجوہ سے کلام ہے

۳۸۱۔ نماز شرعی اور لغوی کا فرق کیا یہ حکم ہر نمازی کے لئے عام ہے خواہ اسکی نماز کامل ہو یا ناقص؟ اگر لغت پر نظر کی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر مصلی کو عام ہے مگر یہ درست نہیں اور اگر شریعت کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ نماز کس لئے مقرر کی گئی اور نماز کیا ہے جس کو شارع صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فرمایا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جس نے نماز میں رکوع و سجود پوری طرح نہیں کیا تھا یہ ارشاد فرمایا تھا ارجع فصل فانك لم تصل نماز دوبارہ لوٹاؤ کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی اسکو لغۃً تو آپ نے مصلی قرار دیا شرعاً مصلی نہیں قرار دیا نیز آپ کا ارشاد ہے جب نماز مقبول نہیں ہوئی،

تو پُرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر پڑھنے والے کے منہ پہ مار دی جاتی ہے نیز حضور کا ارشاد ہے من لم تنھہ صلاتہ عن الفحشاء والمنکر لم یزدد من اللہ الا بُعداً جس کی نماز نے اس کو بے حیائی اور بُرے کاموں سے نہ روکا وہ اللہ سے دور ہی ہوتا رہیگا تو شرعاً جس شخص نے نماز شرعاً نہیں پڑھی (گو ظاہراً پڑھی ہو) اور جس کی نماز اس کے منہ پر مار دی گئی اور جس کو اللہ سے بعد ہی بڑھتا گیا اس کے لئے ملائکہ کیونکر دعا یا استغفار کر سکتے ہیں ؟ یہ تو شرعاً و عقلاً محال ہے۔ شرعاً محال ہونیکی دلیل تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اولئک الذی یلعنھم اللہ ویلعنھم اللاعنون یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنیوالے بھی لعنت کرتے ہیں تو جس پر اللہ تعالیٰ اور سب لعنت کرنیوالے لعنت کریں اس کے لئے دعا و استغفار کیسا ؟ اور عقلاً محال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جس کا عمل عذاب عقاب کو مقتضی ہو اس کے لئے فرشتوں کی طرف سے دعا یا استغفار کیسے ہو سکتا ہے ؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ جب تک وہ اپنی نماز کی جگہ میں ہے جہاں نماز پڑھی ہے، اس نمازی کے حق میں ہے جس نے شرعی نماز پڑھی ہو جس پر ثواب عطا ہوتا ہے۔ ایسی نماز نہ پڑھی جائے جو اس پر لعنت کرتی ہوئی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو اس وبال سے محفوظ رکھے اور کامل نماز کی توفیق عطا فرمائے (آمین) یہاں ایک سوال ہوگا وہ یہ کہ جس کی کچھ نماز قبول ہوگئی ہو اور کچھ قبول نہ ہوئی ہو اسکو بھی یہ خیر و برکت حاصل ہوگی یا نہیں کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی نماز تو پوری قبول ہو جاتی ہے کسی کی آدھی قبول ہوتی ہے۔ کسی کی تہائی کسی کی چوتھائی۔ وعلی ہذا القیاس تو ایسے لوگ اگر نماز کے بعد کچھ دیر اسی جگہ بیٹھے رہیں جہاں نماز پڑھی تھی ان کے لئے فرشتے دعا یا استغفار کریں گے یا نہیں تو واللہ اعلم ظاہر تو یہ ہے کہ ان کے لئے اس خیر کی امید ہے کیونکہ ان کی فرض نماز قیامت کے دن نفل نمازوں سے پوری کی جائیگی جو نقصان فرض میں رہ گیا ہوگا نوافل سے اسکی تلافی کر دی جائیگی یہ اسی دعا کا اثر ہے جو فرشتوں نے اس کے لئے کی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر فضل فرمایا کہ فرض میں جو کوتاہی رہ گئی تھی اسی جگہ نفل کو قبول فرمالیا، یہ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے اسکے لئے مغفرت کی دعا کرتے اور یوں کہتے ہیں

اے اللہ اسکی مغفرت فرما اور مغفرت اسی وقت ہوتی ہے جب کچھ کوتاہی ہوگئی ہو اور اسکے ساتھ فرشتوں کا یہ کہنا کہ اے اللہ اسکی مغفرت فرما اس بات کو بتلاتا ہے کہ یہاں کوئی عمل ایسا بھی ہے جو رحمت کو مقتضی ہے۔ قولہ الوجہ الاول ھل ھذا علی عمومہ الیٰ قولہ دل ان ھنالک عملا یوجب الرحمۃ

ف عرض فرشتوں کا اللھم اغفرلہ واللھم ارحمہ کہنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جن لوگوں کی نماز میں سے کچھ حصہ مقبول کچھ نا مقبول ہو وہ اس فضیلت کے مستحق ہیں کیونکہ مغفرت و رحمت کے مستحق ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے کچھ کوتاہی کی ہو کچھ نیکی کی ہو

(۱۸۴) دلیل فضیلت نماز بر اعمال دیگر

اس میں دیگر اعمال سے نماز کی فضیلت پر بھی دلیل ہے یہ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے نمازی کے لئے استغفار کرتے رہتے ہیں اگرچہ نماز سے فارغ ہوکر کسی اور کام میں لگ بھی جائے جب تک وہ اسی جگہ میں رہے جہاں نماز پڑھی تھی اور یہ بات نماز کے سوا کسی اور عبادت کے لئے وارد نہیں ہوئی الوجہ الثانی فیہ دلیل علی فضیلۃ الصلوٰۃ الیٰ قولہ ولم یأت مثل ذلک فی غیرھا من العبادات

ف افسوس ہے کہ ایسی افضل عبادت کیساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ اسکو اسطرح بے پروائی سے ادا کرتے ہیں کہ یہی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قابل قبول ادا ہوئی یا نہیں حضرات صوفیہ رضی اللہ عنہم کو تکمیل صلاۃ کا جس قدر اہتمام ہے مشاہد ہے ہم نے اپنے اکابر کو اسی قدم پر پایا ہے۔ حضرت مولانا گنگوھی قدس اللہ سرہ کی نماز کو جس نے دیکھا ہے وہ بیساختہ بول اٹھتا ہے کہ خدا کیلئے نماز ایسی ہی ہونی چاہیئے یہی شان حضرت سیدی مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نماز کی تھی رزقنا اللہ وایاکم تمام الصلوٰۃ وتمام الوضوء وتمام رضوانہ آمین

(۱۸۵) دلیل فضیلت صلحائے بنی آدم بر ملائکہ

اس میں ان لوگوں کی بھی دلیل ہے جو صلحاء بنی آدم کو ملائکہ پر فضیلت دیتے ہیں کیونکہ یہ نیک بندے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں

اور فرشتے ان کے لئے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ اس جگہ سے
کیا مراد ہے جہاں نمازی نے نماز پڑھی آیا اس سے مراد وہی جگہ ہے جہاں قیام اور سجدہ کیا تھا
یا وہ پورا مکان یا گھر جس میں نماز کی جگہ تجویز کی گئی

نماز کی جگہ سے کیا مراد ہے

سو جمہور تو اسی طرف ہیں کہ قیام و سجدہ کی جگہ مراد ہے البتہ بعض نے جو غالباً قاضی عیاض ہیں یہ فرمایا ہے کہ وہ
پورا گھر مراد ہے جس کو نماز کے لئے تجویز کیا گیا ہے اگرچہ اس خاص جگہ میں نہ بیٹھے جہاں
نماز ادا کی ہے (بلکہ جب تک اس مسجد یا گھر میں رہیگا جہاں نماز پڑھی تھی فرشتے اس کے
لئے استغفار کرتے رہیں گے مثلاً کسی نے مسجد میں نماز پڑھی پھر اس جگہ سے جہاں نماز پڑھی
تھی ہٹ گیا مگر مسجد کے اندر ہی رہا اس سے اور اس کے حدود و متعلقات سے باہر
نہیں گیا مسجد کے حجرہ میں چلا گیا یا مسجد کے اندرونی یا بیرونی حصہ میں بیٹھ گیا تو
فرشتے اسکے لئے دعا کرتے رہیں گے وھو قول کثیر بعض مجمع علیہ وقول واحد
(ولم ینشرح صدری بھذا الکلام فلم ادر ترجمہ) حدث سے مراد وہ شے ہے جو
وضو کو توڑ دے یہاں ایک سوال اور ہے کہ آیا یہ حکم تمام نمازوں کو عام ہے خواہ فرض
نماز ہوں یا نوافل ظاہر عموم ہی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عموم ہی
سے بیان فرمایا ہے۔ قولہ الوجہ الثالث فیہ دلیل لمن یفضل الصالحین
من بنی آدم الی قولہ لانہ صلی اللہ علیہ وسلم اتی بہ نکرۃ

ف۔ ہم نے اپنے اکابر کو اسی قول پر عامل پایا ہے جو قاضی عیاض سے منقول ہے حضرت
مولانا گنگوہی قدس سرہ نماز فجر وغیرہ کے بعد اپنے حجرہ میں تشریف لے آتے تھے جو مسجد
سے ملحق تھا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی معمول تھا اور حضرت
حکیم الامت دام مجدہم کا بھی اسی پر عمل ہے یہ حضرات مصلیٰ کو اسی مقام سے مخصوص نہیں
کرتے جہاں نماز ادا کی ہے بلکہ مسجد اور متعلقات مسجد کو عام کہتے ہیں واللہ تعالیٰ اعلم
وفی الحدیث انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ما شاء

(۱۸۶) خوشخبری سنانے میں سنت یہ ہے کہ اول ادنیٰ کو بیان کرے پھر اعلیٰ کو

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بشارت دینے میں سنت یہ ہے کہ اول کمتر بات بیان کی جائے پھر اعلیٰ درجہ پر اسکو ختم کیا جائے کیونکہ دل خوش کرنے میں اس کا زیادہ اثر ہے، یہاں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولا بشارت کو اجمالا بیان فرمایا کہ فرشتے اس کے لئے دعا کرتے ہیں، پھر بعد میں اسکی تفسیر فرمائی تو اجمال میں یہ احتمال تھا کہ وہ اعلیٰ درجہ کی دعا دیتے ہوں یا ادنیٰ درجہ کی مگر سننے والوں کو اس سے بھی خوشی حاصل ہوئی کیونکہ یہ بھی خیر میں ترقی اور زیادت ہے کہ فرشتے دعا کریں خواہ کیسی ہی دعا کریں اسکے بعد دعا کی تشریح فرمائی کہ مغفرت اور رحمت کی دعا دیتے ہیں اور جسکی مغفرت ہو جائے اور جس پر رحمت ہو جائے تو یہ تو بڑا اعلیٰ درجہ کا انعام ہے۔ قولہ الوجہ الخامس فیہ دلیل علی ان السنۃ فی البشریٰ الا قولہ فمن غفرلہ و رحمہ فھو اعلی الجوائز

ف مغفرت اور رحمت کا اعلیٰ درجہ کا انعام ہونا ہمارے اکابر کا خاص مذاق ہے۔ یہ حضرات عالی مقامات عالیہ کے طالب نہیں ہوتے صرف مغفرت و رحمت کے طالب ہوتے ہیں کہ جس کو بخش دیا گیا جس پر رحمت ہو گئی اس کو سب کچھ مل گیا اگرچہ جنتیوں کی جوتیوں میں ہی جگہ مل جائے قالہ سیدی حکیم الامت دام مجدہ و علاہ وقد تائید قولہ بقول المصنف فللہ الحمد

(۱۸۷) جس طاعت کے بعد دوسری طاعت نہ ہو اس میں خلل ہے

اس میں حضرات صوفیہ کے اس قول کی بھی دلیل ہے کہ جس طاعت کے بعد دوسری طاعت نہ ہو اس میں خلل ہے یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ملائکہ تم میں سے ہر شخص کو دعا دیتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنی نماز کی جگہ میں رہے تو چونکہ اس کی نماز یا اس کا کچھ حصہ مقبول ہو چکا تھا تو اس کے بعد دوسری طاعت اس کے پیچھے پائی گئی یعنی نماز کی جگہ میں بیٹھا رہنا جسکی وجہ سے فرشتوں نے اس کے لئے استغفار کیا تو ایک خیر کے پیچھے دوسری

خیر پائی گئی جیسا بزرگوں نے فرمایا ہے،

یہاں یہ سوال ہوگا کہ اس واقعہ کی اطلاع دینے پر شرعی اور علمی فائدہ کون سا مرتب ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اس میں اس جگہ پر (کچھ دیر تک) جمے رہنے کی ترغیب ہے جہاں نماز پڑھی گئی ہے تاکہ نمازی کو یہ خیر زائد ہو کہ فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہیں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی خبر نہ دیتے تو کسی کو بھی اس کا علم نہ ہوتا جو اس پر عمل کر کے یہ خیر و برکت حاصل کرتا مگر دیکھو تو کہ آج اسکے جاننے کے بعد بھی کتنے ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی اس پر عمل کرتا ہے۔ تو جاننے کے بعد اس سے اعراض کرنا اس حقیقت کو بتلا رہا ہے جسکی طرف حضرات صوفیہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ نماز کی جگہ سے جلدی ہٹ جانا اسکی دلیل ہے کہ نماز قبول نہیں ہوئی۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص مواضع خیر سے محروم ہوگیا اس پر اندیشہ ہے کہ وہ اہل خیر سے نہیں بلکہ اہل شر سے ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ سے روشنی پڑتی ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے عرض کیا اے رب! کیا میں اس بات کو معلوم کر سکتا ہوں کہ آپکے نزدیک میرا واسطے کیا ہے؟ (یعنی میں آپکے نزدیک کیسا ہوں؟) فرمایا اے موسیٰ! جب تم دنیا حاصل کرنا چاہو اور میں تم کو اس سے روک دوں اور آخرت حاصل کرنا چاہو تو میں اسکو تمہارے لئے آسان کر دوں پس سمجھ جاؤ کہ تمہارے لئے میرے پاس کچھ حصہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کے لیے نیکی کو آسان کر دینا علامات خیر میں سے ہے قوله الوجه السادس فيه دليل لاهل الفتوح الى قوله فالتيسير منه عزوجل للخير من علامة الخير

ف حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کہہ کر جب دوبارہ اللہ کہنے کی توفیق ہوگئی تو سمجھ لو پہلی دفعہ کا قبول ہوگیا ہے ورنہ دوبارہ توفیق نہ ہوتی۔ اسی طرح ایک نماز کے بعد جب دوسری نماز کی توفیق ہوگئی یہ اسکی علامت ہے کہ پہلی قبول ہوگئی ہے ورنہ دوسری کی توفیق نہ ہوتی۔ اس مقام سے بھی حاجی صاحب کے اس ارشاد کی تائید ہوتی ہے وقال الرومی ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست

ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

اللہ کے ساتھ حسن ظن اور تقویت رجاء کیلئے یہ مضمون بہت مفید ہے حدیث میں ہے
انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ماشاء میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں ،
اب وہ جو چاہے میرے ساتھ گمان قائم کرے پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ گمان
رکھے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کا خاتمہ بالخیر کریں گے اور بدون حساب و عذاب کے اس کو
بخش دیں گے انشاء اللہ اس کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا اور جو یہ گمان رکھے گا کہ اللہ تعالیٰ
نے میری عبادت کو قبول فرمالیا ہے اس سے ایسا ہی معاملہ ہوگا پس اللہ سے نیک
گمان رکھو اور وساوس و خطرات شیطانی و نفسانی کی پرواہ نہ کرو کہ وہ تم کو اللہ سے
بدگمان کرنا چاہتے ہیں ۔

اعاذنا اللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا

باب ۲۱ ربیع نمبر

حدیث

سجود السھو

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں شام کی دو نمازوں میں سے ایک نماز پڑھائی (ظہر کی یا عصر کی) ابن سیرین کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ نے تو اس نماز کا نام لیا تھا مگر میں بھول گیا، ابوہریرہ نے کہا پس آپ نے ہم کو دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا اسکے بعد ایک لکڑی سے جو مسجد کے عرض میں لگی ہوئی تھی سہارا لگا کر کھڑے ہوگئے (ایسا معلوم ہوتا تھا) گویا آپ غضبناک ہیں۔ حضور نے دائیں ہاتھ کو بائیں پہ رکھ لیا اور انگلیوں میں انگلیاں کو پھنسا لیا اور دائیں رخسارہ کو بائیں ہاتھ کی پشت پہ رکھ لیا جلدی جانیوالے تو مسجد کے دروازوں سے نکل گئے جو رہ گئے انہوں نے آپس میں کہا کیا نماز کم کر دی گئی کہ چار رکعت کی جگہ دو ہی رکعتیں رہ گئی ہیں۔ جماعت میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے مگر ہیبت ؏ کی وجہ سے حضور ﷺ سے گفتگو نہ کر سکے۔ جماعت میں ایک شخص اور تھا جسکے ہاتھ لمبے تھے اور ان کو ذوالیدین کہا جاتا تھا۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ بھول گئے یا نماز کم ہوگئی؟ حضور نے فرمایا نہ میں بھولا نہ نماز کم ہوئی پھر آپ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کیا ذوالیدین جیسا کہہ رہا ہے ویسا ہی ہوا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں تو حضور مصلی پر آگے بڑھ گئے اور جتنی نماز رہ گئی تھی اس کو پورا کیا پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کیا

؏ مقربان را بیش بود حیرانی ۱۲ ظ

نماز کے سجدہ کے برابر یا اس سے بھی لمبا پھر سر اٹھایا اور اللہ اکبر کہا پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کیا پہلے سجدہ کے برابر یا اس سے بھی لمبا پھر سر اٹھایا اور اللہ اکبر کہا، یہ سجدہ سہو تھا) بعض دفعہ لوگ ان سے (یعنی حضرت ابن سیرین سے) دریافت کرتے کہ پھر (سجدہ سہو کر کے) حضور نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ بھی کہا تو فرماتے مجھے خبر ملی ہے کہ عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ پھر حضور نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ نماز میں عمل قلیل جائز ہے اور کلام قلیل نماز کے پورا کرنے کو مانع نہیں جبکہ بھول کر ہو یا قصداً اس شخص سے کلام کیا جائے جو بھول گیا ہے جبکہ اسکی نماز اسکی نماز سے مربوط ہو جیسے امام اور مقتدی (باہم نماز کے اندر گفتگو کریں اور ایک دوسرے کو بھول چوک پر متنبہ کرے) تو امام مالک و شافعی کے نزدیک اس صورت میں کلام قلیل سے نماز فاسد نہیں ہوتی حنفیہ کے نزدیک فاسد ہو جاتی ہے خواہ عمداً کلام کیا جائے یا سہواً اور یہ حدیث حنفیہ کے نزدیک منسوخ ہے تفصیل کے لئے اعلاء السنن جلد پنجم ملاحظہ ہو) اس حدیث میں چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۸۸) جس کو علم نہ ہو اسے بزرگوں کے افعال پر انکار نہ کرنا چاہیئے

حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس شخص کو یہ علم نہ ہو کہ بزرگان کا فلاں عمل صواب اور درست ہے یا نہیں اسے بزرگوں کے افعال کو تسلیم کرنا چاہیئے ان کو سلامتی پر محمول کرنا چاہیئے یہ اس سے معلوم ہوا کہ جلدی جانے والے یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ نماز کم کر دی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر کچھ عتاب نہیں فرمایا کیونکہ حضور کی زندگی میں نسخ ممکن تھا اور دوسروں کے متعلق یہ احتمال نہیں ہو سکتا تو ان کے افعال کو اسی حد تک تسلیم کیا جائیگا جب تک اجماع کی مخالفت لازم نہ آوے اسکے علاوہ جہاں تک تاویل و احتمال کا امکان ہو ان کے افعال کو سلامتی پر محمول کیا جائیگا اگرچہ اس احتمال کا یقین نہ ہو سکے بلکہ احتمال بعید ہی ہو۔ قوله الوجه الثالث فيه دليل على التسليم لاهل الفضل الى قوله وان كان غير مقطوع به

ف: یہ حکم ان لوگوں کے متعلق ہے جن کا اہل فضل و صاحب کمال ہونا پہلے سے معلوم ہو چکا ہو کہ ان کا کوئی فعل خلاف شرع معلوم ہو تو جب تک تاویل کا امکان ہو تاویل کرنا چاہیئے اور جن لوگوں کا فضل و کمال ہی ثابت نہیں ان کے افعال و اقوال میں تاویل کی ضرورت نہیں ان کا جو عمل یا قول خلاف شرع معلوم ہو فوراً اسکی تردید کی جائیگی ورنہ ہر شخص کو مخالفت شرع کر کے تاویل کا حق ہو جائیگا اور اسمیں جس قدر مفسدہ ہے مخفی نہیں۔

(۱۵۹) چھوٹے کو بڑے کیساتھ ادب سے گفتگو کرنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹے کو بڑے سے مراجعت اور گفتگو کرنا جائز ہے جبکہ اس سے ایسی بات صادر ہو جو بظاہر خلاف معروف ہے مگر یہ مراجعت ادب کیساتھ ہونی چاہیئے یہ اس سے معلوم ہوا کہ ذوالیدین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مراجعت کی مگر ایسی ادب کی ساتھ (جس کیطرف اشارہ کیا گیا ہے)

(۱۶۰) بزرگوں کی عظمت کرنا چاہیئے اگرچہ ان سے خلاف قاعدہ فعل کا صدور ہی ہو

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگوں کی عظمت کرنا چاہیئے اگرچہ ان سے کوئی ایسا فعل بھی صادر ہوتا ہوا دیکھے جو اسکے نزدیک خلاف قاعدہ ہے مگر اس دیکھنے والے کو لازم ہے کہ انکے ساتھ برابر لگا رہے یہاں تک کہ اس فعل کی حقیقت معلوم ہو جائے کہ وہ بزرگ اسکو کس وجہ پر محمول کرتے ہیں یہ مسئلہ حضرت صدیق اکبر و عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے مستنبط ہوا کیونکہ جو کچھ ذوالیدین کو معلوم تھا ان حضرات کو بھی معلوم تھا مگر ہیبت نے ان کو گفتگو کرنے سے روک دیا مگر صورتحال کی نزاکت نے ان کو اس پر مجبور کیا کہ حضور سے اس وقت تک علیحدہ نہ ہوں جب تک حکم معلوم نہ ہو جاوے اور ان سب صورتوں کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو برقرار رکھا کسی پر انکار نہیں فرمایا نہ ان کو ملامت کی جو حضور کے فعل کو سلامتی پر محمول کر کے یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ نماز کم ہو گئی نہ ذوالیدین پر انکار فرمایا کہ تم نے مراجعت کیوں کی، نہ حضرات شیخین سے باز پرس کی کہ تم خاموش کیوں رہے۔

اگر ان احوال میں سے کوئی حالت بھی ناجائز ہوتی تو حضور اس کے بارہ میں کچھ ضرور فرماتے کیونکہ آپ صاحب تشریع ہیں اور شارع کو یہ جائز نہیں کہ ضرورت کے وقت حکم بیان نہ کرے بعد میں بیان کرے۔

الوجه الخامس یؤخذ منه اکبارذی الفضل الی قوله ولا یجوز له تاخیر البیان عن وقت الحاجة

(۱۹۱) جب بزرگ چھوٹوں سے اپنی بابت کچھ دریافت کریں تو صحیح واقعہ بیان کرنا چاہیے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب بزرگ چھوٹوں سے اپنی بات دریافت کرے کہ مجھ سے کچھ کوتاہی تو نہیں ہوئی تو ان کو چاہیئے کہ جو کچھ ہوا ہو اس کو بجنسہ بیان کر دے دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر و عمر رضی اللہ عنہما سے اس واقعہ کے متعلق دریافت فرمایا تو انہوں نے جو کچھ ہوا تھا اسکو بجنسہ ہی بیان کر دیا۔ قوله فیه دلیل علی انه اذا سأل الفاضل المفضول الی قوله فاخبره بما وقع

(۱۹۲) حکمت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قدرت بھی اپنا کام کرتی ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکمت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قدرت بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقع میں نماز کے اندر نسیان ہو گیا حالانکہ آپ کی عادت مبارکہ تو یہ تھی کہ نیند کی حالت میں بھی صرف آپ کی آنکھیں سوتی تھیں دل نہیں سوتا تھا اور اس واقعہ میں حضور کی حالت میں (رکعات) نماز کی گنتی کو بھول گئے یہ محض قدرت کی کارفرمائی نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر اس واقعہ میں حضور کو نسیان ہونا دو عظیم الشان اسباب کی وجہ سے ہوا ایک سبب تو وہی جس کو خود حضور نے صراحتہً ارشاد فرمایا ہے انما انسی او انسی لاسن (رواہ مالک بلاغا) میں جو کبھی بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ امت کیلئے عملاً نسیان و سہو کے احکام مقرر کردوں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب تشریع ہیں آپ کی اقتدار کی جاتی ہے اور ان تمام اعمال کا جو آپ کی اقتدار میں قیامت تک کئے جائیں گے ثواب آپ کو ملتا ہے اس لئے آپ کا یہ نسیان جو تشریع احکام کا سبب ہوا یاد سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ آپ کے حق میں

موجب کرامت وعظمت وترقی ہے۔ کسی درجہ میں بھی قابل نقص نہیں۔ رہا یہ سوال کہ آپ کے بھولنے میں حکمت کیا ہے؟ اور بھلائے جانے میں کیا حکمت ہے؟ جواب یہ ہے کہ آپکے بھولنے میں تو حکمت یہ ہے کہ آپ کے اندر صفات بشریہ کا ظہور ہو صفات بشریہ کے ظہور سے یہ بات ثابت ہو جائیگی کہ انسانوں سے زیادہ جو کچھ آپ کے اندر کمالات ہیں وہ آپکی خصوصیت و رفع منزلت پر دلالت کرتے ہیں اور بھلائے جانے میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قدرت آپکے ہاتھوں آپ کے اقوال وافعال کے ذریعہ سے خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری بھلائیوں کو جاری کرتی رہتی اور احکام مقرر کرتی رہتی ہے تاکہ اس سے یہ بات ظاہر ہو کہ حق تعالیٰ کو آپ پر کس قدر توجہ ہے کہ آپ کی کوئی حالت حکمت سے خالی نہیں ہوتی اور تاکہ اس بات کی تصدیق ہو جو آپنے فرمائی ہے اور اس مطالبہ اور دعوی کی تائید ہو جو دنیا کے سامنے آپنے پیش کیا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں میں خود کچھ نہیں کہتا خود کچھ نہیں کرتا بلکہ وہی کرتا اور کہتا ہوں جو اللہ تعالیٰ مجھ سے ظاہر کرانا چاہتے ہیں اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین مواقع کے سوا کبھی نسیان کا صدور نہیں ہوا دو دفعہ افعال میں سہو ہوا کہ (تشریع) حکم کے لئے اتنی ہی ضرورت تھی ایک تو یہی واقعہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے کہ دو رکعت پڑھ کر آپ کھڑے ہو گئے تھے دوسرا واقعہ یہ ہے کہ چار رکعت پڑھ کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہو گئے تھے اور اقوال میں صرف ایک دفعہ نسیان ہوا کہ اقوال میں (تشریع) حکم کے لئے اتنی ہی ضرورت تھی وہ یہ کہ ایک دفعہ سورۃ الملک پڑھتے ہوئے اسکی ایک آیت آپ سے چھوٹ گئی تھی (جو نماز کے اندر ہی آپ کو یاد آگئی) اور سلام کے بعد آپنے پوچھا ابی بن کعب جماعت میں شریک تھے یا نہیں؟ انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں فرمایا پھر تم نے مجھ کو وہ آیت کیوں یاد نہ دلائی جسکو میں چھوڑ گیا تھا انہوں نے عرض کیا ارادہ تو ہوا تھا پھر یہ خیال ہوا کہ شاید منسوخ ہو گئی ہو فرمایا اگر منسوخ ہوتی تو میں اطلاع کر دیتا (اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ حکم مقرر کرنا تھا کہ اگر امام کوئی بات بھول جائے تو مقتدی کو اسے لقمہ دیکر بتلا دینا چاہئیے) ان مواقع کے سوا آپ کو کبھی نسیان نہیں ہوا۔

اور دوسرا سبب یہ بھی محتمل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور حق اور غلبہ ادب

میں ایسی استغراقی حالت کو پہنچ گئے تھے کہ رکعات نماز کی شمار سے ذہول ہوگیا قولہ الوجہ السابع فیہ دلیل علی ان القدرۃ تنفعل الیٰ قولہ من حالۃ استغراقہ علیہ السلام فی الحضور والادب حتی ذہل عن العدد

ف. یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے کیونکہ عالم الغیب سے سہو ونسیان نہیں ہو سکتا خدا اہل بدعت پر رحم کرے اور انکی ہدایت دے کہ انہوں نے عبث رسول کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدائی کے درجہ پر پہنچادیا جائے۔ حضور کے سہو نسیان میں یہ بھی مصلحت و حکمت تھی کہ اگر کسی عابد زاہد مجاہد متقی کو ایسا واقعہ پیش آجائے تو وہ دلگیر نہ ہو اور یہ نہ سمجھے کہ میرا مجاہدہ بیکار گیا کہ نماز میں غفلت و سہو ہونے لگا اگر حضور کو سہو کا واقعہ پیش نہ آتا تو اہل مجاہدہ تو ایسی فتور کے پیش آنے سے اپنے آپ کو غم میں ہلاک کر دیتے اب ان کو یہ واقعات تسلی کے لئے کافی ہیں کہ جب بشریت کیوجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسا اتفاق پیش آیا ہے تو ہماری کیا مجال ہے کہ سہو و نسیان سے اپنے کو معصوم سمجھ لیں

یعنی طمع مدار وصال دوام را

اس حکمت کو حضرت شارح نے بھی وجہ تاسع میں بیان فرمایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے لطف اور مہربانی کی دلیل ہے جو وہ اپنے بندوں پر فرماتے ہیں کہ تعلیم امت کو حضور کے فعل سے دی گئی اگر آپ قول سے تعلیم دیدیتے جب بھی کافی تھا مگر آپ کے بعد صحابہ کو اور امت کے بابرکت لوگوں کو سہو ہوتا تو وہ اس سے اپنے دل میں بہت غمگین ہوتے کہ ان سے نماز میں ایسا فعل کیوں صادر ہوا جو ان کے نبی سے کبھی صادر نہیں ہوا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عملی تعلیم سے ان کا حزن وغم زائل کردیا گیا اور یہ عین رحمت و مہربانی ہے۔

(۱۹۳) جس امر کا علم نہ ہو اس پر گواہ طلب کرنے چاہئیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس بات کا خود کو علم نہ ہو اس پر بیّنہ (گواہ) طلب کرنے چاہئیں اگرچہ خبر دینے والا سچا ہی ہو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالیدین کی بات سن کر حضرت صدیق و عمر رضی اللہ عنہما سے تصدیق چاہی حالانکہ ذوالیدین کو حضور نے ذوالشہادتین کا لقب عطا فرمایا

تھا کران کی شہادت بمنزلہ دو شہادتوں کے تھی) کیونکہ وہ صوفیہ میں (یعنی اصحاب صفہ میں) سب سے زیادہ سچے تھے اور یوں تو سب ہی سچے تھے بس کامل و اکمل کا فرق تھا، مگر جب انہوں نے ایسی بات کہی جسکا حضور کو علم نہ تھا تو آپ نے ان پر بینہ طلب کیا۔ الوجہ العشرون فیہ دلیل علی طلب البینۃ الی قولہ طلب منہ البینۃ علی قولہ

ف۔ ذوالیدین کا لقب ذوالشہادتین ہونا میری نظر سے نہیں گذرا۔ حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کا لقب ذوالشہادتین مشہور ہے۔ ذوالیدین کو بعض روایات میں ذوالشمالین کہا گیا ہے کچھ تعجب نہیں کہ ذوالشمالین کو غلطی سے کاتب نے ذوالشہادتین لکھ دیا ہو جس سے حضرت شارح کو غلط ہو گیا واللہ تعالیٰ اعلم

(۱۹۴) جو شخص کام میں لگا ہوا ہو اس کے خلل کی تلافی کر دی جاتی ہے

حدیث میں ایک اشارہ صوفیہ بھی ہے کہ جو شخص اپنے کام میں لگا ہوا ہو اسکے خلل کی تلافی کر دی جاتی ہے اور اگر اس حالت میں دشمن اس سے مکر و فریب کرے اسکے مقابلہ میں اسکی مدد کی جاتی ہے اور جو شخص اپنی حالت کی نگہداشت چھوڑ دے اس میں اس کا دشمن شریک ہو جائے گا (یعنی شیطان اسکے کاموں میں حصہ لیگا) اے شخص تو دین کی درستی بھی چاہتا ہے اور نفس کی راحت بھی۔ ہیہات ہیہات بھلا آفتاب اور ظلمتیں کہاں جمع ہو سکتی ہیں؟ قولہ الوجہ السابع والعشرون ھنا اشارۃ صوفیۃ الی قولہ ھیہات کیف تجتمع الشموس والظلم۔

ف۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے سہو کا منشا مراقبہ و استحضار حق ہو اسکی نماز میں بظاہر سہو وغیرہ سے جو خلل ہو جاتا ہے اس سے نماز ناقص نہیں ہوتی بلکہ مراقبہ کی برکت سے خلل کی تلافی ہو جاتی ہے اور شیطان جو اس خلل سے خوش ہوا تھا سجدہ سہو سے اسکی خوشی خاک میں ملا دی جاتی ہے اور جو سہو مراقبہ کی وجہ سے نہ ہو بلکہ راحت نفس کی وجہ سے ہو کہ نماز توجہ سے نہیں پڑھی گئی کیونکہ توجہ سے نماز پڑھنا نفس پر گراں ہوتا ہے تو اسکے خلل کی تلافی سجدۂ سہو سے نہیں ہوتی گو ظاہر میں نماز صحیح ہو جاوے بلکہ اس خلل کی تلافی نماز کے اعادہ سے

ہوگئی کہ دوبارہ توجہ کے ساتھ نماز پڑھی جائے۔

ف۔ دین کی درستی راحت نفس کیساتھ نہیں ہوسکتی بلکہ اسکے لئے مجاہدہ اور مراقبہ یعنی اہتمام اور فکر و نگہداشت کی ضرورت ہے جو نفس پر گراں ہے، اور مجاہدہ بھی اپنی رائے سے کافی نہیں بلکہ شیخ عارف کی تجویز سے ہونا چاہیئے پھر کبھی تو شیخ کوئی خاص مجاہدہ تجویز نہیں کرتا بلکہ محض دارو گیر اور ڈانٹ ڈپٹ سے نفس کی اصلاح کر دیتا ہے بعض دفعہ خلوت اور چلہ کشی وغیرہ تجویز کرتا ہے مگر لوگوں کی بے حسی ملاحظہ ہو کہ صلاح دین کی طلب کا بھی دعویٰ ہے اور شیخ کی تنبیہ سے ناگواری بھی ہے۔ ان لوگوں کو عارف کا یہ قول یاد کر لینا چاہیئے

ے
ناز پروردہ تنعم نہ برد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

باب سی و دوم

حدیث

السترۃ للمصلی والمرور بین یدیہ

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو سامنے رکھ کر نماز پڑھے جو لوگوں کے اور اسکے درمیان آڑ ہو جائے۔ (مراد سترہ ہے) پھر کوئی اسکے سامنے سے (سترہ کے اندر کو) گذرنا چاہے تو اسکو ہٹا دے اگر وہ انکار کرے (اور سامنے گذرنے سے باز نہ آئے) تو اس سے قتال کرے یعنی سختی سے دفع کر دے کیونکہ وہ نرا شیطان ہے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ جو نمازی کے اور سترہ کے درمیان سے گذرے اس سے قتال جائز ہے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۹۵) نماز کے سامنے سے گذرنے والے کو کیوں کر ہٹایا جائے

اس قتال میں اور اسکی کیفیت میں لوگوں نے بہت اختلاف کیا ہے یہاں تک کہ بعض غالی علماء نے تو یہ کہدیا ہے کہ اس کو جان سے بھی مار ڈالے تو اس کا خون معاف ہے مگر صحیح مطلب وہ ہے جو حدیث کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد فرمودہ علت سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ یہ بات متقدین میں کسی سے ہم نے نہیں سنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ نرا شیطان ہے تو اس کے ساتھ قتال بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا شیطان کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور شیطان سے مقاتلہ و مقابلہ معمولی افعال

سے ہوا کرتا ہے جیسے تعویذ یا جھاڑ پھونک وغیرہ (اس کے ساتھ کشتی کون لڑتا ہے) اور نماز میں ضرورت کیوقت عمل قلیل جائز ہے، اور اگر اس شخص کیساتھ پوری طرح لڑائی کی گئی جو نمازی کو نماز کی حد سے باہر کردے تو اس صورت میں خود یہ نمازی اس سے بھی بڑھکر دوسرا شیطان ہو جائے گا اسی لئے ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ اس کو نرمی سے ایسی طرح ہٹا دے جو نمازی کی نماز کو فاسد نہ کرے اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو جانے دے اور اپنی نماز میں مشغول رہے قولہ فی الوجہ الاول واما المقاتلۃ وکیفیتہا الی قولہ واشتغل بالصلوٰۃ

ف ہر چند کہ یہ مسئلہ بظاہر تصوف کا نہیں مگر عجیب تحقیق ہے اس لئے اس کا ترجمہ کر دیا گیا۔ نیز بعض غالی صوفیوں کو نماز کے سامنے سے گذرنے والے پر بڑا غصہ آتا ہے اور بعض دفعہ ایسی حرکت سے اس کو روکتے ہیں جس سے نماز فاسد ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے صوفیوں کو اس تحقیق سے مطلع کرنے کی ضرورت بھی تھی، ۱۲ ظ

(۱۹۶) ظاہر سے باطن پر استدلال کیا جاتا ہے

حدیث میں اس امر کی بھی دلیل ہے کہ ظاہر سے باطن پر استدلال کیا جاتا ہے جبکہ باطن پر رسائی نہ ہوسکتی ہو کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ پھر کوئی اس کے سامنے سے گذرنا چاہے اور اس کے ارادہ کا علم اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کو سترہ کے قریب آتا ہوا دیکھیں تو اس حالت سے ہی اس کی نیت پر دلالت ہوگی اور ہم اس وقت بات کرنے سے شرعاً مجبور ہیں اس کی نیت کو دریافت نہیں کر سکتے اس لئے دلالت حال کے مقتضی پر عمل کرنا پڑا۔ الوجہ الرابع فیہ دلیل علی ان الظاہر یستدل بہ علی الباطن الی قولہ فعلمنا بمقتضی مادل علیہ حالہ

ف ظاہر سے باطن پر استدلال کرنا صوفیہ کا خاص حصہ ہے، علماء مجتہدین بھی اس میں ان کے شریک ہیں مگر اجتہاد ظاہر تو آج کل مفقود ہو چکا ہے اجتہاد باطن کا دروازہ بند نہیں ہوا چنانچہ مشائخ طریق میں بحمد اللہ اب تک یہ شان موجود ہے اور جس صوفی کو

اجتہاد فی الباطن کا درجہ حاصل نہ ہو وہ مصلح اور مربی بننے کے قابل نہیں اگرچہ وہ صالح و متقی و صاحب ولایت ہوئے ۔

(۱۹۷) کسی پر کوئی حکم قطعی بدون دلیل یقینی کے نہیں لگایا جاسکتا

کسی شے پر قطعی حکم بغیر دلیل (واضح) کے جو محتمل تاویل نہ ہو نہیں لگایا جاسکتا دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو شیطان کا لقب اسی وقت دیا جب کہ اسکو ہٹایا گیا اور واپس نہ ہوا۔ اگر ہٹانے سے ہٹ گیا تو وہ شیطان نہیں کیونکہ ممکن ہے اس کا دل کسی طرف مشغول ہو جس کی وجہ سے نمازی کو اس نے دیکھا نہ ہو یا دیکھا ہو اور یہ نہ سمجھا ہو کہ نماز پڑھ رہا ہے یا اور کوئی عذر ہو اور جب اسکو ہٹایا گیا پھر بھی واپس نہ ہوا تو اب کوئی عذر باقی نہیں رہا اس وقت تحقیق اور یقین کے ساتھ اس پر شیطان ہونے کا حکم لگایا گیا ہے۔

احتمال کی رعایت بھی ضروری ہے

یہاں سے ایک اور علمی مسئلہ مستنبط ہوا وہ یہ کہ اگرچہ محتمل کا حکم قطعی کے برابر نہیں مگر محتمل کے حکم کو بھی ضائع نہ کیا جائیگا بلکہ احتمال کی رعایت بھی ضروری ہے کیونکہ اگر احتمال کے احکام کو ضائع کر دیا گیا تو اس پر بہت سے مفاسد مرتب ہوں گے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً یہ حکم دیا ہے کہ سامنے سے گذرنے والے کو ہٹاؤ کیونکہ احتمال ہے کہ وہ سہو یا نسیان کی بنا پر آگے سے گذر رہا ہو اب اگر یہ احتمال واقع کے موافق ہوا اور وہ واپس ہو گیا تو مقصود حاصل ہو گیا ورنہ اسکو سختی سے روکا جائے اور یہ حکم لگا دیا جائے کہ وہ شیطان ہے۔ الوجہ الخامس فیہ دلیل علی ان لا یقطع بالشئ الی قولہ وحکمنا بانہ شیطان۔

ف: حضرت حکیم الامت دام مجدہم کی یہ خاص تعلیم ہے کہ سالک کو تمام احتمالات کی رعایت کر کے کام کرنا چاہیئے فرمایا کرتے ہیں میرے نزدیک انسان کی تعریف حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان متفکر ہے جس کو تمام پہلوؤں کی فکر نہ ہو وہ انسان ہی نہیں ۱۲

(۱۹۸) احترام اسی کا کیا جائیگا جو خود بھی احترام کرے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احترام اسی کا کیا جائیگا جو خود بھی شریعت کا احترام کرے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلے کے سامنے سے گذرنے کو حرام اور اس کے ہٹانے اور عتق سے روکنے کا حکم اسی نمازی کیلئے دیا ہے جس نے اپنے سامنے سترہ کرلیا ہو اس کے سوا جس نے نماز کے وقت سترہ کے حکم کو ضائع کیا ہو اس کے لئے یہ احترامات نہیں ہیں اسکی زیادہ توضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے

من خاف اللّٰہ خوف اللّٰہ منہ کل شئی ومن لم یخف اللّٰہ خوفہ اللّٰہ من کل شئی جو اللہ سے ڈرے گا

اللہ تعالیٰ ہر چیز میں اس کا خوف ڈال دے گا اور جو اللہ سے نہ ڈرے گا اللہ تعالیٰ ہر چیز سے اسکو ڈرائے گا۔

پس احترام کے عوض احترام ہے برابر کا بدلہ ہے الوجہ السادس فیہ دلیل علی انہ لا یحترم الا من یحترم الحی قولہ جزاء وفاقا

ف یہاں سے سالکین کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً سبق لینا چاہئیے کہ آجکل جو ان کی عزت ذلت سے اور ہیبت خفت سے بدل گئی ہے اس کا سبب کیا ہے؟ سید الحکماء صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے خوف خدا اور احترام شریعت میں کمی کی ہے اسی کا یہ بدلہ ہے۔ پس اہل سیاست کی تدابیر کا تجربہ تو ہو چکا اب مسلمان اپنے رسول کی ارشاد فرمودہ تدبیر کا بھی تجربہ کرلیں دلوں میں خوف خدا اور احترام احکام شریعت پیدا کریں اور عمل سے اس کا ثبوت دیں اغراض نفسانی کو چھوڑ دیں پھر دیکھیں کہ ان کے دن کس طرح پھرتے ہیں یہ وہ تدبیر ہے جس کا تجربہ ہزار سال تک ہمارے اسلاف نے کیا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ ان سے زیادہ باعزت و جلال وصاحب رعب و وقار دنیا میں کوئی قوم نہ تھی مگر افسوس ہے کہ

مسلمان اپنے گھر کی دولت سے غافل ہیں اور کفار کی تقلید کرکے وہ اسباب عزت اختیار کرتے ہیں جو کفار ہی کے مناسب ہیں مسلمان کے شایان شان نہیں فاعتبروا یا اولی الابصار

(۱۹۹) ادب و احترام عمل سے بھی افضل ہے

اس میں تصوف کی بھی ایک دلیل ہے وہ یہ کہ صوفیہ کے نزدیک شریعت کا ادب و احترام عمل سے بھی افضل ہے اسکی تائید اس سے ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو اپنی نماز کا احترام کرے اور اپنے آگے نماز کے وقت سترہ قائم کرے سامنے سے گذرنیوالے پر حکومت دیدی ہے اس کے ہٹانے اور دفع کرنے کا اختیار دیدیا ہے اور جو اس کا حکم نہ مانے اس کو فاسق قرار دیا حتی کہ شیطان بھی فرمادیا ہے اور اگر یہ شخص سترہ قائم نہ کرتا تو صرف نماز پڑھنے سے اسکو یہ حکومت اور عزت حاصل نہ ہوتی پس ثابت ہوا کہ نماز کا ادب واحترام نماز سے بھی افضل ہے۔ الوجہ الثامن فیہ دلیل صوفی الحی قولہ حتی جعلہ شیطانا

ف اسکی توضیح فقہا کے اس قول سے ہوتی ہے کہ مستحبات وسنن کا استخفاف کفر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کا احترام ایمان ہے حالانکہ مستحبات وسنن کا بجالانا لازم نہیں نہ ان کے ترک سے کوئی گناہ اس سے ثابت ہوا کہ احکام شرعیہ کا احترام ان کے بجالانے سے بھی زیادہ ضروری ہے یہاں سے ان لوگوں کی حماقت ظاہر ہوگئی جو اسلام و کفر کا مدار صرف عمل پر رکھتے ہیں اعتقاد و احترام کو بیکار سمجھتے ہیں حالانکہ ایمان شرعاً ولغۃً اعتقاد ہی کا نام ہے عمل اس کا ثمرہ ہے خوب سمجھ لو۔

(۲۰۰) ہر شخص پر وقتی فعل کے موافق حکم لگایا جائے گا

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص پر اس کے وقتی فعل کے موافق حکم لگایا جائیگا گذشتہ عمل کو نہ دیکھا جائیگا

دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ وہ تو شیطان ہے جو باوجود روکنے کے نمازی کے آگے سے گذرے اس فرق کا لحاظ نہیں فرمایا کہ اس سے پہلے وہ متقی تھا یا غیر متقی الوجہ التاسع فیہ دلیل علی انہ یحکم للشخص بمقتضی فعلہ فی الوقت الی قولہ و لم یفرق بین ما کان قبل ذلک علی تقوی او غیرھا

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو بعض رہنماؤں کے مضر اسلام افعال پر یہ کہہ کر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے گذشتہ زندگی میں قوم کے لئے ایسی قربانیاں کی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ اعمال سابقہ سے وقتی افعال پر پردہ نہیں پڑ سکتا کسی عابد زاہد کا وقتی گناہ اس کے پہلے اعمال کی وجہ سے جائز نہیں ہو سکتا

اس میں صوفیہ کی بڑی دلیل ہے جو حال ہی پر حکم لگاتے ہیں اس کے ماسوا (۲۰) ماضی یا مستقبل پر حکم نہیں لگاتے یہاں تک کہ ان کا ارشاد ہے کہ اپنے ہر سانس میں اسی حال پر رہو جس پر تم مرنا چاہتے ہو کیونکہ اندیشہ ہے کہ تم کو اسی سانس میں موت آجائے۔ پھر کس بھروسہ پر بعض اوقات ایسی حالت میں رہتے ہو جس پر تم کو مرنا پسند نہیں اور جس نے اپنے حسن جمال کو ماضی کے حوالہ کر دیا وہ گویا کچھ تھا ہی نہیں یعنی جو شخص اپنے حسنِ حال پر اسلئے مطمئن ہو گیا ہے کہ زمانہ ماضی میں اسکی حالت اچھی تھی اور حالتِ موجودہ پر نظر نہیں کرتا کہ اب کیا سے کیا ہو گیا ہے وہ کسی درجہ میں بھی قابل اعتبار نہیں ہم سب کے سب اعتقاداً حق اور صواب کو جانتے پہچانتے ہیں مگر ہم نے نفسانی خواہشوں کو اختیار کر رکھا ہے اس لئے اس مضمون کا حال بنانا ہم کو دشوار ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں سے کرے جن پر فروع و اصول کی تحصیل سے وصول آسان کر دیا گیا ہے۔ قولہ الوجہ العاشر فیہ دلیل لاھل الصوفۃ الذی یجعلون الحکم للحال لا لغیرہ الی قولہ جعلنا اللہ ممن سھل علیہ الوصول بتحصیل الفروع والاصول

ف یہاں سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیئے جو بعض دفعہ کفار کے جلسوں میں کفار کی صدارت میں مشرکانہ ترانوں میں شریک ہوتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ کیا اس حالت

میں مرنا ان کو پسند ہوگا۔ بحث و تکرار سے فیصلہ نہ کبھی ہوا نہ ہوسکتا ہے دل کو ٹٹولئے اور دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے بعد ہر مومن خود فیصلہ کر دیگا کہ اس حالت میں مرنا اس کو ہرگز پسند نہیں۔ پھر اپنی زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسی حالت میں کیوں گذارا جائے جس پر مرنا پسند نہیں ؎

شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

ف سالکین اس قاعدہ کو پیش نظر رکھیں کہ ہر سانس اور ہر لمحہ میں اسی حالت پر رہیں جس پر مرنا پسند ہو کسی وقت بھی اللہ کی مرضی کیخلاف کوئی حالت نہ ہونی چاہیے۔ اور اگر خطا ہو جاوے فوراً توبہ کر لیں اور اس فقرہ کو آب زر سے لکھ لیں کہ

"جس نے اپنے حسنِ حال کو ماضی کے حوالہ کر دیا وہ گویا کچھ تھا ہی نہیں"

حقیقت میں تمام منازل سلوک طے کرنے کے لئے یہ روشن ہدایت ہے جو اس پر مستقیم ہو گیا وہ ہی صاحبِ استقامت ہے۔ جعلنا اللہ و ایاکم کما یحب و یرضی آمین

باب سی و سوم ۳۳

حدیث

فتنۃ الاھل والمال وکفارتھا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرد کو اپنے گھر والوں میں اور مال و اولاد اور ہمسایوں میں جو فتنہ پیش آتا ہے اس کا کفارہ تو نماز و روزہ اور صدقہ اور امر و نہی سے ہو جاتا ہے۔

شرح ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ خاص فتنہ جس کا حدیث میں ذکر ہے اس کا کفارہ یہ چار چیزیں ہو جاتی ہیں جو مذکور ہیں یعنی نماز، روزہ اور صدقہ اور امر و نہی، اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۰۲) سوال فتنہ کیا چیز ہے؟ اس کی حد کیا ہے؟ اور یہ فتنہ مردوں ہی کے لئے مخصوص ہے عورتوں کے لئے نہیں یا دونوں کو عام ہے اور مردوں کی تخصیص میں اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور جن عبادات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے فرض عبادات مراد ہیں یا فرض کے علاوہ (نفل نماز و روزہ وغیرہ) اور کفارہ ان سب کا مجموعہ ہوگا یا ان میں سے ایک بھی کفارہ ہو جائیگا

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ لغت میں فتنہ کے معنے آزمائش کے ہیں اور آزمائش کبھی خیر سے ہوتی ہے کبھی شر سے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ ہم تم کو بھلائی برائی میں آزمائش کے لئے مبتلا کریں گے (یعنی راحت و تکلیف سے تم کو آزمائیں گے) اور گھر والوں اور اولاد ہمسایوں سے

آزمائش کی چند صورتیں ہیں ایک یہ کہ آدمی ان سب کا وہ حق ادا کرتا ہے یا نہیں جو ان کے لئے اس پر واجب ہے کیونکہ وہ ان کا ذمہ دار ہے اور اس ذمہ داری سے آخرت میں سوال ہو گا پس اگر کسی نے حق واجب کو ادا نہ کیا ہو اس کا کفارہ ان طاعات کے بجا لانے سے نہ ہو گا (جو حدیث میں بطور کفارہ کے مذکور ہیں) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا کہ اگر میں اللہ کے راستہ میں استقلال کے ساتھ محض اللہ کیلئے دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے بدون پیٹ پھیرے قتل کیا جاؤں تو اللہ تعالیٰ اس عمل کو میرے تمام خطاؤں کا کفارہ بنا دیں گے ؟ حضور نے فرمایا ہاں سوائے دَین کے کہ وہ بدون ادا کئے یا معاف کئے معاف نہ ہو گا ؟ اور یہ حقوق بھی جو کہ اہل وعیال وغیرہ کے لئے شرعاً انسان کے ذمہ واجب ہیں) منجملہ دیون کے ہیں وہ بھی کسی طاعت کے بجالانے سے معاف نہ ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من کانت له مظلمة لاخيه من عرض اوشئ فليتحلله من اليوم جس شخص پر اسکے بھائی کا کوئی مطالبہ آبرو یا اور کسی چیز کے متعلق ہو وہ آج ہی اس سے معاف کرا لے کہ قیامت میں کوئی اپنا حق معاف نہ کرے گا اور یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ جب حقوق واجب ہو جاتے ہیں تو ان کو بجز ادا یا معافی کے اور کوئی چیز ساقط نہیں کر سکتی اور اگر یہ حقوق جن کو تلف کیا ہے حقوق واجبہ نہ تھے بلکہ مستحبات کی قسم سے تھے تو مستحب کے ترک سے گناہ نہیں ہوتا جس کے لئے کفارہ کی حاجت ہو؟

ہاں ایک صورت باقی رہ گئی وہ یہ کہ دل کو ان سے تعلق ہو جاوے سو تعلق دو قسم پر ہے ایک یہ کہ تعلق مفرط ہو (یعنی حد سے بڑھا ہوا) حتیٰ کہ اسکو حقوق اللہ سے بھی مشغول کر دے (روک دے) تو یہ اس باب سے نہیں جس کا کفارہ طاعات سے ہو جائے بلکہ یہ اسکے وعید کے تحت میں داخل ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے قل ان کان اباءكم وابناءكم واخوانكم وازواجكم وعشيرتكم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها احب اليكم من الله ورسوله وجهاد في سبيله فتربصوا حتى ياتي الله بامره

فرما دیجئے اگر تمہارے باپ دادا اور بیٹے (پوتے) اور بھائی بند اور بیبیاں اور خاندان والے اور وہ اموال جن کو تم نے محنت سے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے اور وہ مکانات جو تم کو بھلے لگتے ہیں یہ سب تمہارے دل میں اللہ سے اور اسکے رسول سے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق اپنا دوسرا حکم بھیجیں یعنی حکم ثانی کا انتظار کرتے رہو اور شاہی محاورات میں یہ جملہ سخت وعید ہے اور دوسری قسم تعلق کی یہ ہے کہ اللہ کے حقوق میں سے کسی حق کی ادائیگی سے مشغول نہ کرے نزدیک یہ نوع البتہ وہ ہے جس کا کفارہ اعمال طاعت سے ہو جاتا ہے واللہ اعلم ۔

کیونکہ جب اس کے دل میں خواہش نفس کا لحاظ اور اللہ تعالیٰ کے حق کا خیال دونوں جمع ہو گئے اور اس نے اللہ کے حق کو مقدم کیا خواہش نفس کو موخر کیا تو یہ مراعات جسکی اسے توفیق ہو گئی ہے غیر اللہ کے ساتھ دل کی مشغولی کا کفارہ ہو جائیگی اسکی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے انتم فی زمان کثیر فقہاءہ قلیل قراءہ تحفظ فیہ حدود القرآن وتضیع حروفہ قلیل من یسأل کثیر من یعطی یطیلون فیہ الصلوٰۃ ویقصرون الخطبۃ یبدأون اعمالھم قبل اھوائھم وسیأتی علی الناس زمان قلیل فقہاءہ کثیر قراءہ تحفظ فیہ حروف القرآن وتضیع حدودہ، کثیر من یسأل قلیل من یعطی، یطیلون فیہ الخطبۃ ویقصرون الصلوٰۃ یبدأون اھواءھم قبل اعمالھم، تم ایسے زمانہ میں ہو جسمیں سمجھنے والے زیادہ ہیں پڑھنے والے کم ہیں، قرآن کے احکام کی حفاظت زیادہ کی جاتی ہے حروف و الفاظ کی خدمت زیادہ نہیں کی جاتی، مانگنے والے کم ہیں دینے والے زیادہ ہیں نماز لمبی لمبی پڑھتے ہیں تقریر مختصر کرتے ہیں، اپنی خواہشوں سے پہلے اعمال (شرعیہ) بجالاتے ہیں اور عنقریب ایک زمانہ آئے گا جس میں شریعت کے سمجھنے والے کم ہوں گے پڑھنے والے بہت ہوں گے الفاظ قرآن کی بہت حفاظت کی جائیگی اور احکام د

حدود ضائع کئے جائیں گے مانگنے والے بہت ہوں گے دینے والے کم ہوں گے۔ تقریریں لمبی کریں گے نماز کو مختصر کریں گے اعمال شرعیہ سے پہلے اپنی خواہشوں کو پورا کریں گے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی تعریف کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اپنی خواہشوں سے پہلے اعمال کو بجا لاتے ہیں یہ نہیں فرمایا کہ وہ خواہش سے بالکل پاک ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کے ساتھ دل کو تعلق ہونا مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اس کا اللہ کے تعلق پر غالب ہونا مذموم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کے درمیان عدل کیساتھ برابری کیا کرتے تھے اگرچہ یہ آپ کے ذمہ فرض نہ تھا اور یہ آپ کی خاص خصوصیت تھی کہ آپکے ذمہ بیبیوں کے ساتھ برابری کرنا لازم نہ تھی مگر آپنے پھر بھی کسی پر کبھی زیادتی نہیں کی اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپکے اہل و عیال پر درود و سلام نازل فرمائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کے ساتھ عدل کا برتاؤ کیا کرتے اور اس کے بعد فرماتے کہ اے اللہ یہ تو میری اپنی طاقت کے موافق کوشش ہے اور جس چیز پر مجھے قدرت نہیں اس میں مجھ سے مواخذہ نہ فرمائیے۔ اس سے مراد قلب کا کسی کی طرف زیادہ مائل ہونا اور کسی کی طرف زیادہ مائل نہ ہونا ہے اور یہ بات حضور نے ہماری تعلیم کے لئے ارشاد فرمائی ہے کیونکہ آپ کو خود ایسے میلان کسی سے نہ تھا جیسے ہم لوگوں کو ہوا کرتا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ جب آپ سے بعض بیبیوں نے اس بات کی شکایت کی کہ آپ حضرت عائشہ کو دوسری بیبیوں پر ترجیح دیتے ہیں جس سے ان لوگوں کو جو حضور کی حالت رفیعہ سے ناواقف ہیں یہ گمان ہوا ہوگا کہ اس ترجیح کا سبب حضرت عائشہ کی نوجوانی اور ان کا حسن و جمال تھا تو حضور نے اس شکایت کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اس معاملہ میں ملامت نہ کرو چونکہ مجھ پر کسی بیوی کے بستر پر وحی نازل نہیں ہوتی بجز عائشہ کے بستر کے کہ ان کے بستر میں ہونا مانع نہیں ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف بتا دیا کہ دوسری بیویوں پر حضرت عائشہ کی ترجیح کا سبب یہ تھا کہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے یہاں خاص درجہ اور خاص مرتبہ سے ممتاز فرمایا ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ کو خاص تعلق ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے خاص تعلق کیوں نہ ہوگا۔

رہی یہ بات کہ فتنہ ان چار چیزوں ہی کے ساتھ مخصوص ہے یا غالب کو بیان کر کے ادنیٰ پر تنبیہ کی گئی ہے سو احتمال دونوں ہیں مگر ظاہر یہ ہے کہ غالب کو بیان کر کے ادنیٰ پر تنبیہ کی گئی ہے جیسا بہت سی حدیثوں میں ہم نے بتلایا ہے کہ جب کسی علت پر حکم کو مرتب کیا جاتا ہے تو جہاں وہ علت پائی جائیگی حکم بھی پایا جائے گا اور اس قاعدہ پر اہل سنت کا اجماع ہے تو جو تعلق بھی اللہ تعالیٰ کے کسی حق سے مشغول کر دے وہ انسان کے لئے وبال ہے اور جس چیز سے نفس کو تعلق تو ہو مگر اللہ تعالیٰ کے کسی حق سے مشغول نہ کرے تو حقوق مامور بہا کا بجالانا اس تعلق کا کفارہ ہو جاتا ہے جیسا ان دلائل سے معلوم ہوا جو کتاب وسنت سے ہم نے بیان کی ہیں آیات اور احادیث اس باب میں اور بھی بہت ہیں مگر سمجھ دار کے لئے وہی کافی ہیں جو ہم بتلا چکے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ یہ فتنہ مردوں ہی کے لئے مخصوص ہے عورتوں کے لئے نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ھن شقائق الرجال عورتیں مردوں کی بہنیں ہیں یعنی لزوم احکام بھی وہ بھی مردوں جیسی ہیں اس کا مقتضی یہ ہے کہ حکم بھی مردوں کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ سب کو عام ہو اور یہاں مردوں کی تخصیص کا نقشہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بتلایا ہے کہ اغلب کو بیان کر کے ادنیٰ پر تنبیہ کی گئی ہے اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ ما ترکت بعدی فتنۃ ھی اضر علی الرجال من النساء میں اپنے زمانہ کے بعد کسی فتنہ کو مردوں کے حق میں عورتوں سے زیادہ مضر نہیں پاتا، عورتوں کے بارہ میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کے حق میں مردوں سے زیادہ مضر فتنہ کوئی نہیں، حالانکہ جیسا مرد عورتوں کی محبت میں حد سے تجاوز کرتے ہیں بعض دفعہ عورتیں بھی مردوں کی محبت میں حد سے نکل جاتی ہیں کیونکہ مرد اس بلا میں زیادہ مبتلا ہیں اور اولاد کے بارہ میں بعض دفعہ عورت مرد سے بڑھ جاتی ہے یعنی

اس کو اولاد سے زیادہ تعلق ہوتا ہے مگر چونکہ باپ کی طرح اس کی حکومت اولاد پر نہیں۔
اس لئے آپ نے اعلیٰ کو بیان فرمادیا (حاکم کا محکوم کی محبت میں حدود سے تجاوز کرنا
زیادہ برا ہے (۲) مال ومتاع وغیرہ کا تعلق سو اس میں مرد و عورت سب برابر مگر پھر بھی
غلبہ مردوں ہی کو ہے کیونکہ وہ صاحب حکومت ہیں ان پر کسی کی حکومت نہیں اور عورتیں
اکثر محکوم ہوتی ہیں اگر ان کو مال ومتاع سے تعلق بھی ہو تو مرد اپنی حکومت سے اس تعلق کو
اعتدال پر لا سکتا ہے لیکن مرد کو مال ومتاع سے محبت ہو تو عورت اسکو اعتدال پر نہیں
لا سکتی تو واللہ اعلم اسی وجہ سے حضور نے یہاں مردوں کا ذکر فرمایا ہے عورتوں کا ذکر
نہیں فرمایا۔ (۲) یہ سوال کہ یہ چاروں عبادات ہی کفارہ ہو جائیں گی یا جملہ اعمال کا مجموعہ
کفارہ ہوگا اس کا بھی وہی جواب ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ یہاں بھی اعلیٰ کو بیان فرما کر
بقیہ پر تنبیہ کی گئی ہے مقصود نہ ایک ہے نہ چار فقط بلکہ تمام اعمال صالحہ مراد ہیں
کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اعمال بدنیہ میں سے اعلیٰ کو بیان
فرمایا ہے۔ یعنی نماز روزہ کو اور نماز کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے و
انہا لکبیرۃ الا علی الخشعین نماز بہت گراں ہے مگر اہل خشوع پر گراں
نہیں اس سے نماز کا تمام اعمال بدنیہ میں اعلیٰ ہونا ظاہر ہے۔ نیز حقوق اموال
یعنی طاعات مالیہ میں سے بھی اعلیٰ کو بیان فرمایا ہے یعنی صدقہ کو اور اقوال میں
سے بھی اعلیٰ کو بیان فرمایا ہے یعنی امر ونہی کو تو جو شخص یہ چار اعمال بجا لائے
گا اس سے بقیہ اعمال فوت نہیں ہو سکتے وہ اس پر قادر ہی نہ ہوگا کیونکہ اعمال صالحہ
میں ایسا ارتباط ہے کہ ایک کا سلسلہ دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ ایک عمل دوسرے کو وہ
تیسرے کو مسلسل اپنے ساتھ لے آتا ہے اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا
ہے اذا رأیت الحسنۃ فاعلم ان لہا اخیات جب تم کسی میں کوئی بات
اچھی دیکھو تو سمجھ لو کہ اسکی بہنیں اور بھی ہیں اور یہی حال سیئہ کا ہے کہ ایک
گناہ کا سلسلہ دوسرے گناہ سے ملا ہوا ہے جس کو ایک گناہ کا مرتکب دیکھو سمجھ لو کہ
اس کے ساتھ اور گناہ بھی ہیں۔

(۵) یہ سوال کہ ان اعمال میں سے ہر ایک الگ الگ کفارہ ہے یا ان کا مجموعہ کفارہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ سب کا مجموعہ کفارہ ہوگا جبکہ بقیہ واجبات و فرائض بھی بجا لائے اور ان پر پابندی کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر لم يزدد من الله الا بعدا جس کی نماز نے اسے بے حیائی اور گناہ سے نہ روکا وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہی ہوتا جائے گا اور جس نے واجبات میں سے ایک کو بھی ترک کر دیا اس نے بے حیائی اور گناہ کا ارتکاب کیا اور جس نے ان دونوں کا ارتکاب کیا وہ اللہ سے دور ہوگیا اور جو اللہ سے دور ہوگیا اس کا کوئی عمل اس فتنہ کا کفارہ کیوں کر ہوگا جس میں گفتگو ہو رہی ہے جبکہ وہ اس فتنہ سے بھی سنگین تر فتنہ میں مبتلا ہے۔

اور یہاں سے تم کو سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ ہوا ہوگا کہ حضور نے اتنے فوائد ایک خوبصورت جملہ میں کس خوبی سے جمع فرما دیئے ہیں۔ الوجه الاول ماهذه الفتنة وما حدها الى قوله في الوجه الثاني كيف جمع هذه الفوائد بهذه العبارة الرائقة

ف یہاں سے ان چار اعمال کی اہمیت واضح ہوگئی کہ ان کو بجا لانے والا بقیہ اعمال کو ضرور بجا لائے گا مگر افسوس ہے کہ ان اعمال میں بہت کوتاہی کی جا رہی ہے، عوام تو نماز روزہ میں بھی کوتاہی کرتے ہیں مگر خواص صدقہ اور امر و نہی میں بہت کوتاہی کرتے ہیں، یہ مسلم کہ اکثر خواص پر زکوٰۃ فرض نہیں مگر تہجد اور اشراق و اوابین و صوم عاشورا اور صوم عرفہ وغیرہ ہی ان پر کب فرض ہے؟ پس جیسا نماز روزہ میں وہ فرض پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ نوافل و مستحبات کا بھی اہتمام کرتے ہیں اسی طرح طاعات مالیہ میں بھی صدقہ نافلہ و مستحبہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نیز تبلیغ احکام کا خاص طور سے اہتمام کرنا چاہیے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے یہی مراد ہے، کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ خواص نے صرف درس و تدریس پر

پر قناعت کر لی ہے عامۃ المسلمین کو امر و نہی کرنے سے پہلو تہی کی جاتی ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام کا جن کے یہ حضرات وارث ہیں اصل وظیفہ امر و نہی اور تبلیغ ہی تھا اصطلاحی درس و تدریس ان کا وظیفہ نہ تھا، درس و تدریس درا صل اسی مقصد کا وسیلہ اور ذریعہ ہے تاکہ مبلغ علم صحیح کے ساتھ تبلیغ کر سکے، پھر یہ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ وسیلہ اور ذریعہ کا تو اتنا اہتمام اور اصل مقصد سے اتنی بے پروائی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ منصب تبلیغ کو جاہلوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور وہ مسلمانوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ اگر علماء اس منصب سے تغافل نہ کرتے تو جاہلوں کو یہ جرأت نہ ہوتی اور عوام بھی حق و باطل میں تمیز کر سکتے، مگر جب عوام کے سامنے صرف ایک ہی پہلو آتا ہے دوسرا پہلو نہیں آتا تو وہ بھی جاہلوں کی پیروی کرنے لگتے ہیں، ضرورت ہے کہ ہر اسلامی مدرسہ میں جہاں درس و تدریس کے لئے دس پندرہ مدرس مقرر کئے جاتے ہیں وہاں تبلیغ احکام کے لئے بھی کم از کم تین چار مبلغ رکھے جائیں مگر ان سے چندہ کی تحصیل کا کام نہ لیا جائے کیونکہ محصل چندہ مبلغ احکام نہیں ہو سکتا وہ اگر تبلیغ احکام کرتا بھی ہے تو اس کا سامعین پر اثر نہیں ہوتا اور عامۃ مسلمین کو جان لینا چاہئے کہ تبلیغ احکام صرف علماء ہی کے ذمہ نہیں بلکہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے جس شخص کو جتنا علم احکام کا حاصل ہے اس کو دوسروں تک پہنچانا اس کے ذمہ فرض ہے مثلاً سب کو معلوم ہے کہ نماز فرض ہے تو جو نماز نہیں پڑھتا اس کو یہ حکم پہنچانا ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے اسی طرح جن کاموں کا گناہ ہونا معلوم ہے ان کا گناہ ہونا اس شخص کو بتلایا جائے جو ان میں مبتلا ہے۔ البتہ عام لوگوں کو وعظ کی صورت سے تبلیغ نہ کرنا چاہئے کہ یہ منصب اہل علم کا ہے۔ جاہل جب وعظ کہنا شروع کرتا ہے تو غلط یا صحیح جو زبان پر آتا ہے کہہ جاتا ہے جس سے گمراہی کا اندیشہ ہے اس لئے عوام کو وعظ نہ کہنا چاہئے، بلکہ گفت و شنید اور نصیحت کے طور پر ایک دوسرے کو احکام سے مطلع کرنا چاہئے کیونکہ تبلیغ احکام فرض بھی ہے اور اس کو اصلاح حال میں بھی بڑا دخل ہے، جن لوگوں کو تبلیغ کی ضرورت اور اس کے نظامِ عمل سے

واقف ہونے کا شوق ہو۔ حضرت حکیم الامت دام مجدہم کا رسالہ دعوت الداعی اور حیات المسلمین مطالعہ کریں۔

(۲۰۳) اعمالِ قلب کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیئے

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو اعمال قلب کو اعمال بدنیہ پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امور مذکورہ مال و اولاد وغیرہ سے دل کی مشغولی کو کفارہ کا محتاج قرار دیا ہے اور کفارہ اسی چیز کا ہوتا ہے جو ناپسند ہو پس معلوم ہوا کہ دل کا غیر حق سے مشغول ہونا ناپسندیدہ ہے۔ الوجہ الثالث فیہ دلیل لاھل الصوفۃ الی قولہ ولا یکفرالا ما لا یرضی

ف۔ اعمال قلب کو اعمال بدن پر ترجیح دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اعمال بدن کا اہتمام نہیں کرتے محض اعمال قلب پر اکتفاء کرتے ہیں کیونکہ یہ تو مجاہدہ کے خلاف ہے اور مجاہدہ طریق صوفیہ کی اصل بنیاد ہے اور مجاہدہ بدون اعمال بدنیہ کے نہیں ہوسکتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کو اعمال بدنیہ کے ساتھ اعمال قلبیہ کا دوسروں سے زیادہ اہتمام ہوتا ہے کیونکہ اعمال بدنیہ بھی اسی وقت قابل ہوتے ہیں جب قلب درست ہو اور قلب کی درستی یہ ہے کہ اخلاص سے معمور ہو۔

(۲۰۴)

اس میں صوفیہ کے ترک شہوات اور مجاہدۂ نفس کی بھی دلیل ہے کیونکہ ان فتنوں میں اور ان سے بھی بڑے فتنوں میں مبتلا ہونے کا سبب غلبۂ شہوات ہی تو ہے اور غلبۂ شہوات کا علاج بجز مجاہدہ اور ترک شہوات کے کچھ نہیں الوجہ الرابع فیہ دلیل لھم علی ترک الشھوات الی قولہ انما ھو غلبۃ الشھوات

(۲۰۵) جس کو جلوت کے حقوق کا تحمل نہ ہو وہ خلوت اختیار کرے

حدیث کے مضمون میں ایک لطیف اشارہ اس پر بھی ہے کہ گویا رسول اللہ

علی اللہ علیہ وسلم ان فتنوں سے ہم کو ڈراتے ہیں کہ ان سے الگ رہنا ہی بہتر ہے کیونکہ ان سے بھاگنے ہی میں سلامتی ہے اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں پس جو شخص ان فتنوں کے تحمل پر قادر ہو اور جو کچھ ان کے حقوق اس کے ذمہ شرعاً ہیں ان کو پوری طرح ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے خاص درجہ اور تعلق کو بھی محفوظ رکھے وہ تو اہل حقیقت و اہل شریعت کے نزدیک یکتائے زمانہ ہے، ورنہ ضعیف ہے اور اہل حقیقت کے نزدیک ضعیف وہ ہے جو میل جول اور تعلقات سے بھاگنے والا ہو یعنی خلوت کو جلوت پر ترجیح دینے والا ہو اور اہل علم کے نزدیک ضعیف وہ ہے جو تعلقات اور میل جول سے نکلنے پر قادر نہ ہو، یعنی جب تک وہ پہلے مقام پر نہ پہنچے جس کے کمال پر سب کا اتفاق ہے کیونکہ اس مقام پر پہنچنے کے بعد تعلقات سے نکلنے کی ضرورت نہیں رہتی اس مقام پر پہنچنے کے بعد یہ تمام تعلقات موجب ترقی بن جاتے ہیں موجب تنزل نہیں ہوتے۔

جب تم کو ہدایت اور اسکے طرق معلوم ہو گئے پھر بھی حظ نفس کی طرف جھکتے رہو تو سلوک کے وقت راستہ تم پر دشوار ہو جائے گا۔ الوجہ الخامس یؤخذ من مفہوم الحدیث اشارۃ لطیفۃ الیٰ قولہ توعرت علیك عند السلوك الطرق

ف تعلقات دنیویہ کی جڑ نکاح ہے جس شخص نے نکاح نہیں کیا وہ گویا دنیا میں داخل ہی نہیں ہوا اسی لئے علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ نکاح کرنا اور عبادات ضروریہ پر اکتفا کرنا افضل ہے یا نکاح نہ کرنا اور عبادات ضروریہ کی ساتھ نوافل کی کثرت کرنا افضل ہے، حنفیہ کا رجحان مسلک اول کی طرف ہے اور شافعیہ کے نزدیک مسلک دوم افضل ہے مگر یہ اختلاف اسی صورت میں ہے جبکہ نکاح کے بعد حقوق نکاح ادا کرنے کی قدرت ہو۔ بیوی کا نان و نفقہ و مہر وغیرہ

عہ یعنی نہ قلب کو ان تعلقات سے فارغ اور یکسو کرنا چاہتا ہے مگر دل یکسو نہیں ہوتا جمعیت قلب میسر نہیں ہوتی ۱۲ ظ

ادا کر سکے اس کی دلجوئی دلداری کر سکے اور اولاد ہو جائے تو ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکے وغیرہ وغیرہ

تو جو شخص ادائے حقوق پر قادر ہو اس کے لئے نکاح کرنا کثرت نوافل سے افضل ہے کیونکہ نکاح حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے تمام انبیاء علیہم السلام بجز ایک دو کے صاحب ازواج تھے اور جو شخص ان حقوق کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو جہ افلاس کے یا بوجہ آزادی طبیعت کے اس کے لئے کثرت نوافل نکاح سے افضل ہے اور اس صورت میں اسکو غلبۂ شہوت کے مفاسد سے بچنے کے لئے سخت مجاہدات کی ضرورت ہوگی جیسے کثرت صیام و قلت اختلاط مع الانام وغیرہ وغیرہ

ف۔ جو شخص باوجود ادا حقوق سے عاجز ہونے کے تعلقات دنیویہ میں مشغول ہوتا ہے وہ اہل حقیقت کے نزدیک ضعیف نہیں بلکہ ہلاک ہونیوالا ہے ان کے نزدیک ضعیف وہ ہے جو اس حالت میں تعلقات سے الگ ہی رہے نکاح ہی نہ کرے، آبادی میں بھی نہ رہے جو ہمسایہ وغیرہ کے حقوق ادا کرنے پڑیں۔

ف۔ یہاں سے ان جاہل صوفیوں کی غلطی واضح ہوگئی جو نکاح کر کے بیوی اور اولاد کے حقوق ادا نہیں کرتے اور فخر کرتے ہیں کہ ہم نے دس سال یا بیس سال سے بیوی کا منہ نہیں دیکھا وہ یاد رکھیں کہ اہل حقیقت کے نزدیک ایسے لوگ ہلاک و برباد ہونیوالے ہیں اگر ان کو بیوی کا منہ دیکھنے سے بچنا تھا تو نکاح کرنے کو کس نے کہا تھا اور اگر نکاح کیا ہے تو اس کے حقوق ادا کرنا تمام مجاہدات و ریاضات سے مقدم ہے۔ مجاہدات و ریاضات فرض نہیں اور ادائے حقوق فرض ہے غیر فرض کے لئے فرض کو ترک کرنا پوری ہلاکت ہے خوب سمجھ لو۔

باب سی و چہارم ۳۴

حدیث

تعاقب الملائکۃ الکرام الکاتبین

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے درمیان کچھ فرشتے رات کو اور کچھ فرشتے دن کو باری باری آتے ہیں اور وہ سب نماز فجر اور نماز عصر میں جمع ہوجاتے ہیں پھر وہ فرشتے جو رات کو آئے تھے آسمان پر چڑھ جاتے ہیں تو ان سے ان کا پروردگار سوال فرماتا ہے، اور وہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے، کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو نماز پڑھتا ہوا چھوڑا اور جب ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے؛

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ ہمارے درمیان کچھ فرشتے رات کو کچھ دن کو باری باری آتے ہیں اور نماز صبح اور نماز عصر میں سب اکٹھے ہوجاتے ہیں اور اللہ عزوجل ہمارے پروردگار اپنے بندوں کے متعلق ان سے سوالات کرتے ہیں اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۰۶) یہاں چند سوالات ہیں

۱۔ اللہ تعالیٰ شانہ صرف آخری عمل کو کیوں دریافت فرماتے ہیں، دوسرے اعمال کو کیوں نہیں پوچھتے کیونکہ حدیث کا لفظ یہ ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے تو سوال اسی عمل سے ہوتا ہے جس پر بندوں کو چھوڑ کر فرشتے

آسمان پر گئے تھے اور وہ آخری عمل ہے جوان کے سامنے ہوا)

۲۔ فرشتے سوال سے زیادہ جواب کیوں دیتے ہیں (کیونکہ وہ سوال کا جواب دے کر اتنا اور بڑھاتے ہیں داتیناھم وھم یصلون جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے)

۳۔ یہ بندے کون ہیں جن کی بابت سوال ہوتا ہے۔

۴۔ سوال کے لئے یہی اوقات کیوں مقرر ہوئے دوسرے اوقات کیوں نہ ہوئے

۵۔ ہم لوگوں کو اس سوال وجواب کی اطلاع سے کیا فائدہ ہے؟ اور اس پر علمی احکام کیا مرتب ہوئے؟

اعتبار خاتمہ کا ہے پس اپنے دن اور رات کو اعمال حسنہ پر ختم کرنا چاہئے

پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان الاعمال بخواتیمہا کہ اعمال کا اعتبار ان کے خاتمہ پر ہے تو یہاں بھی وہی حکم ہے جو وہاں ہے جیسا زندگی بھر کے اعمال میں خاتمہ کے اعمال کا اعتبار ہے اسی طرح دن بھر اور رات بھر کے اعمال میں اخیر عمل کا اعتبار ہے جس کی رات اور دن اچھے عمل پر ختم ہوا اس کی ساری رات اور سارا دن اچھا ہی شمار ہوگا۔

(۲) ملائکہ کا سوال سے زیادہ جواب دینا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو یہ بات معلوم ہے کہ اس سوال کا منشاء رحمت وفضل ہے تو وہ جواب میں ایک بات اور بڑھا دیتے ہیں جو رحمت وفضل کا مزید سبب ہے کہ ہم نے یہاں سے جا کر بھی ان کو نماز ہی پڑھتا ہوا پایا تھا اور اس سے دو علمی مسئلے مستنبط ہوئے

نماز تمام عبادات سے اعلیٰ وافضل ہے

ایک یہ کہ نماز تمام عبادات میں اعلیٰ وافضل ہے کیونکہ سوال و جواب اسی پر واقع ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ

فرشتے ہمارے نیک اعمال سے خوش ہوتے ہیں

ملائکہ بندے کے نیک عمل سے خوش ہوتے ہیں اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بہترین جزا کے طالب ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اپنی طرف سے ایسی بات نہ بڑھاتے جس کا ان سے سوال نہیں کیا گیا تھا۔ رہا یہ کہ یہ بندے کون ہیں جن کی طرف اس عظیم الشان خصوصیت سے اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں اور ان کو یاد فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ان کو یاد فرمانا بڑی رحمت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتلایا ہے کہ ان کا اپنے بندہ کو یاد کرنا رحمت ہی رحمت ہے چنانچہ سورۂ مریم میں فرمایا ہے ذکر رحمۃ ربک عبدہ پس یہ بندے وہی ہیں جن کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے ان عبادی لیس لک علیھم سلطان کہ اے ابلیس میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہ چلے گا۔

بعد فجر اور بعد عصر کی فضیلت

رہا یہ کہ اس سوال و جواب کے لئے ان ہی اوقات کو کیوں مخصوص کیا گیا (یعنی بعد فجر و بعد عصر کو) تو اس کی وجہ تشریف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اوقات کو شرف دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتے ہیں شرف عطا فرما دیتے ہیں خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان ہو یا کچھ بھی ہو اور اس پر دو علمی مسئلے مرتب ہوتے ہیں ایک یہ کہ یہ دو وقت تمام اوقات میں اشرف و اکمل ہیں اور اس پر بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں منجملہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جو آپ نے حق تعالیٰ کی طرف سے بیان فرمایا ہے۔ اذکرنی ساعۃ بعد الفجر و ساعۃ بعد العصر اکفک ما بینھما میرے بندے تو مجھے کچھ دیر فجر (کی نماز) کے بعد اور کچھ دیر عصر (کی نماز) کے بعد یاد کر لیا کر پھر ان دونوں کے درمیانی حصہ کے لئے میں تجھے کافی ہوں گا (یعنی تو میری پناہ میں ہوگا میں تیرے سارے کام بنا دوں گا)

رزق صبح کی نماز کے بعد تقسیم ہوتا ہے

منجملہ ان کے یہ ہے کہ رزق صبح کی نماز کے بعد تقسیم ہوتا ہے تو جو شخص اس وقت طاعت میں مشغول ہوگا اس کے رزق میں ترقی ہوگی۔ اسی لئے تم عابدوں کے رزق میں برکت دیکھتے ہو اور برکت تمام ترقیوں سے بڑھ کر ہے۔

اور حدیث میں اس شخص پر سخت وعید آئی جو عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے اس سے معلوم ہوا کہ یہ وقت خاص عظمت رکھتا ہے منجملہ ان کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے استعینوا بالغدوۃ والروحۃ مدد لو صبح کے وقت اور شام کے وقت کام کرنے سے اگر ان میں فضیلت نہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا پتہ نہ بتلاتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو نماز ان اوقات میں ادا کی جاتی ہے وہ تمام نمازوں سے افضل ہوتی ہے کیونکہ جس عمل کو اہتمام کے ساتھ دریافت کیا جاتا ہے وہ دوسرے اعمال سے ارفع ہوتا ہے اور سب نمازوں میں سے ان ہی دو نمازوں کی بابت سوال ہوتا ہے تو اس تاویل پر یہی صلاۃ وسطی ہے جس پر محافظت کا ہم کو حکم دیا گیا ہے تو اس صورت میں صلاۃ وسطی دو ہونگی۔ ایک صلاۃ وسطی رات کے وقت میں ہے دوسری صلوۃ وسطی دن کے وقت میں ہے کیونکہ صلاۃ وسطی کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے اس میں ان کے گیارہ اقوال ہیں اور کوئی قول ایسا نہیں جس میں دوسروں نے طعن اور اعتراض نہ کیا ہو اور مجھے امید ہے کہ جو تقریر ہم نے کی ہے اس پر سب سے کم اعتراض وارد ہوگا۔

علاوہ ازیں یہ کہ اس حدیث کی جب یہ تقریر کی گئی تو بعض طلبہ نے تو اس سے موافقت کی بلکہ اکثر نے تو اس کو تسلیم کیا اور پسند کیا بجز ایک شخص کے جس نے ہماری اس بات پر بے ڈھنگے پن سے اعتراض کیا کہ اس حدیث سے صلاۃ وسطی پر دلالت ہے۔ ایک طالب علم پر جسکو مقرر سے تعلق تھا یہ اعتراض گراں ہوا تو رات کو اس نے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ

مقرر حضور کے سامنے ہے اور عرض کر رہا ہے یا رسول اللہ مجھے اس حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس میں صلاۃ وسطیٰ پر دلالت ہے اور اپنی تقریر بیان کی اور یہ بھی کہا کہ اس پر ایک شخص نے اعتراض کیا ہے کہ اس سے صلاۃ وسطیٰ پر دلالت نہیں ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ تم نے جو کچھ کہا خوب کہا اور جو تم نے سمجھا درست ہے۔ صبح ہوئی تو خواب دیکھنے والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی مقرر کو اطلاع دی اس نے کہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو درست فرما دیا ہے تو اب مجھے کسی کے رد کی پروا نہیں۔

رہا یہ کہ اس اطلاع میں فائدہ کیا ہے اور اس پر علمی مسائل کیا مرتب ہوتے تو اس میں بہت فائدہ ہے اور علمی مسائل بھی بہت ہیں۔

بیداری اور ہوشیاری سے کام کرنا چاہیئے

منجملہ فوائد کے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس میں ہم کو بتلایا گیا ہے کہ ہمارے اعمال ضبط کئے جاتے ہیں اور ان کی کیفیت بھی بتلا دی گئی اس پر علمی مسئلہ یہ مرتب ہوا کہ ہم کو بیداری اور ہوشیاری سے کام کرنا اور امر و نہی کی حفاظت کرنا چاہیئے یہ تو عوام کا حصہ ہے اور خواص کا حصہ یہ ہے کہ ان کو ان اوقات سے فرحت و سرور ہونا چاہیئے

عارفین کو فجر اور عصر کے وقت مسرور ہونا چاہیئے

کیونکہ شاہی فرستادے ان کے پاس آتے اور اللہ تعالیٰ (ان سے) ان کا حال دریافت فرماتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک تمام مسرتوں سے بڑھ کر مسرت ہے اسی لئے بعض اہل اللہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب رات کا پچھلا حصہ آتا اور وہ نماز تہجد سے فارغ ہو جاتے تو عمدہ سے عمدہ کپڑے پہن کر اچھے سے اچھے بستر پر بیٹھتے اور فرماتے میرے پروردگار کے معزز فرستادوں کو مرحبا بسم اللہ تشریف لائیے اور لکھیئے اس کے بعد برابر ذکر تلاوت میں لگے رہتے یہاں

تک کہ نماز کا وقت آتا تو نماز پڑھتے، پھر دن کی آخری نماز (یعنی عصر) کے لئے بھی ایسا ہی اہتمام کرتے اور رات میں بھی اسی طرح ذکر و تلاوت کرتے ہمیشہ ان کا یہی معمول تھا۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہم کو ملائکہ کی اس محبت کا علم ہو گیا جو ان کو ہمارے ساتھ ہے جس کا علمی نفع یہ ہے کہ ہم کو بھی ان سے انس و محبت ہوگی

فرشتوں سے محبت ہونا چاہیئے

اور یہ محبت اللہ تعالیٰ سے قرب کا ذریعہ ہے کیونکہ حدیث میں ہے المرء مع من احب انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہو۔ پس صلحاء کی محبت انسان کو صلحاء کے ساتھ کردے گی اور وہ بارگاہ قرب میں واصل ہیں۔ تو یہ بھی مقرب ہو جائے گا۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ اس میں غیب کی خبر دی گئی ہے اور یہ سب سے بڑا فائدہ ہے جس پر علمی نفع یہ مرتب ہوگا کہ اس سے ایمان کو ترقی ہوگی جس سے بہت بڑی نعمت اور وہ اعلیٰ درجہ کی مدح حاصل ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ نے ایمان

غیب کی باتیں سننے سے ایمان کو ترقی ہوتی ہے

والوں کی تعریف میں فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے الذین یؤمنون بالغیب (قرآن ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو غیب پر یقین رکھتے ہیں) نیز اس پر یہ فائدہ بھی مرتب ہوا کہ ان دو نمازوں کی حرمت و عظمت کی ہم کو اطلاع ہو گئی جس سے علمی نفع یہ ہوا کہ ان دو نمازوں کی پابندی اور حفاظت کا اہتمام کیا جائے گا۔ نیز اس سے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت و عظمت بھی ہمارے قلوب میں زیادہ ہو گئی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امور غیب کی جس قدر اطلاع اور علم ہوا اور جتنا آپ ان کو بیان فرمائیں اسی قدر آپ کی رفعت و عظمت قلوب میں زیادہ ہوتی ہے اور ہم جس قدر حضور کی

جس قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں ترقی ہوگی اسی قدر قرب میں ترقی ہوگی

کی تعظیم زیادہ کریں گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے قرب میں ترقی کریں گے۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے اس امت محمدیہ کی رفعت دوسری امتوں پر معلوم ہوئی کیونکہ اس واقعہ کی اطلاع اسی واسطے تو دی گئی ہے کہ یہ بات معلوم ہو کہ حق تعالیٰ کی اس امت پر کس قدر عنایت ہے اس کا علمی نفع یہ ہے کہ ہم اس نعمت کا شکر کریں جو خاص طور پر ہمیں عطا کی گئی ہے اور شکر ترقی نعمت کو مقتضی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے

لئن شکرتم لازیدنکم

اگر تم نعمت کا شکر کروگے تو میں تم کو زیادہ عطا کروں گا۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر کیسی توجہ ہے جس کا علمی نفع یہ ہے کہ اس بات کے علم سے ہماری قوت یقین زیادہ ہوگی (اللہ تعالیٰ سے محبت میں ترقی ہوگی) اور یہ بڑا اعلیٰ درجہ ہے۔

قوت وضعف ایمان کا معیار

ایک فائدہ یہ ہے کہ اس حدیث کو سن کر تمہیں اپنے ایمان کا اندازہ ہوگا اپنے ایمان کی قوت وضعف کی معرفت حاصل ہوگی کیونکہ اگر اس حدیث سے عمل کی رغبت زیادہ ہوئی تو یہ قوت ایمان کی علامت ہوگی جو اس بات کی بشارت ہے کہ تمہارے اندر نسبت توم موجود ہے (یعنی تم کو اللہ والوں کی نسبت سے حصہ ملا ہے) اور اگر تم یہ دیکھو کہ اس حدیث کے سننے سے تمہارے اندر کچھ زیادتی نہیں ہوئی بلکہ تم نے اسی طرح اس کو سنا ہے جیسا لوگوں کی باتوں کو سنا کرتے ہو تو معلوم ہوگا کہ تم ان مسکینوں اور محروموں

میں سے ہو جن کی حالت اندیشہ ناک ہے اور اس حالت میں معالجہ کر کے اپنے نفس کی اصلاح کا تم کو اہتمام ہوگا اور یہ علم کا بہت بڑا دروازہ ہے

قولہ الوجہ الاول ان یقال لم سأل مولانا جل جلالہ عن اٰخر الاعمال لا غیرالی قولہ فی الوجہ الخامس وھذا وجہ کبیر من الفقہ

ف سالکین کو نماز فجر اور نماز عصر کے بعد خاص طور سے ذکر اللہ میں کچھ دیر مشغول رہنا چاہیئے۔ سلف صالحین نماز فجر کے بعد سے طلوع آفتاب تک بات کرنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔ ہم نے اپنے اکابر کو اسی قدم پر پایا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مراقب رہتے تھے۔ حضرت حکیم الامت دام ظلہم ومجدہم بھی اس وقت کسی سے بات نہیں کرتے تھے اپنے خاص معمولات میں مشغول رہتے تھے، عصر کے بعد بھی کچھ دیر ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے ہیں حالانکہ ان حضرات کی تو گفتگو بھی اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے ان کا ہر کام ذکر ہی ہے ؎

گفتگوئے عاشقان درکار رب

جوشش عشق ست نے ترک ادب

علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد رزق تقسیم ہوتا ہے۔ یہ رزق ظاہر و رزق باطن دونوں کو عام ہے اس لئے اس وقت سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔

ف صلوٰۃ وسطیٰ کے متعلق حنفیہ کا قول یہ ہے کہ وہ صلوٰۃ العصر ہے۔ احادیث صحیحہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے، حضرت شارح

نے یہاں جو تحقیق بیان فرمائی ہے کہ صلاۃ وسطیٰ دو ہیں۔
ایک وُسطی اللیل
ایک وُسطی النہار
یہ عجیب تحقیق ہے مگر سلف میں سے غالباً کوئی اس طرف نہیں گیا۔ سب کے نزدیک صلاۃ وسطیٰ ایک ہی ہے پس اعتقاداً تو حنفیہ کی تحقیق کو راجح سمجھا جائے اور عملاً دونوں نمازوں کا اہتمام صلاۃ وسطی کی طرح کیا جائے واللہ اعلم بالصواب

باب سی و پنجم ۳۵

حدیث

من نسی صلوۃ فلیصلها اذا ذکرها

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص کسی نماز کو بھول جائے تو جب یاد آئے اسی وقت اسکو پڑھ لے اس کے سوا اس کا کفارہ کچھ نہیں۔ اقم الصلوۃ لذکری نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو۔

شرح ظاہر حدیث بتلاتا ہے کہ بھولی ہوئی نماز کو جب وہ یاد آئے وقت پڑھنا چاہیئے یعنی بشرطیکہ وقت مکروہ نہ ہو کیونکہ لیلۃ ... میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز فجر قضا ہوئی تو آپ نے عین طلوع شمس کے وقت قضا نماز نہیں پڑھی بلکہ کسی قدر توقف کے بعد قضا کی۔

(۲۰۷) ذکر اللہ جملہ اعمال سے اعلیٰ ہے اور ذکر کی اقسام

یہاں ایک اشارہ علم تصوف کا بھی ہے کیونکہ صوفیاء فرماتے ہیں کہ تمام اعمال میں اعلیٰ عمل ذکر ہے کیونکہ ذکر لسانی سے احکام الٰہی کی یادداشت پیدا ہوتی ہے اور وہی تمام اذکار میں بلند تر ہے جیسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو امر و نہی کے موقعہ پر یاد کرنا زبانی ذکر سے بہتر ہے اور غفلت کا سبب نسیان ہی تو ہے، پس جو محروم ہوا غفلت کے سبب محروم ہوا اور جو کامیاب ہوا ذکر و حضوری کی وجہ سے کامیاب ہوا، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں ولذکر اللّٰہ اکبر اللہ کی یاد سب سے بڑی دولت ہے۔ قولہ الوجہ الرابع ھنا اشارۃ صوفیۃ الی قولہ ولذکر اللّٰہ اکبر

ف یہ اشارہ اقم الصلوٰۃ لذکری سے حاصل ہوا جس میں اللہ کی یاد کے لئے نماز کی پابندی کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام فرائض و واجبات سے مقصود اللہ کی یاد ہے۔ پس ذکر تمام اعمال سے افضل ہوا۔ اس کے بعد سمجھو کہ لوگوں نے عام طور پر ذکر اور یاد کو زبانی ذکر میں منحصر کر رکھا ہے یہ غلط ہے بلکہ اصل ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو امر و نہی کے

امر و نہی کے موقعہ پر تعمیل حکم کرنا اصل ذکر ہے ذکر لسانی

اسی کا ذریعہ ہے کے موقعہ پر یاد رکھا جائے یعنی جس وقت جو حکم دیا ہے اور جس کام سے منع کیا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم اور نہی کو یاد کر کے ما مور بہ بجا لائے اور منہی عنہ سے رک جائے۔ جو شخص امر و نہی کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کے حکم اور نہی کو یاد کر کے اس کی تعمیل نہیں کرتا وہ ذاکر نہیں گو زبان سے کتنا ہی ذکر کرتا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا یہی مطلب ہے۔

اور حضرات صوفیہ نے جو ذکر لسانی کا بہت اہتمام کیا ہے اور اس کی تاکید کی ہے وہ بھی محض اسی واسطے ہے کہ کثرت ذکر سے دل بیدار ہو جاتا ہے اور امر و نہی کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کے احکام کو یاد کر کے ان کی تعمیل پر مستعد ہو جاتا ہے۔ اگر ذکر لسانی سے یہ مقصود حاصل نہ ہو تو سمجھنا چاہئے

کہ ابھی ذکر ناقص ہے کامل نہیں اس شخص کو شیخ محقق کامل کی طرف رجوع کر کے تکمیل ذکر کا اہتمام کرنا چاہیے، جب ذکر میں مرتبہ کمال حاصل ہوگا جس کا نام نسبت اور حضور دائم ہے تو امر و نہی کے وقت قلب حق تعالیٰ سے غافل نہ ہوگا اور ہر وقت کے متعلق جو احکام ہیں ان کی تعمیل ہوتی رہے گی یہی اصل ذکر ہے جو کامیاب ہوا اسی سے کامیاب ہوا پس جو لوگ ذکر لسانی کو فضول سمجھتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں کیونکہ اصل ذکر کا ذریعہ یہی ہے ۔

از صفت و ز نام چہ زاید خیال　　　وان خیال تست دلال وصال

اور جو لوگ محض ذکر لسانی یا ذکر قلبی کو کافی سمجھتے ہیں اور احکام الٰہیہ کی تعمیل کا اہتمام نہیں کرتے وہ بھی گمراہ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ مجھے اس طریقہ سے یاد کرو جس طرح میں نے بتلایا ہے تو جو شخص نماز کے وقت نماز نہیں پڑھتا محض زبان یا دل سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو اس طریقہ سے یاد نہیں کرتا جس طریقہ پر وہ اس وقت اپنی یاد چاہتے ہیں اسی طرح جس پر زکوٰۃ فرض ہو اس کو سال تمام پر زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی یاد کا طریقہ یہی ہے، جس پر رمضان کا روزہ فرض ہے اس کو رمضان میں روزہ رکھنا چاہیے کہ اس وقت اللہ کی یاد کا یہی طریقہ ہے جس وقت کوئی نامحرم عورت سامنے سے گذرے اس وقت اللہ کی یاد کا طریقہ یہی ہے کہ آنکھیں نیچی کرلے وعلیٰ ہذا ہر وقت کے متعلق جو بھی حکم ہے اس وقت اس کا بجا لانا ہی ذکر ہے اگر اس وقت حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو نرا مراقبہ یا ذکر لسانی کرنے سے یہ شخص ذاکر نہ ہوگا بلکہ غافل اور نافرمان شمار ہوگا اسی لئے محققین صوفیہ کا ارشاد ہے کل مطیع للّٰہ فھو ذاکر جو شخص اللہ کی اطاعت میں لگا ہوا ہے وہ ذاکر ہے گو زبان سے ذکر نہ کر رہا ہو کیونکہ اطاعت میں لگا رہنا بدون محبت یا خوف الٰہی کے نہیں ہوتا اور محبت یا خوف ہی اصل ذکر ہے۔ خوب سمجھ لو۔

باب سی و ششم
۳۶

حدیث

الاذان فی البادیۃ وفضلہ

عبدالرحمٰن بن ابی صعصعہ انصاری مازنی رضی اللہ عنہما اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ تم کو بکریوں سے اور جنگل میں رہنے سے محبت ہے تو جب تم اپنی بکریوں میں یا جنگل میں ہو اور نماز کے لئے اذان دو تو بلند آواز سے اذان دیا کرو کیونکہ مؤذن کی اذان جہاں تک جاتی ہے وہاں تک جو انسان یا جن یا جو چیز بھی اس کی آواز سنے گی قیامت کے دن اس کے واسطے گواہی دے گی۔ ابو سعید خدری نے فرمایا کہ میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ جو چیز مؤذن کی اذان سنے گی وہ اس کے لئے قیامت کے دن گواہی دیگی۔

(۲۰۸) بے جان چیزیں بھی اعمال صالحہ کی گواہی دیں گی

شئے سے مراد بظاہر ہر چیز ہے جاندار ہو یا بے جان کیونکہ شئے کا اطلاق سب پر آتا ہے خصوصاً جب کہ دوسری حدیث میں مدر و شجر بھی آیا ہے

(یعنی ڈھیلے اور درخت بھی گواہی دیں گے) یہاں ایک سوال ہے کہ ان چیزوں کی گواہی سے فائدہ کیا ہوگا؟ اور عمل کرنیوالے کے لیے اس پر کون سی خیر مرتب ہوگی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو سننے والوں کے عمل کے برابر ثواب ملے گا واللہ اعلم اسکی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے من دعا الی ھدی فله اجرہ واجر من عمل به جو شخص ہدایت کی طرف بلائے اس کو اس عمل کا ثواب بھی ملے گا اور جو اس پر عمل کریگا اس کا ثواب بھی ملے گا نیز حدیث میں بھی آیا ہے کہ زمین کے قطعات باہم ایکدوسرے کو روزانہ پکارتے ہیں ایک دوسرے سے سوال کرتا ہے کیا تجھ پر کوئی اللہ کو یاد کرنیوالا گذرا ہے؟ تو جس قطعہ پر اللہ کو یاد کرنیوالا گذرا ہوگا وہ دوسرے قطعات پر فخر کرتا ہے تو چونکہ یہ شخص اذان دیکر ذکر اللہ کی طرف بلا رہا ہے اس لئے اس کو دوہرا ثواب ملے گا، اگر یہ کہا جائے کہ اذان تو ذکر نہیں بلکہ وقت نماز کی اطلاع ہے تو ہم کہیں گے بجا ہے مگر اس کو ذکر ہی کا ثواب ملے گا کیونکہ اذان میں الوہیت (خداوندی) کا اقرار ہے اور شرک کی نفی ہے اور جو کوئی اذان سنے اس کو اذان کا جواب دینا مشروع و مسنون ہے تو اس میں نماز کی اطلاع بھی ہے اور افضل الاذکار یعنی نماز کی دعوت بھی ہے اس لئے اس پر وہ ثواب مرتب ہوا جو ہم نے بتلایا ہے۔

الوجه الاول هل يعنى بشئ كل حيوان او جماد الى قوله فوجب له بذلك من الاجر ما ذكرنا

(۲۰۹) جمادات میں شعور اور قوت سماع کا اثبات

حدیث میں اس پر بھی دلالت ہے کہ جمادات سنتے ہیں علماء نے ان احادیث و آیات کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے جن میں جمادات کے متعلق اس قسم کی باتیں وارد ہوئی ہیں جیسے اللہ تعالی کا ارشاد ہے وان من شئ الا يسبح بحمده کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح وحمد نہ کرتی ہو تو بعضوں نے کہا ہے کہ ان میں بعض اوقات حیات پیدا کردی جاتی ہے اس

وقت وہ تسبیح کرتے ہیں اور بعض نے ان آیات واحادیث کو ظاہر پر رکھا ہے۔ کہ جمادات اسی حالت میں سنتے اور خوش ہوتے اور تسبیح کرتے ہیں کیونکہ قدرت سب کچھ کر سکتی ہے اور یہی حق ہے خصوصاً جبکہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانہار وان منہا لما یشقق فیخرج منہ الماء وان منہا لما یہبط من خشیۃ اللہ ط کہ بعضے پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر بہتی ہیں بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو اُن سے پانی رستا ہے اور بعضے اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ علماء محققین نے فرمایا ہے کہ جو پتھر مٹی کی طرح بہتا ہے اور جو پہاڑ گرتا ہے وہ اللہ عزوجل کے خوف ہی سے گرتا ہے، یہی قول حق ہے کیونکہ اگر یہ تسبیح وغیرہ زبان حال سے ہوتی جیسا ایک جماعت کا خیال ہے تو ہمیں اس کی اطلاع دینے سے کیا فائدہ؟ کیونکہ اتنی بات تو ہم کو بداہۃً معلوم ہے کہ ہر مخلوق اپنے انقلاب وتغیر واحتیاج سے اپنے خالق کا پتہ دے رہی ہے۔ اس کا بتلانا تو تحصیل حاصل ہے جو حکیم کے حق میں محال ہے۔

ف۔ جمادات ونباتات میں شعور اور قوت تکلم کا ہونا صوفیہ کو کشف سے معلوم ہو چکا ہے بعض اہل اللہ سے درختوں اور پہاڑوں نے بات چیت کی ہے وہ ان آیات واحادیث کو جن میں جمادات کے متعلق اس قسم کی باتیں مذکور ہیں ظاہر پر محمول کرتے۔ فلاسفہ اور معتزلہ اور وہ علماء جن پر فلسفہ غالب ہے۔ ان میں تاویل کرتے ہیں مگر ظاہر قرآن وحدیث صوفیہ کا مؤید ہے۔

(۲۱۰) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین کے قطعات قیامت کے دن اُن اعمال خیر وشر کی گواہی دیں گے جو اُن پر کئے گئے ہیں اس کے متعلق اور بھی بہت احادیث وارد ہیں آیات قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں، اور قدرت الٰہیہ سب کچھ کر سکتی ہے اور اس مضمون کی اطلاع سے فائدہ بھی جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ اس کو ظاہر پر رکھا جائے تاویل کرنے سے اس اطلاع کا

فائدہ کچھ نہیں رہتا۔ اور جو لوگ قدرت الٰہیہ پر حکم لگانا چاہتے اور یوں کہتے ہیں کہ سمجھنا اور بات کرنا بدون حیات و عقل کے ناممکن ہے، اُن کے پاس

فہم و تکلم کو حیات و عقل پر موقوف سمجھنا بلا دلیل ہے

اس دعوے کی شرعی دلیل کوئی نہیں، انہوں نے محض عقل سے یہ بات نکالی ہے

قدرت کو عقل کا پابند نہیں کیا جا سکتا

اور قدرت کو عقل کا پابند نہیں کیا جا سکتا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں و یخلق ما لا تعلمون اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہیں اس مضمون پر ہم شروع کتاب میں بحث کر چکے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں قولہ الوجہ الثالث فیہ دلیل علی ان الجمادات تشہد الی قولہ اغنی عن اعادتہ ھنا

ف اس زمانہ میں سائنس کی ایجادات نے فلسفۂ قدیمہ کے بہت سے نظریوں کو غلط کر دیا ہے۔ جن چیزوں کو پہلے عرض کہا جاتا ہے آج وہ جواھر میں داخل ہیں، ریڈیو اور گراموفون کی ایجاد نے جمادات کے تکلم کا استبعاد بھی رفع کر دیا کیا تعجب ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں ایسی برقی طاقت رکھی ہو جو ان اعمال کا اثر قبول کر لیتی ہو جو اس پر یا اس کے قریب کئے جاتے ہوں اور قیامت میں وہ ان اعمال کی گواہی دے۔ حضرات اہل کشف کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ ان کو بعض دفعہ زمین پر بیٹھتے ہی معلوم ہو گیا کہ یہاں کسی نے بُرا کام کیا ہے یا یہاں کسی بزرگ نے قیام کیا ہے یہ اسی اثر کا تو نتیجہ ہے جو اعمال صالحہ یا اعمال سیاہ کی وجہ سے اس جگہ پیدا ہو گیا تھا۔

ف قانون قدرت کی تحقیق

نو تعلیم یافتہ جماعت کو جو بعض آیات واحادیث پر شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا منشا یہی ہے کہ وہ قدرت الٰہیہ کو [illegible] عقل کا پابند کرنا چاہتے ہیں اور

اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے ایک لفظ اس جماعت نے خوب یاد کر لیا ہے کہ قانون قدرت کے خلاف نہیں ہو سکتا، مگر کوئی ان سے پوچھے کہ جب تم قدرت کا احاطہ نہیں کر سکتے تو اس کے قوانین کا احاطہ کیونکر کر سکتے ہو ممکن ہے جس بات کو تم اپنے زعم میں قانون قدرت کے خلاف سمجھتے ہو وہ حقیقت میں قانون قدرت کے خلاف نہ ہو بلکہ کسی ایسے قانون کے موافق ہو جس کی تم کو خبر نہیں۔ غرض یہ لوگ اپنی عقل سے قدرت کا ایک قانون بنا لیتے ہیں اور جو بات اس کے خلاف سنتے ہیں اس کو رد کر دیتے ہیں حالانکہ عقل سے قدرت کے لئے کوئی قانون مقرر کرنا ہرگز جائز نہیں جب تک خود صاحبِ قدرت نہ کہے کہ میرا یہ قانون ہے۔ خوب سمجھ لو۔

(۲۱۱) حیوانات وجمادات نیک بندوں سے خوش ہوتے ہیں

حدیث میں اس پر بھی دلالت ہے کہ حیوانات وجمادات نیک بندوں سے خوش ہوتے ہیں (جب ہی تو وہ ان کے لئے گواہی دیں گے) آیت فما بکت[ع] علیھم السماء والارض کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ جس زمین پر بندہ عبادت کرتا تھا اور آسمان کے جس دروازہ سے اس کے اعمال اوپر جاتے تھے وہ چالیس دن تک (اس شخص کے مرنے کے بعد) روتے ہیں، یہ حدیث جنگل میں عبادت کرنے کی بھی ترغیب دے رہی ہے کیونکہ جب مؤمن کو اس ثواب کی اطلاع ہوگی تو وہ اس میں کوشش کرے گا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص نماز کے وقت جنگل میں ہو اور اذان واقامت کہہ کر نماز پڑھے تو اس کے پیچھے پہاڑوں کے برابر فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور اگر صرف اقامت کہے اذان نہ دے تو اس کے پیچھے صرف دو فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔

ع نہ ان پر آسمان کو رونا آیا نہ زمین کو

جنگل میں نماز پڑھنے کی فضیلت اور اس کا مطلب

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جنگل کی ایک نماز ستر نمازوں کے برابر ہے، پس ان احادیث سے جو جنگل میں عبادت کرنے کے متعلق ہیں اور ان احادیث سے جو بستی میں نماز پڑھنے اور جماعت میں حاضر ہونے اور مسجدوں کی پابندی کرنے ان میں عبادت کرنے وغیرہ کے متعلق ہیں یہ معلوم ہوا کہ مؤمن جب کتاب و سنت کے موافق عمل کر رہا ہو تو وہ جہاں بھی ہوگا حسبِ وعدہ بڑی خیر میں ہوگا۔

الوجه الرابع فيه دليل على ان الحيوان والجماد يفرح بالصالحين الى قوله في خير عظيم بحسب الوعد الحق

ف جنگل کی نماز میں جو ثواب فضیلت وارد ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ بستی کو چھوڑ کر جنگل میں نماز پڑھنے جایا کریں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ضرورت سے جیسے بکریاں چرانا یا زراعت یا اور کسی مزدوری کام کے لئے جنگل جانا پڑے تو بستی کی مسجد اور جماعت کے فوت ہونے سے دلگیر نہ ہوں بلکہ اذان و اقامت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ جنگل کی تنہا نماز ہی میں بھی بہت ثواب عطا فرمائیں گے۔ باقی بلا ضرورت بستی کی نماز چھوڑ کر جنگل میں نماز پڑھنے کے لئے جانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین سے منقول نہیں۔

(۲۱۲) جو حبِّ دنیا دین سے مانع نہ ہو وہ جائز ہے

حدیث میں اس پر بھی دلالت ہے کہ جس شخص کو دنیا کے کسی ساز و سامان سے محبت ہو اور یہ محبت دین کے حقوق واجبہ و مستحبہ کے پوری طرح بجا لانے سے مانع نہ ہو تو ایسی محبت جائز ہے کیونکہ ان بزرگ نے اپنے ساتھی کو اس محبت سے منع نہیں کیا بلکہ اس پر قائم

دکھا جو اس کے اندر نظر آئی تھی۔ یعنی بکریوں کی محبت ہاں اس کو ایک امر مستحب کی ترغیب دی کہ جنگل میں اذان کے ساتھ نماز پڑھا کرے۔

قولہ الوجہ السادس فیہ دلیل علی ان من احب شیئا من متاع الدنیا الیٰ قولہ وھو الاذان والصلاۃ فیہ

(۲۱۳) اختلاف اغراض مانع اتحاد نہیں

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اختلاف اغراض کے ساتھ بھی صحبت میں اتفاق واتحاد ہو سکتا ہے کیونکہ ان دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے کو اس کے حال پر برقرار رکھا جائے اور بایں ہمہ دونوں میں اتفاق تھا کیونکہ ہر شخص اپنے حال میں شریعت کے موافق تھا۔ ایسا ہی قصہ امام مالک رضی اللہ عنہ کو اپنے ایک دوست کے ساتھ پیش آیا تھا جو عبادت میں مشغول تھا۔ اس نے امام مالک کے پاس خط بھیجا جس میں اس بات کی ترغیب دی تھی کہ علمی مشاغل اور اس میں جد وجہد کو چھوڑ کر ہمہ تن عبادت میں مشغول ہو جاؤ، امام مالک نے اسکو جواب دیا کہ تم بھی خیر پر ہو اور میں بھی خیر پر ہوں، میں اس خیر کو نہیں چھوڑ سکتا جس پر میں ہوں اور تم اس خیر کو نہیں چھوڑ سکتے جس پر تم ہو پھر دونوں میں دوستی بدستور قائم رہی حالانکہ ہر ایک اپنے خاص حال پر جما ہوا تھا۔

ف یہاں سے ان صوفیوں کی غلطی واضح ہو گئی جو اپنے کو سب سے الگ رکھے اور سب کو دنیادار سمجھ کر چھوڑ بیٹھتے ہیں حالانکہ یہ کوشش کرنا کہ سارے ہم جیسے ہو جائیں نری جہالت ہے۔ اگر سارے صوفی ہی ہو جائیں تو علم کی اشاعت کون کرے گا درس وتدریس کا فرض کون ادا کرے گا زراعت وتجارت اور قضا وحکومت کون کرے گا ممالک اسلامیہ کی جہاد کے ذریعہ دشمنوں سے کون حفاظت کرے گا۔ اسی طرح اگر علماء یہ چاہیں کہ سارے ہم جیسے ہو جائیں تو مقامات سلوک کون طے کریگا، امراض قلب کا علاج کون کرے گا؟

مسلمانوں کو اپنے حال و قال سے کون سنبھلے گا؟ غرض یہ خیال کرنا کہ ہم اس سے محبت و اتفاق رکھیں گے جس کا حال ہمارے حال کے موافق ہو۔ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے ہر شخص کو اس مسلمان سے دوستی اور محبت رکھنا چاہیئے جو اپنے احوال میں شریعت کیموافق عمل کر رہا ہو خواہ وہ بکریاں چرانے والا ہو یا عالم ہو یا قاضی ہو یا تاجر و زراعت پیشہ ہو۔

(۲۱۴) ہر ایک کو اس کے مناسب نصیحت کی جائے

اس سے یہ بھی معلوم کہ ہر شخص کو اس کے حالت کے مناسب نصیحت کرنا چاہیئے کیونکہ ان بزرگ اصحابی نے اپنے دوست کو اسی امر مستحب کی ہدایت کی جو اس کی حالت کے مناسب تھا یعنی اذان کے ساتھ نماز پڑھنا اس سے یہ نہیں کہا کہ مسجدوں میں نماز پڑھنے کی پابندی کرو اور اس کے مثل دوسرے ایسے کام جو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی سکونت بستی میں ہے (نہیں بتلائے) کہ اس سے اسکو تشویش ہوتی کیونکہ جس حالت میں وہ تھا اس میں رہتے ہوئے ان کاموں کو نہیں کر سکتا تھا

الوجه الثامن يوخذ منه ان نصيحة كل شخص بما يقتضيه حاله الى قوله لكونه لايقدر على فعله مع ماهو فيه۔

ف۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

چار پارا قدر طاقت بار نہ ۔۔۔ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ
طفل را گر نان دہی بر جائے شیر ۔۔۔ طفل بیچارہ ازاں نان مردہ گیر

بعض لوگ سب لوگوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں وہ محقق نہیں عطائی ہیں محقق ہر شخص کو اس کے حال کے مناسب کام بتلاتا ہے۔

(۲۱۵) قرن اول میں ہر ایک کو دوسرے کی فکر تھی

اس سے قرن اول کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ ان میں ہر ایک دوسرے کی فکر میں لگا رہتا تھا اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ بزرگ صحابی اپنے بھائی کو یہ بات نہ بتلاتے۔

الوجہ التاسع فیہ دلیل علی فضل الصدر الاول الی قولہ لما ارشد ھذا السید اخاہ الی ذلک

ف۔ ہم لوگوں کی بدحالی اور پستی کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنا فکر ہے اپنے بھائیوں کی فکر نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں کوئی کسی کی خیرخواہی نہیں کرتا۔ افسوس۔

(۲۱۶) ہر ایک کے لئے جمعیت قلب کا طریق جدا ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص کی جمعیت خاطر (جمعیت قلب) کا طریقہ جدا ہے۔ یا اس سے معلوم ہوا کہ ان بزرگ صحابی نے اپنے ساتھی کو اذان کی ہدایت کی دوسرے مستحبات واوراد نہیں بتلائے جس کی وجہ وہی تھی جو ہم نے بتلائی کہ ایک کی جمعیت خاطر کا طریق الگ ہے۔

قولہ الوجہ العاشر فیہ دلیل علی ان لکل شخص ما ھو اجمع لخاطرہ الی قولہ للعلۃ التی عللنا ھا قبل

ف۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو بارہ تسبیح اور مراقبات ہی سے جمعیت قلب حاصل ہو بعض کو اذان سے بعض کو تلاوت قرآن سے یہ دولت حاصل ہوتی ہے پس ہر ایک کو اس کے مناسب کام بتلاؤ۔

(۲۱۷) حضرات صحابہ کو مستحبات کا اہتمام بھی بہت تھا

اس سے یہ بھی معلوم

ہوا کہ قرنِ اول کے لوگ مستحبات کی بھی ایسی ہی پابندی کرتے تھے جیسی واجبات کی کیونکہ صحابی نے یوں فرمایا ہے کہ جب تم اذان دو اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنے ساتھی کی نسبت یہ گمان نہ تھا کہ وہ اس مستحب کو چھوڑ دیتے ہیں اور نماز کے وقت اذان نہیں دیتے اور اذان کی جو پانچ قسمیں فقہا نے بیان فرمائی ہیں: واجب و مستحب و حرام و مکروہ ومباح، یہ اذان ان میں سے نوع مستحب میں داخل تھی (کیونکہ جو شخص جنگل میں تنہا نماز پڑھے اس کے ذمہ اذان واجب نہیں صرف مستحب ہے، مگر صحابی نے اس شخص کو اس مستحب میں ایک چیز کو زیادہ کرنے کی ہدایت کی یعنی آواز بلند کرنے کی۔

قولہ الوجہ الحادی عشر فیہ دلیل علی ان الصدر اول کانوا یحافظون علی المندوبات الیٰ قولہ وھو مد الصوت

(۲۱۸) سب سے اہم واقدم دین ہے

اس میں اہل تصوف کے حق پر ہونے کی بھی دلیل ہے کیونکہ ان کے نزدیک سب چیزوں سے اہم اور مقدم دین ہے اگر قرن اوّل کا بھی یہی حال نہ ہوتا تو یہ صحابی اپنے ساتھی کو یہ وصیت نہ کرتے جس کا ذکر ہو چکا ہے (بلکہ کوئی دنیا کی ترقی کا ذریعہ بتلاتے) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تو یہ حالت تھی کہ جب باہم ملاقات کرتے تو ایک دوسرے سے یوں کہتا تھا تعال نومن۔ آؤ ایمان کی باتیں کریں، یعنی ایسی باتیں کریں جن سے ہمارے ایمان کو قوت ہو (شارح فرماتے ہیں) کہ میرے احباب میں بھی ایک صاحب ایسے ہی تھے جن کا مرتبہ طریق علم اور طریق حال دونوں میں بلند تھا جب ہم دونوں ملاقات کرتے تو سلام کے بعد اوّل یہ سوال کرتے کہ تمہارے دین کا کیا حال ہے اور اپنے پروردگار کے ساتھ تمہارا کیسا حال ہے تمہاری قلبی حالت کیسی ہے، اس کے بعد دوسری باتوں کو

پوچھتے تھے (مثلاً مزاج کیسا ہے گھر میں خیریت ہے وغیرہ وغیرہ) ان سے مل کر جب میں جدا ہوتا تو سینہ میں انشراح اور ایمان میں خاص ترقی محسوس کرتا تھا جس کا سبب ان کا صدق اور قرن اول کے ساتھ تشبہ تھا کہ سب سے زیادہ اہم اور ضروری بات کو مقدم کرتے تھے۔ اخوت ایمان اسی طرح کی ہونی چاہیئے اسی لئے اللہ تعالیٰ جل جلالہ فرماتے ہیں

الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقین

سب دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے بجز متقین کے کہ ان کی دوستی وہاں کام آئے گی اور جو شخص لباس تقوی سے آراستہ ہوگا اس پر تقوے کے آثار ضرور ظاہر ہوں گے۔

قوله الوجه الثاني عشر فيه دليل لاهل الصوفة لان اهم الاشياء عندهم الدين الى قوله فمن لبس ثوب التقى ظهرت عليه بشارة

ف۔ افسوس آجکل یہ طریقہ مسلمانوں میں بالکل متروک ہو گیا اعزہ اور احباب سے ملتے ہیں تو مزاج پرسی اور گھر باہر کی خیریت تو دریافت کرتے ہیں یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے دین کا کیا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کیسا ہے قلبی حالت کی کیا کیفیت ہے۔ صوفیہ زمانہ کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہیئے

جعلنا الله وایاکم کما یحب ویرضی

باب ۳۷ سی وہفتم

حدیث

فضل الاذان والصف الاول والعتمۃ والصبح

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر لوگ جانتے اس ثواب کو جو اذان اور صف اول میں ہے پھر قرعہ اندازی کے سوا کوئی صورت (تصفیہ) کی نہ پاتے تو وہ ضرور قرعہ اندازی کرتے (اور اذان وصف اول کو وہی شخص پاتا جس کا نام قرعہ میں نکلتا) اور اگر جانتے اس ثواب کو جو دوپہر کے وقت نماز کے لئے آنے میں ہے تو اس میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتے اور اگر جانتے اس (ثواب) کو جو عشاء اور صبح (کی نماز باجماعت) میں ہے تو ان کے لئے ضرور آتے، چاہے گھسٹ کر ہی آنا پڑتا۔

شرح ظاہر حدیث میں صف اول کی اور اذان کی اور ظہر کی نماز اور عشاء وصبح کی نماز میں جماعت کی ترغیب ہے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

۲) **اعمال صالحہ میں مسابقت کرنا چاہیئے** حدیث سے معلوم ہوا کہ نیک اعمال میں باہم ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہیئے اور یہ کہ اس

سے عمل میں نقص لازم نہیں آتا اور نہ یہ ریا میں داخل ہے اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے لاستهموا علیہ کہ وہ اس پر قرعہ اندازی کرتے اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون اسی میں باہم آگے بڑھنے والوں کو آگے بڑھنا چاہیئے۔
قولہ فی الثانی فیہ دلیل علی المنافسۃ الی قولہ فلیتنافس المتنافسون"

(۲۲۰) نفس کو کسی عمل کا شوق نفع معلوم ہونے کے بعد ہوتا ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نفوس انسانی کو اعمال پر برانگیختگی اسی وقت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے کیا نفع حاصل ہوگا، اسکی دلیل حضور کا یہ ارشاد ہے لویعلم الناس اگر لوگوں کو معلوم ہوتا الخ جس میں حضور نے ثواب کی عظمت پر اشارہ فرما دیا ہے اور دوسرے مواقع میں مفصل طریقہ پر بیان فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ اذان دینے والوں کی گردنیں قیامت کے دن سب سے زیادہ لمبی ہوں گی، نیز ارشاد ہے کہ مؤذن مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے، وغیرہ وغیرہ چونکہ اس حدیث میں اذان وغیرہ کی ترغیب کا عنوان ہے اس لئے یہاں حضور نے عظمت ثواب پر اشارہ کافی سمجھا تفصیل بیان نہیں فرمائی اس سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ مخبر کو خبر کا عنوان ایسا اختیار کرنا چاہیئے جس سے زیادہ فائدہ کی امید غالب ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اجمال سے کام لیا اور دوسری احادیث میں تفسیر فرمائی ان دونوں میں تفرقہ کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ آپ نے ہر موقعہ کے مناسب عنوان اختیار فرمایا جس میں اس وقت زیادہ نفع کی امید تھی۔ قولہ فی الوجہ الثالث فیہ دلیل علی ان النفوس فی الغالب الیٰ قولہ الا بھذا الوجہ

(۲۲۱) اعمال خیر کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنا چاہئے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمالِ خیر کی تحصیل کے لئے ہر ممکن تدبیر سے کام لینا چاہئے اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے "پھر کوئی صورت نہ پاتے" یعنی یہ لوگ قرعہ اندازی اسی وقت کریں گے جب اس عمل خیر کے حاصل کرنے کی قدرت نہ رہے گی۔ یہیں سے صوفیہ نے اپنے نفس کے مقابلہ میں تدبیر اور مجاہدہ کی دلیل اخذ کی ہے چنانچہ بعض صوفیہ سے منقول ہے کہ وہ ایک مدت اپنے نفس کو صوفیہ کے لباس پر آمادہ کرتے رہے اس کی خوبیاں اس کو بتلاتے رہے یہاں تک کہ اس نے صوفیہ کا لباس پہن لیا جب یہ لباس پہنا دیا تو اس کے بعد جب وہ کسی ایسے کام کا ارادہ کرتے جو صوفیہ کے طرز کے خلاف ہوتا تو نفس سے فرماتے کہ تو نے اس قوم کا لباس پہن لیا (اور ان کی سی صورت بنالی ہے) پھر ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہے یا وہ اہل دنیا کی سی حالت کا تقاضا کرتا تو فرماتے یہ حالت اس لباس کے مناسب نہیں۔ اس جیسی تدبیریں ان حضرات سے بہت منقول ہیں۔

قولہ الوجہ الخامس فیہ دلیل علی التحصیل الی قولہ ومثلہ عنہم کثیر

ف۔ لباس اور وضع کو بھی اصلاح حال میں بہت دخل ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا نہیں وہ لوگ سخت غلطی کرتے ہیں جو منہ اٹھا کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ لباس میں کیا رکھا ہے اور بعضے حضرات سعدیؒ کا یہ شعر پڑھ دیا کرتے ہیں ؎

درویش صفت باش وکلاہ تتری دار

ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ سعدی کا مطلب لباس و وضع کی لغویت کا اثبات نہیں بلکہ درویش صفت ہونے کی ضرورت و اہمیت بتلانا ہے اور

تجربہ سے ثابت ہے کہ درویش صفت بدون ان کی وضع اختیار کئے عادتاً نہیں ہو سکتا تو مقدمہ لازم کا لازم ہوگا، ہاں جب درجہ کمال حاصل ہو جاوے اور انسان صحیح معنوں میں درویش صفت ہو جاوے پھر اس کو وضع اور طرز کی پابندی لازم نہیں رہتی۔

(۲۲۲) نشاط کے ساتھ کام کرنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عمل صالح کے لئے نشاط کے ساتھ کسل کو چھوڑ کر سبقت کرنا چاہیئے۔ اس کی دلیل حضور کا یہ ارشاد ہے ولو حبوا چاہے گھسٹ ہی کر آنا پڑتا اور جس کا یہ حال ہوگا وہ تو کسل سے بہت دور ہوگا۔

(۲۲۳) مجاہدہ صوفیہ کی دلیل

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے کہ وہ اپنے نفوس کو مجاہدہ سے پکڑتے ہیں (یعنی مجاہدات سے ان کو قابو میں لاتے ہیں) کیونکہ گھسٹ کر آنا تو بڑا مجاہدہ ہے۔

(۲۲۴) شعائر اسلام میں اخفاء افضل نہیں بلکہ اظہار افضل ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اعمال شعائر اسلام ضروریہ میں سے ہوں ان کو ظاہر کر کے ادا کرنا افضل ہے۔ چنانچہ یہ سب اعمال جن کا حدیث میں ذکر ہے اسلام کے شعائر ضروریہ سے ہیں۔

(۲۲۵) دین کے لئے ظاہری بدنمائی گوارا کرنا چاہیئے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے ظاہری بدنمائی اختیار کرنا چاہیئے اسکی دلیل بھی حضور کا وہی ارشاد ہے ولو حبوا کیونکہ بڑے درجہ کے آدمی کے حق میں گھسٹ کر چلنا بدنما صورت ہے خصوصاً

جب اس کو کوئی جاہ و مرتبہ بھی حاصل ہو مگر یہاں دین کی رعایت کی گئی اور بدنمائی کی رعایت نہیں کی گئی۔

اور اس میں لوگوں کے قول کی دلیل بھی ہے جو یوں کہتے ہیں کہ جمعہ کی نماز ادا کی جائے اگرچہ راستہ میں گارا ہو جس سے کپڑوں وغیرہ کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ اگر راستہ میں گارا کیچڑ ہو جس سے کپڑوں اور بدن کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو یہ عذر ایسا ہے جس کی وجہ سے جمعہ کو چھوڑنا جائز ہو جائے؟ اس میں دو قول ہیں اور اس حدیث میں ان لوگوں کے لئے حجت ہے جو اس کو عذر نہیں مانتے۔

ف۔ یہاں سے ان صوفیوں کا رد ہو گیا جو وقار و وقار بہت پکارا کرتے ہیں کہ یہ کام وقار کے خلاف ہے ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ تصوف میں وقار کوئی چیز نہیں نہ شریعت نے فضائل کے مقابلہ میں اس کا کچھ لحاظ کیا۔ اصل چیز اتباع حق ہے اور صوفیہ کی بڑی دولت دنیا سے یکسوئی ہے۔

(۲۲۶) مسابقت کی تقسیم اور مسابقت معنویہ کی تحقیق

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ باہم ایک دوسرے پر سبقت ظاہراً بھی ہوتی ہے اور باطناً بھی اور یہاں سبقت معنویہ مراد ہے نہ کہ حسیہ کیونکہ سبقت حسیہ کی صورت تو یہ ہے کہ پیروں سے دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے بڑھے اور یہ صورت یہاں ممنوع ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب نماز کے لئے آؤ تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ سکون و اطمینان کے ساتھ آؤ۔ پس اب سبقت معنویہ ہی رہ گئی یعنی وقت کی نگہداشت میں لگا رہنا اس سے پہلے وہی آئے گا جس کو وقت کا دوسروں سے زیادہ اہتمام ہوگا، اس موقعہ پر ایک سوال ہوگا وہ یہ کہ اس حدیث میں عشاء اور صبح کو ایک درجہ

میں رکھا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو عشاء کی جماعت میں حاضر ہوا اس نے گویا آدھی رات تہجد میں قیام کیا اور جو صبح کی جماعت میں آیا اس نے گویا تمام رات تہجد میں قیام کیا اس کا جواب یہ ہے کہ سبقت ومبادرت کے باب میں دونوں کے یکساں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کا ثواب واجر بھی برابر ہو جائے اور مبادرت میں دونوں کو اس لئے برابر کر دیا گیا کہ ان دو نمازوں کو دوسری نمازوں پر عظمت و فوقیت حاصل ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارے اور منافقین کے درمیان فرق کرنیوالی عشا اور صبح ہے منافقین ان دونوں میں نہیں آسکتے۔ دیکھو اگر دو گواہ عادل ہوں تو یہ ضرور نہیں کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر کسی بات میں بھی رفعت حاصل نہ ہو کیونکہ جتنی بات کی عدالت شرعیہ میں ضرورت ہے اس میں برابر ہو جانے کے بعد اگر ایک میں کوئی وصف دوسرے سے زیادہ ہو تو اس کا کچھ حرج نہیں ایسا ہی یہاں سمجھو کہ یہ دو نمازیں بقیہ نمازوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ رہا ان دونوں کے درمیان جو ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے وہ دوسری بات ہے۔

ف۔ حنفیہ کے نزدیک صلاۃ وسطیٰ کی تفسیر نماز عصر کے ساتھ راجح ہے اور دلائل صحیحہ سے بھی مؤید ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ نماز عصر تمام نمازوں سے افضل ہو۔ پس یہاں جو صبح و عشا کی فضیلت بتلائی گئی ہے وہ فضیلت جزئیہ ہے جس کی تشریح دوسری حدیث میں وارد ہوئی ہے کہ یہ دونوں نمازیں منافقین پر گراں ہیں، مگر چونکہ مالکیہ کے نزدیک صلاۃ وسطیٰ کی تفسیر فجر کے ساتھ راجح ہے اس لئے شارح نے ان دو نمازوں کو بقیہ تمام نمازوں سے افضل کہہ دیا ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

⁂

باب سی و ہشتم ۳۸

حدیث

اتیان الصلوٰۃ بالسکینۃ

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اچانک آپ نے لوگوں کا شور سنا نماز کے بعد فرمایا کیا بات تھی (یہ شور کیسا تھا) انہوں نے عرض کیا کہ ہم نماز کے لئے جلدی کر رہے تھے۔ حضور نے فرمایا آئندہ ایسا نہ کرنا جب تم نماز کے لئے آؤ تو سکون و وقار کے ساتھ آیا کرو پھر جتنی نماز مل جاوے اسکو تو امام کے ساتھ پڑھ لو اور جو فوت ہو جاوے اس کو بعد میں پورا کر لو۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ نماز کے لئے اطمینان سے آنا چاہئیے اور جو حصہ فوت ہو جاوے اس کو پورا کر لینا چاہئیے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۲۷) کسی پر بدون تحقیق حال کے حکم نہیں لگانا چاہئیے

حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی فعل یا فاعل پر حکم شرعی تحقیق سبب کے بغیر نہیں ہو سکتا اس کی دلیل حضور کا یہ قول ہے ماشانکم (کیا بات تھی)

پھر جب لوگوں نے نماز کے لئے جلدی کرنے کا ذکر کیا اس وقت آپ نے اس کے متعلق حکم بیان فرمایا محض شور سنتے ہی فیصلہ نہیں کر لیا گیا کہ یہ حرکت بیجا تھی اور نہ تحقیق سبب سے پہلے آپ نے ان کے فعل پر کچھ مواخذہ فرمایا کیونکہ جلدی کرنے اور شور کرنے میں یہ احتمال بھی تھا جو صحابہ نے بیان کیا اور یہ احتمال بھی تھا کہ کوئی دوسرا عذر پیش آ گیا ہو کیونکہ حوادث تو شمار اور انحصار میں نہیں آسکتے۔

قوله الوجه الاول ان الحکم الشرعی لا یکون الا بعد تحقیق الحال
قوله لان الحوادث لا تنحصر۔

ف آجکل صوفیہ اور مشائخ بھی اس معاملہ میں تساہل کرنے لگے ہیں کہ بدون تحقیق کے جس پر جو چاہتے ہیں حکم لگا دیتے ہیں ان کو اور سب مسلمانوں کو اس قاعدہ کی پابندی کرنا چاہیئے اور جان لینا چاہیئے کہ بدون تحقیق حال کے کسی پر کوئی حکم لگانا جائز نہیں۔

(۲۲۸) نماز میں خشوع وسکون کا وجوب مختلف فیہ ہے

یہاں ایک سوال ہے کہ یہ حکم بطور وجوب کے ہے یا بطور استحباب کے اور کیا اس سکون کی کوئی حد معین ہے یا نہیں؟ پہلے سوال کا تو جواب یہ ہے کہ صیغۂ امر کے متعلق اختلاف ہے لیکن اس مقام پر امر کا استحباب کے لئے ہونا زیادہ ظاہر ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ خود نماز کے اندر تادب وخشوع وسکون کے واجب ہونے میں اختلاف ہے اکثر فقہا کا قول یہ ہے کہ وہ شرط کمال ہے شرط صحت نہیں اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب تک نماز کا انتظار کرتا ہے نماز ہی میں رہتا ہے جس میں نماز کے لئے چلنے نماز کے لئے وضو کرنے اور بیٹھے رہنے کو نماز ہی کے حکم میں کر دیا گیا حالانکہ یہ سب وسائل ومقدمات ہیں اور وسیلہ یا مقدمہ کا بڑا حکم

یہ ہے کہ اس کو خود اس شئے کے مثل کردیا جائے جس کا وہ وسیلہ ہے تو جب خود نماز کے اندر اس وصف سکون وخشوع کے واجب ہونے میں اختلاف ہے تو وسیلہ میں وجوب کیسے ہوگا، دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ امر وجوب کے لئے ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کلام میں کچھ اضافہ کرکے اس پہ اشارہ فرماتے کیونکہ تنہا امر تو وجوب کے لئے کافی نہیں اور آپ صاحب تشریع ہیں اور یہ وقت حکم بیان کرنے کا تھا اور ضرورت کے موقعہ سے بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں، تیسری بات یہ ہے کہ صحابہ کا تیزی کے ساتھ چلنا نماز کے شوق اور ثواب کی رغبت اور اس میں ترقی کی طلب سے تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ بتلانا چاہا کہ ثواب جلدی کرنے اور جلدی پہنچنے ہی پر موقوف نہیں بلکہ اس صورت میں بھی ثواب مل جائے گا جس کا حکم کیا گیا ہے تاکہ ان کے دلوں کو سکون واطمینان ہوجائے تو آئندہ نماز کے لئے سکون سے آیا کریں)

قوله الوجه الثانی وهنا بحث الی قوله لان یسکن نفوسهم بذلك

ف۔ یہاں سے معلوم ہوگیا کہ جن صوفیہ نے بلا خشوع و بلا سکون کے نماز کو باطل کہا ہے ان کا مطلب بطلان کمال ہے کہ نماز ناقص ہوگئی بطلان اصل مراد نہیں کہ نماز صحیح نہ ہو ۱۲

(۲۲۹) حوادث کیطرف دل کا بلا اختیار متوجہ ہوجانا اور دیر تک متوجہ رہنا مفسد صلوٰۃ نہیں نہ موجب خلل

حدیث سے معلوم ہوا کہ حوادث کی طرف نماز میں دل کا متوجہ ہونا جائز ہے بشرطیکہ نماز کی طرف دل کی توجہ فوت نہ ہو اور یہ کہ اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی جبکہ معمولی التفات

ہو زیادہ نہ ہو یا اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ نے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے اندر آدمیوں کا شور سُنا اور کسی کو نماز کے اعادہ کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ آپ نے کسی سے یہ فرمایا کہ اس سے نماز میں کچھ خلل آگیا ہے اور یقیناً شور سننے سے اسکی طرف دل کو تھوڑی بہت توجہ ضرور ہوئی ہوگی۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دل دل میں کسی ضروری بات کے سوچنے سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی جبکہ دل پر غلبہ نماز کے شغل کو ہے، یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس (غُل) شور کی یاد دیر تک برابر رہی یہاں تک کہ آپ نماز سے فارغ ہوگئے۔ اس وقت اس کے متعلق سوال فرمایا اور ان دونوں باتوں کا نماز میں بلا اختیار و قصد کے جائز ہونا اس حدیث کے مجموعی معنے سے ماخوذ ہے رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد جبکہ آپ سے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا یہ شیطان کی شاطری ہے وہ تمہاری نماز میں سے کچھ اچک لیتا ہے سو وہ قصد کے متعلق ہے کیونکہ ادھر ادھر دیکھنا نمازی کے اختیار ہی سے ہوتا ہے کسی عذر طاری کی وجہ سے نہیں ہوتا سو یہ تو حقیقت میں اس رشتہ سے نکل جاتا ہے جس میں وہ داخل ہوا تھا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین ان کو اس کے سوا کچھ حکم نہیں دیا گیا کہ اللہ کی عبادت اخلاص سے کریں اور جو اخلاص کے ساتھ عبادت کرتا ہے وہ ادھر ادھر نماز میں نہیں دیکھ سکتا اور جو بغیر اخلاص کے عبادت میں داخل ہو گیا وہ ان احکام کو پوری طرح کیونکر بجا لائے گا جن کا امر کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب آدمی نماز میں داخل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر پوری طرح متوجہ ہوتے ہیں پھر اگر وہ ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے رُخ پھیر لیتے ہیں تو جو شخص بے توجہی اور دل کی بے رُخی سے نماز میں داخل ہوا اور

جس حال میں نماز سے پہلے تھا اسی میں نماز کے اندر مشغول رہا اس کو اللہ تعالیٰ کی توجہ کہاں نصیب؟ ہیہات ان کے اور خدا کی توجہ کے درمیان تو بہت سے میدان ہیں جن کو ہمت و حوصلہ والے ہی طے کرتے ہیں پس بیدار ہو جاؤ اگر سوتے ہو اور ہمت کرو اگر جاگ رہے ہو۔

(۲۳) نماز وہ اچھی ہے جس میں بشریت کا حصہ باقی رہے

اور ذکر وہ اچھا جسمیں فنا تام ہو جائے اس میں صوفیہ کے اس قول کی بھی دلیل ہے کہ

نماز تو اچھی وہی ہے جس میں بشریت کا بھی کچھ حصہ باقی رہے تاکہ کلام الٰہی کو سمجھتا رہے اور جن ارکان کا امر کیا گیا ہے ان کو پوری طرح بجا لاتا رہے اور ذکر کی سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ ذاکر مذکور میں بالکل فنا ہو جائے یہاں تک کہ اس کو یہ بھی خبر نہ رہے کہ اس کی دائیں جانب کیا ہے؟ اور بائیں طرف کون ہے؟ اگر یہ بات صحیح نہ ہوتی بلکہ نماز کا حکم بھی وہی ہوتا جو ذکر کا بتلایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع میں شور کی آواز کو نماز کے اندر نہ سن سکتے تھے یہاں ایک سوال ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ سب سے اچھی نماز وہ ہے جس میں بشریت باقی رہے یہ حکم سب نمازوں کو عام ہے یا صرف فرض نماز کے ساتھ خاص ہے تو واللہ اعلم ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم فرض نمازوں کے لئے تو بالاتفاق ہے اور نوافل کے بارہ میں ظاہر یہ ہے کہ ان کا حکم مثل ذکر کے ہے کہ ان میں فناء تام ہی بہتر ہے اس کی تائید حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ان کی ران میں ایک تیر لگ گیا تھا جس سے ان کو تکلیف تھی لوگوں نے اس کو نکالنا چاہا تو آپ انکار کرتے تھے کہ ابھی نہیں تھوڑی دیر کے بعد نکالنا پھر وہ نکالنا چاہتے تو یہی جواب دیتے کہ ابھی نہیں، تو بعض لوگوں نے کہا کہ تم نماز کے سوا کسی وقت میں اس کو نہ نکال

سکو گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کہ جس وقت نفل نماز کے سجدہ میں آپ گئے اس وقت تیر کو کھینچ کر نکال دیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا فرمایا کیا بات ہے کیا تیر نکالنا چاہتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا وہ تو ہم نے نکال بھی لیا پھر اسکو سامنے کر دیا کہ دیکھئے یہی تو ہے فرمایا بخدا مجھے تمہاری اس حرکت کی کچھ بھی خبر نہیں ہوئی اور ایسے واقعات اہل برکت صلحاء سے بہت منقول ہیں۔

قوله الوجه السادس فيه دليل لاهل الصوفة الى قوله ومثله كثير عن المباركين مع حذف شئ من العبارة من بينهما

ف۔ اس پر حنفیہ کے اصول سے یہ سوال وارد ہوگا کہ شروع کے بعد نفل بھی واجب ہو جاتی ہے اور اس میں بھی قرآن کو صحیح طور سے پڑھنا اور ارکان کا پوری طرح بجالانا ضروری ہے جیسا فرائض میں ضروری ہے اور یہ فناء تام کی صورت میں نہیں ہو سکتا یقیناً فناء تام کی صورت میں ارکان میں گڑبڑ ہوگی جس سے بعض اوقات سجدۂ سہو لازم ہوگا اور سجدۂ سہو بھول گیا تو نماز ناقص ہوگی، جواب یہ ہے کہ نوافل میں تطویل کی اجازت ہے کہ ارکان کو جتنا چاہے طویل کر دے لمبا قیام کرے لمبا رکوع کرے لمبا سجدہ کرے پس اگر کسی شخص کو لمبے رکوع یا لمبے سجدہ میں فناء تام حاصل ہو جائے تو اس سے نماز میں کوئی خلل نہ ہوگا کیونکہ رکوع یا سجدہ میں محض تسبیحات ہوتی ہیں جو ذکر کی قبیل سے ہیں۔ البتہ حالت قیام میں قراءت قرآن واجب ہے، اسی طرح قعدہ میں تشہد واجب ہے۔ اس میں فناء تام ہونا اچھا نہیں تاکہ قراءت اور تشہد میں گڑبڑ نہ ہو اور ظاہر یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نماز نفل کے سجدہ میں حالت فنا حاصل ہوتی تھی اسی لئے لوگوں نے سجدہ میں تیر کو نکالا۔ قیام

اور قعود میں نہیں نکالا۔ خلاصہ یہ کہ نوافل کے ان ارکان میں حالت فنا کا طاری ہونا اچھا ہے جن میں کوئی ذکر طویل واجب نہیں جیسے رکوع قومہ یا سجدہ اور جن ارکان میں قراءت یا تشہد واجب ہو ان میں اتنی بشریت کا رہنا ضروری ہے جس سے یہ معلوم ہوتا رہے کہ زبان سے کیا نکل رہا ہے خوب سمجھ لو۔

یہ جواب تو اس وقت ہے جب فنا تام سے مراد استغراق ہو جیسا شارح کے کلام سے متبادر ہے اور اگر فنا تام سے حضور تام مراد ہو تو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ حضور جتنا کامل ہوتا ہے اسی قدر احکام عمدگی اور خوبی سے ادا ہوتے ہیں۔ حضور تام سے تلقی خطاب اور تکمیل ارکان میں اصلا خلل نہیں ہوتا اس میں لذت خطاب کے ساتھ تلقی خطاب اور تکمیل ارکان سب جمع ہوتے ہیں اس لئے فرض اور نفل نماز میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں حضور تام دونوں میں مطلوب ہے کیونکہ حضور تام میں بشریت کے اوصاف باقی رہتے ہیں گو بعض دفعہ لذت خطاب سے مغلوب ہو جاتے ہیں مگر مستور نہیں ہوتے اسی لئے ہمارے بزرگوں کا قول یہ ہے کہ نماز میں حضور تام ہونا چاہئے اور ذکر میں استغراق تام حضور تام کی حقیقت وہی ہے جو حدیث نبوی میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ

عبادت اسطرح کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو

اس مراقبہ کو جس قدر کامل کیا جائے گا اسی قدر حضور تام حاصل ہوگا۔ جس کے لئے استغراق لازم نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲۳۱) نماز کے لئے سکون و وقار کے ساتھ آنے کی تحقیق

رہا یہ سوال کہ اس سکون کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں ؟ تو علماء نے فرمایا ہے کہ سکون کی حد یہ ہے کہ انسان حد وقار سے باہر نہ ہو تو جب تک وقار محفوظ ہو سکون حاصل ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب وہ مسجد کو آتے ہوئے اقامت کی آواز راستہ میں سن لیتے تو قدم بڑھالیتے اور جلدی جلدی قدم اٹھاتے تھے۔ یہ سکون کا انتہائی درجہ ہے اس سے زیادہ رفتار بڑھانے کو لپکنا یا دوڑنا کہا جائیگا جو وقار کی حد سے باہر اور سکون کے خلاف ہے۔

دین بہت آسان ہے

اور اس سے معلوم ہوا کہ دین بہت آسان ہے کیونکہ صحابہ کو جب نماز میں دیر ہو جانے سے فکر ہوا اور فکر کی وجہ تیزی کے ساتھ مسجد کی طرف چلے تو حضور نے ان کے لئے اس کوتاہی کا کفارہ یہ مقرر کیا کہ جب نماز کو آیا کرو تو سکون سے آیا کرو پھر جتنی جلدی نماز مل جائے اس کو پڑھ لو جو فوت ہو جائے اس کو بعد میں پورا کر لو حالانکہ تاخیر صلوۃ معمولی جرم نہیں جس سے یہ خطا سرزد ہو یعنی نماز میں وقت سے تاخیر کر دے وہ اس آیت کی وعید کا مصداق ہے

(فخلف من بعدھم خلف) اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیاً ٥

(پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور شہوتوں کے پیچھے پڑ گئے سو عنقریب جہنم کے طبقہ میں داخل ہوں گے)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسکی تفسیر میں منقول ہے کہ بخدا ان لوگوں

نے نماز کو چھوڑا نہیں تھا بلکہ وقت مختار سے مؤخر کر دیا تھا جب جی میں آتا تھا
پڑھ لیتے تھے خواہ تنگ وقت ہو یا وسیع مستحب ہو یا مکروہ جب اوقات
کی فضیلت کا یہ درجہ ہے کہ اس کے فوت کرنے پر ایسی وعید ہے تو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت سے نماز کا کچھ حصہ رہ جانا کیا کچھ ہوگا کیونکہ
وقت کے بارہ میں تو علماء کے درمیان اختلاف بھی ہے بعض اول وقت
کو افضل فرماتے ہیں بعض اوسط کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت
میں جو نماز ہو اس کے متعلق تو کسی کو بھی اختلاف نہیں بلکہ اس پر سب متفق
ہیں کہ وہ تمام نمازوں سے افضل نماز ہے تو اتنی بڑی فضیلت میں کوتاہی
کرنا کتنا بڑا جرم ہوگا خود ہی سمجھ لو پھر اتنے بڑے جرم کا کفارہ کتنا آسان
مقرر کیا گیا ہے کہ نماز کے لئے سکون کے ساتھ آؤ دوڑ کر آنے کی ضرورت
نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سکون سے آنا دراصل کفارہ نہیں بلکہ کفارہ تو وہ
فکر ہے جو دوڑنے اور جلدی کرنے کا متقاضی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے صحابہ کے اہتمام اور فکر کو معلوم فرما کر امر سکون کو بجائے کفارہ کے ذکر
فرمایا پس سکون کے ساتھ نماز کے لئے آنا اسی وقت کفارۂ تاخیر ہوگا جب
اس کے ساتھ فکر و اہتمام بھی مجتمع ہو خوب سمجھ لو۔ اور اس پر اصحاب قلوب
کے لئے یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ نیک کام کا فکر و اہتمام بھی اس کے فوت
ہونے کا بدل ہو جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ بدل سب باتوں میں اصل
کے برابر نہیں ہو سکتا، اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس
ارشاد سے ہوتی ہے جبکہ زید بن حارثہؓ نے آپ سے دریافت کیا کہ جس سے
اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں اس کے اندر اللہ

محبتِ الٰہی کی علامت

کی طرف سے کیا علامت ظاہر ہوتی ہے جس
سے وہ یہ سمجھ لے کہ خدا کو مجھ سے محبت ہے۔ حضور نے فرمایا اے زید!
تم نے کس حال میں صبح کی ہے، کہا میں نے اس حال میں صبح کی ہے کہ اپنے

دل میں خیر کی اور اہل خیر کی محبت پاتا ہوں اور اگر قدرت پاتا ہوں تو خیر کی طرف سبقت کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے فوت ہو جائے تو رنجیدہ اور نادم ہوتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس یہی اللہ کی محبت کی علامت ہے اس شخص کے لئے جس کو وہ چاہتے ہیں اور اگر اس کے سوا وہ اور کچھ ارادہ کرتے تو دوسری حالت کے لئے تم کو تیار کر دیتے تو نیک کے اس قول پر بھی کہ خیر کے فوت ہو جانے پر رنجیدہ ہوتا ہوں ان کے لئے مضمون حدیث کی بشارت صحیح رہی تو معلوم ہوا کہ عمل خیر کے فوت ہونے پر فکر اور رنج ہونا بھی عمل کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے

الندم توبۃ — ندامت توبہ ہے

تنہا ندامت بھی گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہے

اور اس میں عجیب علمی مضمون ہے کہ تنہا ندامت ہی گناہ کو دور کر دیتی ہے جب کہ کسی فعل ممنوع کا ارتکاب ہو گیا ہو، اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو کہ ندامت توبہ ہے ظاہر ہی پر محمول کریں اور اگر یہ تاویل کریں کہ ندامت توبہ کے اسباب میں بڑا سبب ہے یا اس کے اجزاء میں بڑا جزو ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد الحج عرفۃ کہ حج عرفہ ہے کے یہی معنی ہیں تو اس تاویل پر تنہا ندامت سے تو گناہ دور نہ ہوگا البتہ ندامت اس ورطہ سے خلاصی پانے کا بہت بڑا سبب ہو جائے گی جس میں گناہ کے بعد انسان پھنس جاتا ہے اور جو صورت بھی ہو دونوں خیر عظیم ہیں اور بہر حال ندامت سے اس نقصان کی تلافی تو ضرور ہو جاتی ہے جو خیر کے فوت ہونے سے ہوتا ہے جیسا اوپر بیان ہوا ہے۔

مومن دنیا میں غمگین ہی رہتا ہے

اس کی زیادہ توضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے

ما امسی المؤمن فیہا یعنی فی الدنیا ولا اصبح الا حزینا

مؤمن دنیا میں ہر صبح اور شام غمگین ہی رہتا ہے۔

کیونکہ دو حالتوں میں سے ایک حالت اس کو ضرور پیش آتی ہے یا کسی مستحب کام سے غفلت یا سہو کی وجہ سے کسی مکروہ کا ارتکاب یہ تو کم سے کم ہے اور ممکن ہے کبھی حرام کا ارتکاب بھی ہو جائے یا فرض ہی ترک ہو جائے تو یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کی یہ خاص شان بیان فرمائی ہے کہ وہ دنیا میں ہمیشہ غمگین ہی رہتا ہے اگر غم اور رنج کچھ نفع نہ دیتا تو اسکو مقام مدح میں ذکر کرنے کی کچھ وجہ نہ تھی پس معلوم ہوا کہ حزن و غم سے ان کوتاہیوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے جو مومن سے بصورت ترک مندوب یا ارتکاب مکروہ سرزد ہوتی ہیں اور اس مضمون پر بھی ایک فقہی مسئلہ اور ایک حقیقت و طریقت کا مسئلہ مرتب ہوا۔

خیر کے فوت ہونے پر رنج ہونا ایمان کی علامت ہے

فقہی مسئلہ تو یہ مرتب ہوا کہ کسی خیر کے فوت ہونے یا اسکی ضد کے ارتکاب پر رنج ہونا ایمان کی علامت ہے اور تصوف کا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ دل میں حزن و غم رہنا چاہیئے کیونکہ صوفیہ کا قول ہے

ان القلب اذا خلا من الحزن خرب

دل جب رنج و غم سے خالی ہوتا ہے ویران ہو جاتا ہے

دل جب رنج و غم سے خالی ہوتا ہے ویران ہو جاتا ہے

اور اس پر تصوف کا دوسرا مسئلہ یہ مرتب ہوا کہ جس شخص کا یہ حال ہوگا اس کی حالت ہر دم مراقبہ اور نگہداشت کی حالت ہوگی کیونکہ ہر وقت رنج و غم اسی کو ہو سکتا ہے جو ہر وقت کے حقوق و آداب پر نظر رکھے اسی کو ان آداب کے فوت ہونے یا سہواً مکروہ کے سرزد ہو جانے سے رنج ہوگا اور جس کو حالت مراقبہ حاصل نہ ہو اس کو یہی خبر نہ ہوگی کہ مجھ سے اس وقت کا کون سا حق فوت اور کون سے مکروہ کا ارتکاب ہوا۔

نگہداشت بہت بڑی حالت ہے اور مراقبہ و نگہداشت بہت بڑی حالت ہے اور بیش بہا دولت ہے مگر جس کو یہ حالت حاصل ہو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خوف کے اندر امید بھی ساتھ ساتھ ہو ورنہ یہ شخص حالت کمال سے ناقص رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہمارے اس قول کی دلیل ہے المؤمن تسرہ حسناتہ و تسوءہ سیئاتہ مومن کو نیکیاں خوش کرتی ہیں اور گناہ رنجیدہ کرتے ہیں تو یہ شخص

غلبۂ خوف میں اس خوف سے بھی خوش ہونا چاہئے کیونکہ خوف بھی ایک نعمت ہے جب اپنے دل میں خوف پائے تو اس کو اس خوف سے خوش بھی ہونا چاہیئے کیونکہ خوف الٰہی بھی ایک حسنہ ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کا حسنہ ہے تو عین حالت خوف میں اس کے اندر ایمان کی دو علامتیں جمع ہو جائیں گی۔ ایک خوف کا اپنے موقع میں ہونا، دوسرے فرح کا اپنے محل میں ہونا۔ اسی لئے بعض بزرگوں نے اپنی ایک مناجات میں فرمایا ہے، "یکون خوفک خوف محب و محبوب کہ مجھے آپ سے ایسا خوف حاصل ہو جیسا محب محبوب کا خوف ہوتا ہے کیونکہ عاشق کے

خوف کی تو یہ شان ہے کہ وہ تو ادنیٰ ادنیٰ بات بھی خطا کی اپنے اندر دیکھتا ہے تو ڈر جاتا ہے کہ یہ بُعد و فراق کا سبب نہ ہو جاوے، اور محبوب کے خوف کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات بھی موجب بُعد و فراق دیکھتا ہے تو زیادہ نہیں گھبراتا کیونکہ جانتا ہے کہ محبوب کو ایسی ایسی خطائیں کچھ ضرر نہیں دیا کرتیں اس کو اپنی کسی خطا سے رنج بھی نہیں ہوتا۔ پس مناجات کا حاصل یہ ہوا کہ میرے اندر نہ صرف عاشق کا خوف ہو کہ ذرا ذرا سی خطا پر ناامید ہو جایا کروں نہ صرف معشوق جیسا خوف ہو جس کو اپنی کسی خطا سے بھی اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کو اپنے محبوب ہونے کا ناز ہوتا ہے بلکہ میرے اندر دونوں کے خوف کو جمع کر دیجئے تاکہ فکر تو ہر خطا سے بچنے کی ہو مگر ناامیدی کسی حال میں نہ ہو تو یہ شخص ایک ہی وقت میں شان محب اور شان محبوب کا جامع ہوگا اور یہ تمام حالات سے کامل تر حالت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے کرم سے اس کا اہل بنادیں۔

قولہ فی الوجہ السادس واما الجواب علی قولنا هل للسکینۃ حد الٰی قولہ جعلنا اللّٰہ من اهلها بمنه

ف۔ خوف کے ساتھ رجاء کا جمع کرنا ہر حال میں ضروری ہے اس پر علما اور صوفیہ سب کا اتفاق ہے لیکن اس پر ایک اشکال واقع ہوتا ہے کہ جس وقت کسی وارد کی وجہ سے خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو عین غلبہ کی حالت میں رجاء کو کیوں کر جمع کیا جائے کیونکہ غلبۂ خوف بے اختیار ہوتا ہے اور شدت کے ساتھ ہوتا ہے اس وقت ضد کو اس کے ساتھ کیونکر جمع کیا جائے۔ شارح نے اس کا عجیب حل کیا ہے کہ عین حالت خوف میں اس خوف ہی سے اس کو خوش ہونا چاہیئے کہ الحمد للہ مجھے اللہ تعالیٰ

نے اپنا خوف عطا فرمایا جو بہت بڑی دولت ہے۔ جس پر بہت بڑی بشارت نص قرآن میں وارد ہے ولمن[عہ] خاف مقام ربہ جنتان۔ بس اس سے رجاء حاصل ہو جائیگی۔ غلبۂ خوف میں اگر انسان کو اپنے اندر کوئی عمل صالح نظر نہیں آتا نہ اپنی نماز نماز معلوم ہوتی ہے نہ ذکر و تلاوت طاعت معلوم ہوتی ہے سارے حسنات سیئات ہی نظر آتے ہیں تو یہ خوف تو اسکو اپنے اندر ضرور نظر آتا ہے بس اس کو اسی سے خوش ہونا چاہیئے۔ اس خوف پر خوش ہونے ہی سے رجاء حاصل ہو جائے گی۔ بقیہ نعمتوں اور طاعات کو سوچنے کی اور ان سے رجاء حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، سبحان اللہ کیسا عجیب حل ہے۔ سچ ہے

اولئک ہم الفلاسفۃ حقا

⁂

عہ ترجمہ: جو شخص اپنے رب کے مقام سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔

باب سی ونہم ۳۹

حدیث

القیام الی الصلوۃ

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو جب تک مجھے مسجد کی طرف آتا ہوا نہ دیکھ لو کھڑے نہ ہوا کرو اور سکون و وقار کے ساتھ بیٹھے رہو۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ اقامت کے بعد کھڑا ہونا ضروری نہیں جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر نہ آجائیں۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے امام مالک رحمہ اللہ کا قول اس حدیث کے موافق ہے اور یہی ان کی حجت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اقامت کے وقت کھڑا ہونا ضروری نہیں بلکہ لوگوں کو اختیار ہے خواہ اقامت کے شروع میں کھڑے ہوں یا وسط یا امام کے نماز شروع کرنے پر کھڑے ہوں اور امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ جب مؤذن قد قامت الصلوۃ کہے اس وقت سب کو کھڑا ہونا چاہیئے۔ (نصرہ الشارح نفسہ فی الوجہ الخامس) ان کی دلیل حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقامت کے وقت قد قامت الصلوۃ پر کھڑے ہوتے ہی تکبیر کہہ دیتے تھے۔

حنفیہ نے دونوں حدیثوں کو جمع کیا اور یہ کہا ہے کہ اگر اقامت کے وقت

امام مسجد کے اندر موجود نہ ہو بلکہ مسجد سے باہر حجرہ وغیرہ میں ہو اس وقت تو امام کو دیکھ کر نمازیوں کو کھڑا ہونا چاہیئے قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا نہ ہونا چاہیئے اور اگر اقامت کے وقت امام مسجد میں موجود ہو تو قد قامت الصلوٰۃ پر سب کو اٹھنا چاہیئے۔ علامہ طحطاوی نے شرح مراقی الفلاح میں تصریح کی ہے کہ حنفیہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قد قامت الصلوٰۃ سے قیام کو مؤخر نہ کیا جاوے یہ معنے نہیں کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ پس یہ ایسی سنت نہیں ہے جس پر اصرار کیا اور مبالغہ کیا جائے نہ سلف نے اس پر اصرار کیا بلکہ تمام بلادِ اسلام میں علماء نے اس میں توسیع ہی رکھی ہے جس کا جی چاہے اول اقامت سے کھڑا ہو جائے جس کا جی چاہے قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا ہو جائے جس کا جی چاہے امام کی تکبیر پر کھڑا ہو، اس پر اصرار کرنا اور جو ایسا نہ کرے اس پر انکار و طعن کرنا حد سے تجاوز ہے اور یہ صورت تو سلف سے کہیں بھی منقول نہیں جو آجکل ہندوستان کے بعض شہروں میں رواج پا رہی ہے کہ امام شروع اقامت میں یا اقامت کے متصل اپنے مصلے پر آ کر اس غرض سے بیٹھتا ہے کہ قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑا ہو۔ فقہاء نے تو ان لوگوں کے لئے جو پہلے سے مسجد میں بیٹھے ہوئے ہوں اٹھنے کا ایک معیار بتلایا تھا، ان کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ اس معیار کو جاری کرنے کے لئے قیام سے قعود کیا کرو اور قد قامت الصلوٰۃ پر اٹھا کرو مگر آجکل کچھ لوگوں کو نئی نئی باتیں نکالنے میں مزا آتا ہے جس کے لئے اہل دنیا نے تو ملبوسات و مطعومات کو تختۂ مشق بنایا تھا آئمہ مساجد نے عبادات کو تختۂ مشق بنا لیا فالی اللہ المشتکی اس حدیث پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۳۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نہیں چھوڑا

حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے تمام احکام کی تعلیم بطریق کمال دیدی ہے کیونکہ آپ نے اس
چھوٹی سی بات کو بھی نہیں چھوڑا جس پر بہت کم کسی کی نظر جاتی ہے۔ مگر
حضور نے قول اور فعل سے اس کو بھی ظاہر کر دیا اس تعلیم میں رفق اور سہولت
کی بھی رعایت ہے اور واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں پر
بہت ہی مہربان تھے۔ آپ کو یہ احتمال ہوا کہ شاید کسی وقت جماعت
میں کوئی کمزور آدمی ہو اگر وہ بھی اقامت کو سن کر کھڑا ہو اور کسی وجہ سے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو باہر تشریف لانے میں دیر ہو گئی تو یہ کمزور
آدمی نماز اس وقت شروع کرے گا جب کہ پہلے سے کھڑا کھڑا تھک گیا
ہوگا اور کیا عجب ہے کہ تھک کر بیٹھ جائے اور بیٹھ کر نماز ادا کرے اور
قیام کی فضیلت اس سے فوت ہو جائے اور ممکن ہے کسی وقت گرمی یا
سردی ہو اور حضرات صحابہ میں زیادہ ایسے ہی تھے جن کے پاس کپڑے کم
تھے اور کھڑے ہوئے آدمی کو گرمی سردی زیادہ لگتی ہے تو اقامت کے وقت
سے کھڑا ہونا ان کے لئے نماز میں تشویش کا سبب ہوگا۔

عبادت میں مشغول ہونے سے پہلے اپنی حالت کو دیکھ لینا چاہیے

اور اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ عبادت کرنے والے کو نماز یا
اور کسی عبادت میں مشغول ہونے سے پہلے دیکھ لینا چاہیئے کہ اسے
کس حالت پر عبادت کرنا چاہیئے جس سے عبادت اچھی طرح ادا ہو
اور تشویش و پریشانی کا سامنا نہ ہو۔

قولہ الوجہ الرابع منیہ دلیل علی تو فیتہ صلی اللہ
علیہ وسلم تعلیم جمیع الاحکام الی قولہ ولا یکون
معہ تشویش

ف۔ بعض اہل اللہ اسی سنت پر نظر کر کے اپنے خدام کو ذرا ذرا سی

چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں جو دیکھنے میں چھوٹی معلوم ہوتی ہے مگر نتیجہ اور اثر کے لحاظ سے بہت بڑی ہوتی ہیں ان پر ناواقف لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ بڑے سخت گیر ہیں اتنی معمولی معمولی باتوں کو بھی نہیں چھوڑتے ان کو اس مقام سے سبق لینا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تمام احکام پوری طرح پہنچا دیئے ہیں۔ معمولی سے معمولی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آپ نے نہیں چھوڑی مگر وہ باتیں ناواقف ہی کی نظر میں معمولی ہیں۔ حکماء و عقلاء کی نظر میں جب ان کی حکمتیں آتی ہیں تو پہاڑ سے بھی بڑی دکھائی دیتی ہیں۔

(۲۳۳) احکام میں کمزوروں کا اوّل لحاظ کیا جائے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احکام میں قوی لوگوں کو کمزوروں کا تابع کیا جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عموم کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے

لاتقوموا حتی ترونی

جبتک مجھے نہ دیکھ لو نماز کے لئے کھڑے نہ ہو

جس میں قوی اور ضعیف سب کو یکساں (مساوی) خطاب ہے۔ حضور نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے دیکھنے سے پہلے ضعفاء کھڑے نہ ہوں۔ اقویاء کھڑے ہوسکتے ہیں بلکہ آپ نے کمزوروں کی رعایت سے قانون مقرر فرمایا اور اقویاء کو ان کا تابع کر دیا گیا۔ اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

سیروا بسیر اضعفکم

اپنے کمزور ساتھیوں کی چال چلا کرو

اقویاء کی چال نہ چلو ورنہ کمزور پیچھے رہ جائیں گے یا تھک کر پریشان ہوں گے اور سب کو پریشان کریں گے۔

قولہ الوجہ السادس فیہ دلیل علی ان یحمل القوی

الی قولہ سیروا بسیر اضعفکم

ف۔ حضرات اہل اللہ کو اس سنت کا بہت زیادہ اہتمام ہے جیسا ان کی صحبت میں رہنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۲۳۴) حکمت کے ساتھ قدرت پر بھی نظر رہنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹی سے چھوٹی بات میں حکمت کیساتھ قدرت الٰہیہ میں بھی نظر رہنا چاہیئے چنانچہ اس مسئلہ میں حکمت کا پہلو تو یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقامت کی ایک حالت بیان فرمائی ہے کیونکہ اقامت نماز وقتیہ کے شروع ہونے کا وقت بتلانے کی ایک علامت ہے (تو حضور نے بتلا دیا کہ یہ ضروری نہیں کہ اقامت ختم ہونے کے ساتھ ہی امام اللہ اکبر کہدے۔ کبھی کسی عذر سے اس میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے اور قدرت پر نظر یہ ہے کہ حضور نے لوگوں کو اس وقت تک کھڑا ہونے سے روک دیا جب تک آپ کو نہ دیکھ لیں کیوں کہ ممکن ہے غیب سے کوئی مانع پیش آجائے جو وقت پر آپ کو باہر تشریف لانے سے روک دے اور احکام حکمت کے ساتھ قدرت کو پیش نظر رکھنا اہل فہم کے نزدیک بڑا بلند مرتبہ ہے جیسا چند حدیثوں میں ہم نے پہلے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

قولہ الوجہ السابع فیہ دلیل علی لحظ القدرۃ الی

قولہ فی غیر ما حدیث

(۲۳۵) عبادت کا ادب یہ ہے کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کیطرف نہ لوٹے

اس میں صوفیہ کے اس قول کی دلیل بھی ہے کہ عبادت کا ادب یہ ہے

کہ اعلیٰ حالت سے ادنیٰ کی طرف نہ لوٹے چنانچہ حضور نے اس وقت تک کھڑے ہونے سے منع فرمایا ہے جب تک آپ کو دیکھ لیں مبادا تقدیم سے کوئی ایسی بات پیش آجائے جو موجب تاخیر ہو تو اس وقت لوگوں کو عبادت کے لئے کھڑے ہوجانے کے بعد قعود کی طرف لوٹنا پڑیگا جس میں ایک گونہ نقصان مرتبہ ہے۔

قولہ الوجہ الثامن منہ دلیل لاھل الصوفۃ الخ

قولہ فیکون نقص مرتبۃ

(۲۳۶) مقدم کا اہتمام پہلے کرو اگرچہ مؤخر اس سے اعلیٰ ہو

حدیث سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ جو کام مقدم ہو پہلے اس کا پورا اہتمام کیا جائے اگرچہ اس کا مابعد اس سے بھی ارفع وافضل کیوں نہ ہو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تک مجھے نہ دیکھ لو اس وقت تک نماز کے لئے نہ کھڑے ہو۔ حالانکہ نماز یقیناً اقامت سے ارفع واولیٰ ہے مگر اس وقت امام کو دیکھنے میں مشغول رہنا کہ باہر آگیا ہے یا نہیں جو درحقیقت اقامت کے حق کو ادا کرنا ہے۔ نماز میں مشغول ہونے سے اولیٰ ہے جو اقامت کے جملہ شرائط ادا کرنے کے بعد شروع ہوگی، اس میں حکمت کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہر حق دار کا حق پورا ادا کیا جائے اگرچہ قلیل ہی ہو۔ اعلیٰ کا حق ادا کرنا ادنیٰ کا حق ادا کرنے سے مانع نہ ہو۔ اسکی دلیل بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے۔ فلا تقوموا حتی ترونی

(۲۳۷) ادائے حق وقت کا لحاظ رکھو

حدیث میں حضرات صوفیہ کی اس تعلیم کی بھی دلیل ہے کہ وہ ادائیگی حق وقت میں مشغول رہنے اور اسکی نگہداشت رکھنے کی ترغیب دیا کرتے ہیں اگرچہ معمولی ہی حق ہو۔ کیونکہ امام کو دیکھتا رہنا (جس کی تعلیم اس حدیث میں ہے) ایک معمولی بات

ہے مگر چوں کہ اس وقت کا حق ہے تو اس کو چھوڑ کر اگلے کام میں مشغول نہ ہونا چاہئے اگر چہ وہ اس سے اعلیٰ ہی ہے۔ حق وقت میں سستی سے کام نہ لو ورنہ عتاب یا مذمت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بعض اہل خیر کا ارشاد ہے جو شخص اپنے وقت کا حق پوری طرح ادا کرتا رہے گا اگرچہ قلیل ہی ہو اس کا بوجھ ہلکا رہے گا، فکر کم ہو گا، علم درست ہو گا، عمل اچھا ہو گا، کامیابی اور معرفت کا لفظ اس کے لئے درست ہو گا۔ دین و دنیا دونوں میں سود مند ہو گا۔

ف حق وقت کی تاکید حضرات فقہاء نے بھی فرمائی ہے چنانچہ کتب فقہ میں مصرح ہے کہ تلاوت کرتے ہوئے اگر اذان ہونے لگے تو تلاوت کو موقوف کر کے اذان کا جواب دینا افضل ہے کیونکہ یہ جواب سنت وقت ہے اور سنت وقت دوسرے اعمال سے مقدم و افضل ہے اگرچہ وہ اعمال فی نفسہ اس سنت سے ارفع ہوں مگر حق وقت کی وجہ سے سنت وقت ان سے مقدم ہو گی۔ پس عارف کو ہر وقت یہ سوچتا رہنا چاہئے کہ اس وقت کا میرے اوپر کیا حق ہے؟ اگر کوئی خاص حق نہ ہو تو اللہ کی یاد میں لگا رہنا تو ایسا حق ہے جس سے کسی وقت کو خالی نہ جانے دیا جائے۔ جعلنا اللہ وایاکم کما یحب ویرضی

باب جنبی علم

حدیث

انتظار الامام

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نماز کے لئے اقامت کہی گئی لوگوں نے صفیں برابر کرلیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آگے بڑھ گئے حالانکہ آپ اس وقت جنابت کی حالت میں تھے پھر جب آپ کو یاد آیا کہ مجھے غسل کی ضرورت ہے تو فرمایا اپنی اپنی جگہ پر رہو پھر واپس گھر میں گئے اور غسل کیا پھر اس حالت میں تشریف لائے کہ آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا اور آپ نے نماز پڑھائی۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ لوگ نماز کی صفیں برابر کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ آپ لوٹ کر گھر میں گئے اور غسل کیا اور باہر تشریف لائے، اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۳۸) قرینۂ حال سے کوئی حکم لگانا جائز ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرینہ حال سے حکم لگانا جائز ہے جب کہ ایک صورت کے سوا کسی اور صورت کی گنجائش ہی نہ ہو، اس کی دلیل صحابی کا یہ قول ہے وھو جنب کہ آپ جنابت کی

حالت میں تھے، کیونکہ صحابی کو اس کا علم قرینۂ حال ہی سے ہوا تھا اور قرینہ وہ ہے جو بعد میں بیان کیا ہے کہ آپ اس حالت میں تشریف لائے کہ سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس قرینہ پر نظر کر کے اس کے سوا اور کسی احتمال کی گنجائش نہیں کہ اس وقت حضور کو غسل کی ضرورت تھی اور غسل بھی مستحب یا سنت نہ تھا بلکہ فرض تھا۔ کیونکہ جب حضور نے نماز کو چھوڑا حالانکہ لوگ صفیں برابر کر چکے تھے اور ان کو اپنے انتظار کا حکم دیا پھر غسل کر کے آپ باہر تشریف لائے تو اس جگہ جنابت کے سوا اور کوئی وجہ نہیں بن سکتی۔ پس صحابی نے صحیح کہا اگر کوئی دوسرا احتمال ہو سکتا تو صحابی یقین اور جزم کے ساتھ حکم نہ لگاتے اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ جس دلیل سے مدلول تک قطعی طور پر رسائی ہو جائے وہی علم صحیح حاصل کرنے کا راستہ ہے جس پر حکم لگا دینا چاہیئے (خواہ قرینہ حال ہو یا کوئی دلیل عقلی یا نقلی ہو)

قوله الوجه السادس فيه دليل على جواز الحكم بقرينة الحال الى قوله يجب الحكم به

ف یہ قاعدہ علم فقہ اور علم تصوف دونوں میں مشترک ہے۔ فقہا اور صوفیہ دونوں اس قاعدہ سے کام لیتے ہیں اگرچہ فقہاء قرائن پر حکم کم لگاتے ہیں اور صوفیہ زیادہ مگر قاعدہ دونوں کے یہاں مسلم ہے۔ لیکن قرینہ پر حکم لگانے کی یہ شرط ہے کہ اس میں ایک صورت کے سوا دوسری صورت کی گنجائش ہی نہ ہو جیسا واقعۂ حدیث میں واضح ہے۔

(۲۳۹) حوائج بشریہ عبادت کے منافی نہیں

حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو چیزیں حوائج بشریہ میں داخل ہیں وہ عبادت کے منافی نہیں ہیں بشرطیکہ طریق مشروع یعنی جائز طریقہ پر ادا کی جائیں کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالاجماع

سب سے زیادہ عبادت کرنیوالے تھے اور تم دیکھ رہے ہو کہ ضروریات بشریہ جماع وغیرہ کچھ بھی آپ کی عبادت میں مخل نہ ہوتی تھیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ضروریات کو طریق مشروع پہ ادا کرتے تھے اور بشریت کے اندر رہتے ہوئے غایت کمال یہی ہے کیونکہ اس وقت امور طبعیہ اوامر الٰہیہ کے تابع ہو جاتے ہیں اور اس کا غایت کمال ہونا ظاہر ہے کہ احکام الٰہیہ طبیعت ثانیہ بن جائیں اور امور طبعیہ احکام الٰہیہ کے تابع ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا وذرية

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی بہت رسول بھیجے ہیں اور ہم نے ان کو بھی بیوی بچے دیئے تھے۔

مطلب وہی ہے کہ سب کے سب ضروریات بشریہ کا حق ادا کرتے تھے اور بیوی بچوں کا ذکر خاص طور سے اس لئے کیا گیا کہ یہ دونوں ان اسباب میں سب سے اعظم واشد ہیں جن سے عام لوگ مبتلا فتن ہوتے ہیں۔ نیز نکاح تمام شہوتوں میں سب سے بڑی شہوت ہے۔ غرض اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پوری طرح طبیعت بشریہ پہ تھے (تقاضائے بشریت سب کے سب ان کے اندر موجود تھے اور وہ سب کا حق ادا کرتے تھے۔ مگر یہ ان کو احوال عالیہ کا حق ادا کرنے یعنی نبوت و رسالت کا حق پوری طرح ادا کرنے سے ذرا مانع نہ ہوتا تھا اور اسی سے دوسروں کا عذر ساقط ہو گیا کہ بشریت کے ساتھ حق عبادت ادا نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ نے اس عذر کو باطل کرنے کے لئے ہی انبیاء و رسل فرشتوں میں سے نہیں بھیجے بلکہ انسانوں میں سے بھیجے تاکہ ان کو دیکھ کر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ضروریات بشریہ اور طبیعت انسانیہ ان احکام کی بجا آوری سے مانع نہیں

ہو سکتی جن کا بارگاہ ربوبیت نے ان کو مکلف بنایا ہے پس اللہ کی حجت بندوں پر قائم ہو گئی

قل فللّٰه الحجة البالغة

کہہ دیجئے حجت کاملہ تو اللہ ہی کیلئے ہے

(۲۴۰) دین کے معاملہ میں حیا و شرم نہ کرنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کے معاملہ میں حیا و شرم کی ضرورت نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اپنا جنبی ہونا یاد آ گیا تو آپ نے کوئی بہانہ نہیں کیا نہ سر کو چھپایا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ نکسیر پھوٹ گئی ہو گی اور جنابت کا حال مخفی رہے بلکہ آپ نے صورت واقعہ کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا تاکہ اس سے یہ قاعدہ اخذ کر لیا جائے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ دین کے معاملہ میں شرم عرفی کی ضرورت نہیں۔

قوله الوجه الثامن فيه دليل على عدم الحياء في الدين الى قوله حتى تقعد هذه القاعدة التى ذكرنا

(۲۴۱) عبادات میں کاوش اور وہم کرنا بدعت ہے

حدیث میں اس کی بھی دلیل ہے کہ عبادت میں کاوش کرنا اور وہم میں پڑنا یا بدعت ہے (اگر بقصد ہے) یا مصیبت ہے (اگر بلا قصد ہے) یہ اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل میں زیادہ دیر نہیں کی جس کی دلیل صحابی کا یہ پرشوکت قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کھڑا ہوا چھوڑا اور واپس تشریف لے گئے پھر غسل کیا اور باہر آ گئے پھر ان کو نماز پڑھائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آپ کے انتظار میں کھڑے ہی رہے۔ اگر آپ کا غسل

دیر میں ہوا کرتا تو آپ یقیناً صحابہ کو بیٹھنے کا حکم دے کر جاتے کیونکہ امت کے ساتھ آپ کی نرمی اور شفقت اور تمام امور میں یسر و سہولت کی رعایت جس قدر تھی وہ ایسی بدیہی ہے جس کے لئے دلیل بیان کرنے کی حاجت نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے ایک اور علمی

وضو اور غسل میں جلدی کرنا اور نماز میں دیر کرنا ھی سنت ہے

مسئلہ معلوم ہوا کہ طہارت میں خواہ وضو ہو یا غسل جلدی کرنا اور نماز میں دیر تک مشغول رہنا ہی سنت ہے، حضور نے اس مسئلہ کو اپنے عمل سے ظاہر فرمادیا کیونکہ عملی تعلیم قولی تعلیم سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی عادت تھی کہ خطبہ کو مختصر کرتے تھے اور نماز کو طویل، مگر آج کل اکثر مدعیان علم کا طرز عمل اس کے خلاف ہے۔ پھر ہم سے ان کی اقتداء کیونکر ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل و احسان سے اس بلا سے بچائے۔

قوله فی دلیل علی ان التعمق فی العبادة والوسواس الی

قوله اعاذنا الله من ذلك بمنه

(۲۴۲) عبادت میں اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف عود نہ کرنا چاہئے

اس میں صوفیہ کے اس قول کی بھی دلیل ہے کہ عبادت کرنیوالے کو اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف رجوع نہ کرنا چاہئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ حکم دیا کہ اپنے حال پر رہو۔ بیٹھنے کا حکم نہیں دیا کیونکہ اس وقت وہ توجہ الی اللہ کے لئے کھڑے ہو چکے تھے تو حضور نے یہ پسند

نہ کیا کہ ان سے یوں کہا جائے کہ پھر پہلی حالت کی طرف لوٹ جاؤ اور بیٹھ جاؤ بلکہ یہ فرمایا کہ اپنی جگہ پہ رہو۔

(۳۴۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں کا ایمان زیادہ قوی تھا

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زمانہ ما بعد سے زیادہ قوی تھا کیونکہ صحابی فرماتے ہیں کہ لوگوں نے صفیں برابر کرلیں (پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم دینے کی نوبت نہیں آئی۔ نیز آپ کو صفیں سیدھی ہوجانے کی خبر دینے کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ لوگوں نے خود ہی صفیں سیدھی کرلیں اور حضور بھی بے فکر رہے اور زمانہ خلفاء کے متعلق روایات میں یہ آیا ہے کہ انہوں نے کچھ آدمیوں کو صفیں سیدھی کرنے پہ مامور کر رکھا تھا جب تک وہ آکر اطلاع نہ دیتے کہ صفیں برابر ہو گئی ہیں اس وقت تک وہ حضرات نماز کے لئے تکبیر نہ کہتے تھے جیسا امام مالک رح نے موطا میں روایت کیا ہے تو دونوں زمانوں کے ایمان میں فرق نمایاں ہوگیا۔ پھر ہمارے زمانہ کے ایمان کا حال کیا پوچھتے ہو اللہ تعالیٰ اپنے فضل ہی سے ہم کو ایمان کا بڑا حصہ عطا فرمائے۔

قوت ایمان ھی سے اعمال میں سہولت ہوتی ہے

یہاں سے ایک علمی مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ قوت ایمان کے اندازہ ہی سے اعمال صالحہ میں خفت اور سہولت ہوتی ہے جسکی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے

وانہا لکبیرۃ الا علی الخاشعین

نماز بیشک بہت گراں ہے مگر اہل خشوع پر نہیں

اس کمال قوت ایمان ہی کا یہ اثر تھا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں سے ایسے کارنامے ظاہر ہوئے جو دوسروں کے ہاتھوں ظاہر نہیں ہوئے اور نہ وہ اس پر قادر ہیں، صحابہ کے بعد حضرات صوفیہ کا درجہ ہے کہ ان کے ابدان کو ان مجاہدات (شاقہ) کا تحمل اور ان پر ان حالات عالیہ کا ظہور اسی قوت ایمان کی وجہ سے تو ہے (جو ان کو دوسروں سے زیادہ حاصل ہے)

قولہ الوجہ الثانی عشر فیہ دلیل علی ان الایمان الی قولہ الا بقوۃ ایمانہم

(۲۴۴) جماعت کو امام کا انتظار کرنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جماعت کو امام کا انتظار کرنا چاہیئے جب اسے کوئی عذر پیش آجائے بشرطیکہ نماز میں داخل نہ ہو گئے ہوں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ انتظار اسی وقت کیا جائے جبکہ عذر تھوڑی دیر کا ہو جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر اتنی دیر کا تھا کہ آپ نے غسل کر لیا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کا انتظار اسی وقت کیا جائے جب کہ اس نے جماعت کو انتظار کا حکم دیا ہو یہ مضمون اس حدیث کو اس حدیث کے ساتھ ملانے سے مفہوم ہوا جس میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار بعض عرب قبائل میں صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے اور نماز کا وقت آگیا تو صحابہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے ہیں تو صحابہ نماز میں تھے آپ نے ان کے ساتھ اپنی نماز پوری کی۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ تم نے

اچھا کیا اور کما قال صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ جب آپ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ نماز میں آپ کا انتظار کریں تو صحابہ نے نماز کا وقت ہو جانے پر نماز شروع کر دی جس کے وہ مامور تھے اور اس واقعہ میں حضور نے ان کو انتظار کا حکم دیا تھا تو انہوں نے حکم کی تعمیل کی، ان دونوں حدیثوں کے ملانے سے وہ علمی مسئلہ مستنبط ہوا جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے، البتہ اگر نمازیوں کو یقین ہو یا گمان غالب ہو کہ امام کا عذر تھوڑی دیر کا ہے تو اگرچہ اس نے انتظار کا حکم نہ دیا ہو تب بھی اس کی حرمت کی وجہ سے کچھ دیر تک اس کا انتظار کرنا چاہیئے جبکہ وقت میں گنجائش ہو اور وقت مستحب کے نکلنے کا اندیشہ نہ ہو بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ نمازیوں میں سے بھی اگر کوئی شخص کسی خاص مسجد میں نماز پڑھنے کا پابند ہو اور نماز کا وقت آجائے اور وہ شخص نہ آیا ہو تو اتنی دیر اس کا انتظار کیا جائے جتنی دیر میں ایک نماز ادا ہو جائے۔ یعنی دو رکعت کے برابر انتظار کیا جائے۔ اس کے بعد نماز شروع کر دیں کیونکہ اس کی پابندی کا بھی ایک حق ہے جس کا احترام کرنا چاہیئے اسکی بیقدری نہ کرنا چاہیئے اور یقیناً امام کی حرمت اور اس کا حق بہت زیادہ ہے۔ خوب سمجھ لو

اسی مناسبت سے ہم ایک شیخ کی حکایت بیان کرتے ہیں جو تمام نمازوں میں پابندی سے آیا کرتے تھے اور مسجد کے دروازہ پر اذان دے کر مسجد میں داخل ہوتے تھے ایک دن وقت معین سے ذرا پیچھے رہ گئے تو مؤذن نے نماز کے لئے اقامت کہہ دی اور لوگوں نے نماز شروع کر دی شیخ تشریف لائے تو لوگوں کو نماز میں دیکھا جس سے ان کا دل متغیر ہوا کیونکہ آج ان سے اذان واقامت فوت ہوئی اور تکبیر تحریمہ بھی فوت ہوئی مگر انہوں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ جب رات ہوئی تو مؤذن نے خواب میں

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ اس سے فرماتے ہیں

تأدب مع الشیخ   شیخ کیساتھ مؤدب ہو کر رہو

(تمیز سے کام کیا کرو بدتمیزی کا معاملہ نہ کرو)

جب صبح کی نماز کیلئے شیخ تشریف لائے تو خود ہی مؤذن سے فرمایا کیا تو نے یہ سمجھا ہے کہ میرے ساتھ کوئی نہیں جو میرا بدلہ لے (شیخ کو مؤذن کا خواب بطور کشف کے پہلے ہی معلوم ہو گیا) تب مؤذن نے توبہ کی اور شیخ سے معافی مانگی، اسی طرح جو شخص بھی اپنے مولیٰ کے ساتھ سچائی کا معاملہ کرتا ہے وہ اسکی مدد کرتا ہے۔

قوله فی الوجه الاول والثانی والثالث ان الجماعة ینتظرون الامام الی قوله فانه ینصره

ف ہر چند کہ یہ مسئلہ تصوف کا نہیں مگر صوفیہ کے معمولات میں سے ہے وہ اپنی خانقاہوں کی مساجد میں شیخ کا انتظار نماز کے لئے ضرور کرتے ہیں بدون شیخ کے نماز شروع نہیں کرتے چونکہ عموماً خانقاہوں کی مساجد میں اہل خانقاہ ہی زیادہ ہوتے ہیں جن کو شیخ کا انتظار گراں نہیں ہوتا اس لئے اس انتظار میں کوئی قباحت نہیں جب تک وقت میں گنجائش ہے۔ خانقاہ امدادیہ میں حالانکہ کسی کو بھی حضرت شیخ کی تشریف آوری سے پہلے نماز شروع کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا بلکہ گراں گذرتا ہے مگر حضرت حکیم الامت کا ارشاد ہے کہ پانچ منٹ سے زیادہ جبرا انتظار نہ کیا جائے۔ بہرحال انتظار امام کے لئے یہ حدیث حجت ہے۔   واللہ تعالیٰ اعلم

باب چہل و یکم ۴۱

حدیث

سبعة يظلهم الله يوم القيامة في ظل عرشه

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سات شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دیں گے جس دن کہ اس کے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہ ہوگا۔

(ایک ۱) امام عادل اور

(دوسرا ۲) وہ جوان جس کا اٹھان اپنے پروردگار کی عبادت میں ہوا ہو اور

(تیسرا ۳) وہ شخص جس کا دل مسجدوں ہی میں اٹکا رہتا ہو اور

(چوتھے ۴) وہ دو شخص جن میں باہم اللہ کے لئے محبت ہو اسی پہ جمع ہوتے ہیں اسی پہ جدا ہوتے ہیں۔ اور

(پانچواں ۵) وہ شخص جس کو کسی معزز خوبصورت عورت نے اپنے پاس غرض نفسانی کے لئے بلایا اور اس نے صاف کہدیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور

(چھٹا ۶) وہ شخص جس نے کچھ صدقہ کیا اور چھپا کر دیا یہاں تک کہ اس کے بائیں

ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ دایاں ہاتھ کیا خرچ کر رہا ہے۔ اور
(ساتواں) وہ شخص جس نے اللہ عزوجل کو تنہائی میں یاد کیا پھر اس کی آنکھیں بہنے لگیں، (اللہ کی محبت یا ہیبت سے رونے لگا)

شرح ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ ان سات شخصوں کو جن کا ذکر ہوا اللہ تعالیٰ قیامت میں سایہ کی جگہ دیں گے جبکہ اللہ کے سوا کسی کے پاس سایہ نہ ہوگا، اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۴۵) اعمال صالحہ دلیل سعادت ہیں

حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال صالحہ انسان کی سعادت پر دلالت کرتے ہیں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ سات شخص ہیں جن کو حق تعالیٰ قیامت میں سایہ دیں گے پھر آپ نے سایہ کا سبب ان اعمال کو بتلایا جن کا حدیث میں ذکر ہے۔

قولہ الوجہ الثانی فیہ دلیل علی ان اعمال الخیر دالۃ الی قولہ فجعل موجب الظل تلک الاعمال

(۲۴۶) اعمال صالحہ سب مطلوب ہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ ہم سے تمام اعمال صالحہ مطلوب ہیں اگرچہ بعضے افعال فرض و واجب بھی نہ ہوں کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اعمال کا ثواب بیان فرما دیا اور ان سب کے بجالانے کا حکم نہیں دیا بلکہ ان میں سے بعض کا تو آپ نے حکم دیا ہے جو واجب ہیں اور بعض کا حکم نہیں دیا وہ مستحب ہیں کیونکہ فائدہ کا زیادہ ہونا ضمناً خود ہی عمل پر ترغیب دیتا ہے۔

قولہ فیہ دلیل علی ان جمیع افعال البر مطلوبۃ منا الخ
قولہ لان کثرۃ الربح تحض بضمنہ علی المعاملۃ

(۲۴۷) ثواب کی بناء کسی علت پر نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ اعمال پر ثواب کا عطا ہونا کسی علت عقلیہ یا علت ذاتیہ پر مبنی نہیں کیونکہ ان سات اعمال میں سے بعض واجب ہیں اور بعض مستحب ہیں اور ثواب سب کا برابر ہے کہ عرش کا سایہ عطا ہوگا اور دلائل شرعیہ کی بناء پر امت کا اس پر اتفاق ہے کہ فرائض کا مرتبہ دوسرا اعمال سے بڑھا ہوا ہے پس اگر ثواب کی بناء پر کسی علت پر ہوتی تو فرض و مستحب کا ثواب برابر نہ کیا جاتا حالانکہ یہاں برابر کر دیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ کسی علت کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر ہے۔

قوله فى الوجه الخامس فيه دليل على ان اعطاء الاجور على الاعمال الى قوله فليس ذلك لعلة

(۲۴۸) خواہش نفس کو پوری طرح دبانا اور اخلاص حقیقی حاصل کرنا ہی کامیابی کا سبب ہے

یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ ان سات اعمال کے ساتھ اس ثواب کا مخصوص ہونا امر تعبدی ہے جس کی کوئی علت عقلی نہیں یا قیاسی ہے جس کی علت عقل سے معلوم ہو سکتی ہے؟ اگر کہا جاوے کہ یہ امر تعبدی ہے جس کی علت عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی تب تو کچھ بحث نہیں اگر یہ کہا جائے کہ اسکی علت معقول ہے تو وہ کیا ہے؟ تو اس سوال کا جواب واللہ اعلم یہ ہے کہ یہاں دو علتیں ہیں ایک تو پوری قوت سے نفس کو اور اس کی خواہش کو دبانا اور یہ دنیا و آخرت کی خیر کے لئے بڑا سبب ہے، کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هى المأوى

"اور جس نے نفس کو خواہش سے روک لیا تو جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

رجعتم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر وهو جهاد النفس

اب تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس جاتے ہو جو کہ نفس کا جہاد ہے۔

اور دوسری علت حقیقت اخلاص کا حاصل ہونا ہے اور اس کی عظمت اور اس کا موجب ترقی ورفعت ہونا ظاہر ہے۔ حق تعالیٰ جل جلالہ فرماتے ہیں

وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين

لوگوں کو اور کسی بات کا حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی عبادت کریں خلوص کے ساتھ اللہ کے لئے منقاد بن کر۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

ان الله لا يقبل عمل امرئ حتى يتقنه قالوا وما اتقانه يا رسول الله قال يخلصه من الرياء والبدعة

اللہ تعالیٰ کسی شخص کا عمل اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک اس کو پختہ نہ کرلے۔

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ عمل کی پختگی کیا ہے فرمایا یہ کہ اس کو ریاء اور بدعت سے پاک کرلے اور ریاء کا چھوڑنا ہی عین اخلاص ہے اور ان دونوں علتوں کی علت اللہ عزوجل کا خوف ہے (خوف ہی کی وجہ سے اخلاص کی طلب اور ریاء سے نفرت ہوتی ہے اور اسی سے نفس کو دبانے اور اس کی خواہشوں کو فنا کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ اب تم ان سب میں الگ الگ غور کرو تو خود ہی اسکی تصدیق کرو گے۔

چنانچہ اول امام عادل ہی کو لو کہ وہ اپنے کو محض شدت خوف الٰہی

کی وجہ سے ہی ظلم سے رکتا اور اپنے نفس کو عدل پر مجبور کرتا ہے ،
باوجودیکہ اس کو ظلم پر قدرت حاصل ہے کیونکہ وہ ظالمانہ حکم بھی دے سکتا
ہے اور دوسروں کو دبا بھی سکتا ہے کوئی اس کو ظلم سے روک نہیں سکتا
اب بجز شدت خوف خدا کے کیا چیز ہے جو اس کو عدل پہ مجبور کر دہی ہے
اور ایک حدیث میں اس شخص کی حکایت ہے جس نے اپنے گھر والوں
کو وصیت کی تھی کہ جب میں مرجاؤں مجھے جلا دینا چنانچہ وہ مرگیا تو انہوں
نے ایسا ہی کیا حق تعالیٰ نے اس کے تمام اعضاء کو جمع کیا اور زندہ کر کے
اس سے پوچھا کہ تو نے ایسی وصیت کیوں کی تھی کہا اے پروردگار! محض تیرے
خوف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسکو بخش دیا، تو شدت خوف ہی اس شخص کی
نجات کا سبب بنی ۔ رہا وہ جوان جس کا اٹھان اللہ کی عبادت میں ہوا، تو
ظاہر ہے کہ عبادت حقیقت میں نفس کو دبانا اور راحت سے نکالنا اور
مجاہدات پر آمادہ کرنا ہے اور اس پر مداومت باوجودیکہ جوانی کے زمانہ میں
نفس کی خواہشیں زوروں پر ہوتی ہیں بدون خوف شدید کے نہیں ہو
سکتی اسی لئے ایک نوجوان عابد کی نسبت منقول ہے کہ وہ بستر پر لیٹتے
تو سو نہیں سکتے تھے بس یہ کہہ کر کھڑے ہو جاتے کہ اے اللہ! آپ جانتے
ہیں کہ آپ کی جہنم کے خوف نے مجھے سونے سے روک دیا ہے اور کھڑے ہو
کر صبح تک نماز پڑھتے رہتے ۔ رہا وہ شخص جس کا دل مسجدوں[ع] میں اٹکا رہا
ہو تو بظاہر ہے کہ اخلاص حقیقی دل کو عبادات سے پیوستہ کر دیتا ہے

ع مراد جنس مسجد ہے خواہ کسی مسجد سے دل اٹکا ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
جمع کا صیغہ غالباً اسلئے اختیار فرمایا کہ اس زمانہ میں المسجد سے متبادر مسجد حرام یا مسجد نبوی
ہوتی تھی اور مقصود تعمیم تھی اس لئے المسجد کی جگہ المساجد جمع محلی باللام کا صیغہ اختیار فرمایا
جو استغراق یا جنس پر دال ہوتا ہے قالہ الشارح ۱۲ ظ

اور تمام عبادات میں ارفع و اعلیٰ نماز ہے اور نمازوں میں سب سے ارفع وہ ہے جو مسجدوں میں ادا ہوتی ہے تو یہ شخص اخلاص کی وجہ سے اعلیٰ درجے کی عبادت کی دُھن میں لگا رہتا ہے جیسا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت منقول ہے کہ لوگوں نے ان کا نام حمام المسجد (مسجد کا کبوتر) رکھ لیا تھا کیونکہ وہ مسجد سے بہت لگے لپٹے رہتے تھے،عہ اور جن دو شخصوں میں اللہ کے لئے محبت ہو اسی پر جمع ہوں اسی پر جدا ہوں یعنی محض منہ دیکھے کی محبت نہیں بلکہ سچی اور واقعی محبت ہے جو ملاقات و اجتماع کے وقت بھی رہتی ہے اور مفارقت و جدائی کی حالت میں بھی رہتی ہے تو یہ بات ان دونوں کے شدت اخلاص ہی سے پیدا ہو سکتی ہے یہاں تک کہ نفس کی کوئی خواہش کوئی غرض اور کسی شے کی طلب درمیان میں نہ ہو محض اللہ کا واسطہ ہو اور اللہ کے لئے تعلق ہو۔

رہا وہ شخص جس کو کسی معزز خوبصورت عورت نے اپنے پاس بلایا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں تو یہ بات سختی کے ساتھ نفس کی خواہشوں کے دبانے سے حاصل ہو سکتی ہے، اور اس کا سبب شدت خوف خدا ہوتا ہے، رہا یہ سوال کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا کہ عزت دار خوبصورت عورت نے بلایا حالانکہ عورت تو ہر حالت میں بڑا فتنہ ہے خواہ معزز ہو یا ذلیل خوبصورت ہو یا بدصورت۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

عہ اس زمانہ کی تہذیب تو یہ تھی اب اپنے زمانہ کی تہذیب ملاحظہ ہو کہ ملانوں کو مسجد کا مینڈھا کہا جاتا ہے۔ ایک رئیس نے کسی طالب علم کو مسجد سے آتا دیکھ کر کہا وہ آئے مسجد کے مینڈھے تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ مسجد کا مینڈھا سگِ دنیا سے اچھا ہے۔ خاموش ہی تو رہ گئے ۱۲ ظ

ما ترکت بعدی فتنۃ ھی اضر علی الرجال من النساء

میں نے اپنے پیچھے کوئی فتنہ مردوں کے حق میں عورتوں سے زیادہ خطرناک نہیں چھوڑا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دو وصفوں کو اس لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ یہ بات محقق ہو جاوے کہ اس کے انکار کا سبب شدت خوف خداوندی کے سوا اور کچھ نہ تھا کیونکہ اگر کوئی ذلیل عورت شریف آدمی کو بلائے اور وہ انکار کر دے تو احتمال ہو سکتا ہے کہ انکار کا منشا عزت نفس ہے اس کی شرافت نے ایسی ذلیل عورت سے اختلاط گوارا نہ کیا۔ اسی طرح بدصورت عورت نے کسی کو اپنی طرف بلایا اور اس نے انکار کر دیا تو احتمال ہو سکتا ہے کہ طبعی نفرت کی وجہ سے انکار کیا ہے مگر جہاں یہ دونوں باتیں نہ ہوں بلکہ عورت معزز خاندان کی ہو اور خوبصورت بھی ہو اور خود ہی طالب وصال بھی ہو اس صورت میں مرد کے انکار کا منشا خوف خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ کہ ان دونوں وصفوں میں سے ہر ایک کو عورت کی طرف رغبت و میلان اور شہوت جماع کے بھڑکانے میں بڑا دخل ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

تتزوج المرأۃ لجمالھا وحسبھا

عورت سے شادی کی جاتی ہے اسکے جمال کیوجہ سے یا شرافت کی وجہ سے اور جس چیز کی طرف ایک سبب سے بھی رغبت ہو جاتی ہے وہاں اگر دو سبب رغبت کے جمع ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ رغبت زیادہ اور خواہش پوری قوت کے ساتھ ہوگی۔ اسی لئے اس خواہش کے دبانے پر ثواب بھی بہت زیادہ عطا ہوا۔

اس کی نظیر بعض صوفیہ سے منقول ہے کہ ان میں سے کچھ تو خلوت میں مقید تھے اور بعضے مقید نہ تھے پھر ان کو فتوحات میں عمدہ کھانا حاصل ہوا

تو شیخ نے فرمایا خلوت والوں کو مقدم کرو (پہلے ان کے سامنے یہ کھانا رکھو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) تو ان میں سے بعضے تو کھانے کو دیکھتے ہی اپنے دوسرے بھائیوں کو خبر دینے چل دیئے یہ بھی معلوم نہ کیا کہ یہ کیا ہے اور کس قسم کا کھانا ہے اور بعضوں نے کھڑے ہی کھڑے کھانے کو کھولا اس کو دیکھا اور پہچان لیا کہ کیا ہے اور بدون کھائے چل دیئے اور بعض نے اس کو دیکھا اور ایک لقمہ اٹھا کر منہ میں دیا اس کا مزا چکھا (لذت حاصل کی) یہاں تک کہ مزا چکھنے کی وجہ سے کھانے کی خواہش نے زور کیا مگر اس کے بعد اس نے دوسرا لقمہ نہیں لیا بلکہ چھوڑ کر چل دیا تو اس شخص کا زہد جس نے کھانے کا مزا چکھ لیا تھا دوسروں سے بڑھا ہوا تھا کیونکہ اس کی خواہش زبردست تھی جس کو اس نے قوت سے دبا دیا (دوسروں نے کھانے کو دیکھا اور چکھا ہی نہیں تو خواہش کیا خاک ہوتی۔

(۸) وہ جس نے صدقہ کیا اور چھپا کر دیا حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوئی کہ داہنے نے کیا کیا تو یہ کمال اخلاص ہی سے ہوسکتا ہے۔ اسی کے قریب بعض صوفیہ سے منقول ہے کہ وہ کسی کا ہدیہ بہت کم وصول کیا کرتے تھے۔ ایک دن عشاء کے بعد ایک شخص نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ باہر آئے تو دیکھا کہ ان کا ایک پڑوسی ہے جو کپڑا سینے کا کام کرتا تھا پوچھا کیا کہنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ آج میں نے اتنی رقم کا کپڑا سیا ہے اور اس سے یہ کھانا خرید کر لایا ہوں جو میرے ساتھ ہے اور کچھ گھر کی ضرورت کی چیزیں خرید لی ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ سب حلال طریقہ سے حاصل کیا ہوا ہے میں اس کو خوشی کے ساتھ آپ کے واسطے لایا ہوں اور اس وقت اندھیری رات ہے اور بخدا میں نے کسی کو اس ہدیہ کی اطلاع نہیں کی اور نہ کسی نے مجھے آپ کے پاس آتا ہوا دیکھا، وہ کھانا یہ ہے اس کو لے لیجئے یہ کہہ کر دروازہ ہی میں اس کو رکھ کر چلتا بنا، تو دیکھو اس درجہ اہتمام اخفاء

پیاس شخص کو اس بات ہی نے تو برانگیختہ کیا تھا کہ اس کو عمل میں اخلاص کی طلب تھی۔

(۲) وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں بہنے لگیں تو اس میں تو دونوں وصف مجتمع ہیں۔ خوف بھی اور اخلاص بھی اور ان اوصاف حمیدہ میں سے کوئی وصف بھی اس وقت تک پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک نفسانی صفات زائل نہ ہو جائیں، جس قدر صفات نفس غائب ہوں گی اسی قدر راستہ کھلے گا۔ اسی لئے بعض لوگوں کا جن کو اس قوم (صوفیہ) سے تعلق نسبت حاصل ہے یہ ارشاد ہے کہ جب تک تیری نظر اپنے نفس پر ہے اس وقت تک تو اس کے سوا کسی کو نہ دیکھے گا اور جب اپنے نفس سے نظر ہٹا لے گا تو کوئی چیز بھی تیری نظر سے غائب نہ رہے گی، پس ان چیزوں کے دیکھنے کی رغبت کر جن کو تو شمار بھی نہیں کر سکتا۔ ایک اپنے نفس کو دیکھنے سے کیا ملے گا اور ہمارے بزرگوں کا ارشاد ہے کہ بیشمار چیزوں کے دیکھنے سے بھی کیا فائدہ؟ اس ایک کو دیکھو جس کے دیکھنے کے بعد کسی کے دیکھنے کی ہوس ہی دل میں نہ آئے ؎

دل ہو وہ جس میں کچھ نہ ہو جلوۂ یار کے سوا
میری نظر میں خاک بھی جام جہاں نما نہیں

اور بعض کمالات وہ ہیں جن کے ایک ذرہ کی معرفت بھی تجھ کو اس وقت تک حاصل نہ ہوگی جب تک اس چیز سے اعراض نہ کرے جو حقیقت میں ذرہ کے برابر بھی نہیں یعنی دنیا اور سب سے بڑی دنیا تیرا نفس ہے اور جب تجھ کو یہ وصف حاصل ہو جائے یعنی دنیا سے اور اپنے نفس سے تیری نظر اٹھ

ع اس مقام کو ناچیز مترجم خود حل نہیں کر سکا حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے اسکو حل فرمایا وللہ الحمد ۱۲ ظ

جائے تو ساری مخلوق تیرے ایک ذرہ کے بھی برابر نہ ہوگی یعنی اس وقت تیری قیمت اللہ کے نزدیک بہت زیادہ ہوگی ۔

قوله فی الوجه العاشر وهنا بحث هل هذه السبعة خصت بهذا الثواب تعيد الى قوله فی الوجه السابع عشر عاد الورى باسره لا يعدل منك ذرة

ف یہ حدیث طریق صوفیہ کی واضح حجت ہے کیونکہ جن اعمال عظیمہ پر اسمیں اجر عظیم کی بشارت دی گئی ہے ان پر حضرات صوفیہ ہی پوری طرح عامل ہیں خصوصاً ہر شخص کے ساتھ عدل کا معاملہ کرنا اور مسجدوں میں دل کا اٹکا رہنا اور باہم اللہ کے لئے محبت کرنا اور کیسی ہی حسین و جمیل عورت بلائے اللہ کا خوف کر کے اس سے بچ جانا اور تنہائی میں اللہ کی یاد میں رونا اور چھپا کر صدقہ خیرات کرنا ان حضرات کا معمول خاص ہے ، معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معرفت گنگوہ کی بیواؤں غریبوں کے مکان پر عشا کے بعد روپیہ بھجواتے تھے اور مولانا محمد یحییٰ صاحب اپنے منہ پر لنگی یا رومال بطور نقاب کے ڈال لیتے تھے تاکہ کوئی پہچانے نہیں جب حضرت کے وصال کے بعد رات کو روپیہ کی تقسیم موقوف ہوئی اس وقت بیواؤں اور غریبوں کو علم ہوا کہ یہ سب کچھ حضرت قدس سرہ کی طرف سے ہوتا تھا اور اگر اخیر عمر میں مولانا کی بینائی زائل نہ ہوگئی ہوتی تو شاید حضرت والا اس تقسیم میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کو بھی واسطہ نہ بناتے اور خود اپنے ہاتھ ہی سے اس کام کو انجام دیتے تاکہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ۔

ف یہ صدقہ نافلہ ہے جس کے چھپا کر دینے میں اتنا ثواب ہے اور صدقہ فرض یعنی زکوٰۃ اور صدقہ فطر وغیرہ کو ظاہر کر کے دینا افضل ہے کیونکہ

اخفاء کی فضیلت ریا سے بچنے کے لئے ہے اور فرائض میں ریا نہیں ہوتی جو کام فرض ہے اس کے بجالانے میں کیا ریا؟ وہ تو سب ہی کرتے ہیں مگر زکوٰۃ و صدقۂ فطر کے ظاہر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ جس غریب کو دو اس کو زکوٰۃ کا روپیہ کہہ کر دو، اس کی ضرورت نہیں بلکہ یوں کہنا اچھا بھی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے غرباء کو نقد وغیرہ دو چھپا کر نہ دو تاکہ لوگ خواہ مخواہ بدنام نہ کریں کہ فلاں شخص کے پاس اتنا روپیہ ہے مگر ہم نے کبھی اس کو زکوٰۃ دیتے ہوئے نہ دیکھا، اگر تم دو چار کے سامنے زکوٰۃ کی رقم دیتے رہو گے تو تمام مسلمان بدگمانی سے بچیں گے ان کو تم سے ہمدردی بھی ہوگی اور کیا عجب ہے کہ تم کو دیکھ کر کوئی دوسرا مالدار بھی زکوٰۃ دینے لگے تو اس کے عمل کا ثواب بھی تم کو ملے گا اگرچہ اس کا ثواب بھی کم نہ کیا جائے گا۔

(۲۴۹) اللہ کے واسطے محبت کرنیوالوں کی تین قسمیں ہیں

المتحابون فی اللہ یعنی اللہ کے واسطے باہم محبت کرنیوالوں کی تین قسمیں ہیں ایک یہ کہ اللہ کے واسطے محبت ہو مگر ساتھ میں کسی دنیوی منفعت کی بھی امید ہو خواہ ظاہری ہو یا باطنی، ظاہری جیسے مال و دولت، باطنی جیسے جاہ و عزت وغیرہ تو یہ تو طالب غرض ہے اس کا مقصود دنیا ہی ہے بس یہ ہوگا اور اسکی غرض خواہ وہ پوری ہو یا نہ ہو۔

دوسری قسم یہ ہے کہ صحبت و رفاقت تو اللہ کے لئے ہو مگر اس کے ساتھ کسی اُخروی نفع کی بھی اُمید ہے خواہ ظاہری ہو یا باطنی ظاہری جیسے توفیق اعمال صالحہ و ذکر و شغل وغیرہ باطنی جیسے اخلاق حمیدہ و نسبت و احسان و اخلاص کا حصول علوم و معارف کا ورود اور مرنے کے بعد شیخ کی شفاعت سے دخول جنت وغیرہ سو یہ بھی طالب حاجت اور صاحب غرض ہے

مگر اس کا نفس پہلے سے بلند حوصلہ ہے کہ اس کو منافع کی طلب تو ہے مگر منافع اخرویہ کی طلب ہے، منافع دنیویہ کی طلب نہیں اور اسی قسم کے لوگ اُن حضرات کے پاس زیادہ ہوتے ہیں جو بزرگ کہلاتے ہیں۔

تیسری قسم یہ ہے کہ صحبت اور رفاقت و محبت محض اللہ کے لئے ہے اور کوئی غرض نہیں نہ دنیوی نہ اخروی یعنی شیخ سے تعلق صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ والا ہے اور اس قابل ہے کہ اس سے محبت اور تعلق پیدا کیا جائے خواہ تم کو نفع ہو یا نہ ہو جیسا بادشاہ عادل سے سب کو محبت ہوتی ہے اگرچہ کسی خاص شخص کو اس کے عدل سے نفع حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو مگر عدل کمال ہی ایسا ہے کہ جس میں بھی ہو اس سے طبعاً محبت ہوتی ہے اسیطرح اللہ والا ہونا وصف ہی ایسا ہے کہ جس میں یہ وصف ہو اس سے محبت اور تعلق ہونا چاہیئے اگرچہ کسی خاص شخص کو اس سے نفع نہ پہنچا ہو جس کو یہ بات حاصل ہو بس وہ ہے جس کو اللہ کے لئے محبت کرنے والا سچ مچ کہہ سکتے ہیں اور جو ایسا ہوگا اس کو اپنے بھائی کی کوئی بات بھی جو اس کے حق میں صادر ہو متغیر نہ کرے گی کیونکہ اس کی محبت اپنے واسطے نہیں بلکہ اللہ کے واسطے ہے اور اللہ تعالیٰ کا تعلق اس کے کسی برتاؤ سے بدل نہیں سکتا اور جو ایسا نہ ہو وہ امتحان کے موقعہ پر بہت کم ثابت قدم رہے گا اور اگر ایک کی نیت اللہ کے لئے ہو اور دوسرے کی نیت کچھ اور ہو یعنی دنیا کے لئے ہو تو ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل ملیگا چنانچہ دو شخصوں کی جو اللہ کے واسطے باہم صحبت رفاقت رکھتے تھے حکایت ہے کہ ان میں سے ایک نے دوسرے کے ساتھ جفا کی تو اس نے اس سے کہا عزیز من! ذرا تم فلاں بزرگ کی مجلس میں تو ہو آؤ چنانچہ وہ اس کے کہنے سننے سے چلا گیا جب مجلس میں پہنچا تو اِن بزرگ نے اس وقت باتوں باتوں میں وہ بات ظاہر کردی جو اسکی طرف سے اپنے ساتھی کے ساتھ صادر ہوئی تھی اور یہ سمجھ گیا کہ میں نے اپنے دوست پہ زیادتی کی اور اسکے

ساتھ جفا کی۔ اسی وقت اس نے توبہ کی استغفار کی اور عزم کر لیا کہ واپس جاتے ہی اپنے دوست کے پاؤں پکڑوں گا شاید وہ میری خطا معاف کر دے جب دوست کے پاس پہنچا اس کو اپنے ارادہ کی اطلاع دی اس نے کہا عزیز من! تم اپنے نفس کے پاؤں پکڑو کیونکہ مجھے تو تم سے خالص اللہ کے واسطے تعلق ہے مجھ پر تمہاری کوئی حرکت گراں نہیں ہو سکتی مگر تمہارا رُخ صرف اپنے نفس کی طرف ہے اور کسی طرف نہیں چنانچہ اب بھی تم اپنے نفس کے کہنے ہی سے معافی مانگنے آئے ہو تو تم اسی کے پاؤں پکڑ لو۔

قوله فی البحث الرابع فالمتحابون فی الله علی ثلثة وجوه الی قوله وانما وجهك فی حق نفسك لا غیر

(۲۵۰) اللہ کو تنہائی میں یاد کرنے کی تین صورتیں ہیں

یہاں ایک سوال اور ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کرنے سے مراد ظاہر تنہائی ہے یا باطنی یا دونوں کا مجموعہ؟ ظاہر تنہائی کے معنی تو یہ ہیں کہ اپنی جگہ پر تنہا ہو اس کے پاس کوئی دوسرا نہ ہو اور باطنی تنہائی کے معنی یہ ہیں کہ اس کے رونے کا سبب صرف اللہ کا خوف ہو اور کوئی سبب نہ ہو اور مجموعہ کی صورت یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی دوسرا بھی نہ ہو اور رونے کا سبب بھی خوف خدا کے سوا کچھ نہ ہو اگر یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جمع ہوں تو اس میں شک نہیں کہ یہ حالت زیادہ کامل ہے اور اگر تنہائی پوری ہو پاس کوئی نہ ہو مگر اللہ کو یاد کرتے ہوئے کسی اور خیال سے رونے لگا اللہ کے خوف کی وجہ سے نہیں رویا نہ اللہ کی یاد سے محبت میں رویا تو بالاتفاق یہ حالت وہ نہیں جس کی طرف اس جگہ اشارہ کیا گیا ہے بلکہ یہ حالت مذموم ہے کیونکہ دھوکہ پر مشتمل ہے ظاہر تو یہ کر رہا ہے کہ اللہ کی وجہ سے رویا ہے۔ کیونکہ یاد الٰہی کے ساتھ گریہ طاری ہوا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں بلکہ آنسو اتفاقاً اللہ کو یاد کرتے ہوئے ظاہر ہو گئے نکل آئے مگر جب تنہائی میں رونا فرض کیا گیا ہے تو

دہوکہ کے کیا معنی ؟ دہوکہ کی صورت تو وہ ہے جبکہ مجمع میں ذکر ہو اور اللہ کی یاد سے نہ رویا ہو اور جو صورت شارح نے بیان کی ہے اس میں نہ دہوکہ ہے نہ ثواب رہی تیسری صورت کہ مجمع میں اللہ کو یاد کرکے رویا ہو اور دل ماسوا سے خالی ہو ذکر اللہ ہی کے اثر سے آنسو نکلے ہوں تو امید ہے کہ یہ شخص بھی ان بابرکت لوگوں میں داخل ہے جن کا حدیث میں ذکر ہے کیونکہ اس پر بھی یہ بات باطناً صادق ہے کہ اس نے خلوت میں اللہ کو یاد کیا کیونکہ اس کا باطن ماسوا سے خالی تھا گو ظاہر مجمع میں تھا اور جو صورت بطور احتمال کے حدیث کے تحت میں داخل ہو اس میں امید تو ضرور ہوتی ہے اگرچہ یقینی صورت وہی ہے جہاں مضمون حدیث کا پورا متحقق ہو اور وہ وہی ہے جہاں دونوں باتیں مجتمع ہوں رخلوت ظاہر بھی خلوت باطن بھی)

ذکر اللہ کے اقسام

یہاں ایک اور سوال ہے وہ یہ کہ ذکر اللہ سے مراد وہ ہے جو زبان اور لبوں سے ہو یا وہ جو دل سے ہو اگرچہ زبان کو حرکت نہ ہو یا جس صورت سے بھی ہو ہر حال میں ذاکر کہلائے گا، جواب یہ ہے کہ ان صورتوں میں سے ہر ایک پر ذکر اللہ صادق ہے جس کی دلیل سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جو صحیح حدیث قدسی میں وارد ہے۔

من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی ومن ذکرنی فی ملاءٍ ذکرتہ فی ملاءٍ خیر منہم[ع]

جس نے مجھے اپنے دل میں یاد کیا میں اس کو اپنے دل میں یاد کروں گا اور جو مجھے جماعت میں یاد کریگا میں اسکو اس سے بہتر جماعت میں یاد کروں گا

ع یہاں سے اُس قول کا بھی جواب ہوگیا جو بخاری شریف کی ایک تقریر میں جو بہت بڑے علامہ کی طرف منسوب ہے لکھا ہے کہ ذکر قلبی کی ہمیں کوئی دلیل سنت سے نہیں ملی ۱۲ ظ

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ذاکر کا لقب دیا ہے اور طفیلی تو اس سے بھی کم تر بہانہ سے امید وابستہ کر لیتا ہے۔ یہ تو بہت صاف دلیل ہے جس سے احتجاج مجتہدانہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارے واسطے کیوں کافی نہ ہوگی۔

صوفیہ کے نزدیک ذکر قلبی افضل ہے

پھر مذہب صوفیہ پر تو ذکر قلبی افضل ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد پر امر و نہی کے موقعہ پر اللہ کو یاد کرنا اور حکم کی تعمیل کرنا زبانی ذکر سے افضل ہے کیونکہ ان کا قول ہے

ذکر اللّٰہ عند امرہ و نہیہ خیر من ذکرہ باللسان

سو حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق جواب تو یہ ہے کہ بیشک امر و نہی کے موقعہ پر اللہ کو یاد کرنا اور حکم کی تعمیل کرنا زبانی ذکر سے بہتر ہے مگر یہ حدیث اس کو شامل نہیں اگرچہ امید یہ ہے کہ اس کا حال اس ذاکر کے حال سے بھی بلند تر ہے جس کا یہاں ذکر ہے اور صوفیہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو پیش نظر رکھ کر فرمایا ہے۔

مضغة فی الجسد اذا صلحت صلح الجسد کله الا وھی القلب

انسان کے بدن میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے سارا بدن درست ہو جاتا ہے سن لو وہ دل ہے۔

اس بنا پر صوفیہ کا قول دوسروں کے قول پر راجح ہے کیونکہ جب تمام بدن کی صلاح کو صلاح قلب پر موقوف کیا گیا ہے اور سب کی صلاح ذکر اللہ سے ہے تو ذکر قلب ذکر لسان اور ذکر جوارح سے افضل ہوا اور بات تو یہ ہے کہ عمل اختلاف سے بچ کر اور تمام صورتوں میں سے درجہ کمال کو لیکر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان میں سے کرے جن کو اللہ نے اپنے احسان

سے یہ دولت عطا فرمائی ہے۔

قولہ فی البحث السابع ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ ھل یعنی بقولہ خالیا حسا او معنی الی قولہ جعلنا اللہ ممن من علیہ بذلک بمنہ

ف۔ حضرت حکیم الامت دام مجدہم کی بھی یہی تحقیق ہے کہ سب سے افضل ذکر وہ ذکر ہے جس میں ذکر لسانی کے ساتھ ساتھ ذکر قلبی مجتمع ہو تنہا ذکر قلبی گو افضل ہے مگر مختلف فیہ ہے، دوسرے یہ تجربہ ہے کہ تنہا ذکر قلبی دیر تک نہیں رہتا کچھ دیر کے بعد دل ادھر ادھر متوجہ ہو جاتا ہے اور یہ شخص دھوکہ میں رہتا ہے کہ میں ذکر قلبی کر رہا ہے البتہ اگر کسی کا دل ذکر قلبی میں غیر حق کیطرف متوجہ نہ ہوتا ہو تو اس کو ذکر لسانی کی ضرورت نہیں اگر اس سے تشویش ہوتی ہو، خوب سمجھ لو۔



باب چہل و دوم ۴۲

حدیث

تقدیم العشاء علی الصلوۃ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ حضور نے فرمایا کہ جب شام کا کھانا سامنے آجائے اور نماز کی اقامت ہو جائے تو کھانے کو مقدم کرو۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ شام کا کھانا جب سامنے آجائے اس کو پہلے کھا لینا جائز ہے اگرچہ نماز کھڑی ہو گئی ہو اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۵۱) حضور و خشوع و اخلاص ہی نماز کے قبول ہونے کے

اسباب ہیں یہاں ایک سوال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذا وضع العشاء کیوں فرمایا کہ جب شام کا کھانا سامنے رکھا جائے اذا کان وقت العشاء کیوں نہیں فرمایا کہ جب شام کا وقت آجائے جواب یہ ہے کہ کھانے کا سامنے رکھا جانا خواہش طعام کو بھڑکانے کا سبب ہے اور خواہش طعام کا بھڑکنا اس کے ساتھ دل کو وابستہ کرتا ہے اور دل کا اس سے وابستہ ہونا نماز میں حضور و خشوع و اخلاص نہ ہونے کا سبب ہے، اور

یہی وہ چیزیں ہیں جو نماز کے مقبول ہونے کے اسباب ہیں تو جب کھانے کا سامنے آنا ایسی علت ہے جس سے نماز کے قبول نہ ہونے کا اندیشہ ہے تو اس سے کہا جائیگا کہ پہلے کھانا کھا کر اپنی اس علت کا علاج کر لو اس کے بعد نماز کی طرف پیش قدمی کرو کیونکہ اللہ جل جلالہٗ فرماتے ہیں۔

فاذا فرغت فانصب والی ربلک فارغب

جب فارغ ہو جاؤ اس وقت محنت کرو اور اپنے پروردگار ہی کی طرف متوجہ ہو

ضروریات سے فارغ ہو کر ذکر اور نماز میں مشغول ہونا چاہیئے

علماء نے فرمایا ہے کہ ضروری امور سے فارغ ہونا مراد ہے کیونکہ دل ہمیشہ اپنی ضرورتوں میں اٹکا ہوا رہتا ہے جب ان سے فراغت ہو جائے اسی وقت عبادت میں مشغول ہونا بہتر ہے، چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب وہ روزہ سے ہوتے اور اپنی کسی باندی کی کوئی ادا ان کے دل کو بھا جاتی تو مغرب کے وقت کھانا کھا کر اس سے جماع کرتے اور غسل کر کے نماز پڑھتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ مغرب کا وقت ایسا تنگ نہیں جیسا عوام نے سمجھ رکھا ہے کہ افطار کرتے ہی نماز کی جلدی مچا دیتے ہیں دیکھو عبداللہ بن عمر روزہ افطار کرنے کے بعد باندی سے جماع کرتے پھر غسل کرتے پھر نماز مغرب کو جاتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں رمضان کے دنوں میں مغرب کی نماز غروب کے کافی دیر بعد ہوتی تھی، تو ان بزرگ صحابی نے آیات وحدیث کا مطلب خوب سمجھا اس لئے وہ سب لوگوں سے زیادہ متبع سنت کہلاتے تھے پس اگر مغرب کا وقت آجائے اور کھانا سامنے نہ لایا گیا ہو تو اس وقت نماز کو کھانے پر مقدم کرنا واجب ہے کیونکہ اب کھانے کے انتظار میں بیٹھنا فضول وقت ضائع کرنا ہے کہ نہ اس وقت یہ شخص کھانا کھا رہا ہے نہ اس فرض نماز کو ادا کرتا ہے جو اس کے ذمہ ہے اور یہاں سے یہ علمی مسئلہ

معلوم ہوا کہ حق اس کا ہے جو پہلے آئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب شام کا کھانا سامنے رکھدیا جائے اور نماز بھی کھڑی ہو جائے تو کھانا پہلے کھاؤ کیونکہ کھانا نماز کی اقامت سے پہلے آ گیا ہے تو حق اسی کا ہے اور اس میں اہل خواطر کی یعنی صوفیہ اہل کشف کی دلیل بھی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جب چند خواطر یکے بعد دیگرے قلب پر وارد ہوں تو حکم خاطر اول کے لئے ہے یعنی اسی کو مقدم کیا جائے۔

قولہ فی الوجہ الخامس وھنا بحث لم قال اذا وضع العشاء الی قولہ فی الوجہ السابع الحکم للخاطر الاول

ف حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے حضرت مولانا گنگوھی قدس سرہ سے دریافت کیا کہ بعض دفعہ ذکر کے وقت کوئی ضروری کام یاد آجاتا ہے اس وقت اگر اس کام کو نہ کیا جائے تو ذکر میں کشاکشی ہوتی ہے اس سے فراغت کر لی جائے تو ذکر میں یکسوئی ہوتی ہے تو اس وقت ذکر کو مقدم کیا جائے یا اس کام کو پہلے کر لیا جائے فرمایا اس کام کو پہلے کر لیا جائے پھر یکسوئی کے ساتھ ذکر کیا جائے، یہ تحقیق اس دلیل سے مؤید ہے جو شارح نے یہاں بیان فرمائی ہے

(۲۵۲) مستحبات کی پابندی کرنا سنت ہے حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مستحبات کی پابندی کرنا سنت ہے بلا ضرورت کے ان کو ترک کرنا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب شام کا کھانا سامنے رکھدیا جائے اور نماز کی اقامت ہو جائے تو کھانے کو مقدم کرو اور جماعت سے نماز پڑھنا اکثر علماء کے نزدیک مستحب ہے مگر حنفیہ کے نزدیک واجب یا سنت مؤکدہ ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی عذر نہ ہو تو مستحب کو ترک نہ کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کے چھوڑنے کی اجازت صرف کھانے کی وجہ سے دی ہے جب وہ آگے رکھدیا جائے اس سے معلوم ہوا کہ مستحب کو بلا وجہ ترک نہ کیا جاوے،

قوله فی الوجه الثامن فیه دلیل علی ان من السنة المحافظة علی المندوبات الی قوله الا من اجل علة الطعام وتقدمه

(۲۵۳) متبع سنت کے سارے کام طاعت ہی ہوتے ہیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ متبع سنت کے سارے کام طاعت ہی ہوتے ہیں جن پر اسے اجر ملتا ہے کیونکہ متبع سنت ایسے وقت میں کھانے کو مقدم صرف اس لئے کریگا شارع علیہ السلام نے اس کا حکم دیا ہے تو اس کو ثواب ملے گا کیونکہ اس کا کھانا محض امر کی وجہ سے ہوگا اور غیر متبع سنت محض اپنے اختیار سے اور اپنی خواہش کی رعایت سے کھائے گا اور بڑا فرق ہے اس میں جو امر کی وجہ سے کھائے اور اس میں جو شہوت کی وجہ سے کھائے اسیطرح تمام کاموں میں دونوں کا یہی حال ہوگا۔ نیز اسمیں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جنہوں نے شہوت کی حصہ ہی کو چھوڑ دیا اور یہاں تک چھوڑا کہ ان میں خواہش نفس کا نام بھی نہیں رہا۔ کیونکہ یہ خواہش ہی نماز کے مؤخر کرنے کا سبب ہوتی ہے جب یہ ہی نہ ہوگی تو نماز اپنے مستحب وقت میں ادا ہوگی حدیث سے اللہ تعالیٰ کی مہربانی بھی اپنے بندوں پر معلوم ہوئی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی عبادت سے مستغنی ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر شام کے کھانے کو نماز سے مقدم کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ نفس کو غذا کی خواہش ہوتی ہے اس سے راحت و آرام ملتا ہے اور عبادت میں تو غالب حالت یہی ہے کہ لوگوں کو تعب ہی ہوتا ہے گو سب کی یہ حالت نہیں۔

خاصانِ خدا کو عبادت سے بھی ویسی ہی راحت ملتی ہے جیسی دوسروں کو غذا سے

کیونکہ خاصانِ خدا کو تو عبادت سے بھی ویسی ہی راحت ملتی ہے جیسی دوسروں کو عمدہ غذاؤں سے ملتی ہے اسی حقیقت کی وجہ سے

ابراہیم بن ادہم نے فرمایا ہے جیسا ان سے منقول ہے کہ دنیا والے مسکین ہیں دنیا سے چلے گئے اور اس کی راحت کا کچھ بھی مزہ نہ چکھا لوگوں نے کہا دنیا کی راحت کیا ہے جس کا اہل دنیا نے مزہ نہیں چکھا۔ فرمایا طاعت کی لذت کہ یہ دنیا والے اس کو بدون چکھے ہی چلے گئے تو ان کو نہ دنیا ہی ملی نہ آخرت ہی اور اسی حقیقت کی بنار پر سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے

أرحنا بها يا بلال يعنى الصلوة

(اے بلال ہم کو نماز کے ذریعے سے راحت دو یعنی جلدی نماز کیلئے اذان و اقامت کہو)

قوله الوجه التاسع فيه دليل على ان المتبع السنة الى قوله

فى الوجه الحادى عشر ارحنا بها يا بلال يعنى الصلوٰة

ف - حدیث ارحنا بہا یا بلال جو مطلب شارح نے بیان کیا ہے اس پر وہ اشکال وارد نہیں ہوتا جو دوسرے علمار کی تفسیر پر وارد ہوتا ہے اہل علم اس کو سمجھ جائیں گے۔

(۲۵۴) اللہ والوں کے نزدیک دنیا کے کام اسی وقت مباح ہیں جب آخرت میں معین ہوں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل ارادت یعنی وصلہ والوں کے نزدیک دنیا کے کام اسی وقت مباح سمجھے جاتے ہیں جبکہ وہ آخرت میں معین ہوں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا نیکو مقدم کرنے کی اجازت صرف اس لئے دی ہے تاکہ نماز اچھی طرح کامل طریقے سے ادا ہو اور کھانا نفس کے حظوظ اور شہوات میں سے ہے اور حظوظ نفس جتنے بھی ہیں سب دنیا ہیں اور نماز آخرت کا کام ہے تو دنیا کی سب سے بڑی چیز کھانا پینا ہے جس کے سب محتاج ہیں دوسری چیزوں سے تو کبھی استغنا بھی ہو سکتا ہے اور ان کے ترک سے کچھ ضرر نہیں ہوتا مگر کھانا نہ ہو تو عادۃ مستمرہ یہ ہے کہ انسان ہی نہ ہوگا اور یہ

آخرت کے سب سے بڑے کام یعنی نماز میں معین ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مومن اور کافر کے درمیان امتیازی نشان نماز کا چھوڑنا ہے جس سے معلوم ہوا کہ نماز تمام اعمال آخرت سے اعلیٰ وافضل ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سب سے بڑے کام کا حکم آخرت کے سب سے بڑے کام کے مقابلہ میں بتلادیا کہ اس کو اس کے لئے معین بنانا چاہیئے اب ان کے سوا جو اور کام رہ گئے وہ ان کے تابع ہیں پس یہاں اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا کے سب کاموں کو اعمال آخرت میں معین بنانا چاہیئے کوئی کام محض دنیا کے واسطے نہ کرنا چاہیئے۔

قولہ الوجہ الرابع عشر فیہ دلیل علی ان امور الدنیا ما تستتبع

الی قولہ من باب التنبیہ بالاعلیٰ علی الادنیٰ۔

الحمد للہ کہ آج بتاریخ ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ بعد نماز عصر بروز یکشنبہ حصہ اول رحمت القدوس تمام ہوا، اللہ تعالیٰ بقیہ حصص کی تکمیل کی بھی توفیق عطا فرمائیں اور اس کتاب کو نافع عام وخاص اور مقبول بارگاہ بنائیں آمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا النبی الامی محمد وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ و نعمتہ تتم الصلحت ۱۲

رحمت القدوس کا پہلا حصہ ختم ہوا

باب چہل و سوم ۴۳

حدیث

تخفیف الصلوٰۃ

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جس کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہلکی اور زیادہ کامل ہو لیکن بعض دفعہ آپ بچے کے رونے کی آواز سن لیتے تو نماز کو ہلکی کر دیتے مبادا اس کی ماں پریشانی میں نہ پڑ جائے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں تکمیل کے ساتھ تخفیف فرماتے تھے اور یہ کہ آپ غیر حق کی رعایت سے بھی نماز میں تخفیف کرتے تھے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۵۱) درجہ کمال میں اکمل حالات کا اتباع کرنا چاہیئے اور ادنیٰ درجہ میں صرف صحت پر اکتفا نہ کیا جائے

حدیث میں (حضرات) صحابہ کے اہتمام (اتباع) کی دلیل ہے کہ وہ درجہ کمال میں تو اکمل حالات کا اتباع کرتے تھے اور درجہ صحت میں ادنیٰ پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ کچھ زیادتی کرتے تھے تاکہ درجہ کفایت سے کمی نہ رہ جائے (اور عمل برباد نہ ہو جائے) اور ادنیٰ درجہ میں کفایت کا تحقق یقینی طور پر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس پر کچھ تھوڑی سی زیادت نہ کی جائے بشرطیکہ زیادت شرعاً ممنوع نہ ہو جیسے وضو میں چار دفعہ اعضاء کو دھونا

ممنوع ہے یا دہ زیادت ایسی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی درجہ میں بھی عملاً ثابت نہ ہو تو اس سے بھی بچا جائیگا تاکہ بدعت میں مبتلا نہ ہو جائیں اور بدعت کی مذمت حدیثوں میں جس قدر آئی ہے وہ معلوم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس فیہ فھو رد

(جو شخص ہمارے اس امر میں یعنی دین میں ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے)

نیز آپ کا ارشاد ہے کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت گمراہی ہے) اور اس جیسی بہت سی حدیثیں ہیں)

نمازوں کے بعد صرف دُعا کیلئے مجتمع ہونا بدعت ہے

اور اسی میں نمازوں کے بعد لوگوں کا دعا کے لئے مجتمع ہونا بھی داخل ہے پس یہ عمل اور اس کے مشابہ جوں سب بدعت ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے بعد صحابہ و تابعین سے کہیں ثابت نہیں کہ انھوں نے عبادت یا ثواب سمجھ کر ایسا کیا ہو۔ اور اگر یہ مدت کے عبادت کو رد نہ کیا جائے کم از کم یہ ہو کہ وہ کیا جائے تو جائز ہے مگر افضل وہی ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد سلف صالح نے مداومت کی ہے۔

ف صوفیہ زمانہ کو اس مقام سے سبق لینا چاہئے کیونکہ وہ بکثرت بدعات میں مبتلا ہیں اور جب کہا جاتا ہے کہ یہ عمل بدعت ہے تو کہتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے ہم تو نیک کام کرتے ہیں بُرا کام تو نہیں کرتے سوان کو سمجھ لینا چاہئے کہ نیک کام وہی ہے جس کا شریعت میں ثبوت ہو۔ دیکھو دعا کرنا نیک کام ہے لیکن نمازوں کے بعد مجتمع ہو کر دعا کرنا بدعت ہے کیونکہ اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالح سے ثبوت نہیں پس اسی پر ان اعمال کو قیاس کر لیا جائے جن کو صوفیۂ زمانہ نے نیک اعمال سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مگر شریعت میں ان کا ثبوت نہیں۔ جیسے عرس مشائخ

اور فاتحہ خوانی کے جلسے وغیرہ اور قوالی و سماع تو جس صورت سے آجکل ہوتا ہے وہ تو علاوہ بدعت ہونے کے بہت سی محرمات و مکروہات پر مشتمل ہے۔

ف بدعت وہ نیا کام ہے جس کا ثبوت شریعت میں نہ ہو اور اس کو دین یا ثواب سمجھ کر کیا جائے۔ اگر دین یا ثواب سمجھ کر نہ کیا جائے تو بدعت نہیں۔ بس ریل اور تار اور موٹر اور ہوائی جہاز اور ہر قسم کے لباس اور مطعومات و مشروبات کا استعمال بدعت نہیں کیونکہ ان کو ثواب یا عبادت یا دین سمجھ کر استعمال نہیں کیا جاتا۔ (سیلون) کرسی بھر اور خاص مقدار اور خاص طرز و وضع کی سمایت یا تسبیح (اسی میں دکھنا بھی بدعت نہیں کیونکہ ان چیزوں کو ثواب سمجھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ بطور علاج و تدبیر کے اختیار کیا جاتا ہے۔ خوب سمجھ لو۔

ف مجتمع ہو کر دعا کرنا جو بدعت ہے اس سے وہ اجتماع مراد ہے جو محض دعا کے لئے ہو پس نماز کے فوراً بعد جو دعا کی جاتی ہے وہ بدعت نہیں کیونکہ اس میں دعا کے لئے اجتماع نہیں ہوتا بلکہ اجتماع تو نماز کے لئے ہوا تھا اسی حالت میں دعا بھی ہو گئی اور نماز کے بعد دعا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً و فعلاً ثابت ہے جیسا اعلاء السنن خصوصیہ میں بہت تفصیل کے ساتھ احادیث کثیرہ سے اس کا ثبوت دیا گیا ہے۔ پس نماز کے بعد سب لوگ تھوڑی دیر تک دعا کریں تو یہ صورت سنت کے خلاف نہیں سنت کے خلاف یہ طریقہ ہے کہ جماعت کی نماز ختم ہو جانے کے بعد لوگ نوافل وسنن میں مشغول ہو جاتے ہیں اور نوافل و سنن سے فراغت کے بعد محض دعا کے لئے اجتماع ہو جیسی کہ آجکل دعاے ثانیہ کہا جاتا ہے اور بلاد سواحل ہند میں اس کا بڑا التزام ہے سو یہ اجتماع جو محض دعا کے لئے ہوتا ہے خالص بدعت ہے۔

(۱۵۲) نماز میں کسی حادثہ کی طرف التفات کرنا خشوع کے منافی نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھتے ہوئے کوئی حادثہ پیش آجائے تو اسکی طرف التفات کرنا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کا بچہ کی آواز کو سننا اور اس (کے سبب) میں غور کرنا ایسی شے کی طرف التفات تھا جو نماز سے خارج ہے (مگر اس کا تعلق نمازیوں سے تھا اس لئے اس کی طرف التفات فرمایا گیا) مگر یہ (شرط) ضرور ہے کہ التفات معمولی ہو یا جس سے نماز کے ارکان وغیرہ میں خلل نہ آئے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نماز (اس حالت میں بھی) سب سے کامل تر تھی اگر یہ التفات آپ کو نماز سے مشغول کر دیتا تو آپ نماز کو کامل طور پر نہ ادا کر سکتے۔

"قولہ الوجہ الثامن فیہ دلیل علی ان الفکرۃ الی قولہ ما انتہا"

(۱۵۲) حکم شرعی میں غور کرنا بھی منافی خشوع نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت نماز کے اندر یا کسی اور عبادت میں مشغول ہوتے ہوئے حکم شرعی میں غور کرنا بھی جائز ہے بشرطیکہ عبادت کو باقی رکھ کر اس کے واجبات کو پورا کرتے ہوئے ایسا کرنا ممکن ہو (مطلب یہ کہ سرسری طور پر غور کرنا جس سے نماز کے ارکان و واجبات میں خلل نہ آنے پائے جائز ہے یہ نہیں کہ نماز میں ہدایہ اور بخاری کے اشکالات کو حل کرنے لگے) اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچہ کے رونے کی آواز سن کر نماز کو مختصر کر دیتے تھے حالانکہ عمل شروع کرنے کے وقت تطویل کا ارادہ تھا تو نماز کو مختصر کرنا بھی ایک عمل ہے جو حکم میں غور کرنے کا نتیجہ تھا پس یہاں چھ باتیں جمع ہو گئیں۔

(ایک تو) واقعہ کی طرف التفات

(دوسرے) حکم شرعی میں غور کرنا

(تیسرے) وہ عمل کرنا جو نماز میں ممکن تھا (یعنی نماز کو مختصر کر دینا)

(چوتھے) حق غیر (یعنی بچہ اور اس کی ماں کے حق کی رعایت)

(پانچویں) سد ذریعہ (کا اہتمام یعنی جس چیز سے فتنہ کا احتمال بھی ہو گو یقینی نہ ہو اس کو پہلے ہی سے روک تھام کیونکہ بچہ کے رونے سے اس کی ماں

کا پریشان ہونا لازم نہیں ممکن ہے کہ پریشانی پیش نہ آئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احتمال فتنہ کا بھی لحاظ فرمایا کہ احتیاط اسی کو مقتضی ہے اور اسی کا نام سد ذریعہ ہے جو اصول شرعیہ میں سے بڑی اصل ہے۔

چھٹے قوی کو احکام میں ضعیف کے تابع کر دینا جبکہ دونوں کسی کام میں ساتھ ساتھ ہوں۔ اسی کی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

سیروا بسیر اضعفکم   اپنے کمزوروں کی چال چلا کرو۔

قولہ الوجہ التاسع فیہ دلیل علی جواز النظر فی حکم من الاحکام الی قولہ سیروا بسیر اضعفکم

(۱۵۴) خیر میں توسط ہی سنت ہے

اس میں امت کے حال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و شفقت پر بھی دلالت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے کہ بعض دفعہ تخفیف و اختصار پر عمل کیا، تو ہوشیار محنت کرنے والا تو سنت کے اتباع کا پورا حصہ لے لیگا اور کمزور مسکین بھی اتباع سنت سے محروم نہ رہے گا وہ بھی کچھ حصہ لے لیگا اور تطویل و اختصار کے درمیان بہت وسعت ہے اور خیر میں توسط (درجۂ اوسط اختیار کرنا) ہی سنت ہے۔

قولہ الوجہ العاشر فیہ دلیل علی رحمتہ علیہ السلام بامتہ الی قولہ و توسط فی الخیر التی ہی السنۃ۔

(۱۵۵) دلداری اور دلجوئی تمام احوال سے اعلیٰ و ارفع ہے

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو دلداری اور دلجوئی کے بہت قائل ہیں اور وہ ان کے نزدیک تمام احوال سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ کی ماں کی اور خود بچہ کی پریشانی کی رعایت فرمائی اور اس کے لئے نماز کو مختصر کر دیا اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی دلجوئی بھی عبادت ہے جس

کے لئے نماز کو مختصر کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں ایک قید ہے جس کو بزرگوں میں سے خاص ہی لوگ جانتے ہیں وہ یہ کہ دلداری اور دلجوئی اس کی اس حالت کو کم نہ کر دے جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے یعنی دوسروں کی جوتیوں کی نگہداشت میں اپنی اشرفیوں کو برباد نہ کر دے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مخلوق کی دلداری اور دلجوئی میں اتنا مبالغہ نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا وقت ہی نہ ملے ہر وقت لوگوں کی خاطر مدارات میں ہی لگا رہے بلکہ ایک وقت ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں بجز اللہ تعالیٰ کے کسی پر توجہ نہ ہو، اس کی دلیل حدیث کا یہ لفظ ہے ولا اتم اور کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل تر نماز کسی کی نہ تھی کیونکہ اختصار کے بعد درجہ کفایت میں بھی آپ کی عبادت ناقص نہ ہوتی تھی۔ اسی لئے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ صوفی متبع سنت عجائبات زمانہ سے ہے۔

صوفی متبع سنت عجائبات میں سے ہے

یعنی صوفی کا متبع سنت ہونا بہت عجیب ہے کیونکہ صوفی پر اکثر حالات مختلفہ کا ورود ہوتا ہے۔ کبھی تجلی صفات جلالیہ ہے کبھی تجلی صفات جمالیہ ہے اور جب ایک قسم کی تجلی ہوتی ہے تو غلبہ اسی کا ہوتا ہے اس وقت دوسری صفات کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوتا اگر اس وقت یہ شخص اتباع سنت میں پختہ رہے اور تمام صفات کا حق ادا کرتا رہے تو واقعی بڑا کمال ہے اس مثال میں غور کرو کہ نماز کی حالت کا مقتضا تو یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی پر توجہ نہ ہو اور امامت کا مقتضا یہ ہے کہ مقتدیوں کی پریشانی کا بھی لحاظ کیا جائے گا۔ اس حالت میں کوئی صوفی مغلوب الحال امام ہو تو وہ مختصر نماز کا حق ادا کریگا۔ مقتدیوں کے حال پر التفات نہ کرے گا اور زاہد خشک امام ہو تو نماز میں ایسا اختصار کرے گا جس سے واجبات میں بھی خلل آجائے گا اور صوفی متبع سنت امام ہو تو نماز کو بھی کامل طور سے ادا کرے گا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی متوجہ رہے گا اور مقتدیوں کی رعایت سے نماز کو بھی مختصر کرے گا اور دونوں قسم کے حقوق کی نگہبانی آسان کام نہیں اس لئے صوفی کا متبع سنت ہونا بہت عجیب ہے۔ اور جو صوفی

ایسا ہو وہ اپنے وقت کا قطب اور عالم وجود کا تاج ہوگا اور یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو بھی وہ دولت عطا فرمائیں جو ان کو اپنے احسان سے عطا فرمائی ہے۔

قولہ الوجہ الحادی عشر فیہ دلیل لاھل الصوفیۃ الذین یقولون بجبر القلوب الی قولہ من اللہ بفضلہ علینا بما من بہ علیہم جمیعہ

ف الحمد للہ کہ ہمارے اکابر حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ و حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ و حضرت حکیم الامت دام مجدہم کے سب باوجود صوفی اور صاحب احوال رفیعہ ہونے کے بدرجۂ کمال متبع سنت تھے اور یہی ان کا وہ کمال ہے جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی اور اسی وجہ سے ناواقف لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات تو نرے علماء ہیں صوفی نہیں کیونکہ عوام کے نزدیک صوفی وہی ہے جو مغلوب الحال ہو اور صوفی متبع سنت مغلوب الحال نہیں ہوتا بلکہ غالب علی الاحوال ہوتا ہے وہ ہر حالت میں اتباع سنت سے ایک قدم ہٹنا گوارہ نہیں کرتا، اسی لئے یہ حضرات اپنے وقت کے قطب الارشاد اور مجدد ہیں ؎

بکفے جام شریعت بکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

من اللہ تعالیٰ بفضلہ علینا بما من بہ علیہم جمیعہ

ف نماز میں تخفیف اور تطویل کی تحقیق

نماز کی تخفیف کبھو تو قرأت کو مختصر کرنے سے ہوتی ہے اور کبھی تمام ارکان میں اختصار کرنے سے ہوتی ہے بشرطیکہ ایسا اختصار نہ ہو جس سے ارکان میں خلل واقع ہو جائے ورنہ نماز ہی نہ ہوگی یا ناقص ہوگی اور حدیث میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز باوجود تخفیف ہونے کے کامل و اکمل ہوتی تھی اس جگہ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تخفیف صلوٰۃ کو آج کل کی تخفیف پر قیاس نہ کرنا چاہئے کیونکہ حضرات صحابہ اور سلف سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت شروع کرتے تو آدمی

بقیع تک جا کر واپس بھی ہو جاتا تھا اور آپ پہلی ہی رکعت میں ہوتے تھے۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ صبح کی نماز میں بعض دفعہ سورۂ بقرہ دو رکعت میں پڑھتے تھے اور بعض صحابہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سورۂ یوسف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سُن کر یاد کی تھی کیونکہ وہ اکثر صبح کی نماز میں اس کو پڑھتے تھے اور موطا امام مالک میں ام الفضل بنت الحارث سے روایت ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے سورہ والمرسلت سنی تو فرمایا بیٹا تم نے یہ سورت پڑھ کر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت یاد دلادی کیونکہ یہ آخری سورت ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مغرب کی نماز میں سُنی تھی (اس کے بعد میں نے حضور کی قرأت نہیں سُنی) اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کی عادت نماز میں تطویل قرأت تھی اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کیونکہ صحابہ سے زیادہ متبع سنت کون ہو سکتا ہے مگر اس تطویل کو وہ تخفیف فرماتے ہیں کیونکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کے عاشق تھے ان کو تطویل قرأت گراں نہ تھی البتہ اگر کوئی عارض پیش آجاتا مثلاً بچہ رونے لگتا اور کوئی حادثہ پیش آجاتا تو اس عادت مستمرہ کو چھوڑ کر قرأت میں تخفیف کر دی جاتی تھی۔ پس تخفیف صلوٰۃ کا حاصل یہ ہوا کہ موقع اور وقت کے مناسب قرأت کی جائے۔ اگر حالت اطمینان اور سکون کی ہو تو قرأت طویل کی جائے اور اس میں بھی مقتدیوں کی حالت کی رعایت کی جائے کہ اتنی تطویل نہ ہو جو نمازیوں پر گراں گذرے اور اگر حالت بے اطمینانی اور پریشانی کی ہو تو اس حالت کے مناسب قرأت کی جائے۔ مگر کسی حالت میں بھی واجبات میں خلل نہ ڈالا جائے گا۔ دین کے سب کاموں میں قاعدہ یہی ہے کہ ہر عمل کو درجۂ کمال پر ادا کیا جائے۔ ادنیٰ درجہ پر بدون کسی عذر کے کفایت نہ کی جائے اور ادنیٰ درجہ پر کفایت کرنے میں بھی واجبات میں خلل نہ ڈالا جائے۔

حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو لیٹے وقت

میں عام مانا جاتا اور مقتدا تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں بعض ایمان کے واجبات بھی پوری طرح ادا نہ کرتا تھا۔

فَاِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

افسوس علم بھی ضائع ہوگیا اور اس کی حقیقت بھی ناپید ہوگئی عمل بھی برباد ہوگیا اور اس کی تکمیل بھی جاتی رہی اسی لئے سیدنا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو مکروہات میں اس بات نے مبتلا کیا ہے کہ انہوں نے الفاظ شرعیہ کو ان معانی پر محمول کر لیا جو پہلے زمانہ میں معروف نہ تھے۔ چنانچہ آج کل ہم نماز میں تخفیف کرتے ہیں تو حد جواز ہی سے نکل جاتے ہیں کیونکہ ہماری لمبی نماز بھی ادنیٰ درجہ سے زیادہ نہیں ہوتی تو جب اس میں کمی کی جائے گی تو لامحالہ حد جواز سے نکل جائیں گے۔ بس نماز کی تکمیل اور تخفیف کی مقدار کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی نظر تمام احادیث پر ہو اور حضرات فقہاء رضی اللہ عنہم نے کتب فقہ میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس کو اتباع سنت کا شوق ہو اس کو کتب فقہیہ واجبات و فروض و سنن و مستحبات صلوٰۃ معلوم کر لینا چاہیئے تاکہ تخفیف کے وقت سنن و مستحبات میں اختصار کیا جا سکے واجبات و فروض میں خلل نہ ڈالا جائے۔

وهٰذا ما صانبه علیہ الشارح رحمہ اللہ فی الوجه الاول والثانی علیہ اجمع

ف یہاں سے ان صوفیوں کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو ہر حالت میں اپنے معمول ہی پر جمے رہتے ہیں کسی حال میں اس کو ترک نہیں کرتے سفر میں بھی نماز لمبی کرتے ہیں خواہ قافلہ چلنے والا ہو یا ریل چھوٹنے والی ہو اور مقتدی وقت کی تنگی سے پریشان ہوں مگر امام صاحب ہیں کہ طوال مفصل کو نہیں چھوڑ سکتے اور نماز کے بعد وظیفہ کو بھی

ضرور پورا کریں گے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا غلو شریعت میں ناپسندیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ سفر میں قُل اعوذ برب الفلق اور قُل اعوذ برب الناس سے صبح کی نماز پڑھائی ہے حالانکہ صبح کی نماز میں آپ کی عادت تطویل قرأت کی تھی مگر آپ نے ہمیشہ موقع اور وقت کے مناسب عمل کیا ہے جس سے کسی پر گرانی نہ ہو۔ خوب سمجھ لو۔ ✗



باب چہل و چہارم

حدیث

افضل صلوٰۃ التراویح

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینہ میں مسجد کے اندر ایک حجرہ سا بنوایا جو غالباً بوریہ کا تھا جس میں آپ نے چند راتوں میں نماز پڑھی تو آپ کی نماز کے ساتھ کچھ لوگوں نے صحابہ میں سے نماز پڑھی جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ (نماز سے) بیٹھنے لگے (یعنی اس وقت نماز پڑھنا چھوڑ دیا) پھر آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے جو کچھ تم کو کرتے دیکھا میں اس کو سمجھ گیا ہوں (کہ تم کو میرے ساتھ نماز پڑھنے کا شوق ہے) سو اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو کیونکہ انسان کی افضل نماز وہی ہے جو گھر میں ہو سوائے مکتوبہ (یعنی فرض نماز) کے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ نفل نماز مسجد میں پڑھنا جائز ہے اور افضل یہ ہے کہ نفل نماز گھر میں پڑھے، اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۵۶) اسبابِ دلجمعی کا اہتمام کرنا چاہیئے اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں حجرہ بنا لینا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ عمارت کے طور پر نہ ہو نہ ایسی چیز سے بنا ہو جس کو بقاء و دوام ہو اس کی دلیل حدیث کا یہ لفظ ہے کہ آپ نے بوریہ کا حجرہ بنوایا تھا کیونکہ حجرہ تعمیر کرنے میں مسجد کی تغییر ہے اور مسجد وقف ہے اس کی تغییر جائز

نہیں۔ نہ بوریہ یا کپڑے سے حجرہ بنانے میں مسجد اپنے حال پر رہے گی اس میں تغیر نہ ہوگا اور کپڑا وغیرہ ڈالنے سے خلوت تام رہے گی اور عبادت اچھی طرح ہوگی کیونکہ اس سے عبادت میں دلجمعی زیادہ ہوگی (جو روح عبادت ہے) اور اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ انسان کو وہ اسباب اختیار کرنا چاہئیں جن سے عبادت میں دل جمعی زیادہ ہو بشرطیکہ وہ اسباب بدعت (میں داخل) نہ ہوں ورنہ ممنوع ہوں گے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ جل جلالہ قیامت کے دن صاحب بدعت سے فرمائیں گے اچھا اگر میں ان گناہوں کو بخش دوں جو میرے اور تیرے درمیان ہیں تو جن لوگوں کو تو نے گمراہ کیا ہے ان کے ساتھ کیا کروں؟ (یعنی ان کا حق کیونکر معاف کر دوں اور یہ گناہ کیسے بخش دوں کہ تو نے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہ کیا ہے کہ یہ گناہ تو متعدی ہے جس کے ساتھ حق العباد متعلق ہے اور حق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک بندے معاف نہ کریں اور وہاں اپنا حق کون چھوڑنے والا ہے۔ وہ تو سب اس کی جان کو آجائیں گے کہ تو نے ہم کو گمراہ کیا)۔

قوله الوجه الاول جواز اتخاذ الحجرة فى المسجد الى قوله فالذين اضللت كيف افعل بهم۔

ف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں جو بوریہ کا حجرہ بنوایا تھا یہ زمانۂ اعتکاف میں خلوت کے لئے تھا، چنانچہ اب بھی اعتکاف کرنے والے کپڑا لٹکا کر اپنے لئے جگہ مخصوص کر لیتے ہیں مگر جماعت کی نماز کے وقت ان کپڑوں کو اٹھا دینا چاہیئے تاکہ جماعت میں تنگی نہ ہو اور صفوف میں انقطاع نہ ہو۔

اس حدیث میں صوفیہ کی خلوت نشینی کا ثبوت ہے کہ وہ بھی دل جمعی کے لئے خلوت اور چلہ کشی اختیار کرتے ہیں۔

ف بدعت کی مذمت یہاں سے بدعت کا وبال بھی معلوم ہوا کہ اس میں نہ صرف اللہ کی اضاعت نہیں بلکہ حق العباد کی بھی اضاعت ہے اور حق العباد کا وبال بہت سخت ہے پس صوفیہ مبتدعین

کو عبث حاصل کرنا چاہئے اور سماع و عرس وغیرہ سے توبہ کرنا چاہئے کہ عوام ان کو عبادت اور ثواب سمجھ کر کرتے ہیں اور صوفیہ نما اپنے قول و فعل سے ان بدعات کو رواج دے رہے ہیں۔

ونفعنا اللہ وایاکم لاتباع السنۃ السنیۃ فی الاعمال والاقوال کلہا الخفیۃ منہا والجلیۃ آمین

(۱۵۷) ایام محترمہ کی تعظیم بطریقہ یہ ہے کہ ان میں عبادت زیادہ کی جائے

اس میں رمضان کی افضلیت کی بھی دلیل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مہینوں میں سے اسی مہینہ کو اس عبادت کیساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ نیز اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایام محترمہ اور مکانات محترمہ کی تعظیم کا طریقہ یہی ہے کہ انواع عبادات کے ذریعہ ان کی عظمت ظاہر کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ کی عظمت کو اسی طرح ظاہر فرمایا ہے کہ اس میں عبادات کو بڑھا دیا۔

قولہ فی الاجمع خاص فیہ دلیل علی افضلیۃ رمضان الی قولہ فی الاوہ السادس الا بزیادۃ فی التعبدات

ف حضرات صوفیہ کو رمضان کا اور جملہ ایام محترمہ کا جس قدر اہتمام ہے ظاہر ہے اور وہ بھی ان کی تعظیم عبادات میں زیادت سے ہی کرتے ہیں عوام کی طرح جلسے اور جلوس وغیرہ سے نہیں کرتے جیسا آجکل ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد منائی جاتی ہے کہ یہ سراسر بدعت ہے حضرات صوفیہ اس دن میں درود شریف کی کثرت کرتے ہیں بعضے روزہ بھی رکھتے ہیں۔

(۱۵۸) تراویح رمضان کی اصل تعظیم شعائر اللہ سے ہے اس حدیث سے سیدنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ جب آپ نے دیکھا کہ

اللہ تعالیٰ شانہ کو ان راتوں کی عظمت ظاہر کرنے کا اہتمام ہے کہ جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں بحکم خداوندی آپ کے پاس قرآن کا دور کرنے کو تشریف لاتے تھے رمضان کے سوا کسی مہینہ میں وہ دور کے لئے نہ آتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے بھی اس کی تعظیم میں یہ زیادتی کی کہ اس مہینہ میں ایک خاص نماز بڑھادی جو دوسرے مہینوں میں نہیں بڑھائی اور اس کو عملاً امت پر ظاہر بھی کر دیا تاکہ وہ بھی آپ کی اقتدا کریں اسی کا نام تعظیم شعائر ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں

ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من التقوی القلوب

اور جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ تعظیم دلوں کے تقویٰ سے (ناشی) ہوتی ہے اور جتنا تقویٰ دلوں میں ہوگا اسی قدر فضیلت ہوگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی متقی نہیں ہو سکتا پس آپ کی برابر شعائر اللہ کی تعظیم بھی کوئی نہیں کر سکتا، اور اس میں ایک صوفیانہ اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ جو صاحب حال احکام کے اتباع میں پختہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ

عارف کامل ہمیشہ تجلی میں رہتا ہے

تجلی اور مشاہدہ میں ہی رہتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلاوتِ قرآن کے وقت یہی حال تھا جب آپ رحمت کی آیت پر گذرتے اللہ تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے اور جب عذاب کی آیت پر گذرتے (جس میں کفار پر عذاب کا ذکر ہوتا) تو پناہ مانگتے اور جب ایسی آیت پر گذرتے جو اللہ تعالیٰ کی صفت پر دلالت کرتی ہے جیسے خالق ہونا قادر ہونا باعظمت ہونا تو اللہ کی پاکی بیان کرتے، غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس آیت پر گذرتے اسی حالت سے رنگ جاتے تھے جو اس آیت کے مخاطب کی حالت ہونا چاہیے اور وہی جواب دیتے جس کا ادب تقاضا کرتا اور اسی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تعلیم دی ہے چنانچہ جب آپ نے اُن کے سامنے سورۂ رحمٰن پڑھی اور وہ خاموش رہے تو آپ نے فرمایا تم وہ بات کیوں نہیں کہتے جو جنوں نے سورۂ

رحمٰن کو سنتے ہوئے کہی تھی۔ صحابہ نے عرض کیا، انہوں نے کیا کہا تھا فرمایا جب میں فبای آلاء ربکما تکذبان پڑھتا تھا کہ تم اللہ کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے، تو وہ کہتے تھے لا بشیء من نعمک ربنا نکذب یعنی اے پروردگار ہم کسی نعمت کا بھی انکار نہیں کرتے۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تعلیم اور خوبی ارشاد کو پیش نظر رکھو تو بارگاہ ربوبیت کا ادب اچھی طرح بجا لا سکو گے اگرچہ اللہ تعالیٰ کو بوجہ غنا اور جلال کے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں، مگر بندہ کو تو اس کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ادب پوری طرح بجا لائے کہ ایمان کی علامت یہی ہے اور ایمان کا نفع بندہ ہی کو پہنچے گا)

قولہ الوجہ السابع یوخذ منہ فضل سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم الی قولہ فالوجہ الرابع عشر مع غناۂ عن الکل وجلالہ وانما قرنت بین الوجہ السابع والرابع عشر لکون الثانی مرتبا علی الاول عندی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۲ مترجم

تراویح سنت ہے، بدعت نہیں

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ تراویح کی نماز رمضان میں باجماعت بدعت نہیں بلکہ سنت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً اس کا ثبوت مل چکا ہے پھر سنت ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کی جماعت کو دیکھ کر نعمت البدعة ھذہ (یہ بدعت بہت اچھی ہے) فرمانا سو آپ نے لغت کے اعتبار سے اس کو بدعت فرمایا ہے نہ کہ شرعاً کیونکہ حضرت عمرؓ نے صرف اتنی بات جدید کی تھی، کہ لوگوں کو ایک امام پر جمع کر دیا تھا پہلے مختلف قاریوں کے پیچھے ایک ایک جماعت اقتداء کرتی تھی۔ غرض تراویح کی نماز باجماعت حضرت عمر کے اس فعل سے پہلے بھی قائم تھی۔ پھر اس کو شرعاً بدعت کیونکر کہا جا سکتا ہے البتہ یہ ہیئت اور صورت دیکھنے میں جدید تھی کہ سب لوگ ایک مسجد میں ایک ہی امام کے پیچھے تراویح پڑھیں تو لغت کے اعتبار سے اس کو بدعت کہنا صحیح تھا۔

دیا ہے کہ جب نوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کی یہ نماز مسجد میں کیوں پڑھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ نماز تراویح کا مسجد ہی میں پڑھنا افضل ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں کے بعد تراویح کی جماعت کو اس لئے ترک فرما دیا کہ دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہو جائے پھر تم اس کو نباہ نہ سکو، اور یہ اندیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جاتا رہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے افضل پر عمل کیا اور تراویح کی نماز باجماعت اہتمام کے ساتھ مسجدوں میں قائم کی جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ان کو معلوم ہو چکا تھا اور اس سے یہ فقہی مسئلہ معلوم ہوا کہ جب کسی فعل سے کسی خاص علت کی وجہ سے منع کیا جائے تو علت کے مرتفع ہو جانے سے ممانعت بھی زائل ہو جائے گی اور وہ فعل جائز ہوگا۔

وھذا مما نبہ علیہ الشارح فی الوجہ الثانی

(۱۵۸) بعض دفعہ مفضول افضل ہو جاتا ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض دفعہ مفضول افضل اور ادنیٰ کام اعلیٰ ہو جاتا ہے جب کوئی علت اس کو مرتفع کرنیوالی پائی جائے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں کے بعد اس وقت کی عبادت کو موقوف فرما دیا حالانکہ اس وقت کی عبادت افضل تھی مگر چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عبادت کو موقوف کرنا تعلیم کے لئے تھا اور تشریع احکام بہت بڑی عبادت ہے تو اس علت کے بڑھ جانے کی وجہ سے مفضول فاضل اور ادنیٰ عمل اعلیٰ ہو گیا۔

قولہ الوجہ العاشر فیہ دلیل علی ان المفضول قد یرجع فاضلا الی قولہ رجع المفضول فاضلا

ف: بعض دفعہ مشائخ طریق بھی کسی خاص وجہ سے غیر افضل پر عمل کرتے ہیں جس سے ناقصین کو وہم ہوتا ہے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو افضل پر عمل نہیں کرتے حالانکہ اگر وہ اس علت کو جان لیتے جس کی وجہ سے غیر افضل کو اختیار کیا گیا تھا۔

تو معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہی افضل تھا۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۱۵۹) بقدر ضرورت دنیا حاصل کرنا جائز ہے حدیث سے معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت دنیا حاصل کرنا جائز ہے اور وہ آخرت کے لئے سامان کرنے میں معین بھی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فصلوا ایھا الناس فی بیوتکم اے لوگو اپنے گھروں میں نماز پڑھو۔ اگر گھر بنانا جائز نہ ہوتا تو حضور یہ نہ فرماتے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھو۔ گھروں کی اضافت صحابہ کی طرف فرمانا اس کو مقتضی ہے کہ صحابہ نے گھر بنا رکھے تھے اور گھر بنانا جائز ہے اور ان سے آخرت کے کاموں میں مدد ملتی ہے کیونکہ آدمی ان میں خلوت کیساتھ عبادت کرتا اور اپنے معبود سے مناجات کرتا ہے جس میں کوئی تشویش اور پریشانی مخل نہیں ہوتی اور کیونکہ اپنے گھر کے برابر دوسری جگہ سکون و اطمینان نہیں مل سکتا اسی طرح اور جتنی ضروریات بشریہ ہیں (جیسے ذرائع کسب و معاش و نکاح و غیرہ) اگر وہ شریعت کے موافق ہوں اور ان سے مقصود طاعات میں امداد ہو اور یہ قصد حالاً ہو محض زبانی دعویٰ نہ ہو تو وہ سب بھی حقیقت میں آخرت محمودہ میں داخل ہیں

قولہ الوجہ الخامس عشر فیہ دلیل علی جواز اخذ مالا بد منہ من الدنیا الی قولہ فاسہ فی الحقیقۃ کلہا اخرۃ محمودۃ۔

(۱۶۰) حالت کا اخفا رہی افضل و اکمل ہے اس میں اہل تصوف کی بھی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ حالت کا اخفا ہی اکمل و افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان کی افضل نماز وہ ہے جو وہ اپنے گھر میں پڑھے بجز فرض نماز کے اور فرض کے بعد نوافل کا زیادہ کرنا ایمان میں زیادتی کا سبب ہے جیسا ابن ابی زید رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایمان اعمال کی زیادتی سے زیادہ ہوتا ہے اور اعمال کی کمی

سے ناقص ہوتا ہے۔ غرض اعمال ہی سے ایمان میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے اور ایمان کی زیادتی بہت بڑی حالت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کا اخفاء افضل ہے تو جو تفسیر ہم نے کی تھی وہ درست ہو گئی کہ حالات کا اخفاء ہی اکمل ہے، اور بعض بزرگوں کا ارشاد ہے کہ اپنے دل کو اسرار کا اور اپنے مولیٰ کا خزانہ بناؤ۔ شکایت کا خزانہ نہ بناؤ (یعنی اللہ کی تقدیر سے دل میں گرانی اور شکوہ نہ لاؤ۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں اور ہم کو بھی وہ دولت عطا فرمائیں جس سے ان پر فضل ہوا ہے، اللہ کے سوا کوئی رب نہیں نہ ان کے سوا کسی سے امید کی جا سکتی ہے وہی فضل فرمائیں گے تو کام بنے گا) قوله الحجة التاسع عشر بيه وسيل لاهل الصوفة الى قوله لا رب سواه ولا مرجو الا اياه

ف اہل اللہ فرائض کے سوا اپنے تمام اعمال واحوال کے اخفاء کا اہتمام فرماتے ہیں اور جن سے اظہار ہوا ہے وہ یا غلبہ حال سے ہوا ہے یا کسی مصلحت سے تاکہ ان کے اصحاب ان اعمال واحوال میں ان کا اتباع کریں یا اما بنعمة ربك فحدث کا امتثال کرتے ہوئے تحدیث نعمت کے طور پر اظہار فرمایا ہے۔

صوفیہ قلندریہ کو اخفاء حال کا اس وجہ اہتمام ہوتا ہے کہ وہ تکثیر نوافل کے بجائے ذکر خفی اور ذکر قلبی زیادہ کرتے ہیں جس کی اطلاع فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی اور پہلے گذر چکا ہے کہ ذکر قلبی ذکر لسانی سے افضل ہے اور ذکر اللہ بہت بڑا عمل ہے۔

ولذكر الله اكبر ۱۲ مترجم



باب چہل و پنجم

حدیث

جواز المشی فی الصلوٰۃ

ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (نماز میں) اس وقت پہنچے جب آپ رکوع میں تھے تو انہوں نے صف میں ملنے سے پہلے ہی رکوع کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ کھسک کر صف میں جا ملے نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کو بیان کیا تو آپ نے فرمایا اللہ تم کو زیادہ شوق دے پھر ایسا نہ کرنا۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ نماز میں تھوڑا سا چلنا جائز ہے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۶۱) **شوق کا زیادہ ہونا معین عبادت ہے،** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد زادک اللّٰہ حرصا ولا تعد میں صحابی کے لئے زیادہ حرص و شوق کی دعا ہے جس کا مطلب ہے کہ اللہ تم کو اعلیٰ عبادات کی طلب میں کوشش کا زیادہ شوق دے کیونکہ اگر وہ اسی جگہ نماز پڑھ لیتے جہاں نیت باندھی تھی تو نماز درست ہو جاتی مگر صف اول کا درجہ بہت بلند ہے اور اس میں بھی وہ جگہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب ہو، زیادہ افضل ہے تو صحابی نے تمام صفوں سے افضل صف اور اس میں بھی سب سے زیادہ افضل جگہ لینی چاہی، اس سے یہ علی

ف: اس سے معلوم ہوا کہ شوق کا زیادہ ہونا ہی عبادات پر برانگیختہ کرتا ہے اور یہ دلیل ہے صوفیہ کی جو یہ فرماتے ہیں کہ مردوں کو ہمت ہی نے اعمال پر آمادہ کیا ہے۔ ابدان نے اور جسمانی قوت نے آمادہ نہیں کیا۔

مردان طریق کو ہمت نے ہی آمادہ کیا ہے

قوله الوجه الثاني قوله صلى الله عليه وسلم زادك الله حرصا ولا تعد الى قوله انما حملت الرجال الهمم لا الابدان

ف: اس ہمت عالیہ کا اثر یہ ہے کہ اللہ والے بڑھاپے میں بھی جوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں جس کا اندازہ ان کے پاس بیٹھنے سے ہوتا ہے

(۱۶۲) کام سے پہلے اس کا اہتمام کرو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لا تعد (پھر ایسا نہ کرنا) کا مطلب یہ ہے کہ پھر نماز میں اتنی دیر نہ کرنا کہ صف اول تک پہنچنے کے لئے نماز میں چلنے کی ضرورت ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تکمیل عمل کے لئے مستحب یہ ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے اس کا اہتمام کیا جائے۔ مثل مشہور ہے قبل الرمی تراش السھام تیراندازی سے پہلے تیروں کے پر درست کئے جاتے ہیں۔

قوله ولا تعد اي لا تعد للتاخير الى قوله في الوجه الثالث تراش السهام.

(۱۶۳) بدون طلب کے بھی کسی کو دعا دینا جائز ہے

حدیث میں یہ بھی ہے کہ کسی کو دعا دینا اگرچہ اس نے درخواست بھی نہ کی ہو جائز ہے جبکہ وہ دعا کا اہل ہو کیونکہ اس سے اس کام میں اعانت ہوگی جس میں وہ لگا ہوا ہے چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرہ کو دعا دی حالانکہ انہوں نے درخواست نہ کی تھی کیونکہ آپ نے ان کے اندر آثار خیر ملاحظہ فرمائے تھے پھر آپ نے ان کو ایسی دعا

(۵) جو سراسر خیر تھی کہ خدا تم کو نیک اعمال کا زیادہ شوق دے یہ نہیں فرمایا کہ خدا کرے تم دوبارہ ایسا نہ کرو کیونکہ حضور کی ہر دعا مستجاب ہے، تو اس دعا میں یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ کسی وقت جماعت ہی سے رہ جائیں، اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ کسی کو کوئی دعا اپنے واسطے یا کسی کے واسطے اس وقت تک نہ کرنا چاہیئے جب تک یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ سراسر خیر ہی خیر ہے۔

قوله الوجه الخامس يوخذ منه الدعاء للشخص الى قوله سواء كان لنفسه او لغيره .

(۱۴۴) دلجوئی اور دلداری کا ثبوت

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو جبر قلوب کے قائل ہیں یعنی دلداری خلق اور دلجوئی کو عبادت سمجھتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو دعا دی کیونکہ ان کے نزدیک سب سے بڑی خوشی یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دعا دیں غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ صحابی کا دل اس وجہ سے کہ اس نے اپنی رائے سے بغیر حکم شرعی معلوم کئے ایک عمل کر لیا شکستہ ہو رہا ہے تو آپ نے خوشخبری سنا کر اس کے دل کو جوڑ دیا۔

قوله الوجه السابع فيه دليل لاهل الصوفة الى قوله وهو لا يعلم ما حكم الشرع فيه .

ف حضرات صوفیہ کو عمل مشروع کا سنت ہے اس کا جس قدر اہتمام ہوتا ہے ظاہر ہے اسی طرح ان کی یہ بھی عادت ہے کہ اپنے دوستوں میں سے جس کو اہل سمجھتے ہیں دعاؤں سے نوازتے رہتے ہیں گو وہ درخواست بھی نہ کریں اور شکستہ دلوں کا جوڑنا تو ان کا خاص حصہ ہے ۱۲ مترجم

باب چہل و ششم

حدیث

وجوب توفیۃ ارکان الصلوٰۃ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اس نے نماز پڑھی پھر آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دے کر فرمایا واپس جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے پھر نماز پڑھی پھر آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا آپ نے فرمایا واپس جاؤ پھر نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تین بار اسی طرح ہوا تو اس نے عرض کیا قسم اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا میں اس سے اچھی نماز پڑھنا نہیں جانتا مجھے آپ بتلا دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو۔ پھر تم کو جتنا قرآن یاد ہو اس میں سے جتنا آسان ہو پڑھو پھر رکوع کرو یہاں تک کہ رکوع میں اطمینان سے جھکے رہو پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ میں رہو پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ میں رہو پھر تمام نماز میں اسی طرح کرتے رہو۔

شرح ظاہر حدیث نماز کے جملہ ارکان قیام اور رکوع وغیرہ کو پوری طرح بجالانے کو واجب کرتا ہے اور جو ایسا نہ کرے اس کی نماز

درست نہ ہوگی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۶۵) عمل کا بار بار تکرار کرنا بذل تکمیل عمل کے بیکار ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک عمل کو اچھی طرح نہ کیا جائے بار بار دہرانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس شخص نے تین مرتبہ نماز کو دہرایا اور ہر دفعہ حضور نے یہی فرمایا کہ واپس جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔

قوله الوجه السابع فيه دليل على ان تكرار العمل الى قوله لم تفصل ثلاثا۔

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو نفلیں تو بہت پڑھتے ہیں مگر نماز میں بہت جلدی کرتے ہیں ارکان کو اطمینان سے ادا نہیں کرتے، ارکان کو اطمینان سے ادا کرنا جمہور علماء کے نزدیک فرض ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے ۱۲ ظ

(۱۶۶) جب تک سوال نہ کیا جائے مسئلہ بتلانا واجب نہیں

اس میں ان لوگوں کی بھی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ عالم کے ذمہ مسئلہ بتلانا اس وقت تک واجب نہیں جب تک اس سے سوال نہ کیا جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک اس کو نہیں بتلایا جب تک اس نے یہ نہیں کہا کہ یا رسول اللہ مجھے بتلا دیجئے۔

قوله الوجه الثامن فيه دليل لمن يقول الى قوله حتى قال علمني

ف بعض حضرات صوفیہ کا معمول یہی ہے کہ جب تک ان سے دریافت نہ کیا جائے اس وقت تک خود مسئلہ نہیں بتلاتے۔ یہ حدیث ان کی حجت ہے۔

(۱۶۷) محض احتمال کی بنا پر حکم نہ لگانا چاہیئے حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر محتمل پر کوئی حکم

نہ لگایا جائے جب تک اس کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر نہ کوئی تنقید کی نہ اس کو ملامت کی بس یہی فرمایا کہ واپس جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی کیونکہ احتمال تھا کہ اس نے پوری طرح نماز کے ارکان کو اس لئے ادا نہ کیا ہو کہ دل کی پریشانی اور مشغولی کی وجہ سے بھول ہو گیا یا جہل کی وجہ سے ایسا کیا ہو جیسا بعد میں اس نے ظاہر کیا غرض احتمال کی وجہ سے آپ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں فرمایا کہ نماز کے صحیح نہ ہونے کی اس کو اطلاع کر دی۔

قولہ الوجہ التاسع یؤخذ منہ ان لا یحکم بشئ محتمل الی قولہ ثم لم یزد علیہ السلام علی الاخبار بعدم الاجزاء شیئا

ف اس ادب کی رعایت صوفیہ کاملین ہی کرتے ہیں ورنہ لوگ عام طور سے احتمال ہی پر حکم لگا دیتے ہیں۔

(۱۶۸) عبادت میں مشغول ہونے والے کو دیکھنا جائز ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت میں مشغول ہونے والے کی طرف دیکھنا جائز ہے البتہ اگر اس کے سامنے بیٹھا ہو تو نہ دیکھے کیونکہ آگے بیٹھنے والا اگر سامنے سے دیکھے گا تو اس سے عبادت کرنے والے کو تشویش ہوگی (اس کا دل بٹے گا) علماء نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اس حالت میں اس کی طرف سے منہ پھیرلے غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس شخص سے یہ فرمایا کہ واپس جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی اس سے معلوم ہوا کہ جب تک وہ نماز پڑھتا رہا حضور اس کو دیکھتے رہے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کو اس کی نماز کا حال معلوم نہ ہو سکتا۔

ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحت لوگوں کے اعمال کی نگہداشت کرنا چاہئے

اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ ہر نگران کو ان لوگوں کی دینی حالت پر نظر

دیکھنا چاہئے جو اس کی نگرانی کے تحت میں ہیں کیونکہ ان کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی
اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال و حکام کے نام ایک خط میں لکھا تھا
ان اھم امورکم عندی الصلوٰۃ مجھے تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ نماز کا
فکر ہے کہ تم اس کی پوری پابندی کرتے ہو یا نہیں،

ف کسی معتبر کتاب میں میں نے دیکھا ہے جس کا نام یاد نہیں رہا غالباً کنز العمال
میں دیکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ میں جب
معتبر اہل شخص کو کوئی عہدہ دیتا ہوں تو کیا یہ کافی ہے کہ عہدہ دینے سے پہلے اس
کی اہلیت یا قت دیانت و امانت کی تحقیق کر لوں پھر میں سبکدوش ہوں یا
مجھے عہدہ دینے کے بعد اس کے کام کی تحقیق بھی کرنا چاہئے کہ جیسا میرا گمان تھا
وہ ویسا ہی ثابت ہوا یا اس کے متعلق میرا گمان غلط نکلا۔ سب نے جواب دیا کہ
عہدہ دینے سے پہلے پوری طرح تحقیق کر لینا کافی ہے اس کے بعد آپ
سبکدوش ہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ جواب صحیح نہیں بلکہ مجھے اس کے کام کی تحقیق بھی
کرنا چاہئے کہ جیسا میرا گمان تھا اس نے اسی طرح کام کا حق ادا کیا یا میرا گمان
اس کے متعلق غلط ثابت ہوا بدون اس کے میں سبکدوش نہ ہوں گا۔ محققین صوفیہ
کا بھی یہی خیال ہے کہ جس کو کوئی خدمت سپرد کی جائے اس کے اعمال کی جانچ بھی
کرنا چاہئے کہ جو خدمت اس کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کا اہل ثابت ہوا یا نہیں۔

(۱۶۹) صحابہ میں تکلف اور تصنع نہ تھا

اس حدیث سے صحابہ کی فضیلت اور ان کی بے تکلفی بھی معلوم ہوئی
کہ ان میں بناوٹ اور تصنع نام کو بھی نہ تھی چنانچہ ان صحابی نے بے تکلف کہہ دیا کہ
والذی بعثک بالحق ما احسن غیرہ فعلمنی قسم اس کی جس نے آپ کو حق کے
ساتھ بھیجا ہے میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا آپ مجھے بتلا دیجئے، اس نے
تواضع سے کہہ دیا اور صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ قسم سے کلام کو مؤکد کیا اور علماءُ

نے فرمایا ہے کہ طالب علم مقصود دو وجہوں سے محروم رہتا ہے یا تکبر کی وجہ سے یا شرم کی وجہ سے کیونکہ دین میں تکبر یا شرم کا کام نہیں نہ حق بات کہنے میں نہ اس کے بتلانے میں نہ معلوم کرنے میں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

نعم النساء نساء الانصار لم یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین

انصار کی عورتیں بہت اچھی عورتیں ہیں ان کو مسائل دین کے دریافت کرنے میں حیا و شرم مانع نہیں ہوتی۔

قولہ الوجہ الثانی عشر فیہ دلیل علی فضل الصحابۃ الی قولہ ان یتفقھن فی الدین۔

(۱۷۰) نفس کشی کا ثبوت اور اس کا مطلب

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ نفس کو مارنا چاہیئے کیونکہ نفس کے عیوب ظاہر کرکے اس کو رسوا کرنا بھی موت ہے اور نفس کی موت ہی اسکی حیات ہے سے

موت النفوس حیاتھا من احب ان یحیا یموت

نفسوں کا مرنا ہی ان کی زندگی ہے، جو زندہ رہنا چاہے اسے پہلے مرنا چاہیئے۔ قولہ الوجہ الثالث عشر فیہ دلیل لاھل الصوفۃ الی قولہ من احب ان یحیا یموت

ف نفس کا مارنا یا نفس کشی تصوف کی اصطلاح میں تکبر، دعویٰ، عجب، پندار، خود رائی و خود بینی زائل کرنے کا نام ہے جب تک یہ رذائل نفس کے اندر موجود ہیں وہ زندہ ہے جس دن ان سے پاک ہو گیا مردہ ہو گیا مگر اس موت کے بعد اسکو دوسری حیات عطا ہوتی ہے جو روحانی حیات ہے اور لازوال حیات ہے سے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا رومی فرماتے ہیں سے

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

ای دعوئ عقل ۱۲

اے اقرار جہالت خود کنم تا عقل تحقیق میسر شود ولنعم ما قال ے

سالہا تو سنگ بودی دل خراش — آزمودن یک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ — خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

ہر کجا رنجے دوا آنجا رود — ہر کجا دردے شفا آنجا رود

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود

ہر کجا مشکل جواب آنجا رود



حدیث

ردّ الماموم علی الامام بالحمد فی الرفع

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو کیونکہ جس کا قول فرشتوں کے قول سے مل جائے گا اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے وقت جس کی تحمید ملائکہ کے قول سے مل جائے گی اس کی مغفرت ہو جائے گی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱) **جماعت کی نماز سب نمازوں سے افضل ہے** حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ جماعت کی نماز کو دوسری نمازوں پر فضیلت ہے کیونکہ ملائکہ تنہا نماز پڑھنے والے کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے پر آمین یا حمد کچھ نہیں کہتے ملائکہ امام کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں کہ جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں اور اس مقام پر قوت کلام کا مدلول یہ ہے کہ اس وقت اللھم ربنا ولک الحمد کہنے کی پابندی کرنا چاہیئے کیونکہ جب رسول اللہ نے اس کا ثواب بتلایا ہے تو گویا آپ بڑی تاکید کیساتھ یہ فرما رہے ہیں کہ اس سے غفلت نہ کرو اور اس کا پورا خیال رکھو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے دوسرے ارکان پر اس رکن کو زیادہ شرف حاصل ہے کیونکہ اس رکن کے سوا اور کسی کے متعلق یہ نہیں آیا کہ ملائکہ اس میں آدمی کیساتھ موافقت کر کے شریک ہوتے ہیں ان سورۂ حمد کے ختم پر بھی جب امام آمین کہتا ہے تو ملائکہ آمین کہتے ہیں جس سے اس سورت کی بھی فضیلت ثابت ہوئی کیونکہ ختم فاتحہ کے علاوہ اور کسی سورت کی قرأت کے لئے یہ نہیں آیا کہ ملائکہ اس پر آمین کہتے ہیں بہرحال امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے پر ملائکہ کا اللھم ربنا لک الحمد کہنا بتلاتا ہے کہ اس رکن کی عظمت دوسرے ارکان و اقوال سے زیادہ ہے

قولہ فی الوجہ الخامس فیہ دلیل علی فضل صلوٰۃ الجماعۃ الی قولہ فی الرابع علی تعظیمہا من بین الارکان والاقوال

ف صوفیہ متبعین سنت کو جماعت کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے ہم نے اپنے اکابر کو اسی قدم پر پایا ہے اور حضرات سلف صالحین کا بھی یہی طریقہ ہے مگر آجکل کے جاہل صوفیوں نے تصوف کو بدنام کر رکھا ہے وہ جماعت کا تو کیا اہتمام کرتے نماز کی بھی پوری پابندی نہیں کرتے نہ معلوم ان لوگوں نے تصوف کس چیز کا نام رکھ لیا ہے جو مخالف سنت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے فلا حول ولا قوۃ الا باللہ

(۱۷۲) ترک حظوظ جملہ اعمال سے افضل ہے

یہاں ایک صوفیانہ اشارہ بھی ہے کیونکہ ان حضرات نے جب یہ دیکھا کہ ملائکہ اللھم ربنا لک الحمد کہنے میں نمازیوں کے ساتھ اس لئے شریک ہوتے ہیں کہ رکوع میں بندہ کو صرف اپنے رب کی تعظیم کا حکم ہے قرأت اور دعا وغیرہ کی اجازت نہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبانی ارشاد فرمایا ہے کہ جس کو میرا ذکر مجھ سے مانگنے اور دعا کرنے سے روکے میں اس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر جب کہ نمازی اپنے رب کی تعظیم کر کے سر اٹھاتے ہیں اتنی بڑی خیر و برکت رکھ دی کہ فرشتے بھی ان کے ساتھ اللھم ربنا لک الحمد کہنے میں شریک ہوتے ہیں اور جس کا قول ان کے قول سے مل جائے

اس کی مغفرت ہو جاتی ہے اور اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو اسکی اطلاع دیدیں تاکہ وہ اس نعمت کی قدر کریں کیونکہ مغفرت سے بڑھ کر کوئی ثواب نہیں تو انہوں نے سمجھ لیا کہ اس اشارہ کا مقتضی یہ ہے کہ نفسانی خواہش کو چھوڑ دینا سب کاموں سے افضل ہے (چنانچہ اپنی ضروریات کے لئے دعا کرنا اور اللہ تعالیٰ سے مانگنا نفس کا تقاضا ہے مگر اللہ تعالیٰ مانگنے والوں سے زیادہ ان کو دیتے ہیں جو اللہ کی یاد میں مشغول ہو کر رہ جاتے ہیں اس لئے انہوں نے اسی کو اختیار کیا اور تمام حظوظ نفس سے باہر ہوگئے اور رب جلیل (یعنی حق سبحانہ) کے ذکر میں مشغول ہوگئے جس کے ثمرہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلند عزت سے نوازا کہ ان کا شرف اپنی کتاب محکم میں نازل فرمایا چنانچہ ارشاد ہے رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی ہے اور ارشاد ہے واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھو جو اپنے رب کو صبح اور شام یاد کرتے ہیں صرف اسی کی ذات کا ارادہ کرتے ہوئے (کسی دنیوی غرض سے نہیں) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی وہ بات سمجھا دیں جو ان کو سمجھائی ہے اور جملہ احوال میں ان کے ساتھ کر دیں اللہ کے سوا کوئی رب نہیں ۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وسلم تسلیما، قولہ فی الوجہ السادس وهنا اشارة صوفية مع الحكمة التي ذكرها في الوجه الخامس الى قوله لا رب سواه ۔

باب چہل و ہفتم

حدیث

رؤیۃ المولیٰ عزوجل

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم اپنے پروردگار کو قیامت کے دن دیکھیں گے، فرمایا کیا تم کو چودھویں رات میں چاند کے دیکھنے میں کچھ شبہ ہوتا ہے؟ جبکہ اس کے سامنے بادل بھی نہ ہو، عرض کیا یا رسول اللہ نہیں، فرمایا کیا تم کو سورج کے دیکھنے میں شبہ ہے؟ جبکہ اس کے سامنے بادل نہ ہو، عرض کیا نہیں یا رسول اللہ! فرمایا تو تم اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے۔ لوگ قیامت کے دن جمع کئے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جو جس چیز کی عبادت کرتا ہو اس کے پیچھے چلا جائے، چنانچہ کچھ لوگ سورج کے پیچھے ہو لیں گے کچھ چاند کے پیچھے ہو لیں گے بعض شیاطین کے ساتھ ہو لیں گے اور یہ امت رہ جائے گی جن میں اس کے منافق بھی ہوں گے اللہ تعالیٰ اس امت کے پاس تشریف لائیں گے اور فرمائیں گے میں تمہارا رب ہوں تم میرے ساتھ آؤ یہ امت کہے گی کہ ہم تو اپنی اسی جگہ پڑے رہیں گے یہاں تک کہ ہمارا رب تشریف لائے کیونکہ جب ہمارا رب آئیگا ہم اس کو پہچان لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے پاس دوسری بار تشریف لائیں گے اور فرمائیں گے میں تمہارا رب ہوں تم میرے ساتھ چلو اس وقت مسلمان کہیں گے بیشک آپ ہمارے پروردگار ہیں تب اللہ تعالیٰ ان کو بلائیں گے اور جہنم کی پشت پر پل صراط قائم کیا جائے گا۔ پس تمام رسولوں سے پہلے میں اپنی امت کو لیکر اس پر سے گذروں گا اور اس وقت رسولوں کے سوا کوئی بات نہ کر سکے گا رسولوں کا کلام اس وقت یہ ہوگا اللّٰھم سلّم سلّم (اے اللہ سلامتی سے پار کر دے سلامتی سے پار کر دے) اور جہنم میں ایسے کانٹے ہوں گے جیسے سعدان کے کانٹے

ہوتے ہیں تم نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں صحابہ نے عرض کیا ہاں دیکھے ہیں. فرمایا وہ ایسے ہی ہوں گے
مگر ان کی جسامت کی مقدار اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کچھ لوگ اپنے اعمال کے سبب (ان
کانٹوں کے ذریعہ جہنم کی طرف) کھینچے جائیں گے تو بعض تو اپنے عمل کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ
جائیں گے اور بعضوں کو ان کانٹوں سے خراش لگے گی پھر بچ جائیں گے، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ
جہنم والوں میں سے جن پر رحمت کرنا چاہیں گے رحمت کریں گے تو فرشتوں کو حکم دیں گے کہ جو اللہ کی
عبادت کرنے والا (جہنم میں) ہو اس کو نکال لاؤ. فرشتے ان کو نکالیں گے اور فرشتے ان کو سجدہ کے
نشانوں سے پہچانیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آگ کے اوپر سجدہ کے نشان کو کھانا حرام کر دیا ہے
غرض وہ جہنم سے نکالے جائیں گے انسان کے تمام بدن کو آگ کھا لے گی مگر سجدہ کے نشان کو نہ کھا سکے
گی. یہ لوگ جہنم سے جلے ہوئے نکلیں گے ان کے اوپر آب حیات ڈالا جائے گا جس سے وہ اس طرح
اگیں گے جیسا سیلاب کے خس و خاشاک میں دانہ اگتا ہے. پھر اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلے
فارغ ہو جائیں گے اور صرف ایک شخص دوزخ اور جنت کے بیچ میں رہ جائیگا جو دوزخیوں میں سب کے
پیچھے جنت میں جائیگا (جہنم سے نکلنے کے بعد) اس کا منہ دوزخ ہی کی طرف ہوگا تو وہ کہے گا اے پروردگار
میرا منہ جہنم کی طرف سے پھیر دے کیونکہ مجھے اس کی بدبو نے پریشان کر دیا اور اس کی لپٹ نے پھونک دیا ہے
اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر تیری یہ فرمائش پوری کر دی گئی تو کیا اور تو نہیں مانگے گا؟ وہ کہے گا نہیں آپ کی
عزت کی قسم (میں اور کچھ نہ مانگوں گا) پھر وہ اللہ تعالیٰ سے بہت کچھ عہد و میثاق کریگا تو اللہ تعالیٰ
اس کا منہ جہنم کی طرف سے ہٹا دیں گے جب وہ جنت کو اپنے سامنے دیکھے گا اور اس کی زینت و آرائش پر
نظر پڑے گی تو جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے وہ خاموش رہے گا پھر ضبط نہ کر سکے گا تو کہے گا اے رب مجھے
جنت کے دروازے کے پاس پہنچا دیجئے. اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا تو نے ابھی پختہ عہد نہ کیا تھا کہ اور
کچھ نہ مانگوں گا تو وہ کہے گا اے رب میں ساری مخلوق میں سب سے زیادہ بدبخت نہیں ہوں گا تو فرمائیں
گے اچھا! اس کے بعد اور تو کچھ نہ مانگے گا، وہ کہے گا نہیں آپ کی عزت کی قسم اور کچھ نہ مانگوں گا پھر
اس پر اللہ تعالیٰ کے سامنے بہت کچھ عہد و میثاق کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے دروازہ
پر پہنچا دیں گے، دروازہ پر پہنچ کر جب وہ جنت کی رونق اور تازگی اور مسرت بخش منظر دیکھے گا تو
جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے خاموش رہے گا پھر کہے گا اے پروردگار مجھے جنت کے اندر پہنچا دیجئے. اللہ

عزوجل فرمائیں گے اے ابن آدم تو کیسا غدار ہے کیا تو نے ابھی پختہ عہد نہ کیا تھا کہ اور کچھ نہ مانگوں گا وہ عرض کرے گا اے پروردگار اپنی ساری مخلوق میں سب مجھے ہی سب سے زیادہ محروم اور بدبخت نہ کیجئے اس بات پر اللہ تعالیٰ ہنس پڑیں گے (یعنی بہت خوش ہوں گے اللہ تعالیٰ کی ہنسی کو انسان اپنی ہنسی پر قیاس نہ کرے ہو بے اختیار ہوا کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اضطرار سے پاک ہیں غرض) پھر اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں جانے کی اجازت دے دیں گے اور فرمائیں گے تمنا کر اور جو کچھ تجھ سب مانگ، چنانچہ وہ اپنی تمنائیں کرنا شروع کرے گا جب اس کی تمنا ختم ہو جائیگی تو حق تعالیٰ اس کو یاد دلاتے رہیں گے کہ یہ بھی مانگ یہ بھی مانگ یہاں تک کہ جب اس کی تمام آرزوئیں انتہا کو پہنچ جائیں گی تو حق تعالیٰ فرمائیں گے (جا) تیرے واسطے یہ بھی ہے اور اسی کی برابر اور بھی اور ابو سعید خدریؓ کی روایت میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا کہ تیرے واسطے یہ بھی ہے اور اس کا دس گنا اور۔

شرح ظاہر حدیث میں اللہ تعالیٰ کی دیدار کی تحقیق ہے جو قیامت کے دن ہم کو نصیب ہوگا اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱–۲) حدیث سے معلوم ہوا کہ ادراک حواس حق تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اللہ عزوجل ان میں ہو جاتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں اوراک پیدا فرماتے ہیں (یہ ضروری نہیں کہ حواس درست ہوں تو ادراک ہو ہی جائے، یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے پاس آئیں گے (جیسا آنا ان کی شان کے لائق ہے) اور فرمائیں گے کہ میں تمہارا رب ہوں مگر بلا وجہ مدیت اور کلام کے ان کو حق تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ ہوگی (وہ نہیں پہچانیں گے اور کہدیں گے کہ ہم تو یہیں جگہ میں گے جب تک ہمارا رب آئے۔

حجاب ہماری طرف سے ہے حق تعالیٰ کی طرف سے نہیں

کیونکہ یہ حجاب خود بندوں کی طرف سے ہوگا ان ہی کے حواس کا اندراک اس وقت نہیں نہ ہوگا، ہم اس کو بلا تشبیہ ایک مثال سے واضح کرتے ہیں ورنہ اللہ کے لئے تو جتنی مثال ہے (ان کی شان کے لائق کون مثال بیان کر سکتا ہے)، دیکھو آفتاب کو کیا جب سامنے ہو اور کسی کمزور نگاہ والے سے کہا جائے کہ سورج کو دیکھو اور اس کو یہ بات معلوم ہے کہ جب آفتاب کے سامنے بادل نہ ہو تو وہ خوب روشن ہوتا ہے مگر اس وقت جب اس کو دیکھتا تو

نگاہ کمزور ہونے کی وجہ سے سورج میں سُرخ اور سبز اور سفید اور سیاہ دھلیاں نظر آئیں گی تو وہ بے ساختہ کہے گا کہ یہ تو وہ سورج نہیں جس کو میں پہچانتا ہوں (یہ تو نہ معلوم کیا چیز ہے) تو اس سے کہا جائیگا کہ (آفتاب تو وہی ہے مگر) تیرا ادراک صحیح نہیں وہ اس میں بحث کریگا تو اس سے کہا جائیگا کہ اپنی آنکھوں کا علاج کر کے پھر آ اور سورج کو دیکھ جب دوا سے آنکھ کا علاج کر کے دوبارہ سورج کو دیکھے گا تو اس کو سنگی اور حُسن میں حالت کمال پر پائیگا اس وقت خود اقرار کریگا کہ واقعی پہلے جو حجاب تھا وہ میری طرف سے تھا یہی حال عالم مشتوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ ہے تو اس کی ذلت کے ساتھ کیا حال ہوگا جس کی مثل کوئی چیز نہیں پس جتنے حجابات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب جہل کی طرف سے ہیں جو قدرت اور حکمت الٰہیہ سے پیدا کئے گئے ہیں اس میں صوفیہ کے لئے بھی حجت ہے جو فرماتے ہیں کہ حجابات سب ان کی طرف سے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں، جو ان حجابات سے پیدا طرح نکل گیا وہی واصل اور عارف ہوگیا وہ اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتا ہے اور اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مشاہدہ کرتا ہے اور مشاہدہ کیا جاتا ہے لیکن عظمت اور کبریائی کے حدود کی رعایت کیساتھ قواعد شرعیہ اور اس تنزیہ کو محفوظ رکھ کر جو جلال الٰہی کے لائق ہے رہیں جس کو ادب اور عظمت انبیاء اور قواعد شرعیہ کی مخالفت پر دیکھو سمجھ جاؤ کہ اس کو نہ وصول ہوا نہ معرفت حاصل ہوئی نہ مشاہدہ سے حصہ ملا بلکہ محجوب اور محروم ہے۔

قولہ فی الوجہ الثانی عشر قولہ علیہ السلام فیقولون ھذا مکاننا الی قولہ فی الوجہ الثالث عشر بمقتضی القدرۃ والحکمۃ الربانیۃ۔

مومنین جواول یہ کہیں گے کہ ہم اسی جگہ میں گے یہاں سے نہ ہٹیں گے یہاں تک کہ ہمارا (۱۷۴) پروردگار ہمارے پاس آئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے سامنے اسی طرح تجلی فرمائیں جیسا دنیا میں ہم سے وعدہ کیا تھا۔

یہاں سے یہ علمی مسئلہ معلوم ہوا **جیسا علم یہاں ہوگا ویسا ہی آخرت میں ہوگا** کہ جو حال تمہارے علم کا اس عالم میں ہے وہی حال تمہارا اس عالم میں ہوگا۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب قبر کے دو فرشتوں منکر نکیر کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے دریافت کیا کیا اس وقت میری عقل بھی ٹھکانے ہوگی؟

کہا گیا اہل عقل تو ٹھکانے ہوگی انہوں نے کہا تو پھر ہم کو ان کی پروا نہیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا علم اس وقت ایمان کے اعلیٰ درجہ پر ہوگا اس لئے انہوں نے فرمایا کہ جب مجھے اتنی عقل ہوگی جس سے میں ایمان کو سمجھ لوں تو پھر میں نجات پا جاؤں گا، اس میں کچھ شک نہیں، اندیشہ اگر تھا تو علامت کے بدلنے کا تھا کہ مرنے کے بعد کہیں عقل ہی خبط نہ ہو جائے جب یہ نہیں تو پھر اندیشہ کچھ نہیں عقل سلامت ہے تو انشاء اللہ ہر سوال کا جواب آسان ہے)

قیامت میں تجلی بقدر معرفت ہوگی

اس لئے اہل معرفت اور علماء شریعت نے فرمایا ہے کہ وہاں دار کرامت میں تجلی اسی تفاوت سے ہوگی جتنا دنیا میں لوگوں کی معرفت اور اجلال و تعظیم میں تفاوت ہے اور مومنین کے اس قول کا کہ جب ہمارا رب آئے گا ہم اس کو پہچان لیں گے۔ مطلب یہ کہ جب وہ ہمارے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کریں گے تو ہم پہچان لیں گے، کیونکہ مسلمان وہاں بھی (اور یہاں بھی) اس بات کو جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت بڑی ہے وہ جو چاہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں کرتے ہیں (تو قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تجلی فرمائیں اور بندوں کو اس تجلی اور دیدار کا تحمل بھی عطا فرمادیں)

یہاں ایک سوال ہے کہ یہ جواب سب لوگ یک زبان ہو کر دیں گے یا خاص خاص اہل معرفت جواب دیں گے، اور انہی سے خطاب کیا جائے گا دوسرے لوگ ان کے تابع ہوں گے، جیسا دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ جماعت میں سے جب بعض لوگ بولتے ہیں اور باقی خاموش رہتے ہیں، تو محاورہ عرب میں کہا جاتا ہے کہ جماعت نے یوں کہا، جماعت کی طرف کسی بات کی نسبت کرنے میں سب کا بولنا ضروری نہیں دونوں صورتیں ممکن ہیں لطف قدرت سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہاں عامی کو بھی حسن جواب اور حسن ادب عطا ہو جائے جیسا یہاں اہل معرفت کو عطا ہوا ہے اور اس میں بڑی بشارت ہے، کہ ایمان کی سلامتی کی خبر دی گئی اور بتلا دیا گیا کہ ایمان کی وجہ سے کتنا بڑا فضل ہوگا کہ اس بندہ کو باوجودیکہ وہ جیسا حقیر ہے معلوم ہے اپنے مولیٰ جلیل اللہ تعالیٰ شانہ سے خطاب اور گفتگو کا شرف عطا ہوگا حالانکہ ان کی شان استغنا و جلال جیسی کچھ ہے ظاہر ہے۔

اسی واسطے ایک عابدہ سے منقول ہے کہ وہ موت کے نام سے بہت خوش ہوتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کیا اللہ تعالیٰ مجھ سے خطاب فرمائیں گے اور دھمکا کر یہ نہ فرمائیں گے اے نالائق بندی تو نے ایسا کیا

اور دیکھا کیا بس یہی میرا بڑا مطلوب ہے، حافظ شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

عاشق کو محبوب کی دشنام میں بھی وہ لذت آتی ہے جو دوسروں کو تعظیم و تکریم میں بھی حاصل نہیں ہوتی

رزقنا اللہ وایاکم حب اللہ وحب رسولہ وسقانا من شراب حبہ آمین

اور یہ جو فرمایا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ چلیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرف جانے کا حکم ہوگا اس طرف ہولیں گے اور یہی مومنوں اور منافقوں میں امتیاز کا موقع ہوگا چنانچہ منافقین سے کہا جائیگا کہ پیچھے لوٹو وہ پیچھے کو پھریں گے تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی جیسا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے فضرب بینھم بسور ایسا ہی ایک اور حدیث میں بھی آیا ہے۔

قولہ الوجہ الرابع عشر قولہ ھذا مکاننا الیٰ قولہ فی حدیث غیر ھذا

(۱۷۵) امتحان کے وقت حقیقت واضح ہوتی ہے

اس سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ امتحان کے وقت تمام حقائق کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے چنانچہ منافقوں کو بطور امتحان ہی کہا جائیگا کہ پیچھے پھر کر دیکھو اور نور حاصل کرو وہ بیوقوف پیچھے مڑ کر دیکھنے لگیں گے اسی وقت ان کے اور مسلمانوں کے درمیان دیوار کھڑی ہوجائیگی۔

اپنے ایمان کی حالت کو ٹٹولتا رہنا چاہیئے

اور اس پر یہ فائدہ مرتب ہوا کہ انسان کو اپنے ایمان کی حالت کو ٹٹولتا رہے تاکہ اس کو معلوم ہوجائے کہ وہ کس جماعت میں سے ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا اپنے نفس سے محاسبہ کرتے رہو قبل اس کے کہ تم سے قیامت میں حساب لیا جائے، اور تاکہ تم کو معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عدل پر مبنی ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے ہم کو حکم دیا ہے سب حق ہے اور فیصلہ بدلتا نہیں پس اپنے نفس کو مہمل نہ چھوڑو اور نجات کی طمع اسباب نجات کی ضد سے نہ کرو کہ یہ عین حماقت ہے۔ قولہ الوجہ الخامس عشر فیہ

ف مالانف سعدی نے اسی مضمون کو اس عنوان سے بیان فرمایا ہے ؎

جان جملہ علمہا این ست داین ۔ کہ بدانی من کیم در یوم دین

علمِ حقیقی کی تعریف

تمام علوم کی جان یہ ہے کہ تم کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں قیامت میں کون ہوں، مومن ہوں یا منافق، مطیع ہوں یا عاصی۔ اس بات کے معلوم کرنے کا طریقہ یہاں بتا دیا گیا ہے کہ اپنے یقین کی حالت کو ٹٹولتے رہو اپنے نفس سے محاسبہ کرتے رہو اس کو مہمل نہ چھوڑو جو شخص اپنے نفس کی نگہداشت رکھتا ہے اس کو اپنا اصلی حال معلوم ہو جاتا ہے جو نگہداشت سے غافل رہتا ہے وہ دھوکہ میں رہتا ہے۔

(۱۷۶) قیامت میں بھی قبول دُعاء کی امید ہے

حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ قیامت کے دن بھی قبول دعاء کی امید ہے اور اس سے خیر حاصل ہونے کی توقع ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرات رسل کرام (انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام) پل صراط پر گذرتے ہوئے اللھم سلم سلم کی دعا نہ کرتے۔

قوله الوجه الثالث والعشرون فيه دليل على ان الدعاء الى قوله لما كانت الرسل يدعون

(۱۷۷) دُعا میں اللھم کا صیغہ افضل ہے

حدیث سے دعا کی اس صورت کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ اللھم کیساتھ انبیاء دعا کریں گے اگر اس طرح دعا کرنا افضل نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اس عظیم الشان موقعہ میں اس کو اختیار نہ کرتے بلکہ اس سے افضل کو اختیار کرتے، کہا گیا ہے کہ اللھم کے معنے یہ ہیں کہ اے اللہ میں آپ سے ان تمام ناموں کیساتھ سوال کرتا ہوں جن کے ذریعے سے آپ سے سوال کیا جاتا ہے۔

قوله الوجه الرابع والعشرون فيه دليل على فضيلة هذه الصفة الى قوله بجميع ما سئلت به

ف سلامتی اور نجات کی دُعا سب سے افضل ہے

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلامتی اور نجات کی دعا سب دعاؤں سے بڑھ کر ہے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اس ہولناک موقعہ میں صرف سلامتی کی دعاء کریں گے اگر اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہوتی تو اس موقعہ میں اس کو اختیار کرتے

اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سوال عافیت سب دعاؤں سے زیادہ محبوب ہے۔

اللھم انی اسئلک العفو والعافیۃ فی الدنیا والآخرۃ

(۱۶۸) کسی مسلمان کو رحمت الٰہی سے مایوس نہیں کرنا چاہئے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص اہل ایمان میں سے ہو خواہ کسی حالت میں ہو اس کو یقینی طور پر ارحم الراحمین کی رحمت سے ناامید نہیں کیا جا سکتا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے ہو جن کے لئے خیر مقدر ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

انہ لا ییأس من روح اللہ الا القوم الکافرون

اللہ تعالیٰ کی عطا سے کافروں کے سوا کوئی ناامید نہیں ہوتا

منقول ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور خلفاء سے حساب لیا گیا پھر ان کو دائیں طرف جانے کا حکم دیا گیا (جو علامت ہے جنتی ہونے کی اصحاب الیمین اہل جنت ہی ہیں) یہاں تک کہ ان کی نوبت آئی اور ان سے بھی حساب ہوا پھر ان کو بھی دائیں طرف جانے کا حکم ہوا، وہ فرشتوں کے ساتھ چل رہے تھے کہ راستہ میں ایک لاش پڑی ہوئی ملی انہوں نے فرشتوں سے پوچھا یہ کون ہے۔ فرشتوں نے کہا اسی سے پوچھ لو وہ خود بتلا دے گا (کہ میں کون ہوں) تو آپ نے پیر اس کو ٹھوکر لگائی اور پوچھا تو کون ہے؟ کہا میں حجاج بن یوسف ہوں۔ پوچھا اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کہا ہر مقتول کے عوض مجھے قتل کیا (پھر زندہ کیا) اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے عوض مجھے ستر دفعہ قتل کیا جا چکا ہے اور اب میں اسی چیز کی امید رکھتا ہوں جس کی اہل توحید کو امید ہوا کرتی ہے (یعنی مجھے امید ہے کہ جن لوگوں پر میں نے ظلم کیا تھا ان کا بدلہ لینے کے بعد اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرما دیں گے اور جنت میں پہنچا دیں گے)

قولہا الوجہ التاسع والعشرون فیہ دلیل علی ان من کان من اھل الایمان الی قولہ وانا انتظر ما ینتظرہ الموحدون۔

ف حضرات صوفیہ کا یہ خاص مذاق ہے کہ وہ کسی مسلمان کو رحمت الٰہی سے مایوس نہیں کرتے

فتوے لگاتے ہو کہ فلاں کافر ہے اور فلاں کافر ہے خدا کی قسم قیامت کے دن تم دیکھو گے کہ بعض ایسے لوگوں کی مغفرت ہو رہی ہے جو دنیا میں پورے کافر سمجھے جاتے تھے پھر فرمایا اس کا منشا یہ نہیں کہ دھمکانے کے لئے انتظام کے طور پر کسی کو کافر کہہ دیا جائے (جیسا حدیث میں تارک صلوٰۃ کو کافر کہا گیا ہے) مگر یہ مت سمجھو کہ جس پر کفر کا فتوی لگایا گیا ہے وہ سچ مچ کافر ہو گیا، الغرض کسی مسلمان کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرنا چاہیئے مولانا فرماتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست   سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(۷۹) نار بالذات محرق نہیں ہے

اس میں مذہب اہل سنت کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ نار بالذات (خود) محرق نہیں بلکہ جلانے کی صفت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے اس میں آتی ہے اگر وہ بالذات محرق ہوتی تو ملائکہ وغیرہ سب کو جلا دیتی ہے (حالانکہ فرشتوں پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا) اور سجدے کے مقامات کو بھی جلا دیتی جیسا تمام بدن کو جلائے گی (حالانکہ جہنم کی آگ سجدے کے مقامات کو نہیں جلا سکتی) غرض تحریق کے تجزیہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جلنا جو آگ کی صفت ہے اس کی مقتضی اس کی ذات کا وجود نہیں بلکہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے اس میں پیدا ہوتی ہے ۔

یہاں چند سوالات ہیں ایک یہ کہ مقامات سجدہ کی بابت جو فرمایا ہے کہ آگ ان کو نہ کھائے گی۔ یہ ہر مومن کے لئے عام ہے، خواہ اس نے کبھی سجدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ جواب یہ ہے کہ اگر ہم اس کو عموم پر محمول کریں تو لفظ کو اس کے موضوع اور معنی سے نکال دیں گے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ملائکہ مسلمانوں کو سجدے کے اثر اور نشان سے پہچانیں گے اور لفظ شی کا اثر وہی ہے جس پر شی کا مرور اور ظہور ہوا ہو تو جس نے کبھی سجدہ نہیں کیا اس کی پیشانی میں سجدہ کا اثر لفظ نہیں ہو سکتا خصوصاً جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے۔ بین المؤمن والکافر ترک الصلوٰۃ مومن اور کافر میں امتیاز نماز کے پڑھنے اور ترک کرنے سے ہے پس اگر مسلمان نماز پڑھ لے تو اس کو کافر سے امتیاز حاصل ہو گیا اور اس کے جسم میں نماز کا کچھ اثر پیدا ہو جائے گا مگر ہماری گفتگو تو اس شخص کے متعلق ہے جس نے بالکل نماز نہیں پڑھی نہ ایک نہ زیادہ کہ اس کے مقامات سجود کو آگ کھائے گی یا نہیں ؟ تو ظاہر یہ ہے کہ جب اس کے

جسم میں نماز کو کوئی اثر اور نشان نہیں ہے تو اس کے مقامات سجود کو آگ کھا سکتی ہے۔

تارک صلوۃ کی حالت زیادہ خطرناک ہے

اس توجیہ پر تارک صلوۃ کی حالت زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ موت کے وقت ایمان سلب ہو جائے اور اگر ایمان پر خاتمہ ہو بھی گیا تو یہ اندیشہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کیساتھ جہنم سے نہ نکالا جائے (جن کو سجدہ کے نشان سے ملائکہ پہچانیں گے) کیونکہ اس کے پاس یہ علامت نہیں ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ یہاں ایک حدیث ہمارے اس بیان کے معارض ہے اور وہ جبریل کا قول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا من مات من امتک یشھد ان لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ قال وان فعل کذا او کذا قال وان فعل کذا و کذا (جو شخص آپ کی امت میں سے اس حالت میں مرے کہ وہ لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ، کی شہادت زبان و دل سے) دیتا ہو وہ جنت میں داخل ہو جائیگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگرچہ اس نے ایسا ایسا گناہ بھی کیا ہو کہا اگرچہ اس نے ایسا ایسا (گناہ) بھی کیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تارک صلوۃ پر بڑا اندیشہ ہے موت کے وقت کہ ایمان سلب نہ ہو جائے، اور اگر وہ شہادت کا اقرار کرتا ہوا دل سے اس کو مانتا ہوا مرا تو اندیشہ یہ ہے کہ ان لوگوں کیساتھ جہنم سے نہ نکلے گا جو علامت والے ہیں بلکہ اس قبضہ کے ساتھ نکلے گا جو اللہ تعالیٰ مٹھی بھر کر نکالیں گے جیسا حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء و صالحین کی شفاعت کے بعد جبکہ یہ حضرات سفارش کر کے گنہگار مسلمانوں کو جہنم سے نکالیں گے اور جہنم میں ان کے نزدیک وہی لوگ رہ جائیں گے جن کو قرآن نے دوزخ میں قید کیا ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و اولیاء کے نزدیک کوئی مومن جہنم میں نہ رہا ہوگا صرف کفار و مشرکین ہی رہ گئے ہوں گے) اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے رسولوں نے شفاعت کر لی انبیاء نے شفاعت کر لی ملائکہ نے شفاعت کر لی علماء نے شفاعت کر لی اب ارحم الراحمین کی شفاعت کی باری ہے۔ پھر اللہ عزوجل جہنم میں سے ایک مٹھی بھر کر نکالیں گے، اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ ان کا مٹھی بھرنا کیونکر ہوگا اور اس کی مقدار کیا ہوگی، تو اس

مٹھی میں وہ سب لوگ نکل آئیں گے جن کو قرآن کے قانون نے انبیاء و علماء کے نزدیک جہنم میں قید کیا تھا تو یہ لوگ بھی جو کبھی نماز کے پاس نہ گئے تھے، ان ہی کے ساتھ نکلیں گے اور ان سب کا بیان اپنی جگہ پر اسی کتاب میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

قوله فی الوجه التاسع عشر وهذا لیس بمذهب اهل السنة الی قوله من داخل الکتاب انشاء الله تعالیٰ۔

ف کافر و مشرک کی مغفرت نہ ہوگی اور جن لوگوں کو انبیاء و اولیاء جہنم میں چھوڑ دیں گے پھر اللہ تعالیٰ نکالیں گے وہ درحقیقت مومن ہوں گے مگر ان کا ایمان ضعیف ہوگا

قانون قرآن نے حقیقتاً ان لوگوں کو جہنم میں قید کیا ہوگا وہ تو کافر و مشرک ہی ہوں گے کیونکہ قانون قرآن یہی ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک به ویغفر ما دون ذلك لمن یشاء اور ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ بھی جہنم سے نہ نکالیں گے مگر بعض لوگوں کا ایمان اتنا ضعیف اور مخفی ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و اولیاء ان کو کافر و مشرک سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ اب ہمارے علم میں ان لوگوں کے سوا جہنم میں کوئی نہیں رہا جن کو قانون قرآن نے قید کیا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے علم کامل اور رحمت کاملہ کا اظہار فرمائیں گے اور بہت سی مخلوق کو جہنم سے نکال کر بتلا دیں گے کہ ان کو رسولوں نے انبیاء نے ملائکہ نے اولیاء نے کافر سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیا تھا مگر مجھ کو ان کے ایمان کا حال معلوم ہے یہ مومن تھے کافر و مشرک نہ تھے مگر ایمان اس قدر کمزور تھا کہ تمام اصحاب فراست ان کے ایمان کو نہ پہچان سکے یہاں سے معلوم ہوا کہ علم غیب محیط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں بھی نہ ہوگا۔

علم غیب اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے

علم غیب محیط اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ اور علم غیر محیط کو علم غیب کہنا صحیح نہیں۔

ف اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی بھی رحیم و کریم نہیں یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی بھی رحیم و کریم نہیں چنانچہ یہ بیشمار مخلوق تمام انبیاء و رسل و اولیاء کی نظر عنایت و رحمت سے محروم رہے گی مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی دستگیری کریگی، یہاں سے ان جاہلوں کی حماقت ظاہر ہو گئی جو اللہ تعالیٰ کو تو جبار و قہار ہی سمجھتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیران پیر کو رحیم و کریم سمجھ کر نعوذ باللہ خدا سے بھی بڑھا دیتے ہیں جیسا بعض اہل بدعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم غیب اور مختار کل قرار دیتے اور پیران پیر کی دستگیری پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں نعوذ باللہ من ضلالۃ البدعۃ و نسألہ کمال اتباع السنۃ اللھم اجعلنا من عبادک المتقین الغر المحجلین آمین

(۱۸۰) **فضیلت عبادت** استحقاق عذاب کے یہ موانع جو حدیث میں عبادت کی فضیلت کی بھی دلیل ہے کہ باوجود عذاب سے محفوظ رہیں گے بہاں ایک صوفیانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ جب صوفیہ نے اس حدیث سے یہ معلوم کیا کہ موانع عبادت کی بڑی عزت و حرمت ہے، کہ آگ ان کو نہ جلا سکے گی نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی انسان کے پیٹ میں جہاد فی سبیل اللہ کا غبار اور جہنم کا دھواں جمع نہ ہو سکے گا یہاں تک کہ دودھ تھن میں واپس ہو جائے یعنی جیسا یہ دشوار ہے ایسا ہی یہ بھی ناممکن ہے کہ جس پیٹ میں جہاد کا غبار ہو اس میں جہنم کا دھواں پہنچ جائے۔ اور اسی مطلب میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں تو صوفیہ نے اپنے دلوں کو اور بدن کو اور تمام اعضاء کو عبادت ہی میں مشغول کر دیا جس سے اس وعدۂ جمیل کے مطابق وہ دونوں جہان میں بلند مرتبہ کے مستحق ہو گئے رغبت کرنیوالوں کو اس میں رغبت کرنا چاہیئے۔ قولہ الوجہ الثلاثون فیہ دلیل علی فضل العبادۃ الی قولہ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔

ف پس زبان کو بھی عبادت میں مشغول رکھو اور دل کو بھی اور سانس کو بھی اور تمام اعضاء کو بھی جس کا طریقہ علماء و اولیاء کے بتلانے سے معلوم ہوگا۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا کے قبول ہونے

قبول دعا کی قوی امید رکھنا چاہیئے

کی قوی امید رکھنا چاہیئے اگرچہ دعا کرنیوالا اس کا اہل نہ ہو کیونکہ یہ شخص جس کا حال بیان ہو رہا ہے صحیح طور سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جہنمی ہوگا اور جو شخص جہنمی ہو اس کا مردود ہونا یقینی ہے (مقبول ہوتا تو جہنم میں کیوں جاتا) پھر بھی حق تعالیٰ اس پر اپنا فضل فرمائیں گے اور اپنی رحمت اس پر مبذول فرمائیں گے (اس کی دعا اور درخواست کو قبول فرمائیں گے) تو جو شخص ابھی احتمال ہی کے درجہ میں ہے کہ جنتی ہوگا یا جہنمی اس کا کیا حال ہونا چاہیئے یقیناً اس کو قبول دعا کی بہت زیادہ امید رکھنا چاہیئے کیونکہ اس دار (دنیا) میں تو سب لوگوں کی حالت سعادت اور شقاوت دونوں کو محتمل ہے تو ان کو ارحم الراحمین کی رحمت کی بہت زیادہ امید رکھنا چاہیئے۔

قولہ الوجہ الثامن والثلاثون فیہ دلیل علی قوۃ الرجاء الی قولہ فھو اقوی رجاء فی رحمۃ ارحم الراحمین۔

ف حضرات صوفیہ کا یہ خاص مذاق ہے وہ دعا کی اجابت سے ناامید نہیں ہوتے بعض اہل اللہ بعض امور کے لئے تیئیس سال تک برابر دعا کرتے رہے ۲۳ سال کے بعد اجابت کا ظہور ہوا ان کو اجابت دعا کا یقین تھا اس لئے برابر دعا میں لگے رہے، مگر عام لوگوں کی عادت یہ ہے کہ چند روز دعا کر کے جب قبول کے آثار نہیں دیکھتے گھبرا کر دعا چھوڑ دیتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ہم قبول دعا کے اہل نہیں ان کو یہاں سے سبق لینا چاہیئے کہ یہ شخص جو سب کے آخر میں جہنم سے نکلے گا یقیناً اپنے کو مردود سمجھتا ہوگا مگر پھر بھی قبول دعا سے ناامید نہ ہوگا دعا کریگا اور اس کی دعا قبول بھی ہوگی مسلمانوں نے جہاں اپنی کامیابی کے دوسرے طریقوں سے تغافل برتا ہے افسوس ہے کہ وہ دعا جیسی سہل چیز سے بھی تغافل برت رہے ہیں اگر کم از کم ہر مسلمان عزت اسلام و مسلمین اور غلبۂ اسلام کے لئے دعا ہی کرتا رہے اور برابر اس میں لگا رہے تو انشاء اللہ کچھ دنوں کے بعد آثار قبول نظر آجائیں گے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

حدیث میں قبول دعا کی قوی امید کی

(۱۸۲) قبول دعا طریقہ جاننے پر بھی موقوف نہیں

کہ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ایسے شخص کی دعا بھی

قبول ہو جاتی ہے جس کو دعا کا طریقہ بھی معلوم نہیں اور ادعیہ (ماثورہ) کی خبر بھی نہیں چنانچہ اس شخص نے ادعیہ (ماثورہ) میں سے کوئی دعا استعمال نہیں کی بس ایک حاجت کی درخواست کی اپنی تکلیف کی شکایت کی کہ اے اللہ میرا چہرہ جہنم کی طرف سے پھیر دیجئے اور اپنی حالت عرض کر دی کہ جہنم کی آگ نے مجھے جھونک دیا ہے اور اس کی بدبو نے دماغ پریشان کر دیا ہے اس کی اسی درخواست پر اجابت مرتب ہو گئی اور تکلیف دور کر دی گئی۔ میں ایک دفعہ ایک بزرگ کے پاس گیا تو ان کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا ارحمنی والسلام مجھ پر رحم کر دیجئے بس اور کچھ نہیں وہ اپنی حالت میں مستغرق تھے اور اسی لفظ کو بار بار کہہ رہے تھے میں نے کہا کہ یہ کیسی دعا اور درخواست ہے فرمایا مجھے پھر میں نے دنیا میں اور اس کی بلاؤں اور پریشانیوں میں غور کیا آخرت میں اور اس کی تکالیف و مصائب میں تامل کیا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا مانگوں اور کس کس چیز کو شمار کروں اس لئے میں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھ پر رحم کر دیجئے بس اور کچھ نہیں۔ میں نے اسی وقت اس کلام کی حلاوت اپنے دل میں محسوس کی اور اب تک حلاوت محسوس کرتا ہوں جب بھی ان کی یہ بات یاد آجاتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اپنی حالت میں سچا ہے تو میں نے کہا تم نے جو کچھ کیا بہتر کیا چنانچہ وہ اسی حالت میں زندہ رہے پھر موت کے وقت ان کو شہادت نصیب ہوئی اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کی دعا قبول فرمالی ہے۔

کیونکہ زندگی کی ایک ساعت میں ان کو اپنے مولا کی ساتھ سچا تعلق نصیب ہو گیا تھا۔

صدق و اخلاص حاصل کرو

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں　　گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

ایک نالہ بھی اگر وہاں قبول ہو جاوے اور قبول ہوتا ہے خلوص سے تو وہی کام بنانے کے لئے بس ہے خلوص کی کوشش میں لگے رہو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے یہ دولت ہمیں عطاء فرمائیں آمین اور اس مضمون کی تقویت جس کو ہم بیان کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ھو الغفور الرحیم

فرما دیجئے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر بے فکر نافرمانی کر کے ظلم کیا ہے تم اللہ کی

رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش سکتا ہے۔ یقیناً وہی بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

قولہ الوجہ الثامن والثلاثون فیہ دلیل آخر علی قوۃ الرجاء الی قولہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً

ف حضرات فقہاء اور صوفیہ دونوں نے فرمایا ہے کہ اگرچہ دعا میں ادعیہ ماثورہ کا اختیار کرنا افضل ہے مگر اس کی پابندی کی ضرورت نہیں اگر کسی وقت کسی بات کے لئے اپنی زبان میں اپنے محاورہ میں دعا کرنے کو دل چاہے تو بے تکلف جس لفظ سے چاہے دعا کرے بس اتنی بات کی رعایت ہے کہ حرام چیز کی دعا نہ ہو اور حدود سے تجاوز نہ ہو۔

(۱۸۳) اصل نعمت مولا کی توجہ والتفات اور اس کا خطاب و جواب ہے

حدیث کے اس فقرہ میں نیقول و عزتک وہ بندہ کہے گا نہیں قسم آپ کی عزت کی میں اس کے سوا کچھ نہ مانگوں گا۔ ایک صوفیانہ استنباط ہے وہ یہ کہ فرحت اور خوشی کے غلبہ میں یہ شخص جلدی سے قسم کھائے گا، پھر صوفیہ کے مذاق پر تو اس خوشی کا منشا التفات خطاب ہے محض حاجت کا پیدا ہونا نہیں کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص صرف حاجت کے پیدا ہونے ہی کو نعمت سمجھتا ہے وہ محجوب ہے، بلکہ اصل نعمت مولیٰ کی توجہ و التفات اور اس کا جواب و خطاب ہے اور اہل حجاب کہتے ہیں کہ یہاں اس شخص کی خوشی کا منشا حاجت کا پورا ہونا ہے اس لئے وہ جلدی سے قسم کھائے گا۔ مگر انہوں نے اس شخص کو بھی اپنی طرح محجوب سمجھ لیا ہے حالانکہ جس کو اللہ تعالیٰ سے خطاب و جواب کی دولت عطا ہو گئی وہ محجوب نہیں رہتا بلکہ واصل بن جاتا ہے اور واصل کو اصل فرحت محبوب کے خطاب سے ہوتی ہے۔

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو کچھ بھی دولت ایمان عطا ہوئی ہے وہ کسی نہ کسی وقت وصول سے کامیاب ہوگا چنانچہ یہ مسلمان جو سب سے پیچھے جہنم سے نکلے گا ظاہر ہے کہ سب سے ادنیٰ درجہ میں ہوگا مگر دولت ایمان سے کامیاب تھا اس لئے وصول سے سرفراز ہوا گو سب کے بعد ہی سہی اللہ تعالیٰ سے کلام و سوال و جواب اور رضا ہی کا نام تو وصول ہے ہاں وصول کے درجات ہیں کسی کو اعلیٰ درجہ حاصل ہے کسی کو ادنیٰ مگر کوئی مومن وصول سے محروم نہ رہے گا یہی وہ ولایت عامہ ہے جو ہر مسلمان کو حاصل ہے

اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور، اور یہی معنی اس حدیث کے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ لیس لہا دون اللہ حجاب واللہ تعالیٰ اعلم، اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ایمان کتنی بڑی دولت ہے مسلمانوں کو اس دولت کی قدر کرنا اور اس کی حفاظت میں کوشش کرنا چاہیے کہ آجکل اس دولت پر ڈاکہ ڈالنے والے بھی بہت پیدا ہو رہے ہیں۔

(۱۸۴) حرص وطمع انسان کی جبلت ہے

حدیث کا یہ مضمون کہ وہ شخص خاموش رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے پھر کہے گا اے رب مجھے جنت کے دروازہ تک پہنچا دیجئے، حق تعالیٰ فرمائیں گے کیا تو نے عہد و میثاق نہ دیا تھا کہ اور کچھ نہ مانگوں گا۔ بتلاتا ہے کہ انسان بالطبع حریص واقع ہوا ہے چنانچہ جب وہ جلنے سے بچا دیا گیا اور جنت کا منظر دیکھنے لگا تو اس سے صبر نہ کر سکا کیونکہ طمع اس کی طبیعت ہے۔ اب غلبۂ طمع کی وجہ سے وہ سارے عہد و پیمان بھول گیا اور جنت کے نزدیک پہنچنے کی درخواست کرنے لگا جو کہ جنت کا دروازہ ہے کہ شاید وہاں پہنچنا نصیب ہو جائے۔

ناقص اپنے نقصان ہی کے موافق مانگا کرتا ہے

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ضعیف اپنے ضعف کے موافق ہی درخواست کیا کرتا ہے چنانچہ اس شخص نے اولاً یہ درخواست کی کہ جہنم کے قرب سے بچا دیا جائے اور بعد میں جو درخواست کی اس سفر کی ابتداء میں اس کی جرأت نہ کر سکا کیونکہ وہ اپنے کو اس سے زیادہ کا اہل نہ سمجھتا تھا اور اگر وہ یہ دیکھ لیتا کہ میں کس سے مانگ رہا ہوں تو پہلے ہی وہ مانگ لیتا جو اخیر میں طلب کیا

ناامیدی کے وقت نفس تھوڑے پر بھی قناعت کرلیتا ہے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ناامیدی کے وقت نفس تھوڑے پر بھی قناعت کر لیتا ہے چنانچہ اس شخص نے اپنے عمل ناقص کی وجہ سے (دفعۃً) جنت میں پہنچنے کی طمع نہیں کی صرف اتنی امید کی کہ جہنم سے بچا دیا جائے کیونکہ اس سے زیادہ کی اس کو امید نہ تھی، اسی لئے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ نفس کو مباحات سے بالکل روک دو خواہ ضروری ہوں یا غیر ضروری کہ اسی طرح تم اس کے ساتھ بقدر ضرورت مباحات پر صلح کر سکتے ہو اور جب بالکل روک دینے کے بعد تھوڑی سی اجازت اس کو دیدی جائے گی تو وہ

خوش بھی ہو جائیگا مثلاً چند لقمات کے لئے کھانے سے ایک دم اس کو روک دو تو پھر چند لقموں پر اس سے صلح کر سکو گے جن سے کمر سیدھی ہو جائے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا کر دیں حسب ابن آدم لقیمات یقمن صلبہ اور اگر نفس اپنی طمع پر قائم رہا رجا اس کو نہ دبایا گیا، تو وہ ساری دنیا لیکر بھی قناعت نہ کریگا۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لوان لابن آدم وادیین من ذھب لابتغی لھما ثالثا۔ اگر ابن آدم کے پاس سونے کے بھرے ہوئے دو جنگل بھی ہوں تو وہ ان کے ساتھ تیسرے کی طلب کریگا اور اہل توفیق نے فرمایا ہے۔

من لم یرض بالیسیر فھوا سیر

جو تھوڑے سے راضی نہ ہو وہ (نفس کا) قیدی ہے

قولہ فی الوجہ الثانی والاربعین قولہ سکت ماشاء اللہ ان یسکت الی قولہ فی الوجہ الرابع والعشرین من لم یرض بالیسیر فھوا سیر۔

ف عارف طالب دنیا نہیں ہوتا لہٰذا اس طریق کا پہلا قدم ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ دل سے دنیا کی محبت اور طلب نکل جائے عارف طالب دنیا نہیں ہوتا طالب آخرت ہوتا ہے اور بقدر ضرورت کسب دنیا زہد کے خلاف نہیں بلکہ ماموربہ ہے اور بلا طلب کے زیادہ مل جائے تو اس کا لے لینا بھی زہد کے خلاف نہیں کیونکہ صحابہ میں بعض اغنیاء بھی تھے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مال تھا مگر وہ طالب دنیا نہ تھے خدا تعالیٰ نے عطا فرمایا تو انہوں نے اس کو قبول کر لیا اور مصارف خیر میں خرچ کیا کما جاء فی الحدیث عن ایوب علیہ السلام حین امطر علیہ جراد من ذھب فجعل یحثوہ فی ثوبہ وقال لہ ربہ الم اغنک عن ھذا قال بلی یارب ولکن لا غنی بی عن برکتک واللہ تعالیٰ اعلم ونعوذ باللہ من شرور انفسنا

ف مجاہدہ کے ارکان مجاہدہ کے چار ارکان جو صوفیہ نے بیان فرمائے ہیں ۱۔ تقلیل طعام

۲۔ تقلیل منام

۳۔ تقلیل کلام

۴۔ تقلیل اختلاط مع الانام

ان میں سے نمبر اول و دوم آجکل تعلیم میں متروک ہیں کیونکہ لوگوں کے قوی خود ہی ضعیف ہیں کھانا، سونا کم کرنے سے ضعف زیادہ ہوجاتا ہے اور انسان ناکارہ ہوجاتا ہے بس کھانے میں اتنا مجاہدہ بس ہے کہ تھوڑی سی بھوک رکھ کر کھایا کرے پوری طرح شکم سیر نہ ہوا کرے اور شام کو پانی کم پیا کرے۔ نیند کے متعلق اتنا مجاہدہ کافی ہے کہ چھ گھنٹہ سے زیادہ نہ سویا کرے اس سے کمی کرنا دماغ کو مضر ہے۔

البتہ تقلیل کلام اور تقلیل اختلاط کی اس زمانہ میں پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے اس لئے محققین طریق ان دونوں مجاہدوں پر آجکل زیادہ زور دیتے ہیں کیونکہ زیادہ گناہ زبان سے آنکھ سے کان سے ہوتے ہیں اور ان کا یہی طریق ہے کہ بلا ضرورت بات نہ کی جائے اور سب سے الگ رہا جائے بلا ضرورت لوگوں سے نہ ملا جائے۔

(۱۸۵) اللہ تعالیٰ کے کمال لطف کا بیان

اس میں اللہ تعالیٰ کے کمال لطف پر بھی دلالت ہے کہ وہ بنی آدم کے ساتھ کس قدر مہربانی کا معاملہ فرماتے اور ان کے عذروں کو کیسا قبول فرماتے ہیں کیونکہ وہ ان کے ضعف کو جانتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اولاً اس شخص کے سب وعدے اور عہد قبول فرمائے اور اس کی ایک درخواست پوری بھی کردی حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ شخص جنت اور اس کی راحت کو دیکھ کر صبر نہ کرسکے گا اور یقیناً اپنے عہد اور وعدہ کو توڑے گا پھر بھی اس کے وعدے اور عہد کو قبول فرماتے ہیں اسی کی نظیر حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے

وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ ویعفو عن السیئات ویعلم ما تفعلون

وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور ان کے گناہوں سے درگذر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

قبول توبہ کی خبر دینے کے بعد ویعلم ما تفعلون بڑھانے میں ایک لطیف نکتہ ہے

ورنہ بظاہر یہاں اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ قرآن میں یہ مضمون بہت جگہ آچکا ہے کہ اللہ عزوجل ہمارے اعمال سے باخبر ہیں اور یہ تو شرطِ ایمان ہے کہ اس کا یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے تمام اعمال وضمیر کا علم ہے۔ مگر یہاں اس کو اس لئے بڑھایا گیا ہے کہ توبہ کرنیوالوں میں سے بعض تو اپنی توبہ پر قائم رہتے ہیں اور بعض اس کو توڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون توبہ پر قائم رہے گا اور کون اس کو توڑے گا مگر باین ہمہ وہ سب کی توبہ قبول کر لیتے ہیں اور بلا درجہ میں قبول کرتے ہیں، سب کو توبہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں اور ہر توبہ کرنے والے کی مدد بھی فرماتے ہیں، گو وہ بعد میں توبہ کو توڑ ہی دے، اس کے متعلق وہ حدیث کافی دلیل ہے جو بنی اسرائیل کے ایک شخص کے متعلق وارد ہوئی ہے کہ وہ گناہ کرتا پھر تائب تھا پھر توبہ کرتا تھا پھر گناہ کرتا پھر توبہ کرتا تھا یہاں تک کہ ملائکہ نے عرض کیا اے پروردگار! آپ اس بندہ کو نہیں دیکھتے کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے کہ گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے توبہ کے بعد بھی گناہ سے باز نہیں آتا، حق تعالیٰ جل جلالہ نے فرمایا اے فرشتو! کیا تم میرے بندے کی اس بات کو نہیں دیکھتے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ پر مواخذہ کرتا اور توبہ کو قبول کرتا ہے۔ قسم ہے میری عزت کی میں ہمیشہ اس کی توبہ قبول کرتا رہوں گا جب تک بھی وہ توبہ کرتا رہے گا۔ سبحان اللہ کیا لطف و کرم ہے ؎

اے خدا قربان احسانت شوم   وہ چہ احسان است قربانت شوم

قال الرومی ؎

دگر خشم گیرد بکردار زشت   چو باز آمدی ماجرا در نوشت

وقال الآخر ماکیا حسن درتبہ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

المؤمن التواب یبقی لہ فضلۃ من عملہ یدخل بہا الجنۃ

ہمیشہ توبہ کرنیوالے مؤمن کے پاس کچھ تو عمل کا مزد رہتا ہے جس کی وجہ سے

وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

قولہ الوجہ الخامس والاربعون فیہ دلیل علی لطف اللہ عزوجل ببنی آدم الی قولہ فیدخل بها الجنۃ

(۱۸۶) انسان اپنی بھلائی کے لئے ہر ممکن حیلہ کو کام میں لاتا ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان اپنی بھلائی کے واسطے کیسے کیسے حیلے کرتا ہے چنانچہ اس شخص نے اول تو یہ درخواست کی کہ جہنم سے دور کر دیا جائے کہ شاید اس طرح کچھ تھوڑا سا ساتھ نیک بندوں کے ساتھ حاصل ہو جائے (جب یہ درخواست پوری ہو گئی تو آگے بڑھا) یہ تو خدائے علیم وخبیر کے ساتھ انسان کا دقیق حیلہ ہے دوسروں کے ساتھ اس کا کیا حال ہوگا اسی لئے آخری درخواست پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہنس پڑیں گے۔

ہر شخص کی جتنی عقل وتدبیر دنیا میں ہے، وہ آخرت میں بھی باقی رہے گی

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان کی جتنی عقل اور فکر اور تدبیر دنیا میں ہوگی وہ آخرت میں بھی باقی رہے گی کیونکہ وہ اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جو یہاں اس کی حالت تھی جس کی دلیل یہ لطیف حیلہ ہے (جو اس شخص سے صادر ہوگا) نیز حدیثوں میں جو روح ونفس کا مناظرہ مذکور ہے (وہ بھی اس کی دلیل ہے) اور اس کے سوا اور بھی بہت احادیث اس باب میں وارد ہیں۔

قولہ الوجہ السادس والاربعون فیہ دلیل علی کثرۃ تخیل بنی آدم الی قولہ فی الوجہ السابع والاربعین وغیر ذلک من الاحادیث مما یشبہ ذلک

(۱۸۷) جس کو جس عمل سے فتح باب اور کامیابی ہو رہی ہو اس کو لگا رہے

حدیث کا یہ لفظ کہ اخیر میں حق تعالیٰ فرمائیں گے ویحک یا ابن آدم ما اغدرک اے ابن آدم! تیرا ناس ہو تو بہت ہی غدار ہے۔ یہ پہلے سے زیادہ سخت ہے کیونکہ اس نے

تین دفعہ عہد شکنی کی تھی، بار بار عہد کو توڑ چکا تھا، مگر وہ بھی اپنی ایک بات پر برقرار ہے کے
جواب میں ہمارا اس پر زیادتی بھی نہیں کی اور کمی بھی نہیں کی وہ یہی کہتا رہا۔ اس لا تعلق
اشقی خلقت خداوندا اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدقسمت مجھے ہی نہ بنا۔ کیونکہ جب یہ بات
اس نے پہلی بار قبول کر لی تھی اور دوسری بار بھی اور جو کچھ اس نے کہا تھا اس کی وجہ سے مستحق
ہو رہا تو دعا کی بات۔ یہ جملہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من سرہ
من مطلب فضیلۃ مہ جس کو بھی دعا سے دونوں مل دیں پھر اس کو لگا ہے تو اس
شخص نے اس علم کی تحصیل مشقت میں کی اگر دنیا میں اس بات پر عمل کر لیتا تو اس کو اس
قسم کی فرصت ہی واقع نہ ہوتی۔

قوله الوجه السابع والاربعون فيقول الله وعلمت يا ابن آدم الى قوله ما المنابع الى هذا[1]

(۱۸۸) کسی شخص کو کسی وصف سے اس وقت تک موصوف کیا جائے جب تک کم از کم تین بار اس کا ظہور نہ ہو

اور تیسری بار میں حق تعالیٰ کا لفظ ما المنابع سے خطاب فرمانا بتلاتا ہے کہ کسی شخص کی طرف کسی وصف
کی نسبت اس وقت تک کی جائے جب تک اس سے بار بار اس کا ظہور نہ ہوا اور تکرار کا کم از کم
عدد تین ہے جس کے بعد کسی وصف کی نسبت اس کی طرف ہو سکتی ہے کیونکہ پہلی بار اور
دوسری بار میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ غلطی اور بھول چوک ہو گئی ہو یا ایک بار غلطی ہوئی ہو دوسری
بار بھول چوک ہوئی ہو اور تیسری بار محض قصد ہی سے عمل ہوتا ہے اس وقت یہ بات محقق ہو گی کہ
اس سے پہلے بھی قصد موجود تھا خواہ عمل صالح کا قصد ہو یا اور کچھ ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے اس شخص
کو تیسری دفعہ سے پہلے غدار نہیں فرمایا۔

ف: یہ قاعدہ اوصاف ذمیمہ سے متعلق ہے اور اوصاف حمیدہ میں ایک دفعہ کے صدور سے
بھی نسبت جائز ہے ۱۲

غدر انسان کی جبلت ہے

یہاں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے تیسری دفعہ میں جو اس کو ابن آدم کہہ کر خطاب فرمایا تو ہمیں ....

بتلایا گیا ہے کہ انسان میں بے وفائی اصل ہے۔ یہی وصف اسمیں غالب ہے مگر جس کو حق تعالیٰ بچائیں وہ البتہ بچتا ہے۔

تزکیۂ اخلاق محض فضل سے ہوتا ہے۔

اور تزکیۂ اخلاق فضل کے واسطہ سے ہوتا

ولولا فضل الله علیکم ورحمته ما زکی منکم من احد ابدا

اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہو سکتا

وان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی

اور نفس تو بدی ہی کا حکم کرنے والا ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرما دیں

اور ابن آدم کہنے میں تو بیخ کے ساتھ ایک خاص لطف بھی ہے کیونکہ کریم کی دھمکی کثرت عطا کا پتہ دیتی ہے (کریم جب کسی کو دھمکاتا ہے تو اس کو مالا مال بھی کر دیتا ہے) اور بخیل کی دھمکی یہ بتلاتی ہے کہ کچھ بھی نہ دے گا اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ قیامت کے دن مومن سے بہت چھپا کر حساب لیں گے کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے میرے بندے تو نے ایسا کیا تھا ویسا کیا تھا بندہ اپنے مولیٰ کے سامنے ان سب کا اعتراف کرے گا حتیٰ کہ وہ سمجھ جائے گا کہ بس میں تو کثرت گناہ کی وجہ سے ہلاک ہوا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیرے ان عیبوں کو لوگوں سے چھپایا ہے اور آج بھی تیرے لئے ان کو بخشتا ہوں تم نے دیکھا کہ کریم کی دھمکی کا انجام کیسا عجیب ہوا کہ جب غلام کو ہلاکت کا یقین ہو گیا فوراً کرم شروع ہو گیا اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو یاد نہ دلائیں اور بدون حساب کتاب کے ہی اپنی رحمت سے بخش دیں اور فرشتوں سے یوں فرما دیں۔

جنت بھی محض فضل سے ملیگی

کہ میرے بندے کو محض میری رحمت کی بناء پر جنت میں لیجاؤ تو انسان کی اس سے پوری تسلی نہ ہوگی اس کے دل میں یہ کھٹکا رہے گا کہ محض رحمت سے تو نہیں بلکہ کچھ اپنے عمل سے بھی جنت کا مستحق ہوا ہوں جیسا بنی اسرائیل میں ایک شخص کا قصہ (آتا) میں آتا ہے کہ وہ ایک جزیرہ

میں رہتا تھا جو سمندر کے بیچ میں دنیا سے الگ تھا اس کے پاس وہاں کوئی آدمی نہ تھا وہ تنہا اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا اور کسی وقت عبادت میں سستی نہ کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جزیرہ میں اس کے واسطے ایک انار کا درخت پیدا کر دیا تھا جس پر روزانہ ایک ہی انار پیدا ہوتا اور ایک ہی دن میں بڑھتا اور پک جاتا جسے یہ عابد کھا لیا کرتا تھا اور پانی کا ایک چشمہ بھی اس کے واسطے جاری کر دیا گیا تھا جس سے سیراب ہوتا تھا ایسے حال پر وہ پانچ سو برس تک زندہ رہا پھر اس نے حق تعالیٰ سے درخواست کی کہ سجدہ کی حالت میں اس کی روح قبض کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ تحفہ بھی اس کو عطا فرما دیا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عابد کے متعلق ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اس کو لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے کہ میرے اس بندہ کو محض میری رحمت کی بنا پر جنت میں لیجاؤ اس پر وہ بولے گا نہیں اے رب بلکہ میرے عمل کی وجہ سے؟

پس اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیں گے کہ اس سے صرف بینائی کی نعمت کا تو حساب لو کہ اس کا شکریہ ادا کیا یا نہیں، ملائکہ حساب کریں گے تو پانچ سو برس کی عبادت اس ایک نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے بھی کافی نہ ہوگی اس کے سوا اور نعمتوں کا کیا ذکر وہ تو سب ویسی کی ویسی ہی رہ جائیں گے ان کا حق تو کچھ بھی ادا نہ ہوگا، اس وقت وہ عابد عرض کرے گا اے رب مجھے جنت میں اپنی رحمت سے پہنچا دیجئے، حق تعالیٰ فرمائیں گے (ہاں ہاں) تو تو بہت اچھا بندہ تھا فرشتو! میرے بندے کو میری رحمت کی وجہ سے جنت میں لے جاؤ تو جب اس نے گناہوں کا اقرار لے لیا اس وقت اس کے لئے چند در چند خوشیاں جمع ہو گئیں ایک خوشی گناہوں کی مغفرت کی، ایک خوشی پردہ پوشی کی کہ اس کو رسوا نہیں کیا گیا۔ ایک خوشی اس راحت کی جو جنت میں پہنچا کر اسے عطا کی گئی اس طرح اس کے پاس بہت سی نعمتیں جمع ہو گئیں تو وہ منعم سے پوری طرح راضی ہو گیا اور یہ بھی منعم کی طرف سے بڑا انعام ہے کہ

عہ سبحان اللہ جب بندہ کو اپنے عمل کا ہیچ ہونا مشاہد ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ اسکے عمل کی تعریف فرما رہے ہیں کہ تو تو بہت اچھے عمل کرتا تھا۔ یہ سب ہے شانِ کرم اور یہ ہے رحمت و فضل۔ ۱۲

منعم علیہ کو انعام کی حقیقت اور عظمت سے خبردار کرے تاکہ اس کو پوری مسرت اور لذت حاصل ہو۔ الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ بھی (بندہ پروری) نہ جانے گا حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔ اسی طرح یہاں جب اللہ تعالیٰ نے اس آخری جنتی پر اپنے فضل سے یہ انعام کرنا چاہا کہ عزت کے گھر یعنی جنت میں اس کو پہنچائیں تو پہلے اس کو بہت دھمکایا اور اس سے اقرار کرایا کہ وہ بڑا مجرم ہے اس کی طبیعت میں بھی غدر ہے اور باتوں میں بھی دنیا میں بھی غداری سے کام لیتا تھا اور آخرت میں بھی اس سے باز نہ آیا دونوں جگہ غدر کو اپنے ساتھ لئے رہا جب اس نے اپنی خطا کا اقرار کر لیا تو محض رحمت سے جنت میں بھیج دیا جس سے اس کو بے انتہا خوشی اور چند در چند لذتیں حاصل ہوئیں۔

قولہ فی الوجہ السابع والاربعین ولکونہ عزوجل نوادھنالک ما الغدرماک الی

قولہ فی الوجہ الثامن والاربعین ومستصحبا فی الدارین

ف: یہ جو فرمایا گیا کہ تزکیہ اخلاق اور دخول جنت محض فضل سے ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے لئے عمل اور کوشش کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ عمل اور کوشش کے بعد بھی جس کو یہ دولت حاصل ہو جائے وہ اس کو اپنی کوشش کا ثمرہ نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھے جس کو اللہ تعالیٰ اس دولت کے لئے عمل کی توفیق دے دیں سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل کرنا چاہتے ہیں ورنہ انسان کا نفس تو بدی کی طرف ہی جاتا ہے۔

(۱۸۹) اللہ تعالیٰ کے فضل کی حرص کرنا چاہئے حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے فضل کی امید اور طمع رکھنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اپنی نعمت و رحمت کا مرتبہ یاد دلایا ہے کہ قیامت کے دن بہت سے گناہوں کو معاف فرمائیں گے اور اپنے فضل سے ان پر پردہ ڈالیں گے اور جو کچھ ہو چکا اس سے درگذر کریں گے۔ پس تم بھی اس فضل کو محض فضل ہی کی وجہ سے لئے ساتھ رکھو اور کسی وقت اس سے نظر قطع نہ کرو تاکہ یہ بات صحیح طور پر تم کو معلوم ہو جائے کہ نعمت کا عطا محض اللہ کے فضل ہی سے ہوگا اور یہ کیونکہ یا اس کا سبب ہدایت ہے یا عفو و درگذر ہے یا دونوں کا مجموعہ اور یہ سبب فضل ہی تو ہے جس پر چاہیں وہ کرنا چاہیں اور جس طرح

چاہیں کوئی ان سے سوال نہیں کر سکتا کہ ایسا کیوں کیا؟

امید کو ہر دم اپنے ساتھ رکھو

اور امید کی شان کو اپنے ساتھ رکھنا ہر دم اللہ سے امیدوار رہنا اگرچہ اللہ کی طرف سے کیسا ہی معاملہ دیکھے یہی ایمان کی علامت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون

خدا کی عطا سے ان لوگوں کے سوا جو کافر ہیں اور کوئی ناامید نہیں ہوتا

چنانچہ اس شخص میں جس کا قصہ حدیث میں ہے یہ صفت رجا باقی تھی اس کو اللہ سے ہر حال میں امید تھی اس سے اس کو پوری سعادت اور کامیابی حاصل ہو گئی کہ جنت میں پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی یہ نعمت بلا مشقت کے عطا فرما دیں وہی کارساز ہیں اور لائق حمد اور یہ جو فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اخیر میں اس کی بات پر ہنس پڑیں گے سو اللہ تعالیٰ کا ہنسنا ہمارے ہنسنے کے مشابہ نہیں جس کا منشا خفت و اضطراب ہوتا ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی بات کو سن کر طبیعت ہلکی ہوتی اور ہنسنے کے لئے بیتاب ہو جاتی ہے بلکہ اس میں اس معاملہ کی طرف اشارہ ہے جو بادشاہوں سے ہنسنے کے موقعہ پر صادر ہوتا ہے کہ جس کی بات سے وہ ہنستے ہیں اس پر بہت احسان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں کہ ان کی صفات مخلوقات کی صفات کے مشابہ ہوں مگر ہم سے اسی طرح خطاب کیا جاتا ہے جیسا اپنی عادت اور عرف کی بناء پر ہم بولتے اور سمجھتے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے مانگ کیا مانگتا ہے تو وہ اپنی تمنا بیان کرے گا یہاں تک کہ اس کی تمنائیں ختم ہو جائیں گی، سو تم خود اندازہ کر لو کہ ایک برا یا حرص و طمع کی تمنا کیا کچھ ہوگی جس نے بڑی خیر کو یعنی جنت کو کھلی آنکھوں دیکھ لیا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس سے یہ کہنے والا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ بڑا غنی اور بہت ہی کریم ہے اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تجھ کو یہ بھی دیا اور اتنا ہی اور، یعنی تمنا سے دو چند اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ذلک لک وعشرۃ امثالہ کہ تجھ کو یہ بھی دیا اور اس کا دس گنا اور یہ سب اس کے کرم کی شان جس کا کوئی مثل نہیں پس اصل عطا بھی اسی کے فضل سے ہے اور سنیا دتی بھی اسی کے فضل سے ہے مگر چونکہ اصل عطا میں بندہ کا بھی کوئی وصف مل گیا ہے خواہ عبادت یا

باب چہل ونہم ۴۹

حدیث

جواز الدعا فی الصلوٰۃ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے کوئی دعا بتلا دیجئے جس سے نماز میں دعا کیا کروں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں کہا کرو۔

اللھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرۃ من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم

اے اللہ میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور آپ کے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخش سکتا تو مجھے اپنے پاس سے مغفرت عطا کیجئے اور مجھ پر رحم فرمائیے کیونکہ آپ ہی غفور رحیم ہیں۔

شرح ظاہر حدیث سے نماز میں دعا کا جائز ہونا اور اس دعا کا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۹۱) بزرگوں سے تعلیم کی طلب کرنا چاہئے گو طالب صاحب معرفت بھی ہو

حدیث سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کی تعلیم کی درخواست کرنا چاہئے اگرچہ طالب کو ایک گونہ معرفت پہلے سے حاصل ہو کیونکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ

مجھے کوئی دعا بتلا دیجئے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ ان کو دعاؤں کی معرفت اس قدر تھی کہ صحابہ میں دوسروں کو نہ تھی ایک تو اس لئے کہ وہ فصاحت سے ممتاز تھے دوسرے ان کا ایمان قوی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں زیادہ رہے تھے مگر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت زیادہ لینی چاہی اس لئے حضور سے درخواست کی کہ آپ مجھے کوئی دعا بتلا دیجئے رہا یہ سوال کہ انہوں نے یہ کیوں کہا کہ کوئی دعا ایسی بتلا دیجئے جو نماز میں کیا کروں، اطلاق کیساتھ درخواست کیوں نہیں کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے نماز میں دعا کرنے کی خاص طور پر ترغیب دی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اقرب ما یکون العبد من اللہ اذا کان فی الصلوٰۃ

واقرب ما یکون فی الصلوٰۃ اذا کان ساجدا و بطنہ جائع

فاکثروا فیہ الدعاء فقمین ان یستجاب لکم ای حقیق

بندہ کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب اس وقت ہوتا ہے جب کہ نماز میں ہو اور نماز میں زیادہ قرب اس وقت ہوتا ہے جبکہ سجدہ میں ہو اور اس کا پیٹ خالی ہو بھوک لگ رہی ہو؟ پس تم سجدہ میں دعا زیادہ کیا کرو وہ اس لائق ہے کہ قبول کر لی جائے اس لئے ابوبکر صدیق نے یہ فرمایا کہ مجھے ایسی دعا بتلا دیجئے جو نماز میں کیا کروں۔

قولہ الوجہ الاول طلب التعلیم من الفاضل الی قولہ ای حقیق۔

ف حدیث کا یہ لفظ و بطنہ جائع صوفیہ کی اس تعلیم کی دلیل ہے کہ ذکر و فکر کے لئے ایسا وقت تجویز کرنا چاہئے جبکہ پیٹ خالی ہو یعنی نہ تو بہت بھرا ہوا ہو کہ سستی پیدا ہو نہ اتنا خالی ہو کہ بھوک سے بے تاب ہو کیونکہ ایسی حالت میں شارع نے کھانے کو نماز سے مقدم کرنے کا امر کیا ہے کما مر

حدیث سے یہ علمی مسئلہ بھی

(۱۹۲) عبادت میں اعلیٰ درجہ پر نظر کرنا چاہئے معلوم ہوا کہ انسان کو عبادت میں درجۂ اعلیٰ پر نظر کرنا اور قاعدۂ شرعیہ کے موافق اس کے اکتساب حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دعا کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی اگرچہ ایک حدیث میں اوپر گذر چکا ہے کہ دعا میں یہ بھی جائز ہے کہ اپنی حاجت ہی مانگے

اس سے بھی کامیابی کی امید ہے ۔ ادعیہ ماثورہ کی پابندی لازم نہیں ، مگر افضل یہ ہے کہ اسباب رحمت میں سے اعلیٰ و ارفع کو اختیار کیا جائے الفاظ میں بھی اوقات میں بھی مکان میں بھی اصول شریعت سے یہ سب باتیں معلوم ہو چکی ہیں اور اس بارہ میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب کا اشارہ ہی بہت کافی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب تم فارغ ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جاؤ کیونکہ اس میں جن امور کا ذکر ہے وہ سب کے سب امید قبول دُعا کے اسباب میں سے ہیں کیونکہ مخلوق کے مشاغل سے فراغ حاصل ہونا حضور قلب اور اخلاص حاصل ہونے کے اسباب میں سے بڑا سبب ہے اور رغبت و توجہ سے دوام تذلیل حاصل ہوتا اور بار بار ایسے الفاظ اختیار کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے جو رحم لانے والے ہوں اور انتصاب سے مراد نماز پڑھنا ہے جو تمام طاعتوں کو متضمن ہے کیونکہ وہ سب کی اصل ہے جب اصل طاعت کا امر کیا گیا تو دوسری اس کے ضمن میں خود ہی آ گئی ہیں ۔

قوله الوجه الشافی یترتب علی هذا من الفقه ان ینظر المرأفی عبادته الی الارفع الی قوله فتنبرة فی العمنی

(۱۹۳) دُعا کی حقیقت اور اس کے درجات

یہاں ایک سوال ہے کہ اللھم انی ظلمت نفسی الخ کو حضرت صدیق کی درخواست سے کیا تعلق ہے کیونکہ ادعیہ شرعیہ میں متعارف طریقہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ ہوں جن کے ضمن میں کوئی شے کا یا صفات جلیلہ میں سے کسی صفت کا اسماء الہیہ میں کسی اسم کا احترام ظاہر کیا جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

و لله الاسماء الحسنیٰ فادعوه بها

اللہ کے لئے اچھے اچھے نام ہیں تو تم ان کے وسیلے سے اللہ سے دعا کرو

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۔

ان اسم الله الاعظم ما دعا به احد الا اجیب ملخصا

کہ اللہ کا اسم اعظم کے وسیلے سے جو دعا بھی کوئی کرے ضرور قبول کی جاتی ہے

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اذا سألتم اللّٰہ فاسئلوہ بجاہی فان جاہی عند اللّٰہ عظیم جب تم اللہ سے سوال کرو تو میری جاہ کے وسیلے سے دعا کرو کیونکہ اللہ کے نزدیک میری جاہ بہت بڑی ہے۔ اس معنی میں آثار بہت ہیں اور دعائیں بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں بہت ہیں۔

جواب چند وجوہ سے ہے: اول یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق کا مقصود سمجھ گئے تھے کہ وہ ایسی دعا معلوم کرنا چاہتے تھے جو بالیقین قبول ہو جائے اور حکمت شریعت کے موافق ہو، جس سے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی نصیب ہو تو حضور نے ان کو عجیب اشارہ میں جواب دیا گویا آپ یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی حق حتمی طور پر واجب نہیں (کہ کسی دعا کو ضرور قبول ہی کر لیا کریں) بلکہ یہ تو محض استغنا ہیں جن سے جس کو چاہتے ہیں کامیاب کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں محروم کر دیتے ہیں جسے کامیاب کرتے ہیں محض اپنی طرف سے اپنے فضل سے کامیاب کرتے ہیں (اس کی دعا یا عمل کا دخل اس میں برائے نام ہوتا ہے حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا) پس سب سے بڑی چیز کو جو کہ مغفرت ہے اصل حقیقی سے مانگنا چاہیئے جو کہ فضل خداوندی ہے اس کے سوا کسی اور چیز سے اپنے خیال کو وابستہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور یہ ایسا ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات شریف کے متعلق فرمایا ہے

لن یدخل احد اعمله الجنة، قالوا ولا انت یا رسول اللّٰہ قال ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰہ بفضل و رحمتہ

کسی کو اس کا عمل جنت میں نہ پہنچائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اور آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل و رحمت سے ڈھانپ لیں (تو فضل سے جنت

ع اس حدیث کی صحت کی مجھے تحقیق نہیں نہ اس وقت کتابیں پاس ہیں کہ تحقیق کر سکوں کہ یہ مضمون بحالت سفر لکھ رہا ہوں کسی محقق عالم سے تحقیق کر لی جائے ۱۲ ظ

میں پہنچوں گا) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بنشانِ حکمت یہ کہتے ہیں (آپ ہی کو واسطہ سبب کو معرفت نصیب ہوئی عبادت کا طریقہ معلوم ہوا) اور اسی کے ساتھ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے۔

خمس صلوات افترضهن الله على عباده فمن جاء بهن لم ينتقص منهن شيئا استخفافا بحقهن فان الله جاعل له يوم القيمة عهدا ان يدخله الجنة۔

پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں جو اُن کو اسطرح بجالایا کہ ان میں کچھ کمی نہیں[عہ] کی ان کے حق کو ہلکا اور حقیر سمجھ کر تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے لئے اس بات کا عہد اور ذمہ لینے والے ہیں کہ اس کو جنت میں داخل کردیں گے اور یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ اسمیں دخولِ جنت کا سبب محض فضل کو بتلایا گیا ہے اور اس میں اعمال کو بتلایا گیا ہے سو ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ اعمال پر نجات کا وعدہ مقام عوام (کے لحاظ سے) ہے اور یہ بھی سچا وعدہ ہے جس کو ان کے لئے پورا کیا جائیگا (چنانچہ ارشاد ہے، ومن اوفى بعهده من الله فاستبشروا ببيعكم الذي بايعتم به اور جو تم میں سے اپنے عہد کو جو اس نے اللہ سے کیا ہے پورا کرے تو تم کو اس سودے سے خوش ہونا چاہئے جو تم نے اللہ کیساتھ کیا ہے) اور خلاصہ بظاہر عمل کو باقی رکھنے اور اسکی پابندی کرنے سے اعمال کے موافق ہوگی حکمت حکیم کی رعایت کے سبب اور حقیقی نجات محض فضل سے متعلق ہے یہ خواص کا مقام ہے جیسے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام خواص میں اخص الخواص ہیں اسیطرح جو لوگ قیامت تک اخلاص کیساتھ آپ کی پیروی کرنیوالے ہیں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی خواص میں

عہ یعنی ارکان و واجبات میں خلل نہیں ڈالا۔ اچھی طرح سب کو بجالایا ۱۲

عہ اور اگر دل میں تو نماز کی عزت و حرمت ہے مگر ظاہر میں سستی سے نماز میں خلل ہو جاتا ہے تو امید ہے کہ یہ کمی نوافل سے پوری کردی جائیگی ۱۲

سے ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارہ میں فرمایا ہے کہ
ابوبکر تم پر زیادہ نماز روزہ کی وجہ سے فوقیت نہیں لے گئے بلکہ اس چیز کی وجہ سے فوقیت
لے گئے ہیں جو ان کے دل میں جمی ہوئی ہے یعنی ایمان و تصدیق کامل، اور جس مقصد کو انہوں
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب کیا تھا وہ عوام کا مقام تھا تو گویا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اس دعا کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں کہ تم ان لوگوں میں ہو جن کا یہ مقام نہیں
جس کو تم نے طلب کیا ہے بلکہ تم کو تمہارے درجہ کے موافق جواب دیتے ہیں جو کہ خواص کا
مقام ہے جو شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کرتے ہیں تو شریعت کا مقتضا تو یہ ہے کہ
اعمال اور دعا وغیرہ کی پابندی کی جائے اور اس کو نجات کا سبب سمجھا جائیگا اور حقیقت
یہ ہے کہ دنیا جہان کی تمام بھلائیوں کو محض فضل پر موقوف سمجھے اور کسی شئے کو سبب نہ سمجھے
یہاں سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اس کے حال کے موافق جواب دیا جائے یعنی
اس کی صلاحیت دیکھ کر۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

انزلوا الناس علی منازلھم   لوگوں کو ان کے درجوں پر رکھا کرو۔

یہ ارشاد عام ہے گفتگو اور سوال وجواب کو بھی اور عملی برتاؤ کو بھی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے حضرت صدیق کو یہ تعلیم دی کہ اپنے مقصد کو مولیٰ عزوجل
کے پاس سے طلب کریں کیونکہ جب وہ اللہ عزوجل کے پاس سے بلا واسطہ عبد کے ہو کر عمل
نقص سے طلب کیا جائیگا تو بہت کامل ہوگا، پھر اس درخواست کو دو بزرگ ناموں یعنی
غفور و رحیم کے ذکر سے کامیاب کر دیا گیا جن میں سے ایک کا مقتضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے
جب سوال کیا جاتا ہے وہ عطا فرماتے ہیں اور اس دعا میں بھی یہی درخواست ہے کہ
اپنے پاس سے مغفرت و رحمت عطا فرمائیں تو مطلوب کی تحصیل میں یہ صورت زیادہ مؤثر
ہے اور دوسرا اسم کا مقتضی مغفرت ہے اور جس کی مغفرت ہوگئی اس پر رحمت ہوگئی اور
جس پر رحمت ہوگئی اس کی مغفرت بھی ہوگئی۔

نیز یہاں ایک اور احتمال بھی ہے وہ یہ کہ دعا کا قبول ہونا مشیت الٰہیہ پر موقوف
ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء

بلکہ تم اللہ ہی کو پکارتے رہو پھر وہ اگر چاہتے ہیں اس مصیبت کو دور کر دیتے ہیں جس کے لئے اللہ کو پکارتے ہو)، تو اللہ تعالیٰ نے اجابت کی دعا کی امید دلائی ہے قطعی وعدہ نہیں کیا، اور مضطر کے بارہ میں ارشاد ہے امن یجیب المضطر اذا دعاہ (زیادہ بہتر ہے جو مضطر کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے) یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مضطر کی دعا کا قبول کرنا اپنے ذمہ وعدۂ جمیل سے لازم کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر وعدہ کو وفا کرنیوالا کون ہے؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق کو دعا کی صورت سے ہٹا کر جو خوف ورجا کے درمیان ہوتی ہے حالت مضطر کی طرف منتقل کر دیا جسمیں اجابت کا ذمہ لیا گیا ہے، اور اضطرار کی حقیقت اس لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ظلمت نفسی ظلما کثیرا (کہ میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے) یعنی میرے پاس اس ظلم کے رفع کرنے کا کوئی حیلہ نہیں اور یہ (نہایت) احتیاج کی حالت ہے (پھر فرمایا ہے ولا یغفر الذنوب الا انت اور آپ کے سوا گناہوں کی مغفرت کوئی نہیں کر سکتا یہ نہایت اضطرار کی حالت ہے) کیونکہ جو شخص ان اسباب پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو جو گناہوں کی مغفرت کرا سکیں وہ پورا مضطر ہے کیونکہ اگر کسی کے پاس بڑے بڑے گناہ ہوں اور ان کے ساتھ ایسی چیزیں بھی بہت ہوں جو گناہوں کا کفارہ ہو سکیں تو وہ یوں نہیں کہا کرتا اغفر لی مغفرۃ من عندک (کہ مجھے اپنے پاس سے مغفرت عطا کیجئے کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو مغفرت کا سبب بن سکے)، تو ان دو لفظوں کے مضمون میں احتیاج محض (اور اضطرار حقیقی) کی حقیقت متحقق ہو گئی۔ دل میں اتر جانے والی باتیں ہیں اور تم خود سمجھدار ہو سمجھ جاؤ، میرے باپ ماں ان دونوں پر فدا ہوں کیسے اچھے معلم تھے اور کیسے اچھے متعلم۔ ان کے آثار کیسے عمدہ ہیں اور ان کے باطن کیسے منور اور ان کے احوال کس قدر بلند۔ اللہ تعالیٰ ہم پر بھی اپنے فضل سے ان دونوں حضرات کی برکتیں بار بار نازل فرمائیں۔ قولہ الوجہ الثالث قولہ علیہ السلام ہو قال قل اللھم انی ظلمت نفسی الخ ھذا بحث الی قولہ اعاد اللہ علینا من برکاتھا بمنہ

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ دعا میں نہایت احتیاج اور غایت اضطرار کی حالت اختیار کرنا چاہئے کہ صورت بھی مضطر کی سی ہو الفاظ بھی افتقار و اضطرار کے مناسب ہوں

محض سوال اور درخواست کے الفاظ پر کفایت نہ کی جائے اور یہ دولت اہل اللہ کی صحبت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ففی ذلک فلیتنافس المتنافسون

(۱۹۴) نفس ہر شر کا منبع ہے پس ہر حال میں اپنے کو خطاوار سمجھو!

یہاں ایک اور سوال ہے وہ یہ کہ حضرت صدیقؓ کا دعا میں یہ کہنا ظلمت نفسی ظلما کثیرا (کہ میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے) حقیقت پر محمول ہے یا مجاز پر؟ اگر مجاز ہے تو یہ بات محال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبب مغفرت کی تعلیم کرتے ہوئے مجاز کا استعمال کریں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی مقام طلب و رغبت میں اللہ تعالیٰ کو مجاز سے خطاب نہیں کر سکتے۔ پس اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے۔ اب اگر یہ حقیقت ہے تو وہ کون سا گناہ ہے، کیونکہ اسلام سے پہلے جو کچھ تھا اس پر تو مواخذہ نہیں اور اسلام کے بعد تو وہ سب کے سردار اور خیر میں متقدمین حیرۃ من دکسی؟ (جس کے متعلق کہا گیا ہے ظلمت نفسی ظلما کثیرا) اس کا جواب وہ ہے جو پہلے ایک حدیث میں یا ابن آدم کی شرح میں گذر چکا ہے کہ انسان کی اصل طبعی حالت ہو فائی (اور نقد) ہے۔ (یہی حالت اندر غالب ہے، مگر جس کو اللہ اس سے محفوظ کر دے) پس دنیا و آخرت میں جو خیر بھی ہم کو حاصل ہے یا ہوتی ہے وہ محض اللہ جل جلالہ کے فضل سے ہے خواہ اس طرح کہ ایسے اعمال کی ہم کو ہدایت کی جن کو حکمت الٰہیہ نے حصول خیر کا سبب بنایا ہے (یہ عوام کا مقام ہے) یا محض عفو و فضل سے بدون کسی عمل وغیرہ کے سبب کے (اور یہ خواص کا ذوق ہے) ہمارے اس قول کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے؛

وَمَا بِکُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے؛

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَکٰی مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا

اور اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا

نیز ارشاد ہے،

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ کہ نفس تو برائی ہی کا امر

کرنیوالا ہے مگر جس پر اللہ کا رحم ہو جائے۔

تو نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق رضی اللہ عنہ کو متنبہ فرمایا کہ اصل کا اقرار کریں جس حالت پر نفس کو فطرۃً بنایا گیا ہے اس کا اعتراف کریں یہی سچی حقیقت ہے اور اس کے بعد خیر تام کو جو مغفرت و رحمت ہے اصل حقیقی سے یعنی غفور رحیم سے طلب کریں (اپنی کسی شے کو مغفرت و رحمت کا سبب نہ سمجھیں) اسی لئے بعض اہل خیر نے فرمایا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز بڑھ ہو سکتی ہے خواہ ظاہراً یا باطناً بجز نفس کے کہ وہ اہل حقیقت و معرفت کے نزدیک کبھی بڑا نہیں ہو سکتا بلکہ جس قدر سالک کی معرفت بڑھتی ہے اسی قدر نفس کی ذلت و حقارت ان کی نظر میں بڑھتی جاتی ہے سیدی حضرتؒ اس قول کی صحت پر شاہد ہے کیونکہ جب وہ شخص جو صدق و تصدیق کے انتہائی مقام پر پہنچا ہوا ہے اس انتہا کے بعد بھی اتنے بڑے اعتراف کی طرف بلایا گیا ہے جس کا ابھی بیان ہوا تو کیا اس کی نظر میں نفس کی کچھ بھی قدر باقی رہ گئی ہوگی معاذ اللہ ہرگز نہیں۔ پس جس کو خلاص اور اخلاص کی طلب ہو اس کو ان کے راستہ پر چلنا اور نفس کو مٹانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے فضل سے ان کے سلسلہ میں داخل فرمائیں (آمین)

قولہ الوجہ الرابع ہذا بحث فی قول ہذا السند ظلمت نفسی الی قولہ ضمنا[1] فی سلکھم بمنہ

ف سچ ہے خودی کو مٹا دو خدا سے مل جاؤ گے دع نفسک و تعالی ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظا ازمیان برخیز

تو در گم شو وصال این ست و بس گم شدن گم کن کمال این ست و بس

مگر یہ دولت محض الفاظ یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتی کاملین کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ رزقنا اللہ وایاکم ذلک بمنہ وفضلہ آمین

باب ہنجاہ (۵۰)

حدیث

رفع الصوت بالذکر بعد الصلوٰۃ

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا جس وقت لوگ فرض نماز سے فارغ ہوکر واپس ہوتے۔

شرح ظاہر حدیث کا مدلول یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے تو ذکر کی آواز سنی جاتی تھی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے

نمازوں کے بعد ذکر جہر کی تحقیق صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہل صفہ تو بلا حاجت ضروریہ کے مسجد سے نکلتے ہی نہ تھے بلکہ ہمیشہ مسجد ہی میں رہتے تھے اور بعض صحابہ دوسری نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر بیٹھے رہتے تھے کیونکہ اس میں ثواب ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

فذلکم الرباط فذلکم الرباط فذلکم الرباط ثلاثا

یہی حدود کی محافظت ہے یہی حدود کی محافظت ہے یہی حدود کی محافظت ہے تین بار اس قول کو دہرایا پس اب اس حدیث کو عموم پر محمول نہیں کرسکتے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب صحابہ نماز کے بعد گھروں کو واپس ہوجاتے تھے۔ بلکہ خصوص پر محمول کیا جائیگا جس کو حدیث ذوالیدین میں اس لفظ سے بیان کیا گیا ہے خرج السرعان کہ جلدی کرنیوالے مسجد سے نکل گئے اور یہ وہ تھے جن کو ضروری کام ہوتے تھے وہ نماز کے بعد ذکر کرتے ہوئے مسجد سے

نکلتے تھے تاکہ ان سے کوئی مستحب فوت نہ ہو جائے کیونکہ نماز کے بعد ذکر کرنے کی فضیلت وارد ہے۔ غرض یہ حضرات اپنی ضرورتوں کے لئے جلدی مسجد سے نکل جاتے اور جلدی کی وجہ سے باآواز بلند ذکر کرتے تھے کیونکہ مسجد سے باہر اگر کوئی آہستہ ذکر کرے تو ممکن ہے کوئی اس سے بات کرنے لگے اور اس کو باتوں میں مشغول کر کے ذکر سے محروم کر دے اور حضرات صحابہ سب کے سب مستحبات کی پوری پابندی کرتے تھے (اس پابندی کی وجہ سے ہی مسجد کے باہر بلند آواز سے ذکر کرتے تھے) تو اگر اس علت کی وجہ سے جہر کیا جائے تو اس وقت جہر افضل ہوگا مفضول نہ ہوگا گو فی نفسہ ذکر خفی افضل ہے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ذکر خفی ذکر جلی سے ستر درجہ افضل ہے، یہ اس وقت ہے جبکہ دونوں علت سے خالی ہوں کیونکہ جہر میں بعض دفعہ ریا بھی داخل ہو جاتی ہے لیکن اگر اس غرض سے جہر کیا جائے کہ جہر نہ کیا جائے تو ذکر بالکل ہی فوت ہو جائیگا تو اس وقت جہر افضل ہوگا، اور ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر خفی کی فضیلت اس لئے بیان فرمائی ہو تاکہ لوگ جہر پر دوام نہ کرلیں جیسا راوی حدیث نے بیان کیا ہے (اور جہر پر ہمیشہ دوام نہیں ہو سکتا بعض دفعہ جہر سے دوسروں کو تشویش ہوتی یا سونیوالوں کو تکلیف ہوتی ہے) اور ممکن ہے یہ جہر کرنیوالے وہ لوگ ہوں جو ابھی ابھی اسلام لائے تھے ان کو جہر سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ ان کو ذکر سے مانوس کرنا اور ایمان کی محبت ان کے دل میں ڈالنا مقصود تھا اور دوسروں کو افضل کی خبر دے دی گئی تاکہ جہاں تک ممکن ہو افضل پر عمل کریں اور بعض کے جہر پر سکوت کیا گیا تاکہ جواز پر دلالت ہو جائے۔ غرض اس میں مبتدیوں اور معذوروں کے لئے ایک نمونہ ہے پس دین آسان ہے۔

دوسری اس ذکر کی کیفیت میں گفتگو، سو اسمیں چند احتمالات ہیں ایک وہ جو ابھی بیان جاری کیا گیا کہ جہر کا منشا یہ تھا کہ نمازوں کے بعد جو ذکر ماثور ہے وہ فوت نہ ہو جائے (یعنی ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار اللہ اکبر اور سو پورا کرنے کے لئے ایک بار لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیٔ قدیر) اور یہ بھی احتمال ہے کہ مراد وہ ذکر ہو جو مسجد سے نکلنے کے وقت ماثور ہے کہ مسجد سے

نکلتے ہوئے بایاں پیر پہلے نکالے اور کہے اللھم افتح لی ابواب فضلك کہ اس وقت یہی سنت ہے اور یہ احتمال زیادہ ظاہر ہے اور اس فتویٰ میں حدیث اپنے ظاہر پر ہے گی (کہ) انصراف سے مراد مسجد سے گھر کی طرف لوٹنا ہے نماز سے فارغ ہونا مراد نہیں. پس حدیث سے نماز کے بعد مطلقاً ذکر جہر کا ثبوت نہیں ہو سکتا جیسا اہل بدعت کا معمول ہے) اور اس ذکر کے اظہار و اعلان کا فائدہ یہ ہوگا کہ ناواقف لوگ بھی اس سنت سے واقف ہو جائیں گے اور جس کا دل کسی فرودی فکر میں مشغول ہو وہ بھی ذکر کو سن کر متنبہ ہو جائے (اگر مشغولی کی وجہ سے بھول گیا ہو تو اس سنت کو یاد کر کے بجالائے) تو جہر کرنے والے کو ذکر کا ثواب دو طرح سے حاصل ہوگا ایک تو خود اپنے ذکر کی وجہ سے دوسرے نفع متعدی کی وجہ سے (کہ اسکے ذکر کو سنکر دوسرے بھی اس سنت کو بجالائے) کیونکہ اس نے اسی قصد سے جہر کیا تھا کہ دوسروں کو تعلیم دے اور ان کے دل میں یہ بات ڈالدے کہ اس وقت سنت یہ ہے جو میں نے ادا کی، جیسا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا جب آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم رات کو قرأت میں بلند آواز کیوں کرتے ہو کہا میں سونیوالوں کو بیدار کرنا چاہتا ہوں اور شیطان کو بھگانا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب کو پسند کیا اور فرمایا کسی قدر آواز پست کر دیا کرو اور صحابہ رضی اللہ عنہم سب ہی ایسے تھے کہ وہ کوئی عمل بدون نیت صالحہ اور رکنائی سنت کی رکوشنی کے نہیں کرتے تھے (پس جو حضرات مسجد سے نکلتے ہوئے اللھم افتح لنا ابواب فضلك بلند آواز سے کہتے تھے، ان کے جہر کا منشا بھی نیت صالحہ تھی)

اور اس سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ عمل سے پہلے نیت درست کرنا چاہیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خیر العمل ما تقدمتہ النیۃ بہترین عمل وہ ہے جس سے پہلے نیت (صالحہ) ہو۔

ایک عمل میں چند نیتیں جمع کرنے کی تحقیق

اور اگر کسی عمل میں خیر کی بہت سی

نیتیں جمع ہو سکیں تو سب کو جمع کر لینا چاہیئے کیونکہ اس سے ثواب بڑھ جائے گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ عمل واجب یا فرض نہ ہو کیونکہ اگر واجب ہوا اور اس کی نیت کے ساتھ کسی اور عمل کی نیت بھی ملا دی گئی تو اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے کہ فرض ادا ہوگا یا نہیں یا دونوں ادا ہو جائیں گے یا ان میں سے ادنیٰ ادا ہوگا یا اعلیٰ یہ چار قول ہیں مگر قران حج وعمرہ کی صورت مستثنیٰ ہے کہ وہاں ایک عمل کا دونوں کے لئے کافی ہو جانا متفق علیہ ہے (یعنی ایک ہی احرام دونوں کے لئے کافی ہو جاتا ہے) بشرطیکہ بعد میں ادائے دم بھی کی جائے (یعنی ہدی ذبح کی جائے) جیسا کتب فروع میں مذکور ہے۔

پس فرض میں تنہا اسی کی نیت کی جائے کسی اور عمل کی نیت اس کے ساتھ شامل نہ کی جائے تاکہ خلاف سے خروج ہو جائے اور فرض ذمہ سے (بالیقین) ادا ہو جائے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث میں فرض نماز سے مراد خاص صبح کی نماز ہو اس احتمال کی تائید کہ یہ حدیث نماز صبح کے ساتھ مخصوص ہے اس سے ہوتی ہے کہ جب ایک لفظ کو اطلاق اور تقیید کے ساتھ ذکر کیا جائے تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مخصوص کیا جاتا ہے اور دوسری احادیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے فارغ ہو کر حضرات صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے اور دریافت فرماتے تھے کہ تم میں سے کسی نے آج رات کوئی خواب دیکھا ہے اگر کسی نے خواب دیکھا ہوتا بیان کرتا اور آپ جو کچھ اللہ نے چاہا اس کے جواب میں فرماتے اور طلوع شمس تک صحابہ سے باتیں کرتے رہتے تھے اور آپ کی باتیں ذکر ہی ہوتی تھیں۔ اگر حدیث کا محمل یہ ہے تو اس وقت سے لے کر آج تک عمل اسی پر ہے کیونکہ آج بھی عموماً نماز سے فارغ ہو کر جب مسجد سے نکلتے ہیں تو لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں کیونکہ اس وقت راستہ میں خلوت ہوتی ہے بجز ان لوگوں کے جو نماز پڑھ کر نکلتے ہیں راستوں میں کوئی نہیں ہوتا اور نمازی بھی ایک دم سے نہیں نکلتے بلکہ متفرق طور پر مسجد سے نکلتے ہیں۔

اور قلوب اس وقت منور ہوتے اور ذکر سے راحت پاتے ہیں ، اور سلف کے گھر بھی قد آدم سے کچھ ہی اونچے ہوتے تھے تو گھروں میں سے بھی ذکر کی آواز سنی جاتی تھی گھر میں رہنے والے اسوقت بیدار ہوتے اور کسی عذر کی وجہ سے گھر میں مقید ہوتے تھے آج لوگوں کے ذکر کی آواز (گھروں میں سے) اس لئے سنی نہیں جا سکتی کہ عمارتیں بلند ہیں اور لوگوں پر نیند اور غفلت کا غلبہ ہے . پس عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس خبر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس وقت بھی بلند آواز سے ذکر کرنا ذکر خفی سے مفضول اور کمتر ہے کیونکہ جب آدمی راستہ میں اکیلا ہو تو اس وقت راستہ اور گھر برابر ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں (اور گھر میں بلند آواز سے ذکر کرنا ذکر خفی کے برابر ہے کہ اسمیں ریا کا اندیشہ نہیں)

نیز اس پر بھی تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اس وقت ذکر میں مشغول ہونا مؤکد اور ضروری ہے اس میں رغبت کرنا چاہیئے کیونکہ اس وقت ذکر میں مشغول ہونے سے رزق میں ترقی ہوتی ہے کیونکہ رزق طلوع فجر سے طلوع شمس تک کے درمیان تقسیم ہوتا ہے تو جو شخص اس وقت کسی عبادت میں مشغول رہے گا اس کا رزق بہت وسیع ہوگا جیسا حدیث میں آیا ہے . اور اس دلیل پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ جو طاعت زیادت رزق کا سبب ہو اس میں مشغول ہونا اولیٰ ہے کیونکہ اس سے دنیا و آخرت کی خیر حاصل ہوگی ، اس کے متعلق بہت سے آثار وارد ہیں اور اسی لئے اہل صفہ طلب رزق کا اہتمام بہت کم کرتے تھے کیونکہ ان کو اس حدیث پر اور اس کے امثال پر پورا یقین تھا تو وہ دونوں جہان میں بوجہ کامیاب تھے ، مگر یہاں ایک شرط ہے کہ طاعت میں خالص اللہ کے واسطے مشغول ہو جائے رزق کے واسطے مشغول نہ ہو جائے کیونکہ اگر رزق کے واسطے طاعت میں مشغولی ہوگی تو نہ دنیا ملے گی نہ آخرت

ف چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل صفہ کو فتوحات اسلامیہ کی وسعت کے بعد بڑے بڑے مناصب بھی عطا فرمائے اور بیت المال کے خزانے بھی اور یہ سب کچھ بلا طلب ہی کے ان کو حاصل ہوا ۱۲ ظ

اسی معنی میں کہا گیا ہے

ان الخیر بالطاعات منوط وصاحبھا بالبرکات موصوف

والمعاصی صاحبھا ممقوت و داراہ بالبلایا محفوفتان

خیر طاعات کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اور صاحب طاعات برکات سے موصوف ہے

اور گناہ والا مقت وغضب میں مبتلا ہے اور اسکی دنیا و آخرت دونوں کی دونوں

بلاؤں سے گھری ہوئی ہیں۔

نیز کہا گیا ہے۔

داراك بالطاعات مرجحتان وانفار السوء بھا معروف

تیرے دونوں گھر دنیا و آخرت طاعات ہی سے نفع مند ہوں گے اور طاعات

کے ذریعہ مصیبت سے بچنا سب کو معلوم ہے یہ بحث تو اس وقت ہے جبکہ

ذکر سے مراد وہ ہو جو مسجد سے نکلتے ہوئے مشروع ہے اور اگر انصراف سے مراد

نماز سے فارغ ہونا ہے مسجد سے نکلنا مراد نہیں، تو اس وقت یہ گفتگو نہ ہوگی

بلکہ دوسری تاویل ہوگی جو آگے آتی ہے۔ ابن بطال رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں

اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ احتمال یہ بھی ہے کہ نمازوں کے بعد

یہ ذکر جہر دشمن کے شہروں پر حملہ اور جہاد کی حالت میں ہو تو اگر حدیث کا یہ محمل ہے

تو اب بھی عمل اسی کے موافق ہے کیونکہ سنت یہ ہے کہ مجاہدین نماز سے فارغ ہو

کر پانچوں وقت بلند آواز سے ذکر (یعنی تکبیر) کہا کریں تاکہ دشمن کے دلوں پر

رعب غالب ہو جائے اور اگر اس پر محمول نہیں تو یہ حدیث بالاجماع منسوخ ہے

اور اجماع کے لئے کسی حجت کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود مستقل حجت ہے۔

قولہ الوجہ الثانی ان اھل الصفۃ الیٰ قولہ والاجماع لا یحتج علیہ

ف اس تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ نمازوں کے بعد معاً ذکر جہر بدعت ہے

جیسا بعض مبتدعین کا معمول ہے کہ ہر نماز کے بعد یا فجر و عصر کے بعد تین بار لا الٰہ

الا اللہ ضرب وجہر کے ساتھ کہتے اور تین بار حق حق حق کہتے ہیں اور عبداللہ بن عباس

کی یہ حدیث ان کی حجت نہیں ہو سکتی کیونکہ اسمیں بہت سے احتمالات ہیں جن کا ذکر گذر چکا اور اگر اس کو ظاہر پر رکھا جائے تو وہ اجماع سے منسوخ ہے۔ فقہاء امت صحابہ و تابعین کا اجماع ہو چکا ہے کہ نمازوں کے بعد بجز جہاد وغیرہ یا تکبیرات ایام تشریق کے ذکر جہر مشروع نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالحق والصواب

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ جو وظائف و اذکار دنیوی مقاصد کے لئے پڑھے جاتے ہیں ان میں ثواب نہیں جبکہ مقصود دنیا ہو، ثواب اس وقت ہے جب محض طاعت و رضائے حق کے لئے ان کو بجا لائے پھر دنیوی مقاصد اس کے غلام ہو کر خود ہی آجاتے ہیں ان کو مقصود نہ بنانا چاہیئے۔

———

باب پنجاہ و یکم [۵۱]

حدیث

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اور اس سے اسکی رعیت کے متعلق باز پرس کی جائیگی امام بھی نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اسکی رعیت کے متعلق سوال کیا جائیگا اور مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے ان کے متعلق باز پرس کی جائے گی عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائیگا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائیگا۔ راوی نے کہا مجھے گمان ہوتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مرد اپنے باپ کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا غرض تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے متعلق باز پرس ہوگی۔

شرح خلاصہ حدیث یہ ہے کہ جو شخص جس چیز کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۹۶) یہ ذمہ داری ان ہی امور میں منحصر ہے جنکا ذکر حدیث میں ہے یا دیگر امور کیطرف بھی متعدی ہے۔ اگر ہم علت سمجھنے کے قائل ہوں تو جہاں علت موجود پائیں گے حکم کو متعدی کردیں گے اور حدیث میں جن چیزوں کا خاص طور پر ذکر ہے اس کو قلیل سے کثیر پر تنبیہ کرنے کے باب سے سمجھا جائیگا کیونکہ علت سب جگہ امانت اور نگہبانی ہے اور قواعد شریعت اس بارہ میں بہت ہیں جو اس (تعدیہ) پر صراحتًہ یا ضمنًا دلالت کرتے ہیں۔ پس بیان حدیث کا فائدہ یہ ہے کہ ان امور پر متنبہ کیا جائے جن کا ذکر یہاں ہے کہ یہ فائدہ ایک معقول فائدہ ہے کیونکہ لوگ عام طور پر راعی اور ذمہ دار صرف خلیفہ اور سلطان ہی کو سمجھتے ہیں اس کو سوا جن لوگوں کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ذمہ دار نہیں سمجھتے چنانچہ مرد کہتا ہے کہ میرے گھر والے میرے واسطے مباح ہیں میرا اوپر ان کا کچھ حق نہیں بجز نفقہ (روٹی کپڑے) وغیرہ کے جو عادۃً مرد کے ذمہ ہوتا ہے اور اس سے صرف نفقہ کے متعلق باز پرس ہوگی یہ نہیں سوچتا کہ اس کے ذمہ اس سے زیادہ بھی کچھ حق ہے اسی طرح بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ کا مال میرا مال ہے مجھ پر اسکی باز پرس کیا ہے بلکہ وہی میرا اوپر حاکم ہے (جو کچھ باز پرس ہوگی باپ سے ہوگی) بیوی بھی یہی کہتی ہے غلام بھی یہی سمجھتا ہے اور اس جہالت کے درمیان حقوق ضائع ہوجاتے ہیں جن کی باز پرس ہوگی مگر لوگ ان حقوق کو غفلت میں برباد کر رہے ہیں، پس اس پر تنبیہ کردی گئی تاکہ ان لوگوں کی پوری خیرخواہی ہوجائے جو کسی ذمہ داری کے تحت میں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب ذمہ داروں سے زیادہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنیوالے ہیں (اس لئے آپنے تنبیہ فرمائی) بقیہ امانات اور ذمہ داریوں پر یہی مثالیں دلالت کررہی ہیں (ان ہی پر سب کو قیاس کیا جائیگا) چنانچہ سب سے بڑی ذمہ داری تو اس کی ہے جس کے لئے اطاعت وانقیاد کی بیعت کی جاتی ہے (مراد خلیفہ اور سلطان ہے) اس پر تو حدیث عبادہ بن الصامت میں گفتگو گزر چکی ہے اس کے بعد جن لوگوں کا ذکر ہے ان کے متعلق اس وقت کچھ بیان کیا جائیگا

جتنا اللہ تعالیٰ مدت ذمہ رہے گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

والرجل راع فی اهله و مسئول عن رعیته

مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان اور حاکم اور ذمہ دار ہے اس سے اس رعیت کے متعلق بازپرس ہوگی۔

یہاں اهل کا لفظ مبہم ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اہل کا اطلاق کبھی زوجہ پر آتا ہے جیسا اسامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ افک میں کہا تھا

اهلك يا رسول الله لا اعلم الا خيرا

یا رسول اللہ وہ آپ کی بی بی ہیں میں تو بھلائی کے سوا ان کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔ (مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں)

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اہل سے مراد وہ ہوں جن کا نفقہ مرد کے ذمہ شرعاً واجب ہوتا ہے جیسا نوح علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ ان ابنی من اهلی کہ میرا بیٹا بھی میرے اہل میں داخل ہے اور جیسا اللہ تعالیٰ شانہ نے ایوب علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے وو هبناله اهله و مثلهم معهم ہم نے ایوب علیہ السلام کو ان کے گھر والے عطا کر دیئے۔ اور ان کے مثل بھی ان کے ساتھ یہاں اہل سے مراد بیوی بچے سب ہیں۔ نیز غلام بھی اہل میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی منجملہ رعیت کے ہے جس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے متعلق هو من اهل البيت کہ وہ اہل بیت میں سے ہے حالانکہ وہ غلام (آزاد شدہ) تھے۔ نیز غلام کے لئے اپنی سیدہ کی زینت (ظاہرہ وجہ د کفین) کی طرف نظر کرنا مباح ہے جیسا محارم کے لئے مباح ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ او ما ملكت ايمانهن

حدیث میں دو نوں احتمال ہیں (کہ اہل سے صرف بیوی مراد ہے یا سب گھر والے مراد ہوں)

مگر ظاہر یہ ہے کہ اس کو عموم پر رکھا جائے کیونکہ فائدہ اس صورت میں عام و تام ہوگا نیز
اس لئے بھی عموم پر رکھنا اولیٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے اخیر
میں فرمایا ہے والرجل راع فی مال ابیہ کہ آدمی اپنے باپ کے مال کا بھی
نگہبان اور ذمہ دار ہے اور یہ نہیں فرمایا کہ باپ اپنے بیٹے کے مال کا نگہبان اور
ذمہ دار ہے کیونکہ بیٹا اہل میں داخل ہو چکا ہے اسی طرح یہ نہیں فرمایا کہ آدمی
اپنے غلام اور بیوی کا نگہبان ہے اور ذمہ دار ہے کیونکہ غلام اور بیوی بھی اہل
میں آچکے ہاں بیٹے اور غلام اور بیوی کی ذمہ داری کو آپ نے بیان فرما دیا تاکہ ہم کو معلوم ہو
جائے کہ جس طرح گھر کے مالک سے ان کے متعلق بازپرس ہوگی ان سے بھی بقدر خصوصیت
(و تعلق) کے بازپرس ہوگی جیسا آگے بتلایا جائیگا

پس مرد کے ذمہ بیوی بچوں اور غلاموں کے جو حقوق واجب ہیں ان میں سے بعض
تو وہ ہیں جو سب لوگوں کو خواہ عالم ہوں یا جاہل معلوم ہیں جیسے نفقہ کپڑا اور رہنے کا
گھر اس میں تو کچھ خفا نہیں، مگر یہ کل میں سے بعض ہے، کیونکہ اس کے علاوہ اس
کے ذمہ یہ بھی واجب ہے کہ ان کے دین کی حفاظت کرے ان کو دین پر ابھارتا رہے فرض
پر بھی مستحبات پر بھی، ہر ایک پر اس کے درجے کے موافق ترغیب دے اور یہ حق
نفقہ اور لباس سے بھی زیادہ مؤکد ہے کیونکہ نفقہ اور لباس تو تنگدستی کی حالت میں
ساقط بھی ہو جاتا ہے اور دین کی طرف رہبری اور اس کی تعلیم کسی حال بھی ساقط
نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ جو حق کبھی ساقط نہ ہو وہ اس حق سے زیادہ مؤکد اور ضروری
ہے جو کسی وقت ساقط ہو جائے ۔

مگر چونکہ لوگوں نے حکام کو نفقہ اور کپڑا اور دیگر امور دنیویہ ہی کے متعلق فیصلہ
کرتے دیکھا ہے ان کے سوا کسی اور بات کو ذمہ داروں کے اوپر لازم کرتے ہوئے
نہیں دیکھا تو وہ یہ سمجھ گئے کہ بس حق واجب وہی ہے جس کو حکام اپنے فیصلوں
میں لازم کرتے ہیں اس کے سوا کچھ واجب نہیں۔

اور جو لوگ اہل علم اور اہل خیر سمجھے جاتے ہیں ان کی بڑی دوڑ یہ ہے کہ

نفقہ ولباس کے علاوہ جو حقوق دینیہ ہیں وہ مستحب کی قسم سے ہیں اگر ان کو ادا کریں تو ثواب ہے نہ ادا کریں تو گنہگار نہ ہوں گے حالانکہ یہ بھی جہل محض ہے اور بالکل غلط ہے کتاب و سنت اور اقوال آئمہ میں اس کے غلط ہونے کی دلیل موجود ہے، کتاب کی دلالت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا

اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم سے بچاؤ

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وأمُرْ أهْلَكَ بالصلوۃ واصطبر علیھا

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور خود بھی اسکی پابندی کرو

رہی حدیث، سو روایات میں وارد ہے کہ جس شخص کی اولاد بالغ ہو جائے اور وہ ان کے نکاح وغیرہ کے بارہ میں کوتاہی کرے یہاں تک کہ وہ اس کوتاہی کی وجہ سے کسی محذور (گناہ) میں مبتلا ہو جائیں تو اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا اُن پر ہوگا۔ نیز نماز کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مروھم بھا لسبع واضربوھم علیھا لعشر

بچوں کو نماز کا حکم کرو جب سات سال کے ہوں اور نماز کے ترک پہ

ان کو مارو جب دس سال کے ہوں۔

اور یہ حکم صرف نماز ہی کے واسطے نہیں بلکہ نماز کا ذکر اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ کیلئے ہے یہی اقوال ائمہ تو ابن ابی زید نے اپنے رسالہ وغیرہ میں بیان کیا ہے کہ بچوں کو نماز کے لئے مارا جائے جب دس کے ہوں جیسا حدیث میں آیا ہے اسیطرح دوسرے واجبات و فرائض میں بھی کوتاہی کریں تو سزا دینا چاہیئے۔

علماء نے اس مسئلہ میں بھی اختلاف کیا ہے کہ ولی اپنے ماتحت نابالغ بچوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے اور ان پر مجبور کرے تو ان اعمال کا ثواب کس کو ملے گا۔ اس میں تین قول ہیں ایک یہ کہ ثواب ولی کو ملے گا دوسرا یہ کہ ثواب بچہ کو ملیگا

کیونکہ عمل تو اسی نے کیا ہے۔ تیسرا یہ کہ دونوں کو ثواب ہوگا۔ یہی قول صحیح ہے جس کی دلیل سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب حج وداع میں ایک عورت نے اپنے ہودج میں سے ایک بچہ کو نکال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا اس بچہ کا بھی حج ہو سکتا ہے آپ نے فرمایا ہاں اور تجھے ثواب ملیگا (مترجم کہتا ہے کہ اس حدیث سے دوسرے قول کی تو نفی ہوگئی مگر پہلے قول کی نفی نہیں ہوئی بلکہ بظاہر اس کی تائید ہے اور تیسرے قول کی تائید اسمیں نہیں)

اور غلاموں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر باندی زنا کرے اس کو سزائے تازیانہ دو پھر زنا کرے تو سزائے تازیانہ دو اگر تیسری یا چوتھی دفعہ پھر زنا کرے تو اس کو بیچ دو اگرچہ ایک ہی رسی کے عوض بیچو۔ اسی کے مثل وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بعض لوگ ان کی زمین میں ان کے پاس ہی رہتے تھے ایک دن حضرت عائشہ نے اسی زمین میں ان خطوط کے نشانات دیکھے جن پر چوسر کھیلی جاتی ہے تو آپ نے ان لوگوں کے اخراج کا حکم دے دیا اگر اس حرکت سے باز نہ آئیں۔ اسی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ اپنی چیز ایسے شخص کو کرایہ پر دینا جائز نہیں جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ اس میں کوئی حرام کام کرے گا۔ اسکی تائید حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

ولا تکرھوا فتیٰتکم علی البغاء

کہ اپنی باندیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو ان کے ذمہ اتنا خراج نہ لگاؤ جس کے ادا کرنے کے لئے وہ زنا پر مجبور ہوں)

تو جیسے یہ حرام ہے کہ باندیوں کو زنا کے لئے کرایہ پر دیا جائے اور اس کی اجرت لینا حرام ہے اسی طرح دوسرے مال کو بھی حرام کام کے لئے کرایہ پر دینا اور اس کرایہ کو اپنے کام میں لانا حرام ہے۔ شراب بیچنے والے کو اپنی دکان کرایہ پر دینا یا اپنے مکان کو جوا کھیلنے کے لئے یا مندر بنانے کیلئے کرایہ پر دینا وعلیٰ ہذا القیاس

ہمارے اس قول کی تقویت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اپنے عمال وحکام کے نام لکھا تھا

ان اھم امورکم عندی الصلوۃ من حفظھا وحافظ علیھا حفظ دینہ ومن ضیعھا فھو لما سواھا اضیع

مجھے تمہارے سب کاموں میں زیادہ فکر نماز کی ہے جو شخص نماز کی حفاظت کرے اور اس کی پابندی کرے وہ اپنے دین کو محفوظ کریگا اور جو نماز کو ضائع کرتا ہے وہ اس کے سوا دوسرے کاموں کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔

ان سب نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان پر اپنے اہل وعیال کا صرف نفقہ ہی واجب نہیں بلکہ ان کے دین کی حفاظت بھی لازم ہے۔

اس باب میں یعنی ان حقوق کے بارہ میں جو مرد پر اپنے اہل وعیال کے متعلق واجب ہیں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو اعمال خود مرد پر واجب ہیں ان پر اپنے اہل وعیال کو عامل بنانا بھی واجب ہے اگر وہ بالغ ہوں تب تو وجوب اپنی حقیقت پر ہے بجز ان اعمال کے جو شریعت نے ان سے ساقط کر دیئے ہیں جیسے جمعہ عورتوں اور غلاموں سے ساقط ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں دلیل شرعی کے ساتھ یہ مسئلہ مذکور ہے اور اگر بالغ نہ ہوں تو وجوب حقیقی نہیں بلکہ لغیرہ ہے یعنی نابالغوں کو احکام ضروریہ کی تعلیم دینا اور عادت ڈلوانا واجب ہے گو پابند بنانا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور جو اعمال خود مرد پر واجب نہیں بلکہ مستحب ہیں ان کا اہل و عیال کو عامل بنانا بھی مستحب ہے مگر ان کو یہ بھی بتلا دینا چاہیئے کہ یہ اعمال مستحب ہیں جیسا خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا نماز میں صفوں کے برابر کرنے کے متعلق معمول تھا کہ اول خطبہ میں بیان کر دیتے تھے کہ صفوں کا برابر کرنا واجبات میں سے نہیں (بلکہ مکملات صلوۃ سے ہے اور سنت ہے) پھر کچھ آدمیوں کو صفیں برابر کرنے پر مقرر کرتے جو لوگوں کو اس پر مجبور کرتے تھے اور

حضرات خلفاء اس وقت تک نماز شروع نہ کرتے جب تک وہ لوگ اطلاع نہ دیتے کہ صفیں برابر ہوگئی ہیں، اس کے متعلق پوری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ غرض اعمال مستحبہ میں بھی اہل و عیال سے مسامحت نہ کرنا چاہیئے۔

اب ہم تم کو بتلاتے ہیں کہ حکام صرف نفقہ اور کپڑا وغیرہ ہی میں فیصلہ کیوں کرتے ہیں جس سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس یہی چیزیں مرد کے ذمہ لازم ہیں۔ دین کی اور باتوں میں فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حکام ان ہی حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں جن کے متعلق ان کی طرف مرافعہ کیا جائے اور جن حقوق کا مرافعہ نہ کیا جائے گا ان کا فیصلہ نہ کریں گے، دیکھو اگر کسی شخص کے مقابلہ میں تمہارے پاس تین یا چار حجتیں ہوں، پھر تم ایک ہی حجت سے اس پر مطالبہ (قائم) کرو تو حاکم ایک حجت ہی سے تمہارے حق میں فیصلہ کر دے گا اس کے ذمہ یہ لازم نہیں کہ بقیہ حجتوں سے جن کو تم نے ظاہر نہیں کیا نہ ان کا مطالبہ کیا تمہارے لئے فیصلہ کرے اسی طرح یہاں سمجھو کہ رعیت کے کچھ حقوق دینی بھی راعی کے ذمہ ہوتے ہیں جن کو وہ ادا نہیں کرتا مثلاً نماز کی پابندی کرانا، زکوٰۃ اور روزہ کی تاکید کرنا، ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح کا اہتمام کرنا، مگر ان حقوق کا ادا نہ کرنا رعیت کی خواہش نفس کے موافق ہے اس لئے وہ اس سے خوش ہے کہ راعی نے ان حقوق کو ادا نہیں کیا تو وہ حکام کے سامنے بھی ان حقوق کا ذکر نہیں کرتے یا اس لئے کہ رعیت کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ ہمارے کچھ دینی حقوق بھی ہیں یا علم تو ہے مگر وہ اس سے خوش ہے کہ راعی نے ان حقوق کو ادا نہیں کیا اور اس سے اعمال شرعیہ کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ بعض دفعہ ایسے راعی سے محبت کی جاتی ہے کیونکہ وہ خواہش نفس کے موافق ہے اور دوسرے حقوق جو حظ دنیا کی قبیل سے راعی

کے ذمہ ہیں جیسے کھانا کپڑا وغیرہ ان کا چھوڑنا رعیت کو گوارا نہیں وہ راعی سے ان حقوق کو طلب کرتی ہے اجب وہ طلب کے بعد بھی توجہ نہیں کرتا تو حکام کی طرف مرافعہ کی حاجت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب بکثرت ان حقوق کا مطالبہ اور مرافعہ ہونے لگا تو ان حقوق کا راعی کے ذمہ واجب ہونا مشہور و معلوم ہو گیا اور دوسرے حقوق یعنی حقوق دینیہ کے طالب بھی کم ہیں ان کے ادا کرنے والے بھی کم ہیں جاننے والے بھی کم ہیں تو وہ ایسے ادہورے ہو گئے کہ گویا ان کا بیان کرنے والا اور بتلانے والا دین میں کوئی بدعت ایجاد کر رہا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون دین میں کیسا رخنہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس کے نشانات ہی بدل گئے اس پر عمل کرنے والے ہی جاتے رہے، معاملہ یہاں تک حد سے بڑھ گیا کہ جب کسی کو دیکھا جاتا ہے کہ اپنے گھر والوں کو واجبات دین کا امر کر رہا یا دین کے معاملہ میں ان پر سختی کر رہا ہے تو اس کو دھمکایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ میاں جانے بھی دو ابھی تو یہ بچہ ہے جب تمہاری عمر پر آوے گا خود عمل کرے گا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ دین دو ہیں۔ ایک بچوں کا دین، ایک بڑوں کا دین اللہ تعالیٰ سلف پر رحم فرمائے۔ ان کا یہ طرز نہ تھا ان کے یہاں بچوں اور بڑوں کا سب کا ایک ہی دین تھا۔

میرے ایک شیخ نے اپنے ایک شیخ کا واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ وہ اپنے شاگرد کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا چھوٹا بچہ مکتب سے آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی تختی یاد کر لی ہے اب میں بیٹھا رہوں یا کھیل کو چلا جاؤں؟ شیخ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا بچہ نے بار بار اپنے سوال کا اعادہ کیا، مگر وہ خاموش ہی رہے، شاگرد نے عرض کیا کہ آپ بچہ سے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ جاؤ کھیلو، کیا بچوں کے لئے کھیل مشروع نہیں ہے؟ یہ تو ان کی صحت کے لئے مفید ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میرے نامۂ اعمال میں

اذہب فالعب (جاؤ کھیلو) کہا جائے۔ میں تو ایسا نہ کروں گا اور اگر وہ خود کھیلنے لگے گا تو اس کو منع بھی نہ کروں گا کیونکہ بچوں کے لئے بقدر ضرورت لہو ولعب کی اجازت ہے۔ سو دیکھو سلف کے یہاں تربیت کا کیا طرز تھا اور نامۂ اعمال میں اپنی باتوں کے درج ہونے پر وہ کیسی احتیاط کرتے تھے۔

یہ تو ان امور کے متعلق کلام تھا جو دین میں مشروع ہیں اور جو امور نفس کے لئے مباح کر دیئے گئے ہیں تو ان کو اہل وعیال کی خاطر چھوڑ دینا مستحب مذہب ہے جب تک دین میں کوئی مفسدہ نہ پیدا ہو۔ اسی طرح جو معاملات (یعنی دین میل ملاپ کی قسم سے) ان کے درمیان باہم ہوا کرتے ہیں۔ ان میں بھی مستحب یہ ہے کہ ان معاملات کی ترغیب دی جائے مگر سختی نہ کی جائے تاکہ ان کو مکارم اخلاق کی عادت ہو کہ یہی سنت ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

ہمارے اس قول کی دلیل یہ ہے کہ اہل وعیال کے واسطے اپنے حظ نفس کو چھوڑ دینا مرد کے حق میں مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

المومن یاکل بشھوۃ عیالہٗ
مومن اپنے گھروالوں کی خواہش سے کھایا کرتا ہے

یعنی جس چیز کو ان کا دل چاہتا ہے وہی کھاتا ہے اپنی خواہش کے موافق فرمائش نہیں کرتا پھر اگر چہ کسی وقت اسکو اشتہا نہ ہو مگر گھروالوں کی خاطر سے کچھ کھالیتا ہے تاکہ اس کے نہ کھانے سے وہ بھی کھانا نہ چھوڑ دیں تو دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل وعیال کی خاطر اپنی خواہش کے چھوڑ دینے کو کمال ایمان کی علامت بتایا ہے کیونکہ اگر وہ اپنی خواہش

بے کھایا کرے جب بھی ایمان سے تو خارج نہ ہو گا کہ یہ بھی فی نفسہٖ
مباح ہے اور جس کام کا کرنا ایمان سے خارج نہ کرے اس کا چھوڑ نا
کمال ایمان ہو گا اور اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ فرمائی ہے کیونکہ کھانا جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی
حکمت سے اس بدن کی حیات موقوف رکھی ہے وہ رات دن میں ہمیشہ ضرور
ہی ہوتا ہے اور اپنی خواہش و رغبت کے ساتھ کھانا اطباء کے قول پر
صلاح بدن کے لئے زیادہ مفید بھی ہے اور سنت نبویہ نے بھی رعایت
طب کو مشروع کیا ہے حتیٰ کہ اطباء حاذقین نے فرمایا ہے کہ جو کھانا بعض
اوقات بدن کو مضر ہوتا ہے وہ بھی اگر بجی رغبت سے کھالیا جائے
تو نقصان نہیں کرتا بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل و عیال
کی خاطر اپنے مرغوب کھانے کو چھوڑ دینا ایمان کامل کی علامت قرار دیا ہے
کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے دین کی صلاح کو صلاح بدن پر ترجیح دینا
ہے تو یہ اسی باب سے ہے جس پر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اس میں اعلیٰ
ادنیٰ پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مومن کامل جب کھانے میں جو دنیا کی نعمتوں
میں سب سے اعلیٰ ہے اہل و عیال کی رغبت کو مقدم کرتا ہے تو معمولی
باتوں میں تو ضرور اس کا لحاظ کرے گا۔

اور یہ جو ہم نے شرط لگائی ہے کہ یہ رعایت اس وقت کی جائز
ہے جبکہ اس سے دین کا مزہ نہ ہو اس کی مثال جماع ہے کہ اگر مرد کو
جماع کی خواہش ہو اور اس کے ترک سے دین میں خلل کا اندیشہ ہو
تو اگرچہ بیوی کو اس وقت رغبت نہ ہو پھر بھی مرد کو اپنی رغبت کو
مقدم کرنا چاہیے۔ بیوی کی رغبت کا انتظار نہ کرے اسی لئے شریعت
نے نشوز زوجہ کے وقت جبکہ وہ اپنے بلا عذر شرعی جماع سے انکار
کرے نفقہ بند کرنے کی اجازت دی ہے حالانکہ نفقہ شوہر کے ذمہ

واجب ہے۔ جیسا اوپر گذر چکا نیز بیوی کے ماننے پیٹنے کی بھی اجازت دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

واللاتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا

(ترجمہ) اور جن عورتوں کی طرف سے تم کو نشوز (نافرمانی) کا خطرہ ہو (اول) ان کو نصیحت کرو اور (پھر) ان کو خواب گاہ میں الگ کر دو اور (اس پر بھی باز نہ آئیں تو) ان کو سزائے ضرب دو اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ہرگز بھی ان کے موافق ہو جاؤ اور خواہ مخواہ ستانے کے لئے ان پر راستہ نہ ڈھونڈو۔

اس باب میں حدیثیں بھی بہت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جماع کے بارہ میں مرد کو اپنا حق بیوی سے پوری طرح وصول کر لینا جائز ہے (خواہ اس کو رغبت ہو یا نہ ہو) کیونکہ ایسا نہ کرنے میں اس کے دین پر بڑے فساد کا خطرہ ہے تو یہاں بھی پہلی صورت کے مقابلہ میں اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ کی گئی ہے۔ تم شریعت کے اس عجیب نظام کو دیکھو جب تم اسمیں غور کرو گے حیرت میں رہ جاؤ گے کہ اگر دین میں خلل کا اندیشہ نہ ہو تو شریعت نے مسلمانوں کو اپنے حظ نفس کے چھوڑنے کی کیسی ترغیب دی ہے (کہ کھانے تک میں اپنی رغبت کو اہل و عیال کی رغبت کے تابع کرنے کا حکم دیا) اور اگر کسی رغبت کے چھوڑنے سے دین میں خلل کا اندیشہ ہو تو اس کا پورا کرنا مستحب ہے بلکہ ضروری اور واجب ہو جاتا ہے کیونکہ حسی چیز سے روکنا واجب کو ساقط کر دیتا ہو (جیسا یہاں بیوی کا شوہر کو جماع سے روکنا نفقہ واجبہ کو ساقط کر دیتا ہے) تو اس کا حاصل کرنا

واجب ہے) اور اگر اس کے حاصل کرنے کے لئے ممنوع کو بھی جائز کر دیا جائے تو اس کی تحصیل اور زیادہ مؤکد ہو جاتی ہے (جیسا یہاں یہی مقصود ہے) کیونکہ مرد کا اپنی بیوی کو مارنا بدون نشوز کے ممنوع ہے مگر نشوز کے بعد مارنا جائز ہے تو رغبت جماع کو پورا کرنا بہت بڑی عبادت ہوگئی اسی پر دشریعت کے تمام نظام کو) قیاس کر لو۔

اس گفتگو سے یہ علمی مسئلہ بطور نتیجہ کے معلوم ہوا کہ دین اور صلاح دین اصل مقصود ہے اس کے سوا جو کچھ ہے وہ تبعاً مقصود ہے بشرطیکہ اس سے دین میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور اس کا مآل ایسے مباح کی طرف بھی نہ ہو جس کا کرنا اور چھوڑنا برابر ہے (کیونکہ مباح کسی درجہ میں مقصود نہیں نہ اصالتاً نہ تبعاً) اور یہی دلیل ہے طریق صوفیہ کے ترجیح کی کیونکہ ان کے طریق کی بنا ترک حظوظ نفس اور تحمل اذیت اور ترک اذیت (مسلم) اور (مسلمانوں کا) دل خوش کرنے پر ہے (اور ان امور کا عبادت ہونا ظاہر ہے) غرض صوفیہ نہ مباحات میں تکثیر کرتے ہیں نہ ایسے اعمال کے پاس جاتے ہیں جن سے دین میں خلل کا اندیشہ ہوا ہے (اپنے نفس کے ساتھ تو ان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی خواہشوں کو پورا نہیں کرتے اور اس کو خوش کرنے کے لیے کسی کو اذیت نہیں پہنچاتے اور دوسروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ان کی اذیت کا تحمل کرتے اور ہر مسلمان کا دل خوش کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صوفی کے متعلق منقول ہے کہ ان سے ایک شخص ملا اور دریافت کرنے لگا کہ آپ کس حال میں ہیں؟ فرمایا کہ مشوش اور پریشان ہوں یا اور کوئی لفظ اسی کے معنیٰ میں فرمایا۔ جب وہ چلا گیا تو خدام نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے یہ بات کیوں کہی؟ (بظاہر تو آپ پریشان معلوم نہیں ہوتے) فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ اس کو مجھ سے بغض ہے تو میں نے اس کا دل خوش کرنا چاہا (اگر میں اپنی راحت کا اظہار

کرتا اس کو خوشی نہ ہوتی ؛ اسی وقت کوئی فقیہ صاحب تشریف لے آئے
(انہوں نے یہ واقعہ سنا تو) کہنے لگے یہ کیا واہیات ہے تم نے جھوٹ بول
کر اس کا دل خوش کیا یہ تو جائز نہ تھا۔ تم نے جس نیکی کا قصد کیا اس سے
بدتر گناہ میں مبتلا ہو گئے۔

کسی نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا کہ بتلاؤ کیا یہ دونوں بیبی بزرگ
صوفی اور ان سے بغض رکھنے والا مسلمان نہیں ہیں ؟ کہا بیشک مسلمان
ہیں اس نے کہا پھر جب ایک مسلمان دوسرے سے ناحق بغض رکھے اور
جس سے بغض کیا جارہا ہے وہ سچا مسلمان ہے تو کیا اس کو اپنے بھائی
مسلمان کی اس حالت سے رنج نہ ہوگا کہ ناحق بغض کی وجہ سے اس کا
ایمان ناقص ہو رہا ہے۔ کیونکہ مومن کو اپنے بھائی مسلمان کی ہر اس حالت
سے تکلیف پہنچتی ہے جو خود اس کو پیش آتی تو تکلیف ہوتی تو جیسا اس کو
اپنے ایمان کے ناقص ہونے سے تشویش ہوتی ہے ایسے ہی اپنے بھائی
کے نقص ایمان سے تکلیف ہوتی ہے پس جب یہ بات سمجھ میں آ گئی
تو اب اس جواب میں کذب کہاں ہوا ؟ بلکہ اس بزرگ نے اپنی حالت
اور مخاطب کی حالت کے موافق سچا جواب دیا ہے۔ یہ سب جوابوں سے
جواب بہتر ہے مگر اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو علم حال اور علم دونوں
دونوں سے حصہ ملا ہو ورنہ ایک میں مقلد ہو گا خواہ فقیہ کا مقلد ہو یا
صوفی کا جو فقیہ کا مقلد ہو گا صوفی کو برا کہے گا جو صوفی کا مقلد ہو گا فقیہ
کو برا کہے گا اور جس کو فقہ ظاہر اور فقہ حال دونوں سے حصہ ملا ہو گا
وہ کسی کا مقلد نہ ہو گا بلکہ محقق ہو گا اور کسی کو برا نہ کہے گا۔

ہمارے اس قول کی کہ اصل مقصود دین ہے اس کے سوا جو کچھ ہے
تبعاً مقصود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی
تائید ہوتی ہے کہ

لان یؤدب الرجل ولدہ خیر لہ من أن یتصدق بصاع من طعام

کوئی شخص اپنی اولاد کو تادیب کرے یہ اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع[1] غلہ صدقہ کرے۔

کیونکہ اولاد کے ساتھ قلبی تعلق ہوتا ہے جیسا حدیث میں وارد ہے الولد مبخلۃ ومجبنۃ اولاد بخل اور بزدلی کا سبب ہے یعنی ان دو مذموم خصلتوں کے بڑھانے میں اولاد بڑا سبب ہے کیونکہ اس کی محبت مال کے خرچ کرنے سے مانع ہوتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ میرا بیٹا میرے مال کا زیادہ مستحق ہے پھر غریبوں پر کیوں صدقہ کروں اور جب جہاد میں جاتا ہے تو دل اولاد میں لگا رہتا ہے اور واپسی کا مشتاق ہوتا ہے جس سے بزدلی اور جان بچانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ غالب حالت یہی ہے اور حدیث میں لوگوں کی غالب حالت ہی کو بتلایا گیا ہے رشاذ و نادر ایسے مخلص بھی ہوتے ہیں جو اولاد کو اللہ کے حوالہ کر کے میدان جہاد میں بے فکر ہو کر جاتے ہیں جیسا حضرات صحابہ و تابعین کی حالت تاریخ سے معلوم ہو چکی ہے) اور مال سے بھی قلب کو تعلق ہوتا ہے مگر اولاد کے ساتھ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور جس بات سے اولاد کو تکلیف ہوتی ہے اس سے باپ کے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی لئے اولاد کی تادیب اور تنبیہ جس سے اس کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے ایک صاع صدقہ سے بڑھ کر ہے کیونکہ یہ نفس پر زیادہ شاق ہے (صدقہ اتنا شاق نہیں) یہاں شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ایک صاع کی تحدید سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر ایک صاع سے زیادہ صدقہ کرے تو وہ تادیب اولاد سے کمتر نہ ہوگا بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگا۔

---

[1] صاع شرعی ہندوستانی وزن سے چار سیر کے قریب ہوتا ہے ۱۲ ظ

تو اگر کوئی اپنی اولاد کو تادیب و تنبیہ نہ کرے بلکہ دو صاع غلہ خیرات کر دیا کرے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ غلہ کی مقدار بڑھا کر تادیب اولاد کو کم کر سکتا ہے بلکہ مقصود تفاضل اعمال کا بیان ہے کہ اولاد کی ادنیٰ تنبیہ و تادیب صدقہ کی ادنیٰ مقدار سے بڑھ کر ہے کیونکہ بچوں کو شرعی سزا معقول طریقہ سے ہوتی ہے جیسے ایک تازیانہ یا کان مل دینا (یا ایک طمانچہ) اور کفارات مشروعہ کی ادنیٰ مقدار ایک مدعہ ہے چنانچہ حدیث میں ہے مد لکل مسکین پس (حاصل یہ ہوا کہ) اولاد کی تادیب و تنبیہ کا ادنیٰ درجہ صدقہ مشروعہ کے ادنیٰ درجے سے بڑھا ہوا ہے اور شریعت نے صدقہ کی ادنیٰ مقدار جو مقرر کی ہے اس سے انسان کو پوری راحت حاصل ہو جاتی ہے یعنی وہ اتنی مقدار ہے جس سے عام طور پر ہر شخص کا پیٹ بھر جاتا ہے اور جب انسان کا پیٹ بھر جائے تو اسکی تمام خواہشیں اور ساری منفعتیں اور سب قوتیں مجتمع ہو جاتی ہیں اب وہ پوری طرح اپنے مقاصد کے حاصل کرنے پر قادر ہو جاتا ہے تو گویا کسی کا پیٹ بھر دینا اس کو زندہ کر دینا ہے اور (مرتے ہوئے آدمی کو) زندہ کرنا جیسا قیمتی کام ہے شرعاً و طبعاً معلوم ہے، پس شریعت نے اس ادنیٰ تکلیف کو جو اولاد کی تادیب شرعی سے (ماں باپ کے دل کو) ہوتی ہے۔ سب سے بڑے عمل یعنی احیاء نفس سے بھی بلند تر قرار دیا ہے کیونکہ یہ نفس پر زیادہ شاق ہے صدقہ میں اس قدر تکلیف دل کو نہیں پہنچتی جیسی اولاد کو سزا دینے میں پہنچتی ہے اس تقریر سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ علوم میں سب سے افضل احکام الٰہی میں اسرار حکمت کو سمجھنا ہے کیونکہ اس سے ایمان قوی ہوتا ہے اور اس سے نفس کے مقابلہ

عہ مد صاع کا چوتھائی ہے اور کفارات کی ادنیٰ مقدار ایک مد ہونا مالکیہ کا مذہب ہے حنفیہ کے نزدیک نصف صاع ادنیٰ مقدار ہے ۱۲ منہ

میں مدد ملتی ہے اس کی تائید حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔

ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون

اللہ سے بہتر حکم کرنے والا کون ہے ان لوگوں

کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

کیونکہ غالب احوال میں یقین منظور نظر اور فہم اور تدبر ہی سے حاصل ہوتا ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یقین حاصل کرو کیونکہ میں بھی اس کو حاصل کرتا ہوں۔

نیز باپ پر واجب ہے کہ اولاد کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جس سے ان کو باپ کے حقوق واجبہ ادا کرنے میں مدد ملے جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی حاضر ہوئے جنہوں نے اپنے ایک بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ہبہ پر گواہ کرنا چاہتے تھے تو حضور نے اُن سے پوچھا۔ اس بیٹے کے سوا تمہارے اور بھی اولاد ہے؟ کہا ہاں۔ فرمایا کیا تم نے ان سب کو بھی اس کے برابر دیا ہے؟ کہا نہیں۔ فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری خدمت گذاری میں سب کے سب برابر رہیں؟ کہا ہاں۔ فرمایا تو پھر تم بھی ان کے درمیان برابری کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں غور کرو

اتحب ان یکونوا لک فی البر سواء

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری خدمت گذاری میں سب کے سب برابر ہوں؟

اس جملہ میں اس امر کی تعریض ہے کہ تمہارا فعل تو اس مطلوب کا منافی ہے (جب تم اولاد سے خدمت گذاری میں مساوات کے طالب ہو تو خود مساوات کیوں نہیں کرتے تم کو بھی ان کے ساتھ مساوات و عدل کا برتاؤ کرنا چاہیئے) غرض اس حدیث میں باپ کو ترغیب دی گئی ہے کہ اولاد کی

ساتھ ایسا معاملہ کرے جس سے ان کو خدمت گذاری میں مدد ملے (اس کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں پیدا ہو)۔

اسی کی نظیر یہ واقعہ بھی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضور سے آپ کی ازواج نے دریافت فرمایا کہ آپ ہم میں سے کس کو محبوب رکھتے ہیں۔ فرمایا اس سوال کا جواب دوسرے وقت دیا جائے گا پھر آپ نے ہر ایک بی بی کو دوسریوں سے چھپا کر ایک ایک دینار دیا اور ہر ایک کو تاکید کردی کہ اس کی اطلاع کسی کو نہ ہونے پائے۔ پھر دوسرے وقت آپ سے وہی سوال کیا گیا کہ آپ کو سب بیبیوں میں کون سی زیادہ محبوب ہے تو فرمایا دینار والی زیادہ محبوب ہے، تو دیکھو حضور نے سب کو خوش کردیا اور کسی کے دل میں ذرا بھی ملال و پریشانی کا اثر نہ ہوا کیونکہ ہر بی بی کا خیال تھا کہ دینار والی میں ہی ہوں اور کوئی نہیں۔ بس ہر مرد کو اپنی چند بیبیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہئے کہ ہر ایک یہ سمجھے کہ مجھ سے زیادہ محبت ہے۔ کیونکہ اس سے حسن معاشرت میں مدد ملتی ہے اور حسن معاشرت بیبیوں کا حق ہے کہ ان کی بہتری اسی میں ہے۔ اگر بیبیوں کے ساتھ حسن معاشرت کا معاملہ نہ ہو تو ان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہوجائیں گی۔ یہ تو اولاد و ازواج کے متعلق حسن معاشرت کا حکم تھا۔ رہے غلام تو ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ یہ تھا کہ بعض دفعہ آپ غلام کے ساتھ آٹا پیستے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو۔ نیز آپ نے فرمایا ہے کہ جب تمہارا خادم کھانا لیکر آئے تو اس کو اپنے ساتھ کھلاؤ اور اگر اپنے ساتھ نہ جِھلاؤ تو اس کو اپنے خاص کھانے میں سے ایک دو لقمہ ہی دے دو۔ اس کے متعلق مفصل کلام اپنے موقعہ پر آئے گا۔ کیونکہ اس طرح برتاؤ کرنے سے غلام کو آقا کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا اور اس کے مال کو اپنا مال سمجھ کر اس کی حفاظت کرے گا۔

اسی کی نظیر یہ واقعہ ہے جو حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک رات کچھ لکھ رہے تھے بعض درباری بھی آپ کے پاس تھے کہ چراغ کا تیل ختم ہوگیا اور لکھنے کا کام باقی تھا آپ کا غلام اس وقت سوگیا تھا۔ ایک درباری نے عرض کیا کہ غلام کو جگا دیا جائے تاکہ چراغ میں تیل ڈال دے فرمایا نہیں وہ ابھی سویا ہے کچی نیند میں جگا دینے سے اس کو تکلیف ہوگی اس کے بعد آپ خود اٹھے اور چراغ میں تیل ڈالا اور اپنی جگہ واپس آکر پھر لکھنے لگے اور فرمایا کہ جب میں تیل ڈالنے کو اٹھا تھا اس وقت بھی عمر تھا لوٹ کر آیا تو اب بھی عمر ہی ہوں دتیل ڈالنے کے لئے اٹھنے سے میں کچھ بدل نہیں گیا۔ اگر ہم اس قسم کے واقعات کا سلف صالحین کی تاریخ میں تتبع کریں تو بہت واقعات ملیں گے مگر سمجھنے والے کے لئے یہ تھوڑا بھی بہت ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا و مسئولۃ عن رعیتھا

عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار اور نگہبان ہے اور اس سے اس ذمہ داری کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔

اس فصاحت و اعجاز کلام میں تو غور کرو کیسا واضح اور مقصود کو پوری طرح ادا کرنے والا ہے۔ کیونکہ عورت کو شوہر کے ان ہی حالات و معاملات سے سابقہ پڑتا ہے جو گھر کے اندر ہوتے ہیں تو اس کو گھر سے باہر کے حالات کا مکلف نہیں کیا گیا کیونکہ ان تک اس کی پوری دسترس نہیں ہوتی۔ اس جملہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عورت کو گھر کے اندر پردہ میں رہنا چاہئے اگر عورتوں کے لئے مردوں کی طرح بے پردہ باہر رہنا جائز ہوتا تو ان کی ذمہ داری کو گھر کے ساتھ خاص نہ کیا جاتا اور گھر کے اندر جو امور عورت کے ذمہ واجب ہیں ان کی تفصیل دوسری حدیثوں میں مذکور ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا ارشاد ہے۔

ولکم علیھن ان لا یدخلن احداً او رکعم ولا یوطئن فرشکم غیرکم الا باذنکم

تمہارا حق عورتوں کے ذمہ یہ ہے کہ تمہارے گھروں میں کسی کو بدون تمہاری اجازت کے داخل نہ ہونے دیں اور تمہارے بستروں میں بدون تمہاری اجازت کے کسی غیر کو قدم نہ رکھنے دیں۔

نیز آپ کا ارشاد ہے

تحفظ المرأۃ زوجھا فی نفسھا و مالہ

عورت کو شوہر کی حرمت و ناموس کی حفاظت کرنا چاہئے اپنی ذات میں بھی اور اس کے مال میں بھی۔

یعنی اپنی عصمت و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال کو فضول کاموں میں نہ اڑائے۔ یہ تو اس کے ذمہ واجب اور مستحب کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہے۔

جھاد المرأۃ حسن التبعل

عورت کا جہاد شوہر داری کی خوبی ہے۔

یعنی شوہر داری کے حق کو اچھی طرح ادا کرنا، اور جہاد دو قسم پر ہے واجب اور مستحب، اسی طرح شوہر داری کی خوبی دو قسم پر ہے اس کا جو حصہ اپنی ذات کی حفاظت اور شوہر کے مال کی نگہبانی وغیرہ سے متعلق ہے وہ تو واجب ہے اور جو حصہ اپنی زینت و آرائش سے شوہر کو خوش کرنے کے لئے اور اس کی ذات و آبرو کی زیادہ نگہداشت وغیرہ سے متعلق ہے وہ مستحب ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

والخادم راع فی مال سیدہٖ

اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان (ذمہ دار) ہے۔

اس ترتیب عجیب میں بھی غور کرو چونکہ غلام دستور عام کے مطابق آقا کے مال کے سوا اور کسی چیز میں تصرف کا مالک نہیں نہ کچھ بگاڑ سکتا ہے، نہ سنوار سکتا ہے اس لئے کہا گیا کہ اس سے متعلق مال کے باز پرس ہوگی کیونکہ غالب یہی ہے کہ مال غلام کی امانت و حفاظت میں رکھا جاتا ہے اگر اس کے سوا کوئی اور چیز بھی اس کی ذمہ داری میں دی گئی ہو تو اس میں بھی حق امانت ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ لوگوں کی عام عادت پر مبنی ہیں۔ اسی طرح بیوی کے بارے میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر شوہر نے امور خانہ داری کے علاوہ کسی اور تصرف کا بھی اس کو مالک کر دیا ہو تو اس کے ذمہ اس کی حفاظت بھی لازم ہے کہ پوری طرح حق امانت ادا کرے یہاں تک کہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ عورت کے ذمہ لازم ہے کہ شوہر کو گھر کی ہر زیادتی کمی سے باخبر کرتی رہے کیونکہ شوہر سے شریعت کا مطالبہ ہے کہ گھر والوں کی اچھی طرح نگہداشت کرے تو جب عورت اس کو تمام کلیات و جزئیات سے باخبر رکھتی رہے گی اسی کے موافق اس کی طرف سے نگہداشت ہوگی جس کا نفع سب کو پہنچے گا اور اس طرح شوہر کو ان کے حقوق کی ادائیگی میں آسانی رہے گی

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

والرجل راع فی مال ابیہ

اور مرد اپنے باپ کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے

رجل یعنی مرد کا اطلاق بالغ پر ہی ہوتا ہے نابالغ پر نہیں ہوتا تو یہاں بھی بالغ ہی مراد ہے کیونکہ بالغ ہی احکام کا مکلف ہوتا ہے اسی وقت اس سے سوال اور باز پرس کا موقع ہوتا ہے نابالغ سے باز پرس نہیں ہوتی کیونکہ وہ مکلف نہیں دوسرے وہ خود ہی ماں کی پرورش اور ذمہ داری میں ہوتا ہے یا جس کے حوالہ باپ نے کر دیا ہو تو اس وقت دوسروں سے اسکے متعلق باز پرس ہوگی۔ بہرحال بالغ لڑکے پر واجب ہے کہ اپنے باپ کے مال کی

حفاظت کرے اور بدون اجازت کے اس میں سے کچھ نہ لے اس عجیب تنبیہ پر غور کرو کیونکہ بیٹے کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ باپ کا مال تو ایک دن میرے ہی پاس آنیوالا ہے تو اس کے بارہ میں میرا اور دوسروں کا حکم یکساں نہیں ہے بلکہ مجھے باپ کے مال میں تصرف کا حق ہے تو شارع علیہ السلام نے تنبیہ فرمادی کہ اس وقت یعنی جب تک باپ زندہ ہے وہ غیروں ہی کے مثل ہے اس کو اسی طرح تصرف جائز ہے جس طرح غیروں کو جائز ہے کہ بلا اجازت کچھ نہیں لے سکتا اگرچہ یہ مال بعد میں بیٹے ہی کا ہو جائے گا مگر بعد کی خبر کسے ہے کیا عجب ہے کہ بیٹا ہی باپ کے سامنے فوت ہو جائے اور اسی لئے اگر بیٹا باپ کا مال چرا لے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا مگر اسمیں کچھ تفصیل مذکور ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے اور باپ اگر بیٹے کا مال چرا لے تو اس کا ہاتھ کسی حال میں نہ کاٹا جائیگا کیونکہ بیٹے کا باپ کے مال میں اس وقت کچھ حق نہیں بجز مقدار نفقہ کے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہو بشرطیکہ باپ کے ذمہ اس کا نفقہ اس وقت واجب ہو ورنہ بالغ ہونے کے بعد باپ کے ذمہ اولاد کا نفقہ واجب نہیں مگر یہ کہ وہ اپاہج ہو کمانے کے قابل نہ ہو وغیرہ وغیرہ اور مال کا لفظ تمام اموال کو شامل ہے جن کو عرفاً مال سمجھا جاتا ہے۔ نقد اور چاندی سونے کے ساتھ خاص نہیں پس اولاد کو باپ کے تمام اموال کی حفاظت لازم ہے۔ کسی مال میں بھی بدون اجازت کے تصرف نہ کرنا چاہیئے اور ان سب کے لئے یعنی بیٹے اور خادم اور زوجہ کے لئے مستحب ہے کہ ان کاموں کے اندر بھی جو ان کے ذمہ لازم نہیں مرد کی مدد کریں اسکی راحت کا اہتمام کریں اور جو مصالح ان کو معلوم ہوں ان پر ادب اور تمیز کے ساتھ اس کو متنبہ کریں کیونکہ غالب حالت یہ ہے کہ گھر کی چیزوں کو زیادہ تر یہی برتتے اور استعمال کرتے ہیں تو ان جزئیات کا جو وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہیں ان کو ہی زیادہ علم ہو سکتا ہے اور ان پر

جو مصالح مرتب ہوتی ہیں ان کو بھی یہی زیادہ جانتے ہیں اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر گھر کو اپنا گھر سمجھیں جس طرح اپنے گھر کی ضروریات اور مصالح پر نظر ہوتی ہے اسی طرح باپ اور شوہر اور مالک کے گھر کی ضروریات اور مصالح پر نظر کرنا چاہیے کیونکہ امانت کی حقیقت یہی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

حتی یحب لاخیہ المؤمن ما یحب لنفسہ

کوئی شخص مومن کامل نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی مسلمان کیلئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اجانب کے متعلق ہے تو بیبیاں قد بدرجۂ اولیٰ اس کے مخاطب ہیں۔

اس جگہ ایک صوفیانہ گفتگو بھی ہے، وہ یہ کہ بندے سب کے سب حقیقت میں امانت دار ہیں اور مال سب سے بڑے مولیٰ حق تعالیٰ شانہ کا ہے۔ پس اپنے نفس کی نگہداشت کرو کہ دعویٰ نہ کرنے پائے اور امانت کو پوری طرح ادا کرتا ہے، بندگی کے اوصاف سے متصف ہو ربوبیت کے اوصاف سے متصف نہ ہو کہ نرے دعوے سے اپنی ملک ثابت کرنے لگو حالانکہ درحقیقت

مالک ہر شے خداست   این امانت چند روزہ نزد ماست

پس حقیقت کو فراموش کر کے ملک مجازی پر مغرور ہونا اور دعوے ملک سے تکبر میں مبتلا ہو جانا عاقل کا کام نہیں۔ یہیں سے سعید بنا ہے جو سعید بنا اور بدبخت بنا ہے جو بدبخت بنا، جنہوں نے اللہ کو مالک سمجھا اور اپنے کو امین وہ سعید ہو گئے اور جنہوں نے خدا کی ملکیت کو ذہن سے نکال دیا اپنے کو مالک سمجھ بیٹھے وہ بدبخت ہو گئے۔ بخل کا بڑا سبب یہی ہے کہ انسان مال کو اپنا مملوک اور خدا کے احکام کو ایک قسم

کا تاوان اور بار سمجھتا ہے اسی لئے زکوٰۃ اور حج میں روپیہ خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی ہے اگر دل میں یہ بات اچھی طرح راسخ ہو جائے کہ مال و متاع جو کچھ ہمارے پاس ہے حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ہے جس کے ہم محافظ و امین بنائے گئے ہیں تاکہ حکم الہٰی کے موافق اس کو خرچ کریں تو واجبات شرعیہ میں مال خرچ کرتے ہوئے دل میں تنگی کے بجائے بشاشت و فرحت پیدا ہو گی اور حظوظ نفس میں خرچ کرتے ہوئے دل تنگ ہو گا کہ نہ معلوم یہ خرچ مالک کو پسند ہے یا نہیں۔

ایک بزرگ اپنی اولاد سے فرمایا کرتے تھے کہ تم ایک کام کر لو تو کامیاب ہو جاؤ ان کا رعب بہت تھا اس لئے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اسکی تفصیل دریافت کریں کئی دن تک بار بار وہ اسی بات کو دہراتے رہے اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے۔ یہاں تک ایک نے جرات کر کے دریافت کیا کہ وہ کونسا کام ہے؟ فرمایا بندگی کے طریق میں داخل ہو جاؤ بس تم کو سب سے بڑی کامیابی حاصل ہو جائیگی۔ کہا گیا بندگی کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا دعویٰ اور اغراض کو ترک کر دینا اور پوری طرح حکم کو تسلیم کرنا اور بجا لانا، واقعی انہوں نے بہت اچھی تعلیم دی مختصر لفظوں میں بہت بڑا علم ظاہر کیا اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنا سچا بندہ بنا دے۔ بمنہ لا رب سواہ قولہ فی الوجہ الثالث فالرجل راع فی اہلہ مسئول عن رعیتہ الی قولہ فی الوجہ الخامس جعلنا اللہ عبیدالہ حقا بمنہ لا رب سواہ،

ف: اس حدیث کی شرح سے معلوم ہوا ہو گا کہ حسن معاشرت بھی دین کا بڑا جزو ہے جس کی طرف اس حدیث میں متوجہ کیا گیا ہے افسوس ہے کہ اسکی طرف آج کل بہت کم توجہ دی جاتی ہے عام طور پر حسن معاشرت کو دین سے خارج سمجھا جاتا ہے اور تصوف سے تو اس کا کچھ تعلق ہی نہیں مانا جاتا چنانچہ عام طور سے صوفی اس کو سمجھا جاتا ہے جس کو نہ بیوی سے تعلق ہو نہ بچوں سے نہ ماں باپ کی پرواہ ہو نہ اعزہ و اقارب کی حالانکہ حدیث میں ہر شخص کو ذمہ دار و نگہبان قرار دیا گیا ہے جس کے ذمہ

اپنے متعلقین کے حقوق کی نگہداشت فرض ہے اور ان حقوق کی نگہداشت ہی حقیقت
میں اصل تصوف ہے کیونکہ یہ سب حقوق اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ کے
حقوق کا ادا کرنا ہی تصوف ہے خدا کا حق صرف عبادات ہی پر منحصر نہیں بلکہ انسان
کے تمام احوال و متعلقات پر حاوی ہے اگر کوئی محض عبادت اور ذکر کا حق ادا کرے
اور ان حقوق کو ادا نہ کرے جو بیوی بچوں باپ ماں بھائی بہنوں اور قرابت داروں پڑوسیوں
وغیرہ کے حق تعالیٰ نے واجب کئے ہیں تو یقیناً اس کو صوفی نہ کہا جائے گا اگر کسی
کو ان حقوق کے ادا کی ہمت نہ ہو اسے نکاح نہ کرنا چاہیئے، بستی میں رہنا بھی نہ
چاہیئے، سب سے الگ کسی پہاڑ یا جنگل میں رہنا چاہیئے بشرطیکہ والدین اسی طرح
دیگر قرابت داروں میں سے کسی کا نفقہ اس کے ذمہ شرعاً واجب ہو یا واجب ہو
اور اس نے ان کو بقدر نفقہ جائداد وغیرہ دیدی ہو یا انہوں نے اپنے حق سے اس
کو سبکدوش کر دیا ہو کیونکہ عزلت و خلوت بھی ہر شخص کو جائز نہیں صرف
اسی کو جائز ہے جس کے ذمہ اہل حقوق کے حقوق واجب ہوں خوب سمجھ لو۔

باب پنجاہ و دوم ۵۲

حدیث

التبکیر والتبرید بالصلوٰۃ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے تھے کہ جب سخت سردی ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز کو اول پڑھتے اور جب سخت گرمی ہوتی تو اس نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھتے تھے۔ مراد جمعہ کی نماز ہے۔

شرح ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ سردی کی نماز میں جمعہ اور ظہر کی نماز اول وقت پڑھنا چاہیئے اور گرمی کے زمانہ میں دیر سے پڑھنا چاہیئے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۹۷) اس تشویش کو زائل کرنا چاہیئے

اس نماز کو سردی میں اول وقت اور گرمی میں دیر سے پڑھنے میں کیا حکمت ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حکم تعبدی ہے قیاس وعقل کو اس میں دخل نہیں تو گفتگو کی ضرورت نہیں اور اگر کہا جائے کہ یہ حکم معقول المعنیٰ ہے جس میں قیاس وعقل کو دخل ہے تو اس میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو مومنین کے لئے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے چنانچہ آپ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ بالمؤمنین رؤف رحیم کہ آپ مومنین پر بہت شفقت کرنے والے بڑے مہربان ہیں تو جس چیز میں مسلمانوں کو ذرا بھی اذیت اور تشویش ہوتی تھی آپ اس کو زائل کر دیا کرتے تھے چونکہ سخت سردی سے ان کو تکلیف ہوتی تھی خصوصاً اصحاب صفہ کو کیونکہ ان کی اور ان کے سوا دوسرے صحابہ میں سے بھی بعض کی غالب حالت یہ تھی کہ ان کے پاس کپڑے کم تھے تو آپ جمعہ اور ظہر کی نماز سویرے پڑھتے تھے کہ دیر سے پڑھنے میں ان کو سردی سے تکلیف ہوتی تھی اور سردی کا عزر بہت سخت ہے جیسا دوپہر کی گرمی کا عزر بھی سخت ہے اسی لئے گرمی میں آپ اس نماز کو دیر سے پڑھتے تھے، کیونکہ گرمی سے بھی بہت تکلیف ہوتی ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جس چیز سے انسان کو نماز میں تشویش و پریشانی ہو اس کو زائل کر دینا چاہئے کہ اس سے نماز اچھی طرح ادا ہوتی ہے۔ تشویش کے ساتھ نہ خشوع ہو سکتا ہے نہ حضور قلب۔

عبادت میں خشوع اور حضور قلب سب سے بڑا مطلوب ہے،

اور نماز میں نمازی سے جن امور کا مطالبہ کیا گیا ہے ان میں یہی دو چیزیں سب سے بڑی ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

لا یصلی احدکم وھو یدافع الاخبثین

کوئی شخص اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ وہ پیشاب یا پاخانہ کو دبا دیتا ہو۔

کیونکہ اس حالت میں خشوع اور حضور قلب نصیب نہ ہوگا۔ ساری توجہ پیشاب پاخانہ کے دبانے میں مصروف ہوگی۔

قولہ فی الوجہ الثانی ھنا بحث وھو ما الحکمۃ فی التکبیر بہا
الی قولہ فی الوجہ الثالث لا یصلی احدکم وھو یدافع الاخبثین

(۱۹۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع جملہ امور میں کیا جائے عبادات میں بھی عادات میں بھی

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین میں اپنی رائے اور فہم سے بھی بعض امور مشروع کرتے تھے اور اس پر بھی امت کو اسی طرح عمل کرنا واجب ہے جیسا وحی ظاہر پر۔ اس سے سمجھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نماز کو مقدم سبب سے کبھی موخر اور یہ نہیں بتلایا کہ آپ نے وحی نازل ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے حالانکہ آپ جب کوئی کام یا کوئی امر وحی سے کرتے تھے تو پہلے اس کی خبر دے دیا کرتے تھے کہ مجھ پر اس معاملہ میں یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ اس میں ان لوگوں کی دلیل ہے جو قول خداوندی لتحکم بین الناس بما اراک اللہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ رما اراک اللہ کے عموم میں وہ تمام امور مراد ہیں جو آپ کے دل میں بطور بخاطر کے آتے یا آپ ان کو مصلحت سمجھتے ۔ اگرچہ ان کے متعلق وحی نازل نہ ہوتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادات کے طور پر جو کچھ بھی کرتے تھے وہ سب وحی کے قبیل سے ہے خواہ بواسطہ ہو کہ فرشتہ اس حکم کو لے کر آیا ہو یا وحی الہام کے ذریعہ بلا واسطہ ہو۔

اسی لئے اہل

اتباع سنت ہی افضل اعمال ہے

توفیق و اہل تحقیق کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر کام میں اتباع سنت افضل اعمال ہے اور یہی تقرب خداوندی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس

ارشاد سے ہوتی ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ،

فرما دیجئے کہ اے لوگو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو یا محبت الٰہی کی دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کریں گے۔

اس میں مطلقاً اتباع کا حکم ہے یہ نہیں کہا گیا کہ جن امور کے متعلق صراحتہً وحی نازل ہوئی ہو ان میں ہی میرا اتباع کرو بس حضور کی سنت کا اتباع ہر حال میں موجب قرب اور سبب محبوبیت ہے خواہ آپ نے وحی کے بعد عمل کیا ہو یا اپنی رائے سے عمل کیا ہو کیونکہ آپ کی رائے بھی اللہ تعالیٰ کی تقریر کے بعد وحی میں داخل ہے۔

قولہ الوجہ الخامس فیہ دلیل علی ان سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم یشرع من الامور فی الدین الخ قولہ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

ف کسی نے ہمارے اکابر میں ایک بزرگ سے جن کا نام یاد نہیں رہا سوال کیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کے سلسلہ میں ذاکرین شاغلین کو جلدی کامیابی کیوں ہوتی ہے۔ دوسرے سلسلہ والوں کو اتنی جلدی کامیابی نہیں ہوتی فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے سلسلہ میں اتباع سنت کا اہتمام زیادہ ہے اور اتباع سنت کا خاصہ ہے کہ اس سے جذب الٰہی جلد ہوتا ہے اور کیونکہ متبع سنت محبوب حق بن جاتا ہے جیسا ارشاد ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اور محبت کے لئے جذب لازم ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جذب کیا جاتا ہے اور نسبت باطنہ اسی قدر جلد حاصل ہوتی ہے جس قدر جلد جذب غیبی عطا ہو جائے اور یہ

بھی کافی ہوجاتا ہے اور بدون اتباع سنت کے بڑے بڑے مجاہدے بھی بیکار ہوجاتے ہیں خوب سمجھ لو۔

ہم نے اپنے اکابر کو دیکھا ہے کہ بعض کو انہوں نے صرف بارہ تسبیح کی تعلیم دی بعض کو صرف دو سو بار لا الہ الا اللہ اور دو ہزار مرتبہ اللہ اللہ کی تعلیم دی بعض کو صرف پانچ سو مرتبہ لا الہ الا اللہ کا ذکر بتلایا اور بحمد اللہ اسی عمل قلیل سے یہ لوگ کامیاب اور جلد نسبت مع اللہ کی دولت سے مالا مال ہوگئے کیونکہ ذکر کے ساتھ ان کو اتباع سنت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے کہ وضو اور استنجا اور نماز کے تمام آداب سنت کے موافق بجا لائیں نشست و برخاست بیداری اور نیند میں ادعیہ ماثورہ کی پابندی کریں جو اوقات مختلفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں مسلمانوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئیں ہر مسلمان کی عزت و حرمت کو اپنی عزت و حرمت سے زیادہ سمجھیں دل آزاری اور دل شکنی سے پرہیز کریں جملہ اہل حقوق کے حقوق ادا کریں اور جو ادا نہ ہو سکیں ان سے معافی طلب کریں نماز روزہ وغیرہ اور جو واجبات و فرائض قضا ہوگئے ہیں ان کو ادا کریں کسی کا قرض ادا نہ کیا ہو اس کو جلد ادا کریں وغیرہ وغیرہ نماز با جماعت ادا کریں اس کا اہتمام کریں کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہونے پائے، اگر کبھی عذر کی وجہ سے مسجد میں نہ جا سکیں تو گھر پر گھر والوں کے ساتھ ہی جماعت سے نماز پڑھیں اسی طرح جملہ اعمال میں اتباع سنت کا پورا اہتمام کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اتباع سنت کے اہتمام کی وجہ سے اس شخص کو دوام ذکر کی توفیق ہوجاتی ہے ہر وقت سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد دل میں تازہ رہتی اور یہی دھن رہتی ہے کہ اس وقت اور اس حالت کے متعلق آپ کی سنت کیا ہے؟ جب اس طرح ذکر رسول دل پر غالب ہوگیا تو محبت رسول کا بھی دل پر غلبہ ہوتا ہے اور محبت رسول کا وسیلہ محبت و معرفت الٰہیہ ہونا ظاہر ہے، اس کے بعد تھوڑا سا ذکر

نفی اثبات اور ذکر اسم ذات بھی حصول نسبت مع اللہ کے لئے کافی ہو جاتا ہے جس کے ساتھ کبھی ذکر پاس انفاس کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ کبھی ذکر قلبی بتلا دیا جاتا ہے۔ کبھی کوئی مراقبہ حسب حال تجویز کر دیا جاتا ہے زیادہ مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۱۹۹) نماز میں فراغ قلب مطلوب ہے

حدیث میں اسکی بھی دلیل ہے کہ نماز میں دل کا یکسو اور فارغ کرنا مطلوب ہے کیونکہ وہ اللہ عزوجل کا گھر ہے۔ یہ اضافت تشریفیہ ایسی ہے جیسا کعبہ کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ مکان سے پاک ہیں مطلب یہ ہے کہ مومن کا دل اللہ کے انوار و تجلیات کا محل ہے۔ یہ اس سے مفہوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سردی اور گرمی کی شدت کا لحاظ فرماتے تھے جو یقیناً دل تک بھی پہنچتی اور اس میں تشویش پیدا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی اس میں مشغول ہو کر اس کام سے رہ جاتا ہے جس کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جو چیز بھی مشغول اور مشوش کرنے والی ہو خواہ کسی قسم کی ہو اسکی ساتھ یہی معاملہ کرنا چاہیئے۔

دنیا سے زیادہ موجب تشویش کوئی چیز نہیں

اسی لئے اہل توفیق تو دنیا ہی سے الگ ہو گئے کیونکہ اس سے زیادہ موجب تشویش کوئی چیز نہیں اسی وجہ سے انہوں نے نفسانی خواہشوں اور مناصب حکومت کی طلب کو بھی بالائے طاق رکھ دیا کیونکہ یہ بھی بڑی تشویش کا باعث ہیں۔

اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

یا ایھا الذین آمنو لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاری

اے ایمان والو! تم نماز کے قریب مت جاؤ اس حالت میں کہ تم نشے سے مست ہو۔

اہل توفیق نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے سکاری من حب الدنیا کہ حب دنیا کے نشے سے مست ہو کر نماز کے قریب نہ جاؤ۔ بلکہ اس نشہ کو دور کر کے نماز شروع کرو۔

علم اعتبار اور تفسیر بالرائے میں فرق

اور یہ تفسیر بطور علم اعتبار سے ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے مدلول حقیقی کے ساتھ بطور قیاس کے دوسری چیز کو بھی شامل کیا جاتا ہے چنانچہ یہاں مدلول حقیقی تو یہ ہے کہ شراب کے نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھنا چاہئے اہل توفیق نے حب دنیا کے نشہ کو بھی مدلول حقیقی کے ساتھ قیاساً شامل کر دیا کیونکہ یہ نشہ بھی نماز میں حضور قلب سے مانع ہے جیسا شراب کا نشہ مانع ہے، پس صوفیہ کا علم اعتبار زنادقہ اور باطنیہ کی تفسیر بالرائے سے بالکل جدا ہے کیونکہ وہ لوگ تو قرآن کے مدلول حقیقی کی نفی کر کے دوسرا مدلول اپنی طرف سے بیان کرتے ہیں اور یہ سراسر قرآن کی تحریف ہے جو حرام اور قریب بکفر ہے اور صوفیہ مدلول حقیقی کی نفی نہیں کرتے بلکہ اس کو باقی رکھ کر دوسری اشیاء کو قیاساً اس کے ساتھ شامل کرتے ہیں جیسا فقہا قیاس سے اصل قرآنی کے ساتھ بہت سی فروع کو ملحق کیا کرتے ہیں۔ خوب سمجھ لو۔

قوله الوجه السادس فيه دليل على ان المطلوب في الصلوة اخلاء القلب الى قوله سكارى من حب الدنيا.

(۱۰) تشویش قلیل کی پرواہ نہ کی جائے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

تنشویش قلیل ہو تو اس کی پرواہ نہ کی جائیگی کیونکہ اس سے بجز خواص کے کون بچا ہوا ہے اور خواص تو تھوڑے ہی ہیں۔ یہ اس سے مفہوم ہوا کہ صحابی نے سردی اور گرمی کو شدت سے موصوف کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سردی اور گرمی کی شدت میں نماز کو مقدم یا مؤخر کرتے تھے تھوڑی سی گرمی یا سردی میں ایسا نہ کرتے تھے تو جب گرمی یا سردی زیادہ نہ ہو بلکہ قلیل ہو اس وقت بھی کچھ تکلیف تو ضرور ہوتی ہے کیونکہ طبیعت بشریت کمزور ہی بنائی گئی ہے اور بکمزوری قدرتی طور سے ہر چیز کا اثر ہوتا ہے مگر قدر قلیل تکلیف یا تاثر کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ اگر پیشاب پاخانہ کا دباؤ تھوڑا ہو جس سے خشوع فوت نہ ہو تو نماز بلا کراہت جائز ہے۔

قوله الوجه السابع فيه دليل على انه اذا كان التشويش يسيرا لايبالى به الى قوله فالصلوة جائزة

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو ذکر و شغل کے لئے دل کی پوری یکسوئی کے طالب رہا کرتے ہیں اور جب تک پوری یکسوئی حاصل نہ ہو ذکر و شغل ہی کو ترک کئے رہتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ پوری یکسوئی بجز خواص کے کسی کو حاصل نہیں ہوتی تھوڑی بہت پریشانی ہر شخص کو رہا کرتی ہے اس کے دفع کا انتظار کرنا اور اس انتظار میں کام کو موقوف رکھنا عمر کو ضائع و برباد کرنا ہے بلکہ فراغ قلب کا صحیح راستہ یہ ہے کہ پریشانی کی حالت ہی میں ذکر اللہ و اعمال و طاعات میں مشغول ہو جائے اس کی برکت ہی سے جلد فراغ قلب حاصل ہو جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں

؎

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(۱۰۱) مصلحت عامہ کی رعایت مصلحت خاصہ سے مقدم ہے

حدیث سے مصلحت عامہ کی رعایت کا امر بھی معلوم ہوا کیونکہ یہ گرمی اور سردی کی شدت کا لحاظ اسی لئے کیا گیا کہ بعض لوگ اس کلفت کا تحمل نہیں کر سکتے یا کم کر سکتے ہیں ورنہ بالیقین بعض ایسے بھی ہیں جو اس کا تحمل کر سکتے ہیں بلکہ اس سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس میں ان کو ثواب ملتا ہے کہ عبادت میں ثواب بقدر تعب ہی کے ہوتا ہے اور تعب سے اس لئے ثواب ملتا ہے کہ تعب کے ساتھ عبادت کرنا مجاہدہ ہے۔ اسی لئے بعض متعبدین گرمی کے زمانہ میں اپنی نماز کا معمول گھر کے اندر ادا کرتے ہیں اور جاڑے میں گھر کی چھت پر تاکہ مجاہدہ کا ثواب ملے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

اور جو لوگ ہمارے واسطے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کر دیتے ہیں۔

اس پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خواص کی رعایت نہیں کی بلکہ عام لوگوں کی رعایت کر کے سب کو ایک ہی طریق پر چلایا اور بعض کا ثواب اس لئے کم کر دیا کہ دوسروں کی نماز ہی اس تشویش کی وجہ سے نہ ہوتی جو گرمی یا سردی کی شدت سے ان کو پہنچتی یا ان کو کوئی ایسا مرض لاحق ہو جاتا جو بہت سی نمازوں کی جماعت میں آنے سے مانع ہو جاتا۔ مگر مصلحت عامہ کی رعایت میں یہ شرط ہے کہ دو فریق میں سے ایک کی رعایت کرنے سے دوسرے فریق کے دین میں خلل واقع نہ ہو چنانچہ یہاں ایسا ہی ہے کہ ایک فریق کے زیادہ ثواب کو اس وقت کم کیا گیا جبکہ اس کا فرض پوری طرح ادا ہو گیا۔ ایک کی

رعایت سے دوسرے کے فرض کو ناقص نہیں کیا گیا۔

قوله الوجه الثامن فيه دليل على الامر بالنظر

لمصلحة العامة الى قوله بعد ما اكمل له فرضه

ف تعب برداشت کرنا مطلقاً مجاہدہ نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے

حضرت شارح کے کلام سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مطلقاً تعب برداشت کرنا مجاہدہ اور موجب زیادت اجر ہے مگر محققین کے نزدیک یہ حکم مطلق نہیں بلکہ مقامات کے ساتھ مخصوص ہے قالہ سیدی حکیم الامت دام مجدہ طرق و وسائل میں بلا ضرورت قصداً تعب برداشت کرنا نہ مجاہدہ ہے نہ موجب اجر مثلاً کنواں نزدیک ہے اور دریا دور ہے کنویں کے پانی سے وضو کرنے میں تعب نہیں اور دریا پر جا کر وضو کرنے میں تعب ہے تو کنویں کو چھوڑ کر دریا پر جانا مجاہدہ اور موجب ثواب نہ ہوگا۔ ہاں اگر کنویں کی پانی کی ناپاکی پر شبہ ہو تو اس وقت بے شک دریا سے وضو کرنے میں زیادہ ثواب ہوگا کیونکہ اس صورت میں تحمل تعب بلا وجہ نہیں بلکہ معقول وجہ سے ہے اسی طرح اگر مسجد کے حمام میں سردی کے زمانہ میں گرم پانی موجود ہو اور حوض میں ٹھنڈا پانی بھی موجود ہے تو گرم پانی چھوڑ کر حوض سے وضو کرنا مجاہدہ اور ثواب نہیں کہ بلا وجہ نفس کو تکلیف دینا ہے، البتہ اگر گرم پانی موجود نہ ہو اہتمام کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے مگر اس اہتمام میں نماز باجماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو اس حالت میں ٹھنڈے پانی سے وضو اور غسل کرنا مجاہدہ ہے جس سے ثواب زیادہ ملے گا بشرطیکہ ٹھنڈے پانی سے بیمار پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو یہ تو وسائل اور طرق میں تعب برداشت کرنے کا

حکم تھا اور مقاصد میں تعب برداشت کرنا مطلقاً موجب ثواب ہے مثلاً
نماز کو طویل قرآت اور طویل رکوع وسجود سے ادا کرنا ہر حال میں مجاہدہ
اور باعث ثواب ہے جبکہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو کیونکہ جماعت میں امام کو
تخفیف صلوۃ کا حکم ہے۔ اسی طرح فرض نماز کو جماعت سے ادا کرنا
مجاہدہ اور موجب اجر ہے گو جماعت سے ادا کرنے میں تعب ہوتا ہو
بشرطیکہ تعب تحمل سے زیادہ نہ ہو اور دوسروں کی پریشانی کا سبب
بھی نہ ہو کیونکہ یہ امور مقاصد میں سے ہیں طرق و وسائل میں سے
نہیں۔ اب سمجھو کہ حنفیہ کے نزدیک نماز کو اول وقت میں ادا کرنا مقاصد
میں سے نہیں بلکہ مباحات میں سے ہے پس محض نفس کو تعب میں ڈالنے
کے لئے گرمی کے موسم میں اول وقت ظہر کی نماز ادا کرنا مجاہدہ یا موجب اجر
نہ ہوگا کہ بلاوجہ تعب برداشت کرنے کا نام مجاہدہ نہیں البتہ جن علماء
کے نزدیک ہر نماز کو اول وقت میں ادا کرنا افضل ہے جیسا شافعیہ
کا مذہب مشہور ہے ان کے نزدیک گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز کا اول
وقت میں ادا کرنا مجاہدہ ہوگا۔ پس اگر مالکیہ کا مذہب اس باب میں شافعیہ
کے موافق ہے جب تو شارح کا کلام اہل تحقیق کے موافق ہے اور اگر ان کا
مذہب اس باب میں حنفیہ کے موافق ہے تو یہ کلام اہل تحقیق کے خلاف
ہے اور جب حنفیہ کے نزدیک گرمی کے زمانہ میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت
پڑھنا ہی افضل ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو مؤخر کرکے
کسی کا ثواب کم نہیں کیا بلکہ سب کے ثواب کو زیادہ ہی کیا ہے کیونکہ اس
صورت میں اگر کوئی اپنے نفس کو تعب میں ڈالنے کے لئے ظہر کی نماز اول وقت
میں پڑھنا چاہے تو حنفیہ اس کے فعل کو مجاہدہ میں داخل نہ کریں گے
نہ زیادت ثواب کا سبب سمجھیں گے فافہم، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسی طرح بعض متعبدین کا گرمی کے زمانہ میں گھر کے اندر اور سردی

میں کھلی چھت پر نماز پڑھنا بھی مجاہدہ موجب ثواب نہیں کیونکہ وسائل میں بلاضرورت تعب برداشت کرنا مجاہدہ نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بطور علاج کے ایسا کیا ہوگا ثواب کی نیت سے نہ کیا ہوگا۔

(۱۰۲) مستحبات کا اسی قدر اہتمام کیا جائے جس سے دوسروں کے فرض میں خلل واقع نہ ہو یہ بھی

حدیث سے معلوم ہوا کہ عبادت میں قدر واجب سے زائد مستحبات وغیرہ کو اس وقت اختیار کیا جائے گا جبکہ اس سے دوسروں کے فرض میں نقصان نہ آئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تقریر کے موافق بعض حضرات کو زیادہ ثواب سے اسی وجہ سے محروم کیا تھا کہ سخت گرمی میں نماز پڑھنے سے دوسروں کے فرض میں نقصان آتا تھا۔

قوله الوجه التاسع فيه دليل على انه لا يوخذ ما زاد على الواجب الى قوله لامن اجل نقص فرض الغير

ف۔ بعض لوگ اپنے معمولات و وظائف کے ایسے پابند ہوتے ہیں کہ رفقار کی پریشانی کی بھی پروا نہیں کرتے مثلاً سفر میں ریل کے وقت کی بھی رعایت نہیں کرتے۔ ریل چھوٹے یا ملے وہ بدون وظیفہ پورا کئے نہیں رہتے تو اگر ایسا شخص تنہا سفر کررہا ہو اس کو اختیار ہے اور اگر دوسرے رفقاء کے ساتھ سفر کررہا ہو تو ان کی رعایت اپنے معمولات کی رعایت سے مقدم ہے کیونکہ ریل چھوٹ جانے سے سب کو پریشانی ہوگی اور پریشانی سے ان کے فرائض میں خلل واقع ہوگا نماز میں دلجمعی فوت ہو جائے گی اور اجنبی جگہ قیام کرنے سے کھانے پینے سونے میں بھی تکلیف ہوگی۔

جماعت میں سب سے زیادہ کمزور کی رعایت کرنا چاہیے

یہاں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سیروا بسیر اضعفکم (سب سے زیادہ کمزور کی چال چلا کرو) سفر ہی کیساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر موقع کے لئے عام ہے چنانچہ یہ حدیث بھی اسی قبیل سے ہے کہ جب بعض لوگ گرمی کی تکلیف برداشت نہ کر سکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے ساتھ کمزوروں جیسا معاملہ کر کے تخفیف کو اختیار فرمایا اس سے یہ فقہی مسئلہ بھی مستنبط ہوا کہ امام کو اپنی جماعت کے حال پر نظر کرنا چاہیئے اگر ان میں کوئی کمزور یا بیمار یا ضرورت مند ہو تو نماز میں تخفیف کرے کہ اس وقت یہی سنت ہے اور اگر سب قوی (تندرست) معلوم ہوں ایمان میں بھی بدن میں بھی تو ان کے ساتھ افضل طریقہ یعنی عزیمت کو اختیار کرے اور نماز کے جملہ ارکان طویل کر دے۔ غرض ہر شخص کو جس کے متعلق کسی قسم کی ذمہ داری ہو ادنیٰ یا اعلیٰ مناسب یہ ہے کہ اپنے متعلقین کے لئے تمام امور میں چھوٹے ہوں یا بڑے، معمولی ہوں یا غیر معمولی اس حالت پر نظر رکھے جو ان کو آسان ہو اور اس میں بھی کمال مطلوب ہے، ایسی آسانی مطلوب نہیں جس سے کمال فوت ہو جائے۔ اور یہ بات فقہ حال سے میسر آسکتی ہے رفقیہ النفس ہی اس کی رعایت پوری کر سکتا ہے اور فقہ حال جملہ انواع فقہ سے افضل و انفع ہے۔

فقہ حال فقہ کی اعلیٰ قسم ہے

جیسا فقہ نے فرمایا ہے کیونکہ فقہ حال کی حقیقت نورِ فقہ ہے جو فقہ کا خلاصہ ہے اور مغز و روح ہے جیسا نحوی کیلئے تصوف کیونکہ نحو سے مقصود قرآن و حدیث کو صحت کے ساتھ پڑھنا

اور سمجھنا ہے اور پڑھنے سے مقصود عمل ہے اور عمل میں درجۂ کمال مطلوب ہوتا ہے اور تکمیل علم وعمل ہی کا نام تصوف ہے پس تصوف نحو کا خلاصہ اور مغز ہوا صوفیہ کی اصطلاح میں فقہ حال کو مراقبہ اور نگہداشت کہتے ہیں کیونکہ فقیہ الحال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی نگہداشت کرتا ہے۔

ایک فقیہ الحال کی حکایت

چنانچہ میں نے ایک فقیہ کے متعلق جو واقعی فقیہ تھے سنا ہے کہ جب ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھوڑی دیر سکوت کر کے جواب دیا کرتے اس کی وجہ ان سے پوچھی گئی تو فرمایا میں (اول) اس پر غور کرتا ہوں کہ میرے لئے اس وقت کیا مناسب ہے آیا جواب دینا یا عذر کر دینا) اس کے بعد جو مناسب ہوتا ہے اس کے موافق عمل کرتا ہوں، دیکھو ان بزرگ نے فقہ عام، فقہ حال اور مراقبہ تینوں کو کس طرح جمع کر کے دکھا دیا کیونکہ فقہ عام کا مقتضا یہ تھا کہ وقت کا حق ادا کیا جائے۔ مراقبہ کا مقتضا یہ تھا کہ غفلت سے بات نہ کی جائے بلکہ عظمت حق پیش نظر رہے ان بزرگ نے ہر سوال کے بعد تھوڑی دیر سکوت کر کے جواب دینے کی عادت ڈال کر تینوں کو جمع کر دیا۔ درحقیقت فقہا اور علماء یہ حضرات ہیں۔ علماء ظاہر میں جو اہل انصاف ہیں وہ بھی ان کی عظمت وجلالت کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایک عالم اور صوفی کی حکایت

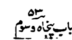
چنانچہ میں نے ایک باہرکت صوفی کو دیکھا کہ ایک دن ایک بڑے عالم فقیہ جو فتوی کے لئے مرجع خاص وعام تھے ان سے ملنے آئے اور وہ دائمی فتوی دینے کے اہل تھے مگر سلطنت کے مشیر بھی تھے بادشاہ ان کی عظمت وفضیلت کی وجہ سے بعض اہم معاملات میں ان سے

مشورہ کیا کرتا تھا۔ الغرض یہ عالم فقیر درویش سے ملنے آئے اور ان سے باتیں کیں پھر اپنے لئے دعا کی درخواست کی کیونکہ ان کی عادت تھی کہ درویشوں کیساتھ تواضع سے پیش آتے اور ان کی دعا کی درخواست کیا کرتے تھے ان بزرگ نے فرمایا بلکہ مناسب یہ ہے کہ آپ میرے لئے دعا کریں کیونکہ آپ مسلمانوں کے علماء و فقہا سے ہیں۔ درویش کا یہ کہنا تھا کہ وہ عالم بے خود ہوگئے زار زار رونے لگے اتنا روئے کہ جان نکلنے کو ہوگئی۔ بار بار یہ کہتے تھے کیا مجھ جیسا آدمی بھی علماء میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

عالم کس وقت عالم ہوتا ہے

حالانکہ عالم بخدا اس وقت تک عالم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہر سانس اللہ کیساتھ اللہ کے لئے نہ نکلے اور جو تو بس دین کے ساتھ کھیل رہے ہیں اور کچھ نہیں، مجھے اس عالم کی دینداری سے جو پہلے سے معلوم تھی بہت کچھ امید تھی مگر اس دن کی حالت اور اعتراف و خضوع سے قوی امید ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بدولت آخرت میں مقربین کے درجوں میں بلند فرمائیں گے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل سے وہیں پہنچا دیں کہ ان کے سوا کوئی رب نہیں۔

قولہ الوجہ العاشر فیہ دلیل علی ان قولہ صلی اللہ علیہ وسلم صیروا بسیر اضعفکم الی قولہ لا رب سواہ



حدیث

تحیۃ المسجد والامام یخطب

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن
اس وقت آیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو آپ
نے اس سے فرمایا اے فلاں! کیا تو نے نماز پڑھ لی ہے؟ کہا نہیں!
فرمایا کھڑا ہو جا اور نماز پڑھ۔ ایک صحیح روایت میں ہے قال قم فارکع
رکعتین وتجوز فیہما، فرمایا کھڑا ہو جا اور دو رکعتیں اختصار کے
ساتھ پڑھ لے۔

شرح

خطبہ کے وقت تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم

بظاہر حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ کے وقت تحیۃ المسجد
پڑھنا جائز ہے مگر مالکیہ و حنفیہ اس سے منع کرتے ہیں کیونکہ دوسری
حدیث میں ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن خطبہ کے وقت لوگوں کی
گردنوں کو پھلانگتا ہوا مسجد نبوی میں آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا اجلس نقد آذیت، بیٹھ جاؤ تم نے لوگوں کو اذیت دی
آپ نے اس کو تحیۃ المسجد کا امر نہیں فرمایا اور حدیث جابر میں جو کہ زیر
بحث ہے اس امر کی تصریح نہیں کہ یہ خطبہ نماز جمعہ کا خطبہ تھا (صرف
اتنا معلوم ہوا ہے کہ جمعے کے دن میں تھا) سو ممکن ہے کہ جمعے کے دن
حضور نے کسی اور سبب سے فجر یا عصر کے بعد خطبہ دیا ہو۔ کیونکہ آپ کی
عادت تھی کہ جب کوئی مہم در پیش ہوتی تو لوگوں کو جمع کرانے اور خطبہ دیا
کرتے تھے۔ اس احتمال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے شخص مذکور سے دریافت فرمایا کیا تو نے نماز
پڑھ لی ۔ اس نے کہا نہیں تو اگر یہ خطبہ نماز جمعہ کا خطبہ ہوتا تو اس
سوال کا موقع نہ تھا کیونکہ جمعہ کی نماز کا وقت بالاتفاق خطبے کے بعد ہے
اس سے پہلے نہیں (اور تحیۃ المسجد واجب یا فرض نہیں جو اس کو دریافت
کیا جاتا۔ پس اہل ظاہر کا اسی حدیث سے تحیۃ المسجد کے وجوب پر استدلال
کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ تو خود محتمل محتاج بیان ہے) پس ظاہر یہ ہے کہ یہ
خطبہ نماز فجر یا عصر کے بعد کسی ضرورت سے تھا اور شخص مذکور مسجد میں
داخل ہوتے ہی خطبہ سننے بیٹھ گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس
کے بیٹھنے سے شبہ ہوا کہ یہ یا تو فرض نماز پڑھ چکا ہے یا اس کا خیال
یہ ہے کہ ابھی تک مسجد میں جماعت نہیں ہوئی خطبے کے بعد نماز ہو گی تو
آپ نے دریافت فرمایا کیا تو نے نماز پڑھ لی جب اس نے کہا نہیں فرمایا
اٹھو نماز پڑھ لو، یعنی مسجد میں جماعت ہو چکی ہے تم اس خیال میں
نہ ہو کہ خطبے کے بعد نماز ہو گی اور چونکہ بعض روایات میں تصریح ہے
کہ آپ نے اس کو دو رکعت پڑھنے کا امر دیا اس لئے ظاہر یہ ہے کہ یہ
خطبہ نماز فجر کے بعد تھا۔ عصر کے بعد ہوتا تو چار رکعت پڑھنے کا امر
فرماتے اور شاید وقت تنگ ہو گیا ہو گا اس لئے صرف دو فرض

پڑھنے کا اور ان میں بھی اختصار کرنے کا حکم دیا واللہ تعالیٰ اعلم مگر مسلم نے اس حدیث کو باین الفاظ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من دخل یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین خفیفتین

جو شخص جمعہ کے دن ایسے وقت آئے گا کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعتیں ہلکی ہلکی پڑھ لے ۔

اور اگر یہ حدیث صحیح ہے تو بلاشک اس باب میں صریح ہے جس میں کسی تاویل کا احتمال نہیں۔ اسی وجہ سے مذہب مالک میں اس حدیث کے موافق ایک قول یہ بھی ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن خطبہ کے وقت آئے اس کو دو رکعتیں جلدی جلدی پڑھ لینا چاہیے ۔

پس ہم نے اول جو بات کہی ہے وہی حدیث کا ظاہر مفہوم ہے اور دوسری حدیث سے اس کا معارضہ بعض متقدمین کے ادب سے ذکر کر دیا گیا کہ انہوں نے دوسری حدیث کو اس کا معارض تبلایا ہے۔

ع مسلم اور بخاری کی حدیث کے متعلق شارح کا یہ فرمانا کہ اگر یہ صحیح ہے اھ شم۔ کو واضح کر رہا ہے کہ ان دونوں کتابوں کا صحیح ہونا غالب اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے جس میں ایک دو حدیثوں کا ضعیف ہونا کچھ مضر اور قادح نہیں چنانچہ اس حدیث میں دارقطنی نے کلام کیا ہے کہ تمام روات نے اسکو بصورت واقعہ روایت کیا ہے قول عام کی صورت میں بجز ایک راوی کے کسی نے روایت نہیں کیا پس اصول حدیث کے لحاظ سے یہ حدیث ان الفاظ سے شاذ میں داخل ہے ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الباری واعلاء السنن اور حدیث شاذ کو صحیح میں شمار نہیں کیا جاتا واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ خا

عہ ورنہ حقیقت میں وہ اسکی معارض نہیں کیونکہ جو لوگ خطبہ کے وقت (باقی اگلے صفحہ پر)

فضیلت سلف کا انکار محض جہل وغباوت ہے

کیونکہ ان کو ہمارے اوپر فضیلت حاصل ہے جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں اس کا انکار کرنا محض اپنی غباوت وجہالت کا ثبوت دینا ہے اگرچہ کسی وقت کسی مسئلہ میں متاخر پر بھی ایسی بات منکشف ہو جاتی ہے جو متقدمین پر منکشف نہیں ہوئی مگر اس سے ان کی جلالت منصب وعظمت شان میں کچھ خلل واقع نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو محض مولیٰ کریم کی ایک عطا ہے جس سے وہ متاخرین کی اشک شوئی کر دیتے ہیں۔

متاخرین پر بعض علوم کے منکشف ہونے کی حکمت جو سلف پر منکشف نہیں ہوئے

کہ متاخر ہونے کی وجہ سے جو ان کا دل شکستہ تھا بعض علوم کے انکشافات سے اس کو جوڑ دیا جاتا ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

فلعل بعض من یبلغہ ان یکون اوعیٰ لہ من بعض من سمعہ

کہ شاید بعضے وہ جن کو بعد میں میری حدیث پہنچے گی بعضے سننے والوں سے زیادہ سمجھنے والے ہوں۔

غرض متاخرین کے لئے بھی کچھ حصہ رکھ دیا گیا گو زیادہ حصہ متقدمین ہی کا ہے اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح کتاب اللہ اور حدیث نبوی

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) تحیۃ المسجد کو جائز کہتے ہیں وہ اس کو واجب تو نہیں کہتے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے شخص کو تحیۃ المسجد کا امر نہ فرمانا اور تخطی رقاب کی وجہ سے جلوس کا حکم دینا عدم جواز تحیۃ المسجد بحالت خطبہ کی دلیل نہیں غایت مافی الباب عدم وجوب کی دلیل ہوگی جس سے ظاہریہ پر حجت قائم کی جا سکتی ہے شافعیہ پر قائم نہیں کی جا سکتی واللہ اعلم ۱۲ ظ

کے عجائب ہمیشہ باقی رہیں گے ان کے فوائد قیامت تک ختم نہ ہوں گے، ایک فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے قلوب ہر زمانہ میں فتاح علیم کے فضل کی بارشوں کے منتظر رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

واتقوا اللہ و یعلمکم اللہ

اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ تم کو خود تعلیم دیں گے

جس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ سے علوم وہبیہ عطا ہوتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء ۔ بے کتاب بے معید و اوستا

اگر سارے فائدے اور تمام علوم ختم ہو چکے ہوتے تو متاخرین کو اس آیت کے خطاب اور ان احادیث کے معانی سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوتا حالانکہ قرآن کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا تنقضی عجائبہ اس کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے ولا یخلق علیٰ کثرۃ الترداد ۔ اور بار بار پڑھنے پڑھانے سے کہنہ بھی نہیں ہوتا بلکہ ہر دفعہ ہر وقت تازہ کلام معلوم ہوتا ہے

متاخرین کی وہی تحقیق معتبر ہے جو اجماع سلف کے خلاف نہ ہو

مگر اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ متاخرین پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ فتح وکشف ہوگا وہ اجماع متقدمین کے خلاف نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہوا تو اس کو فتح وکشف من اللہ نہ کہا جائے گا بلکہ استدراج میں شمار کیا جائے گا۔ بس متاخرین کے علوم کا حاصل یہ ہے کہ یا تو وہ کسی قول ضعیف کو قوی کر دیتے ہیں یا کسی مسئلہ کو متقدمین نے اجماع سے طے کیا تھا متاخرین کا اس کی دلیل کتاب وسنت میں معلوم ہو جاتی ہے یا وہ کسی مسئلہ شرعیہ پر سے اشکال کو حجت قویہ کے ساتھ دفع کر دیتے ہیں جس سے متقدمین نے تعرض نہ کیا تھا خواہ اس لئے کہ ان کے نزدیک اشکال کی کچھ اہمیت نہ تھی کیونکہ شاذ و نادر ہی کسی کو وہ اشکال پیش آتا تھا یا قوت ایمان کی وجہ سے ان کی

نظر میں وہ اشکال اشکال ہی نہ تھا بعد میں بوجہ ضعف ایمان اور غفلت فہم کے وہ اشکال پہاڑ بن گیا جس کو متاخرین میں سے کسی نے حجت تو بیسے دفع کر دیا اس پر کسی جاہل کا اپنے جہل کی وجہ سے یہ گمان کرنا کہ اس نے ایسی بات کہی ہے جس کی نظیر متقدمین نہیں پیش کر سکے سراسر علم اور علماء سے ناواقفیت کی دلیل ہے جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ اگر متاخرین میں سے کسی کو قواعد شرع کے اقتضاء سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جو تمام متقدمین کے خلاف ہے تو اسے اپنے کو متہم سمجھنا چاہیے نہ متقدمین کو متہم سمجھنے کا اسے حق نہیں۔

متاخرین کی فہم سلف کے سامنے یقیناً ناقص ہے کیونکہ آپ کی فہم

خواہ کتنی ہی کامل ہو پھر بھی یقیناً متقدمین کے مقابلہ میں ناقص ہے۔ دو وجہ سے ایک تو حدیث کی تصریح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم
تمام قرون میں سب سے بہتر قرن میرا ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے۔

اور ظاہر ہے کہ مراد دین کے اعتبار سے خیریت ہے اور دین نام ہے مجموعہ علم و عمل کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم و عمل میں متقدمین سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ پھر اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ متقدمین کا عمل ہمارے زمانہ والوں کے عمل سے زیادہ مستحکم اور پختہ تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ عمل علم کا ثمرہ ہے اور ظاہر ہے کہ جب دو درختوں میں ایک کا پھل اچھا اور زیادہ ہو اور دوسرے کا خراب اور کم ہو تو جس کا پھل عمدہ اور زیادہ ہوگا یقیناً وہ دوسرے سے افضل ہوگا یا ایسی بدیہی بات ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا بشرطیکہ اسے بصیرت وعقل سے کچھ حصہ ملا ہو۔ قولہ ظاہر الحدیث یدل علی جواز تحیۃ المسجد الی قولہ فالوجہ الرابع عندی لہ بصیرۃ وعقل۔

ف۔ اس حدیث کی شرح میں شارح علیہ الرحمۃ نے تصوف کا کوئی مسئلہ بیان نہیں فرمایا مگر متقدمین اور متاخرین کے علوم میں جو فرق بتلایا ہے اور سلف صالح کے ادب و تعظیم کی جس قدر تاکید کی ہے اس کے جاننے کی صوفیہ اور علماء سبھی کو ضرورت ہے اس لئے اس کا ترجمہ کر دیا گیا یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو سلف کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور اپنی علمی یا کشفی تحقیقات کو ان کے علوم سے افضل سمجھتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ علم وہی معتبر ہے جو عمل محکم کا ثمرہ ہو۔

جس کا عمل مستحکم نہیں اس کا علم بھی مستحکم نہیں

جس کا عمل محکم نہیں اس کا علم بھی مستحکم نہیں اور جس کا علم مستحکم نہیں اسے اپنی تحقیقات کو تحقیقات کہنا زیبا نہیں کمال علم تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ اور آجکل ویسا تقویٰ کہاں جیسا سلف میں تھا، آجکل یا تو تقویٰ ہی نہیں وہ دیدہ کا معاملہ ہے یا تقویٰ ہے تو اپنے سوا کسی کو متقی نہیں سمجھتے خالص اور صحیح تقویٰ بہت ہی کم ہے اس حالت میں کسی کا اپنے کو محقق یا مجتہد سمجھنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ف عطائے حق کا دروازہ بند نہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عطائے الٰہی کا دروازہ بند نہیں بعض دفعہ اللہ تعالیٰ متاخرین پر وہ علوم منکشف فرما دیتے ہیں جو متقدمین پر منکشف نہیں ہوئے مگر یہ بھی متقدمین ہی کی اتباع کا ثمرہ ہے اگر متاخرین ان کا اتباع نہ کرتے علم کا دروازہ ان کے لئے مفتوح نہ ہوتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ متاخرین کی علمی یا کشفی تحقیقات اس وقت قابل قبول ہیں جب کہ اجماع سلف کے خلاف نہ ہوں اگر وہ اجماع سلف کے

خز:۔ کوئی تحقیق بیان کریں گے رد کر دی جائے گی اس کو تحقیق علمی نہ کہا جائے گا بلکہ جہل مرکب اور تلبیس ابلیس میں شمار کیا جائیگا۔

سورۃ الفیل کی ایک نئی تفسیر اور اس کا رد

اس کی ایک تازہ نظیر وہ تحقیق ہے جو سورۃ الفیل کی تفسیر میں ابھی ابھی ایک نئے مفسر نے بیان کیا ہے کہ ترمیہم بحجارۃ من سجیل، طیرا کی صفت نہیں نہ ترمی صیغہ مونث غائب بلکہ یہ علیحدہ مستقل جملہ ہے اور ترمی واحد مذکر حاضر ہے جسمیں قریش کو خطاب کیا گیا ہے جیسا الم ترکیف فعل ربک میں بھی قریش ہی کو خطاب ہے پس سورت کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خرق عادت کے طور پر ہاتھی والوں کے لشکر پر پرندوں کی فوج بھیج دی تھی جن کے پنجوں اور چونچوں میں کنکر کی پتھریاں تھیں پرندوں نے یہ پتھریاں ہاتھی والوں پر برسائیں تو ان کا بھرکس نکل گیا بلکہ مطلب ہے کہ ابرہہ قریش کا دشمن تھا وہ مکہ پر اپنی لشکر کشی کو مکہ والوں سے چھپانا چاہتا تھا مگر یہ راز مخفی نہ رہ سکا کیونکہ قاعدہ ہے کہ لاشں خور پرندے جنگی لشکروں کے ساتھ اس امید پر ہو لیا کرتے ہیں کہ اب ہم کو آذوقہ ملیگا۔ الم یجعل کیدہم فی تضلیل کا یہ مطلب ہوا کہ لاشں خور پرندوں کو دیکھ کر مکہ والے لشکر کی آمد سے خبردار ہو گئے اور زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا قریش مقابلے کے لئے تیار ہو گئے ان کے پاس سوا پتھروں اور کنکروں کے اور کیا تھا قریش نے پتھر برسانے شروع کئے یہ پتھراؤ ایسا عجیب غریب تھا کہ اس کے سامنے ابرہہ کے لشکر والوں کی ڈھالیں بھی بیکار ہو گئیں اور وہ ان پتھروں کا جواب تیر بازی سے دینا بھی بھول گئے دم کے دم میں تمام لشکر کا گھوڑوں ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا نہ کوئی نام لیوا رہا نہ پانی دیوا۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ نے قریش کو یاد دلا کر بتایا ہے کہ تم اسلام لانے میں یہ اندیشہ نہ کرو کہ ارد گرد کی طاقتیں تم پر ہجوم کر آئیں گی اور تم کو کچل ڈالیں گی کیونکہ کل ہی کا واقعہ ہے

کہ تم نے ابرہہ کے لشکر پر ایسا پتھراؤ کیا کہ اس کا بھرکس نکال دیا تھا بس تمہارا یہ پتھراؤ سلامت ہے پھر تم کو کسی طاقت کا کیا اندیشہ؟

دیکھا آپ نے آج کل کے نئے مفسروں کی تحقیقات کو واقعی وہ قرآن میں ایسی موشگافیاں کرتے ہیں کہ سلف کے فرشتوں کو بھی ان کی ہوا نہ لگی ہو ان بیچاروں کو ایسی نئی تحقیق کہاں سوجھ سکتی تھی کہ قریش کے پتھراؤ سے بھی لشکروں کا ہاتھیوں سمیت صفایا ہو سکتا ہے پھر نہ معلوم قریش اپنے اس پتھراؤ کو ابرہہ کے بعد کسی اور لشکر کے مقابلہ میں استعمال کر کے کیوں نہ کامیاب ہوئے۔ اور ابرہہ کے لشکر کیساتھ والے یہ لاشں خور پرندے بھی فتح مکہ کے وقت کہاں مر گئے تھے کہ مکہ والوں کو لشکر مدینہ کا اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک وہ بالکل محصور نہ ہو گئے، نہ خیبر کے یہودیوں کو ان لاشں خوروں نے لشکر اسلام کی آمد سے خبردار کیا کہ صبح کو اسلامی لشکر خیبر میں داخل ہوا اور بستی والے جالی کدال لے کر جنگل جانے کا ارادہ کر رہے تھے دفعتہ سامنے سے لشکر کو دیکھا تو محمد والخمیس کہتے ہوئے قلعے کی طرف بھاگے۔

اس مفسر کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ اپنے جہل کی تعبیر ہے اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ متاخرین کی تحقیقات وہی قبول کی جا سکتی ہے جو اجماع سلف کے خلاف نہ ہوں اور سورۃ الفیل کی یہ جدید تفسیر اجماع سلف کے بالکل خلاف ہے، آج تک کسی صحابی یا تابعی یا تبع تابعی یا معتبر مفسر سے بہ سند معتبر یہ تفسیر منقول نہیں دیکھی گئی کہ ترمیہم طیراً کی صفت نہیں بلکہ صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور اس کے مخاطب قریش یا اہل مکہ ہیں اور نہ تاریخ سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے کہ لاشں خور پرندے بھی

ہی سے ابرہہ کے لشکر کے ساتھ ہو لیے تھے نہ اس کا کوئی ثبوت ہے،
کہ ابرہہ نے اپنی لشکر کشی کو مخفی رکھنے کی کوشش کی تھی جس کا راز
فاش کرنے کے لیے ناشس خود پرندوں کو لشکر کے ساتھ چلنے کی ضرورت
تھی نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ قریش نے ابرہہ کے لشکر کا سنگباری
کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اور اپنے پتھراؤ سے ہاتھیوں سمیت تمام فوج
کا ستھراؤ کر دیا تھا نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ قریش کو اسلام سے یہ اندیشہ
مانع تھا کہ ارد گرد کی طاقتیں ان پر ہجوم کر دیں گی۔ تقلید آبا و موروث
اصنام مانع اسلام نہ تھی اس مفسر نے کس طرح اپنی طرف سے بلا
دلیل مقدمات بنا کر کھڑے کئے اور خود ساختہ بنیاد پر کلام الٰہی
کی تفسیر کی عمارت قائم کرنے کی بیہودہ کوشش کی ہے پس یہ تفسیر جس
طرح اجماع سلف کے خلاف ہے اسی طرح تاریخ کے بھی خلاف ہے
اس جگہ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں اجمالی اشارہ کر دیا گیا تا کہ ناظرین
آجکل کی ایسی نئی نئی تفسیروں سے ہوشیار رہیں ان کو علامہ
ابن ابی جمرہ کا یہ ارشاد ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ متاخرین کی وہی
تحقیقات معتبر ہیں جو اجماع سلف کے خلاف نہ ہوں اس کلیہ کو
نصب العین بنانے کے بعد کسی محقق کی نئی تحقیقات سے ان کے ایمان کو
ضرر نہ ہوگا۔

ف شیخ کو طالبین کی نگہداشت کرنا چاہیئے

اس حدیث سے تصوف کا یہ مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ شیخ
کو اپنے مریدوں شاگردوں کے احوال کی نگہداشت کرنا چاہیئے اگر کسی کے
متعلق یہ شبہ ہو کہ اس نے کسی فرض یا واجب یا سنت میں کوتاہی کی
ہے تو اول اس سے دریافت کیا جائے اگر وہ اقرار کرے تو اس کو ادائے

فرض و واجب وغیرہ میں تعجیل کی تاکید کی جائے۔

ف تفحص احوال کیلئے سلسلۂ کلام قطع کرنا جائز ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ کو تفحص احوال کیلئے اپنی گفتگو اور تقریر یا خطبہ کے سلسلہ کو قطع کر کے اس شخص کی طرف متوجہ ہونا جس سے کسی متعلق تقصیر کا شبہ ہوا ہے جائز ہے مگر تفحص و تحقیق میں نرمی سے کام لینا اور خود صاحب معاملہ سے معاملہ کی تحقیق کرنا چاہیئے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ میں ثابت ہے واللہ تعالیٰ اعلم

حدیث

دعاء رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک سال لوگوں کو قحط کا سامنا ہوا تو ایک اعرابی جمعہ کے دن جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مال تباہ و برباد ہو گیا اور اہل و عیال بھوکے ہو گئے آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعا کیجئے تو آپ نے خطبہ ہی میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آتا تھا پس قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے حضور نے ابھی تک اپنے دونوں ہاتھ نیست نہیں کئے تھے کہ بادل پہاڑوں کی طرح اٹھا، آپ ممبر سے نیچے نہیں اترے تھے کہ میں نے بارش کے قطرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک سے ٹپکتے ہوئے دیکھا اتنی بارش ہوئی کہ مسجد کی چھت ٹپکنے لگی، اس دن میں برابر بارش ہوتی رہی پھر اس سے اگلے دن بھی اور اس کے بعد والے دن میں بھی، اس کے بعد بھی دوسرے جمعہ تک بارش کا سلسلہ بند نہ ہوا، پھر وہی اعرابی یا اور کوئی دوسرے جمعہ کے خطبہ میں کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مال غرق ہو گیا عمارتیں گرنے

نگیں ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تو حضورؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا اے اللہ ہمارے ارد گرد (بارش) ہو اور ہمارے اوپر نہ ہو پھر اپنے ہاتھ سے جس طرف بادل کو اشارہ کیا اس طرف سے کھل گیا اور مدینہ مثل چاک گریبان کے ہو گیا (کہ مدینہ کے اندر آسمان کھلا ہوا تھا اور چاروں طرف بادل گھرا ہوا تھا) مہینہ بھر تک جنگل بارش کے پانی سے بہتا رہا اور جس سمت سے بھی کوئی آتا تھا بارش کی خبر لاتا تھا۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ امام سے خطبہ کے درمیان کسی ضروری امر کے لئے گفتگو کرنا جائز ہے اور امام اس کا جواب بھی دے سکتا ہے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ مشکلات و حوادث میں مقبولان الٰہی سے (۱۰۴) دعا کی درخواست کرنا چاہئے اور طلب دعا سے پہلے اپنا حال بھی بیان کرنا چاہئے جیسا اس اعرابی نے کیا کہ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ بالاجماع آپ سب مقبولان الٰہی سے افضل ہیں آپ کی زندگی میں آپ کے سوا مہمات میں کسی کی طرف بھی رجوع نہ کیا جاتا تھا۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارش کی احتیاج کے وقت جب استسقاء کے لئے بستی سے باہر نکلتے تو حضرت عباسؓ سے فرماتے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو حضورؐ کے واسطہ سے بارش کی دعا کیا کرتے تھے اب آپ کے وسیلہ سے دعا کریں گے کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں اور سب سے قریب تر ہیں پھر اعرابی نے طلب دعا سے پہلے پریشانی کا حال بیان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا اس میں حکمت یہ ہے کہ جب تم دین دار سے اپنی پریشانی بیان کرو گے اس کا دل تمہارے واسطے پگھل جائیگا وہ دل سے دعا کرے گا اور ایسے مبارک دل کے پسیجنے اور دل لگا کر دعا کرنے ہی سے رحمت اور قبول

دعا کی امید کی جاتی ہے۔

قوله الوجه الثانی فیه طلب الدعاء ممن فیه اهلیة للقبول الی قوله فی الوجه الثالث وعند تلك الرقة وجمع ذلك الخاطر المبارك ترجی الرحمة والاجابة

(۱۰۵) امر خلاف عادت کبھی رحمت ہوتا ہے کبھی نقمت اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امر کا خلاف عادت ہونا کبھی رحمت پر دلالت کرتا ہے کبھی اس کے خلاف پر چنانچہ بارش کا وقت پر نہ ہونا جس کا انجام ہلاکت اموال ہو یہ بھی تغیر عادت ہے اور یہ تغیر نقمت ہے بعض روایات میں آیا ہے اذا بغض اللّٰہ قوماً امطر صیفھم واحبس شتاءھم جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے نفرت کرتے ہیں گرمی کے زمانہ میں ان پر بارش کرتے ہیں اور جاڑے برسات میں آسمان صاف رکھتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے ساتھ ساتھ فوراً بادل کا اٹھنا اور بارش ہو جانا یہ بھی خرق عادت ہے مگر یہ تغیر رحمت ہے

قوله الوجه العاشر فیه دلیل علی ان تغیر العادة قد تکون دالة علی رحمة اوغیرها الی قوله الا انها تغییر رحمة۔

ف نزول بلا میں گناہوں کو کسطرح دخل ہے

افسوس آجکل بعض لوگ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ گناہوں کی وجہ سے بھی بلائیں نازل ہو سکتی ہیں ان کے نزدیک بارش ہونے یا نہ ہونے کا سبب بس وہی ہے جو سائنس نے بتلا دیا ہے مگر ان سے کوئی پوچھے کہ سائنس نے اس کا بھی کوئی سبب بتلایا ہے کہ جب ہمیشہ برستا اور جاڑے

ہی میں بارش ہوا کرتی ہے تو کسی سال اس قاعدہ کیخلاف گرمی کے زمانہ میں کیوں ہوتی اور جاڑے برسات میں کیوں نہیں ہوتی؟ اس عادت مستمرہ کے بدلنے کا بھی تو سبب کوئی ہونا چاہیئے سائنس اس جگہ خاموش ہے شریعت نے اس مشکل کو حل کر دیا ہے کہ عادت مستمرہ کے بدلنے کا سبب لوگوں کی شامت اعمال ہے۔

ولو انہم آمنو واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون۔

آج سے اسی سال پہلے اسی ہندوستان میں لوگوں کو عام طور پر عفت پاکدامنی سچائی دیانت داری امانت بزرگوں کے احترام علماء کی عزت کا اہتمام تھا بے حیائی، بے شرمی، جھوٹ، دغا بازی سے نفرت تھی دلوں میں خدا کا خوف بزرگوں کا لحاظ تھا علانیہ فحش کا بازار گرم نہ تھا تو وہ لوگ ان بیماریوں کا نام بھی نہ جانتے تھے جن میں آج کل ہندوستان کا ہر نوجوان مبتلا ہے جس طرح ان کا ایمان قوی تھا بدن بھی قوی تھا صحت بنی ہوئی تھی وقت پر بارش ہوتی تھی۔ پیداوار کی کثرت تھی بے فکری کا زمانہ تھا، اب ہمارے اعمال خراب ہو گئے ہر طرف سینما بائسکوپ کی وجہ سے فحش کو ترقی ہے سودی لین دین کی کثرت ہے علانیہ حرامکاری ہوتی ہے تو نہ وہ بے فکری رہی نہ وہ راحت جس کو دیکھو پریشان و حیران، جدھر نظر اٹھاؤ ادھر ہی ایک بلائے بے درماں، بیماریاں ایسی آتی ہیں جن کا کبھی نام نہ سنا تھا لڑائیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک کبھی اسکی نظیر زمانہ کی آنکھوں نے نہ دیکھی تھی، یہ شامت اعمال نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا سائنس اس خوفناک بارش کا بھی کوئی سبب بتلائے گی جو بموں اور گولوں کی صورت میں آسمان سے برستی اور دم کے دم میں لاکھوں آدمیوں کو درماد رخصت

مستحکم اور مضبوط شہروں کو تہ و بالا بنا دیتی ہے کہ یہ کون سی مانسون ہے، پیدا ہوئی ہے ؟ اس بارش کا مانسون سمندر کی بھاپ سے نہیں اٹھا بلکہ قلوبِ نفوس کی بھاپ سے بنتا اور مخلوق کے گناہوں کے سبب برستا ہے۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظہر منہا وما بطن

حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا خیر کے لئے بہت بڑا وسیلہ ہے

(۱۰۶) دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے کتنی جلدی فائدہ ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من الھم الدعاء فقد فتح علیہ ابواب الخیر

جس کے دل میں دعا ڈال دی گئی (یعنی دعا سے جس کو رغبت اور شوق پیدا ہو گیا) اس پر خیر کے دروازے کھول دیئے گئے۔

اسی لئے حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ دعا خود عین خیر ہے (یعنی دعا خود اپنی ذات سے مطلوب و مقصود ہے قضا حاجت کے لئے مطلوب نہیں) قضاء حاجت تو تبعاً مطلوب ہے کیونکہ دعا کی حقیقت (مولائے جلیل اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنا) اور اس کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرنا ہے اور یہ عبدیت کا خلعت ہے جس سے بڑھ کر بندہ کے لئے کوئی بھی خلعت نہیں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی دلیل ہے۔

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان

اے ابلیس! میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں۔

دیکھو ان حضرات کو یہ شرف بلند اور اتنی بڑی حفاظت اسی عبدیت کی صورت سے تو حاصل ہوئی سو کہ صفت عبودیت ہے اس کی ضد کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد سن لو۔

وان الکافرین لا مولیٰ لھم

کافروں کا کوئی مددگار نہیں (جو ان کو شیطان کے پھندوں سے نکالے)

قوله الوجه الثانی عشر فیه دلیل علی ان الدعاء من اکبر وسائل الخیر الیٰ قوله وان الکافرین لا مولیٰ لھم۔

ف شاید کسی کے دل میں اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ کافر بھی تو اللہ کے بندے ہیں پھر وہ اللہ کی موالات سے کیوں محروم ہیں۔

جواب یہ ہے کہ وہ بندے تو ہیں مگر ایسے بندے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف منسوب کر کے عبادی میرے بندے کہنا پسند نہیں فرماتے اور بندہ حقیقت میں وہ ہے جس کو آقا خوش ہو کر اپنا غلام کہے ؎

وہ اگر کہہ کر مجھے اپنا غلام سب سے پیارا نام ہو میرا یہی

کافروں کو اللہ تعالیٰ اپنا غلام تو کیا فرماتے آدمی بھی کہنا پسند نہیں فرماتے اولئک کالانعام بل ھم اضل

کیونکہ آدمی حقیقت میں وہ ہے جو آدم علیہ السلام کے طریقہ پر ہو جو ان کے طریقہ عبودیت کے خلاف کفر و بغاوت حق میں مبتلا ہے وہ آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ؎

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ دعا بذات خود مطلوب ہے محض قضاء حاجت کے واسطے مطلوب نہیں ہے بلکہ قضاء حاجت تبعاً مطلوب ہے، پس جن لوگوں کو یہ دیکھنا ہو کہ دعا کیونکر قبول ہوتی ہے وہ اس پر عمل کر کے دیکھیں یعنی دعا کو بذات خود مطلوب بنائیں۔

(۱۰۷) شفیع کی عظمت کے موافق عطا ہوا کرتی ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ شفاعت کرنیوالے کی عزت و عظمت کے موافق اللہ کی طرف سے عطا ہوا کرتی ہے جو نکہ اس طبقہ میں شفاعت کرنے

والے سردار دو جہان تھے رصلی اللہ علیہ وسلم) تو بارش کا سلسلہ متواتر بند ہو گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں کی مراد اچھی طرح پوری ہو گئی اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

وتمتکم شفعاءکم فانظروا بمن تستشفعون

تمہارے امام (جو تم کو نمازیں پڑھاتے ہیں) تمہارے شفیع ہیں

پس دیکھ لیا کرو کہ تم کس کو شفیع بنا رہے ہو یعنی یہ دیکھ لیا کرو کہ وہ اس قابل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت قبول فرمائیں مطلب یہ کہ اس کے ظاہر و باطن کی تحقیق کر لو کہ شریعت کے موافق ہے یا نہیں واللہ علم اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں

قدم محبوبک عند مطلوبک تجد مرغوبک

مطلوب کے سامنے اپنے محبوب کو آگے بڑھاؤ تو مرغوب کو پاؤ گے

محبوب چیز کی قربانی سے مطلوب کو پاؤ گے

یعنی محبوب چیز کی قربانی کرو تو مطلوب کو پاؤ گے۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون کیونکہ محبوب چیز کی قربانی ضرور قبول ہوتی ہے جیسا آیت کا قرآنیہ کا مدلول ہے واللہ اعلم۔

اس جگہ ایک سوال ہے وہ یہ کہ دونوں جمعوں میں دعا کی درخواست کے لئے یہ دو اعرابی یا ایک اعرابی ہی کیوں کھڑا ہوا حضرت صحابہ اور خلفاء میں سے کوئی کیوں نہ کھڑا ہوا؟

جواب یہ ہے کہ حضرات خلفاء اور صحابہ کا مقام رضا و تسلیم ہے اور سائل کا مقام فقر و مسکنت ہے۔ پس درخواست دعا کے لئے وہی اٹھا جس کا یہ مقام تھا اس اجمال کی تفصیل ایک حکایت کے ضمن میں معلوم ہو گی۔

ایک بزرگ مجذوب کی حکایت

ایک دفعہ جزیرہ اندلس میں قحط پڑا تو لوگ ایک مجذوب بزرگ کے پاس گئے ان سے درخواست کی کہ نماز استسقاء کیلئے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں ان کی عادت یہ تھی کہ ایک بانس پر بچوں کی طرح سوار ہو کر چلتے تھے تاکہ لوگ بیوقوف سمجھیں اور احمق سمجھ کر ایذا نہ دیں چنانچہ اسی شان سے وہ ان کے ساتھ ہو لئے اور راستہ میں شاہی باغ تھا تو آپ شاہی باغ کے پاس پہنچے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا باغ کا داروغہ جلدی سے گھبرا کر باہر آیا اور کہا کیا بات ہے فرمایا باغ میں جتنے درخت ہیں سب میں پانی دے مالی نے کہا آپ بھی عجیب بیہودہ گو ہیں میں اپنے باغ کی حالت کو اچھی طرح جانتا ہوں جب پانی دینے کی ضرورت ہوگی خود پانی دے دوں گا تمہارے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بزرگ نے لوگوں کی طرف رُخ پھیرا اور فرمایا تم نے اس کی بات سنی؟ جب یہ ادنیٰ مخلوق اپنے باغ کی ضرورت کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی زمین کی ضرورت کو نہیں جانتے؟ وہ بھی اپنے باغ کی حالت کو خوب جانتا ہے تو تم نے مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کے سوا کچھ نہیں چاہا کہ مجھے اللہ کے سامنے ذلیل کرو جیسا اس مالی کے سامنے ذلیل ہوا۔ پھر اپنے بانس پر سوار ہو کر الٹے لوٹ گئے اور لوگوں کو چھوڑ کر چل دیئے مگر اس تسلیم و رضا کا یہ ثمرہ ملا کہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹنے نہ پائے تھے کہ بارش سے سیراب ہو گئے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تسلیم و رضا میں سب سے اعلیٰ تھا مگر اسی کے ساتھ آپ ہر شخص سے اس کے حال کے موافق معاملہ فرماتے تھے کمزوروں کی دلجوئی فرماتے ان کی درخواست پر دعا کر دیتے قوی کو اس کے حال پر رکھتے اور متوسط سے لطف کا معاملہ فرماتے اور یہ

معاملہ ہوتا یا اللہ کیطرف سے اپنے بندوں پر رحمت ہی رحمت ہے تاکہ اس مبارک راستہ میں قوی اور ضعیف متوسط سب ہی چلنے لگیں اور ان میں سے ہر شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہے بشرطیکہ ہر ایک کو حقیقت یا شریعت سے اپنا حصہ معلوم ہو کہ اس کا حصہ کہاں ہے اور اس کے شرائط و آداب کیا ہیں ؟ یہاں دنیا میں تو بڑا فائدہ یہی ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہوجائے کہ میرا حصہ حقیقت میں ہے یا شریعت میں اور جس میں بھی حصہ ہے اسکے شرائط و آداب کی اس کو خبر ہو اس سے آگے جو کچھ ملیگا آخرت میں ملے گا کہ دار الجزار وہی ہے دنیا دار العمل ہے دار الجزار نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں سے کرے جن کو اپنے فضل سے اس فائدہ عظمیٰ کے ساتھ سرفراز فرمایا ہے۔

قوله فی الوجه الثالث عشر فیه دلیل علی ان الاعطار یکون علی قدر حرمة الشفیع الی قوله فی الوجه الخامس عشر جعلنا الیه ممن من بها علیه بمنه

ف دعا مقام رضا و تسلیم کے منافی نہیں منافات جب ہوتی ہے کہ دعا بذات خود مطلوب نہ ہو بلکہ قضاء حاجت مطلوب ہو اور اگر دعا خود اس لئے مطلوب ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اپنے عجز و نیاز کا اظہار ہے اور دل سے اس پر راضی ہو کہ حاجت پوری ہو یا نہ ہو دعا کو نہ چھوڑوں گا اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی رہوں گا تو یہ دعا عین رضا و تسلیم ہے پس بعض بزرگوں کے واقعات سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دعا کو تسلیم و رضا کے خلاف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دعا واقع میں رضا و تسلیم کے خلاف ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ یا تو وہ بزرگ غلبۂ حال کی وجہ سے دعا کو مقام رضا کے ساتھ جمع نہ کرسکے یا یہ کہ گو ان دونوں میں منافات نہیں مگر مقام رضا و تسلیم کی یہ خاصیت ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے دعا چھوٹ ہی جاتی ہے۔ اعتدال کے بعد پھر عود کر آتی ہے۔ خوب سمجھ لو۔

حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ معلوم ہوا کہ بادل (۱۰۸)
آپ کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ کہ جس طرف انگلی سے اشارہ کرتے اُس طرف
سے بادل کھل جاتا۔ کیونکہ زبان سے تو آپ حق تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے بادل
کو زبان سے کچھ نہیں کہا اُس کی طرف ، تو اشارہ ہی کیا تھا۔ پس اگر بادل کو
آپ کی اطاعت کا حکم نہ دیا گیا ہوتا تو وہ آپ کے اشارہ کی تعمیل نہ کرتا۔ کیونکہ
بادل بھی جیسا حدیث میں آیا ہے مامور ہے جہاں جاتا ہے جتنی دیر رہتا ہے جس
جگہ رہتا ہے (حکم سے رہتا ہے) اور اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ
بادل تو باوجود اس قدر بعد کے اشارہ کو بھی سمجھ لیتا ہے۔

محروم القسمت کو نصیحت سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے

اور محروم (القسمت) دل کا بہرا نصیحتوں کے دُر بے بہا سُن کر بھی متنبہ نہیں
ہوتا کلا بل ران علی قلوبھم (کچھ نہیں بلکہ اُن کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے
جس کے لیے سعادت (کے راستہ) میں کوئی قدم (مقدر نہیں یا جس کے لیے
ازل میں سعادت (مقدر) نہیں۔ اس کے لیے ساری نصیحتیں نقصان ہی
(بن جاتی) ہیں۔

قوله فی الوجه التاسع فیه دلیل علی عظم معجزته علیه السلام
الی قوله من لم یکن له فی القدم[ع] سعادة فکل موعظة
علیه خران -

ف - یہاں سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف میں جلدی نہ کرنا چاہیئے۔ اگر نفع

ع اما الترجمة الاولی فمبنیة علی ان اصل العبارة من لم یکن له فی السعادة
قدم الخ بفتح القاف وصحفه الکاتب الی قوله من لم یکن له فی القدم
سعادة - والترجمة الثانیة جبنیة علی کون القدم بکسر القاف بمعنی الازل
ولکن الظاهر هو الاول لقلة استعمال القدم بمعنی الازل فی کلام المصنفین -
والله تعالی اعلم ۱۲ ظ۔

کی اُمید غالب ہو تو نصیحت کی جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔ کیونکہ بعض لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اُلٹا شریعت ہی کو بُرا کہنے لگتے ہیں۔

(۱۰۹) فوائدِ صحبت اور اُس کے شرائط

یہاں ایک اور اشارہ بھی ہے کہ قرب (اور جوار) کی برکت نے زمین کو رحمت سے مالا مال کر دیا۔ حالانکہ وہ جماد (محض) ہے تو جاندار کو (بالخصوص انسان کو برکت صحبت سے) کیا کچھ فائدہ ہوگا؟ (خود ہی سمجھ لو) چنانچہ اسی مجاورت (اور صحبت) سے ابوطالب کو برکت حاصل ہوئی کہ دوزخیوں میں سب سے کم عذاب اُن پر ہے حالانکہ اُنھوں نے (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کا اتباع نہیں کیا تھا مگر حضور کے ساتھ رہے۔ آپ کی صحبت سے مشرف ہوئے تو برکت سے محروم نہ رہے) لیکن مجاورت (اور صحبت) کے متعلق یہ امر قابلِ تنبیہ ہے کہ اگر اُس سے اہلِ ایمان کو کسی قدر منفعت اور مدد پہنچتی ہو تو اس کو کچھ برکت حاصل ہوگی۔ اور اگر زیادہ منفعت و مدد پہنچے تو برکت کے ساتھ اُس کو عظمت و حرمت بھی حاصل ہوگی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے قرب و جوار کی زمین کو ہر طرف بارہ میل تک حرم مکہ کی طرح حرم بنا دیا ہے۔ کہ نہ اُس کا شکار مارا جائے نہ اس کا درخت کاٹا جائے۔ یہ حُرمت (اس زمین کو) اُن ہی لوگوں کی وجہ سے تو حاصل ہُوئی جو اس زمین کے بسنے والے تھے (چونکہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجاورت اور صُحبت کے ساتھ آپ کی نصرت میں بھی حصہ لیا تھا آپ کا اتباع بھی کیا تھا تو اُن کے احترام کا یہ اثر ہُوا کہ اُن کی زمین بھی محترم ہو گئی) پس یہ قرب (اس زمین کے لیے) ایسا ہی ہے جیسا عاقل مخاطب کے لیے اتباع (کہ جیسا وہ بوجہ اتباع کے محترم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ زمین بوجہ قرب اہلِ اتباع کے محترم ہو گئی) کیونکہ مخلوق میں ہر نوع کو اُس کی حالت کے مناسب نفع حاصل ہوتا ہے (پس زمین کو صلحاء کی مجاورت سے یہ نفع ہُوا کہ اُس کو حرم بنا دیا گیا) جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ صحبت کی نسبت (اور مقدار) ہی

کے موافق خیر حاصل ہوتی ہے۔ جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُس سے دوسرے کو شر نہ پہنچے تو اسی لیے حدیث میں آیا ہے ھم القوم لا یشقی بھم جلیسھم۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا محروم نہیں رہتا اور اگر مجاورت (اور صحبت اس طرح نہ ہو بلکہ) اس کے خلاف ہو (کہ جس کی صحبت میں رہتا ہے اُس کو ایذاء پہنچاتا ہے) تو معاملہ برعکس ہوگا (کہ صحبت سے بجائے نفع کے ضرر پہنچے گا) اسی لیے اہلِ تحقیق نے فرمایا ہے کہ انسان محقق (عارف کامل) کی مثال آگ جیسی ہے کہ جو شخص احتیاط کے ساتھ اُسے کام میں لائے گا۔ اُس سے مختلف قسم کے منافع حاصل کرے گا۔ جیسا حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: متاعاللمقوین علماء نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو اہلِ حاجت کے لیے فائدہ کی چیز بنایا ہے اور جو شخص بے احتیاطی کے ساتھ اس کو استعمال کرے گا نقصان اُٹھائے گا۔

یہی حال انسان محقق کا ہے جو اسے پہچان لے اور ادب کے ساتھ اُس کی صحبت میں رہے وہ اُس سے بہت کچھ منافع حاصل کرے گا اور جو (پہچاننے کے بعد) اُس کو تحقیر کرے گا اُس کو (بجائے نفع کے) ضرر لاحق ہوگا اگرچہ محقق (عارف) نے اُس کو ضرر دینے کا قصد بھی نہ کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غیرت کو اُس کے لیے جوش آتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں من اٰذی لی ولیا فقد اٰذنی بالمحاربۃ (جسے میرے ولی کو ایذا دی اُس نے مجھے اعلانِ جنگ دیا ہے

"اللھم انا نعوذ بک من سخطک وسخط اولیائک ونعوذ بک من الحور بعد الکور ومن العمی بعد الھدی ونسئلک ان تجعل عاقبۃ امورنا رشدا برحمتک یا ارحم الراحمین) قولہ وھنا اشارۃ وھی ان برکۃ الجوار افادت الارض الرحمۃ الی قولہ فقد اٰذنی بالمحاربۃ"

ف - ایذا دینا ہر مسلمان کو بلکہ ہر حیوان کو حرام ہے جبکہ بلا وجہ ایذا دی جائے اور اولیاء و علماء کو ایذا دینا زیادہ حرام ہے کہ گویا خدا کا مقابلہ ہے۔ پھر ایذاء کے بھی درجے ہیں۔ ایک یہ کہ محل سے بلا وجہ ایذاء دی جائے کہ عملاً اُن کے ساتھ گستاخی

اور بدتہذیبی کا معاملہ کیا جائے۔ ایک یہ کہ زبان سے بلاوجہ اُن کو بُرا بھلا کہا جائے۔ یہ دونوں صورتیں ہر حال میں موجب وبال ہیں۔ ایک یہ کہ اُن کو بُرا تو نہ کہا جائے، نہ گستاخی کا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن ان کی ولایت اور کمالات کا انکار کیا جائے۔ یہ تیسری صورت صرف اُس شخص کے حق میں موجب وبال ہے جو اُن کے ولایت و کمالات سے واقف ہے۔ ناواقف کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ کیونکہ ولی کی ولایت کا ماننا یا اُس سے واقف ہونا فرض یا واجب نہیں اور مسلم یہ ہے کہ جس شخص کی ولایت کا ثبوت سے عقلاء اور صلحاء و علماء کو اعتقاد ہو اُس کی ولایت سے انکار نہ کیا جائے گو تم کو بذاتِ خود اُس کی تحقیق نہ ہو۔ کیونکہ غیر ولی سے حُسنِ ظن مذموم نہیں اور ولی سے بدظن ہونا بُرا ہے تو بلا ضرورت ایسے شخص کی ولایت سے انکار کیوں کیا جائے جس کی ولایت کو ثبوت سے عقلاء اور صلحاء و علماء تسلیم کرتے ہیں۔

علامات ولایت

رہا یہ کہ کسی کی ولایت کی تحقیق خود کیونکر کی جائے؟ تو اگر یہ طالب تحقیق عامی ہے جب تو اُس کو عقلاء اور صلحاء و علماء کی تقلید سے کام لینا چاہئے اور اگر اُس کو کچھ نورِ بصیرت حاصل ہے تو چند روز اُس کی صحبت میں رہ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ اس شخص کی طرف دُنیاداروں کا میلان زیادہ ہے یا دین داروں کا۔ اس کی باتیں دُنیا کے متعلق زیادہ ہوتی ہیں یا دین کے۔ اس کے پاس بیٹھنے سے دل دُنیا کی طرف راغب ہوتا ہے یا آخرت کی طرف۔ گناہوں سے نفرت اور نیک کاموں کی رغبت اُس کے پاس بیٹھنے سے زیادہ ہوتی ہے یا نہیں۔ فرائض و نوافل و اذکار میں وہ اپنے معمولات کا پابند ہے یا نہیں؟ اور زیادہ وقت اُس کا اللہ کی یاد میں گزرتا ہے یا دُنیا کے قصّوں میں۔ اگر چند روز اُس کے پاس رہنے سے یہ اندازہ ہو کہ اس شخص پر اللہ کی یاد، اللہ و رسول کی محبت غالب ہے۔ زیادہ اوقات اسی تذکرہ میں گزرتے ہیں اور اسکے اقوال و افعال و احوال سُنتِ نبویہ کے موافق ہیں تو سمجھ لیا جائے کہ وہ اللہ کا ولی ہے جس کو ایذا دینا اللہ تعالے کو اعلانِ جنگ دینا ہے ؎

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی　　نیک بین باشی اگر اہل دلی

باب پنجاہ و پنجم

حدیث

صلوٰۃ النوافل قبل الفرائض و بعدھا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے اور اس کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کے بعد اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے اور عشاء کے بعد دو رکعتیں اور جمعہ کے بعد نماز نہ پڑھتے۔ یہاں تک کہ (گھر کی طرف) لوٹ جاتے پھر (گھر میں) دو رکعتیں پڑھتے۔

شرح ظاہر حدیث تین احکام پر دال ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے اور ظہر کے بعد مسجد میں نماز پڑھتے تھے مگر مغرب کے بعد مسجد میں نماز نہ پڑھتے تھے بلکہ اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے مگر جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے اور پیچھے مسجد میں نماز نہ پڑھتے تھے جمعہ سے فارغ ہو کر اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۱۰) یہاں دو سوال ہیں (۱) یہ کہ راوی نے صبح اور عصر کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ ان دونوں کا کیا حکم ہے؟ (ان کے آگے یا پیچھے نفل نماز ہے یا نہیں؟)

(۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نفل نماز کی جو صفت (اور کیفیت یہاں) منقول ہے یہ تعبد (محض) ہے جس کی علت عقل سے معلوم نہیں ہوسکتی یا قیاسی حکم ہے جس کی علت

عقل میں آسکتی ہے ۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ فجر و عصر کا گو یہاں ذکر نہیں مگر دوسری روایات میں موجود ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بعد (طلوع) فجر کے بجز فجر کی دوسنتوں کے (نفل) نماز نہیں۔ اس باب میں اور بھی بہت احادیث ہیں۔ نیز یہ بھی وارد ہُوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو رکعتوں میں تخفیف کرتے تھے اور تخفیف کی علت بھی (بعض روایات میں) مذکور ہے ۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اس باب میں بھی بہت احادیث ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ تعبّد (محض) ہے جب تو گفتگو ہی کی ضرورت نہیں اور اگر یہ حکم کسی حکمت پر مبنی ہے تو وہ حکمت واللہ اعلم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں (عملاً اپنی اُمّت کو) خدمت (اور عبدیت) میں ترقی کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ جیسا ضمام (بن ثعلبہ) کو (قولاً) اسی کی ہدایت فرمائی تھی جبکہ اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ: کیا میرے ذمّے (ان فرائض کے علاوہ) کچھ اور بھی ہے۔ فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم اپنی خوشی سے (کچھ نفل ادا) کرو

تعلیم عملی زبانی تعلیم سے زیادہ مؤثر ہے

تو جس چیز کی آپ نے قول سے ترغیب دی تھی اُسی کی اپنے عمل سے ترغیب دی۔ کیونکہ آپ کی عملی تعلیم زیادہ مؤثر ہوتی تھی اور (قاعدہ بھی یہی ہے کہ) احکام کی پختگی عمل سے ہی زیادہ کامل ہوتی ہے۔ اگرچہ قولی بھی اس کے لیے کافی ہے جیسا شریعت (کے اصول) سے بارہا معلوم ہو چکا ہے۔ اور (حکمت نوافل کے بیان میں) یہ توجیہ بہت عمدہ ہے۔

جس کام کا دوسروں کو امر کرو خود بھی اُس پر عمل کرو

یہ بیان سے معلوم ہُوا کہ انسان جس نیک کام کا دوسروں کو امر کرے یا ترغیب دے اُس پر

خود بھی عمل کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ قال کے ساتھ وہ اس کا حال بن جائے تاکہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت میں داخل نہ ہو (جس میں سخت وعید ہے)۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔

"اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بُری ہے کہ ایسی بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔"

(ہر چند کہ یہ آیت دعویٰ کے متعلق ہے، امر بالمعروف کے متعلق نہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ایسا دعویٰ نہ کرنا چاہیئے جس کو پورا نہ کیا جائے اور یہ بات سیاق سے بھی ظاہر ہے اور شانِ نزول سے بھی معلوم ہے۔ مگر آیت کے ظاہری الفاظ مطلق قول پر دال ہیں جس میں دعویٰ اور امر بالمعروف دونوں داخل معلوم ہوتے ہیں۔ پس امر بالمعروف میں بھی اس کا لحاظ کرنا چاہیئے کہ جس بات کا دوسروں کو امر کیا جائے خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور بہر حال میں آیت کا یہ مطلب نہیں کہ بے عمل دوسروں کو نصیحت نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ناصح کو بے عمل نہ ہونا چاہیئے) اسی لیے بعض اہلِ حال نے فرمایا ہے کہ فقیہ الکلام اور فقیہ الحال کو قیامت کی ہوائیں چلنا اور دُنیا کا بادل پھٹنے کے وقت معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں اس میدان کا شہسوار کون ہے؟ (اُس وقت حقیقت پر سے پردہ اُٹھ جائے گا اور معلوم ہوگا کہ محض وعظ کہنا، کتابوں کا پڑھنا پڑھانا اور مسائل کا حل کر نا کام آ رہا نہیں بلکہ احکام پر عمل کرنے اور اُس کو حال بنانے کی ضرورت تھی۔

نوافل کے مشروع ہونے کی حکمت

اور جب ہم نوافل کے مجموعی عدد پر نظر کرتے ہیں

تو اس حکمت (مذکورہ) کی ساتھ ہمارے سامنے ایک اور حقیقت آجاتی ہے جو بہت ہی لطیف ہے اور اپنی ہمّت کی خصلتوں میں سے (عجیب خصلت) ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن نمازوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے (بطور نفل کے) زیادہ کیا ہے

تتبع آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ (ان کا مجموعہ) چوالیس[۴۴] رکعتیں ہیں اور ایک رکعت وتر کی (ان کے علاوہ ہے تو کل پینتالیس[۴۵] رکعتیں ہوئی۔ ان کو پانچ فرض نمازوں کے ساتھ ملایا جائے تو پچاس[۵۰] نمازیں پوری ہوں گی اور یہی وہ اصلی عدد ہے جو اولاً فرض ہُوا تھا۔ جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت پر شفقت کر کے تخفیف کی درخواست کی تھی (تو پچاس سے پانچ رہ گئیں) لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات بابرکات کے حق میں درجۂ کمال کو اختیار فرمایا کہ اصلی فرض کو ہی پورا فرماتے تھے تاکہ ارشادِ خداوندی الذی وفی[عہ] (کی تعمیل) میں آپ کا قدم راسخ ہو جائے۔ جیسے موسیٰ علیہ السّلام نے (شعیب علیہ السلام سے) فرمایا تھا ایما الاجلین قضیتُ فلاعدوان علیّ کہ ان دونوں مدتوں میں سے جس مُدت کو بھی میں پُورا کر دوں یعنی آٹھ سال کی مُدت یا دس سال کی مُدت تو مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا) پھر آپ نے دونوں میں سے بڑی مدت کو پُورا کیا کیونکہ انبیاء و رسل صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین (بہمت) بلند ہمت والے ہیں اور کیوں نہ ہوں وہ تو مخلوق کے بہتروں سے بھی بہتر ہیں (ان کا طریقہ یہی ہے کہ اعلیٰ و افضل و اکمل کو اختیار فرماتے ہیں) اب ہمیں ان چوالیس[۴۴] رکعتوں کے بتلانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دو رکعتیں تو (سُنت) فجر کی ہیں اور بارہ رکعتیں چاشت کی ہیں۔ جیسا احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور زوال (آفتاب) کے وقت[عہ] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اولاً نماز سے منع

عہ پوری آیت وابراھیم الذی وفیٰ ہے جس میں حضرت ابراہیم کی حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے کہ اُنھوں نے اللہ تعالےٰ کے حکم کو پُوری طرح ادا کر دیا تھا۔ ۱۲ منہ

عہ فی الاصل وعند الزوال بقدر ما کان ینھی عن الصلوٰۃ فی ذلک الوقت ثم رجع علیہ السلام فصلے فیہ اربعا الخ وفیہ تصحیف والصحیح عندی بعد ما کان ینھی عن الصلوٰۃ الخ ولم یظھر لی وجہ قولہ ثم رجع علیہ السلام فان الرجوع یدل علی النسخ ولیس ذلک من النسخ فی شئی فانہ صلی اللہ علیہ وسلم انما نھی عن الصلوٰۃ عند استوا وھذا النھی باق علی حالہ وصلی اربعا بعد الزوال حین تزول الشمس عن کبد السماء ولم ینہ عن الصلوٰۃ بعد الزوال قط فافھم۔ ۱۲ منہ

فرماتے تھے۔ پھر آپ نے (زوال کے بعد) چار رکعتیں پڑھی ہیں۔ غالب گمان اس (نماز) کی تحقیق عدد میں یہی ہے اور ظہر سے پہلے دو رکعتیں، ظہر کے بعد دو رکعتیں، عصر سے پہلے دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں، تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں، عشاء کے بعد دو رکعتیں اور اگر صلوٰۃ فی الزوال کی دو رکعتیں ہوں (چار نہ ہوں جیسا اُوپر بتلایا گیا) تو چوالیس کا عدد پُورا کرنے کے لیے وہ دو رکعتیں شمار کر لی جائیں جو حضرت عائشہ رضؓ کی ایک روایت میں وارد ہیں کہ آپ اپنے بستر پر دو رکعتیں پڑھنے کے بعد سویا کرتے تھے اور قیام اللیل (یعنی تہجد) کی بارہ رکعتیں اور وتر کی ایک رکعت (مترجم کہتا ہے کہ فی الزوال کی دو رکعتیں مان کر پینتالیس کا عدد پُورا نہیں ہوتا بلکہ فی الزوال کی چار مان کر بھی بستر پر سونے کے وقت کی دو رکعتیں ملانے سے یہ عدد پُورا ہو گا۔ جیسا شمار کرنے والے پر مخفی نہیں اور اسلم یہ ہے کہ فی الزوال کی دو رکعتیں شمار کی جائیں اور ظہر سے پہلے چار رکعتیں کیونکہ حدیث ام حبیبہ و عائشہ رضی اللہ عنہما سے ظہر کے پہلے چار سُنتوں کا ثبوت ہوتا ہے اور یہی حنفیہ اور جمہور علماء کا مذہب ہے اور بستر پر سونے کی دو رکعتیں حضورؐ سے دواماً ثابت نہیں)۔

اس تقریر پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ تمہارے بیان سے صرف اتنا معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ فرضوں کے علاوہ پینتالیس رکعتیں پڑھی ہیں۔ یہ تو ثابت نہ ہوا کہ پینتالیس نمازیں پڑھی ہیں تاکہ مجموعہ پچاس نمازیں ہوں۔ آگے اس کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ۴۵ رکعتیں ہی ۴۵ نمازیں ہیں) کیونکہ ایک رکعت پر (شرعاً) نماز کا اطلاق ہوتا ہے۔ جس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ زَادَکُمْ صَلٰوۃً اَلَا وَھِیَ الْوِتْرُ

"اللہ تعالیٰ نے تمہاری نمازوں میں ایک نماز اور بڑھادی ہے۔ سُن لو وہ وتر ہے۔"

(اور وتر ایک رکعت ہے) تو (دیکھو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک رکعت[عہ] کو نماز فرمایا ہے اور بظاہر اس (وتر کے بڑھانے) میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ[عہ] صلے اللہ علیہ وسلم نے (۵۰ کے) عدد میں ایک کی کمی چھوڑ دی تھی تو اللہ تعالےٰ نے اُس کو زیادہ (کر کے کمی کو پُورا) کر دیا تاکہ اللہ تعالےٰ کے احسان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی اُمت پر فضل کامل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے احسان سے اس اُمت کے صلحاء میں داخل کرے۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ تو جیسا ابتداء میں اللہ تعالےٰ نے محض فضل اور تخفیف کے لیے (نمازوں کا) عدد کم کر دیا تھا کہ پچاس کی جگہ پانچ کر دیں) اسی طرح (آخر میں) تفضل و تکمیل کے لیے (وتر کی

عہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ وتر کم از کم ایک رکعت ہے یا تین رکعت۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ وتر کم از کم تین رکعت ہے مگر اس باب کی احادیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر حقیقت میں ایک ہی رکعت ہے مگر اُس کے ساتھ دو رکعتوں کا ملانا ضروری ہے۔ اگر تنہا ایک ہی رکعت پر اکتفا کیا جائے تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں۔ کیونکہ عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے کہ ما اجزأت رکعۃ واحدۃ قط کہ ایک رکعت تنہا کبھی کافی نہیں ہوتی۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت نہیں کہ آپ نے کبھی وتر کی تنہا ایک رکعت پڑھی ہو۔ پس یہ بھی صحیح ہے کہ وتر ایک رکعت ہے کیونکہ حقیقت میں ایک ہی رکعت وتر ہے اُس کے ساتھ دو رکعتیں اس لیے ملائی جاتی ہیں تاکہ ایک رکعت تنہا نہ ہو۔ جس کو بعض احادیث میں بُتیراء کہا گیا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بُتیراء سے منع فرمایا ہے۔ جب وتر کے ساتھ دو رکعتوں کا ملانا ضروری ہے تو یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ وتر تین رکعت ہے۔ بہرحال اس اختلاف سے شارح کے کلام پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اُن کا یہ مدعا بہرحال ہیں ثابت ہے کہ شرعاً ایک رکعت کو بھی نماز کہا جاتا ہے واللہ اعلم۔ اس کی تائید فقہاء حنفیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے واللہ لا اصلی یعنی میں نماز نہ پڑھوں گا تو جب تک وہ ایک رکعت پوری نہ پڑھے حانث نہ ہوگا۔ جب ایک رکعت پوری پڑھ لے گا حانث ہو جائے گا۔ کیونکہ ایک رکعت سے کم نماز نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت کو شرعاً نماز کہا جاتا ہے۔ ۱۲ ظ

عہ فی الاصل ویظہر فیہ من الحکمۃ ان المولی سبحانہ لما نقص من العدد واحدۃ نامعا ہو جل جلالہ الخ وفیہ تصحیف حدیٰ والصحیح ان المولیٰ صلے اللہ علیہ وسلم الخ فافہم ۱۲ ا

ایک رکعت بڑھا کر ثواب کو کامل کر دیا کہ اب ان ۵ پانچ نفل رکعتوں کے پڑھنے والے کو حقیقی پچاس نمازوں کا ثواب ملے گا۔ اگرچہ تنہا پانچ فرض بھی پچاس نمازوں کے برابر ہیں۔ کیونکہ ہر نماز کا ثواب دس کے برابر ہے۔ مگر وہ حکمی پچاس ہیں۔ حقیقی نہیں واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ -

یہاں ایک لطیف گفتگو ہے وہ یہ کہ یہ اُمت (محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) دُوسری اُمتوں پر گواہ کیوں بنائی گئی ؟ جیسا کہ اللہ عزوجل کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے :

وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا -

" اور ایسا ہی ہم نے تم کو امت وسط یعنی بہترین اُمت بنایا تاکہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے اُوپر گواہ بنیں "

اُمت محمدیہ دُوسری اُمتوں سے کیونکر افضل ہوگئی حالانکہ یہ اُن سے کمزور ہے

حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو (شب معراج میں) سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا تھا کہ میں بنی اسرائیل کو بہت زیادہ جھیل چکا ہوں (اُن پر دو نمازیں فرض کی گئی تھیں وہ اُن کو بھی پُوری طرح ادا نہ کر سکے) اور آپ کی اُمت (اُن سے کمزور ہے وہ) اس کی (یعنی پانچ نمازوں کی) طاقت نہیں رکھتی تو (جواب یہ ہے کہ) اللہ تعالےٰ نے اپنا فضل فرمایا کہ ہمارے آقا (سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو درجہ کمال کی توفیق عطا فرمائی کہ جو عدد اولاً مطلوب تھا اس کو (خود) آپ نے ہی پُورا کر دیا۔

(اور اُمت کو بھی اس کی ترغیب دی) تاکہ گواہوں کا تزکیہ (کامل ہو جائے کیونکہ تزکیہ وعدالت گواہی کی شرط ہے۔ پس اللہ تعالےٰ کے فضل سے اس اُمت کا تزکیہ (اچھی طرح) ظاہر ہوگیا (کہ دوسری اُمتیں باوجود قوت کے دو نمازوں کو بھی پُورا نہ کر سکیں اور یہ اُمت باوجود ضعف کے پچاس نمازیں ادا کرتی ہے۔

ترقی کے دو دروازے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو باوجود اس کے ضعف کے اسی پر نہیں چھوڑ دیا، بلکہ آپ نے ہمارے لیے ترقی کے دو دروازے اور کھول دیئے۔ ایک تو اپنے اس ارشاد سے کہ رحمہ اللہ عبدا صلی اربعا قبل الظہر وصلی اربعا بعدہ اربع ومن صلی بین العشائین اثنتی عشرۃ رکعۃ بنی اللہ لہ قصرا فی الجنۃ۔ "اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جو چار (رکعت والے فرض) سے پہلے چار رکعتیں (نفل) پڑھ لے اور چار (رکعت والے فرض) کے فرض کے بعد بھی چار رکعتیں (نفل) پڑھ لے اور جو شخص مغرب وعشاء کے درمیان بارہ رکعتیں پڑھے گا۔ اللہ تعالےٰ اُس کے لیے جنت میں عالی شان محل بنائیں گے "۔

اس حدیث سے ظہر وعصر وعشاء کے پہلے اور پیچھے چار رکعتیں پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔ مگر عصر کے بعد نماز نفل کی ممانعت احادیث مشہورہ متواترہ میں وارد ہے اور یہ حدیث اُن کے برابر نہیں اس لیے بعد عصر کو اس حدیث سے مستثنیٰ کیا جائے گا۔ ترمذی نے بسند حسن روایت کیا ہے رحمہ اللہ امرأ صلے قبل العصر اربعا۔ اللہ تعالےٰ اُس شخص پر رحم کرے جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے۔ اس میں عصر کے بعد کا ذکر نہیں اس لیے نماز عصر سے پہلے ہی چار رکعتیں پڑھنا چاہئیں۔ بعد میں نہیں۔ واللہ تعالےٰ اعلم ۱۲۔ اور اس کے مشابہ دوسری احادیث بھی اس کے ہم معنی وارد ہوئی ہیں (جن میں نوافل کی ترغیب ہے) اور وہ بہت حدیثیں ہیں "۔

دوسرا دروازہ

جملہ افعال واقوال میں تزکیۂ کامل کی ضرورت ہے

یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (نماز کے علاوہ ہمارے) بقیہ افعال واقوال کے تزکیۂ کامل کی ضرورت پر بھی اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے:

من لم تنھہ صلوتہ عن الفحشاء والمنکر لم یزدد من اللہ الا بعدا۔

"جس شخص کو اُس کی نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے نہ روکے اُس کو اللہ سے بُعد ہی بڑھے گا"

(قُرب نہ بڑھے گا کیونکہ اس صورت میں اُس کی نماز نماز نہ ہوگی بلکہ صرف اُٹھک بیٹھک ہوگی جو عظمتِ الٰہی کے لائق نہیں بلکہ اس کے منافی ہے اور یہ وعید اُس وقت ہے جبکہ یہ شخص گناہوں سے نادم ہوکر توبہ بھی نہ کرتا ہو۔ اگر توبہ کر لیتا ہو اور دل میں ندامت ہو تو بُعد نہ ہوگا بلکہ اُمید ہے کہ کسی وقت گناہوں سے بالکل الگ ہو جائے گا۔ غرض گناہ سے ندامت ہونا اور توبہ کی توفیق ہونا بھی نماز کی برکات میں سے ایک برکت ہے)

پس اے شبہات اور شہوات کے ساتھی تجھے اللہ کی قسم! کچھ تو اپنی جان کی خبر لے۔ اپنے کو اس مقام رفیع اور عظیم الشان درجے سے محروم تو نہ کر۔ اپنے نفس کو ذلت اور ملامت کے مقام میں کھڑا کر! (شہوات پرستی میں آزاد نہ چھوڑ) کیونکہ جو شخص اپنی خواہش نفس کا اتباع کرتا ہے اس کی مروت (آدمیت) زائل ہو جاتی ہے اور دین بد نما ہو جاتا ہے۔ جس کی یہ حالت ہو اُس کا عمل برباد ہے اور جہنم اُس کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اگر تم (برابر) روزہ رکھو یہاں تک کہ (سوکھ کر) تانت کی طرح (لاغر) ہو جاؤ اور راتوں کو نماز پڑھو یہاں تک کہ کمان کی طرح (خمیدہ) ہو جاؤ۔ مگر تمہارے اندر ورع (اور تقویٰ) نہ ہو جو (محرمات سے) روکنے والا ہو تو یہ اعمال تم کو جہنم سے نہیں بچا سکتے" اور جوان آدمی جب اپنی شہوتوں کو چھوڑ دیتا ہے تو اب اس کا نفس حدود قصور کے حاصل کرنے کی توقع کرتا ہے (وہ ان اعمال میں کوشش کرنے لگتا ہے جو جنت میں پہنچانے والے اور جہنم سے روکنے والے ہیں)

نوافل کی ترتیب اور تفریق کی حکمت

تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجیب حکمت میں غور

تو کرو کہ آپ نے ان (نفل) نمازوں کو کس عجیب ترتیب کے ساتھ متفرق اوقات میں رکھا ہے۔ اگر آپ ان سب کو ایک ہی وقت میں رکھ دیتے یا ان کا عدد مقرر فرما دیتے جس میں زیادتی یا کمی نہ ہو سکتی ہو تو اس میں زحمت کو (مشقت ہوتی اور شاید بہت لوگ ان کے پورا کرنے کی قدرت نہ پاتے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ) ان میں سے بعض (نوافل) کو تو فرض نمازوں کے ساتھ رکھا اور جو بعض (نوافل فرض) نمازوں کے ساتھ نہیں ہیں اُن کا وقت (بہت) وسیع ہے۔ مثلاً رات کی نماز (یعنی تہجد) ایک جانب میں ہے (جس کا وقت بہت ہے) اور چاشت کی نماز طلوعِ آفتاب سے زوال تک (ایک جانب میں) ہے (اور یہ بھی کافی وقت ہے) پھر اگر کوئی قیام اللیل (یعنی تہجد) اور چاشت کی نماز سے عاجز ہو وہ اُن نمازوں سے تو عاجز نہ ہوگا جو فرضوں کے ساتھ ہیں۔ یہ تو سب ہی آدمیوں کو آسان ہیں۔ چنانچہ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کوئی خالی فرض نماز کو ادا کرتے ہوئے اُس سے پہلے اور پیچھے نفل نماز نہ پڑھتا ہو اور اگر کوئی ایسا ہو تو وہ (شاذو) نادر کے حکم میں ہے (اور نادر بمنزلہ معدوم کے ہے) جس کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔

تم اس لطیف اشارہ پر بھی نظر کرو کہ جب ہم سے اوّلاً پچاس نمازوں کا مطالبہ کیا گیا پھر فرض پانچ رہ گئیں تو اصلی فرض تو یہ پانچ ہی ہیں مگر کمال کا درجہ پچاس ہیں تو جتنی اُس اصل میں جو حکم قطعی سے ثابت ہے کمی رہ گئی تھی اُس کو دوسری اصل سے جو اون مطلوب تھی پورا کر دیا گیا یعنی پانچ فرضوں رکے ساتھ پینتالیس رکعتیں ملا کر اُن) کو پچاس کر دیا گیا اور ان کا نام نفل رکھا کیونکہ یہ حتمی (اور لازم) نہیں (بلکہ درجۂ کمال حاصل کرنے کے واسطے ہیں) اسی سے حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ جل جلالہٗ فرمائیں گے میرے بندہ کی نماز کو دیکھو اگر وہ فرض کو پوری طرح بجالایا ہو فبہا ورنہ دیکھو کہ اگر اس کے پاس کچھ نوافل ہوں تو فرض (کی کمی) کو اُن سے پورا کر دو۔ تو اُس اصل کو جو فرض ہے دوسری اصل سے جو کہ اوّلاً وضع کی گئی تھی پورا کر دیا جائے گا۔ پس اس وقت اللہ تعالےٰ کا یہ

ارشاد ہر طرح صادق آئے گا۔ مایبدل القول لدی۔ کہ میرے یہاں بات نہیں بدلا کرتی۔ چنانچہ گو فرض نماز اس وقت پانچ ہیں مگر وہی پچاس بھی ہیں کیونکہ اول تو پانچ کا ثواب پچاس کے برابر کر دیا گیا۔ پھر ان پانچ کی کمی کو بھی نوافل سے پورا کر دیا گیا حالانکہ نفل فرض کے برابر نہیں مگر چونکہ اولاً پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں اس لیے ۴۵ نفلوں کو بھی فرض کا درجہ دے دیا گیا۔ اس پر شاید یہ سوال وارد ہو کہ کیا ۴۵ رکعات سے زیادہ کو فرض کا درجہ نہ دیا جائے گا نیا اُن سے فرائض کی کمی کو پورا نہ کیا جائے گا۔ جواب یہ ہے کہ قیاس کا مقتضیٰ یہی تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام نوافل کو فرض کا مکمل بنا دیا ہے۔ کیونکہ نفل ہونے میں یہ ۴۵ اور اس سے زیادہ سب برابر ہیں۔

(واللہ ذو الفضل العظیم) قولہ الوجہ الاول ھذا الذی جاء

عنہ علیہ السلام من صفۃ ھذا المتنفل حل ھو تعبہ لا یعقل الی قولہ

فی الوجہ الثانی نعیاء قولہ تعالیٰ مایبدل القول لدی۔

ف اس حدیث کی شرح میں علامہ شارح نے حکمت تنفل کے متعلق جس علم عظیم کو ظاہر کیا ہے یہ اُن علوم میں سے ہے جو صوفیہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور دراصل یہ اسرار کشفیہ ہیں جن کے بیان سے زبان اکثر قاصر رہتی ہے اسی لیے ممکن ہے کہ اس تقریر کے بعض مقدمات اہل علم کی نظر میں مخدوش ہوں مگر علوم کشفیہ ذوقیہ کو مقدمات و دلائل کی حاجت نہیں۔ صاحب ذوق کا انشراح صدر اس کے لیے کافی ہے۔

ف بیان سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو سنن مؤکدہ کے بجالانے میں بھی تساہل اور تکاسل سے کام لیتے ہیں اُن کو متنبہ ہو جانا چاہیئے کہ وہ اپنے کو بہت بڑے درجہ سے محروم کر رہے اور اپنی بھلائی سے غفلت کر رہے ہیں ایسا لوت ہے جو نفل کو بڑا کر دکھا ست پوری طرح بجالانا ہو کہ نوافل سے اُن کی تکمیل کا محتاج نہ ہو۔ پہلے زمانہ میں ایسے نمازی شاذ و نادر ہی ہوتے تھے جو فرائض کے پہلے اور

پیچھے کچھ نوافل نہ پڑھتے ہوں گے، آج کل ایسے لوگوں کی کثرت ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے اور ہمیں اور سب مسلمانوں کو تکمیل صلوٰۃ کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

ف یہاں سے سالکین کو سبق لینا چاہیئے کہ اُن کو پانچ فرضوں کے علاوہ کم از کم ۵۸ رکعتیں نوافل کی مع وتر کے پڑھنا چاہئیں تاکہ حقیقتاً وحکماً ہر طرح ۵۰ نمازیں ادا ہو جائیں کیونکہ طریق سلوک، مجاہدہ، ذکر کثرت عبادت پر مبنی ہے ان کو پینتالیس رکعات سے کم نوافل نہ پڑھنا چاہئیں۔ جس کی ایک صُورت تو وہ ہے جو حضرت شارح نے بیان فرمائی۔ دوسری صُورت یہ ہے کہ سنن مؤکدہ کی بارہ رکعتوں اور وتر کی تین رکعتوں کے علاوہ تیس رکعتیں اور پڑھی جائیں۔

حنفیہ کے نزدیک سنن مؤکدہ کی تفصیل یہ ہے کہ نماز فجر کے پہلے دو رکعتیں ظہر سے پہلے چار اور اُس کے بعد دو رکعتیں مغرب کے بعد، دو رکعتیں عشاء کے بعد دو رکعتیں ہیں۔ ان کے ساتھ وتر کی تین رکعات ملانے سے مجموعہ عدد پندرہ ہُوا۔ ان کے علاوہ تیس رکعات نوافل اس طرح پڑھ لی جائیں کہ مغرب کی سُنتوں کے بعد صلوٰۃ الاوابین چھ رکعات۔ تہجد آخر شب میں آٹھ رکعات۔ صلوٰۃ الاشراق چار رکعات۔ عصر سے پہلے دو رکعتیں اور اسی میں تحیۃ المسجد کی نیت کر لی جائے۔ صلوٰۃ الضحیٰ چار رکعات، ظہر کی سنتوں کے بعد دو رکعتیں، عشاء سے پہلے دو رکعتیں۔ عشاء کی سنتوں کے بعد دو رکعتیں۔ اس طرح مجموعہ عدد رکعات نوافل وسنن مع وتر کے پینتالیس ہوگا۔ ان کے ساتھ پانچ فرض نمازوں کو ملا لینے سے پچاس نمازوں کا عدد پُورا ہو جائیگا۔ اگر آخر شب میں تہجد کے لیے بیدار ہونے کی اُمید نہ ہو تو عشاء کی سنتوں کے بعد وتر سے پہلے یا پیچھے ۸ رکعتیں تہجد کی نیت سے پڑھ لی جائیں۔

ف جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ شرعاً ایک رکعت پر بھی نماز کا اطلاق ہوتا ہے تو ۵۰ نمازیں پورا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پانچ فرض اور وتر کی رکعات کا مجموعہ بیس رکعات ہے۔ ان کے علاوہ تیس رکعتیں اور پڑھ لی جائیں جن میں بارہ رکعات تو سنن مؤکدہ کی ہوں اور چار اشراق کی اور ظہر کی دو سنتوں کے بعد دو رکعتیں، عصر سے پہلے چار رکعتیں مغرب کی سنتوں کے بعد چار رکعتیں۔ عشاء کی سنتوں کے بعد دو نفلیں،

وتر کے بعد بہ نیت تہجد دو رکعتیں۔

اگر کسی کو یہ ترتیب آسان نہ ہو تو جس وقت فرصت زیادہ ہو اُس میں تعداد رکعات بڑھا کر تہجد کا عدد پورا کر دے۔ مگر جو صورت ہم نے بیان کی ہے وہ بعض احادیث کے موافق ہے۔ مثلاً ایک حدیث قدسی میں ہے:-

ابن اٰدم ارکع لی اربع رکعات من اول النہار اکفک اٰخرہ۔

"اے ابن آدم! تو دن کے شروع میں میرے لیے چار رکعتیں پڑھ لیا کر۔ میں دن بھر تیری حفاظت کروں گا"

اکثر علماء نے اس حدیث کو نمازِ اشراق پر محمول کیا ہے۔ ترمذی کی حدیث میں ہے رحمہ اللہ امرأ صلی قبل العصر اربعًا۔ جس کا ترجمہ گزر چکا۔ نماز عشاء اور ظہر کے بعد چار رکعتوں کی فضیلت ایک حدیث میں گزر چکی ہے۔ صلوٰۃ الاوابین کے بارہ میں اختلاف ہے کہ چھ رکعات علاوہ سنت مغرب کے ہیں یا مغرب کی سنتوں کے ساتھ، اگر کسی کو مغرب کے بعد چار نفلوں کا وقت نہ ملے تو وہ عشاء سے پہلے چار رکعتیں پڑھ لیا کرے کہ ایک حدیث میں جو اُوپر گزر چکی ہے عشاء سے پہلے بھی چار رکعتیں پڑھنے کی فضیلت وارد ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں وتر کے بعد دو رکعتوں کو تہجد کا قائم مقام بتلایا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ف: یہ تو تزکیہ صلوٰۃ کی صورت تھی اسی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ جملہ افعال و اقوال میں تزکیہ کا اہتمام کیا جائے اسی کا نام ورع اور تقویٰ ہے جس کے لیے اصلاحِ نفس کی ضرورت ہے جو مشائخ صوفیاء کی تربیت و تعلیم سے حاصل ہوتی ہے کہ وہی امراضِ قلب کے طبیب ہیں ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر
دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

ف: حدیث سے معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی سنتیں مسجد میں نہ پڑھتے۔ بلکہ گھر میں پڑھتے تھے۔ اسی طرح جمعہ کے بعد گھر میں دو رکعتیں پڑھتے

تھے۔ اس میں واللہ اعلم حکمت یہ تھی کہ مغرب کا وقت تنگ ہے اور مشغولی کا وقت بھی ہے۔
بعض لوگ ضروری کاموں کو ادھورا چھوڑ کر نماز کے لیے آجاتے ہیں جن کو نماز مغرب کے
بعد جلدی پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مغرب اور جمعہ کے بعد مسجد میں سُنتیں نہ پڑھنے کی حکمت

بعض لوگ اس وقت تھکے ماندے اور بعضے روزہ دار ہوتے ہیں۔ اگر رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم مغرب کی سُنتیں مسجد میں پڑھتے تو صحابہ بھی مسجد کے پابند رہتے جس
سے بعض کو تکلیف ہوتی جو آپ کو گوارا نہ تھی۔ حضورؐ نے تو فرض مغرب کے متعلق بھی یہ
فرمایا ہے کہ اگر شام کا کھانا سامنے رکھ دیا جائے اور نماز کی اقامت ہونے لگے تو
پہلے کھانے سے فارغ ہو جاؤ۔ تو نوافل کے لیے اُن کو مسجد کا پابند بنانا آپ کیسے
گوارا فرماتے؟ اس لیے مغرب کی سُنتیں گھر میں پڑھتے تھے تاکہ اہل حاجت فرض پڑھتے
ہی اپنے گھر چلے جائیں اور ضروری کاموں سے فارغ ہو کر یکسی قدر راحت و آرام کرکے
سُنتیں پڑھ لیں اور جمعہ کے بعد مسجد میں سُنتیں اس لیے نہ پڑھتے تھے کہ ناواقف لوگ یہ
خیال نہ کریں کہ یہ دو رکعات ظہر کی چار رکعتیں پوری کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہیں۔ پھر
رفتہ رفتہ یہ اعتقاد نہ ہو جائے کہ یہ رکعتیں فرض ہیں۔

جیسا بعض علماء کا قول ہے کہ جمعہ کا خطبہ ظہر کی دو رکعتوں کا قائم مقام ہے حالانکہ
خطبہ کو نماز سے بظاہر کچھ نسبت نہیں تو ان دو رکعتوں کو تو ضرور ظہر کی دو رکعتوں کا قائم مقام
سمجھ لیا جاتا۔ کیونکہ نماز کو نماز سے پوری نسبت ہے۔ اب اس میں علماء کی گفتگو کی
ہے کہ مغرب کی سنتوں کا اور جمعہ کے بعد دو رکعتوں کا مسجد میں پڑھنا کیسا ہے؟ سو اس
پر تو سب کا اتفاق ہے کہ مغرب کے بعد مسجد میں سُنتیں پڑھنا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے جس علت کی وجہ سے ان کو گھر میں پڑھا ہے وہ علت دوسروں
کے حق میں مفقود ہے۔ لیکن افضل یہی ہے کہ اُن کو گھر میں ہی ادا کیا جائے۔ کیونکہ
فضیلت حضورؐ کے اتباع ہی میں ہے۔ اگرچہ سلف میں بعض حضرات ان سنتوں کو

مسجد میں پڑھتے تھے اور جمعہ کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے مسجد میں پڑھنے سے منع فرمایا ہے بعض نے جائز کہا ہے۔ مگر جائز کہنے والے بھی یہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کے متصل نہ پڑھے بلکہ ایک دروازہ سے نکل کر دوسرے دروازہ سے مسجد میں آکر پڑھ سکتا ہے یا جس جگہ فرض جمعہ ادا کیا ہے اُس جگہ سے ہٹ کر یہ رکعتیں پڑھے اور اگر جگہ بدلنے میں دشواری ہو تو کم از کم جمعہ کی نماز کے بعد کچھ دیر بیٹھا رہے اور پھر یہ دو رکعتیں پڑھے تاکہ وہ شبہ جاتا رہے کہ یہ دو رکعتیں نماز ظہر کی چار پوری کرنے کے لیے ہیں اور اس میں تو کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ اُن کا گھر میں پڑھنا ہی افضل ہے۔ یہ خلاصہ ہے اُس تقریر کا جو علامہ شارح نے اسی مقام پر بیان فرمائی ہے۔

علماء زمانہ کی شکایت

اس کے بعد اُنھوں نے اپنے زمانہ کے علماء پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے متصل یہ رکعتیں پڑھتے ہیں۔ نہ جگہ بدلتے ہیں نہ کچھ توقف کرتے ہیں۔ گویا اُنھوں نے اس حدیث کو اور مسلم کی اس حدیث کو سُنا ہی نہیں جس میں وارد ہے کہ ایک شخص جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر اسی جگہ نفلیں پڑھنے لگا تو حضرت عمرؓ نے اُس کو اپنی طرف کھینچا اور فرمایا بیٹھ جاؤ (پہلی اُمتیں اسی سے برباد ہوئی ہیں کہ وہ نمازوں میں فصل نہ کرتے تھے) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے قول کی تقریر و تصدیق فرمائی۔ یہ دونوں حدیثیں صحت اور شہرت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ پھر بھی علماء زمانہ ان کی معنوں پر غور نہیں کرتے۔ بس علم اور اہل علم کہاں چلے گئے؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

دین میں کیسی نئی نئی باتیں پیدا ہونے لگیں ؟ جن کا زیادہ حصہ اس جماعت کے ہاتھوں پیدا ہو رہا ہے جو علم کی طرف منسوب ہے۔ ان کے پاس بجز الفاظ نقل کر دینے اور زبردستی بحث و مباحثہ اور فخر و مباہات کرنے کے کچھ نہیں رہا۔ ہیہات علم اس طرح حاصل نہیں ہوتا نہ اس کا یہ طریقہ ہے۔ علم تو اتباع سُنّت سے

سے حاصل ہوتا ہے اور نور (قلب) وحکمت (باطن) سے اتباعِ سُنت میں سلف کی موافقت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے فضل سے اس کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین

ف نوافل و وتر کا گھر میں ہی پڑھنا افضل ہے جیسا احادیث سے واضح ہے مگر چونکہ ایک زمانہ میں منکرینِ سُنت کی جماعت پیدا ہوگئی جس نے سنن و نوافل کو بالکل ہی ترک کردیا تو اہلِ حق نے سنن مؤکدہ کو مسجد میں پڑھنا شروع کردیا تاکہ لوگ اُن کو منکرِ سنت اور تارکِ سُنت سمجھ کر بدنام نہ کریں اور منکرینِ سُنت کا عملاً رد بھی ہو جاوے۔ مگر جمعہ کے بعد نفلیں پڑھنے میں اس کا خیال کرنا چاہیئے کہ جس جگہ جمعہ کی نماز پڑھی ہے اُسی جگہ نفلیں نہ پڑھی جائیں بلکہ وہاں سے ہٹ کر یا کچھ دیر توقف کر کے پڑھیں۔ فرض کے بعد معاً متصلاً نہ پڑھیں۔ شارح نے جمعہ کے بعد دو رکعتیں بیان فرمائی ہیں۔ یہ اُن کا مذہب ہے حنفیہ کے نزدیک چار یا چھ رکعتیں ثابت ہیں۔ دلائل اعلاء السنن میں ملاحظہ ہوں۔

ف علامہ شارح کی تقریر سے اتباعِ سُنت کی تاکید اور فقہ علم اور فقہ حال کی تعریف بخوبی واضح ہے اور فقہ حال ہی کا نام تصوف ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کی جو باتیں زبان سے بیان کی جاتی ہیں وہ عملاً حال بن جائیں۔ کیا اب بھی کسی یہ کہنے کا حق ہے کہ تصوف کا قرآن وحدیث سے ثبوت نہیں؟ حق یہ ہے کہ محققین صوفیہ سے بڑھ کر متبع کتاب وسنت کوئی جماعت نہیں۔ جعلنا اللّٰہ ممن تبعھم۔ آمین۔

❖

حدیث

غزوۂ بنی قریظہ

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (ظہر کے بعد) غزوۂ احزاب سے (فارغ ہوکر) واپس ہوئے تو آپ نے ہم سے فرمایا کہ کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے۔ مگر بنو قریظہ (کے محلہ) میں (پہنچ کر یعنی وہاں جلدی پہنچو۔ نمازِ عصر کی وجہ سے تاخیر نہ کرو۔ نماز وہیں جاکر پڑھو) تو (صحابہ یہ حکم سُنتے ہی روانہ ہو گئے جن میں سے اکثر تو نمازِ عصر کے وقت بنو قریظہ کے محلہ میں پہنچ گئے اور) ایک جماعت کو راستہ ہی میں عصر کا وقت ہو گیا تو (ان میں دو فریق ہو گئے) بعض نے کہا کہ ہم تو عصر کی نماز بنو قریظہ میں پہنچ کر ہی پڑھیں گے راستہ میں نہ پڑھیں گے۔ (کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد یہی تھا کہ بنو قریظہ میں پہنچنے سے پہلے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے۔ پس ہم کو اس ارشاد کی پوری تعمیل کرنا چاہیئے) بعض نے کہا ہم تو (راستہ ہی میں) نماز پڑھ لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی یہ مراد نہ تھی (کہ نماز کو قضا کر دو یا وقت مکروہ میں ادا کرو۔ بلکہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ نماز عصر کی وجہ سے روانگی میں تاخیر نہ کی جائے۔ سو ہم نے روانگی میں تاخیر نہیں کی بلکہ حکم کے ساتھ ہی روانہ ہو گئے اور جب ہم نے حکم کی تعمیل کر دی ہے تو اب راستہ میں نماز پڑھنا اور بنو قریظہ کے محلہ میں نماز پڑھنا برابر ہے) پھر (دونوں فریق کی)

اس (گفتگو اور اختلافِ رائے) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ نے اُن میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی "۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بنو قریظہ کی طرف جانے کا حکم دیا اور صحابہ نے اس حکم کی تعمیل میں سبقت کی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے "۔

(۱۱۱) اس حدیث کے فوائد پر گفتگو کرنے سے پہلے واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے صحابہ کو بنو قریظہ کی طرف جانے کا حکم ہُوا تھا۔

خلاصہ واقعہ غزوۂ خندق سو واقعہ یہ ہے کہ جب صحابہ غزوہ احزاب سے واپس ہُوئے (جس کو غزوہ خندق بھی کہتے ہیں۔

کیونکہ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی حفاظت کے لیے شرقی جانب میں بڑی گہری اور چوڑی خندق کھد واتی تھی کہ اسی طرف سے مدینہ میں دشمن میں آنے کا راستہ تھا باقی سمتیں پہاڑوں، ٹیلوں اور لوگوں کے مکانات کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ فوج اِدھر کو نہیں آسکتی تھی۔ ایک ایک دو دو آدمی آسکتے تھے تو اُن کے روکنے کو تیر اندازوں کی مختصر جماعت کافی تھی۔ یہ لڑائی ۵ھ میں ہوئی ہے اُس کے بانی یہود بنی نضیر تھے جو چند سال پہلے مدینہ سے جلاوطن کئے گئے اور خیبر میں جابسے تھے۔ اُنہوں نے مکہ جاکر قریش کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اُبھارا اور یقین دلایا کہ خیبر کے یہودی بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اور یہود بنو قریظہ بھی جو مدینہ میں رہتے ہیں ہماری موافقت کریں گے۔ چنانچہ اہل مکہ نے اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مدینہ کا رُخ کیا۔ اطراف و جوانب کے دیہاتی بھی اُن کے ساتھ ہو گئے۔ مدینہ پہنچتے پہنچتے اُن کی تعداد دس بارہ ہزار ہو گئی۔ بنو قریظہ نے اُن کی کثرت پر بھروسہ کر کے مسلمانوں سے غداری کی اور نقضِ عہد کر کے قریش کے ساتھ ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا پسند فرمایا

شہر کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کا حکم دیا۔ لشکرِ قریش نے خندق کے پاس قیام کیا۔ کیونکہ شہر میں گھسنے کا راستہ وہی تھا مگر خندق کا عرض و عمق دیکھ کر اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس کا عبور کرنا آسان نہ تھا۔ دو چار بہادروں نے خندق میں گھوڑے ڈالے بھی مگر مُسلمانوں کی تیر اندازی نے اُن کو پار ہونے کی مہلت نہ دی۔ ایک دو بہادر ہمّت کر کے پار بھی ہوئے تو حضرت علی اور حضرت زبیرؓ جیسے بہادروں کی تلواروں نے اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب قریش نے خندق کے کنارہ سے مُسلمانوں پر تیر برسانے شروع کئے تو مسلمانوں نے بھی تیر بازی سے اُن کو جواب دیا۔ کئی دن تک اسی طرح مقابلہ رہا۔ سردی کا موسم تھا۔ قریش کا لشکر کھلے میدان میں بڑی سے پریشان تھا۔ اُدھر سامانِ رسد بھی ختم ہونے لگا تو قریش نے بنو قریظہ پر تقاضا کیا کہ تم مدینہ کے اندر سے مُسلمانوں پر حملہ کر دو تاکہ وہ تمہاری طرف متوجّہ ہوں اور ہم خندق کو عبور کر کے شہر میں گھس آئیں۔

بنو قریظہ نے قریش کی کمزوری اور بے بسی دیکھ کر ان کی موافقت سے پہلو تہی کی اور دوبارہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے صلح کرنا چاہی ابھی وہ پیامِ صُلح نہ بھیجنے پائے تھے کہ اُسی رات ٹھنڈی ہوا بڑے زور سے چلی جس سے قریش کے خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ کھلے میدان میں خیموں کی پناہ بھی باقی نہ رہی تو سب سے پہلے ابوسفیان اپنی سانڈنی پر سوار ہو کر مکہ کی طرف بھاگے اُن کو بھاگتا دیکھ کر تمام لشکر نے راہِ فرار اختیار کی۔ صُبح تک میدان بالکل صاف تھا کہ کفار میں سے ایک بھی مدینہ کے آس پاس نظر نہ آتا تھا۔

یاایها الذین آمنوا اذکروا نعمة الله علیکم اذ جاءتکم جنود فارسلنا علیهم ریحا وجنودا لم تروها وکان الله بما تعملون بصیرا۔ الی قوله ورد الله الذین کفروا بغیظهم لم ینالوا خیرا وکفی الله المؤمنین القتال وکان الله قویا عزیزا ۔

(سورۃ الاحزاب)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ نے اس غیبی امداد پر شکرانۂ فتح ادا فرمایا اور پھر دو دن تک احتیاطاً وہاں قیام کر کے مدینہ کا رُخ کیا) اس وقت مسلمانوں میں کچھ لوگ زخمی بھی تھے جن کو قریش کی تیر بازی سے زخم کاری لگا تھا (آپ ان کو ساتھ لے کر واپس ہُوئے) اور بدن سے ہتھیار رکھوں کر غسل کرنے کا ارادہ فرمایا کہ اسی وقت جبریل علیہ السلام ہتھیار بند تشریف لائے اور کہا کیا آپ ہتھیار رکھونا چاہتے ہیں حالانکہ ملائکہ ابھی تک ہتھیار بند ہیں (آپ نے فرمایا اب کیا کام رہ گیا ہے جس کے لیے ہتھیار بند رہنے کی ضرورت ہے) جبریل علیہ السلام نے کہا: بنو قریظہ پر حملہ کرنا اور اُن کو غداری کی سزا دینا ہے پھر اللہ تعالےٰ کی طرف سے حکم پہنچا یا کہ اسی وقت (بنو قریظہ کی طرف) چلئے ابھی ہتھیار نہ کھولئے اور جتنے مسلمان احزاب کے مقابلہ کو گئے تھے اُن کو بھی حکم دیجئے کہ اس وقت (بنو قریظہ کی طرف) روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ صحابہ روانہ ہو گئے۔ اُن میں جو زخمی تھے وہ بھی دو دو آدمیوں کا سہارا لیے ہوئے نکل کھڑے ہُوئے۔ دُشمن اسلام (یعنی احزاب قریش) نے (رات کی سردی سے بے تاب ہو کر اگرچہ راہ فرار اختیار کر لی تھی۔ مگر دھوپ نکلنے پر جو اس درست ہُوئے تو اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے اور دوبارہ لوٹ کر) مدینہ پر حملہ کرنے کی طمع کرنے لگے کیونکہ اُن کو معلوم تھا کہ تیر باری سے مسلمان بہت زخمی ہو چکے ہیں (اور ہمارے بھاگنے کی خبر سُن کر خندق سے پہرہ بھی اُٹھا لیا گیا ہوگا۔ اب ہم کو دفعتہً مدینہ میں گھس جانا دشوار نہ ہوگا اور زخم خوردہ لشکر اسلام کو ہمارے مقابلہ کی سکت نہ ہوگی) وہ یہ خیالات ہی پکا رہے تھے کہ دفعتہً (کسی جاسوس وغیرہ کی زبانی) یہ خبر سُن کر کہ مسلمان (خندق سے واپس ہوتے ہی) اسی وقت (بنو قریظہ کے مقابلہ کو) نکل کھڑے ہُوئے ہیں تو اللہ عزّ و جل نے ان لوگوں کے دلوں میں رُعب ڈال دیا (اُن کو معلوم ہو گیا کہ لشکر اسلام باوجود زخم خوردہ ہونے کے ان کی طرح بزدل اور کمزور نہیں ہُوا اُس کے وہی دم خم باقی ہیں) تو سب (کے سب ہی کو) واپس بھاگے چلے گئے اور اللہ تعالےٰ نے (اپنی عنایت اور رحمت سے) مسلمانوں کے سر سے وہ بلا ٹالدی

جو اُن لوگوں نے مدینہ پر لوٹ کر حملہ کرنے کی صورت میں ڈالنا چاہی تھی (یہ تو مختصر حکایت واقعہ تھی اب سمجھو کہ اس سے کیا فائدے حاصل ہوئے)۔

کامیابی اور امدادِ غیبی کا بڑا سبب امتثالِ امر ہے

اس سے معلوم ہوا کہ نصرت (اور کامیابی) کا بڑا سبب امتثالِ امر ہے (کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالایا جائے) کیونکہ یقیناً یہ زخمی مسلمان جو دو دو آدمیوں کے سہارے سے نکلے تھے نہ (دشمن سے) لڑنے کی طاقت رکھتے تھے نہ کسی کو دفع کر سکتے تھے (محض تعمیلِ حکم کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے) تو جب انہوں نے حکم کے آگے گردن جھکا دی اور معاملہ کو اللہ کی قدرت کے حوالہ کر دیا (اور زبانِ حال سے کہہ دیا کہ جتنا ہماری قدرت میں تھا ہم نے کر دیا آگے جو کچھ ہو گا آپ کی قدرت سے ہو گا) تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی ایسی مدد کی کہ بدون لڑے کامیاب ہو گئے۔ ان کو کچھ بھی نہ کرنا پڑا حضرات صحابہ نے اس بات کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے صرف اپنے حکم کی تعمیل چاہتے ہیں اور نصرت (و کامیابی) محض اللہ کے (فضل و) انعام سے ہوتی ہے جو وہ اپنے اس ارشاد کی تصدیق کے لیے عطا فرماتے ہیں: وکان حقا علینا نصر المؤمنین "مسلمانوں کی مدد کرنا ہمارے ذمہ لازم ہے"۔

(جس کا محض اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے۔ اس میں بندہ کا کچھ دخل نہیں۔ اس کا کام تو تعمیلِ حکم ہے۔ انقیاد اور تسلیم کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کامیابی عطا فرماتے ہیں) اور اپنے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ قیامت تک یہی رہے گا کہ جو اُس کی مدد کرے گا اللہ تعالیٰ بھی اُس کی مدد کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بات سے بڑھ کر کس کی بات سچی (ہو سکتی) ہے؟

(بس یہ سنت اللہ بدل نہیں سکتی اگر کسی جگہ دشمن کے مقابلہ میں باوجود جملہ اسباب کامیابی مجتمع ہونے کے مسلمان ناکام رہے ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بجا آوریٔ احکام میں اُن سے کوتاہی ہوئی ہے، بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی مدد یہی ہے کہ

اُس کے حکم کی تعمیل کرے اور جس بات سے منع کر دیا گیا ہے اُس سے پرہیز کرے۔
(اور درحقیقت یہ خود بندہ کی طرف سے اپنی مدد ہے کیونکہ تعمیل احکام اور اجتناب حرام سے جو کچھ نفع ہے بندہ ہی کا ہے۔ اللہ تعالےٰ کو نہ اس کی اطاعت سے کچھ نفع نہ معصیت سے کوئی نقصان، مگر یہ بھی اُن کی طرف سے نعمت بر نعمت ہے کہ اس کو اپنی نصرت فرما دیا۔ حالانکہ وہ اس سے بری ہیں کہ کوئی اُن کی مدد کرے)

ف ہمارے بزرگوں کا ارشاد ہے کہ ثمر غایت ہ سے عمل مقصود ہے۔ کامیابی مقصود نہیں کیونکہ کامیابی اس کے اختیار میں نہیں اس کے اختیار میں عمل ہے۔ پس عمل ہی کو مقصود سمجھنا چاہیئے۔ ثمرات پر نظر نہ کرنا چاہیئے۔ جس شخص کا عمل مرضی الہٰی کے موافق ہے وہ ظاہری ناکامی کی حالت میں بھی کامیاب ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی کامیابی رضائے حق ہے اور وہ اس کو حاصل ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھنے سے تمام پریشانیوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ سالکین میں زیادہ تر پریشان وہ ہیں جو عمل کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ خاص حالات وکیفیات کو مقصود سمجھتے ہیں جن کو وصل اور وصول اور کامیابی کا لقب دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ حالات اور کیفیات بندہ کے اختیار میں نہیں اور امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونا پریشانی مُول لینا ہے۔ پس اُن کو تکمیل اعمال کا اہتمام کرنا چاہیئے جو اُن کے اختیار میں ہے جس کا ان کو مکلف کیا گیا ہے۔ جب عمل کامل ہو جاتا ہے تو عادۃ اللہ یہ ہے کہ وصول وکامیابی عطا ہو جاتی ہے اور تکمیل اعمال کا طریقہ یہ ہے کہ آداب ظاہرہ کو بھی ادا کیا جائے جو علمائے شریعت سے معلوم ہو سکتے ہیں اور آداب باطنہ کی بھی پُوری رعایت کی جائے جو مشائخ طریق سے معلوم ہوں گے۔

آداب باطنہ میں بڑا ادب یہ ہے کہ عمل ریا سے پاک ہو۔ رضائے حق کے سوا اُس سے کچھ مقصود نہ ہو اور عمل کے بعد دل میں تواضع ہو۔ عجب پیدا نہ ہو کہ میں نے اتنا بڑا کام کیا بلکہ عمل کو اللہ کا فضل سمجھے اپنا کمال نہ سمجھے۔ اعمال صالحہ سے طبعاً فرحت اور مسرت کا ہونا عجب نہیں یہ تو عمل صالح کی خاصیت ہے کہ اُس سے فرحت

ونشاط اور حلاوتِ باطنہ حاصل ہوتی ہے ۔ قل بفضل اللہ و برحمۃ فبذٰلک فلیفرحوا
جیساگناہ کی یہ خاصیت ہے کہ اُس سے مومن کے دل کو رنج اور پریشانی ہوتی ہے ۔
حدیث میں ہے :

" اذا سرتك حسنتك وساءتك سيئتك فانت مؤمن "

عُجب یہ ہے کہ عمل کو اپنا کمال سمجھے ۔ جس کا لازمی اثر یہ ہے کہ دوسروں سے جو اُس کے برابر عمل نہیں کرتے اپنے کو افضل سمجھے اور یہ آداب ظاہرہ و باطنہ جیسا مجاہدۂ باطن میں ہیں ۔ اسی طرح جہاد ظاہر میں بھی ہیں ۔ مسلمانوں کو جہاد ظاہر میں بھی ان آداب کی رعایت کرنا چاہیئے ۔ مثلاً ظاہری ادب یہ ہے کہ فتویٰ شرعی سے جہاد کی اجازت ہو اور جن شرائط کے ساتھ جہاد مشروط ہے وہ سب مجتمع ہوں اور باطنی ادب یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے سوا کچھ مقصود نہ ہو ۔

یہاں سے سیاسی جدوجہد کرنے والے مسلمانوں کو بھی سبق لینا چاہیئے کہ نصرت الٰہی کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کے حق میں امتثال حکم ہے ۔ مسلمان تو اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے مگر ہمارے سیاست دان اس سب سے بڑے سبب کا تو اہتمام نہیں کرتے ۔ دوسرے اسباب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ۔

یہاں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ بعض دفعہ صلحاء بھی تو باوجود اصلاح اعمال کے ناکام ہو گئے ہیں کامیاب نہ ہوئے ۔ جواب یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ۔ ایک انفرادی جو ہر شخص کی ذات سے الگ الگ متعلق ہیں ۔ ان میں ہر شخص اپنے عمل کی اصلاح سے کامیاب ہو جاتا ہے ۔ دوسرے اجتماعی جو مسلمانوں کے اجتماع سے متعلق ہیں ۔ انفرادی اعمال میں صلحاء کبھی ناکام نہیں ہوتے جبکہ امتثال حکم میں انہوں نے کوتاہی نہ کی ہو اور اجتماعی اعمال میں کامیابی کے لیے تنہا صلحاء کا اصلاح عمل کافی نہیں بلکہ جماعت کی جماعت کا عمل درست ہونا چاہیئے یا کم از کم اُن میں سے اکثر کا عمل درست ہو ۔ اگر ایسا نہ ہُوا بلکہ اکثر کا عمل مرضیٔ حق کے خلاف ہُوا تو نصرت و کامیابی لازم نہیں ۔ لیکن اس صورت میں اگر ناکامی ہُوئی تو جماعت ہی کو ناکام کہا جائے گا ہر شخص کو ناکام

نہ کیا جانے گا۔ کیونکہ جن کا عمل مرضیٔ حق کے موافق تھا وہ اُس وقت بھی حقیقتہً کامیاب ہوں گے۔

چنانچہ ایک بزرگ نے ایسے ہی موقع پر ایک شخص کو جواب دیا تھا جس نے بطور طعن کے دریافت کیا تھا کہ آپ کے بزرگوں کی جد وجہد سے کیا حاصل ہُوا ؟ فرمایا ؂

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

رہا یہ سوال کہ جماعت کے اعمال کی اصلاح تو بہت دشوار ہے۔ اس شرط کے تو یہ معنی ہونے کہ مسلمان کسی وقت بھی کسی اجتماعی عمل میں کامیاب نہ ہو سکیں گے، جواب یہ ہے کہ کسی اجتماعی عمل میں کامیابی کے لیے زمانۂ ماضی اور مستقبل میں اعمال کا درست ہونا شرط نہیں اگرچہ کمال فلاح اسی سے وابستہ ہے بلکہ حالتِ موجودہ میں اصلاحِ عمل شرط ہے اور یہ کچھ دشوار نہیں کیونکہ سچی توبہ سے ایک منٹ میں پچھلے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔

پس جب مسلمان کسی اجتماعی عمل کو شروع کرنا چاہیں اُس وقت سب سے پہلے اُن کا امیر حق تعالےٰ کی جناب میں اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرے۔ پھر سب مسلمانوں سے کہے کہ ہر شخص سچے دل سے توبہ کرے اس کے بعد حالتِ عمل میں اللہ تعالےٰ کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں۔ گناہوں سے الگ رہیں انشاء اللہ کامیابی اُن کے قدم چُومے گی۔ پس جہاں دوسرے اسباب کے لیے جد وجہد کی جاتی ہے اس سب سے بڑے سبب کے لیے بھی تھوڑی سی کوشش کر لی جایا کرے تو کیا حرج ہے ؟

شاید اس مقام پر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ امام حسین علیہ السلام جماعتِ یزید کے مقابلہ میں کیوں ناکام ہوئے۔ وہ تو امتثالِ احکام میں اُس وقت

سب سے بڑھے بوڑھے تھے اور اُن کے ہمراہی بھی سب صلحاء تھے۔ جواب یہ ہے کہ اگرچہ نصرت اور کامیابی کے لیے امتثالِ حکم بہت بڑا سبب ہے مگر تنہا یہی کافی نہیں بلکہ دُوسرے اسباب کا مجتمع ہونا بھی ضروری ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ اہلِ حق کی جماعت سے اہلِ باطل کی جماعت دوگنی سے زیادہ نہ ہو۔ اہلِ حق کے پاس سامانِ رسد وغیرہ کی کمی نہ ہو۔ اگر اہلِ باطل کی جماعت دوگنی سے زیادہ ہو یا اہلِ حق کے پاس کھانے پینے کا سامان نہ ہو۔ نہ کہیں سے سامانِ رسد کے آنے کی اُمید ہو تو اُس وقت اہلِ حق کو میدان سے بھاگ جانے یا دُشمن سے دَب کر صُلح کر لینے کی اجازت ہے اور بعض دفعہ ایسا کرنا واجب ہے جبکہ مقابلے سے مُسلمانوں سے نفع پہنچنے کی اُمید نہ ہو اور ظاہر ہے کہ حضرت امام کی جماعت اہلِ باطل کی جماعت کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ بچے بڑے سب ملا کر بیاسی[۸۲] آدمی تھے اور لشکرِ یزید چار ہزار سے بھی زیادہ تھا۔ پھر حضرت امامؓ کی جماعت کا پانی بند کر دیا گیا تھا۔ سب کے سب پیاسے تھے۔ اس حالت میں مقابلے کے جُملہ اسباب مجتمع نہ تھے۔ اس لیے حضرت امام کو شرعاً وہاں سے بھاگ جانے یا صُلح کرنے کی اجازت تھی۔ بھاگنے کا تو راستہ بند تھا کیونکہ دُشمن نے ہر طرف سے محاصرہ کر لیا تھا، صلح کے لیے حضرت امام نے پیام بھیجا تو ظالموں نے اس کو بھی ٹھکرا دیا۔

اب حضرت امام کے سامنے دو ہی راستے تھے یا یزید کی بیعت قبول فرما لیتے اور اس حالت میں شرعاً اس کی اجازت بھی۔ چنانچہ بہت سے صحابہ نے اسی وجہ سے اُس کی بیعت قبول کر لی تھی کہ اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پاتے تھے یا باطل کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے شرعاً اس کی بھی اُن کو اجازت تھی۔ کیونکہ اس صُورت میں اگرچہ بظاہر اہلِ حق کو کچھ فائدہ نہ تھا۔ مگر باطناً اہلِ حق اور اہلِ باطل سب کو یہ نفع پہنچنے کی توقع تھی کہ اہلِ حق کو باطل کے سامنے سرنگوں ہونے سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو جائے گی۔ ان کی ہمتیں اظہارِ حق کے لیے بلند ہو جائیں گی اور جماعتِ یزید کو اپنا برسرِ باطل ہونا واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ نے اسی دوسری صورت

کو اختیار فرمایا اور تاریخ شاہد ہے کہ قتل امام حسینؓ کے بعد یزید اور جماعت یزید سب کے سب عامۂ اہلِ اسلام کی نظروں میں ایسے ذلیل و خوار ہوئے کہ ان کو کسی سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہر طرف سے اُن پر نفرت و نفرین کے گولے برستے تھے۔ شرم کے مارے کسی جگہ سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔

شہادتِ امام نے اہلِ باطل کا باطل پر ہونا اچھی طرح دُنیا پر روشن کر دیا اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں اگر جان کا خطرہ ہو تو صاحبِ حق کو تنہا اپنی جان پر کھیل جانے کی اجازت ہے اس کو القاء نفس فی التہلکہ نہ کہا جائے گا کیونکہ اس سے گو ظاہر میں اہلِ حق کو نفع نہ ہو مگر باطناً مسلمانوں کو اصلاحِ عقیدہ کا فائدہ حاصل ہوگا کہ منکر کا منکر ہونا اور بدعت کا بدعت اور قبیح ہونا سب مُسلمانوں پر واضح ہو جائے گا۔ کفار کے مقابلے میں اس طرح جان پر کھیلنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے نہ مسلمانوں کو کچھ نفع ہے نہ اصلاحِ عقیدہ کفار کی توقع اور اگر کسی وقت کوئی نفع متصور ہو۔ مثلاً یہ کہ اس سے کفار کے دلوں میں ہیبت و رُعب قائم ہوتا ہو یا اُن کی اغاظت ہو کہ مسلمانوں کی جان بازی سے اُن کے دل جلیں تو وہاں بھی اس کی اجازت ہے۔ تفصیل کتب فقہ سے معلوم کی جائے۔ امید ہے کہ اب اس مقام پر کوئی اشکال باقی نہ رہا ہوگا۔ نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ امتثال احکام سے نُصرت کا وعدہ کفار کے مقابلہ میں ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں۔ اگر مسلمان باہم قتال کریں تو صلحاء کا غلبہ لازم نہیں۔ وفیہ مافیہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(١١٢) فحوی کلام بھی بمنزلہ نص کے ہے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ فحوی کلام پر بھی اُسی طرح عمل واجب ہے جیسا نص پر عمل کرنا واجب ہے۔ فحوی کلام وہ ہے جو کلام کی قوت (الفاظ تاکید اور قرینۂ حال) سے سمجھا جائے۔ چنانچہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ سے یہ فرمایا کہ بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں تو وہ سمجھ گئے کہ مقصود

قتال کے لیے نکلنا ہے اس لیے آپ نے مقصود کو صراحۃً بیان نہیں فرمایا۔ کیونکہ قوت کلام سے صحابہ آپ کا مطلب سمجھ گئے تھے۔

جہاد نفس اور جہاد شیطان میں کامیابی کا طریقہ التجا ہے

یہ تو جہاد اصغر کے متعلق حکم تھا جس میں دشمن سے (یعنی کافروں سے) مقابلہ ہوتا ہے۔ یہی حکم جہاد اکبر کا ہے جس میں نفس کے ساتھ جہاد ہوتا ہے اور کہ اس میں بھی امداد غیبی اور کامیابی کا بڑا سبب امتثالِ امر ہے) اس کی طرف اللہ تعالےٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے:

واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ۔

" اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پریشان کرے تو اللہ کی پناہ طلب کیجئے "

(اس میں جہاد نفس اور جہاد شیطان کے لیے اللہ کی طرف التجا کو کامیابی کا سبب بتلایا گیا ہے کیونکہ) حالت جس قدر سنگین ہوتی ہے اُسی کے مناسب کامیابی کا ذریعہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ چونکہ شیطان اور نفس کا معاملہ زیادہ سنگین ہے تو اس کے مقابلے میں کامیابی کا ذریعہ محض التجا قرار دیا گیا (کہ اللہ کی پناہ طلب کرو، اللہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ) جیسا نفس کے مقابلہ میں کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ شریعت کے موافق مجاہدہ کیا جائے۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

" اور جو لوگ ہمارے واسطے (اپنے نفس سے) مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (رضا و قرب) کے راستے دکھا دیتے ہیں "۔

(اور اس مجاہدہ میں امداد (غیبی) کا ذریعہ یہ بتلایا کہ اللہ تعالےٰ سے سچے دل سے مدد مانگو (تو اس کا مال بھی استعاذہ و التجا کی طرف ہوا) چنانچہ ارشاد ہے:

ایاک نعبد وایاک نستعین، اے اللہ! ہم آپ ہی عبادت کرتے ہیں اور

مجاہدۂ نفس ہوا) اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں (یہ التجا ہوئی جو مجاہدہ میں کامیابی کا وسیلہ ہے) اسی لیے بعض اہلِ توفیق نے فرمایا ہے کہ جب مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے خواہ کسی قسم کی ہو (ظاہری یا باطنی) تو میں التجا میں مشغول ہوجاتا ہوں۔ پھر اُس کی پرواہ نہیں کرتا اور التجا کے چند طریقے ہیں ایک یہ کہ ذکر اللہ اور عبادت میں ہمہ تن مشغول ہوجائے اور معاملہ کو اللہ کے سپرد کردے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی ارشاد فرمایا ہے :

من شغلہ ذکری عن مسألتی أعطیتہ أفضل ما اعطی السائلین

"جو شخص میری یاد میں ایسا مشغول ہوجائے کہ مجھ سے مانگنے (اور دُعا کرنے) کی بھی اسے فرصت نہ ہو میں اُس کو مانگنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں"

(اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ اور عبادت میں ہمہ تن مشغول ہوجانا بھی التجا کی ایک فرد ہے) ایک صورت یہ ہے کہ صدقہ (خیرات) کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے استعینوا علی حوائجکم بالصدقۃ اپنی حاجات میں کامیاب ہونے کے لیے) صدقہ سے مدد لو۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ دُعا میں مشغول ہوجائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من الھم الدعاء فقد فتح علیہ ابواب الخیر۔ جس کو دعا کی توفیق ہوگئی اُس پر خیر کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اور اگر ان (تینوں) کے مجموعہ کو اختیار کر لیا جائے پھر تو کیا پوچھنا؟ کیونکہ اہل توفیق کا مشاہدہ ہے کہ خیر (حاصل ہونے) کا جو سبب بھی ہے وہ عین خیر ہے قولہ اوجہ الخامس نیہ دلیل علی ان فحوی الکلام الی قولہ ھو عین الخیر۔

ف یہ مضمون آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جو لوگ اثنائے سلوک میں کسی ضیق میں مُبتلا ہوجائیں یا اور کسی قسم کی پریشانی پیش آئے اُن کو اسباب سے کام لینا چاہیئے۔ ان شاء اللہ بہت جلد کامیابی نصیب ہوگی۔ جعلنا اللہ ممن جعلہ مخلصًا بالمراد منصورا وجعل کدہ باتنا کالھباء منثورا۔

(۱۱۴۳) نفس کا مُردہ ہونا ہی حیات ہے

اس میں صوفیہ کے ایک قول کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ نفس کا مرجانا ہی اُس کی زندگی ہے۔ جو شخص حیات کا طالب ہو اُسے مُردہ بن جانا چاہیئے (اس مطلب کو اس عنوان سے بھی بیان کیا جاتا ہے موتوا قبل ان تموتوا، مرنے سے پہلے ہی مرجاؤ۔

یعنی ظاہری موت سے پہلے ہی اپنے آپ کو مُردہ بدست زندہ بنادو۔ اپنے ارادہ واختیار و تجویز اور دعوے کو فنا کردو) کیونکہ حضرات صحابہ کی نظر میں جب اپنے نفس کی کچھ وقعت نہ رہی اور وہ اللہ تعالےٰ کے راستے میں موت پر راضی ہوکر نکل کھڑے ہوئے۔ کیونکہ جو شخص اس حالت سے نکلے گا جو ہم نے صحابہ کی حالت اُوپر بیان کی ہے وہ موت ہی کے ارادے سے نکلے گا تو وہ اُسی وقت نصرت (اور کامیابی) اور ثواب و سلامتی سے کامیاب ہوگئے۔

جس نے جو دولت باطنی پائی ذلّتِ نفس سے پائی

یہی اہلِ توفیق کا حال ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ پایا اسی سے پایا ہے کہ اُن کی نظروں میں اپنے نفس کی کچھ قدر وقیمت باقی نہیں رہی اور وہ (ہر وقت اللہ تعالےٰ کے حکم پر) اپنی جان دینے کو تیار رہے ہیں اور اہلِ دُنیا اپنے نفس کی محبت سے ذلیل ہوگئے۔ اُن کے لیے یہاں بھی ذلّت لازم ہوگئی اور وہاں بھی۔

حدیث میں وارد ہے کہ ہر بندہ کے سر میں اُس کی (عقل و) حکمت ہے (جس کی باگ ؏) فرشتے کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ بڑائی اور بلندی کا

؏ یہاں کوئی لفظ اصل کتاب سے چھوٹ گیا ہے میں نے اپنے ذوق سے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔

فان کان صوابًا فمن اللہ ومن رسولہ وان کان خطأً فمنی ومن الشیطان ۱۲ ظ

دعوے کرنے لگتا ہے تو فرشتہ اُس کے سر پہ چوٹ لگا کر کہتا ہے :

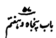
" پست ہو جا خدا تجھے ذلیل کرے "! اور اگر تواضع اختیار کرے تو فرشتہ کہتا ہے :

" بلند ہو جا ! خُدا تجھے رفعت (وعزت) دے ۔

اللہ تعالےٰ ہمیں بھی اپنے فضل سے وہ دولت عطا فرمائیں جس سے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنا مقرب بنالیں ۔ (آمین)

قوله الوجه السادس فيه دليل صوفي الى قوله من الله علينا بما به يقربنا اليه بمنه "

※



حدیث

السنۃ یوم عید الفطر

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (عیدگاہ کو) عید الفطر کے دن اُس وقت تک نہ جاتے جب تک چند چھوارے نہ کھالیتے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ اُن کو عدد طاق کی رعایت سے تناول فرماتے (مثلاً تین یا پانچ یا سات)

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ عید الفطر میں سُنت یہ ہے کہ کوئی شخص عیدگاہ کو بدون کچھ کھائے نہ جائے اور مستحب یہ ہے کہ چھوہارے کھائے جائیں اور اُن میں عدد طاق کی رعایت کی جائے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱) چھوارہ (اور کھجور) مدینہ والوں کے لیے سب چیزوں سے زیادہ آسان (اور سہل الحصول) ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُسی چیز کو پسند فرماتے تھے جو آسان (اور سہل الحصول) ہو (اس لیے آپ عید کے دن چند چھوارے نوش فرماکر نماز کو چلے جاتے)

کھانے پینے میں تکلف خلافِ سُنت ہے اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اس دن ناشتہ

کے لیے تکلّف کرنا خلافِ سُنّت ہے۔ کیونکہ دل اُسی میں مشغول رہے گا اور سیّدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم اور حضرات صحابہ کو بڑی فکر آخرت کی تھی یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ اپنے گھر والوں سے فرمایا کرتے تھے کھانا ایسا بناؤ جو پیا جا سکے۔ ایسا نہ بناؤ جسے کھانے (اور چبانے) کی ضرورت ہو کیونکہ کھانے اور پینے (کی مدت) میں اتنی اتنی آیتوں کا فرق ہے (یعنی کھانے میں زیادہ دیر لگتی ہے جس سے تلاوتِ قرآن کا حرج ہوتا ہے پینے میں زیادہ دیر نہیں لگتی) پس یہ حضرات دُنیا کو بقدرِ ضرورت ہی لیتے تھے۔

قولہ فی ـ الوجہ الثانی منہا انہا ایسر الاشیاء عند ھم الیٰ قولہ فما کانوا رضوان اللہ علیہم یاخذون من الدنیا الا قدر الضرورۃ ـ

ف اس سُنّت پر سب سے زیادہ عمل حضرات صُوفیہ کا ہے وہ بھی دُنیا بقدرِ ضرورت ہی لیتے ہیں ما کس میں تکلّف نہیں کرتے جو آسانی سے بلامشقّت وطلب میسّر ہو اُسی پر قناعت کرتے ہیں۔

(۵۱) **خیرِ حقیقی امتثالِ امر ہے** یہاں سے معلوم ہُوا کہ (ہر حال میں) امتثالِ امر ہی حقیقی خیر ہے خواہ نفس کے موافق ہو یا خلاف ہو۔ اگر امتثالِ امر میں خواہشِ نفس کی موافقت بھی ہو جیسا یہاں ہے (کہ عید کے دن سویرے ہی کچھ کھا لینا سُنّت ہے اور یہ سُنّت خواہشِ نفس کے موافق ہے) اس کے سوا اور جو مواقع اُس کے مشابہ ہوں تو یہ بھی منجملہ نعمتوں کے (ایک بڑی نعمت) ہے کیونکہ اس وقت نفس اپنی خواہش کو بھی پُورا کرتا ہے اور ثواب بھی ملتا ہے۔ ہمارے اس قول کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عید الاضحیٰ میں عید گاہ جانے سے پہلے کچھ نہ کھاتے تھے یہاں تک کہ (نماز کے بعد) اپنی ہدی یا قربانی کو ذبح فرماتے (پھر اُس میں سے کھاتے) اور قربانی میں سے بھی سب سے پہلے گوشت عہ جگر تناول فرماتے کیونکہ یوم النحر میں جملہ طاعات

عہ ہذہ ترجمۃ قولہ زیادۃ الکبد فی مختصر القاموس زائدۃ الکبد ھنیۃ منہ صغیرۃ الی جانبہ منتحیۃ عنہا ۱۲ء

سے افضل اراقۃ الدم (یعنی قربانی کرنا) ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ جس چیز کو اللہ تعالےٰ پسند فرماتے ہیں اسی کو پہلے تناول کیا جائے (اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ بعض دفعہ اُن افعال میں بھی ثواب ملتا ہے جو خواہش نفس کے موافق ہیں۔ جیسے کھانا پینا وغیرہ۔ یہ ضرور نہیں کہ ثواب اُسی کام میں ملا کرے جو نفس کے خلاف ہو)۔

یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے گوشت جگر کیوں کھاتے تھے؟ تو واللہ اعلم اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل جنت کے کے ساتھ تشبہ ہو جائے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ پہلا کھانا جو جنتی کھائیں گے اُس مچھلی کا گوشت جگر ہوگا جس پر تمام زمینوں کا مدار ہے (اور یہ بھی احتمال ہے کہ کلیجی جلدی تیار ہو جاتی ہے گوشت کے پکنے میں دیر ہوتی ہے اس لیے آپ پہلے کلیجی تناول فرمالیتے تاکہ زیادہ دیر تک بھوکا رہنے سے تکلیف نہ ہو۔

مذمت مخالفت سنت و ترجیح عادت یہاں سے معلوم ہوا کہ آج کل کے اہل تنعم دُنیا داروں کا یہ طریقہ ہے کہ عیدالاضحٰی کی رات میں پہلے سے گوشت تیار کرتے اور قسم قسم کے کھانے پکاتے اور قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے ہی کھالیتے ہیں سُنت کے خلاف ہے۔ یہ تو اُن کا حال ہے جو قربانی کرتے ہیں اور بہت سے تو قربانی چھوڑ کر سُنت کی مخالفت کرتے ہیں کہ (باوجود صاحب نصاب ہونے کے قربانی نہیں کرتے) غرض بعض دفعہ شریعت کے اچھے کام بھی اُن بدعتوں اور مخالفتوں سے رنگ دیئے جاتے ہیں جن کو لوگوں نے اپنا دستورالعمل بنالیا ہے (چنانچہ قربانی کرنا سُنت ہے مگر اس کو سُنت کے موافق ادا نہیں کیا جاتا کیونکہ رواج کے موافق ادا کیا جاتا ہے کہ قربانی سے پہلے ہی انواع و اقسام کے کھانے تیار کرکے کھائے جاتے ہیں حالانکہ سُنت یہ ہے کہ سب سے پہلے قربانی کا گوشت کھایا جائے) اور یہ لوگ بطور حجت کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ لوگوں کی عادت (اور قوم کا رواج) یوں ہی ہے مگر ایسے لوگوں

کو ہم آدمی کس طرح کہیں جو اپنے نبی کی سُنت کو چھوڑتے اور اپنی بُری عادتوں کو سُنت پر ترجیح دیتے ہیں ۔

قوله الوجه الثالث فيه من الفقه ان حقيقة الخير هو نفس الامتثال الى قوله ويؤثرون عادة نفوسهم اذ ميهم ۔

ف یہ ہے تصوف حقیقی کہ ادنیٰ ادنیٰ عمل میں بھی اتباعِ سُنت کا اہتمام کیا جائے۔ صوفیہ محققین کے نزدیک وہ لوگ آدمی نہیں جو سنت نبویہ کو چھوڑ کر رسم ورواج کو اُس پر ترجیح دیں۔ واللہ المستعان۔

یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو گئی جو ثواب کا مدار مخالفت نفس ہی پر سمجھے ہُوئے ہیں۔ حالانکہ مدار فضیلت امتثال امر ہے خواہ نفس کے موافق ہو یا خلاف ہو خوب سمجھ لو ۔



باب پنجاہ دہشتم
۵۵

حدیث

العمل فی ایام التشریق

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کسی زمانے میں عمل کرنا ان دنوں کے عمل سے افضل نہیں (مراد ایام تشریق ہیں) صحابہ نے کہا یا رسول اللہ : اور جہاد بھی نہیں فرمایا! جہاد بھی نہیں مگر یہ کہ کوئی شخص اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈال دے پھر کچھ لیکر واپس نہ ہو"

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ کسی زمانے میں عمل کرنا ایام تشریق کے عمل کے برابر نہیں اور وہ یوم النحر کے بعد تین دن ہیں " اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

ایامِ عید عبادت کے لیے ہیں لہو ولعب کے لیے نہیں ہیں

(۱۱۶) اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایام اگرچہ عید کے دن ہیں مگر عبادت کے لیے ہیں لہو (ولعب) کے لیے نہیں" تو آج کل جو بیہودگیاں ان دنوں میں کی جاتی ہیں وہ اس حدیث سے ممنوع ہیں۔

اب اگر کوئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد سے احتجاج کرے لکل امة عید و ہذا یومہ عید نا۔ ہر اُمت کی ایک عید (ہوتی) ہے اور یہ دن

ہماری عید کا ہے تو (اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (اس کے ساتھ) اُن کاموں کو بھی تو بتلا دیا ہے جو ان دنوں میں جائز کئے گئے ہیں۔ (اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ یہ دن ہماری عید کا ہے) چنانچہ ارشاد فرمایا:

انما هي ايام اكل وشرب وذكر الله ۔ "بس یہ دن کھانے پینے اور اللہ کو یاد کرنے کے ہیں"

(جس سے معلوم ہُوا کہ مُسلمانوں کی عید دُوسری قوموں کی عید کی طرح لہو ولعب کی عید نہیں بلکہ ذکر اللہ کی عید ہے) نیز ارشاد فرمایا افضل ما يعمل فيها اراقة الدماء سب سے افضل عمل جو ان دنوں میں کیا جاتا ہے خون بہانا (یعنی قربانی کرنا) ہے اور اس میں سُنت یہ ہے کہ اپنی قربانی میں سے خود بھی کھائے۔ صدقہ بھی کرے (دوستوں عزیزوں کو) ہدیہ بھی دے۔ غرض ان دنوں میں سب سے اعلیٰ عبادت مشروع کی گئی ہے یعنی ذکر اللہ، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما عمل آدمي عملا انجى له من عذاب الله من ذكر الله ۔

"آدمی کوئی عمل اللہ کے عذاب سے زیادہ نجات دینے والا ذکر اللہ سے بڑھ کر نہیں کرتا"

اور قربانی میں مال کا خرچ کرنا بھی مشروع کیا گیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تنافسوا في اثمانها فانها مطاياكم الى الجنة ۔ قربانی کی قیمتوں میں دل کھول کر خرچ کیا کرو کیونکہ وہ جنت کے (پہنچانے کے لیے) تمہاری سواریاں ہیں۔ اور قربانی میں صدقہ بھی مشروع کیا گیا اور صدقہ جیسا حدیث میں ہے تطفئ غضب الرب اللہ کے غصہ کو کم کرتا ہے۔ بس ان دنوں میں جس عبادت سے منع کیا گیا ہے وہ صرف روزہ ہے اور کچھ نہیں۔ باقی عبادات سب مطلوب ہیں خواہ وجوبًا یا استحبابًا کیونکہ فرض (واجب) تو بشرط قدرت کسی وقت بھی ساقط نہیں ہوتا نہ عید میں نہ اور دنوں میں اور یہ حدیث (جو اس باب میں مذکور ہے) تمام مستحبات کی ترغیب دے رہی ہے اور ان ایام میں اُن کے ادا

کرنے کو دوسرے ایام سے افضل بتلا رہی ہے جس سے تاکید مقصود ہے (کہ ان ایام میں دُوسرے دنوں سے زیادہ مستحبات کا اہتمام کرنا چاہیئے کیونکہ ان ایام کا ہر عمل جہاد سے بھی افضل ہے۔

اوقاتِ غفلت میں عبادت کرنا افضل ہے

یہاں ایک سوال ہے کہ ان ایام میں اعمال کی فضیلت کسی علت کی بناء پر ہے یا تعبد محض ہے (جس کی کوئی علت نہیں ہو) (جواب میں) ہم کہتے ہیں کہ ایک علت کی وجہ سے ہے وہ یہ کہ قواعد شرعیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ اوقاتِ غفلت میں عبادت کرنا افضل ہے جیسا مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھنے کی فضیلت وارد ہے کیونکہ یہ لوگوں کی غفلت کا وقت ہے اسی طرح قیام اللیل (اور تہجد) کی فضیلت کہ وہ بھی غفلت کا وقت ہے لوگ اس وقت غفلت اور نیند میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح نماز چاشت کی فضیلت کیونکہ اس وقت بھی لوگ اپنے اسباب (معاش) میں غافل ہوتے ہیں۔ غرض ایسی بہت نظیریں ہیں (جن سے اوقاتِ غفلت میں عبادت کی فضیلت ثابت ہے) تو چونکہ یہ ایام عید بھی کھانے پینے اور نفس کی راحت کے دن ہیں اس لیے ان دنوں میں لوگوں پر نیند اور غفلت کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے (تو جس شخص ان دنوں میں عبادات اور ذکر میں لگا رہے گا اس کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہو گی۔)

عیدین یا نکاح میں دف بجانا جائز ہے یا نہیں ؟

باقی آج کل تو نیک کاموں سے رغبت ہی اُٹھ گئی۔ اب تو ان دنوں کو لہو و لعب اور حرام کاموں کے لیے خاص کر لیا گیا ہے اور حجت کے طور پر یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عید کے دن) حضرت عائشہ کے گھر میں داخل ہوئے تو اُن کے پاس قبیلہ بنو النجار کی چھوکریاں گا رہی اور (دف بجا رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی طرف پشت کر کے اپنے بستر پر لیٹ

گئے۔ کچھ دیر کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں آئے تو لڑکیوں کو دھمکایا اور فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں یہ شیطان کا باجہ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا۔ اُن کو (اپنے حال پر) رہنے دو۔ کیونکہ یہ عید کا دن ہے (ان کو بھی اپنا جی خوش کرنے دو) اگر یہ حدیث صحیح ہو[عہ] تب بھی اس میں (جواز لہو ولعب کے لیے) کچھ حجت نہیں کیونکہ (بظاہر یہ واقعہ ابتدائے اسلام کا ہے۔ اُس وقت تو شراب بھی حلال تھی، سود بھی حلال تھا، جوا بھی جائز تھا اور بہت سے فرائض اس وقت تک فرض نہ ہوئے تھے۔ پھر حکم اس کے خلاف جاری ہوا (شراب وربا وقمار حرام کر دیئے گئے اور بہت سے فرائض لازم کئے گئے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

انما بعثت بکسر الدف والمزمار "میں تو ڈھپڑوں اور باجوں کو توڑنے کو مبعوث ہوا ہوں"۔

یہ سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم (مجلس سے) نکلے اور بچوں کے ہاتھوں سے دف اور باجے چھین کر توڑنے لگے تو جن چیزوں کی اباحت ابتدائے اسلام میں بعض احادیث سے معلوم ہوتی ہے پھر بعد میں اُن کی حرمت ثابت ہو گئی۔ اُن احادیث سے یہ حجت قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ منسوخ ہو چکی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصریح فرمادی ہے :

لھو المؤمن لا یکون الا فی ثلاث فی رمیہ عن قوسہ و تادیبہ لفرسہ وملاعبۃ لاھلہ۔

مرد کہ مومن کا لہو (ولعب) تین چیزوں کے سوا نہیں ہوتا (۱) کمان کے ساتھ تیر اندازی کرنا (۲) اپنے گھوڑے کو شائستہ بنانا (۳) اپنی بیوی سے دل لگی کرنا (اُس کے ساتھ کھیلنا) پھر ان تین پر چوتھی چیز کا اضافہ کیسے ہو سکتا ہے!

عہ اخر کہتا ہے کہ یقیناً صحیح ہے فقد اخرجہ الشیخان وغیرھا ۱۲ ط

اور اس مضمون میں بہت حدیثیں (وارد) ہیں (کہ ان تین کے سوا (لہو و لعب باطل ہے) اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ

.. بعض لوگ لہو (و لعب) کی باتیں اختیار کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے گمراہ کریں ؟

پس لہو شرعاً ممنوع ہے عیدین ہو یا غیر عیدین سوا اُس کے جو ہم نے ابھی بیان کی (اور وہ بھی محض صورۃً لہو ہے حقیقۃً لہو نہیں ۔ کیونکہ تیراندازی اور گھوڑے کی سواری جہاد میں کار آمد ہے اور بیوی کے ساتھ دل لگی ہنسی کرنے میں اُس کی دلجوئی ہے جس سے محبّت میں ترقی ہوتی ہے اور زوجین میں باہم تعلق محبت ہونا مصالح نکاح کی بُنیاد ہے)

الوجہ الاول منھا ان فیہ دلیلا علی ان ھذہ الایام وان کانت ایام عید الی قولہ فاللھو ممنوع شرعا الا ما ذکرنا ذا انفا ۔

مزامیر کی حرمت پر تو فقہاء کا اتفاق ہے اور دف کے متعلق جمہور فقہاء **ف** کا قول یہ ہے کہ عیدین میں اور نکاح اور خوشی کے موقع میں جائز ہے بشرطیکہ ویسے ہی بے قاعدہ بجادیا جائے ۔ قواعد موسیقی کے طریقہ پر تطریب کے ساتھ نہ ہو کیونکہ آثار صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی مواقع سرور میں بالخصوص نکاح میں دف کی اجازت دی ہے ۔ جس سے معلوم ہُوا کہ حدیث عائشہؓ منسوخ نہیں اور حضرت عائشہؓ کے گھر میں جو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں وہ باقاعدہ گانے والیاں نہیں تھیں ۔

حدیث میں تصریح ہے وجاریتان تغنیان ولیستا بمغنیتین کہ دو لڑکیاں گا رہی تھیں اور وہ گانے والیاں نہ تھیں ۔ اور خوب سمجھ لو کہ حدیث میں غالباً دف کا لفظ نہیں ہے بلکہ معازف کا لفظ ہے اور معازف وہ باجا ہے جو ہاتھ سے بجایا جاتا ہے جیسے ستار، ڈھولک، سارنگی، ہارمونیم وغیرہ اور مزامیر وہ

یا جو مُنہ سے بجایا جائے جیسے تَتے۔ نفیری اور بین وغیرہ۔ دَف کو معازف میں عام طور سے شمار نہیں کیا جاتا وہ الگ چیز ہے۔ یہ فقہاء حنفیہ و شافعیہ کا مسلک ہے اور احوط وہ ہے جو شارح نے بیان کیا ہے کہ سب ہی سے احتراز کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو ایام تشریق میں عبادت کا اہتمام نہیں کرتے۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی عید دوسری قوموں کی عید سے جُدا ہے۔ اسلامی عید کا حاصل یہ ہے کہ سال بھر جو نفس کو مجاہدہ اور خلوت کے ساتھ عبادت میں مشغول کیا تھا چند دنوں اُسے خوش کر کے بھی عبادت میں لگایا جائے تاکہ مجاہدہ سے جو بعض دفعہ ایک قسم کی افسردگی پیدا ہو جاتی ہے اُس کی تلافی ہو جائے۔ ایام عید میں جب نفس کو اچھے کھانوں، اچھے کپڑوں اور دعوتوں کی ملاقاتوں سے خوش کیا جائے گا تو اب وہ انشراح اور خوشی کے ساتھ عبادت میں لگے گا۔ پس ایام عید میں بھی نفس کو آزاد نہ چھوڑا جائے بلکہ اُسے خوش کر کے کام میں لگایا جائے۔ اگر عید کے دنوں میں آزاد رکھا گیا تو وہ چند دن اور بھی آزاد رہنا چاہے گا اور اس طرح آزادی کا راستہ کھولنے سے سال بھر عبادات میں خلل رہے گا۔

ف یہاں سے آج کل کے اہلِ سماع کو بھی سبق لینا چاہیئے کہ وہ سماع میں اُن آلات لہو سے بھی پرہیز نہیں کرتے جن کی حرمت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ دیگر آدابِ سماع کی تو کیا رعایت کریں گے کہ سامعین سب اہل ہوں۔ نااہل کوئی نہ ہو۔ سنانے والا بھی اہل ہو۔ صاحبِ دل ہو۔ مضمون بھی لغو و بے ہودہ نہ ہو بلکہ حمد و نعت یا کلام معرفت ہو اور سماع بھی بحالتِ اضطرار ہو رہا ہو کہ بدون اُس کے قبض کسی طرح مرتفع ہی نہ ہوتا ہو۔ وغیر ذلک من الشرائط التی ذکرھا القوم الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ ط

۱۱۷) **ایامِ تشریق ابتلاء و امتحان کے ایام ہیں** ایام تشریق کو ایک اور فضیلت بھی ہے کہ یہ ایام حضرت

خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ابتلاء و امتحان کے ایام ہیں (پس ان میں اس ابتلاء کو یاد کر کے لہو ولعب سے بچنا چاہیئے) پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پر کرم فرمایا کہ محنت (و آزمائش) کو نعمت سے اور کتنی بڑی نعمت سے بدل دیا کہ جنت سے ایک دُنبہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں آیا اور حضرت ابراہیمؑ کو بانی سنت اضحیہ بنا دیا گیا کہ اب قیامت تک کی تمام قربانیوں کا ثواب اُن کو بھی ملتا رہے گا۔

ان دو وجہوں کی وجہ سے یہ ایام تمام ایام سے افضل ہو گئے اور اللہ سبحانہٗ جب اپنے بندوں میں سے کسی پر کوئی احسان فرماتے ہیں اس کو زائل نہیں کرتے پس اُن کے لیے اس فضیلت کو باقی رکھا اور اس میں یہ زیادتی فرمائی کہ نعمت کو بھی باقی رکھا یعنی (ہمیشہ ہمیشہ کو) اُن کے لیے قربانی اور اس کے متعلقات مشروع کر دیئے گئے (کہ نماز بھی پڑھیں۔ تکبیریں بھی عید کی نماز میں زیادہ کہیں اور ہر نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیرات تشریق کی پابندی کریں) اور محنت (و مشقت) کو بھی اُن سے مرتفع کر دیا۔ یعنی بچوں کے ذبح کرنے (کے حکم) کو (قبل از عمل ہی منسوخ کر دیا گیا۔ اب ان کی جگہ جانوروں کی قربانی واجب کر دی گئی۔)

کیا ایامِ تشریق میں ہر عمل دوسرے ایام کے اعمال سے افضل ہے؟ یا خاص اعمال ہی افضل ہیں؟

یہاں ایک سوال ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "ما العمل" میں الف و لام جنس کا ہے کہ اس فضیلت میں فرائض و مستحبات علی اختلاف الدرجات سب مساوی ہیں یا لام عہد ہے جس سے مخصوص اعمال مُراد ہیں؟ تو لفظ کا صیغہ (اور اس کی صورت) دونوں کو محتمل ہے۔ پس ان ایام میں جو فرائض ادا کئے جائیں گے وہ بھی دوسرے ایام کے فرائض سے افضل ہوں گے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے متعلق فرمایا ہے من شھد ھا فی

جماعة فکانما قام لیلۃ " جس نے صبح کی نماز جماعت سے پڑھی گویا اُس نے رات بھر نماز پڑھی " اور عشاء کے متعلق فرمایا ہے : من شھد ھا فی جماعة فکانما قام نصف لیلۃ " جس نے عشاء جماعت سے پڑھی اُس نے گویا آدھی رات نماز پڑھی " تو دیکھو یہ بھی جماعت سے ادا کی گئی ہے اور وہ بھی مگر دونوں کے ثواب میں آدھوں آدھ کا فرق ہے۔ اس کی وجہ بجز اُس کے کچھ نہیں کہ صبح کی نماز میں عشاء کی نماز سے زیادہ مشقت ہے۔ کیونکہ صبح کے وقت بہت لوگ جنابت کی حالت میں اور غفلت کی نیند میں ہوتے ہیں۔ عشاء کے وقت یہ بات نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایام تشریق کے اندر لوگ کھانے پینے اور راحت کرنے، بیویوں سے مشغولی ہونے کے سبب زیادہ غفلت میں ہوتے ہیں۔ اس علت پر نظر کر کے یہ ایام اور دنوں سے افضل ہو گئے اور ان میں عمل کرنا مطلقاً جہاد کے مشابہ ہو گیا کیونکہ جہاد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ فرض اور نفل، اور ان ایام میں بھی ہر طرح کے اعمال ادا ہوتے ہیں۔ فرائض بھی سنن و مستحبات بھی۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ لام عہد کے لیے ہو جس سے اُن اعمال پر اشارہ ہو گا جو احادیث میں اوپر بیان ہوئے ہیں کہ یہ دن کھانے پینے اور ذکر اللہ کرنے کے ہیں اور بہتر یہی ہے کہ لفظ کو عموم پر رکھا جائے کہ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ اس صورت میں ان حدیثوں کا جو خاص اعمال پر دلالت کر رہی ہیں۔ مطلب یہ ہو گا کہ ان دنوں میں فرائض کے بعد جن اعمال کا اہتمام کرنا چاہیئے اُن میں سب سے مقدم وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں۔ یعنی قربانی کرنا، ذکر اللہ کرنا، صدقہ کرنا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کے سوا اور اعمال نہ کیے جائیں۔ ہماری اس بات کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے ماعمل آدمی افضل (کسی آدمی نے ان ایام میں کوئی عمل قربانی سے افضل نہیں کیا) تو آپ نے ان مخصوص اعمال کو افضلیت کے

طور پر بیان فرمایا ہے اور جن اعمال کو افضلیت کے طریقہ پر بیان کیا جائے۔ اُن کے ساتھ دُوسرے اعمال بھی جمع ہوسکتے ہیں اور اگر کوئی ان اعمال (مخصوصہ) پر قادر نہ ہو (مثلاً قربانی کی وسعت نہیں یا صدقہ کرسکتا ہے) تو فرائض سے زیادہ کچھ نیک کام کرلینے سے اپنے کو محروم نہ رکھے (مثلاً ذکر اللہ اور تلاوت قرآن اور نوافل ہی کی کثرت کرے۔)

قولہ فی الوجہ الاول وفضلت ایضاً من نوع اٰخراعنی ایام التشریق الی قولہ فذیجلی فضلہ من الخیر المزداد علی الفرائض ۔

(۱۱۸) فضیلت جہاد و مجاہدہ

حدیث میں فضیلت جہاد پر بھی دلالت ہے کیونکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے

(ایام تشریق) کے عمل کی فضیلت سُن کر عرض کیا ولا الجہاد (یارسول اللہ! اور کیا جہاد بھی اس سے افضل نہیں) اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فضیلت جہاد ثابت نہ ہوچکی ہوتی تو صحابہ اس طرح سوال نہ کرتے (معلوم ہوا کہ جہاد کی فضیلت اُن کو پہلے سے معلوم تھی) اور جہاد کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی وارد ہے:

اعمال البر فی الجہاد کبزقۃ فی البحر۔

"نیک اعمال جہاد کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر کے سامنے ایک کلی پانی"۔

یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی بیشتر قسمیں قرار دی ہیں اور جہاد کی اعلیٰ قسم بس اس صورت کو بیان فرمایا جو دوسرے موقعہ میں شہر کا مخصوص ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں (الارجل) خرج یخاطر بنفسہ ومالہ۔ مگر وہ شخص جو جہاد میں نکلا اور اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈال دیا، حالانکہ دُوسرے مواقع میں جان و مال کو خطرے میں ڈالنا ممنوع ہے۔ پھر اس پر بس نہیں بلکہ اس صورت کی افضلیت کو اس پر موقوف کیا گیا کہ جان و مال کو خطرے میں ڈال دینے کے بعد ہلاکت متحقق بھی ہوجائے۔ چنانچہ

ارشاد ہے فلم یرجع بشئی (کہ پھر ان میں سے کچھ لے کر واپس نہ ہُوا) حالانکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں : ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ "اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو (جس سے معلوم ہُوا کہ جان و مال کو قصداً ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے)

مامور بہ میں اُسی کی نوع سے زیادتی کرنا محمود ہے

جواب یہ ہے کہ جو شخص مامور بہ میں اُسی کی نوع سے کچھ زیادتی کرتا ہے وہ زیادہ تعریف و مدح کا مستحق ہوتا ہے جیسا توکل. امور بہ ہے کہ شرط ایمان ہے۔ اس میں جتنی زیادتی ہوگی اتنی ہی مدح ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے :

من توکل علی اللہ حق توکلہ " جو اللہ پر توکل کرے پورا توکل "

(اسی طرح تقوے کے بارے میں ارشاد ہے "اتقوا اللہ حق تقاتہ" (اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے) اسی طرح ایثار خصائل ایمان سے ہے۔ اُس میں بھی اُسی وقت مدح ہوگی جبکہ زیادہ ایثار کیا جائے۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں : ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ " اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھوکے رہیں) اور اس کا تتبع کیا جائے تو بہت نظیریں ملیں گی۔ اب سمجھو کہ جہاد کا مشروع ہوا چونکہ ہلاکتِ نفس کی طرف مفضی ہے۔ تو جو شخص جہاد کے موقعہ پر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالے گا اس کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوگی کیونکہ ذریعہ امور بہ میں اُسی کی نوع سے زیادتی ہے اور (مامور بہ میں زیادتی کرنا اخلاص اور صدق کی دلیل ہے اور اخلاص و صدق تمام اعمال سے بلند تر ہیں۔ نیز رضائے خداوندی مامور بہ کو پوری طرح بجالانے سے حاصل ہوتی ہے تو اُس میں زیادتی کرنا طلب رضا میں ترقی کرنا ہے۔ جیسا موسیٰؑ نے (حق تعالےٰ سے) عرض کیا تھا وعجلت الیک رب لترضیٰ (اے اللہ ! اور میں آپ کے پاس جلدی کرکے آگیا تاکہ آپ راضی ہوں۔ اس سے بھی معلوم ہُوا کہ مامور بہ میں زیادت موجب زیادت رضا ہے اور اسی پر زیادہ مدح ہوتی ہے)

اسی لیے جب شاہ سوار کی تعریف کی جاتی ہے تو کہتے ہیں فارس احمق بڑا احمق سوار ہے اور یہ اُس کی اعلیٰ درجہ کی مدح ہے کیونکہ احمق وہ ہے جو خطرہ میں ڈالتا ہے اور اسی سے اُس کی شہسواری ظاہر ہوتی ہے :

احوال نفیسہ بدوں مجاہدات کے حاصل نہیں ہو سکتے

اس میں سو فیہ کی بھی رعایت ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ تم احوال نفیسہ تک بدون نفس نفیس کے ہلاک کرنے اور مجاہدات سے اُس کو خطرے میں ڈالنے کے نہیں پہنچ سکتے۔ اسی سے تم انتہا کو پہنچ سکتے ہو۔ جب (اس مُردار) کمینہ دُنیا کا طالب یوں کہتا ہے کہ

احاول ملکا او اموت فلعذ را "میں ملک لینے کی کوشش کروں گا یا اُسی کی طلب میں مر جاؤں گا تاکہ معذور شمار کیا جاؤں۔ حالانکہ دُنیا کی سلطنت حاصل بھی ہو جائے تو لامحالہ فنا ہونے والی ہے (اس کو بقاء نہیں) اور آخرت میں (حکومت کا) غالب انجام یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ کی کلفت ہی نصیب ہوگی، تو اب تمہارے نزدیک اُس شخص (کے طلب) کا کیا حال ہونا چاہیے جو دربار قدس میں پہنچ کر مقعد صدق سے عزت والے بادشاہ کے نزدیک سرفراز ہو، سلطنت ابدیہ کا طالب ہو تو یوں کہنا ہے

دعونی یاعذالی فی ھواہ خلعت عذاری — ویذکراہ علونی فتقواء شعاری

وزملوا مطایا اعمال حثیثة للجواد — وبالنفوس جودوا بلا تلعثم منکم ولا انکاد

والقنوا بوصل الحبیب عند نیل الادمع الغزار

(ترجمہ) اے ملامت گرو (ناصحو) مجھے چھوڑ دو۔ میں نے اُس کی محبت میں حیا کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اُسی کے ذکر سے میرا دل بہلاؤ کہ اُس کا تقویٰ ہی میرا شعار ہے اور اعمال کی تیاریاں تیار کر لو جو زیب (حاصل) کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ چلنے والی ہوں، اور اپنی جانوں کو بدون کسی رکاوٹ اور انکار کے

عہ مقعد صدق [illegible]

پیشِ نظر رکھو اور آنسوؤں کے بہنے کے وقت وصالِ محبوب کا یقین رکھو۔ قولہ الوجہ الثانی وفیہ دلیل علی فضیلۃ الجہاد الی قولہ عند فیض الادمع الغزار۔

ف جان کو خطرہ میں ڈالنا جہاد کے سوا دوسرے مواقع میں جائز نہیں۔ جہاد کے موقعہ پر جائز ہے کیونکہ جہاد کا موضوع ہی یہ ہے کہ قتال کے ذریعے اللہ کا بول بالا کیا جائے اور ظاہر بدون جان کی بازی کے نہیں ہوسکتا تو وہاں خطرے میں اپنے کو ڈال دینا جائز بلکہ محمود ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے جہاد کے موقعہ پر تنہا ہزاروں پر حملہ کیا۔ دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور بہتوں کو مار کر نکل آئے۔ یہ قاعدہ بہت ہی نفیس ہے کہ مامور بہ میں اسی کی نوع سے زیادتی کرنا محمود ہے۔ دوسری نوع سے زیادتی کرنا محمود نہیں۔ مثلاً نماز میں جتنا بھی خشوع و خضوع ہوگا محمود ہوگا۔ مگر اوقات میں زیادتی کرنا کہ جن اوقات میں شریعت نے نماز سے منع کیا ہے ان میں بھی نماز پڑھنے لگے مذموم ہے کہ یہ دوسری نوع کی زیادت ہے۔ اسی طرح فرائض کی رکعات معینہ میں زیادتی کرنا مذموم ہے کہ حدود سے تجاوز ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔



۵۱
باب پنجاہ و نہم

حدیث

جواز التنفل علی الدابۃ فی السفر

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں اپنی سواری پر رات کی نماز (یعنی تہجد) پڑھا کرتے تھے۔ جدھر بھی اُس کا رُخ ہوتا اور سر سے اشارہ کرتے تھے۔ مگر فرائض (سواری پر) نہیں پڑھتے۔ وتر اُسی پر پڑھ لیا کرتے تھے۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہوا کہ سواری پر نفلیں پڑھنا سفر میں جائز ہے خواہ سوار کا منہ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۹۱) نمازِ نفل کی فضیلت حدیث سے نفل نماز پڑھنے کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں بھی نماز نفل کو ترک نہیں کیا۔ حالانکہ سفر میں بوجہ مشقت کے فرائض کے اندر تخفیف ہو جاتی اور اُن کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نفل کو بدستورِ سابق مستحب قرار دیا اور اُس کے لیے نماز کا نام باقی رکھا جس کا بجالانا مطلوب ہے۔

نماز کو کسی وقت کیوں ساقط نہیں کیا گیا یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ نماز کو مرض اور خوف اور سفر

میں کیوں باقی رکھا گیا۔ حالانکہ اُس کی صورت (ان عذروں کی وجہ سے) بدل جاتی ہے
جیسا کہ معلوم ہے مگر کسی حالت میں بھی جب تک عقل باقی رہے نماز چھوڑنے کی اجازت
نہیں دی گئی تو (جواب میں) ہم کہتے ہیں واللہ اعلم اس میں دو حکمتیں ہیں ایک یہ کہ
نماز کفر و ایمان میں فارق (اور ممیز) ہے اور ایمان کی علامت ہر حال میں مطلوب ہونا
چاہیئے جیسا ایمان ہر حال میں مطلوب ہے مگر یہ کہ عقل ہی زائل ہو جائے تو اُس
وقت انسان مکلف نہیں رہتا (اسی طرح نماز بھی بجز زوال عقل کے کسی حال میں
ساقط نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نماز بندہ اور حق تعالٰے کے درمیان وُصلہ ہے (یعنی
اللہ تعالٰے سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے) اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے بندہ اور
درمیان وصلہ ہو اُس کا (ہر حال میں) بندہ محتاج ہے اسی لیے نماز ہر حالت میں
باقی رکھی گئی اور عذر کے موافق طرح طرح سے اُس میں تخفیف کر دی گئی۔ جیسا
سب کو معلوم ہے (کہ سفر میں چار فرض کے دو رہ جاتے ہیں۔ جماعت اور سُنن
مؤکدہ کا تاکد ساقط ہو جاتا ہے۔ بیماری میں قیام کی قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر بیٹھنے کی
طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔)

اسی حقیقت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں واستعینوا
بالغدوۃ والروحۃ وشیٔ من الدلجۃ ۔ مدد حاصل کرو صبح کے وقت اور
شام کے وقت اور رات کی تاریکی میں کچھ عبادت کر کے (اس سے بھی یہی مُراد
ہے کہ ان اوقات میں نماز کا کچھ معمول ہونا چاہیئے۔) کیونکہ بندۂ ضعیف کے
لیے بڑی استعانت اُسی چیز سے ہو سکتی ہے جو اللہ تعالٰے کے ساتھ اُس کے
تعلق کو بڑھانے والی ہو۔ اسی سے اُس کو اپنی اُمید کے موافق بہترین فائدہ
حاصل ہوگا۔

عبادت کسی بھی وقت ساقط نہیں

اور جو کچھ ہم نے نماز کے بارے
میں کہا ہے اُسی کے مشابہ عبادت

کی شان بھی ہے (کہ وہ بھی کسی وقت ساقط نہیں بلکہ بندہ کو ہر وقت عبادت میں رہنا چاہیئے) کیونکہ حکمت ، بانیہ اس کو مقتضی ہے کہ ہم سے عبادت اور اُس کا دوام مطلوب ہو۔ اسی کے واسطے ہم پیدا کئے گئے ہیں۔ چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون - میں نے جن وانسان کو بس اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں ، حالانکہ حق تعالیٰ ہم سے بھی مستغنی ہیں اور ہماری عبادت سے بھی۔ لیکن کسی وجہ سے جس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں حکمت اس کو مقتضی ہوئی ہے - اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :

الذی یعلم السر فی السموات والارض

" یعنی وہی جانتا ہے آسمان و زمین کے پیدا کرنے کی حکمت کو "

اسی طرح ہمارے پیدا کرنے اور تمام مخلوقات کے پیدا کرنے کی حکمت کو بھی وہی جانتے ہیں رہا یہ کہ حکمت اس کو مقتضی کیوں ہوئی - اس کے متعلق لوگوں نے جو مختلف باتیں بیان کی ہیں اُن میں ہر ایک کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے اور دلیل قطعی نبوت ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے اور نبوت کے ذریعے اس باب میں کچھ وارد نہیں ہوا - بس ہمارے ذمہ اس بات پر ایمان لانا واجب ہے کہ اللہ تعالےٰ تمام مخلوقات سے مستغنی ہیں اور یہ کہ اللہ تعالےٰ نے مخلوقات میں سے ایک ذرہ کو بھی بدون کسی حکمت کے نہیں پیدا کیا - اب اگر کسی نے طریق سے یا احتمال کے طور پر کوئی حکمت (کسی کی) عقل میں آجائے اور اصول شریعت کے منافی بھی نہ ہو تو اُس سے ایمان میں قوت ہوگی - چنانچہ اگر اُس قاعدہ کے موافق ایمان لایا جائے جو ہم نے ابھی بیان کیا کہ اللہ تعالےٰ ہر چیز سے مستغنی ہیں اور تمام چیزیں کسی حکمت کی وجہ سے پیدا کی گئی ہیں جس کو اللہ تعالےٰ ہی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ اللہ تعالےٰ کو (ضرورت و حاجت اور غرض سے) منزہ اور

عہ اور جو وارد ہے وہ محدثین کے نزدیک بے اصل ہے یعنی کنت کنزاً مخفیاً فخلقت الخلق لکی اعرف اگرچہ محققین کے نزدیک اس کا مضمون صحیح ہے - واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ

پاک ہی سمجھا جائے جیسا اُن کی شان کے مناسب ہے تو یقیناً اس سے ایمان میں ترقی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم کو بھی یہ دولت عطا فرمائیں۔

(۲) تمہید کے بعد پھر اُسی مضمون کی طرف عود کرتے ہیں جس پر ہم نے اشارہ کیا تھا کہ ہم کو جس کام کے لیے پیدا کیا گیا اور جو ہم سے مطلوب ہے وہ دوام عبادت ہے۔ مگر ایک تو فطرۃً انسان ضعیف البنیان ہے پھر اُس کو بشری ضرورتوں کی بھی احتیاج ہے۔ جیسے کھانا، پینا (سونا) وغیرہ جن کو ہم اپنے اندر بداہتہً محسوس کرتے ہیں تو (اب دیکھو) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کو کیسی لطیف حکمت کے ساتھ جمع فرمادیا ہے جس پر بدون فیض ربانی اور الہام رحمانی کے کسی کو اطلاع نہیں ہوسکتی تھی۔

ذکر اللہ تمام عبادات میں اعلیٰ ہے وہ یہ کہ قواعد شریعت سے معلوم ہوچکا ہے کہ تمام عبادات میں اعلیٰ اور عذاب الٰہی سے زیادہ نجات دینے والی چیز ذکر اللہ ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعلیٰ عبادت یعنی ذکر اللہ کو ہماری تمام حرکات و سکنات میں مقرر فرمادیا جن میں سے بعض (مقامات) میں تو ذکر اللہ واجب ہے۔ بعض میں مستحب ہے اور مستحب میں بھی بعض کا استحباب مؤکد ہے بعض کا غیر مؤکد۔ چنانچہ آپ نے ہمارے لیے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ کھانے پینے، جماع کرنے، کپڑا پہننے، کپڑا اُتارنے، بستر پر لیٹنے، گھر میں داخل ہونے، قضاء حاجت کو جانے، وہاں سے نکلنے اور شکار کرنے اور حلال جانور کو ذبح کرنے اور کسی جگہ سفر کر کے جانے اور مہتم بالشان معاملے میں گفتگو کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیا کریں اور ہر موقعہ کے مناسب ذکر کرنے کا طریقہ بھی آپ نے بتلادیا۔ ان میں سے بعض مقامات ایسے ہیں کہ اگر وہاں اللہ کا نام نہ لیا جائے تو وہ شے ہم پر حرام ہوجاتی ہے۔ اُس کا کھانا جائز نہیں ہوتا۔ جیسے حیوان کو ذبح کرتے ہوئے یا شکار پر کتا یا تیر چھوڑتے ہوئے بسم اللہ کہنا ضروری ہے،

کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :

ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ

" اور جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُسے مت کھاؤ "

اسی لیے اہل کتاب کا ذبیحہ ہمارے واسطے حلال کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ سیّدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے مگر اللہ تعالےٰ کو مانتے اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں اُن کو بھی ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کا حکم ویسا ہی ہے جیسا ہم کو ہے اور مجوس اللہ کو نہیں مانتے (کیونکہ وہ مشرک ہیں اور مشرک کے ساتھ خدا کا ماننا نہ ماننے کے حکم میں ہے) تو اُن کا ذبیحہ ہمارے واسطے ہرگز حلال نہیں کیونکہ نسبت ہیں بُعد ہو گیا ہے۔ اور بعض احوال میں اللہ تعالےٰ کا نام لینا سُنّت ہے جیسے بیت الخلاء میں جاتے ہوئے، گھر میں داخل ہونے کے وقت، بستر پر لیٹتے ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

بعض احوال میں اللہ کا نام لینا مستحب ہے جیسے کسی کا کام بناتے ہُوئے خواہ دُنیا کا کام ہو یا دین کا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی کام کرنے والا آتا جیسے کپڑا سینے والا یا رنگریز پیش کرنے والا اور آپ اُس کے حوالہ کوئی کام کر دیتیں تو درمیان میں دریافت کرتیں کہ تُو نے کام کرتے ہوئے اللہ کا نام بھی لیا ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں بسم اللہ کر کے مَیں نے کام شروع کیا ہے تو اُس کو کام پُورا کرنے دیتیں اور اگر یہ کہتا کہ میں نے بسم اللہ کر کے کام شروع نہیں کیا تو کام پُورا کرنے سے پہلے ہی اُس کو اُٹھا دیتیں کہ اللہ کا نام پہلے کیوں نہیں لیا تو ان مواقع میں اور جو اُن کے مشابہ ہوں اللہ تعالےٰ کا نام لینا مستحب ہے اسی طرح نیند سے بیدار ہونے کے وقت وغیرہ وغیرہ۔

تم اس عجیب حقیقت اور سہل و لطیف طریقہ میں غور کرو کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کے ضعف کی رعایت کر کے کتنا آسان راستہ عبادت کا مقرر کر دیا کہ

بندہ ہر وقت عبادت میں بھی مشغول ہو سکتا ہے اور اپنی ضروریات زندگی کو بھی پورا کر سکتا ہے) الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر ۔ کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی (تمہاری حالت کو) نہ جانے گا حالانکہ وہ تو بڑا باریک بیں اور خبردار ہے۔ مگر یہ مقام اُسی کو حاصل ہوتا، بلکہ اُس کی بُو بھی وہی پاتا ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے اتباع سنت نبویہ کی توفیق عطا فرمائی ہو۔ پھر جس حقیقت کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کی تاکید کو اپنے اس ارشاد سے اور بڑھا دیا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا ہے۔

من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی ومن ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملاخیر منھم ومن تقرب الی بشبر تقربت منہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن اتانی یمشی اتیتہ ھر ولۃ۔" جو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے میں اُس سے بہتر جماعت میں اُس کا ذکر کرتا ہوں اور جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں اُس کی طرف دو ہاتھ سے زیادہ بڑھتا ہوں جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں "

(مطلب یہ ہے کہ بندہ جب میری طرف متوجہ ہوتا ہے میں اُس سے زیادہ اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اس مقصود کو سمجھانے کے لیے اس عنوان خاص سے بیان کر دیا گیا جس کا ظاہر مراد نہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ دل سے مسافت سے اور حرکت و سرعت سے منزہ ہیں) نیز قرآن میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :-

الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم " (وہ اہلِ عقل کون ہیں ؟ وہ ہیں) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوتے ہوئے بھی، بیٹھے ہوئے بھی، لیٹتے ہوئے بھی، اس اشارہ میں غور کرو کہ ذکر پر ایسا دوام ہونا

چاہیئے) کہ بندہ کی کوئی حالت بھی ایسی نہ ہو جس میں وہ مستقل عبادت میں مشغول نہ ہو۔ اگر عبادت کا یہ طریقہ (یعنی ذکر) مشروع نہ ہوتا تو دُنیا سے بالکلیہ علیحدگی کے بغیر دوام عبادت کا تصور بھی نہ ہو سکتا اور یہ صورت ہماری فطری احتیاج کے منافی تھی تو اللہ تعالےٰ نے اس عجیب طریقے سے ہماری احتیاج کے ساتھ عبادت کو جمع فرما دیا (کہ ذکر کو بھی عبادت کی اعلےٰ قسم بنا دیا) اور اس طرح ہم کو تمام بھلائیوں کی طرف اپنے فضل و رحمت سے آسان اور نزدیک راستہ سے پہنچا دیا اور یہ جو ہم نے بیان کیا ہے کہ کھانے کے وقت اللہ کا نام لینا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔

اس باب کی حدیثیں ہم نے یہاں بیان نہیں کیں۔ کیونکہ یہاں ہمارا مقصود اس خیر کی طرف راہنمائی کرنا اور (مخاطب کے) دل میں اس (اہم مضمون) کو ڈالنا تھا تاکہ اس کی قدر کی جائے ورنہ جتنی حالتوں کے متعلق ہم نے ذکر کی تاکید کی ہے ان سب کے بارے میں متعدد حدیثیں وارد ہیں۔ ایک (دو) نہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ نے (ہماری) عمر درازی کی اور توفیق الٰہی نے مدد کی تو انشاء اللہ ان سب احادیث کو مستقل کتاب[ع] میں لکھیں گے تاکہ واقفیت حاصل کرنے والوں کو آسانی ہو۔ بعونہ وفضلہ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اسی حقیقت کی وجہ سے صوفیہ کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوئی کیونکہ وہ ہمیشہ ذکر میں مشغول اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اس خاص حالت ہی کی وجہ سے اُن کو خواص کہا جاتا ہے۔ اس لیے صوفیہ نے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کہا ہے کہ اگر تم ہماری محبت میں سچے ہو تو عاشق تو جہاں بھی جاتا ہے محبوب کے ذکر کے ساتھ جاتا ہے (پس تم کو بھی ہر حال میں ہمارا ذکر کرنا چاہیئے) کیونکہ دوام ذکر سے اللہ تعالےٰ کی ہم نشینی اور

ع۔ معلوم نہیں وہ کتاب حضرت شارح نے لکھی ہے یا نہیں؟ اور لکھی ہے تو طبع ہوئی ہے یا نہیں؟ لیکن اس باب میں حصن حصین بہت مکمل کتاب ہے۔ حضرت حکیم الامت نے تمتہ قربات عند اللہ وصلوات الرسول میں اُس کا بہت اچھا خلاصہ جمع فرما دیا ہے۔ (یعنی "مناجات مقبول" میں ناشر)

حضور (د قرب) حاصل ہوتا ہے جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا ہے انا جلیس من ذکرنی میں اس کا ہمنشین ہوتا ہوں جو مجھے یاد کرتا ہے۔ پس اگر تجھ کو کچھ عقل ہے تو سمجھ لے کہ تجھ سے کیا قصہ کیا گیا ہے اور اے مسکین تو کیا ہے اور کون ہے (تو اللہ کا محب ہے یا نہیں) اور محب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی دلیل بھی تیرے پاس ہے یا نہیں؟)

قولہ الوجہ السادس۔ فیہ دلیل علی افضلیۃ المتنفل الی قولہ ومن انت یا مسکین۔

ف سہولت ذکر اور دوام ذکر کا طریقہ شارح نے اس مقام پر جس علم عظیم اور حکمت باہرہ کی طرف اشارہ کیا ہے اُس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے اس لیے اس کو کھول کر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ تم ذرا اپنے ذہن کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات تصورات خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے۔ ایک لامتناہی مبداء سے نکل رہا ہے۔ اس کی حقیقت میں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یا تو اچھے خیالات ذہن میں آتے ہیں یا بُرے؟ اس کی آمد کسی طریقہ سے روکی نہیں جا سکتی۔ کون سی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

خیالات ایک نامعلوم سرچشمہ سے ظہور کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے، نہ اُن کے فنا کرنے پر۔ لیکن انسان کو اتنی طاقت ضرور دی گئی ہے کہ اپنی توجہ بُرے خیالات کی طرف سے ہٹا کر اچھے خیالات کی طرف مبذول کر دے یا علم نفسیات کی اصطلاح میں یوں کہو سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ ذہن میں سلبی خیالات اضطراری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اب یہ آپ

کے اختیار میں ہے کہ ان خیالات کو گھلے لگا لیں اور معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے دل میں جگہ دے دیں یا یہ کہ اُن کے ذہن میں آتے ہی ایجابی خیال کو اُن کی سرکوبی کے لیے لے آئیں اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت کے مقابل کر دیں

ان الذین اتقوا اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون۔

ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلے میں نور ہی کامیاب ہوگا۔ کیونکہ ظلمت نور ہی کی غیبت کا نام ہے۔ نور کے نہ ہونے ہی سے ظلمت پیدا ہوتی ہے جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے آسکتی ہے؟

شارع علیہ السلام نے یہی طریقہ ہم کو بتلایا ہے کہ تم اس پر تو قادر نہیں ہو کہ سلبی خیالات کو ذہن میں نہ آنے دو مگر اس پر قادر ہو کہ ایجابی خیال کو اُن کے مقابل کر دو۔ ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالے کا خیال ہے جو تمام محامد و محاسن کے جامع اور تمام خوبیوں اور کمالات کا سرچشمہ اور طمانینت و سرور اور علو و قوت و عزت و سطوت کے مبداء ہیں۔ اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالے کے خیال کو اُس میں جمانے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں حق تعالے کی صفات کا اپنے اندر ظہور دیکھو گے۔ فطرت انسان کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جس کے خیال اور ذہن میں رہتا ہے رفتہ رفتہ اُسی کی خوبو اس میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس قانون کو ماننے کے بعد تم ہرگز سلبی خیالات پر توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے بلکہ ایجابی خیالات ہی کو دل میں جمانے کی کوشش کرو گے۔ اب تم ہی بتلاؤ کہ حق تعالے سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے جس سے تم ایک لحظہ کے لیے بھی حقیقی معنے میں خوش رہ سکتے ہو ؎

کیست زو بہتر بجوائے ہیچکس
تا بدان دل شاد باشی یک نفس

اگر چشم بصیرت کھلی ہوئی ہے تو پھر کیا حق تعالے کی ذہن سے بہتر اور کسی کی ذہن ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! حق تعالے کو چھوڑ کر خلق میں محویت گو وہ بظاہر

کیسی ہی دلفریب اور دل کش کیوں نہ ہوں نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے۔ اور ظلمت سے ضیق۔ غم و حزن اور خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے۔ ظلمت میں کوئی چیز بھی اپنے صحیح خد و خال میں نظر نہیں آسکتی۔ پس ظاہر نظر میں اشیاء کی یہ دلفریبی نفس کا دھوکہ ہے۔ التباس ہے قوتِ واہمہ کی اختراع ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ قلب پر چھا جاتا ہے۔ ابھی اعتماد تھا ذرا دیر بعد خوف طاری ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں استقلال و استحکام نہیں ہوتا۔ کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آتی۔ اگر چشمِ بصیرت کھل جائے اور ظلمت کی جگہ نور دل میں جلوہ گر ہو جائے تو تمام اشیاء اپنی اصلی حالت پر نظر آنے لگیں گی۔ حیاتِ طیبہ نصیب ہو گی۔ طمانینت و بردِ قلب حاصل ہو گی خوف و حزن زائل ہو جائے گا۔ استقلال و استحکام عطا ہو گا۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب من عمل صالحا من ذکر او انثی و

ھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ط

پس ہم کو نورِ قلب حاصل کرنا چاہیئے جس کا ذریعہ ذکر اللہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ پھر حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے فاذکروا اللہ ذکرا کثیرا۔ ولا یزال لسانک رطبا من ذکر اللہ ط پر پورا عمل ہو۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو اور مقصود اس سے رضا و قربِ الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو۔ جب دل کی توجہ ذکرِ الٰہی کی وجہ سے خرافاتِ دنیا سے ہٹ کر ایک مرکز پر مرکوز ہو گی تو خود بخود فاسد اور پریشان کن خیالات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ خیالات کی پراگندگی موقوف ہوتے ہی ایک روحانی کیفیت اور طمانینت سے قلب معمور ہو جائے گا۔

اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد تمام چیزوں سے استغنا ہو جائے گا نہ کسی چیز کے حصول سے لذت ہو گی نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج۔ ہاں کسی چیز سے لذت ہو گی تو اللہ کی نعمت سمجھ کر ہو گی۔ اگر رنج ہو گا تو اللہ کی ناراضی کے خیال سے ہو گا۔

مگر اللہ تعالیٰ کی رضا و عدم رضا کا طریقہ قرآن و حدیث میں تمہارے سامنے ہے اپنے اعمال کو اُن سے جانچ لینے کے بعد پھر دُنیا کی کسی چیز کے فوت ہونے سے رنج نہ ہو گا ؎

اذا رضیت منی کرام عشیرتی فلا زال غضبانا علی لئامہا

ایک طریقہ کا ذکر یہ ہے کہ مختلف حالات مختلف اوقات کے متعلق جو دعائیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہیں اُن کی پابندی کی جائے اس طرح کسی وقت بھی اللہ تعالےٰ سے غفلت دل میں راہ نہ پائے گی۔ کیونکہ اُن کی پابندی اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ہر وقت اللہ تعالےٰ کی یاد دل میں جمی رہے۔ پہلے پہل اس پابندی میں کسی قدر دُشواری اس لیے ہوتی ہے کہ قلب میں اللہ تعالےٰ کی یاد پوری طرح نہیں جمی۔ پھر ہر موقعہ پر دل میں خود بخود اس دُعاء کا تقاضا پیدا ہونے لگتا ہے جو حضورؐ نے اس موقعہ کے لیے ارشاد فرمائی ہے۔ ان دُعاؤں کا خاص فائدہ یہ ہے کہ اپنی ہر حالت ہر کیفیت اور دُنیا کی ہر شئے کے متعلق یہ عقیدہ دل میں راسخ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اور ہو رہا ہے اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ دُنیا میں جو چیز بھی ہے اللہ تعالےٰ کی مخلوق اور محکوم ہے۔ وہی رب اور حاکم ہیں۔ اُن کے سوا نہ کوئی رب ہے نہ مؤثر نہ نفع دینے والا ہے نہ ضرر دینے والا۔ چونکہ ہمارا سابقہ رات دن ان ہی اشیاء سے رہتا ہے۔ یہی ہمارے سامنے ہیں۔ یہی ہمارے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہیں۔ ان ہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں۔ مگر سب فانی اور زوال پذیر ہیں ان کا زوال وفنا ہمارے تحزن و غم کا باعث ہوتا ہے تو ہم کو چاہیئے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن کو منتقل کریں تاکہ ہر طرف حق تعالےٰ ہی کا جلوہ نظر آئے۔ ہر شئی کی سفلی جہت سے توجہ کو ہٹا کر ایجابی جہت یعنی جہت حق کی طرف انتقال کریں۔ اس طرح یادِ حق دل میں قائم ہونے لگے گی۔ اب ہمارے ذہن میں شئے نہ ہو گی حق ہو گا۔ در اُن تمام انوار سے قلب معمور ہونے لگے گا

جو اللہ تعالےٰ کی طرف رُخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں اور بہت جلد معلوم ہو جانے گا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا دل ہے۔ حق تعالیٰ کا جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے۔ کسی اہلِ دل نے کہا ہے ؎

شوخیٔ جناں بھی آنکھ اٹھاتا ہے بارِ دل
گردن جھکائے دیکھ رہا ہوں بہارِ دل

دوسرا کہتا ہے ؎

بیا بیا و تماشائے خوش نظارہ کُن !
چہ گل شگفتہ بدل از نسیم کوئے حبیب

عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجتست
چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجتست

آفاق میں حق تعالےٰ ظاہر ہیں ہر شئے کے ساتھ جہت حق موجود ہے مگر علم صحیح کے استعمال سے وہم والتباس کو دور کرنے اور نظر کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات و اوقات کے لیے جو خاص خاص اذکار وادعیہ تعلیم فرمائی ہیں اُن کا مقصد یہی ہے کہ اُن کی پابندی سے نظر کی اصلاح ہوئی نقطہ نظر بدلا تو معلوم ہوا کہ نفس و آفاق میں حق تعالےٰ نماں وعیاں ہیں۔ اُن سے ہی تعلق قائم کرنا اُن ہی کی یاد کا دل میں جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے۔ اللہ سے غفلت و ذہول اور خلق میں استغراق وانہماک تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے ؎

عشق بامردہ نباشد پائدار عشق را باحی و باقیوم دار
گر گریزی بر امید راحتے ہم ازانجا پیش آید آفتے
ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

گھر سے باہر قدم نکالو تو اللہ کو یاد کرو۔ بازار میں جاؤ تو اُس کو یاد کرو۔

دکان کھولو تو اللہ کو یاد کرو۔ مسجد میں قدم رکھو تو اللہ سے دُعا کرو۔ باہر آؤ تو اُسی سے فضل کی درخواست کرو۔ بیوی بچّوں کو دیکھو تو اُس کی نعمت کا شکر کرو۔ کھانا کھاؤ تو اللہ کے نام سے شروع کرو۔ کھانا کھا چکو تو اُس کی نعمت کا شکریہ ادا کرو۔ سونے کا ارادہ کرو تو موت کو یاد کرکے اللہ کی حفاظت کا دامن پکڑو۔ جاگو تو نئی زندگی عطاء ہونے پر اللہ کی حمد کرو۔ اسی طرح ہر حالت ہر وقت اور ہر کیفیت میں اللہ تعالیٰ کی حکمت وقدرت اور حکومت وسطوت کا مشاہدہ کرو خود اپنی ذات کو اپنی ہستی کو بھی اللہ کی مخلوق ومحکوم سمجھ کر دیکھو۔ اللہ سے غافل ہوکر اپنی ہستی پر نظر نہ کرو۔ یہ مراقبہ راسخ اور کامل ہونے کے ساتھ ہی فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید کے معنی کی ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گی اور زبانِ حال سے یوں کہنے لگو گے ؎

حُسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردہٗ
پس بچشمِ عاشقاں خود را تماشا کردہٗ

جعلنا اللّٰہ وایاکم ممن راقب اللّٰہ فوجدہ تجاھہ آمین !



باب شصت

حدیث

اشراط الساعة

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تقوم الساعۃ حتی یقبض العلم وتکثر الزلازل ویتقارب الزمان وتظھر الفتن ویکثر الھرج وھو القتل حتی یکثر فیکم المال فیفیض۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ علم (دُنیا سے) اُٹھالیا جائے اور زلزلے کثرت سے آئیں اور زمانہ قریب قریب ہو جائے (یعنی گھٹنے لگے) اور فتنے ظاہر ہوں اور کشت و خون زیادہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ تمہارے اندر مال کی اتنی کثرت ہو جائے کہ بہنے لگے۔"

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ یہ پانچ چیزیں جو یہاں مذکور ہیں قرب قیامت کی علامات میں سے ہیں۔ اس کے متعلق چند باتیں بیان کرنی ہیں۔

(۱۲۰) یہ علم جو دُنیا سے اُٹھایا جائے گا علم منقول ہے یا غیر منقول؟ تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم کہتے ہیں کہ اس سے اُس نور کی طرف اشارہ ہے

علم حقیقی وہ نور ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضانِ فہم ہوتا ہے

جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے

(فیضان) فہم ہوتا ہے۔ کیونکہ کتابیں تو ہمیشہ رہیں گی بلکہ زیادہ ہوتی رہیں گی۔ لیکن فہم و عمل میں نقص ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ (کسی وقت) بالکل ہی اُٹھ جائے گا۔" اس پر پہلے بھی ہم ایک حدیث کی شرح میں گفتگو کر چکے ہیں۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہ اُٹھائیں گے کہ لوگوں کے دلوں سے اُس کو نکال دیں (بلکہ اس طرح اُٹھائیں گے کہ علماء کو دُنیا سے اُٹھا لیا جائے گا) قولہ منھا ھذا العلم الذی یقبض ما المراد بہ الی قولہ ینتزعہ من العباد۔

ف معلوم ہُوا کہ علم حقیقت میں نور ہے جو دل میں عمل اور تقویٰ کی برکت سے پیدا ہوتا ہے۔

(۱۲۱) آیاتِ الٰہیہ سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد کہ زلزلے کثرت سے آئیں گے۔ اس پر سوال یہ ہے کہ اس میں (یعنی قیامت کے قریب بکثرت زلزلے آنے میں) کوئی ایسی حکمت ہے جس کو ہم سمجھ سکیں یا ہم کو وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ جواب یہ ہے کہ حکمت تو یقیناً ہے اور (اللہ تعالیٰ کی) عادت جاریہ کے مقتضی پر نظر کر کے وہ حکمت ظاہر بھی ہے مگر یقین کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں یہی حکمت ہے (اس کے سوا کچھ نہیں۔ ممکن ہے کہ جو ہم نے سمجھا ہے وہ نہ ہو کچھ اور حکمت ہو) بہر حال شریعت کے تتبع (اور اُس میں غور و تدبر) کرنے سے ہمیں زلزلہ کی دو حکمتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ عادۃ اللہ یُوں جاری ہے کہ زلزلہ دو وجہ سے آتا ہے ایک انتقام کے لیے جب وہ کسی سے انتقام لینا چاہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ زلزلہ سے بہت لوگ ہلاک اور برباد ہُوئے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانے تک بھی ایسا ہو رہا ہے۔ چنانچہ جس وقت میں افریقہ میں تھا تو تواتر کے ساتھ یہ خبر پہنچی کہ افریقہ کی ایک بستی میں زلزلہ آیا جس سے وہاں کی پُوری آبادی زمین میں دھنس گئی اور وہ لوگ

اسی قابل تھے کیونکہ اُن میں فساد بہت بڑھ گیا تھا۔ دُوسرے اُن لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کے لیے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ کیونکہ زلزلہ بھی اللہ قدرت کی نشانیوں میں سے ہے اور اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں وما نرسل بالآیات الا تخویفا (اور ہم ان نشانیوں کو ڈرانے ہی کے واسطے بھیجتے ہیں) اور یقیناً قرب قیامت میں فساد بڑھ جائے گا تو اُس وقت زلزلے بطور عذاب کے بھی آئیں گے اور اس لیے بھی کہ جن کی تقدیر میں سعادت ہے وہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ قیامت سے بڑے زلزلے کے سامنے آئے گی۔ جیسا حق تعالیٰ نے فرمایا ہے فدکتا دکۃ واحدۃ نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

ولقد اخذناھم بالعذاب فما استکانوا لربھم وما یتضرعون حتی اذا فتحنا علیھم باباً ذا عذاب شدید اذا ھم فیہ مبلسون۔

وہ اور ہم نے اُن کو عذاب میں پکڑا سو وہ اپنے رب کے سامنے نہ جھکے نہ عاجزی زاری کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جب ہم نے سخت عذاب کا دروازہ اُن پر کھولدیا تو اب وہ سٹ پٹائے رہ گئے۔"

مطلب یہ ہے کہ اول اُن کو معمولی عذاب میں پکڑا گیا تاکہ حجت تمام ہو جائے اور (اپنی حرکتوں سے) باز آجائیں۔ جب اس پر بھی باز نہ آئے تو عذاب مہلک نے اُن کو آلیا۔ پس (صانع) حکیم کی سُنت یہی ہے کہ پہلے تھوڑا سا عذاب بھیجتے ہیں تاکہ جس میں خیر کی اہلیت ہو وہ اللہ کی طرف مرجوع کرے۔ اور جو عذاب ہی کے لائق ہیں اُن پر پُورا عذاب نازل ہو۔

اسی قاعدہ کے موافق قیامت سے پہلے بہت زلزلے آئیں گے۔ کیونکہ حکمت کا تقاضہ یہی ہے کہ بندوں کو اول ڈرا دیا جائے۔ اگرچہ اس سے اُن لوگوں کو نفع نہ ہوگا جن کے لیے عذاب ناگزیر ہے وہ برابر اپنی بدی میں ترقی کرتے رہیں گے تو اُن کو سخت بلا کا سامنا ہوگا حکمۃ بالغۃ فما تغنی النذر۔ غرض قیامت

کا زلزلہ بہت سخت ہوگا جس سے تمام زمین ایک دم شکستہ ہوکر ریزہ ریزہ ہو جائے گی تو اس سے پہلے بہت سے زلزلے آئیں گے تاکہ اُن کی کثرت سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اسی قسم کا ایک بڑا زلزلہ بھی آنے والا ہے۔ قولہ ویکثر الزلازل فہل ھنا فیہ معنی من الحکمۃ الی قولہ بوجود الزلزلۃ العظمیٰ من جنسھا۔

ف آیاتِ الٰہیہ سے عبرت حاصل کرنا صوفیہ کا خاص مذاق ہے وہ ادنیٰ ادنیٰ عذاب سے بھی گھبرا کر اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۱۲۲) ایمان و عمل صالح سے وقت میں بھی برکت ہوتی ہے اور عمر و مال میں بھی

زمانہ کے قریب قریب ہونے (اور گھٹنے) کا کیا مطلب ہے آیا نقصان حسی مراد ہے یا نقصان باطنی؟ دونوں احتمال ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ دونوں ہی مراد ہیں کیونکہ آثار میں دونوں پر الگ الگ اشارہ وارد ہے۔ نقصان باطنی تو واقع ہو چکا ہے اب ہم کو نقصان حسی اور نقصان باطنی (کی حقیقت) کے بیان کرنے کی ضرورت ہے اور آثار میں جو اشارہ دونوں کے متعلق وارد ہے اُس کو بھی بتلانا ہے تو (سمجھو کہ) نقصان باطنی کا مطلب یہ ہے کہ عمل میں نقصان واقع ہوگا۔ کیونکہ انسان کی عمر ہی اُس کا راس المال (اور قیمتی سرمایہ) ہے اور اس کا نفع یہ ہے کہ عمل اچھا ہو اگر بابرکت کاموں میں کمی ہونے لگے تو زمانہ ناقص ہوگا کیونکہ اُس سے فائدہ کم ہوگا۔ جیسے درخت اور پھل کی حالت ہے کہ اگر پھل میں کمی ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ درخت ناقص ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات۔

"ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے۔"

(معلوم ہوا کہ ان[عہ] چیزوں کا نقصان بڑی مصیبت ہے جو بطور ابتلاء کے اللہ تعالےٰ

عہ اس آیت کا ربط مقصود شارح سے ظاہر نہیں ہوا۔ ۱۲ ظ

کی طرف سے وارد ہوتی ہے بطور نعمت کے نہیں آتی) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں جس دن میرے علم کے اندر کچھ ترقی نہ ہو اور نہ میں کسی پر کوئی احسان کروں تو اُس دن آفتاب کا طلوع ہونا میرے واسطے نامبارک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کی بقیہ عمر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی (کیونکہ) وہ اُس میں اپنی بگڑی کو بنالیتا ہے اور بگڑی کو بنانے کا طریقہ بجز توبہ اور عمل صالح کے کیا ہے کہ اس کے ذریعے وہ اپنے نقصان کی تلافی کر سکتا ہے اور تعجب عالم کا منشاء اس کے سوا کچھ نہیں کہ قلوب پر دُنیا کی محبت غالب ہو اور اسی میں دل مشغول ہو۔ دُنیا کو آخرت کے کاموں پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (ایک حدیث میں) اس حقیقت پر متنبہ فرمایا ہے:

بقوله انتم فی زمان وذکر من صفات اهله انهم یبدؤن اعمالهم قبل اهوائهم وسیأتی زمان وذکر من صفات اهله انهم یبدؤن فیه اهوائهم قبل اعمالهم۔

"تم ایسے زمانے میں ہو جس میں خواہش (نفس) پر عمل (صالح) کو مقدم کیا جاتا ہے پھر ایک زمانہ آنے گا جس میں خواہش (نفس) کو عمل (صالح) سے مقدم کیا جائے گا۔"

وقال علیه السلام من ابتداء بحظه من دنیاه فاته حظه من اٰخرته ولم ینل من دنیاه الا ما کتب له ومن ابتداء بحظه من اٰخرته نال من اٰخرته ما احب ولم یفته من دنیاه ما کتب له۔

"نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص دنیا کے حصہ کو مقدم کرے گا اُس سے آخرت کا حصہ فوت ہو جائے گا اور دُنیا میں سے اُتنا ہی ملے گا جتنا اس کے لیے مقدر ہے اور جو آخرت کے حصہ کو مقدم کرے گا اُس کو آخرت میں اس کی خواہش کے موافق ملے گا اور دنیا بھی جتنی مقدر ہے فوت نہ ہو گی۔"

وقال علیه السلام من شرط الساعة وذکر فیه ویقل العمل۔

نیز آپ نے علاماتِ قیامت میں یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اُس وقت عمل کم ہو جائے گا۔"

اور اس مضمون میں بہت حدیثیں وارد ہیں۔ تو (اس تقریر سے) وہ بات واضح ہوگئی جو (نقصان) باطنی کے متعلق ہم نے عرض کی تھی اور یہ تو فقہ اور نقل کے طریقہ پر (کلام) تھا۔ رہے حضرات اہلِ معاملہ (صوفیہ کرام) تو اُن کے طریق پر (نقصانِ معنوی) کا بیان یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں وقت ایک تلوار ہے اگر تو اُس کو نہ کاٹے گا وہ تجھے کاٹ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اُس کو عمل (صالح) میں نہ گزارو گے تو وہ تم کو (اس) ٹال مٹول ہی میں ختم کر دے گا۔

آجکل دُنیا کے کاموں اور دُنیوی معاملات میں بھی بے برکتی ہو رہی ہے

یہ تو اعمالِ آخرت کا بیان تھا اور اب تو اعمالِ دنیویہ میں بھی نقصان ظاہر ہوگیا اور تمام معاملات میں اچھی طرح واضح ہوگیا ہے۔ چنانچہ اہلِ صنعت میں سے کوئی بھی اپنی صنعت میں اُس درجہ پر نہیں پہنچ سکتا جو پہلے آدمیوں کے متعلق سنا گیا ہے۔ یہی طرح تاجر اور کاشت کار حتیٰ کہ بادشاہ بھی اُس درجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے علاوہ تمام دنیوی اسباب و ذرائع میں بہت ہی نقص واقع ہوگیا ہے جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حقوق و احکام کے بجالانے میں کوتاہی اور سُستی کرنے لگے اور باہم ایک دوسرے سے مکر (و فریب) کرنے لگے ہیں اس لیے اُن کے بدن اور مال اور عقل (ہر چیز) سے برکت اُٹھ گئی اور سب پر اس طرح وبال آگیا کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں (کہ ہم کیا سے کیا ہوگئے ہیں) چنانچہ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ یہ بے برکتی کہاں سے آگئی؟ حالانکہ ہم نے طلب (اور محنت) میں کوشش کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ زبانِ حال اُن (کے سوال) کا جواب دیتی ہے قل هو من عند انفسکم۔ کہہ دو کہ یہ سب کچھ تمہاری ہی ذات سے ہے۔ کیونکہ یہ صفات (اور یہ حالات جو تمہارے اندر ہیں) تقاضائے ایمان کے خلاف ہیں۔ ایمان تو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ (چاہتا) ہے ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا۔ نہ باہم حسد کرو نہ ایک دوسرے سے بُغض

دیکھو نہ پیٹھ موڑ کر چلو اور اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن اپنے بھائی مومن کے لیے وہی چاہتا ہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔ نیز آپ کا ارشاد ہے: اللّٰہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ۔ "اللہ تعالےٰ (اپنے) بندہ کی مدد کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی (مسلمان) کی مدد کرتا رہتا ہے"۔ حضرات سلف کا یہی طریقہ تھا۔

ہمدردی اور خیر خواہی خلق سے مال میں برکت ہونے کا عجیب واقعہ

چنانچہ میں نے ایک تاریخ میں دیکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے کسی ملک پر قبضہ کیا تو خزانہ میں گیہوں کے دانے بھی دیکھے جو اُس گیہوں سے بہت بڑے تھے جو عام طور پر لوگوں کی نظروں میں رہتا ہے۔ بادشاہ نے اُس کے متعلق تفتیش کی (کہ یہ گیہوں کس نے خزانے میں رکھے اور کس لیے رکھے) تو ایک بوڑھے نے جس کی عمر لمبی ہو گئی تھی بتلایا کہ میں اس کی حقیقت سے واقف ہوں۔

بات یہ ہے کہ ایک جوان اور بڈھے نے شرکت میں کھیتی کی تھی جب کھیتی کٹ گئی اور خرمن تیار ہو گیا تو دونوں نے (اس کے دو حصے کر لیے پھر) ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس غلہ کو باری باری اُٹھانا چاہیئے۔ ایک دفعہ تم اپنے حصہ میں سے کچھ اُٹھا کر گھر پہنچاؤ۔ میں اپنے اور تمہارے حصہ کا پہرہ دوں گا۔ پھر میں اپنے حصہ میں سے کچھ اُٹھا کر گھر پہنچاؤں گا۔ تم میرے اور اپنے حصہ کا پہرہ دینا۔ چنانچہ اس قرارداد کے موافق اوّل بڈھے نے اپنے حصہ میں سے کچھ اُٹھایا اور جوان پہرہ پر رہا۔ بڈھے کے بال بچے بہت تھے تو جوان اپنے دل میں کہنے لگا یہ بڈھا آدمی ہے اس کے بال بچے بھی ہیں مجھے اس کی مدد کرنا چاہیئے تو وہ اپنے ڈھیر میں سے کچھ گیہوں نکال کر اُس کے ڈھیر میں ڈال دیتا۔ پھر جب جوان کے اُٹھانے کی باری آئی اور بڈھا پہرہ پر ہوا تو اُس نے اپنے دل میں کہا یہ جوان آدمی ہے لوگ اس کے پاس ملنے ملانے کو زیادہ آتے ہیں۔ مجھے اس کی مدد کرنا چاہیئے۔ اُس نے بھی اپنے ڈھیر میں سے گیہوں

نکال کر جوان کے ڈھیر میں ڈال دیئے۔ غرض دونوں یونہی کرتے رہے کہ جوان اپنے پہرہ کے وقت بڈھے کے ڈھیر میں اپنے گیہوں ملاتا رہا اور بڈھا اس کے حصہ میں اپنے حصہ سے ڈالتا رہا نتیجہ یہ ہوا کہ (دونوں باری باری گیہوں اٹھاتے رہے اور غلہ (میں برکت ہونے لگی کہ پہلے سے) بڑھنے لگا حتیٰ کہ گیہوں کا دانہ بھی بڑا ہونے لگا۔ یہاں تک برکت ہوئی) دونوں ڈھوتے ڈھوتے تھک گئے غلہ کے اٹھانے سے عاجز ہوگئے اور یہ بھی دیکھا کہ غلہ کا دانہ بہت بڑھ گیا ہے۔ عام طور پر جتنا بڑا ہوتا ہے اُس کی حد سے بھی نکل گیا ہے تو ہر ایک نے دوسرے سے قسم دے کر پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیا کرتا رہتا ہے (جو غلہ میں اتنی برکت ہوگئی) تو ایک نے دوسرے کو بتلایا کہ میں تو تیرے پیچھے ایسا کرتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ میں بھی یہی کرتا رہتا ہوں۔ یہ قصہ بستی میں مشہور ہوگیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی خبر پہنچی تو اُس نے کسی کو بھیجا تاکہ اس گیہوں میں سے تھوڑا سا بادشاہ کے سامنے پیش کرے۔ جب بادشاہ نے یہ گیہوں دیکھا تو کہا اس میں سے کچھ (نمونہ کے طور پر) شاہی خزانہ میں رکھ دیا جائے تاکہ بعد والوں کو اس سے عبرت اور نصیحت حاصل ہو تو دیکھو جب ان دونوں نے ادب کے ساتھ حقیقتِ ایمان کا حق ادا کیا تو اُن پر ایمان کی برکتیں نازل ہوگئیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں:۔

ولو ان اھل القریٰ امنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض

دو ، اور اگر ان بستیوں کے باشندے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے "

(اب نہ ویسا ایمان ہے نہ ویسا تقویٰ تو وہ پہلی سی برکتیں بھی نہیں رہیں) رہا حسّی نقصان تو وہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوا کیونکہ رات اور دن کے گھنٹے بدستور اپنے حال پر ہیں (اگرچہ یہ فرق ضرور ہوگیا ہے کہ ان گھنٹوں میں جتنا کام پہلے لوگ کر لیتے تھے اب اُتنا کام نہیں ہو سکتا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حسّی نقصان کی بھی اطلاع دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ سال مہینہ کے برابر ہو

جائے گا اور مہینہ ہفتہ کے برابر اور ہفتہ دن کے برابر اور دن ایک گھنٹہ کے برابر ہوگا (الی آخرالحدیث) اس علامت کا ظہور ابھی باقی ہے۔ وقولہ و یکثر الزلازل فھل ھذا فیہ معنی من الحکمۃ الی قولہ فھذا مما بقی خروجہ "

ف اعمال صالحہ اور تقوے سے وقت میں برکت ہونا صوفیہ کے نزدیک بدیہیات سے ہے۔

معتبر طریقے سے سُنا گیا ہے کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید دہلوی عصر کی نماز کے بعد قرآن شریف پڑھنا شروع کرتے اور مغرب تک ختم کر لیتے تھے بعض بزرگان سلف نے تھوڑی عمر میں اس قدر کام کیا ہے کہ اُن کی تصانیف کے اوراق کو اُن کی عمر کے ایام پر تقسیم کیا گیا تو ہر دن ہزار صفحے ہوئے۔ آج کل تو اتنے صفحات کا مسودہ سے نقل کرنا بھی دشوار ہے۔ اُن حضرات نے ان کو لکھا بھی تھا اور تصنیف کے طور پر لکھا تھا جس میں عبارت آفرینی اور تدبر و تامل اور تلاش و تحقیق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ان ایام میں سے بچپن اور طالب علمی اور سفر و مرض کے ایام بھی نکال دیئے جائیں جن کا مستثنیٰ کرنا ضروری ہے تو یہ اوسط ایک ہزار صفحہ روزانہ سے بھی بہت زیادہ ہو جائے گا۔

(۱۴۴) علم شریعت اور دین داری قتل ناحق سے مانع ہے اور قلتِ علم و قلتِ دین فساد کی جڑ ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ قتل کی کثرت ہوگی۔ اس سے قتل ناحق مراد ہے کیونکہ حدود دالٰہیہ کی وجہ سے قتل ہونا تو بستیوں کے لیے رحمت ہے اور مخلوق کے لیے بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی زمین میں اللہ کی حدود میں سے ایک حد کا قائم کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ اس پر مہینہ بھر بارش ہوتی رہے۔ ایک روایت میں (مہینہ بھر کی جگہ) چالیس دن وارد ہے اور قتل ناحق کی کثرت علم اور دین کی کمی ہی سے ہوتی ہے اور قیامت کے قریب یہ دونوں کم ہو جائیں گے (تو قتل ناحق کی کثرت ہونے لگے گی) اس کی تائید رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ قاتل کو خبر نہ ہوگی کہ اُس نے کیوں قتل کیا اور مقتول کو پتہ نہ ہوگا کہ اُس کو کس وجہ سے مارا گیا۔ قولہ علیہ اسلام و یکثر الھرج و ھو القتل الی قولہ و لا المقتول فیما ذا اقتل۔

آج کل قتل ناحق کی جس قدر کثرت ہے بیان سے باہر ہے۔ کافر سلطنتوں کا یہ حال ہے کہ باہمی جنگ میں صرف فوج ہی پر حملہ نہیں کرتے بلکہ کھلی بستیوں پر بے دریغ بم برساتے ہیں۔ جس سے نہتی بے گناہ رعیت بلا وجہ تباہ ہوجاتی ہے۔ جس میں عورت و مرد، بڈھے، جوان، بچے اور بڑے سب ہی ہلاک ہوتے ہیں۔ یہ تو کافروں کا حال ہے۔ اب مسلمانوں کا سنیئے۔ انہوں نے بھی کافروں کی دیکھا دیکھی یہی طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے۔ جب کوئی جماعت کسی بات پر حکومت سے برسرِ پیکار ہوتی ہے تو وہ ریلوں کی پٹڑیاں اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے جس سے ریل گاڑی گر پڑتی ہے حالانکہ اُس میں نا کردہ گناہ مسافر سوار ہوتے ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ مسافروں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو اُن کے ہلاک کرنے اور لُوٹنے کو تم نے جائز سمجھ لیا

یہاں سے معلوم ہُوا کہ علم دین اور سچی دین داری ہی سے دُنیا میں امن وامان قائم ہو سکتا ہے۔ علوم دنیویہ سے دُنیا میں فساد ہی بڑھتا ہے۔ آج کل علوم دُنیا کی اشاعت ہر جگہ بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ جا بجا اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں مگر کسی طرح فساد میں کمی نہیں آتی۔ بلکہ دن بدن ترقی ہے اگر اس کی جگہ علم دین اور دینداری کو ترقی دی جاتی تو یقیناً دُنیا فساد سے پاک ہوجاتی۔ ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون۔

اس حقیقت پر سب سے زیادہ یقین و اعتقاد حضرات صوفیہ کو ہے اُن کے نزدیک اعمالِ سیئہ اور قلتِ دین سے آفات و بلیات کا نزول اور اعمالِ صالحہ و تقویٰ و استغفار و توبہ سے ان کا مندفع ہونا بدیہیات سے ہے۔ پہلے زمانے میں عامۂ مسلمین کو بھی اس کا پختہ اعتقاد تھا۔ مگر اب اس میں ضعف پیدا ہوگیا ہے

مولانا فرماتے ہیں ؎

ابر نآید از پئے منع زکوٰۃ ۔۔۔ وز زنا افتد بلا اندر جہات

(۴۴۲) غلبۂ حرص کے ساتھ کثرتِ مال بڑا فتنہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد کہ تمہارے اندر مال کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ بہنے لگے۔ یہاں مال سے چاندی سونا مراد ہے اور کچھ نہیں۔ اگرچہ عرب کے محاورہ میں اُونٹ پر بھی مال کا اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے لوگ اپنے عرف میں دوسری چیزوں کو بھی مال کہتے ہیں اور اس تخصیص کی ایک دلیل تو اسی حدیث میں موجود ہے اور ایک دوسری حدیثوں میں ہے۔ اس حدیث میں تو حضورؐ کا یہ ارشاد ہے کہ مال بہنے لگے گا اور یہ صفت حقیقتہً اُن ہی چیزوں میں استعمال کی جاتی ہے جو زمین سے نکلتی ہیں۔ مال ہو یا پانی (وغیرہ) کبھی مجازاً اور چیزوں کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے مگر حقیقت چھوڑ کر لفظ کو مجاز پر بلا دلیل محمول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ لفظ کو ظاہر پر محمول کیا جائے جب تک کوئی معارض شرعی موجود نہ ہو اور یہاں کوئی بھی معارض نہیں ہے۔

دُوسری حدیثوں میں جو دلیل ہے وہ یہ ہے کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ نہر فرات (کا پانی ایک جگہ) سے ہٹ جائے گا اور سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا۔ لوگ اُس پر باہم قتال کریں گے۔ یہاں تک کہ ہر سو میں سے ننانوے قتل ہو جائیں گے صرف ایک بچے گا۔ نیز یہ بھی آیا ہے کہ زمین اپنے خزانوں کو اُگل دے گی مگر یہ اُس وقت ہوگا جبکہ لوگوں میں حرص بڑھ جائے گی اور حرص کی وجہ سے مال کم ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ زمین کو حکم دیں گے کہ اپنے خزانے نکال دے اُس وقت مال بہہ پڑے گا یہاں تک کہ کوئی اپنا صدقہ (اور زکوٰۃ) لے کر نکلے گا تو اُس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا جس کو دینا چاہے گا وہ کہہ دے گا کہ اگر تم یہ صدقہ کل لاتے تو ہم لے لیتے آج تو ہمیں اس کی حاجت نہیں۔ ان حدیثوں سے مال کے

ظاہر ہونے اور بہنے کی کیفیت بھی معلوم ہوگئی کہ زمین اپنے خزانے اُگل دے گی اور سونے کا پہاڑ (نہر فرات سے) نکلے گا اور اس کی جو علت بتلائی گئی ہے یعنی حرص کے ساتھ مال کی قلت وہ تو ہر زمانہ میں موجود ہے (تو اس فتنہ کے ظہور کا ہر وقت اندیشہ ہے) کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوتا مگر اُس کے دونوں طرف دو فرشتے ہوتے ہیں اُن میں سے ایک تو کہتا ہے اللھم اعط لمنفق خلفاً" اے اللہ! مال خرچ کرنے والے کو (اُس کے مال کا) عوض دیجئے"۔ دوسرا کہتا ہے اللھم اعط لممسک تلفاً" اے اللہ! مال جمع کرنے والے کو بربادی دیجئے"۔ یہ سوال نہ کیا جائے کہ جب قلت مال کا سبب حرص ہے تو پھر (غلبۂ حرص کے وقت) مال (زمین سے) کیوں نکلے گا (کیونکہ اس علت کا مقتضا، تو یہ ہے کہ جب تک لوگوں میں حرص کا غلبہ باقی ہو مال کی کثرت نہ ہو بلکہ قلت ہی رہے) جواب یہ ہے کہ مال کے ظاہر ہونے اور زیادہ ہونے میں فتنہ زیادہ ہے بالخصوص جبکہ اُس علت کو بھی اُس کے ساتھ ملا لیا جائے جو اُوپر مذکور ہوئی کہ صدقہ قبول کرنے والا بھی کوئی نہ ملے گا۔ اس سے بڑھ کر فتنہ کیا ہوگا (کہ مال کے پاک ہونے کی کوئی صورت ہی نہ ہوگی محض وبالِ جان ہی ہوگا) اور خود مال کا زیادہ ہونا اور بہنے لگنا بھی بہت بڑا فتنہ ہے (کلا ان الانسان لیطغیٰ اَن راٰہ استغنیٰ "بے شک انسان سرکش ہو جاتا ہے جب وہ اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے تو جب تک غلبۂ حرص کے ساتھ مال کی قلت ہو فتنہ کم ہے۔ اگر مال زیادہ ہو فتنہ زیادہ ہوگا) اس حدیث کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں (قیامت کی) جو علامات بیان کی گئی ہیں اُن کی تصدیق کی جائے اور ان امور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یقین کر کے ایمان کو قوی کیا جائے اور ان فتنوں سے بچنے کے لیے وہ عمل کیا جائے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ فتنوں کا ذکر فرمایا تو عرض کیا گیا آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں اگر ہمارے سامنے یہ فتنے آجائیں تو آپ نے فرمایا الجئوا الی الایمان والاعمال الصالحات" تم ایمان اور اعمالِ صالحہ کی پناہ ڈھونڈو۔ چنانچہ ان میں سے اکثر علامات اب ظاہر ہو چکی ہیں تو کیا صادق مصدوق

صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق کوئی اپنی نجات کی تیاری کرنے والا ہے؟
یہاں ایک صوفیانہ گفتگو بھی ہے وہ یہ کہ جب ان حضرات کو معلوم ہو گیا کہ ان
بڑے بڑے فتنوں سے بھی نجات ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعہ ہوتی ہے تو انہوں
نے یقین کر لیا کہ چھوٹے چھوٹے فتنوں سے تو اعمال صالحہ اور ایمان کے ذریعہ بدرجہ اولیٰ
نجات حاصل ہوگی تو انہوں نے ایمان اور عمل صالح کے سوا کسی کام میں اپنے کو
مشغول نہ کیا بلکہ ہمیشہ کے لیے اُن ہی میں لگ گئے۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ
اس دُنیا کا فنا لابدی ہے تو انہوں نے اول کو آخر کر دیا اور آخر کو اول کر
دیا یعنی دُنیا کو مؤخر اور آخرت کو مقدم کیا) اس لیے فرمایا ہے کہ جب یہ دُنیا کا
گھر باقی نہ رہے گا تو اس کا سامان بھی فنا ہو گا۔ پس ایسے گھر کے لیے کام کرو
جس کو فنا نہیں اور جس کا سامان بھی باقی رہنے والا ہے اور اپنے اوقات
کو نفع سے آباد رکھو۔ اُن کو (عمل سے) خالی (چھوڑ کر برباد) نہ کرو۔
وقوله علیه السلام حتی یکثر فیکم المال فیفیض المال ھنا
المراد به الفضة والذھب الی قوله و لا تدعه عالیاً۔

ف حضرات صوفیہ کا حرص وہوا سے منزہ ہونا اور کثرتِ مال کا طالب نہ ہونا
مشاہد ہے۔ یہ حدیث اُن کے مذاق کی تائید کرتی ہے۔



باب شصت و یکم

حدیث

ان لنفسک علیک حقا و لاھلک علیک حقا

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا مجھے یہ نہیں بتلایا گیا کہ تم رات بھر (نماز میں) قیام کرتے اور ہر دن روزہ رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا بے شک میں ایسا کرتا ہوں۔ فرمایا۔ اگر تم (ہمیشہ) ایسا کروگے تو تمہاری آنکھیں (اندر کو) گڑھ جائیں گی اور تمہارا بدن لاغر ہو جائے گا۔ (جس سے تکلیف ہوگی) اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے پس روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو (رات کو نماز میں) قیام بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو۔

شرح ظاہر حدیث ہمیشہ رات بھر نماز پڑھنے اور ہر دن روزہ رکھنے سے ممانعت پر دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ بشر اس سے عاجز ہے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۲۵) بدون تحقیق کامل کے کسی پر کوئی حکم نہ لگانا چاہیئے

کسی شخص پر کوئی حکم پوری تحقیق اور تفتیش کے بعد لگانا چاہیئے کیونکہ راوی نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی کہ عبداللہ بن عمر رات بھر نماز پڑھتے اور ہر

دن روزہ رکھتے ہیں۔ تو حضورؐ نے عبداللہ بن عمرؓ پر اس روایت سے کوئی حکم نہیں لگایا بلکہ پہلے اُن سے دریافت کیا۔ اگرچہ حضورؐ جانتے تھے کہ جس نے آپ کو خبر دی ہے وہ بھی سچا ہے کیونکہ حضرات صحابہ سب کے سب مقامِ صدق اور دیانت پر فائز تھے مگر تحقیق کا ایک پہلو باقی تھا کہ خود اُس شخص سے بھی دریافت کیا جائے تو حضورؐ نے اس پہلو کو نہیں چھوڑا بلکہ اُن سے دریافت کرنے کے بعد جب اُن کی زبان سے خود سُن لیا تب یقین کیا۔ پس آپ کے اس دریافت کرنے میں چند مسائل شرعیہ پر دلالت ہے ایک تو وہی جس پر ابھی اشارہ کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ تحقیق روایت کے متعلق قاعدہ شرعیہ مقرر کر دیا جائے (کہ راوی ثقہ اور صادق بھی ہو جب بھی دُوسرے پر کوئی حکم اُس وقت تک نہ لگایا جائے جب تک خود اُس سے معاملہ کی تحقیق نہ کر لی جائے) اور (تیسرے) یہ کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس وقت اس عمل کے متعلق اُس کی کوئی خاص نیت تھی جس کو زبان سے ظاہر نہیں کیا اور اسی لیے وہ نقل میں نہیں آسکی یا کوئی خاص نیت نہ تھی۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ عمل کسی شرط پر معلق تھا یا نہیں؟ اور اس شرط کا علم راوی کو تھا یا نہیں یا مروی عنہ نے یہ بات ویسے ہی کہہ دی تھی اس پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ نہ تھا اس لیے آپؐ نے دریافت کیا تاکہ یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ آئندہ کے لیے کیا ارادہ ہے۔ اس کے سوا اور بھی بہت احتمالات ہیں جن کو رفع کرنے کے لیے سوال کیا گیا واللہ اعلم۔ اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ سُنت کی چند قسمیں ہیں۔ اُن میں سے ایک سُنت تو وہ ہے جس پر عمل کرنا واجب ہے گو اُس کے ثبوت کا یقین نہ ہو۔ مثلاً دو گواہوں کی شہادت پر فیصلہ کرنا کیونکہ اُن کے متعلق غلطی کا بھی احتمال ہے اور سچا ہونا بھی ممکن ہے مگر ہم کو اُن کی شہادت پر حکم نافذ کرنے کا امر ہے جبکہ اُن کا عادل ہونا متیقن ہو۔ پس جو شخص کسی حکم کو اس حال میں نافذ کر دے کہ شریعت کے موافق اس کے سبب کا پورا ثبوت نہیں ہوا تو اُس کا یہ فعل سراسر گمراہی ہے اگرچہ نفس الامر میں اُس کا فیصلہ بعینہٖ حق کے موافق ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ہم کو غیب پر حکم لگانے کا امر نہیں کیا گیا۔ بجز اللہ عزوجل پر ایمان لانے کے کہ یہاں غیب پر حکم لگانے کا امر کیا گیا ہے۔

قولہ الوجہ الاول منہا ان الحکم لایکون الا علی اکمل وجوہ التحقیق والتثبیت الیٰ قولہ الا ف الایمان بہ عزوجل حیث امرنا بہ ۔

ف حضرات صوفیہ میں جو علم ظاہر و باطن کے جامع ہیں وہ روایات پر عمل کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ بدون تحقیق کامل کے کسی پر کوئی حکم نہیں لگاتے۔ بعض صوفیہ جو علم ظاہر کے جامع نہیں ہیں حسن ظن کی بنا پر روایات میں تساہل کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتابوں میں ضعاف اور احادیث موضوعہ کثرت سے پائی جاتی ہیں مگر محققین صوفیہ کی یہ شان نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۔

(۱۲۹) ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحتوں کے جزئیات احوال سے باخبر رہنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کی نگرانی میں کچھ رعیت ہو خواہ چھوٹی رعیت ہو یا بڑی اُسے اپنی رعیت کے جزئیات احوال کو معلوم کرنا چاہیئے اور رعیت میں سے جس کو بھی کسی کے احوال کی کچھ خبر ہو اُس پر واجب ہے کہ سردار کو اُن احوال سے مطلع کر دے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس حدیث میں) عبداللہ بن عمرو سے فرمایا ہے کیا مجھ کو یہ نہیں بتلایا گیا کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو۔ الخ اگر آپ نے خود اس کو دریافت نہ کیا ہوتا اور صحابہ کے نزدیک یہ بات طے شدہ نہ ہوتی کہ اُن کو اپنے اور دوسروں کے جن احوال کا علم ہو اُس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کرتے رہیں تاکہ اُس کے متعلق حکم الٰہی معلوم ہو جائے تو حضورؐ کو کوئی بھی یہ خبر نہ پہنچاتا کیونکہ آپ کی ہیبت صحابہ کے دلوں میں بہت تھی یہاں تک کہ وہ اس تمنا میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہات کا آدمی آ کر آپ سے کچھ دریافت کرے تو حضورؐ جو کچھ جواب میں فرمائیں اُس کو سنیں اور اُس سے فائدہ حاصل کریں۔" (تو بدون آپ کے دریافت کئے کسی کی مجال نہ تھی کہ ایک دوسرے کی بات حضورؐ تک پہنچاتا) قولہ الوجہ الثالث فیہ دلیل علی ان کل من کان مستولیا علی رعیۃ صغرت او کبرت الیٰ قولہ فیستفید ون ۔

ف اس دلیل و استدلال میں نظر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت کے

متعلق حضرت علی کا یہ ارشاد موجود ہے من راٰہ بداھۃ ھابہ ومن خالطہ بشاشۃ احبہ۔ جس سے واضح ہوگیا کہ ہر وقت کے پاس رہنے والوں پر زیادہ ہیبت غالب نہ ہوتی تھی بلکہ محبت غالب ہوتی تھی۔ احادیث و سیر کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہے کہ حضرات صحابہ بلا تکلف آپؐ کے سامنے ہر قسم کی باتیں کیا کرتے تھے حتیٰ کہ غلام اور باندیاں اور مسلمانوں کے بچے بھی آپؐ سے بے تکلف تھے اور یہ جو ایک حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ اس تمنا میں رہتے تھے کہ کوئی دیہاتی آکر آپؐ سے کچھ سوال کرے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صحابہ ہیبت کی وجہ سے آپ کے سامنے بات نہ کر سکتے تھے صرف یہ معلوم ہوا کہ سوالات نہیں کر سکتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کے بعض بے تکلف سوالات سے ایک دفعہ آپ کو ایذا پہنچی تھی کیونکہ وہ سوالات بے ضرورت تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یا ایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم۔ جس میں اس قسم کے سوالات سے ممانعت کر دی گئی۔ اس کے بعد صحابہ سوالات میں احتیاط کرنے لگے اور کسی عاقل دیہاتی کے آنے اور سوال کرنے کی تمنا کرنے لگے تھے۔ کیونکہ دیہاتیوں کے سوالات سے حضورؐ پر گرانی نہ ہوتی تھی۔ رہا یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح ہوئی سو اس سے متعلق کنز العمال میں تاریخ حاکم کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اُن کے والد حضرت عمرو بن العاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تھی کہ عبداللہ رات بھر نماز پڑھتے ہیں اور رات کو روزہ رکھتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبداللہ! (رات کو) نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو (اور دن میں) روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کیا کرو اور اپنے باپ عمرو بن العاص کی اطاعت کرو۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی والدہ نے بھی اُن کی شکایت کی تھی کہ عبداللہ نے تو دُنیا کو ترک ہی کر دیا ہے اُس سے کچھ واسطہ نہیں۔ بیویوں کو چھوڑ دیا ہے اُن سے کچھ مطلب ہی نہیں نہ وہ

ترجمہ جو آپ کو دفعۃً دیکھتا اس پر آپ کی ہیبت غالب ہوتی اور جو دل کھول کر ملتا جلتا اُس پر محبت غالب ہوتی تھی ۱۲ ظ

گوشت کھاتے ہیں۔ صئ ج ۲ ۔

اس سے معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عبداللہ بن عمرو کے جزئیات، احوال کو خود دریافت نہیں کیا بلکہ اُن کے والدین نے شکایت کی تھی اور اُن کے والدین کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرب اور قرابت کا ایسا تعلق تھا کہ حضورؐ کی ہیبت اس قسم کی باتوں سے اُن کو مانع نہ تھی۔ یہ تو اس دلیل و استدلال پر کلام تھا باقی حضرت شارح کا مُدّعا اس دلیل پر موقوف نہیں۔ دوسرے دلائل سے یہ مدعا ثابت ہے کہ ہر ذمّہ دار کو اپنے ماتحتوں کے احوال و اقوال کی خبرگیری کرنا چاہیئے البتہ تجسس سے پرہیز کرنا چاہیئے کہ قرآن و حدیث میں تجسس سے منع وارد ہے۔ ماتحتوں کے احوال و افعال کی خبرگیری کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام اُن کے سپرد کر کے بے فکر نہ ہو جائے بلکہ تحقیق کرتا رہے کہ وہ اس کام کو کس طرح انجام دیتے ہیں اور اگر اُن کے دُوسرے اعمال کے متعلق کوئی شکایت پہنچے تو اُس کی پوری تحقیق کر کے اُن کو تنبیہ کی جائے۔ واللہ تعالٰے اعلم۔

(۱۷۶) عبادت میں فرائض کو مقدم کرنا چاہیئے حدیث سے معلوم ہُوا کہ عبادت میں فرائض (مستحبات و نوافل پر) مقدم کرنا مناسب ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ تمہاری جان کا تم پر حق ہے۔ تمہارے گھر والوں کا تم پر حق ہے (تو آپ نے حقوقِ نفس اور حقوقِ اہل کو شب بیداری اور صوم دہر پر مقدم کرنے کا امر فرمایا ہے)

اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ نفس کے حق سے کیا مراد ہے؟ اسی طرح اہل کے حقوق کیا ہیں؟ اور اہل سے یہاں کون مراد ہے؟ سو حقِ نفس کے بارے میں حضرات فقہاء اور اہلِ معاملات (یعنی صوفیہ کرام) میں اختلاف ہُوا ہے۔ فقہاء تو یہ فرماتے ہیں کہ حقِ نفس یہ ہے کہ جن حظوظ کی بوجہ بشریت کے نفس کو حاجت ہے اُن کو پُورا کیا جائے (جیسے کھانا پینا، سونا، بیوی کے پاس جانا) اور کسی وقت نفس

کو راحت بھی دی جائے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دوسری حدیث) میں فرمایا ہے روّحوا القلوب ساعۃ - دلوں کو کچھ کچھ دیر کے بعد آرام بھی دیا کرو۔ نیز آپ کا ارشاد ہے ان المنبت لا ارضا قطع ولا ظہرا ابقی - تیز دوڑانے والے نے نہ تو مسافت ہی کو طے کیا نہ سواری کو سلامت رکھا (کیونکہ برابر تیز دوڑانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ جانور چلنے سے رہ جاتا ہے) مگر ان حضرات کے نزدیک بھی اس حظ کے پورا کرنے کی شرط یہ ہے کہ سُنت کے موافق پورا کیا جائے اور اہل معاملات (صوفیہ کرام) فرماتے ہیں کہ نفس کا تم پر حق یہ ہے کہ اُس کو مولیٰ کے سوا سب سے الگ کر دو (اس صورت میں یہ حدیث ایسی ہوگی) جیسا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انصر اخاک ظالما او مظلوما (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم) اور ظالم کی مدد یہ ہے کہ اُس کو ظلم سے روک دے (حالانکہ ظلم سے روکنا اس کو ناگوار ہوگا مگر اُس کا حق نصرت اسی طرح ادا ہوگا اس کی ناگواری کی پرواہ نہ کی جائے گی۔ اسی طرح نفس کو اللہ تعالیٰ کے سوا سب سے منقطع کر دینا اگرچہ اس کو ناگوار ہو مگر اُس کی خیر خواہی کا حق اسی طرح ادا ہوگا خوب سمجھ لو) اور دونوں قولوں کو جمع کرنا بھی ممکن ہے۔ اس صورت میں تقریر یہ ہوگی کہ تعلقات قلبیہ میں تو حق نفس یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا سب سے اُس کو منقطع کر دو اور اسباب (ظاہرہ) میں حق نفس یہ ہے کہ خلاف شرع اسباب سے اُس کو جُدا کر دو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ قلوب کو تمام احوال میں اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے لگاؤ نہ رہے (ہر طرف اللہ تعالےٰ ہی کی طرف متوجہ رہے) اور اسباب ظاہرہ میں جو تصرف بھی ہو شریعت کے مطابق ہو جس کی رفعت شان پر سب کا اتفاق ہے۔ اس طریقہ کی شاہد آثار نبویہ میں حضرت معاذ کی حدیث ہے جب اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ یمن بھیجا تا کہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ یہ دونوں وہاں پہنچے اور لوگوں کی تعلیم کے لیے ایک ایک سمت کو روانہ ہو گئے جیسا کہ اُن کو امر کیا گیا تھا۔ پھر کسی موقعہ پر دونوں کا اجتماع ہوا تو ایک نے دوسرے سے پُوچھا تم قرآن کس طرح پڑھتے ہو؟ حضرت

ابوموسیٰ نے فرمایا۔ میں اس کو (نماز میں) کھڑا ہو کر بھی پڑھتا ہوں۔ بیٹھ کر بھی پڑھتا ہوں لیٹ کر بھی پڑھتا ہوں۔ وقفہ وقفہ سے پڑھتا رہتا ہوں۔ رات بھر نہیں سوتا۔ حضرت معاذ نے فرمایا کہ میں تو (رات کو نماز میں) کھڑا ہو کر پڑھتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں اور جیسا قیام سے ثواب کی اُمید رکھتا ہوں اسی طرح سونے میں بھی ثواب سمجھتا ہوں۔ پھر دونوں اس اختلاف کا خود فیصلہ نہ کر سکے اور کسی نے دُوسرے کی بات کو نہ مانا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس اختلاف کا ذکر کیا تو حضورؐ نے فرمایا اے ابوموسیٰ! معاذ تم سے زیادہ سمجھدار ہیں جو قیام (لیل) بھی کرتے ہیں اور سوتے بھی ہیں (اسی کے مناسب) بعض بزرگان طریق کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ ان کو مناجات اور فضل (خداوندی) کی خاص حالت میسّر ہوئی تو دُعا کی کہ یہ حالت میرے لیے ہمیشہ رہا کرے تو اُن سے (بطریق الہام کے) کہا گیا کیا تم بشر نہیں ہو اور بشریت کے رہتے ہوئے یہ حالت ہمیشہ نہیں رہ سکتی ؎

در بزم عیش یک دو قدح درکش و برو یعنی طمع مدار وصال دوام را (حافظ)

پس جب تم ہمارے حکم اور نہی کی طرف رجوع کرتے رہو (ہمارے حکم کو بجالاؤ اور جس فعل سے منع کیا گیا ہے اُس سے باز رہو) تم ہمیشہ ہمارے پاس رہو گے (یعنی قرب کا مدار احوال پر نہیں بلکہ اعمال پر ہے۔ تم اپنے اعمال کو شریعت کے موافق رکھو ہر حال میں مقرب رہو گے۔ احوال ہوں یا نہ ہوں اگرچہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ استقامت اعمال سے استقامت احوال بھی عطا ہو جاتی ہے مگر احوال کے لیے دوام لازم نہیں) رہا یہ کہ یہاں اہل سے کون مراد ہے تو یہ بھی احتمال ہے کہ بیوی بچے وغیرہ جن کا نفقہ مرد کے ذمہ ہے سب ہی مراد ہوں کیونکہ اگر انسان ہر وقت عبادت میں مشغول رہے گا۔ ان کے حقوق کا ادا کرنا دشوار ہو جائے گا۔ حالانکہ ان حقوق کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا! اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں اہل سے صرف بیوی مراد ہو کیونکہ شوہر پر اُس کا حق یہ بھی ہے کہ اس سے مقاربت کرے اور روزہ اور شب بیداری (کی کثرت) اس میں کمی کا باعث ہو گی جس سے ایک حق واجب

میں خلل واقع ہوگا۔ مگر عام معنے پر حدیث کا محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اس میں زیادہ فائدہ ہے (اور اس حدیث میں اہل کو زوجہ پر محمول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اولاد اور ماں باپ وغیرہ کا حق بندہ کے ذمہ نہیں بلکہ یہ کہا جانے گا کہ چونکہ صحابی کے والدین نے خاص طور پر یہ شکایت کی تھی کہ عبداللہ کو تو نہ دنیا سے واسطہ نہ بیوی سے مطلب۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خصوصیت کے ساتھ بیوی کے حق کی تاکید فرمائی بقیہ حقوق میں کوتاہی کی کسی نے شکایت نہ کی تھی تو یہاں اُن کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ دوسرے مواقع پر بہت احادیث میں حضورؐ نے جملہ اہل حقوق کے حقوق پر تنبیہ فرمادی ہے) قولہ: لوجہ السادس فیہ دلیل علی ان الاولیٰ فی العبادۃ تقدیم الفرائض الی قولہ وحملہ علی الاعم اولیٰ لانہ اکبر فی الفائدۃ۔

ف یہ ہے اصلی اور حقیقی تصوف کہ فرائض کو نوافل و مستحبات پر مقدم کیا جائے لیکن آج کل کے جاہلوں کا تصوف یہ ہے کہ نماز قضاء ہو جاوے، روزہ قضاء ہو جاوے مگر پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ قضاء نہیں ہو سکتا۔ بعضے جاہل صوفی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے تیس برس سے بیوی بچوں کی صورت نہیں دیکھی۔ بعضے اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم سے کسی بزرگ کا کوئی عُرس فوت نہیں ہوتا برابر ہر عُرس میں شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کی وجہ سے اُن کی صدہا نمازیں ریل کے سفر میں قضا ہو جاتی ہیں یا بے ڈھنگے پن سے پڑھی جاتی ہیں۔ مگر ان جاہلوں کے نزدیک نماز روزہ میں وہ ثواب کہاں جو عُرس اور قوالی میں ہے استغفر اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ ان لوگوں نے کیسا شریعت اسلامیہ کو مسخ کیا اور کس بُری طرح تصوف کو بدنام کیا ہے۔ یاد رکھو نہ یہ لوگ صُوفی ہیں نہ ان کو تصوف کی ہوا لگی تصوف تو اس کا نام ہے کہ دل نور ذکر سے منور ہو جاوے۔ اللہ تعالیٰ سے غافل نہ رہے اور اعمال میں شریعت کی پوری پوری موافقت ہو۔ جس کو یہ دولت حاصل ہے وہ صوفی ہے ورنہ مدعی اور جاہل ہے۔

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ مدار قرب احوال پر نہیں بلکہ اعمال پر ہے۔ یہ بات آب زر سے

لکھنے کی ہے۔ حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم نے اپنے مواعظ و ملفوظات میں بار بار اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ سالک کو اپنے اعمال کی اصلاح اور تکمیل میں سعی کرنا چاہیئے کہ قرب اسی سے عطا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ سبحان اللہ دل سے خلوص کے ساتھ کہنے سے تو قرب ہو گا مگر گھنٹہ بھر کے استغراق اور دن بھر کے جوش و خروش سے کچھ بھی قرب نہ ہو گا۔ کیونکہ احوال کو قرب میں دخل نہیں وہ تو صرف سہولت اعمال کے لیے عطا ہوا کرتے ہیں تاکہ سالک کی ہمت عمل کے لیے بلند رہے خود مقصود نہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے دستر خوان پر چٹنی کہ وہ غذا کے لیے معین ہوتی ہے خود مقصود نہیں ہوتی۔ انسان کو چٹنی کے ذریعہ غذا سے پیٹ بھرنا چاہیئے۔ اگر کوئی چٹنی کی لذت پا کر اسی سے پیٹ بھرنے لگے تو یقیناً نقصان اٹھائے گا اور سب اس کو احمق بتلائیں گے۔

(۱۲۸) حدیث میں (انسان کی) بشری کمزوریوں پر بھی دلالت ہو رہی ہے کہ تکلف کے ساتھ قدر تحمل طبعی سے زیادہ عمل کرنا اکثر ضرر اور نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ سے ان پر متنبہ فرمایا ہے (فانک ان فعلت ذلک) ھجمت عینک و نفھت نفسک (اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری آنکھیں (اندر کو) گڑ جائیں گی اور تمہارا جسم کمزور ہو جائے گا۔ اس کلام کا پر شوکت عنوان بتلا رہا ہے کہ طبیعت انسانی اپنے ضعف کی وجہ سے اس عمل کا تحمل نہیں کر سکتی جس کا ان صحابی نے ارادہ کیا تھا۔ اس کی ایک نظیر یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کو وصال صوم سے منع فرمایا تھا (وصال صوم یہ ہے کہ لگاتار روزے رکھتا چلا جائے۔ درمیان میں رات کو بھی کچھ نہ کھائے) صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ تو ایسا کرتے ہیں۔ فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے رات کو اللہ تعالیٰ کھلاتے پلاتے رہتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ حسی طور پر آپ (جنتی) کھانا کھاتے تھے کیونکہ اس صورت میں آپ کا وصال باقی نہ رہتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا فرماتے ہیں جیسی کھانے پینے والے کو (غذا سے) حاصل ہوتی ہے۔ اسی بناء پر ایک بزرگ جب وصال کا ارادہ کرتے ایک روٹی

اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیتے تھے۔ ایک دن وہ کسی ضرورت سے باہر گئے تو کسی درویش نے وہ روٹی تکیے کے نیچے سے نکال لی۔ جب بزرگ واپس آئے اور تکیہ کے نیچے روٹی کو نہ پایا تو پوچھا یہاں سے روٹی کہاں گئی؟ درویش نے کہا حضور! آپ جیسے شخص کو اس روٹی کی ضرورت ہی کیا ہے (وہ تو کئی دن سے ویسے ہی رکھی ہوئی تھی ہم نے اس کو الگ کر دیا کہ جب کھاتے نہیں تو فضول رکھنے سے کیا فائدہ؟) فرمایا ادب کی رعایت کرو۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اس وقت میری جو حالت تم دیکھ رہے ہو یہ میری طبعی (اور فطری) حالت ہے (ہرگز نہیں) بلکہ محض فضل الٰہی اور فیض ربانی (اس کا سبب) ہے تو اگر کسی وقت مجھے حالت بشری کی طرف لوٹا دیا جاوے (اور یہ فیض و امداد روک دی جائے) اس وقت اگر میرے پاس یہ روٹی ہوگی تو میں اس سے دشمن کو دفع کر سکوں گا (یعنی بھوک کو جو کبھی ہلاکت کی طرف مفضی ہو جاتی ہے اسی لیے اس کو دشمن کہہ دیا گیا یا شیطان کو دفع کر سکوں گا جو فیض و مدد باطنی کے بند ہونے کے وقت سالک کو بہکانے آتا ہے کہ لو تمہاری محنت رائیگاں ہو گئی) وہاں یہ قدر کی گئی کہ مدد بند کر دی گئی اب تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تو اس وقت روٹی تکیے کے نیچے سے نکال کر اس کے وسوسہ کو دفع کر دیا جائے گا کہ میرے مالک نے ایک مدد بند کر دی تو دوسری امداد تو اس کی طرف سے موجود ہے کہ اس نے مجھے روٹی کھانے کو دی ہے جس سے بھوک کو دفع کر کے قوت حاصل کر سکتا ہوں)

اسی حقیقت کی بناء پر احکام کو اصلی اور اکثری حالت پر مبنی کیا گیا ہے۔ مثلاً تین وقت کے فاقہ کے بعد مردار کو حلال کر دیا گیا کیونکہ طبیعت انسان کی اصلی وضع اپنی کمزوری کی وجہ سے اس مقدار سے زیادہ فاقہ کا تحمل نہیں کر سکتی۔ اگر اس سے زیادہ کا تحمل کیا جائے گا تو انسان کی حالت میں خلل واقع ہو گا جس سے بعض دفعہ موت کی نوبت آ جائے گی اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

ما یفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم و آمنتم۔

"اللہ تعالیٰ کو تمہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے اگر تم شکر کرتے رہو اور ایمان لے آؤ۔"

(تو کسی حالت میں انسان کو ہلاکت میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ جب خُدا نے اجازت دے دی ہے بے تکلف مُردار کھا کر اپنی جان بچائے اور قوت حاصل کرکے ایمان اور عمل صالح میں ترقی کرے۔ عبدیت اور بندگی اسی کا نام ہے۔ اس وقت طبعی نفرت پر عمل کرکے مُردار سے احتراز کرنا اور جان کو ہلاکت میں ڈالنا خدا کی بندگی نہیں بلکہ اپنی طبیعت کی بندگی ہے۔ عاشق کی شان یہ ہونا چاہئیے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں ؎

خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

عشق و محبت کی شان یہ ہے کہ اگر ایک وقت محبوب سر پر تاج شاہی رکھے تو جیسا اُس وقت خوش ہو کر محبوب کا شکر یہ ادا کرتا ہے اسی طرح اگر دوسرے وقت تاج شاہی سر سے اُتار کر ایک بھنگی کے سامنے عجز و نیاز کا حکم دے تو اس حکم کو بھی خوشی سے بلا چون وچرا بجالائے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن

دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

پھر اگر انسان کو کسی وقت اس سے زیادہ قوت عطا ہو جائے (کہ تین وقت سے زیادہ فاقہ کرنے سے بھی اُس کو ضعف اور کمزوری نہ ہو) تو یہ محض فضل و احسان ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو لیے دوسرا دروازہ کھول دیا ہے۔ کیونکہ جیسا اللہ تعالیٰ نے دوسروں کے لیے کھانے پینے سے قوت عطا کرنے کا قانون مقرر کیا ہے اسی طرح اپنے خاص بندوں کے لیے بدون کھانے پینے کے قوت اور ہمت عطا کرنے کا قاعدہ جاری کر دیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کی طرف التفات نہ کریں۔ تو جو شخص اس شان کو (یعنی وصال صوم کو) اختیار کرکے ان لوگوں کی حرص کرنے لگے حالانکہ ابھی اس کو یہ فیض حاصل نہیں ہوا تو اس کی حالت میں ضرور خلل واقع ہوگا اور یہ شخص اس آیت کا مخاطب ہوگا ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اپنے ہاتھوں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مگر یہ کہ کسی کے ساتھ اس درجے

لطف (کا معاملہ) ہو جائے کہ بزرگوں کے ساتھ تو اُس کو حُسنِ ظن ہے۔ اُن کی حالت کی تصدیق (اُس کے دل میں) ہے تو اور بات ہے لیکن غالب یہی ہے کہ اس شخص کو (ابتداء میں) دشواری پیش آئے گی۔ پھر بزرگوں کی حرمت کی وجہ سے دشواری اُٹھادی جائے گی۔

قوله فی الوجه السابع فیه دلیل علی ضعف البشریة

الی قوله ثم یحمل عنه للحرمة ۔

(۱۲۹) حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ دین میں جس عمل کو مستحب کہا گیا ہے وہ بھی ہر حال میں مطلوب ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ صم وافطر وقم ونم۔ روزہ بھی رکھو افطار بھی کرو۔ رات کو اٹھو بھی اور سوؤ بھی۔ اس کے اشارہ سے مستحب کا مطلوب ہونا مفہوم ہو رہا ہے اور اشارۂ کلام اور فحوی کلام کا وہی حکم ہے جو نص کا حکم ہے۔ مجھے اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہوتا تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کلام کے ضمن میں یہ فرما رہے ہیں کہ اداءِ حقوق (زوجہ وغیرہ) میں ایسے مشغول نہ ہو کہ مستحبات کو بالکل ہی نظر انداز کر دو بلکہ فرض اور مستحب دونوں کو بجالاتے رہو۔ اگر تم قواعدِ شریعت میں غور کرو گے تو سب کو اسی انداز پر پاؤ گے (کہ فرائض اور مستحبات دونوں ہی کے اہتمام کا حکم کیا ہے)

پس جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا گیا ہے وہ اپنے عیوب پر نظر رکھتا ہے (کہ فرائض میں کوتاہی ہو رہی ہے یا مستحبات میں) جس سے کامیابی کا راستہ اُس کو نظر آجاتا ہے۔ اس لیے (ایک بزرگ نے) فرمایا ہے کہ تمہارا اپنے نفس پر نظر کرنا ما سوا سے حجاب ہو جاتا ہے (یعنی ایسا شخص دوسروں کی خبر گیری اور خدمت نہیں کرتا نہ اُن کے حقوق ادا کرتا ہے) اور اپنے نفس کے سوا دوسری چیزوں میں مشغول ہو جانا اپنے نفس سے حجاب ہو جاتا ہے (کہ ایسا شخص اپنے نفس کی اصلاح و تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتا دوسروں ہی کی فکر میں رہتا ہے۔ پس نہ ہمہ تن

دوسروں میں مشغول ہو نہ ہمہ تن اپنے نفس میں مشغول ہو، بلکہ دوسروں کا حق بھی ادا کرے اور اپنی اصلاح کا بھی اہتمام کرے) پھر اگر تم کو اپنے نفس (کی اصلاح و فکر) سے عجب ہونے لگا (اپنے کمالات پر نظر کر کے اپنے کو کچھ سمجھنے لگا) تو دوسروں سے کچھ فائدہ نہ پہنچے گا اور اگر (اصلاح نفس میں اس طرح لگے رہے کہ) اپنے نفس (کے کمالات) سے اندھے بن گئے تو اپنی ذات سے بھی تم کو خیر حاصل ہوگی اور دوسروں سے بھی فائدہ پہنچے گا۔

قولہ الوجہ الثامن فیہ دلیل علی ان المندوب فی الدین مطلوب علی کل حال الی قولہ نات خیرھا وخیر ما سواھا۔

ف اپنے نفس سے اسی کو نفع پہنچتا ہے جو اس کی فکر اصلاح سے غفلت نہ کرے اور ہمیشہ اس کو متہم سمجھے اور دوسروں سے نفع اس کو پہنچتا ہے جو اپنے کو سب سے کمتر سمجھے۔ پانی نشیب کی طرف جاتا ہے، بلندی کی طرف نہیں چڑھتا اور اگر کبھی اتفاق سے بلندی پر جاتا بھی ہے تو نشیب کو بھر کر جاتا ہے یہی حال فیض باطن کا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

باب شصت و دوم

حدیث

الاستخارۃ فی الامور

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو تمام کاموں میں استخارہ کی تعلیم (اس تاکید سے) فرماتے تھے جیسا قرآن کی سورت (اہتمام کے ساتھ) سکھلایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ جب کسی کو کسی کام کا فکر (و تردد) ہو تو دو رکعتیں نفل پڑھے اُن کے بعد یوں کہے:-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ اَوْ قَالَ عَاجِلِ اَمْرِیْ وَاٰجِلِهٖ فَاقْدُرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ وَاٰجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِهٖ۔ قال ویسمی حاجته۔

ترجمہ: اے اللہ! میں آپ سے تجویز خیر طلب کرتا ہوں آپ کے علم کے وسیلہ سے اور قدرت طلب کرتا ہوں آپ کی قدرت کے طفیل، اور مانگتا ہوں آپ سے آپ کے بڑے فضل کا کچھ حصہ کیونکہ آپ قادر ہیں میں قادر نہیں آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا۔ آپ تو علام الغیوب

ہیں۔ یا اللہ! اگر آپ کے علم میں یہ کام میرے لیے خیر ہو (یہاں مقصود کا نام لے یا تصور کرے) میرے دین میں بھی دنیا میں بھی اور انجام کار میں بھی تو اُس کو میرے لیے تجویز کر دیجئے اور میرے لیے آسان بھی کر دیجئے۔ پھر اُس میں میرے لیے برکت (و ترقی) بھی دیجئے اور اگر آپ کے علم میں یہ کام میرے لیے شر ہو (یہاں بھی مقصود کا نام لے یا تصور کرے) میرے دین میں اور دُنیا میں اور انجام کار میں تو اُس کو مجھ سے ہٹا دیجئے اور مجھے (بھی) اُس (کے خیال) سے ہٹا دیجئے اور جہاں کہیں بھی خیر ہو اُس کو میرے لیے مقدر فرما دیجئے۔ پھر مجھے اُس سے راضی رکھئے۔"

فرمایا اور (درمیان میں) اپنی حاجت کا نام بھی لے (ترجمہ میں تو اُس کا موقعہ بتلا دیا گیا اور اصل دُعا میں اُس کا موقعہ لفظ هٰذا الامر ہے)

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا نے استخارہ پر ترغیب دیا کرتے تھے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے:-

صوفیہ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی کام کے لیے استخارہ کیا اور اُس میں اللہ تعالےٰ نے (کسی جانب) کوئی فیصلہ کر دیا (مثلاً وہ مقصود پورا کر دیا یا اُس سے دل کو ہٹا دیا یا ایسے اسباب پیدا کر دیئے جس سے وہ معاملہ خود ہی ہٹ گیا) اور بندہ اُس فیصلے سے راضی نہ ہُوا تو یہ اُن کے نزدیک کبائر میں سے ہے (یعنی بڑا گناہ ہے) جس سے توبہ کرنا اور باز آنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ سوءِ ادب ہے۔ صوفیہ کا یہ ارشاد بہت ظاہر ہے کیونکہ جب بندۂ مسکین نے اپنے ایسے بڑے آقائے جلیل کی طرف رجوع کیا۔ اور اللہ تعالےٰ سے درخواست کی کہ اُس کے لیے جو صورت مناسب ہو تجویز کر دی جائے پھر یہ اللہ کی تجویز سے کیوں راضی نہیں ہوتا؟ یہ حالت تو نفاق کے مشابہ ہے بلکہ یہی تو عین نفاق ہے کیونکہ اس نے اپنا فقر اپنی احتیاج ظاہر کی (اور زبان سے) معاملہ کو اللہ تعالےٰ کے سپرد کر دیا اور دل میں اُس کے خلاف تھا اس حالت کو اُس کے اس قول سے کیا تعلق اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ (کہ یا اللہ! میں آپ سے تجویز خیر طلب کرتا ہوں آپ کے علم کے وسیلہ سے)۔ اللہ سے تجویز کی درخواست کرنا پھر

اُس کی تجویز سے دامنی نہ ہونا دلگیر ہونا ہی تو نفاق ہے) ۔ ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں میں کسی پر اُس شخص سے زیادہ غضب ناک نہیں ہوتا جس نے مجھ سے کسی معاملہ میں استخارہ کیا ۔ میں اُس کے متعلق ایک فیصلہ کردوں پھر وہ میرے فیصلے سے ناگواری ظاہر کرے ۔ او کما قال

قولہ بعد شرح الفاظ الحدیث و قد ذکر: هل العوفة انه من استخارة فی شئ الی قولہ قضاء فکرهہ او کما قال ۔

(۱۱۹) ہر لمحہ فقر و احتیاج و رجوع الی اللہ کو لازم کر لینا چاہیئے

اس میں صوفیہ کے لیے بہت بڑی دلیل ہے جو ہمیشہ کے لیے فقر و احتیاج اور ہر سانس میں اللہ تعالےٰ کی طرف یکسوئی کو اختیار کئے ہوئے ہیں کیونکہ جب ذرا سی دیر کی احتیاج سے (جو استخارہ میں ظاہر کی جاتی ہے) اتنا بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ بندہ کی دو رکعت نماز اور اُس کے بعد اللہ تعالےٰ کے دربار میں شفیع بن جاتی ہے) تو اگر یہ حالت دائمی ہو جائے تو پھر کیا ہوگا ؟ (خود ہی سمجھ لو) ؎

آں دعائے بیخودان خود دیگر ست	آں دعا زو نیست گفت داور ست
آں دعا حق می کند چوں او فناست	آں دعا و آں اجابت از خدا ست
چوں خدا از خود سوال و گد کند	پس دعائے خویشتن چوں رد کند (۲)

صوفیہ میں سے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ جب کسی درویش کو کوئی حاجت پیش آتی وہ اس کے متعلق اللہ تعالےٰ سے التجا کرتے تو وہ اللہ تعالےٰ کے فضل سے (بہت جلد) پوری ہو جاتی ۔ اس پر کوئی درویش عرض کرتا کہ حضرت اللہ تعالیٰ کی طرف التجا لے جانا بھی کتنی بڑی دولت ہے تو اُن کا جواب یہ ہوتا تھا کہ تم اس سے ہٹے ہوئے کب ہو ، جو اُس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہو (التجا تو وہ لے جاوے جو اللہ تعالےٰ سے غافل و محجوب ہو اور تم تو ہر وقت

اُس کی طرف متوجہ ہو) ان بزرگوں کے الفاظ میں غور کرو کس طرح اصول شریعت کے موافق حد اعتدال پر کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے بعضوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس موقع کے لیے کیا قاعدہ ہے (کیا جواب مناسب ہے مگر اللہ تعالیٰ وقت پر اُن کی امداد فرماتے ہیں۔ اُن کی زبان سے وہی نکلتا ہے جو موقع کے مناسب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس کو جس دروازہ سے رزق دیا جائے اُسی کو لگا رہے اور جب ساری غیر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے میں ہے تو اس دروازہ سے کسی وقت نہ ہٹنا چاہیئے کہ رجوع کی ضرورت ہو۔ جیسا ان بزرگ نے فرمایا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا ہے من شغلہ ذکری عن مسألتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین جس کو میری یاد مجھ سے سوال کرنے (اور دُعا کرنے) سے روک دے میں اُس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ دیتا ہوں۔ پس اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھو کہ تم کس کے دروازے پر کھڑے ہو؟ اور کس (عظیم الشان) جہت کی طرف متوجہ ہو رہے ہو (اُس کا ادب ملحوظ رکھ کر دعا کرو اور جو مانگتا ہو مانگو پھر انشاء اللہ محروم نہ لوٹو گے)

قولہ فہذا اقوی دلیل لاھل الصوفۃ الی قولہ بباب من تقف وای جہۃ تقصد۔

ف ۱ دعائے استخارہ کے الفاظ کو بجنسہا ادا کرنا اور جس طرح حدیث میں وارد ہیں اُسی طرح یاد کرنا چاہیئے۔ معنی بھی یاد ہوں تو بہت اچھا ہے تاکہ دعا دل سے اضطرار کے ساتھ ہو۔

ف ۲ استخارہ واجبات یا محرمات و مکروہات میں نہیں ہو سکتا کیونکہ واجب کا بجالانا ضروری اور محرم و مکروہ سے بچنا لازم۔ پھر اُن میں استخارہ کا کیا مطلب؟ استخارہ صرف مباحات میں ہُوا کرتا ہے اور مستحبات میں بھی ہو سکتا ہے جبکہ دو مستحب میں سے ایک کو کرنا چاہتا ہو اور یہ معلوم نہیں کہ ان میں سے کونسا میرے واسطے زیادہ بہتر ہوگا۔

مت مشہور یہ ہے کہ استخارہ میں جس جانب دل مائل ہو اُسی طرف خیر ہوتی ہے۔ اُسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ مگر حدیث میں اُس کا کچھ ذکر نہیں اس لیے استخارہ کے بعد جس شق کو بھی اختیار کرے گا اُس میں خیر ہوگی خواہ وہی جانب ہو جس کی طرف دل زیادہ مائل تھا یا دوسری جانب ہو۔ غرض استخارہ کے بعد جس جانب پر عمل کی توفیق ہوگی اسی میں خیر ہوگی۔

مت اس میں شک نہیں کہ اگر استخارہ کے بعد کسی جانب دل زیادہ مائل ہُوا کہ استخارہ سے پہلے اُس طرف زیادہ میلان نہ تھا تو بظاہر یہ علامت اس کی ہے کہ اسی جانب کو اختیار کرنا بہتر ہے مگر وجوب اور لزوم کی علامت نہیں اس لیے اُس کے خلاف کو بھی اختیار کرنا جائز ہے۔ کچھ گناہ یا ضرر کا اندیشہ نہیں۔ بعض لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ استخارہ کے بعد جس جانب دل زیادہ مائل ہو اس کے خلاف کرنا جائز نہیں یا اُس میں ضرر ہوگا غلط ہے اسی طرح جب تک دل کسی ایک طرف مائل نہ ہو استخارہ کو بیکار سمجھتے ہیں یہ بھی صحیح نہیں۔

مت استخارہ کا مطلب یہ ہے کہ جب دو جائز یا دو مستحب کاموں میں تردد ہو کہ ان میں سے کس کو اختیار کروں تو استخارہ کر کے جس شق کو دل چاہے اختیار کرلے اُس میں ضرر نہ ہوگا۔ پھر جس شق کو اختیار کر لیا اُس کو حق تعالیٰ کی تجویز سمجھ کر اُس سے راضی رہنا چاہئے اور یقین رکھنا چاہیئے کہ اس میں خیر ضرور ہوگی جو اکثر تو مشاہدہ میں آجائے گی اور اگر کبھی اُس کے مشاہدہ میں نہ آئے تو سمجھے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہیں اُن کے علم میں میرے لیے خیر ضرور ہے گو میری سمجھ میں نہ آئی ہو۔ استخارہ کے بعد جس شق کو اختیار کر لیا گیا اُس سے ناگواری اور ناراضی اور یہ خیال کہ مجھے دوسری شق اختیار کرنا چاہیئے تھی اُسی میں خیر ہوتی بہت بُری بات ہے جس پر حدیث میں وعید وارد ہوئی ہے۔



باب شصت و سوم ۶۳

حدیث

ما بین بیتہ و منبرہ صلی اللہ علیہ وسلم

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہوگا۔"

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اور منبر کے درمیان جنت کا ایک روضہ ہے اور منبر حوض پر ہے اس کے متعلق چند وجوہ سے کلام ہے اول یہ کہ اس کا کیا مطلب ہے[عہ] کہ یہ قطعہ جنت کا روضہ ہے؟ کیا زمین کا یہ ٹکڑا بعینہ دنیا سے جنت میں منتقل کر دیا جائے گا یا یہ مطلب ہے کہ اس میں (نیک) عمل کرنے سے جنت میں ایک روضہ کا استحقاق ہو جاتا ہے۔ علماء اس باب میں مختلف ہیں کسی نے پہلے قول کو لیا کسی نے دوسرے کو اور واللہ اعلم۔

بہتر یہ ہے کہ دونوں کو جمع کر لیا جائے کیونکہ ان میں سے ہر شق پر دلیل قائم ہے اور نظر و قیاس سے بھی ہر ایک کی تائید ہو رہی ہے (تو ایک کے ترک کی کوئی وجہ نہیں) اور تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ قطعہ خود جنت ہی کا ٹکڑا ہو جیسا حجر اسود جنت کا پتھر ہے۔ نیل و فرات جنت کی نہریں ہیں اور ہندوستان کے بعض

[عہ] اس مضمون کا ترجمہ بطور خلاصہ کے اس لیے کر دیا گیا کہ مفید تحقیق ہے اور چونکہ اس میں کوئی شائبہ تصوف کا نہیں ہے اس لیے نمبر نہیں دیا ۱۲ منہ

(خوشبودار) پھل (اور پھول) اُن پتوں سے پیدا ہوئے ہیں جو آدم علیہ السلام کے ساتھ (اُن کے بدن پر چپکے ہوئے) جنت سے اُترے تھے۔ غرض حکمت اس کو مقتضی ہوئی ہے کہ اس دُنیا میں بھی جنت کے پانی اُس کی مٹی اُس کے پتھروں اُس کے میووں میں سے کچھ (بطور نمونہ کے) ہو یہ حلم جلیل (اللہ جل شانہ) کی حکمت ہے پس یہ قطعہ اس وقت بھی جنت کے باغوں میں سے ایک روضہ ہے اور آخرت میں بھی جنت کا روضہ ہو جاوے گا۔ جیسا پہلے تھا اور اس میں عمل کرنے والے کو جنت کے روضہ کا استحقاق بھی ہو گا۔ یہی زیادہ ظاہر ہے۔ دو وجہ سے ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کی وجہ سے۔ دوسرے اُس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مشابہت ہو گی کہ جیسے اُن کو اللہ تعالیٰ نے جنت کا پتھر عطا فرمایا اسی طرح اپنے حبیب کو جنت کا روضہ عطا فرمایا۔

(۱۲۰) جمادات کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے شرف اور بزرگی حاصل ہوتی ہے

اس میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ جب بے جان چیزوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے شرف حاصل ہوتا ہے تو اس کے شرف کا کیا پوچھنا جو اقوال و احوال میں آپ کا متبع ہو فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین کسی کو خبر نہیں کہ اُن کے لیے کیا کیا آنکھ کی ٹھنڈک مخفی رکھی گئی ہے اسی وجہ سے حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم جب کسی اجنبی کو مسجد میں دیکھتے جس کو پہلے سے نہ پہچانتے تھے اُس سے پوچھتے کہ تیرے پاس قرآن کتنا ہے؟ پھر اُن کی حالت کے موافق رعایت کرتے اور اُسی کے مطابق مرتبہ عطا فرماتے

صحابہ کے نزدیک قرآن کے سوا بزرگی کا معیار کچھ نہ تھا

کیونکہ اُن کے نزدیک رفعت اور بزرگی کا معیار قرآن کے سوا کچھ نہ تھا۔ نیز آج

اور جب فضیلت کے تھے اُن میں تو سب برابر یا قریب قریب تھے اور پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دفتر (بیت المال) میں صحابہ کے نام لکھے تو سب سے مقدم اُن کو کیا جو اسب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھے پھر اُن کو جو ہجرت میں مقدم تھے پھر اُن کو جو ہجرت میں مقدم تھے۔ پھر باقی لوگوں کو قرآن کے اعتبار سے مقدم و مؤخر کیا کہ جس کے پاس قرآن کا جتنا حصہ ہوتا اسی کے موافق اُس کو درجہ دیا جاتا یہاں تک کہ روایات میں آیا ہے کہ اُن کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ آپ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو مجھ پر فضیلت کیوں دی؟ فرمایا اس لیے کہ اس کے باپ تیرے باپ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ ان سب کے بعد اللہ و رسول کے ساتھ محبت کا درجہ ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کو دریافت کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا کہ تو نے اس کے لیے کیا سامان تیار کیا ہے؟ اُس نے کہا میں نے قیامت کے لیے کوئی بڑا عمل تو زیادہ نہیں کیا مگر میں اللہ سے اور اُس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ حضور نے فرمایا بس تو جا تو اُن کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت رکھتا ہے۔

(تنبیہ) مگر دیکھو ایسا نہ ہو کہ تمہاری محبت محض دعوے ہی کی محبت ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں جس میں ہوں وہ ایمان کی حلاوت پالے گا اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ و رسول اُس کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں اس حدیث پر شرح اس کتاب میں کلام گزر چکا ہے۔ غرض بلندی مرتبہ کا معیار ایمان اور اتباع ہے پھر جس کا دل چاہے اپنے کو ذلیل کرے یا معزز بنالے۔

(۱۲۱) دنیا کی جو چیزیں ضروریاتِ انسانی میں داخل ہیں وہ دنیا نہیں، بلکہ ثواب ہی ثواب ہیں جب کہ بقدرِ ضرورت ہوں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں ضروریاتِ بشریہ میں سے ہیں وہ دنیا میں اصلا داخل نہیں بلکہ ثواب ہی ثواب ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرا گھر اور

میرا منبر (جس میں گھر اور منبر کو حضور نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور آپ کی طرف دُنیا منسوب نہیں ہو سکتی تو معلوم ہُوا کہ گھر اور منبر دُنیا میں داخل نہیں) کیونکہ گھر تو بندہ کی ضرورت کی چیز ہے وہ آدمیوں سے اُس کو چھپاتا ہے (اور بعض اوقات، لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہونے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے بیوی کے پاس جانا اور قضاء حاجت کرنا وغیرہ وغیرہ) اور بارش اور دھوپ کی تکلیف سے بچانا ہے اور اُس میں خلوت کے ساتھ اپنے رب کی عبادت ہو سکتی ہے۔

اسی طرح دُنیا کے جس سامان کی بھی انسان کو ضرورت ہو جس سے آخرت کے کاموں میں مدد ملتی ہو وہ سب ثواب ہی ثواب ہے بشرطیکہ ضرورت کے موافق ہو (زیادہ نہ ہو) ورنہ خواہش نفس کے لیے ہو گا اور نفسانیات میں شامل ہو کر دوسری قسم میں داخل ہو جائے گا۔ اس لیے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ازواج مطہرات کے گھروں کو مسجد نبوی میں شامل کیا۔ بعض صحابہ نے فرمایا کاش! ان مکانات کو اُن کے حال ہی پر چھوڑ دیا جاتا (مسجد میں شامل نہ کیا جاتا) تاکہ اس اُمت کے پچھلے لوگ بھی اپنے نبی کے گھروں کو دیکھ لیتے کہ وہ کس شان کے تھے۔ دیکھ کر ان کی سادگی اور بے تکلفی اور قدر ضرورت کے موافق ہونے سے سبق حاصل کرتے (اُن کی بلندی قد آدم سے صرف ایک ہاتھ کی لمبائی کے برابر زیادہ تھی۔ اسی طرح آپ نے فرمایا ہے میرا منبر سو منبر میں سے اگرچہ کچھ ترفع ہے مگر حضور نے منبر صرف دین کی ضرورت کے لیے بنوایا تھا کہ تمام حاضرین اللہ تعالیٰ کے احکام کو سُن سکیں اس لیے وہ ثواب ہی ثواب تھا۔

غرض انسان کو جس چیز کی اپنے دین کے لیے احتیاج ہو اور اُس میں دین کی مصلحت ہو وہ دُنیا نہیں ہے اگرچہ ظاہر میں سامان دُنیا کے مشابہ ہو۔ اسی علت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی اُسی وقت بنوائی جب آپ سے عرض کیا گیا کہ سلاطین روم کسی کے خط کو بدون مہر کے نہیں پڑھتے (اور دعوت اسلام کے لیے سلاطین عالم کے نام خطوط بھیجنے کی ضرورت تھی) تو آپ نے اس (دینی) غرض کے لیے انگوٹھی بنوائی۔ اس لیے علماء نے انگوٹھی پہننے میں اختلاف کیا

ہے کہ یہ ہر شخص کے لیے مطلقاً سُنت ہے یا صرف اُن ہی لوگوں کے لیے سُنت ہے جو صاحبِ حکومت ہوں جس نے اُس علت پر نظر کی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی بنوائی تھی اُس نے تو یہ کہا کہ انگوٹھی پہننا اُس کے لیے سنت ہے جس کو اس کی ضرورت ہو اور ضرورت کا ذکر اُوپر آچکا ہے اور جس نے صرف آپؐ کے فعل پر نظر کی علت پر نظر نہیں کی اُس نے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے وہ مطلقاً سنت ہے اسی لیے کسی نے کہا ہے ؎

الدین بالسنۃ محیاہ   فلا تقصد فی فعلک سواہ

واہ ذر عوائد سوء   قد انلفت واھلکت محیاہ

(ترجمہ) دین کی حیات سُنت سے ہے۔ پس اپنے افعال میں سُنت کے سوا اُن کے غیر کا قصد نہ کرو۔ بُری عادتوں سے بچو جو دین کی حیات کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں "

قولہ وفیہ دلیل علی ان ما ھو من ضرورۃ البشر لیس من الدنیا الی قولہ واھلکت محیاہ۔



باب شصت و چہارم ۶۴

حدیث

کراھۃ الرسول ان یبیت عندہ ذھب اولیبی

عقبہ بن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی جب آپ نے سلام پھیرا تو جلدی سے کھڑے ہو گئے اور اپنی ازواج میں سے کسی کے پاس تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے اور لوگوں کے چہرے سے آپ نے محسوس کیا کہ اُن کو آپ کے جلدی اُٹھ جانے سے تعجب ہُوا ہے تو فرمایا کہ مجھے نماز میں یاد آیا کہ ہمارے پاس کچھ سونا ہے تو مجھے پسند نہ ہُوا کہ شام کو یا رات کو وہ ہمارے پاس رہے اس لیے میں نے اُس کے تقسیم کر دینے کا حکم دیا۔

شرح حدیث سے معلوم ہُوا کہ نماز کے اندر جو بات یاد آئے اُس پر عمل کرنا جائز ہے جب کہ وہ بات ایسی ہو جس سے نماز میں (نقصان نہ آتا ہو بلکہ) صلاح و کمال حاصل ہوتا ہو اور نماز کو فاسد کرنے والی بھی نہ ہو اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۴۲) ایک طاعت میں مشغولی کے وقت دوسری طاعت کو سوچنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ ایک طاعت میں مشغول ہوتے ہُوئے دوسری طاعت کا ارادہ کرنا یا اُس کو سوچنا جائز ہے مگر اس میں تفصیل کی ضرورت ہے کہ کس چیز

کا یاد کرنا نماز کو فاسد کرتا ہے اور کس کا یاد کرنا فاسد نہیں کرتا جس کے لیے اُن خواطر کا اقسام کا جاننا ضروری ہے جو نماز کے اندر انسان کے دل پر وارد ہوتے ہیں

خواطر و وساوس کے اقسام

اور وہ چار قسم کے ہیں۔ نفسانی، شیطانی ملکی اور ربانی۔

خواطر ربانی تو نماز کے قبول ہونے کی علامت ہیں اور نماز پڑھنے والوں کا یہ اعلیٰ درجہ ہے کہ نماز میں اُن کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بات وارد ہو (دنیا (کی زندگی) کے اعتبار سے یہی مناجات کی حقیقت ہے (اور آخرت کے اعتبار سے مناجات کی حقیقت اس سے بھی اعلیٰ ہے) اور اس درجے کا میاب ہونے والے کچھ لوگ ہیں جو اس کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ جو اسی شان کے تھے اُن سے جب کوئی مرید یہ کہتا کہ میں نے نماز میں یا نماز کے بعد فلاں غرض کے لیے دعا کی تھی تو وہ اُس سے دریافت کرتے کہ تو نے دعا کے قبول ہونے کے متعلق کوئی جواب اور حضور قلب کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خطاب بھی سنا؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں سنا ہے تو سمجھ جاتے کہ اس کو خصوصیت والوں کے درجات میں سے کوئی درجہ حاصل ہے اور اگر کہتا کہ میں نے تو کچھ نہیں سنا تو اُس کو وہاں میں شمار کرتے اور فرماتے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اخلاص کے ساتھ خلوص قلب سے دعا کرے اور اپنی درخواست کا جواب نہ سنے یہ تو محال ہے۔ اُن کے نزدیک یہ عورت معاملات کی نہیں ہے تھی کیونکہ اُن کا حال یہی تھا کہ اُن کو حضور قلب کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب اور جواب مسموع ہوتا تھا اور اس صورت میں نماز سے قلب کو جس قدر راحت ملے گی ظاہر ہے) اسی حقیقت کی بناء پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جعلت قرۃ عینی فی الصلٰوۃ۔ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ نیز فرماتے ہیں ارحنا بھا یا بلال اے بلال! ہم کو نماز سے راحت پہنچاؤ۔ کیونکہ مجاہدہ کی پیاس شراب مناجات کی ٹھنڈک سے بجھ جاتی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گرمی (شوق و محبت) کو

سکون ہوتا تھا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اقرب مایکون العبد من ربه وهو ساجد فاکثروا فیه الدعاء فقمن ان یستجاب لکم۔

"بندہ کو اپنے رب کا زیادہ قرب سجدہ میں حاصل ہوتا ہے تو سجدہ میں دعا بہت کیا کرو یہ دعا اس قابل ہے کہ قبول کی جائے۔"

کیونکہ اس میں قرب و اتصال (کی شان) ہے اس کو اہل قرب ہی سمجھتے ہیں اور اُن ہی کے ساتھ یہ حال مخصوص ہے۔ اے اللہ! ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو بھی اس درجہ کا اہل بنادے ورنہ (کم از کم) ہم کو اُس کی تصدیق سے تو محروم نہ فرمائیے۔

اور خاطر ملکی وہ ہے جو کسی خیر کی طرف انسان کو رغبت دلائے جیسے وہ بات جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ پھر یہ خاطر کبھی تو ایسا ہوتا ہے جس پر تم کو عمل کرنا چاہئے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خشوع کا سبب بن جاتا ہے اور یہ بھی نماز کا اعلیٰ درجہ ہے یا اُس سے نماز کے اندر دوسرے منقطع ہو جاتے ہیں اور اس حالت میں نماز کا حسن ہی نہیا ہوگا۔ جب کہ دل اس میں اتنا مشغول نہ ہو کہ اُس سے نماز (کے ارکان و واجبات) میں خلل واقع ہو جائے کہ اس صورت میں نماز کا اعادہ کیا جائے گا۔ جیسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا کہ ایک بار آپ نے حضرت صحابہ رضی اللہ عنہم کو مغرب کی نماز پڑھائی اور اس میں قرأت نہ کی۔ بعد میں آپ سے اس کے متعلق عرض کیا گیا کہ آپ نے نماز میں قرأت نہیں کی (فرمایا رکوع اور سجدہ کیسا تھا کہا گیا اچھا تھا۔ فرمایا تو پھر کچھ حرج نہیں۔ یعنی شام کی طرف ایک لشکر کے تیار کرنے (کے خیال) میں رہا لوگوں کو ان کے مقامات پر متعین کیا اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے نماز کا اعادہ فرمایا۔ اسی لیے علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ اگر رکوع و سجود پوری طرح ادا ہو گیا ہو اور قرأت نہ کی گئی ہو تو نماز کا اعادہ واجب ہے یا نہیں (حنفیہ و شافعیہ کے نزدیک اعادہ واجب ہے کیونکہ قرأت بھی رکن صلوٰۃ ہے جس کے ترک سے نماز

باطل ہو جاتی ہے) اور اگر رکوع و سجدہ میں کچھ نقصان رہ گیا ہو تو اعادہ (بالاتفاق) ضروری ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک اعرابی سے جس نے نماز میں رکوع و سجود پوری طرح نہ کیا تھا، جلدی جلدی نماز پڑھی تھی) فرمایا ارجع فصل فانک لم تصل لوٹو پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی ۔ کیونکہ اس صورت میں ارکان کے اندر نقص رہ گیا ہے اور اگر خاطر نفسانی ہو تو اگر وہ ایسا خیال ہے جو نماز کے منافی ہے جیسے کسی جائز خواہش کو سوچنا (خواہ کھانے پینے کی قسم سے ہو یا بیوی بچوں کا خیال ہو وغیرہ وغیرہ) تو نماز کا اعادہ مستحب ہے ۔ کیونکہ نماز سے اصل مقصود (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور) حضور قلب اور لذاتِ نفس سے الگ ہونا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : ان اللہ لا یقبل عمل امرء حتی یکون قلبه مع جوارحه ۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کا عمل قبول نہیں فرماتے جب تک اُس کا دل اعضاء کے ساتھ نہ ہو (کہ جس طرح اُس کے اعضاء قیام و رکوع و سجود وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں ۔ اسی طرح اس کا دل بھی قیام و رکوع و سجود میں مشغول ہو کہ دل بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے بحالتِ قیام عرض معروض کرتا ہو ۔ اللہ کے سامنے عجز و نیاز کے ساتھ رکوع و سجود کرتا ہو) اب اگر قلب ان شہوتوں میں مشغول ہوا تو وہ کہاں اور نماز کہاں ؟ ہاں اگر یہ نفسانی خطرہ ایسا ہو کہ دل میں آیا پھر الگ کر دیا گیا اور اُس کی طرف التفات نہ ہوا تو ان شاء اللہ معزنہ ہو گا ۔ بشرطیکہ تکبیر تحریمہ اخلاص کے ساتھ (حضور قلب سے) کہی گئی ہو ۔ کیونکہ ہمیں بُرے خیالات کے دفع کرنے کا حکم ہے ۔ نماز میں بھی اور نماز سے باہر بھی ۔ مگر نماز میں اُن کے دفع کرنے کی زیادہ تاکید ہے ۔ اُسی علت کی وجہ سے جو اُوپر مذکور ہوئی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے احدث مع الذنب توبة السر بالسر والعلانیة بالعلانیة ۔ گناہ کے ساتھ جلدی سے توبہ کر دو ۔ مخفی گناہ سے مخفی طور سے توبہ کرو اور علانیہ سے علانیہ کرو (پس جب کوئی بُرا خیال دل میں آئے

اُس سے فوراً توجہ کو ہٹا لو یہی اُس کی توبہ ہے۔ اور اگر وہ خیال ناجائز شہوت (حرام خواہش) کا خیال ہوا تو نماز بالکل نہ ہو گی۔ کیونکہ طاعت اور معصیت جمع نہیں ہو سکتیں۔ جب ہم سے حضورِ قلب کے فوت ہونے پر یہ کچھ کہا گیا ہے جس کا اُوپر ذکر ہوا (کہ اللہ تعالیٰ ایسی نماز کو قبول نہیں فرماتے) تو اس بُری حالت کا تو کیا پوچھنا؟ اور اگر شیطانی خطرہ ہوا تو (اُس کی دو حالتیں ہیں) اگر اُس کی طرف دل مائل ہو گیا اُسی میں لگ گیا، اُس کی طرف متوجہ ہو گیا تو نماز فاسد ہے کیونکہ یہ بھی نفسانی خطرہ کی جنس سے ہے جو حرام خواہش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو خیال شہوانی ہو وہ نفسانی ہو گا اور جو معصیت کی قسم سے ہو وہ شیطانی ہو گا۔ اور اگر اُس کی طرف التفات نہ ہوا اُس سے استغفار کر لیا اور توجہ کو ہٹا لیا تو اُمید ہے کہ ان شاء اللہ نماز فاسد نہ ہو گی (یہ دوسری قسم ہے)۔

خواطر کی ایک قسم وہ ہے جو بطلان اور جواز کے درمیان ہے یہ وہ خواطر ہیں جو کثرت کے ساتھ دل میں آتے ہیں اور ان کے دفع کرنے سے غفلت کی جاتی ہے اور اُن میں (قصداً) دل کو مشغول بھی نہیں کیا جاتا۔ ان کے متعلق نہ اس پر کوئی دلیل ہے کہ اُن سے نماز فاسد ہو جاتی ہے نہ اُس کے عکس پر کوئی دلیل ہے۔

قوله منها جواز الامر بعمل طاعة وهو فی اخری الی قوله فلا دلیل لنا علی الفساد و لا علی ضده۔

ف خواطر نفسانی کی ایک قسم سے اور خواطر شیطانی سے مطلقاً نماز کا فاسد ہو جانا صوفیہ کا مذہب ہے۔ فقہاء کے نزدیک ان سے نماز فاسد نہیں ہوتی ناقص ہو جاتی ہے یعنی کامل درجہ میں قبول نہیں ہوتی اگرچہ درجۂ صحت میں قبول ہو جاتی ہے کہ اس شخص کو تارکِ صلوٰۃ شمار نہیں کیا جاتا نمازی مانا جاتا ہے۔ فقہاء کے نزدیک ارکان کے ترک سے نماز فاسد ہوتی ہے اور واجبات کے ترک سے واجب الاعادہ اور ترکِ خشوع سے مستحب للاعادہ ہوتی ہے۔

ف خشوع کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ نماز میں قصداً کوئی دنیوی خیال نہ لایا جائے

بلکہ اپنی طرف سے نماز ہی کی طرف توجہ رکھی جائے۔ اگر بلاقصد وسوسہ آئے تو خشوع کے لیے مضر نہیں اور اعلیٰ درجہ یہ ہے ان تعبد اللہ کانک تراہ اس طرح عبادت کرو جیسے خدا کو دیکھ رہے ہو۔ ان دونوں کے درمیان بہت سے درجات ہیں۔

(۱۲۳) نماز کے بعد کچھ دیر مصلے پر بیٹھنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہوا کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ نماز کے بعد (کچھ دیر) مسجد میں ٹھہرتے تھے (فوراً مصلے سے کھڑے نہ ہو جاتے تھے۔ یہ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلدی گھر میں تشریف لے جانے سے تعجب کیا۔ اگر یہ بات حضور کی عادت (شریفہ) کے خلاف نہ ہوتی تو صحابہ اس پر تعجب نہ فرماتے۔

قولہ و فیہ دلیل علی ان عادۃ سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم کانت للاقامۃ بعد الصلوٰۃ الی قولہ لم یتعجب منہ۔

ف اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ بھی نماز کے بعد فوراً مسجد سے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر رہتے تھے۔ کیونکہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر سے واپس تشریف لائے ہیں تو صحابہ بدستور اپنی حالت پر تھے۔ یہاں سے حضرات صوفیہ اور محققین علماء کی تائید ہوگئی جو نماز فجر اور عصر کے بعد کچھ دیر تک تسبیح وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں اہلِ ظاہر نے جو اس عمل سے انکار کیا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اشارات کلام تک رسائی نہیں اُن کا فہم ظاہر حدیث سے آگے نہیں بڑھتا۔

(۱۲۴) جو کسی بات کی طرف دعوت دیتا ہے وہی اُسپر غالب ہوتی ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جو کسی خیر کی طرف بُلاتا ہے اکثر اوقات وہی خیر اُس پر غالب ہوتی ہے تاکہ حال قول کے موافق ہو۔ چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُوسری حدیثوں میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی نماز کی جگہ بیٹھا رہے ملائکہ

اُس کو دُعا دیتے رہتے ہیں۔ نیز فرمایا ہے کہ ایک نماز کے بعد دُوسری نماز کا انتظار کرنا رہا ما ہے (یعنی سرحد اسلام کی حفاظت کے مثل ہے) چونکہ حضورؐ نے اس بات کی ترغیب دی ہے تو آپ کی حالت پر بھی اسی کا غلبہ تھا۔ صحابہ نے جب اس کے خلاف دیکھا تو اُن کو تعجب ہُوا۔ قولہ وفی ھذا دلیل علی ان یکون من یدعوالی خیر یغلب ذلک الخیر علیہ الی قولہ فلما رأوا منہ غیر ذلک تعجبوا۔

ف یہاں سے معلوم ہُوا کہ جن باتوں کی دوسروں کو ترغیب دی جائے اُس پر خود بھی اکثر اوقات عمل کرنا چاہیئے۔

(۱۲۵) حقِ صحبت یہ ہے کہ اہلِ صحبت کی تشویش کو زائل کیا جائے

حدیث سے معلوم ہوا کہ عادت کے خلاف کرنے سے دوستوں کو تشویش ہوتی ہے۔ جبکہ اُن کو اس کا سبب معلوم نہ ہو۔ چنانچہ صحابہ نے اسی وجہ سے تعجب کیا۔ نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ صحبت کا حق یہ ہے کہ اہلِ صحبت کی ادنیٰ تشویش کو بھی حتی الامکان دُور کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (اس واقعہ میں فوراً) واپس تشریف لائے اور صحابہ کو بتلا دیا کہ اس وقت (خلاف عادت) جلدی گھر والوں کے پاس کیوں تشریف لے گئے تھے۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان مخالفۃ العادۃ تقتضی التشویش علی الاخوان الی قولہ واخبارھم بسبب سرعۃ رجوعہ الی اھلہ۔

ف اس کا اہتمام حضرات صوفیہ کو سب سے زیادہ ہے اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ حسن معاشرت بھی دین کا بڑا جزو ہے۔

(۱۲۶) ظاہری حالت کے موافق برتاؤ کرنا درست ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ انسان کی ظاہری حالت کے موافق برتاؤ کرنا درست ہے گو اُس نے صاف طور سے اپنی حالت ظاہر نہ کی ہو اور سوال بھی نہ کیا ہو کیونکہ سیدنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کے چہروں میں تعجب کے آثار ملاحظہ فرمائے تو اُن کو اپنے فعل کا سبب بتلا دیا۔

کیفیتِ قلب کا اثر چہرے پر ظاہر ہو جاتا ہے

نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ قلب میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ بات اُسی پر مخفی رہ سکتی ہے جس کے دل میں نور نہ ہو اور نور سے مُراد وہ خاص نور ہے جو وارثانِ رسول کو عطا ہوتا ہے۔ ورنہ یوں تو ہر مُسلمان کو اپنے ایمان کے موافق کچھ نہ کچھ نور حاصل ہوتا ہی ہے (مگر وہ حالاتِ قلبیہ کے ادراک میں کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے خاص نور کی ضرورت ہے جو کمالِ ایمان سے حاصل ہوتا ہے) یہ اس سے مفہوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈال کر اُن کے دلوں کی حالت پر استدلال فرمایا۔ اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے المؤمن ینظر بنور اللہ (مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) جب وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھے گا تو چہرے کی علامات سے اُس پر دل کی حالت مخفی نہ رہے گی۔ اب اگر اس کا ایمان قوی ہُوا، تو وہ اصحابِ کشف سے ہوگا جو (دوسروں کے) دلوں کو اپنی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جیسا چہروں کو سر کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

قولہ وفیہ دلیل علی العمل بما یظہر من الشخص دون افصاحٍ وسوال الی قولہ کما یبصرون الوجوہ باعین رؤسھم۔

ف اس کو فراست کہا جاتا ہے جو احوالِ رفیعہ میں سے ہے گر مقاصد میں سے نہیں اس لیے جس کو عطا ہو جائے نعمتِ الٰہی کا شکر ادا کرے اور اُس کے فوت سے غمگین نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ حالات اور کیفیات اختیار سے باہر ہیں اور امورِ غیر اختیاریہ کے درپے ہونا پریشانی کا سبب ہے۔ شارح کے کلام سے شبہ ہوتا ہے کہ قوتِ ایمان کے لیے کشف لازم ہے مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں کیونکہ اہلِ طریق

کا اتفاق ہے کہ ولایت کے لیے کشف لازم نہیں۔ خوب سمجھ لو۔

(۱۶۷) کسی ضرورت سے اپنے نیک عمل کا بیان کرنا ریاء نہیں ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ (اپنے کسی) نیک کام کا ذکر کرنا ضرورت کے وقت جائز ہے اور اس سے حالت اخفا نہیں بدلتی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کی حالت (تشویش) ملاحظہ فرمائی تو (ازالہ تشویش کی ضرورت سے) اپنا وہ نیک کام ظاہر فرمادیا جو آپ نے گھر جا کر کیا تھا تاکہ اُن کے قلوب مطمئن ہو جائیں کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو شخص کسی نیک کام کو چُھپا کر کرے پھر (بلا ضرورت) اس کو (لوگوں کے سامنے) بیان کر دے تو وہ عمل دفتر علانیہ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے (کہ اب وہ ثواب نہ ملے گا جو اخفاءِ عمل سے ملتا ہے بلکہ علانیہ کام کرنے کا ثواب ملے گا) اور اگر اُس کو دوبارہ بیان کر دیا تو وہ دفتر ریاء کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے (اب ثواب باطل ہو کر گناہ لکھا جاتا ہے) اور اگر کسی ضرورت سے ظاہر کیا جائے جیسی یہاں موجود تھی یا اُس کے مشابہ اور کوئی ضرورت ہو اور اظہار سے اپنی تعریف اور ثناء کی نیت نہ ہو تو اُمید ہے کہ نیکی اپنی حالت پر رہے گی (ثواب اخفاء باطل نہ ہو گا)

شیطان کا ایک بڑا کید اہلِ توفیق نے تصریح کی ہے کہ شیطان کی چالوں میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ جب بندہ چُھپا کر کوئی کام کرتا ہے تو اُس سے کہتا ہے کہ اس کو لوگوں کے سامنے بیان کر دے تاکہ تیری اقتداء کی جاوے اور دوسروں کے عمل کا بھی تجھے ثواب ملے) چنانچہ وہ ایسا ضرور کرتا ہے اور اس طرح ریاء میں مُبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس کو خبر بھی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس خیال میں رہتا ہے کہ مجھے ثواب ملے گا جو کہ جہل مرکب ہے۔

قولہ و فیہ دلیل علیٰ جواز ذکر المعروف الی نیکون جھلا مرکبا۔

ف اقتداء کے لیے اپنے اعمال کا ظاہر کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ اس کا کام ہے جس کی نظر مخلوق سے اُٹھ جائے اور مدح و ذم اس کے نزدیک برابر ہو جائے۔

(۱۲۸) اپنے مال کو گھر والوں کی تحویل میں رکھنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ اپنے مال کو بیوی کے پاس رکھنا جائز ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمارے پاس کچھ سونا تھا حالانکہ وہ آپ کی بیوی کے پاس تھا اس لیے بعض ازواج کے پاس تشریف لے گئے اور اس کا (کسی حدیث سے) پتہ نہیں چلا کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی چیز ایسی بھی تھی جس کی آپ نے خود حفاظت کی ہو اور آپ کے سوا گھر والوں میں سے کسی کو اس کا پتہ نہ ہو۔ الغرض یہ بھی معلوم ہُوا کہ نیک کام میں دوسروں کو نائب کر دینا جائز ہے، چنانچہ حدیث میں آپ کا ارشاد موجود ہے کہ میں نے اُس کے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا (فوائد نفقہ یہ نیابت طاعت مالیہ کے ساتھ مخصوص ہے)

قوله وفيه دليل على ان للرجل ان يترك ماله عند اهله الى قوله

معلن عليه دون اهله ۰ وقوله فامرت بقسمة ۔

ف بعض حضرات صوفیہ کا اسی پر عمل ہے کہ روپیہ پیسہ اپنے پاس نہیں رکھتے گھر والوں کی تحویل میں رکھتے ہیں۔ اگر اُن کے گھر والے دیندار، دیانتدار ہوں تو ایسا کرنا درست ہے۔ جیسا حدیث سے معلوم ہُوا ورنہ خود حفاظت کرنا چاہیئے۔ جیسا ولا تؤتوا السفهاء اموالكم سے مفہوم ہوتا ہے کہ بیوقوفوں کو اپنے اموال نہ دو جس کی تفسیر عورتوں اور بچوں سے کی گئی ہے جس کو حفاظتِ مال کا سلیقہ نہ ہو۔

(۱۲۹) دن بھر مال کو اپنی مِلک میں رکھنا خلافِ زہد نہیں ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ مال کو دن بھر اپنی مِلک میں رکھنا جائز ہے اس سے متاع زہد باطل نہ ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ پسند نہ ہُوا کہ شام کو یا رات کو سونا ہمارے پاس رہے اور ایک دن رہنے سے آپ نے کراہت ظاہر نہیں فرمائی اور اس سے زہد کا مستحب ہونا بھی معلوم ہُوا چونکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر صرف کراہت کا اظہار فرمایا ہے اور کراہت کے ارتکاب میں گناہ نہیں ہوتا جس سے مال جمع کرنے کا جواز بھی مفہوم ہو رہا ہے۔ بشرطیکہ دشبہ بھی مطلق نہ کرتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زہد (باتوں سے نہیں ہوتا) صرف حال سے ہوتا ہے اور حسی ہوتا معنوی، زہد معنوی تو یہ ہے کہ دل کو مال سے تعلق نہ ہو اور حسی یہ ہے کہ مال کو علیحدہ کر دے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر کیا۔

قولہ فیہ دلیل علی جواز ابقاء المال علی ملک صاحبہ طول یومہ الی

قولہ واما الحسی فہو الخروج عنہ کما فعل سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم ھنا۔

(۱۳۰) اُن صُوفیہ کی دلیل جو رات کو اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے اس میں اُن صُوفیہ کی بھی

دلیل ہے جو کسی معلوم شئے پر رات نہیں گزارتے (یعنی رات کو وہ اپنے علم میں اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے) کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ ناگوار ہے کہ شام کو یا رات کو ہمارے پاس سونا رہے۔ میں نے اس طریقے کے ایک بزرگ کو دیکھا ہے کہ دن میں اُن کے پاس جو کچھ فتوحات آتیں رات کو اُن میں سے کچھ نہ رہتی تھی۔ ایک دن اُن کی زیارت کو بڑی جماعت آگئی اور اُس دن فتوحات بھی بہت ہوئیں تو خادم نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں تمام فتوحات کو شیخ پر ظاہر کر دوں گا تو اس جماعت کے لیے کچھ بھی نہ بچے گا وہ سب کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے اور یہ بہت بڑا مجمع ہے صبح کو ان کے ناشتے کے لیے بھی کچھ نہ ہوگا۔ ہمیں اُن کے واسطے ایک اچھی مقدار شیخ کو اطلاع کئے بغیر بچا لینا چاہیے جو کل کو اُنھیں کفایت کر سکے۔ چنانچہ اُس نے ویسا ہی کیا (کہ کچھ فتوحات بچا لیں) اور باقی کو سامنے کر دیا۔ لوگوں نے کھایا اور جو اُن سے بچا شیخ نے وقت کے موافق فقراء و مساکین میں اُس کے تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ جب صبح ہوئی تو اُن کے پاس کچھ فتوحات نہ آئیں اب وہ خادم کھڑا ہوا اور دسترخوان بچھا کر اس نے بہت سا کھانا مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے پوچھا یہ کہاں سے آیا؟ اُس نے سارا واقعہ بیان کر کے عرض کیا کہ حضرت اگر میں ایسا نہ کرتا اور آپ

معمول کے موافق سارا بچا ہوا کھانا خیرات کر دیتا) تو آج اس جماعت کے کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا۔ شیخ نے فرمایا (سبحان اللہ! کیسی اُلٹی سمجھ ہے) تمہاری اس حرکت نے ہی تو ہم کو آج کی فتوحات سے محروم کر دیا اگر تم سب بچا ہوا کھانا خیرات کر دیتے اور اللہ کے ساتھ جو معاملہ جاری تھا اس کو نہ بدلتے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا معاملہ نہ بدلتے جس نے کل اتنی بڑی جماعت کے کھانے کا اپنے خزانہ سے انتظام کیا تھا وہ آج اس سے عاجز نہ تھا مگر تم نے خلافِ معمول کھانا بچا کر آج کی فتوحات کا دروازہ بند کر دیا۔ غرض جو کوشش کرتا ہے وہ (مقصود کو) پا ہی لیتا ہے اور جو خلوص سے کام کرتا ہے اُس سے اخلاص کے موافق معاملہ کیا جاتا ہے پس (اخلاص کامل اختیار کرو کیونکہ) پرکھنے والا بڑی گہری نظر والا ہے اور معاملہ ایسے کریم کے ساتھ ہے جو وعدہ کا پُورا اور غنی اور مہربان ہے۔ اس لیے کسی نے کہا ہے کہ جس بات سے تم چاہو پہنچو۔ اللہ تعالیٰ کو حقیقت کا پُورا علم ہے (وہ دلوں کے اسرار اور نیتوں سے خبر دار ہیں۔ مخلص اور غیر مخلص مومن اور منافق وہاں نہیں چھپ سکتا) قولہ وفیہ دلیل لاهل المعرفة الذین لا یبیتون علی معلوم الی قولہ فقد بان للحق بالحقیقة علم ۔

ف شیخ سے اخفاء حال کرکے معمولاتِ خانقاہ کو بدلنا بڑا جرم ہے اس سے فتوحات بند ہو جاتی ہیں اور نظام میں بے برکتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کو اس مُرید کی طرح آئندہ کے متعلق کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اسلم یہ ہے کہ شیخ کو اپنے وسوسے سے مطلع کرکے یہ عرض کر دے کہ میری رائے میں کل کے واسطے کچھ بچا لینا مناسب ہے۔ اگر شیخ اس رائے کو قبول کرے بجائے نہ قبول کرے تو اُس کے قول پر عمل کرے اور اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھے کہ آئندہ آج سے زیادہ فتوحات ہوں گی اور اگر بالفرض فتوحات نہ ہوں تو ایک دن کے فاقہ سے موت تو نہ آجائے گا۔ اتنی سی بات کے لیے شیخ کے معمول کو بدلنا اور اخفاءِ حال سے اُس کو مکدر کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

باب شصت وپنجم ۶۵

حدیث

قضاء النافلة فی وقت الکراهة

کریب (مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے (ام المؤمنین حضرت) ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے عصر کے بعد دو رکعتیں (نفل) پڑھنے کے متعلق سوال کیا (کہ یہ جائز ہے یا نہیں) حضرت ام سلمہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا کہ آپ اس سے منع فرماتے تھے۔ پھر میں نے (ایک دن) دیکھا کہ آپ نے جب عصر کی نماز پڑھی اور میرے گھر میں تشریف لائے تو دو رکعتیں پڑھنے لگے اس وقت میرے پاس انصار کے قبیلۂ بنو حرام کی کچھ عورتیں بیٹھی تھیں (تو میں خود آپ کے پاس نہ جا سکی بلکہ) میں نے ایک لڑکی کو آپ کے پاس بھیجا اور اُس کو سمجھا دیا کہ تو حضورؐ کے پہلو میں (آپ کے پاس) جا کر کھڑی ہو جانا۔ پھر عرض کرنا کہ ام سلمہ کہتی ہیں یا رسول اللہ! میں نے تو آپ سے یہ سُنا تھا کہ آپ ان دو رکعتوں سے منع فرماتے تھے اور (اب) میں دیکھتی ہوں کہ آپ (عصر کے بعد) یہ دو رکعتیں پڑھ رہے ہیں؟ اس پر اگر آپ ہاتھ سے اشارہ فرمائیں تو پیچھے ہٹ جانا۔ چنانچہ لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا تو وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا اے ابو امیہ! کی بیٹی (حضرت ام سلمہ مراد ہیں) تم نے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے متعلق دریافت کیا ہے تو بات یہ ہے کہ میرے پاس قبیلۂ عبد القیس کے کچھ لوگ آ گئے تھے اُنہوں نے مجھے ان دو رکعتوں سے مشغول کر دیا جو ظہر کے بعد

(پڑھی جاتی) ہیں سو یہ دو رکعتیں وہی[عہ] (ظہر والی) ہیں (عصر کے بعد والی نہیں ہیں جن سے منع کیا گیا ہے)

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد نفل نماز جائز ہے جبکہ ظہر کے بعد کی سنتیں فوت ہوگئی ہوں۔ امام شافعی کا مذہب تو یہ ہے کہ عصر کے بعد مطلقاً نفل نماز جائز ہے خواہ ظہر کے بعد کی سنتیں فوت ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں۔ مگر حدیث[عہ] میں اس قول کے لیے کچھ حجت نہیں۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل نماز دوسروں کی نفل جیسی نہیں۔ کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ آپ جب کوئی عمل کرتے تھے اُس پر دوام کرتے تھے تو آپ کی نفل نماز دوسروں کی نفل نماز کے مثل (واجب) ہوتی تھی۔ دوسری حدیث کے صریح الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے فرمایا لوگوں نے مجھے ظہر کی دو رکعتوں سے مشغول کر دیا تھا تو مَیں نے اُن کی قضاء کی ہے اور قوت کلام کا درجہ اہلِ زبان کے نزدیک نص کے برابر ہے اور اس کلام کی قوت اور شوکت بتلا رہی ہے کہ آپ کا یہ فعل اُس نہی کا ناقض یا ناسخ نہیں ہے۔ جو عصر کے بعد نفل نماز پڑھنے کے متعلق پہلے سے موجود تھی بلکہ آپ کا یہ فعل خاص علت کی وجہ سے تھا جو حدیث میں مذکور ہے اور نہی اپنے حال پر باقی ہے۔ اُس کا حکم بھی دائمی ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کا کوئی منصف

عہ نسائی اور طحاوی کی روایت میں یہ بھی ہے فقلت یا رسول اللہ انقضیهما اذا فاتتنا قال لا۔ حضرت ام سلمہ کہتی ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم بھی ظہر کی دو رکعتوں کی (عصر کے بعد) قضاء کر لیا کریں جو کبھی ہم سے فوت ہو جاویں۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ کذا فی اعلاء السنن ۲۳ ۲

عہ اس حدیث کی شرح میں حضرت شارح رحمۃ اللہ علیہ نے بہت طویل کلام کیا ہے۔ میں نے اس کا خلاصہ یہاں اس لیے بیان کر دیا تاکہ مدعیان اجتہاد کو معلوم ہو جاوے کہ تفقہ اور اجتہاد کسے کہتے ہیں محض حدیث کا ترجمہ کر لینے سے اجتہاد کا درجہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بس ائمہ مجتہدین کا قول کسی حدیث صحیح کے خلاف دیکھ کر اُن پر طعن کرنا نری جہالت ہے کیونکہ وہ ظاہر میں ہی خلاف ہوتا ہے حقیقت میں خلاف نہیں ہوتا ہے۔

انکار نہیں کر سکتا۔ اس لیے امام مالک (اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) کا مذہب یہ ہے کہ یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ آپ نے نوافل کو اپنے ذمہ لازم کر لیا تھا۔ دوسرے ایسا نہیں کر سکتے اُن کو نہی پر عمل کرنا چاہیئے جس کا حکم باقی اور مستمر ہے البتہ لفظ حدیث پر بحث کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کر کے نوافل کو اپنے ذمہ لازم کر لے۔ پھر کسی عذر کی وجہ سے ظہر کی رکعتیں رہ جائیں اور عذر اتنا ممتد ہو جائے کہ ظہر کا وقت نکل جائے تو اُس کو عصر کے بعد اُن کی قضاء جائز ہے۔ جیسا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة۔ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اچھی اقتداء ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی ایک سوال پھر باقی رہے گا وہ یہ کہ عصر کے بعد نوافل ظہر کی قضا کرنا ہر عذر میں جائز ہے خواہ کیسا ہی عذر ہو؟ یا اسی عذر کے ساتھ خاص ہے۔ جو رسول اللہ صلعم کو پیش آیا تھا کہ آپؐ اُن لوگوں کو مسلمان کرنے میں مشغول تھے اُن کے دل میں اصولِ شریعت کو جما رہے تھے جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے۔ اگر ہم عموم کے قائل ہوں تو ہر عذر میں اس فعل کو جائز کہا جائے گا اور اگر اسی عذر کے ساتھ حکم کو خاص کریں تو جب تک کسی کو ایسا ہی عذر واقع نہ ہو اس فعل سے منع کیا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو ایسا عذر پیش آنا شاذ و نادر ہی ہے خصوصاً اس زمانہ میں تو شاید ہی کسی کو ایسا عذر پیش آتا ہوگا اور اگر پیش بھی آئے تو اُس کی جگہ

عہ مگر خود یہ مسئلہ محل کلام ہے کہ نوافل کو بطور نذر کے اپنے ذمے لازم کر لینا مناسب ہے یا نہیں؟ سو ظاہر یہ ہے کہ ایسا کرنا بہتر نہیں کیونکہ اگر یہ صورت افضل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت فجر اور عصر کے بعد نوافل سے منع فرمایا تھا اسی وقت یہ بھی بتلا دیتے کہ اگر کوئی ان اوقات میں نفل پڑھنا چاہے تو وہ نذر کے طور پر اپنے ذمے کچھ رکعتیں لازم کر لیا کرے پھر اُن کو ان اوقات میں پڑھ سکتا ہے۔ صحابہ سے بھی اس کا ثبوت نہیں کہ اُنھوں نے نوافل کو بطور نذر کے اپنے ذمے لیا ہو واللہ تعالیٰ اعلم ملاظ۔

دوسرے اس خدمت کو انجام دینے والے بہت مل جائیں گے۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی کو دوسرا اس خدمت کا انجام دینے والا نہ ملے تو (جواز کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر) یہ بہت ہی نادر ہے اور (مثل مشہور ہے النادر کالمعدوم) اس کے لیے کوئی حکم نہیں مقرر ہو سکتا۔ اسی بناء پر (واللہ اعلم امام مالک) (وابو حنیفہؒ) نے اس حکم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے (اور نسائی کی حدیث میں جو زیادت ہے وہ اس تخصیص کی صریح مؤید ہے)

(۱۳۱) چھوٹے بڑوں کے فعل پر سوال وارد کر سکتے ہیں حدیث سے معلوم ہُوا

کہ مفضول فاضل پر (یعنی خورد اپنے بزرگ پر) سوال (وارد) کر سکتا ہے جب اُس سے کوئی ایسی بات دیکھے جو اُس کی عادت دائمہ (اور ہمیشہ کے معمول) کے خلاف ہے چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اسی بناء پر) استفسار کیا تھا اور (ظاہر ہے کہ) حضور کے زمانے میں اور بعد میں بھی سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چھوٹے ہی ہیں۔

قولہ فیہ دلیل علی جواز استفہام المفضول علی الفاضل الی قولہ بالنسبۃ الیہ علیہ السلام مفضولون۔

ف مگر چھوٹوں کو بزرگوں کے کسی فعل پر سوال نہایت ادب سے کرنا چاہیئے جیسا حضرت ام سلمہؓ نے کیا۔ صوفیہ میں بعض حضرات قوال بالمعروف مشہور ہیں وہ اپنے بزرگوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ یہ حدیث اُن کی دلیل ہے مگر یہ درجہ اسی کے لیے ہے جس کو طرق آداب کی رعایت معلوم ہو۔

(۱۳۲) سوال سے پہلے منشاء سوال کی تحقیق لازم ہے یہ بھی معلوم ہُوا کہ سوال

سے پہلے منشاء سوال کی تحقیق کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ نے عرض کیا کہ مَیں آپ کو عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتا ہُوا دیکھ رہی ہوں (اس قول سے تحقیق حال ہی

مقصود تھی کہ اگر یہ نماز کوئی اور نماز ہے تو پھر کوئی اشکال نہیں اور منشاء سوال کی تحقیق اس لیے مزید ہے کہ) شاید وہاں کوئی ایسی بات موجود ہو جو ظاہر بین کی نظر سے مخفی ہو (جس کے معلوم ہو جانے کے بعد سوال وارد ہی نہ ہو) جیسا بیان (واقعۂ حدیث میں) ہوا کہ حضرت ام سلمہ نے حضور کی نماز کو عصر کے بعد کی رکعتوں پر محمول کیا تھا۔ جس سے ممانعت ہو چکی تھی۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ قضاء نماز تھی عصر کے بعد نفل نہ تھی۔

سوال میں تاخیر مناسب نہیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سوال میں تاخیر مناسب نہیں بلکہ جلدی کرنا ہی بہتر ہے (خصوصاً جب کسی فعل پر سوال ہو تو ابتداء فعل کے ساتھ ہی سوال کرنا چاہیے۔ تاکہ اگر وہ فعل نسیان یا خطا کی وجہ سے ہو رہا ہے تو اُس کی تلافی ہو سکے۔ کام کر لینے کے بعد بجز استغفار کے تلافی نہ ہو سکے گی) چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافِ عادت ایک عمل کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے سوال میں تاخیر نہیں کی نہ اُس کا انتظار کیا کہ آپؐ نماز سے فارغ ہو جائیں تو سوال کروں۔ بلکہ اُس وقت سوال میں جلدی کی حالانکہ وہ خود بھی مشغول تھیں (کہ مہمانوں کی خاطرداری کی وجہ سے خود دریافت کے لیے نہیں جا سکیں باندی کو بھیجا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی (نماز میں) مشغول تھے (مگر سوال اس نماز ہی کے متعلق تھا اس لیے مؤخر نہیں کیا گیا۔ اگر کسی اور عمل کے متعلق ہوتا تو نماز سے فراغت تک مؤخر کرنا لازم تھا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ (کے اس فعل) پر انکار نہیں فرمایا تھا (تو ثابت ہوا کہ جس عمل میں اشکال واقع ہو اُس پر ابتداء عمل ہی میں سوال کرنا درست ہے)۔

قولہ فیہ دلیل علی ان الاستفہام لا یکون الا بعد التحقیق الی قولہ ولم ینکرہ علیہ السلام علیہا بعد۔

(۱۳۳) نمازی سے اس کی نماز کے متعلق بات کرسکتے ہیں

یہ بھی معلوم ہُوا کہ نماز کی حالت میں نمازی سے ایسی بات کی نسبت سوال کیا جاسکتا ہے جس کا مرتبہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے نماز ہی میں آپ سے سوال کیا۔ کیونکہ اگر نماز سے فراغت تک سوال کو مؤخر کیا جاتا تو سوال بے فائدہ ہو جاتا (کیونکہ مقصود سوال سے یہ تھا کہ اگر آپ بھول سے یہ نماز پڑھ رہے ہیں تو اس کو ترک کردیں اور ظاہر ہے کہ یہ مقصود نماز کے بعد حاصل نہ ہو سکتا تھا)۔

نماز میں اشارہ سے بات کا جواب دینا درست ہے

یہ بھی معلوم ہُوا کہ نماز میں سوال کا جواب اشارہ سے دیا جاسکتا ہے۔ اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی (اور ناقص بھی نہیں ہوتی) بشرطیکہ تھوڑا سا اشارہ ہو (جس میں عمل کثیر کی نوبت نہ آئے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب باندی نے (نماز کے اندر) گفتگو کی تو آپ نے دست مبارک سے اُس کو اشارہ کیا کہ پیچھے کھڑی ہو جائے۔

احکامِ شرعیہ دریافت کرنے کے لیے جاہل کو مقصد بنا سکتے ہیں، بشرطیکہ اُسے آداب بتلا دیئے جاویں

یہ بھی معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ دریافت کرنے کے لیے کسی ناواقف (ان پڑھ) کو قاصد بنا سکتے ہیں بشرطیکہ اُس کو اُن آداب کی تعلیم کردی جائے جو اس حکم کے (دریافت کرنے کے) متعلق (شرعاً ضروری ہیں۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے جب اس باندی کو بھیجا تو اُس کو سب کچھ بتلا دیا کہ تجھ کو کیا کہنا چاہیئے اور کس طرح کرنا چاہیئے۔

قولہ وفیہ دلیل علی جواز السوال لمن ھو فی الصلوۃ الیٰ قولہ ما تقول وما تفعل۔

ف احادیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ مہمان کی (بڑی) حُرمت ہے (اُس کا احترام کرنا چاہیئے) دیکھو حضرت ام سلمہ کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے (اور بلا واسطہ سوال کرنے) سے اسی بات نے تو روکا کہ وہ ان عورتوں (کی خاطر داری) میں مشغول تھیں جو اُن کی زیارت (اور ملاقات) کو آئی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورتوں کا ایک دوسرے کی ملاقات کو جانا جائز ہے بشرطیکہ اس میں کسی حرام یا مکروہ کا ارتکاب نہ ہو۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو دیکھ لیتے جو آپ کے بعد عورتوں نے ایجاد کی ہیں تو اُن کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے تو جب (ان حرکتوں کی وجہ سے) اُن کو مسجدوں سے روک دیا گیا تو اور مقامات سے بدرجۂ اولیٰ روکا جائے گا۔

گھر والوں کے سامنے نفلیں پڑھنے میں ریاء کا اندیشہ نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ گھر والوں کے سامنے نفل نماز پڑھنا جائز ہے (یعنی اس میں ریا کا اندیشہ نہیں نہ یہ خلوت کے منافی ہے۔ کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ کے سامنے نماز نہ پڑھی ہوتی تو اُن کو آپ کی نماز کا علم ہی نہ ہوتا (پس یہ جو کہا گیا ہے کہ نوافل مسجد میں نہ پڑھے جائیں بلکہ گھر میں پڑھے جائیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھر میں گھر والوں سے چھپ کر پڑھے جائیں اور راز اس میں یہ ہے کہ ریاء کا خطرہ وہاں ہوتا ہے جہاں عمل کے دیکھنے والے ایسے لوگ ہوں جن کا اپنے سے افضل ہونا طبعاً گوارا نہیں ہوتا بلکہ اُن پر اپنی فوقیت اور فضیلت کی طبعاً خواہش ہوتی ہے اور اپنے گھر والوں پر فوقیت وفضیلت کی خواہش نہیں ہوتی بلکہ اُن کا فضائل دنیویہ یا دینیہ میں بڑھ جانا انسان کو طبعاً گوارا ہے۔ کسی کی بیوی یا بچّے اُس سے بھی زیادہ صاحب ولایت وفضیلت بن جائیں تو اُس سے اُس کو طبعاً خوشی ہوتی ہے ناگواری نہیں ہوتی اس لیے اُن کے سامنے نفلیں پڑھنے میں ریاء نہیں ہوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو مسجد اور گھر ہر جگہ برابر تھی آپ کو کسی جگہ بھی ریا کا خطرہ نہ تھا مگر آپ کا عمل اس طریقہ پر ہُوا کرتا تھا جس کے اتباع میں اُمت کے لیے

بھی کچھ خطرہ نہ ہو خوب سمجھ لو)

قولہ فیہ دلیل علی ان العصیف حرمۃ الی قولہ ما عنت بہ۔

ف عورتوں کا باہم ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے جانا عام حالات میں تو کچھ زیادہ بُرا نہیں بشرطیکہ غیبت و شکایت کی باتیں نہ کریں۔ نماز کو دقت سے مؤخر نہ کریں لیکن تقریبات میں اُن کا جمع ہونا مفاسد سے خالی نہیں۔ اکثر بے پردگی بھی ہوتی ہے اور نمازیں بھی برباد ہوتی ہیں۔

(۱۳۵) بلاضرورت نمازی کے پاس کھڑا ہونا مکروہ ہے حدیث سے معلوم ہوا

بلاضرورت نمازی کے پاس (کھڑا ہونا یا) بیٹھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے باندی کو اشارہ کیا کہ آپ کے پیچھے کھڑی ہو جائے اور معلوم ہے کہ اُس سے کچھ نہ کچھ تشویش (ضرور) ہوتی ہے۔

تولہ فیہ دلیل علی کراھۃ القرب من المصلی الی قولہ تشویش ما۔

ف آج کل لوگوں میں عام مرض ہے کہ کسی سے ملنا ہوتا ہے اور وہ نماز میں مشغول ہے تو اُس کے پاس جاکر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت دام مجدہم کو یہ حرکت بہت ناگوار ہوتی ہے۔ یہ حدیث اُن کی حجت ہے۔

(۱۳۶) اگر نمازی سے کوئی ضروری بات نماز ہی کے اندر کہنا ہو تو اُس کے پہلو میں کھڑا ہو کر کہے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر نماز ہی کی حالت

میں نمازی سے کچھ کہنا ہو تو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ نمازی کے پہلو میں قریب جاکر بات کرے کیونکہ حضرت ام سلمہؓ نے باندی سے یہی فرمایا کہ حضورؐ کے پہلو میں کھڑے ہو کر عرض کرنا۔ قیاس فہمی بھی اسی کو مقتضی ہے کیونکہ اگر یہ شخص پہلو میں کھڑا ہو کر بات کرے گا تو نمازی گوشۂ چشم سے دیکھ کر اسے پہچان لے گا

اور ادنیٰ اشارہ سے جواب دے دیگا۔ اگر سامنے کھڑا ہوگا تو وہ اس کو اپنے آگے سے ہٹائے گا کیونکہ وہ سامنے گزرنے والا ہوگا اور اس کے لیے دفع کا حکم ہے) اور اگر پیچھے یا کچھ دور کھڑا ہوگا تو بعض دفعہ پہچاننا دشوار ہوگا اور پہچان بھی لیا تو دُور ہونے کی وجہ سے اُس کی بات پر توجہ نہ ہو سکے گی جس سے نمازی کو تشویش (اور پریشانی لاحق) ہوگی اور ایسی حالت میں اشارہ سے جواب دینا بھی بعض دفعہ آسان نہ ہوگا۔

قولہ فیا، دیا، علی ان ادب من یسائی الی قولہ لاتمکن الاشارۃ الیہ الابمشقۃ

ف سبحان اللہ! یہی آداب ہیں جن کی شریعت نے تشویش اور پریشانی سے بچانے کے لیے تعلیم کی ہے ان آداب کو دیکھ کر بے ساختہ ہر شخص شریعتِ اسلامیہ کی نسبت یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

شریعت نے تو مُسلمانوں کو ادنیٰ ادنیٰ تشویش سے بچانے کا اس قدر اہتمام کیا ہے مگر اب عوام اور خواص سب ہی اُس سے بے پرواہ ہیں اُن کی حرکات سے کسی پر پریشانی کا پہاڑ بھی ٹوٹ پڑے تو پرواہ نہیں کرتے اسی کا نتیجہ ہے کہ باہم وہ اُلفت و محبت باقی نہیں جو کبھی مُسلمانوں کے ساتھ مخصوص تھی فالی اللہ المشتکی۔

(۱۳۷) عورتوں سے علم حاصل کرنا جائز ہے جبکہ اس کی اہل ہوں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورتوں سے (شریعت یا طریقت کا) علم حاصل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ راوی نے حضرت ام سلمہؓ سے یہ مسئلہ (مذکورہ) دریافت کیا اور اُن پر اعتماد کیا لیکن (عورتوں سے علم حاصل کرنے میں) یہ شرط ہے کہ اُن میں اس کی اہلیت ہو چنانچہ حضرت ام سلمہؓ میں یہ اہلیت (بدرجہ کمال) موجود تھی (اور یہ شرط مردوں سے علم حاصل کرنے میں بھی ہے مگر ان میں بکثرت قابل ہوتے ہیں

اس لیے تعرض کی ضرورت نہیں ۔ عورتوں میں قابل کم ہوتی ہیں اس لیے شرط کی تعرض کر دی گئی) اور اس سے حضرات سلف (صالحین) رضی اللہ عنہم کا اہتمام بالدین بھی ظاہر ہے (کہ اُن کو دین کا کس قدر اہتمام تھا کہ راوی کو جس بات کا علم نہ تھا اس کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا (بے فکری کے ساتھ اُس کو ٹالا نہیں ، بلکہ حکم شرعی معلوم کرنے کی فکر میں رہے) اور یہ حضرات کبھی ایسے ہی تھے خدا اُن سے راضی ہو کہ ایک ایک حدیث کے لیے کئی کئی دن کا (بلکہ مہینوں کا) سفر کرتے تھے اسی لیے کسی نے کہا ہے اذا کان لک بالدین اهتمام فنعم المعان لك تدر وان اضعته فما خطرك في الوجود به خطر ۔ جب تک تم کو دین کا اہتمام ہے تو بلند مقامات (میں) تمہارے لیے عزت ہے اور اگر دین کو برباد کر دیا تو پھر جو حالت بھی تم کو پیش آئے اُس میں خطرہ (ہی خطرہ) ہے ۔ قوله وفيه دليل على جواز اذا العلم من النسا ان قرأه فمه خطا اذ في الوجود به خطر ۔

ف اس سے اُن صوفیہ کی حجت ظاہر ہو گئی جنہوں نے بعض بزرگ عورتوں سے استفادہ کیا ہے پہلے زمانے میں جب مسلمانوں کے دن پہلے تھے عورتیں علوم ظاہرہ و باطنہ دونوں میں مردوں کی طرح کمال حاصل کرتی تھیں ۔ آج کل مسلمان عورتوں نے علم کی طرف سے ایسی غفلت برتی ہے کہ گویا کبھی ان کو علم سے مَس ہی نہ تھا اگر کچھ عورتوں کو علم کا شوق ہوتا بھی ہے تو اسکولوں میں انگریزی پڑھنے کا شوق ہوتا ہے جو روز بروز ترقی پا رہا ہے مگر اس کو علم کہنا ہی علم کی توہین ہے آج کل جہل کا نام لوگوں نے علم رکھ دیا ہے ۔ بیت

علیکہ رہ بجی نتماید جہالت ست

مردوں کو بھی آج کل علم دین کا اہتمام نہیں البتہ اگر کسی کے دس پانچ لڑکوں میں کوئی کودن بے وقوف ہوتا ہے جس سے امتحانات پاس کرنے کی اُمید نہیں ہوتی اور اس لیے اس کی تعلیم پہ روپیہ خرچ کرنا بھی گوارا نہیں ہوتا تو مری بکری خواہ خضر کے نام اُس کو عربی پڑھنے اور علم دین حاصل کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں پھر ہمارے

بھائی شکایت کرتے ہیں کہ آج کل رازی اور غزالی کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ بھلا ان نلائقوں اور بے وقوفوں کو کوئی رازی اور غزالی کیونکر بنادے گا۔ جو علمِ دین کے واسطے چھانٹ چھانٹ کر بھیجے جاتے ہیں۔ قوم کو کچھ تو انصاف کرنا چاہیئے اور اپنی اس غفلت اور بے حسی پر کچھ تو شرمانا چاہیئے کہ دین کے ساتھ اس کا کیا برتاؤ ہو رہا ہے؟ اس بے پرواہی کا نتیجہ بہت کچھ ہمارے سامنے آچکا ہے تو اس غلطی کا اعادہ نہ ہونا چاہیئے۔

باب شصت و ششم[۶۶]

حدیث

سبعۃ اوامر و سبعۃ نواھی

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم فرمایا، اور سات سے منع فرمایا۔ جنازہ کے ساتھ چلنے کا ہم کو حکم دیا اور بیمار کی عیادت کا اور دعوت کرنے والی کی دعوت منظور کرنے کا (مراد ولیمہ کی دعوت ہے) اور مظلوم کی مدد کرنے کا اور قسم پورا کرنے کا اور سلام کا جواب دینے کا اور چھینکنے والے کو دُعاء دینے کا (بشرطیکہ وہ بھی اول اللہ تعالےٰ کی حمد کرے یعنی الحمد للہ کہے تو سُننے والوں کو یرحمک اللہ کہنا چاہئے اگر وہ حمد نہ کرے یا آہستہ کرے تو دُعا دینا لازم نہیں۔ اور ہم کو چاندی کے برتن (استعمال کرنے) سے منع فرمایا اور سونے کی انگوٹھی (پہننے) سے اور حریر و دیباج اور پارچہ قسی و استبرق اور سُرخ (ریشمی) رومالوں سے بھی۔

شرح حدیث کا ظاہری مطلب واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سات باتوں کا حکم دیا ہے اور سات سے منع فرمایا ہے (مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ امر و نہی کا ان ہی میں انحصار ہو گیا۔ مراد یہ ہے کہ صحابی کو اُس وقت ان امور کے متعلق حکم شرعی ظاہر کرنے کی ضرورت کسی وجہ سے زیادہ معلوم ہُوئی تو اُن کے شمار کے ساتھ بیان فرما دیا کیونکہ شمار یاد کر لینے سے مضمون کا یاد کرنا آسان ہو جاتا ہے)

اب سوال یہ ہے کہ جن امور کا اس حدیث میں حکم ہُوا ہے کیا سب کا ایک ہی درجہ ہے؟ اور وہ درجہ کیا ہے؟ وجوب ہے یا استحباب؟ اسی طرح جن امور سے نہی وارد ہُوئی ہے وہ سب حرام ہیں یا مکروہ؟ جواب یہ ہے کہ جن چیزوں کا یہاں امر ہُوا ہے سب واجب نہیں بلکہ بعض واجب ہیں بعض مستحب۔ چنانچہ جنازہ کے ساتھ جانا مستحب ہے کسی کو اس کو واجب کہنا معلوم نہیں ہُوا۔ البتہ اگر جنازہ کا اُٹھانے والا اور نماز پڑھ کر دفن کرنے والا کوئی نہ ہو تو جو لوگ اس حالت سے واقف ہیں اُن پر فرض عین ہو جائے گا۔ اسی طرح بیمار کی عیادت مستحب ہے اور اگر کوئی تیمارداری کرنے والا نہ ہو تو فرض کفایہ ہے (اور جن کو علم ہو جائے کہ کوئی بیمار کو نہیں پُوچھتا اُن پر فرض عین ہے) دعوت کا قبول کرنا مطلقاً واجب نہیں صرف دعوتِ ولیمہ کا قبول کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہاں کوئی ایسا لہو ولعب نہ ہو جو شرعاً حرام ہے۔ اگر ایسی صُورت ہو تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں اور جس صُورت میں واجب بھی ہے اُس میں بھی کھانا واجب نہیں۔ صرف شرکت واجب ہے کھانے میں اختیار ہے خواہ کھاؤ یا نہ کھاؤ (اور دُعاء کر کے مبارکباد دے کر واپس آجاؤ کھانے سے عذر کر دو)۔

اس کے علاوہ اور دعوتوں میں تفصیل ہے بعض کا قبول کرنا مستحب ہے بعض کا مباح بعض کا حرام (تفصیل علماء سے معلوم کی جائے یا کتب فقہ کی مراجعت کی جائے)

مظلوم کی مدد کرنا واجب ہے اسی طرح قسم کا پُورا کرنا واجب ہے (اگر اپنی ہی قسم ہے تو اُس کے واجب ہونے میں اختلاف نہیں۔ اگر دُوسرے نے قسم دی ہے تو اس میں اختلاف ہے کہ اُس کا پُورا کرنا واجب ہے یا نہیں اور حق یہ ہے کہ اگر اُس نے کسی امر واجب کی قسم دی ہے تو پُورا کرنا واجب ہے مثلاً یوں کہے کہ تجھے خدا کی قسم نماز ضرور پڑھا کر اور اگر کسی مستحب کام کی قسم دی ہے تو قسم کا پُورا کرنا مستحب ہے اور مکروہ یا حرام کام کی قسم دی ہے تو اُس کا پُورا کرنا مکروہ یا حرام ہے۔ سلام کا جواب دینا واجب ہے اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہُوا (البتہ اگر کسی نے

مجمع کو سلام کیا ہے تو ہر اک پر جواب واجب نہیں سب پر فرض کفایہ ہے ایک کا جواب سب کی طرف سے جواب ہو جائے گا اور سب ہی جواب دے دیں تو بہتر ہے اور چھینکنے والے کو دُعا دینا سُنت مؤکدہ ہے جو شرعاً مطلوب ہے (اور بعض کے نزدیک واجب ہے اُسی تفصیل سے جو سلام کے جواب میں گزری اور اسی شرط سے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اُس نے حمد بھی کی ہو۔)

اور جن چیزوں سے حدیث میں منع کیا گیا ہے وہ سب حرام ہیں۔ حریر و دیباج اور قسی و استبرق۔ یہ سب ریشمی کپڑوں کی اقسام ہیں جو مردوں کے لیے حرام ہیں اور عورتوں کے لیے جائز ہیں۔ اسی طرح سونے کی انگوٹھی عورتوں کو جائز ہے مردوں کے لیے حرام ہے اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ منہی عنہ ما مور بہ سے اشد ہوتا ہے (یعنی سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی چیز سے منع کرنا کسی کام کا حکم کرنے سے زیادہ سخت ہے) کیونکہ منہی عنہ تو سب حرام ہوتے ہیں بشرطیکہ نہی بطریق لزوم کے ہو اور ما مور بہ سب واجب نہیں ہوتے بعض واجب ہوتے ہیں بعض مستحب تو وہ اخف (اور سہل) ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اذا امرتکم بامر فأتوا منہ ما استطعتم وما نھیتکم عنہ فلا تقربوا۔ جب میں تم کو کسی کام کا حکم کروں تو جتنا بجا لا سکو بجا لاؤ اور جس سے منع کر دوں اُس کے پاس نہ جاؤ۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جن باتوں کا امر کیا گیا ہے وہ سب واجب نہیں بلکہ بعض مستحب بھی ہیں۔ اور واجبات سب تمہاری طاقت و استطاعت کے موافق ہیں (طاقت سے زیادہ کو واجب نہیں کیا گیا) اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا اللہ تعالےٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں فرماتے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ واجبات میں سے جس کو تمہارا جی چاہے ادا کرو اور جس کو جی نہ چاہے چھوڑ دو۔ یہ کوئی عقلمند بھی جسے دو کا ایک سے زیادہ ہونا معلوم ہے، نہیں سمجھ سکتا۔ مگر یہ کہ کسی کے دل پر ہوائے نفس ہی غالب ہو گئی ہو (تو وہ جو چاہے سمجھ لے)۔

اور اُوپر جو یہ قید لگائی گئی ہے کہ منہی عنہ سب حرام ہیں بشرطیکہ نہی بطریق لزوم کے ہو، یہ شرط اس لیے ہے کہ بعض دفعہ نہی کے ساتھ کوئی قرینہ ایسا ہوتا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نہی کراہت کی وجہ سے ہے یا شفقت کی وجہ سے ہے جیسا (ایک دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کو) وصال سے منع فرمایا تھا (وصال یہ ہے کہ روزہ پر روزہ رکھا جائے۔ درمیان میں رات کو بھی کچھ نہ کھایا جائے) اسی طرح اور جو نہی اس کے مشابہ ہو کہ قرینے سے اس کا شفقت کے لیے ہونا معلوم ہو جائے تو اُس سے حرمت ثابت نہ ہوگی مگر نہی میں ایسا قرینہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اکثر نہی لزوم ہی کے لیے ہوتی ہے اور امر میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ استحباب یا ارشاد کے طور پر حکم ہوتا ہے۔ اس لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ امر سے وجوب پر استدلال کرنے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے اور نہی سے استدلال کرنے کے لیے قرینہ کی ضرورت نہیں بلکہ نہی حرمت قرینہ کی محتاج ہے۔

اس میں صُوفیہ کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ آقا کے امر کا مقتضی (۱۳۸) یہ ہے کہ اُس کی تعمیل کی جائے۔ کسی صُورت سے بھی ہو (خواہ واجب سمجھ کر تعمیل کرو یا مستحب سمجھ کر) کیونکہ غلام کے ذمے تو مولیٰ کے حکم کا بجالانا ہے اس کے سوا کچھ نہیں (غلام کو اس بحث کی ضرورت نہیں کہ امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب کے لیے) پھر وہ اس سے آگے ایک قدم اور بڑھاتے ہیں کہ مولیٰ کے حکم کو غلام کے حق میں احسان اور عنایت سمجھتے ہیں کہ ان کا اتنا درجہ تو ہُوا کہ اُن سے سوال اور خطاب ہُوا۔

جیسا حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبی سے فرمایا کہ مجھے حکم ہُوا ہے کہ تم کو (فلاں سورۃ) پڑھ کر سُناؤں۔ حضرت ابی نے عرض کیا اور میرا وہاں ذکر ہُوا تھا (یعنی اللہ تعالےٰ نے میرا نام لے کر حکم دیا ہے) فرمایا ہاں تمہارا نام بھی لیا اور تمہارے باپ کا بھی۔ یہ سُن کر حضرت ابی اس خوشی میں کہ میرا اتنا درجہ ہو گیا ہے (کہ اللہ تعالےٰ میرا نام لیتا ہے) رونے لگے

(ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے) اور کبھی خوشی کے غلبہ سے بھی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ؎

گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق در ایں کار داشت

اور اسی لیے (کہ صوفیہ کو محض حق تعالیٰ سے خطاب اور سوال و جواب کی تمنا ہے درجاتِ عالیہ کی تمنا نہیں)

حضرت رابعہ عدویہ نے (ایک بار) جبکہ بعض لوگوں نے اشتیاقِ موت پر اعتراض کیا کہ موت کا اشتیاق تو اُس کو ہونا چاہیئے جسے یقین ہو کہ مرتے ہی جنت میں پہنچ جاؤں گا۔ جس کو یہ یقین نہ ہو وہ کیونکر موت کا مشتاق ہو سکتا ہے) فرمایا تو کیا وہ مجھے دھکا نہیں گے بھی جیس کیوں بھی نہ کہیں گے کہ یا امة السوء فعلت کذا و کذا۔ اے بُری بندی! تُو نے ایسا ایسا کیا تھا لوگوں نے کہا ہاں (اگر مواخذہ ہُوا تو یہ تو ہوگا ہی) فرمایا تو میرا مقصود یہی ہے (میں اس سے زیادہ کی طالب نہیں بس وہ مجھ سے خطاب کریں پھر چاہے گالیاں ہی دے لیں ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

؎

احبک حبین حب الھوی
وحب لانک اھل لذاکا
فاما الذی ھو حب الھوی
فشغلی بذکرک عما سواکا
واما الذی انت اھل لہ
فکشفک لی الحجب حتی اراکا

میں آپ سے دو طرح کی محبت رکھتا ہوں۔ ایک عاشقانہ (جس کا منشاء دل

کا آپ پر آجاتا ہے) دُوسری محبت اس لیے کہ واقعی آپ محبت کے قابل ہیں۔
سو پہلی محبت کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کی یاد میں مستغرق ہو کر میں نے سب کو (دل سے) بُھلا دیا ہے اور دُوسری محبت کا مقتضی یہ ہے کہ آپ میرے آگے سے پردے اُٹھادیں تاکہ آپ کو (جی بھر کے دیکھ لوں) یا یہ مطلب ہے کہ دُوسری محبت اس لیے ہے کہ آپ نے میرے سامنے سے پردے اُٹھادیئے ہیں یہاں تک کہ مَیں آپ کو نگاہِ بصیرت سے دیکھ رہا ہوں اور مشاہدۂ قلب نے بتلا دیا کہ واقعی آپ ہی محبت کے قابل ہیں دُوسرا کوئی اس قابل نہیں مگر یہ کہ وہ آپ ہی تک پہنچانے والا ہو مانع نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم ؎

قولہ وفیہ دلیل لاھل الصوفۃ الی ــــ قولہ حق ادا کا



باب شصت و ہفتم ۶۷

حدیث

وفاۃ الرسولؐ وفضل ابی بکرؓ

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (وفات نبویہ کے قصہ میں) روایت ہے کہ حضرت ابوبکر (صدیق) رضی اللہ عنہ (حجرۂ نبویہ) سے باہر آئے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے (جس کا ذکر آگے آئے گا) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا بس بیٹھ جاؤ۔ اُنھوں نے (بیٹھنے سے) انکار کیا (اور برابر تقریر کرتے رہے) تو ابوبکر صدیقؓ نے خطبہ دیا جس میں توحید و رسالت کی شہادت تھی تو سب لوگ اُن کی طرف متوجہ ہو گئے اور حضرت عمر کو چھوڑ دیا (یعنی اُنکی طرف متوجہ نہ رہے) شہادت توحید و رسالت کے بعد حضرت صدیقؓ نے فرمایا۔

اما بعد۔ تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو تو (وہ سُن لے کہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تو وفات ہو چکی اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو تو (وہ جان لے کہ) اللہ زندہ ہے وہ کبھی نہ مرے گا۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل الی الشاکرین۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں ہیں) اُن سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تم اپنی ایڑیوں کے بل (دین سے) لوٹ جاؤ گے اور جو (دین سے) پھرے گا وہ اللہ تعالےٰ کا کچھ نقصان

نہ کرے گا اور (جو اس حالت میں صبر و شکر کرے گا تو) اللہ تعالیٰ شاکرین کو ضرور جزا دے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (اس آیت کو سن کر) بخدا لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ گویا وہ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو بھی نازل کیا ہے۔ یہاں تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو پڑھا تب اُن کو یہ آیت یاد آئی) پھر تو لوگوں نے اس آیت کو سن کر یاد کر لیا۔ اس کے بعد ہر شخص اسی آیت کو پڑھتا ہُوا پھرتا تھا۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ پر ترجیح دی۔ اس آیت کے متعلق چند باتیں بیان کرنے کی ہیں۔

(۱۳۹) عارف اپنے مقام خاص کے مقتضا پر کلام کرتا ہے یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اس نازک موقعہ پر ان دونوں حضرات میں اختلاف کیوں ہُوا۔ حالانکہ دونوں جس درجہ پر ہیں ظاہر ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آیت کو تلاوت کیا تو صحابہ کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس آیت کو اس وقت سے پہلے کبھی سُنا ہی نہ تھا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کے اختلاف کا سبب اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ دونوں کی حالت اس وقت کیا تھی اور دونوں کا خاص مقام کیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو اور حالت تو اس وقت یہ تھی کہ جب ان کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم اس اندوہناک خبر سے گھبرا گئے تو حضرت عمرؓ نے تلوار نیام سے نکال لی اور فرمایا اگر کسی کی زبان سے یہ بات نکلی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی ہے تو اس تلوار سے اُس کا خاتمہ کر دوں گا (حضورؐ کی وفات نہیں ہوئی بلکہ) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو (بطور معراج کے) اُٹھا لیا ہے آپؐ ابھی واپس آئیں گے اور بعض لوگوں کو قتل

کر دیں گے۔ بعض کے ہاتھ کاٹ دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (وفات کی خبر سننے کے بعد) نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے نہ آپ کو دیکھا (بلکہ خبر سنتے ہی تلوار نکال کر لوگوں کو اس قسم کی گفتگو سے منع کرنے لگے) اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس وقت (ایک ضرورت سے) مدینہ کے باہر گئے ہوئے تھے جب اُن کو یہ خبر پہنچی تشریف لائے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ آپ کے چہرۂ مبارک کو کھول کر دیکھا۔ حضورؐ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ زندگی میں بھی پاکیزہ تھے مرنے کے بعد بھی پاکیزہ ہیں اس کے بعد باہر آئے اور حضرت عمرؓ بار بار اپنی اُسی بات کو دُہرا رہے تھے۔ حضرت صدیقؓ نے ان کو بیٹھ جانے کا حکم دیا (مگر وہ نہ مانے) پھر حضرت صدیق نے وہ خطبہ شروع کر دیا جس کا مضمون حدیث میں مذکور ہے (یہ تو اُن حضرات کی اُس وقت کی حالت تھی) اور اُن کی ایک ایک خاص حالت وہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں بتلائی ہے انا مدینۃ السخاء و ابوبکر بابھا و انا مدینۃ الشجاعۃ و عمر بابھا و انا مدینۃ الحیاء و عثمان بابھا و انا مدینۃ العلم و علی بابھا۔ (میں سخاوت کا شہر ہوں ابوبکر اس کا دروازہ ہیں۔ میں شجاعت کا شہر ہوں عمر اس کا دروازہ ہیں، میں حیاء کا شہر ہوں عثمان اس کا دروازہ ہیں، میں علم کا شہر ہوں علی اس کا دروازہ ہیں۔

ف اس حدیث کی صحت میں محدثین کو کلام ہے اور (ظاہر ہے کہ) شجاعت سے مراد دین میں شجاعت (اور پختگی) ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو فاروق کا خطاب دیا کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے اسلام لانے کے دن ہی حق اور باطل میں فیصلہ کر دیا تھا کہ اُسی دن سے) اللہ تعالیٰ کی عبادت اعلانیہ ہونے لگی اور (یہ بھی ظاہر ہے کہ) سخاوت کی زیادتی یقین کی قوت ہی سے ہو سکتی ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابوبکر زیادہ نماز اور روزے کی وجہ سے تم پر فوقیت نہیں لے گئے بلکہ ایک چیز کی وجہ سے بڑھ گئے جو اُن کے

دل میں ڈالی گئی ہے اور وہ چیز کیا ہے ؟ قوتِ یقین ہی تو ہے اور جس کا یقین قوی ہوگا اُس کو حوادث کی قوت و شدت سے حرکت و اضطراب نہیں ہوسکتا۔

(وہ ہر حالت میں کوہ وقار بنا رہتا ہے) وہ اپنے ہر کام کو یقین پر مبنی کرتا اور تمام حالات کی پوری تحقیق کر لیتا ہے اور جس کا مقام قوتِ دین ہوگا جس کا (دوسرا) نام شجاعت ہے وہ اپنے ہر کام میں پوری احتیاط اور قوت کو ملحوظ رکھے گا (تمام حالات کی پوری تحقیق کے درپے نہیں ہوتا بلکہ عمل میں ہر محتمل پہلو کی رعایت کا اہتمام کرتا ہے) چونکہ حضرت عمر شجاعت اور قوتِ دین کے مقام پر تھے جب اُن سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی ہے اور لوگوں کی حالتِ اضطراب کا مشاہدہ کیا تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں گئے بلکہ ہر احتمال پر نظر کی۔ اُن کو یہ بھی احتمال ہوا کہ حقیقتہً آپ کی وفات ہوگئی ہو اور یہ بھی احتمال ہوا کہ بطور معراج کے وفات ہو اور آپ واپس آ جائیں گے اور وقتی حالت کا مقتضایہ تھا کہ اس واقعہ کو اسی پہلو پر محمول کیا جائے جس میں پوری احتیاط ہو یعنی معراج کی حالت پر، تاکہ لوگوں میں جو اضطراب اور زلزلہ سا پیدا ہو گیا ہے وہ زائل ہو جائے اور اس احتمال پر نظر کرکے) اُن میں کسی قدر سکون پیدا ہو جائے۔ پھر (بعد تحقیق کے) اگر یہی پہلو صحیح نکلا جس پر واقعہ کو محمول کیا گیا تھا تو سبحان اللہ اور اگر دوسرا پہلو نکلا کہ حقیقتہً آپ کی وفات ہو چکی ہے تو یہ حقیقت سکون کی حالت میں اُن کے سامنے آئے گی کیونکہ صدمہ کی بات پر جب کچھ مدت گزر جاتی ہے نفس کو سکون ہو جاتا اور دل مضبوط ہو جاتا اور (کسی قدر) مطمئن ہو جاتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ (صبر وہ ہے جو صدمہ کی ابتدائی حالت میں ہو۔ اسی وقت مستقل مزاج اور غیر مستقل کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور جب صدمہ پر مدت گزر جاتی ہے تو اُس وقت تو سب کو بے اختیار صبر آ جاتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے جس میں کچھ شبہ نہیں۔ اسی بات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روکا بلکہ اُنھوں نے لوگوں کے سامنے

تقریر شروع کر دی تاکہ اُن کا اضطراب اور زلزلہ کم ہو جائے) اگر وہ پہلے حضورؐ کے پاس پہنچ جاتے اور حقیقی وفات کا مشاہدہ کر لیتے جیسا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مشاہدہ کیا تو اُن کو اس بات کے کہنے کا موقعہ نہ رہتا (جس سے لوگوں کو اضطراب کی حالت میں سنبھال لیا گیا) کیونکہ اب یہ بات جھوٹ ہوتی اور حضرت عمرؓ اس سے بہت دور رہتے۔ (کہ جھوٹ بات مُنہ سے نکالیں اور تحقیق سے پہلے جو کچھ اُنہوں نے کہا اُس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی حضورؐ کی وفات محقق نہیں ہوئی احتمال ہے کہ یہ بھی معراج کی حالت ہو اور ممکن ہے کہ اس احتمال کے سوا دوسرا احتمال ان کے ذہن ہی میں نہ آیا ہو کیونکہ اُن کا خیال یہ تھا کہ حق تعالےٰ نے ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ میں جس غلبہ کی خبر دی ہے، وہ حضورؐ کے سامنے ہی ہو گا جیسا آیت سے متبادر یہی ہے اور وہ غلبہ ابھی تک ظاہر نہیں ہُوا تو ابھی حضورؐ کی وفات نہیں ہو سکتی۔)

حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب حضورؐ کی زیارت کر کے وہ باہر آئے تو فرمایا کہ موت کے وقت بنو ہاشم (کے آدمیوں میں سے) جس قسم کی بُو آیا کرتی ہے مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے وہی اس وقت آ رہی ہے تو یہ حضرات تو وفات سے پہلے ہی موت کی بُو سے علامت کو پہچان لیتے تھے تو کیا حقیقی وفات کے بعد آپ کو دیکھ کر اُنہیں کچھ شبہ ہو سکتا تھا! یہ ناممکن ہے پس حضرت عمرؓ (اسی لیے خبر وفات سُن کر حضورؐ کے پاس نہیں گئے بلکہ آپ) نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا جو اُن کی اپنی اصلی حالت کا مقتضا تھا۔ جب صاحب یقین بزرگ تشریف لائے تو وہ اس حادثہ عظیم سے مضطرب نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے حقیقتِ حال معلوم کرنے سے پہلے کوئی بات نہیں کرنی چاہی (سیدھے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے آپؐ کا چہرہ مبارک کھول کر دیکھا جب ان کو محقق ہو گیا کہ واقعی سچ مچ آپؐ کی وفات ہو گئی ہے تو غور کیا کہ اس کے وقت کے متعلق اللہ تعالےٰ کا حکم اُن کو اور سب مسلمانوں کو کیا ہے؟ تو فوراً قرآن کی آیت دل

میں آئی جس میں اس حالت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد محکم موجود تھا جو قرآن میں تلاوت کیا جاتا ہے۔ پس وہ حکم کے سامنے جُھک گئے اور دل سے منقاد ہو گئے۔ پھر باہر آ کر لوگوں کو بھی اللہ کے حکم کے سامنے جُھک جانے کی ترغیب دی۔ غرض دونوں بزرگوں نے اپنے مقامِ رفیع کے مقتضیٰ پر عمل کیا (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں حضرات کی باتوں میں حکمت اور مصلحت رکھی تھی حضرت عمرؓ کی بات سے تو منافقین دم بخود رہ گئے اُن کو یہ موقعہ نہ ملا کہ فوراً دشمنانِ دین کو اطلاع کر کے بھڑکا دیتے اور حضرت صدیقؓ کے زبردست بلیغ خطبے سے مُسلمانوں کے دل مضبوط ہو گئے۔ اضطراب جاتا رہا اور مردانہ وار اس صدمہ کو برداشت کر کے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں سرگرم ہو گئے۔ اس لیے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب مَیں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ آیت پڑھتے سُنا تو میرے پیر مجھے نہ اُٹھا سکے (فوراً گر پڑا)

کمالِ یقین کی علامت یہ ہے کہ نازک موقعہ پر بھی سُنتِ نبویہ کو ہاتھ سے نہ جانے دے

اس واقعہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دین کی قوت اور یقین کی عظمت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایسے نازک موقعہ پر بھی مستقل رہے اور اتنے مستقل رہے کہ اپنے کلام کو اسی قاعدہ سے شروع کیا جو سُنتِ نبویہ کا مقتضا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ مہتم بالشان امور میں کلام کو اللہ سبحانہ کے ذکر و ثناء سے شروع کرتے تھے۔

فيه دليل على قوة ابى بكر الى قوله بذكر الله سبحانه والثناء عليه

باہم ایک دوسرے کا ادب کرنا بھی دین کا جُز ہے

اس سے حضراتِ صحابہ کا باہم ایک دُوسرے کا ادب ملحوظ رکھنا بھی معلوم ہُوا۔ یہ بھی دین کا جزو ہے چنانچہ حضرت صدیقؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم بیٹھ جاؤ (تاکہ میں کچھ بولوں) اس سے زیادہ کچھ نہیں

کہا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ حضرت کی وفات معراجی نہیں بلکہ حقیقی وفات ہے تم نے دیکھا نہیں ہے (میں حضورؐ کو دیکھ کر آیا ہوں وغیرہ وغیرہ) اور بیٹھ جانے کو اس لیے کہا کہ اُن کی تقریر کے ساتھ اپنی تقریر شروع کر دینا ادب کے خلاف تھا۔ مطلب یہ تھا کہ بس تم کو جو کہنا تھا کہہ چکے اب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ بیٹھ جائیں)

قولہ وفیہ دلیل علی۔ تادب الصحابۃ الی قولہ ولعدیرہ علیہ فیما قال شیئا

ضرورتِ دین کے لیے ترکِ ادب بھی ادب ہی ہے نیز اسی سے یہ بھی معلوم ہوا

کہ ادب کی رعایت اسی وقت تک ہے جب تک دین کی ضرورت (فوت) نہ ہو اور اگر (ادب سے) دین کی ضرورت (فوت ہوتی) ہو تو اب ادب کی رعایت نہ ہوگی بلکہ اس وقت ترکِ ادب ہی ادب ہوگا دیکھو جب حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق رضہ کی بات نہ مانی (اور خاموش نہ ہونے) اور حالت نازک تھی تو انہوں نے سیدھے منبر پر جاکر) اپنا خطبہ شروع کر دیا اور دین کی (ضرورت کی وجہ) سے اُن کا ادب چھوڑ دیا۔ (کیونکہ گفتگو کا ادب یہ ہے کہ جب تک ایک شخص بول رہا ہے دوسرا اپنی تقریر شروع نہ کرے مگر صورتِ حال کی نزاکت اور دینی ضرورت نے حضرت صدیقؓ کو مجبور کر دیا کہ حضرت عمرؓ کی گفتگو کے ساتھ ہی اپنی تقریر شروع کر دیں پھر بھی اتنا ادب ملحوظ رکھا کہ حضرت عمرؓ مسجد کے سامنے گفتگو کر رہے تھے حضرت صدیقؓ نے وہاں تقریر شروع نہیں کی بلکہ مسجد کے اندر منبر نبویؐ پر تقریر فرمائی) اور اسی دینی ضرورت نے حضرت عمرؓ کو حضرت صدیقؓ کا ادب ملحوظ رکھنے سے روکا تھا کہ جب انہوں نے ان سے خاموش ہونے کو فرمایا خاموش نہیں ہوئے (برابر بولتے رہے کیونکہ وہ اپنے نزدیک اپنی گفتگو کو دینی ضرورت پر مبنی سمجھ رہے تھے کہ اس وقت منافقین کو دبانے کے لیے یہی کہنے کی ضرورت ہے کہ حضورؐ کا وصال نہیں ہوا جب سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی اس کے بعد تحقیق کی جائے گی کہ حضورؐ کی واقعی وفات ہوگئی یا بیماری سے غشی آگئی ہے)

قولہ وفیہ دلیل علی۔ تادب الصحابۃ رضی اللہ عنہم بعضہم مع بعض الی قولہ ویکت حین اشتد الیہ بالسکوت۔

بعض لوگ ادب کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے بزرگ کے خلاف کوئی بات زبان سے نہ نکالے۔ یہ صحیح ہے مگر خلاف کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بات نہ کہے جس سے ظاہر ہو کہ کہنے والا اپنے بزرگوں کا مخالف ہے ان کو بزرگ نہیں سمجھتا یہ مطلب نہیں کہ شرعی مسائل میں ان کی رائے سے اختلاف بھی نہ کرے۔ اگر مسائل شرعیہ میں اختلاف کو بھی بے ادبی میں داخل کیا جائے گا تو کیا نعوذ باللہ امام محمد بن حسن اور امام ابو یوسف بے ادب تھے جنہوں نے اپنے شیخ امام ابو حنیفہ سے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا۔ یہ حاشا وکلا یہ ہرگز بے ادبی میں داخل نہیں اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضرت عمر کے نزدیک اس بات کی ضرورت تھی تو وہ کہہ رہے تھے اس لیے حضرت صدیق کے خاموش کرنے سے خاموش نہ ہوئے اور حضرت صدیقؓ کے نزدیک حضرت عمر کی بات کی ضرورت اس وقت تک تھی جب تک حقیقت واضح نہ ہوئی تھی۔ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد صحابہ کو سنبھالنے اور اطمینان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل اور کفن دفن میں مشغول ہونے کی ضرورت تھی اس لیے آپ نے حضرت عمرؓ کو خاموش رہنے کے لیے فرمایا کہ اب تمہاری بات کا وقت نہیں رہا میں حقیقت پر مطلع ہو کر آیا ہوں۔ اب اس کے مقتضا پر عمل کرنا لازم ہے۔ پس اصرار کے نے دینی ضرورت کو ادب پر مقدم کیا۔

ہمارے اکابر کا عمل بھی حضرات شیخینؓ کی اس سنت پر تھا کہ وہ ضرورت دینیہ کو ادب پر مقدم کیا کرتے تھے اور مسائل شرعیہ میں اپنے بزرگوں سے بعض امور میں اختلاف کرتے تھے مگر تہذیب کے عنوان سے تاکہ اختلاف رائے مخالفت کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ افسوس! آج کل اس طرز پر لوگ نہیں چلتے۔ اختلاف رائے کو مخالفت و مخاصمت کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور تقریر و تحریر میں دوسرے کے ایمان و نیت پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہ لوگ دائرہ علم و تقویٰ سے خارج ہیں فالی اللہ المشتکی۔

(۱۴۲) پریشانی کے وقت کلام مختصر اور دلیل مستحکم بیان کرنی چاہیئے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ فصاحت و بلاغت اور دین کی پختگی کا مقتضا یہ ہے کہ مشکلات کے وقت کلام موجز (مختصر) کیا جائے اور حجت (دلیل) مؤثر و مستحکم بیان کی جائے۔ دیکھو حضرت صدیق کا یہ خطبہ من کان منکم یعبد محمداً فان محمداً قد مات الخ کس قدر بلیغ اور نہایت درجہ بلیغ ہے مگر مختصر بھی ہے (طویل نہیں اور قاعدہ ہے کہ جس پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ زیادہ لمبی چوڑی باتیں نہیں کیا کرتا چند جملوں ہی میں حقیقت کو واضح کر دیتا ہے) اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ دین و احکام کے لیے سب سے بڑی قطعی حجت کتاب اللہ ہے اگر یہ بات نہ ہوتی اور اسی پر حق کا مدار نہ ہوتا تو صحابہ سب کے سب سر خم نہ کر دیتے اور ان ہی آیتوں کو بار بار نہ دُہراتے۔

قوله وفيه دليل على ان من الفصاحة والبلاغة الى قوله يكررون الآى ۔

(۱۴۳) حق واضح کرنے کے لیے کلام کو حق و باطل میں تقسیم کرنا بھی جائز ہے

نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ کلام کو حق و باطل پر تقسیم کرنا بھی جائز ہے تاکہ حق اچھی طرح واضح ہو جائے دیکھو حضرت صدیق نے ایسا ہی کیا ہے فرمایا کہ تم میں جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو تو سُن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مر چکے ہیں اور جو اللہ وحدہٗ کی عبادت کرتا ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہیں وہ نہیں مر سکتے۔ حالانکہ حضرت صدیقؓ کو قطعاً معلوم تھا کہ صحابہ میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرنے والا نہ تھا مگر آپ نے ایسی بات کو جو یقیناً محال تھی ایسی بات سے ملا کر بیان کیا جو سب کے نزدیک محقق اور یقینی تھی تاکہ اسی طرح حق مؤکد اور اہل حق ثابت قدم ہو جائیں۔ قوله وفيه دليل على جواز تقسيم الكلام بين

الحق والباطل الیٰ قولہ تاکیداً للحق وتثبیتاً لاھلہ۔

ف یہ بھی حضرات صوفیہ کی دولتوں میں سے ایک دولت ہے کہ اللہ تعالیٰ بوجہ قوتِ دین اُن کے فصاحت و بلاغت کلام بھی عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ مولانا رومی، مولانا جامی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی وغیرہم کی فصاحت و بلاغت معلوم ہے۔ ہمارے زمانہ میں حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہ کی فصاحت و بلاغت کا دُنیا نے مشاہدہ کیا ہے کہ حضرت کے برابر مؤثر بیان کسی کا نہ ہوتا تھا بلاغت اسی کا نام ہے، رنگینی الفاظ کا نام نہیں وقل لھم فی انفسھم قولا بلیغا حضرت کی شان میں یہ شعر بالکل سچا ہے ؎

ومن لبیان فی القلوب مؤثر   وبعدک قول القائلین فضول

"اب ایسا بیان کون کرے گا جو دلوں میں اثر کرتا چلا جائے۔ آپ کے بعد تو بولنے والوں کی باتیں فضول ہی سی ہیں"

اس مقام پر حضرت صدیق کو حالانکہ قطعاً معلوم تھا کہ صحابہ سب اللہ ہی کی عبادت کرنے والے ہیں مگر حضور کی خبر وفات سُن کر جو اُن کے ہوش اُڑ گئے اور ایک حالتِ اضطراب پیدا ہوگئی اس پر اس عنوان سے تنبیہ فرمائی کہ یہ حالت تو اُس کی ہونی چاہیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اس کو اس قدر پریشان و مضطرب نہ ہونا چاہیئے۔ اہلِ بلاغت سمجھ سکتے ہیں کہ اس موقعہ کے لیے اس سے بہتر عنوان حقیقت کو واضح کرنے والا اور گرتوں کو سنبھالنے والا نہیں ہو سکتا تھا۔ احقر نے اپنے قصیدۂ نعتیہ "وسیلۃ الظفر" میں اسی واقعہ کو اس عنوان سے بیان کیا ہے ؎

ماکان اثبتہ لکل مھمۃ   کادت تزدل لھا ذوات صخور

من کان یعبد احمد افق دبکم   مات الحبیب ولات حین نکیر

من کان یعبد ربہ فھو الا الہ   الواحد القیوم خیر نصیر

ھذا الثبات فھل سمعت بمثلہ   ھذا الوقار وکان غیر وقور

حضرت صدیقؓ ہر مشکل موقعہ پر جہاں پہاڑ بھی ہلنے کو ہو جائیں بڑے ہی ثابت قدم تھے اُن کے اس بلیغ خطبہ پر تعجب کرو جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقعہ پر دیا تھا جبکہ بڑے بڑے صحابہ گھبرا اُٹھے تھے فرمایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو وہ سُن لے کہ محبوب تو مر چکے اب اس سے انکار کی گنجائش نہیں اور جو رب محمد کی عبادت کرتا ہو وہ سُن لے کہ اللہ واحد قیوم زندہ ہے اور بڑا اچھا مددگار ہے۔ یہ ہے ثبات قدم تم نے کہیں اس کی نظیر سُنی ہے یہ ہے وقار و استقلال اور واقعی حضرت صدیق بڑے صاحب استقلال تھے۔ حضرت صدیق میں یہ استقلال ان کے مقام یقین کا ثمرہ تھا اور اسی لیے ان کو سب سے پہلا خلیفہ منتخب کیا گیا کہ اس وقت ایسے ہی صاحب استقلال کی مسلمانوں کو ضرورت تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبائل عرب میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی اور بعضے مرتد ہو گئے تو اس رخنۂ روت کو بند کرنے کے لیے بڑے صاحب استقلال خلیفہ کی ضرورت تھی چنانچہ حضرت صدیق نے سب سے پہلے اسی فتنہ کا سر کچلا اور اللہ نے ان کی مدد کی۔ آپ نے مرتدین کو ذرا مہلت نہیں دی حالانکہ وقت نازک تھا۔ فارس اور روم کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا خطرہ تھا۔ چنانچہ اسی نزاکت حال کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ مرتدین عرب کو اس وقت چھوڑ دیا جائے ان کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا پہلے بیرونی دشمنوں کا انتظام کیا جائے تاکہ لوگوں کی گھبراہٹ کو سکون ہو جائے وہ اس سے پریشان ہیں کہ اپنے ملک میں بھی جنگ کریں اور باہر والوں سے بھی مقابلہ کریں۔ حضرت صدیق نے اس مشورہ کو سختی کے ساتھ رد کیا کہ آستین کے سانپ سے غفلت برتنا ہرگز مناسب نہیں ان کی سرکوبی سب سے پہلے ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ اس میں آپ کا ساتھ نہ دینگے۔ حضرت صدیق نے فرمایا بخدا میں مرتدین سے ضرور قتال کروں گا چاہے صرف تُوا ہی میرے ساتھ ہو اور کوئی نہ ہو۔ یہ بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہَوا کو اُن کی مدد کے لیے بھیج دیا کہ دفعۃً تمام مسجد ہَوا سے بھر گئی اور جو لوگ حضرت

صدیق کی رائے کے خلاف تھے اُن کے چہروں پر خاص طور سے ہوا نے کنکریاں ماریں جس سے گھبرا کر وہ سب مسجد سے باہر نکل گئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قتال میں حضرت صدیقؓ کا شرح صدر کر دیا تو میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے پھر اللہ تعالیٰ نے میرا بھی شرح صدر کر دیا۔ چنانچہ ایک سال میں مرتدین کا فتنہ فرو ہو گیا۔ پھر حضرت صدیقؓ نے ایک ہاتھ فارس کی طرف بڑھایا ایک ہاتھ روم کی طرف اور دونوں طاقتوں سے مقابلہ شروع ہو گیا۔ نقشۂ جنگ حضرت صدیقؓ ہی نے بنا دیا تھا۔ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ حضرت عمرؓ کا مقام شجاعت اور شدت فی الدین تھا تو حضرت صدیقؓ کے بعد مسلمانوں کو اُن کی حاجت تھی تاکہ حضرت صدیقؓ کے بنائے ہوئے نقشہ پر جرأت کی ساتھ بڑھتے چلے جائیں۔ چنانچہ آپ کے زمانے میں بڑی بڑی فتوحات ہوئیں۔ اسلام تمام اطراف میں پھیل گیا اور بلند ہو گیا۔ پھر قاعدہ ہے کہ ہر چیز کو کمال کے بعد زوال ہوتا ہے تو حضرت عثمانؓ کی خلافت کی طرف مسلمان محتاج ہوئے کیونکہ ان کی خلافت میں چھ سال کے اندر بہت زیادہ فتوحات ہوئیں اور سلطنتِ اسلام کمال درجہ پر پہنچ گئی پھر آخری ۶ سال میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگے اور زوال شروع ہونے کے وقت مقام صبر و تسلیم و حِلم کی ضرورت ہے اور یہ حضرت عثمانؓ کا خاص مقام ہے۔ انہوں نے رعایا کی آزادی اور قلتِ اطاعت اور بے باکی اور قلتِ احترام خلیفہ پر کہ یہی زوال کا سرچشمہ ہے۔ غایت حلم سے کام لیا جو کمال حیاء کا مقتضا ہے پھر باغیوں کی بغاوت پر صبر و تسلیم سے کام لیا خود اپنی جان دے دی۔ مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہتھیار نہیں اٹھائے اور جس نے ایسا کرنا چاہا اس کو روک دیا اس میں اُمّت کو سبق تھا کہ جب رعایا میں بے باکی و آزادی پیدا ہونے لگے اس وقت خلیفہ کو حلم سے کام لینا چاہیئے۔ اور رعایا باغی ہو جائے تو اپنی اسلامی برادری سے جنگ نہ کرنا چاہیئے۔ پھر حضرت علیؓ کی خلافت کے مسلمان محتاج ہوئے کیونکہ ان کا مقام علم تھا امت کو ضرورت تھی کہ باغیوں کے متعلق مفصل احکام کا علم ہو۔ اگر سر دست یونہی اسی طرح قتل ہوتا رہا تو فتنہ اور بھی برہم ہو جائے گا۔

لوگ بغاوت کیا کریں گے اور خلیفہ کو قتل کر دیا کریں گے تو خلیفہ اور خلافت کا رُعب جاتا رہے گا اور بہت جلد حکومت اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا اس وقت حضرت علی نے اہل تاویل سے قتال کیا اور مسلمانوں کو تفصیل کے ساتھ اہل تاویل اور مارقین و خارجین کے احکام سے مطلع کر کے قولاً وعملاً حق کو واضح فرما دیا تھا کہ آئندہ کے لیے احتمال والتباس باقی نہ رہے۔ غرض ہر شخص کا ایک مقام معلوم ہے اور مسلمانوں کو سب ہی کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی برکت سے ہم پر بھی فضل فرمائیں اور ایسے اعمال کی توفیق دیں جن سے ہم اُن کے قریب پہنچ جائیں اور قیامت میں اُن ہی کے ساتھ ہمارا حشر ہو اور متقین کی جماعت میں بلامحنت و مشقت کے عافیت کے ساتھ اپنے فضل سے داخل فرمادیں۔ آمین (اس تقریر کا اکثر حصّہ حضرت شارح کے کلام سے ماخوذ ہے چونکہ اس میں کوئی مسئلہ تصوّف کا نہ تھا مگر مضمون عجیب تھا اس لیے فائدہ کے ضمن میں بیان کر دیا گیا۔ سبحان اللہ حضرت شارح نے بڑی خوبی سے مقاماتِ خلفاءِ اربعہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر امام حسن رضی اللہ عنہ کا بیان رہ گیا کہ وہ بھی خلیفۂ راشد ہیں اور ان ہی کی خلافت پر تیس سالہ مدّت خلافت علیٰ منہاج السنۃ تمام ہوتی ہے تو کہنا چاہیئے کہ حضرت علیؓ کے بعد مسلمانوں کو امام حسن کی خلافت کی طرف احتیاج ہوئی جن کا خاص مقام سیادت تھا جس کا مقتضا یہ ہے کہ جب قومی نزاعات کا طاقت سے خاتمہ نہ ہو تو سردار اپنے معاملانہ روش سے اس کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ امام حسنؓ نے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کو اپنی شانِ سیادت سے صلح و اتفاق و اتحاد کی طرف واپس کر دیا۔ اپنے کو خلافت سے معزول کر کے حضرت معاویہ کو خلافت سونپ دی۔ اسی لیے اس سال کو عام الجماعت کہا جاتا ہے کہ اس سال مسلمان پھر سے متفق و متحد اور مجتمع ہو گئے جس کی برکت سے صدیوں تک خلافتِ اسلامی باقی رہی اور ترقی کرتی رہی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۴۵) مصائب میں بڑی تسلی قرآن کی تلاوت و تکرار سے ہوتی ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ مصائب میں تسلی کا سب سے بڑا ذریعہ بار بار قرآن (کی آیات) کو دُہرانا (اور بکثرت پڑھنا) ہے یہی حق ہے اور کھلی ہوئی بات ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ونُنزل من القرآن ماھو شفاء و رحمة للمؤمنین۔ ہم قرآن میں وہ چیزیں نازل کرتے ہیں جو مؤمنین کے لیے شفاء اور رحمت ہیں اُس کی ایک شان و خاصہ یہ بھی ہے کہ غم اور پریشانی کے وقت اس سے تسلی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ (اسی لیے) صحابہ نے بار بار اس آیت کو دُہرانا شروع کر دیا (جو حضرت صدیق نے اپنے خطبہ میں پڑھی تھی) کہ ایک شخص بھی ایسا نہ رہا جس کی زبان سے وہ آیت نہ سُنی گئی ہو۔ کیونکہ اس آیت کو سُن کر اُنہیں اللہ کا حکم تو معلوم ہوگیا تھا پھر بار بار دُہرانے اور تکرار کرنے میں اس کے سوا کیا فائدہ تھا کہ وہ اس سے اپنے رنج و غم میں تسلی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

قوله فيه دليل على ان اكبر التسلي في المصائب تردادكتاب الله الى قوله الا التسلي بها على ماهم فيه من الحزن والبرحاء ۔

ف ذکر اللہ سے اطمینان و تسلی حاصل ہونا صوفیہ کا مشاہدہ ہے وہ الا بذکر الله تطمئن القلوب کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں اور ذکر اللہ کی اعلیٰ فرد نماز اور تلاوتِ قرآن ہے اور مصیبت کے وقت خصوصیت کے ساتھ آیت انا للہ و انا الیہ راجعون کا تکرار اور معنی و مطلب سمجھ کر بار بار پڑھتے رہنا بڑی تسلی کا ذریعہ اور دل کو سنبھالنے والا ہے۔

(۱۴۶) مخاطب کو اسکی مصلحت کی بات بتلانا چاہیئے اگرچہ وہ جانتا بھی ہو

یہاں سے معلوم ہوا کہ جس بات میں مخاطب کی مصلحت ہو اسے بتلانی چاہیئے اگرچہ ہم کو معلوم ہو کہ وہ اس بات کو پہلے سے جانتا ہے کیونکہ حوادث پیش آنے

کے وقت انسان کا دل حادثہ سے ایسا پریشان ہو جاتا ہے کہ جانی پہچانی بات سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ دیکھو صحابہ کو سبھی کو یا اکثر کو یہ آیت معلوم تھی اس کے نزول کا دن اور شانِ نزول بھی معلوم تھا مگر حادثہ (وفات نبویؐ) کے دفعتہً پیش آجانے سے قلوب ایسے پریشان ہو گئے کہ اسی آیت سے ذہول ہو گیا جو پہلے سے جانی ہوئی تھی۔ پھر اس شخص کا تو کیا حال ہو گا جسے پہلے سے کچھ بھی خبر نہ تھی اور ایسی مصیبت کا سامنا ہو گیا جو تحمل سے باہر ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من عزّی مصابا فله اجر المصاب۔ جس نے مصیبت زدہ کو تسلی دی اسے بھی اس مصیبت زدہ کے برابر ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کو وہ باتیں یاد دلاتا ہے جو اس وقت یاد کرنی چاہئیں جس سے اس کا غم ہلکا ہو جاتا ہے تو اس کی تسلی سے جتنا اس کا غم ہلکا ہو گا اسی قدر اس کو ثواب ملے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر اس کو یہ مصیبت پیش آتی اور اس پر صبر کرتا تو جتنا ثواب اس وقت ملتا وہی مصیبت زدہ کو تسلی اور دلاسا دینے سے ملے گا کہ اس نے اس کو صابر بنا دیا ہے اور کسی کو صابر بنا دینے کا بھی وہی حکم ہے جو خود صبر کرنے کا ہے:

لقوله علیه السلام الدال علی الخیر کفاعله اسی کے مناسب بعض حکماء کا یہ قول ہے جو حکمت پر مشتمل ہے کہ آدمی چار قسم کے ہیں ایک تو وہ جو عالم ہے اور اس کو اپنا عالم ہونا بھی معلوم ہے (یہ مطلب نہیں کہ علم کا مدعی ہے بلکہ اس کو احکام شرعیہ مستحضر ہیں اور ان پر نظر ہے اور جانتا ہے کہ اس وقت کے متعلق شریعت کا یہ حکم ہے) اس سے علم حاصل کرو۔ دوسرا وہ جو جاہل ہے اور اسے اپنا جاہل ہونا معلوم ہے اس کو بتلاؤ اور تعلیم دو۔ تیسرا وہ جو جاہل ہے مگر اسے اپنے جہل کی خبر نہیں (بلکہ اپنے کو عالم سمجھتا ہے) اس سے دور بھاگو کہ اس کی فلاح کی اُمید نہیں یوں کسی کو خلافِ عادت فلاح نصیب ہو جائے تو اور بات ہے۔ چوتھا وہ جو عالم ہے مگر اسے اپنا عالم ہونا معلوم نہیں (یعنی پریشانی یا اور کسی وجہ سے احکام وقتیہ اُس کے ذہن میں حاضر نہیں رہے اس لیے وہ حالتِ حاضرہ کے متعلق اپنے

کوجاہل سمجھتا ہے) تو اس کو یاد دلاؤ اس سے تم کو بھی نفع ہوگا (اور اس کو بھی)۔

قولہ وفیہ من الفقہ ان یذکر الشخص بالشئی الذی لہ فیہ مصلحۃ الی قولہ فذکروہ تنتفعوا بہ۔

ف حضرات صوفیہ کا اس پر پورا عمل ہے وہ برابر موت اور قیامت اور جنت و نار کی یاد دہانی کرتے رہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو خصوصاً سالکین کو ان چیزوں کا علم ہے مگر غلبۂ اشتغال دنیویہ کی وجہ سے ان سے ذہول ہو جاتا ہے۔

(۱۷۰) امتحان کے وقت دل کی حالت کھل جاتی ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ امتحان کے وقت انسان کے دل کی حالت کھل جاتی ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جو (مسلمانوں کے لیے) بڑی مصیبت تھی اس نے سب لوگوں کے دلوں کی حالت کو واضح کر دیا کچھ لوگ (جو برائے نام مسلمان ہوئے تھے) مرتد ہو گئے اور بہت لوگ (جو سچے مسلمان تھے) ثابت قدم رہے۔ بعض لوگ کسی قدر فتنہ میں مبتلا ہوئے پھر واپس آگئے تو آزمائش سے زبانی دعووں کی حقیقت کھل جاتی اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصدیق ہو جاتی ہے الٓمّٓ ٭ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون و لقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا و لیعلمن الکذبین ۞ الٓمّٓ۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ان کو اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی۔ (ضرور آزمائش ہوگی) اور ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی بھی آزمائش کی ہے پھر یقیناً اللہ تعالیٰ سچوں کو جھوٹوں سے الگ کر کے رہیں گے۔

اس میں صوفیہ کی حجت ہے جنہوں نے اپنے طریق کو امتحان اور صبر ہی پر قائم کیا ہے کہ انسان راحت اور تکلیف ہر حالت میں ثابت قدم رہے اسی لیے فرماتے ہیں جس کو یہ خوشی حاصل کرنا ہو کہ اس کو کبھی کسی ناگواری کا سامنا نہ ہو تو کسی ایسی

چیز سے دل کو وابستہ نہ رکھے جس پر فنا کا اندیشہ ہو (مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے دل کو اور اپنی توقعات کو وابستہ نہ کرے) کیونکہ اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے (مراد غیر اللہ ہے اور غیر اللہ وہ ہے جو تعلق مع اللہ سے مانع ہو پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دل کو وابستہ کرنا منع نہیں کہ آپ سے وابستگی تو اللہ تعالےٰ سے وابستگی ہے مگر حضورؐ سے اللہ تعالےٰ کے برابر وابستگی نہ ہوگی۔ کیونکہ آپ بھی تو واسطہ ہی ہیں اصل مقصود تو حق تعالےٰ ہیں۔ پس اصل اور واسطہ میں فرق ہونا چاہیئے اسی طرح مشائخ طریق کا تعلق اللہ تعالےٰ سے مانع نہیں بلکہ موصل ہے مگر وہ بھی معرفت رسول کا واسطہ ہیں تو یہاں بھی اصل اور واسطہ کا فرق ہونا چاہیئے۔ خوب سمجھ لو)

قولہ وفیہ من الفقہ ان ھذا الامتحان یعرف المرأ ما احتوی علیہ جنانہ الی قولہ لان ما سواہ عزوجل مفقود۔

ف صوفیہ کے طریق کا امتحان پر مبنی ہونا یہ ہے کہ مشائخ طریق طالبین کے امتحان کرتے ہیں کبھی طلب دیکھنے کے لیے سختی کرتے ہیں کبھی انقیاد و تواضع کا امتحان کرنے کے لیے سختی کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر طالب صادق ہی ٹھہرتا ہے جھوٹا نہیں ٹھہرتا۔ دوسرے یہ کہ صوفیہ خود اپنا امتحان بھی کرتے ہیں۔ بعض دفعہ کسی غریب آدمی کی خدمت کرکے دیکھتے ہیں کہ نفس میں ناگواری پیدا ہوتی یا اپنے حال پر رہا۔ بعض دفعہ عمدہ لباس پہن کر غور کرتے ہیں کہ نفس میں تکبر پیدا ہوا یا اپنے حال پر رہا وغیرہ وغیرہ۔ مگر شریعت کے خلاف کام کرکے نفس کو آزمانا جائز نہیں۔ مثلاً عورتوں کو گھورنے لگے کہ دیکھوں نفس میں شہوت پیدا ہوئی یا نہیں وعلیٰ ھذا القیاس۔ شریعت نے جس کام سے منع کر دیا ہے اس کا ارتکاب امتحان کیواسطے بھی حرام ہے اور جن بزرگوں سے ایسا منقول ہے یا روایت غلط ہے یا غلبۂ حال تھا جس کی تقلید جائز نہیں۔

ف ایک بار حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اگر راحت چاہتے ہو تو اللہ کے سوا کسی سے توقع نہ رکھو۔ پھر فرمایا کہ مجھ سے بھی توقع نہ رکھو۔ یہ وہی بات ہے

جو حضرت شارح نے یہاں بیان فرمائی ہے اور اس کا مطلب اُوپر لکھ دیا گیا کہ اصلی توقع اللہ تعالیٰ سے رکھنا چاہیئے۔ باقی سب سے اسی قدر تعلق اور توقع رکھی جائے جو واسطے کے مناسب ہے۔ کیونکہ یہ حضرات اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود تک پہنچانے والے ہیں پس فرق مراتب کا لحاظ ضروری ہے لا الٰہ الا اللہ کا دب سواہ۔

ف امتحان کے وقت دل کی اصلی حالت کا کھل جانا مشاہدہ ہے بعض لوگ اسی وقت تک اللہ اور رسول کے عاشق ہیں جب تک راحت و آرام میں ہیں اور اگر کبھی کوئی مصیبت پیش آگئی تو ایسے کلمات زبان سے نکالتے ہیں کہ ایمان ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ آج کل مسلمان ایسی آزمائش کے دور سے گزر رہے ہیں۔ بعض جگہ پر مسلمانوں پر سخت مظالم و مصائب کا نزول ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اور سب مسلمانوں کے ایمان کو سلامت و محفوظ رکھے۔

اللھم انا نسئلک العفو والعافیۃ فی الدنیا والآخرۃ۔



باب شصت و ہشتم [۶۸]

حدیث

جواز بکاء الرحمۃ علی المیت

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپ کے پاس پیام بھیجا کہ میرا ایک بچہ مر رہا ہے آپ ہمارے پاس تشریف لائیے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اس سے میرا سلام کہو اور (میری طرف سے) کہہ دو کہ رسول اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ ہی کا ہے جو وہ لے لیں اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ دے دیں اور اللہ کے پاس ہر چیز کی مدت مقرر ہے۔ پس تم صبر کرو اور اللہ سے ثواب کی امید رکھو۔ صاحبزادی نے پھر پیام بھیجا کہ میں آپ کو قسم دیتی ہوں آپ ضرور تشریف لائیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور حضرت سعد بن عبادہ اور معاذ بن جبل اور ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور بہت لوگ آپ کے ہمراہ چلے (جب گھر پر پہنچے) تو بچہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا اور اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ راوی کا گمان ہے کہ صحابی نے یہ بھی فرمایا کہ اُس کا سانس پرانی مشک کی طرح (بول رہا) تھا تو (یہ حال دیکھ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (مبارک) آنکھیں (آنسوؤں سے) بہہ پڑیں تو حضرت سعد نے کہا یا رسول اللہ! یہ کیا؟ فرمایا "یہ رحمت ہے، جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ودیعت کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے رحم دلوں ہی پر تو رحمت فرماتے ہیں۔"

شرح ظاہر حدیث اس پر دال ہے کہ رحمت کی وجہ سے رونا جائز ہے اس حدیث پر چند وجوہ سے گفتگو ہے۔

(۱۴۸) کسی کی موت کے وقت بزرگوں کو بلانا چاہیئے موت کی تکلیف کے وقت

بزرگوں کو بلانا چاہیئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی نے حضورؐ کو بلایا کہ اُن کے بیٹے کی موت کے حادثہ میں تشریف لائیں اور (ظاہر ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت میں اور ہر زمانے میں تمام لوگوں سے افضل ہیں۔

قولہ منہا استحضار ذوی الفضل عند معالجۃ الموت الی قولہ افضل للعباد۔

(۱۴۹) مصیبت زدہ کی تسلی کی جائے مصیبت زدہ کو صبر کی تلقین کی جائے اور اس کو تسلی دی جائے

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادی سے فرمایا فلتصبر و لتحتسب پس صبر کرو اور ثواب کی طلب کرو۔

قولہ فیہ دلیل علی مراجعۃ صاحب المصیبۃ بالتصبر الی قولہ و لتحتسب۔

ف یہ امور صوفیہ کے اخلاق میں داخل ہیں اُن کی وصیت ہے کہ میت کے پاس نزع کے وقت کسی عاقل و صالح کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارے حاجی صاحبؒ کے ایک مُرید کا انتقال ہونے لگا تو وہ نزع کی حالت میں اپنے تجارتی کاروبار کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ لوگ کلمہ کی تلقین کرتے تھے مگر وہ اپنی دکان اور تجارت کی باتوں میں مشغول تھے۔ اُن کے بھائی بہت ہوشیار سمجھدار تھے۔ اُنھوں نے کان پر منہ لگا کر کہا بھائی صاحب! کیا باتیں کر رہے ہو؟ حاجی صاحب تم کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بس حاجی صاحب کا نام سُن کر فوراً ذہن دوسری طرف منتقل ہوگیا۔ کہا حاجی صاحب کے لیے قالین بچھاؤ تعظیم سے بٹھلاؤ پھر جو ذکر و شغل حاجی صاحب نے بتلایا تھا اس میں مشغول ہوگئے اور ذکر اللہ کرتے کرتے ختم ہوگئے۔ پس بزرگوں کو کسی کی موت کے وقت بلانے میں بڑی مصلحت ہے اُن سے میت

کو بھی قوت حاصل ہوتی ہے اور اہل میت کو بھی تقویت ہوتی ہے۔

(۱۵۰) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی کو بلایا جائے تو اس کو یہ بھی بتلا دیا جائے کہ کیوں بلایا جا رہا ہے (کیا کام ہے) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی نے اس طرح پیام بھیجا کہ میرا بچہ مر رہا ہے آپ تشریف لائیے تو انہوں نے تشریف آوری کی درخواست بعد میں کی پہلے بچہ کی حالت سے اطلاع دی۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان من السنۃ ان یخبر الذی یستدعی الی قولہ الا لبعمما اخبرتہ بموت ابنہا۔

ف حسن معاشرت اور ادب کلام بھی اسلام کا بڑا جزو ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دوسرے کو اصلاً پریشانی اور کلفت نہ ہو المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ اس میں ادب کلام بھی داخل ہے کہ بات صاف ہونی چاہئے، ہر معاملہ صاف ہونا چاہئے۔ اس جزو کی طرف عوام تو عوام بہت سے خواص کو بھی توجہ نہیں حضرت اقدس حکیم الامۃ قدس سرہ[عہ] نے اپنے تجدیدی کارناموں میں جہاں اور بہت سی عظیم الشان

عہ آہ آج بجائے دام مجدہم اور دامت برکاتہم کے حضرت کے نام کے ساتھ قدس سرہ اور نور اللہ مرقدہ قلم سے لکھا جا رہا ہے کیا کہوں اس وقت دل پر کیا گذری ہے ؎

تفطر قلبی از رأیتک راحلا ۔۔۔ وکادت لہا شم الجبال تزول

کسے وہم تھا کہ نہ ہوں سکے وہ کسے تا گماں کر بھی گیا ہم ۔۔۔ تقرتو کیے گئیں وہ کر چراغ دل ہی بجھ گئے

وہ حکیم امت مصلحے وہ مجدد طریق ہدیٰ ۔۔۔ وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

۱۶ر رجب ۱۳۶۲ھ سے آنے والی رات کو دو شنبہ کی مغرب کے بعد عشاء کے وقت آفتاب رشد و ہدایت غروب ہوگیا۔ دریائے حکمت و معرفت زیر زمین مخفی ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب کون محبت و شفقت کے لہجہ سے مولوی ظفر کہہ کر مجھے پکارے گا۔ کون دست شفقت سر پر پھیرے گا اور کون علمی و عملی کوتاہیوں پر تنبیہ کرے گا اور کون علوم کا ہو اور احوال باطنہ کی گتھیوں کو سلجھانے گا اور کون اپنی بابرکت مجلس اور قیمتی ملفوظات سے تاریک دلوں کو منور کرے گا ہائے ہائے انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

فدتہ نفوسنا لو کان یبقی ۔۔۔ لکان لنا بہ قلّ ظلیل ۔۔۔ اب بجز اس کے کہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلامی خدمتیں انجام دی ہیں اُن ہی میں سے ایک کارنامہ یہ ہے کہ باب حسنِ معاشرت کو زندہ فرمایا۔ اس کے لئے آداب المعاشرت کے نام سے مستقل کتاب تالیف فرمائی۔ "بہشتی زیور" اور "تعلیم الدین" میں سلیقہ کی باتوں اور آداب کے لیے ابواب قائم فرمائے۔ اپنے قیمتی ملفوظات میں شب و روز اس پر تنبیہ فرمائی۔ انتہا یہ کہ وصال سے چند گھنٹے پہلے قریب مغرب کے دریافت فرمایا کیا وقت ہے؟ (کیونکہ حضرت کو محسوس ہوگیا تھا کہ مغرب کے بعد وصالِ محبوب کی گھڑیاں آنے والی ہیں) کسی نے جواب دیا، دس منٹ باقی ہیں۔ فرمایا مغرب کے آنے میں یا جانے میں؟ عالمِ نزع میں بھی ادبِ کلام کی تعلیم زبان فیض ترجمان سے جاری رہی کہ اتنا کہنا کافی نہیں کہ دس منٹ باقی ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے تھا کہ مغرب کے آنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ اللہ اللہ اصلاح وتعلیم اور پابندیٔ اصول اخیر لمحۂ حیات تک بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ واقعی آپ کے لیے بجا طور پر اللہ تعالیٰ نے قلوب رجال میں لقب حکیم الامۃ مجدد الملت القا فرمایا تھا۔ ایک حکیم اُمت اور مجدد کی یہی شان ہونا چاہیئے تھی کہ جس کام کے لیے دُنیا میں تشریف لائے تھے آخری وقت تک اس کو انجام دیتے رہیں۔ حقوق العباد اور امانات کا جس قدر اہتمام تھا زبان کی طاقت سلب ہونے سے پہلے اس پر بھی تنبیہ فرماگئے۔ مفصل حالات و واقعات کے لیے احقر کا رسالہ حیاتِ اشرف ملاحظہ ہو جو انشاء اللہ عنقریب کسی رسالہ میں شائع ہو جائے گا۔

بہر حال حدیث میں کلام کے اس ادب پر تنبیہ ہے کہ جب کسی کو بُلایا جائے تو اُس کو وجہ بھی بتلا دی جاوے کہ کیوں بُلایا جا رہا ہے؟ محض اتنا کہنا کافی نہیں کہ آپ کو بُلایا ہے اس سے سُننے والے کو پریشانی ہوگی کہ نہ معلوم کیوں بُلایا ہے اور جس کام کو بُلایا ہے وہ ایسا کام ہے بھی یا نہیں جو بدون جانے نہ ہو سکتا ہو اسی طرح بعض لوگ حضرت حکیم الامۃ

(حاشیہ صے سے آگے) حضرت کے تذکرہ سے دل بہلائیں اور حضرت کے لئے ارفع درجات اور ترقی مقامات کی دُعا کریں اور حضرت کی تالیفات و تعلیمات کو مشعلِ راہ بنائیں یہ تسلی کی کیا صورت ہے۔ باقیات صالحات میں ملفوظات و تصنیفات کے دو ازواجِ محترمہ اور دو چھوٹے بھائی زندہ ہیں۔ اہلِ سلسلہ کو ان سب کا احترام کرنا اور ان کے حقوق کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ محتشم ح ۲

قدس سرہٗ سے صرف اتنا عرض کرتے کہ تعویذ دے دو یا ایک تعویذ کی ضرورت ہے تو صاف فرمادیتے کہ میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔ جب وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر عرض کرتا کہ فلاں کام کے لیے تعویذ کی ضرورت ہے تو فرماتے کہ تم نے پہلے اس طرح کیوں نہیں کہا تھا؟ جاؤ آدھ گھنٹہ کے بعد پوری بات کہہ کر تعویذ مانگنا۔ آپ نے دیکھا کہ اسی آداب کی تعلیم حدیث میں موجود ہے۔ مگر حدیث پڑھنے والے ان احکام کو اس سے نہیں سمجھتے بس آمین رفع یدین اور قرأت فاتحہ وغیرہ اختلافی مسائل ہی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان اتفاقی مسائل پر توجہ نہیں کرتے۔

(۱۵۱) **چھوٹا بڑے کو قسم دے سکتا ہے** حدیث سے معلوم ہوا کہ چھوٹا اپنے بڑے کو بھی قسم دے سکتا ہے۔

چنانچہ حضور کی صاحبزادی نے دوسری مرتبہ جو پیام بھیجا اس میں قسم دے کر عرض کیا کہ آپ کو قسم ہے ضرور تشریف لائیے۔ اس کو باب حلف اور یمین میں شمار نہ کیا جائے گا بلکہ طلب اور رغبت میں داخل کیا جائے گا۔ یہاں ایک سوال تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے پیام کے بعد محض قسم دینے کی وجہ سے تشریف لے گئے یا اور کوئی وجہ تھی یا دوسری وجہ کے ساتھ یہ بھی ایک وجہ تھی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پہلی بار کے بلانے پر آپ کیوں تشریف نہیں لے گئے حالانکہ آپ تو غیروں کے ساتھ بھی رحمت اور حسن خلق کا معاملہ فرماتے تھے اپنی بیٹی کے ساتھ تو اور زیادہ اس کا ظہور ہونا چاہیئے تھا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلی بار بُلانے پر نہ جانا اس لیے تھا کہ آپ کو یہ مسئلہ بتلانا تھا کہ ایسے موقعہ پر بلایا جائے تو جانا واجب نہیں اس کو دعوتِ نکاح اور دعوتِ ولیمہ پر قیاس نہ کیا جائے (کہ وہاں دعوت کے بعد جانا ضروری ہے) دوسرے آپ کو یہ بھی خیال ہوا ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک جو آپ کا (بلند) درجہ ہے کہیں اس کی وجہ سے صاحبزادی کو یہ گمان نہ ہو کہ آپ کے آنے سے بچے کی موت ٹل جائے گی یا کچھ دنوں کے لیے مؤخر

ہو جائے گی۔ اس لیے اولاً آپ نے اُن کو بتلا دیا کہ اس معاملہ میں کسی کا کچھ دخل نہیں۔ چنانچہ کہلا بھیجا ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی اللہ تعالے جو کچھ لے لیں وہ بھی ان ہی کا ہے جو کچھ دیں وہ بھی ان ہی کا ہے اور ہر شخص کی ایک مدت اُن کے یہاں مقرر ہے۔ پھر ان کو اس موقعہ و حالت کے احکام بھی بتلا دیئے کہ تم کو صبر کرنا اور ثواب حاصل کرنے میں کوشش کرنا چاہیئے۔

امام مالکؒ نے مؤطا میں (اسی کے مناسب) ایک روایت بیان فرمائی ہے کہ ایک عالم کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، اُس کا انتقال ہوگیا تو اُن کو سخت صدمہ ہُوا حتیٰ کہ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا (افادۂ علمی کا دروازہ بند کر دیا) حالانکہ (کمال) علم و فضل کی وجہ سے لوگ اُن کے (بہت) محتاج تھے۔ اب یہ حال ہو گیا کہ ان کے پاس سوالات آتے تو خادم سوالات کو لے کر گھر میں جاتا اور ان پر جواب لکھوا کر لاتا اور لوگوں کے حوالہ کر دیتا۔ جب کچھ مدت تک یہی حال رہا تو ایک عابدہ نیک بی بی کو بھی اطلاع ہوئی وہ اُن کے دروازہ پر پہنچی اور خادم سے کہا کہ مجھے ایک ضروری بات پُوچھنی ہے مگر بالمشافہ پوچھوں گی بواسطہ نہیں کہہ سکتی۔ خادم نے کہا کہ میں تم کو اندر نہیں بھیج سکتا۔ چنانچہ سب لوگ تو (اپنا اپنا جواب لے کر) چلے گئے۔ یہ بی بی دروازہ ہی پر بیٹھی رہیں۔ خادم نے نرمی سے ان کو بھی جانے کے لیے کہا مگر وہ وہاں سے نہ ٹلیں اور کہا مجھے حضرت سے ملنا ضروری ہے جب دیر تک بیٹھی رہیں تب خادم نے (مجبور ہو کر) شیخ کو اس کی اطلاع دی انھوں نے گھر میں آنے کی اجازت دی تو عرض کیا حضرت میرے کچھ پڑوسی ہیں جن سے میں نے کسی شادی میں جانے کے لیے چند زیورات عاریت لئے تھے انھوں نے مجھے وہ زیورات عاریت دیدیئے۔ پھر اُس شادی کے بعد بھی ایک مدت تک میرے ہی پاس وہ زیورات چھوڑ دیئے کہ ان کو استعمال کئے جاؤں اور اپنا بناؤ سنگار کرتی رہوں۔ پھر اب وہ مجھ سے اپنے زیورات طلب کرتے ہیں مگر میرا دل واپس کرنے کو نہیں چاہتا (کیونکہ مدت تک پاس رکھنے سے مجھ کو اُن کی محبت سی ہوگئی ہے) شیخ نے فرمایا کہ اب تم کو ان کا اپنے پاس رکھنا

جائز نہیں کیونکہ وہ تو عاریت تھے (تمہاری ملک نہ تھے) اور عاریت کو بجنسہ ادا کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ کہا حضرت! میں نے تو ایک دن کے لیے مانگے تھے انہوں نے برسوں میرے پاس رکھ چھوڑے (اب کیونکر دوں اب تو مجھے اُن سے محبت ہو گئی ہے) فرمایا اب تو واپسی میں اور جلدی کرنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے احسان پر احسان کیا (کہ ایک دن کی جگہ برسوں تمہیں استعمال کرنے کی اجازت دی) ان بی بی نے کوشش کی کہ وہ کچھ تو گنجائش نکال دیں مگر وہ سختی پر سختی کرتے چلے گئے (کہ اب انکار کی اصلاً گنجائش نہیں) تو ان بی بی نے عرض کیا حضرت! پھر آپ کی بیوی بھی تو اللہ تعالیٰ کی عاریت ہی تھی جو چند روز کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی تھی۔ پھر اپنی چیز لے لی۔ تو آپ کا یہ رنج و غم اور لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھ جانا کس لیے؟ (آپ نے اللہ کی امانت کو خوشی کے ساتھ کیوں واپس نہیں کیا؟ رنج و غم کو لے کر کیوں بیٹھ گئے؟) اس پر ان بزرگ نے اپنی حالت میں غور کیا اور سمجھ گئے کہ میں نے غلطی کی) اور بی بی کا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت سے گھر کے باہر آنے لگے (اور افاداتِ علمی کا دروازہ کھول دیا۔ سبحان اللہ! حضرات سلف کی عورتیں بھی کیسی سمجھدار تھیں کہ بڑے بڑے علماء کو سبق دیتی تھیں اور اس زمانے کے علماء بھی کیسے تھے کہ ایک عورت کے متنبہ کرنے سے اپنی غلطی کا اقرار کر لیتے تھے۔ اب تو ہم اپنے شیخ کے کہنے سے بھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے فالی اللہ المشتکی من فساد القلوب۔)

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلی بار بُلانے پر نہ جانا اس لیے تھا کہ اپنے اور پرائے سب کو یکساں طور پر حکم شرعی سے مطلع فرما دیں (کہ ایسی دعوت پر جانا لازم نہیں) اور دوبارہ بُلانے پر تشریف لے جانا اپنی بیٹی کی قسم پُورا کرنے کے لیے بھی تھا اور اسی شفقت و رحمت کے مقتضاء پر عمل کرنے کے لیے بھی جو آپ کی فطرت میں ودیعت تھی اور صاحبزادی کے لیے بھی جبکہ اس بات سے اطمینان ہو گیا جس کا پہلے احتمال ہوا تھا اس میں اہلِ طریق کی بھی دلیل ہے جو دلداری اور

جبرِ قلوب کے قائل ہیں (مگر دلداری کے لیے یہ حدود بھی ہیں جن پر حدیث میں متنبہ کیا گیا ہے کہ اول مفسدہ محتملہ کا انسداد کر دیا جائے پھر دلداری کی جائے۔)

قولہ وفیہ دلیل علی جواز القسم علی الفاضل الی قولہ یقولون بجبر القلوب۔

(۱۵۲) اہلِ فضل کے کرم سے قطعی طور پر نااُمید نہ ہونا چاہیئے

حدیث میں اس پر اشارہ ہے کہ اہل فضل کے فضل (وکرم) سے قطعی طور پر ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ اگرچہ وہ (ایک دو بار) جواب بھی دے چکے ہوں۔ چنانچہ حضورؐ کی صاحبزادی نے قاصد کو دوبارہ بھیجا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار انکار فرما چکے تھے (مگر وہ اس انکار سے قطعی مایوس نہ ہوئیں۔ دوبارہ پھر درخواست کی) یہ تو مخلوق کے فضل وکرم کی طمع تھی تو اس ذات کے فضل وکرم کی طمع کیسی ہونی چاہیئے جس کا مثل ہی کوئی نہیں؟ اسی لیے حدیث قدسی میں آیا ہے کہ گنہگار بندہ (ایک دفعہ) اللہ جل جلالہٗ سے دعا کرتا ہے وہ اعراض فرماتے ہیں۔ وہ دوبارہ پھر دُعا کرتا ہے اللہ تعالےٰ اب بھی اعراض فرماتے ہیں وہ پھر دُعا کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ اے فرشتو! کیا تم میرے اس بندہ کو نہیں دیکھتے؟ (کیسا بار بار مجھے پکار رہا اور درخواست کر رہا ہے؟) وہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی نہیں جس کو پکارے (اور جس سے کچھ مانگے) مَیں تم کو گواہ کرتا ہوں مَیں نے اس کو بخش دیا اور اُس کی دعا قبول کی۔

ف ہم نے اللہ والوں کے فضل وکرم کا کھُلی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے جو ان کو لگا لپٹا رہتا ہے وہ محروم نہیں رہتا ؎

تا دمِ آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود

بحمد اللہ وہ دمِ آخر میں بھی امیدواروں کو بشارتِ عالیہ ومبارک باد سے کامیاب فرما دیتے ہیں والعادف تکفیہ الاشارۃ دھے ابلغ من صریح العبادۃ جب اللہ والوں کے فضل وکرم کا یہ حال ہے تو اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم کا کیا پوچھنا؟ ان سے تو کسی حال بھی مایوسی جائز نہیں برابر عرض ومعروض میں لگا رہنا

چاہیئے۔انشاء اللہ محروم نہ رہے گا۔ افسوس ہے کہ آج کل ہم لوگوں نے دُعا کی طرف سے بہت غفلت کر رکھی ہے حالانکہ حدیث شریف میں بڑی تاکید سے ارشاد ہوا ہے لن یھلک مع الدعاء احد۔ دعا کے ساتھ ہرگز کوئی ہلاک نہیں ہو سکتا۔

دوستو! دعا کا التزام رکھو اور یہ جان کر دعا کرو کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جس کو پکارا جائے۔ کوئی نہیں جس سے کچھ مانگا جائے۔ کوئی نہیں جس کو حاجت روا سمجھا جاوے۔ کوئی نہیں جس سے مدد طلب کی جائے۔ انشاء اللہ محروم نہ رہو گے۔

(۱۵۳) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غمی کے گھر میں بدون بلائے جانا جائز ہے بخلاف ولیمہ (وغیرہ خوشی کے مواقع) کے (کہ وہاں بدون بلائے نہ جانا چاہیئے) یہ اس سے معلوم ہوا کہ سعد بن عبادہ و معاذ بن جبل و ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل کھڑے ہوئے حالانکہ حضورؐ نے ان سے کچھ فرمایا نہ صاحبزادی نے اُن کو بُلایا نہ ان حضرات نے اجازت طلب کی۔

ف افسوس ہے آج کل رنج و غم کے گھر جانے کے لیے بھی بعض لوگ بُلانے کے منتظر رہتے ہیں۔ حالانکہ گھر والا اس وقت خود اپنی پریشانی اور غم میں مُبتلا ہوتا ہے اُس کو کسی کے بُلانے کی فرصت کہاں ہوتی ہے؟ مُسلمان آج کل ترقی کے تو طالب ہیں مگر اس کی بُنیاد کو جو کہ اتفاق و اتحاد ہے خود اپنے ہاتھوں ہی سے کاٹتے جاتے ہیں ؎

پھوٹ مسلم کو کر رہی ہے تباہ — آہ! لوہے کو کھا رہا ہے زنگ
اُڑ کے وہ آسماں پر پہنچے — ہم ابھی تک اُڑا رہے ہیں پتنگ

(۱۵۴) موت کی شدت یا خفت شقاوت یا سعادت کی علامت نہیں

حدیث سے معلوم ہُوا کہ موت کی شدت اور خفت کو شقاوت یا سعادت کی علامت نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ بچہ (جس کی موت کا حال حدیث میں ہے بے تکلف

نہ تھا (بلکہ معصوم تھا) بایں ہمہ اس پر موت کی شدت ہو رہی تھی۔ اس میں جو کچھ حکمت ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت فجاءۃ (اچانک کی موت) کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ دو گھروں میں سے ایک میں جلدی پہنچا دیتی ہے (تو اس کو بری علامت نہ سمجھنا چاہیئے اور بعض احادیث میں جو ایسی موت سے پناہ مانگی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان کو وصیت وغیرہ کا موقع نہیں ملتا۔ نیز ایسی موت سے زندوں کے دلوں پر سخت چوٹ لگتی ہے اُن کے دل دہل جاتے ہیں) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کا کوئی درجہ باقی رہ جاتا ہے جس پر وہ اپنے عمل سے نہیں پہنچا تھا تو اس پر موت میں سختی کی جاتی ہے تاکہ اس درجہ پر پہنچ جائے۔

ف اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ اضطراریہ سے بھی ترقی ہوتی ہے فیہ حجۃ لمن قال بہ۔

(۱۵۵) ادب یہ ہے کہ بڑا آدمی گفتگو کی ابتداء کرے دین میں ادب یہ ہے کہ بڑا آدمی پہلے گفتگو کرے۔ چنانچہ اس موقعہ پر حضرت سعد بن عبادہ نے اول گفتگو کی۔ حالانکہ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا سب ہی دیکھ رہے تھے مگر ایک نے دوسرے کا ادب کیا۔ کیونکہ اُن کی عادت سے یہ بات معلوم ہے کہ گفتگو شروع وہی کرتا تھا جو سب سے مقدم (و معظم ہو) پس حضرت سعد بن عبادہ نے گفتگو کا افتتاح کیا (کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ سوال میں ادب (و تہذیب) کی رعایت ضروری ہے اور یہ کہ سوال سے پہلے بزرگوں کا نام بھی (ادب سے) لیا جائے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ماھذا؟ یارسول اللہ! یہ کیا ہے؟ تو پہلے حضورؐ کا نام ادب سے لیا پھر ادب سے سوال کیا اور سوال میں بھی اختصار ملحوظ رکھا اس لفظ پر کچھ زیادتی نہیں کی۔

(۱۵۶) آنسو نکلنے کی عام وجہ صحیح نہیں بلکہ اسکی حقیقت رحمت و رقت ہے حدیث سے معلوم ہوا کہ آنسوؤں

کی حقیقت اور اُن کے سبب کے متعلق جو باتیں لوگوں نے بیان کی ہیں سب لکھیں لوگوں نے اس کے متعلق پانچ چھ باتیں یا اس کے قریب بیان کی ہیں جن میں سے ایک بات کو (عام طور سے) اچھا سمجھا گیا ہے کہ گناہوں کی شرمندگی سے دل کو پسینہ آتا ہے (وہ آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے نکلتا ہے) اسی سے اور باتوں کو بھی بنا لیا گیا ہے مگر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بتلا دیا ہے کہ یہ بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی ایک چیز ہے جس کو رحم دل بندوں کے دل میں ودیعت کر دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد و فانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء (کہ اللہ تعالے اپنے بندوں میں سے رحم دلوں ہی پر رحم فرماتا ہے) اس بات کو بتلاتا ہے کہ یہ آنسو اس رحمت کی وجہ سے نکلتے ہیں جو رحم دل مومنوں کے دلوں میں رکھی ہوئی ہے تو جیسا کہ علوم میں سمجھ (کی طاقت) اس نور سے پیدا ہوتی ہے جو علماء کے قلوب میں ہوتا ہے اسی طرح یہ آنسو ان رحم دلوں کی آنکھ سے بہتے ہیں جن کے دلوں میں رحمت ہے۔ یہ بھی حکیم کی ایک حکمت ہے۔

فانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالے اسی پر رحمت فرماتے ہیں جن کے دلوں میں رحمت (کا مادہ) ہے یعنی رحم والوں کے سوا کسی پر رحمت نہیں فرماتے۔ اب یا تو اس کو ظاہر ہی پر رکھ جائے اور کلام کے حصر پر نظر کر کے دوسروں سے رحمت کی نفی کر دی جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حصر مقصود نہ ہو بلکہ اہلِ رحمت کے لیے حکم رحمت کو ثابت کرنا مراد ہو۔ دوسروں سے نفی مراد نہیں۔ جیسے بولتے ہیں انما الجمیل یوسف بس حسین تو یوسف علیہ السلام ہیں۔ جس سے ان کے لیے حسن وجمال ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ دوسروں سے نفی کا قصد نہیں ہوتا (اہل بلاغت کی اصطلاح میں یوں کہنا چاہیے کہ حصر حقیقی مراد نہیں بلکہ حصر اضافی ہے یعنی دوسروں سے خاص درجہ حسن کی نفی مقصود ہے مطلق حسن کی نفی نہیں۔ اسی طرح یہاں پر رحم دلوں کے لیے خاص درجہ کی رحمت ثابت کر کے بے رحموں سے اس درجہ کی نفی کی گئی ہے مطلق رحمت

کی نفی نہیں کی گئی) اور کبھی ایسے کلام سے (جس میں لفظ انما لایا گیا ہو) صرف استحقاق کا بتلانا مقصود ہوتا ہے) حصر کا قصد نہیں ہوتا نہ حقیقۃً نہ اضافۃً) جیسے حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے ان الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولئک یرجون رحمۃ اللہ۔ بے شک جو لوگ ایمان لے آئے اور مہاجر ہو گئے اور جنھوں نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا۔ یہ لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ (یہاں بھی کلام میں حصر ہے کیونکہ خبر کے معرفہ ہونے سے معنی حصر پیدا ہو جاتے ہیں مگر) مطلب یہ ہے کہ ان کو وعدۂ الٰہی کی امید کا حق ہے اور دوسرے جو رحمت کے امیدوار ہیں وہ بلا وجہ امیدوار ہیں تو یہاں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے (ایک یہ کہ حصر مقصود ہو مگر حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے کہ یہی لوگ اپنی اُمید میں حق بجانب ہیں۔ دوسرے گو امیدوار ہیں مگر اُن کی امید بلا سبب ہے دوسرے یہ کہ) مقصود (حصر نہیں بلکہ) ان لوگوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ استحقاق رحمت کا حکم بیان کر دیا گیا۔ دوسروں سے نفی مقصود نہیں اور یہی زیادہ ظاہر ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت کے کچھ جھونکے (وقتاً فوقتاً) ہوتے ہیں جس کو اللہ چاہتے ہیں (ان کی ہَوا) پہنچا دیتے ہیں (اس کے لیے مہاجرین و مجاہد ہونا شرط نہیں بلکہ ایمان بھی شرط نہیں۔ بعض دفعہ کافر کو بھی رحمت کا جھونکا لگ جاتا ہے تو اس کو ایمان کی توفیق ہو جاتی ہے) خواہ اس میں رحمت (کا مادہ) ہو یا نہ ہو۔

نیز حدیث میں آیا ہے کہ (قیامت کے دن) انبیاء و رسل اور ملائکہ اور علماء و صالحین شفاعت کریں گے پھر حق تعالےٰ فرمائیں گے انبیاء شفاعت کر چکے، ملائکہ شفاعت کر چکے نیک بندے شفاعت کر چکے۔ اب ارحم الراحمین کی شفاعت باقی ہے پھر اللہ تعالےٰ ایک مٹھی بھر کر (اور بعض روایات میں ہے کہ تین دفعہ دونوں ہاتھ بھر کر) بعض ایسے آدمیوں کو جہنم سے نکالیں گے جن کو (انبیاء و رسل کے خیال میں) قرآن نے جہنم میں محبوس کر دیا تھا۔ یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو سب کے سب کافر سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیں گے۔ اسی لیے کوئی اُن کی شفاعت نہ کرے گا مگر وہ واقع میں کافر

نہ تھے مومن تھے۔ لیکن ایمان اتنا کمزور اور خفی تھا کہ انبیاء و ملائکہ کو بھی اُن کے ایمان کا پتہ نہ لگے گا۔ ارحم الراحمین عالم الغیب ان کو خود اپنی رحمت سے بدون کسی کی شفاعت کے جہنم سے نکالیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ رحمت مطلقہ رحم دلوں کے واسطے مخصوص نہیں۔ البتہ اگر رحمت سے مراد ایمان ہو اور ایمان سے مراد ایمان کامل ہو تو بھی لوگ حقیقت میں رحمت کے مستحق ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اس رحمت کے ساتھ اہل ایمان ہی مخصوص ہیں یعنی کاملین اور ایسی رحمت سے خشوع پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں خشوع کی مدح فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے والذین ھم فی صلوتھم خاشعون بس حدیث اپنے ظاہری معنی پر محمول ہو گی کیونکہ اس صورت میں حکم ان ہی لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر کیا جا رہا ہے اور دوسروں سے جن میں ایمان نہیں مطلقاً رحمت کی نفی ہے اور مومنین سے مطلق نفی نہیں بلکہ خاص رحمت کی نفی ہے۔ ورنہ مطلق رحمت ان کے لیے یقیناً ثابت ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذلک لمن یشاء۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف نہیں فرمائیں گے کہ ان کے ساتھ (کسی کو) شریک کیا جائے اس کے سوا (اور گناہوں کو) جس کے لیے چاہیں گے معاف فرما دیں گے (پس ہر مومن کے لیے استحقاقِ مغفرت ثابت ہے اور مغفرت بھی رحمت کا ایک فرد ہے۔)

یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی کا نفاق کامل ہو جاتا ہے تو اس کی آنکھیں اس کے اختیار میں ہوتی ہیں جب چاہتا ہے ان کو بہا لیتا ہے۔ بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض ہے کیونکہ آنسو آنسو برابر ہیں (ایک حدیث میں ان کا سبب رحمت کو قرار دیا گیا دوسری میں نفاق پر مبنی کیا گیا) جواب یہ ہے کہ ہاں ظاہر میں تعارض معلوم ہوتا ہے مگر شرط پر نظر کرنے کے بعد کچھ تعارض نہیں رہتا۔ کیونکہ جس آنسو کا سبب کامل نفاق فرمایا گیا ہے یہ وہ ہے جو بلا چاہنے

اختیار سے نکالا جائے اور رونے کے موقع پر روک لیا جائے جیسے ہر زمانے میں لوگ ان مسکینوں کی حالت سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جو ملتے بنا کر لوگوں کو جمع کرتے ہیں پھر اپنی حالت بیان کرتے ہیں کہ ہم ایسے تھے ہم ویسے تھے اور یہ تمام بیان غلط اور جھوٹ ہوتا ہے جس کا جھوٹ ہونا ان لوگوں کو جو اُن کے اصول و فروع سے واقف ہیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے پھر جب وہ اپنا پورا حال بیان کر چکتے ہیں تو بے تحاشا رونے لگتے ہیں۔ بارش کی طرح اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر ناواقف لوگ گمان کرتے ہیں کہ اُس نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے (بھلا جھوٹ باتیں کر کے بھی کوئی اس طرح رو یا کرتا ہے) پھر اس پر ترس کھا کر ہر طرف سے صدقہ و خیرات کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ایسے واقعات ان لوگوں سے بہت منقول ہیں، چنانچہ وہ کتاب جو ابوساسان کی طرف منسوب ہے جس میں اُن کے حالات (عروج و نزول) کا ذکر ہے وہی اس کے ثبوت کو کافی ہے (کہ رونا اختیاری بھی ہوتا ہے کیونکہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھ کر روتے ہیں ان کا رونا بناوٹی ہے) لوگ اُن کی حالت کا برابر معائنہ کرتے ہیں اور جس رونے کی اس حدیث میں خبر دی گئی ہے (کہ اُس کا منشاء رحمت ہے) یہ وہ ہے جو کسی سبب سے پیدا ہو۔ مثلاً موت کو یاد کر کے یا کسی کے حال پر ترس کھانے سے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو اس موقع پر نکلے جبکہ آپ نے بچے کو موت کی سختی برداشت کرتے ہوئے دیکھا، حالانکہ وہ کمسن (معصوم) تھا یا اللہ کے خوف سے رونا آئے یا اور کسی حالت کے سوچنے سے رونے لگے۔ جیسا منقول ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو وہ بہت زیادہ رو رہی تھیں۔ پوچھا اے فاطمہ کیوں رو رہی ہو؟ عرض کی کچھ نہیں قبر میں جانے کو سوچ کر رونے لگی (کہ دیکھئے وہاں کیا حال ہو؟ اللہ! اللہ نبی کی صاحبزادی کو تو قبر کا اتنا فکر اور ہم لوگ آج کل کیسے بے فکر ہیں) تو یہ سب ایک ہی قسم کا رونا ہے۔ جس کو ایمان کامل کی حقیقت مقتضی ہے اور یہیں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں کہ یہ اللہ کی رحمت ہے، نوع

پر اشارہ کیا ہے، جنس پر اشارہ نہیں فرمایا (مطلب یہ ہے کہ جو رونا میرے اس رونے کی قسم سے ہو اُس کا منشاء رحمت ہے یہ مطلب نہیں کہ ہر رونے کا منشاء رحمت ہے۔ اب دونوں حدیثوں میں کچھ تعارض نہ رہا) جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ سعد بن عبادہ اور جو صحابہ اُس وقت تھے ان میں سے کسی کی آنکھ سے بھی آنسو نہیں نکلا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی روئے اور آپؐ کے رونے کا منشاء کمالِ ایمان تھا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق سب سے زیادہ کامل ایمان والے ہیں۔ اسی لیے آپؐ نے اپنے صاحبزادہ ابراہیم (علی ابیہ وعلیہ السلام والتحیۃ) کے انتقال کے وقت فرمایا تھا تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول ما یسخط الرب"۔ آنکھیں رو رہی ہیں دل غمگین ہے مگر (زبان و دل) سے ہم ایسی بات نہ کہیں گے جو اللہ تعالے کو ناراض کرے " کیونکہ موقعہ پر رونا اور غم کرنا ایمان کا مقتضی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالے کی ناراضی کے اسباب کو ترک کرنا ایمان کا مقتضی ہے۔

ف حقیقت یہ ہے کہ علامہ کی طویل تقریر سے بھی یہ مقام پوری طرح حل نہیں ہُوا۔ یہ اشکال ہنوز باقی ہے کہ اگر ایسے مواقع پر رونا کمالِ ایمان کا مقتضی ہے تو کیا یہ حضرات صحابہ ان صوفیوں سے بھی ناقص الایمان تھے جن کے رونے کو شارح نے کمالِ ایمان میں داخل کیا ہے اور اس کا کوئی قائل نہیں ہو سکتا۔ حضرات صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ضرور ناقص تھے مگر دوسروں کی نسبت سے ہرگز ناقص نہ تھے۔ پس اگر ایسے موقع پر رونا صوفیہ کے کمالِ ایمان کی دلیل ہے تو یہ دلیل صحابہ میں کیوں نہ پائی گئی۔ جو کچھ میری سمجھ میں حدیث کا مطلب آیا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ فان کان صوابا فمن اللہ و رسولہ وان کان خطاء فمن نفسی۔ میرا خیال یہ ہے کہ حضرات صحابہ بھی اس وقت دل سے ضرور روئے اُن کے دلوں پر بھی رقت طاری ہوئی مگر اُنھوں نے یہ سمجھ کر کہ رونا کمالِ صبر کے منافی ہے شدتِ ضبط سے کام لیا اس لیے اُن کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے۔ جب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا تو دریافت کیا کہ یہ کیا (کیونکہ وہ تو رونے کو مطلقاً صبر کے خلاف سمجھتے تھے) حضورؐ نے بتلادیا کہ آنکھوں سے آنسو نکل آنا صبر کے خلاف نہیں صبر کے خلاف جزع فزع ہے کہ چلاکر روئے اور زبان سے بیان کرے اور ایسے موقعہ پر آنکھوں سے آنسو نکل آنا جبکہ اپنے عزیز کا انتقال ہو رہا ہو دلی ہمدردی اور رحمت کا مقتضیٰ ہے۔ بعض دفعہ دلی ہمدردی اور رحمت کے غلبہ سے آنسو نکل آتے ہیں۔ پس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ آنکھوں سے آنسو کا نکلنا رحمت ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر اگر آنسو بہنے لگیں تو اُن کا منشاء قلبی رحمت ہے اور اس سے حضرات صحابہ بھی خالی نہیں دل اُن کے بھی پسیج رہے تھے مگر وہ ضبط سے کام لے رہے تھے۔ حضورؐ نے بتلادیا کہ اتنے ضبط کی ضرورت نہیں زبان کو اور دل کو قابو میں رکھنا چاہیئے کہ دل میں اللہ کی شکایت پیدا نہ ہو، اس کے حاکم وحکیم ہونے کو دل میں مستحضر رکھے اور زبان سے کوئی بے جا بات نہ نکلنے پائے۔ پس اب حدیث پر کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ کیونکہ حاصل یہ ہوا کہ شرط کمال ایمان ایسے موقعہ پر دل سے رونا دل کا پسیجنا ہے اور صحابہ اس سے محروم نہ تھے آنکھوں سے آنسو نکلنا شرط کمال ایمان نہیں کیونکہ وہ اختیار میں نہیں اور امور غیر اختیاریہ پر کمال ایمان موقوف نہیں ہو سکتا لیکن اگر اس موقعہ پر آنسو نکل آئیں تو یہ بھی مذموم نہیں نہ صبر کے خلاف ہے بلکہ اُسی رحمت قلبی کا اثر ہے جو شرطِ کمال ایمان ہے اور یقیناً دل میں اپنے عزیزوں، قرابت داروں اور بچوں کے ساتھ ہمدردی ورحمت کا ہونا کمال ایمان کا مقتضیٰ ہے۔ ان کی وفات پر دل ضرور پگھلنا چاہیئے ورنہ قساوت ہوگی وابعد الناس من اللہ القلب القاسی سنگدل آدمی اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہے۔ اس تقریر کے بعد یہ اشکال بھی حدیث پر نہ رہا کہ دُوسری حدیث میں تو آنسوؤں کو کمال نفاق سے مسبب بتلایا ہے۔ کیونکہ حضورؐ کے اس ارشاد کا کہ یہ آنسو رحمت کے ہیں یہ مطلب نہیں کہ ہر آنسو رحمت ہی سے نکلتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر آنسوؤں کا نکل آنا رحمتِ قلب کی وجہ سے ہوتا

ہے۔ نیز حدیث میں آنسوؤں کی حقیقت کا بیان نہیں محض سبب قریب کا بیان ہے۔ شارع علیہ السلام کو ان چیزوں کی تحقیق سے کچھ غرض نہیں بلکہ سبب قریب بتلا دینا مقصود تھا تاکہ اس کو صبر کے خلاف سمجھنے کا شبہ دفع ہو جائے۔ واللہ اعلم

(۱۵۷) اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے کہ وہ گریہ زاری بہت کرتے ہیں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گریہ کو اس رحمت کا اثر قرار دیا ہے جو قلوب میں رکھی گئی ہے۔ چنانچہ بعض صوفیا سے منقول ہے کہ وہ بہت رویا کرتے تھے جس سے اُن کی آنکھوں میں آشوب ہو گیا۔ لوگ کسی طبیب کو لائے اُس نے کہا میں اس شرط سے علاج کر سکتا ہوں کہ جب تک آشوب کا اثر باقی رہے آپ رونا موقوف کر دیں۔ فرمایا ایسی آنکھ کس کام کی جس سے رویا نہ جائے۔ بخدا میں اس شرط کو منظور نہیں کر سکتا اور مجھے تمہاری دوا کی بھی ضرورت نہیں بلکہ روتے روتے مر جاؤں گا اور بھلا غمزدہ کی تسلی کا سامان آنسوؤں کے سوا بھی کسی چیز میں ہے؟

ف اُوپر بتلایا جا چکا ہے کہ رحمت کا اثر حقیقت میں دل کا رونا ہے، آنسوؤں سے رونا ضرور نہیں۔ اگر کسی کا دل روتا ہو آنسو نہ نکلتے ہوں اس کو پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ مقصود حاصل ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر دل کے رونے کے ساتھ آنکھیں بھی رونے لگیں تو اس میں ظاہر و باطن کا اجتماع ہے اور یہ صورت افضل ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں گزر چکا ہے ورجل ذکر اللہ خالیا ففاضت عینا ہ کہ قیامت میں جن سات شخصوں کو عرش کا سایہ نصیب ہو گا ان میں ایک وہ شخص بھی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کیا تو اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھ کا رونا بھی پسند ہے اسی لیے ایک حدیث میں ہے فان لم تبکوا فتباکوا کہ اگر تم کو رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنا لیا کرو۔ اسی وجہ سے صوفیہ کو گریہ وزاری محبوب ہے اور اس میں وہ اپنی آنکھیں جاتی رہنے کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ ۱۲ مترجم

(۱۵۸) موت کو یاد رکھنا چاہیئے جو یقیناً آنے والی ہے

اس حدیث کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس یقینی سخت وقت کو یاد رکھا جائے (یعنی موت کو) جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا اور اس کے حملے سے پہلے سامان کی تیاری کرلی جائے، کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے کسی عزیز سے موت کو نہیں روک سکے اور خود اپنے سے بھی نہیں روک سکے تو دوسروں کا کیا پوچھنا؟ جس سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے کل نفس ذائقة الموت کہ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ بعض حکماء نے خوب فرمایا ہے ؎

ولو کانت الدنیا تدوم لاھلھا — لکان رسول اللہ حیا و باقیا
فعبک یا ھذا اذا کنت عاقلا — مقیلا وکن فیھا لزادک داعیا

اگر دُنیا (کی زندگی) کسی کے لیے ہمیشہ رہا کرتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور زندہ باقی رہتے۔ پس اگر تو عاقل ہے تو تجھے اتنا کافی ہے کہ دُنیا کو قیلولہ[1] کی جگہ سمجھ اور اس میں اپنے توشۂ راہ کو محفوظ کرلے اور بدون سامان کے موت کے منہ میں جانے سے بچا رہ کہ تیرے ہاتھ تقوے سے خالی ہوں اور موت کا وقت آجائے (اللہ کا تابعدار بندہ بن جا کیونکہ موت یقیناً کسی نہ کسی وقت دفعتہ آجائے گی - قولہ و ھنا شادة وھی ان اھل الفضل لا یقطع الا یاس منھم الی قولہ فالحمام لک مناجتی ؎

ف مراقبہ موت و ذکر موت صوفیہ کا خاص شعار ہے، یہی چیز ہے جس نے اُن کی نگاہ میں دُنیا کو حقیر کر دیا ہے۔ اسی نے اُن کے لیے ترک لذات و مجاہدات کو آسان کر دیا ہے۔ اس پر بعض[2] نوجوانوں نے اعتراض کیا ہے کہ صوفیہ

---

[1] قیلولہ دوپہر کے لیٹنے کو کہتے ہیں جو عموماً تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ راحت کم کرو کام زیادہ کرو۔ ۱۲

[2] مثلاً ڈاکٹر زکی مبارک مصری مصنف کتاب الاخلاق عند الغزالی ۱۲ -

نے اسلام کا جو نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے یہ وہ اسلام نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے پیش فرمایا ہے۔ وہ اسلام تو فتوحات اور حصولِ سلطنت کا دین ہے جس کے لیے علائق دُنیا کا بقا لازم ہے اور صوفیہ نے جو اسلام پیش کیا ہے اس میں ترکِ علائق دُنیا لازم ہے جو رہبانیت ہے اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دُنیا کی محبت اور اس کے علائق دل میں باقی رکھ کر فتوحات اور حصولِ سلطنت کی ہرگز تعلیم نہیں دی۔ بلکہ قلب کو حبِ دُنیا اور اس کے علائق سے پاک کرنے کے بعد جہاد کی تعلیم دی ہے۔
اسی لیے حدیث میں وارد ہے واللہ اعلم بمن یقاتل فی سبیلہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کے راستے میں جہاد کرنے والا کون ہے؛ یعنی جو شخص نام ونمود یا محبت قوم وحمیت وطن کے لیے قتال کرتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ نہیں۔
اب ہم کو بتلایا جائے کہ یہ درجہ اخلاص وخلوص کو اُس شخص کو کیونکر حاصل ہو سکتا ہے جس کا دل حبِ دُنیا اور علائق دُنیا سے پاک نہیں۔ پس صُوفیہ جہاد فی سبیل اللہ کے منکر نہیں بلکہ نام ونمود اور غرض نفسانی کے لیے جہاد کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے اپنی وہ حالت بنا ؤ جو صحابہ کی تھی رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ یخافون یوما تتقلب فیہ القلوب والابصار۔
وہ ایسے لوگ تھے جن کو بیع وشراء اور دُنیا کے تمام کاروبار؛ اللہ کی یاد سے نماز کی پابندی سے زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتے تھے۔ وہ اس دن سے ڈرتے تھے جس میں آنکھیں اور دل اُلٹ پلٹ ہو جائیں گے الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔
یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر سلطنت عطا کر دیں تو نماز کی پابندی کریں، زکوٰۃ دیں نیک کاموں کا امر کریں۔ بُرے کاموں سے روکیں، یعنی جہاد سے اُن کی غرض محض اللہ کا بول بالا کرنا اور زمین کو فواحش اور فساد سے پاک کرنا تھی۔
واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا

اُن پر اللہ کا یہ انعام تھا کہ وہ پہلے ایک دُوسرے کے دُشمن تھے۔ پھر اُن کے دلوں میں ایسی اُلفت پیدا ہوگئی کہ اللہ کے فضل سے سب بھائی بھائی ہوگئے اور یہ صفت بدوں اتفاق کے نہیں ہو سکتی اور اتفاق خود غرضی اور ذاتی مفاد سے قطع نظر کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ محبت دنیا و علائق دُنیا سے پاک پاک ہو جائے اسی لیے ارشاد ہے لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ۔ کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے واسطے وہی نہ چاہے جو اپنے واسطے چاہتا ہے۔ صحابہ کی یہی شان تھی ویؤثرون علٰی انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ۔ وہ اپنے اُوپر دُوسروں کو ترجیح دیتے تھے اگرچہ خود ان کو کیسا ہی فاقہ ہو اور یہ سب کچھ اللہ تعالٰے کے واسطے کرتے تھے۔ وطنیت یا قومیت کے جذبہ سے یہ کرتے تھے۔ صوفیہ مسلمانوں کو ایسا مجاہد بنانا چاہتے ہیں جو محض اللہ تعالٰے کے واسطے کام کرنے والے ہوں۔ مگر لوگ اُن کی تعلیم کا مضحکہ اُڑاتے اور دوسرے طریقوں سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ اور برابر ناکامی کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ یہ کتنا غلط ہے کہ صوفیۂ محققین رہبانیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بتلایا جائے کہ مُسلمانوں کے عروج کا وہ کون سا زمانہ ہے جس میں صوفیہ جہاد سے الگ ہو کر بیٹھ گئے تھے ہندوستان میں تو صوفیہ نے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اُن ہی کے دم سے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت زیادہ ہوئی ہے۔

ف یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صوفیہ نے جو مجاہدۂ نفس اور ترک لذات و ترک علائق کی تعلیم دی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ساری عمر ترک لذات اور ترک علائق ہی میں گزار دے۔ بلکہ تھوڑے دنوں کے لیے ایسا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اللہ تعالٰے کی یاد دل میں اچھی طرح پیوست ہو جائے۔ کسی کام میں اللہ تعالٰے کی یاد سے غفلت نہ ہو کسی کام میں خواہش نفس کا میل نہ ہو جو کام ہو اللہ تعالٰے کے لیے ہو۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی

للہ رب العالمین اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ کچھ دنوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ترک علائق اختیار فرمایا ہے۔ کان یخلوا فی غار حراء یتحنث فیھا۔ آپ نبوت سے پہلے غارِ حراء میں خلوت کے لیے جایا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی کل زندگی تمام تر مجاہدات اور ترکِ علائق ہی میں گزری۔ جب یہ حالت پیدا ہو جائے کہ بیع وشراء اور دُنیا کا کاروبار اللہ تعالےٰ کی یاد سے غافل نہ کرسکیں اور دست بکار و دل بہ یار کی شان ہو جائے تو اب ترکِ علائق اور خلوت وغیرہ کی حاجت باقی نہیں رہتی بلکہ اب صوفیہ اس کو خدمتِ خلق کی تعلیم فرماتے ہیں۔ فرمائیے اس میں کوئی سی بات خلافِ سُنّت ہے ؟

ف یہ تو نوجوانوں کے شُبہ کا جواب تھا باقی اس میں شک نہیں کہ جن صوفیہ کے طرزِ عمل سے ان نوجوانوں کو تصوف پر اعتراض پیدا ہُوا ہے وہ بھی تصوف کی اصل حقیقت سے دُور جا پڑے ہیں۔ اُنہوں نے محض اذکار و اشغال و مراقبات ہی کا نام تصوف رکھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ امورِ مستحبہ محض واجبات و فرائض کی تکمیل کے لیے تصوف میں اختیار کئے جاتے ہیں۔

جب واجبات و فرائض میں شانِ احسان پیدا ہو جائے تو اب ایک خاص وقت خلوت کا ملہ کا مقرر کرکے بقیہ اوقات میں واجبات و فرائض اور خدمتِ خلق بجا لانا چاہیئے۔

جس کی صُورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمارے لیے دو نمونے ہیں۔ ایک مکّی زندگی دُوسرے مدنی زندگی، جہاں مسلمان برسرِ حکومت ہوں وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی مدنی زندگی کو مشعلِ راہ بنانا چاہیئے۔ جہاں برسرِ اقتدار نہ ہوں وہاں مکّی زندگی کو رہبر بنانا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ مکّی زندگی میں بھی باوجود حکومت نہ ہونے کے جمود محض نہ تھا، بلکہ تبلیغ احکام و اشاعتِ اسلام میں سعی و سرگرمی برابر جاری تھی۔ یہ جو صوفیہ اور علماء میں اس وقت جمود محض ہے کہ ایک جماعت نے خانقاہوں کو سنبھال

رکھا ہے۔ ایک نے مدارس کو اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام سے کسی کو بھی سروکار نہیں۔ یہ جمود بے شک خلافِ سُنّت ہے۔ صوفیہ کو لازم ہے کہ اپنی خانقاہوں سے اصحاب نفوسِ قدسیہ کو مختلف مقامات میں تبلیغ احکام و اشاعتِ اسلام کے لیے تعینات کریں۔

علماء پر فرض ہے کہ ایک جماعت مبلغین کی تیار کر کے اطراف و جوانب میں روانہ کرتے رہیں جن کا کام تحصیلِ چندہ نہ ہو، بلکہ خدمت اسلام و تبلیغ احکام ہو۔ اگر اس فریضہ کو اچھی طرح ادا کیا جائے تو اُمید ہے کہ مکی زندگی مدنی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔



حدیث

الرؤیا فی تعذیب العصاة

سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز (صبح) پڑھ کر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے رات کو کسی نے خواب تو نہیں دیکھا؟ اگر کوئی دیکھتا تھا تو عرض کر دیا کرتا تھا آپ کچھ تعبیر ارشاد فرمادیا کرتے۔ عادت کے موافق ایک بار ہم سے پُوچھا کہ رات کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ ہم نے عرض کیا کوئی نہیں۔ فرمایا آج کی رات مَیں نے دیکھا ہے کہ دو شخص میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر ارض مقدس[ع] کی طرف لے چلے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص بیٹھا ہُوا ہے اور دُوسرا کھڑا ہے اُس کے ہاتھ میں لوہے کا زنبور ہے۔ اس بیٹھے ہوئے کے کلّے کو اس سے چیر رہا ہے یہاں تک کہ گدی تک جا پہنچتا ہے۔ پھر دوسرے کلّے کے ساتھ بھی یہی معاملہ کر رہا ہے اور یہ منہ اُس کا درست ہو جاتا ہے پھر اُس کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے۔ مَیں نے پُوچھا یہ کیا بات ہے؟ وہ دونوں شخص بولے آگے چلو، ہم آگے چلے۔ یہاں تک کہ ایک آدمی پر گزر ہُوا جو لیٹا ہُوا ہے اور اُس کے سر پر ایک شخص بڑا بھاری پتھر لیے کھڑا ہے۔ اس سے اس کا سر زور سے پھوڑتا ہے۔ جب وہ پھر مارتا ہے پتھر لڑھک کر دُور جا گرتا ہے وہ اُس کو اُٹھانے کو جاتا ہے تو لوٹ کر واپس نہیں

ع مراد بیت المقدس ہے۔ قال الشارح ۱۲ ظ

اُنے پایا کہ اس کا سر اچھا خاصا جیسے پہلے تھا ویسے ہی ہو جاتا ہے اور وہ پھر اس کو اسی طرح پھوڑتا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ دونوں بولے آگے چلو۔ ہم آگے چلے اور ایک غار پر پہنچے جو تنور کی طرح تھا نیچے سے چوڑا اُوپر سے تنگ اس میں آگ جل رہی ہے اور بہت سے ننگے مرد اور ننگی عورتیں اس کے اندر بھرے ہوئے ہیں جس وقت آگ اُوپر کو اُٹھتی ہے وہ سب بھی اُوپر کو اُٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ نکلنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ جب آگ نیچے کو بیٹھ جاتی ہے وہ بھی نیچے چلے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ دونوں بولے آگے چلو۔ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک نہر پر پہنچے جس میں خُون بھرا ہے ایک شخص اس میں کھڑا ہے نہر کے درمیان کنارہ پر دُوسرا شخص کھڑا ہے اس کے سامنے پتھر پڑے ہیں۔ جب وہ پہلا شخص کنارہ کی طرف آتا اور نہر سے نکلنا چاہتا ہے دُوسرا اس کے مُنہ پر پتھر مارتا ہے اور جہاں سے آتا ہے اسی جگہ لوٹا دیتا ہے۔ جب وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے اسی طرح پتھر مُنہ پر مار کر واپس کر دیتا ہے۔ میں نے کہا یہ کیا ہے؟ بولے آگے چلو۔ ہم آگے چلے۔ یہاں تک کہ ایک سرسبز باغ میں پہنچے جس میں بڑا درخت تھا اُس کی جڑ میں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس بہت سے بچے تھے اور درخت کے پاس ہی ایک اور شخص تھا جن کے سامنے آگ تھی وہ اس کو بھڑکا رہا ہے۔ یہ دونوں مجھے لے کر درخت پر چڑھے اور ایک گھر میں لے گئے جس سے زیادہ خوبصورت مکان میں نے نہیں دیکھا اور اس میں بوڑھے اور جوان مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں بچے بھی تھے۔ پھر اُس سے نکال کر دُوسرے گھر میں لے گئے، وہ پہلے سے بھی زیادہ خُوب صورت تھا۔ اس میں بھی کچھ بڈھے تھے کچھ جوان تھے۔ میں نے کہا کہ تم دونوں نے مجھے رات بھر گھمایا۔ اب یہ بتلاؤ کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے یہ کیا تھا؟ بولے ہاں اب بتلاتے ہیں۔ وہ شخص جس کا کلّہ چیرا جا رہا ہے وہ جھوٹا آدمی ہے جس کی جھوٹی بات لوگ سُن کر تمام جہان میں پھیلاتے ہیں۔ اس سے قیامت تک...

یہی معاملہ ہوتا رہے گا اور جس کا سر پھوڑا جارہا ہے یہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا۔ وہ اس کو چھوڑ کر رات بھر سوتا ہے اور دن میں بھی عمل نہیں کرتا۔ اس سے قیامت تک یہی معاملہ ہوتا رہے گا اور جن لوگوں کو آپ نے تنور میں دیکھا ہے وہ زانی ہیں۔ اور جس کو آپ نے خون کی نہر میں دیکھا ہے وہ سُود خور ہے اور درخت کی جڑ میں جن بزرگ کو دیکھا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور ان کے گرد جو بچے دیکھے یہ لوگوں کی اولاد ہیں (جو بچپن میں انتقال کر گئے ان کی پرورش حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں) اور جو شخص آگ بھڑکا رہا ہے وہ مالک دا روغہ جہنم ہے اور جس گھر میں آپ پہلے گئے تھے وہ عام مؤمنین کا مقام ہے اور یہ دُوسرا گھر شہداء کا ہے اور میں جبرائیل ہوں، یہ دوسرے میکائیل ہیں۔ اب ذرا اپنے سر کو اُوپر اُٹھایئے۔ میں نے سر اُٹھایا تو اپنے اُوپر بادل کی طرح ایک چیز دیکھی۔ کہا یہ آپ کا گھر ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے اپنے گھر میں جانے دو۔ کہا ابھی آپ کی کچھ عمر باقی ہے جس کو آپ نے پُورا نہیں کیا۔ اگر آپ کی عمر پوری ہو جاتی تو اپنے گھر میں پہنچ جاتے۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز کے بعد صحابہ سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ کسی نے خواب تو نہیں دیکھا؟ اور آپ اُن کی خوابوں کی تعبیر بھی دیا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ جس دن حضورؐ نے اپنے اس خواب کو بیان فرمایا اُس دن کسی نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا، اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۵۹) خواب کا اور اُس کی تعبیر کا اہتمام

یہاں چند سوالات ہیں (۱) نماز سے مراد پانچوں نمازیں ہیں یا کوئی ایک نماز۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صحابہ کے خواب دریافت فرمایا کرتے تھے اس میں کیا حکمت ہے؟

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا یہ خواب کس لیے بیان فرمایا ؟

جواب یہ ہے کہ بظاہر نماز سے صبح کی نماز مراد ہے۔ کیونکہ حدیث کے یہ الفاظ من رأى منكم الليلة رؤيا - آج رات تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے ؟ صبح کی نماز کے بعد ہی بولے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ علمی مسئلہ بھی مستنبط ہُوا کہ امام نمازیوں کی طرف منہ کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ سکتا ہے۔ اس میں کچھ حرج نہیں یہ بھی قیام کے قائم مقام ہے بلکہ (جن نمازوں کے بعد سنت مؤکدہ نہ ہو ان میں امام کا اپنی جگہ پر نمازیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا) یہی سنت ہے اس سے اُن لوگوں کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ امام کو اپنی جگہ سے کھڑا ہو جانا لازم ہے۔ یہاں تک کہ بعض متقشف امام نماز سے فارغ ہوتے ہی ایسے (گھبرا کر) کھڑے ہوتے ہیں جیسے کوئی چوٹ کی تکلیف سے کھڑا ہوتا ہے اور اس کو وہ دین سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح دو عظیم الشان خیر اُن سے فوت ہو جاتی ہیں - ایک تو ملائکہ کا استغفار کرتا رہنا جب تک نماز کی جگہ بیٹھا رہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے ملائکہ ہر اس شخص کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں جو اپنی نماز کی جگہ میں بیٹھا رہے جب تک حدث نہ کرے وہ کہتے رہتے ہیں اللهم اغفرله اللهم ارحمه - اے اللہ ! اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ ! اس پر رحم فرما۔ دُوسرے اس سُنت کی مخالفت ہوتی ہے جو اسی حدیث میں صراحتہ مذکور ہے کہ حضورؐ جب نماز سے فارغ ہوتے ہماری طرف مُنہ کر کے بیٹھتے تھے۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ نماز پڑھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر حضورؐ کھڑے ہو کر متوجہ ہُوا کرتے تو حدیث میں اس کا ذکر ضرور ہوتا کیونکہ حضرات صحابہ نے اس سے بھی چھوٹی باتوں کو بیان کیا ہے۔ تاکہ اُمت آپ کی اقتداء کرے (اگر اس جگہ قیام ثابت ہوتا تو صحابہ ضرور بیان فرماتے) میں اُندلس میں جن بڑے مقتدا علماء سے ملا ہوں ان کو نماز کے بعد قیام کرتے ہُوئے نہیں دیکھا بلکہ وہ بدون قیام کے ہی لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے تھے (مترجم کہتا ہے کہ ہمارے اکابر علماء کا عمل بھی علماء اندلس کے مطابق ہے ۱۲)

رہا سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس فعل پر دوام فرمانا (کہ ہمیشہ روزانہ لوگوں سے یہ پُوچھتے تھے کہ آج رات کسی نے خواب دیکھا ہے؟) اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب اجزاء نبوت سے ہے (مگر ایک جزو کے وجود سے کل کا وجود نہیں ہو جاتا۔ کل کا وجود جملہ اجزاء کے اجتماع سے ہوتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو قرآن کا ایک جزو یاد ہو جائے تو اس کو حافظ قرآن نہ کہا جائے گا۔ جب تک پُورا قرآن حفظ نہ ہو خوب سمجھ لو) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس کے اہتمام (اور نگہداشت) کی ترغیب دیتے تھے۔ کیونکہ جب حضورؐ کو اس کا اہتمام تھا تو ہم پر آپ کا اتباع واجب ہے اگرچہ خواب نبوت کے اجزاء میں سے بھی نہ ہوتا چہ جائیکہ وہ نبوت کے اجزاء میں سے ہے (تو اب تو زیادہ اہتمام چاہیئے)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مُسلمانوں کے لیے ابتداء خیر اسی سے ہُوئی ہے۔ کیونکہ نبوت سے (۶ ماہ) پہلے آپؐ سوتے ہوئے سچے خواب دیکھتے تھے (جو کہ نبوت کی تمہید تھی) جیسا کتاب کے شروع میں پہلی ہی حدیث سے معلوم ہو چکا ہے وحسن العهد من الایمان اپنے رفیق[عہ] سے اچھا برتاؤ کرنا بھی ایمان میں داخل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حسن عہد کی (رعایت) کرنے والا کون ہوگا؟ آپؐ کا ایمان تو سب سے زیادہ قوی اور کامل ہے۔ رہا آپ کا (خواب سُن کر) تعبیر دینا۔ سو اس میں صحابہ کو تعلیم تھی ان کو تعبیر خواب کا طریقہ بتلانا تھا۔ کیونکہ جس کو یہ علم آ جائے وہ بھی اس کے حق میں اللہ تعالےٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ جیسا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ہے ذلکما مما علمنی ربی۔ یہ علم (تعبیر) اُن علوم میں سے ہے جن کی میرے رب نے مجھے تعلیم دی ہے اور انسان کو جو بات

عہ یہی وجہ تھی کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ آخر عمر تک تسبیح ہاتھ میں رکھتے رہے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت اب تو آپ کو تسبیح کی حاجت نہیں رہی تو فرمایا اسی کی برکت سے تو حاجت نہیں رہی تو کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دوں؟ او کما قال ۱۲ ظ

معلوم ہو جائے جس کا پہلے اُسے علم نہ تھا وہ اس کے حق میں ایک نعمت ہے۔
رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی خواب بیان کرنا تو (اس کی وجہ ظاہر ہے کہ) آپ کا خواب وحی ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا ہر خواب باجماع علماء وحی ہوتا ہے اور وحی کو چھپانا آپ کو جائز نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندوں کے لیے ایک حکم ہے اور حکم الٰہی کا پہنچانا رسول اللہ پر لازم ہے)۔ دوسرے اس خواب میں جیسا انشاء اللہ ہم بتلائیں گے سمجھ دار کے لیے بہت سے احکام ضروریہ اور فوائد مہمہ ہیں۔ تو حضورؐ نے ان احکام اور فوائد پر (اُمّت کو) مطلع کرنا چاہا۔
قولہ صلاۃ ھل المراد بہا العموم وھی الخمس او واحدۃ منہا الیٰ قولہ فاداد الاخبار بتلک الاحکام والفوائد۔

ف یہاں سے صوفیہ کے اس عمل کی کہ وہ بھی اپنے متعلقین کے خوابوں کو اہتمام سے سنتے اور ان کی تعبیر دیتے ہیں اصل معلوم ہوگئی۔ کیونکہ جن لوگوں کا سلوک موافق نبویہ طے ہوتا ہے ان کو حصول نسبت سے پہلے رؤیائے صالحہ صادقہ بکثرت نظر آتے ہیں۔ بعض دفعہ ان خوابوں میں عجیب عجیب علوم القاء ہوتے ہیں تو مشائخ ان خوابوں سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس سالک کا سلوک سنت نبویہ کے موافق ہے اور عنقریب اس کو نسبت مع اللہ حاصل ہو جائے گی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس زمانۂ فساد میں بعضے ذاکرین جھوٹ بھی بولتے ہیں اور جھوٹے خواب گھڑ کر شیخ کے سامنے پیش کرتے ہیں اور بعضے جھوٹ تو نہیں بولتے مگر اُن کے خواب پریشاں خیالات ہوتے ہیں۔ اس لیے مشائخ اہل تحقیق آج کل کے خوابوں پر زیادہ توجہ نہیں فرماتے۔ خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ لوگ اچھا خواب دیکھ کر ہی اپنے حسنِ حال پر قانع ہو رہے ہیں تو سختی کے ساتھ خواب پر توجہ کرنے سے منع فرماتے ہیں۔
حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے کہ میں نے لوگوں کے ہزارہا خوابوں میں سے ایک دو کو اس قابل پایا کہ اس کو خواب کہا جا سکے ورنہ سب

اضغاث احلام پریشان خیالات ہی پائے۔ اھ

بعض بھولے بھالے مشائخ جو اپنے زمانہ کی حالت سے واقف نہ تھے محض سنت صوفیہ سمجھ کر اپنے متعلقین کے خواب روزانہ اہتمام سے سُنا کرتے تھے اور اُن کے متعلقین ایسے جھوٹے جھوٹے خواب روزانہ تصنیف کیا کرتے تھے کہ جن کے نہ سر نہ پاؤں۔ مگر وہ سب کی تصدیق کرتے تھے اور اگر کوئی مرید یہ کہتا کہ میں نے خواب میں فلاں بزرگ کو دیکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنے پیر سے اتنی رقم لے کر ہمارے مزار پر آؤ تو یہ حضرت فوراً وہ رقم اس کے حوالہ کر دیتے تھے۔ بس خواب کے معاملہ میں شیخ کو اس قدر بھولا نہ بننا چاہیئے۔ اگر حکیم الامتؒ کے سامنے کوئی ایسا خواب بیان کرتا۔ اول تو کسی کو اس قسم کی جرأت ہی نہ تھی تو وہ یقیناً یہ جواب دیتے کہ وہ بزرگ جب خود مجھے حکم دیں گے اُس وقت رقم دوں گا۔ اس کی کیا وجہ ہے خواب میں تم سے تو کہہ گئے اور مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔

ف اللہ کی نعمتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا بطور شکر کے ان کا اظہار لازم ہے واما بنعمۃ ربک فحدث۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا اظہار کرتا ہوں کہ اس ناچیز کے خوابوں کی بابت حضرت اقدس سیدی مُرشدی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ماشاء اللہ مولوی ظفر احمد کے خواب تو واقعات ہوتے ہیں اور حضرت سیدی حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے بندہ کے بعض خواب اپنی مجلس میں بطور استدلال کے بیان فرمائے اور متعدد خواب تربیت السالک میں نقل کرائے ہیں اور الحمد للہ کہ بندہ کو حق تعالیٰ نے علم تعبیر سے بھی مناسبت عطا فرمائی ہے۔ اللھم لک الحمد ولک الشکر حمداً کثیراً کما تحب وترضیٰ۔

ف مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرض وفات میں مجھ سے فرمایا کہ مولانا ایسی تدبیر کرو کہ مجھے نیند آئے کیونکہ آج کل مجھے جب نیند آتی ہے اچھا خواب آتا ہے اور اچھا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ بعض لوگوں کو

خواب میں ایسی ترقی ہوتی ہے جو ریاضت و مجاہدہ سے بھی نہیں ہوتی۔ ان پر خواب میں علوم صحیحہ کا القا ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کل میرے اُوپر خواب میں علوم کا القا ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ تحریک تبلیغ (بطرز خاص) بھی خواب میں مجھ پر منکشف ہُوئی تھی۔

(۱۶۰) گُناہ کا خیال آنے پر اُن وعیدوں کو یاد کرنا چاہیئے

اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے جن کو اس پر ایمان اور تصدیق حاصل ہے ایک بڑا فائدہ ہے بشرطیکہ تصدیق حقیقی ہو کہ سچے دل سے وہ حضورؐ کے اس خواب کو وحی الٰہی سمجھتے ہوں) وہ فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی وقت نفس یا شیطان کی طرف سے (اُن گناہوں میں سے جن کا عذاب یہاں مذکور ہے) کسی گُناہ کا ارادہ دل میں آئے اس وقت اس ہلاکت خیز منظر کو یاد کرے تو نفس سرکشی سے رُک جائے گا اور ایسے ہی فوائد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس تفصیل سے مطلع فرمایا ہے۔ کیونکہ جس شخص کو عذاب کا محض اجمالی علم ہو مقدار و کیفیت کی خبر نہ ہو وہ اُس کے برابر نہیں جو تفصیل سے باخبر ہے اس کو پہلے سے زیادہ خوف ہوگا۔

چنانچہ ایک عابد زاہد کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے بعضے شیطان آدمیوں کو حسد تھا وہ ان کی بابرکت حالت سے (دل ہی دل میں) جلتے تھے تو چاہا کہ (کسی ترکیب سے) ان کو لوگوں کی نظروں سے گرادیں تو اُنھوں نے ایک بہت ہی حسین جمیل عورت کو (اس کام کے لیے) تیار کیا۔ اُس کو خوب پٹی پڑھا دی کر تو پہلے اس سے یہ کہنا پھر آہستہ آہستہ اپنی طرف مائل کرنا اس کے بعد اُس کو بنا سنوار کر عابد کے پاس لے گئے (اور وہاں جاکر) آپس میں جھگڑنے اور لڑنے لگے جیسے یہ عورت اُن میں سے ایک کی بیٹی ہے اور اُس کے بارے میں جھگڑتا ہے (شوہر کہتا ہے کہ اس کو میرے گھر کیوں نہیں بھیجتے؟ باپ کہتا ہے کہ ابھی یہ رُخصت کے قابل نہیں اور تو نے بھی تو مہر کی شرطیں پوری نہیں کیں وغیرہ

پھر لڑائی جھگڑے کے بعد) عابد کے پاس آئے (اور کہنے لگے) کہ حضرت آج ایک رات کے لیے آپ اس لڑکی کو اپنے گھر کے ایک کونہ میں جگہ دے دیں کل کو (جب ہمارا فیصلہ ہو جائے گا) ہم اُسے لے جائیں گے اور اسی قسم کی دُوسری باتیں بنائیں۔ عابد نے انکار کیا تو یہ لوگ اصرار پر اصرار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ (مجبور ہو کر) عابد نے اُن کی بات مان لی اور عورت تک نہ دیکھی (ویسے ہی بدون دیکھے اُس سے کہہ دیا کہ جا گھر میں کسی جگہ آرام کر۔

جب رات زیادہ گزر گئی اور یہ عابد برابر اپنی عبادت میں مشغول رہا (عورت کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا) تو وہ بناؤ سنگار کے ساتھ دفعتہ اس کے پاس پہنچی اور یہ ظاہر کیا کہ مجھے تو گھر میں تنہا ڈر لگتا ہے۔ آپ کے پاس تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ مقصود یہ تھا کہ اپنا چہرہ عابد کو دکھلائے اور مُنہ کھول کے اُسی کے پاس بیٹھے (تاکہ صُورت دیکھ کر اس کی شہوت کو ہیجان ہو) چنانچہ پاس بیٹھ کر اس نے (اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے) عابد کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ پھر کھلے لفظوں میں مقصود ظاہر کر دیا (کہ میں تو آپ پر عاشق ہوں تمنائے وصال مجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ یہ لڑنے جھگڑنے والے میرے باپ یا شوہر کچھ نہیں ہیں بلکہ سب میرے دوست آشنا ہیں۔ میں نے ہی اُن سے درخواست کی تھی کہ اس بہانے سے مجھے آپ تک پہنچا دیں) اور بے حیائی کے کلام پر اُس کو اُبھارنے لگی۔

جب عابد نے اُس کی طرف سے اس قسم کی کوشش (اور کشش) دیکھی تو کہا اچھا تھوڑی دیر کی مجھے مُہلت دے۔ پھر چراغ میں تیل ڈالا اور اس میں موٹی سی بتی ڈالی۔ جب اس کی لو تیز ہوگئی تو اُس میں اپنی انگلی دے دی اور کچھ دیر تک برابر اُسے آگ میں رہنے دیا۔ جب انگلی خوب جلنے لگی اور آگ کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی تو عابد چیخ مار کر بے ہوش ہوگیا

عورت پر اُس کی اس حالت سے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کے سچے معاملے سے رُعب طاری ہو گیا اور وہ بھی گناہ کے ارادے سے رُک گئی۔

جب صبح ہوئی اور وہ شیطان آدمی اُسے اپنی ساتھ لے گئے تورات کی کیفیت دریافت کی۔ عورت نے سارا ماجرا سُنا دیا (اور بتلا دیا کہ واقعی اس شخص کا معاملہ خُدا کے ساتھ سچا ہے اس کو پریشان کرنا اچھا نہیں) تو وہ شیطان بھی اپنے ارادہ سے باز آ گئے۔ کسی نے (اسی مضمون کو) شعر میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

نفسی علی البرد لیس تقویٰ ولا علی الیسر الحرارۃ

فکیف تقوی لحر نار وقودھا الناس والحجارۃ[۵]

میرے نفس کو نہ سردی کی سہار ہے نہ تھوڑی سی گرمی کی۔ تو اس کو اُس آگ کی کیونکر سہار ہوگی جس کا ایندھن آدمی ہیں اور پتھر۔

قولہ وفیہ فائدۃ کبری الی قولہ الناس والحجارۃ۔

ف حضرات صوفیہ کرام کی یہی تعلیم ہے کہ جب گناہوں کی طرف نفس کا میلان ہو تو ان آیات واحادیث کا مطالعہ کیا جائے جن میں گناہوں پر وعید اور عذاب شدید مذکور ہے اور نفس پر یاس وقنوط کا غلبہ ہونے لگے تو آیات رحمت اور ثوابِ جنت کو یاد کر کے خوف کو معتدل کرنا چاہیئے۔ یہ حدیث ان کی مؤید ہے۔

(۱۶۱) قیام لیل واجب ہے یا مستحب

حدیث کا یہ جملہ کہ "جس کا سر پھوڑا جارہا ہے یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا ہے تو وہ رات کو اس سے اعراض کر کے سوتا ہے اور دن میں بھی اُس پر عمل نہیں کرتا قیامت تک اُس سے یہی معاملہ ہوتا رہے گا" محل اشکال ہے۔ سوال یہ ہے کہ قیام لیل

---

[۵] وقود کا ترجمہ عام طور سے ایندھن کیا جاتا ہے اسکا صحیح ترجمہ سلگاؤ ہے یعنی جس سے آگ سُلگائی جاتی ہے جیسے سُنٹھی اور باریک چپٹی وغیرہ کہ جس طرح دُنیا کی آگ ان چیزوں سے سُلگتی ہے دوزخ کی آگ آدمیوں اور پتھروں سے سُلگتی ہے۔ نعوذ باللہ من حر النار ومن غضب الجبار ونسئل العفو والعافیۃ من العزیز الغفار فی الدنیا وفی دار القرار آمین ۱۲ ظ۔

(رات کو بعد عشاء کے نماز میں قرآن پڑھنا) مستحب ہے اور ترک مستحب پر عذاب نہیں ہوتا تو ترک قیام لیل پر عذاب کیسے ہوگا؟

جواب یہ ہے کہ قیام لیل کے واجب ہونے (نہ ہونے) میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض اُس کے وجوب کے قائل ہیں مگر وہ بقدر فواق ناقہ کو واجب کہتے ہیں (زیادہ نہیں قدر فواق ناقہ اتنی مدت کو کہتے ہیں جس میں دودھ نکالنے سے پہلے اُونٹنی کے بچے کو تھن سے لگایا جاتا ہے تاکہ وہ دودھ اُتارے۔ پھر جلدی سے اُس کو الگ کر دیتے ہیں اور یہ مدت عادۃً دو تین منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی جس میں کم از کم دو تین رکعت ادا ہوسکتی ہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے لابد من قیام باللیل ولوقدر فواق ناقۃ قیام لیل ضروری ہے اگرچہ فواق ناقہ کے برابر ہو) اس قول پر تو کسی سوال اور بحث کی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ حدیث بھی اُن علماء کی ایک دلیل ہے (جو قیام لیل کو واجب کہتے ہیں)

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ قیام لیل مستحب ہے۔ جمہور (فقہاء وعلماء) اسی طرف ہیں۔ اس قول پر بے شک وہ سوال وارد ہوگا (کہ ترک مستحب پر عذاب کیوں ہوا؟) سو اس کے دو جواب ہیں۔

ایک یہ کہ جب کسی کو کبائر پر عذاب ہوگا تو اُن کے ساتھ صغائر پر بھی عذاب ہوگا کیونکہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

ان تجتنبوا کبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سيئاتكم۔

"اگر تم اُن بڑے گناہوں سے بچتے رہو جن سے تم کو منع کیا جارہا ہے تو ہم تمہاری سیئات (صغائر) کو معاف کردیں گے"

جس سے (بطور مفہوم مخالف کے) معلوم ہُوا کہ اگر کبائر سے نہ بچا گیا تو (صغائر معاف نہ ہوں گے۔ کیوں کہ اُن کے معاف ہونے کی شرط کبائر سے بچنا ہے بلکہ اس صورت میں) سب پر عذاب ہوگا اور متفق علیہ مستحب کو چھوڑنا مختلف فیہ مستحب کے چھوڑنے کے برابر نہیں (بلکہ دونوں میں فرق ہے متفق علیہ

مستحب کا چھوڑنا تو گناہ کی کسی قسم میں داخل نہیں اور مختلف فیہ مستحب کا چھوڑنا ایک قول پر تو کچھ نہیں مگر دُوسرے قول پر گناہ کبیرہ ہے) اس لیے ہم نے ترکِ قیام لیل کو صغائر میں شمار کر لیا ہے۔ اگرچہ اکثر علماء کے نزدیک وہ مستحب ہے۔ مگر بعض علماء اُس کو واجب بھی کہتے ہیں۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن (سب سے پہلے) بندہ کی نماز کو دیکھا جائے گا۔ اگر اُس کو (اچھی طرح) بجالایا ہو نبھا اور اگر نماز میں نقص ہُوا تو اللہ تعالےٰ (فرشتوں سے) فرمائیں گے۔ میرے بندہ کے اس عمل کو (اچھی طرح) دیکھو۔ اگر اُس نے کچھ نوافل بھی ادا کیے ہوں تو اُن سے اُس کی نماز (کی کمی) کو پُورا کر دو۔ اسی طرح تمام اعمال کے ساتھ معاملہ ہوگا کہ اگر فرائض کو کامل طور سے نہ ادا کیا گیا ہو اور اُس جنس کی نوافل موجود ہوں اُن سے فرض کی تکمیل کر دی جائے گی اور یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے (محض فضل و رحمت (کا معاملہ) ہے۔

تو جب اس شخص نے قیام لیل کو ترک کر دیا جس سے اُن نمازوں کی تلافی ہو سکتی تھی جو اُس نے دن میں ضائع کی تھیں تو ترکِ قیام لیل پر عذاب دیا گیا۔ کیونکہ اُس نے وہ کام نہیں کیا جس سے فرض کی تلافی ہو جاتی تو اس پر عذاب ہونا دراصل اُس کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ عذاب تو درحقیقت فرض کے نقصان پر ہوگا مگر قیام لیل سے اُس نقصان کی تلافی ہو کر عذاب ٹل جاتا ہے۔ جب عذاب کو ٹلانے والا کام بھی نہ ہُوا تو اُسی کی طرف عذاب کو منسوب کر دیا گیا اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :۔

ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطاً و اقوم قیلا۔

"رات کا اُٹھنا (نفس کو) بہت پامال کرتا ہے اور بات کو بہت صاف (اور سیدھا) کرتا ہے"

(تجربہ ہے کہ رات کو اُٹھنے میں بڑا مجاہدہ نفس پر ہے اور اُس وقت جو

کچھ پڑھا جاتا یا دُعا کی جاتی ہے یا ذکر کیا جاتا ہے سب دل سے نکلتا ہے اس لیے قیام لیل کی بڑی فضیلت ہے اور یہ عمل ایسا ہے جس سے فرض نمازوں کی کوتاہی کی تلافی ہو جاتی اور عذاب ٹل جاتا ہے تو جس نے فرائض میں کوتاہی کر کے اس افضل ترین مستحب کو بھی ترک کر دیا ہو اُس کے عذاب کو ترک فرض کے ساتھ اس مستحب کے ترک پر بھی حوالہ کیا جائے گا) اور یہ جواب زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم : اسی لیے علماء نے ہر فرض کے ساتھ اسی نوع کے نوافل کی تکثیر کو مستحب فرمایا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے فرض میں کچھ کمی رہ جائے (تو نوافل سے پُوری ہو جائے گی)۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ فام عنہ باللیل (وہ رات کو قرآن سے اعراض کر کے سوتا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ سو کر رات کی نمازیں فوت کرتا ہے تو گو لفظ عام ہے مگر مراد خاص ہے (یعنی قیام لیل مستحب کا ترک مراد نہیں بلکہ نماز فرض کا ترک مراد ہے کہ رات کو قرآن کے احکام سے اعراض کر کے عشاء سے پہلے سو رہتا ہے اور صُبح کے بعد تک سوتا رہتا ہے۔ نہ عشاء کی نماز پڑھتا ہے نہ صبح کی۔ اس صُورت میں عذاب ترک فرض پر ہُوا نہ ترک مستحب پر)۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ مقصود بطور کنایہ کے یہ ہے کہ اس شخص کو خدا نے قرآن کا علم دیا تھا پھر وہ نہ دن میں اُس پر عمل کرتا تھا نہ رات میں لم یعمل فیہ بالنہار سے دن میں عمل نہ کرنے کو بتلایا گیا اور نام عنہ باللیل سے رات میں عمل نہ کرنا مُراد ہے۔ کیونکہ کسی چیز سے اعراض کر کے سو رہنا کمال ترک پر دلالت کرتا ہے۔

قولہ وھنا بحث وھو کیف یقع العذاب علی ترک القیام باللیل الی قولہ لانہ ابلغ فی الترک۔

ف اور پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ حدیث معراج جسمانی سے مقدم ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح نبوت سے پہلے سچے خواب بطور

تمہیدِ نبوت کے نظر آتے تھے اسی طرح معراج جسمانی سے پہلے خواب میں چند بار معراج روحانی ہوئی ہے تاکہ طبیعت معراج جسمانی کی متحمل ہو جائے۔ یہ حدیث بھی غالباً معراج روحانی سے متعلق ہے اور معراج جسمانی سے پہلے قیام لیل ہی فرض تھا۔ جیسا سورۃ المزمل کی تفسیر سے واضح ہے۔ معراج جسمانی کے بعد جب پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوگئیں قیام لیل کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ پس اگر مان لیا جائے کہ یہ عذاب ترک قیام لیل ہی کی وجہ سے ہُوا تو یہ حکم اُس وقت تھے جبکہ قیام لیل فرض تھا۔

اور چوتھا جواب یہ ہے کہ قیام لیل جمہور کے نزدیک بھی واجب ہے مگر قیام لیل سے مُراد تہجد نہیں جو عشاء کے بعد کچھ دیر سو کر جاگنے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے ما کان بعد العشاء فھومن قیام اللیل۔ نماز عشاء کے بعد جو نماز بھی ہو وہ قیام لیل میں شامل ہے اور نمازِ عشاء کے بعد نماز وتر حنفیہ کے نزدیک واجب ہے، تو جو شخص عشاء کے بعد نماز وتر ادا کرے گا اُس کو تارکِ قیام لیل نہیں کہا جائے گا۔ تارکِ قیامِ لیل وہ ہے جو عشاء پڑھ کر سو جائے اور وتر نہ پڑھے۔ حنفیہ کے علاوہ دُوسرے ائمہ نے اگرچہ وتر کو واجب نہیں کیا مگر فرائض کے بعد آکد السنن (تمام سنتوں سے زیادہ مؤکد) فرمایا ہے جس کے ترک کی وہ بھی اجازت نہیں دیتے تو اختلاف محض لفظی ہے۔ تمام سنن مؤکدہ سے زیادہ مؤکد جو شئے ہوگی وہ واجب ہی ہوگی۔ پس وعید ترکِ مستحب پر نہیں بلکہ ترکِ واجب پر ہے۔

ہمارے اکابر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ مالا بدہ منہ میں نماز تہجد کو سنن مؤکدہ میں شمار کیا ہے اور مواظبت نبویہ سے اس پر استدلال کیا ہے اور غالباً اُن سے پہلے ابن ہمامؒ نے بھی یہی کہا ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا بھی کچھ مدت تک یہی قول تھا۔ لیکن جب احقر نے اعلاء السنن میں دلائل سے ثابت کیا کہ یہ قول خلاف اجماع ہے۔ فقہاء

اربعہ میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں گیا جملہ فقہاء نے تہجد کو نوافل میں ہی شمار کیا ہے اس لیے یوں کہنا چاہیئے کہ تہجد کو سُنّت غیر مؤکدہ ہے مگر قیام لیل بقدر وتر واجب ہے تو حضرت نے اس تحقیق کو پسند فرمایا۔ اہل علم اس بحث کو تفصیلاً اعلاء السنن میں ملاحظہ فرمائیں گے تو زیادہ لطف آئے گا۔

ف اس میں شک نہیں کہ صوفیہ کو تہجد کا بہت زیادہ اہتمام ہے اور اسی لیے حدیث کے اس فائدہ پر تنبیہ کر دی گئی کہ اسی سے صوفیہ کے اس اہتمام کی دلیل نکلتی ہے۔ اُن کا قول ہے کہ جس کو جو نعمت ملی ہے وقت تہجد ہی میں ملی ہے۔ عارف فرماتے ہیں ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

اس لیے تہجد کا اہتمام ضرور کرنا چاہیئے۔ اگر پچھلی رات کو اُٹھنے کی ہمت نہ ہو تو عشاء کے بعد ہی کچھ نفلیں زیادہ پڑھ لی جائیں کہ اگر تہجد حاصل نہ ہو تو قیام لیل ہی حاصل ہو جائے۔ قیام لیل اور تہجد کا ثواب قریب ہی قریب ہے۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام لیل کا بھی امر ہے۔ یاایھا المزمل قم الیل الا قلیلا۔ اور تہجد کا بھی امر ہے۔ ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک۔ تہجد یہ ہے کہ عشاء کے بعد کچھ دیر سو کر بیدار ہو جائے اور وضو وغیرہ کر کے نماز میں مشغول ہو جائے۔

قیام لیل کے لیے عشاء کے بعد سونا ضروری نہیں۔ فرض عشاء کے بعد جو نماز بھی پڑھی جائے گی قیام لیل میں داخل ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ قیام لیل کی افضل صورت تہجد ہے۔ مگر جس کو سونے کے بعد بیدار ہونے کی ہمت نہ ہو اُس کے لیے عشاء کے بعد ہی کچھ نفلیں پڑھ لینا مناسب ہے کہ یہ بھی قائم مقام تہجد کے ہے۔ چنانچہ حضرات صحابہ نے قیام لیالی رمضان (تراویح) کے لیے عشاء کے بعد ہی کا وقت رکھا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

قیامِ رمضان آخر شب میں کیا تھا مگر چونکہ سب لوگوں کا آخر شب میں جمع ہونا دشوار تھا اس لیے تراویح کا وقت بعد عشاء کے رکھا گیا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ عشاء کے بعد نفلیں پڑھ لینا بھی تہجد کے قائم مقام ہے اگرچہ اُس کے برابر نہ ہو۔ تو جسے افضل صُورت کی ہمت نہ ہو اُسے بالکل بھی تو تہجد سے محروم نہ ہونا چاہیئے۔ اور پہلے ایک حدیث گزر چکی ہے کہ جو شخص رات کو سُورۂ بقر کی دو آیتوں کے ساتھ قیام کرے تو یہ دو آیتیں اُس کے لیے تمام رات کے قیام سے کفایت کریں گی "

تو جو لوگ عشاء کے بعد تہجد پڑھنا چاہیں اُن کو دو رکعتوں میں سورۂ بقرہ کی یہ دو آیتیں بھی ضرور پڑھ لینا چاہئیں (آمن الرسول سے آخر سورۃ تک) انشاءاللہ وہ تمام رات کی شب بیداری کرنے والوں میں داخل ہوں گے۔ بشرطیکہ حدیث پر سچے دل سے یقین و اعتقاد ہو۔ اسی واسطے میں نے لفظ انشاء اللہ استعمال کیا ہے ورنہ مجھے بحمداللہ اس میں ذرا بھی شبہ اور شک نہیں۔

(۶۲) علم کو حال بنانا چاہیئے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کو ہر دم مستحضر رکھے

اس حدیث کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جو کچھ وعدہ اور وعید مذکور ہے اُس پر ایمان (اور یقین) کیا جائے اور نجات کا سامان کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ اسی فائدہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس کے مضامین پر مطلع فرمایا۔ اسی وجہ سے اہل طریق (صوفیہ کرام) کو دُوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ علم کو حال بنالیتے ہیں (کسی حدیث یا آیت کو پڑھ کر سرسری طور سے نہیں گزر جاتے بلکہ اُس میں اس قدر تامل اور فکر کرتے ہیں کہ وہ دل پر جم جاتی اور ہر دم اُس کا مضمون مستحضر اور پیشِ نظر رہتا ہے۔ علم کو حال بنانے کا یہی مطلب ہے اس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ قلب اُس حدیث یا آیت کے اثر سے رنگین ہو جاتا ہے

اور یہی علم سے مقصود ہے ورنہ محض لفظی علم ہوگا)۔

چنانچہ ایک طالب علم کا واقعہ ہے کہ وہ بہت دنوں تک اپنے شیخ (کی مجلس) سے غائب رہا پھر (ایک مدت کے بعد) آیا تو شیخ نے فرمایا برخوردار! اتنی مدت تک ہم سے دُور دُور کیوں رہے؟ کہا حضرت میں نے آپ سے دو آیتیں سُنی تھیں اُن پر عمل کر رہا تھا تاکہ اُن کو اپنا حال بنالوں۔ چنانچہ میں نے اس غرض کے لیے نفس کے ساتھ مجاہدہ کیا۔ یہاں تک کہ خدائے تعالےٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور ان دو آیتوں کو میرا حال بنادیا یا اسی کے قریب کچھ اور الفاظ تھے۔ شیخ نے فرمایا برخوردار وہ دو آیتیں کون سی ہیں؟ کہا۔ ایک تو یہ آیت ہے: فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اُس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اُس کو بھی دیکھ لے گا۔

دوسری یہ آیت ہے وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا ویعلم مستقرھا ومستودعھا۔ زمین میں چلنے والا کوئی جاندار نہیں۔ مگر اللہ تعالےٰ کے ذمے اُس کا رزق ہے اور اللہ تعالےٰ جانتا ہے اُس کے قرار کی جگہ کو بھی اور اُس کی ودیعت گاہ کو بھی (جہاں وہ بطور امانت رہتا ہے)۔

بعض نے مستقر کی تفسیر ماں کے رحم سے اور مستودع کی تفسیر باپ کی پُشت سے کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ مستقر سے مراد وہ گھر ہو جہاں انسان رات کو قرار پکڑتا ہے اور مستودع سے مُراد جائے دفن ہو جہاں مرنے کے بعد رکھا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ تو میں نے نفس کے ساتھ اس بات کے لیے مجاہدہ کیا کہ نیک کاموں کا التزام کرے اُن میں سے ذرہ برابر بھی نہ چھُوٹنے پائے اور بُرے کاموں کو چھوڑ دے۔ اُن میں سے ذرہ برابر کا بھی ارتکاب نہ کرے اور میں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ زمین پر چلنے والوں میں سے ایک جاندار میں بھی ہوں تو میرا رزق اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہے۔ وہ مجھے بھی جانتے ہیں اور میرے

کمانے کو بھی تو اب میں نے رزق کے ساتھ نفس کے تعلق اور لگاؤ کو قطع کر دیا اللہ تعالیٰ کے وعدۂ جمیلہ پر بھروسہ کر کے۔ کیونکہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتے چنانچہ حق تعالیٰ عزّ و جل نے اب میرے لیے رزق کو آسان کر دیا ہے۔ وہ اپنے حسن لطف اور وعدہ کے موافق مجھے روزانہ رزق پہنچاتے ہیں۔

شیخ نے کہا برخوردارِ من! مبارک ہو تم تو عابدین سے فوقیت لے گئے۔ آقاؤں کا غلاموں سے یہی تو مقصود ہے کہ غلام اپنے آقا ہی کے ہو کر رہیں ادھر اُدھر نظر نہ کریں، اسی لیے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

اذا کان وعدك بالرزق لا یخلف وطلبك الامر من غیرہ لا یعرف

فحسبی تصدیق وعد لا یخلف واشتغالی بامر غیرہ منی لا یعرف۔

"جب رزق کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تجھ سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتے اور کسی دُوسرے سے بھی کوئی چیز طلب نہیں کی جا سکتی تو مجھے اُس وعدے کی تصدیق کافی ہے جو خلاف نہیں ہو سکتا اور آئندہ ماسوا اللہ تعالیٰ کے کام میں مشغولی میری طرف سے نہیں ہو گی۔"

ف۔ صاحبِ حال کے لیے تارک اسباب ہونا ضروری نہیں

علم کو حال بنانا تو سب کے نزدیک ضروری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث و قرآن کے وعدے اور وعید میں دل پر جم جائیں کہ ہر دم مستحضر اور پیش نظر رہیں، مگر حال کا یہ اثر کہ ہر صاحب حال تارکِ اسباب بھی ہو جائے ضروری اور لازم نہیں۔ حضرات صحابہؓ سے زیادہ کامل الیقین کون ہو سکتا ہے؟ مگر تم دیکھو گے کہ اجلۂ صحابہ بلکہ قریب قریب تمام تر صحابہ اسباب معاش میں مشغول رہتے۔ کوئی تاجر تھا کوئی کاشت کار، کوئی صنعت و حرفت سے روزی کماتا تھا۔ کوئی بیت المال سے وظیفہ لیتا تھا۔

بہر حال شریعت کا یہ مقصود نہیں کہ مسلمان ان اسبابِ معاش کو ترک کر دیں

جو قدرت نے کسی حکمت سے اس عالم اسباب میں حصول رزق کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ اسباب کو مؤثر نہ سمجھیں۔ کیوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کے قبضہ میں نفع و ضرر کی طاقت نہیں ہے اور جن اہلِ حال پر ترکِ اسباب کا داعیہ غالب ہوتا ہے اُن کو بھی اسباب یقینیہ کے ترک جائز نہیں۔ صرف اسباب ظنیہ کا ترک جائز ہے۔ تفصیل کے لیے تربیت السالک حکیم الامۃؒ ملاحظہ ہو۔

ف۔ ترکِ اسباب کے شرائط ترک اسباب ظنیہ کے جواز کی چند شرطیں ہیں:-

(۱) قلب پر ترک اسباب کا شدید تقاضا ہو جس کی مخالفت دشوار ہو جائے یا شیخ کا حکم ہو۔

(۲) مخلوق سے نظر بالکل اُٹھ جائے کسی شخص کے بغرض مُلاقات آنے پر یہ خیال دل میں نہ آنے پائے کہ یہ مجھے کچھ ہدیہ دے تو اچھا ہے۔

(۳) ایسا نہ ہو کہ ترکِ اسباب کے بعد ہر ہدیہ قبول کرنے لگے بلکہ قواعد شرعیہ سے جو ہدیہ واقعی ہدیہ ہو قبول کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(۴) تارکِ اسباب کا عزم اور حوصلہ اس قدر بلند ہونا چاہیئے کہ سلاطین و اغنیاء سے زیادہ اپنے کو غنی سمجھے۔ کیونکہ اُن کی حاجتیں تو دوسروں کے ہاتھ میں ہیں اور متوکل کی ہر حاجت خود اسی کے ہاتھ میں ہے کہ جہاں کوئی ضرورت پیش آئی ہاتھ اُٹھا کر اللہ تعالےٰ سے دُعا کی اور حاجت پُوری ہو گئی۔

(۵) صاحب اہل و عیال کو ترک اسباب جائز نہیں مگر یہ کہ اُس کے اہل و عیال بھی اسی کی طرح صاحبِ حال ہوں اور اگر ترکِ اسباب کے وقت صاحب عیال نہ تھا۔ پھر حق تعالےٰ کی طرف سے بابِ فتوحات مفتوح ہو جانے کے بعد صاحب اہل و عیال بن گیا تو اس میں کچھ کراہت نہیں۔ گو اُس کے اہل و عیال صاحب حال نہ بھی ہوں کیونکہ باب فتوحات مفتوح ہو جانے کے بعد

ظن غالب یہ ہے کہ اُس کے اہل و عیال کو ترک اسباب سے پریشانی کا سامنا نہ ہوگا اوران احکام کا مدار ظن غالب ہی پر ہے۔

(۲) اگر کسی کے ترک اسباب سے اُس کے اہل وعیال کو تنگی اور پریشانی فاقہ وغیرہ کی پیش آنے لگے تو اُس پر اسباب میں مشغول ہونا واجب ہے۔ مگر یہ کہ اہل و عیال سب بالغ ہوں اور وہ بھی اس کی طرح صاحب حال ہوں تنگی اور فاقہ پر راضی ہوں تو اور بات ہے۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو اپنی موافقت پر مجبور کر کے پریشان کرنا جائز نہیں بلکہ اسباب کا اختیار کرنا واجب ہے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو گنہگار ہوگا اور اہل و عیال کو اپنے نفقہ کے لیے قاضی کی عدالت میں اس پر دعوے کرنے کا حق ہے۔ تفصیل کے لیے احیاء العلوم باب التوکل ملاحظہ ہو"۔

ف۔ شراِئط توکل و ترک اسباب پر نظر کرنے کے بعد نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ کہنا کہ صوفیہ توکل کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ تعطل کی تعلیم دیتے ہیں بالکل غلط ہے جس حالت میں صوفیہ محققین توکل بصورت ترک اسباب کی اجازت دیتے ہیں اُس وقت یہ شخص ترک اسباب پر مجبور اور اختیار اسباب سے معذور ہوجاتا ہے۔ اس وقت وہ معطل نہیں ہوتا بلکہ سلاطین سے زیادہ غنی اور مستغنی ہوتا ہے۔ چنانچہ اُن کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔ ایک دفعہ محمد شاہ تغلق نے اپنے امراء وزراء اور اہل دربار کو منع کر دیا تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے یہاں کوئی نہ جانے پائے نہ کوئی اُن کو ہدیہ نذرانہ پیش کرے۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ سلطان جی کا لنگر جو اسقدر وسیع ہو رہا ہے کہ دونوں وقت تین چار ہزار درویش کھانا کھاتے ہیں اور مخلوق برابر اُن کی طرف کھچی چلی آرہی ہے۔ اس کا مدار میرے امراء وزراء و اہل دربار کے ہدایہ پر ہے۔ اگر یہ ہدایہ اور نذرانے بند ہو گئے تو لنگر بند ہو جائیگا اور لنگر بند ہو جانے کے بعد مخلوق کا میلان بھی اس طرف کم ہو جائیگا۔ چنانچہ ایک مہینہ تک تمام ہدایہ اور نذرانے بند رہے لیکن لنگر پھر بھی بند نہ ہُوا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ترقی پر تھا۔

معلوم ہوا کہ ان حضرات کی فتوحات کا مدار انسانوں کے ہدایہ وغیرہ پر نہیں۔ اگر ساری مخلوق اپنا ہاتھ روک لے جب بھی اُن کے کام انشاء اللہ بند نہ ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ کسی دُوسری مخلوق کو اُن کی خدمت کے لیے مسخر کر دیں گے۔ وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لایکونوا امثالکم۔ یہ تو قدیم واقعہ ہے اور ہمارے سامنے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانہ میں جبکہ تحریک خلافت کا ہندوستان میں بہت زور تھا اور حضرت حکیم الامتہؒ شرکت ہنود کی وجہ سے اُس سے الگ تھے تو بعض اہلِ خلافت نے یہ کوشش کی کہ حضرت مولانا کی خدمت میں جو لوگ ہدایہ اور نذرانے بھیجتے ہیں اُن کو اس سے روک دیا جاوے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس سال ہمیشہ سے بھی زیادہ ہدایہ اور نذرانے آئے کہ پہلے تو اوسط ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا تھا اُس سال تین سو روپیہ ماہوار کا اوسط ہو گیا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے جو زیادتی کی تھی وہ برابر بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ اخیر میں ایک ہزار روپیہ ماہوار کا اوسط ہو گیا تھا۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں قبول ہدایہ سے زیادہ رد ہدایہ کا اوسط تھا۔ وہ ہدایہ قبول کم کرتے تھے واپس زیادہ کرتے تھے۔ کیونکہ شرائط قبول سخت تھیں جن کی پابندی کرنے والے تھوڑے ہی ہوتے تھے اس پر بھی کسی کے کم کرنے سے اُن کی آمدنی کم نہیں ہوتی تھی سچ ہے۔ ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لایحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیئ قدرا ہ۔



باب ہفتم

حدیث

لاحسد الا فی اثنتین

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم
یقول لاحسد الا فی اثنتین رجل آتاہ اللہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ
فی الحق ورجل آتاہ اللہ حکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا الناس۔

(ترجمہ) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ قابل رشک دو ہی (شخصوں کی) حالتیں ہیں۔ ایک وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے مال دیا ہو پھر اُسے (راہ) حق میں خرچ کرنے کی توفیق دی ہو۔ دُوسرے وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے دین کی سمجھ دی ہو (یعنی قرآن و حدیث کا علم دیا ہو) پھر وہ اس کے موافق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو اُسکی تعلیم (بھی) دیتا ہے۔

شرح ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ ان دو صفتوں میں حسد جائز ہے ان کے ماسوا کسی اور صفت میں جائز نہیں۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے:۔

(۱۶۳) حسد اور غبطہ کے احکام یہاں حسد سے کیا مُراد ہے؟ بظاہر حقیقی معنی مراد نہیں، بلکہ مجازاً غبطہ (اور رشک) مُراد ہے۔ جس کے متعلق حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔ رشک کرنے والوں کو اسی میں رشک

کرنا چاہیے۔ حسد کی حقیقت یہ ہے کہ جو شی عادۃً ایک سے دُوسرے کی طرف مُنتقل ہو سکتی ہے۔ اُس کا اپنی طرف منتقل ہونا اور دُوسرے سے زائل ہونا چاہے یہ جائز نہیں۔ اسی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن واسئلو الله من فضله۔

"مردوں کے لیے اُن کی کوشش (اور کسب) سے حصّہ ہے اور عورتوں کے لیے اُن کی کوشش (اور عمل) سے حصّہ ہے (تو ایک دُوسرے کی حالت کی تمنّا نہ کرے) اور اللہ سے اُس کا فضل مانگو"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت دی ہو تو اُس شخص سے اُس نعمت کو طلب نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو کہ جس طرح اُس کو نعمت دی ہے تم کو بھی اپنے فضل سے عطا فرمائے۔ کیونکہ جس کے پاس بھی کوئی نعمت ہے وہ اللہ کا فضل و احسان ہے۔ خُدا کے ذمّے نہ کسی کا کچھ آتا ہے نہ کسی کا کوئی استحقاق ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے اذا حسدت فلا تبغ۔ اگر تم کو کسی سے حسد پیدا ہو تو حد سے نہ بڑھو۔ کیونکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ حسد میں ایک سے دُوسرے کی طرف نعمت کا منتقل ہونا مطلوب ہوتا ہے اور انتقال کی دو صُورتیں ہیں، کبھی اس طرح سے انتقال ہوتا ہے کہ صاحبِ نعمت کو پہلے سے بھی زیادہ خیر حاصل ہو جائے۔ مثلاً ایک شخص نے دُوسرے کے پاس کپڑا دیکھا اُس کو تمنّا ہوئی کہ یہ کپڑا مجھے مل جائے اور اُس سے مانگ بھی لیا۔ خُدا نے کپڑے والے کو اُس سے بھی بہتر (کپڑا یا اور) کوئی چیز عطا فرما دی اور اُس نے یہ کپڑا حاسد کو صدقہ کر دیا یا اُس کے ہاتھ بیع کر دیا۔ اس صُورت میں حاسد کا مقصود بھی پُورا ہو گیا اور محسود کی نعمت میں ترقی ہو گئی (ایسے انتقال کی تمنّا حسد حرام نہیں)۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ دُوسرے کی نعمت کا اپنی طرف منتقل ہونا اس

طرح چاہے کہ اُس کو مزید اور نقصان پہنچے۔ مثلاً کسی کے پاس دینوی ساز و سامان دیکھ کر یہ تمنّا کی جائے کہ یہ سامان میرے پاس آجائے اور محسود مر جائے یا قتل ہو جائے یا شہر سے نکال دیا جائے وغیرہ وغیرہ ایسے انتقال کی تمنّا جائز نہیں) یہی مطلب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اذا حسدت فلا تبغ کا کہ حسد میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ یعنی دُوسرے کے نقصان کی تمنّا نہ کرو۔ مناسب تو یہ ہے کہ کسی سے حسد بالکل ہی نہ کیا جائے (اُس کی نعمت کا اپنی طرف منتقل ہونا ہرگز نہ چاہو) اگر کسی کی کوئی چیز تم کو پسند ہو اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگو کہ وہ اپنے فضل سے تم کو بھی یہ نعمت عطا فرما دے۔ اگر اس پر قدرت نہ ہو اور تمہارا دل اُسی چیز کا بعینہٖ طالب ہو تو اُس کے مزید اور نقصان کی تمنّا نہ کرو کہ یہ حد سے تجاوز ہے اور (یہی وہ حسد ہے جو) بہت بڑا گناہ ہے۔

مَیں نے تاریخ میں (ایک واقعہ) دیکھا ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالےٰ نے دُنیا کا ساز و سامان بہت کچھ دیا تھا۔ اُس کو دیکھ کر ایک مسکین نے گلی کوچوں میں بازاروں میں یہ صدا لگانی شروع کی کہ اے اللہ! مجھ پر بھی رزق کا دروازہ اسی طرح کھول دے جیسا فلاں شخص پر کھول دیا ہے اُس مالدار کا نام لے کر پُکارتا۔ تو اُس نے مسکین کو بُلا کر کہا کہ تو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا؟ تجھے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنے کے واسطے یہی بات رہ گئی کہ مجھ جیسا ہونا چاہتا ہے۔ اگر تُو میرا نام لینا نہیں چھوڑے گا تو میری شہرت زیادہ ہو جائے گی (دُنیا میں میری تونگری کا چرچا ہو جائے گا) جس سے ممکن ہے کسی وقت مجھے تکلیف کا سامنا ہو جائے (چور یا ڈاکو میرے درپے ہو گئے تو بڑی مصیبت ہو گی)۔ مسکین نے کہا مَیں تو اپنی صدا کو نہیں بدلوں گا۔ مَیں نہ تجھے گالی دیتا ہوں نہ بُرا کہتا ہوں (اللہ تعالےٰ سے دُعا کرتا ہوں) تو جو میرے جی میں آئے گا، دُعا کر دوں گا (دُعا سے کسی کو روکنے کا حق نہیں) اُس نے کہا اچھا بتلا تو روزانہ

اپنے واسطے کتنی رقم چاہتا ہے۔ مسکین نے کوئی مقدار بتلائی۔ مالدار نے کہا کہ اتنی مقدار روزانہ تجھ کو میرے یہاں سے پہنچ جایا کرے گی تو اپنے گھر میں بیٹھ۔ نہ میرا نام لے نہ کسی سے سوال کر۔

چنانچہ مرتے دم تک اُس نے یہ احسان جاری رکھا اور ایک دن بند نہیں کیا تو اس طرح کی دُعا بھی پکار پکار کر بازاروں گلیوں میں کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں دُوسرے کی نعمت کی طلب اُس کو مضر پہنچا ہے کہ خواہ مخواہ چور ڈاکو اُس کے پیچھے لگ جائیں۔

قوله هل هذا الحسد هنا حقيقة او مجازا الى قوله فبقى يجرى عليه ذلك المعروف حتى توفى۔

ف۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ جو حسد کی حقیقت مشہور ہے کہ دُوسرے کی نعمت کا زوال چاہا جاتے یہ تو صحیح ہے مگر طلب زوال مطلقاً گناہ نہیں۔ گناہ یہ ہے کہ طلب زوال دُوسرے کے ضرر کے ساتھ ہو۔ اگر ضرر کے ساتھ طلب زوال نہ ہو تو یہ حسد حرام میں داخل نہیں گو خلاف اَولیٰ ضرور ہے۔ غبط اور رشک میں دُوسرے سے زوالِ نعمت کی تمنا نہیں ہوتی صرف اپنے لیے اُس جیسی نعمت کی طلب ہوتی ہے۔ یہ جائز ہے اور اس میں بھی تفصیل ہے جو تفسیر بیان القرآن میں تحت آیت ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض۔ مذکور ہے وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔

ف۔ چونکہ حسد بھی اُن امراض قلبیہ سے ہے جس کے ازالہ کا صوفیہ کو بہت اہتمام ہے اس لیے اس تحقیق کو بیان کر دیا گیا۔ افسوس ہے کہ آج کل اس مرض سے اکثر صوفیہ بھی خالی نہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ جہاں کسی کی طرف لوگوں کا رجوع زیادہ ہوا دہ لوگ اس کے دَرپے ہوئے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تصوف کی بُنیاد اخلاص پر ہے اور حسد کے ساتھ اخلاص کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس مرض سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔

(۱۶۴) حکمت سے مراد قرآن و حدیث کی فہم ہے

بظاہر یہاں حکمت سے مراد کتاب اللہ کی سمجھ (قرآن و حدیث کی فہم ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا جس کو حکمت دی گئی اُس کو بڑی خیر دیدی گئی۔ علماء نے (اس کی تفسیر میں) فرمایا ہے کہ حکمت سے مراد کتاب اللہ کا فہم ہے۔ اس کی دلیل خود اسی حدیث کے اس لفظ میں موجود ہے کہ وہ اس کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور (وجود ظہور) اسلام کے بعد کوئی شخص اپنے فیصلہ میں ثواب کا مستحق جب ہی ہو سکتا ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق فیصلہ کرے اور کتاب اللہ کی فہم میں سنتِ رسول کی بھی فہم داخل ہے۔ کیونکہ دونوں حکمت کا مصداق ہیں اور دونوں کے ساتھ فیصلہ کرنے کا ایک ہی حکم ہے۔ یہی وہ دو قیمتی دینی چیزیں ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لن تضلوا ما تمسکتم بھما کہ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور اگر دوسروں کو بھی ان کی تعلیم دی جائے۔ یہ تو درجۂ کمال ہے۔ کیونکہ جو شخص اللہ کی طرف سے (ان کی) فہم دیا گیا ہو اور اس پر خود بھی عمل کرتا ہو اور دوسروں کو تعلیم دیتا ہو وہ تو اعلےٰ مقامات پر فائز ہے۔ یہی لوگ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو اُس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب ختم نہیں ہوتا۔

ایک ولد صالح (نیک لڑکا یا لڑکی) جو اُس کے لیے دُعا کرتا رہے۔ دوسرے صدقہ جاریہ (مسجد مدرسہ و سرائے مسافرخانہ۔ کنواں نہر وغیرہ جو اس کے بعد بھی چلتے رہیں)۔ تیسرے وہ علم جس سے اُس کی موت کے بعد لوگ نفع حاصل کرتے رہیں اور ان تینوں میں اعلیٰ (وافضل) علم ہے اور وہ علم جس میں یہ اجر عظیم حاصل ہوتا ہے وہ کتاب وسنت ہی کا علم ہے۔ یا وہ جو اُن سے

مستنبط ہو (یعنی علم فقہ) ۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص فرض نماز پڑھتا رہے اور (اس کے بعد کسی جگہ) بیٹھ کر خیر کی تعلیم دیتا رہے اُس کو آسمانی بادشاہت میں عظیم (بڑا سردار) کا لقب دیا جاتا ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ کتاب (وسُنت) کی فہم سے کیا مُراد ہے ؟ اگر اوامر و نواہی اور حلال و حرام کا سمجھنا مراد ہے اور کچھ نہیں تو یہ حکمت تو متقدمین کو حاصل ہو چکی۔ پچھلوں کے لیے اس کا کچھ حصّہ باقی نہیں رہا۔ کیونکہ اصول قائم ہو چکے احکام ثابت (ومدون) ہو چکے (اب پچھلوں کا کام صرف اتنا ہے کہ ان ہی قواعد و اصول و فروع سے نئے نئے حادثات کا حکم معلوم کرتے رہیں اور گویہ بھی حکمت ہی میں داخل ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اعلیٰ درجہ کی حکمت مجتہدین اور اُن کے اصحاب کے حصّہ میں آچکی ہے) یا یہ کہ اوامر و نواہی کا علم حاصل کر کے احکام کی حکمتوں (اور ان کے اسرار) کو بھی معلوم کیا جائے۔ قرآن کی امثال و قصص کے فوائد کو سمجھا جائے کہ ہر ہر مثال اور قصّے میں کیا حکمت (اور کیا رازِ مخفی) ہے ؟

اگر یہ مراد ہے تو یہ حکمت تو قیامت تک ختم ہونے والی نہیں۔ اس سے پہلے اور پچھلے سب اپنی قسمت کے موافق حصّہ لے سکتے ہیں۔ اسی کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے ۔ لاتنقضی عجائبه ولا یخلق علی کثرة الرد ولا یشبع منه العلماء ۔ قرآن کے عجائب ختم نہیں ہوں گے وہ باوجود بار بار پڑھنے کے پرانا نہیں ہوتا (ہر دفعہ تازہ بتازہ معلوم ہوتا ہے) اور علماء اس سے سیر نہیں ہو سکتے (بلکہ برابر نئے نئے علوم حاصل کرتے رہیں گے) ۔

اس کی مثال مُوسیٰ علیہ السّلام کے قصّہ میں حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے :

فلما ترآء الجمعان قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون قال کلا ان معی ربی سیهدین ٭ فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم ہ

جب دونوں جماعتیں ایک دُوسرے کو دیکھنے لگیں (یعنی بنی اسرائیل اور قومِ فرعون) تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا یقیناً ہم تو پکڑ لیے گئے (کیونکہ آگے سمندر ہے اور پیچھے دُشمن) فرمایا ہرگز نہیں کیونکہ یقیناً میرے ساتھ میرا پروردگار ہے۔ وہ مجھے (نجات کا) طریقہ بتلائے گا۔ پس ہم نے (فوراً) وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! اپنے عصا کو سمندر پر مارو۔ (اُس کا مارنا تھا) کہ فوراً سمندر پھٹ گیا اور اُس کا ہر حصّہ بڑے پہاڑ کی مانند (کھڑا) ہو گیا (اور درمیان میں خشک راستہ بن گیا)۔ اب معلوم کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ واقعہ کس لیے بیان فرمایا اور اس سے کیا بات سمجھی گئی جس میں ہم کو (موسیٰ علیہ السلام) کی تقلید کرنا چاہیئے؟

میرے علم میں علماء متقدمین نے اس حقیقت سے تعرض نہیں کیا، حالانکہ ہم کو اس قصّہ کا مخاطب بنایا گیا ہے اور یہ واقعات بے فائدہ ہمارے سامنے نہیں بیان کئے گئے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: فاقصص القصص لعلھم یتفکرون۔ ان واقعات کو (لوگوں کے سامنے) بیان کیجئے تاکہ وہ (ان میں) غور کریں۔ پس واللہ اعلم۔ اس قصّہ کا فائدہ یہ ہے کہ چونکہ موسیٰ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر بدون حکم خداوندی کے نہیں نکلے تھے۔ پھر سمندر اُن کے سامنے حائل ہو گیا اور پیچھے سے (دشمن کی) جماعت پہنچ گئی۔ ایک نے دُوسرے کو دیکھ لیا تو عادتِ جاریہ کے موافق بنی اسرائیل کو یقین ہو گیا کہ وہ پکڑ لیے گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے (نجات کا طریقہ) معلوم کرنا چاہا کہ شاید اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت کے لیے کوئی خاص ہدایت ہو جس پر دشمن کا سامنا ہونے کے وقت عمل کرنے کا حکم ہو کیونکہ اُن کا یہ کہنا کہ "ہم تو پکڑے گئے" جبکہ موسیٰ علیہ السلام بھی وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جو انہوں نے دیکھا تھا کہ آگے سمندر ہے اور پیچھے دُشمن ہے اس سے مقصود بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جو کچھ (طریقہ نجات کا) ہو اُسے معلوم کیا جائے (صورتِ حال سے ان کو مطلع کرنا مقصود نہ تھا کیونکہ

صورت حال تو اُن کے سامنے بھی تھی۔ پس یہ جملہ خبر یہ حقیقت میں انشائیہ استفہامیہ تھا) پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھی کوئی چیز نہ تھی جس سے وہ دشمن کا مقابلہ کرتے۔ بس اُن کے پاس اس یقین کے سوا کچھ نہ تھا کہ جس خدا نے اُن کو (مصر سے) نکلنے کا حکم دیا۔ پھر اس حکم کی تعمیل کی توفیق دی وہ اُن کے ساتھ ہے اور وہ اُن کو دشمن کے حوالہ نہ کرے گا۔

موسیٰ علیہ السلام نے عادات جاریہ وغیرہ پر نظر نہ کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت عادت کی پابند نہیں، وہ جو چاہے کرسکتے ہیں جس طرح چاہیں کرسکتے ہیں۔ اس لیے اُنہوں نے (قوت یقین کے ساتھ) جواب دیا کلا ان معی ربی سیہدین ہرگز نہیں (ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا) کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے وہ مجھے (نجات کا) راستہ بتلائے گا۔ گو موسیٰ علیہ السلام کے پُرزور جواب کا حاصل یہ تھا کہ اے قوم! میرے پاس تم سے زیادہ کوئی چیز بجز قوتِ ایمان کے نہیں ہے۔ مجھے اپنے رب پر پُورا اور سچا یقین ہے کہ وہ مجھے میری اور تمہاری سب کی نجات کا راستہ بتلا دے گا۔ چنانچہ وہ جواب سے فارغ بھی نہ ہُوئے تھے کہ فوراً وحی نازل ہوئی فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر کہ اپنے عصا کو سمندر پر مارو۔ اس میں فاء تعقیب بتلا رہی ہے کہ جواب کے ساتھ ہی وحی نازل ہوئی اور یہ کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق (خاص) کی خبر دی اُسی وقت اُن کو (طریق نجات کی) ہدایت ہُوئی جیسا باعظمت و جلال ہستی کی شان کے لائق ہے۔ جب کوئی کمزور اسی پر بھروسہ کرے (اور اُس کی پناہ میں آجائے تو وہ اپنی شان کے مناسب مدد کیا کرتا ہے) چنانچہ اس کے بعد اُن کا اور اُن کے دشمن کا جو انجام ہُوا وہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرما دیا ہے (کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر کا پانی پھٹ کر خشک راستہ بن گیا اور دشمن اُس میں گھُسا تو پانی برابر ہوگیا) اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہوگیا۔ اسی طرح اے مخاطب! جس کے سامنے یہ قصہ بیان کیا گیا ہے اگر تو بھی اپنے پروردگار کے حکم کی پوری طرح تعمیل

کہے گا جیسا تجھ کو حکم ہوا ہے اور خدا کے سوا کسی چیز سے اپنے دل کو نہ لگائے گا تو وہ ہر ضرورت کے موقعہ پر نصرت و کامیابی سے تیری مدد کرے گا۔ ایسے موقع پر تجھ کو عادت جاریہ پر نظر کر کے گھبرانا نہ چاہئے جیسا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا (بلکہ یقین کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ میرے ساتھ ہے وہ ضرور نجات کا رستہ اپنی قدرت سے خلاف عادت پیدا کر دے گا) پس تجھ کو اپنے ایمان میں موسوی المقل ہونا چاہیئے (اور عقل موسوی کا فیصلہ یہی تھا کہ عادت اور اسباب کوئی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ خلاف عادت بھی سب کچھ کر سکتے ہیں) تو تیری ہوائے نفسانی کا فرعون اللہ کی مہربانی سے دریائے ہلاکت میں غرق ہو جائے گا اور ایسے ہی ہر وہ شخص بھی (تباہ ہو جائے گا) جو تیرے ساتھ برائی کا قصد کریگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتے ہیں وکان حقا علینا نصر المؤمنین ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمے حق ہے۔

قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ اسی وعدہ کی تصدیق کے لیے بیان کیا گیا ہے کیونکہ جو قصہ وعدہ کے بعد بیان کیا جاتا ہے اُس سے وعدہ کی تصدیق و تاکید ہی مقصود ہوتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ان تنصروا اللہ ینصرکم اگر تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور بندہ کی طرف اللہ تعالیٰ کی مدد یہی ہے کہ اُس کے امر کا اتباع کرے اور جس چیز سے منع کیا ہے اُس سے دُور رہے (اور یہ حقیقت میں خود اپنی مدد ہے کیونکہ اوامر و نواہی الٰہیہ کی پابندی میں بندہ ہی کا نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نفع نہیں مگر یہ اُن کا لطف و کرم ہے کہ اس کو اللہ کی مدد فرمایا)۔

اس قصہ میں ایک اور بھی لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ جماعت میں اگر ایک شخص بھی بحکم الٰہی کی تعمیل کرنے والا ہو باقی سب اُس شخص کے مطیع ہوں تو سب کی مدد (اللہ کی طرف سے) کی جائے گی۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام جیسا صاحب یقین اُن کے سوا کوئی نہ تھا مگر چونکہ وہ سب اُن کے مطیع تھے تو اس

عجیب وغریب نصرت کی برکت سب ہی کو حاصل ہوگئی ۔

اس میں ایک اور بھی اشارہ ہے جو اس مضمون (سابق) کو مؤکد کر رہا ہے وہ یہ کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل حکم میں سبقت کی (کہ اللہ کے حکم سے مصر سے نکل پڑے) تو انہوں نے سچے یقین کے ساتھ سمجھ لیا کہ حکم دینے والا اپنے بندہ کا ساتھ نہیں چھوڑے گا جو اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے کیونکہ یہ تو وعدہ خلافی ہے اور وعدہ خلافی جناب حق میں محال ہے۔ پس جو شخص یہ جانتا ہو کہ میں حکم الٰہی کے موافق کر رہا ہوں جیسا اُن کا حکم ہے (ویسا ہی کر رہا ہوں) اور تعمیل حکم کا منشأ محض ایمان اور طلب ثواب ہے تو اُس کو نصرت الٰہی میں شک نہ کرنا چاہیئے اور کچھ بھی وسوسہ اور شبہ دل میں نہ لائے ۔ اگر اُس کے دل میں شک نے راہ لی تو تصدیق میں ضعف ہوگا اور تصدیق ہی کا نام ایمان ہے اور ایمان کی کمزوری خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت ہے۔ گو اس کو شعور نہ ہو اور یہ دشمن کی چال ہے ۔ (شیطان اسی طرح انسان کو فریب دیا کرتا ہے) بعض دفعہ اس شک ہی کی وجہ سے نصرت میں دیر ہوتی ہے اور اس تاخیر کی وجہ سے اس کا ضعف یقین بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شقاوت عظمیٰ (بڑی بدبختی) کا سبب بن جاتا ہے اور یہ بھی دشمن کی ایک بڑی چال ہے (کہ اسی طرح وہ مومن کو کفر تک پہنچانا چاہتا ہے)۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں اُن لوگوں کی تعریف کی ہے جو حکم الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے یقین پر جمے رہے۔ جیسا ہم نے ابھی بتلایا ۔ پھر اُن کا کیسا عمدہ انجام ہوا ۔ تو ہم کو بھی اس بات میں اُن کی تقلید کرنا چاہیئے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔ الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل فانقلبوا بنعمۃ من اللہ و فضل لم یمسسھم سوء واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم ۔ "یہ مومن وہ ہیں جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے مقابلہ کو (قریش نے) بہت بڑا لشکر جمع کیا ہے اُن سے ڈرو (اور میدان بدر کا رُخ نہ کرو) تو اس خبر نے اُن

کے یقین و ایمان کو (اور بھی) بڑھا دیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ پس (اس یقین کا) انجام یہ ہُوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ (کامیاب) واپس ہوئے اُن کو ذرا بھی کلفت نے نہ چھوا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رضامندی اُن کو حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل وکرم والے ہیں۔

ف ۔ قرآن کی امثال و قصص سے ایسے فوائد معلوم کرنا جن سے مسلمانوں کو اپنی حالت کی اصلاح و استقامت میں مدد ملے علم اعتبار کہلاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا استنباط ہے۔ جیسا آیاتِ احکام سے فقہاء استنباط کرتے ہیں اس کو قرآن کی تفسیر نہیں کہنا چاہیئے بلکہ عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے لیے ان فوائد سے مستفید ہونا چاہیئے۔ بعض نا واقفوں نے صوفیہ کے ان اشارات و اعتبارات کو قرآن کی تفسیر سمجھ لیا ہے یہ اُن کی غلطی ہے۔ تفسیر وہی ہے جو لغت عرب اور محاورات عرب کے موافق کلام کا مدلول ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہوگا استنباط و اعتبار کہلائے گا۔

ف ۔ قرآن و حدیث میں جہاں حکمت کا لفظ آتا ہے اُس سے مراد دین کی سمجھ ہے یا ہر وہ بات جو دین کے لیے نافع ہو۔ فلسفہ کو حکمت کہنا اور فلاسفہ کو حکماء کہنا بعد کی اصطلاح ہے۔

ف ۔ قرآن کی امثال و قصص سے اس قسم کے فوائد و لطائف استنباط کرنا جو اس مقام پر مذکور ہیں حضرات صوفیہ کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی وہ حکمت ہے جو قیامت تک ختم نہ ہوگی۔ یہاں سے تصوف کی اہمیت ظاہر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱۶۵) تمنّائے خیر بھی مُفید ہے گو وہ خیر حاصل نہ ہو

شاید اس جگہ کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ہمیں دُنیا یا آخرت میں اُس

سے کیا فائدہ ہو گا کہ ہم کسی ایسے مالدار کی حالت کی تمنا کریں جو مواقع خیر میں اپنا مال خرچ کرتا ہے یا کسی عالم کی حالت کی تمنا کریں جو علم سے فیصلہ کرتا اور دُوسروں کو تعلیم بھی دیتا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شخص میں اس کی اہلیت نہیں تو جو شخص بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا وہ کیونکر ایک عالم کی حالت کی تمنا کر سکتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ میں کسی طرح اُس کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

جواب یہ ہے کہ (تمنا تو محال کی بھی ہو سکتی ہے اور یہ تو امور ممکنہ ہیں اُن کی تمنا بدرجہ اولیٰ ہو سکتی ہے پس) اگر یہ شخص اللہ کے ساتھ اخلاص سے معاملہ کر کے (سچے دل سے) اُسی کی حالت کی تمنا کرے گا اس کو اس کے برابر ثواب ملے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دُنیا چار شخصوں کے لیے ہے (یعنی دُنیا میں چار قسم کے آدمی ہیں) ایک وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے مال بھی دیا علم بھی دیا وہ اس مال (کے حاصل کرنے اور خرچ کرنے) میں اپنے خُدا سے ڈرتا ہے۔ (حرام طریقہ سے کمانے اور حرام کاموں میں خرچ کرنے سے بچتا ہے) اُس سے اپنی قرابت کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اس میں اللہ تعالےٰ کا بھی حق ہے (زکوٰۃ وصدقہ وغیرہ اور اُن حقوق کو پُوری طرح ادا کرتا ہے) یہ تو سب سے افضل (واعلیٰ) درجہ میں ہے۔ ایک وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے علم تو دیا مال نہیں دیا تو وہ سچی نیت کے ساتھ اللہ سے کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا میں بھی فلاں (مالدار عالم صالح) کی طرح کام کرتا۔ ان دونوں کا ثواب برابر ہے۔

ایک وہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے مال دیا علم نہیں دیا اور وہ جہل کی وجہ سے مال میں گڑبڑ کرتا ہے۔ نہ اُس (کے کمانے اور خرچ کرنے) میں اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہے اور نہ اُس سے صلہ رحمی کرتا ہے۔ نہ اُس میں وہ اللہ تعالےٰ کا کچھ حق جانتا ہے یہ سب سے بدتر درجہ میں ہے۔ ایک وہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے نہ علم دیا نہ مال دیا اور وہ (اپنے دل میں) یوں

کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں (جاہل مالدار) کی طرح کام کرتا (مزے اُڑاتا اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا) تو یہ اپنی نیت کے ساتھ ہے۔ ان دونوں کا گناہ برابر ہے۔

اس حدیث میں علم سے مراد یہ ہے کہ مال میں اللہ تعالیٰ کا حق معلوم ہو اور اتنا علم تو قریب قریب ہر شخص کو ہوتا ہی ہے بجز معدودے چند کے اور جب یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھی مال میں حق ہے مگر اُس کے ادا کرنے کا طریقہ معلوم نہیں تو اس کو علماء سے دریافت کر کے اُن کے فتوے کے موافق عمل کرنا چاہیئے۔ پس اوّل تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مال میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے پھر اُس کے ادا کرنے کا عزم ہونا چاہیئے۔ پھر اُس کا طریقہ دریافت کرنا چاہیئے۔ پھر طرق واجبہ اور مستحبہ میں مال خرچ کرنا چاہیئے۔ جس کو یہ علم حاصل ہو اُس کو عالم کہا جائے گا (کیونکہ حقوق مال کے متعلق جتنا علم ضروری ہے وہ اس کو حاصل ہے)۔

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اُمت کے ساتھ بے انتہا خیرخواہی واضح ہے کہ آپ اُن کو ہر اُس چیز کی ہدایت فرماتے ہیں جس سے دونوں جہان میں نفع حاصل ہے۔ چنانچہ ان دو چیزوں میں حسد (اور رشک) کو جائز فرمایا تاکہ رشک کرنے والے کو بھی یہ بلند درجہ حاصل ہو جائے جس کے حاصل ہونے کا طریقہ اُس کو معلوم نہ تھا (کیونکہ مفلس اور بے علم آدمی کیونکر سمجھ سکتا ہے کہ مجھے افلاس اور جہل کی حالت میں بھی مالداروں اور عالموں کی برابر درجہ مل سکتا ہے)۔ حکایت ہے کہ بنی اسرائیل پر ایک دفعہ سخت قحط ہوا تو اُن کا ایک عابد ریت کے ٹیلہ پر سے گزرا اور دل سے یہ تمنا کی کہ اگر میرے پاس ریت کے اس ٹیلہ کے برابر غلہ ہوتا تو بنی اسرائیل پر صدقہ کر دیتا۔ سچی نیت سے تمنا کی تھی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کا معاملہ سچا تھا تو اُس زمانے کے نبی پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی کہ فلاں عابد سے کہہ دو کہ میں نے اُس کا صدقہ

قبول کرلیا ہے۔ پس سیّدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ہم کو بھی لطیف پیرایہ میں عمدہ تعلیم سے خیر کے وہ تمام خزانے بتلادیں جو پہلی اُمتوں نے حاصل کئے تھے۔ اس طرح اگر کسی شخص کی عمر علم حاصل کرنے کے قابل نہیں رہی وہ اگر کسی عالم کی حالت کی تمنا کرے گا اُس کو اس نیت اور عزم کا ثواب ملے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے نیۃ المؤمن خیر من عملہ مومن کی نیت اُس کے عمل سے زیادہ (اللہ کے یہاں) پہنچنے والی ہے۔ ایک دین دار بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے ایک بیمار بھائی کے پاس (بیمار پُرسی کو) گئے تو بیمار نے کہا قصد کر لیجئے کہ ہم سب مل کر حج کو چلیں گے۔ پھر سب ملکر جہاد کریں گے۔ پھر سب مل کر سرحد اسلام کی حفاظت کریں گے۔ بزرگ نے کہا بھائی صاحب! آپ کی حالت تو یہ ہے کہ (بستر سے لگے ہُوئے ہیں اور ارادے یہ ہیں) کہا اگر زندہ رہے تو ارادہ پُورا کر کے رہیں گے اور مر گئے تو ہم کو نیت کا ثواب ملے گا بلکہ سچّی نیت ہو (سچّے دل سے ارادہ ہو) یہ لوگ ہیں وہ جو اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ کی بات کو سمجھتے ہیں۔

پھر اس کے ساتھ اس تمنّا سے دو باتیں اور بھی حاصل ہوں گی۔ ایک اپنی عمر برباد جانے پر ندامت ہوگی (کہ میں نے فلاں عالم کی طرح اپنی عمر کو تحصیلِ علم میں کیوں خرچ نہ کیا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الندم توبۃ " ندامت ہی کا نام توبہ ہے۔ دُوسرے اس کو اہل خیر سے محبت ہوگی دُوسروں سے اُن کو افضل سمجھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے المرأ مع من احب۔ آدمی اُسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرے گا۔ (مراد حبِ عقلی ہے حبِ طبعی نہیں۔ پس اگر کسی کو کسی کافر یا فاسق عورت سے عشق بلا اختیار ہو جائے مگر عقلاً وہ اللہ و رسول اور اہل اللہ سے محبت رکھتا ہے تو وہ اہل اللہ کے ساتھ ہی رہے گا انشاء اللہ تعالےٰ) اور کبھی کسی بات میں جو اُن سے سُنیے گا اُس کو ان کی اتباع بھی نصیب ہو جائے گی۔

اس میں اور اُن میں کسی قدر مناسبت (اور موافقت) ہو جائے گی والتشبہ بالکرام فلاح اور بزرگوں کے ساتھ مشابہت حاصل کرنا بھی فلاح (اور کامیابی) ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ سچا ہوا تو بطور خرق عادت کے اللہ تعالےٰ اُس کے لیے علم کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ جیسا فتوح الشام میں یوقنا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ عربی زبان بالکل نہ جانتے تھے جب مسلمانوں نے اُن کا قلعہ فتح کر کے اُن کو قید کر لیا تو صبح کو وہ عربی بولنے لگے اور قرآن حکیم کی چند سورتیں حفظ پڑھنے لگے اور اسلام لے آئے۔ مسلمانوں کے امیر نے پوچھا کہ یہ حالت تم کو کیونکر عطا ہوئی؟ تو بتلایا کہ میں نے رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا۔ آپ نے مجھ کو عربی زبان سکھلا دی اور قرآن کی سورتیں یاد کرائیں۔ پھر مسلمانوں کو اُن کے اسلام سے بہت نفع پہنچا۔

یہ حکایت ہم نے صرف اس لیے بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ علم بطور خرق عادت کے بھی حاصل ہو سکتا ہے (تو اُس کی تمنا لغو اور بے فائدہ نہیں ہو سکتی) یا اللہ تعالےٰ اس (تمنا کرنے والے) کو اُس کی برکت سے اُسی طرح مال دے دیتے ہیں جیسا مال دار کو دیا ہے (تو یہ تمنا بھی بے فائدہ نہیں۔ کیونکہ مال تو صبح و شام آنے جانے والا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ دم کے دم میں کسی مفلس کو مال دار بنا دے خصوصاً جبکہ اُس کی نیت یہ ہو کہ مال حاصل ہونے پر نیک کاموں میں خرچ کرے گا۔ غریبوں کی امداد کرے گا۔ قرابت داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کرے گا)۔

اگر بطور خرق عادات کے یہ مالدار نہ بھی ہوا تو اس نیت کا ثواب تو اُس کو ملتا رہے گا۔ پس ہم نے جو بات اُوپر کہی تھی وہ (اچھی طرح) واضح ہو گئی کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اُمت کے ساتھ غایت شفقت اور حسنِ تعلیم پر دلالت ہے (کہ حضورؐ نے) اپنی اُمت کو وہ تمام باتیں

بتلادی ہیں جن سے اُن کو دونوں جہانوں میں فائدہ حاصل ہو) اس حدیث سے چند علمی مسائل اور بھی معلوم ہوگئے۔

ایک یہ کہ حدیث و قرآن کے سمجھنے میں پُوری کوشش کرنا چاہیئے کیونکہ ان دونوں ہی میں بڑی خیر و برکت ہے۔ دُوسرے یہ کہ جس کو اپنے ماتحتوں پر کچھ بھی ولایت (اور حکومت) حاصل ہو اُس کو سوچنا چاہیئے کہ وہ اُن کو کس طرح اپنے حسنِ تعلیم سے خیر (اور نفع) پہنچا سکتا ہے تاکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء (اس سُنّت میں بھی) ہو جائے: اگر اور کسی پر زور نہ ہو تو اپنے نفس پر تو ہر شخص کا زور ہے (تو کم از کم اپنے آپ ہی کو نفع اور خیر پہنچانے کے طریقے سوچا کرے)۔

حدیث میں اس پر بھی اشارہ ہے کہ علم سے پُورا نفع بدون عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دیقضی بہا کہ ایک شخص کو اللہ تعالےٰ نے علم دیا ہے تو وہ اُس کے موافق فیصلہ کرتا ہے " (معلوم ہُوا کہ عالم کی حالت قابلِ رشک اُسی وقت ہے جب وہ اُس پر عمل کرتا ہو)۔

اور اس میں صوفیہ (کے اس عمل) کی بھی دلیل ہے کہ اُن میں سے ہر شخص دُوسرے سے یہ سوال (پہلے) کرتا ہے کہ تمہارا مقام (آج کل) کون سا ہے ؟ اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق کیسا ہے ؟ یہ سوال وہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس ترقی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نصیب ہو۔ (کیونکہ حضورؐ یہی چاہتے ہیں کہ مُسلمان برابر ترقی میں رہے تنزل نہ ہونے پائے۔ اگر عمل سے ترقی نہ کر سکے نیّت خیر ہی سے ترقی کرے) اور تاکہ ایک کو دُوسرے کی حالت پر رشک ہو (تو وہ بھی اُس مقام کے لیے کوشش کرے جو دُوسرے کو حاصل ہے۔ اگر وہ مقام حاصل نہ بھی ہُوا تو کوشش اور نیّت کی برکت سے ہی اُس کے برابر ہو جائے گا)۔

اسی لیے (کسی عارف نے) فرمایا ہے جب میرا نفس آپ کا (غلام) ہو جائے اور آپ میرے ہو جائیں تو میں دونوں جہان کا مالک ہوں۔ دونوں جہان میرے ہیں۔

قولہ وقد یقول السامعون او بعضھم ذالک فائدۃ لنا الی قولہ فانا صاحب الدارین وھمالی۔

ف۔ واقعی فقہاء اور صوفیہ ہی سچے حکماء ہیں۔ دیکھو اس حدیث سے اُن عجیب وغریب فوائد کو معلوم کرنا کتنی بڑی حکمت ہے جو اللہ تعالےٰ نے صوفیہ کو عطا فرمائی ہے۔ اے اللہ! میری تمنا سچے دل سے یہ ہے کہ میری بقیہ عمر درسِ قرآن اور درسِ حدیث میں تمام ہو اور عافیت اور راحت وطمانیت اور دل جمعی بدرجۂ اتم مجھے عطا ہو۔ زندگی دُنیا میں بھی اور موت کے وقت بھی اور موت کے بعد قبر میں بھی اور میدانِ حشر میں بھی اور اے اللہ! مجھے اور میرے اہل وعیال واحباب کو بھی یہ دولتیں عطا ہوں۔

ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔



باب ۱۱

حدیث

فضل الصدقة

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نے (اپنے دل میں) کہا میں (آج) ضرور کچھ صدقہ کروں گا۔ وہ اپنے صدقہ (خیرات کا مال) لے کر نکلا اور ایک چور کے ہاتھ میں دے دیا۔ صبح کو لوگوں میں چرچا ہوا کہ (رات) ایک چور کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اُس نے کہا اے اللہ! آپ ہی کے لیے حمد ہے۔ میں (آج پھر) ضرور صدقہ کروں گا وہ (رات کو) پھر صدقہ لے کر نکلا اور ایک زناکار عورت کو دے دیا۔ صبح کو لوگوں میں چرچا ہوا کہ آج رات ایک زانیہ پر صدقہ کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا اے اللہ: آپ ہی کے لیے حمد ہے۔ میں (آج پھر) ضرور صدقہ کروں گا وہ (رات کو) پھر صدقہ لے کر نکلا اور ایک غنی کو دے دیا۔ صبح کو چرچا ہوا کہ آج (رات) غنی کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اُس نے کہا اے اللہ! آپ ہی کے لیے حمد ہے چور (کے صدقہ) پر اور زانیہ (کے صدقہ) پر اور غنی (کے صدقہ) پر، تو اُس کے پاس پیام پہنچا کہ تیرا چور کو صدقہ دینا (بیکار نہیں گیا)۔ اُمید ہے کہ وہ چوری سے باز آ جائے اور زانیہ پر صدقہ (بھی بیکار نہیں گیا) اُمید ہے کہ وہ زنا سے بچ جائے اور غنی پر صدقہ (بھی بیکار نہیں گیا) اُمید ہے کہ اُس کو عبرت ہو جائے اور وہ بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت سے خرچ کرنے لگے"۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہُوا کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ حُسنِ معاملہ کو جاری رکھنا رفعت درجات کا سبب ہے ۔

(دیکھو اُس شخص نے اللہ تعالےٰ کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا کہ مَیں صدقہ کردوں گا اُس پر برابر جارہا ۔ ایک صدقہ کے بے محل صَرَف ہونے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ صدقہ کرتا رہا تو اُس کے درجاتِ قرب میں ترقی ہوتی رہی اور ہر صدقہ قبول ہوتا رہا کوئی بھی بیکار نہ گیا اگرچہ بظاہر بے محل صرف ہُوا تھا) ۔

(۱۶۶) صدقۂ نافلہ چُھپا کر دینا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ چُھپا کر صدقہ کرنا افضل ہے پہلی شریعتوں میں بھی یہ حکم ہماری شریعت کی طرح تھا کیونکہ سیاق حدیث بتلا رہا ہے کہ یہ صدقہ رات کو کیا گیا تھا (اور بعض الفاظ میں اس کی تصریح بھی ہے) منها الدليل على صدقة السر الى قوله فاصبح الناس ـــــ يتحدثون ۔

ف صوفیہ کو اس کا بہت اہتمام ہے مگر یہ حکم صدقۂ نافلہ کے لیے ہے ۔ فرض کا اخفاء بہتر نہیں اُس کو علانیہ دینا چاہیئے جیسا نماز میں نفل کا اخفا افضل ہے اور فرض کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا لازم ہے ۔

(۱۶۷) اپنے دل سے نیک عمل کے متعلق باتیں کرنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ اپنے دل سے اچھے کام کے متعلق باتیں کرنا جائز ہیں ۔ کیونکہ اس شخص نے کہا تھا کہ مَیں آج ضرور صدقہ کروں گا اور حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ کسی سے کہا تھا ۔ تو معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنے دل سے کہا تھا اور اس میں فائدہ یہ ہے کہ نیت اچھی طرح محقق (اور مضبوط) ہو جاتی ہے ۔ وفيه دليل على جواز معاوضة المرأمع نفسه الى قوله تحقيق النية ۔

ف ۔ اس سے فقہاء حنفیہ کے اس قول کی دلیل واضح ہو گئی کہ نماز وغیرہ میں زبان سے بھی نیت کر لینا اچھا ہے ۔ اہلِ ظاہر نے اس کو بدعت کہا ہے مگر اُنھوں نے

اس حدیث میں غور نہیں کیا۔

(۱۶۸) عمل میں اخلاص کا اہتمام ہی کامیابی کا وسیلہ ہے حدیث سے معلوم ہُوا

کہ عمل کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا اور آمیزش (نفس و غرض) سے پاک کرنا ہی کامیابی کا بڑا وسیلہ ہے۔ دیکھو (اُس شخص نے خالص رضائے حق کے لیے عمل کیا تو) اُس پر کیسا فضل ہُوا اور کیسی بشارت دی گئی کہ امید ہے ایسا ہو، امید ہے ایسا ہو، امید ہے ایسا ہو۔ جب اُس نے اپنی سی کوشش خرچ کر دی اور مقدر سے جو کچھ پیش آیا اُس پر راضی رہا (تو اللہ تعالیٰ نے اُس کا ہر صدقہ قبول فرمایا اور اسی کے برمحل ہونے کی بشارت دی) اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ صدقہ کے لیے معرفِ خیر کا تلاش کرنا پہلی شریعتوں میں بھی مطلوب تھا جیسا ہماری شریعت میں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تخیروا لصدقاتکم اپنے صدقات کے لیے معرفِ خیر تلاش کرو اور اس حدیث میں بھی ہے کہ جب اُس شخص نے سُنا کہ اس کا صدقہ غیر مستحق کے پاس پہنچا ہے تو اُس نے صدقہ کا اعادہ کیا۔ وفیہ دلیل علی ان تحقیق العمل للہ تعالیٰ الیٰ قولہ فی غیر مستوجب لھا۔

ف۔ اس حدیث کی شرح میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ صدقہ نفل تھا یا فرض۔ حضرت شارح کی رائے یہ ہے کہ یہ صدقہ فرض نہ تھا بلکہ مستحب تھا کیونکہ تیسری دفعہ بھی اُس کا صدقہ بے محل صرف ہُوا تھا۔ پھر اُس نے اعادہ نہیں کیا۔ اگر فرض ہوتا تو پھر اعادہ کرتا۔ مگر یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہوگا۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ جب صدقہ کرنے والا اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ گمان کر کے کسی کو صدقہ دے کہ یہ فقیر محتاج اور مستحق ہے بعد میں معلوم ہو کہ مستحق نہ تھا تو صدقہ ادا ہو جائے گا خواہ فرض ہو یا نفل البتہ اگر بعد میں یہ معلوم ہو کہ صدقہ لینے والا اس کا بیٹا یا مثلاً بیوی یا شوہر ہے تو فرض کا اعادہ لازم ہے کیونکہ صدقہ گھر ہی میں لوٹ آیا

ہے باہر نہیں گیا اور اگر صدقہ نافلہ ہو تو اعادہ لازم نہیں۔ کیونکہ صدقۂ نفل ہر شخص پر
ہو سکتا ہے خواہ اولاد و اصول ہی کیوں نہ ہوں اور اُس شخص نے جو صدقہ کا ارادہ
کیا تو یہ عزیمت تھی اور عزیمت پر عمل کرنا افضل ہے یا ممکن ہے پہلی اُمتوں کے لیے
اس صورت میں اعادہ لازم ہو۔ آج کل صدقہ کے لیے مصرف تلاش کرنے میں بہت
کوتاہی ہو رہی ہے۔ عام طور سے صدقات و زکوٰۃ کا روپیہ سائلوں کو یا چندہ
مانگنے والوں کو دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُس کے زیادہ مستحق وہ لوگ ہیں جو خود
نہ اپنے واسطے سوال کرتے ہیں نہ کسی مدرسہ اور انجمن کے واسطے چندہ کرتے ہیں۔
للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض
یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف ط۔

مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرضِ وفات میں فرمایا کہ زکوٰۃ
کا درجہ ہدیہ سے کمتر ہے (گو زکوٰۃ فرض اور ہدیہ سُنت مگر بعض دفعہ سُنت
فرض سے بڑھ جاتی ہے جیسے تلاوتِ قرآن سُنت ہے اور اُس کا سُننا اُس شخص
پر جس کو آواز پہنچ رہی ہے فرض ہے مگر تلاوت کا درجہ سماع سے زیادہ
ہے۔ اسی طرح ابتداءً سلام کرنا سُنت ہے اور اُس کا جواب دینا فرض ہے۔
مگر ابتداءً سلام کا درجہ جواب سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ فرض ہے مگر
وہ مال کو پاک کرنے والی ہے اور ہدیہ سُنت ہے مگر وہ قلبِ مُسلم کو خوش
کرنے کے واسطے ہے اس لیے اس کا درجہ زکوٰۃ سے بڑھا ہوا ہے۔

پھر فرمایا زکوٰۃ دینے والوں پر مصرف کا تفقد لازم ہے۔ جو شخص جس قدر
اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کرکے صبر کرتا ہے اسی قدر اہلِ اموال پر بقدر اُس کے
صبر کے اُس کی امداد لازم ہو جاتی ہے یہ ہیں اصل مصارف زکوٰۃ کے۔ مگر یہ
اہلِ اموال سائلین کو اور چندہ والوں کو دے کر سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

پھر فرمایا کہ جس شخص کے مال میں زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد برکت نہ ہو سمجھ
لو کہ اُس نے زکوٰۃ مصرف میں نہیں دی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے:

یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات۔ اللہ تعالیٰ سُود کو مٹا دیتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

(۱۶۹) ظاہر پر ہی حکم لگایا جائے گا حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکم ظاہر پر لگایا جائے گا جب تک اُس کے خلاف پر دلیل قائم نہ ہو اور یہ کہ تمام ادیان (سابقہ) میں اُسی پر عمل تھا کیونکہ یہ شخص رات کو نکلا اور ان لوگوں کو (جن پر صدقہ کیا گیا) بظاہر مسکین سمجھا تو اُس نے اُن کی ظاہری حالت کے موافق عمل کیا اور صدقہ دے دیا۔ جب اُس کے گمان کے خلاف ثابت ہُوا تو اُس نے عمل کا اعادہ کیا۔

حدیث میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے سچے دل سے کوئی چیز خیرات کرے اور مال حلال طیب ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کو ضائع نہیں فرماتے بلکہ اُس کی خیرات کو اُس کی تجویز سے بہتر مصرف میں پہنچا دیتے ہیں۔ جیسا حدیث کے آخر میں بشارت کے مضمون سے واضح ہے اور اُس میں جو اُمید کا لفظ ہے یہ شک کے واسطے نہیں بلکہ یقین کے واسطے ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے۔ جس سے مقصود تسلی ہے اور تسلی یقینی خبر ہی سے ہو سکتی ہے (اگر محاورات شاہی میں وعدہ کے موقع پر امید ہی کا لفظ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ اُس کا حق بادشاہ پر ہے بلکہ وعدۂ شاہی کو محض فضل و کرم سمجھے۔

عجیب حکایت اس موقع کے مناسب ایک شخص کی حکایت ہے کہ اُس کے دل میں یہ بات آئی کہ اللہ کے لیے سو دینار (اشرفیاں) خیرات کرو۔ وہ ایک بزرگ کے پاس گیا اور عرض کی حضرت مجھے بتلایئے یہ خیرات کس کو دوں؟ فرمایا کل کو سویرے شہر پناہ پر پہنچ جاؤ جو شخص سب سے پہلے تم کو ملے اُس کو دے دو۔ اُس نے ایسا ہی کیا تو سب سے پہلے ایک شخص ملا، جو دُنیادار (مالدار) مشہور تھا اور اُس کی حالت سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا لباس اور ظاہری شان سے فقیر مسکین معلوم نہ ہوتا تھا) اُس نے دل میں کہا کہ اس غنی کو

صدقہ کیونکر دوں۔ پھر خیال کیا کہ شیخ مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں اور اُن کے ارشاد پر عمل کرنا چاہیے، چنانچہ مال اُس کے حوالے کر دیا۔ مال دینے کے بعد دل میں خلجان پیدا ہوا تو اُس نے کہا کہ میں بھی اُس کے پیچھے رہوں گا دیکھوں یہ کیا کرتا ہے؟ چنانچہ دُور سے اُس کے پیچھے ہو لیا کہ اُس کو خبر نہ ہو، تو دیکھا کہ اُس نے ایک ویرانہ میں جاکر اپنے کپڑے کے نیچے سے کوئی چیز نکال کر پھینکی ہے۔ اُس نے وہاں جاکر دیکھا تو مری ہوئی مرغی تھی۔ یہ پھر اُس کے پاس چلا یہاں تک کہ وہ گھر میں داخل ہو گیا تو اُس نے دروازہ کے پیچھے کھڑا ہو کر کان لگائے اور سُنا کہ وہ اپنے بال بچوں سے کہہ رہا ہے خوش ہو جاؤ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے فتوحات بھیجی ہیں اور سارا قصہ بیان کیا۔

وہ سب خوش ہو گئے۔ پھر وہ بازار گیا اور گھر والوں کے لیے کھانا خریدا۔ یہ بھی اُس کے پیچھے رہا اور ساتھ ہی لوٹا تو کھانے کو دیکھ کر بال بچوں کی خوشی بڑی دیکھی۔ اُن کی باتیں بھی سنیں تو معلوم ہوا کہ سب فاقہ سے تھے۔ اُس نے اس پر بس نہ کیا، بلکہ جب یہ شخص کھانے پینے سے فارغ ہو کر باہر آیا تو قسم دے کر اُس کا حال پُوچھا۔ اُس نے کہا تین دن سے ہمارے گھر میں کچھ نہیں تھا اور سب فاقہ سے تھے، میرے پاس کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جس کو بیچ کر کھانا لاتا۔ صرف یہ کپڑے بدن پر ہیں جن سے اپنی پردہ پوشی کرتا، ورنہ یہ لوگ اس شاندار لباس کو دیکھ کر مجھے مالدار سمجھتے ہیں)۔

آج میں گھر سے نکلا کہ شاید کوئی چیز مل جائے جس کے ذریعہ ان کا فاقہ توڑوں، تو میں نے وہ مرغی مری ہوئی پائی جس کو تم نے مجھے پھینکتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دل میں) کہا اللہ کا شکر ہے آج ہم اس سے کچھ سہارا کریں گے کل کو اللہ تعالیٰ اور کچھ دے گا۔ میں اُس کو لے کر جا رہا تھا کہ تم نے مجھے وہ رقم دی تو اب مردار ہمارے واسطے حرام تھا۔ میں نے اُس کو پھینک دیا اور تمہارے مال سے کھانا خریدا) اب تو یہ شخص بڑا خوش ہوا اور جاکر شیخ سے سارا قصہ بیان کیا۔

فرمایا برخوردارِ من! جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچائی کا معاملہ کرتا ہے اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی سُنت (اور عادت) یہی ہے کہ اُس کے واسطے سب سے بہتر اور عمدہ حالت تجویز فرماتے ہیں"۔ قولہ وفیہ دلیل علی ان الحکمہ للتخاص الی قولہ خیر الامور واحسنہا؟

ف ۔ عزیز من! تمام تر مدار سچائی اور خلوص پر ہے اس کے لیے اہلِ طریق نے یہ ریاضات و مجاہدات تجویز فرمائے ہیں جو صوفیہ میں رائج ہیں۔ مگر سمجھ لو کہ ریاضات و مجاہدات خود مطلوب نہیں بلکہ اُن کے ذریعہ صدق و خلوص کی تحصیل مطلوب ہے۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو ریاضات و مجاہدات سب بیکار ہیں اور یہ حاصل ہو جائے تو سب کارآمد ہیں اور اگر بدون مجاہدہ و ریاضت کے کسی کو یہ دولت مل جائے تو اُس کو مجاہدہ و ریاضت کی اصلاً حاجت نہیں۔ پس تقوے و کثرتِ ذکر کافی ہے۔

ف ۔ ظاہر پر حکم لگانا صُوفیہ کے یہاں بھی معمول ہے۔ پس جو لوگ مشائخ کے اعمال و احکام کو حقیقت پر مبنی سمجھتے ہیں۔ غلط ہے حقیقت الامر کی خبر اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لا یعلم الغیب الا ھو اور معصوم بجز نبی کے کوئی نہیں خواہ کتنا ہی بڑا ولی ہو، صوفیہ کو اپنے مشائخ کے ساتھ محبت و عقیدت تو لازم ہے مگر عقیدت کو حد سے نہ بڑھانا چاہیئے۔ جب عقیدت حد سے بڑھ جاتی ہے شخصیت پرستی پیدا ہو جاتی ہے جو تعلیمِ اسلام کے خلاف ہے۔

(۱۶۰) تسلیم و رضا کی برکت حدیث سے تسلیم و رضا کی برکت بھی معلوم ہو گئی۔ کیونکہ اس شخص کی کوشش بناہر ہر دفعہ ناکام رہی۔ مگر وہ تنگدل نہ ہوا اور ہر دفعہ تسلیم و رضا (کی شان سے اللہ تعالیٰ کی حمد) کرتا رہا اور اپنے معاملے کا اعادہ کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کو بشارت سے نوازا گیا۔ وفیہ دلیل علی برکۃ التسلیم والرضا الی قولہ فاعقبہ تلک البشارۃ۔

ف - تسلیم و رضا کا دُوسرا نام تفویض ہے کہ معاملہ اللہ تعالٰے کے سپرد کر دے اور اُس کی رضا پر راضی رہے - صوفیہ کی یہ خاص شان ہے ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ   در کف شیر نر خونخوارۂ

(۱۷۱) مالداروں میں حرص زیادہ ہوتی ہے حدیث سے معلوم ہُوا کہ اکثر مالداروں میں حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ دیکھو اُس شخص نے آخر میں جس کو صدقہ دیا وہ غنی تھا۔ گر اُس نے صدقہ لے لیا۔ حالانکہ وہ اُس کا مستحق نہ تھا اور اگر مالداروں میں حرص زیادہ نہ ہوتی تو اُن کے پاس مال ہی نہ جمع ہوتا (الا ماشاء اللہ) وفیہ دلیل علی ان غلبۃ الشح فی الغالب من الاغنیاء الیٰ قولہ ما اجتمع المال لھم فی الا غلب منھم -

ف - عام طور پر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مالداروں میں حرص نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُن کے پاس تو بہت کچھ ہے اُن کی نیت بھری ہوتی ہے۔ دل غنی ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں جو مالدار باقاعدہ زکوٰۃ و صدقات ادا کرتے ہیں اُن کا تو دل غنی ہوتا ہے مگر جو زکوٰۃ نہیں نکالتے اُن میں غریبوں سے زیادہ حرص ہوتی ہے۔ اس لیے اہل اموال کے ہدایا میں غرباء کے ہدایا سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے -

اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ بڈھوں کی نظر جوانوں سے زیادہ پاک ہوتی ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں - بڈھوں میں شہوت زیادہ ہوتی ہے گو جھوٹی ہی شہوت ہو - جوانوں میں شہوت کم ہوتی ہے مگر جب ہوتی ہے سچی ہوتی ہے۔ جیسے بُڈھوں کو بھوک زیادہ لگتی ہے گو اُن سے کھایا نہیں جاتا بہت تھوڑا کھاتے ہیں اور یہ جھوٹی بھوک ہے جو اُن کو بار بار ستاتی ہے - اُن کو بھوک کی سہار نہیں ہوتی اور جوان کو بھوک زیادہ نہیں لگتی - اپنے وقت پر لگتی ہے اور سچی بھوک لگتی ہے - پس بُڈھوں سے جوان عورتوں کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے گر یہ کہ بالکل گودڑ کا حریرہ ہو گیا ہو تو وہ غیر اولی الاربۃ من الرجال میں داخل ہوگا۔ یہاں

سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو اپنی عورتوں کو پیروں کے سامنے بے پردہ لاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ حضرت تو بوڑھے ہوگئے ہیں ان سے پردہ کی کیا ضرورت ہے اور اُن مشائخ کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو عموماً مالداروں کے ہدایا کو خلوص پر مبنی سمجھتے ہیں۔

(۱۷۲) بندگی کو قطع نہ کرو اگرچہ بظاہر قبول کی امید نہ ہو!

اس حدیث میں صوفیہ کے اس قول کی بھی دلیل ہے کہ خدمت کو قطع نہ کرو اگرچہ بظاہر اُس کے قبول ہونے کی اُمید نہ ہو یا قبول نہ ہونا محقق بھی ہو جائے کیونکہ غلام کو اپنے مولیٰ کی خدمت سے چارہ نہیں۔

دوسرے یہ خدمت ہی سے قبول کی امید کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے واقعات میں مذکور ہے کہ اُن میں ایک عابد نے برسوں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تو اُس زمانے کے نبی پر وحی آئی کہ میرے فلاں بندہ سے کہہ دو جتنی چاہے عبادت کرے وہ جہنمی ہے۔ نبی نے اس کو یہ پیغام پہنچا دیا۔ اُس نے کہا میرے پروردگار! کے فیصلہ پر آفرین ہے۔ پھر اپنے گھر واپس آیا اور پہلے سے بھی زیادہ عبادت کرنے لگا اور عرض کیا خداوندا! میں تو آپ کی عبادت اُس وقت بھی کرتا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ مجھ میں کچھ بھی اہلیت نہیں تو اب کیونکر عبادت نہ کروں جبکہ آپ نے اپنے فضل سے مجھے اپنے دوزخ کا اہل بنا دیا ہے (دوزخ ہی سہی آپ ہی کی ہے نسبت اب بھی باقی ہے تو مجھ میں کچھ تو اہلیت ہے کہ آپ کے ساتھ کسی قدر تعلق ہوگیا) چنانچہ وہ عبادت میں سرگرم رہنے لگا اور پہلے سے زیادہ کام کرنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے اُن ہی پیغمبر کے پاس پھر وحی بھیجی کہ اُس عابد سے کہہ دو جو چاہے (عمل) کرے وہ جنتی ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنے کو (کسی قابل نہیں سمجھا (حقیر و ذلیل جانا) اللہ اللہ خدا کو تواضع کس قدر پسند ہے۔ یہی راستہ سب سے زیادہ نزدیک ہے مگر تواضع سے زیادہ دشوار بھی

کوئی چیز نہیں۔ تکبر اور ریا سب سے اخیر میں صدیقین کے دماغ سے باہر ہوتی ہے) کسی بزرگ نے خوب کہا ہے۔ لئن اردتمہ مبنی السلوعنکمہ فلیس لی ملکہ بدون ان ابعد تمہ۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ میں آپ سے اپنے دل کو خالی کرلوں تو مجھے تو آپ سے چارہ نہیں خواہ آپ رد کریں (یا قبول کریں)۔

قولہ وفیہ دلیل لاھل الصوفۃ الذین یقولون لا تقطع الخدمۃ الی قولہ وان ابعد تمہ۔

ف ۔ اس شخص نے تو وحی آنے پر بھی عبادت کو قطع نہ کیا حالانکہ وحی علم قطعی کا موجب ہے۔ پھر کسی کو اپنے کشف یا الہام پر اعتماد کرکے عبادت قطع کرنے کا کیا حق ہے؟ ایک بزرگ کے پاس اُن کا مرید آیا اور عرض کیا کہ جب میں ذکر کرنے بیٹھتا ہوں یہ آواز آتی ہے کہ تو کافر ہے۔ بزرگ نے فرمایا یہ دشنام محبت ہے محبوبوں کی عادت ہے عشاق کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ کام میں لگے رہو اور اس آواز پر التفات نہ کرو۔ (غالباً کافر سے مُراد کافر بالطاغوت تھا) مگر یہ گھبراگیا وہ معنی مشہور پر ہی محمول کرنے لگا) شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایک بار وحی میں اُس کو جہنمی کہا گیا دوبارہ جنتی کہا گیا اور دونوں میں مستقبل کی خبر ہے تو ان متعارض خبروں کو کیونکر جمع کیا جائے گا اور اگر ایک کو ساقط کیا جائے تو کلام الٰہی میں خطا و کذب لازم آئے گا۔ تعالی اللّٰہ عن ذلک علواکبیرا۔

جواب یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے ایک جگہ جہنم میں بنی ہوئی ہے ایک جگہ جنت میں۔ اگر ایمان نصیب ہوگیا تو اُس کو جہنم کی جگہ پہلے دکھلائی جاتی ہے کہ اگر تم ایمان نہ لاتے تو تمہارا ٹھکانہ یہاں ہوتا مگر اب یہ جگہ کسی کافر کو دی جائے گی اور تمہارا ٹھکانہ جنت میں ہے۔ پھر اُس کو جنت کا درجہ دکھلایا جاتا ہے تاکہ زیادہ خوشی اور قدر ہو۔ اسی طرح کافر کو پہلے جنت کا ٹھکانا دکھلایا جاتا ہے کہ اگر تو ایمان لاتا یہاں پہنچتا مگر اب تیرا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔ پھر اس کو جہنم کا درجہ دکھلایا جاتا

ہے تاکہ حسرت اور غم زیادہ ہو۔

پس پہلی بار جو وحی میں کہا گیا کہ جو چاہے کر تو جہنمی ہے۔اس سے جہنمی حقیقی مراد نہیں بلکہ مجازاً جہنمی مراد تھا کہ تیری جگہ جہنم میں بھی تجویز کی ہوئی ہے۔اگر ایمان نہ لاتا اور دوسری وحی میں جنتی سے حقیقی جنتی مراد ہے۔پس تعارض نہ رہا ۔ مجازاً ہر مومن کو جہنمی اور ہر کافر کو جنتی کہا جاسکتا ہے۔کیونکہ ہر شخص کی جگہ جنت اور دوزخ دونوں میں نامزد ہے ۔ رہا یہ کہ مجازاً جہنمی کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ جواب صوفیہ کے مذاق پر تو یہ ہے کہ یہ دشنام محبت تھی جو عشاق کے امتحان کے واسطے دی جاتی ہے اور اللہ تعالٰی کو تو امتحان کی ضرورت نہیں مگر بندوں کو اس قسم کے واقعہ سے عاشق کے صدق و خلوص کا علم ہو جاتا ہے اور فقہاء کے مذاق پر جواب یہ ہے کہ لوگوں کو یہ مسئلہ بتلانا مقصود تھا کہ اگر کسی کو اپنے جہنمی ہونے کا یقین بھی ہو جائے پھر بھی عبادت اور تعلق مع اللہ کو قطع نہ کرے کیونکہ اللہ تعالٰی تمہارے یقین کے خلاف بھی کر سکتے ہیں۔نیز یہ بھی بتلانا تھا کہ خدا کو تواضع پسند ہے۔

ف ۔اس شخص کے اس قول سے کہ اب کیونکر عبادت نہ کروں جبکہ آپ نے اپنے فضل سے مجھے اپنی دوزخ کا اہل بنادیا ہے۔حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نانوتوی کے ایک قول کی تائید ہوگئی ۔مولانا کے زمانے میں ریاست رامپور میں ایک ذاکر مشاغل کو بحالت قبض یہ یقین ہوگیا کہ میں شیطان ہوں۔غریب بہت پریشان ہوا اور اسی پریشانی کے عالم میں رامپور ہی کے ایک بزرگ کے ملنے گیا۔ اُن سے اپنا حال عرض کیا کہ حضرتؒ میں تو شیطان ہوں۔انہوں نے بجائے تسلی اور دستگیری کے جواب دیا کہ اگر تو شیطان ہے تو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ ۔ اُس کو یقین ہوگیا کہ میں واقعی شیطان ہوگیا ہوں کہ اتنا بڑا بزرگ بھی مجھ پر لاحول پڑھتا ہے سو اس نے اسی غم میں خودکشی کرلی ۔مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو فرمایا کہ ہم تو فلاں صاحب کو بزرگ اور عارف سمجھتے تھے مگر معلوم

ہُوا کہ وہ تو کورے ہی ہیں۔ اگر وہ شخص میرے پاس آتا اور مجھ سے کہتا کہ مَیں شیطان ہوگیا ہوں تو مَیں یہ جواب دیتا کہ پھر کیا ہُوا شیطان بھی تو اُسی کا ہے نسبت اب بھی قطع نہیں ہوئی۔ اس جواب کے ساتھ ہی اُس کا قبض مبدل بہ بسط ہو جاتا اور ہلاکت سے بچ جاتا (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ) اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ اگر وحی سے بھی کسی کو جہنمی کہا جائے پھر بھی وہ جنتی ہو سکتا ہے۔ اگر ایمان و عمل صالح پر جادہ ہے تو حرف کسی بزرگ یا شیخ کے بُرا کہنے سے کسی کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک خود اُس کے اعمال بُرے نہ ہوں۔ اہل طریق اس معاملہ میں بہت غلو کرتے ہیں کہ شیخ کے اقوال کو آیت و حدیث سمجھ کر فیصلہ کرنے لگتے ہیں خود تحقیق نہیں کرتے حالانکہ مشائخ بھی بشر ہیں بشریت سے بری نہیں۔ اُن کی بہت سی باتیں بشریت سے ناشی ہوتی ہیں جن کو جاننے والے جانتے ہیں۔

ف ۔ چور کے متعلق جو کہا گیا کہ اُمید ہے وہ اس صدقہ کی وجہ سے چوری سے باز آ جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کیونکہ انسان عموماً تنگی اور فقر ہی کی وجہ سے چوری کرتا ہے اور چور کا چوری سے رُک جانا بڑی چیز ہے۔ کیونکہ مُسلمان اس کے ضرر سے بچ جائیں گے تو اس کا ثواب صدقہ سے بھی افضل ہے اور زانیہ کے متعلق جو کہا گیا کہ شاید وہ زنا سے توبہ کرے یہ بھی اسی وجہ سے ہے کیونکہ بعض عورتوں کو زنا کاری پر فقر و احتیاج ہی برانگیختہ کرتا ہے جس کی تکلیف کو وہ برداشت نہیں کر سکتیں اور زنا کے ذریعہ روپیہ کماتی ہیں۔ ایسی عورت کو جب کچھ رقم دے دی جائے گی تو وہ اس حرکت سے باز آ جائے گی ہمیشہ کو نہیں تو کچھ دنوں کو سہی اور کسی کے ذریعہ زانیہ کا زنا سے توبہ کر لینا صدقہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لان یھدی اللہ بك رجلا واحدا خیرلك من حمر النعم۔ تمہارے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ کسی ایک آدمی کو بھی ہدایت کر دیں یہ تمہارے واسطے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے (جو عرب کا قیمتی مال ہے) ہاں جو عورتیں غلبۂ شہوت کی وجہ سے زنا کرتی ہیں اُن

کو صدقہ دینے سے یہ اُمید نہیں کہ زنا سے باز آ جائیں گی (قالہ الشارح فی وجہ) اور گو اس مضمون کو مسائل تصوف سے تعلق نہیں مگر اُوپر جو مصرف زکوٰۃ کی تحقیق اور تفقد کی تاکید کی گئی ہے اُس سے تعلق ہے اور عموماً بہت لوگ اس سے غافل ہیں۔ لوگ زنا کار عورتوں کو صدقہ نہیں دیتے۔ بنہ چوروں کو حالانکہ اُن کو صدقہ دینا زیادہ ثواب ہے کہ شاید وہ گناہوں سے توبہ کریں۔

مولانا جمال الدین مرحوم وزیر ریاست بھوپال کو کسی نے خبر دی کہ آج بھوپال میں ایک بڑی خوب صورت رنڈی آئی ہے تو فوراً آپ نے اپنے منشی کو اُس کے پاس بھیجا کہ تم کو وزیر صاحب بلاتے ہیں۔ وہ وزیر صاحب کے یہاں پہنچ گئی۔ آپ نے اُس کو ایک دو منزلہ مکان پر ٹھہرا دیا اور کھانے پینے اور دیگر ضروریات رہائش کا انتظام کر دیا۔ اُس کی روزانہ فیس پانچ سو روپیہ تھی۔ یہ فیس بھی ہر دن اُس کو پہنچاتے رہے اور نوکروں سے کہہ دیا کہ اس کے پاس کوئی آنے جائے تو اُس کو روکا نہ جائے مگر مجھے اطلاع دی جائے کہ کون آیا اور کون گیا؟ وزیر صاحب کے مکان پر کس کی مجال تھی جو اُس سے ملنے آتا۔ غرض ایک مہینہ تک اُس کو اپنے مکان پر رکھا۔ روزانہ فیس دی۔ مگر کسی کو اُس کے پاس پہنچنے نہ دیا۔ ایک مہینہ کے بعد اُس نے خود ہی اجازت طلب کی کہ میں بھوپال سے باہر جانا چاہتی ہوں۔ تو آپ نے اُس کو اجازت دے دی اور وہ اسی دن بھوپال سے باہر چلی گئی۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ مولانا جمال الدین وزیر بڑے نیک اور متقی ہیں۔ انہوں نے اس رنڈی کو اپنے مکان پر صرف اس لیے رکھا ہے تاکہ بھوپال کے نوجوان خراب نہ ہوں مگر ظاہر میں اُن کا یہ فعل ایسا تھا جو کسی متقی سے نہیں سُنا گیا تو شہر میں بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں جب وہ رنڈی چلی گئی تو رئیسہ بھوپال نے مولانا سے پُوچھا سُنا ہے آپ نے مہینہ بھر تک رنڈی کو اپنے مکان میں رکھا اور روزانہ فیس بھی دی۔ فرمایا ہاں صحیح ہے۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر یہ بازار میں رہی تو میری ریاست کے نوجوان لڑکے گناہ کر کے تباہ و برباد ہو جائیں گے اُن

کی صحت بھی خراب ہو گی اور رقم بھی ضائع ہو گی تو میں نے اُس کو اپنے گھر پر ایک دو منزلہ کمرہ دے دیا تاکہ ریاست کا کوئی آدمی اُس سے ملوث نہ ہو اور خُدا کے فضل سے ریاست کی ملازمت سے میں نے بہت کچھ روپیہ کما لیا ہے تو میں نے ریاست کے جوانوں کو بچانے کے لیے ایک مہینہ میں پندرہ ہزار روپے اس پر خرچ کر دیئے۔ مجھے یہ رقم کچھ بھی معلوم نہیں ہوئی اور میری ریاست کے آدمی اس بلا سے محفوظ رہ گئے۔

رئیس پر مولانا کے اس بیان پر بہت گہرا اثر ہُوا اور کہا مولانا واقعی آپ نے ریاست کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ یہ تو آپ نے ایسا کام کیا جس کی طرف کسی کا خیال ہی نہیں جاتا پھر مولانا کو ایک بڑی رقم نذر کی اور خلعت شاہانہ سے نوازا۔ مولانا جمال الدین مرحوم کی نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی کہ زانیہ کو صدقہ دینا افضل ہے تاکہ وہ بھی زنا سے بچیں اور مسلمان نوجوان بھی اس بلا سے بچے رہیں۔

افسوس ہے آج کل اہل اموال کو اس طرف توجہ نہیں۔ اُن کو لازم ہے کہ اسمبلی کے ذریعے یہ قانون مُسلمانوں کے واسطے پاس کرائیں کہ ہر مسلمان مرد، عورت کو سینما، تھیٹر وغیرہ دیکھنا جُرم ہے۔ ہر مسلمان مرد عورت کو شراب کی خرید و فروخت اور استعمال جُرم ہے اور ہر مُسلمان عورت کے لیے زناکاری کو ذریعہ کسبِ معاش بنانا جُرم ہے۔

قانونی طور پر ان افعال کو جُرم قرار دیا جائے اور ان پر سزائے تازیانہ یا قید خانہ مقرر کرائی جائے اور مُسلمان ریاستوں کو بھی اپنی ریاست میں مُسلمانوں کے واسطے اسی قسم کے قانون پاس کرنا چاہیئے۔ نیز زناکار عورتوں کو شادی پر مجبور کیا جائے اور جب تک شادی نہ ہو، صدقات وخیرات سے اُن کی خبر گیری کی جائے۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک رنڈی کا خط آیا کہ میں نے آپ کی کتاب بہشتی زیور پڑھ کر زنا سے توبہ کر لی ہے مگر [illegible]

پیشہ کے میرے پاس کوئی ذریعہ کسب معاش کا نہیں۔ دُعا کیجئے کہ میں اپنی توبہ پر قائم رہوں۔ حضرت اقدس نے جواب دیا کہ میں تمہارے واسطے دُعا کرتا ہوں اور جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے ماہوار پندرہ روپیہ برابر تمہارے پاس پہنچتے رہیں گے۔ چنانچہ بہت دنوں تک یہ رقم جاتی رہی۔

(۱۷۲) مُسلمان کے پاس جو کچھ بھی ہے عطیۂ حق تعالیٰ ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ دُنیا کا تمام سامان جو کچھ بھی (انسان کے پاس) ہے، اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو عطیہ ہے۔ خدا تعالیٰ پر کسی کا کچھ حق نہیں۔ اس کی دلیل حدیث کا یہ جُملہ ہے فیستفق مما اعطاہ اللہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اُسے عطا فرمایا ہے اُس میں سے خرچ کرے۔ تو سب کو عطیہ قرار دیا گیا ہے۔ یہی اہلِ سُنت کا مذہب ہے اور یہی حق ہے۔

حدیث سے اس صدقہ کرنے والے کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس کے فعل کو صحابہ کے سامنے بیان فرمانا اس کی دلیل ہے کہ حضورؐ اُس کے اتباع کی ترغیب دے رہے ہیں کہ دُوسروں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے) اور فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کر دیا۔ کیونکہ جب اُس نے صدقہ کی اور تقدیر اُس کی تجویز سے موافق نہ ہُوئی (کہ جس کو صدقہ کا مستحق سمجھا تھا وہ مستحق ثابت نہ ہُوا) تو اُس نے اللہ تعالےٰ کی حمد کی اور تسلیم و رضا سے کام لیا یہ تو حقیقت پر مبنی عمل تھا اور اسی کی برکت سے اُس کا عمل سالم رہا (ضائع نہ ہُوا جیسا بعد میں پیامِ الٰہی نے بتلایا) اور شریعت کا ادب یہ تھا کہ اُس نے صدقہ کا اعادہ کیا اور تین بار اعادہ کیا۔

ہر دفعہ میں شریعت و حقیقت کو جمع کرتا رہا اور یہ بڑا بلند حال ہے جیسا پہلے بھی کئی جگہ بتلایا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہم کو بھی اپنے فضل سے بلا مشقت

کے یہ حال (رفیع) عطا فرمائیں۔ (آمین)۔

قولہ فیہ دلیل علی ان جمیع متاع الدنیا حبۃ من اللہ الی قولہ من اللہ علینا بہا بلا محنۃ بمنہ۔

ف - شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کرنا اہلِ طریق کا خاص وظیفہ ہے ۔

برکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اہلِ طریق کو علماءِ ظاہر سے اسی امر میں امتیاز ہے کہ وہ شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کرتے ہیں۔ علماءِ ظاہر صرف شریعت کا اظہار کرتے ہیں حقیقت کا نہیں۔

❖

باب ۶۳

حدیث
صدقۃ المرأۃ من مال زوجہا

"عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا انفقت المرأۃ من طعام بیتہا غیر مفسدۃ کان لہا اجرہا بما انفقت ولزوجہا اجرہ بما کسب وللخازن مثل ذلک لاینقص بعضہم اجر بعض شیئا"

(ترجمہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عورت اپنے گھر کے کھانے میں سے کچھ خرچ کرے بشرطیکہ گھر کو برباد نہ کرے تو عورت کو خرچ کرنے کا ثواب ملے گا اور شوہر کو کمانے کا ثواب ملے گا اور خزانچی کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ ایک دوسرے کے ثواب کو ذرا بھی کم نہ کرے گا۔"

شرح ظاہر حدیث کا مطلب واضح ہے مگر دونوں جگہ مالک کی اجازت شرط ہے۔ کیونکہ کسی کا مال بدون اس کی اجازت کے خرچ کرنا جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا یحل مال امرء مسلم الا عن طیب نفس منہ۔ کسی مسلمان کا مال بدون اس کی خوشی کے حلال نہیں۔ ہاں اجازت میں زبان سے ہی ہونا شرط نہیں بلکہ عرف وعادت بھی کافی ہے۔ جیسے سائل کو روٹی کا ٹکڑا دے دینا یا کسی کو نمک یا آگ یا پانی دے دینا یا دوٹی کے لیے خمیر دے دینا کہ

عرفاً ان چیزوں میں تنگی نہیں کی جاتی بلکہ عورت کو اجازت اور وسعت ہوتی ہے اور ان چیزوں کا دینا مستحب بھی ہے۔ حدیث میں اس شخص سے متعلق جو کسی کو نمک دیدے وارد ہوا ہے کہ اس کو اس شخص کے برابر ثواب ملے گا جو اس کھانے کو صدقہ کر دے جو اسی نمک سے تیار ہوا ہے۔

خمیر دینے والے کے بارے میں بھی ایسا ہی وارد ہوا ہے۔ اسی طرح کوئی کسی کو آگ دے دے تو جتنا کھانا اس آگ پر پکایا جائے گا اس کے صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا اور کسی کو ہانڈی دے دے تو جتنا کھانا اس ہانڈی میں پکے گا جب تک بھی پکتا رہے گا اس کے صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ اس کے متعلق بہت احادیث ہیں جن سے تھوڑی سی چیز کے دینے پر بہت ثواب بیان کیا گیا ہے۔ ان چیزوں سے انکار کرنا مروت اور حسن معاشرت کے بھی خلاف ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ تو عرفاً عورت کو ان چیزوں کے دینے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس لیے ان چیزوں کا مانگنا معیوب نہیں اور ان میں بخل کرنا سخت معیوب شمار ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ما وقی به المرأعرضه کتب له صدقة۔ جس چیز کے ذریعے انسان اپنی آبرو کو بچائے اس میں بھی اس کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔ مگر یہ کہ مالک یا شوہر کی طرف سے کوئی علامت ایسی پائی جائے جو عرف کے صریح خلاف ہو۔ اس صورت میں اصل پر عمل کیا جائے گا اور عورت کو ان چیزوں کا دینا ممنوع ہوگا یا اسکی مرضی سے زیادہ دینا منع ہوگا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ جب مال شوہر کا ہے تو عورت کو کس بات کا ثواب ملیگا؟ جواب یہ ہے کہ عورت بھی اپنے شوہر کی خزانچی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الخازن الذی یعطی ما امر به طیبة به نفسه احد المتصدقین کہ جب خزانچی اس چیز کو خوش ہو کر دیدے جس کے دینے کا اسے حکم

ہُوا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہوگا (تو عورت کو بھی خزانچی کی طرح صدقہ کا ثواب ملے گا۔ رہی خزانچی کے لیے ثواب کی علت تو) کیونکہ جب اُس نے خوشی سے دے دیا اور جس کو دینے کے واسطے کہا گیا تھا اُس کو پریشان نہ کیا بلکہ حکم کے ساتھ فوراً ہی دے دیا تو اُسے مسلمان کا دل خوش کرنے کا ثواب ملے گا۔ کیونکہ دیر کرنے میں (ایک تو لینے والے کو پریشانی ہوتی ہے دوسرے) یہ بھی احتمال ہے کہ دینے والے کی نیت بدل جائے تو دیر کرنا محتاج کے حرمان کا سبب اور جلدی کرنا احسان کا سبب ہوگا۔ کیونکہ دے دینے کے بعد اگر مالک کی نیت بدلے گی تو یہ بہت بعید ہے کہ وہ اُس کے ہاتھ میں سے واپس لینے کی کوشش کرے تو چونکہ خزانچی خوشی کے ساتھ جلدی دے دینے میں مالک کی اعانت نیک کام میں کر رہا ہے اس لیے ثواب کا مستحق ہوگا۔ پھر خزانچی جس قدر سہولت اور عجلت کے ساتھ رقم دے گا اسی قدر لینے والے کو خوشی اور فرحت ہوگی جس سے احسان میں زیادتی ہوتی ہے اور جس چیز سے احسان میں زیادتی ہے وہ بھی احسان ہی ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا فائدہ واضح ہوگیا کہ خزانچی بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے (جب کہ خوشی کے ساتھ وہ رقم دے دے جس کے دینے کا اُسے حکم ہُوا ہے)۔

نیز ایک اور حقیقت بھی ہے وہ یہ کہ نفس انسانی کی فطرت میں حرص اور بخل ہے۔ اُس کے قبضہ میں دُنیا کا جو سامان بھی ہو وہ اُس کو اپنے ہاتھ سے نکالنا نہیں چاہتا۔ اگرچہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ یہ اُس کی ملک نہیں ہے، تو جب وہ کچھ خرچ کرے گا ثواب ملے گا۔ کیونکہ خرچ کرنے میں نفس کی طبعی حالت کی مخالفت اور حکم الٰہی کی موافقت ہے۔

دیکھو تمام عالم جانتا ہے کہ جو کچھ اُن کے پاس دُنیا کا سامان ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہے اور اُن کے ہاتھ میں بطور عاریت کے (امانت) ہے

اور اُس میں سے تھوڑی مقدار کے خرچ کرنے کا اُن کو حکم ہوا ہے جس پر بہت ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اور باقی میں برکت کا اور اگر خرچ نہ کریں تو عذاب کی وعید ہے اور باقی مال سے برکت کے اُٹھ جانے کی دھمکی ہے۔ پھر بھی صدقہ واجبہ ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔

اسی طرح خزانچی جانتا ہے کہ اُس کے قبضہ میں جو کچھ ہے مالک کا ہے اور اگر وہ مالک کے حکم کے بعد کسی کو دینے میں دیر کرے گا مجرم ہوگا اور اگر جلدی کرے گا سہولت سے دے دے گا تو ثواب ملے گا پھر بھی تم بہت کم لوگوں کو ایسا پاؤ گے جو لوگوں کو پریشان کئے بغیر رقم دے دیں، کیونکہ اُن کو مال کے ساتھ تعلق طبعی ہو جاتا ہے۔

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان جب تک ستر شیطان کے جبڑے کلّے نہیں توڑ لیتا اُس وقت تک صدقہ نہیں کرتا، مطلب یہ کہ شیطان اُس کے مال پر دانت بھینچے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب یہ صدقہ کا ارادہ کرتا ہے وہ اس کو روکتے ہیں اُن کا منہ توڑ کر یہ صدقہ کر پاتا ہے۔"

(الشیطان یعدکم الفقر و یأمرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ و فضلا ط)

مگر مالک اور خزانچی میں فرق یہ ہے کہ مالک تو یہ سمجھتا ہے کہ مال اُس کے ہاتھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ قیامت تک اُس کا حساب اسی کے ذمے رہے گا اور خزانچی یہ سمجھتا ہے کہ مالک اُس کو معزول کر کے اپنا مال واپس لے سکتا ہے اور اگر مال اُس کے پاس بھی رہا تو اُس کا فائدہ مالک ہی کو پہنچے گا۔ پھر بھی حرص و طمع کی وجہ سے کسی کو دینے میں حیلہ و حجت کرتا ہے۔ اس میں بھی حکیم کی حکمت ہے۔

(ھذا خلاصۃ ما ذکرہ الشارح فی شرحہ)

(۱۷۳) مخالفت نفس میں ثواب ہے بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو!

اس حدیث سے صوفیہ کے طریق کی خوبی (اور فضیلت) ظاہر ہے کیونکہ (اُن کا عمل اسی پر ہے کہ) جس کام میں نفس کی مخالفت ہو اور شرعاً ممنوع نہ ہو اس میں ثواب ہے۔ اس قاعدہ کی قواعد شرعیہ کے موافق جس قدر بھی تحقیق کروگے انشاء اللہ صحیح پاؤگے کہیں ٹوٹے گا نہیں۔ اس لیے اہلِ طریق نے مخالفتِ نفس کو اپنا دستور العمل بنالیا ہے یہاں تک کہ ایک نصرانی راہب نے اسی واسطے اسلام قبول کرلیا کہ اُس نے مخالفتِ نفس کا عہد کر رکھا تھا تو ایک مسلمان عالم نے اُس کی حسنِ عبادت دیکھ کر تعجب کیا۔

نصرانی راہب نے اُن سے پوچھا۔ آپ نے میرا حال کیسا پایا؟

فرمایا۔ بہت اچھا ہے مگر ایک بات کی کسر ہے۔ کہا وہ کیا؟ فرمایا بس یہ کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

نصرانی نے کچھ دیر کے لیے سر جھکا لیا پھر اسلام لے آیا۔ اس پر اُس کے گرجا والے شور کرنے لگے۔ اُس نے کہا۔ بتلاؤ مجھے تمہارے اندر یہ مرتبہ کس چیز سے حاصل ہُوا؟

سب نے بالاتفاق کہا کہ مجاہدہ اور مخالفتِ نفس کی وجہ سے۔ کہا اسی چیز نے مجھے اسلام پر مجبور کیا۔ کیونکہ جب اس عالم نے میرے سامنے اسلام کا ذکر کیا تو میرے نفس نے اس کو قبول نہ کیا۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ اسلام حق ہے اور میں نے جو کچھ پایا ہے نفس کی مخالفت سے پایا ہے تو میں نے مخالفتِ نفس ہی کے لیے اسلام قبول کرلیا اور سمجھ گیا کہ اسلام دین برحق ہے کیونکہ نفس حق ہی سے بھاگتا ہے۔ اس کے بعد اُس کا اسلام بہت اچھا ہوگیا۔

" قوله فيه دليل لحسن طريق اهل الصوفة الى قوله وحسن اسلامه "

ف - اصل مجاہدہ مخالفتِ نفس ہی ہے۔ کیونکہ نفس اکثر شہوات و محرمات کی طرف راغب ہوتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھانا پینا اور سونا بھی چھوڑ دو کہ نفس تو ان کاموں کی طرف بھی راغب ہے۔ کیونکہ یہ رغبت شہوت حرام نہیں بلکہ مامور بہا ہے۔ اسی طرح بیوی بچوں کی محبت اور دلداری بھی رغبت حرام نہیں بلکہ مامور بہا ہے۔ ان چیزوں میں مخالفت نفس جائز نہیں۔ البتہ ان میں حدود کی رعایت لازم ہے۔ حد سے زیادہ رغبت میں نفس کی مخالفت کی جائے اور اس کے حدود کا اجمالی علم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے واعظ " حفظ الحدود " اور "حقوق البیت" کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے اُن کو پیشِ نظر رکھا جائے۔



باب ۴۳

حدیث

اتلاف اموال الناس

بن ری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں کا مال اس نیت سے (قرض) لے کہ اُن کو ہضم کر جائے گا اللہ تعالےٰ اُس کو برباد کر دیں گے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہُوا کہ جس شخص کے پاس قرض ادا کرنے کا کوئی سامان نہ ہو اُس کو قرض لینا جائز نہیں۔ اسی طرح جس کے بیوی بچے ہوں اُس کو اپنا تمام مال صدقہ کرنا بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس صُورت میں وہ اپنے بال بچوں کا حق ہضم کر کے اُن کو پریشان کرے گا) مگر یہ کہ وہ صبر کے ساتھ معروف ہو، اپنے نفس پر دُوسروں کو ترجیح دیتا ہو اگرچہ خود فاقے سے ہو۔ جیسا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا کہ اپنا سارا مال صدقہ کر دیا (اور گھر پر اللہ اور رسول کے نام کے سوا کچھ نہ رکھا) اسی طرح انصار نے مہاجرین کو ترجیح دی (خود تنگی اُٹھائی مہاجرین کو راحت پہنچائی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ضائع کرنے سے منع کیا ہے (خواہ اپنا مال ہو یا دُوسروں کا) پس کسی کو یہ جائز نہیں کہ صدقہ کے بہانہ سے لوگوں کا مال ضائع کرے (یعنی صدقہ کرنے کے لیے لوگوں سے قرض لے اور قرض لے کر ادا نہ کرے۔ صدقہ کے لیے بھی قرض لینا ایسے شخص کو جائز نہیں جس کے پاس ادائے قرض کا سامان نہ ہو۔ یہ حدیث محدثین کی اصطلاح میں تعلیق یا معلق کہلاتی ہے اور بخاریؒ کی تعلیقات حجت ہیں جبکہ جزم کے

ساتھ مذکور ہوں کیونکہ وہ دُوسرے طرق سے موصول ہوتی ہیں۔

شرح اگرچہ حدیث کا لفظ عام ہے مگر لوگوں کا مال سے مُراد قرض لینا ہے۔ کیونکہ قرض لینے کی چند شرطیں ہیں جن کی بہت لوگ رعایت نہیں کرتے جس کی وجہ سے لوگوں کے اموال ضائع ہو جاتے ہیں۔ فقہاء نے قرض لینے کے لیے جو شرطیں بیان فرمائی ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) اس کے پاس اتنا سامان ہو جس سے ہر حال میں قرض کو ادا کر سکے۔

(۲) یا مضطر ہو کہ اُس پر تین وقت کا فاقہ گزر چکا ہے جس کی وجہ سے دُوسروں کے مال میں اُس کا حق واجب ہو گیا ہو۔ کیونکہ ایسے محتاج کو اگر کوئی دینے سے انکار کرے تو اُس کو لڑ کر اُس سے کھانا وغیرہ لینا جائز ہے۔ اگر مالدار مارا گیا تو وہ بُرا مقتول ہو گا اور مضطر مارا گیا تو شہید ہو گا۔ پھر علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ فراخی میسّر آنے کے بعد مضطر کو وہ مال جو اُس نے جبراً دُوسرے سے لیا ہے واپس کرنا واجب ہے یا نہیں (حنفیہ کا قول یہ ہے کہ واپس کرنا واجب ہے اور یہی قول جمہور کا ہے) خلاصہ یہ کہ قرض لینے کی چار صُورتیں ہیں جن میں سے تین جائز ہیں۔ ایک ناجائز ہے۔

(۱) یہ کہ اُس کے پاس اتنا سامان موجود ہو جس سے قرض کو ہر حال میں ادا کیا جا سکے (زندگی میں بھی مرنے کے بعد بھی) یہ تو بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اُس کے پاس قرض ادا کرنے کا سامان نہیں۔ مگر اُس نے قرض دینے والے سے اپنا حال بیان کر دیا کہ میرے پاس اس قرض کے ادا کرنے کا کچھ سامان نہیں اگر کچھ میرے پاس آگیا ادا کر دوں گا۔ ورنہ مجھ سے مطالبہ نہ کیا جائے۔ یہ بھی جائز ہے گو بعض علماء کا اس کے جواز میں اختلاف ہے مگر ظاہر یہی ہے کہ جائز ہے۔

(۳) اس کے پاس قرض ادا کرنے کا سامان نہ ہو مگر اس میں وہ اوصاف مجتمع ہوں جو صدیق اکبر اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم میں موجود تھے یعنی

صبر و توکل اور کثرت سخاوت اور بدون ضرورت شرعیہ کے قرض نہ لے اور ضرورت سے زیادہ قرض نہ لے۔ اس صورت میں بھی قرض لینا جائز ہے۔ قواعد شرعیہ اس کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

(۴) اس کے پاس قرض ادا کرنے کا سامان نہ ہو، نہ ضرورت شرعیہ موجود ہو نہ مال والے سے اپنا افلاس بیان کرے اس صورت سے قرض جائز نہیں اور یہی صورت ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا دی ہے۔ کیونکہ شرعی ضرورت کو بہت لوگ نہیں جانتے۔ عوام ہی نہیں بلکہ علماء ظاہر بھی نہیں جانتے۔ انہوں نے اپنے واسطے کچھ قاعدے خود بنا لیے ہیں جن کو شرعی ضرورت میں شمار کر لیا ہے (مثلاً مہمان نوازی اور لنگر خانے کا جاری کرنا کیونکہ جب) ہم سے کوئی ملنے آتا ہے تو اس کو کھانا کیسے نہ کھلایا جائے حالانکہ مہمان وہ ہے جو قرابت کی وجہ سے ملنے آئے یا اس کا مقصود صرف ملاقات ہو۔ کوئی اور غرض دنیوی یا دینی نہ ہو جیسے طلب اصلاح نفس یا تعلیم و تلقین ذکر حاصل کرنا یا کسی مقدمہ وغیرہ کے لیے دعا کرانا یا تعویذ وغیرہ لینا کہ ان اغراض کے لیے آنے والا مہمان نہیں ہوتا اور جو مہمان ہو اس کے لیے بھی تکلف کرنا اس وقت تک جائز ہے جبکہ وسعت ہو ورنہ جو کچھ گھر میں موجود ہو وہی مہمان کے سامنے پیش کر دینا چاہیے۔ اس سے زیادہ تکلف نہ کیا جائے اور اگر فاقہ ہو تو مہمان سے کہہ دینا چاہیے کہ میرے یہاں آج فاقہ ہے تم بھی فاقہ کرو۔ جب خدا تعالیٰ دے گا ہم بھی کھائیں گے تم بھی کھانا۔ مگر تم دیکھو گے کہ علماء بھی ان شرائط کا لحاظ نہیں کرتے مہمان نوازی اور لنگر خانے کے لیے قرض پر قرض لیتے رہتے ہیں اور اس طریقہ سے لوگوں کا مال لینا اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں اور دل میں یوں کہتے ہیں کہ ہم مضطر ہیں لوگوں کے مال میں ہمارا حق واجب ہو چکا ہے۔ ہم کو قرض لینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جو کچھ ہم لے رہے ہیں ہمارا حق ہے۔

اس پر امام بخاریؒ نے یہ قید بڑھا کر تنبیہ کی ہے کہ بدون سامان ادا کئے قرض لینا اسی شخص کو جائز ہے جو صبر کے ساتھ معروف ہو۔ یہ نہیں کہ ضرورت کے

وقت خود اپنے دل سے یہ سمجھ لے کہ میں قرض لے کر نفس کو مجاہدہ میں ڈالوں گا اور لوگوں کے تنگ کرنے پر صبر کروں گا۔ یہاں تک کہ ان کا حق ادا ہو جائے اس شخص سے کہا جائے گا کہ یہ سب حدیث النفس ہے اور نفس بڑا خیانت کرنے والا ہے۔ صابر وہ ہے جس کو عام طور پر لوگ صابر سمجھتے ہوں۔ یہ نہیں کہ خود اپنے دل سے اپنے کو صابر سمجھنے لگے (اور ضرورت شرعیہ وہ ہے جس کو شریعت کے جاننے والے فقہاء ضرورت کہیں۔ خود تمہارا اپنے دل سے کسی ضرورت کو شرعی ضرورت قرار دینا کافی نہیں) پھر معروف بالصبر ہونے کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ یہ صبر ایثار کی شان سے ہو اور ایثار بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنی ذاتی ضرورتوں پر مقدم کرتا ہو۔ یہ نہیں کہ شہرت کے واسطے یا غرض نفسانی کے واسطے صبر کرتا ہو یا مجبوری کا صبر ہو کہ اس کے پاس کچھ ہے نہیں (اس حالت میں صبر نہ کرے تو کیا کرے) اس حالت میں صبر نہ کرنے یا کم صبر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صبر کرنا، صبر نہ کرنے سے اچھا ہے۔ اگرچہ ایسا صبر کرنے والا مردوں کی صف میں کھڑا نہیں ہو سکتا اور نہ اُس کو اہل وفا میں شمار کیا جائے گا۔

صابر وہ ہے جو صبر کے ساتھ ایثار میں بھی معروف ہو کہ دوسروں کو اپنے اُوپر ترجیح دیتا ہو اگرچہ خود فاقہ اور احتیاج اور تنگی میں مُبتلا ہو۔ ان شرطوں کو دیکھو اور ان میں غور کرو کیا اس زمانے میں اُن کا وجود کسی میں ممکن ہے؟ (بالکل نہیں، مگر یہ کہ شاذ و نادر (کسی ایک دو میں ہوں تو ہوں) پس ہم نے جو قرض کی چار صُورتیں بیان کر کے تین کو جائز اور ایک کو ناجائز بتلایا ہے یہ فقہی تقسیم ہے کیونکہ احکام بیان کرنے والے پر تمامی احکام کا بیان کر دینا ضروری ہے۔ گو اُن میں سے کوئی صُورت نادر ہی کیوں نہ ہوں جس کا وقوع ممکن نہ ہو۔ اسی لیے یہ تقسیم بیان کر دی گئی۔ ورنہ ہماری حالت کے اعتبار سے توصرف دو ہی صُورتیں جائز ہیں اور دو ناجائز ہیں۔ کیونکہ تیسری صُورت جس

میں حضرت صدیق اکبر اور حضرات مہاجرین و انصار کے ایثار کو دلیل میں بیان کیا گیا ہے آج کل جائز نہیں کیونکہ اُس کی شرطیں اس زمانہ میں عام طور سے مفقود ہیں۔ (ھذا خلاصۃ ما ذکرہ الشارح فی شرحہ۔)

(۱۷۴) بلا ضرورت قرض لینا ہی ممنوع ہے

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنا اور) دوسروں کا مال ضائع کرنے سے عموماً منع فرمایا ہے تو تم کو اس عموم کی تخصیص کا حق نہیں کہ یوں کہنے لگو کہ میں تو صدقہ کرنے کے لیے قرض لے رہا ہوں اور یہ اضاعت مال میں داخل نہیں۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) یہ بھی سراسر اضاعت ہے۔ جب تک تم دوسرے کو صاف صاف نہ بتلا دو کہ میں یہ قرض صدقہ کرنے کے واسطے لے رہا ہوں۔ (میرے پاس اس کے ادا کرنے کا کوئی سامان بھی نہیں) اگر اللہ تعالیٰ نے میرے پاس کچھ بھیجدیا تمہارا قرض ادا کر دوں گا ورنہ مجھ پر کوئی مطالبہ تمہارا نہ ہوگا۔ اگر وہ اس پر راضی ہو جائے تو خیر ورنہ صدقہ کے واسطے بھی قرض لینا جائز نہیں۔

اس میں علاوہ اس کے کہ تم اپنی رائے سے شارع علیہ السلام کے عام لفظ کو خاص کر رہے ہو ایک علت اور بھی ہے وہ یہ کہ تمہارے ذمہ پر تو ایک حق لازم ہو گیا اور جو صدقہ تم نے کیا ہے اُس کا قبول ہونا یا نہ ہونا محتمل ہے تو جو حق ثابت ہو چکا ہے اُس سے ایک مشکوک اور محتمل چیز کیونکر تم کو بری کر سکتی ہے۔ (پس یہ خیال لغو ہے کہ اگر قیامت میں قرض دینے والے نے مطالبہ کیا تو میں وہ ثواب اُس کو دے دوں گا۔ جو صدقہ سے مجھے ملا ہے۔ کیونکہ ثواب ملنا قبول ہونے کی فرع ہے اور قبول ہونا محتمل ہے) تو شرعاً و عقلاً (کسی طرح) یہ صورت جائز نہیں۔ تم کو اس خطرناک صورت کے ارتکاب پر اُن حکایات سے جرأت نہ کرنا چاہیئے جو بعضے بابرکت حضرات سے منقول ہیں۔ مثلاً ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ اُن کے زمانے میں سخت قحط ہوا تو انہوں نے بہت سا مال قرض لے کر اور اُس سے غلّہ خرید کر مسکینوں کو تقسیم کر دیا۔ جب مال والے اپنے مال کا مطالبہ کرنے آئے بزرگ نے

وضو کرکے دو رکعتیں پڑھیں اور اللہ تعالےٰ سے دُعا کی کہ مجھے ان لوگوں کے سامنے ذلیل ورسوا نہ کیجئے۔ پھر فرمایا بوریا اُٹھا کر دیکھو کیا اُس کے نیچے کچھ نظر آتا ہے؟ اُنہوں نے بوریا اُٹھایا تو اُس کے نیچے بہت مال تھا فرمایا اپنے مال کے برابر لے لو۔ اُنہوں نے (شمار کیا تو) اُس کو برابر سرابر پایا۔ تو ان بزرگ کے واقعہ میں چند احتمالات ہیں ایک یہ کہ اُن کا (رزق کے بارے میں) حق تعالےٰ کے ساتھ خاص معاملہ تھا اُنہوں نے اُسی کے موافق عمل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من رزق من باب فلیلزمہ جس کو جس دروازے سے روزی ملتی ہو اُسی کو چمٹا رہے اور اہلِ توفیق (یعنی بزرگانِ دین) نے فرمایا ہے کہ جس شخص کے لیے اللہ تعالےٰ خرقِ عادت کے طور پر کوئی دروازہ خیر کا کھول دیں تو شرعاً وہ اُسی کے ساتھ مخصوص ہے (دوسرے لوگوں کو اس کی تقلید جائز نہیں) اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ بزرگ مستجاب الدعوات ہوں (اُن کی دُعا قبول ہوتی ہو، ورنہ ہوتی ہو اور اُن کو اللہ تعالےٰ کا معاملہ اپنے ساتھ معلوم ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب اُن کا معاملہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ سچا تھا تو اُن کا صدقہ قبول ہوگیا اور جب اللہ تعالےٰ نے صدقہ قبول کرلیا تو وہ حاجت کے وقت اپنے بندہ کو ضائع کرنے والے نہیں تھے حاشا و کلا (اور صدقہ کا قبول ہو جانا صدقِ نیت اور خلوص سے معلوم ہو سکتا ہے)۔

پس جس شخص کو یہ حالت نصیب نہ ہو اُس کو ان جیسے بزرگوں کی تقلید (ایسے افعال میں) جائز نہیں۔ کیونکہ ان حضرات کے حالات (کرامات) کو تو تسلیم کیا جائیگا مگر اُن کی تقلید نہیں کی جائے گی اور نہ اُن پر اعتراض کیا جائے گا۔ کیونکہ (ہمارے اندر) وہ حال نہیں جو ان اعمال کا سبب ہے۔ اسی لیے بعض اہلِ طریق کا ارشاد ہے جب تم نے اپنا سب کام اللہ تعالےٰ کے سپرد کردیا اور تمہارا دل اُس کے دروازہ سے چمٹ گیا اور تمہارا ہاتھ دُنیا سے رُک گیا اور تمہارا حال اللہ تعالےٰ کے امرونہی سے گھر گیا (یعنی تمہارا کوئی حال مرضی الٰہی کے خلاف نہ تھا) تو تم دنیا سے الگ ہو اگرچہ دُنیا میں لگے رہے۔ غرض صحتِ حال کی علامت اُنہوں نے یہ بتلائی ہے

کہ ہر طرح امرونہی سے گھرا ہوا ہو۔ یہی سب باتوں کا خلاصہ ہے (یعنی تصوف کا حاصل ہے) اور یہی وہ امر حق ہے جس پر تمام اہل حال وا ہل قال (صوفیہ وعلماء متفق) ہیں (سب کے نزدیک کمال اس کا نام ہے کہ بندہ اللہ تعالے کی اوامر و نواہی کی تعمیل میں بدرجۂ کمال لگا رہے) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اُن میں سے کرے جن پر یہ انعامات ہوئے ہیں۔ انہ ولی حمید قولہ اذا منع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضاعۃ المال الغیر عموماً لی قولہ ولی حمید۔

ف ۔ حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک بزرگ پنجاب کے آئے جن پر چار ہزار روپیہ قرض ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے ایک رئیس کے نام سفارش چاہتے تھے۔ میں نے سفارش کردی۔ پھر دریافت کیا کہ آپ کے ذمے اتنا قرضہ کیونکر ہوا؟ کہا میرے یہاں لنگر خانہ ہے جتنے بھی مرید آتے ہیں لنگر خانہ سے کھانا کھاتے ہیں۔ پہلے تو ایسا ہوتا تھا کہ لوگ کھانا کھاتے بھی تھے اور نذرانہ بھی دیتے تھے۔ اب کچھ دنوں سے یہ ہو رہا ہے کہ لوگ لنگر خانہ سے ہفتوں کھانا کھا جاتے ہیں اور کچھ دیتے نہیں اس لیے قرضہ ہو گیا۔

یہ حکایت بیان کر کے حضرت نے فرمایا کہ میں نے اسی واسطے اپنے یہاں لنگر خانہ نہیں رکھا۔ بس جو آتا ہے اُس کو بتلا دیا جاتا ہے کہ قیام کی جگہ یہ ہے اور طعام کا انتظام فلاں فلاں کرتے ہیں اُن سے معاملہ طے کر لو۔ لنگر خانہ کر کے کون یہ دردِ سر مول لے کہ کس نے کتنے دن کھایا اور کس نے کیا دیا؟ اب اگر کوئی مجھے کچھ بھی نہ دے تو مجھے وسوسہ نہیں آتا اور جو دیتا ہے بڑے نخروں سے لیتا ہوں کہ اس میں ہدیہ کی شرائط بھی موجود ہیں یا نہیں؟ لنگر خانہ کرنے کے بعد یہ تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ ہدیہ میں شرائط و خلوص کی تحقیق کی جاتے الا ماشاء اللہ۔ دیکھئے یہ بیچارے لنگر خانہ کر کے کس قدر پریشان ہوئے اور مریدوں نے بھی غضب ہی کیا کہ آئے کھا گئے اور دیا دلایا کچھ بھی نہیں۔ جب اُن کو معلوم تھا کہ شیخ کے پاس نہ زمین ہے نہ جائیداد ہے اور نہ کوئی اور آمدنی ہے، لنگر خانے کا مدار مریدوں ہی کے نذرانہ

پر ہے۔ ایسی حالت میں ہفتوں ٹھہر کر کھانا اور بدوں نذرانہ دیئے چلے جانا شیخ کو تکلیف ہی دینا ہے۔ چنانچہ بے چاروں کو اپنے مذاق کے خلاف ایک زمین کے پاس سفارش لے جانے کی نوبت آگئی۔

میں کہتا ہوں یہ بھی غنیمت ہے کہ ان بزرگ کو قرض ادا کرنے کی تو فکر ہوئی۔ بعضے تو اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور یہ سمجھ کر کہ ہم نے تو صدقہ کے واسطے قرض لیا ہے اگر ادا نہ ہوا تو کیا ہے قیامت میں قرض والا مواخذہ کرے گا تو وہ ثواب اُس کو دے دیں گے جو صدقہ سے ہم کو ملا ہوگا۔ سبحان اللہ! اور اگر ثواب ہی نہ ملا ہو بلکہ عذاب لکھا گیا ہو تو کیا دے دو گے؟ یہ سب نفس کے بہلانے ہیں جن سے وہ گناہ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ بہلانے اور بے ہودہ دلیلیں نہیں چل سکتیں۔

پس سالکین کو قرض سے بہت بچنا چاہیئے۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ نے اپنی وصیت میں تحریر فرمایا ہے کہ بندہ کے ذمے قرض کبھی نہیں ہوتا۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو قرض اپنی وسعت و ہمت سے زیادہ نہ کیا جائے اور فکر کر کے جلد ادا کیا جائے تاکہ حدیث کی وعید سے محفوظ رہیں۔



باب ۴۲

حدیث

الامر بالصدقۃ علی کل مسلم

ابی بردہ اپنے باپ (بردہ) سے روایت کرتے ہیں (رضی اللہ عنہما) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مُسلمان کے ذمّہ صدقہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر کوئی (صدقہ کے لیے کوئی چیز) نہ پائے (یعنی مفلس غریب ہو تو وہ کیونکر صدقہ کرے) فرمایا اپنے ہاتھوں سے (کچھ) کام کرے جس سے اپنے کو بھی نفع پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔ عرض کیا اگر کوئی (اس کی بھی طاقت) نہ پائے (کہ اُس کو کوئی دست کاری نہیں آتی ہو) فرمایا وہ کسی حاجت مند پریشان کی مدد کرے۔ عرض کیا اگر اُس کا بھی موقع نہ پائے (خواہ اس وجہ سے کہ اُس کے سامنے کوئی محتاج مصیبت زدہ نہیں ہے یا جس قسم کی مدد کی اُس کو ضرورت ہے اُس سے یہ عاجز ہے) فرمایا تو وہ نیک کام کرتا ہے بُرے کاموں سے بچ رہا ہے یہی اُس کے لیے صدقہ ہے۔

شرح حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ اُس میں صدقہ کا امر ہے اور صدقہ کرنے کے لیے کوئی ذریعہ اختیار کرنے کا بھی حکم ہے اور بظاہر یہ امر استحبابی ہے وجوبی نہیں۔ دُوسری احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں منجملہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے لاصدقۃ الاعن ظہر غنی۔ صدقہ نہیں ہے مگر غنا کے بعد۔ اور یہاں ہر مُسلمان کا صدقہ بیان کیا گیا ہے تو یہ واجب نہیں نیز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی دو رکعتوں کی بابت فرمایا کہ وہ اس صدقہ کو ادا کرتی ہیں (جو یہاں مذکور ہے) جبکہ صدقہ پر قدرت نہ ہو اور اس حدیث کے آخر میں جو حضور نے یہ فرمایا ہے کہ نیک کام کرتا رہے بُرے کاموں سے بچتا رہے یہی اُس کے لیے صدقہ ہے تو یہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے خواہ صدقہ کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ بُرا کام کرنا اور اچھا کام چھوڑنا کسی حال میں جائز نہیں۔ لیکن (یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ) یہاں نیک کاموں سے مُراد وہ اعمال ہیں جو واجب سے زیادہ ہیں (اسی طرح بُرے کاموں سے مراد وہ اعمال ہیں جو کبائر کے علاوہ ہیں اور واجبات سے زیادہ کام کرنا اور کبائر کے علاوہ صغائر سے بھی بچنا) یہ صدقہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اچھی بات بھی صدقہ ہے اور راستہ سے تکلیف کی چیز ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے مُسلمان بھائی سے بشاشت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہے۔ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اس سے معلوم ہُوا کہ دین سارے کا سارا ہی مطلوب ہے۔ فرض بھی اور مستحب بھی اور دونوں کا شریعت میں پورا اہتمام ہے۔ حدیث میں صدقہ کی فضیلت پر بھی دلالت ہے (ھذا خلاصۃ ماذکرہ الشارح فی شرحہ۔)

(۱۷۵) تصوف کی بُنیاد سخاوت اور ایثار پر ہے اسمیں صوفیہ

(کے طریق) کی بھی دلیل ہے، جنہوں نے اپنے طریق کی بُنیاد سخاوت اور ایثار پر ہی قائم کی ہے۔ چنانچہ اُن میں سے ایک جماعت سے منقول ہے کہ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ رات کو اُن کے گھر میں صدقہ کی کوئی چیز رہے (بلکہ رات سے پہلے پہلے اُس کو خیرات کر دیتے تھے) فیہ دلیل اھل الصوفیۃ الی قولہ من الصدقۃ المعلومۃ فی بیوتھم۔

(۱۷۶) لوگوں میں فقیر کم اور غنی زیادہ ہیں حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ لوگوں میں (فقیر کم اور غنی

زیادہ ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاق کے ساتھ ہر مسلمان پر صدقہ لازم فرمایا ہے حالانکہ یقیناً بعض ایسے بھی تھے جن کے پاس کچھ بھی نہیں (تو اس کی وجہ بظاہر یہی ہے کہ لوگوں میں زیادہ تر غنی ہوتے ہیں غرباء کم اس لیے آپ نے اوّل مطلقاً ہر شخص پر صدقہ لازم فرمایا۔ شاذ و نادر کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ جب صحابہ نے عرض کیا کہ کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو اُس وقت فقیروں کا حکم بیان کر دیا گیا)۔

بعض علماء نے مساکین کی قلت پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے صدقہ واجبہ میں صرف چالیسواں حصّہ فرض کیا ہے اور وہ بھی مطلقاً نہیں، بلکہ بقدر نصاب مال ہونے پر واجب کیا ہے کہ چاندی پانچ اوقیہ (دو سو درہم یعنی ساڑھے باون تولہ) ہو اور سونا بیس دینار (یعنی ساڑھے سات تولہ) ہو اور علیم رحیم (جس کا علم بھی کامل ہے اور رحمت بھی کامل ہے) اپنے (غریب) بندوں کے لیے ایسی مقدار مقرر نہیں کر سکتا جو اُن کے واسطے کافی نہ ہو حالانکہ وہ ان کا شمار بھی جانتا ہے اور حالت سے بھی باخبر ہے الا یعلم من خلق وھو اللطیف

کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ بھی نہ جانے گا حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور پُوری طرح باخبر ہے تو چونکہ اللہ تعالےٰ کو معلوم تھا کہ مساکین کم ہوں گے اور یہ بھی معلوم تھا کہ (جتنے بھی ہوں گے) ان کو (اغنیاء کی دولت کا) چالیسواں حصّہ کافی ہو جائے گا تو یہی مقدار فرض کر دی گئی اور اغنیاء سب کے سب اس مقدار زکوٰۃ کو جو اللہ تعالےٰ نے اُن پر واجب کی ہے نکالتے رہیں تو کبھی کسی مسکین کو بھیک مانگنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

قولہ فیہ دلیل علی ان الیسارۃ فی الناس اغلب الی قولہ

ما احتاج مسکین لان یسأل احداً۔

ف ۔ اس دلیل کا یہ مقدمہ تو یقیناً صحیح ہے کہ اغنیاء مسلمین کی دولت کا چالیسواں حصّہ اور زمینداروں کی پیداوار زمین کا عُشر غرباء مُسلمین کے لیے کافی

ہے اور اگر اغنیاء زکوٰۃ وعشر نکالتے رہیں تو کسی مسلمان مسکین کو بھیک مانگنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر زمانے میں مسلمانوں میں فقیر کم اور اغنیاء زیادہ ہوں گے۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت فقیر زیادہ ہوں اور اغنیاء کم مگر اُن کی دولت اتنی زیادہ ہو کہ اُس کی زکوٰۃ اور عُشر تمام فقراء کے لیے کافی ہو جائے۔

پس اس وقت مُسلمانوں میں افلاس زیادہ ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اغنیاء باقاعدہ پُوری زکوٰۃ اور عشر نہیں نکالتے اور یہ مرض اغنیاء میں آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اسی لیے صدیوں سے مسلمانوں میں افلاس بڑھ رہا ہے۔ دُوسرے یہ کہ ہندوؤں کے اختلاط سے مُسلمانوں کی ایک جماعت نے بھیک مانگنے کو عیب سمجھنے کے بجائے ہُنر سمجھ لیا اور اس کو مُستقل پیشہ بنا لیا ہے۔ اُن کو لاکھ کہا جائے کہ ہٹے کٹے تندرست آدمی کو بھیک مانگنا جائز نہیں۔ تم کو مزدوری کرنا چاہیئے یا دستکاری سیکھ کر پیٹ پالنا چاہیئے مگر اُن کی عقلیں مسخ ہو گئی ہیں وہ بھیک مانگنے ہی کو ہُنر سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مُسلمان مالداروں کی خیرات کا زیادہ حصّہ انہی کے قبضہ میں جاتا ہے اور یہ لوگ ہزارہا روپیہ جمع کرنے کے بعد بھی بھیک مانگنا نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ جب وہ مرتے ہیں اُن کی جھونپڑیوں میں سے ہزارہا روپیہ نکلتا ہے۔ پس ان کو غریب اور فقیر سمجھنا غلط ہے اور ان کو زکوٰۃ وصدقات دینا رقم برباد کرنا ہے۔ پس مُسلمانوں کو سب سے پہلے زکوٰۃ کا انتظام کرنا چاہیئے پھر ہر شہر اور ہر قصبہ کے امراء کو اپنی بستی کے فقراء کی تحقیق کرنا چاہیئے۔ تحقیق کے بعد زکوٰۃ دی جائے اور اُن سے کہہ دیا جائے کہ زکوٰۃ کی رقم کے بھروسہ ہی پر نہ رہو بلکہ جو کچھ اس وقت تم کو دیا جا رہا ہے اُس سے تجارت یا اور کوئی کاروبار شروع کرو۔ تاکہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ پہلے زمانے کے فقراء ایسے ہی تھے وہ ایک دفعہ زکوٰۃ لے کر اُس سے کاروبار کرنے لگتے تھے۔ البتہ یتیم بچے اور بیوہ

عورتیں یا بوڑھے اور اپاہج مجبوراً زکوٰۃ کے بھروسہ پر رہتے تھے جن میں سے یتیم بچے تو تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر جب بالغ ہو جاتے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے تھے اور بیوہ عورتیں دوسری شادی کو عیب نہ جانتی تھیں وہ بھی کچھ دنوں کے بعد زکوٰۃ سے مستغنی ہو جاتی تھیں۔ اگر اب بھی اس کا رواج پوری طرح ہو جائے تو بیوہ عورتیں بہت کم رہ جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ اپاہج اور معذور کی تعداد زیادہ نہیں۔ اس طریقہ پر انتظام کے ساتھ عمل کیا جائے تو یقیناً مال دار اور زمیندار مسلمانوں کی زکوٰۃ و عشر مسلمانوں کا افلاس دُور کرنے کے لیے کافی ہو جائے۔

(۱۷۱) کسبِ معاش کی فضیلت حدیث سے کسب معاش کی فضیلت بھی معلوم ہو رہی ہے بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو اور اُس سے دین میں مدد ملتی ہو لفظ یعمل بیدہ اس پر دال ہے جس سے ان تمام صنعتوں کا جواز مفہوم ہوتا ہے جو ہاتھ سے کی جاتی ہیں (بشرطیکہ شریعت کے خلاف نہ ہوں) حدیث میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اپنی ضرورت کو صدقہ پر مقدم کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ارشاد ہے یعمل بیدہٖ فینفع نفسہ ویتصدق (جس کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو) اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرے پھر اپنے کو فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔ تو حضور نے دستکاری کے بعد اپنے کو فائدہ پہنچانا پہلے بیان کیا پھر صدقہ کو بیان کیا۔ اس میں تم غور کرو گے تو بڑا عجیب اشارہ پاؤ گے۔ کیونکہ اگر آپ صرف اتنا کہہ دیتے یعمل بیدہٖ و یتصدق کہ وہ اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرے اور صدقہ کرے تو صحابہ کے سوال کا تو جواب ہو جاتا۔ کیونکہ وہ تو صدقہ ہی کے بارے میں سوال کر رہے تھے مگر کسی کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ بس میں تو صدقہ کرنے کے واسطے کام کروں گا اور خود اپنی ذات کے لیے اللہ تعالیٰ پر توکل کروں گا جو وہ دیں گے لے لوں گا۔ حضور نے ینفع نفسہ بڑھا کر بتلا

دیا کہ اپنے کو نفع پہنچانا مقدم ہے کیونکہ سب سے بڑا صدقہ یہ ہے کہ انسان اپنا بوجھ دُوسروں پر نہ ڈالے امر اہم کو مقدم کرے۔ اس کے بعد صدقہ کرے۔ پھر یہ لفظ انسان کی تمام ضرورتوں کو عام ہے خواہ اس کی ذات سے متعلق ہوں یا اہل وعیال سے یا اپنے گھر کی حاجت سے جو عادۃً بشر کو لاحق ہوتی ہیں بشرطیکہ شریعت کے موافق ہوں کہ یہ قید تو تمام حالات میں لازم ہے۔ وفیہ دلیل علیٰ فضل التکسب الی قولہ فان ھذا اصل فی کل ہذہ الامور۔

ف۔ تم دیکھتے ہو کہ شریعت میں صدقہ کا کس طرح اہتمام ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ بھی اپنے ہاتھ سے کسبِ معاش کرے اور اپنی حاجت کو پُورا کر کے کچھ صدقہ کرے اس کی وجہ ایک تو وہی ہے کہ شریعت مُسلمانوں کے افلاس کو دُور کرنا چاہتی ہے۔ شریعت اس کو گوارا نہیں کرتی کہ تندرست ہٹا کٹا آدمی ہو دُوسروں کے ہاتھ کو دیکھے بلکہ اُسے خود کسبِ معاش کر کے دُوسروں پر صدقہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہر تندرست مسلمان اس پر عمل کرنے لگے اور کوئی بھی بیکار نہ رہے کسی نہ کسی کام میں لگ جائے خواہ مزدوری ہی کرنے لگے یا جنگل سے گھاس اور لکڑی کاٹ کر بیچا کرے اور کوئی صنعت وحرفت اختیار کرے تو یقیناً مُسلمانوں میں بھیک مانگنے والا کوئی باقی نہ رہے۔

دوسری وجہ صدقہ کے اہتمام کی یہ ہے کہ اس سے بُخل کا مادہ نکل جاتا اور سخاوت پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص صدقہ کا اہتمام کرے گا اور روزانہ کچھ نہ کچھ خیرات کرنے کا التزام کرے گا تم دیکھو گے کہ کچھ عرصہ کے بعد اُس میں سخاوت کی صفت پیدا ہو جائے گی۔ جو اخلاقِ حمیدہ میں اعلیٰ درجہ کی صفت ہے۔

نیز صدقہ کی عادت سے دُنیا کی محبت بھی دل سے نکل جائے گی اسی لیے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ سخاوت زہد کا دروازہ ہے بلکہ وہی عین زہد ہے۔ صدقہ کا اہتمام وہی کرتا ہے جس کے دل میں دُنیا کی محبت نہ ہو اور اگر کسی کے دل میں دُنیا کی محبت ہو بھی تو صدقہ کی عادت سے انشاء اللہ دل اس گندگی سے پاک

ہو جائے گا «حب الدنیا رأس کل خطیئۃ» ، دُنیا کی محبت ہی تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ جب یہ دل سے نکل جاتی ہے، پھر گناہوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا اور نیکیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(۱۰۸) نفع متعدی نفع لازم سے افضل ہے حدیث کا مفہوم تمام انواع (صدقات) کے بتلانے کے بعد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً صدقہ کی ترغیب دی ہے کیونکہ اس کا نفع متعدی ہے جب اُس سے عاجز ہو تو اُس کے قریب یا اُس کے قائم مقام کی ترغیب دی کہ (ہاتھ سے) کام کرے پھر خود بھی نفع حاصل کرے صدقہ بھی کرے کیونکہ اس کا نفع بھی متعدی ہے جو یہ بھی نہ کر سکے تو اُس کے قائم مقام اس امر کی ترغیب دی کہ کسی حاجت مند پریشان کی مدد کرے (کہ اس کا نفع بھی متعدی ہے) اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ نیک کاموں میں ان جیسا (اُن کے برابر) کوئی کام نہیں۔ لیکن جو معروف یعنی جو بھلائی بھی ہو سکے کرے۔

معروف سے مراد وہ عمل ہے جو شرعاً پسندیدہ اور مستحب ہو اگرچہ اتنا ہی ہو کہ مُسلمانوں کے راستے میں سے تکلیف دینے والی چیز ہٹا دے یا چاشت کی دو رکعتیں پڑھ لیا کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو مستحب کام سے خالی نہ رکھے۔ کوئی مستحب کام (فرائض و واجبات سے زیادہ) کر لیا کرے اگرچہ تھوڑا ہی ہو (معمولی ہی درجہ کا ہو) کیونکہ اس میں بھی صدقہ یعنی ثواب ہے اور اگر تم کسی مستحب پر بھی قدرت نہیں رکھتے تو تمہارا شر سے رُک جانا یعنی بُرے کاموں کو جو شرعاً ممنوع ہیں چھوڑ دینا بھی صدقہ ہے اس پر بھی تم کو ثواب ملیگا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو تسلی دی ہے جو (فرائض و واجبات سے زیادہ) مستحبات کے بجالانے سے عاجز ہوں، بشرطیکہ واقعی عاجز ہوں خواہ مخواہ) عاجز بنتے نہ ہوں کہ ان کو شر سے بچنے میں بھی ثواب

ملے گا۔ بس وہ بُرے کاموں سے بچتے رہیں۔ اور یہ تسلی ویسی ہی ہے جیسے ایک حدیث میں آیا ہے کہ فقراء صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مالدار (صحابہ) صدقہ کی وجہ سے ہم پر سبقت لے گئے (نماز، روزہ وغیرہ تو وہ بھی کرتے ہیں ہم بھی کرتے ہیں مگر وہ صدقہ بھی کرتے ہیں اور ہم اس سے عاجز ہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تم کو ایسی بات بتلاتا ہوں جو صدقہ سے بھی (تمہارے واسطے) بہتر ہے۔ تم ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ اور ۳۳ بار اللہ اکبر اور ۳۳ بار الحمد للہ کہو اور لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیئٍ قدیر، کہہ کر سو کا عدد پورا کر دیا کرو یہ (صدقہ سے بھی) بڑھ کر ہے۔ اغنیاء صحابہ کو یہ خبر پہنچی تو وہ بھی ہر نماز کے بعد یہ عمل کرنے لگے۔

فقراء پھر حضورؐ کے پاس واپس آئے اور کہا یا رسول اللہ! اغنیاء نے تو وہ عمل بھی شروع کر دیا (جو آپ نے خاص ہم کو بتلایا تھا) حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے عطا کرے (یعنی اب تم کو یہ تمنا نہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو فضیلت نہ دیں، و لا تتمنوا ما فضل اللّٰہ بہ بعضکم علٰی بعضٍ) اور یہاں سے معلوم ہوا کہ شریعت ہم سے پورے دین (پر عمل) کا مطالبہ کرتی ہے فرائض کا بھی نوافل کا بھی اور مستحبات کا بھی۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً فرض کو مقدم کیا جائے پھر مستحبات و نوافل میں جو اعلیٰ ہو اُس کو اختیار کیا جائے اور جو سب ہی کو بجا لائے (سبحان اللہ) اُس کے کیا کہنے ہیں اور جو مستحبات میں سے ادنیٰ کو بجا لائے اعلیٰ کو چھوڑ دے اُس نے پسندیدہ طریقہ کو چھوڑ دیا لیکن پھر بھی وہ خیر سے محروم نہیں ہوگا اور جو شخص مستحبات میں سے کچھ بھی نہ بجا لائے اُس نے اپنے کو بہت خسارہ میں رکھا تو اب وہ بُرے کاموں ہی سے بچتا رہے اس پر بھی اُس کو ثواب ملے گا۔ اگر یہ بھی نہ کیا تو اُس کے ہاتھ سے دین جاتا رہا اُس کے پاس دین کا کوئی نشان نہیں۔ نسأل اللّٰہ العافیۃ بمنّہٖ۔ قولہ فمفهوم

الحدیث علی ھذہ التنویعات الی قولہ نسأل اللہ العافیۃ ۔

ف ۔ صوفیہ اور فقہاء میں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ نفع متعدی لازم سے افضل ہے اسی لیے اُن اعمال کو افضل کہا جاتا ہے جن کا نفع متعدی ہے ۔ مگر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ قاعدہ مستحبات و نوافل میں ہے فرائض میں نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ زکوٰۃ نماز سے افضل ہو حالانکہ بالاتفاق ایمان کے بعد تمام اعمال سے افضل نماز ہے حالانکہ اُس کا نفع لازم ہے اور زکوٰۃ کا نفع متعدی ہے ۔ مگر فرائض میں قاعدۂ مذکورہ جاری نہیں ۔ یہ قاعدہ مستحبات میں ہے کہ جس مستحب کا نفع متعدی ہو وہ اُس سے افضل ہے جس کا نفع لازم ہے اور مستحبات میں بھی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے کہ بعض دفعہ شیخ مبصر طالب حق کے لیے اُن اعمال کو ترجیح دیتا ہے جن کا نفع لازم ہے ۔ اس کو وہی سمجھتا ہے جس کو امراض قلب پر پوری نظر ہے وہ جانتا ہے کہ جس شخص کی اصلاح نفس پوری طرح نہیں ہوئی اس کو نفع متعدی کا اہتمام مفید نہیں ہوتا بلکہ عجب و کبر کا سبب بن جاتا ہے اسی لیے مبتدی سالک کو خدمتِ خلق کے خیال سے بھی روکا جاتا ہے ۔

جیسا بعض لوگ ذکر و شغل و اصلاحِ باطن میں اس قصد سے مشغول ہوتے ہیں کہ اپنی اصلاح و تکمیل کے بعد ہم دوسروں کی اصلاح کریں گے ۔ یہ خیال عجب و کبر سے پیدا ہوتا اور اُس کو بڑھاتا ہے ۔ مبتدی سالک کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیئے یہ وسوسہ بھی نہ لانا چاہیئے کہ بعد میں دوسروں کی اصلاح کروں گا ۔ اسی طرح اس کو واعظ کہنے سے بھی منع کیا جاتا ہے کیونکہ لوگوں کی تعظیم و تکریم سے اُس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے واعظ میں خلوص پیدا نہیں ہوتا ۔ وہ ایسی تقریر کرنے کی خواہش کرتا ہے جس سے لوگوں میں تعریف ہو تام مشہور ہو تو ایسا نفع متعدی کس کام کا جس میں اخلاص نہ ہو ۔ جملہ اعمال کی روح اخلاص ہے ۔ اگر اخلاص نہیں ہے تو عمل مقبول نہیں خواہ اُس کا نفع لازم ہو یا متعدی ۔

میں نے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ سے سنا کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس مدرسہ دیوبند کانپور میں خدام کے اصرار سے وعظ کے لیے کھڑے ہوئے۔ اُس وقت اتفاق سے کسی مسئلہ منطق کی تقریر درمیان میں آگئی۔ حضرت مولانا نے اس مسئلہ کی ایسی تشریح فرمائی کہ علماء منطق نے بھی نہ سنی ہوگی۔ اثناء تقریر میں ایک بہت بڑے معقولی عالم تشریف لے آئے۔ حضرت مولانا کی نظر جو اُن پر پڑی فوراً تقریر بند کر کے بیٹھ گئے۔ جب جلسہ منتشر ہوگیا تو ایک بزرگ نے عرض کیا کہ آپ نے فلاں صاحب کے آنے پر تقریر کیوں بند کر دی؟ یہی تو موقع اس تقریر کا تھا تاکہ اُن کو بھی معلوم ہو جاتا کہ علماء دیوبند معقول و منطق میں بھی کسی سے کم نہیں۔ فرمایا ہاں یہی خیال تو میرے دل میں بھی آگیا تھا کہ اب موقع ہے اسی لیے تقریر بند کر دی۔

مطلب یہ تھا کہ جب وعظ میں اس خیال سے کوئی تقریر کی جائے کہ اب موقع ہے اب مخالفوں کو بھی ہمارا کمال معلوم ہوگا تو خلوص کہاں باقی رہا۔ اس وقت تقریر بند کر دینا چاہیئے۔ سبحان اللہ! یہ حضرات اطباء قلوب تھے نفس کے مکر و کید پر ہر وقت اُن کی نظر رہتی ہے۔ اگر ہم جیسے ہوتے تو کسی نہ کسی تاویل سے خلوص کا دعوےٰ کر لیتے اور تقریر بند نہ کرتے۔ مثلاً یہی تاویل کر لیتے کہ ہم اپنا کمال نہیں ظاہر کرتے بلکہ اپنے بزرگوں اور اُستادوں کا کمال ظاہر کرنا چاہتے ہیں مگر اللہ تعالےٰ کے سامنے یہ تاویلیں نہیں چل سکتیں ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام   در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

با خدا تدبیر و حیلہ کے رواست

کار با او راست باید داشتن   رایت اخلاص و صدق افراشتن

پس صدقہ کرنے والے کو بھی اخلاص کا اہتمام کرنا چاہیئے اسی لیے صدقۂ نافلہ کو چھپا کر دینا افضل ہے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔

(تنبیہ) یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا کہ کسی حاجت مند پریشان کی مدد کردے۔ حالانکہ ثواب تو ہر مسلمان کی مدد کرنے میں ملتا ہے۔ خواہ حاجت مند ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ فی عون العبد مادام العبد فی عون اخیہ۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد کرتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی (مسلمان) کی مدد میں لگا رہے۔ جواب یہ ہے کہ ثواب تو ہر مسلمان کی مدد میں ملتا ہے مگر جب صحابہ نے صدقہ کی انواع سے سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ اُن کو ایسے اعمال بتلادیں جن کا ثواب صدقہ کے برابر ہو۔

سو ظاہر ہے کہ حاجت مند پریشان کی مدد میں ثواب زیادہ ہے اگر حاجت مند نہ ہو تو ثواب کم ہے اور حاجت مند ہو پریشان نہ ہو۔ جب بھی اس قدر ثواب نہ ہوگا جتنا حاجت مند پریشان کی مدد میں ہے۔ بس اس صفت کے زیادہ ہونے سے مدد کا ثواب اس قدر ہوگیا کہ صدقہ فوت ہونے کی تلافی ہوجائے گی۔ پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہاں مدد سے مراد مالی امداد نہیں کیونکہ یہ عمل اُس شخص کے واسطے بتلایا گیا ہے جو صدقہ مالیہ سے بالکل عاجز ہے۔ مدد سے یہاں مراد یہ ہے کہ پریشان آدمی کو پریشانی سے نکلنے کا راستہ بتلادیا جائے اگرچہ اپنے پاس سے کچھ نہ دو۔ مثلاً اُس سے یوں کہدو کہ میں تم کو ایک صورت بتلاتا ہوں جس سے یہ پریشانی دُور ہوجائے گی۔ اتنا کہنے سے ہی پریشان آدمی کو اس درجہ خوشی ہوگی کہ صدقہ لینے سے نہ ہوتی۔ مثلاً ایک آدمی راستہ بھُول گیا ہے تم اُس سے کہو کہ آؤ میں تم کو اُس جگہ پہنچادوں گا جہاں تم جانا چاہتے ہو۔ یقیناً گم کردہ راہ کو تمہاری اس بات سے بے حد خوشی ہوگی یا کسی پر مقدمہ قائم ہوگیا ہے تم اس سے کہو کہ میں تم کو فلاں رئیس کے پاس پہنچائے دیتا ہوں وہ تمہاری سفارش حاکم سے کردے گا۔ خود سوچ لو کہ اتنا کہنے سے پریشان آدمی کو کس قدر تسلی ہوگی یا کسی کا کوئی عزیز قریب مرگیا ہو اور وہ اُس کے غم میں

پریشان ہو تم اُس کی تسلی و تعزیت کے لیے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگو اور اُس کا غم غلط کر دو تو اُس کو کس قدر راحت ہو گی۔ بس جو شخص کسی مسلمان کی مالی امداد نہ کر سکے وہ ان طریقوں سے کسی پریشان آدمی کی پریشانی کو دُور کرنے کا اہتمام کرے تو اُس کو بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ رئیس الاتقیا تھے۔ ایک دفعہ آپ پیادہ سفر کر رہے تھے اور عادت اکثر پیادہ سفر کرنے کی تھی۔ راستہ میں ایک بوڑھے کو دیکھا سر پر لکڑیاں لادے ہوئے جا رہا ہے، اور بوجھ کی وجہ سے سانس پھول رہی ہے۔ آپ آگے بڑھے اور اُس سے کہا بھائی تم تھک گئے ہو۔ لاؤ کچھ دُور تک میں یہ بوجھ لے لوں۔ اُس نے مقدس صُورت دیکھ کر کہا کہ تم بھی تو بوڑھے ہو مجھ سے کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتے فرمایا ہاں ٹھیک ہے مگر میں خالی ہاتھ سفر کر رہا ہوں اس لیے تم سے زیادہ تھکا ہوا نہیں۔ اُس نے کہا مگر تمہاری صُورت شریفانہ ہے تم نے بوجھ اُٹھانے کا کام کب کیا ہو گا؟ فرمایا نہیں بھائی کام تو سب ہی کو کرنا پڑ جاتا ہے بغرض بہت اصرار کے ساتھ اس سے لکڑیوں کا بوجھ لے کر اس کے گاؤں تک پہنچایا۔ اُس کا گاؤں ایک دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ راستہ میں باتیں ہونے لگیں تو وہ بوڑھا پوچھتا ہے کہ میاں تم مولوی مظفر حسین صاحب کو بھی جانتے ہو جو کاندھلہ میں رہتے ہیں۔ فرمایا ہاں جانتا ہوں۔ کہا مجھے اُن سے ملنے کا بہت ہی شوق ہے۔ نہ معلوم وہ آج کل کاندھلہ ہیں یا کہیں باہر ہیں۔ جب اُس کا گاؤں آ گیا اور اُس نے آپ کے سر پر سے بوجھ اُتار لیا اُس وقت فرمایا کہ بھائی مظفر حسین تو میرا ہی نام ہے کاندھلہ رہتا ہوں اور وہیں جا رہا ہوں لوگ مولوی مظفر حسین بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ سُن کر بوڑھا پیروں میں گر پڑا کہ حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟ فرمایا کیا حرج ہے، مسلمان مسلمان کے کام آہی جاتا ہے۔ یہ بھی حاجت مند پریشان کی مدد کی ایک صُورت ہے اور تم سوچو گے تو

اور بہت سی صُورتیں سمجھ میں آجائیں گی ۔

اللہ تعالیٰ مُسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائیں کہ اپنے حاجت مند پریشان بھائیوں کی پریشانی دُور کرنے کی تدبیریں سوچا کریں اور ان کی مدد کیا کریں ۔ اگر سب مُسلمان بھائیوں میں یہی ایک وصف پیدا ہو جائے تو اُن کے دن پھر جائیں اور یہ صُورتِ حال بدل جائے جو اِس وقت اُن پر وبال کی طرح مسلط ہے جس کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہر شخص کو اپنی فکر ہے دُوسروں کی فکر نہیں ۔ ہر شخص اپنی غرض کا بندہ ہے ۔ اپنی ذاتی منفعت کو قوم کی منفعت پر مقدم کرتا ہے ۔ جب تک کسی قوم میں یہ مرض موجود ہے وہ کبھی دُنیا میں عزت و راحت حاصل نہیں کر سکتی ۔

(۱۷۹) دُوسروں کو پریشان کرنا گُناہ اور خود کو پریشان کرنا ثواب ہے

اس جگہ ایک بات پر تنبیہ (ضروری) ہے وہ یہ کہ شریعت کی حکمت میں غور کرو کہ دُوسروں کو راحت پہنچانا اور اُن کا دِل خُوش کرنا تو ثواب ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے واسطے ایسا کیا جائے اور دُوسروں کو ضرر پہنچانا اور پریشان کرنا گناہ ہے مگر خود اپنے نفس کو پریشان کرنا اس کو مجاہدہ (اور مشقت میں ڈالنا) ثواب ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے کیا جائے ۔ چنانچہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے (بطور وصیت کے) فرمایا تھا وزعزع بالخوف قلبک فان ذلک مما یرضی ربک ۔ اپنے دل کو خوف سے جھنجھوڑتے رہو کہ یہ حق تعالیٰ کو پسند ہے ۔

غور کرو اس میں کوئی حکمت معلوم ہوتی ہے یا نہیں ؟ ہم پہلے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ حکیم کوئی کام بدون حکمت کے نہیں کرتا (تو اس میں ضرور کوئی حکمت ہے)

چنانچہ اس کی حکمت ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی ۔ وہ یہ کہ (واللہ اعلم) اگر تم اپنے آپ کو خوش کرو گے اگرچہ یہ دعویٰ بھی کرو کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے ایسا کرتے ہو جب بھی نفس کے وسیسہ (اور مخفی کید) سے بہت کم سالم رہو گے کیونکہ اس

میں نفس کو حظ حاصل ہوتا ہے (اور جس عمل میں حظ نفس شامل ہو اس کا اللہ تعالیٰ کے واسطے ہونا بہت دشوار ہے۔ اس لیے اپنے نفس کو خوش کرنے میں ثواب نہیں بلکہ اس کو مجاہدہ و مشقت میں ڈالنا ثواب قرار دیا گیا) اور یہ سد ذریعہ کی جنس سے ہے جو کہ شریعت کا قاعدہ کلیہ ہے (کہ جو چیز کسی وقت شر کا ذریعہ بننے لگے اُس کو شروع ہی سے روک دیا جاتا ہے یہ نہیں کہ ذریعہ بننے کے وقت منع کی جائے اور پہلے جائز رکھا جائے) اس کی ایسی مثال ہے کہ حق تعالیٰ نے مکّہ کو خشک رکھا کہ وہاں کھیتی نہیں ہوتی اور وہاں تک پہنچنا بھی مشقت سے خالی نہیں تاکہ وہاں جانا اور قیام کرنا خالص اللہ تعالیٰ کے واسطے ہو کیونکہ اُس میں (بظاہر) کوئی ایسی چیز نہیں جو نفس (کی لذت اور حظ) کے مناسب ہو اور اگر برعکس معاملہ ہوتا کہ مکّہ سرسبزی اور شادابی اور (کثرت) فواکہ میں دمشق جیسا ہوتا تو وہاں جانا اور قیام کرنا خالص عبادت کے لیے نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کی سرسبزی میں حظ نفس اور تفریح بھی شامل ہو جاتی (اسی طرح یہاں سمجھو کہ اپنے نفس کو خوش کرنے میں چونکہ حظ نفس کی بھی آمیزش ہے اس لیے اُس میں ثواب نہیں بلکہ دُوسروں کو خوش کرنے میں ثواب ہے)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ غیروں کو خوش کرنا اگر خالص اللہ تعالیٰ کے واسطے ہو تو اُس میں نفس کو کچھ نہ کچھ تعب ضرور ہوتا ہے۔ کم از کم یہی بات ہے کہ ہر شخص کا دل ہر قسم کی بھلائی کو اپنے واسطے جمع کرنا چاہتا ہے اب اگر دُوسرے کے لیے ایثار کرے گا (اور اس کو کچھ بھلائی دینا چاہے گا) تو دل پر تعب ہو گا اور یہ (دل کا تعب ظاہر کے تعب سے بھی زیادہ گراں ہے۔ تو (اس صورت میں) عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے واسطے ہوگی اور عبادت کی جڑ اخلاص ہی تو ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مخلصین لہ الدین کہ اللہ کے لیے اخلاص کے ساتھ عبادت کا امر کیا گیا ہے) تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اخلاص کے اسباب بھی بتلا دیئے تاکہ اس کی برکت سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

مد پہنچے۔ اسی لیے یمن بن ازق رحمۃ اللہ علیہ نے جو دونوں جماعتوں کے بڑے ہیں (علماء کے بھی صوفیہ کے بھی) فرمایا ہے کہ میں نے عبادت کے معاملہ میں نظر کی تو غربت (یعنی گھر چھوڑنے) سے زیادہ کسی چیز کو اُس میں معین نہیں پایا۔ کیونکہ وطن اور اہل وعیال اور ہمسایوں کے پاس رہنے میں نفس کو بہت سے موانع (اور حظوظ نفسانیہ) پیش آتے ہیں (جو خالص اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہونے سے روکتے ہیں) ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر وطن سے دُور رہنے میں میرے دین کی اصلاح ہو تو اللہ تعالےٰ وطن اور اہل وعیال (کے پاس رکھ کر) اپنے سے مجھے متوحش نہ کرے جبکہ میری ہمت (اور توجہ) اللہ تعالےٰ سے وابستہ ہے اور میرا ارادہ اپنے دین کی درستی کا ہے۔ قولہ دھنا تنبیہ وھو المنظر الیٰ حکمۃ الشرع الیٰ قولہ وحزمی فی اصلاح دینی۔

ف ۔ یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون ۔ آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ جب قرآن ایسی چیز ہے پس ان) لوگوں کو اللہ تعالےٰ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیئے (اور اس کو دولت عظیمہ سمجھ کر لینا چاہیئے) وہ اس دُنیا سے بدرجہا بہتر ہے جس کو جمع کر رہے ہیں۔ اس آیت میں نعمتِ قرآن سے خوش ہونے کا امر ہے اور جس بات کا امر ہو اُس کے بجالانے میں ثواب یقینی ہے۔ تو اپنے نفس کو خوش کرنے میں بھی ثواب ہُوا۔ نیز ایک حدیث میں ہے اذا سرتک حسنتک وساء تک سیئتک فانت مؤمن جب تم کو اپنے نیک عمل سے خوشی ہو اور بُرے کام سے رنج ہو تو تم مومن ہو۔ اس میں نیک عمل سے خوش ہونے کو ایمان کی علامت بتلایا گیا ہے اور ایمان کی علامت کا مطلوب ہونا اور عمل مطلوب پر ثواب کا ہونا ظاہر ہے۔

جواب یہ ہے کہ آیت میں تو قرآن سے اور اسلام سے خوش ہونے کا امر ہے اور یہ ایسی نعمت ہے جو تمام مسلمانوں کے لیے عام ہے جس سے ہر

مُسلمان کو خوشی ہونا چاہیئے اور بحمد اللہ ہر مسلمان کو اس کی خوشی ہے کہ وہ وہ اللہ تعالےٰ کی آخری کتاب کا وارث اور اُس کے آخری پیغمبر کا اُمتی ہے۔ مگر یہ خوشی وہ نہیں جس سے یہاں بحث ہو رہی ہے۔ یہاں ایسی چیز پر خوشی مراد ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہو جیسے اپنا علم و عمل و عبادت وغیرہ۔

اور حدیث میں مسرت سے مراد طبعی مسرت ہے جو بے اختیار نیک عمل سے ہُوا کرتی ہے۔ جیسے گُناہ سے ایک قسم کی پریشانی اور وحشت ورنج بھی ہر مسلمان کو بے اختیار ہوتا ہے۔ غرض حدیث میں مسرت اختیاری مراد نہیں اور شارح کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کسی خاص حالت سے اپنے نفس کو قصداً خوش کرنے میں ثواب نہیں۔ اس پر کچھ اشکال وارد نہیں ہوتا۔ مگر یہ عرض کیا جائے گا کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے کیونکہ بعض دفعہ اپنی کسی خاص حالت سے بھی اپنے نفس کو خوش کرنے میں ثواب ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پر بحالتِ قبض حزن و غم یا خوف کا اس قدر غلبہ ہو جائے کہ یاس کے قریب حالت پہنچ جائے۔ اُس وقت اللہ تعالےٰ کی وہ نعمتیں جو خاص اپنے اُوپر ہیں سوچ کر دل کو خوش کرنا اور یاس کو دُور کر کے رجا کی کیفیت پیدا کرنا ثواب ہے۔ کیونکہ خدا کی رحمت سے یاس اور نا امیدی کفر ہے اور رجاء ایمان ہے تو جو خوشی کفر سے بچا کر ایمان کی طرف لائے یقیناً اس میں ثواب ہے۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ کی محبت دل میں غالب کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ کی اُن نعمتوں کو جو اپنے ساتھ مخصوص ہیں سوچنا اور اُن سے خوش ہونا ثواب ہے۔ کیونکہ یہ خوشی غلبۂ محبتِ الٰہی کا ذریعہ بن رہی ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے یہی وہ احوال ہیں جن کے لیے شیخ محقق سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے، وہی سمجھ سکتا ہے کہ کس کے لیے اپنے دل کو خوش کرنا ثواب ہے اور کس کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ کرنا ثواب ہے۔

ف ۔ اُوپر کہا گیا ہے کہ تم میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفس رکی لذت

اور خطا) کے مناسب ہو۔ میں نے یہاں "بظاہر" کی قید اس لیے بڑھادی ہے کہ باطن میں جمالِ کعبہ معظمہ اس قدر کشش اور دلربائی رکھتا ہے کہ جب مومن کی اُس پر پہلی بار نظر پڑتی ہے تو سفر کا تمام تکان جاتا رہتا ہے۔ اور اُن تمام مشقتوں کو بھول جاتا ہے جو وہاں پہنچنے تک پیش آئی تھیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ پہلی نظر سے دل میں کس قدر ٹھنڈک اور انشراح کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کے سامنے دُنیا بھر کی لذتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ بلاتشبیہ کعبہ معظمہ دُنیا میں جنت ہے جس طرح جنت میں قدم رکھتے ہی انسان اُن تمام مشقتوں کو بھول جائے گا جو جنت تک پہنچنے میں برداشت کی تھیں اور بے ساختہ کہے گا:

الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور۔ یہی حال کعبہ معظمہ کو پہلی بار دیکھ کر ہوتا ہے اور اس کا احساس جس طرح مومن کے دل کو ہوتا ہے کفار کے دلوں کو بھی ہوتا ہے بشرطیکہ دل میں کچھ احساس نیک و بد کا باقی ہو۔ غلبۂ مادیت سے بالکل نہ مسخ ہو گیا ہو۔

کعبۂ معظمہ میں علاوہ انوار باطنیہ کے ظاہری اعجاز بھی ایسا ہے جس سے مومن کا ایمان کامل ہوتا اور کافر کو ایمان کی طرف ہدایت ہو سکتی ہے اگر وہ انصاف سے کام لے۔ ایک یہ کہ کعبۂ معظمہ کی حُرمت کی وجہ سے چاروں طرف کچھ دُور تک مخصوص قطعہ کو زمینِ حرم قرار دیا گیا ہے جس میں شکار کرنا بھی ممنوع اور درختوں کا کاٹنا ناجائز ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس زمینِ حرم میں بھیڑیا اور بکری ساتھ ساتھ چلتے ہیں نہ بکری بھیڑیئے سے ڈرتی ہے نہ بھیڑیا اُس پر حملہ کرتا ہے۔ زمینِ حرم سے باہر نکلتے ہی پھر بکری بھیڑیئے کا شکار ہے۔

نیز تم دیکھو گے کہ ہزاروں پرند کعبہ کا چکر کاٹ کر نکلتے ہیں اُس کے اُوپر سے کوئی نہیں جاتا۔ دوسرے تم منیٰ میں دیکھو گے کہ تین پتھروں پر تین دن تک کنکریاں ماری جاتی ہیں اور یہ سلسلہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے

چلا آرہا ہے۔ ممکن ہے اُس وقت حجاج کی شمار کم رہی ہو مگر سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج وداع کے بعد سے تو آج تک حجاج کی شمار ہر سال لاکھ دو لاکھ سے کم نہیں ہوتی۔ اب سوچو کہ جن مقامات پر ہزاروں برس سے اسقدر بے شمار کنکریاں پڑتی چلی آتی ہیں وہاں تو ان کنکریوں سے پہاڑ بن جاتا۔ مگر مشاہدہ ہے کہ شام تک کنکریوں کا جس قدر انبار عظیم نظر آتا ہے صبح کو اُس کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ تھوڑی سی محدودے چند کنکریاں پڑی رہ جاتی ہیں باقی سب غائب ہو جاتی ہیں شاید تم کہو کہ حکومت نے اُن کے اٹھوانے کا انتظام کیا ہوگا۔ ہرگز نہیں! کسی کا دل چاہے تو رات دن پہرہ دے کر دیکھ لے اُس کو خود معلوم ہو جائے گا کہ حکومت کی طرف سے اُن کے اٹھوانے کا کوئی بندوبست نہیں۔ پھر یہ کنکریاں کہاں چلی جاتی ہیں ؟

حدیث میں آتا ہے کہ جو قبول ہو جاتی ہیں اُن کو فرشتے اُٹھا لیتے ہیں اور جنت میں پہنچا دیتے ہیں اور[ع] جو قبول نہیں ہوتیں وہ یہیں رہ جاتی ہیں۔ یہ زندہ معجزہ ہے جو زمانۂ رسالت سے اب تک باقی ہے اور جب تک خانۂ کعبہ کا حج ہوتا رہے گا باقی رہے گا۔

ف - اُوپر امام یمن بن رزق رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد مذکور ہُوا ہے کہ اصلاح حال اور عبادت کے معاملہ میں غربت یعنی گھر چھوڑنے سے زیادہ اُنہوں نے کسی چیز کو معاون نہیں پایا۔ یہی وہ چیز ہے جس پر اِس زمانے میں

ع - اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ بحمد اللہ حجاج میں ہر زمانے میں مقبول زیادہ ہوتے ہیں اور مردود بہت کم۔ پس وہ جو بمبئی سے ہر سال کسی شیخ احمد خادم روضۂ نبوی کے نام سے ایک اشتہار شائع ہوتا ہے وہ بالکل غلط اور سراسر جھوٹ ہے۔ مدینہ میں کوئی بھی شیخ احمد خادم روضۂ نبوی نہیں ہے۔ نہ معلوم یہ کس ملحد کی حرکت ہے جو ہر سال جھوٹا اشتہار شائع کرتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کو اُس پر ہرگز توجہ نہ کرنا چاہیئے اور جس کو بھی وہ اشتہار ملے فوراً جلا دینا چاہیئے۔ ۱۲۔ ظ ⁘

ہمارے محترم بزرگ اور مخلص دوست مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زور دیا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ اپنے گھر پر رہ کر پوری اصلاح نہیں ہوتی۔ لوگوں کو دین کے واسطے گھر چھوڑنے کی عادت کرنا چاہئیے کیونکہ گھر پر کچھ ایسے مشاغل مکان اور دکان اور تعلقات کے لگے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے پُوری طرح انسان کا دل دین کے واسطے فارغ نہیں ہوتا باہر وہ مشاغل اور موانع نہیں ہوتے تو جتنا وقت دین کے واسطے باہر نکل کر دیا جائے گا اُس میں دل کی توجہ کامل ہوگی اور قلب دین کے واسطے فارغ ہوگا۔ اسی لیے مولانا اس کی بہت تاکید کرتے تھے کہ گھر سے نکلو اور ایک چلّہ یا دو چلّہ یا جتنا وقت بھی سہولت سے دیا جاسکے گھر سے باہر نکل کر دین کے واسطے دو اور اس تمام وقت کو اس طرح تقسیم کرو کہ کوئی لمحہ بھی بے کار ضائع نہ ہو۔ کچھ دیر تعلیم دین حاصل کرو۔ کچھ دیر ذکر اللہ میں مشغول رہو۔ کچھ وقت تبلیغ میں صرف کرو کہ ناواقف مسلمانوں کو کلمۂ اسلام اور اس کے معنی بتلاؤ۔ بے نمازیوں کو نرمی اور شفقت سے نمازی بنانے کی کوشش کرو۔ کچھ دیر تلاوت قرآن اور نوافل میں مشغول رہو۔ غرض یہ سارا زمانہ غربت کا ایسے گزار دو کہ چند دنوں کے لیے حضرات صحابہ کا نمونہ بن جاؤ۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا کے طریقۂ تبلیغ سے فریضۂ تبلیغ بھی ادا ہوتا ہے اور خود اپنے نفس کی بھی اصلاح ہوتی ہے بشرطیکہ اُن اصولوں پر پُوری طرح عمل کیا جائے جو مولانا نے بتلائے ہیں۔ ولمثل هذا فليعمل العاملون۔

(۱۸۰) ترکِ عمل پر بھی ثواب ہے جب ترک کرنا واجب یا مستحب ہو

اس حدیث سے بعض اصولیین کا رد ہوگیا جو یہ کہتے ہیں کہ ترکِ عمل پر ثواب نہیں ہوتا (صرف عمل پر ثواب ہوتا ہے یعنی بُرے کام کے چھوڑنے پر ثواب نہیں) کیونکہ وہ عمل نہیں (بلکہ عدم عمل ہے) یہ لوگ راستہ سے چُوک گئے

اور گمراہی میں بہت دُور پہنچ گئے۔ وہ محض اپنی عقل سے ثواب (کا قاعدہ) مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب اور سُنّت کو نہیں دیکھتے۔ چنانچہ کتاب اللہ میں ارشاد ہے ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف (ان کافروں سے کہہ دو کہ) اگر وہ (کفر سے) باز آجائیں گے تو اُن کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور باز رہنا ایک عمل ہی تو ہے اس میں کچھ شک نہیں (مگر اس میں ایک اشکال ہے جس کا جواب فوائد میں مذکور ہوگا) اور حدیث (ایک دو نہیں اور بھی بہت ہیں منجملہ اُن کے) ایک تو یہی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے ویمسک عن الشر فانہ لہ صدقۃ اور شر سے بچنا رہے کہ یہ بھی اُس کے لیے صدقہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام نیک اعمال کو فلیعمل بالمعروف میں جمع فرما دیا ہے (کہ نیک اعمال کرتا رہے) اور جملہ اقسام شر کو اسی لفظ میں جمع فرما دیا ہے ولیمسک عن الشر۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک اعمال میں سے کوئی سا عمل کرے یا بُرے اعمال میں سے کسی عمل کو ترک کر دے، ہر صورت میں اُس کے لیے صدقہ (کا ثواب) ہے۔ یہاں تمہارے دل میں یہ کھٹک نہ ہونی چاہیئے کہ صدقہ (کا ثواب) مجموعہ پر ہوگا یعنی نیک عمل کرنے کے ساتھ بُرے عمل کے چھوڑنے پر ثواب ہوگا تنہا بُرے عمل کے چھوڑنے پر نہ ہوگا۔ کیونکہ الفاظ حدیث اس مفہوم کو ادا نہیں کرتے اور یہ تو معتزلہ کا مذہب ہے اُن کا قول ہے کہ نیکی اُس وقت تک مقبول نہیں ہوتی جب تک بُرے عمل کو نہ چھوڑا جائے۔ جمہور اُمت (کا قول) اس کے خلاف ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔

جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اُس کو بھی دیکھ لے گا (یعنی اُس کی جزا پائے گا) اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اُس کو بھی دیکھ لے گا اب اگر نیک عمل کی جزا بُرے اعمال کے چھوڑنے پر موقوف ہے تو لازم آئے گا کہ ذرہ برابر نیکی کچھ

کام نہ آئے گی۔ حالانکہ یہ نص کے خلاف ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں اتق محارم اللہ تکن اعبد الناس۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچتا رہ تو سب سے بڑا عابد بن جائے گا (اس میں بھی عمل خیر کی شرط نہیں صرف عمل شر سے بچنے پر بشارت دی گئی ہے) اور آیات و احادیث اس باب میں بہت ہیں تو سبحان اللہ! یہ لوگ سمجھ بوجھ سے کس قدر محروم ہو گئے۔ قولہ وفیہ دعلی بعض الاصولیین الی قولہ فسبحان من حرمہم طریق الرشاد۔

ف۔ میں نے اس مسئلہ کو مسائل تصوف میں اس لیے داخل کر دیا کہ صوفیہ نے اس سے اپنی کتابوں میں بحث کی ہے۔ اگرچہ یہ مقاصد میں سے نہیں۔ مگر مسئلہ مشکل ہے جس میں علماء امت نے بحث کی ہے اور ممکن ہے آج کل بھی اصول فقہ پڑھنے پڑھانے والے اس کو مشکل سمجھ رہے ہوں اس لیے جی چاہا کہ اپنی بساط کے موافق اس کو حل کر دوں کیا عجب ہے کسی کو فائدہ پہنچ جائے۔ اب سنئے۔

حضرت شارح نے اس حدیث سے اُن اصولیین کا رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ترک فعل پر ثواب نہیں ہوتا۔ میں نہیں معلوم کر سکا کہ یہ اصولیین کون ہیں؟ کیونکہ اصول حنفیہ میں یہ قول کسی کی طرف منسوب نہیں کیا گیا بلکہ ہماری کتب اصول میں ثواب و عقاب سے اس مسئلہ میں بحث ہی نہیں کی گئی۔ اصل بحث صرف یہ ہے کہ انسان اوامر شرعیہ میں تو بالاتفاق فعل کا مکلف ہے۔ یعنی جس بات کا شریعت میں امر ہے انسان اُس کے کرنے کا مکلف ہے لیکن جن اشیاء سے منع کیا گیا ہے جن کو نواہی کہتے ہیں وہاں فعل کا مکلف ہے یا عدم فعل کا؟ اصولیین کہتے ہیں کہ وہاں بھی فعل کا یعنی نفس کو گناہ سے روکنے کا مکلف ہے اور یہ فعل ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ منہیات میں فعل کا مکلف نہیں بلکہ عدم فعل کا مکلف ہے کہ وہ کام وجود میں نہ آئے خواہ نفس کو روکنے کی وجہ سے وجود

میں نہ آئے یا اس لیے کہ اُس کا ارادہ عدم کے ساتھ متعلق ہو۔ اصولیین فرماتے ہیں کہ ارادہ اور مشیت کا تعلق عدم سے نہیں ہوسکتا۔ پس اگرچہ شریعت کا مقصود تو یہی ہے کہ فعل ممنوع وجود میں نہ آئے مگر خود عدم کوئی شے نہیں جس سے مشیت کا تعلق ہو سکے۔ اس لیے ضرور ہے کہ منہیات میں انسان کو کف النفس کا یعنی نفس کو روکنے کا مکلف کہا جائے تاکہ اس سے مشیت متعلق ہو سکے اور اسی طرح قدرت کے تحت میں آ سکے۔ نفسِ عدم سے تو نہ مشیت متعلق ہو سکتی ہے نہ وہ قدرت کے تحت میں آ سکتا ہے اس کا مکلف کیونکر کہا جائے گا؟ معتزلہ کسی دلیل سے یہ تو ثابت نہیں کر سکے کہ عدم فعل قدرت کے تحت میں آ سکتا ہے۔ انہوں نے اصولیین پر یہ اعتراض کر دیا کہ تمہارے قول پر لازم آتا ہے کہ اگر کسی شخص کو فعلِ حرام کی طرف میلان ہی نہ ہو۔ جیسا حضرت صدیقؓ سے منقول ہے کہ میرے دل نے شراب کو کبھی نہیں چاہا نہ اسلام میں نہ جاہلیت میں۔ تو ان کو کچھ فضیلت حاصل نہ ہو کیونکہ کف النفس نہیں پایا گیا۔ نفس کو روکنا تو اُسی وقت ہو سکتا ہے جب خواہش ہو۔ اصولیین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں گو کف النفس نہیں پایا گیا مگر اُس سے اعلیٰ درجہ عصمت کا موجود ہے جو کف النفس سے بھی افضل ہے۔

ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے حرام کا ارتکاب اس لیے نہیں کیا کہ اُس کو حرام کا خیال ہی نہیں آیا تو چاہیئے کہ وہ گنہگار ہو کیونکہ اُس نے نفس کو روکا نہیں۔ جواب یہ ہے کہ جب تک اُس کو حرام کا خیال نہ آئے وہ کف النفس کا مکلف ہی نہیں تو گنہگار کیوں ہو۔ جب خیال آوے اُس وقت نفس کو روکنے کا مکلف ہے۔ ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو زنا کی طرف میلان ہوا اور اُس نے نفس کو میلان سے نہ روکا مگر زنا کیا بھی نہیں تو اس کو گنہگار ہونا چاہیئے۔ حالانکہ حدیث صحیح سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کے ارادہ پر تو ثواب لکھا جاتا ہے عمل ہو یا نہ ہو مگر سیئہ کے ارادہ پر گناہ نہیں لکھا جاتا

جب تک عمل نہ ہو۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قاعدہ سے اُس کو گناہ گار ہونا چاہیئے۔ مگر حدیث کی وجہ سے ہم اُس کو گناہ گار نہیں کہتے۔ یہ اللہ تعالےٰ کی رحمت ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں ارادہ سے مُراد قصد جازم نہیں ہے بلکہ حدیث النفس ہے کہ دل میں خیال آیا مگر اس کو پختہ نہیں ہونے دیا۔ خیال ہی کے درجہ میں رکھا تو یہ معاف ہے۔ کیونکہ اُس کا روکنا دشوار ہے الا لمن عصمہ اللہ۔ اور اگر قصد جازم ہوگیا تو اب اگر گناہ کا صدور اس لیے نہیں ہوا کہ اس نے خدا کے خوف سے نفس کو روک دیا تو یہاں کف النفس موجود ہے۔ وہ ثواب کا مستحق ہوگا اور اگر اس لیے صدور نہ ہوا کہ کوئی مانع حسی پیش آگیا۔ مثلاً عورت راضی نہ ہوئی یا تنہائی کا موقعہ نہ ملا یا اور کوئی سبب پیش آگیا اس صورت میں یہ گناہ گار ہے کیونکہ اس نے نفس کو گناہ سے نہیں روکا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اصولیین نے ثواب و عقاب سے بحث نہیں کی وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح اوامر میں انسان فعل کا مکلف ہے اسی طرح نواہی میں بھی فعل کا یعنی کف النفس اور ترک کا مکلف ہے۔ عدم فعل کا مکلف نہیں۔ ثواب و عقاب سے معتزلہ نے اپنے اعتراضات میں بحث کی ہے اور اس کا جواب اصولیین نے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ ترک بالقصد پر ثواب کے قائل ہیں۔ ترک بلاقصد پر ثواب کے قائل نہیں۔ اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ بعض اولیاء کاملین گناہوں کو بالقصد نہیں چھوڑتے۔ بلکہ اس لیے چھوڑتے ہیں کہ ان کو معاصی سے نفرت ہے اُن کو گناہوں کا خیال ہی نہیں آتا تو اصولیین کے قول پر لازم آتا ہے کہ ان حضرات کاملین سے وہ لوگ افضل ہوں جن کو گناہوں کی طرف میلان ہوتا ہے پھر نفس کو روکتے ہیں۔ اور غالباً یہی اشکال حضرت شارح کو پیش آیا ہے اُس کا جواب اصولیین نے یہ دیا ہے کہ ان کاملین کو کف النفس سے بڑھ کر دوسری فضیلت عصمت کی

حاصل ہے۔ اس لیے ناقصین اُن سے افضل نہیں ہوسکتے اور اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ ترک بلا قصد پر مطلقاً ثواب ملتا ہے تو اصولیین اُس کے قائل ہو جائیں گے مگر ابھی تک کسی نص سے اس کا ثبوت نہیں ملا اور حضرت شارح نے جس قدر دلائل بیان کیے ہیں اُن میں کسی دلیل سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ترک بلا قصد پر ثواب ملتا ہے۔ چنانچہ ان ینتھوا یغفرلھم ماقد سلف۔ میں کفار کو خطاب ہوا ہے کہ اگر وہ کفر سے باز آجائیں گے اُن کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

یہاں یقیناً کفر سے باز آنے کا مطلب قبولِ اسلام ہے اور وہ اُسی وقت معتبر ہے جب بالقصد ہو، بلا قصد ہرگز معتبر نہیں اور اگر کوئی کافر صرف کفر سے باز آجائے اسلام قبول نہ کرے اُس کے لیے ہرگز وعدۂ مغفرت نہیں اور یہ صورت محض فرضی ہے کیونکہ بدون قبولِ اسلام کے کفر سے باز آنے کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال یہاں ترکِ کفر بالقصد اور قبولِ اسلام بالاختیار مُراد ہے۔ بلا قصد ترکِ کفر اور بالاضطرار قبولِ اسلام پر مغفرت مرتب نہیں ہوتی اور جس حدیث کی ہم شرح کر رہے ہیں اُس میں بھی "ولیمسک عن الشر" سے قصد و اختیار کے ساتھ گناہوں کا چھوڑنا مراد ہے۔ بلا قصد چھوڑنا مراد نہیں کیونکہ لفظ "امساک" متعدی ہے جس کے وہی معنی ہیں جو کف النفس کے معنی ہیں اور اُس پر اصولیین ثواب کے قائل ہیں۔ اسی طرح اتق محارم اللہ میں بھی اتقا متعدی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے ارادہ و اختیار سے محارم اللہ کو چھوڑ دے۔ اس کا حاصل بھی وہی کف النفس ہے۔ البتہ ایک حدیث بظاہر اہل اصول کے خلاف ہے:

وھو قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی بضع احدکم بصدقۃ قالوا یا رسول اللہ ھل فی بضع احدنا صدقۃ قال نعم ارأیتم لو جعلھا فی حرام کان علیہ وزر قالوا نعم قال فکذلک او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ تمہاری شرمگاہ میں بھی صدقہ ہے (جبکہ بیوی یا شرعی باندی سے مشغول ہو) صحابہ نے اس پر تعجب کیا کہ یا رسول اللہ! کیا شرمگاہ میں بھی صدقہ ہے؟ فرمایا بتلاؤ اگر وہ حرام جگہ میں اُس کو استعمال کرتا تو اُس پر گناہ نہ ہوتا؟ عرض کیا ہاں گناہ ہوتا۔ فرمایا تو ایسے ہی (جب حلال جگہ استعمال کیا ثواب بھی ہوگا) اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کے پاس جانے میں اس لیے ثواب ملا کہ حرام جگہ سے باز رہا تو حرام سے بچنے میں مطلقاً ثواب ہُوا خواہ اس قصد سے بیوی کے پاس گیا ہو یا نہ گیا ہو۔

جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے تو صرف اتنا ہی معلوم ہُوا کہ بیوی کے پاس جانے میں ثواب ہے اور حرام جگہ جانے میں گناہ ہے۔ پھر اُس کی وجہ بتلائی گئی کہ بیوی کے پاس جانے میں ثواب اس لیے ہے کہ وہ زنا سے بچنے کا سبب ہے اور جو عمل کسی حرام سے بچنے کا ذریعہ ہو اس میں ثواب ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ تو عمل پر ثواب ہے نہ کہ محض ترک عمل بلا قصد پر۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بیوی کا دیانۃً حق ہے کہ مرد گاہے گاہے اُس سے ہم بستری کرے تاکہ اُس کی عفت و عصمت محفوظ رہے۔ اسی طرح خود اپنے کو حرام سے بچانے کے لیے بھی قضاءِ شہوت ضروری ہے، تو چونکہ بیوی کے پاس جانے میں اُس کی اور اپنی عفت کی حفاظت بھی ہے اور بیوی کے حق کی ادائیگی بھی ہے۔ اس لیے ثواب ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ثواب عمل پر ہے محض ترکِ حرام بلا قصد پر نہیں اور یہی حکم باندی کے پاس جانے کا ہے جبکہ شرعی باندی ہو کیونکہ اُس کی عفت کی حفاظت بھی مولیٰ پر واجب ہے۔

یہ تو اصولیین حنفیہ کا مذہب ہے اصولیین مالکیہ کا مذہب مجھے معلوم نہیں کہ وہ مطلقاً ترکِ عمل پر ثواب کا انکار کرتے ہیں یا ترکِ بلا قصد پر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعضے مطلقاً ترک پر ثواب کے منکر ہیں جیسا حضرت شارح کے بیان سے واضح ہوتا ہے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ گناہ کو بالقصد ترک

کرنا اور اُس سے بچنا عین تقویٰ ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہے واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوىٰ فان الجنة هى الماوىٰ ۔ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش (نفسانی) سے روکتا رہا تو اُس کا ٹھکانا جنت ہے۔ اس میں ترک ہوئی پر وعدۂ ثواب کی تصریح ہے اور یہ حدیث جس کی شرح کی جا رہی ہے صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بُرے کاموں سے رُکنا صدقہ ہے اس سے پہلے ایک حدیث گذر چکی ہے جس میں سات شخصوں کے لیے قیامت میں سایۂ عرش کی بشارت ہے جن میں ایک وہ شخص بھی ہے جس کو کسی خوبصورت معزز عورت نے اپنی طرف بُلایا اور وہ یہ کہہ کر رُک گیا کہ میں اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہوں۔ یہاں بھی ترک پر ثواب کا وعدہ ہے۔

اسی طرح حدیثِ غار میں بھی یہی مضمون ہے جو پہلے گذر چکی۔ پس یہ کہنا کہ ترک پر مطلقاً ثواب نہیں سراسر نصوص کے خلاف ہے۔ البتہ ترک بلا قصد پر ثواب کی تصریح کسی روایت میں نظر سے نہیں گذری۔ اگر کوئی صحیح روایت اس مضمون میں صریح ہو تو وہ اصولیین کے قول سے مقدم اور راجح ہوگی کیونکہ اُس باب میں قیاس کوئی چیز نہیں اس کا مدار محض نصوص پر ہے اور اللہ تعالےٰ کے رحم و کرم سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سب مسلمانوں کی حسنات کو سیئات پر غالب کر دیں۔ فانہ برءُ وف رحیم۔

اُوپر معاصی سے غفلت کے متعلق ایک سوال و جواب مذکور ہُوا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص معاصی سے غافل ہو اُس کو گناہ نہیں کیونکہ غفلت کی حالت میں وہ کفِ النفس کا مکلف نہیں۔ اس پر سوال یہ ہے کہ اُس کو ثواب ملتا ہے یا نہیں۔ اصولیین کے جواب میں ثواب سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔ میرے نزدیک اس میں تفصیل کی ضرورت ہے وہ یہ کہ دیکھنا چاہیئے کہ معاصی سے غفلت کا منشاء کیا ہے؟ اگر منشاء طاعات و حسنات میں انہماک ہے تو اس غفلت پر ثواب ملے گا۔ کیونکہ اس غفلت کو اللہ تعالےٰ نے مدح و

شناء کے موقع پر بیان فرمایا ہے ان الذین یرمون المحصنٰت الغافلات المؤمنات لعنوا فی الدنیا والاخرۃ۔ (جو لوگ پاکدامن غافل بے خبر مومن عورتوں کو تہمت لگاتے ہیں اُن پر دُنیا و آخرت میں لعنت ہے) یہاں غافلات کا یہی مطلب ہے کہ وہ بُرے کاموں کو جانتی ہی نہیں ہیں۔ بس اپنے دینی مشاغل اور گھر کے کار کاج میں لگی رہتی ہیں اور اگر غفلت کا منشاء دُنیا میں انہماک ہے کہ اس کو اپنی تجارت یا ملازمت کے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی جو گناہوں کی طرف التفات ہو، تو اگر تجارت یا ملازمت وغیرہ موافق شریعت ہو اور فرائض و واجبات میں اُس کی وجہ سے کوتاہی نہ ہوتی ہو تو اُس میں بھی ایسا انہماک جو معاصی سے روک دے محمود ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا ارشاد ہے۔ ان اللہ یبغض الرجل البطال۔ اللہ تعالیٰ بے کار آدمی سے نفرت کرتے ہیں (کیونکہ بے کاری ہی میں گناہوں کی فرصت ملتی ہے) جب بے کاری ناپسند ہے تو کام میں لگے رہنا اللہ تعالےٰ کو پسند ہے اور جو چیز ان کو پسند ہو اُس پر ثواب ضرور ہے مگر گو اس قدر نہ ہو جس قدر اطاعات و حسنات میں مشغول رہنے سے ملتا اور اگر مُسلمان کسب معاش میں بھی اپنی نیت درست کرے کہ اہل وعیال کا حق ادا کرنے اور فقراء کی امداد کرنے اور دین کی خدمت کرنے کے واسطے دُنیا کمائے تو وہ بھی پھر حسنات میں داخل ہو جائے گی۔ مگر یہ نیت صرف لفظوں سے نہیں ہوتی بلکہ سچے

عہ ایک حدیث میں ہے ان من الذنوب ذنوبا لا یکفرھا الصلوٰۃ ولا الصوم ولا الحج ویکفرھا الھم فی طلب المعیشۃ الطبرانی وابونعیم صاحب الحلیۃ واللفظ المصنف فی بھجۃ النفوس لا یکفرھا الا الکد علی العیال۔ ص ۱۹۲ ج ۲۔

گناہوں میں سے بعض گناہ وہ ہیں جن کا کفارہ نہ نماز سے ہوتا ہے نہ روزہ سے نہ حج سے اُن کا کفارہ طلب معاش میں فکر سے ہوتا ہے۔ ایک لفظ میں یہ ہے کہ اُن کا کفارہ عیال کے

ارادہ [illegible] ہے اور اگر یہ غفلت کسی مکروہ میں انہماک سے ہے جیسے شطرنج یا کھیل کود میں ایسا انہماک [illegible] ہے جس کی وجہ سے [illegible] معاصی کا خیال ہی نہیں آتا تو اگر یہ انہماک فرائض و واجبات میں مخل ہوتا ہے تو اس غفلت میں گناہ ہے اور اگر فرائض و واجبات میں مخل نہیں ہوتا تو اس غفلت میں نہ ثواب ہے نہ گناہ۔ ہاں یہ شخص اُن لوگوں سے اچھا ہے جو معاصی میں منہمک رہتے ہیں۔ اور اگر کسی ایک گناہ میں ایسا منہمک ہے جس کی وجہ سے دُوسرے گناہوں کی طرف التفات نہیں ہوتا تو یہ غفلت بھی گناہ ہے کیونکہ اس کا منشا انہماک فی المعصیۃ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اے اللہ! ہمیں ایسا بنا دے جیسا آپ چاہتے ہیں۔ اے اللہ! ہمیں اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے۔ اے اللہ! ہمارے ذریعہ سے اپنے دین کو عزت اور غلبہ دے۔ اللّٰھم اجعلنا کما تحب و ترضیٰ۔ واجعل آخرتنا خیرا من الاولیٰ۔ آمین!



باب ۵

حدیث

اخذ المال بسخاوۃ النفس

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے مجھے دیا، پھر سوال کیا تو آپ نے پھر بھی مجھے دیا۔ پھر مانگا تو پھر بھی دیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا اے حکیم! یہ مال (دیکھنے میں) خوشنما (اور دل کو) مرغوب ہے تو جو شخص اس کو نفس کی استغناء کے ساتھ لے اُس کے لیے تو مال میں برکت عطا کی جاتی ہے اور جو نفس کی طمع و حرص کے ساتھ لے اُس میں برکت نہیں دی جاتی اُس کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے بعض آدمی کھاتا ہے اور اُس کا پیٹ نہیں بھرتا اور یاد رکھو، اونچا ہاتھ جھکے ہوئے ہاتھ سے اچھا ہوتا ہے۔

شرح حدیث کا ظاہری مطلب تو یہ ہوا کہ استغناء نفس کے ساتھ جو مال ملے اُس میں برکت ہوتی ہے اور حرص و طمع سے جو کچھ لیا جاتا ہے اُس میں برکت نہیں ہوتی۔ حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا ثبوت ہو رہا ہے کہ مانگنے والے نے بار بار مانگا اور ہر دفعہ آپ دیتے رہے۔ بار بار مانگنے سے پریشان نہیں ہوئے۔

(۱۸۱) مال جمع کرنے کے ساتھ بھی زہد ہو سکتا ہے حدیث سے ثابت ہوا کہ مال حاصل کرنے (اور جمع کرنے) کے ساتھ بھی زہد ہو سکتا ہے اور زہد کے ساتھ

مال حاصل کرنے پر چند فائدے مرتب ہوتے ہیں. ایک تو زہد کا ثواب، دُوسرے دل کا چین، تیسرے رزق میں برکت. زہد پر تو حدیث کا یہ لفظ دلالت کر رہا ہے فمن اخذہ بسخاوۃ نفس. جس نے اس مال کو سخاوت نفس کے ساتھ لیا (جس کا ترجمہ ہم نے استغناء کیا ہے) اور (ظاہر ہے کہ) سخاوت نفس ہی تو زہد (کی حقیقت) ہے (اس سے ثابت ہوا کہ زہد مال کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے) رہا دل کا چین تو اسکی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے الزھد فی الدنیا یریح القلب والبدن دُنیا سے بے رغبت ہونا دل کو بھی راحت دیتا ہے اور بدن کو بھی. اور انسان کے لیے یہی سب سے بڑی راحت ہے (اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے کہ دل کو بھی چین ہو اور بدن کو بھی) اور برکت رزق پر حدیث کا یہ جملہ دلالت کر رہا ہے بورک لہ فیہ کہ اس کے مال میں برکت عطا کی جاتی ہے اور اس (مجموعہ) پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہُوا کہ زہد میں دُنیا و آخرت دونوں کی بھلائیاں جمع ہو جاتی ہیں. دُنیا کی بھلائی تو یہ کہ اُسکے مال میں برکت ہوتی ہے جس سے حریص آدمی محروم ہے وہ دُنیا جمع کرنے میں رہتا ہے مگر برکت نہیں پاتا. دُوسرے زاہد کو دل اور بدن دونوں کے چین حاصل ہوتی ہے جس سے اہل دُنیا یکسر محروم ہیں حالانکہ دُنیا میں راحت کی حقیقت یہی ہے (کہ دل اور بدن کو چین ہو) اور آخرت کی بھلائی یہ ہے کہ زہد کا ثواب ملیگا اور اس سے حساب کم ہوگا. کیونکہ زہد کی وجہ سے وہ مال کے حقوق واجبہ (زکوٰۃ و نفقاتِ لازمہ) کو ادا کرتا رہے گا اور جس مال میں شبہ ہوگا اُس سے الگ رہیگا اور یہی پوری سعادت ہے (کہ قیامت میں ثواب کا مستحق ہو اور باز پرس سے بچا رہے).

اور طالب دُنیا کو دُنیا میں بھی خسارہ ہے اور آخرت میں بھی. دُنیا کا خسارہ تو یہ کہ دل اور بدن دونوں بے چین رہتے ہیں چنانچہ حدیث میں ہے والحرص فیھا تعب للقلب والبدن دُنیا کی حرص دل کو بھی تعب میں ڈالتی ہے اور بدن کو بھی اور یہ انتہا درجہ کی مصیبت اور مشقت ہے. زیادہ سامانِ دُنیا جمع کرنے سے جو اُمید قائم کی تھی وہ پوری نہیں ہوتی کیونکہ اُس کی برکت جاتی رہتی ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہو چکا کہ جو شخص دُنیا کو اشرافِ نفس (یعنی حرص) سے لے گا اس میں برکت نہیں دی جاتی اور اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہوگی کہ انسان سرتاپا پریشانی و مشقت ہی میں رہے پھر بھی جو اُمید قائم کی تھی وہ

پوری نہ ہوئی۔ تم اس کا مشاہدہ حسی طور پر یوں کر سکتے ہو کہ اہل دُنیا کی جاں (دسترخوان پر) دیکھنے میں کھانا بہت ہوتا ہے اور کھاتے وقت (تھوڑے میں پیٹ نہیں بھرتا بلکہ) بہت زیادہ کھانے سے پیٹ بھرتا ہے اور جتنا کھایا جاتا ہے اُس کی نسبت سے (بدن اور دماغ و قلب میں) طاقت کم آتی ہے اور اصل میں تو زاہدین کا کھانا دیکھنے میں کم ہوتا ہے مگر اُس سے بڑی جماعت کا پیٹ بھر جاتا ہے اور جتنا کھاتے ہیں اُس کی نسبت سے اُن میں قوت اور طاقت بہت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ پھر اہل دُنیا کو اس پریشانی اور مشقت کے ساتھ دوسری مصیبت یہ پیش آتی ہے کہ اُن میں باہم حسد اور کینہ اور غیبت اور بخل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یا تو وہ بخل کی وجہ سے دُوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتے یا کم ادا کرتے ہیں یا اپنے حقوق پُوری طرح وصول کرنا چاہتے ہیں (کہ پائی پائی کا حساب کرتے ہیں) ان تمام مصائب اور مُشکلات کے علاوہ آخرت کا خسارہ جُدا رہا، جس میں عذاب بھی ہے اور ذلت بھی۔ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے ہمیں اُس سے بچائے (آمین) قولہ فیہ دلیل قد یقع الزھد مع الاخذ الخ قولہ اعاذنا اللہ منھا بمنہ ۔

ف ۔ بعض لوگوں کے نزدیک زہد کے معنی یہ ہیں کہ مال و دولت سے بالکل کنارہ کش ہو جائے۔ مال کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ کسی کا ہدیہ بھی قبول نہ کرے نہ تجارت و ملازمت اور صنعت و حرفت میں مشغول ہو یہ غلط ہے۔ زہد کی حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کو دل سے چھوڑ دے اور اُس کی پروا نہ کرے کہ کس نے اس کو لیا۔ زہد آرزو کم کرنے کا نام ہے۔ زاہد وہ ہے جس نے اُن تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جو اللہ تعالےٰ سے غافل کرتی ہیں۔ تم دیکھو گے کہ بعضے ظاہر میں مفلس و فقیر ہیں مگر پھر بھی خدا سے غافل ہیں اور بعضے ظاہر میں مالدار ہیں مگر اُن کا باطن دوامِ حضور مع اللہ تعالےٰ سے مالامال ہے۔

حدیث میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے بتلا دیا گیا ہے کہ جو اس مال کو اشرافِ نفس یعنی حرص و طمع سے لیتا ہے وہ زاہد نہیں اور جو سخاوتِ نفس یعنی استغناء سے

لیتا ہے وہ زاہد ہے۔ گو اس کی پاس بہت کچھ ہو مگر دل اُس کی محبت سے خالی ہو اور مال سے دین کے کاموں میں مدد لیتا اور اہلِ حقوق کے حقوق ادا کرتا ہو۔

تصوف اور زہد کی حقیقت غیر اللہ سے مُنہ پھیر لینا اور اللہ تعالے پر بھروسہ رکھنا اور ہر حالت کی باگ تفویض و رضا کے ہاتھ میں دے دینا اور در دروازۂ کرم کے کھلنے کا منتظر رہنا اللہ تعالےٰ کے فضل پر اعتماد کرنا، ہر وقت اللہ تعالےٰ سے ڈرتا رہنا اور تمام حالات میں اللہ تعالےٰ سے نیک گمان رکھنا ہے۔ خُوب سمجھ لو۔

آج کل کے مشائخ میں زاہد کی پہچان یہ ہے کہ جو ہر ہدیہ قبول نہ کرتا ہو بلکہ بعض کو قبول کرتا ہو بعض کو رد کر دیتا ہو۔ جو شخص کسی کا ہدیہ رد نہ کرتا ہو سب کو ہی قبول کرلیتا ہو وہ زاہد نہیں۔

ف - ہم نے اہل اللہ کے کھانے میں کھلی آنکھوں برکت کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ حضرات بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ عین وقت پر زیادہ مہمان آگئے تو گھر میں جو کھانا موجود تھا وہی اُن کے سامنے لاکر رکھ دیا اور سب کے سب اُس سے سیر ہو گئے۔ حالانکہ جب کھانا سامنے آیا تھا تو خیال ہوتا تھا کہ اتنے بڑے مجمع کو یہ تھوڑا سا کھانا کیونکر کافی ہوگا۔ مگر بسم اللہ کرکے کھانا شروع کیا تو کافی سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اہل اللہ کے یہاں کا کھانا اہلِ دُنیا کے کھانوں سے لذیذ بھی زیادہ ہوتا ہے اور اُس سے قلب و دماغ اور جسم کو وہ طاقت حاصل ہوتی ہے جو مالداروں کے مرغن قیمتی کھانوں سے نہیں ہوتی۔

(۱۸۲) زہد سلوک باطن کا پہلا دروازہ ہے

حدیث میں فضیلت صوفیہ کی بھی دلیل ہے جن کے طریق کی بُنیاد ہی زہد پر ہے کیونکہ وہ سلوک کا پہلا دروازہ ہے اسی لیے یمن بن رزق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر تمہارے دل میں فقر اور غنا کا اندیشہ (یا فکر) ہو اور منصب و ریاست کی طلب ہو تو تمہارا قدم دین کے راستہ میں نہیں جم سکتا۔ یہ تو دائمی فقر (اور محرومی) کی کنجی ہے۔ قولہ وفیہ دلیل لفضل اھل الصوفۃ

الیٰ قولہ فذالک مفتاح فقر الابد ۔

ف ۔ اس کا حاصل وہی ہے جو اُوپر کہا گیا ہے کہ زاہد وہ ہے جس کا دل محبت منصب دنیوی اور طلب ریاست سے پاک ہو۔ اگر بلا طلب اور بدون محبت کے کوئی منصب مل جاوے اور خلافِ شریعت نہ ہو اُس کا قبول کر لینا خلاف زہد نہیں۔ حضرات خلفاء راشدین سے زیادہ زاہد کون ہوگا مگر سب کے سب صاحب منصب خلافت تھے۔ اسی طرح بہت سے اولیاء کرام صنعت و حرفت والے تھے۔ کسبِ حلال کے لیے اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ بعض اولیاء کرام صاحبِ خانقاہ تھے مگر اُن کے یہاں کثرت سے ہدایا اور نذرانے آتے تھے جن کی وجہ سے اُن کا دربار شاہانہ معلوم ہوتا تھا مگر اُن کے قلوب محبتِ دُنیا سے پاک تھے جس پر اُن کے احوال و واقعات شاہد تھے۔

(۱۸۳) مثال بیان کرنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ جس بات کو مخاطب نہ سمجھ سکے اُس کے سمجھانے کے لیے ایسی مثال کرنا جائز ہے جس سے وہ اچھی طرح بات سمجھ جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ یہ اعمال بیان فرمائی ہے کہ جو شخص حرص کے ساتھ مال جمع کرتا ہے اُس کے مال میں برکت نہیں ہوتی اور اُس کا حال ایسا ہوتا ہے کہ جیسے بعض آدمی کھاتا ہے مگر اُس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ کیونکہ عام طور سے اکثر آدمی خصوصاً اس زمانہ کے لوگ برکت کی حقیقت نہیں جانتے۔

برکت کی حقیقت

اُن کے نزدیک برکت یہ ہے کہ (دیکھنے میں) کوئی شے زیادہ ہو جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی مثال بیان فرما کر جس کو سب جانتے ہیں بتلا دیا کہ برکت ایک خاص چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوتی ہے وہ نہیں جو عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں۔

اب تم اس مثال میں غور کرو کہ کھانے سے ہر شخص کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ پیٹ بھر جائے تاکہ بھوک کی تکلیف جاتی رہے مگر پیٹ بھر جانا تمہارے اختیار میں نہیں۔ یہ نعمت اللہ تعالےٰ کے حکم سے پیدا ہوتی ہے اور اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ تم کو

نظر بھی نہیں آتی ۔ چنانچہ بعض دفعہ آدمی بہت کھانے کے بعد بھی بھوکا رہتا ہے ۔ اس کا پیٹ نہیں بھرتا ۔ اسی طرح استسقاء کی بیماری میں بہت پانی پینے سے بھی پیاس بھی بجھتی ۔ اسی طرح برکت بھی خدا کے حکم سے پیدا ہوتی ہے وہ کوئی محسوس چیز نہیں) اب اگر کوئی آدمی بہت کھانے کے بعد بھی بھوکا رہے تو اس کا کھانا خسارہ ہی خسارہ ہے کیونکہ جس فائدہ کے لیے اس نے کھایا تھا کہ پیٹ بھر جائے اور بھوک جاتی رہے وہ حاصل نہ ہوا ۔

اسی طرح مال کی ذات میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ مقصود وہ منافع ہیں جو مال کے ذریعہ سے حاصل کئے جاتے ہیں (یعنی راحت قلب و بدن وغیرہ) تو اگر مال زیادہ ہو اور یہ فوائد مقصودہ حاصل نہ ہوئے تو ایسے مال کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔ تم اس حالت کا مشاہدہ اہل دنیا اور اہل دین میں اس طرح کر و گے کہ اہل دنیا اپنی ضرورتوں کو (تھوڑے مال سے پوری نہیں کر سکتے بلکہ) بہت زیادہ مال سے پوری کرتے ہیں ۔ اسی لیے اُن کو مال بڑھانے کے سوا (اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تو رات دن اسی کے سوا) اور کچھ دھندا نہیں ہوتا اُن کی نظر سے وہ چیز غائب رہتی ہے جو اس کے علاوہ ہے (یعنی اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ ضرورتیں تھوڑے مال سے بھی پوری ہو سکتی ہیں جبکہ اُس میں برکت شامل ہو جائے) اور دین داروں کو دیکھو گے کہ وہ ان ہی ضرورتوں کو جنہیں اہل دنیا بہت زیادہ مال سے پوری کرتے ہیں بہت تھوڑے مال سے پوری کر لیتے ہیں اور بعض دفعہ ان سے بھی اچھی طرح پوری کرتے ہیں اور یہ (فرضی قصہ نہیں بلکہ) بکثرت مشاہدہ میں آرہا ہے بشرطیکہ کوئی غور اور تامل سے کام لے ۔ قولہ وفیہ دلیل علی جواز ضرب المثل الیٰ قولہ ھذا ھوجید کثیرلمن تامله وتفطع ۔

ف ۔ ہم نے اہل اللہ میں اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے اور اہل دنیا کو یہ کہتے سُنا ہے کہ ہماری آمدنی تو تنخواہ کی بھی ہے اور زمین کی بھی اور فلاں کی تنخواہ ہی تنخواہ ہے زمینداری کچھ نہیں اور تنخواہ بھی ہم سے بہت کم ہے ۔ پھر بھی

اُس کے گھر کا انتظام ہم سے اچھا اُس کے بچوں اور گھر والوں کا لباس ہمارے بچوں سے اچھا یا ہمارے برابر ہے۔ پھر ہم اتنی دولت کے ساتھ بھی وہ کام نہ کرسکے جو اُس نے تھوڑی سی آمدنی میں کرلیے ہیں۔

یہ برکت نہیں تو اور کیا ہے؟ برکت کوئی ایسی چیز نہیں جو حسی طور پر آنکھوں سے نظر آجائے بلکہ وہ خُدا کی دی ہوئی مخفی نعمت ہے جیسے کھانا کھانے اور پانی پینے کے بعد سیری اور سیرابی مخفی چیز ہے۔ جس کو وہی جانتا ہے جس کا پیٹ بھرا ہُوا اور پیاس بجھی ہے، دُوسرے محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح بے برکتی بھی غیر محسوس شے ہے جس کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہوتا بلکہ اہلِ دین و اہلِ دُنیا کی حالت کا موازنہ کرنے سے ہوتا ہے۔

ف۔ شارح فرماتے ہیں کہ یہاں جو مثال کے ذریعے برکت کا خُدا کی طرف سے ہونا بتلایا گیا ہے یہ صحابہ کے سمجھانے کے لیے نہیں کیونکہ ہم کو یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ صحابہ برکت کی حقیقت سے واقف تھے اُن کو اس کا مشاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات میں اور خود اپنے واقعات میں بار ہا ہو چکا تھا (وہ ایک دفعہ نہیں بلکہ متعدد بار دیکھ چکے تھے کہ ایک دو آدمی کا کھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے پورے لشکر کو کافی ہوگیا اور سب کے سیر ہونے کے بعد بچ بھی رہا۔ بعض دفعہ کھانا کھاتے ہوئے صحابہ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کھانا نیچے سے خود بخود زیادہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ کھانے والوں کے لقموں سے کم نہیں ہُوا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا) پس یہ مثال دوسروں کو سمجھانے کے لیے بیان کی گئی ہے جو صحابہ کے بعد آنے والے تھے۔

اس تشریح اور بیان کے بعد اب ذرا اس پر بھی تو غور کرو کہ آج کل عام طور سے اُن لوگوں کی حالت کیا ہے جو اہلِ علم کہلاتے ہیں دُوسروں کا تو ذکر ہی کیا؟ افسوس طریقے ہی بدل گئے اور بہت سے امور میں حق مشکوک ہوگیا یا اس کا انکار کیا جانے لگا (چنانچہ تم اہلِ علم میں سے بعض کو برکت کی حقیقت سے ناواقف یا منکر پاؤ گے) جس کا سبب وہ بُری عادتیں ہیں جو کثرت سے اُن ہی لوگوں میں

پائی جاتی ہیں جنہوں نے لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈال رکھا ہے کہ وہ علماء اور صلحاء ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ سے فرمایا تھا کیف بک یاحذیفۃ اذا ترکت بدعۃ قالوا ترکت سنۃ۔ اے حذیفہ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم کسی بدعت کو چھوڑ دو گے تو لوگ کہیں گے کہ اس نے سنت کو چھوڑ دیا۔ حضرت حذیفہ نے عرض کیا یا رسول اللہ: تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ اگر میں اُس زمانہ تک زندہ رہوں قال اقرضہم من عرضک لیوم فقدک فرمایا اُن کو اپنی آبرو پر حملہ کرنے دو اُس دن کے (ثواب کے) لیے جب تم دُنیا میں نہ ہو گے، مطلب یہ ہے کہ تم حق اور سُنّت پر عمل کرتے رہو اور اُن کو جو وہ چاہیں بکنے دو۔ کیونکہ تم کو تو اس صورت میں ثواب ہی ثواب ہے جب وہ ناحق تمہاری آبرو پر حملہ کریں۔ (ھذا ترجمۃ ما ذکرہ الشارح فی شرحہ ادخلتہ فی الفوائد لعدم تعلقہ بالمسائل بل بالمواعظ فافہم)۔

تنبیہ: یہ تو شارح نے اپنے زمانے کا حال لکھا ہے اب ذرا ہمیں اپنے زمانے کا حال بھی دیکھنا چاہیئے۔ کیا یہ وہی زمانہ نہیں جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی؟ کیا آج اگر کوئی رواجی مولود نہ پڑھے بلکہ سنت کے موافق ذکر رسول کرے اُس کو بُرا بھلا نہیں کہا جاتا؟ کیا اگر کوئی میلاد میں قیام نہ کرے اُس کو وہابی کہہ کر بدنام نہیں کیا جاتا؟ اور اگر کوئی عالم صوفی قوم کے ہدایہ اور نذرانوں پر رہ کر مسلمانوں پر اپنا بار نہ ڈالنا چاہے بلکہ ملازمت یا صنعت و حرفت و تجارت سے کسبِ حلال کرنا چاہے اُس کو حبِ دُنیا سے بدنام نہیں کیا جاتا؟ حالانکہ جوازِ ترکِ اسباب کے لیے شرط ہے کہ انسان مجرد ہو، صاحبِ عیال نہ ہو اور ملازمتوں میں بہتر وہ ہے جس میں تعلیمِ دین پر اُجرت نہ ہو۔

(۱۸۳) بلند ہاتھ پست ہاتھ سے اچھا ہے اور اُسکی تحقیق حدیث سے معلوم ہُوا کہ

بلند ہاتھ پست ہاتھ سے بہتر ہے۔ اُس کی شرح میں علماء اور صوفیہ کے درمیان اختلاف ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ بلند ہاتھ دینے والا ہے اور پست ہاتھ لینے والا۔ صوفیہ برعکس کہتے ہیں کہ بلند ہاتھ لینے والا ہے اور پست ہاتھ دینے والا۔ کیونکہ لینے والا اتم کو تھوڑی سی چیز کے عوض بہت سا ثواب دیتا ہے (یعنی ثواب کا ذریعہ بنتا ہے) کہ ایک کے بدلے دس اور (بعض دفعہ) سات سو تک (ثواب دلواتا ہے) اور دینے والا ثواب (ہی) کے لیے دیتا ہے تو وہ اس (ثواب) کا منتظر اور محتاج ہے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ دونوں قولوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ دینے والے کی دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ تم سے اپنے عطیہ کے قبول کرنے کی درخواست کرتا ہو۔ دُوسرے یہ کہ (وہ تم سے درخواست نہیں کرتا بلکہ) تم اُس سے سوال کر رہے ہو۔ اس صُورت میں تو دینے والے کا ہاتھ بلند ہے اور (لینے والے کا پست ہے کیونکہ) تم کو سوال کی ذلّت پہنچ چکی۔ اور (آثار میں) آیا ہے کہ ذلّت ہر سوال میں ہے چاہے راستہ ہی کا سوال ہو اور جو اس کا انکار کرے وہ بداہت کا انکار کرتا ہے اور اگر وہ تم سے اپنی عطا کے قبول کرنے کی درخواست کر رہا ہے تو اُس نے تمہارے سامنے اپنی عزت و جاہ کو گرا دیا کہ وہ تم سے ایسی درخواست کر رہا ہے جس میں تم مختار ہو اور وہ محتاج ہے یا تو اس لیے کہ وہ اپنے ذمہ سے واجب شرعی ادا کرنا چاہتا ہے یا اس لیے کہ وہ اس ہدیہ کے ذریعے دُنیا یا آخرت کی بھلائی کا اُمیدوار ہے۔

اس صُورت میں وہ اپنے ہدیہ سے تم پر احسان کا قصد نہیں کرتا بلکہ اپنی بھلائی کا قصد کر رہا ہے تو تمہارا اُس کو قبول کر لینا احسان ہے اور دینے والا سائل و محتاج ہے اُس کا ہاتھ پست ہے، لینے والے کا ہاتھ بلند ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی ہماری دعوت کرتا ہے تو (پہلے) اُس کا احسان ہے پھر اگر ہم دعوت قبول کر لیں تو اب ہمارا (اُس پر) احسان ہے اور جس حدیث کی ہم شرح کر رہے ہیں اُس کا واقعہ بھی اسی کی تاکید کرتا ہے (کہ دینے والے کا ہاتھ بلند ہے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد

(الید العلیا خیر من الید السفلی) سائل ہی کے متعلق فرمایا ہے جبکہ اُس نے بار بار سوال کیا (تو معلوم ہُوا کہ) پست ہاتھ سائل ہی کا ہے۔ قولہ الید العلیا خیر من السفلی مناخلاف بین العلماء واھل المعونۃ الی قولہ ما کر د سوالہ مرادا"

ف ۔ بعض احادیث میں تصریح ہے والید العلیا المنفقۃ والسفلی السائلۃ رواہ مسلم او نچا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچا ہاتھ مانگنے والا ہے۔ اس لیے دینے والے کے ہاتھ کو نیچا کہنا بظاہر صحیح نہیں البتہ بعض روایات میں بجائے المنفقۃ کے المتعففۃ بھی وارد ہے (رواہ ابو داؤد) جس کا مطلب یہ ہے کہ اُونچا ہاتھ سوال سے بچنے والا ہے اور نیچا ہاتھ سوال کرنے والا ہے۔ اس روایت پر لینے والے کے ہاتھ کو بھی اُونچا کہہ سکتے ہیں جبکہ وہ سوال نہ کرے بلکہ دینے والا خود اُس سے قبول ہدیہ کی درخواست کرے اور ہر حال میں نیچا ہاتھ سوال کرنے والے کا ہے۔ پس شارح کی توجیہ پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ بھی بعض الفاظ حدیث سے مؤید ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ان سائلین کو حقیر نہ سمجھو۔ یہ تمہارے محسن ہیں کہ تمہارے اموال کا بوجھ اُٹھا کر آخرت میں پہنچاتے ہیں تو یہ تمہارے مزدور ہیں مگر دُنیا کے نہیں بلکہ حمال آخرت ہیں (قالہ سیدی حکیم الامۃ مدّہ) حاجی صاحب کا یہ مطلب نہیں کہ سائلین کا ہاتھ اُونچا ہے جیسا بعض صوفیہ نے کہا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن کو اپنا محسن سمجھ کر صدقہ دو گے تو ثواب کامل ہوگا حقیر سمجھ کر دو گے تو صدقہ کا ثواب کم ہو جائے گا۔ اگر سائل کے ہاتھ کو اُونچا کہا جائے گا تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا اُن کا ہاتھ اُونچا تھا اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہو سکتا۔ پس بعض صُوفیہ کا سائل کے ہاتھ کو اُونچا کہنا کہ اس لیے کہ وہ دینے والے کے لیے ثواب کا ذریعہ بنتا ہے مگر صحیح نہیں سائل کا ہاتھ اُونچا نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی

وقت دینے والے کا ہاتھ نیچا ہو جائے جبکہ وہ کسی کو ہدیہ دینا چاہے اور وہ قبول نہ کرے پھر اس کے اصرار سے یا درخواست دالتجا سے قبول کرے ۔ واللہ اعلم ۔

حضرت شارح فرماتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہاتھ دونوں ہی اچھے ہیں، دینے والا بھی اور لینے والا بھی البتہ دینے والا زیادہ اچھا ہے کیونکہ حضورؐ نے بلند ہاتھ کو خیر فرمایا ہے جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے (جس کے معنی ہیں بہت اچھا) اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نفس حسن میں دونوں شریک ہیں اور ایک میں خوبی زیادہ ہے جیسے ہم کہیں زید خیر من عمرو زید عمرو سے بہتر ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ عمرو میں کچھ بھی خوبی نہیں بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ زید کا درجہ اُس سے بڑھا ہوا ہے ۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ دونوں ہاتھ اچھے ہیں کیونکہ ان سے نیکی کی گئی ہے (ایک نے احسان کیا دوسرے نے احسان قبول کر کے اُس کو ثواب کا مستحق کیا) پھر ایک کو دوسرے پر فضیلت دوسری وجہ سے ہو گئی یا تو نفس فعل پر نظر کر کے یا مال پر یا نیت و قصد پر نظر کر کے یا ان سب کے مجموعہ سے ۔ ان علتوں ہی کی وجہ سے (علماء وصوفیہ میں) خلاف واقع ہوا ۔ اھ مگر یہ استدلال اُس وقت صحیح ہو گا جبکہ لفظ خیر کو اسم تفضیل مان لیا جائے ورنہ محاورات میں بکثرت اس کا استعمال معنیٰ تفضیل سے خالی ہو کر بھی آتا ہے ۔

(۱۸۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ مقام کی ہدایت فرماتے ہیں !

حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ مقام کی ہدایت فرماتے ہیں، کیونکہ آپؐ کا ارشاد (الید العلیا خیر من السفلیٰ) کا مطلب یہ ہے کہ تم کو اُن لوگوں میں سے ہونا چاہیئے جن کا ہاتھ اُونچا ہے اُن میں سے نہ ہو جن کا ہاتھ نیچا ہے ۔ مگر یہ (تعلیم) مقامات وغیرہ میں ہے دُنیا اور دُنیا کے سامان میں نہیں (کیونکہ) دُنیا میں تو بقدر ضرورت وکفایت پر بس کرنے کی تعلیم ہے فاتقوا اللہ واجملوا فی الطلب دتو کلوا علیہ دُنیا میں سب سے اُونچا ہونے کی تعلیم نہیں) ۔

قولہ فیہ دلیل علی ارشاد الشارع الی الاعلیٰ الی قولہ فانی الدنیا وحظامہا۔

ف ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کو دُنیا اور دین دونوں کے لیے عام کہا جائے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ حدیث کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ دُنیا میں سب سے زیادہ مالدار ہونا چاہیئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ آدنچا ہونا چاہیئے یعنی سوال سے بچنا اور دوسروں کو دینا چاہیئے اور یہ حالت یقیناً محمود و مطلوب ہے۔ دُنیا کے سامان میں بھی کسی کا محتاج اور دستِ نگر ہونا اچھا نہیں۔

ایک حدیث میں ہے المومن القوی خیر من المومن الضعیف وفی کل خیر۔ مسلمان صاحب قوت کمزور سے بہتر ہے اور یوں دونوں ہی اچھے ہیں۔ اس حدیث میں صوفیہ کی حجت ہے کیونکہ وہ بھی مقاماتِ عالیہ کی ہدایت فرماتے ہیں۔ ہر کام میں عزیمت اور فضیلت حاصل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں حتی الامکان بلا ضرورت ادنیٰ حالت پر قناعت نہیں کرتے نماز کو بھی کامل کرنا چاہتے ہیں اور ذکر کو بھی اور خدمتِ خلق کو بھی وعلیٰ ہذا القیاس۔

(۱۸۵) اہلِ فضل و دینداروں سے سوال کرنا جائز ہے حدیث سے معلوم ہوا

کہ اہل فضل اور اہل معاملہ اور دینداروں سے سوال کرنا جائز ہے۔ اس میں کچھ ذلت نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کے سوال سے کچھ تعرض نہیں فرمایا بس اُن کو ایک قاعدہ کلیہ بتادیا (کہ استغنا کے ساتھ مال لینے کا یہ ثمرہ ہے اور حرص کے ساتھ لینے کا یہ نتیجہ ہے) اور اگر اُس کے سوال میں کوئی بات (کراہت یا حرمت کی) ہوتی تو آپ اُس کو کبھی نہ چھپاتے بلکہ اُسے کچھ دیتے بھی نہیں جب تک سوال کی کراہیت (وغیرہ) نہ بتلا دیتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکامِ شرعیہ کے بیان کرنے والے ہیں اور ضرورت کے وقت سے بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔ پس آپ کے ارشاد کی خوشی بتلا رہی ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لینا اور (مانگنا) دوسرے سے لینے (اور مانگنے)

کے مثل نہیں الید العلیا خیر من السفلی۔ بلند ہاتھ پست ہاتھ سے بہتر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک تو تمام حالات میں بلند ہی ہے کیونکہ آپؐ کے دستِ مبارک جیسا کس کا ہاتھ ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے جس میں کچھ بھی خفا نہیں۔ (پس حضورؐ سے مانگنے میں اصلاً ذلت نہیں بلکہ عین سعادت اور بہت بڑی عزت ہے۔ اسی لیے آپؐ نے صحابی کو سوال سے منع نہیں فرمایا بلکہ حرصِ مال سے منع فرمایا ہے) اور بطور وراثت کے یہی حکم اُن حضرات کا ہے جو آپ کے بعد منصبِ خلافت پر سرفراز ہوئے۔ اگرچہ وہ آپ کی مثل نہیں۔ اسی طرح خلیفہ کا نائب اور اُس کا نائب، جب تک سلسلۂ خلافت باقی رہے۔ بشرطیکہ وہ اہلِ فضل اور دیندار ہوں۔ قولہ وفیہ دلیل علی جواز سوال اھل الفضل والدین واھل المعاملۃ الی قولہ اذا کانوا من اھل الفضل والدین۔

ف۔ اہلِ معاملہ سے مُراد وہ حضرات ہیں جن کا معاملہ اللہ تعالےٰ سے درست ہے یعنے بزرگانِ دین کہ وہ بھی باطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں۔ گو ظاہر میں صاحبِ سلطنت نہ ہوں اُن سے مانگنے میں بھی ذلت نہیں۔ کیونکہ وہ کسی مسلمان کو ذلیل نہیں سمجھتے اور سوال سے منع کرنے کی علت یہی ہے کہ اُس سے انسان ذلیل ہوتا ہے ولا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ۔ اور مسلمان کو یہ نہ چاہیئے کہ اپنے کو ذلیل کردے۔ تو جہاں سوال میں ذلت نہ ہو وہاں کراہت نہ ہوگی۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے ان المسئلۃ کد یکد بھا الرجل وجھہ الا ان یسأل الرجل سلطاناً او فی امر لابد منہ قال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوال کرنا ذلت ہے جس سے آدمی اپنے چہرے کو ذلیل کرتا ہے۔ مگر یہ کہ بادشاہ سے سوال کرے (تو ذلت نہیں) یا ایسی حالت میں سوال کرے کہ بدوں سوال کے چارہ نہ ہو (تو معذور ہے) علماء نے لکھا ہے کہ چونکہ سُلطان کے قبضہ میں بیت المال ہے جس میں سب

کا حق ہے تو اُس سے مانگنا اپنا حق مانگنا ہے اُس کی جیب سے تو کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اور اپنا حق مانگنے میں کچھ ذلت نہیں۔

(۱۸۶) غنا سے تحصیلِ علم میں مدد ملتی ہے حدیث سے معلوم ہوا کہ تحصیلِ علم میں غنا سے بہت مدد ملتی ہے۔ حکمت کا مقتضی یہ ہے کہ چنانچہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کو در مسئلہ مال کی) اُس وقت تعلیم دی جبکہ تین مرتبہ مال دے کر اُن کو غنی کر دیا۔ قولہ دفیہ دلیل علی۔ ان من اقوی الاسباب فی حمل العلمہ بمقتضی الحکمۃ المجدۃ الی قولہ صحف۔ اغناۂ بتکرار العطاء ثلثا۔

ف۔ یہ استدلال قوی نہیں۔ ہاں حدیث سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ سوال کرنے والے کو مال کے متعلق حکم شرعی سوال پورا کرنے کے بعد بتلانا چاہیئے۔ کیونکہ سوال پورا کرنے سے پہلے اُس کا دل پریشان ہوتا ہے۔ اس حالت میں وہ حکم شرعی کو پوری طرح نہیں سمجھے گا اور ممکن ہے وہ یہ خیال کرے کہ مجھے ٹالنے کے واسطے یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے تو عالم کو متہم سمجھے گا اور اس صورت میں سائل کو شرمندگی اور خیالات بھی زیادہ ہوگی۔ اور اگر پہلے اُس کی حاجت پوری کر دی جائے تو اُس کا دل اس قسم کے خیالات سے خالی ہو جائے گا۔ پھر اس کو تحصیلِ علم سے فائدہ ہوگا۔ اور جس مسئلہ کو حضرت شارح نے اس حدیث سے استنباط کیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے کیونکہ تحصیلِ علم کے لیے جمعیت قلب اور اطمینان کی ضرورت ہے اور غنا سے ہی یہ بات حاصل ہوتی ہے۔ فقر کی حالت میں انسان کو اپنے کھانے کپڑے کی فکر سے فرصت نہیں ہوتی وہ اطمینان سے کیونکر علم حاصل کرے گا۔ پس طالب علم یا تو غنی ہونا چاہیئے اور اگر فقیر ہو تو اسے کھانے کپڑے کی فکر سے مطمئن کر دینا چاہیئے۔

چنانچہ ہمارے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس جب امام ابو یوسف پڑھنے کے لیے آئے تو امام ابو یوسف کے باپ لے اُن کو درس سے اُٹھانا

چاہا اور کہا میں اپنے بچے کو شغلِ معاش میں لگانا چاہتا ہوں کیونکہ میں فقیر آدمی ہوں۔ میری آمدنی پورے گھر کے خرچ کو کافی نہیں ہوتی۔ یہ لڑکا بھی کچھ کمانے لگے تو گھر کا خرچ پورا ہوگا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اس حالت میں کہ ابھی یہ بچے ہیں اور کچھ علم بھی حاصل نہیں کیا، تم کو ان سے کتنی آمدنی کی امید ہے؟ اس نے کچھ مقدار بتلائی۔ امام صاحب نے فرمایا تم اس کو ہمارے پاس پڑھنے دو اور جتنی رقم تم نے بتلائی ہے اس سے بھی زیادہ ہم تم کو ہر مہینہ دے دیا کریں گے۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئے اور امام ابو یوسف اطمینان کے ساتھ تحصیلِ علم میں لگے رہے۔ پھر دُنیا جانتی ہے کہ وہ کس درجہ کے امام ہوئے۔ امام ابو حنیفہ نے اسی طرح بہت سے طلبہ کو اپنے پاس سے دے کر پڑھایا ہے۔ جو اُن کے بعد بڑے درجہ کے مفتی اور قاضی اور عالم ہوئے۔

اسی حکمت کی وجہ سے ہمارے اکابر نے مدارسِ دینیہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ غریب طلبہ کو مدرسہ سے کھانا کپڑا کتابیں مفت دی جائیں تاکہ وہ اطمینان سے علم کی تحصیل میں لگے رہیں اور اسی وجہ سے اہل طریق نے اپنی خانقاہوں میں غریب سالکین کے لیے امداد کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اغنیاء کو تحصیلِ علم شرعی اور طلب طریقِ باطن کا شوق نہیں رہا۔ اب اہلِ دُنیا کی عقلمندی دیکھو کہ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان طلباء اور سالکین کو کسبِ معاش میں مشغول ہونا چاہیئے۔ یہ لوگ قوم کے اُوپر بار ہیں۔ تو اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کسبِ معاش کی فکر میں مشغول ہو کر تحصیلِ علم اور طلبِ طریق پوری طرح نہیں ہو سکتی اور جو لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ یہ طلباء اور سالکین قوم پر بار ہیں وہ اپنا ہاتھ روک لیں اور دیکھیں کہ خدا اُن کو رزق پہنچاتا ہے یا نہیں؟ یاد رکھو ان مدارس کا مدار اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر ہے وہ خود ایسی جگہ سے اُن کو رزق پہنچاتا ہے جہاں گمان بھی نہیں ہوتا اور سمجھ لو کہ اگر یہ مدارس اور خانقاہیں ویران ہو گئیں تو ہندوستان سے اسلام اور

دین کا نام مٹ جائے گا، ہندوستان میں دین کا جو کچھ نام و نشان باقی ہے، اُن ہی کی برکت سے باقی ہے۔ ہاں یہ مزید تحقیق کرنا چاہیئے کہ حقیقی مدارس اور خانقاہیں کون سی ہیں؟ اور نام و نمود کی کون سی ہیں؟ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا حماقت ہے۔

(۱۸۷) سوال تین بار تک جائز ہے حدیث سے معلوم ہوا کہ تین بار تک سوال کرنا جائز ہے چوتھی بار ممنوع ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دفعہ دُوسری دفعہ سوال کرنے پر دیتے رہے اور خاموش رہے اور تیسری بار سوال کرنے پر بھی دیا اور علمی مسئلہ بتلاکر اُس کے بعد سوال کرنے سے روک دیا کیونکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں قوتِ ایمان کی وجہ سے اس قدر فہم اور ذکاوت تھی کہ اُن کو ادنیٰ اشارہ بھی روکنے کے واسطے کافی تھا (اس لیے گو حضورؐ نے آئندہ سوال کرنے سے صراحتہً منع نہیں فرمایا بلکہ سخاوتِ نفس کی تعلیم دی اور حرصِ مال سے روکا مگر اشارۃً آئندہ سوال کرنے ہی سے روک دیا گیا جس کو صحابی سمجھ گئے اور اُنہوں نے عرض کیا کہ اب میں آپ کے بعد کسی سے بھی سوال نہ کروں گا چنانچہ وہ مالِ غنیمت میں سے اپنا حق بھی کسی خلیفہ سے نہ لیتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اعلان کرنا پڑا کہ لوگو! گواہ رہو میں حکیم بن حزام کو اُس کا حق دینا چاہتا ہوں مگر وہ نہیں لیتے)۔

اور اس میں اُن صوفیہ کی بھی حجت ہے جو زنبیل کے قائل ہیں کہ اگر کسی درویش متوکل کو دو تین دن تک فتوحات نہ ہوں اور ہلاکت کا اندیشہ ہونے لگے تو وہ زنبیل ہاتھ میں لے کر نکل سکتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں زنبیل لے کر نکلنے کی شرط یہ ہے کہ کسی خاص شخص کا قصد کر کے نہ نکلے اور نہ کسی سے زور دے کر مانگے اور نہ قسم کھائے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ سے سوال کرے۔ پھر اگر تقدیر اُسے کسی کے گھر پر یا کسی آدمی کے پاس پہنچادے تو اُس سے آگے نہ بڑھے اور یہ بھی شرط ہے کہ بدون سخت ضرورت کے نہ نکلے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

لاباس ان یشکوا المؤمن حاجتہ لاخیہ المؤمن. اس میں کچھ حرج نہیں کہ مسلمان اپنی حاجت کو اپنے بھائی مسلمان کے سامنے ظاہر کر دے (تو سخت مجبوری میں سوال کرنا جائز ہے) پھر جس شخص کے پاس تقدیر نے اُس کو پہنچاد یا اگر اُس نے دید یا تو بہتر اور نہ دیا تو یہ بھی اچھا ہے اب وہ دُوسرے کے پاس جائے اور تیسرے کے پاس جائے اگر تینوں نے کچھ نہ دیا تو آگے نہ بڑھے اور سمجھ جائے کہ اللہ تعالے کا مقصود یہ ہے کہ صبر و تسلیم سے کام لے۔ اب اپنی جگہ واپس آجائے کسی اور سے سوال نہ کرے۔ یہاں تک کہ حق تعالے اُس کے پاس فتوحات پہنچادیں یا جو اُن کی مرضی ہو کریں۔

اب ذرا تم دیکھو تو کہ آج کل اہل علم اور اہل حال دو نوں میں سے کوئی بھی اُس راستہ پر ہے جس کو اُس کے بزرگوں نے کتاب و سنت سے استنباط کیا ہے جیسا ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں اور اس حدیث (سے شرح) میں بھی کچھ حصّہ مذکور ہے، نہیں خدا قسم! (آج کل کوئی جماعت بھی اپنے بزرگوں کے راستہ پر نہیں) راستے بدل گئے اور (سیدھے راستہ پر) چلنے والے کم رہ گئے فانا للہ وانا الیہ راجعون، قولہ وفیہ دلیل علی جواز تکرار السؤال ثلاثا و لوا بعۃ ممنوعۃ الی قولہ فانا للہ الخ۔

ف۔ حضرت شارح مجھے معاف فرمائیں۔ اس حدیث میں اہل زنبیل کے لیے کوئی حجت نہیں۔ اس میں اشارۃً یہ مسئلہ مذکور ہے کہ جس سے سوال کیا جائے تین دفعہ سے زیادہ نہ کیا جائے۔ مگر یہ اس میں کہاں ہے کہ زنبیل لے کر نکلنا جائز ہے اور جو زنبیل لے کر نکلے وہ تین آدمیوں سے آگے نہ بڑھے۔ اس کے لیے مستقل دلیل کی حاجت ہے اور میرا خیال ہے کہ اسلام میں زنبیل کی کوئی اصل نہیں۔ یہ صرف راہبوں اور جوگیوں کا طریقہ ہے۔ اسلام کا اصول پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ ہر مسلمان پر صدقہ ہے اگر کوئی صدقہ نہ کر سکے تو اپنے ہاتھوں سے کام کرے جس سے اپنے کو بھی نفع پہنچائے اور دُوسروں پر بھی صدقہ کرے اسی

لیے ہمارے اکابر نے سالکین کو سوال سے مطلقاً منع فرمایا ہے۔ اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہوتا اُس کو مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے بعض خدام اسٹیشن پر مزدوری کرنے جاتے اور مزدوری کر کے اپنا کام چلاتے تھے، سوال ہرگز نہ کرتے تھے۔ اسی طرح جو شخص تارکِ اسباب ہو اگر کسی وقت اُس کو فتوحات حاصل نہ ہوں تو فتوحات بند ہونے سے اُس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کو اُس کا ترکِ اسباب پسند نہیں اُسے کسبِ معاش کا کوئی حیلہ کرنا چاہیئے۔ زنبیل لے کر سوال کے لیے ہرگز نہ نکلے اور مولانا روم نے شیخ شیرازیؒ کا جو واقعہ لکھا ہے وہ اُن کا خاص حال تھا جس میں وہ معذور تھے۔ اہلِ حال کے حال کو تسلیم کیا جائے گا مگر اُن کی اقتداء نہیں کی جائے گی جب تک کسی پر ویسا ہی حال غالب نہ ہو۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔



باب ۵۶

حدیث

كراهية السوال

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی برابر لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت میں آئے گا اس حالت میں کہ اُس کے چہرہ میں گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔"

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ زیادہ سوال کرنے والے کے چہرے پر قیامت کے دن گوشت نہ ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مراد ہر سوال نہیں کیونکہ علمی سوال تو مامور بہ ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ اگر تم کو (کوئی حکم) معلوم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے سوال کرو (یعنی اُن سے حکم شرعی دریافت کرو) اسی طرح راستہ کا سوال بھی اس میں داخل نہیں۔ کیونکہ گم کردہ راہ کو راستہ بتلانا مامور بہ ہے (تو اُس کا دریافت کرنا بھی جائز ہے) اب صرف دُنیا کے سامان کا سوال باقی رہ گیا وُہی یہاں مُراد ہے (یعنی بھیک مانگنا کسی سے روپیہ پیسہ کا سوال کرنا) اور یہ بھی ہر حالت میں ممنوع نہیں کیونکہ ضرورت کے وقت سوال جائز ہے (بلکہ بعض کے نزدیک لازم ہے جبکہ بدون سوال کے جان بچانے کی کوئی صورت نہ ہو) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا بأس للمؤمن ان یشکو حاجتہ لاخیہ المؤمن۔ مسلمان کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنی حاجت کو اپنے مُسلمان بھائی سے ظاہر کرے۔ جس شخص کو سخت بھُوک (سے ہلاکت کا اندیشہ) ہو، اُس کے متعلق علماء میں اختلاف ہے کہ اُس

کے لیے صبر کرنا افضل ہے (کہ کسی سے سوال نہ کرے) یا مارے بھوک کے مر جائے، تو شہید ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں واصبر لحکم ربك فانك باعیننا۔ اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کئے رہو، کیونکہ تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو (جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی تقدیر کا منتظر رہنا چاہیئے کسی سے سوال نہ کرنا چاہیئے) یا اس کو سوال کر کے جان بچانا افضل ہے ورنہ گناہ گار ہوگا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلمان کے لیے اس میں کچھ حرج نہیں کہ اپنی حالت کو اپنے مسلمان بھائی سے ظاہر کر دے۔ اگر ایسا نہ کیا یہاں تک کہ مر گیا تو اس نے خودکشی کا سامان کیا تو ایک جماعت کے قول پر گنہ گار ہوگا (اور یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ اس کے پاس فاقہ دور کرنے کی کوئی چیز نہ ہو اور اگر وہ صورت ہو جس کو آج کل بھوک ہڑتال کہا جاتا ہے کہ کھانے پینے کا سامان موجود ہے اور بطور سیاسی حربہ کے بھوک ہڑتال کر رہا ہے۔ اس میں اگر مرے گا تو سب علماء کے نزدیک خودکشی کا گناہ ہوگا خوب سمجھ لو)۔

پس حدیث میں دنیا کا سوال مراد ہے جبکہ بدون حاجت اور سخت ضرورت کا ہو اسی پر وعید ہے (جبکہ مرنے سے پہلے توبہ نہ کی ہو) اور اگر توبہ کر لے تو امید ہے کہ اس عموم میں داخل نہ ہوگا (اور وعید سے بچ جائے گا) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ التوبۃ تجب ماقبلھا۔ توبہ ان تمام گناہوں کو ساقط کر دیتی ہے جو توبہ سے پہلے کئے تھے۔ ہاں یہ سوال باقی رہا کہ توبہ کے وقت جو مال اس کے پاس سوال حرام سے جمع کیا ہوا باقی ہے اس کو کیا کرے؟ سو ظاہر ہے کہ مال حرام کو اپنے قبضہ میں رکھنا جائز نہیں۔ اب اگر ان لوگوں کو پہچانتا ہے جن سے سوال کیا تھا تو ان ہی کو (یا ان کے ورثہ کو) واپس کر دے اور اگر انہیں نہیں پہچانتا تو اس مال کو صدقہ کر دے (اور صدقہ کا ثواب ان کو پہنچا دے، تو یہ حقیقت میں ان کی طرف سے صدقہ ہوگا اپنی طرف سے نہیں۔ پس اس حدیث کے خلاف نہ ہوگا جس میں وارد ہے لاتقبل صدقۃ من غلول کہ حرام مال سے صدقہ

قبول نہیں کیونکہ وہ اُس صورت میں ہے جبکہ حرام مال کو اپنی طرف سے صدقہ کرے اور راز اِس میں یہ ہے کہ جب مال کا مالک معلوم نہ ہو نہ اُس کے ورثاء معلوم ہوں، تو یہ لاوارث کا مال ہے اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اُس کے وارث فقراء ہیں تو فقراء کو پہنچا دینا اصل مالک کے وارثوں کو پہنچا دینا ہے کیونکہ فقراء کے ذریعہ اُس کو ثواب مل جائے گا خوب سمجھ لو) اور یہ حکم جیسا مردوں کے لیے ہے ویسا ہی عورتوں کے لیے ہے اگرچہ حدیث میں لایزال الرجل وارد ہے، جس سے بظاہر مردوں کے ساتھ حکم کا خاص ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ مگر عموماً احکامِ شرعیہ میں مرد کا ذکر بوجہ فضیلت کے ہوتا ہے اور عورتیں تبعاً مراد ہوتی ہیں۔ نیز یہ وعید اُس شخص کے لیے ہے جو سوال کی عادت کرے جیسا لایزال الرجل کے لفظ سے واضح ہے تو اگر کسی نے ایک دو بار سوال کیا ہو عادت نہ کی ہو تو وہ اِس وعید میں داخل نہیں (گو بلا ضرورت سوال کرنے کا گناہ اُس کو بھی ہوگا۔ مگر قیامت میں بدنام نہ کیا جائے۔ پس توبہ اس کو بھی لازم ہے۔ ھذا حاصل ماذکرہ الشارح فی شرحہ)۔

(۱۸۸) علمِ دین کی سب کو ضرورت ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ علمِ دین کی سب کو ضرورت ہے۔ کیونکہ سب سے کم درجے کے لوگ بھیک مانگنے والے جن کے پاس دُنیا کا کچھ ساز و سامان نہیں ہوتا اُن سے بھی سوال پر حساب کیا جائے گا کہ اُن کا سوال حکمِ شرعی کے موافق تھا یا خلاف تھا تو دُوسروں کا کیا حال ہوگا؟ (یہاں سے اُن لوگوں کو سبق لینا چاہیئے جو بدون علمِ شرعی کے شیخ یا مولانا بنے ہوئے ہیں) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہل سے کوئی معذور نہ ہوگا (یعنی یہ عذر نہیں سُنا جائے گا کہ ہم کو خبر نہ تھی ہم جاہل تھے) کیونکہ جب یہ مانگنے والے بھی باوجود اپنی مسکنت کے معذور نہ ہوئے، اُن سے بھی سوال کے متعلق باز پُرس ہوگی تو اور لوگ کیسے معذور ہو سکتے ہیں۔

علم تمام فضائل میں افضل ہے

اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ علم تمام فضیلت کی چیزوں سے افضل ہے جبکہ اُس پر عمل بھی کیا جائے کہ اسی سے معزز اور ذلیل میں امتیاز ہوتا ہے۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ (ضرورت کے وقت) غیر مسلم سے مانگنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مایزال الرجل لیسأل الناس۔ بعض آدمی لوگوں سے برابر مانگتا رہتا ہے اور یہ لفظ مُسلم اور غیر مسلم دونوں کو عام ہے۔ اسی لیے ایک بزرگ اپنے گھر سے بدون ضرورت (اور سخت حاجت) کے نہیں نکلتے تھے اور جب نکلتے تو غیر مسلم کے سوا کسی مُسلمان کے گھر پر نہ جاتے تھے۔ اُن سے کسی نے اُس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں بدون ضرورت و احتیاج کے گھر سے نہیں نکلتا۔ اب اگر مُسلمان کے دروازہ پر جاؤں تو اندیشہ ہے کہ وہ میرا سوال رد کر دے، تو اُس پر کوئی بلا نازل ہو جائے کیونکہ اُس پر شرعاً میری جان کا بچانا واجب ہے (اس واجب میں کوتاہی کرے گا تو بلا نازل ہونے کا اندیشہ ہے) تو میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی مُسلمان کو تکلیف پہنچے اور ذمی (غیر مسلم) میری جان بچانے کا مکلف نہیں۔ اگر وہ مجھ سے ہمدردی کرے گا امید ہے اُس کو بھلائی پہنچ جائے اور اگر میرا سوال رد کر دیگا تو اُسے میری وجہ سے کسی گزند پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو گا (سبحان اللہ! ان بزرگ کی نیت کا کیا کہنا اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہیں جو کسی کا بُرا نہیں چاہتے) مگر حدیث سے اس بات کا استنباط واضح نہیں کیونکہ حدیث میں سائل کی مذمت کی گئی ہے مدح نہیں کی گئی۔ تو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ مذمت میں اس بات کو بھی دخل ہو کہ وہ سب ہی سے سوال کرتا رہا۔ نہ مسلم کو دیکھا نہ غیر مسلم کو۔

فقہاء حنفیہ نے کافر کی مزدوری اور ملازمت کرنے میں بھی یہ قید لگائی ہے کہ جائز کام میں ملازمت یا مزدوری ہو اور اُس سے مُسلمان کی ذلت نہ ہوتی ہو جب مزدوری اور ملازمت میں یہ شرط ہے تو غیر مسلم سے مانگنا کیونکر جائز ہو گا کہ سوال تو خود ہی ذلت ہے، البتہ اگر کوئی غیر مُسلم شریف اور سخی اور نیک دل ہو

ضرورت میں سوال کرنے والوں کو ذلیل نہ سمجھتا ہو بلکہ عزت کرتا ہو تو اُس سے سخت احتیاج کی حالت میں سوال کا مضائقہ نہیں اور ذی علم مسلم اکثر ایسے ہی ہوتے تھے کہ اللہ والوں کی عزت کرتے تھے باقی آج کل تو مسلمان کبھی سوال کرنے والوں کی عزت نہیں کرتے، خواہ کیسے ہی حاجت مند اور کیسے ہی اللہ والے ہوں۔ غیر مسلم تو کیا کریں گے۔ پس ایک زمانے کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا)۔

سائل کو بلاوجہ جھوٹا نہ سمجھنا چاہیئے حدیث سے معلوم ہوا کہ سوال کرنے والوں کو سچا ہی سمجھنا چاہیئے۔

(بلاوجہ اُن کو جھوٹا نہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس حدیث میں سوال کرنے والے کی تو مذمت کی ہے مگر) دوسروں کو سچے اور جھوٹے (سائلوں) میں فرق کرنے کو نہیں فرمایا (پس اُن کو جائز ہے کہ ہر سوال کرنے والے کا سوال پورا کردیں۔ مگر یہ کہ کسی کے متعلق تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہو کہ اُس نے سوال کو پیشہ بنالیا ہے تو اُس کو دینا جائز نہیں ہے کما فی حاشیۃ الترمذی عن الدر وغیرہ۔

چنانچہ ایک باہرکت بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک دن چلے جارہے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ بالکل ننگا ہے لوگوں سے اللہ کے واسطے کپڑا مانگ رہا ہے آپ نے اپنا ایک کپڑا اُتار کر اُس کو دے دیا۔ بعض لوگوں کو اس شخص کی عادت معلوم تھی کہ وہ حیلہ اور مکر کرتا ہے (کپڑا پاس ہوتا ہے پھر بھی ننگا ہو کر یہ کپڑا مانگتا ہے) اور اُس کو بیچ کر ناجائز کاموں میں صرف کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بزرگ واپس ہوئے تو کسی نے خبر دی کہ میں نے اس سائل کو فلاں جگہ دیکھا تو اُس کے بدن پر آپ کا دیا ہوا کپڑا نہ تھا (وہ پھر ننگا پھر رہا ہے) اور ممکن ہے اُس نے آپ کے کپڑے کو بیچ کر ناجائز کاموں میں اُس کی قیمت کو استعمال کیا ہو۔ بزرگ کو یہ سن کر غصہ آیا اور پھر فرمایا ذرا مجھے اُس تک پہنچادو کہ خود اس حالت کا

مشاہدہ کروں جب اُس کے پاس پہنچے تو جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا (کہ واقعی وہ تو پھر ننگا پھر رہا ہے) پُوچھا ارے تُو نے وہ کپڑا کیا کیا جو میں نے دیا تھا وہ تو بہت قیمتی تھا اُس کو بیچ کر تو ایک کی جگہ چار پانچ کپڑے بنا سکتا تھا مگر تو پھر بھی ننگا ہے) اُس نے جواب دیا کہ اپنا کپڑا اُس سے مانگو جس کو تم نے دیا ہے اور مجھے اس کے ساتھ رہنے دو جس کی میں نافرمانی کر رہا ہوں۔ فرمایا بے شک تُو نے سچ کہا۔ پھر اُس کو اسی حال میں چھوڑ کر واپس آگئے (مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان بزرگ نے اس سائل کو پھر بھی کچھ دیا۔ ممکن ہے کہ تحقیقِ حال کے بعد پھر نہ دیا ہو اور اُس کے جواب کو اس لیے رد نہیں کیا کہ اُس نے معقول بات کہی تھی کہ جب تم ثواب کی نیت سے صدقہ کر چکے اور مجھے مستحق سمجھ کر دے چکے تو تمہارا ثواب کہیں نہیں گیا پھر اب تم کو مجھ سے باز پُرس کا حق نہیں۔ اگر میں نے اُس کو ناجائز کام میں صرف کیا اس کا میں ذمہ دار ہوں گا آپ ذمہ دار نہیں تو صدقہ ماضیہ کے متعلق یہ بات صحیح ہے جیسے پہلے ایک حدیث میں گزر چکا ہے کہ کسی نے زانیہ، چور اور غنی کو رات کے اندھیرے میں صدقہ دے دیا تھا تو وہ قبول ہوگیا۔ باقی آئندہ کے لیے ایسے شخص کو دینا جائز نہیں جو حیلہ و مکر سے سوال کرتا ہے اور سوال کر کے بدمعاشی کرتا ہے ۱۲۔

جب تم اپنے نیک کام میں سچے اور مخلص ہو تو جس کے ساتھ تمہارا معاملہ ہے اُس کے فضل میں رہو وہ بھی تم کو سچا قرار دے گا اور (مقرب) خاص بنائے گا۔

قوله وفيه دليل على ان جميع الناس محتاجون الى العلم الى قوله صدقا مخلصا۔

ف۔ ظاہر ہے کہ یہاں علم سے مُراد علمِ دین اور علمِ احکام ہے۔ جب مسلمانوں کے دن اچھے تھے اسی پر عزت و ذلت کا مدار کار تھا مگر آج اُس علم کی وہ عزت باقی نہیں رہی جس میں کچھ تو عامۂ مسلمین کی خطا ہے کہ انہوں نے دُنیا کو دین پر مقدم کر دیا ہے اور کچھ علماء کی بھی خطا ہے کہ اُنھوں نے وعظ گوئی کو نذرانے

وصول کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے۔ اگر علماء لوجہ اللہ محض تبلیغ کی نیت سے وعظ کہیں اور معاوضہ یا نذرانہ قبول نہ کریں بلکہ واپس کردیں تو اُن کی عزت بہت بڑھ جائے۔ صدق اور خلوص کی ہر عمل میں ضرورت ہے جبھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوتا ہے اور جو عمل بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو جاتا ہے اُس کا ثمرہ آخرت میں تو یقینی ہے دُنیا میں بھی مل کر رہتا ہے۔

(۱۸۹) عمل کی جزا وسزا اُسکے مناسب ہوگی کہ آخرت میں امورِ معنویہ محسوس ہوں گے

اس میں یہ حکمت ہے کہ اس سائل کے چہرہ میں قیامت کے دن گوشت نہ ہوگا؛ سو بات یہ ہے کہ چہرہ کا حُسن گوشت ہی سے ہے اسی لیے موٹاپے سے چہرہ کا حسن بڑھ جاتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ اُس کے چہرے میں ذرہ برابر حُسن نہ ہوگا۔ کیونکہ اُس نے دُنیا میں اپنے چہرہ کی آب و تاب کھودی تھی یعنی حیا کو اُتار کر رکھ دیا تھا جو بھیک مانگنے سے روکتی ہے جب اُس نے بلا ضرورت حیاء کو اُتار دیا تو آخرت میں اُس کا حُسن ظاہری زائل کر دیا جائے گا کیونکہ آخرت میں وہ چیزیں محسوس و مشاہد ہوں گی جو یہاں معنوی (اور باطنی) ہیں کیونکہ حکمت اس کو مقتضی ہے کہ دُنیا میں جو گناہ کسی نے کیا ہوگا آخرت میں اُس کا ایک نشان ہوگا جس سے سب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص نے یہ گناہ کیا ہے تاکہ عذاب کے ساتھ ذلّت بھی جمع ہو جائے کہ تمام عالم میں اس کی شہرت ہو جائے۔ چنانچہ جھوٹی گواہی دینے والے کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ وہ قیامت میں اس حال سے اُٹھے گا کہ اُس کی زبان سے آگ نکلتی ہوگی۔ اور سُود خوار ہاتھ پیر مارتا ہوگا۔ جیسے مست اُونٹ مستی میں ہاتھ پیر مارتا ہے اور یتیموں کا مال کھانے والا قبر سے اس طرح اُٹھے گا کہ آگ کے شعلے اس کی ناک سے سانس کے ساتھ نکلتے ہوں گے اسی طرح اور بہت گناہ ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ (اُن کے لیے قیامت میں خاص علامتیں ہوں گی)

اور اس خبر کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس بڑی رُسوائی اور ذلت کے عذاب سے بچیں۔ اللہ تعالےٰ ہم کو اپنے فضل و احسان کے صدقہ ان سب سے پناہ دیں۔ کسی نے کہا ہے اپنا انجام اچھا بنا اگر تجھے کچھ عقل ہے اور اُس دن کی رُسوائی سے بچ جو بہت ہی سخت ہیبت ناک ہے۔ جس کا طریقہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت و تقویٰ ہے جو ہمیشہ تجھ پر انعام کرتا اور تیرے عمل کی قدردانی کرتا ہے۔

قولہ ما الحکمۃ فی کونہ یأتی یوم القیامۃ والمضغۃ لحم فی وجہائی

قولہ بتقوی مولی لم یزل علیک منعما شکورا ۔

ف ۔ صوفیہ کا کشف ہے کہ دُنیا میں جو امور معانی و اغراض کی قسم سے ہیں۔ آخرت میں جواہر محسوس ہوں گے۔ اسی مضمون کو کسی نے ان الفاظ سے تعبیر کر دیا ہے کہ انسان کی جنت اور دوزخ دُنیا میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ ہے۔ یعنی اعمالِ صالحہ جنت ہیں کہ یہی اعمال آخرت میں اُس کو عجیب خوب صورت اشکال میں نظر آئیں گے جن سے راحت پہنچے گی اور اعمالِ سیئہ دوزخ ہیں کہ یہی آخرت میں خوف ناک صورتوں میں اُس کے سامنے آئیں گے اور ستائیں گے۔

اس سے بعض عقلمندوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صوفیہ بھی فلاسفہ کی طرح جنت و دوزخ کو خیالی چیز سمجھتے ہیں موجود اور مشاہد نہیں مانتے۔ صوفیہ کے کلام کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ صوفیہ کے نزدیک جنت و نار اس دُنیا سے الگ موجود اور مستقل مخلوق ہیں۔ چنانچہ بعض نے اپنے کشف سے جنت دوزخ کی پیمائش تک بیان کر دی ہے۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کی نعمتیں اور نقمتیں انسان کے اعمال سے ملتی جلتی ہیں جن کو دیکھ کر وہ خود سمجھ لے گا کہ یہ نعمت فلاں عمل کا صلہ ہے اور یہ نقمت فلاں عمل کی سزا ہے جس کا حاصل وہی ہے جو حضرت شارح نے بیان فرمایا ہے کہ جو امور دُنیا میں معنوی تھے وہ آخرت میں محسوس و مشاہد ہو جائیں گے۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ جنت و دوزخ محض خیالی نہیں بلکہ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ جو چیزیں دُنیا میں خیالی سمجھی جاتی ہیں، وہ

آخرت میں خیالی نہ رہیں گی بلکہ محسوس ومشاہد بن جائیں گے۔

بعض لوگوں نے شیخ ابن عربیؒ کے کلام سے یہ سمجھا ہے کہ دوزخ کچھ مدت کے بعد فنا ہو جائے گی اور کفار ومشرکین کا عذاب ختم ہو جائے گا۔ سو جان لینا چاہیئے کہ شیخ کے کلام میں یہ مضمون ملاحدہ نے ملحق کر دیا ہے، شیخ کا یہ مذہب ہرگز نہیں وہ نصوص قطعیہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الیواقیت والجواہر میں تصریح کر دی ہے کہ شیخ کی فصوص کا جو صحیح نسخہ ہمارے پاس ہے اُس میں کوئی بات بھی خلافِ شریعت نہیں ہے۔ ہاں بعض نسخوں میں کچھ باتیں خلافِ شرع ملتی ہیں سو تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ اُن میں ملاحدہ اور یہود نے الحاق کیا ہے۔ خوب سمجھ لو۔

❖

باب

حدیث

اقران الحج والعمرۃ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وادی عقیق میں سُنا فرماتے تھے کہ آج رات میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک قاصد آیا (جس نے یہ پیام پہنچایا کہ) اس مبارک میدان میں نماز پڑھیئے اور کہیئے کہ عمرہ بھی حج کے اندر ہے۔

شرح حضرت شارح کو اس حدیث پر ایک اشکال واقع ہُوا ہے جس کا جواب بھی اپنے مذہب کے موافق دیا ہے۔ اشکال یہ ہے کہ عمرۃ فی حجۃ (عمرہ بھی حج کے اندر ہے) سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عمرہ کو احرامِ حج کے بعد ملایا گیا حالانکہ قواعد شرع سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عمرہ کو احرامِ حج کے بعد نہیں کیا جاتا بلکہ حج کو احرامِ عمرہ کے بعد کیا جاتا ہے مگر حنفیہ کے مذہب پر یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کیونکہ اُن کے نزدیک افعالِ حج شروع کرنے سے پہلے عمرہ کا احرام اور اعمالِ عمرہ شروع کرنے سے پہلے حج کا احرام ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جاسکتا ہے اور اگر افعال شروع کر دیئے گئے تو حج پر عمرہ کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا، عمرہ پر حج کا اضافہ ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اب تک اعمالِ حج یا عمرہ شروع نہیں کئے تھے۔ کیونکہ ابھی تک آپ مکہ معظمہ نہیں پہنچے تھے اور اعمالِ حج و عمرہ مکہ پہنچ کر ہی شروع ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ

وادی العقیق کا ہے یعنی ذوالحلیفہ کا جو مدینہ سے چھ میل ہے اور مدینہ والوں کی میقات ہے۔ اسی جگہ سے وہ احرام باندھتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام نہیں باندھا تھا نہ حج کا نہ عمرہ کا کہ رات کو اللہ تعالٰی کی طرف سے فرشتہ نے یہ پیام پہنچایا کہ اُس وادی مبارک میں نماز پڑھیے اور نماز کے بعد عمرہ و حج دونوں کا احرام ساتھ ساتھ باندھئے جس کو قران کہا جاتا ہے اور یہ حدیث حنفیہ کے اس دعوے کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے، مفرد یا متمتع نہ تھے۔ اس کے بعد شارح نے ملاحدہ کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی حج کیا ہے۔ اور اُس کی کیفیت میں اس قدر اختلاف روایت ہے کوئی کہتا ہے آپ قارن تھے کوئی کہتا ہے مفرد تھے کوئی کہتا ہے متمتع تھے۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے صحابہ کی نقل پر وثوق نہیں رہتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فعل کو پوری طرح ضبط نہیں کر سکے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ جھوٹ کا احتمال خبر میں ہو سکتا ہے استدلال اور نظر میں نہیں ہو سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (عام طور پر بطریق اعلان) یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں نے قران کیا ہے یا تمتع۔ اگر ایسا ہوتا اور پھر بھی صحابہ نقل میں اختلاف کرتے تو اشکال ہو سکتا تھا اور جب ایسا نہیں بلکہ ہر شخص نے آپ کے افعال سے ارادہ و نیت پر استدلال کیا ہے، استدلال میں اختلاف ہو سکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ عام کے ساتھ اپنے قارن ہونے کو اس لیے ظاہر نہیں فرمایا کہ پھر سب ہی قارن بننے کی کوشش کرتے اور سب کے لیے قران مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں احرام طویل ہوتا ہے طویل مُدت تک محظوراتِ احرام سے بچنا ہر ایک کو آسان نہیں۔ پھر قارن پر قربانی بھی واجب ہے جس کی سب کو استطاعت نہیں۔

دُوسرا جواب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو قران کا حکم دیا کسی

کو تمتع کا، کسی کو افراد کا تاکہ سب صورتوں کا جواز معلوم ہو جائے۔ ناقلین نے اس امر کو آپ کا فعل قرار دیا اور محاورات میں ایسا ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے رجمہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ماعزا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کو رجم کیا حالانکہ آپ نے خود رجم نہیں کیا صرف حکم دیا تھا۔ اسی طرح بولا جاتا ہے بنی الامیر المدینۃ امیر نے فلاں شہر بنایا۔ حالانکہ وہ خود نہیں بناتا صرف حکم دیتا ہے۔ غرض حکم کو فعل کہہ دینا محاورات میں شائع ہے۔

تیسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کی نیت کی تھی اور قارن پر یہ واجب نہیں کہ تلبیہ میں ہر دفعہ حج وعمرہ دونوں کا نام لیا کرے بلکہ ایک دفعہ دونوں کو جمع کرکے پھر ایک کے ذکر پر بھی کفایت کر سکتا ہے۔ تو آپ نے کبھی تو لبیک بعمرۃ وحجۃ کہا جس نے اُس کو سُنا اُس نے کہا حضور قارن تھے کبھی فرمایا لبیک بحجۃ جس نے یہ سُنا وہ سمجھا کہ آپ مفرد ہیں۔ اُس نے افراد کی روایت کی۔ کبھی فرمایا لبیک بعمرۃ جس نے یہ سُنا وہ سمجھا کہ آپ متمتع ہیں۔ اور اس سے تو حضراتِ صحابہ کے اہتمام نقل کی دلیل نکلتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کچھ نکلا جس نے بھی اُس کو سُنا محفوظ رکھا اور جیسا سُنا تھا ویسا ہی بیان کر دیا۔ اب یہ مجتہد اور محقق کا فرض ہے کہ تمام روایات کو جمع کرکے راجح اور مرجوح کو معلوم کرے چنانچہ بحمد اللہ محققین نے ثابت کر دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ کیونکہ بیس سے اُوپر صحیح اور صریح حدیثیں اس پر دال ہیں اور دس وجوہ سے ان روایات کو دوسری روایات پر ترجیح ہے جس کو تفصیل کا شوق ہو زاد المعاد ابن القیم ص۱۹۳ ج ا کا مطالعہ کرے۔ یا اعلاء السنن ص۱۱ ج ۱۰ سے مراجعت کرے۔

(لطیفہ) حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے بوادر النوادر میں تحریر فرمایا ہے کہ ایک عالم سے جو کہ فارسی میں احقر کے اُستاد ہیں ایک عیسائی نے اعتراض کیا کہ اہلِ اسلام میں دینی تحقیق کی کمی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اُن کے

اکثر مسائل مختلف فیہ ہیں۔ اگر کافی تحقیق ہوتی تو سب میں متفقہ فیصلہ ہو جاتا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہی دلیل ہے اُن کی غایت تحقیق کی کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی بے تحقیق کئے نہیں چھوڑا اور تحقیق کے لوازم عادیہ سے ہے اہل تحقیق میں اختلاف ہو جانا بخصوص جبکہ محل تحقیق معانی ہوں جبکہ ماریات مشاہدہ میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ ماشاء اللہ نہایت لطیف جواب ہے۔ ص ۸۰۲

مَیں کہتا ہوں کہ حضرات صحابہ کے اہتمام نقل کی دلیل حج ہی کے واقعہ میں یہ ہے کہ اُنھوں نے اس بات کو بھی نہیں چھوڑا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لبیک کس وقت کہا تھا۔ چنانچہ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا مجھے تعجب ہوتا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ میں بھی اختلاف ہے کہ آپؐ نے کس وقت لبیک کہا۔ فرمایا بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی تو حج کیا تھا اس لیے اُن میں اختلاف ہو گیا۔ مَیں سب سے زیادہ اس کو جانتا ہوں (کیونکہ مَیں آپ کے قریب تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ارادے سے تشریف لے چلے جب آپؐ نے مسجد ذی الحلیفہ میں دو رکعتیں پڑھیں اُسی جگہ احرام باندھا اور دو رکعتیں پڑھنے کے بعد لبیک کہا۔

کچھ لوگوں نے سُنا اور اُس کو محفوظ کر لیا (اُن کی روایت یہی ہے کہ آپ نے دو رکعت پڑھنے کے بعد لبیک کہا) پھر آپؐ ناقہ پر سوار ہوئے جب ناقہ آپ کو لے کر کھڑی ہو گئی اُس وقت بھی لبیک کہا۔ بعض لوگوں نے اُسی وقت آپ کا تلبیہ سُنا کیونکہ مجمع بہت زیادہ تھا سب آپؐ کے پاس نہیں رہ سکتے تھے۔ یکے بعد دیگرے آپؐ کے پاس سے گزرتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی کہا کہ حضورؐ نے اُس وقت لبیک کہا جب ناقہ کھڑی ہو گئی۔ پھر آپ آگے بڑھے جب بیداء کی بلندی پر چڑھے اُس وقت بھی لبیک کہا۔ بعض لوگوں نے اس وقت آپ کا تلبیہ سُنا پہلے نہیں سُنا تھا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیداء کی

بلندی پر چڑھتے ہوئے تلبیہ کہا اور خدا کی قسم! حضورؐ نے اپنی نماز (احرام) ہی کی جگہ (پہلے) لبیک کہا اور ناقہ کے کھڑے ہونے کے وقت بھی (دوبارہ) لبیک کہا اور بلندیٔ بیداء پر بھی لبیک کہا (کیونکہ احرام کے بعد تو ہر اختلافِ حال میں لبیک کہنا مستحب ہے) سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے ابن عباسؓ کی روایت کو پایا وہ اسی جگہ لبیک کہتے ہیں جہاں (احرام) کی دو رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا، او شرط مسلم پر صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے اس کی تائید کی ہے اور یہ روایت سنن ابی داؤد میں بھی ہے اور اب فقہاء کا عمل اب اسی پر ہے۔

اسی طرح آپ کے حج کی ہر ہر بات کو صحابہ نے محفوظ کر کے روایت کیا ہے مثلاً مدینہ سے کس دن خروج ہوا؟ کس وقت کوچ ہوا، ظہر کہاں پڑھی عصر کہاں پڑھی؟ راستہ میں کس مقام پر نزول ہوا، کتنی جگہ پڑاؤ ہوا۔ ہر منزل پر آپ کس جگہ پر کھڑے ہوئے کہاں پیشاب کیا؟ کہاں اُونٹنی کو بٹھا دیا؟ کس جگہ غسل کیا کس جگہ دُعا کی؟ مکہ میں کس راستے سے داخل ہوئے؟ کس دن اور کس وقت داخل ہوئے مکہ میں داخل ہو کر کس دروازے سے بیت اللہ میں آئے آتے ہی پہلے کیا کام کیا؟ مکہ میں کتنے دن ٹھہرے؟ کس تاریخ کو منیٰ کی طرف چلے؟ منیٰ میں کتنی نمازیں پڑھیں؟ وہاں سے عرفات کی طرف کب چلے؟ عرفات کس وقت پہنچے: وہاں کیا خطبہ دیا؟ وہاں سے کب لوٹے؟ اور کس راستہ سے واپس ہوئے راستہ میں کہاں وضو کیا؟ کہاں پیشاب کیا؟ مزدلفہ کب اور کس وقت پہنچے؟ مزدلفہ میں کتنا قیام ہوا وہاں سے کس وقت کوچ ہوا؟ منیٰ کب پہنچے؟ وہاں آتے ہی پہلے کیا کام کیا۔ کس ترتیب سے کیا؟ لوگوں نے اس تمام سفر میں آپؐ سے کیا کیا مسائل دریافت کئے؟ حضورؐ نے اُن کا کیا جواب دیا؟ منیٰ میں کتنے خطبے دیئے؟ اُن میں کیا فرمایا؟ طوافِ زیارت کب کیا؟ رمی جمار کس طرح کیا؟ منیٰ سے واپس ہو کر کہاں نزول ہوا؟ وہاں سے مدینہ کو کس وقت اور کس دن واپسی ہوئی۔ پھر واپسی کے حالات سے بھی اس تفصیل سے بیان کئے

ئے. کوئی ہے جو اس اہتمام کی مثال پیش کر سکے ۔

فضیلتِ انسانی حدیث سے انسان کی فضیلت بھی تمام مخلوقات پر مفہوم ہو رہی ہے کیونکہ کسی مکان یا زمان کی فضیلت ہی انسان کے فائدہ کے لیے ہے کہ وہ اُن میں عبادت کا مامور ہے اور اُس کا ثواب بڑھتا ہے. چنانچہ اس کی تصدیق حق تعالےٰ شانہٗ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون٥ اور اللہ تعالےٰ نے تمہارے واسطے اپنی طرف سے (اپنے حکم سے) اون تمام چیزوں کو مسخر کر دیا (یعنی تمہارے کام میں لگا دیا) ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں (کیونکہ اگر انسان نہ ہو تو ان کا کوئی نقصان نہیں اور یہ نہ ہوں تو انسان پریشان ہو جائے ۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ تمام مخلوقات انسان کے واسطے ہیں ۔ انسان اُن کے واسطے نہیں. تو کیا انسان اشرف المخلوقات ہو کر بیکار محض ہے اس کے متعلق کوئی کام نہیں ؟) یقیناً اس میں دلائل ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں (وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان چیزوں کو ہمارے کام میں لگانا ہمارے بس کی بات تو نہیں کیونکہ چاند، سُورج ، ستارے ، پہاڑ بادل، ہَوا اور دریا ہمارے بنائے ہُوئے نہیں نہ اُن کے نظام پر ہم کو قُدرت۔ اسی طرح زمین سے جو ہمارے واسطے غلّہ پھل ترکاری اور اقسام و انواع کی نعمتیں پیدا ہو رہی ہیں، جانوروں سے دُودھ وغیرہ مل رہا ہے ہم نے اُس میں کچھ نہیں کیا ؟ پھر کس نے ان چیزوں کو ہمارے واسطے بنایا اور سب کو ہمارے کام میں لگا دیا ؟ اسی نقطہ سے اپنے مالک کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر اُس کی نعمتوں کا شکر اَدا کرنے کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا اور اُس کے راضی کرنے کا طریقہ معلوم کرنے کی فکر ہوتی ہے اور انسان سمجھ جاتا ہے کہ جس نے میرے واسطے یہ تمام سامان کیا ہے اُس نے ضرور میرے فرائض بھی کچھ رکھے ہیں اور ایسا مہربان مالک مجھے اندھیرے اور گمراہی میں نہیں چھوڑ سکتا ۔ اس کے بعد اُس کو رسولوں اور راہنماؤں کی

تلاش ہوتی ہے۔ پھر طالب صادق محروم نہیں ہوتا۔ وہ اللہ تعالےٰ کے آخری سچے رسول سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پہنچ جاتا اور قرآن وحدیث سے اپنی طلب کی پیاس بجھاتا ہے) غرض ان تمام مخلوقات سے ہمیں کو فائدہ پہنچ رہا ہے اور ہمارے ہی اُوپر رحمت ہو رہی ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علیٰ ان اللّٰہ عزّوجل یفضل مایشاء من خلقہ الی قولہ فکان الفائدۃ لنا ورحمۃ بنا۔

ف ۔ شریعت نے توکسی زمان یا مکان کی فضیلت اس لیے بتلائی تھی کہ ہم اُس میں عبادت کر کے ثواب زیادہ حاصل کریں۔ لیکن اب اس فضیلت کو لہو ولعب کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے یا آمدنی وصول کرنے کا وسیلہ۔ چنانچہ شبِ قدر کی فضیلت کا یہ حشر ہو رہا ہے کہ اُس رات تراویح میں قرآن ختم کیا جاتا ہے تو مسجد میں فضول چراغاں کی جاتی ہے۔ مٹھائی کا انتظام ہوتا ہے اور مسجد میں وہ شوروغل برپا ہوتا ہے کہ نہ مسجد کا ادب ملحوظ رکھتا ہے نہ نماز پڑھنے والوں کی نماز کا خیال کیا جاتا ہے۔ عید وبقر عید کا دن خوشی کا ہے تاکہ سب مُسلمان جمع ہو کر اللہ تعالےٰ کی عبادت کریں۔ ذکر اللہ زیادہ کریں، اللہ کا بول بالا کریں۔ اُس کو بھی تماشا بنا لیا گیا۔ بہت آدمیوں کی عید تو کپڑوں کی عید ہوتی ہے۔ نماز کا اہتمام برائے نام ہوتا ہے اور عید کی نماز کے بعد تم نوجوانوں کو ہوٹلوں اور سینما گھروں میں رنگ رلیاں مناتے پاؤ گے استغفر اللہ! عاشورہ محرم میں روزہ کی فضیلت ہے اُس میں وہ خرافات ہوتی ہیں کہ ہندوؤں کی رام لیلہ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

ربیع الاوّل میں ولادتِ نبویّہ کی وجہ سے فضیلت اس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام زیادہ پڑھا جائے۔ آپ کی اتباع کا زیادہ اہتمام کیا جائے مگر لوگوں نے اس کو بھی ایک تہوار بنا لیا جس میں سوائے محفلِ میلاد کے اور کچھ نہیں ہوتا اور محفلِ میلاد بھی اپنی طرف سے ایک خاص صورت اختراع کر کے منعقد کی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر کرتے ہی قیام

کیا جاتا ہے اور قیام میں گلے ملاکر درود شریف پڑھا جاتا ہے۔ پھر حاضرین کو مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے اور میلاد خوان کو نذرانہ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی اس طریقہ کو بدعت کہے تو اُس کو وہابی کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے کیونکہ میلاد خوانوں کے نذرانے موقوف ہوتے ہیں مگر یہ صورت اُسی وقت تک اچھی ہے جب تک میلاد خوانوں کو نذرانے مل رہے ہیں اور اگر عامۃ مسلمین اُن سے برابر میلاد پڑھوائیں اور نذرانہ بند کردیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ وہ خود بھی اس کو بدعت کہنے لگیں گے۔ مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے جس زمان یا مکان کو فضیلت دی ہے اُس میں عبادت مطلوب ہے۔ لہو و لعب اور جشن آرائی مطلوب نہیں۔ اب وہ خود فیصلہ کرلیں کہ ان کا عمل مقصود شریعت کے موافق ہے یا خلاف۔ واللہ المستعان۔

واقعہ یہ ہے کہ ان ایام فضیلت کے آنے سے پہلے جو حالت ہماری ہوتی ہے وہی ان ایام میں بھی باقی رہتی ہے اور ان کے بعد بھی۔ نہ ان ایام میں عبادت کا اہتمام ہوتا ہے نہ ان کے بعد بہر محض ہنگامہ آرائی سے کیا فائدہ ؟ جتنی رقم ان ہنگامہ آرائیوں میں ہر سال صرف ہوتی ہے اگر اُس کو کسی تعمیری کام میں صرف کیا جاتا تو مسلمانوں کی حالت سنبھل جاتی اور ان ایام میں اپنی حالت درست کرنے کا اہتمام کیا جاتا تو نصرت خداوندی شامل حال ہوتی مگر لوگ صرف ہنگامہ آرائی کو مقصود سمجھ بیٹھے ہیں عمل کا اہتمام بالکل نہیں۔

❖



حدیث

الانابۃ عن الحج

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حج وداع میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے باپ پر اللہ تعالیٰ کا فریضۂ حج عائد ہوگیا ہے۔ مگر وہ بہت بوڑھا ہے۔ سواری پر جم (کر بیٹھ) نہیں سکتا تو میں کیا اُس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا ہاں! (کر سکتی ہو)۔"

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ حج میں نیابت ہو سکتی ہے۔ اب گفتگو یہ ہے کہ کیا حج فرض اور نفل دونوں میں نیابت ہو سکتی ہے؟ جیسا امام شافعیؒ سے منقول ہے یا صرف نفل میں ہو سکتی ہے فرض میں نہیں۔ سو اس عورت نے اپنے باپ کی جو حالت بیان کی ہے کہ وہ سواری پر نہیں جم سکتا اس کا مقتضا یہ ہے کہ اُس پر حج فرض نہ تھا کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ من استطاع الیہ سبیلا کر (حج اُس پر فرض ہے) جو راستہ طے کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور اس شخص کو طاقت نہ تھی تو اُس پر فرض عائد نہ تھا مگر سوال کرنے والے کے سوال میں تصریح ہے کہ فریضۂ حج اُس کے باپ پر عائد ہوگیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا۔ اس سے زیادہ صریح عبداللہ بن زبیر کی حدیث ہے کہ ایک شخص قبیلۂ خثعم کا حضورؐ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میرے باپ نے اسلام قبول کر

ہیا ہے۔ وہ بہت بوڑھا ہے سواری پر نہیں جم سکتا ہے اور حج اُس پر فرض ہے تو کیا میں اُس کی طرف سے حج کر سکتا ہوں ؟

فرمایا کیا تم اُس کے سب سے بڑے بیٹے ہو ؟ کہا ہاں ! فرمایا بتلاؤ اگر تمہارے باپ پر (کسی کا) دین ہوتا اور تم اُس کو ادا کر دیتے تو کیا اُس کی طرف سے ادا ہو جاتا ؟ کہا ہاں ؛ فرمایا تو بس تم اُس کی طرف سے حج کرو۔ رواہ احمد والنسائی و قال الحافظ ان اسنادہ صالح صہ ج ۱۰ - اعلاء ۔

اس میں سوال کرنے والے نے اپنے باپ کی حالت بیان کر کے صاف کہا کہ اُس پر حج فرض ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کا رد نہیں کیا بلکہ ادائے دین کی مثال دے کر اُس کو حکم دیا کہ اپنے باپ کی طرف سے حج کرے۔ اسی لیے امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول یہ ہے کہ صحت بدن و امن طریق شرط وجوب ادا ہے۔ شرط نفس وجوب نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے من استطاع الیہ سبیلا کی تفسیر میں صرف زاد و راحلہ کا ذکر فرمایا ہے۔ صحت بدن و امن طریق وغیرہ کا ذکر نہیں فرمایا تو جس میں زاد و راحلہ کی قدرت موجود ہے اُس پر حج فرض ہو گا۔ اب اگر مرض اور ضعف وغیرہ بھی نہیں تو خود حج کرنا فرض ہے اور اگر کوئی مرض یا راستہ کی بدامنی یا بڑھاپا مانع ہو گیا تو خود حج کرنا فرض نہیں بلکہ حج بدل کرا دینا یا وصیت کر جانا فرض ہے یہی قول صحیح ہے اگرچہ مذہب میں اور بھی روایات ہیں۔ بہر حال یہ حدیث حج فرض میں جواز نیابت پر دال ہے اور نفل اُس کے تابع ہے ۔۱۲)

یہاں دُوسری گفتگو یہ ہے کہ (حج کی طرح) اور طاعات بدنیہ میں بھی نیابت جائز ہے یا نہیں؛ جیسے نماز، روزہ) تو جمہور کے نزدیک جائز نہیں اور جن ائمہ نے حج میں نیابت جائز کی ہے صرف اسی حدیث کی وجہ سے جائز کی ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ ان میں بھی اختلاف ہے کہ یہ حدیث حج فرض کے متعلق ہے یا نفل کے۔ دوسرے حج میں انفاق مال کی جہت غالب ہے طاعت بدنیہ

اُس کے تابع ہے اور عباداتِ مالیہ میں نیابت جائز ہے اور فرض مالی میں بلا اختلاف جائز ہے۔ باقی عباداتِ بدنیہ (محضہ) میں نیابت جائز نہیں۔ صرف بعض لوگوں نے شذوذ کے طور پر خلاف کیا ہے (یعنی وہ عامۂ فقہاء سے الگ ہو کر ایسا کہتے ہیں) کہ اگر کوئی مر جائے اور اس کے ذمّے فرض روزہ ہو تو ولی اُس کی طرف سے روزہ رکھ دے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے ولی روزہ نہیں رکھ سکتا (بلکہ فدیہ ادا کر سکتا ہے)۔

ایک حدیث میں (یہ لفظ) وارد ہوا ہے یصوم عنہ ولیہ کہ ولی اُس کی طرف سے روزہ رکھ دے۔ بعض علماء نے اس پر عمل کیا مگر جمہور کے نزدیک اس پر عملدرآمد صحیح (طور سے ثابت) نہیں ہوا۔ (جمہور کہتے ہیں کہ جن صحابہ نے یہ حدیث روایت کی ہے اُن کا فتویٰ خود اُس کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ اور عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: لایصلین احد عن احد ولا یصومن احد عن احد ولکن ان کنت فاعلا تصدقت عنه او اهديت۔ کوئی کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے نہ روزہ رکھے لیکن اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اُس کی طرف سے صدقہ کر دو یا ہدی کر دو۔ یعنی قربانی کر کے غرباء کو بانٹ دو"

پس یا تو یہ کہنا چاہیئے کہ پہلی حدیث منسوخ ہے وہ حکم ابتدائی اسلام میں ہو گا یا یہ کہا جائے کہ پہلی حدیث اُس صورت میں ہے جب میت نے وصیت نہ کی ہو یا وصیت کی ہو مگر کچھ مال نہیں چھوڑا تو وارث پر فدیہ واجب نہ ہو گا۔ ہاں اگر وہ چاہے اپنے پاس سے فدیہ ادا کر دے یا نماز پڑھ کر روزہ رکھ کر میت کو اُس کا ثواب پہنچا دے اور دُوسری حدیث اِس صورت میں ہے جب میت نے وصیت کی ہو اور مال بھی چھوڑا ہو۔ اس وقت وارث کا نماز روزہ کفایت نہ کریگا بلکہ فدیہ ادا کرنا واجب ہو گا۔ هذا هو تفصيل ما ذكره الشارح في المقام والبسط في اللمعات والله تعالىٰ اعلم۔

(۱۹۱) کسی کی طرف سے دُوسرا استفتاء کر سکتا ہے حدیث سے معلوم ہُوا کہ مسئلہ

شرعی معلوم کرنے میں نیابت جائز ہے (کہ کسی کی طرف سے دُوسرا استفتاء کر لے) چنانچہ اس عورت نے اپنے باپ کے متعلق استفتاء کیا (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم شرعی بتلا دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ اپنے باپ سے کہو وہ خود آکر سوال کرے) نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورت بھی دُوسرے کی طرف سے حکم شرعی دریافت کر سکتی ہے اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورت سے بات چیت کرنا اور اجنبی مردوں کا اُس کی آواز سُننا جائز ہے اگرچہ اُس کی آواز بھی عورت ہے (یعنی چھپانے کی چیز ہے) جس کا سُننا اجنبی کو جائز نہیں مگر ضرورت میں جائز ہے (اور یہ موقعہ ضرورت کا تھا کہ حکم شرعی معلوم کرنا تھا) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس نے مسئلہ دریافت کیا اور حضورؐ نے اُس کی بات کو سُنا (اگر یہ جائز نہ ہوتا تو حضورؐ اُس کو بات کرنے سے منع کر دیتے اور فرماتے کہ کسی محرم کے ذریعے سے سوال کرو) اور اس سے معلوم ہُوا کہ متقی حکام اور فقہاء کے ساتھ (اُن کے دربار وغیرہ میں) بیٹھنا جائز ہے اگرچہ اُن کے پاس مرد اور عورتیں سب ہی آتے ہوں۔

کیونکہ جس وقت اس عورت نے سوال کیا تھا اُس وقت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور دُوسری احادیث میں بھی یہی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تنہا نہیں بیٹھتے تھے بلکہ صحابہ کی ایک جماعت آپؐ کی مجلس میں حاضر رہتی تھی۔ اسی طرح احکام (شرعیہ) کا تقرر ہُوا ہے کہ آپؐ نے جس کو بھی جو کچھ بتلایا اور جس کے بھی سوال کا جواب دیا صحابہ کی ایک جماعت اُس کو سُنتی اور محفوظ کرتی تھی۔ پھر انہوں نے بعد والوں کو احکام پہنچائے جو کُتب حدیث میں جمع کر دیئے گئے) اگر یہ صُورت دوسروں کے لیے جائز نہ ہوتے، صرف آپؐ کی ذات سے خاص ہوتی کہ وہاں تقرر احکام کے لیے اُس کی ضرورت تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کو ضرور ظاہر فرما دیتے

دیتے دیگر ایسا نہیں ہُوا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کا عمل بھی اسی پر رہا کہ اُن کی مجلس میں بھی ایک خاص جماعت اہل شوریٰ کی رہتی تھی جو حضرات خلفاء کے احکامات کو سُنتے اور محفوظ کرتے اور ضرورت کے موقعہ پر شورہ بھی دیتے تھے ۔

قوله فيه دليل على جواز النيابة في العلم الى قوله لكان يذكر ذالك ديبينه "

ف ۔ صوفیاء کے نزدیک بھی ایک شخص دُوسرے کے متعلق سوال کر سکتا ہے بشرطیکہ اُس کی مخفی حالت کے متعلق سوال نہ ہو ۔ مثلاً یہ سوال کر سکتا ہے کہ فلاں شخص بیمار ہے وہ بیماری میں اپنے معمولات پورے نہیں کر سکتا تو کیا کرے ؟ لیکن یہ سوال نہیں کر سکتا کہ فلاں شخص میں بد نگاہی کا مرض ہے اُس کو کیا کرنا چاہیئے یہ سوال مریض کو خود کرنا چاہیئے ۔ وعلیٰ ہذا القیاس ۔

ف ۔ ضرورت کے موقعہ پر عورت کو عالم کے پاس جانا اور حکم شرعی دریافت کرنا جائز بلکہ بعض دفعہ واجب ہے جب کہ اس کے سوا کوئی صُورت نہ ہو مگر عالم کو تنہائی میں عورتوں سے بات نہ کرنا چاہیئے یا تو اپنے گھر والوں کے سامنے بات چیت کرے یا مجمع عام میں ۔ اگر عالم کے گھر پر سوال کرنے کا موقعہ مل جائے تو عورت کو عالم کے سامنے نہ آنا چاہیئے بلکہ پردے کے پیچھے سے بات کرے اور اگر عالم کے گھر والوں میں سے کوئی اس قابل ہو کہ سوال سمجھ کر صحیح طور سے عالم کے سامنے بیان کر سکے تو اجنبی عورت کو خود بات نہ کرنا چاہیئے بلکہ بواسطہ سوال کرنا چاہیئے اور اگر اُس کے گھر والوں میں کوئی سوال کو صحیح طور سے ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو یہ خود پردے کے پیچھے سے بات کرے اور مجمع عام میں سے سوال کی ضرورت ہو تو عورت کو مُنہ کھول کر نہ آنا چاہیئے ، بلکہ بُرقعہ پوش ہو کر آنا چاہیئے ۔

اور اس عورت نے جس کا واقعہ حدیث میں مذکور ہے مُنہ کھول کر اس

لیے بات کی کہ وہ احرام کی حالت میں تھی اور حالتِ احرام میں عورت کو مُنہ کھولنا جائز بلکہ ضروری ہے۔

اور اللہ تعالےٰ کی قدرت ہے کہ زمانۂ حج میں جو کہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ عورتوں کے مُنہ کھولنے سے اب تک کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوُا۔ مگر پھر بھی زمانۂ فساد پر نظر کر کے آج کل فقہاء نے حالتِ احرام میں بھی عورتوں کو مُنہ چھپانے کی تاکید کی ہے۔ مگر کپڑا مُنہ سے علیٰحدہ رہنا چاہیئے۔ جس کے لیے اس قسم کے کپڑے، پنکھے ایجاد ہو گئے ہیں جن کو سر پر رکھنے سے نقاب چہرہ سے الگ رہتا ہے۔

باب ۶۹

حدیث

مایلبس المحرم فی الحج

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! محرم کون کون سے کپڑے پہن سکتا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (محرم) قمیص نہ پہنے نہ عمامہ باندھے، نہ پائجامہ پہنے نہ برنس (لمبی ٹوپی کا نام ہے جو زمانۂ قدیم میں مستعمل تھی جو پورے سر کو گردن سمیت محیط تھی) اور نہ موزے پہنے مگر یہ کہ کسی کے پاس نعل نہ ہو (وہ جوتہ جس میں ایڑی نہیں ہوتی) تو وہ موزے پہن سکتا ہے، بشرطیکہ اُن کو ٹخنے سے نیچے (کرکے) کاٹ دے اور کوئی ایسا کپڑا نہ پہنو جس کو زعفران یا ورس لگی ہو (یہ بھی ایک گھاس ہے خوشبودار جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ حالتِ احرام میں ان کپڑوں کا پہننا اور ایسے موزے پہننا جس سے ٹخنے ڈھک جائیں اور زعفران و ورس سے رنگے ہوئے کپڑے پہننا ممنوع ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ممانعت ان ہی چیزوں میں منحصر نہیں بلکہ بعض کو بیان فرما کر تنبیہ کی گئی ہے جو اُن کے مثل ہوں جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

(۱۹۲) گفتگو ایسی ہونی چاہیئے کہ مخاطب سمجھ جائے یہاں سے معلوم ہوا کہ سائل سے اس

طرح کلام کرنا چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی سے اسی طرح کلام فرمایا جو حدیث میں مذکور ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ اس جواب سے پوری بات سمجھ جائے گا تو آپ اتنی سی بات پر اکتفا نہ کرتے جو حدیث میں مذکور ہے بلکہ مبالغہ کے ساتھ تشریح فرماتے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث نبوی اور قرآن شریف میں زبانِ عربی کے قاعدے کے موافق ہی غور کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ اسی لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فانما یسرناہ بلسانك لعلهم یتفکرون (ہم نے قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں آسان کر دیا ہے تاکہ وہ سمجھ جائیں (یعنی بقاعدہ زبان عربی جس مطلب کو کلام مقتضی ہے اُس کو سمجھ جائیں تاکہ اُن سے جس بات کا ارادہ کیا گیا ہے اُس کو سمجھ کر نصیحت حاصل کریں اور اُس پر عمل کریں۔

قوله ان المتكلم يخاطب السائل بحسب مايعلم انه يفهم عنه الى

قوله فيتذكرون عند ذلك۔

ف ۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ بات صاف ہو اور پوری ہو ادھوری نہ ہو تاکہ مخاطب اچھی طرح مطلب سمجھ جائے۔ جن لوگوں نے حضرت کے مکاتیب و رسائل کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا جواب مختصر بھی کافی ہوتا تھا۔ صوفیاء اور علماء کو اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

ف ۔ جو لوگ قرآن و حدیث میں بدون ذوقِ عربیت کے غور کرنا چاہتے ہیں، اُن کی غلطی بھی واضح ہو گئی۔ آج کل بعض جہلا صوفیاء قرآن سے اپنے طریقہ کو قواعد عربیت کے خلاف ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ محض ترجمہ دیکھ کر مجتہد بن جانا چاہتے ہیں۔ بعضے تھوڑی سی صرف و نحو پڑھ کر قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب قرآن و حدیث میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو عربی زبان سے ذوق نہ ہو اُس کو علماء محققین سے رجوع کرنا لازم ہے۔ فاسئلوا!

اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون -

(۱۹۳) مسائل جزئیہ کی تحقیق بھی جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ مسائل جزئیہ کی تحقیق کرنا جائز ہے

کیونکہ اس شخص نے جزئیات ہی سے سوال کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو جواب دیا جس سے اس قسم کے سوال کا جواز معلوم ہو گیا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ (احکام) دین کا پوچھنا ضرورت سے پہلے بھی جائز ہے کیونکہ اُس شخص نے محرم کے لباس کو دریافت کیا حالانکہ وہ اس وقت محرم نہ تھا اسی کے مناسب امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا واقعہ ہے کہ ایک رات وہ اپنے زمانہ کے ایک امام کے پاس رہے جن پر عبادت کا زیادہ غلبہ تھا - اگرچہ اُس زمانے کے سبھی ائمہ کا یہی حال تھا مگر پھر بھی بعضوں پر کسی ایک شان کا غلبہ ہوتا تھا، تو وہ امام تو رات بھر نماز میں مشغول رہے اور امام شافعیؒ لیٹے رہے۔ صبح کو اُن عالم کی بیوی نے کہا یہی وہ امام شافعی ہیں جن کی آپ تعریف کیا کرتے تھے۔ آپ تو رات بھر نماز پڑھتے رہے اور وہ رات بھر بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ اُن بزرگ نے اپنی بیوی کی بات کا تذکرہ امام شافعی سے کیا تو فرمایا کہ میں آج رات بھر استنباط مسائل میں مشغول رہا اور اسی (۸۰) مسئلے دلیل و برہان کے ساتھ اپنے ذہن میں جمع کر لیے۔ اُن بزرگ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جس کے لیٹے رہنے پر تو نے اعتراض کیا تھا اُس نے اس رات میں اسی مسائل استنباط کئے ہیں جن میں سے ایک مسئلہ بھی میری ساری عبادت سے افضل ہے کیونکہ میری عبادت تو صرف میرے لیے ہے اور مسائل کا استنباط ساری اُمت کو نافع ہے جس سے قیامت تک وہ دین کا راستہ معلوم کرے گی، ذرا تم ان حضرات کی بزرگی اور باہمی انصاف اور علم کے احترام کو تو دیکھو اللہ تعالیٰ ان سب پر رحم فرمائے (واقعی یہ حضرات امام تھے) اور یہی حق ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے واسطے ہو (کہ ہر عالم دوسرے کا احترام کرے اور صرف اللہ تعالیٰ کے

واسطے احترام کرے)۔ قولہ وفیہ دلیل علی البحث فی جزئیات الدین الیٰ قولہ وھو الحق اذا کان للہ۔

ف۔ اسی قسم کا واقعہ امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا امام شافعی کے ساتھ منقول ہے کہ امام شافعی اخیر شب میں تہجد کو اُٹھے اور امام محمد لیٹے رہے۔ صبح کو امام شافعی نے دریافت کیا کہ آپ نے رات تہجد کیوں نہیں پڑھا؟ فرمایا تم نماز میں قرآن پڑھ رہے تھے اور میں اُن آیات سے مسائل استنباط کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ دو سو سے زیادہ مسائل میں نے جمع کر لیے اس لیے تہجد کو نہ اُٹھا۔ یہ ہیں وہ حضرات جن کے متعلق حدیث میں وارد ہے نوم العالم عبادۃ عالم کا سونا اور لیٹنا بھی عبادت ہے۔

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کی عادت تھی کہ سوتے ہوئے پنسل کاغذ اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ اگر رات کو کوئی مسئلہ علم ظاہر یا علم باطن کا قلب پر وارد ہوتا تو فوراً بتی جلا کر اُس کو لکھ لیتے تھے۔ بعض دفعہ یہ بھی دیکھا گیا کہ دن میں ڈاک پوری نہ ہوئی تو رات کو تہجد کی نماز ہلکی ہلکی رکعتوں سے ادا کر لی اور ڈاک لکھنے بیٹھ گئے۔ کیونکہ اس میں طالبین کی اصلاح و تربیت ہوتی تھی جو تہجد سے اہم و اقدم ہے۔

ف۔ حضرات فقہاء نے استنباط مسائل کے لیے تہجد کو ہمیشہ ناغہ نہیں کیا بلکہ ایسا اتفاق کبھی کبھی ہو جاتا تھا جبکہ قلب پر دفعۃً مسائل کا ورود ہونے لگتا اور تہجد میں مشغول ہونے سے اس سلسلہ کے منقطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ورنہ حضرات فقہاء کو علم ظاہر کے ساتھ عبادت کا بھی بہت زیادہ اہتمام تھا اس عمل ہی کی برکت سے علم ظاہر میں ترقی اور نور پیدا ہوتا تھا اور اسی کی برکت سے بعض دفعہ اُن کے قلب پر دریائے علم موجزن ہوتا تھا تو اس وارد کا حق ادا کرنے کے لیے اُسی میں مشغول رہتے اور اس وقت تہجد کو ناغہ کر دیتے پھر بعد طلوع آفتاب کے اُس کی قضاء کر لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ وارد کا غلبہ

ہمیشہ نہیں ہوا کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک ذاکر شاغل صوفی حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے مہمان ہوئے۔ عشاء کے بعد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے صوفی صاحب سے فرمایا اگر تہجد پڑھنا چاہتے ہو تو اپنا پلنگ مولوی ظفر احمد کے پاس بچھاؤ وہ رات کو اٹھتے کام بھی اٹھ جاؤ گے اور اگر سونا چاہتے ہو تو اپنا پلنگ میرے ساتھ بچھالو۔ صوفی نے کہا میں تو آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ فرمایا بہت اچھا۔ چنانچہ اُس رات دونوں حضرات صبح تک سوتے ہی رہے۔ صبح کی نماز کے بعد وہ صوفی کہنے لگے مولانا ایسی نیند تو روز سُلا دیا کرو۔ واللہ! رات بھر اللہ تعالیٰ کا ایسا حضور رہا کہ مجھے نماز میں بھی اب تک ایسا حضور حاصل نہیں ہوا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا بھائی ہمارے پاس تو بس یہی ہے۔ اللہ اللہ! ایسے حضرات کی نیند پر ناقصوں کے ہزار تہجد قربان ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۱۹۴) اسرارِ حج کا بیان

حاجی (حالتِ احرام میں) جن باتوں کا مکلف کیا گیا ہے کہ سِلا ہُوا کپڑا نہ پہنے خوشبو نہ لگائے۔ زینت نہ کرے اس کی کوئی حکمت ہے یا محض تعبد ہے جس کی علت عقل میں نہیں آسکتی؟ اگر محض تعبد ہے تو گفتگو کی ضرورت نہیں اور اگر کہا جائے کہ قواعد شرعیہ حکمت پر مبنی ہیں تو اس کی حکمت میں غور کیا جائے گا۔ چنانچہ کتاب اللہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں ایک ہی نشانی نہیں بلکہ بہت سی نشانیاں ہیں چنانچہ حکم حج سے پہلے ارشاد ہے فیہ آیات بینات بیت اللہ میں بہت سی نشانیاں ہیں اور یہ لفظ عام ہے جو معنوی حکمتوں اور حسی نشانیوں سب کو شامل ہے یا حسی نشانیوں کیساتھ ہے جیسا بعض علماء نے فرمایا ہے (کہ بیت اللہ میں ایک نشانی قدرت یہ[ع]

ع اور ایک بڑا نشانِ قدرت تو یہ ہے کہ بیت اللہ ہزارہا برس گزر جانے پر بھی محفوظ ہے جبکہ بڑے بڑے سلاطین کے محلات کا نام و نشان تک باقی نہیں کعبہ معظمہ سے قدیم تر عمارت آج دنیا کے پردہ پر کسی جگہ موجود نہیں ۱۲۔ ظ

ہے کہ) وہاں (پہنچ کر) کوئی مخدوم نہیں دیکھا جاتا (بلکہ سب ہی ایک شان میں نظر آتے ہیں نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز) اور (دوسرا نشانِ قدرت) رمی جمار میں (ہے) کہ ہر سال اُن پر کنکریاں ماری جاتی ہیں (اور یہ سلسلہ ہزاروں برس سے چلا آرہا ہے ہر سال لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل ہر جمرہ پر لاکھوں کنکریاں مارتے ہیں) مگر اُن کا کوئی نشان وہاں باقی نہیں رہتا (حالانکہ اُن کے اُٹھانے اور صاف کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے جس کا جی چاہے تحقیق کرے تو عقل کا مقتضا دیہ تھا کہ اسی مقام پر کنکریوں سے ایک پہاڑ بن جاتا مگر ایسا نہیں ہُوا کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ جو کنکریاں قبول ہو جاتی ہیں اُن کو فرشتے اُٹھا لیتے ہیں) تو یہ (حسّی نشانِ قدرت) بھی اُن آیاتِ کثیرہ کا ایک حصہ ہے (جن پر فیہ آیات بینات میں اشارہ کیا گیا ہے اور تیسرا حسی نشانِ قدرت یہ ہے کہ زمینِ حرم کے اندر بھیڑیا اور بکری ساتھ ساتھ رہتے ہیں نہ بکری بھیڑیئے سے ڈرتی ہے نہ بھیڑیا اُس پر حملہ کرتا ہے اور جہاں زمینِ حرم سے باہر ہوئے پھر بکری بکری ہے اور بھیڑیا بھیڑیا) ۔ تو اس میں سوچنے اور سمجھنے والوں کو تنبیہ ہے وہ غور کریں گے تو اُن کی سمجھ میں بہت سی نشانیاں قدرت کی آجائیں گی ۔ ان آیات کے عموم سے ہر شخص اپنی سمجھ کے موافق حصہ لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُس پر منکشف کردیں کیونکہ اس میں عجیب عجیب حکمتیں ہیں ۔

چنانچہ (لباس احرام کے متعلق) اللہ تعالےٰ کی توفیق سے جو حکمت ہمیں معلوم ہوئی وہ دو باتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ حجاج اپنے گناہوں کا بوجھ اتارنے (اور گناہوں سے معافی چاہنے کو) جاتے ہیں ۔ اس حالت کے مناسب یہی صورت ہے کہ ذلت کی شکل بنا کر جائے ۔ لذاتِ نفس سے علیحدہ ہو کر جائے کہ وہی گناہوں میں مبتلا کرتی ہیں کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جب حق تعالےٰ شانہٗ نے ملائکہ سے فرمایا: انی جاعل فی الارض خلیفۃ کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک ۔ کیا آپ زمین میں ایسے لوگوں کو خلیفہ کرنا چاہتے ہیں جو اُس میں

فساد کریں گے خون ریزی کریں گے اور ہم بحمد اللہ آپ کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں (ہم اس کے لیے حاضر ہیں ہمارے ہوتے ہوئے کسی اور کی کیا ضرورت ہے ؟) قال انی اعلم مالا تعلمون سے اللہ تعالیٰ کو غصہ آگیا (اور فرمایا بس میں جانتا ہوں جو کہ تم نہیں جانتے) تو فرشتوں نے سات دفعہ عرش کا طواف کیا اور توبہ و استغفار کیا تو اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے اُن کی توبہ قبول کی پھر فرمایا زمین میں ایک گھر بناؤ جس کا گنہ گار انسان طواف کرے تو میں اُن کی توبہ قبول کروں جیسا (عرش کے طواف سے) تمہاری توبہ قبول کی اور اُن کی بھی مغفرت کردوں جب تمہاری مغفرت کی۔ فرشتوں نے یہ گھر (کعبہ معظمہ) بنایا تو جو اس غرض سے آئے۔ حکمت کا

ع۱ یہ حدیث میری نظر سے نہیں گزری البتہ مُلا علی قاری نے معالم التنزیل سے نقل کیا ہے کہ امام علی بن الحسین (زین العابدین) رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے عرش کے نیچے ایک مکان بنایا جس کا نام البیت المعمور ہے اور فرشتوں کو اس کے طواف کا امر کیا پھر جو فرشتے زمین پر رہتے ہیں اُن کو حکم دیا کہ ایسی تعمیر بہ اسی کے برابر زمین میں ایک گھر بنائیں و اُنہوں نے بنایا۔ اور اس کے طواف کا زمین والوں کو حکم کیا گیا جیسا آسمان والے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے بیت اللہ کو بنایا تھا اور وہ اس کا حج کرتے تھے۔ جب آدم علیہ السلام نے حج کیا۔ فرشتوں نے کہا آپ کا حج قبول ہے ہم نے آپ سے دو ہزار برس پہلے اس کا حج کیا ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

پس اگر یہ حدیث جو شارح نے بیان کی ہے صحیح نہیں تو کچھ اشکال نہیں اور اگر صحیح ہے تو اس سے عصمت ملائکہ کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ ملائکہ کا مقصود اعتراض نہ تھا بلکہ حکمت دریافت کرنا تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے ایسی مخلوق کو خلافت دینے میں کیا حکمت ہے ؟ مگر عنوان خلافِ ادب تھا اس لیے حق تعالےٰ ناراض ہوئے پس ملائکہ کی بات گناہ کے درجہ میں نہ تھی صرف لغزش کے درجہ میں تھی جو عصمت کے منافی نہیں۔ ۱۲ ظ

مقتضاء یہ ہے کہ اُس کی حالت مقصود کے مناسب ہو۔ دیکھو عید (کی نماز) کے لیے نکلنا چونکہ طلب رحمت کا انعام) کے لیے ہے عبادت صوم پُورا کرنے کے بعد تو اُس میں خوشبُو لگانا اچھے کپڑے پہننا مطلوب ہے کیونکہ اس وقت کے مناسب یہی ہے۔ یہ حالت استقامت اور امتثال امر کی ہے کہ امتثالِ امر کے بعد انعام حاصل کرنے کے لیے بارگاہِ عالی میں حاضر ہوئے ہیں تو اچھی شکل سے آنا چاہیئے، اور نمازِ استسقاء کے لیے نکلنا اُس مصیبت کے دُور کرنے کے لیے ہے جو (قحط کی شکل میں) نازل ہوئی ہے تو اُس وقت تضرع و مسکنت (خشوع وخضوع) کے ساتھ نکلنا چاہیئے۔ (کپڑے بھی اچھے نہ ہوں بلکہ میلے کچیلے ہوں) کیونکہ اُس وقت گناہ کا ارتکاب کرکے بارگاہ میں آئے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے جب بندے گناہ کرتے ہیں حق تعالیٰ اُن سے بارش کو روک لیتے ہیں تو اُس حالت کے مناسب یہی صُورت ہے کہ مسکنت و ذلت کی شکل میں آئیں۔ دُعا میں مارے خوف کے ہاتھ بھی اس طرح اُٹھائیں کہ ہتھیلی زمین کی طرف ہو۔ جس سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے) کہ ہماری حالت پلٹ دیجئے۔ اسی طرح حج میں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ، کیونکہ حج میں بہت بڑی طلب ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ حج میں روزِ محشر کا نمونہ ہے کیونکہ وہاں بھی ایک ہی دن میں تمام رُوئے زمین کے آدمی جمع ہوں گے (حج میں بھی ایک تاریخ میں تمام اطراف کے آدمی جمع ہوتے ہیں اور جیسا قیامت میں مختلف مقامات پر مجمع ہوگا کبھی میدان میں جمع ہوں گے، کبھی حساب کے لیے بلائیں جائیں گے کبھی میزانِ عمل پر جائیں گے وغیرہ وغیرہ) اسی طرح یہاں بھی مختلف مقامات مقرر ہیں کبھی (میدانِ عرفات میں اجتماع عظیم ہے) رمی جمار ہو رہا ہے۔ کبھی منیٰ۔ مزدلفہ میں وقوف ہو رہا ہے (کبھی طوافِ زیارت کے لیے جا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ) اور جیسا دُنیا سے آخرت کی طرف جاتے ہوئے اہل وعیال اور مال سب چھُوٹ جاتے ہیں

اور بجز کفن اور ضروریات دفن کے (دُنیا کی) اور کوئی چیز ساتھ نہیں جاتی۔ اسی طرح حاجی اپنے اہل وعیال اور وطن سے مفارقت کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے موت کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم اواخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم (اور اگر ہم اُن کے اُوپر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جانیں دے دو یا گھروں سے نکل جاؤ تو بہت کم آدمی اس فرض کو پُورا کرتے) اور اس کے ساتھ بھی بقدر ضرورت سفر کے مال ہوتا ہے۔ غالب عادت یہی ہے باقی سب چھوڑ جاتا ہے۔

نیز جیسا میت کو قیامت سے پہلے مختلف مقامات میں ٹھہرنا ہوتا ہے اور قسم قسم کے خطرات پیش آتے ہیں حج میں سے بعض لوگ غلامی پاجاتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ غلامی دینا چاہیں اور بعضے ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح حج کے راستے میں بھی بہت مشقتیں پیش آتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس (اور یہ جانور تمہارے بوجھ اُٹھا کر ایسے شہر میں پہنچاتے ہیں جہاں تم بدون جانوں کو مشقت میں ڈالے نہیں پہنچ سکتے تھے) اور بعض لوگ حج کے راستہ ہی میں ہلاک ہوجاتے ہیں جیسا وہاں بعض لوگ قیامت سے پہلے ہی ہلاکت میں پڑ جاتے ہیں) مگر دونوں ہلاکتوں میں ایک فرق ہے کہ یہاں تو صرف اتنی ہی ہلاکت ہے کہ جان بدن سے نکل جاتی ہے۔ جس میں بعض دفعہ سعادت (اور شہادت) بھی مل جاتی ہے اور وہاں کی ہلاکت خطرات کی کثرت سے ہوتی ہے جن سے خلاصی نہیں ہوتی تو وہ شقاوت اور ناکامی کی ہلاکت ہے (حج کے راستہ میں ہلاک ہونے والا اس سے محفوظ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے واسطے گھر سے نکل چکا پھر راستہ میں موت آجائے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ثابت ہوگیا۔ وہ ان شاء اللہ محروم نہیں) مگر قیامت سے پہلے (اور میدان قیامت) میں تو لوگ ننگے کھڑے ہوں گے اور حج میں ننگے نہیں ہوتے۔ اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں اسلام سے پہلے (اکثر) لوگ ننگے ہو کر وقوف

(عرفہ وغیرہ) کرتے تھے۔ مگر اب شریعت نے اُس کو روک دیا اور ستر ڈھانکنے کے لیے لباس کو ضروری قرار دیا (مگر سِلا ہُوا کپڑا اور زینت کا لباس ممنوع کر دیا گیا بس مُردہ کی طرح لُنگی اور چادر میں احرام ہونا چاہیئے اور اُس کو حج پُورا ہونے تک رکھنا چاہیئے کیونکہ قیامت کا تو ہول اس قدر ہوگا کہ کسی کو کسی کے ستر پر نظر کرنے کی مہلت نہ ہوگی اور حج میں نظر سے مانع کوئی چیز نہیں ہے تو لباس کی ضرورت ہے اور قیامت میں کسی کے پاس خوشبُو نہ ہوگی۔ ایسا ہی یہاں بھی (زینت اور خوشبو سے منع کر دیا گیا) نیز قیامت میں حکومت اور سلطنت صرف اللہ تعالےٰ کی ہوگی اور کسی کی نہ ہوگی سب کے دعوے ختم ہو جائیں گے۔ اسی طرح حج میں جب غرض سے جاتے ہیں یعنی گناہوں کی مغفرت اور معافی اس میں بھی کسی کا کچھ دخل نہیں سب کے سب گردن جُھکائے منتظر کھڑے ہوتے ہیں کہ دیکھئے اللہ تعالےٰ کیا فیصلہ فرماتے ہیں (مغفرت سے نوازتے اور حج کو قبول فرماتے ہیں یا اُلٹا مُنہ پر مارتے ہیں۔ پھر میدان عرفات میں بادشاہ اور رعایا امیر و غریب سب ایک لباس میں ہوتے اور سب کے سب اللہ تعالےٰ کے سامنے عاجزی اور انکساری اور زاری کے ساتھ ہاتھ اُٹھائے ہوتے ہیں اُس وقت کوئی خادم اور مخدوم نظر نہیں آتا، بلکہ صاف لمن الملک الیوم للہ کا نقشہ سامنے ہوتا ہے)۔

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ اُنہوں نے ایک بار حج کیا۔ حج سے فارغ ہو کر سو گئے تو خواب میں دیکھا کہ آسمان سے دو فرشتے اُترے ہیں (اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں) ایک نے دُوسرے سے پُوچھا اس سال ہمارے پروردگار کے گھر کا کتنے آدمیوں نے حج کیا؟ دُوسرے نے کہا چھ لاکھ نے۔ اُس نے پھر سوال کیا کہ اُن میں سے کتنوں کا حج قبول ہُوا؟ کہا صرف چھ کا! یہ بزرگ گھبرا کر جاگ اُٹھے اور بار بار کہتے تھے۔ کاش مجھے کوئی بتلا دے کہ مَیں بھی اُن چھ میں ہوں؟ دُوسرے دن پھر سوئے (مگر کچھ معلوم نہ ہُوا) تیسرے دن پھر سوئے تو اُن ہی دو فرشتوں کو دیکھا کہ پھر آسمان سے اُترے ہیں اور پہلے کی طرح سوال و جواب کر

رہے ہیں۔ جب ایک نے یہ جواب دیا کہ اس سال صرف چھ آدمیوں کا حج قبول ہوا ہے تو دُوسرے نے سوال کیا کہ ہمارے پروردگار نے باقیوں کے متعلق کیا فیصلہ کیا ؟ پہلے نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ نے ان چھ میں سے ہر ایک کی سفارش ایک ایک لاکھ کے لیے قبول فرمالی (اس طرح سب ہی کا حج قبول ہو گیا) اب یہ بزرگ فرحاں و شاداں بیدار ہُوئے۔

اسی طرح قیامت میں کوئی نجات پانے والا ہے، کوئی ہلاک ہونے والا، کوئی مقبول ہے، کوئی غیر مقبول ہے۔ کوئی سفارش کرنے والا ہے کسی کے لیے سفارش ہو رہی ہے۔ لیکن شفاعت اللہ تعالےٰ کی اجازت کے بعد ہو گی اور کوئی محض فضل سے ناجی ہو گا (بدون اجازت کے کوئی کسی کی سفارش نہیں کرسکے گا من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ) اور کسی پر فضل بھی ہو گا شفاعت بھی ہو گی۔

قولہ ومنایجث وھومحل ھذہ الصفات التی کلف بھا الحاج من ترک المخیط الیٰ ترک الطیب الیٰ قولہ ولکن باذنہ وفضلہ وقد یکون للمجموع۔

ف ۔ اگرچہ اس میں کوئی مسئلہ تصوف نہیں مگر حج کی رُوح کا بیان ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ کر دیا گیا تاکہ حجاج عموماً اور صوفیاء خصوصاً حج میں اور نماز میں اس روح کو ملحوظ رکھیں۔ کیونکہ نماز میں بھی حج کی شان موجود ہے کہ بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہے تو استقبالِ قبلہ کے ساتھ موت اور قیامت کا منظر سامنے ہونا چاہیئے۔ پھر انشاء اللہ خشوع آسان ہو جائے گا اور اس شان سے حج کیا جائے گا تو انشاء اللہ قبول ہو گا۔

(۱۹۵) قُرب کا بڑا درجہ بڑے بڑے مجاہدات وعبادات سے ہی حاصل ہوتا ہے

اس حکمت کے معلوم ہو جانے سے یہ مسئلہ مستنبط ہُوا کہ قرب کا بڑا درجہ بڑے بڑے مجاہدات اور عبادات ہی سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ مقام (عرفات وغیرہ) ایسا مقام ہے جس میں بڑے بڑے جرائم کی مغفرت ہوتی ہے۔ جیسا حدیث میں وارد ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان یوم عرفہ سے زیادہ کسی دن زیادہ ذلیل اور حقیر نہیں دیکھا جاتا۔ کیونکہ وہ اس دن دیکھتا ہے کہ اللہ تعالےٰ بڑے بڑے گناہوں کو معاف فرما رہے ہیں تو اپنے سر پر مٹی ڈالتا جاتا اور کہتا جاتا ہے کہ جس قوم کو میں نے پچاس یا چالیس سال تک گناہوں میں مبتلا رکھا اُن کو ایک ساعت میں بخش دیا گیا۔ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) تو ایسے مقام تک پہنچنا آسان نہیں بلکہ بڑی مشقت سے پہنچنا ہوتا ہے۔ ہاں جس پر اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے آسان کردیں (اُس کے لیے حج آسان ہو جاتا ہے مگر ایسے تھوڑے ہی ہیں اسی طرح مقامات عالیہ باطنہ کثرت مجاہدات و عبادات و ذکر ہی سے حاصل ہوتے ہیں آسانی سے حاصل نہیں ہوتے الا ماشاء اللہ ؎

ناز پروردہ تنعم نہ بر د راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد!

اور اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ حج میں اس موقف (یعنی میدانِ حشر) کو یاد کرے جس کا یہ نمونہ ہے تاکہ مولےٰ کریم کی طرف سچے دل سے التجا کی توفیق ہو اور اللہ تعالےٰ کی طرف زیادہ توجہ اور رغبت اور اپنی احتیاج کا اظہار ہو کہ اُسی سے تمام خیر کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں امن یجیب المضطر اذا دعاہ (کیا وہ جو مضطر کی دُعا قبول کرتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے کیا اس کے ساتھ بھی دوسروں کو شریک کرتے ہیں) ہرگز نہیں بلکہ اکثر لوگ نادان ہیں جو ایسے خدا کے ساتھ بھی دُوسروں کو شریک کرتے ہیں) اور اللہ تعالےٰ سبحانہٗ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے (وہ مضطر و محتاج کی دُعا ضرور قبول کرتے ہیں) اللہ تعالےٰ ہم کو بھی اُن میں سے کرے جن پر محض اپنے فضل سے احسان فرمایا اور اُن کو کوئی مشقت اُٹھانا نہیں پڑی۔ اللہ کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔ قولہ ویترتب علیہ من معرفۃ الحکمۃ الی قولہ لا رب سواہ۔

عبادت سے حاصل ہوتے ہیں۔ مگر یہ اُس وقت تھا جب مسلمانوں میں طلب دین غالب
اور طلب دُنیا مغلوب تھی۔ اب معاملہ برعکس ہے۔ اُس زمانے میں جو لوگ دین کی
طلب میں مشغول ہوتے ہیں اُن کو تھوڑے سے مجاہدہ ہی سے مقامات عالیہ حاصل
ہو جاتے ہیں۔ یہی مطلب اُس حدیث کا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
صحابہ سے فرمایا تھا کہ تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر اوامر کا دسواں حصّہ چھوڑ دو تو
ہلاک ہو جاؤ۔ پھر ایک زمانہ آئے گا کہ اگر مسلمان اوامر کا دسواں حصّہ بجالائیں تو
کامیاب ہو جائیں گے۔

حدیث میں اوامر سے فرائض و واجبات مُراد نہیں کہ ان میں سے تو کسی کا
ترک بھی کسی وقت جائز نہیں بلکہ وہ مجاہدات و عبادات مُراد ہیں جو شریعت نے
فرائض و واجبات کی تکمیل کے لیے بتلائے ہیں جن سے خاص کیفیت پیدا ہوتی
ہے۔ ان مجاہدات و عبادات کا دسواں حصّہ بھی آج کل نجات اور کامیابی کے
لیے کافی ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ آج کل طالبان خُدا کم ہیں اور آسامیاں (یعنی
مقامات) وہی ہیں جو پہلے تھیں جن کا پُر کرنا ضروری ہے تو آج کل جس میں طلب
کے ساتھ اخلاص ہوتا ہے اُس کو بہت جلد کسی نہ کسی آسامی پر فائز کر دیتے ہیں۔
تو اِس زمانے میں کام تھوڑا کرنا ہوتا ہے اور مرتبہ بڑا مل جاتا ہے۔ دنیا ابدال،
اقطاب و اوتاد و نقباء و اصحاب ولایت سے کسی وقت خالی نہیں ہو سکتی ورنہ
قیامت آجائے مگر پہلے یہ مقامات بہت زیادہ کام کرنے پر عطا ہوتے تھے۔
آج کل تھوڑی سی محنت میں حاصل ہو جاتے ہیں بشرطیکہ طلب صحیح اور اخلاص
کامل ہو۔ اس لیے آج کل سالکین کو صوفیاء متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ زیادہ
مفید نہیں کہ اُن کی تشدید کو دیکھ کر بہت لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ درجۂ ولایت
حاصل کرنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے کیونکہ احیاء العلوم وغیرہ میں ہر بات کو
بڑی سختی اور باریکی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا تحمل آج کل کی طبائع سے

نہیں ہو سکتا۔ اس زمانہ میں طالبانِ سلوک کو حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کی تصانیف کا مطالعہ ہی نافع ہو سکتا ہے۔ حضرت نے اس زمانے کی طبائع کے موافق دستور العمل تجویز کیے اور امراضِ قلب کے معالجات بیان فرمائے ہیں جن پر عمل دشوار نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ جس سلوک کو لوگوں نے بہت دشوار سمجھ رکھا تھا حضرتؒ نے اُس کو پھول سا ہلکا کر دیا ہے اور جس چیز کو معمّہ سمجھا جا رہا تھا اُس کو ایسا صاف اور بے غبار کر دیا ہے کہ ہر شخص حقیقت تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ جس تصوّف کو خلافِ قرآن و حدیث کہا جا رہا تھا حضرت نے اُس کی اصلی حقیقت کو کتاب وسُنت سے ثابت کر کے دکھا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو مسائل السلوک اور التکشف والتعرف وغیرہ۔

ف۔ حج میں تو جو باطنی حکمتیں ہیں وہ آپ نے سمجھ لیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیت اللہ میں اب بھی وہ نشان ہائے قدرت موجود ہیں جن میں انصاف کے ساتھ غور کرنے سے کافر بھی ایمان لے آئے۔ اور مومن غور کرے تو اُس کا ایمان کامل ہو جائے اسی لیے حج کو مکمل ایمان کہا گیا ہے۔

حج کی ظاہری حکمتیں اب ہم بعض ظاہری حکمتیں بھی بیان کرنا چاہتے ہیں جو حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ وہ یہ کہ ہر قوم اور ہر سلطنت میں ایک دن اجتماع اور دربارِ عام کا ہوتا ہے جس میں دور اور نزدیک والے سب آ کر جمع ہوتے ہیں تاکہ حکومت کے احکام پر مطلع ہوں۔ ایک دوسرے سے مل کر تبادلۂ خیالات کریں اور شعائرِ سلطنت کی تعظیم بجا لائیں۔ اسی طرح حج ملتِ اسلامیہ کا دربار ہے جس میں اطرافِ عالم سے مسلمان جمع ہوتے ہیں اُن کی شوکت اور اجتماعی شان ظاہر ہوتی ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو پہچانتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ اسلامی برادری بہت دُور تک پھیل چکی ہے خوش ہوتا ہے آپس میں اتحاد و اتفاق بڑھتا ہے۔ کلمۂ اسلام بلند ہوتا اور اللہ کا بول بالا ہوتا ہے اور اگر دُنیا میں خلافتِ اسلامیہ کا وجود ہو تو خلیفہ کو تمام اطراف کے مُسلمانوں کی حالت معلوم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ہر سال حج کرتے تھے

اور اپنے عمال (گورنروں) کو بھی ہر سال حج کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ کیونکہ جب گورنر حج کو جائیگا تو اُس کے ساتھ اُس کے ملک اور صوبہ کے بھی بہت آدمی ہوں گے اس طرح خلیفہ کو ہر مُلک اور ہر صُوبہ کے آدمیوں سے اپنے عمال و ولاۃ (گورنروں، حاکموں) کے عدل و انصاف یا بے راہروی کی اطلاع آسانی سے ہو جاتی تھی۔ پھر ان اعمال و ولاۃ کے اجتماع سے مُلکی مسائل اور سیاسی مصالح پر بھی مشورہ کا موقع ملتا تھا اور مسائل آئندہ کے متعلق ایک خاص طریقہ اور لائحہ عمل طے ہو جاتا تھا۔ میں نے بچپن میں ایک اخبار میں کسی امریکن ڈاکٹر کا مضمون پڑھا تھا جس میں لکھا تھا کہ یورپ اور امریکہ چار باتوں کے لیے مدت سے کوشش کر رہے ہیں مگر باوجود ہر قسم کے ذرائع و وسائل مہیا ہونے کے اُن کو اب تک کامیابی نہیں ہو سکی اور حیرت ہے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے ہی قدم میں تھوڑی سی مدت میں ان چاروں میں ہی کامیاب ہو گئے۔

ایک یہ کہ ہم ایک مشترک بین الاقوامی زبان کی تجویز میں ہیں مگر ہنوز روزِ اوّل ہے۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عربی کو تمام مسلمانوں کی مشترک بین الاقوامی زبان بنا دیا۔ تم کسی ملک میں چلے جاؤ ہر جگہ مسلمان عربی میں اذان دیتے، عربی میں نماز پڑھتے عربی میں خطبہ دیتے ہیں۔ ہر مُلک اور ہر قوم کو اپنی الگ الگ زبان کے ساتھ عربی زبان سے بھی لگاؤ ضرور رہے (اُن کا اسلام بھی عربی میں ہے اور خطبہ نکاح بھی عربی میں قرآن بھی عربی میں ہے دوسری قوموں کے پاس تورات و انجیل کے تراجم ہی رہ گئے ہیں اصل کتاب مفقود ہے وغیرہ وغیرہ)۔

دوسرے ہم ایک بین الاقوامی کانفرنس کی تجویز میں ہیں مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس میں بھی کامیابی حاصل کر لی ہے کہ ہر سال تمام ممالک اسلامیہ کے مسلمان مکہ میں حج کے لیے جمع ہوتے ہیں جو بہت بڑی بین الاقوامی کانفرنس ہے۔

تیسرے ہم ایک بین الاقوامی سرمایہ جمع کرنا چاہتے ہیں جس میں ناکام ہیں مگر

پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اس میں بھی کامیاب تھے۔ "بیت المال" تمام مُسلمانوں کا بین الاقوامی مشترک خزانہ تھا جس میں تمام دُنیا کے مُسلمانوں کا حق تھا اور جب تک خلافتِ اسلامیہ قائم رہی بیت المال بھی قائم رہا جس سے سب مُسلمان فائدہ حاصل کرتے تھے۔

چوتھے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ بین الاقوامی وحدت حاصل کریں اور یہ رنگ و نسل اور جغرافیہ کی بناء پر اقوام کی تقسیم باطل ہو جائے مگر ابھی تک ناکام ہیں پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے ہی قدم میں اس کو کامیابی کے ساتھ حاصل کر لیا اور فرما دیا انما المؤمنون اخوۃ۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہم کو بلال حبشی بھی اُسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ابو بکرؓ و عمرؓ نظر آتے ہیں، ہر ایک دُوسرے کا احترام و عزت کرتا ہے (فاروقِ اعظمؓ حضرت بلالؓ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے تھے سیدنا بلال، یہ ہمارے سردار بلال ہیں)۔

مگر مُسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سب حکمتیں حکمت کے درجہ میں ہیں اصل علت نہیں۔ فرضِ حج کی علت محض اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اگر یہ حکمتیں نہ بھی ہوتیں جب بھی حج فرض تھا مگر اللہ و رسول کے احکام کی یہ خاص شان ہے کہ اُن میں علاوہ تکمیلِ عبدیت اور اطاعت کے انسان کی دنیوی مصالح بھی بہت ہوتی ہیں۔ جو شخص دین کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیتا ہے دُنیا خود بخود غلام بن کر آجاتی ہے۔

باب ہشتم

حدیث

جواز الشرب من السقایۃ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سقایہ (زمزم) پر تشریف لائے (یہ ایک حوض تھا جس میں لوگوں کے پینے کے واسطے زمزم کا پانی بھرا جاتا تھا) اور پینے کے لیے پانی مانگا۔ حضرت عباسؓ نے کہا اے فضل اپنی ماں کے پاس جاؤ اُن کے پاس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پانی لے آؤ (مطلب یہ تھا کہ ٹھنڈا پانی گھر سے لاؤ کیونکہ عرب میں دیر تک برتن میں رکھا ہوا پانی ٹھنڈا اور عمدہ ہو جاتا ہے)۔ حضورؐ نے فرمایا مجھے (اسی میں سے) پلا دو۔ کہا یا رسول اللہ! اس میں تو لوگ ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ فرمایا پلاؤ بھی۔ غرض اُس میں سے آپ نے پانی پیا پھر (چاہ) زمزم پر تشریف لائے جہاں لوگ پانی بھر رہے اور کام کر رہے تھے۔ فرمایا کام کئے جاؤ۔ تم اچھا کام کر رہے ہو۔ پھر فرمایا اگر یہ (اندیشہ) نہ ہوتا کہ لوگ (ہجوم کر کے) تم پر غالب آ جائیں گے تو میں (سواری سے) اُتر کر رسّی یہاں رکھتا گردن پر اشارہ فرمایا (اور خود پانی کھینچتا)۔

شرح حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جس پانی میں لوگ ہاتھ ڈالتے ہوں وہ پاک ہے اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ کسی کا ہاتھ پاک ہو کسی کا پاک نہ ہو۔ مگر آپ نے سقایہ سے پانی پی کر بتلا دیا کہ ایسے احتمالات (بلا دلیل) پر عمل نہ

کیا جائے گا۔ جب تک یہ امر محقق نہ ہو جائے کہ کسی نے ناپاک ہاتھ ڈالا ہے کیونکہ پانی اپنی ذات سے پاک ہے۔ بلا دلیل اُس کو ناپاک نہ کہا جائے گا۔ اسی لیے فقہاء نے اُن حوضوں اور مشکوں کے پانی سے وضو کو جائز کہا ہے جو راستوں پر بنے ہُوئے یا رکھے ہوتے ہیں جن سے جانور پانی پیتے ہیں اور جانوروں کی ناک کا غبار وغیرہ بھی اُن میں مل جاتا ہے اور لوگوں کے ہاتھوں اور پیروں کا میل بھی جس میں ناپاکی کا احتمال ہو سکتا ہے مگر محض احتمال اور شک سے پانی کو ناپاک نہ کہا جائے گا۔ حضرت شارح نے اس حدیث سے ماءِ مستعمل کی طہارت پر بھی استدلال کیا ہے مگر استدلال ناقص ہے کیونکہ ماءِ مستعمل وہ ہے جس میں ازالۂ حدث کی نیّت سے یا وضو اور غسل کی نیت سے ہاتھ ڈالا جائے اور یہاں ایسا نہ تھا۔ سقایہ میں عرف پینے کے واسطے ہاتھ ڈالتے تھے تو اس سے حنفیہ کے نزدیک پانی مستعمل نہیں ہوتا ہے۔

(۱۹۶) پینے کے لیے پانی مانگنا خلافِ زہد نہیں حدیث سے معلوم ہُوا کہ پینے کے لیے پانی مانگنا حضر اور سفر دونوں میں جائز ہے۔ پانی کا مانگنا اور چیزوں کے مانگنے کے برابر نہیں کہ (اُن کا سوال ممنوع ہے خاص مشروط ہی سے جائز ہے، پینے کے لیے پانی مانگنا ہر حال میں جائز ہے) بعض فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے (مگر یہ قید ضروری ہے کہ دُوسرے کے پاس حاجت سے زیادہ پانی ہو اور اس نے داموں سے نہ خریدا ہو ورنہ بدون سخت مجبوری کے پانی کا سوال بھی نہ کیا جائے)۔

نیز معلوم ہُوا کہ سبیل عام کا پانی جس کو صدقہ نہ کہا گیا ہو غنی اور فقیر سب کے لیے حلال ہے یہ (وہ) صدقہ نہیں (جو غنی پر حرام ہوتا ہے) اس میں کسی پر خاص طور سے احسان نہیں ہوتا (بلکہ وقف عام ہے سب کو اُس سے پینے کا حق ہے) دیکھو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سقایہ سے پانی پیا جس میں کچھ لوگ پانی بھر رہے اور کام کر رہے تھے مگر وہ اپنے عمل کو اللہ تعالےٰ کے واسطے کر چکے اور پانی کو اپنی

ملک سے نکال چکے تھے۔ اگر یہ بھی صدقہ کی طرح ہوتا تو آپ ہرگز نہ پیتے۔ کیونکہ صدقہ آپ پر حرام تھا اور اگر اس میں کچھ کراہت ہوتی جب بھی آپ نہ پیتے۔ مگر آپ سقایہ پر تشریف لے گئے اور اس میں سے پانی طلب کیا۔

قولہ فیہ دلیل علیٰ۔ طلب شرب الماء الی قولہ فاستسقیٰ ۔

ف۔ اس میں کوئی مسئلہ تصوف کا نہیں مگر بعضے خشک زاہد وہمی ہو جاتے ہیں۔ اُن کے وہم کا اس میں علاج ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے ایک خادم خانقاہ کے کنوئیں سے وضو نہیں کرتے کہ یہاں اکثر لوگ ننگے پاؤں باہر سے آتے ہیں اس لیے کنوئیں کے آس پاس کی زمین ناپاک ہے اور کبھی وہاں ڈول رکھا جاتا ہے اور بدوں پاک کئے کنوئیں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس لیے کنواں ناپاک ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ میاں پھر تم میرے پیچھے نماز کیسے پڑھتے ہو جب کہ میں اسی کنوئیں سے وضو کرتا ہوں۔ کہا نماز تو آپ کے پیچھے جائز ہے۔ اسی طرح بعض لوگ وقفِ عام کی چیز کے استعمال میں وہم کرتے ہیں مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کہ سقایہ اور حوض اور کنواں اور سرائے و مقبرہ وغیرہ جو مسافروں اور ہر وارد و صادر کے لیے بنائی جاتی ہے اس میں فقیر و غنی سب برابر ہیں۔ اُس کو صدقہ خاصہ پر قیاس نہ کیا جائے اور اس کی دلیل یہی حدیث ہے جو یہاں مذکور ہے۔

(۱۹۷) مردوں کے سامنے عورتوں کا نام لینا جائز ہے حدیث سے معلوم ہوا کہ

بزرگوں اور مردوں کے مجمع کے سامنے عورتوں کا تذکرہ جائز ہے۔ اس میں کچھ کراہت نہیں۔ دیکھو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہمراہیوں کے سامنے کہا کہ اسے افضل! اپنی ماں کے پاس جاؤ اور حضورؐ نے اس پر عتاب نہیں کیا بلکہ کچھ بھی نہیں فرمایا۔ آج کل بعض لوگوں کی عادت ہے کہ اگر عورتوں کا تذکرہ اُن کی زبان پر آجاتا ہے تو اس کے بعد حاشاک (توبہ توبہ) بھی

کہتے ہیں اور اس کو تہذیب سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بدعت ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی جواز ذکر النساء بحضر اھل الفضل الی قولہ بل ھو من البدع۔

ف۔ آج کل عام لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ پیروں کے سامنے اپنی عورتوں کو لے جاتے ہیں اور پیر صاحب سب کے سامنے عورتوں سے بات چیت کرتے ہیں یہ تو نہایت قبیح بدعت ہے جس کے مفاسد ظاہر ہیں اور زاہدانِ خشک کی یہ حالت ہے کہ وہ عورتوں کا ذکر بھی زبان پر لانا گوارا نہیں کرتے۔ حضرت حکیم الامتہؒ بعض دفعہ اپنے گھر والوں کی کوئی بات مجلس میں کرتے تو بعض لوگ اعتراض کرتے تھے کہ یہ وقار کے خلاف ہے۔ انہوں نے تکبر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ اور یہاں سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ پہلے زمانے کے مسلمانوں کو بردہ کا کس قدر اہتمام تھا کہ عورتوں کا ذکر بھی مردوں کے سامنے تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج کل ذکر سے تو کیا عار ہوتا ہے عورتوں کو مردوں کے سامنے لانے اور جلسوں اور جلوسوں میں لے جانے سے بھی عار نہیں۔ کیسا انقلاب ہُوا ہے؟ خدا خیر کرے نہ معلوم اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟

(۱۹۸) ٹھنڈا پانی پینا بھی خلافِ زہد نہیں حدیث سے معلوم ہُوا کہ پانی کو ٹھنڈا کرنا اور ٹھنڈا پانی پینا جائز ہے۔ حضرت عباسؓ نے اس لیے تو فرمایا تھا کہ اپنی ماں کے پاس جاؤ اور حضورؐ کے لیے پانی لاؤ۔ کیونکہ مجانہ میں تھوڑی دیر کا رکھا ہُوا پانی ٹھنڈا اور لذیذ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ جائز نہ ہوتا تو حضرت عباس ایسا نہ کہتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ بات سُن کر سکوت نہ فرماتے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اگر کسی کو اپنی ضرورت خاص طریقے سے پُوری کرنا ہو تو اُس کو وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس کی بات قبول کرنے سے کوئی مانع اسکے سوا نہ تھا کہ آپ ایک قاعدہ شرعیہ بتلانا چاہتے تھے کہ جس پانی میں لوگوں کے ہاتھ

پڑتے ہوں (اور ناپاکی کا یقین نہ ہو) وہ پاک ہے (محض وہم سے اُس کو ناپاک نہیں کہا جائے گا۔ مگر آپ نے اس وجہ کو بیان نہیں فرمایا صرف اتنا ہی فرمایا کہ اس میں سے پلادو)۔

دوسرے آپ تکلف سے بھی بچنا چاہتے تھے جو آپ کا خاص طریقہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالے عنہا فرماتی ہیں کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا گیا تو آپ ہمیشہ سہل و آسان کو اختیار فرماتے تھے جبکہ اُس میں گناہ نہ ہو اور اس میں حضرات صوفیہ کی دلیل ہے کہ وہ بھی ترک تکلف کی تعلیم دیتے ہیں۔

قوله وفيه دليل على جواز تبريد الماء الى قوله يقولون بترك التكلف۔

ف ۔ بعض زاہدوں کا خیال ہے کہ پانی ٹھنڈا پینا زہد کے خلاف ہے گرم پینا چاہیئے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سید الزاہدین صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈا پانی مرغوب تھا۔ اس واقعہ میں ایک خاص وجہ سے آپ نے مقابیہ کا پانی پیا ہے جو اُوپر تفصیل سے بیان ہو چکی۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا حکیم الامۃ سے فرمایا تھا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیئو ٹھنڈا پیئو۔ ہر بُن مو سے الحمد للہ نکلے گا اور گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی مگر دل نہ کہے گا۔ واقعی سچ فرمایا دُوسرے گرم پانی معدہ کے لیے مضر بھی ہے۔ اسی طرح پانی بہت ٹھنڈا بھی زیادہ برف سے نہ کرنا چاہیئے کہ وہ بھی اعصاب کے لیے مضر ہے۔ اعتدال ہر چیز میں افضل ہے۔

ف ۔ حضرت عائشہ کی حدیث پر ایک اشکال مشہور ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں میں اللہ تعالے کی طرف سے اختیار دیا جاتا تھا تو اس میں کسی شق کے گناہ ہونے کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر حضرت عائشہؓ نے یہ کیوں فرمایا مالم یکن اثما۔ جبکہ اُس میں گناہ نہ ہو۔ اس کا مشہور جواب یہ ہے کہ یہاں استثنٰی منقطع ہے متصل نہیں۔ علماء کے لیے یہ جواب کافی ہے اور عوام کو غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ دُوسرا جواب حضرت حکیم الامتؒ نے دیا تھا جو

جو بہت ضعیف ہے۔ مگر اس وقت باوجود تلاش کے نہیں ملا ورنہ میں اُس کو حضرتؒ ہی کے الفاظ میں لکھنا چاہتا تھا اگر کسی کو مل جائے یہاں نقل کر دے۔

(۱۹۹) جس کام میں دو پہلو ہوں اس میں دین کے پہلو کو مقدم کیا جائے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کسی کام میں ایک پہلو حظ نفس کا ہو اور دُوسرا پہلو مصلحتِ دین کا ہو اگرچہ دینی مصلحت درجۂ استحباب ہی میں ہو تو دین کا پہلو مقدم کیا جائے گا۔ کیونکہ (واقعۂ حدیث میں) ٹھنڈا پانی پینے میں تو نفس کی راحت تھی اور سقایہ سے پینے میں دینی فوائد تھے جن کا اُوپر ذکر آچکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے پہلو کو حظ نفس کے پہلو پر ترجیح دی۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدہ کی تصریح بھی فرما دی ہے۔

فقال انتم فی زمان یقدمون اعمالھم علی اھوائھم و یأتی زمان یبدؤن باھوائھم علی اعمالھم۔ آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم ایسے زمانے میں ہو جس میں مسلمان (دینی) اعمال کو اپنی خواہش (اور حظ نفس) پر مقدم کرتے ہیں اور ایک زمانہ آئے گا جس میں مُسلمان اپنی خواہش (اور نفسانی لذات) کو اعمال (دین) پر مقدم کریں گے۔ قولہ فیہ دلیل علی انہ اذا اجتمع حظ النفس وامر ما فی الدین الی قولہ یبدؤن باھوائھم علیٰ اعمالھم۔

ف۔ وہ زمانہ بھی غنیمت تھا جس میں مُسلمان اعمالِ دین بجا تو لاتے تھے گو لذاتِ نفس کے بعد ہی سہی۔ اب تو وہ زمانہ ہے جس میں لذات اور حظوظ نفس کے لیے احکامِ شرعیہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے فالی اللہ المشتکی۔ اس حدیث میں صوفیاء کی دلیل ہے کیونکہ اُن کے طریق کی بنا اسی پر ہے کہ ہر کام میں دین کے پہلو کو حظ نفس کے پہلو پر مقدم کیا جائے۔

(۲۰۰) گھر میں تصرف کی مالک عورت ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ گھر میں تصرف کی مالک عورت

ہی ہے۔ کیونکہ حضرت عباسؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا کہ اپنی ماں کے پاس جاؤ اور اُس کے پاس سے حضورؐ کے واسطے پانی لاؤ) اگر گھر میں حکومت اور تصرف کا اختیار عورت کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو یوں فرماتے کہ جاؤ خود گھر سے پانی لے آؤ یا کسی دُوسرے کو تصرف کا اختیار ہوتا تو اُس کا نام لیتے اور یہ شُبہ نہیں کیا جا سکتا کہ فضل بن عباس نابالغ ہوں گے۔ اس لیے ایسا کہا گیا کیونکہ اُن کا اس وقت بالغ عاقل ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔ وہ حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے سب سے بڑے تھے اُن ہی کے نام پر حضرت عباسؓ نے کنیت ابوالفضل تھی) اور اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ بیوی کو بھی نیک کام میں شریک کرنا مستحب ہے۔ کیونکہ جب حضرت عباسؓ کی بیوی کو یہ خبر ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مجھ سے پانی منگایا گیا ہے تو وہ برتن کی صفائی اور پانی کی عمدگی اور ستھرائی کا اہتمام کرتیں جس سے اُن کو خوشی بھی ہوتی اور ثواب بھی ملتا۔

قولہ وفیہ دلیل علیٰ ان المرأۃ ھی المتصرفۃ فیما فی البیت الیٰ قولہ فیکون لھا فی ذالک اجر صرود۔

ف۔ یہ مسئلہ دُوسری حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں والمرأۃ داعیۃ فی بیت زوجھا۔ وارد ہے کہ عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگران اور حاکم ہے۔ اس سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو صوفیاء اور علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے گھر میں بیویوں کی حکومت ہے وہی ہر تصرف کی مالک ہیں۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ شریعت کی تعلیم یہی ہے کہ گھر میں تصرف کا اختیار بیوی کے ہاتھ میں اور باہر کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہو۔ نظام اسی طرح قائم ہو سکتا ہے ورنہ عملی میں ہمیشہ گڑبڑ ہوتی ہے۔ اگر گھر کے سامان وغیرہ کا اختیار ایک کے ہاتھ میں نہ ہُوا متعدد ہاتھوں میں ہُوا تو کوئی بھی اپنے کو ذمہ دار نہ سمجھے گا اور جب کوئی ذمہ دار نہ ہُوا تو گھر کی بربادی لازم ہے اور ظاہر ہے کہ مرد سے گھر کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ اُس کو تو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کون سی چیز کہاں ہے اور کتنی مقدار میں ہے؟ اس لیے

بیوی ہی کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہونا چاہیئے کہ وہی حفاظت پُوری طرح کر سکتی ہے. پس گھر والوں میں جو شخص بھی کوئی چیز لے اُس سے پُوچھ کر اُس کو اطلاع کر کے لے تاکہ نظام درست رہے. مگر یہ جبھی ہے کہ بیوی میں انتظام اور حفاظت کا سلیقہ بھی ہو۔ بد سلیقہ کے ہاتھ میں تصرّف و اختیار دینا مناسب نہیں پھر مرد اپنے ہی ہاتھ میں اختیار رکھے یا اولاد میں سے جس کو ہوشیار دیکھے اُس کو اختیار سونپ دے فالصّٰلحٰت قٰنتٰت حٰفظٰت للغیب بما حفظ اللہ میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ عورتیں ہی مرد کے گھر کی محافظ ہیں بشرطیکہ اُن میں صلاحیت ہو.

ف ۔ حدیث سے معلوم ہُوا کہ حضرت عباس کی بیوی ام الفضل رضی اللہ عنہا گھر کے اندر تھیں مجمع میں نہ تھیں جس سے پردے کا ثبوت ہوتا ہے اور یہاں سے اُن لوگوں کے اعتراض کا بھی جواب ہوگیا جو پردہ کو عورتوں کی تذلیل و توہین سمجھتے ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام میں عورتوں کی عزت اس قدر ہے کہ گھر میں حکومت و اختیار اُن ہی کا ہے اور کسی کا نہیں اور اُن کو پردہ میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ قیمتی شئے کو چھپایا ہی جاتا ہے۔ دیکھو ہر شخص اپنی دولت کو چھپا کر تجوری میں اور تالوں میں رکھتا ہے تاکہ چور کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچے اور یقیناً عورت کی قدر و منزلت مال سے زیادہ ہے تو اُن کی حفاظت مال سے بھی زیادہ ہونا چاہیئے تاکہ بوالہوسوں کی نگاہ اُن تک نہ پہنچ سکے۔ جو لوگ اپنی عورتوں کو بے پردہ باہر پھراتے ہیں معلوم ہوتا ہے اُن کے دل میں مال کے برابر بھی اُن کی وقعت نہیں۔ یا اُن کے نزدیک دُنیا میں مال کے چور تو ہیں عورتوں کے ڈاکو نہیں مگر یہ بالکل مشاہدہ کے خلاف ہے عورتوں کے ڈاکو مال کے چوروں سے زیادہ موجود ہیں۔ جس پر وہ واقعات شاہد ہیں جو رات دن اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۲۰۱) **سوال و جواب مختصر ہونا چاہیئے** حدیث سے معلوم ہُوا کہ سوال و جواب میں اختصار ہی بہتر ہے بشرطیکہ مقصود واضح ہو جائے کیونکہ جب حضورؐ سے یہ کہا گیا کہ لوگ اس پانی

میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ آپ نے اتنا ہی فرمایا اسقنی مجھے اسی میں سے پانی دو۔ زیادہ کچھ نہیں فرمایا۔ سائل کا مطلب یہ تھا کہ اس میں گندگی کا احتمال ہے۔ مگر اُس نے بھی اس احتمال کو صاف صاف نہیں کہا۔ حضورؐ نے بھی صاف نہیں فرمایا کہ محض احتمال سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ مقصود دونوں جگہ واضح تھا)۔

قوله وفيه دليل على ان الاختصار في الجواب والسوال هو الاولى الى قوله ولم يزد على ذلك شيئا۔

ف۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے جوابات خطوط میں مختصر ہوتے تھے مگر کافی شافی ہوتے تھے۔ یہ حدیث اُن کے اس طرز کی دلیل ہے مگر ایسا اختصار نہ ہو کہ مقصود ہی واضح نہ ہو کہ وہ بلاغت کے خلاف ہے۔

(۲۰۲) کھانا کھا کر اس جگہ سے ہٹ جانا چاہیئے حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے سے فراغت کے بعد اس جگہ سے ہٹ جانا ہی سُنت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی پی کر اُس جگہ سے چل کر چاہ زمزم پر تشریف لے گئے۔ دُوسری (اس میں یہی حکمت تھی کہ) ایک نیکی کے بعد دُوسری نیکی کرنا بھی اسلامی طریقہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ نے جس جگہ پانی پیا وہاں چند احکام بیان فرمائے۔ پھر دُوسری جگہ تشریف لے جا کر دُوسری نیکی کی۔ حالانکہ دونوں مکان بظاہر برابر تھے۔ وہاں بھی لوگ پانی ہی پلا رہے تھے مگر آپ کا جانا ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے تھا (جو زمزم پر کام کر رہے تھے) اگر آپ اُن کے پاس نہ جاتے تو اُن کے دل شکستہ ہوتے کہ ہم اپنے کام کی وجہ سے حضورؐ کے دیدار اور شرف ہم کلامی سے محروم رہے) نیز (یہ بھی ہوتا کہ) لوگ سقایہ کو زمزم سے افضل قرار دیتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سقایہ پر تشریف لے گئے تھے زمزم پر نہیں گئے تھے تو آپ کا ان لوگوں کے پاس جانا دُوسری نیکی تھی (جس میں چند در چند مصالح دینیہ تھیں) پھر آپ کے اس ارشاد سے کہ "کام کرتے رہو تم اچھا کام کر رہے ہو"

یہ مسئلہ معلوم ہُوا کہ جو لوگ (اچھا) کام رہے رہے ہوں اُن کو اس عمل پر رغبت دلانا چاہیئے (اُن کا حوصلہ بڑھانا چاہیئے) تاکہ وہ نشاط کے ساتھ کام کریں۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں وتعاونوا علی البر والتقوی۔ نیکی اور تقویٰ میں ایک دُوسرے کی مدد کرو (اور مدد میں یہ بھی داخل ہے کہ اُس کام کی فضیلت بیان کی جائے جو دُوسرا کر رہا ہے) مگر کام کرنے والے کی مدح کرنا اس کے خلاف ہے (وہ مناسب نہیں) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی نے ایک شخص کی مدح اُس کے مُنہ پر کی تھی تو آپؐ نے فرمایا قطعتم ظھر الرجل تم نے تو اُس کی کمر توڑ دی کیونکہ ذات کی مدح کرنے سے بعض دفعہ دُوسرے میں عجب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سم قاتل ہے۔ کام کی تعریف میں یہ مفسدہ نہیں بلکہ اس سے تو دُوسرے کو عمل کی رغبت بڑھتی ہے۔ مثلاً تم کسی کو روزہ رکھتے دیکھو تو اُس کے سامنے روزے کے فضائل بیان کر دو یا جہاد کرتے دیکھو تو جہاد کے فضائل بیان کر دو۔ جو (قرآن و حدیث میں) وارد ہوئے ہیں اس سے اُس کو اپنے کام میں تقویت حاصل ہوگی اور حضورؐ کا ان لوگوں کے کام کو عمل صالح فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو اس پر ثواب ملے گا کیونکہ کسی عمل کا صالح ہونا یہی ہے کہ اُس پر ثواب مرتب ہو۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان من السنۃ الانصراف عند الفراغ من الشرب والاکل الی قولہ فائدتھا ما یترتب علیھا من الثواب۔

ف۔ کھانے پینے کے بعد اس جگہ سے ہٹ جانا اس لیے سُنّت ہے تاکہ دُوسروں کو معلوم ہو جائے کہ بس کھا پی چکے وہیں جم کر بیٹھنے سے شُبہ ہوگا کہ شاید ابھی نیت نہیں بھری کچھ کسر باقی ہے اور اگر اپنا گھر نہیں، دُوسرے کا گھر ہے تو وہاں جم کر بیٹھا رہنے سے اُس کے کاموں کا حرج ہوگا۔ ممکن ہے اب اُس کے گھر والے اسی جگہ کھانے کا ارادہ رکھتے ہوں تمہارے بیٹھے رہنے سے اُن کو تکلیف ہوگی۔ البتہ اگر اپنا گھر ہے اور وہ جگہ تمہارے بیٹھنے کے واسطے مخصوص ہے وہاں سے پانی پی کر ہٹ کر ضروری نہیں۔ کیونکہ وہاں سے ہٹ کر پھر اُسی جگہ آؤ گے جب کہ وہ جگہ

بیٹھنے ہی کے واسطے مخصوص ہے ۔ قرآن میں واذا طعمتم فانتشروا (جب کھانا کھا چکو تو چل دو) دُوسرے کے گھر کے متعلق ہے ۔ البتہ اگر گھر والا کھانے کے بعد بھی روکتا چاہے تو پھر وہاں بیٹھنے کا مضائقہ نہیں کیونکہ اب اُس کے حرج اور تکلیف کا اندیشہ نہیں رہا اور حدیث میں پانی پی کر ہٹ جانا اسی جگہ کے متعلق ہے جہاں اور لوگ بھی پانی پینے آتے ہیں ۔ ایسی جگہ یہی چاہیئے کہ جو پی چکے وہ دُوسروں کے لیے جگہ خالی کر دے ۔ یہ آداب معاشرت ہیں جو مسلمانوں کے گھر کی دولت ہے ۔ مگر افسوس اب مسلمان اس سے بالکل بے خبر ہیں کہ اُن کی شریعت نے معاشرت کے متعلق کیسے عجیب وغریب اصول بتلائے ہیں ۔

ف ۔ ایک نیکی کے بعد دُوسری نیکی کرنا یہ بھی اسلامی اصول ہے تاکہ انسان برابر ترقی میں رہے ۔ صُوفیاء کو اس کا خاص اہتمام ہے ۔ آج کل کے صُوفیاء کو بھی اس سے سبق لینا چاہیئے ۔

ف ۔ کسی کی تعریف سامنے کرنا منع ہے جبکہ اُس میں عجب پیدا ہونے کا خطرہ ہو ۔ پیچھے تعریف کرنا منع نہیں کہ اس سے محبت واتفاق بڑھتا ہے ۔

(۲۰۲) اگر کسی مُستحب پر مفسدہ مرتب ہونے کا اندیشہ ہو اُسے ترک کردیا جائے

جو کام فرض نہ ہو بلکہ مُستحب ہو اور اُس کے کرنے پر کسی مفسدہ کے مرتب ہونے کا اندیشہ ہو یا یہ معلوم ہو کہ لوگ مجھے یہ کام نہ کرنے دیں گے تو اس کا چھوڑ دینا جائز ہے ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا ہے کہ اگر لوگوں کے ہجوم کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اپنی گردن پر رسّی رکھ کر زمزم کا پانی کھینچتا (اور لوگوں کو پلاتا) یعنی آپ نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ لوگ آپ کو ایسا نہ کرنے دیں گے ۔ رسّی کھینچنے کے لیے سب ٹوٹ پڑیں گے ۔ پھر ممکن ہے ہجوم سے کسی کے چوٹ لگ جاتی ۔ قولہ وفیہ جواز ترک العمل مالہ یکن فرضا الی قولہ فیہ اذی ۔

ف۔ صوفیاء محققین کا اس پر پُورا عمل ہے کہ تم دیکھو گے انہوں نے سماع مباح کو اس لیے ترک کر دیا کہ اُس میں مفاسد کا خطرہ ہے۔ چنانچہ بزرگوں کے سماع مباح کے واقعات سُن کر لوگوں نے مزامیر و معازف کے ساتھ سماع شروع کر دیا۔ اور صوفیاء چشتیہ کو بدنام کرنے لگے کہ اُن کا سماع ایسا ہی تھا حالانکہ وہ اُس کی حرمت کی تصریح کر رہے ہیں اور سماع مباح کے لیے سخت شرطیں بیان کرتے ہیں جن کی رعایت آج کل کہاں ہے؟ اسی طرح محققین صوفیاء نے اپنے بزرگوں کا عُرس بھی موقوف کر دیا کہ لوگوں نے اُس کو آمدنی کا ذریعہ بنا لیا ہے اسی طرح توجہ کا حلقہ بھی موقوف کر دیا کہ آج کل اس میں منافع سے زیادہ مفاسد ہیں۔

(۲۰۴) اہلِ برکت سے برکت حاصل کرنا چاہیئے یہاں سے معلوم ہُوا کہ اہلِ برکت سے برکت حاصل کرنا مطلوب ہے۔ کیونکہ لوگ رسول اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رسّی کو اسی لیے تو پکڑتے کہ اُن کو آپؐ کے ساتھ لگنے سے برکت حاصل کرنے کا شوق تھا قاعدہ ہے کہ جب کریم اپنے محبوب کا عمل قبول کرتا ہے اُس کے ساتھ شریک ہونے والوں کو بھی محروم نہیں کرتا اور کیسے محروم کر دیں وہ تو خود فرماتے ہیں هم القوم لا یشقیٰ جلیسهم۔ یہ وہ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا محروم نہیں رہتا۔ جب پاس بیٹھنے کا یہ ثمرہ ہے تو کسی عمل میں اُن کے ساتھ شریک ہونا کیا کچھ ہو گا؟ (اور حدیث میں اس شوق و رغبت پر انکار نہیں کیا گیا صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کے اس شوق کی وجہ سے حضورؐ اپنا شوق پُورا نہ کر سکیں گے اور ہجوم سے کسی کی تکلیف کا بھی خطرہ تھا) اور یہاں سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بزرگوں سے اس اُمید پر ہر حالت میں ملنے ملانے کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ اُن سے فضل سے کچھ حصہ مل جائے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے تو اُن کو رحمت ہی رحمت بنایا ہے ہم کو چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کی اس رحمت کو غنیمت سمجھیں (اور اہلِ فضل سے فیض حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کریں مگر اس کا لحاظ رکھا جائے کہ کسی کو یا اُن کو ہجوم سے ایذا نہ پہنچے ورنہ وہ خود اس

کا اہتمام کریں گے کہ ہجوم نہ ہونے پائے۔ جیسا واقعۂ حدیث میں حضورؐ نے ہجوم سے بچنے کے لیے اُس عمل کو چھوڑ دیا جس کا ارادہ کیا تھا) اسی لیے صُوفیاء کا درجہ دُوسروں سے بڑھا ہُوا ہے کیونکہ وہ ایک دُوسرے سے اچھا گمان رکھتے ہیں (ہر ایک دُوسرے سے فیض حاصل کرنے کا طالب ہوتا ہے) میں اُندلس کی ایک بستی میں جس کا نام بلفیق ہے جو بابرکت بزرگ شیخ ابواسحٰقؒ کا وطن ہے اللہ تعالےٰ اُن سے امثال سے نفع پہنچائے گیا تو وہاں یہ دستور دیکھا کہ جب کسی کے متعلق کسی سے دریافت کیا جاتا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں تو ہر شخص اس طرح جواب دیتا کہ سیدی فلاں نفع اللہ بہٖ فی الموضع الفلانی۔ وہ ہمارے سردار اللہ اُن سے نفع پہنچائے فلانی جگہ پر ہیں۔ یہ تو غایت تعظیم کا حال تھا کہ کسی کا نام بھی بدون سیدی اور نفع اللہ بہٖ کے نہ لیتے تھے، مگر سامنے بجز سلام شرعی کے کچھ نہ تھا اور اگر اُس کو پکارتے تو نام لے کر پکارتے اور (سیدی وغیرہ) کچھ نہ بڑھاتے۔ میں نے مُدت تک اپنے قیام کے زمانہ میں سب کا یہی برتاؤ دیکھا۔ اور اس میں ذرا بھی تغیر نہ پایا۔

قولہ وفیہ دلیل علیٰ طلب التبرک بالمبارکین الیٰ قولہ لم یتغیر واعنہ۔

ف۔ شاید کسی کو اس جگہ یہ خیال ہو کہ یہ لوگ بڑے بدتمیز تھے کہ اپنے بزرگوں کو نام لے کر پکارتے تھے تو اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اہل عرب اس کو بدتمیزی شمار نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے بادشاہوں کو بھی نام لے کر پکارتے تھے۔ مکہ میں شریف حسین مرحوم کے زمانے تک یہ دیکھا گیا کہ اہل عرب اُن کو یا شریف حسین کہہ کر پکارتے تھے۔ اب دُوسری قوموں کی دیکھا دیکھی اُن میں بھی تکلف آگیا اور جلالۃ الملک کہہ کر بادشاہ سے بات کرتے ہیں مگر مجمع میں بھی مجمع کی برابر تکلف نہیں آیا۔ اصل تہذیب یہی ہے کہ پیچھے تعظیم کی جائے۔ دُوسرے کے سامنے اپنے بزرگوں کو تعظیمی الفاظ سے یاد کریں۔ سامنے تعظیمی الفاظ سے خطاب کرنے میں ایک قسم کی اجنبیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے قدیم اہل عرب اپنے بڑوں کے سامنے بے تکلف بات کرتے نہ زیادہ تعظیمی الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ پیچھے کسی کے سامنے نام لیتے تو بہت تعظیم سے لیتے تھے۔

آج کل معاملہ برعکس ہے کہ سامنے تو بہت تعظیم ہے اور پیچھے اعتراض ہے۔ البتہ اہلِ محبت سامنے اور پیچھے یکساں رہتے ہیں مگر آج کل اہلِ محبت کہاں؟ قلیل ما ہم: آج کل تو اکثر اہلِ غرض ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

ف ۔ ہمارے اکابر بھی یہی طرز تھا کہ جس مستحب کام سے لوگوں کا ہجوم زیادہ ہوتا اُس کو چھوڑ دیتے تھے۔ کیونکہ ہجوم میں پریشانی بہت ہے۔ آنے والوں کو بھی اور خود کو بھی۔ اسی لیے حضرت حکیم الامتؒ بعد وعظ کے معافحہ سے گھبراتے تھے کہ اس میں ہجوم بہت ہوتا تھا۔ پھر اس مستحب کے اہتمام میں کسی کی تکلیف کا خیال ہوتا ہے نہ راحت کا۔ بعض لوگوں کے چوٹ لگ جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت نے تراویح میں قرآن سُنانا بھی اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ حضرت کا قرآن سُننے کو لوگ دُور دُور سے آتے تو خانقاہ میں ہجوم بہت ہو جاتا تھا آخر عمر میں ختم قرآن گھر پر کرتے تھے۔

(۲۰۵) اشارہ کنایہ سے بات کرنا خلافِ تہذیب نہیں

حدیث سے معلوم ہُوا کہ اشارہ سے بات کرنا بھی جائز ہے اور یہ عیب میں داخل نہیں۔ نہ بزرگی کے خلاف ہے نہ اُس سے بزرگوں کے درجہ میں کوئی نقصان یا خلل واقع ہوتا ہے نہ اس میں کوئی اعتراض کی بات ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گردن مبارک پر اشارہ فرمایا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اعتبار معانی کا ہے۔ الفاظ کا نہیں اور اس میں اہلِ اشارات کی دلیل ہے۔ یعنی حضرات صوفیاءؒ کی کہ وہ بھی اپنے کلام میں اشارات استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اشارات ہی سے خفی اور نازک بات کو سمجھنا چاہیئے (جس سے مخالف تو مطلب سمجھ جاتا ہے اور نا اہل کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ نا اہل کو ان باتوں سے دُور ہی رکھنا چاہیئے)۔ وفیہ دلیل علی الکلام بالاشارۃ الیٰ قولہ وان الابلاغ فیھا فیما خفی ودق۔

ف ۔ حدیث میں تو اشارہ محسوس پر ہے مگر اس سے مضامین دقیقہ پر اشارہ بھی جائز ہو گیا کیونکہ اصل علت میں اشتراک ہے اور صوفیاء کے اشارات کی دلیل

خود فقہاء کے کلام میں موجود ہے۔ انھوں نے دلالت کلام کی چار قسمیں بتلائی ہیں۔ عبارۃ النص۔ اشارۃ النص۔ اقتضاء النص اور دلالۃ النص۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ صوفیاء اپنے کلام میں اشارات بھی استعمال کرتے ہیں تو اب ہر کس و ناکس کو اُن کی کتابوں کا دیکھنا جائز نہیں۔ صرف اسی کو اُن کا مطالعہ جائز ہے جو اُن کی اصطلاحات و اشارات کو بخوبی سمجھتا ہے۔ شیخ ابن عربیؒ نے تصریح کی ہے کہ نااہل کو ہماری کتابوں کا مطالعہ حرام ہے۔

(۲۰۲) **تحقیق اخفاء و اظہارِ عمل مستحب** یہاں ایک سوال ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم (سے پانی بھرنے) والوں کو تو فرمایا کام کئے جاؤ تم اچھا کام کر رہے ہو اور نماز گھر کے بارے میں فرمایا ہے کہ گھر میں نماز پڑھنا (مسجد میں نماز پڑھنے سے) افضل ہے بجز فرض کے کہ اُس کا مسجد میں جماعت سے ادا کرنا افضل بلکہ ضروری ہے۔ سوال کا حاصل یہ ہے کہ زمزم کا پانی بھرنا بھی تو عمل مستحب ہے اس سے اخفاءً کا حکم کیوں نہ دیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ جن مستحبات و نوافل کو اظہار و اخفاء دونوں ہی طرح کیا جاسکے وہاں تو اخفاء افضل ہے اور جن مستحبات کی صورت وضع ایسی ہے کہ اخفاء کے ساتھ اُن کو ادا نہیں کرسکتے جیسے لوگوں کو پانی پلانا اور علم دین کا درس دینا اور جہاد کرنا (جبکہ فرض عین نہ ہُوا ہو) وغیرہ وغیرہ۔ وہاں فضیلت کا مدار نیّت کی درستی پر ہے (اخفاء پر نہیں کیونکہ وہ کام اخفاء کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دوسری حدیث میں) فرماتے ہیں: اوقع اللہ اجرہ علی قدر نیتہ۔ اللہ تعالیٰ اُس کو اس کی نیّت کے موافق ثواب دیتے ہیں (نیّت میں جس قدر خلوص ہوگا اسی قدر ثواب ہوگا) اہلِ سلوک کو اسی بات کی وجہ سے دُوسروں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے اعمال میں ترقی کے پہلو پر نظر رکھتے ہیں خواہ نیّت سے ترقی ہو یا بات سے ہو یا عمل سے ہو یا زمانہ کی برکت سے ہو یا جگہ (کی فضیلت) سے ہو یا

مجموعہ سے ہو۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کفیٰ بالعبادۃ شغلا (انسان کے لیے) عبادت کا شغل کافی ہے (اس شغل کے ساتھ دُوسرے اشغال جمع نہیں ہو سکتے) کیونکہ اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو دُنیا میں تاجر کی ہوتی ہے۔ جس طرح اس کو ہر وقت مال کے بڑھانے کی دُھن ہوتی ہے اسی سوچ اور فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح مال کو بڑھایا جائے۔ اسی طرح اہل معاملات کی حالت اپنے مولیٰ کے ساتھ ہے۔ اُن کو بھی رضاء حق کے سوا کوئی شغل نہیں نہ اُس کے بغیر اُن کو چین آتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ جس آنکھ نے آپ کو نہیں دیکھا اُس نے کسی دل خوش کرنے والی چیز کو نہیں دیکھا اور جس آنکھ نے آپ کو دیکھ لیا وہ کسی ناگوار چیز کو نہ دیکھے گی۔ آپ کی تجلی جلال (کا مُشاہدہ) اُس کی کسر کو پُورا کر دیتا ہے (یعنی کسی ناگوار چیز کے دیکھنے سے اگر طبعی ناگواری ہوتی بھی ہے تو اس میں تجلی جلال بھی تو ہوتی ہے اور آپ کی ہر تجلی محبوب ہے خواہ بصورتِ جمال ہو یا بصورتِ جلال ہو ؏

اُن کو آتا ہے پیار پر غُصّہ ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

جیسے آسمان کی بارش زمین کی خُشکی کو دُور کرتی ہے (تو اُس کی گرج اور کڑک سب ہی گوارا ہوتی ہے اسی طرح تجلی جلال سے زمین قلب کو جو زندگی اور شادابی نصیب ہوتی ہے وہ ظاہری ناگواری کو گوارا بنا دیتی ہے) قسم ہے آپ کے علم کی حرمت کی جس کے سامنے میرا ضعف ظاہر ہے کہ آپ کا لطف ہی میری بدحالی کی شکستگی کو جوڑنے والا ہے۔ قوله وهمنا بحث وهو لمه قال لا اصل نعزم اعملوا الی قوله جبرلو حب جالها۔

ف ۔ یہ شُبہ نہ کیا جائے کہ صُوفیاء چشتیہ ذکر جہر کی تعلیم دیتے ہیں۔ بعض دفعہ تسبیح ہاتھ میں رکھنے کی کہتے ہیں حالانکہ ذکر تو آہستہ بھی ہو سکتا ہے بدون تسبیح کے بھی ہو سکتا ہے تو یہاں اظہار سے اخفاء افضل ہونا چاہیئے۔ جواب یہ ہے کہ اگر ذکر سے ثواب ہی مقصود ہو تو یقیناً ذکر خفی ذکر جہر سے افضل ہے بجز اُن مواقع

کے جہاں شریعت نے جہر مشروع کیا ہے، لیکن چشتیہ ذکر جہر محض ثواب کے لیے نہیں بتلاتے بلکہ ذکر کو قلب میں پیوستہ کرنے کے لیے بتلاتے ہیں اور تجربہ ہے کہ یہ مقصود بدون جہر کے جلدی حاصل نہیں ہوتا جیسے ایک شخص قرآن حفظ کرنے کے واسطے سبق یاد کر رہا ہو تو اُس کا مقصود محض ثواب نہیں بلکہ ثواب کے ساتھ حفظ کرنا بھی مقصود ہے تو وہ اخفاء کے ساتھ سبق یاد نہ کرے گا بلکہ جہر سے کرے گا۔ کیونکہ آہستہ پڑھنے سے یاد نہیں ہوتا یا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ پس نفس جہر میں خود کوئی ثواب نہیں جبکہ شرعاً جہر کا امر نہیں بلکہ وہ ذکر کو دل میں پیوستہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور ذکر کا دل میں جمانا مطلوب و محمود ہے تاکہ کسی وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ غفلت نہ ہو اور قاعدہ ہے کہ مطلوب کا مقدمہ بھی مطلوب ہوتا ہے اس طرح یا بواسطہ جہر بھی محمود اور موجب ثواب ہوگی۔ جیسا حفظ کرنے والے کا جہر محمود اور موجب ثواب ہے اسی طرح تسبیح ہاتھ میں رکھنا خود کوئی ثواب کا کام نہیں بلکہ وہ دل کے لیے مذکر ہے۔ تسبیح ہاتھ میں رہنے سے قلب ذکر یا نہ کو در کی طرف متوجہ رہتا ہے اور توجہ الی اللہ مطلوب ہے تو اُس کا مقدمہ اور ذریعہ بھی بواسطہ مطلوب ہو جائے گا۔ خوب سمجھ لو۔

ف - درس و تدریس اور وعظ و تقریر اور تحریر وغیرہ میں نیت درست کر نا ضروری ہے تاکہ ثواب سے محروم نہ ہو۔ درس و تدریس اور وعظ وغیرہ میں تبلیغ احکام کی نیت کی جائے۔ اگر ان کاموں کے لیے ملازمت کی جائے تو محض تنخواہ کی نیت نہ کی جائے کہ وہ تو ہر حال میں ملے گی۔ نیت یہ کی جائے کہ میں دین کی اشاعت اور تبلیغ کے واسطے یہ کام کر رہا ہوں اور تنخواہ اس واسطے لیتا ہوں تاکہ دل جمعی اور بے فکری سے اس فرض کو ادا کر سکوں۔

باب ہشت دیگ

حدیث

تقدیم صلوٰۃ الفجر بالمزدلفۃ یوم النحر

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نماز بے وقت پڑھتے نہیں دیکھا سوا دو نمازوں کے۔ آپ نے (مزدلفہ میں) مغرب و عشاء کو جمع کیا اور فجر کی نماز بھی وقت سے پہلے پڑھی اور یہ حج کے موقعہ پر ہوا۔

شرح ظاہر حدیث سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں نمازیں اپنے وقت پر نہیں ہوئیں مگر واقعہ میں ایسا نہیں کیونکہ مغرب کی نماز تو عشاء کے وقت میں پڑھی گئی تھی لیکن فجر اپنے وقت پر ادا کی گئی مگر چونکہ اُس دن حضورؐ نے نماز فجر صبح ہوتے ہی پڑھی تھی جو آپ کی عادتِ معروفہ کے خلاف تھا تو صحابی نے اُس کو بے وقت کہہ دیا مطلب یہ تھا کہ جس وقت کی عادت تھی اس سے پہلے نماز پڑھی (جس سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے کہ حضورؐ کی عادت نمازِ فجر میں اسفار کی تھی اور وہ جو بعض احادیث میں آیا ہے کہ آپ فجر کی نماز غلس میں پڑھتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ اسفار نہ کرتے تھے بلکہ ایسے وقت نماز پڑھتے تھے کہ مسجد کے اندرونی حصہ میں تاریکی اور بیرونی حصہ میں روشنی ہوتی تھی)۔

(۲۰۷) مسائل دینی کا تذکرہ تکرار بھی دین ہے اگرچہ مسئلہ مشہور ہی

کیوں نہ ہو یہاں سے معلوم ہوا کہ دین کے احکام کا تذکرہ اور اُن میں گفتگو کرنا بھی دین ہے۔ اگرچہ حکم ظاہر ہو سب کو معلوم ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز کی کیفیت مشہور تھی آج تک بھی اسی کے موافق عمل ہو رہا ہے مگر پھر بھی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ کیا۔ میں بعض بزرگوں سے ملا ہوں جو علم و عمل میں اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ جب کبھی وہ کسی مجلس میں جمع ہوتے تو اُن کی بات چیت مسائل دین ہی میں ہوتی تھی وہ بھی مشکل مسائل میں نہیں نہ باطنی حالات میں گفتگو ہوتی تھی) اس کے سوا اور کوئی بات نہ کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہ اور سلف صالحین سے منقول ہے کہ وہ جب آپس میں ملتے تو کہتے آؤ کچھ دیر ایمان کی باتیں کریں یعنی مسائل دین میں گفتگو کریں۔ کیونکہ دُنیا کی ہر چیز کی حالت یہ ہے کہ اُس میں جب زیادہ گفتگو ہوتی ہے تو بعض وقت دل اُکتا جاتا اور پریشان اور تنگ ہو جاتا ہے۔ مگر ایمان اور اُس کے فروع اور اہلِ ایمان کے حالات میں گفتگو سے اہلِ تحقیق کے نزدیک ایمان بڑھتا ہے (اس لیے وہ کسی وقت بھی اس سے دل تنگ نہیں ہوئے) جیسے علم کو جتنا بھی خرچ کرو بڑھتا ہی ہے علم کے سوا دُوسری چیزوں کو خرچ کرو تو وہ گھٹتی ہے۔

پس تم ایسا راس المال (اور سرمایہ) لے لو جو خرچ کرنے سے بڑھتا ہے ترقی کرتا ہے اور دُوسروں کو بھی اُس سے فائدہ اور غنا حاصل ہوتی ہے اور تمہارا سرمایہ ذرا بھی کم نہ ہو۔ اسی لیے بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ علم ربانی عطیہ ہے۔ علماء تم کو ایک چیز پوری کی پوری دے دیتے ہیں اور اُن کے خزانے میں اس سے کچھ کمی نہیں آتی۔ کیونکہ جب کوئی تم کو علم دیتا ہے تمہارے پاس اُس کے علوم و معارف سب ہی آجاتے ہیں۔ مگر اُس کے پاس جو علم تھا اُس میں کمی نہیں آتی بلکہ اُس میں ایک نئی قسم کی ترقی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ علمی تذکرہ سے خود عالم کو بھی پہلے سے زیادہ تنبہ ہو جاتا ہے اور ثواب زیادہ علاوہ الگ رہا جو سب چیزوں سے بڑھ کر ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان من الدین ذکر الحکم فی الدین الی قولہ الذی ھو خیر من الکل۔

ف ۔ صوفیاء اور علماء کو چاہیے کہ اپنی مجلسوں کو علمی و اصلاحی تذکرہ سے خالی نہ رکھیں سلف کا طریقہ یہی تھا۔ آج کل بعض علماء کی حالت یہ ہے کہ اُن کی مجلس میں بجز اِدھر اُدھر کے قصّوں یا سیاسی جھگڑوں کے اور کچھ نہیں ہوتا یہ حالت تنزلِ دین کی علامت ہے عارف کا تو یہ حال ہونا چاہیئے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہم نے اپنے اکابر کی مجلسوں میں بجز علمی و اصلاحی گفتگو کے فضول قصے نہیں دیکھے الا نلوار والنادر کالمعدوم ۔

(۲۰۸) روایت ہی سے قطع حجت اور تسلی کامل ہوتی ہے

یہاں سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ احکامِ دین کا روایت کرنا خصم کی حجت کو زیادہ قطع کرنے والا ہے۔ اگرچہ اُس پر عملدرآمد ہو رہا ہو اور سب کو اس کا علم ہو کیونکہ روایت ہی سے تو یہ معلوم ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اسی طرح تھا جس طرح عمل ہو رہا ہے۔ پھر ایک دُوسرے سے نقل در نقل ہوتا رہے گا (تو ساری اُمت کو قیامت تک یہ علم ہوتا رہے گا) اگر امام عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس حدیث کو بیان نہ فرماتے اگرچہ عمل اُس کے موافق ہو رہا ہے تو ہم کو کس طرح یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت یہی ہے کوئی مخالف اگر اس کا انکار کرتا تو ہم اُس کو کیا جواب دیتے یا خود ہمارا دل حقیقتِ حال پر مطلع ہونا چاہتا تو کیونکر تسلی ہوتی ؟ کسی نے خوب کہا ہے کہ دین میں کوشش کرتے رہو اور اُس کو بدون کسی اصل کے نہ لو اور وہ کتاب اللہ ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک ثقہ دُوسرے ثقہ سے روایت کرتا ہے اور اجماع اور قیاس بشرطیکہ تم شرعاً قیاس سے متصف ہو اور ان کے سوا پانچواں کوئی طریق معتدل نہیں۔ قولہ وفیہ من الفقہ ان روایتہ الی قولہ لیس طریقہ بالعدل ۔

ف - یہاں سے صوفیاء زمانہ کو سبق لینا چاہیئے جو علم کتاب وسُنّت واجماع و قیاس حاصل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ تو علم شریعت ہے اور ہمارا علم طریقت سینہ بہ سینہ ہے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سینہ بہ سینہ بجز نسبت باطنہ کے کچھ نہیں اور نسبت باطنہ بدون علم وعمل کے حاصل نہیں ہوتی اور علم احکام سینہ بہ سینہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔ بزرگوں کا ارشاد ہے۔ ما اتخذ اللہ من ولی جاھل۔ اللہ تعالیٰ نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا ہے اور جن صوفیاء کو اَن پڑھ کہا جاتا ہے وہ جاہل نہ تھے بقدر ضرورت علم دین اُن کو حاصل تھا خواہ کتابوں سے یا صحبت علماء سے۔ اس کے بعد ہی اُن کا عمل کامل ہوا اور عمل کامل سے نسبت باطنہ اُن کے قلب پر فائض ہوئی۔ پس جو عمل کسی آیت یا حدیث یا اجماع یا قیاس سے ثابت نہ ہو اس کو رد کیا جائے گا احکام الٰہیہ سینہ بہ سینہ حاصل نہیں ہو سکتے اور یہاں سے اُن علماء کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو بدون شرط قیاس کے اپنے کو مجتہد سمجھ بیٹھتے ہیں۔ قیاس کے لیے علاوہ دیگر شرائط کے ایک بڑی شرط کمال ذوق عربیت ہے کیونکہ قرآن کریم عربی فصیح معجز میں نازل ہوا ہے۔ جس کو سب سے زیادہ سمجھنے والے وہی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے قریب تھے کہ اس وقت تک ذوق عربیت پوری طرح محفوظ تھا۔ تفسیر سلف کو چھوڑ کر آج کل جو نئی نئی تفسیریں قرآن کی کی جاتی ہیں یقیناً تحریف میں داخل ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے

ایک مفسّر کا ردّ جس نے واقعۂ معراج میں تحریف کی ہے

ایک مفسر نے سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصٰی کی تفسیر میں لکھا ہے کہ معراج جسمانی نہ تھی نہ محض خواب تھا بلکہ ایک درمیانی کیفیت تھی جو نبوت کے ساتھ مختص ہے جس کی حقیقت ہم بیان نہیں کر سکتے۔ مگر اُس کو یہ عقل نہ آئی کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ معراج کو مکہ والوں کے سامنے بیان کیا اور ان آیات کو پڑھا اُس وقت

اہلِ مکہ نے اُس سے کیا سمجھا تھا ؟ یقیناً سب نے قرآن کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے معراج جسمانی ہی سمجھا تھا اسی لیے تو استہزا کیا۔ اور مضحکہ اُڑایا اور بیت المقدس کا نقشہ دریافت کیا اور اُن قافلوں کا حال پُوچھا جو مکہ سے شام کی طرف گئے تھے اور جس وقت حضرت ابو سفیانؓ سے ہرقل نے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ؟ اُنھوں نے جواب دیا ھو ماثب الرائی فینا غیر انا انکر ما منه شیئا کہ وہ بڑے صائب الرائے ہیں لیکن اُن کی ایک بات ہم کو اوپری معلوم ہوئی پُوچھا وہ کیا ؟ کہا وہ کہتے ہیں کہ میں ایک رات مکہ سے بیت المقدس گیا وہاں سے آسمانوں پر گیا پھر صبح سے پہلے گھر واپس آگیا۔ یہ بات ہماری عقل میں نہیں آئی اس پر بیت المقدس کے پادری نے کہا وہ سچ کہتے ہیں مجھے وہ رات معلوم ہے جس میں وہ بیت المقدس تشریف لائے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ حلبیہ وغیرہ۔ غرض تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام مشرکین نے جو قرآن کے اوّل مخالف تھے قرآن سے اور رسول اللہ کے بیان سے معراج جسمانی ہی سمجھا اسی وجہ سے انکار کیا اسی لیے نشانات دریافت کئے۔ اگر معراجِ جسمانی کا دعویٰ نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی فرمادیتے جو آج چودھویں صدی کا نیا مفسّر کہتا ہے کہ معراجِ جسمانی کا مجھے دعویٰ نہیں بلکہ یہ ایک خاص کیفیت ہے جو نبی کے ساتھ مختص ہے تم اس کو نہیں سمجھ سکتے ؟ آپ کو بیت المقدس کا نقشہ بتلانے اور قافلوں کی حالت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ دُنیا جانتی ہے کہ حضرت صدیق اکبر کو لقب صدیق اُسی دن دیا گیا جب اُنھوں نے معراج کی تصدیق کی جبکہ بہت سے ضعفاء اس بات کو سُن کر مرتد ہوگئے تھے۔ اگر اس نئے مفسر کی تفسیر کو صحیح مان لیا جائے تو اُس کی تصدیق میں کچھ بھی کمال نہ تھا نہ ضعفاء کو ارتداد کی نوبت آنے کی کوئی وجہ تھی۔ نہ مشرکین کو استہزا اور مضحکہ کا کوئی موقعہ تھا۔ مگر خدا ناس کرے اس مرعوبیت کا کہ آج کل دُوسروں کے اعتراض سے خوفزدہ ہوکر مسلمانوں کے نئے مفسّر قرآن ہی کو بدلنے لگے اور اُس میں ایسی تحریفیں کرنے لگے جو قواعد عربیت کے خلاف اور اہلِ عرب کی فہم سے بہت دُور ہیں۔

باب ہشت و دو دوم ۸۲

حدیث

الصدقۃ بجلال البُدُون وجلودہا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اُن اونٹوں کی جھولوں اور کھالوں کو صدقہ کردوں جو (حج کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) قربانی میں نحر کئے گئے تھے۔

شرح ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ قربانی کے اُونٹوں کی جھولوں اور کھالوں کے صدقہ کا حکم کیا گیا۔ اس پر چند سوالات ہیں ایک یہ کہ یہ امر وجوب کے لیے تھا یا استحباب کے لیے؟ دُوسرے حضرت علیؓ کے اس بات کے بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ تیسرے اس میں کیا حکمت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اس حکم کے لیے مخصوص کیا؟

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ امر استحباب کے لیے ہے وجوب کے لیے نہیں۔ کیونکہ خود قربانی کے گوشت کا صدقہ کرنا واجب نہیں جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے تو جھول اور کھال اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ دُوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بات کو اس لیے بیان کیا کہ یہ مسئلہ معلوم ہو جائے کہ صدقہ کرنے میں کسی کو نائب بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ حضرات صحابہؓ کو اس سے خاص فرحت اور فخر ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن

کوکسی بات کے ساتھ خاص طور سے خطاب فرمائیں۔ دیکھو حضرت علیؓ کو اپنے سب ناموں میں زیادہ محبوب ابوتراب تھا کیونکہ یہ کنیت حضورؐ نے دی تھی۔ نیز حکم کی پہنچ بھی مقصود ہے کہ یہ مسئلہ کسی کے واسطہ سے نہیں بلکہ میں نے بلاواسطہ حضورؐ سے سُنا ہے اور بذاتِ خود اُس کو معلوم کیا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اس حکم کے ساتھ اس لیے مخصوص فرمایا کہ اُن کو علم زیادہ تھا اگرچہ حضرات خلفاء سبھی علماء تھے۔ لیکن حضرت علیؓ کو وجوہ خیر میں سے اس خیر میں فضیلت حاصل تھی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انا مدینۃ العلم وعلی بابھا میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ نیز یہ بھی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کے اُونٹوں کے نحر کرنے میں نائب کیا تھا۔ (کیونکہ آپ نے سو اُونٹوں میں تریسٹھ تو خود اپنے ہاتھ سے نحر کئے تھے بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا تھا کہ وہ نحر کریں تو کھالوں اور جھولوں کے صدقہ میں بھی اُن ہی کو نائب کر دیا گیا۔ ھذہ خلاصۃ ماذکرہ الشارح لخ مترجم)

(۲۰۹) اگر کسی کو کسی دینی کام میں نائب کیا جائے تو عالم اور قرابت دار کو مقدم کیا جائے اس سے معلوم ہوا کہ قربانی اور صدقہ وغیرہ میں (اگر کسی کو نائب کرنے کی ضرورت پڑے تو) مستحب یہ ہے کہ کسی عالم کو نائب کیا جائے کہ یہ بھی قربت کو کامل کرنے والا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نیک کام واجب نہ ہوں اُن میں مستحب یہ ہے کہ (ضرورت نیابت کے موقعہ پر) اپنے عزیز قریب کو حکم دیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو نحر ہدی اور صدقہ جلال و جلود کا حکم دیا کیونکہ وہ حضورؐ کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ اس نیابت سے اُن کو خوش کرنا مقصود تھا اگر حضورؐ کسی دُوسرے کو اس صدقہ کا حکم دیتے تو احتمال تھا کہ اُن کی خاطر میں تغیر پیدا

ہو جاتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اپنی طرف سے صدقہ وغیرہ میں نائب کر دیا تاکہ اُن کا دل خوش ہو جائے اور شکستہ نہ ہو۔ قولہ ویتبع علیہ من الفقہ ان المندوب فی النیابۃ الی قولہ ادخال سرور وجبر قلب۔

ف ۔ یہ نیابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی معاملہ میں تھی اور ذاتی معاملات ہی میں اہلِ قرابت کو مقدم کرنا مستحب ہے جبکہ اُن کو علم بھی زیادہ ہو پس اس سے مسئلہ خلافت میں تقدیم پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ حضورؐ کا ذاتی معاملہ نہیں بلکہ عام مسلمانوں سے متعلق ہے اُس میں اسی کو تقدم ہوگا جسے عام مسلمان مقدم کریں اور یہ بدیہی مسئلہ ہے جس میں زیادہ بحث کی اصلا ضرورت نہیں۔ ایک مقام پر ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرات خلفاء راشدین کی خلافت جس ترتیب سے واقع ہوئی ہے وہی عین حکمت اور ضرورت کے موافق تھی۔

(۲۱۰) حُسنِ معاشرت یہ ہے کہ جس نے کام شروع کیا ہو اُسی سے ختم بھی کرایا جائے

ایک وجہ حضرت علیؓ کو اس حکم کے ساتھ مخصوص کرنے کی یہ بھی تھی کہ حُسنِ صحبت (اور حُسنِ معاشرت) کا مقتضایہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو شروع کرے اُس کی تکمیل بھی اُسی کے ہاتھوں سے کرائی جائے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو یمن کی طرف بھیجا تھا کہ وہاں سے قربانی کے اُونٹ لائیں (چنانچہ وہ اپنے ساتھ لے کر آئے اور حج کے موقعہ پر مکہ پہنچے) تو حسن صحبت کے قاعدہ سے اُن ہی کو آپ نے بقیہ قربانی میں نائب کیا اور اُن ہی کو کھالوں اور جھولوں کے تصدق میں نائب کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حُسنِ صحبت کی رعایت کرنے والا کون ہے؟

وفیہ وجہ من حسن الصحبۃ الی قولہ ومن احسن صحبۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ف ۔ جب اس قصہ میں وجوہ نیابت متعدد ہو سکتے ہیں تو کسی ایک وجہ پر یقین

نہیں کیا جاسکتا۔ پس اس سے مسئلہ خلافت میں تقدیم پر استدلال نہیں ہوسکتا اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

ف ۔ حُسنِ صحبت و ادبِ معاشرت بھی دین کا بڑا اہم شعبہ ہے جس کی طرف سے آج کل بہت غفلت ہے اور تعجب تو یہ ہے کہ اس کے آداب کو قرآن و حدیث سے علماءؒ بھی کم سمجھتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے تجدیدی کارناموں میں یہ بھی بڑا کارنامہ ہے کہ آپ نے دین کے اس باب کو زندہ کیا اور اس کی تعلیم و تلقین میں بڑا اہتمام فرمایا۔

(۲۱۱) فتوحاتِ الٰہیہ کو بیان کرنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جب حق تعالےٰ نے کسی بندے پر امورِ خیر کو مفتوح فرمادیں تو اُس کو بیان کرنا چاہیئے بشرطیکہ اُس میں اپنے کسب و اختیار کو دخل نہ ہو (محض وہب و فضل ہو) کیونکہ جن امور میں کسب و اختیار کو دخل ہے اُن کو بیان کرنا تو اپنا تزکیہ (اور اپنے منہ سے اپنی تعریف ہے اور (اس سے) حق تعالےٰ نے (منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد) فرمایا ہے فلا تزکوا انفسکم (اپنی تعریف خود نہ کرو) اور جو امور محض وہب و فضل سے حق تعالےٰ نے عطا فرمائیں اُن کا بیان کرنا شکر میں داخل ہے بشرطیکہ نیت طلب جاہ سے سالم ہو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں التحدث بالنعم شکر نعمتوں کا بیان کرنا بھی شکر ہے اور حق تعالےٰ فرماتے ہیں لئن شکرتم لازیدنکم اگر تم شکر کروگے تو میں تم (پر اپنی نعمتوں) کو بڑھاتا رہوں گا۔

دیکھو حضرت علیؓ نے (اس حدیث میں) یہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے صدقہ کا امر فرمایا (جس میں اس نعمت کا ذکر ہے کہ حضورؐ نے محض وہب و فضل سے اُن کو اس حکم کے ساتھ مخصوص فرمایا) پھر ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ (اس کے بعد) جو کچھ میں نے کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے کیا جس میں دعوے اور تزکیہ سے برأت کا اظہار ہے۔ جیسے کوئی کسی کو صدقہ کرتے ہوئے دیکھے اور وہ

کہہ دے کہ یہ صدقہ واجبہ ہے (نافلہ نہیں) اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں میری تعریف کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ حضرات صحابہ اور پہلے زمانے کے مسلمانوں کے نزدیک واجبات کا ادا کرنا تعریف کا سبب نہ تھا کیونکہ واجب کا ادا کرنا تو لازم ہے اور واجبات کے ادا کرنے میں سب ہی لوگ برابر تھے (اُس زمانہ میں فرائض و واجبات کو کوئی نہیں چھوڑتا تھا تو اس میں تعریف یا کمال کچھ نہ تھا) اسی لیے بعض عابدین نے فرمایا ہے کہ خدا تارکین صلوٰۃ کو جزائے خیر نہ دے۔ انہوں نے (خود تو نماز چھوڑ دی اور) ہم کو نماز پڑھتے دیکھا تو کہنے لگے یہ بڑے عابد ہیں (یعنی ان کے ترک صلوٰۃ نے ہم کو عابدین میں داخل کر دیا اگر وہ بھی نماز پڑھا کرتے تو ہمارا کچھ بھی کمال نہ تھا) اور صحابہ رضی اللہ عنہم جو ان باتوں کا تذکرہ (کبھی کبھی) کر دیتے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخصوص فرمایا ہے اس کا منشاء محض اپنی خوشی کا اظہار اور نعمت کا شکر تھا وہ دعویٰ عمل سے بری تھے۔

آج کل کے آدمیوں کی طرح نہ تھے جو واجبات کو بھی پوری طرح ادا نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ ان کو اہل برکت میں شمار کیا جائے (لوگ ان کو بزرگ اور شیخ سمجھیں) ایسے ہی لوگوں کے متعلق حق تعالےٰ نے فرمایا ہے ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں میں جو انہوں نے نہیں کئے) اس میں صوفیاء کی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ اہل طریق کو چاہیئے کہ حق تعالےٰ نے ان پر جن نعمتوں کو مفتوح کیا ہے اپنے دوستوں کے سامنے بیان کر دیا کریں بشرطیکہ مجلس میں کوئی اجنبی نہ ہو کیونکہ اس سے اہل طریق کا ایمان قوی ہوتا ہے اور ایمان کی زیادتی سے اللہ تعالےٰ کا قرب بڑھتا ہے نیز اس سے ان کو نفس کے مقابلہ میں مدد ملتی ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ اس طریق میں صدق (وخلوص) سے کام کرنے والے کم ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو یہی سمجھ بیٹھے کہ یہ (طریق تصوف) ایسی چیز ہے جس کا بستر لپیٹ دیا گیا ہے (اب دُنیا میں نہ کہیں طریق کا وجود ہے نہ اہل طریق کا) تو یہ خیال ان کو ترقی سے ہمت پست

کرنے کا سبب ہو جاتا ہے (اب اگر مشائخ طریق حق تعالےٰ کی اُن نعمتوں کو بیان کرتے رہیں گے جو اللہ تعالےٰ نے اُن پر مفتوح کی ہیں تو اس سے سُننے والوں کی ہمت بلند ہوگی وہ سمجھیں گے کہ اب بھی وہ حالات و مقامات حاصل ہو سکتے ہیں جو پہلے زمانے میں حاصل ہوتے تھے)۔ مجھ سے ایک شخص نے جس کو طریق سے وابستگی تھی پھر عمل میں سُست پڑ گیا۔ پھر اپنے زمانے میں ایک بزرگ کو دیکھا جس کے اندر حالاتِ صوفیاء کا کچھ حصّہ موجود تھا تو دوبارہ مجاہدہ اور خدمت میں مشغول ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کشود کار سے سرفراز ہو گیا۔ بیان کیا کہ واللہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری سُستی اور کاہلی کا سبب صرف یہ ہوا کہ میں نے اپنے اندر کوئی بات نہ دیکھی اور نہ کسی ایسے شخص سے مُلاقات ہوئی جس میں وہ باتیں موجود ہوں جو صوفیاء کی کتابوں میں لکھی ہیں۔ میں نے کہا کہ اب اس طریق کا بستر لپیٹ دیا گیا ہے تو میں نے کیوں خواہ مخواہ سر مارا۔ پھر جب میں نے فلاں شخص میں کچھ وہ باتیں دیکھیں جو قوم کی کتابوں میں لکھی ہیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ طریق تو باقی ہے لیکن سالک کم ہو گئے ہیں۔ اب میں پھر خدمت اور مجاہدہ میں لگ گیا جس کے بعد میری یہ حالت ہو گئی جو آپ دیکھ رہے ہیں (کہ بحمد اللہ فتوحاتِ الٰہیہ سے کامیاب ہو گیا ہوں)۔ تو فتوحاتِ الٰہیہ کے بیان کرنے میں یہ فائدہ ہے (کہ جو لوگ طریق کو دشوار اور معدوم سمجھ بیٹھے ہیں اُن کی ہمتیں بلند ہو جائیں) اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب تو اپنے حال میں سچا ہو تو تیرا بولنا اور دیکھنا رہنا دیکھنے والوں کے حق میں فلاح ہی فلاح ہے۔ قولہ وفیہ دلیل علی التحدث بما فتح اللہ بہ علی العبد۔ الی قولہ لمن ما آلہٗ فلاح۔

ف۔ کتب صوفیاء میں بزرگوں کی کرامات و تصرفات اور کشفیات و حالات و کیفیات کا ذکر ہوتا ہے تو اُن کو دیکھ کر بعض لوگ اُن کی تحصیل کے طالب ہو جاتے ہیں اور جب حاصل نہیں ہوتیں تو مایوس اور بددل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ امور اختیار سے باہر ہیں اور امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونا پریشانی میں پڑنا ہے اور بعض

کتابوں میں مقامات واخلاق حمیدہ کی تعریف ایسی تدقیق اور کاوش سے کی گئی ہے جسے دیکھ کر بہت لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان مقامات واخلاق کا حاصل ہو جانا آج کل محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ حالانکہ فی نفسہٖ اُن کی تحصیل دشوار نہیں۔ دشواری محض مصنفین کے بیان میں ہے کیونکہ اخلاقِ حمیدہ کی تحصیل اور اخلاقِ رذیلہ کی اصلاح شرعاً مامور بہ ہے اور شریعت نے وسعت وطاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کیا۔ لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا وما جعل علیکم فی الدین من حرج اس پر صراحۃً دال ہے۔

پس تصوف کا حاصل یہ ہے کہ امورِ اختیاریہ میں کوتاہی نہ کرے اور غیر اختیاریہ کے درپے نہ ہو۔ پھر اُس میں کچھ بھی دشواری نہیں۔ البتہ امورِ اختیاریہ میں خلوص و صدق حاصل کرنے اور شائبہ نفس سے بچنے کے لیے کسی شیخ سے رجوع کی ضرورت ہے جس کی صحبت اور تعلیم کی برکت سے قلب میں خلوص اور صدق جلد پیدا ہو جاتا اور نفس کے مکائد پر نظر ہو جاتی ہے۔ یہ بات خود کتابیں دیکھ کر جلدی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی مریض اپنے مرض کا علاج کتابیں دیکھ کر کرے تو دیر میں شفاء ہو گی اور ممکن ہے شفاء نہ ہو بلکہ بڑھ جائے اور کسی طبیب حاذق کے حوالہ اپنے کو کر دے تو جلد شفا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح امراضِ قلب سے شفا طبیب روحانی کے ذریعے جلدی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد نسبت باطنہ کے حصول کا درجہ ہے وہ تو کتابوں سے حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ دولت مشائخ طریق کی صحبت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ خوب سمجھ لو اور بحمد اللہ ہر زمانہ میں ایسے مشائخ موجود رہتے ہیں جن کے وسیلے سے یہ دولت طالبین کو حاصل ہوتی رہتی ہے۔ طلب اور تحقیق شرط ہے بدون تحقیق کے ہر کس وناکس کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

❖

باب ہشت و سہ ۸۳

حدیث

لبس المحرم المخیط

بخاری رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ عطاء رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر کوئی (محرم حالتِ احرام میں) بھُول کر یا جہالت سے خوشبو لگالے یا (سِلا ہُوا) کپڑا پہن لے تو اس پر کفارہ نہیں۔

شرح یہ عطاء کا مذہب ہے۔ متفق علیہ نہیں۔ نسیان میں تو امام شافعی بھی اُن کے موافق ہیں اور امام مالک کے نزدیک نسیان میں بھی کفارہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح نماز میں سہو سے سجدہ سہو لازم ہے اور اس سے نقصان کا جبر ہو جاتا ہے اسی طرح احرام میں سہو و نسیان معاف نہیں بلکہ جبرِ نقصان کے لیے کفارہ لازم ہے اور یہاں سہو و عمد دونوں میں کفارہ ہے۔ نماز میں صرف سہو سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے عمد میں نہیں۔ باقی جہل کی صُورت میں جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی عالم نے عطاء کی موافقت نہیں کی بلکہ نص قرآنی فاسئلوا اھل الذکران کنتم لاتعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پُوچھو) اُن کا رد کر رہی ہے۔ قرآن نے کسی کو جہل کی وجہ سے معذور نہیں قرار دیا اور اگر جہل عُذر ہو جائے تو اس کا درجہ علم سے بڑھ جائے گا جس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (ہذا ما قالہ الشارح فی شرحہ اس مسئلہ میں امام مالک کی دلیل ایک حدیث ہے کہ ایک شخص حالتِ احرام میں خوشبُو لگائے عبا پہنے ہوئے حضور کے سامنے آیا تو آپ نے اُس کو خوشبو کے دھونے

اور عبا کے آثار نے کا حکم دیا اور کفارہ کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ اُس کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا کہ احرام کی حالت میں خوشبو لگانا اور عبا پہننا منع ہے۔ جمہور کی طرف سے جواب کُتب فقہ میں مذکور ہے وہاں دیکھ لیا جائے)۔

(۲۱۲) نا اہل کو محض کتاب دیکھ کر فتویٰ دینا یا باطنی اصلاح کرنا جائز نہیں

یہاں سے معلوم ہُوا کہ کتابوں میں کوئی روایت دیکھ کر فتویٰ دینا ہر شخص کو جائز نہیں یہ کام انہی لوگوں کا ہے جو اس کے اہل ہیں اور فیصلہ شدہ بات کے جاننے والے اور مدلول کلام کے سمجھنے والے ہیں۔ اسی مسئلہ کو دیکھو اگر کوئی ناواقف آدمی عطاء کا یہ قول دیکھے وہ تو اسی پر عمل کرنے لگے گا اور سمجھے گا کہ سب علماء کا یہی قول ہے (کیونکہ یہاں کسی کا خلاف مذکور نہیں) اب وہ اپنے امام پر جھوٹ بات لگانے کا مجرم ہوگا اور دوسروں کو بھی دھوکہ میں ڈالے گا۔ چنانچہ ایک عالم کے متعلق جو مذہب مالک پر فتویٰ دیتے تھے ایک جماعت نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ عطاء کے قول پر فتویٰ دیتے (اور اسی کو مالک کا مذہب سمجھتے) ہیں حالانکہ مالک کا مذہب ہم اُوپر بتلا چکے ہیں (کہ وہ کسی جزو میں بھی عطاء کے موافق نہیں نہ نسیان میں نہ جہل میں)۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ ہم کو معرفتِ علم کا صحیح راستہ دکھلائیں اور اُس پر اپنی رضا کے لیے عمل کی توفیق دیں۔ قولہ ویترتب علیہ من الفقہ انہ لایجوز الحکمۃ بمجرد النقل الی قولہ لاادب سواہ۔

ف۔ ہر چند کہ یہ مسئلہ تصوف کے مسائل سے نہیں مگر اس کی ضرورت علماء اور صوفیاء دونوں کو ہے آجکل یہ مرض عام ہے کہ کتابیں اور ترجمے دیکھ کر حکم شرعی یا باطنی بیان کرنے لگتے ہیں۔ اور بعض تو مجتہدین بن جاتے ہیں۔ حالانکہ کتابیں اور ترجمے دیکھنے سے علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ پڑھنے پڑھانے اور علماء کے پاس مدت سے رہنے سے حاصل ہوتا ہے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

☆

باب ہشت و چہار صد

حدیث

بنا مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور مسجد بنانے کا حکم دیا تو بنو نجار سے فرمایا اے بنی نجار! مجھ سے (اس زمین کی) قیمت کا معاملہ کر لو۔ اُنھوں نے کہا ہم اس کی قیمت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں لینا چاہتے تو آپؐ نے مشرکین کی قبروں کے کھود ڈالنے کا حکم دیا اور خراب زمین کو برابر کر دیا گیا اور کھجوروں کو کاٹ دیا گیا۔ پھر اُن کو مسجد کے قبلہ (کی دیوار) میں اُوپر تلے رکھ دیا گیا۔

شرح حدیث کا ظاہر تو یہ ہے کہ مسجد مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بنائی گئی ہے جبکہ آپؐ نے (مکہ سے) مدینہ کو ہجرت فرمائی۔ اس میں چند وجوہ سے کلام (کی ضرورت) ہے۔

(۲۱۳) ہدیہ قبول کرنے میں خلوص پر نظر کرنا ضروری ہے یہاں سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے متعلق اُس کے مالک سے یہ درخواست کرنا کہ اس کو ہمارے ہاتھ بیچ دو جائز ہے۔ اگرچہ اُس نے پہلے سے بیچنے کا خیال ظاہر نہ کیا ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بنو نجار مجھ سے اس زمین کی قیمت لے لو۔ حالانکہ اُن لوگوں نے اس زمین کو بیچنے کے لیے پیش نہیں کیا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص

کسی صنعت یا پیشہ سے مشہور ہو چکا ہو یا اُس کا خاندان مشہور ہو چکا ہو اُس کو اُس پیشہ کی طرف نسبت کرنا جائز ہے (بشرطیکہ اُس کو ناگوار نہ ہو) اور یہ اُن القاب میں داخل نہیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا بنی النجار (اے بڑھئی کی اولاد) یہ صنعت اُن کے آباؤ اجداد میں کسی نے اختیار کی تھی اُس سے خاندان مشہور ہو گیا۔ آپ نے اُسی مشہور نسبت سے اُن کو خطاب فرمایا (کیونکہ یہ نسبت اُن کو ناگوار نہ تھی)۔

نیز یہاں سے معلوم ہُوا کہ اگر کسی چیز کو خریدنے کا ارادہ کیا گیا ہو پھر مالک اُس کو ہدیہ کر دے تو اُس کا قبول کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ مالک پر دباؤ ڈالنے کا قصد نہ کیا گیا ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا ہدیہ قبول کر لیا حالانکہ پہلے آپ نے خریدنے کا قصد کیا تھا اور اس بات کی دلیل کہ مالک پر دباؤ ڈالنے کا قصد نہ ہو۔ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اوّلاً یہ فرمایا تھا کہ مجھ سے اس زمین کی قیمت لے لو سچ مچ دل سے فرمایا تھا کیونکہ نبی حق کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ نہ حیلہ بہانہ کرتے ہیں نہ ایسی بات مجازاً کہہ سکتے ہیں (اُن کی مراد وہی ہوتی ہے جو الفاظ کا حقیقی مدلول ہے) جس کے دل میں اُس کے خلاف کا وسوسہ بھی ہو وہ نبی کی تنقیص کرتا ہے جو ہرگز جائز نہیں اور اگر زبان سے صاف طور پر اس کو ظاہر کر دے گا قتل کیا جائے گا۔

ہاں یہاں پر ایک مسئلہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ ہدیہ کرنے والے کے خلوص کی تصدیق محض دعوے سے نہ کی جائے گی جب تک خلوص پر قرینہ قائم نہ ہو جو اُس کو واضح کر دے جیسا ان صحابہ کا قول ہے لانطلب ثمنہ الا الی اللہ ہم اس کی قیمت بس اللہ ہی سے طلب کرتے ہیں۔ اور اُن کے اس قول سے یہ لازم نہیں آیا کہ وہ (ہدیہ نہیں کر رہے تھے بلکہ) صدقہ کر رہے تھے۔ کیونکہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہدیہ کرنے والا بھی تو ثواب کا مستحق ہوتا ہے جبکہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہدیہ کرے۔ صدقہ اور ہدیہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ صدقہ تو صرف اللہ تعالیٰ

کے لیے ہوتا ہے بشرطیکہ ریا کو دخل نہ ہو اور ہدیہ کی بہت صورتیں ہیں جن کو کتب فقہ میں بیان کیا گیا ہے جن میں سے ایک قسم یہ بھی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے لیے ہو انہیں ہدیہ والے کو بھی صدقہ والے کی طرح ثواب ملتا ہے اگرچہ ہدیہ کرنے والے نے ان حضرات صحابہ کی طرح صاف صاف نہ کہا ہو کہ میں اللہ تعالےٰ کے واسطے ہدیہ کرتا ہوں بلکہ اور کوئی قرینہ اُس کے قائم مقام ہو۔

بعض صوفیاء سے منقول ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی ہدیہ آتا اور اُن کو کسی قرینہ سے معلوم نہ ہوتا کہ کس قسم کا ہدیہ ہے تو وہ ہدیہ کرنے والے سے فرماتے ہیں تم کو اللہ تعالےٰ کا واسطہ دیتا ہوں کہ سچ بتلاؤ تمہارے نزدیک میرا اس ہدیہ کو قبول کر لینا اچھا ہے یا رد کر دینا اچھا ہے ؟ وہ قسم کھا کر جو صورت بیان کر دیتا اُس کے موافق عمل کرتے تھے اور اُن کے اس فعل کا منشا دعوے سے بچنا تھا اگرچہ وہ بڑے صاحب کشف بزرگ ہوتے تھے، لیکن محض اپنے کشف کی بنا پر کسی کا ہدیہ رد نہ کرتے تھے تاکہ دعوے کی صورت نہ ہو جائے بلکہ ہدیہ دینے والے کی قسم پر عمل کرتے تھے۔

قوله منه جواز طلب الاشياء للبيع الى قوله وان كان على مادوی عنه من اهل الكشف والاطلاع -

ف ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کو بہت بے تکلف کر دیا تھا جیسا واقعات صحابہ سے واضح اور روشن ہے۔ اس لیے آپ کسی چیز کو خریدنا چاہتے اور صحابہ اس کو ہدیہ کر دیتے تو اس میں خلاف خلوص کا شبہ نہ ہوتا تھا۔ مگر آجکل مشائخ نے اپنے مریدوں کو بے تکلف نہیں بنایا وہ اگر کسی مرید سے یہ کہیں گے کہ اپنی فلاں چیز ہمارے ہاتھ بیع کر دو اور وہ کہہ دے کہ نہیں حضور میں اس کو ہدیہ کرتا ہوں تو وہ محض شرما شرمی ایسا کہتا ہے دل سے نہیں کہتا۔ الا ماشاءاللہ! پس اُن کو اس حدیث پر عمل اُسی وقت جائز ہے جبکہ مریدوں کو اپنے سے ویسا ہی بے تکلف بنا دیں جیسا حضورؐ نے صحابہ کو بنا دیا تھا۔

ف ۔ ہدیہ میں خلوص اور محبت کی تحقیق ضروری ہے ۔ ہر ہدیہ کو بلا تحقیق قبول نہ کرنا چاہیئے ۔ ورنہ لوگ حریص اور دُنیا دار مشہور کر دیں گے جس سے فیض عام میں کمی ہو جائے گی اور اپنا نفس بھی حریص ہو جائے گا ۔ اگر کوئی اور صورت تحقیق کی نہ ہو تو اپنے قلب سے رجوع کرنا چاہیئے ۔ جس ہدیہ کو دل قبول کرے لے لیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے ۔

تحقیق خلوص کی ایک صورت وہ بھی ہے جو یہاں ایک بزرگ سے منقول ہے مگر یہ اُس زمانے میں مفید تھی جب ہدیہ کرنے والے سچے ہوتے تھے وہ قسم دینے کے بعد جھوٹ نہیں بولتے تھے ۔ صاف کہہ دیتے تھے کہ حضرت واقعی میرے ہدیہ کا قبول کرنا آپ کے حق میں اچھا نہیں ۔ آجکل ایسے سچے مرید کہاں ؟

(۲۱۴) سعید ازلی کو فتنہ مضر نہیں یہاں اس پر بھی اشارہ ہے کہ جو شخص ازل میں سعید ہو چکا ہے اُس کو ان فتنوں سے کچھ ضرر نہیں ہوتا جو اُس پر گزرتے رہتے ہیں ۔ دیکھو اس قطعۂ زمین کے لیے (جس میں مسجد نبویؐ بنائی گئی) یہ سعادت عظمیٰ مقدر ہو چکی تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مسجد بنائی جائے گی اسی میں آپؐ کا نزول ہو گا اسی میں آپؐ کی قبر شریف ہو گی تو اس کو مشرکین کے قبضہ میں رہنے اور اُن کی خلاف شرع حرکات کا مورد بننے اور اُن کی قبر گاہ ہونے سے کچھ ضرر نہیں پہنچا (اسی لیے کہا گیا ہے) جب انجام اچھا ہو جائے تو ہر بُرائی جاتی رہتی ہے اور اگر انجام بُرا ہو تو ہر اچھی حالت بدل جاتی ہے ۔ قولہ وھنا اشارۃ الی قولہ فکل یحول ۔

ف ۔ یہی وہ منزل ہے جس سے ہر عارف لرزاں ترساں ہے سب کو عاقبت حسنیٰ کی طلب ہے اور اس سے پہلے وہ اپنی کسی حالت سے مطمئن نہیں ہوتے اللہ تعالےٰ ہمیں اور تمہیں حسن خاتمہ اور عاقبت حسنیٰ سے سرفراز فرمائیں ۔ آمین !

(۲۱۵) ہر کام اپنی وسعت کے موافق کرنا چاہیئے یہاں سے معلوم ہوا کہ عمل کی خوبی یہ ہے کہ

انسان اپنے ہر کام میں وسعت کے موافق عمل کرے اگر غنی ہو تو غنا کے موافق عمل کرے۔ تنگدست ہو تو تنگدستی کے موافق عمل کرے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات مہاجرین اپنے وطن اور مال کو چھوڑ کر مدینہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد بنانے کی ضرورت ہوئی تو آپ نے اس وقت کی حالت کے موافق کام کیا کہ مسجد کو کچی اینٹوں سے بنایا۔ چھت میں کھجور کی شاخیں لگائیں اور کھجور کی کڑیوں سے ستون قائم کئے ان ہی کو دیوار میں اُوپر تلے لگوایا جیسا قصعت النخل قبلة المسجد سے ظاہر ہو رہا ہے۔ پکی اینٹوں یا چونہ وغیرہ سے نہیں بنایا نہ کسی قسم کا تکلف کیا جو آپ پر یا دُوسروں پر گرانی کا سبب ہوتا۔ سُنت کا مقتضا یہی ہے اور کتاب اللہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے لینفق ذو سعة من سعته ہر شخص کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہیئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے "خرچ میں آسان روش اختیار کرنا زیادہ کمانے سے بہتر ہے"۔ قولہ دلیل علی ان من حسن التصرف الی قولہ من الزیادۃ فی الکسب۔

ف۔ حضرات صوفیاء کا یہ خاص مذاق ہے کہ ہر حالت میں ہمت اور وسعت کے موافق کام کرتے ہیں اُس سے زیادہ کا تکلف نہیں کرتے۔ دُنیا و آخرت دونوں کی راحت اسی میں ہے۔ مال زیادہ ہو اور خرچ بے ٹھکا ہو تو راحت نہیں مل سکتی۔ اگر خرچ اندازہ سے ہو اور آمدنی قلیل ہو تو راحت ہی راحت ہے۔ اہل اللہ کی حالت کا مشاہدہ اس کی دلیل ہے کہ اُن کے برابر دُنیا کی راحت بھی کسی کو نہیں۔

(۲۱۶) انسان کو دین کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیئے

یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان کو زیادہ اہتمام اپنے دین کا ہونا چاہیئے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے جس چیز پر نظر کی وہ مسجد تھی (کہ اپنے مکانات بنانے سے پہلے آپ کو مسجد بنانے کا فکر ہوا) جو آخرت کا کام تھا (اور دینی ضرورت تھی)۔

یہاں سے اُن فقراء کے قول کی دلیل بھی معلوم ہو گئی جو فرماتے ہیں کہ جب درویش

زہد اختیار کرے اور اپنی تمام مملوکات کو خیرات کرنے کا ارادہ کرے تو جو چیزیں دین کے لیے ضروری ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گی اُن کو ملک سے نکالنا جائز نہ ہوگا۔ بلکہ قدر ضرورت کا رکھنا واجب ہے جیسے وضو کا برتن اور بدن چھپانے کے لیے کپڑا اور جانماز وغیرہ۔ کیونکہ جن چیزوں کے نکال دینے سے دین کا کوئی کام دشوار ہو جائے اُن کو ملک سے نکالنا جائز نہیں۔ دین تمام چیزوں میں اہم اور اقدم ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے تم دین کی فکر رکھو اور اُس کے سوا کسی چیز کی پرواہ نہ کرو کیونکہ انسان کی عزت دین ہی سے ہے اور کسی چیز سے نہیں۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان احدہما علی المرأ انظر فی امر دینہ الی قولہ لا بما سواہ۔

ف۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ آج کل تو دین سے عزت نہیں بلکہ دُنیا میں مال سے عزت ہے جواب یہ ہے کہ اب بھی دین ہی سے عزت ہے بشرطیکہ دین ہو محض دین کی صُورت نہ ہو۔ دین اخلاص کا نام ہے اہل اخلاص کی اب بھی عزت ہے اور ہر زمانہ میں رہے گی اور جن اہل دین کو تم ذلیل دیکھتے ہو اُن میں دین کی صُورت ہی صورت ہے۔ اور وہ بھی ناقص۔ اگر اُن میں حقیقی دین ہوتا ہرگز ذلیل نہ ہوتے۔ وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون۔



باب ہشت صد و پنجم

حدیث

خروج الدجال وفتنتہ

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال مدینہ کے ایک سنگستان میں (مدینہ سے باہر) پڑاؤ کرے گا۔ اُس وقت اُس کے پاس ایک شخص جو سب آدمیوں سے اچھا ہوگا یا فرمایا اچھے لوگوں میں سے ہو جائے گا اور (اس کے مُنہ پر) کہے گا میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی تھی۔ دجال (لوگوں سے) کہے گا بتلاؤ اگر میں اس کو مار ڈالوں اور پھر زندہ کر دوں کیا اس کے بعد بھی تم میرے معاملے میں شک کرو گے۔ سب کہیں گے نہیں چنانچہ وہ اس کو قتل کر دے گا۔ پھر زندہ بھی کر دے گا۔ تو وہ شخص زندہ ہو کر کہے گا بخدا آج سے پہلے مجھے تیرے معاملے میں اس قدر بصیرت نہ تھی جتنی اب ہے (میں پہلے سے زیادہ وثوق کے ساتھ آج پھر کہتا ہوں کہ تو کذاب ہے) دجال کہے گا اچھا میں اس کو پھر قتل کرتا ہوں مگر اب اُس کو اس شخص (کے قتل) پر دسترس نہ ہوگی۔

شرح حدیث کا ظاہری مفہوم دو باتیں ہیں ایک یہ کہ دجال کو جو خرق عادات عطا کئے گئے ہیں وہ خود اُس کے دعوٰے کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ اُس کے خرق عادات اُس کے دعوٰے کو پورا کرنے سے قاصر ہوں گے (چنانچہ وہ اس شخص کے دوبارہ قتل کرنے کا دعوٰے کرے گا مگر اُس پر دسترس نہ ہوگی اپنا سا

مُنہ لے کر رہ جائے گا) دوسرے اس شخص کی قوتِ ایمان معلوم ہو گئی جو دجال کے پاس جائے گا (اور اُس کے منہ پر تکذیب کرے گا) دجال کا اتنا بڑا فتنہ اُسے کچھ ضرر نہ دے سکے گا۔ اس حدیث کے معانی پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۱۷) خرقِ عادت کی تقسیم اور معجزہ وکرامت اور شعبدہ وسحر میں فرق

حضرات علماء نے فرمایا ہے کہ خرقِ عادت کی چار قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جو دعوئے نبوت کی سچائی پر دلالت کرے۔ اس کا تو بستر لپیٹ دیا گیا (اب ایسی خرقِ عادت ظاہر نہیں ہوسکتی جو صدقِ نبوت پر دلالت کرے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں) مگر ہم اس کو محض معرفت کی غرض سے بیان کرتے ہیں کیونکہ اس کا علم بھی دین ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو ولایت پلہ اُس کے تحقق پر دلالت کرے۔ ایک وہ قسم ہے جو محض مجاہدات و ریاضات کا ثمرہ ہے اگرچہ مجاہدہ کرنے والا فاسق اور کافر ہی ہو۔ اس قسم سے بہت لوگ بوجہ جہالت کے فتنہ میں پڑجاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کو سیمیا کہتے ہیں جس کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ارواح کو بُلایا جاتا ہے اور بعض ستاروں کو مسخر کیا جاتا ہے اس سے بہت لوگ گمراہ ہوجاتے ہیں (وہ ایسے لوگوں کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ اس کو بزرگی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں)۔

ان میں سے ہر قسم کی ایک علامت ہے جس سے پہچاننے والا پہچان لیتا ہے۔ مگر وہی پہچانتا ہے جس کے دل میں نورِ ایمان ہے اور ان اقسام کو جانتا ہے۔ چنانچہ پہلی قسم کی جو نبوت پر دلالت کرنے والی ہے علامت یہ ہے کہ اُس کے ساتھ تحدی بھی ہوتی ہے یعنی خرقِ عادت ظاہر کرنے والا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں نبی ہوں اور میری نبوت کی دلیل یہ ہے کہ مَیں ایسا ایسا کرسکتا ہوں (جو دُوسرا کوئی نہیں کرسکتا اگر کسی کو نبوت میں شک ہو تو میرا مقابلہ کرکے دکھلائے) اس کے بعد جیسا اُس نے دعوےٰ کیا تھا اُس کے مطابق ظہور ہو جاتے (اور کوئی اُس کا مقابلہ نہ کرسکے) مگر

اب کسی کو اس قسم کا دعوٰے کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں لا نبی بعدی (کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں) اور یہ حدیث تواتر سے ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا نبی ہونا دلائل عقل و نقل سے ثابت ہو چکا ہے تو حضورؐ کے بعد جو کوئی بھی دعوٰے نبوت کرے یقیناً جھوٹا ہے، اور اس دعوے کے بعد اُس کے ہاتھ سے کوئی خرق عادت ظاہر نہیں ہو سکتی بلکہ جن چیزوں کو وہ خرق عادت قرار دے گا انہی سے اُن کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا (جیسا پنجاب میں ایک مدعی نبوت اسی قریب زمانہ میں ہُوا تھا اور اُس نے اپنی پیشین گوئیاں سچا ہونے کو معجزہ قرار دیا تھا مگر دنیا جانتی ہے کہ اس کی صد ہا پیشین گوئیاں غلط ہوئیں اور جن لوگوں نے اُس کے مقابلے میں پیشین گوئیاں کیں اُن کی اکثر باتیں صحیح ہوئیں)۔

دوسری قسم جو صدق ولایت پر دلالت کرتی ہے وہ ولی کے ہاتھوں بدون تعدی اور دعوٰی کے ظاہر ہوتی ہے اُس کی شرط یہ ہے کہ اس شخص کی حالت سُنت کے موافق ہو اتباع سنت کا اہتمام کرتا ہو کیونکہ حق تعالٰے کسی بدعتی کو ولی نہیں بناتے چنانچہ ارشاد ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالٰے تم سے محبت کریں گے۔ اور اگر ولی کسی وقت بوجہ ضرورت کے کرامت کا دعوٰے کرے عجب و پندار شامل نہ ہو تو اللہ تعالٰے اُس کے دعوٰی کو پُورا کر دیتے ہیں کیونکہ ولی کی کرامت تصدیق نبوت کی برکت ہے۔ جو کرامت بھی کسی ولی سے ظاہر ہوتی ہے وہ اُس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کیونکہ یہ خیر اُس کو صدق اتباع سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

اس کی مثال میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہے کہ ایک بزرگ (رحمہ اللہ ارادہ سے) سمندر (میں جہاز) پر سوار ہوئے اُن کے ساتھ اور بھی حاجی سوار ہو گئے اُس جہاز میں بادشاہ کا گیہوں بھرا ہُوا تھا اچانک سمندر میں طوفان آ گیا جہاز والوں نے باہم مشورہ کیا کہ غلّہ تو شہادت کے ذریعہ ناپ تول کر بھرا گیا ہے اور یہ حاجی اپنے اختیار سے سوار ہو گئے ہیں ہمارے اُوپر ان کی ذمہ داری نہیں تو (جہاز کو ہلکا کرنے

کے لیے) ان حاجیوں کو سمندر میں پھینک دینا چاہیئے۔ گیہوں کو بچالینا چاہیئے کہ اُس کا
ہم سے مطالبہ ہوگا۔ یہ بات ان بزرگ کے کان میں پہنچی۔ جب آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں
نے یہ ارادہ پختہ کر لیا ہے تو جہاز والوں سے فرمایا کہ تم (جہاز کو ہلکا کرنے کے لیے)
گیہوں پھینک دو۔ اُس (کے پُورا کرنے) کا میں ذمہ دار ہوں چنانچہ اُنھوں نے
جتنی مقدار کم کرنا چاہی سمندر میں پھینک دی جس کو اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر سمندر کو
سکون ہوگیا اور منزلِ مقصود پر سلامتی سے پہنچ گئے تو اب ان بزرگ سے گیہوں
کا مطالبہ کیا فرمایا وہ شہادت نکالو جس میں گیہوں کی مقدار لکھی ہوتی ہے اس کے
بعد بقیہ گیہوں کو پیمانہ سے ناپو جتنا کم ہوگا اُس کا میں ضامن ہوں چنانچہ پیمانہ سے
غلّہ ناپا گیا تو اُس مقدار سے بھی زائد تھا جو شہادت میں لکھی ہوئی تھی اور بزرگ
کو چھوڑ دیا گیا۔

اُس وقت انھوں نے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ واللہ میں نے یہ کرامت محض
ضرورت کی وجہ سے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں کی جان کا بچانا لازم تھا (تو ایسی صورت میں
ولی کو کرامت کا دعویٰ جائز ہے) اور اگر کوئی [illegible] ضرورت کے کرامت کا
دعوے کرے وہ اہلِ طریق کے نزدیک اولیا میں سے نہیں بلکہ اُن لوگوں میں سے
ہے جن کے متعلق ارشاد ہے سنستدرجهم من حیث لا یعلمون۔ ہم
اُن کو اس طرح آہستہ آہستہ پکڑتے ہیں کہ اُن کو معلوم بھی نہیں ہوتا (کہ یہ کرامت
ہمارے واسطے لطف نہیں بلکہ قہر ہے اسی کا نام استدراج ہے) اللہ تعالے کے یہاں
اُن کا حصّہ یہی ہے (کہ چند کرامات کا اُن سے ظہور ہوگیا) حضرات صوفیاء نے
تصریح کی ہے کہ جو شخص اس لیے عبادت کرے کہ اُس سے کرامات ظاہر ہوں یا
اُس کی دُعا قبول ہونے لگے یا دُنیا میں اس کا درجہ بلند ہو جائے بزرگ مشہور ہو جائے
تو یہ اُن لوگوں میں سے ہے جو اللہ تعالے کی عبادت ایک کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے
ہیں (اُن کو دربار تک رسائی نہیں ہوتی)۔

اور تیسری قسم جو مجاہدات کی وجہ سے ہو کیونکہ مجاہدات و ریاضات سے بھی

خوارق عادات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ مگر وہ نافذ نہیں ہوتیں (یعنی اُن کی تاثیر کرامت ولی کی طرح کامل نہیں ہوتی اُن سے اس شخص کی وہ عظمت وصولت ظاہر نہیں ہوتی جو کرامت ولی میں ہوتی ہے) اور نہ اُن کا کشف نگاہ کی مسافت سے آگے بڑھتا ہے یہ قسم کافر و مومن دونوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ یہ تو محض مجاہدہ کا اثر ہے۔ نفس مجاہدہ و ریاضت سے بھی باطن منور ہو جاتا اور قلب صاف شفاف آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے جس میں ہر چیز منقش ہو جاتی ہے جو اُس کے سامنے آجائے اور جو سامنے نہ آئے وہ منقش نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ایک بڑے بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ سفر میں ایک گرجا پر گزرے جہاں بہت سے راہب رہتے تھے۔ انہوں نے اُن کے مجاہدات کو دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ یہ لوگ خوب مجاہدہ کرتے ہیں یہ خیال آنا تھا کہ راہبوں نے فوراً خادم سے کہا کہ آپ کی خاطر کرو اچھی طرح میزبانی کرو اور عبادت خانہ میں جہاں بُت رکھے ہوئے ہیں ٹھہراؤ۔

اُس نے ان بزرگ کو بُت خانہ میں پہنچایا تو دل میں ان لوگوں کی حماقت اور نادانی کا خیال آیا کہ سارے مجاہدے ان بتوں کی پرستش کے واسطے کر رہے ہیں۔ یہ خیال آنا تھا کہ دفعتہً سب راہب چلائے اس کو نکال دو باہر کر دو یہاں مت ٹھہراؤ۔ بزرگ کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اتنی جلدی دل کے خطرہ پر مطلع ہو گئے مگر ان لوگوں کا مکاشفہ نگاہ کی مسافت سے آگے نہیں بڑھتا اور اگر ایمان و اتباع سنت کے ساتھ مجاہدہ کیا جائے تو عرش اور عرش کے نیچے تک کا کشف ہونے لگتا ہے (بشرطیکہ کشف سے مناسبت ہو کیونکہ بعض طبائع کو کشف سے مناسبت نہیں ہوتی تو اُن کو اصلاً کشف نہیں ہوتا خواہ کتنے ہی مجاہدے کریں۔ جیسے بعض لوگوں کو خواب سے مناسبت نہیں ہوتی تو ہزار تدبیروں سے بھی خواب نہیں آتا خوب سمجھ لو) متبع سنت مجاہدہ کرے تو ساری دُنیا اُس کے نزدیک ایک قدم کے برابر ہو جاتی ہے جس میں وہ جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے جتنا بھی حق تعالےٰ اُس پر دروازہ کھول دیں۔

چوتھی قسم جس کو سیمیا کہتے ہیں جس میں ارواح کو حاضر کیا جاتا یا بعض ستاروں کو مسخر کیا جاتا ہے اُس کی بھی چند علامتیں ہیں۔ جو لوگ ستاروں کو مسخر کرتے ہیں اُن میں ہر ستارہ کی پرستش کرنے والے کی ایک علامت ہے جس سے اس کو پہچان سکتے ہیں۔ مثلاً جو شخص ستارۂ زحل کی پرستش کرتا ہے اُس کا لباس خراب خستہ گندہ ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی اور نشست و برخاست بھی گندی ہوتی ہے ناواقف آدمی اُس کی یہ حالت دیکھ کر سمجھتا ہے کہ بڑے زاہد متقی ہیں عیش و آرام سے نفور ہیں حالانکہ اس میں زہد ورع کا کچھ دخل نہیں۔ یہ حالت صرف اُس ستارہ کی وجہ سے ہے جس کی وہ پرستش کر رہا ہے اور جب تک اُس کے معبود کا دورہ رہے گا جو اُن کے خیال میں چھتیس سال ہے اُس وقت تک اسی حالت پر رہے گا۔ اس میں کمی نہیں کر سکتا۔ اگر ایک ساعت بھی اُس میں کمی کرے گا سارا کیا کرایا عمل برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح ہر ستارہ کی پرستش کا ایک نشان ہے مگر ستارہ زحل کا عابد اُن کے نزدیک سب سے زیادہ منحوس حالت میں رہتا ہے۔ اور جو شخص ارواح کو حاضر کرتا ہے اُس کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے اُس کا لباس بھی عمدہ صاف ستھرا ہوتا ہے اور ہر حالت میں انشراح و انبساط سے رہتا ہے۔ اس کی نشست و برخاست بھی عمدہ طور سے ہوتی ہے۔

مگر ہر حالت میں ان سب کا مقصود حظ نفس اور طلب جاہ اور مخالفت سنت اور بدعات کا ایجاد ہے جن کے ذریعے عوام کو اپنی طرف مائل کرتے اور اس کو طریق حکمت و معرفت اور ریاضت و مجاہدہ بتلاتے ہیں حالانکہ یہ سب اس کے برعکس طریق ضلالت و جہالت میں داخل ہیں۔ خدا ہم کو اس سے بچائے۔

الغرض جس خرق عادت کے ساتھ اتباع شریعت کی حکومت نہ ہو وہ ہر جہت سے نافذ نہیں ہوتی (صرف ایک جہت سے نافذ ہوتی ہے) اور جب اُس کے مقابلہ میں صاحبِ حقیقت آجاتا ہے تو اُس کے سامنے اُس کی کچھ نہیں چلتی۔ اُس کا عمل دشوار ہو جاتا یا بہت کم چلتا ہے جیسی صاحبِ حقیقت کی ایمانی قوت ہوگی اسی قدر [illegible] سامنے [illegible]۔ اسی لیے یہ لوگ عموماً جابلوں سے

زیادہ ملتے ملاتے (اور اُن ہی کو اپنے جال میں پھانستے ہیں) اہل علم واہل صلاح سے
دُور رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے سامنے اُن کا علم نہیں چلتا) اور جس شخص کو اتباعِ سنت
کے ساتھ خرقِ عادت عطا ہوتا ہے وہ شاہانہ حالت میں رہتا ہے۔ کسی حیلہ اور مکر سے
یا کسی مادی اور غیر مادی طاقت سے اُس کو مغلوب نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی حالت روزانہ
ترقی پذیر ہوتی ہے گھٹتی نہیں۔ تمام آدمی اور سارا عالم وجود اُس کے نزدیک ایک حد پر
ہیں (وہ سب کو لاشئ اور ناقابلِ اعتبار سمجھتا ہے کسی سے اللہ تعالےٰ کے سوا نہیں ڈرتا)
جس طرح چاہتا ہے جس چیز میں چاہتا ہے تصرف کرتا ہے مگر دعوےٰ نہیں کرتا۔ اگر
کبھی دعوےٰ کرتا ہے تو اپنی طاقت وقوت سے بیزاری ظاہر کر کے اللہ کی طاقت وقوت
پر بھروسہ کر کے دعوےٰ کرتا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ اپنے اُوپر اندیشہ ہوتا ہے
(کہ مبادا دربارِ حق سے مردود نہ ہو جاؤں) ہاں جب اُس کے پاس اللہ تعالےٰ کی طرف
سے بشارتیں آتی ہیں (اس وقت خوش ہوتا ہے) اس کی علامت یہ ہے کہ سب سے
زیادہ متواضع ہوتا ہے اور سب سے زیادہ لوگوں کا عُذر قبول کرتا ہے مگر جبکہ دین
کا معاملہ ہو تو اُس وقت تواضع سے کام نہیں لیتا بلکہ سیاست سے کام لیتا ہے۔ مگر
دل میں اپنے کو دُوسروں سے کمتر ہی سمجھتا ہے۔ گو ظاہر میں حکومت وسیاست کرتا نظر
آئے) وہ سب سے زیادہ مخلوقِ خدا پر شفقت کرنے والا ہوتا ہے اپنے کو کمتر جانتا
ہے۔ اُس کے پاس جو خیر بھی ہے (خواہ کرامات ہوں یا کمالات) سب کو اللہ تعالےٰ
کی عطا اور احسان سمجھتا ہے اپنا کوئی استحقاق نہیں سمجھتا۔

لوگوں کو اتباعِ سُنت کی ترغیب دیتا ہے (اور خود بھی سنتوں کا اہتمام کرتا ہے)
خاموش زیادہ رہتا ہے ضرورت کے وقت بولتا ہے۔ بہت ہوشیار ہوتا ہے لوگوں
سے طمع نہیں رکھتا۔ آخرت کا خیال ہر وقت دل کے سامنے رہتا ہے۔ کسی پر اپنا کوئی
حق نہیں سمجھتا۔ دُوسروں کے حقوق اپنے ذمے بہت سمجھتا ہے سامنے بھی اور پیچھے بھی
بشرطیکہ اخوتِ ایمان موجود ہو (یعنی ایمان کی وجہ سے وہ ہر مسلمان کا اپنے ذمہ حق
سمجھتا ہے) مدح وستائش سے بھاگتا ہے (نفرت کرتا ہے) تنہائی اور خلوت سے

مانوس ہوتا ہے۔ احسان کرتا رہتا ہے ایذا رسانی کم کرتا ہے بلکہ نہیں کرتا۔ ہر چیز اُس سے محبت کرتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ زمین بھی جس پر چلتا ہے اور آسمان بھی جو اُس پر سایہ کرتا ہے۔ اسی طرح زمین و آسمان کی مخلوقات بھی۔ آسمان والے اُس کو زمین والوں سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ وہاں یہاں سے زیادہ مشہور ہوتا ہے۔ خبیث مال نہیں کھاتا۔ نہ بُری باتیں سُنتا ہے۔ اُس کو گنہگار کی معصیت سے ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے خود اُس نے گناہ کیا ہے۔ نیک آدمیوں کی طاعات سے ایسی خوشی ہوتی ہے جیسا سی کو اس کا ثواب ملے گا۔ ظاہری صُورت میں آدمی ہوتا ہے مگر باطن میں فرشتہ نورانی مقدس ہوتا ہے۔

اس کے اوصاف کہاں تک بیان کئے جائیں اس کے لیے تو دفتر بھی کافی نہیں۔ اللہ تعالےٰ ہم کو بھی اپنے فضل و کرم سے وہ نعمتیں عطا فرمائیں جو اپنی رحمت سے اُن کو عطا فرمائی ہیں اور اُن کے طفیل میں ہم پر بھی رحم فرمائیں۔ وصلی اللہ علی محمد نبیہ وعبدہ ۔

غرض چونکہ اکثر لوگ اہل طریقہ سے ناواقف ہیں۔ جہل غالب ہو رہا ہے اس لیے جس سے بھی کوئی خرقِ عادت دیکھتے ہیں خواہ کسی قسم کی ہو اُس کو بزرگ کہنے لگتے ہیں یا ان مفسدوں کے فساد کی باتیں سُنتا ہے تو اہل حقیقت پر بھی طعن کرنے لگتا اور اُن کی کرامات کو بھی شعبدہ اور فریب کہنے لگتا ہے اس طرح ان کی برکت سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ دو حال سے خالی نہیں اگر یہ احتیاط سے کام لے گا تو اُن کی حالت کو محتمل سمجھے گا۔ (کہ نہ معلوم یہ کرامت ہے یا شعبدہ) یا ان کو اہلِ فساد میں داخل کرے گا۔ اس صُورت میں حرمان کے ساتھ خسارہ بھی ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دوستوں کے لیے بہت غیرت آتی ہے (وہ اُن کے بُرا بھلا کہنے والوں کو سخت سزا دیتے ہیں) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے من اھان لی ولیا فقد بادزنی بالمحاربة - جس نے میرے ولی کی اہانت کی اُس نے مجھے اعلانِ جنگ دیا ہے۔ قولہ فاماخرق العادة فقد تکلم العلماء علیہ وھو علی اربعة اقسام الیٰ قولہ فقد بادزنی بالمحاربة ۔

ف ۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ نفس مجاہدہ سے بھی باطن منور ہو جاتا ہے اور قلب بمثل صاف شفاف آئینہ کے ہو جاتا ہے۔ یہاں حضرت شارح نے لفظ باطن اور قلب کو لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ ورنہ قلب اصطلاحی کو بدون ایمان کے نورانیت نصیب نہیں ہوتی۔ نفس مجاہدہ سے صرف لطیفہ نفس کی صفائی ہو جاتی ہے جو مادی ہے اور قلب و روح اور سر و خفی و اخفیٰ جو غیر مادی جواہر ہیں بدون ایمان کے منور نہیں ہو سکتے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ یہ لطائف غیر مادیہ بدون معرفت حق کے منور نہیں ہوتے اور معرفتِ حق بدون اسلام کے نہیں ہو سکتی خوب سمجھ لو۔

ف ۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اہلِ حقیقت کے سامنے اہلِ باطل کی کچھ نہیں چلتی ہم نے اپنے اکابر میں اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ایک دفعہ مسلمانوں اور آریوں میں مناظرہ تھا ہندوؤں کی طرف سے ایک جوگی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس وقت مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ کے لیے کوئی عالم کھڑا ہوتا وہ جوگی سر جھکا لیتا اور مسلمان عالم کی تقریر کمزور ہو جاتی اس کیفیت کو ایک صاحبِ دل نے بھانپ لیا اور سیدی حضرت مولوی خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہ کو اطلاع دی۔ اب حضرت نے بھی اپنا سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ وہ جوگی کرسی چھوڑ کر بھاگا پھر جلسہ میں آخر تک نہ آیا۔ اور علماء اسلام کی تقریریں زوردار ہونے لگیں۔ کفار کے مناظر مغلوب ہو گئے اور مسلمان مظفر و منصور واپس آئے۔

اسی طرح ایک جوگی نے ریل میں حضرت مولانا موصوف کے ایک مرید پر تصرف کیا جس سے اُن کے دل میں وساوس شیطانی آنے لگے اور وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ چلتی ریل سے کودنے کا قصد کیا۔ دفعۃً حضرت مولانا کی صورت سامنے نظر آئی کہ فرما رہے ہیں کہو حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ یہ کہنا تھا کہ تمام وساوس کافور ہو گئے اور جوگی کا تصرف باطل ہو گیا وہ خود کہنے لگا کہ تمہارا پیر بڑا کامل ہے اب تو انہوں نے جوگی کو بہت برا بھلا کہا اور وہ نادم ہو کر خاموش ہو گیا۔

اسی طرح حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری اور حضرت مولانا حکیم الامۃ تھانویؒ کے سامنے بھی جوگیوں اور شعبدہ بازوں کی کچھ نہیں چلتی تھی اور مجبور ہو کر انہیں ماننا پڑتا تھا کہ یہ لوگ اہلِ حق ہیں اُن کی باتوں میں نورانیت ہے۔ مجھ سے خود بعض ہندوؤں نے ان حضرات کے کمال کا تذکرہ کیا اور اسلام قبول کیا۔ بحمد اللہ ان حضرات کے خدام میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے سامنے اہلِ باطل کے تصرفات نہیں چل سکتے اور ان کو مغلوب ہو کر اہلِ حق کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کیونکہ مجاہدہ و ریاضت کا اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ وہ انصاف سے کام لیتے ہیں جھوٹ نہیں بولتے۔

ف۔ متبع سنت صاحبِ کرامت کی جو علامات یہاں بیان کی گئی ہیں الحمد للہ ہم نے اپنے اکابر میں اُن کا ظہور بدرجۂ اتم پایا ہے۔ دُنیا اُن کے اتباعِ سنت و زہد و ورع اور تقویٰ اور خشیت و شفقت علی الخلق سے واقف ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے دیکھنے والے ہزاروں لاکھوں موجود ہیں وہ اس کی شہادت دیں گے۔ اس زمانے میں ان اوصافِ کمال کی جامع ہستی حضرت ہی کی ذات تھی نور اللہ مرقدہ۔

(۲۱۸) جس کا ایمان قوی ہوتا ہے وہ بدعات کا تحمل نہیں کر سکتا

یہاں سے معلوم ہُوا کہ جس شخص کا ایمان قوی ہوتا ہے وہ بدعات کا تحمل نہیں کر سکتا۔ نہ اُن پر سکوت کر سکتا ہے۔ دیکھو یہ شخص جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین ہونے کی شہادت دی ہے حالانکہ جانتا تھا کہ دجال مدینہ کے اندر نہیں آ سکتا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ تنہا اُس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ پھر بھی قوتِ ایمان نے اُس کو دجال کے پاس جانے اور اُس کی جماعت میں موجودگی میں اُس کو جھوٹا کہنے پر مجبور کیا۔ اگرچہ وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ ایسا کرنے کے بعد بچ کر آئے گا یا نہیں؟ قوتِ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کے حکم پر قائم رہے اگرچہ تنہا ہی رہ گیا ہو۔ جیسا ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا۔ جبکہ بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور صحابہ کی رعام، ماسئے یہ ہوتی نہ

اس وقت ان لوگوں سے چشم پوشی کی جائے (سختی نہ کی جائے کیونکہ روم و فارس کا خطرہ سر پر موجود تھا) مگر صدیق اکبرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ میں ان سے ضرور مقابلہ کروں گا اگرچہ میرے ساتھ ہُوا ہی ہا ہا کچھ نہ ہو (یہ لفظ دبور کا ترجمہ ہے اور بعض نے اُس کو تشدید سے پڑھا ہے جس کے معنی زنبور یعنی بھڑکے ہیں) حضرت صدیقؓ نے یہ بات پوری بھی نہ کی تھی کہ تمام مسجد ہَوا سے (یا بھڑوں سے) بھر گئی۔ یہاں تک کہ سب لوگ مسجد سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضرت صدیقؓ سے یہ بات سُنی تو سمجھ گیا کہ اُن کی رائے حق ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اُس رائے پر شرح صدر عطا فرمایا جس پر حضرت صدیق کو شرح صدر ہو چُکا تھا اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ نصرت الٰہی قوتِ ایمان کے موافق ہوتی ہے (جس قدر ایمان قوی ہو گا اسی قدر نصرت قوی ہو گی)۔ قولہ وفیہ دلیل علیٰ ان من قوی ایمانہ الی قولہ الا بقدر قوۃ الایمان۔

ف ۔ جب کسی بدعت اور منکر پر نکیر کرنے والا کوئی نہ ہو تو قوتِ ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس وقت یہ نہ دیکھے کہ میں تنہا ہوں، تنہا کیونکر انکار کروں میرے انکار سے کیا فائدہ ہو گا ؟ اس وقت بدعت اور منکر پر ضرور انکار کیا جائے تاکہ حق ظاہر ہو جائے گو ہلاکت کا اندیشہ بھی ہو کیونکہ اگر کسی نے بھی انکار نہ کیا تو عام مُسلمان گمراہ ہو جائیں گے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس وقت مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ مامون کے زمانے میں پھیلا اور بعض علماء گول مول بات کہہ کر چھوٹ گئے، بعضوں نے تقیہ کے طور پر مامون کی موافقت میں جواب دیدیا تو مجھے بھی خیال ہُوا کہ گول مول بات کہہ کر چھوٹ جاؤں کہ دفعتہً مجھے معلوم ہُوا کہ لاکھوں مسلمان دربار سے باہر دوات قلم لیے کھڑے ہیں کہ احمد بن حنبل جو کچھ کہیں گے اُسی پر اعتقاد رکھیں گے تو میں نے عزم کر لیا کہ حق کو صاف صاف کہوں گا تاکہ اُمت گمراہی میں مُبتلا نہ ہو چاہے میرا کچھ ہی حشر ہو۔ غرض جب بدعت اور منکر پر صاف صاف نکیر کرنے والا کوئی نہ ہو اُس وقت صاحبِ حق کو اپنی جان کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے۔ حق

کو صاف صاف کہنا چاہیئے۔ خُوب سمجھ لو۔

ف ۔ یہاں سے یہ ثابت ہُوا کہ اہلِ بدعت قوتِ ایمان سے محروم ہیں۔ گو اہلِ بدعت میں بعض اہلِ نسبت بھی ہیں۔ مگر اُن کی نسبت میں وہ نور نہیں ہوتا جو متبع سُنت صاحبِ نسبت میں ہوتا ہے۔

(۲۱۹) مُسلمان کی بھلائی قوتِ ایمان کے موافق ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ مُسلمان کی بہتری (اور اچھائی؛ قوتِ ایمان کے موافق ہے (جتنا ایمان قوی ہوگا اُسی قدر بہتری ہو گی) جب ایمان قوی ہوتا ہے تو یقین کے ساتھ جان لیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جو لکھ دیا ہے وہی پیش آئے گا۔ چاہے بیٹھا رہے یا حرکت کرے پس مناسب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس بات کا حکم دیا یا ترغیب دی ہے اُس کو پُورا کیا جائے چنانچہ ارشاد ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون۔ فرما دیجئے کہ ہم کو اس کے سوا کچھ پیش نہ آئے گا جو اللہ تعالےٰ نے لکھ دیا ہے وہی ہمارا مددگار ہے اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ شخص (جس کا حدیث میں ذکر ہے) تنہا جا کر دجال کی تکذیب کرے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں تو وہی دجال ہے (جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی ہے) یعنی تو خدا نہیں جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے بلکہ تو جھُوٹا کذاب ہے اور یہ بہت بڑا مجاہدہ ہے کہ حق بات کہہ دی اور اُس کی پرواہ نہ کی کہ انجام کیا ہوگا ؟

آجکل بعض لوگ جو علماء اور دیندار کہلاتے ہیں حق بات کہنا اس خیال سے چھوڑ دیتے ہیں کہ اُس سے دُنیوی ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی حالت کا مشاہدہ کر کے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بدترین لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ہم کو خبر دیدی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جس میں صبح کو آدمی مومن ہوگا شام کو کافر ہو جائے گا، شام کو مومن ہوگا صبح کو کافر ہو جائے گا اپنے دین کو دُنیا کے سامان کے بدلے بیچ دے گا یہ ضرور

نہیں کہ اس سے بالکل ہی کافر ہو جائے بلکہ بعض تو بوجہ مداہنت کے فاسق ہو جائیں گے اور فسق کو بھی کبھی ذرا بڑا کفر کہہ دیا جاتا ہے اور بعضے دُنیا کی طمع میں اسلام سے مرتد ہی ہو جائیں گے اعاذنا اللہ من ذٰلک کلہ) اور یہاں جس شخص کا ذکر ہے وہ اس حدیث کا مصداق ہے لا تزال طائفۃ من اُمتی علی الحق ظاھرۃ الی قیام الساعۃ لا یضرھم من خالفھم ۔ میری اُمت میں کچھ لوگ حق پر غلبہ کے ساتھ جمے رہیں گے ۔ قیامت آنے تک اُن کو کسی مخالف کی مخالفت ضرر نہ دے گی ۔

اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ ایمان مدینہ والوں میں قوی رہے گا اگرچہ بعض میں کچھ گڑبڑ بھی ہو کیونکہ دجال کے مُنہ پر حق بات کہنے والا مدینہ ہی کا آدمی ہوگا ۔ اگر اور کسی جگہ بھی وُہ سر ایسا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بھی خبر سُنا دیتے ۔ قولہ و فیہ دلیل علی ان الخبریۃ ھی بقدر الایمان الی قولہ لاخبر بہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

ف ۔ بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ دجال کے مُنہ پر حق بات کہنے والے یہ بزرگ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے ۔ کیونکہ بعض روایت میں یہ لفظ بھی آیا ہے فیخرج الیہ رجل ممن قد رأٰنی کہ دجال کے پاس ایک شخص میرے دیکھنے والوں میں سے جائے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں میں سے بجز خضر علیہ السلام کے اور کوئی زندہ نہیں وہی اس وقت تک زندہ رہیں گے واللہ تعالیٰ اعلم ۔

خضر علیہ السلام کا نام بلیان بن ملکان ہے کنیت ابو العباس ہے لقب خضر ہے ۔ بعض روایات میں ہے کہ جو اُن کا اور اُن کے باپ کا نام اور اُن کی کنیت اور لقب معلوم کرے اس کا خاتمہ اچھا ہوتا ہے ۔ حدیث میں اُن لوگوں کے لیے تسلی ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حق پر قائم ہیں ۔ اگرچہ سارا زمانہ اُن کا مخالف ہو اُن کے لیے نصرت الٰہی کی بشارت ہے ۔ کیونکہ جس چیز کی وجہ سے اس بزرگ کی نصرت کی گئی وہ علت یہاں بھی موجود ہے یعنی قوت ایمان اور اللہ کی رضا کیلئے حق کو ظاہر کرنا ۔

(۲۲) ایمانی طاقت ضرورت کے موقعہ پر صرف قدرت پر

بھروسہ کرتی ہے حکمت پر نظر نہیں کرتی اور یہیں سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت قوت ایمان تنہا قدرتِ الٰہیہ پر بھروسہ کرتی ہے۔ قانون حکمت کو کام میں نہیں لاتی گو دل میں قانون حکمت اور اثر قدرت دونوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے قانونِ حکمت سے عدول کیا کہ ایسے کام کے لیے نکل کھڑا ہوا جو اس کی طاقت سے باہر تھا اور شریعت جو کہ قانونِ حکمت ہے اس سے منع کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور قدرت الٰہیہ کا مقتضیٰ یہ ہے وما ھم بضارین بہ من احد الا باذن اللہ اور وہ (ساحر کافر) خود کسی کو کچھ ضرر نہیں دے سکتے۔ مگر اللہ کے حکم سے نیز اُس کا مقتضیٰ یہ بھی ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ کہہ دیجئے ہم کو وہی پیش آئے گا جو اللہ نے ہمارے واسطے مقدر کر دیا ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی مصیبت قتل ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو مارنا چاہا تو قتل سے اُس کو کچھ ضرر نہ ہوا اور جب دوبارہ اُس کے قتل کا ارادہ کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کا ملہ کا اظہار کرنے کے لیے دجال کو اس کے قتل سے روک دیا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

رہا یہ کہ پھر پہلی مرتبہ اُس کو قتل پر قدرت کیوں دی گئی تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ عظیمہ کو ثابت کیا ہے کیونکہ اگر پہلی بار ہی قتل سے روک دیا جاتا تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ دجال نے اُس کو دیکھا ہی نہ تھا یا دیکھا تھا مگر پھر اُس کی نگاہ سے غائب ہو گیا۔ اور کرامت اولیاء میں شمار کر لیا جاتا (کہ یہ ولی اپنی کرامت سے غائب ہو گیا۔ اگر غائب نہ ہوتا دجال ضرور مار ڈالتا) مگر جس صورت سے اللہ تعالیٰ نے کرامت ظاہر کی وہ بہت ہی عجیب و غریب ہے کہ دجال کو ایک بار اُس کے قتل پر قدرت دے دی اور دوبارہ قدرت نہ دی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان قوۃ الایمان عند الضرورۃ تعول علی القدرۃ

بمجردھا الی قولہ وما اظہر اللہ عزوجل لہ من الکرامۃ ادفع اعظم۔

ف۔ میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ جب بدعت ومنکر پر نکیر کرنے والا کوئی نہ ہو اُس وقت اپنے کو خطرہ میں ڈال کر بدعت پر انکار کرنا جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے جبکہ سکوت سے اُمت کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہو۔ پس یہ صورت اگرچہ ایک قانونِ حکمت کے خلاف تھی مگر دُوسرے قانونِ حکمت کے موافق تھی۔ حدیث میں ہے اعظم الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔ بڑا جہاد حق بات کہہ دینا ہے ظالم بادشاہ کے سامنے۔ اس کو بڑا جہاد اسی واسطے کہا گیا ہے کہ اس میں جان کا خطرہ غالب ہے چنانچہ بہ کثرت علماء حق ایسے گزرے ہیں جنہوں نے سلاطین کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور جان دے دی کیونکہ اس میں اُمت کو بدعت اور منکر سے بچانے کا فائدہ تھا گو مخاطب کو نفع نہ پہنچا ہو۔ جان کو ہلاکت میں ڈالنا وہاں منع ہے جہاں کوئی نفع مرتب نہ ہو نہ مقابل کو کوئی ضرر پہنچے تو بے فائدہ جان کیوں دی۔

(۲۲۱) ایمان کے ساتھ فتنہ مُضر نہیں ہوتا یہاں سے معلوم ہُوا کہ ایمان کے ساتھ فتنہ کچھ ضرر نہیں دیتا بلکہ فتنہ سے ایمان اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ دیکھو اس شخص کو سخت ابتلاء پیش آیا کہ قتل کیا گیا پھر زندہ کیا گیا مگر اس سے اُس کی قوتِ ایمان (کم نہ ہوئی بلکہ) زیادہ ہی ہوئی کیونکہ پہلے تو اُس کو (دجال کے جھوٹا ہونے کا علم الیقین تھا اب عین الیقین ہو گیا اور عین الیقین علم الیقین سے اعلیٰ ہے۔ جیسا حضرت ابراہیمؑ سے جب کہا گیا اولم تؤمن (کیا تم کو اس کا یقین نہیں کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کریں گے) تو عرض کیا بلی ولکن لیطمئن قلبی کہ یقین کیوں نہ ہوتا لیکن میں اطمینانِ قلب چاہتا ہوں (یعنی علم الیقین سے ترقی کر کے عین الیقین چاہتا ہوں اور وہ مشاہدہ ہی سے ہو گا) اسی لیے وہ درجۂ خلت کے مستحق ہوئے اس میں ایک دُوسری حدیث کی بھی تائید ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دل پر فتنے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں جس پر وہ پیوست ہو گئے اُس میں سیاہ داغ

پیدا کر دیتے ہیں اور جس دل میں پیوست نہ ہوئے اُس میں سفید (چمکتا ہوا) نشان پیدا کر دیتے ہیں جو ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ دل صاف (آئینہ کی طرح) ہو جاتا ہے پھر اُس کو کوئی فتنہ اس کے بعد ضرر نہیں دیتا۔ چنانچہ یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تصدیق کرتا ہوا اللہ و رسول کے راستہ میں مجاہد بن کر نکلا تو اُس کو قتل سے بھی کچھ ضرر نہ پہنچا بلکہ ایمان میں ترقی ہی ہوئی اور دجال کی حالت سے واضح ہو جائے گا کہ اُس کے خوارق عادات خود اُس کی تکذیب کریں گے کیونکہ وہ اپنے آدمیوں سے کہے گا بتلاؤ اگر میں اس کو قتل کر کے پھر زندہ کر دوں کیا پھر بھی میرے متعلق شک کرو گے؟ (اُس کا یہ سوال ہی بتلاتا ہے کہ وہ دعوے خدائی میں جھوٹا ہوگا) اگر اُس کا دعوے خدائی سچا ہوتا تو لوگوں کے دلوں کو اپنی تصدیق پر خود مائل کر دیتا کیونکہ قلوب تو اللہ تعالےٰ کے قبضہ میں ہیں (وہ جس طرح چاہیں اُن کو پھیر سکتے ہیں) پس دجال کا لوگوں سے اپنی تصدیق طلب کرنا خود اُس کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے اور خدا تعالےٰ کے حق میں کمزوری محال ہے) پھر بڑی کمزوری یہ ہوگی کہ وہ دوبارہ اس شخص کے قتل کا دعوے کرے گا مگر قادر نہ ہوگا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا)۔ قوله وفيه دليل على ان الفتنة لا تضر مع الايمان الى قوله وهذا فى حق الربوبية محال۔

ف۔ حضرت شارحؒ نے یہ جو فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے علم الیقین سے عین الیقین کی طرف ترقی کے لیے احیاء موتیٰ کی کیفیت دیکھنا چاہی اس میں کلام ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ بدون مشاہدۂ حسی کے عین الیقین حاصل نہیں ہو سکتا اور مشاہدہ سے پہلے ابراہیمؑ کو عین الیقین کا درجہ حاصل نہ تھا۔ اگر حضرت شارح کی مراد عین الیقین سے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنوی مراد ہیں تو یہ مقدمہ مسلّم ہے مگر اُس کو علم الیقین کے مقابلہ میں لانا درست نہیں کہ اس سے معنی اصطلاحی کا شبہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیدنا ابراہیمؑ علم الیقین و عین الیقین دونوں سے کامیاب تھے۔ جب اولیاء کاملین کو یہ دونوں درجے حاصل ہوتے ہیں تو انبیاء کا کسی

ایک سے خالی ہونا کیونکر ممکن ہے اُن کو وحی اور نبوت کے ساتھ ہی عین الیقین یعنی اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بدون مشاہدہ کیفیت کے دل کو ایک کیفیت پر قرار نہیں ہوتا بلکہ ذہن نقشے بناتا رہتا ہے جیسے ہم کو یقین کامل ہے کہ دُنیا میں خانہ کعبہ موجود ہے مگر جب تک مشاہدہ نہ کر لیا جائے ذہن کو ایک صُورت پر قرار نہیں ہوتا بلکہ مختلف صُورتیں ذہن میں آتی رہتی ہیں کہ کعبہ ایسا ہے یا ایسا ہے، دیکھنے کے بعد ایک صورت پر قرار ہوجاتا ہے کہ بس ایسا ہے اس کا نام اطمینان ہے اور لغۃً اس کو عین الیقین کہہ سکتے ہیں اصطلاحاً نہیں۔ اسی کو حضرت ابراہیمؑ نے طلب کیا تھا اور یہ مقاصد میں سے نہیں بدون اس کے بھی ایمان اور یقین کامل حاصل ہوسکتا ہے۔ جیسے ہم کو بدون دیکھے خانہ کعبہ کے وجود کا پُورا یقین ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اطمینان کی طلب اس لیے کی کہ اُن سے احیاءِ موتیٰ میں نمرود نے مناظرہ کیا تھا اُن کو خیال ہُوا کہ شاید پھر کوئی اس باب میں مناظرہ کرنے لگے تو مَیں اُس کی کیفیت کا مشاہدہ کرلوں تاکہ مشاہدہ کے بعد قوت کے ساتھ گفتگو کر سکوں کیونکہ قاعدہ ہے کہ صاحبِ مشاہدہ کے کلام میں وہ قوت اور شوکت ہوتی ہے جو غیر صاحب مشاہدہ کے کلام میں نہیں ہوتی جس نے حج کر لیا ہے۔ وہ جس قوت اور شوکت کے ساتھ مسائل حج میں گفتگو کرسکتا ہے حج نہ کرنے والا نہیں کرسکتا جیسا کہ ظاہر ہے۔

پس ہر شخص کو دُنیا میں طلب اطمینان کی اجازت نہیں نہ ضرورت فالایمان بین الخوف والرجاء اطمینان تو آخرت ہی میں حاصل ہوگا ہاں طلب یقین لازم ہے۔ اور اُس کا ہر درجہ دُنیا میں حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اولیا کا ملین اُس سے کامیاب ہیں کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے لو انکشف الغطاء ما ازددت یقیناً اگر پردہ اُٹھ جائے جب بھی میرے یقین میں زیادتی نہ ہوگی گو اطمینانی کیفیت ضرور پیدا ہوگی لیس الخبر کالمعاینۃ۔ سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہی ہے مگر اُس کا نام اطمینان ہے۔ اولیاء کو یقین کامل بدون اس کے بھی حاصل ہوتا

ہے اور انبیاء علیہم السلام اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہ و رزقنا ودہ من حکیم)۔

ف۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ فتنہ سے ایمان قوی ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ سچی محبت ہر حال میں بڑھتی ہے خواہ اُس کی وجہ سے کتنی ہی تکلیف پہنچے اور سچی محبت ہی کا نام ایمان ہے والذین آمنوا اشد حبا للہ۔ جس نے عاشق کو دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ تکالیف ومحن سے عشق کی آگ زیادہ بھڑکتی ہے ؎

نہ سازد عشق را کنج سلامت
خوشا رسوائی کوئے ملامت

عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہاں بلا سے جان نکلے تو مگر نکلے نہ آہ ؎
ہوشیار اے دل کہ وہ صبر آزما ہونیکو ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامات تفصیل کے ساتھ بیان فرمادی ہیں۔ جب مومن کے سامنے وہ فتنے آتے ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے تو اُس کے ایمان میں ترقی ہوتی ہے وہ ان کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے لقد صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بے شک ہمارے رسول نے سچ فرمایا تھا۔ جس وقت میں نے اپنے رسالہ العطر الوردی فی ذکر المسیح والمہدی میں یہ حدیث لکھی ہے ویفشو القلم والتجارۃ کہ قیامت کے قریب قلم اور تجارت بہت پھیل جائے گی۔ یعنی لکھنے پڑھنے کا رواج زیادہ ہوگا۔ تجارتیں ترقی کریں گی۔ تو میں نہیں بیان نہیں کہ مجھ پر کیسی وجدی کیفیت طاری ہوئی۔ واقعی حضورؐ نے سچ فرمایا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ آجکل ہر قوم کو ترقی تعلیم اور ترقی تجارت کی کس قدر فکر ہے۔ گاؤں گاؤں میں اسکول کھولے جا

سے ہیں سلطنتوں کی بنیاد تجارت پر قائم ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ باوجود اس قدر ترقی تعلیم کے علم ناپید ہے اور جہل ترقی پر ہے۔ علامت قیامت میں حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے یقبض العلم و یکثر الجہل و یکثر الہرج یعنی القتل۔ علم سمٹ جائے گا اور جہل غالب ہوگا اور ہرج یعنی خون ریزی زیادہ ہوگی۔ سو واقعی اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کی تو ترقی ہے مگر علم کو تنزل ہے کیونکہ لکھنے پڑھنے کا رواج زیادہ تر محض دُنیا اور مادی منفعت کے لیے ہے خدا شناسی یا مذہب سے واقف ہونے کے لیے نہیں اور ایسے لکھنے پڑھنے کا نام علم نہیں بلکہ سراسر جہل ہے اس کی جس قدر ترقی ہوگی جہل ہی بڑھتا جائے گا ع

علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت ست

یہی وجہ ہے کہ اس طرح علم کی جتنی ترقی ہو رہی ہے اسی قدر دُنیا میں فساد اور خون ریزی بڑھ رہا ہے۔ یہ فساد کرنے والے ان پڑھ جاہل نہیں بلکہ تعلیم یافتہ گریجویٹ ہیں وہی کسانوں مزدوروں کو سبز باغ دکھلا کر دُنیا میں فساد پھیلا رہے ہیں۔ ان واقعات کو دیکھ کر مومن کا ایمان پختہ ہوتا اور تصدیق رسولؐ میں برابر ترقی ہوتی ہے کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا ویسا ہو بہو پورا ہو رہا ہے۔

اللھم صل وسلم و بارک علی ھذا النبی الکریم افضل صلواۃ و ازکی تسلیم والحمد للہ رب العلمین۔

(۲۲۲) تقدیر کا بیان حدیث میں قدرت الٰہی کا بھی بیان ہے کہ جس کے لیے گمراہی مقدر ہو چکی ہے اُس کو عبرتیں اور نصیحتیں کچھ بھی نفع نہیں دیتیں۔ دیکھو دجال دعوےٰ کرے گا کہ میرے خدا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ میں اس شخص کو مار کر پھر زندہ کر دوں گا۔ سو ایک دفعہ وہ ایسا کر دے گا پھر (جب وہ شخص زندہ ہو کر کہے گا کہ اب تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ بصیرت کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ تو دجال کذاب ہے) وہ دوبارہ اُسے قتل کرنا

چلے گا مگر بدون کسی ظاہری سبب کے اس کے قتل پر قادر نہ ہوگا۔ اب اُس پر اور اُس کے پیروؤں پر حق کو مان لینا لازم تھا کیونکہ اُس کے دعوے اور دلیل کو باطل کرنے والی چیز کھلم کھلا سب کے سامنے آگئی جس کا کوئی جواب اُن کے پاس نہ ہوگا۔ مگر بات یہ ہے کہ دلائل اور مواعظ سعادت کے ساتھ ہی نفع دیتے ہیں اور فتنے اور امتحانات شقاوت کے ساتھ ہی مزر پہنچاتے ہیں۔ ہم اللہ عزوجل مالک عرش عظیم سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں شقاوت اور محرومی اور فتنوں اور آزمائشوں سے دونوں جہاں میں بچائیں اور اپنے فضل سے دارین کی سعادت سے سرفراز فرمائیں۔ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں۔ وصلی اللہ علی محمد وآلہ۔ قولہ وضیہ دلیل علی اظہار قدرۃ اللہ عزوجل الی قولہ محمد وآلہ۔

ف۔ یہی وہ مقام ہے جس نے عارفین کو لرزا رکھا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اُس کی تقدیر میں کیا ہے گو ظاہر حال سے انجام کا پتہ چل جاتا ہے مگر قطعی فیصلہ مرنے سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرماتے ہیں ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را — در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش — ناگاہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

؎ گہ رشک کند فرشتہ بر پاکئ ما
گہ خندہ زند دیو زنا پاکئ ما
ایمان چو سلامت بہ لب گور بریم
احسنت بریں چستی و چالاکئ ما

ہر شخص کو حسن خاتمہ کا اہتمام کرنا اور اُس کے لیے دل سے دُعا کرتے رہنا چاہیئے۔ رزقنا اللہ وایاکم حسن الختام بحرمۃ النبی وآلہ واصحابہ الکرام صلی اللہ تعالی علیہ وعلیہم الی یوم القیام۔ والحمد للہ رب العلمین۔

باب ہشت و ششم

حدیث

حراسۃ مکۃ والمدینۃ من الدجال

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (دُنیا کا) کوئی شہر ایسا نہیں جس میں دجال نہ پہنچے بجز مکہ اور مدینہ کے کہ ان کے راستوں میں سے کوئی راستہ ایسا نہ ہوگا جس پر فرشتے صف باندھے ہوئے اُن کی حفاظت نہ کرتے ہوں۔ پھر مدینہ میں تین دفعہ زلزلہ آئے گا تو ہر کافر اور منافق (مدینہ سے نکل کر) دجال کی طرف چلا آئے گا۔

شرح حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ دجال زمین کے تمام بلاد میں پہنچے گا بجز مکہ اور مدینہ کے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے ایک تو یہ کہ اس میں دجال کے ظہور کی تحقیق ہے کہ وہ ظاہر ہوگا اور تمام روئے زمین کا دورہ کرے گا۔ مکہ مدینہ کے پاس بھی پہنچے گا مگر فرشتے کھُلم کھُلا صف باندھے ہوئے ان دونوں مقدس شہروں کی حفاظت کرتے ہوں گے اس لیے اندر نہ پہنچ سکے گا مدینہ کو تین بار زلزلہ آئیگا۔ کافر و منافق اس زلزلہ کو دجال کا تصرف سمجھیں گے اور اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اسی لیے ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ مدینہ کی ایسی مثال ہے جیسے بھٹی کہ جس طرح اس میں سونے چاندی کا میل کچیل نکل جاتا ہے اسی طرح مدینہ خبیثوں کو اپنے اندر سے نکال دیتا ہے۔

(۲۲۳) مکہ اور مدینہ فضیلت میں برابر ہیں

ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فضیلت میں مکہ عہ اور مدینہ دونوں برابر ہیں کیونکہ دجال تمام زمین کو پامال کرے گا مگر ان دو مقدس شہروں میں نہ پہنچ سکے گا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں فضیلت میں برابر ہیں اس کی تائید دوسرے دلائل قیاس سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اگر مدینہ میں یہ خصوصیت ہے کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف اور مسجد مبارک ہے اور حضورؐ نے وہاں قیام فرمایا ہے تو مکہ میں یہ خصوصیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باکرامت مکہ میں ہوئی وہاں آپ نبوت سے سرفراز ہوئے اور وہیں آپؐ کا قبلہ ہے اور نبوت کے بعد حضورؐ کا قیام مکہ میں بھی مدینہ کے برابر ہی ہوا (بلکہ کچھ زیادہ) مشہور قول یہی ہے (کیونکہ آپؐ نے نبوت کے بعد مکہ میں تیرہ سال قیام فرمایا اور مدینہ میں دس سال) پس آفتاب رسالت کا مطلع مکہ ہے اور مغرب مدینہ ہے۔ قولہ وظاھر ھذا الحدیث یعطی التسویۃ بینھما فی الفضل الی قولہ ومغربھا بالمدینۃ۔

ف۔ ہر چند کہ یہ مسئلہ تصوف کا نہیں مگر صوفیہ نے اس سے بحث کی ہے اس لیے ترجمہ کر دیا گیا۔ اس باب میں ہمارے اکابر کا فیصلہ یہ ہے کہ جینا مکہ میں اچھا اور مرنا مدینہ میں اچھا۔ کیونکہ مکہ میں اعمالِ صالحہ کا ثواب مدینہ سے زیادہ ہے کہ مسجد احرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہوتی ہے اور مسجد نبویؐ میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ پس زندگی مکہ کی افضل ہے اور جب قرب موت کا احساس ہونے لگے اُس وقت مدینہ پہنچ جانا افضل ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

عہ فقہاء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ امام مالک اور اُن کے مقلدین مدینہ کو مکہ سے افضل فرماتے ہیں۔ امام شافعی اور اُن کے مقلدین مکہ کو مدینہ سے افضل کہتے ہیں مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جو زمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے قبر شریف میں مس کئے ہوئے ہیں۔ وہ زمین کے تمام حصوں سے افضل ہے اور ابن عقیل حنبلی نے تو اُس کو عرش و کرسی سے بھی افضل کہا ہے کذا فی المشی ح مع الحاشیہ ۱۲۔

من استطاع منکم ان یموت بالمدینۃ فلیفعل او کما قال۔" جس سے یہ ہو سکے کہ مدینہ میں اُس کو موت آئے اُس کو ایسا کرنا چاہیئے"۔

دُوسری حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلے وہ لوگ ہوں گے جو بقیع الغرقد (قبرستان مدینہ) میں مدفون ہیں۔ پھر آپ مکہ والوں کا انتظار فرمائیں گے اور ان سب کو ساتھ لے کر میدانِ محشر میں تشریف لائیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جو لوگ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب ہوں گے وہ آپ کی شفاعت سے زیادہ کامیاب ہوں گے۔ اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی ببلد رسولک صلی اللہ علیہ وسلم آمین۔

(۲۲۴) دجال کو خوارق بہت دیئے جائیں گے پس خوارق کو علامت قبول نہ سمجھا جائے جب تک اتباعِ سُنت نہ ہو

حدیث سے معلوم ہُوا کہ اس لعین (مردود دجال) کو خوارقِ عادات بہت دی جائیں گی جن میں سے ایک تو یہی ہے کہ وہ تمام روئے زمین کا دورہ کرے گا حالانکہ (دعویٰ الوہیت کے بعد) اُس کا قیام زمین میں صرف چالیس دن ہوگا اس سے زیادہ نہیں البتہ ان ایام میں پہلا دن سال بھر کے برابر ہوگا اور دُوسرا مہینہ کے برابر اور تیسرا ایک ہفتہ کے برابر اور بقیہ ایام عام دنوں کے برابر چھوٹے بڑے ہوں گے۔ حضرات صحابہ نے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان لمبے دنوں میں ہمیں ایک ہی دن کی نماز کافی ہوگی؟ فرمایا نہیں بلکہ نمازوں کے لیے وقت کا اندازہ کر لیناعہ۔

عہ یہاں سے حضرات صحابہ کی فکرِ دین کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انھوں نے ان ایام کے متعلق دنیوی پریشانیوں کا حل دریافت نہیں کیا صرف دینی پریشانی کا حل دریافت کیا پھر یہ بھی نہ پُوچھا کہ وقت کا اندازہ کیونکر کریں؟ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ کرنے کا حکم دیا ہے تو اس وقت کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے گی جس سے اندازہ کرنا آسان ہو (الحو منفرہی)

دوسری خرق عادت پہلی حدیث میں گزر چکی ہے کہ وہ ایک شخص کو قتل کرے گا
پھر زندہ کرے گا۔ ایک یہ کہ وہ زمین میں دانہ ڈالے گا تو اسی وقت اُگ بھی آئے گا،
پک بھی جائے گا کٹ بھی جائے گا۔ ایک یہ کہ اُس کے ساتھ روٹیوں کے پہاڑ
ہوں گے۔ ایک یہ کہ اُس کے ساتھ جنت اور دوزخ کا نمونہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے بتلادیا کہ جو اُس کی جنت میں داخل ہوگا وہ دوزخ میں ہوگا اور جو
اُس کے دوزخ میں داخل ہوگا وہ جنت میں ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ کسی سے کہے گا کہ میرا
کہنا مان لے وہ انکار کرے گا تو اس شخص کا مال دجال کے ساتھ ہو لے گا۔ اب
وہ شخص بھی اپنے مال کی وجہ سے دجال کا پیرو ہو جائے گا۔ غرض دجال کے کفر کا
اور اس کی وجہ سے لوگوں کے کافر ہونے کا بڑا سبب یہ خوارق عادات ہی ہوں
گے جو اس لعین کو دیئے جائیں گے۔ اس کے ظہور سے پہلے سات سال ایسے گزریں
گے جن میں نہ آسمان سے ایک قطرہ بارش کا نازل ہوگا نہ زمین سے کوئی دانہ
اُگے گا مگر اُس وقت امام مہدی علیہ السلام موجود ہوں گے جن کی برکت سے مُسلمان
بھوکے نہ رہیں گے۔ اس وقت مُسلمانوں کے لیے ذکر اللہ اور تسبیح غذا کا کام دیگا۔
اُن کے نعرۂ تکبیر سے بڑے بڑے مُستحکم قلعے ایک دم گر پڑیں گے۔ دجال کے پاس تو
شعبدے ہی ہوں گے۔ حضرت امام کے پاس اللہ تعالےٰ کی طرف سے بڑی بڑی کرامات
ہوں گی جن سے مُسلمان کے دل مطمئن اور مضبوط ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی عادت یہی
ہے کہ ہر فرعون کے ساتھ ایک موسیٰ اور ہر زہر کے ساتھ تریاق بھی پیدا فرما دیتے ہیں۔

جائے گا۔ چنانچہ اس وقت گھڑی گھنٹے موجود ہیں۔ گھڑی کے ذریعے اوقات نماز کا پتہ چلتا ہے
گا اور اسی سے ایام کی گنتی بھی رہے گی جس سے رمضان کا آنا معلوم ہوگا اُس میں روزہ بھی گھڑی
کے اندازے سے رکھ لیا جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت مُسلمانوں کو ایام کی شمار بڑے
اہتمام سے کرنا ہوگی اور ہر مہینہ تیس دن کا شمار کرنا ہوگا۔ اسی سے رمضان کا علم روزہ کے لیے
اور ذی الحجہ کا علم حج کے لیے ہوگا اور ممکن ہے کہ اُس وقت اللہ تعالےٰ مُسلمانوں کو علم اوقات کا
کوئی اس سے بھی زیادہ آسان طریقہ بتلا دیں۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔ ۲۰ ظ۔

تاکہ طالب حق گمراہی سے محفوظ رہیں اور جو خود ہی گمراہ ہونا چاہے اس کا کوئی علاج نہیں) اسی لیے اہل تحقیق اُن خوارق عادات پر نظر نہیں فرماتے جو اُن کے ہاتھوں سے ظاہر ہو جاتی ہیں اگرچہ وہ کتنی ہی زیادہ ہوں (کیونکہ خوارق عادات دجال سے بھی ظاہر ہوں گی تو اُن پر نظر کرنا اور اُن کو مقبولیت کی علامت قرار دینا غلطی ہے جب تک ان خوارق کے ساتھ کمال اتباع سُنّت اور تقویٰ اور محبت حق موجود نہ ہو) بعض بزرگانِ دین تو ان خوارق سے ڈرتے اور اللہ تعالےٰ سے درخواست کرتے تھے کہ اُن کو اس سے معاف کیا جائے۔ چنانچہ ایک بزرگ سفر کر رہے تھے راستہ میں دریا آگیا جس سے پار ہونا بدون کشتی کے دشوار تھا اُن کے پاس کچھ تھا نہیں جو کشتی والے کا کرایہ دے دیتے یہ سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کروں دفعۃً ان کی نظر دریا پر پڑی کہ اُس کے دونوں کنارے اس قدر قریب ہو گئے ہیں کہ ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے یہ دیکھ کر گھبرا گئے اور عرض کیا خداوندا اگر یہ کرامت ہے تو اسے کو آخرت کے لیے میرے واسطے ذخیرہ (کے طور پر محفوظ) کر لیجئے اور اگر شیطان مردود کی طرف سے (کوئی شعبدہ) ہے تو اس کو مجھ سے دفع کر دیجئے۔ دریا فوراً جیسا تھا ویسا ہی ہو گیا اور بزرگ نے اپنے کپڑوں میں سے ایک کپڑا کشتی والے کو دیا جس کے بعد (کرایہ دے کر) پار ہو گئے۔

بزرگوں سے اس قسم کی حکایات بہت ہیں (جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارق عادات سے خوش نہ ہوتے تھے بلکہ ڈرتے تھے) بس اُن کو تو اپنے اعمال اور ایمان کی تحسین و تکمیل کا اہتمام تھا اور ان ہی کی برکات کی طلب تھی۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص چالیس دن تک اللہ تعالےٰ کے لیے (اپنے اعمال میں) اخلاص (کا اہتمام) کرے حکمت کے چشمے اُس کے دل سے زبان پر ظاہر ہونے لگتے ہیں (یعنی اول اخلاص کی برکت سے دل میں علوم حکمت کا القاء ہوتا ہے پھر اُس کی زبان سے حکمت کی باتیں نکلنے لگتی ہیں۔ یہ حدیث صوفیاء کی چلہ کشی کی اصل ہے) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رقت (قلب) کو تین چیزوں میں

طلب کرو۔ نماز میں، تلاوتِ قرآن میں، ذکر اللہ میں۔ اگر ان میں رقت پاؤ (تو خیر) ورنہ جان لو کہ دروازہ بند ہے (یس ایمان اور اعمالِ صالحہ کی یہ برکات تو مطلوب ہیں۔ کرامات و خوارق عادات مطلوب نہیں) اسی طرح اور جو حقوق (شرعیہ) ہیں (وہ اُن کا اہتمام کرتے ہیں) اُن ہی سے اُن کا حال درست ہوتا ہے۔

قوله وفيه دليل على كثرة ما يعطى هذا اللعين من خرق العادة الى قوله و بها اصلاح حالهم۔

ف ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں میں رقت قلب کی طلب کا حکم دیا ہے مگر آج کل بعض مدعیان تصوف سماع اور قوالی میں رقت قلب کی تلاش کرتے ہیں مگر وہ یاد رکھیں کہ اہل سماع کو نماز اور تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ میں رقت حاصل نہیں ہوتی اور جس کو ان سے رقت حاصل نہ ہو اُس پر دروازہ بند ہے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بزرگانِ دین نے جو سماع سنا ہے وہ آجکل کا سا سماع مزامیر کے ساتھ نہیں تھا اور جیسا بھی تھا بطور غذا کے نہ تھا بلکہ دوا کے طور پر تھا۔ جب کسی پر قبض طاری ہوتا تھا اُس وقت بطور علاج کے اُس کو استعمال کرتے تھے۔ مگر آجکل لوگوں نے دوا کو غذا بنا لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نماز اور تلاوت و ذکر میں ان کو رقت و حلاوت نصیب نہیں ہوتی جو حدیث کے موافق محرومی کی علامت ہے۔

ف ۔ آج کل پنجاب میں ایک اور مدعی پیدا ہوئے ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ دجالِ اکبر پیدا ہو چکا ہے اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا قادیانی بھی دجالوں میں سے ایک تھا مگر دجالِ اکبر نہ تھا۔ اُس میں دجالِ اکبر کی علامات موجود نہ تھیں۔ بڑی علامت تو یہ ہے کہ اُس کا ظہور زمانہ مہدی علیہ السلام میں ہو گا اور اب تک حضرت امام کا ظہور نہیں ہوا۔ دوسری علامات وہ ہیں جو مختصراً اس مقام میں مذکور ہیں مگر پنجاب کے مدعی نے ان خوارق میں عجیب بے تکی تاویلیں کی ہیں اور بعض کے راویوں کو بے وقوف بتایا ہے مگر اُس کو اتنا شعور نہیں کہ قرآن و

حدیث کے سمجھنے والے وہی لوگ تھے جو زمانۂ نزول وحی میں موجود یا اسی کے قریب تھے۔ جس شخص کو فصاحت و بلاغت اور اعجازِ قرآن کی ہوا بھی نہ لگی ہو نہ قرآن و حدیث سے کافی ذوق ہو اس کو فہم قرآن و حدیث کا دعویٰ جائز نہیں۔ اگر اس طرح حدیثوں میں بے تکی تاویلیں کی جائیں گی اور راویانِ حدیث کو بے وقوف بتایا جائے گا تو ایسا شخص خود ستر دجالوں میں سے ایک دجال ہوگا۔

رہا یہ کہنا کہ یہ باتیں عقل میں نہیں آتیں تو قیامت کی علامات کا تمہاری عقل میں آنا ضروری نہیں۔ صرف حدیث کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ قیامت کی کیفیت خود عقل میں نہیں آسکتی تو اس کی علامات کا عقل میں آنا کیا ضروری ہے؟ اور اب تو سائنس نے بہت سی بعید از قیاس باتوں کو قریب کر دیا ہے۔ پہلے کس کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ ریڈیو کے ذریعے لندن کی تقریر ہندوستان میں سنی جاسکتی ہے۔ مگر آج سب سن رہے ہیں۔ پس انتظار کرو انشاء اللہ عنقریب وہ وقت بھی آجائے گا جب علاماتِ قیامت سب کی سب تمہاری عقلوں سے قریب ہوجائیں گی۔ اس مدعی نے ایک کمال تو یہ کیا ہے کہ ظہور مہدی کا تو اقرار کیا ہے مگر نزول مسیح علیہ السلام سے انکار ہے حالانکہ سلف میں بعض ایسے تو گزرے ہیں جنہوں نے ظہور مہدی سے انکار کیا ہے اور حدیث ابن ماجہ لا مہدی الا عیسیٰ کی وجہ سے مہدی اور مسیح کا مصداق عیسیٰ علیہ السلام ہی کو قرار دیا ہے مگر ایسا کوئی نہیں ہوا جس نے نزول مسیح سے انکار کیا ہو۔

امتِ مسلمہ کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ مہدی اور عیسیٰ علیہ السلام الگ الگ دو شخصیتیں ہیں اور حدیث ابن ماجہ کو ضعیف کہا ہے جو احادیث صحیحہ متواترہ کو رد نہیں کر سکتی۔ عیسیٰ علیہ السلام زمانۂ مہدی میں آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال اکبر کو اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے۔ اس وقت چونکہ دجال کا مقابلہ ہوگا جس کے پاس خوارق عادات بہت کچھ ہوں گے اس لیے عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بہت خوارق عادات ظاہر ہوں گے۔ پس یہ شبہ لغو ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے ایسے معجزات اپنی نبوت کے زمانے میں تو ظاہر نہیں ہوئے اب زمانۂ مہدیت میں کیوں ظاہر ہوں گے؟ جواب

واضح ہے کہ اس وقت دجال اکبر کا مقابلہ ہوگا جس کے برابر اہل باطل میں کوئی بھی صاحب خوارق نہیں ہُوا۔ ایک شُبہ یہ کیا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کے سانس سے سارے کافر ہلاک ہو جائیں گے تو وہ تجدید دین کے لیے تبلیغ و اصلاح کس کی کریں گے؟ جواب یہ ہے کہ یہ خاصیت اُن کے سانس میں لشکر دجال سے مقابلے کے وقت ہوگی کہ اُس کے ساتھ ٹڈی دل کافر ہوں گے اور ممکن ہے اُس کے پاس میدان جنگ میں چھوڑنے کیلئے گیس وغیرہ بھی ہوں اُن کے گیس کا جواب عیسیٰ علیہ السلام کا سانس دے گا۔ اُن کا گیس تو دوست دشمن سب ہی کو ہلاک کرنے والا ہوگا مگر عیسیٰ علیہ السلام کا سانس صرف کافروں کو ہلاک کرے گا۔ مسلمانوں کو قوت و فرحت بخشے گا۔ اس طرح دجال کے قتل تک بہت سے کافر ہلاک اور بہت سے فرار ہو جائیں گے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہے گا، تو اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے سانس سے کفار ہلاک نہ ہوں گے۔ چنانچہ خروج یاجوج و ماجوج کے وقت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوگا کہ مسلمانوں کو لے کر کوہ طور پر چلے جائیں۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کے سانس میں یہ خاصیت دائمی ہوتی تو اُن کو کوہ طور پر جانے کا حکم کیوں ہوتا؟ بلکہ یہ حکم دیا جاتا کہ اپنے سانس سے یاجوج و ماجوج کو بھی ہلاک کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُن کے سانس میں یہ خاصیت صرف اُسی ایک میدان میں ہوگی جہاں دجال سے مقابلہ ہوگا۔ اسی طرح اُس نے اور بھی شبہات نکالے ہیں جن کا منشا محض قلت فہم اور قلت ایمان ہے جس کو خدا کی قدرت پر پورا ایمان ہے وہ ایسے شبہات نہیں کر سکتا خوب سمجھ لو۔

(۲۲۵) حرمت مکان سے ایمان ہی کے ساتھ نفع ہوتا ہے ~~معلوم~~ بیان ہے

ہُوا کہ مکان کی حُرمت ایمان کے ساتھ ہی نفع دیتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دجال کی طرف (مدینہ سے) ہر کافر اور منافق نکل کھڑا ہوگا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت مدینہ میں کفار اور منافق بھی ہوں گے حالانکہ اس وقت وہاں نفاق ظاہر نہیں۔ نہ مدینہ میں کوئی کافر مقیم ہے نہ وہاں جا سکتا ہے تو اس وقت عالم

میں فساد بہت ہی زیادہ ہوگا (کہ کفار و منافقین مدینہ میں آباد ہوں گے) حضورؐ نے عاصی اور فاسق نہیں فرمایا (بلکہ کافر و منافق فرمایا ہے تو یہ لوگ باوجود مدینہ میں رہنے کے فتنۂ دجال سے محفوظ نہ رہیں گے کیونکہ بدون ایمان کے حرمت مکان سے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ مدینہ کے مومن تو سب اُس کے فتنہ سے محفوظ رہیں گے خواہ متقی ہوں یا غیر متقی۔ کیونکہ ایمان کے ساتھ برکت مکان سے سب کو نفع ہوتا ہے) اسی لیے امام مالکؒ نے اپنے ایک دوست کو لکھا (صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو لکھا) تھا جبکہ اُنھوں نے بیت المقدس کی طرف جانے کا ارادہ کیا کہ زمین کسی کو پاک نہیں کرتی بلکہ انسان کو اُس کا عمل پاک کرتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ اپنے لیے ایسی چیز کو تلاش کر لو جو تم کو پاک کر دے خواہ حُسن علم ہو یا حُسن عمل کیونکہ بخدا معاملہ بہت نازک ہے۔

وفیه دلیل علی ان حرمة البقعة لا تنفع الا مع الایمان الی قوله فالامر واللّٰه خطر۔

ف۔ حضرت شارح کے زمانے میں تو یہ بات کسی مسلمان کی عقل میں نہ آسکتی تھی کہ مدینہ میں کفار و منافقین بھی رہ سکتے ہیں۔ مگر آجکل ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ امریکہ کی کمپنی کو حجاز کے معادن اور پٹرول کا ٹھیکہ دے دیا گیا ہے اور یہ لوگ بے تکلف مکہ مدینہ کے آس پاس موٹریں لیے پھرتے ہیں۔ کیا عجب ہے کسی وقت اُن کو مدینہ میں مکان بنا کر رہنے کی بھی اجازت دے دی جائے۔ سُلطان نجد و حجاز کا یہ فعل تمام مُسلمانوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے کہ اُنھوں نے کفار کو اس قسم کا ٹھیکہ دے کر حجاز میں رہنے کا موقعہ کیوں دیا؟ اگر معادن کی تلاش ہے تو پہلے اپنے آدمیوں کو یورپ و امریکہ بھیج کر اس کام کی تعلیم دی ہوتی پھر اُن تعلیم یافتہ مسلمانوں سے یہ کام لیا ہوتا۔ مگر آجکل ہمارے سلاطین کو جو سوجھتی ہے اُلٹی ہی سُوجھتی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود تو سب کے سب دجال کے ساتھ ہوں گے وہ تو اُس کو اپنا بادشاہ اور خُدا کہیں گے۔ ممکن ہے کہ کچھ نصاریٰ یہود کی عداوت کے سبب دجال کو نہ

مائیں اور مسلمانوں سے یہ سُن کر کہ مکہ اور مدینہ میں دجال نہ پہنچ سکے گا، مدینہ میں پناہ لیں اور کچھ منافقانہ اسلام بھی لے آئیں مگر چونکہ دل میں ایمان نہ ہوگا اس لیے زلزلوں سے گھبرا کر دجال کے پاس پہنچ جائیں گے۔

ف۔ یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو محض قیامِ اجمیر یا پیرانِ کلیر یا قیامِ چوک تلمندرہی پر قناعت کئے ہُوئے ہیں۔ اعمال کا اہتمام نہیں کرتے نہ ایمان کی حفاظت کرتے ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ مکان مقدس سے اُس کو نفع ہوتا ہے جو اُس کے تقدس کی رعایت کر کے اپنے اعمال اور ایمان کو مقدس کرنے کی کوشش کرے ورنہ قیامِ مدینہ بھی نفع نہیں دے سکتا۔

(۲۲۶) دعویٰ کی حقیقت امتحان کے وقت کُھلتی ہے یہاں سے معلوم ہُوا کہ دعوے کی حقیقت امتحان ہی کے وقت کُھلتی ہے۔ دجال کے قصہ میں دیکھو کہ بہت لوگ ایمان کی آڑ لیتے اسلام کا دعوے کرتے ہوں گے مگر دجال کے آنے پر یہ دعویٰ کچھ بھی نہ ٹھہرے گا۔ ہاں جس کا ایمان واقعی (سچا) ہوگا اور ایمان کے مقتضے پر عمل بھی کرتا ہوگا (وہ ثابت قدم رہے گا) اسی لیے جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فتنوں کا ذکر فرمایا اور صحابہ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اگر یہ زمانہ ہمارے سامنے آجائے تو آپ اُس وقت کے لیے ہم کو کیا حکم دیتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا الجاؤ والی الایمان والاعمال الصلحٰت" ایمان اور اعمالِ صالحہ کی پناہ حاصل کرو"

حالانکہ یہ حضرات سب مومن تھے پھر بھی ایمان و اعمالِ صالحہ کی پناہ لینے کو فرمایا تو مطلب یہ ہے کہ ایمان کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ اور اعمالِ صالحہ بھی ایمان کو قوت دینے والے ہیں کہ اسی سے ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔

ہر شخص کو اپنی حالت میں غور کرنا چاہیئے اور اس میں ہر شخص کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں

اپنے نفس کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ کیونکہ کوئی زمانہ بھی دجالوں سے خالی نہیں ہوتا۔ (حدیث شریف میں ہے کہ میرے اور دجال اکبر کے درمیان کچھ اوپر ستر دجال ہوں گے) پس ہر شخص کو اپنی حالت میں نظر کرنا چاہیئے۔ مبادا وہ دجال کے متبعین میں سے ہو یا خود ہی (ستر دجالوں میں سے ایک) دجال ہو۔

معیارِ امتحان کتاب وسنت کی میزان ہے بشرطیکہ تفسیر سلف صالح کے موافق ہو

اور اس کی پہچان کا ایک ہی معیار ہے کہ اپنے کو کتاب وسنت کی میزان سے تول کر دیکھتا رہے اور کتاب وسنت کی تفسیر سلف صالح کے موافق کرتا رہے (سبحان اللہ! کیا بات فرمائی ہے جس نے ہر دجل وفریب کا رخنہ بند کردیا کیونکہ بعض لوگ اپنی حالت کو کتاب وسنت کے موافق تو ظاہر کرتے ہیں مگر کتاب وسنت کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں اس طرح اپنے کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور مخلوق کو بھی۔ اگر کتاب وسنت کی تفسیر سلف صالح کے موافق کر کے اپنی حالت کو اُس کے موافق نہ پائے (اور پھر بھی کمال کا مدعی ہو) تو یہ شخص مستدرج ہے اور اُس کو پتہ بھی نہیں۔ وہ اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد کا مصداق ہے سنستدرجهم من حیث لا یعلمون - ہم اُن کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے کہ اُن کو خبر بھی نہ ہوگی۔ اسی معنی کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ حاسبوا قبل ان تحاسبوا۔ اپنا محاسبہ خود کرتے رہو اس سے پہلے کہ (قیامت میں) تم سے حساب لیا جائے گا اور (ہر وقت) ادب اور خوف کو اپنے اوپر لازم سمجھے کیونکہ یہ بڑا معاملہ سنگین ہے اور آج ہم ایسے زمانے میں ہیں جس میں بھلائی کے نشان بدل گئے اور راستے مختلف ہو گئے ہیں۔ بھلائی کی طرف بلانے والے اور چلنے والے کم ہیں اور زیادہ شر کی طرف بلانے والے اور شر کے راستہ پر چلنے والے

عہ ذکرہ الشارح فی شرح ھذا الحدیث ۱۲ ظ

ہیں) اللہ تعالٰے اپنے فضل سے لطف کے ساتھ ہماری دستگیری فرمائیں (آمین وصلی اللہ علیٰ خاتم النبیین سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین)۔

ف ۔ حق بات کو چھپایا نہیں جاسکتا ہر زمانے میں صدی کے شروع پر اللہ تعالٰے اس امت میں مجدد پیدا فرماتے ہیں جو دین کی اصلی صورت کو مسلمانوں کے سامنے واضح کر دیتے اور حق کو باطل سے جدا کر دیتے ہیں اور اہلِ قلوب کو اعتراف ہے کہ اس صدی کے مجدد حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ تھے۔ پس مسلمانوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات ومواعظ ورسائل کا مطالعہ کرنا اور حق وباطل کو اُن کے ارشادات سے معلوم کرنا چاہیئے۔

حضرتؒ کے وہ خدام ابھی تک زندہ ہیں جن کے سامنے حضرت اقدس نے ایک دو بار نہیں بلکہ بار بار فرمایا ہے کہ مسٹر گاندھی اس زمانے کا دجال ہے اسی لیے حضرتؒ کو کانگرس سے نفرت تھی اور اُس میں شرکت سے مسلمانوں کو منع کرتے تھے۔ اب بعض عقلمندوں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جوازِ شرکت کانگرس کے لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالٰے علیہ کا وہ فتویٰ پیش کرتے ہیں جو (بہ تقدیر صحت نسبت کہ ہنوز اُسی میں کلام ہے) ۱۸۸۶ء کا لکھا ہوا ہے جب کہ کانگرس میں گاندھی کا وجود بھی نہ تھا اثر تو کیا خاک ہوتا۔ اور حضرت حکیم الامتؒ نے شرکتِ کانگرس سے اُس وقت منع فرمایا ہے جب مسٹر گاندھی کا نام کانگرس اور کانگرس کا نام گاندھی ہوگیا اور وہ مسٹر گاندھی سے مہاتما گاندھی بن گیا تھا۔ اہلِ عقل سیاست دان طبقے نے تجربہ کے بعد حضرت حکیم الامتؒ کے ارشاد کے موافق عملی آنکھوں دیکھ لیا کہ واقعی یہ شخص دجال ہے جس کا ظاہر صلح کل اور باطن دشمنِ اسلام ہے۔ دل کی دشمنی چھپی نہیں رہتی کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔

قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفي صدورهم اكبر قد بينا لكم الآيات ان كنتم تعقلون ۝

زیادہ افسوس اُن علماء پر ہے جو اب تک کانگرس کا دُم چھلا بنے ہوئے

اور مسلمانوں کو اُس کے ساتھ وابستہ رہنے کی تعلیم دے رہے ہیں حالانکہ کانگریس کی اسلام دشمنی اب بالکل عیاں ہو چکی ہے۔ واقعہ بہار و گڑھ مکتیشر میں اُس نے اپنی دشمنی کا ایسا خونیں مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان نہیں مل سکتی۔ مسلمانوں کو ان نام نہاد علماء کی باتوں میں نہ آنا چاہیئے اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ارشادِ گرامی کو مشعلِ راہ بنا کر اس دجال سے اور اس کی جماعت سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔

دُوسرا دجال اس زمانے میں مرزا غلام احمد قادیانی تھا جو بہت سال ہوئے گزر چکا مگر اس کی جماعت باقی ہے مسلمانوں کو اس جماعت سے بھی دُور رہنا اور اُس کے دجل و فریب سے بچتے رہنا چاہیئے۔

باب ہشت و ہفتم

حدیث

من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج

عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا جو تم میں سے بیوی کے نان ونفقہ کا متحمل ہو اُس کو نکاح کرنا چاہیئے کہ وہ نگاہ کو زیادہ محفوظ کرتا اور شرمگاہ کو زیادہ پاک دامن بنادیتا ہے اور جو اس کا متحمل نہ ہو سکے وہ روزہ کو اپنے اوپر لازم کرلے کہ وہ مادۂ شہوت کو کم کرنے والا ہے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ اس میں نکاح کا امر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلیتزوج فرمایا ہے جو امر کا صیغہ ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ مادۂ شہوت کو کم ور کر دیتا ہے۔ اسی لیے دوسری روایت میں روزے کا حکم جوانوں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ بوڑھوں میں یہ مادہ خود ہی کمزور ہو جاتا ہے اور وہ آسانی سے اُس کے تقاضے کو دفع کرسکتے ہیں۔ جوان آدمی اُس کے تقاضے کو آسانی سے دفع نہیں کرسکتا تو اُس کو روزہ کا حکم دیا گیا، اگر چہ وہ ہمت کرے تو بدون روزہ کے بھی یہ تقاضا دفع ہو سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغض للبصر و احصن للفرج فرمایا ہے کہ روزہ نگاہ اور شرمگاہ کو زیادہ محفوظ کرتا ہے یعنی حفاظت کا ایک درجہ بغیر اُس کے بھی قدرت میں رہتا ہے۔ اسی لیے ہر شخص کو ہر حالت میں نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت کا شرعاً امر ہے خواہ اُس میں کتنی ہی زیادہ

شہوت ہو۔ کیونکہ آنکھیں نیچی کرلینا اور شرمگاہ کو حرام سے بچانا قدرت سے باہر کسی وقت بھی نہیں اگرچہ جوان کو اس میں بڑا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور جب تک وہ دین میں مضبوط نہ ہو اس قدرت کو کام میں نہیں لاسکتا (مگر مجاہدہ اور مشقت لازم آنے سے قدرت سے خارج ہونا لازم نہیں آتا) یہ اور بات ہے کہ اسبابِ سہولت پر عمل کرنے کے بعد زیادہ آسانی ہوجاتی ہے۔ اسی لیے جوانوں کو روزے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ زیادہ روزہ رکھنے سے اس مادّے کا تقاضا شدید نہیں رہتا (ھذا خلاصۃ ماذکرہ الشارح رحمہ اللہ ورضی عنہ)

(۲۲۷) انسان اسباب سے کام لینے کا مامور ہے یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان اسباب سے کام لینے کا مامور ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرارت (شہوت) دفع کرنے کے لیے سبب سے کام لینے کا حکم فرمایا ہے کہ شادی کرلے اگر اس کی قدرت نہ ہو تو روزہ رکھے۔ اسی طرح جو بھی نفع اور ضرر ہو انسان کو اُس کے دفع یا تحصیل کے اسباب کو کام میں لانا چاہیے۔ جس طرح بھی شریعت کے موافق اُسے قدرت ہو (یہ تو اس حدیث کا مدلول تھا) لیکن دُوسری حدیث اس کے معارض (بھی) ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ مَیں جوان ہوں اور مجھے اپنے اوپر زنا میں مُبتلا ہونے کا خطرہ ہے اور عورتوں سے شادی کرنے کی قدرت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سُن کر خاموش رہے تو انھوں نے کئی مرتبہ اسی بات کو دُہرایا۔ تیسری دفعہ آپ نے فرمایا جو کچھ تم کو پیش آنے والا ہے قلم (تقدیر) اُس کو لکھ کر خشک ہوچکا ہے اب چاہے اسی پر اکتفا کردیا (پریشانی) بڑھاتے رہو۔

یہاں حضورؐ نے ترک اسباب اور رضا بر قضا کا حکم فرمایا اور جس حدیث کی ہم شرح کررہے ہیں اُس میں اس حالت کے زوال کی تدبیر اور اسبابِ زوال میں کوشش کرنے کا حکم ہے۔ دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ ابوہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے تھے جن کو اکثر فاقہ کی نوبت پیش آتی تھی اور حضرت ابوہریرہؓ تو بھوک کی شدت

سے بے ہوش بھی ہو جاتے تھے پھر بھی اُن کی حرارتِ شہوت کم نہ ہوتی تھی۔ اس لیے اُن کو روزے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ توکل اور رضا برقضاء کی تعلیم دی گئی (جواب کا حاصل یہ ہوا کہ جب تک تدبیر نافع ہو تدبیر کرنے کا حکم ہے اور جب تدبیر بیکار ہو جائے اُس وقت تقدیر پر راضی رہنے کا حکم ہے۔ پس تعارض نہ رہا) چنانچہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اُونٹنی کو کھلا چھوڑ کر اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کروں (یا باندھ کر توکل کروں) فرمایا اعقلہا و توکل اس کو باندھ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو (اگر باندھنے کے بعد بھی کسی طرح بھاگ جائے (اور تلاش سے نہ ملے) تو اب تقدیر پر راضی ہو) غرض حضورؐ نے اس حدیث میں تو حکمِ شریعت بیان فرمایا ہے اور ابوہریرہؓ کے واقعہ میں حکمِ حقیقت بیان فرمایا ہے یعنی تسلیم و رضا۔

پس انسان کو چاہیئے کہ اسبابِ شرعیہ میں اپنی سی کوشش پوری کرے جن کے اختیار کرنے پر عادۃ الٰہیہ یوں ہی جاری ہے کہ اُن سے نفع حاصل ہوتا یا ضرر دفع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسباب پر نظر نہ کرے۔ یہ نہ سمجھے کہ ان ہی سے نجات ہوگی۔ بلکہ قضاءِ الٰہی کے سامنے گردن جھکا دے اور سمجھ لے کہ نجات محض فضل سے ہوگی اس کے عمل سے نہ ہوگی۔ جیسا ابراہیم علیہ السلام نے اوّل تو ایمان کی تحقیق میں پوری کوشش صرف کی (اپنی قوم کی کٹ حجتی کا پوری طرح جواب دیا) مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ (ساتھ ساتھ) یہ بھی فرمایا (ولا اخاف ما تشرکون بہٖ الا ان یشآء ربی شیئا وسع ربی کل شیء علما۔ میں تمہارے ان جھوٹے معبودوں سے اصلا نہیں ڈرتا (یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) ہاں میرا پروردگار ہی کچھ چاہے (تو اور بات ہے) میرا رب ہر چیز کو اپنی وسعتِ علم سے محیط ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام مشیت پر بھروسہ کرنے والے تھے (اسباب پر نظر کرنے والے نہ تھے) اسی طرح ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے تھے کہ شیطان ملعون آپ کے سامنے آیا اور کہنے لگا اے عیسیٰ! تمہارا قول یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالےٰ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے وہی سامنے آتا ہے (تقدیر کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا) تو اپنے کو اس پہاڑ

کی چوٹی سے گرا دو (جو تقدیر میں ہے وہی سامنے آئے گا) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آقا کو تو غلاموں کے امتحان کا حق ہے مگر غلام کو آقا کے امتحان کا حق نہیں۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ ایک شخص نے کہا آپ لوگ تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہی رزق دیتا ہے وہی رزق کو بند کرتا ہے پھر آپ کی اس تدبیر اور محنت سے کیا فائدہ؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ہاں بات تو وہی ہے جو لوگ کہتے ہیں۔ یہ فرما کر پھر اپنے شغل میں لگ گئے (مطلب یہ تھا کہ ہماری تدبیر اور عمل کے بعد بھی وہی ملے گا جو مقدر میں ہے مگر جب تک تدبیر سے نفع کی امید ہو تدبیر کرنا چاہیے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ اسباب اور تدبیر کے پردہ میں تقدیر کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب تدبیر بیکار ہو جائے اس وقت تسلیم و رضا کے ساتھ تقدیر پر قانع ہونا چاہیئے)۔

انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے جو اس سے باہر ہُوا وہ راستہ سے بھٹک گیا جب وہ یہ سمجھے گا کہ میرا عمل سببِ نجات ہے تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ قدرتِ (الٰہی) کو پابند کر رہا ہے (جیسا معتزلہ کا قول ہے کہ نیک عمل پر ثواب دینا اور گناہوں پر سزا دینا خدا تعالیٰ پر لازم ہے یہ لوگ اللہ تعالےٰ کو مقید اور پابند کرنا چاہتے ہیں) اور یہ (صریح) گمراہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کسی کو اُس کا عمل جنت میں نہ پہنچائے گا۔ صحابہ نے کہا۔ یا رسول اللہ! اور نہ آپ کو؟ فرمایا مجھے بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالےٰ کا فضل و رحم مجھے ڈھانپ لے اور حق تعالےٰ فرماتے ہیں من یضلل اللہ فلا ھادی لہ جس کو اللہ گمراہ کر دے اُس کو ہدایت کرنے والا کوئی نہیں۔ جب اللہ تعالےٰ یہ چاہیں کہ کسی (نیک) عمل کرنے والے کا خاتمہ شقاوت پر ہو اور وہ گمراہوں میں داخل ہو تو اُس کے خلاف پر کسے قدرت ہے؟ جیسے بلعم عہ بن باعورا وغیرہ (کا حشر

عہ بہت سے مفسرین ابن جریر اور قرطبی وسیوطی رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ یہ شخص اسم اعظم کا عالم تھا جس سے دعا کی جاتی تو قبول ہوتی ہے کچھ مانگا جاتا تو سوال پورا ہوتا ہے اس نے اسم اعظم کیا تو موسیٰ پر اور ایک روایت میں ہے کہ یوشع پر) بددعا کرنا چاہی تو اسم اعظم سلب کر لیا گیا۔ نعوذ باللہ من الحور بعد الکور ولن یعبہ بعد الھدی)۔

ہوا) اللہ کے حکم کو رد کرنے والا کوئی نہیں وہ جو چاہیں کریں اُن سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں (مگر اس سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اُس کو اپنی تقدیر کا علم نہیں۔ اس کو جن اعمال کا مکلف کیا گیا ہے وہ اُس کی قدرت سے باہر نہیں۔ جن اعمال سے اُس کا خاتمہ اچھا ہوسکتا ہے وہ بھی قدرت میں ہیں اور جن سے خاتمہ بُرا ہوتا ہے وہ بھی قدرت میں ہیں۔ اگر کسی کا خاتمہ بُرا ہوتا ہے وہ اپنے قصد و اختیار سے ایسے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے جن کو خاتمہ خراب کرنے میں دخل ہے جیسے بلعم بن باعورا نے رسولِ وقت کے مقابلہ میں اسم اعظم سے بددعا کرنے کا قصد کیا جس میں وہ ہرگز مجبور نہ تھا اس کے انجام کو جانتا تھا اسی لیے بار بار اپنی قوم کی درخواست کو رد کرتا رہا بالآخر بیوی کے بہکانے سے اس پر آمادہ ہوا جس کا نتیجہ بد سامنے آگیا کہ اسم اعظم کے ساتھ ایمان بھی سلب ہوگیا۔ نعوذ باللہ من ذالک اسی طرح ابلیس نے قصداً سجدۂ آدم سے انکار کیا اور اپنے انکار کی منطقی وجہ بھی بیان کی کہ میں آدم سے افضل ہوں۔ وہ مٹی سے بنائے گئے ہیں میں آگ سے بنایا گیا ہوں اور اس انکار کے نتیجہ سے بھی وہ واقف تھا مگر تکبر وغرور سے جان بوجھ کر شقاوت کو اپنے سر لیا۔ چنانچہ کسی نے اُس کی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

در لوح بُد نوشتہ کہ ملعون شود یکے

بردم گماں بہر کس و برخود گماں نبود

آدم زخاک بود و من ازنور پاک او

گفتم منم یگانۂ واو خود یگانہ بود

پھر جو شخص اپنے عمل کو موجب نجات سمجھے گا وہ یقیناً اپنے کو نیک سمجھے گا اور یہ بڑی گمراہی ہے کیونکہ وہ اپنا تزکیہ کرتا ہے (اپنی حالت کو اچھا سمجھتا ہے) اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقیٰ۔ اپنی تعریف خود مت کرو۔ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ متقی کون ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ کے ذمے کسی کا تزکیہ نہ کرو (یعنی یہ نہ

کہو کہ یہ شخص اللہ کے نزدیک مقبول اور مقرب ہے، تم کو اس کی کیا خبر۔ ہاں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی ہے اُن کا تزکیہ کر سکتے ہو) اس حدیث کا شانِ بیان یہ ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا تو صحابہ نے اس کی تعریف کی (کہ اے فلاں تجھ کو جنت مبارک ہو، تجھ کو خدا کا قرب مبارک ہو۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ذمے کسی کا تزکیہ نہ کرو) پھر فرمایا ہاں یوں کہو (کہ میرا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو مقامِ قرب عطا فرمایا ہوگا۔ میرے خیال میں تو شہادت سے کامیاب ہوا ہے مثلاً) اور یہ حدیث اُس حدیث کے معارض نہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اذا رأيتم الرجل يواظب المسجد فاشهدوا له بالايمان۔ جب تم کسی کو دیکھو کہ مسجد کو لگا لپٹا رہتا ہے تو اس کے متعلق مومن ہونے کی شہادت دو۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حالت تمہارے سامنے ہے اُس کی شہادت دو۔ رہا باطن اور انجام کا حال تو اُس کو تم کیا جانو؟ یہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہی جس کو چاہیں گے اپنے فضل سے اچھا کر دیں گے اور جس کو چاہیں گے اپنے عدل سے عذاب دیں گے۔ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف سے ارشاد فرمایا ہے وما ادری ما يفعل بی ولا بكم۔ مجھے کیا خبر کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ اور تمہارے ساتھ کیا؟ (آیت میں معاملۂ آخرت مراد نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا آخرت میں کامیاب ہونا یقینی ہے جس کا علم خود انبیاء کو بھی یقین کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مراد دنیوی معاملہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ دُنیا میں مجھے غلبہ ہوگا یا تم کو اور مجھے غلبہ ہوگا تو جلدی ہوگا یا دیر میں اور مکہ میں رہتے ہوئے ہوگا یا باہر جا کر ہوگا وغیرہ وغیرہ)۔

نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لا یسئل عما یفعل۔ اللہ تعالیٰ سے اُن کے افعال کے متعلق کوئی باز پُرس کرنے والا نہیں۔ اس آیت کے سامنے گردنیں جُھک گئیں اور بڑے بڑے اعمال والے اخلاص والے اس آیت کے خوف سے پست ہو گئے۔ پس نجات اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم ہی پر موقوف ہے عمل یا کثرتِ عمل پر مدار نہیں

ہاں یہ ضرور ہے کہ عمل سے مومن کو بشارت (اور خوشی) ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی مراد کی توفیق دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فسنیسرہ للیسری (جو شخص نیک اعمال ایمان کے ساتھ بجالاتا ہے) ہم اُس کو آسان راستہ کی (یعنی حصولِ جنت کی) توفیق دیتے ہیں نیز ارشاد ہے وسنیسرہ للعسری اور (جو شخص بُرے اعمال کرتا اور اچھی بات کو جھٹلاتا ہے یعنی کفر اختیار کرتا ہے) ہم اُس کو مصیبت کے راستہ کی (یعنی دخولِ جہنم کی) توفیق دیتے ہیں۔ تو جس شخص کو نیک اعمال کی توفیق ہو رہی ہے اُس کو خوشی ہوتی ہے اور اللہ کے فضل کی قوی اُمید ہو جاتی ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ حق تعالےٰ شانہٗ اُن لوگوں کا ذکر فرما کر جن کو نیک اعمال کی توفیق دی گئی ہے ارشاد فرماتے ہیں اولئک یرجون رحمۃ اللہ۔ یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں جس میں رجا کو اُن لوگوں کا حصّہ قرار دیا گیا ہے جن میں اعمالِ مذکورہ موجود ہوں اور یہ اوصاف اُن ہی کے ہیں جن کو اعمالِ جنت کی توفیق دی گئی ہے۔ اور جس شخص کے لیے اہلِ شقاوت کے اعمال آسان کر دیئے گئے اُس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُسے جہنم کی طرف آہستہ آہستہ لے جایا جا رہا ہے۔ اُس پر لازم ہے کہ اس راستہ سے جلدی ہٹے اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔ توبہ استغفار کی کثرت کرے اور اللہ تعالےٰ سے مدد چاہے اُمید ہے کہ وہ اس کو قبول فرمالیں گے اور شقاوت کے راستہ سے ہٹادیں گے اور اپنے فضل وکرم سے نیک اعمال کی توفیق دے دیں گے۔

اس تقریر سے دونوں حدیثیں جمع ہوگئیں (اور کوئی تعارض باقی نہ رہا) مطلب یہ ہے کہ اسباب سے کام لینا چاہیئے مگر اُن پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ اعمال کے بعد بھی اللہ تعالےٰ کے فضل واحسان پر نظر رکھے جس سے ان اعمال کی توفیق ہوئی اور ساتھ ساتھ تکالیف کے دفع اور نعمت کے تمام وکامل ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف التجا و دُعا و استغاثہ بھی کرتا رہے اور تقدیرِ الٰہی کے سامنے گردن تسلیم خم کیے رہے خیر ہو یا شر، شیریں ہو یا تلخ (سب پر راضی رہے) لیکن یہاں تسلیم ورضا میں (ایک) قید

زمانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ تکوینیات میں تو خیر و شر دونوں سے راضی رہے اور تشریعیات میں نیک اعمال سے خوش اور گناہوں سے رنجیدہ ہونا چاہیئے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں المؤمن تسرہ حسناتہ وتسوءہ سیئاتہ۔ مومن کو اپنی نیکیوں سے خوشی ہوتی ہے اور گناہوں سے رنج ہوتا ہے (مگر یہ رنج اپنے سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالٰے سے نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالٰے نے کسی کو گناہوں پر مجبور تو نہیں کیا۔ ہر شخص اپنے ارادہ و اختیار سے گناہ کرتا ہے اور جس سے بلا ارادہ کسی کی زبردستی سے یا اپنی بھول چوک سے گناہ ہو جاتے وہ معاف ہے لما فی الحدیث رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ) پس مومن (دنیات میں) ہمیشہ قضا و قدر کے سامنے گردن جھکائے جو کچھ بھی پیش آئے اُس پر راضی رہتا ہے اور جس حالت میں اللہ تعالٰے ٹھہرا دیں اُس کے سوا کا طالب نہیں ہوتا نہ اُس کو بدلنا چاہتا ہے یہاں تک کہ حق تعالٰے خود ہی اُس کو بدل دیں۔

ایک صوفی سے کسی نے پوچھا کہ تم نے یہ درجہ کیسے پایا؟ کہا، اللہ تعالٰے نے مجھے جس مقام پر پہنچا دیا میں نے اُس سے منتقل ہونا پسند نہ کیا یہاں تک کہ اللہ تعالٰے ہی نے مجھے اُس سے (آگے) منتقل کر دیا۔ اسی حقیقت پر نظر کر کے کامیاب ہونے والے کامیاب ہو گئے اور نفع حاصل کرنے والے سود مند ہو گئے۔ پھر (یہ بھی ضروری ہے کہ) ہمیشہ اپنی حالت کا تفقد رکھے (اس پر نظر کرتا رہے کہ) اگر کسی معصیت یا بدعت میں اس کو مبتلا کر دیا گیا ہو تو اُس سے راضی نہ ہو کیونکہ مومن کی علامت یہ ہے کہ اُس کو گناہ یا بدعت سے خوشی نہ ہو اُس وقت اس کو اللہ تعالٰے سے فریاد کرنا چاہئے اور اس راستہ سے ہٹنا چاہیئے جس پر چل رہا ہے اور پوری کوشش کے ساتھ اس سے خلاصی پانے کی تدبیر کرے۔ اللہ تعالٰی کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے کیونکہ حق سبحانہٗ فرماتے ہیں ولا یرضی لعبادہ الکفر اللہ تعالٰے اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتے (اور ہر معصیت و مخالفت کفر ہی کی شاخ ہے اُس کو بھی اللہ تعالٰے پسند نہیں فرماتے) اور جس چیز کو آقا اپنے

بندہ کے لیے پسند نہیں کرتا بندہ بھی اُس کو اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا۔

قولہ وفی ھذا دلیل علی ان المراء مامور بعمل الاسباب الیٰ قولہ فلا یرضاہ العبد لنفسہ۔

ف ۔ یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر نے مسلمانوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں۔ وہ اعتقادِ تقدیر کی وجہ سے تدبیر سے کام نہیں لیتے اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام نے اعتقادِ تقدیر کے ساتھ تدبیر کا بھی حکم دیا ہے۔ اب جو لوگ تدبیر کو چھوڑتے ہیں اپنی جہالت کی وجہ سے چھوڑتے ہیں اسلام کی یہ تعلیم نہیں۔ مسئلہ تقدیر پر سب سے زیادہ پختہ اعتقاد حضرات صحابہؓ کا تھا۔ پھر کیا کسی نے اُن کے برابر بلند ہمت کوئی قوم دیکھی ہے یا اُن سے بڑھ کر مدبر اور منتظم کوئی جماعت بھی دیکھی گئی ہے؟ عقیدۂ تقدیر کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی وقت تدبیر کارگر نہ ہو، اسباب بے کار ہو جائیں تو انسان پریشانی سے بدحواس نہ ہو یہ سمجھ کر تسلی کر لے کہ مقدر یہی تھا اسی طرح کامیابی کے بعد تکبر و غرور میں مُبتلا نہ ہو بلکہ اس کامیابی کو اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ سمجھے۔ انسان کی حالت میں اعتدال یوں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

ف ۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت غضب پر غالب ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے وعدے کے خلاف نہ کریں گے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت اختیاری ہے جبری نہیں اور وعدہ کر لینے سے اُن کی قدرت سلب نہیں ہو گئی۔ اگر وہ کسی نیک کو عذاب کرنا چاہیں یا بد کو بخشنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ اللہ تعالےٰ سے باز پُرس کر سکے۔ یہی شانِ قدرت ہے جس کے سامنے جملہ انبیاء و اولیاء کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں گو اُن کو اس کا بھی یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نیک کو بلاوجہ عذاب نہ کریں گے لیکن کسی نے اُن کو مجبور بھی نہیں کیا نہ کر سکتا ہے۔ یہی حقیقت ہے اس مسئلہ کی جس کو امکانِ کذب کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ عنوان اچھا نہیں مگر مضمون بالکل صحیح ہے ورنہ اللہ تعالےٰ کا مجبور اور پابند ہونا لازم آئے گا جو شانِ الوہیت کے منافی اور لا یسئل عما یفعل کے

خلاف ہے۔ اسی شانِ بے نیازی نے اچھے اچھوں کے پتے پانی کر دیئے ہیں جس پر جس قدر عظمتِ شان منکشف ہوتی ہے اسی قدر لرزاں ترساں رہتا ہے ؎

مقرباں را بیش بود حیرانی

(۲۲۸) سوال سے پہلے ہی مسئلہ بتلا دینا واجب ہے یہاں سے معلوم ہوا کہ عالم پر واجب ہے کہ سوال سے پہلے ہی تعلیم کر دے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو اُن کے سوال سے پہلے ہی بتلا دیا کہ اُن کو کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے معارض اعرابی کی مشہور حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی طلب سے پہلے تعلیم نہیں دی دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ مخاطب کی حالت میں نظر کی جائے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ بات نہ مانے گا یا اس وقت تو مان لے گا پھر چھوڑ دے گا یا بھول جائیگا تو اُس کی تعلیم لازم نہیں جب تک وہ خود سوال نہ کرے جیسا حضورؐ نے اعرابی کے ساتھ کیا اور اگر یہ معلوم ہو کہ جو کچھ اس سے کہا جائے گا قبول کرے گا اس کو سوال سے پہلے ہی تعلیم کر دی جائے۔ جیسا اس حدیث میں مذکور ہے۔ قولہ وفیہ دلیل علی ان العالم یجب علیہ ان یعلمہ قبل السوال الی قولہ کما فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الحدیث۔

ف۔ یہ تو صحیح ہے کہ تعلیم کا قبل از سوال واجب ہونا یا نہ ہونا مخاطب کی حالت اور موقعہ و مقام پر موقوف ہے۔ مگر یہ دعویٰ مشکل ہے کہ حضورؐ نے اعرابی کو قبل از سوال اس لیے تعلیم نہیں دی کہ اُس کے قبول نہ کرنے یا چھوڑ دینے کا اندیشہ تھا کیونکہ اعرابی صحابی تھا اور صحابہ کی شان سے یہ بعید ہے کہ حضورؐ کی بات کو قبول نہ کریں یا سُن کر چھوڑ دیں فان الصحابۃ کلھم عدول۔ ظاہر یہ ہے کہ جب اُس نے نماز خود شروع کر دی تو تعلیم کا یہ وقت نہ تھا کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ جو شخص بدون سوال کے عمل شروع کرتا ہے وہ اُس کا طریقہ جانتا ہے مگر حضورؐ اس کی نماز کو دیکھتے رہے جب اُس نے بدون تعدیلِ ارکان کے نماز پڑھی حضورؐ نے اس کا انتظار کیا کہ نماز سے فارغ

ہو کر مجلس میں آنے تو تعلیم کی جائے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ بدون تعدیل ارکان کے نماز ناقص رہتی ہے۔ چنانچہ وہ مجلس میں آیا اور سلام کیا تو آپؐ نے فرمایا: جع فصل فانك لم تصل۔ واپس جاؤ نماز پھر پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ حضورؐ نے اس مختصر اشارہ پر اکتفا کیا تاکہ وہ خود سمجھے کہ میں نے کیا غلطی کی؟ جب دو تین دفعہ نماز کا اعادہ کرکے بھی وہ اپنی غلطی کو نہ سمجھا تو اُس نے دریافت کیا کہ مجھے بتلایا جائے۔ اُس وقت آپ نے تفصیل سے بتلایا کہ نماز اس طرح پڑھنا چاہیئے اس واقعہ میں اجمالی تعلیم تو اس کے سوال سے پہلے ہی کر دی گئی تھی تفصیلی تعلیم طلب کے بعد ہوئی کیونکہ اجمال کے بعد تفصیل زیادہ مُوثر ہوتی ہے۔ تعلیم کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ اولاً اجمالی تعلیم ہو پھر تفصیلی تاکہ اجمال سے مخاطب خود سمجھنے کی کوشش کرے۔

چونکہ نماز ایسا عمل ہے جو رات دن میں پانچ دفعہ فرض ہے اُس کے طریقہ سے ناواقف ہونا معمولی بات نہیں بہت سخت بات تھی اس لیے پہلی بار تفصیل کی حاجت نہیں سمجھی گئی بلکہ اجمال پر اکتفا کیا گیا کہ ایسے عمل کی کوتاہی کو ادنیٰ اشارہ سے انسان سمجھ سکتا ہے جب تین دفعہ کے اشارہ سے بھی وہ نہ سمجھا اُس وقت تفصیل کے ساتھ تعلیم دی گئی اور جس مسئلہ کا اس حدیث میں ذکر ہے جس کی ہم شرح کر رہے ہیں وہ نماز کے برابر کثیر الوقوع نہیں۔ نہ ہر شخص کو اُس کی حاجت اس لیے اُس کو پہلی ہی بار تفصیل سے بیان کر دیا گیا۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ سبحانہ وتعالیٰ۔

(۲۲۹) انسان کو اپنے تمام افعال پر نظر کر کے ان اعمال کو اختیار کرنا چاہیئے جن کو قرب میں زیادہ دخل ہو

یہاں سے معلوم ہُوا کہ انسان کو اپنے تمام افعال میں نظر کر کے اُس عمل کی طرف سبقت کرنا چاہیئے جس کو قربت میں زیادہ دخل ہو۔ ادنیٰ کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جوانوں کو) اوّل نکاح

کا حکم دیا ہے جو ثواب و قرب میں روزہ سے بڑھا ہوا ہے۔ پہلے روزہ کا حکم نہیں دیا جب تک بیوی کے نان و نفقہ کی طاقت مفقود نہ ہو کیونکہ نکاح میں بڑا ثواب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تناکحوا تناسلوا ایاھم بکم الامم یوم القیمۃ۔ نکاح کرو نسل کو بڑھاؤ میں قیامت کے دن تمہاری (کثرت) سے دوسری اُمتوں پر فخر کروں گا (کہ میری اُمت سب سے زیادہ ہے) اگر نکاح اس نیت سے ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بڑھے گی اور آپ خوش ہوں گے) تو اس کی فضیلت میں کیا شبہ ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا رھبانیۃ فی الاسلام اسلام میں رہبانیت نہیں کہ عورتوں سے الگ رہا جائے۔ اگر عورتوں سے الگ رہنے (اور نکاح نہ کرنے) میں فضیلت ہوتی تو شریعت اسلام میں اس کا ضرور حکم ہوتا۔ کیونکہ مجملہ ادیان سماویہ میں اسلام ہی سب سے بہتر دین ہے (جب اسلام میں رہبانیت نہیں تو معلوم ہوا کہ نکاح ہی افضل ہے)۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں حالانکہ مجھے ان کی حاجت نہیں اور ان سے ہم بستر بھی ہوتا ہوں حالانکہ مجھے اُن کی شہوت نہیں۔ لوگوں نے دریافت کیا یا امیرالمؤمنین! پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا محض اس اُمید پر کہ شاید اللہ تعالیٰ میری پُشت سے کوئی بچہ پیدا کر دیں جس سے قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم دُوسری اُمتوں پر فخر کریں (اور جب اس نیت سے ہمبستری کی جائے گی تو وہ شہوت بھی پیدا ہو جائے گی جس پر ہمبستری موقوف ہے مگر وہ شہوت حیوانی نہ ہوگی بلکہ انسانی اور روحانی ہوگی)، بہرحال چونکہ نکاح کو دوسرے اعمال (مستحبہ) پر فضیلت ہے اس لیے حضورؐ نے اُس کو پہلے بیان کیا اور روزہ پر مقدم فرمایا اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ انسان اُسی عمل کا مکلف ہے جس پر اُسے قدرت ہو اور تعمیل کر سکے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو جو نکاح پر قادر نہ ہوں روزہ کا حکم دیا ہے یہ نہیں فرمایا کہ نکاح کی تدبیر کرے اور جس طرح بھی ہو اس کی کوشش کرے کیونکہ نکاح افضل ہے بلکہ آپ نے اس صورت میں صرف روزہ

کا حکم دیا ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان المرأما مور ان ینظر فی کل انفع لہ م ھما قرب الی ربہ الی قولہ وانی امرع بالصوم ۔

ف ۔ ایک عالم نے خوب فرمایا کہ ہمارے اعمال صالحہ میں کوئی عمل ایسا نہیں جس پر دل کو یہ اطمینان ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس سے خوش ہوں گے کیونکہ ہر عمل میں اخلاص کے کم ہونے یا نہ ہونے کا شبہ اور نفس کی آمیزش کا احتمال رہتا ہے۔ بس نکاح ہی ایک ایسا عمل ہے جس کے بعد اولاد نصیب ہو جائے تو دل کو اطمینان ہو سکتا ہے کہ اس سے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوں گے۔ اسی لیے محققین صوفیاء کو نکاح کا ہمیشہ اہتمام رہا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے کہ مسلمانوں کا سلسلۂ پیدائش زیادہ ہو اور اولاد مسلمان اور سچی مسلمان ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان خود بھی نماز روزہ وغیرہ کی پابندی کریں اور اپنی اولاد کو بھی پابند بنائیں ۔

ف ۔ بیوی سے ہمبستری میں یہ نیت تو بڑے درجہ کے لوگوں کا حصہ ہے کہ اگر یہ نیت نہ ہو بلکہ قضاءِ شہوت ہی کی نیت ہو پھر بھی معرفت کو ترقی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں انسان کو اپنے عجز کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اپنے عجز کے مشاہدہ سے بھی معرفت بڑھتی ہے (قالہ سیدی حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ)

ف ۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص کو بدون نکاح کے زنا میں مُبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اُس پر نکاح واجب ہے جبکہ نان و نفقہ کی قدرت ہو اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اُس کے بارے میں اختلاف ہے کہ اُس کو نوافل میں مشغول ہونا افضل ہے یا نکاح کرنا افضل ہے ؟ حنفیہ کے نزدیک نکاح کرنا افضل ہے کہ اس کی وجہ سے نوافل طاعات میں کمی ہو جائے اور شافعیہ کے نزدیک نوافل طاعات میں مشغول ہونا نکاح سے افضل ہے مگر یہ حدیث حنفیہ کی دلیل ہے جیسا حضرتؒ شارح کی تقریر سے ظاہر ہے ۔

(۲۲۰) اعمالِ مستحبہ کی فضیلت نفسِ عمل کی جہت سے نہیں بلکہ عامل کی جہت سے ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ اعمالِ (مستحبہ) کی فضیلت (نفس) عمل پر نظر کرکے نہیں بلکہ عامل کی جہت سے ہوتی ہے۔ دیکھو جس کو نکاح کی قُدرت نہ ہو اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے روزہ کا امر فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کو اسی عمل کا امر فرماتے ہیں جو اُس کے حق میں زیادہ موجبِ قرب ہو اور اس شخص کے حق میں روزہ کا افضل ہونا بالکل ظاہر ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب وہ افلاس کی وجہ سے نکاح کی قُدرت نہیں رکھتا تو روزہ اُس کے مقصود میں معین ہوگا۔ روزہ میں کچھ خرچ بھی نہیں اور مادۂ شہوت اس سے کم ہوجاتا ہے اب وہ سکونِ خاطر کے ساتھ وساوس (شہوانیہ) سے نجات پاکر دل سے آخرت کے کاموں میں مشغول ہوگا پوری طرح اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوگا اور یہی مطلوب ہے اور اگر اُس کو (اس حالت میں) نکاح کا حکم کیا جاتا تو پریشانی میں پڑجاتا۔ اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ نہ ہوسکتا کیونکہ وہ کمانے اور روپیہ جمع کرنے میں مشغول ہوگا حالانکہ مفلس ہے اور افلاس کی حالت میں روپیہ جمع کرنے کی تدبیر کرنا آسان کام نہیں) تو وساوس کی کثرت ہوگی اُس کا دل دُنیا ہی کے بکھیڑوں میں اُلجھ جائے گا اور آخرت کی تدبیر سے کورا ہوجائے گا۔

کسی عمل کو افضل ومفضول اُس وقت کہا جائے گا جب دونوں پر قدرت ہو ورنہ جس پر قدرت ہو وہی افضل ہے

غرض شارح علیہ السلام نے جن اعمال کی فضیلت بیان فرمائی ہے اُن میں افضل اور مفضول کو اُس وقت دیکھا جائے گا جب دونوں پر قدرت ہو اور اگر کسی عمل پر قدرت نہ ہو تو جس پر جس کو قدرت ہے اُس کے حق میں وہی افضل ہوگا چنانچہ جو شخص نکاح

پر قادر نہ ہو اُس کے لیے روزہ افضل ہے اور جو نکاح پر قادر ہو (روزہ پر قادر نہ ہو) اُس کے لیے نکاح افضل ہے (اور جو دونوں پر قادر ہو اُس کے حق میں نکاح افضل ہے) اسی طرح تمام افعال میں غور کرنا چاہیئے خواہ دنیوی اعمال ہوں یا اخروی اور اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو تمام اعمال (مباحہ ہیں۔ کوئی عمل بھی دنیوی نظر نہ آئے گا اگر اس میں نیت اچھی ہو۔ بیش برین نیست کہ وہ خالص دُنیا کمانے کا شغل ہو گا تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو شخص صاحب عیال ہے یا مجرد ہے۔ اگر مجرد ہے اور نیت یہ ہے کہ شغل معاش سے اللہ تعالےٰ کی طاعت میں مدد ملے گا تو اُس میں بھی بڑا ثواب ملے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من بات تعبا نا من طلب الحلال بات مغفور الہ ۔ جو شخص حلال روزی کمانے کی وجہ سے رات کو تھکا ماندہ رہے وہ بخشا بخشایا رات گزارے گا۔ اب سوچو کہ شب قدر کا انتظار سال بھر مغفرت کی ہی اُمید پر تو کیا جاتا ہے اور وہ اس شخص کو طلب حلال کے شغل سے حاصل ہو جاتی ہے تو یقیناً یہ عمل آخرت کا ہُوا (دُنیا کا کام نہ ہُوا کیونکہ جس کام سے مغفرت حاصل ہو وہ آخرت ہی کا کام ہے) اور اگر صاحب عیال ہے تو اس کو تو مجرد آدمی سے بھی زیادہ بھلائی (اور ثواب) ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ گناہوں میں بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بال بچوں کے لیے مشقت برداشت کی جائے (طبرانی اور ابونعیم نے اس حدیث کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے ان من الذنوب ذنوبا لا یکفرھا الصلٰوۃ ولا الصوم ولا الحج و یکفرھا الھم فی طلب المعیشۃ ۔ گناہوں میں بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نہ نماز سے ہوتا ہے نہ روزہ سے نہ حج سے ان کا کفارہ طلب معاش کی فکر سے ہوتا ہے) بشرطیکہ طلب معاش شریعت کے موافق (جائز طریقے) سے ہو۔

دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے رہے ہیں کہ بعضے گناہ ایسے بھی ہیں جن کا کفارہ نہ وقوف عرفہ سے ہوتا ہے نہ قیام لیلۃ القدر سے نہ کسی اور عمل سے (بجز فکر معاش کے) کیونکہ آپؐ نے نفی اور استثناء کے ساتھ کلام فرمایا ہے (جو حصر کے لیے ہے جس

سے بجز مستثنیٰ کے اور سب کی نفی ہو رہی ہے (یہ گفتگو اُن الفاظ کی بنا پر ہے جو حضرت شارح نے روایت کئے ہیں۔ مگر طبرانی اور ابونعیم کے الفاظ میں تو صاف تصریح ہے کہ اُن کا کفارہ نہ نماز سے ہوتا ہے نہ روزہ سے نہ حج سے) تو اب (مؤمن کے) سب کام آخرت ہی کے لیے ہو گئے دُنیا کے لیے نہ رہے جبکہ اُن شروط کی رعایت کی جائے جن کا اُوپر ذکر ہوا کہ اعمالِ دنیویہ شریعت کے موافق جائز ہوں اور ان میں نیت صحیح ہو کہ دُنیا کا کام اس لیے کیا جائے کہ اس سے دین میں مدد ملتی ہے) اس حقیقت پر نظر کر کے اور نیت کو درست کر کے ہی صوفیاءِ کرام بزرگی کے درجہ کو پہنچ گئے اور (دُوسروں سے) ممتاز ہو گئے۔ بلند درجات اور فضیلت میں سبقت لے گئے، اگرچہ (ظاہر میں) وہ اور دوسرے لوگ اعمال میں برابر نظر آتے ہیں مگر اُن کی ہر حرکت اللہ کے لیے اور اللہ کے (حکم کے) ساتھ ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو بات بھی زبان سے نکلتی ہیں قربِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے کیونکہ وہ ان چیزوں پر نظر رکھتے ہیں جن پر ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اُن کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ شدتِ قحط کی وجہ سے لوگوں کو استسقاء کی ضرورت ہوئی تو اُن کے پاس ایک دوست کا پیغام آیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر خاص وسیلہ سے دُعا کریں شاید مخلوق پر رحمت ہو جائے۔ پیغام لانے والے نے دیکھا کہ یہ حضرت اپنے دنیوی کاروبار میں مشغول ہیں رات کو گھر آتے ہیں اور دن کو کاروبار میں لگ جاتے ہیں اس کو تعجب ہُوا کہ جو شخص دنیوی کاروبار میں مشغول ہے وہ اس لائق کہاں کہ اُس سے بارش کے لیے دُعا کرائی جائے۔ یہ شخص تین دن اُن کے پاس رہا۔ پھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو پیغام کا جواب لینا چاہا۔ فرمایا میرے دوست سے کہہ دینا کہ اگر تم کو یہ معلوم ہو کہ میرا کوئی سانس بھی اللہ (کی یاد) کے بغیر نکلتا ہے تو میں اُسی وقت اپنے کو جان سے مار ڈالوں گا۔

اللہ کے ساتھ اُن کا معاملہ یہ تھا مگر عام لوگ اُن کی حالت دیکھ کر یہ گمان کرتے تھے کہ بس دُنیا میں منہمک ہیں، حالانکہ وہ دُنیا سے الگ تھے دل دُنیا کے خیالات سے فارغ تھا۔

اُن کا جسم مخلوق کے ساتھ تھا اور روح وقلب اللہ کے ساتھ اور اُس کی تمام تر بنیاد وہی نیت تھی اور نیت کی درستی اور نیت پر جمارہنا اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اور دوسرے لوگ ثواب وغیرہ میں برابر ہی ہوتے (مگر تصحیح نیت نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق کردیا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرءٍ ما نوی۔ بس اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملتا ہے جو اُس کی نیت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی وجہ سے یہ حضرات حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق بن گئے وتری الجبال تحسبها جامدة وهى تمر مر السحاب صنع الله الذى اتقن كل شىء۔ اور تم (قیامت میں) پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کروگے کہ وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چلتے ہوں گے۔ یہ کارنامہ ہے اُس خدا کا جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا ہے۔

اسی طرح عامی شخص ان بزرگوں کو دنیوی کاروبار میں مشغول یا اس سے محبت کی باتیں کرتے ہوئے اور اندرونی و بیرونی معاملات میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ وہ ہمہ تن اُس کے ساتھ ہیں حالانکہ واقعہ یہ نہیں بلکہ صرف اُن کا جسم اُس کے ساتھ ہے اور قلب و روح ملکوت کی سیر میں مشغول ہیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے باتیں کرتے اور دل لگی کرتے ہوئے بہت مقامات طے کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اُن کے واسطے مقرر فرمائے ہیں۔ مگر یہ بات اہلِ ہمت اور اصحاب تمکین کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے حالات میں پختہ ہوچکے ہیں جس نے اُن کی عقل وفہم کے پردے اُٹھادیئے ہیں۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کی ہر بات کو سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اُن سے کہنا چاہتے ہیں پھر اُس کی تعمیل پر سبقت کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث (باطنی) سے پُورا حصّہ ملا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی شان تھی چنانچہ آپ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ما زاغ البصر وما طغیٰ۔ آپ کی نگاہ نہ (مقصد سے) مائل ہوئی نہ حد سے آگے بڑھی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تنام عینای ولا ینام قلبی

(نیند کی وجہ سے) میری آنکھیں تو سوتی ہیں مگر دل بیدار رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند میں بھی غافل نہ ہوتے تھے اور حبیب اللہ تعالے نے آپ کو اُن چیزوں پر مطلع فرماتے جن پر مطلع فرمایا ہے (یعنی ملکوت و جنت وغیرہ) تو آپ کو یہ چیزیں (اللہ تعالےٰ سے) غافل نہ کرنے پاتیں نہ آدابِ عبودیت (و بندگی) سے ہٹا سکتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض بچوں سے مزاح بھی فرماتے ان کا دل بہلاتے دلجوئی فرماتے اُن کے ساتھ مل کر اُن کے کاموں میں حصہ بھی لیتے تھے مگر آپ کا باطن سیر ملکوت میں مشغول ہوتا تھا جہاں اللہ تعالے نے پہنچانا چاہتے۔ ان بزرگوں نے جن کا ذکر ابھی ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت سے پورا حصہ لیا تھا۔ مگر حضورؐ کے مقام خاص تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی (بس اتباع کی برکت سے اس مقام کی تجلی اور فیض کا ورود اُن پر ہوتا ہے) چنانچہ ایک بزرگ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مراقبہ میں اُن کی رُوح مقام قوب قوسین تک پہنچ گئی تو ایک آواز سُنائی دی کہ اس مقام پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس کو پہنچایا گیا تھا جہاں تمہاری رُوح کو پہنچایا گیا ہے اور زبانِ حال پُکار رہی تھی کہ تابع اور متبوع میں وہی فرق ہے جو اتباع کی وجہ سے تابع اور متبوع میں ہُوا کرتا ہے (کہ تابع تو صرف روح و قلب کے ذریعہ اس مقام کی سیر کر سکتا ہے وہاں قرار نہیں پا سکتا اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات سے اُس مقام پر پہنچے اور آپ کو رسوخ و ثبات حاصل ہُوا) اسی کے مشابہ یہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ علیہ مسجد میں سو رہے تھے اور اُن کا ایک مرید کھڑا ہُوا نماز پڑھ رہا تھا ایک بزرگ نے جو وہاں موجود تھے دو شیطانوں کو مسجد سے باہر دیکھا کہ ایک دُوسرے سے کہہ رہا ہے مسجد میں چلو تاکہ اس نمازی کے دل میں وسوسہ ڈالیں۔ دُوسرے نے کہا مجھے اس سونے والے کا سانس جلائے ڈالتا ہے۔ دیکھو اُس نے اس نمازی کی پرواہ نہیں کی بلکہ حضرت ابراہیم کے سانس کے خوف سے مسجد میں نہ آسکا کہ وہ اس کو پھونک دے گا۔ اس کا سبب اس کے سوا کیا تھا کہ یہ حضرات ہر حالت اور ہر وقت میں حضور الٰہی سے کامیاب ہوتے ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے واسطہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو ان بزرگوں کی برکتوں سے محروم نہ فرمائیں اور جو کچھ اپنے فضل سے اُن کو عطا فرمایا ہے ہمیں بھی عطا فرمائیں آمین۔ وفی ھذا دلیل علی ان الفضیلۃ فی الاعمال لا تنظر من جھۃ مآلہا الاحسن جھتہ عاملہا الی قولہ وان یمن علینا بما من بہ علیھم ۔

ف ۔ یہ تحقیق آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ کسی عمل کو افضل یا مفضول اس وقت کہا جائے گا جب دونوں پر قدرت ہو ورنہ جس پر قدرت ہو وہی افضل ہے۔ بہت لوگ اہلِ سلوک میں سے اس کو نہیں جانتے اور پریشان ہوتے ہیں یا بدگمانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنے کو شیخ کی طرح متوکل تارک اسباب بنانا چاہتے ہیں اور یہ اُن کی قدرت سے باہر ہے تو پریشان ہوتے ہیں کہ ہائے ہمیں باطنی دولت نصیب نہ ہوئی وہ اسی کو باطنی دولت سمجھتے ہیں کہ ترکِ اسباب کر کے بیٹھ جائے۔ یا شیخ کے اصحاب میں جس کو تارکِ اسباب نہیں دیکھتے اس سے بدگمان ہوتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ تصحیح نیت کے ساتھ اعمال دنیویہ مباحہ بھی دین ہو جاتے ہیں جس کو وہ دُنیا میں مشغول دیکھتے ہیں کیا عجب ہے کہ اُس نے نیت کو درست کر کے ان اعمال دنیویہ کو دین بنالیا ہو اور اس کا تجربہ پاس رہ کر ہی ہو سکتا ہے دُور رہ کر نہیں ہو سکتا۔ پس جب تک پاس رہ کر کسی کا طالب دُنیا ہونا محقق نہ ہو بدگمانی جائز نہیں۔

ف ۔ یہ حدیث اہلِ حرفہ و اہلِ اسباب کے لیے بڑی بشارت ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نہ نماز سے ہو سکتا ہے نہ حج سے نہ روزے سے اُن کا کفارہ طلب معاش کی فکر ہی سے ہوتا ہے بشرطیکہ حرفہ اور شغل معاش شریعت کے موافق جائز ہو۔

ف ۔ ہر حالت اور ہر زمانہ میں حضورِ حق سے کامیاب ہونے کا طریقہ کثرت ذکر قلبی اور شغل پاس انفاس ہے۔ اس شغل میں رسوخ کے بعد سوتے ہوئے بھی سلسلہ سے ذکر ہوتا رہتا ہے بشرطیکہ اس کا شیخ متبع سُنت اور خود بھی پابند ذکر ہو۔ ورنہ محض

مشق ہی مشق ہوگی ذکرِ حقیقی حاصل نہ ہوگا۔

(۲۳۱) یہاں سے معلوم ہوا کہ نظر (بد) کا سبب قوتِ شہوت جماعیہ ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ نگاہ کو پست کرنے والا ہے (اور ظاہر ہے کہ نکاح سے قوتِ شہوت بھی معتدل ہوجاتی ہے۔ اسی سے نگاہ پست ہوجاتی ہے) اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وزنا العین النظر والفرج یصدق ذلک او یکذبہ آنکھ کا زنا نظر (بد) ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کردیتی ہے یا تکذیب (یعنی اگر نظر کا منشا فرج ہے تو وہ زنا میں شمار ہے ورنہ نہیں یا مطلب یہ ہے کہ یہ سب مقدمات زنا کے ہیں۔ اگر اس کے بعد فرج سے زنا ہوگیا تو یہ مقدمات واقعی زنا کے مقدمات تھے (اور اگر فرج سے زنا نہ ہوا بلکہ خوفِ خدا سے بچ گیا تو یہ مقدمات بھی معاف ہوجاتے ہیں بشرطیکہ مانع صرف خوفِ خدا ہو کوئی حسّی مانع نہ ہو۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نگاہ کا پست کرنا آیاتِ قرآنی سے مامور ہے تو جو شخص اس کی حفاظت پر قادر نہ ہو اس کو وہ اسباب اختیار کرنے چاہئیں جن سے یہ قدرت حاصل ہوجائے۔ اس جگہ ایک سوال ہے وہ یہ کہ نگاہ کی حفاظت ان ہی دو طریقوں میں منحصر ہے (نکاح یا روزہ) اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اور طریقوں سے بھی ہوسکتا ہے مگر یہ دو اعلیٰ درجہ کے ذریعے ہیں مثلاً کوئی اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لے تو کسی کو بھی نہ دیکھ سکے گا یا شدتِ خوف کا غلبہ ہو یا سخت تکلیف نفس کو دی جائے تو اس سے بھی نگاہ کی حفاظت ہوجاتی ہے۔

امام سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ جب ان کے دل میں غیرِ حق کا خطرہ آتا وہ اپنے آپ کو ایک لکڑی سے مارتے تھے۔ بعض دفعہ ایک دن میں کئی کئی لکڑیاں اپنے اُوپر توڑ ڈالتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی طریقے ہوسکتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے طریقے ہم کو بتلادیے جو سب سے اعلیٰ اور آسان ہیں تو حدیث میں اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ ہے (یہ مطلب نہیں کہ اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں) ہم نے

اس بات پر اس لیے تنبیہ کر دی کہ شاید کوئی شخص ان دو طریقوں سے عاجز ہو یا دونوں پر عمل کر کے بھی اُس کو حفاظت نگاہ میں کامیابی نہ ہو تو وہ یہ کہنے لگے کہ میں نے حدیث پر عمل کر لیا (پھر بھی نگاہ محفوظ نہیں ہوئی تو) میرے ذمہ اس سے زیادہ کچھ نہیں اب وہ اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دے (اور یہ تاویل کرے کہ نگاہ کی حفاظت میری قدرت سے باہر ہے میں اس کا مکلف نہیں رہا) یہ ہرگز جائز نہیں (اگر کسی کو ان دو طریقوں سے کامیابی نہ ہو یا ان دونوں پر عمل نہ کر سکے کہ نکاح پر قدرت ہو نہ روزہ کی طاقت ہو تو وہ اور طریقوں سے نفس کا علاج کرے اس کو مہمل اور آزاد نہ چھوڑے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو حکم الٰہی کے بجالانا کا سامان کرنا چاہیئے وہ اس کا مامور ہے (اور مثال کے طور پر دو طریقے بتلا دیئے یہ مطلب نہیں کہ جو اُن دونوں پر قادر نہ ہو یا اُن سے کامیابی نہ ہو تو وہ حکم الٰہی کا مکلف نہیں رہا)۔ قوله وفيه دليل على ان الموجب للنظر قوة شهوة الجماع الى قوله وانما هذا منه صلى الله عليه وسلم تنبيه على التسبب فى توفية ما امر به العبد ۔

ف ۔ سبحان اللہ! بڑی قیمتی تحقیق ہے ورنہ اہلِ ظاہر تو عام طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ حفاظت نگاہ ان ہی دو طریقوں میں منحصر ہے اگر ان سے کامیابی نہ ہو تو انسان معذور ہے۔ حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہ نے بعض دفعہ یہ علاج تجویز فرمایا ہے کہ ہر نگاہ بد کے بعد نفس کو مالی یا بدنی سزا دی جائے اور نفس سے کہہ دیا جائے کہ جب نظرِ بد کا ارتکاب کرے گا یہی سزا دی جائے گی۔ بدنی سزا تو یہ ہے کہ ہر نظر بد کے بعد بیس رکعت نفل پڑھے جائیں اور مالی سزا یہ ہے کہ آٹھ آنہ یا ایک روپیہ یا جتنی مقدار سے نفس پر گرانی ہو صدقہ کر دیا جائے جب ہر نگاہ بد پر نفس کو یہ سزا دیجائیگی چند روز میں درست ہو جائے گا۔

(۲۳۲) روزہ اور نکاح اس مرض کا علاج بھی ہے اور فی نفسہ طاعت بھی ہے تو جس شخص کو اس پر قدرت ہو کہ طاعت کے ذریعہ علاج کر سکے یہ سب سے

اچھا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے داوو امرضاکم بالصدقۃ وادفعوا البلاء بالصدقۃ۔ "اپنے بیماروں کا علاج صدقہ سے کرو بلا کو صدقہ سے ٹالو"

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حفاظت کا حکم ان ہی دو اعضاء کے ساتھ خاص نہیں (نگاہ اور شرمگاہ) بلکہ تمام اعضاء کی حفاظت مطلوب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا ہ کان اور آنکھ اور دل ان سب کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو پر اس لیے تنبیہ فرمادی ہے کہ جس کے یہ دو عضو محفوظ اور مستقیم ہو جاتے ہیں تو غالب یہ ہے کہ بقیہ اعضاء بھی محفوظ ہو جاتے ہیں اور جس کے یہ دو عضو محفوظ نہ ہوں اُس کے بقیہ اعضاء کا محفوظ ہونا ممکن نہیں۔

قولہ وفیہ فائدۃ اخری انہ دواء وھو فی نفسہ قربۃ الی قولہ فلایمکن استقامۃ باقی الجوارح۔

❖

باب ہشت و ہشتم ۸۸

حدیث

توقیت السحور

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے (رمضان میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی۔ پھر آپ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے (راوی کہتا ہے) میں نے پوچھا کہ اذان اور سحری کے درمیان کتنا (وقفہ) تھا فرمایا بقدر پچاس آیت پڑھنے کے (یعنی تقریباً چار منٹ)۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ سحری آخر وقت میں کھانا سنت ہے کیونکہ سید ا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کھائی اور فجر کے طلوع ہونے میں بقدر پچاس آیت پڑھنے کے وقفہ ہوا جس کی مقدار چار پانچ منٹ ۔۔۔ زیادہ نہیں تو ثابت ہوا کہ حضورؐ نے بالکل صبح کے قریب سحری کھائی تھی ۔ حضورؐ کے اس فعل میں حکمت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ اُمت پر آسانی کرنا چاہتے تھے چنانچہ دیر سے سحری کھانا بھی اُمت پر لطف ہی تھا اگر آپ سحری نہ کھاتے تو اہل فضل آپ کی اتباع میں کبھی سحری نہ کھاتے اور بعض کو اس سے مشقت لاحق ہوتی کیونکہ ہر شخص بدون سحری کے روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ پھر حضورؐ کا صبح کے قریب سحری کھانا یہ مزید لطف ہے کیونکہ رات کے درمیان میں سحری کھانے سے اُمت کو ایک دوسری پریشانی ہوتی وہ یہ کہ عادۃً کھانے کے بعد نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کو کھانے کے بعد بیدار رہنا آسان نہیں اور کھانا کھاتے ہی سو رہنا بدن کے لیے مضر ہے۔ کیونکہ اس ۔۔۔

بخارات دماغ پر چڑھتے ہیں جس سے بیماری پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور اگر رات کے درمیان سحری کھا کر صبح تک بیدار رہے تو بڑا مجاہدہ کرنا پڑے گا کیونکہ کھانے پینے کے بعد نیند کا تقاضا ہوتا ہے۔ اب اگر یہ صبح تک بیدار رہا تو عبادت کے وقت یعنی صبح کی نماز میں نیند کا غلبہ ہوگا (جس سے نماز میں حضور قلب نہ ہو سکے گا) اور زیادہ تو یہ ہوگا کہ رات کے بیچ سحری کھانے والے پر نیند ہی غالب ہوگی اور یہ صبح کی نماز سے رہ جائے گا کہ (یا تو جماعت فوت ہوگی اور تنہا وقت مستحب کے بعد نماز پڑھے گا (یا آفتاب طلوع ہونے کے بعد نماز قضا پڑھے گا) اور اگر آدھی رات کے بعد جاگتا رہا تو نماز صبح میں حضور قلب حاصل نہ ہوگا۔ ان وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کو صبح کے قریب تک مؤخر فرمایا کہ اس وقت سحری کھانے سے نماز صبح فوت نہ ہوگی۔ کیونکہ اب سحری اور نماز میں اتنا ہی وقفہ ہوگا کہ آدمی نماز کے لیے تیاری کر لے۔ اس صورت میں صبح کی نماز حضور قلب سے ادا ہوگی کیونکہ کھانے کے بعد نیند کا غلبہ فوراً نہیں ہوتا بلکہ کچھ دیر کے بعد ہوتا ہے جبکہ بخارات معدے سے دماغ کی طرف چڑھنے لگیں اور اب اتنا وقفہ نہ ہوگا (دوسرے کھانے کے بعد بخارات کا صعود چلنے پھرنے سے موقوف ہو جاتا ہے تو جب سحری کے بعد فوراً استنجا اور وضو اور مسجد میں جانے کے لیے چلنا پھرنا ہوگا دماغ بخارات سے محفوظ رہے گا) پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد دن نکل آئے گا تو انسان اپنی ضروریات اور وظائف وغیرہ میں لگ کر نیند سے بچا رہے گا جس سے عمر بڑھتی ہے کیونکہ نیند بھی ایک قسم کی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وهو الذی یتوفاکم باللیل وہی ہے جو تم کو رات میں وفات دیتا ہے اس میں نیند کو وفات کہا گیا ہے تو نیند کا کم ہونا عمر میں زیادتی کا سبب ہے (بشرطیکہ مقدار صحت سے کم نہ ہو) اور عاقل اپنی عمر کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے چاہے ایک سانس ہی کیوں نہ ہو کیونکہ تاجر کو اس وقت تک لوگ تاجر نہیں کہتے جب تک وہ راس المال کی حفاظت نہ کرے اور تجارت کے طریقہ سے واقف نہ ہو اور حقیقی تاجر مومن ہی ہے۔ کیونکہ وہ باقی رہنے والے فائدہ کے لیے تجارت کرتا ہے اور دنیا کے تاجر فنا ہونے والے

نفع کے لیے تجارت کرتے ہیں اور مومن کا راس المال عمر ہے تو اس کو حفاظت عمر کی بہت ضرورت ہے کہ اسی طرح وہ زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہے تو مومن زیادہ سونے اور غفلت کا شکار ہونے سے بہت بچتا ہے اور جب اس سے بچے گا تو اعمال صالحہ بجالانے کی طرف سبقت کرے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے کہ یہی لوگ اصلی تاجر ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

یا ایہا الذین آمنوا ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم	اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی تجارت بتلاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے؟
تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم	(سنو!) وہ یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور
ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون	جان سے جہاد کرو یہ (تجارت) تمہارے لیے سب
یغفر لکم ذنوبکم ویدخلکم جنات	سے بہتر ہے اگر تم سمجھو کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ
تجری من تحتھا الانھار ومساکن	تمہارے گناہ معاف کردیں گے اور ایسے باغوں
طیبۃ فی جنات عدن ذٰلک	میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی
الفوز العظیم)۔	ہوں گی اور اچھے گھروں میں ہمیشہ رہنے والے باغوں میں یہی ہے بڑی کامیابی)۔

اور یقیناً جو شخص جنت سے کامیاب ہوگیا جہنم سے نجات پاگیا اور عزیز غفار کی طرف سے اس کو مغفرت حاصل ہوگئی۔ وہ سب سے زیادہ نفع پانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زبور میں داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے داؤد! جو میرے ساتھ تجارت کرے وہ سب سے زیادہ نفع پانے والا ہے۔ تو جو شخص اپنی بیداری میں سے غفلتوں سے احتراز نہ کرے وہ سونے والے کے برابر ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ۔

مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر کمثل الحی والمیت ۔	جو شخص اپنے رب کو ذات کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ اور مُردہ جیسی ہے ۔

تو آپ نے غافل کو مُردہ سے تشبیہ دی ہے اگرچہ وہ بیدار ہی ہو۔ کیونکہ اُس کا وقت اللہ تعالےٰ کی عبادت سے خالی جا رہا ہے راس المال برباد ہو رہا ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں یہاں تک کہ جب عمر ختم ہو جائے گی اُس وقت چیخے گا اور کہے گا ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا (مجھے دُنیا میں واپس کردو تا کہ میں کچھ نیک کام کروں تو جواب دیا جائے گا ہرگز نہیں اور جو شخص رات کے پہلے حصہ میں ضرورت کی وجہ سے سوتا ہے جس سے انسان کو چارہ نہیں اُس کی نیند عبادت ہے اور سراسر خیر ہے اُس کا سونا اور نماز پڑھنا اور ذکر کرنا ثواب میں ایک ہی درجہ پر ہے جس پر حضرت معاذ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کا واقعہ دلیل ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تعلیم دینے اور احکام اسلام کے موافق فیصلہ کرنے کے لیے (یمن کی طرف) بھیجا تھا دونوں اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گئے پھر ایک (دن کسی) مقام پر جمع ہوئے تو ایک نے دوسرے کا حال پوچھا۔ ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ میں تو رات بھر کھڑے بیٹھے اور ٹہلتے ہوئے اور لیٹ کر قرآن پڑھتا رہتا ہوں بالکل نہیں سوتا۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں تو رات کے پہلے حصہ میں سوتا ہوں پچھلے حصہ میں اٹھتا ہوں اور سونے میں بھی ویسا ہی ثواب سمجھتا ہوں جیسا جاگنے اور نماز پڑھنے میں سمجھتا ہوں۔

جب دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آئے تو آپ کے سامنے ہر ایک نے اپنا اپنا طریقہ بیان کیا حضورؐ نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے فرمایا کہ وہ تم سے زیادہ فقیہ ہیں یعنی حضرت معاذؓ۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو زیادہ فقیہ اُسی وقت فرما سکتے ہیں جبکہ اس کا طریقہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک زیادہ پسند اور زیادہ موجب قرب ہو یہ تو اُس نیند کا حکم ہے جو ضرورت بشریہ کی وجہ سے ہو جس سے چارہ نہیں اس کے سوا جو نیند ہے وہ عمر کو نقصان پہنچانے والی ہے۔

اب سمجھ میں آگیا ہو گا اس وقت (یعنی صبح کے قریب) سحری کھانے میں بہت

بڑی خوبی ہے۔ دُوسرے اس وقت سحری کھانے سے دن کو روزہ رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ صبح کے وقت معدہ غذا سے پُر ہوگا۔ کھانے کا تقاضا دن کے آخری حصہ میں ہوگا جبکہ افطار کا وقت قریب ہوگا سو تھوڑی دیر کا انتظار آسان ہے دشوار نہیں۔ یہ شخص دن بھر عبادات میں حضورِ قلب سے کامیاب ہوگا۔ کھانے پینے کے وسوسے اور اشتہاء اور تمنا سے محفوظ رہے گا۔ بخلاف اُس کے جو سحری نہیں کھاتا یا رات کے درمیان میں کھاتا ہے۔ وہ تو دن بھر مشقت اور مجاہدۂ نفس میں مشغول رہتا ہے۔ کیونکہ صبح کو اس کا معدہ خالی ہوتا ہے اور معتدبہ دیر کے بعد آدمی کو کھانے کی خواہش بار بار ستاتی ہے اور شیطان کو وسوسے ڈالنے کا بھی زیادہ موقع ملتا ہے اور بعض پر صفراء غالب ہو جاتا ہے تو بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے کیونکہ صفراوی مزاج کو بھوک کا تحمل نہیں ہوتا تو اُس کو رمضان میں روزہ افطار کرنے کی نوبت آجاتی ہے (غرض سحری کھانے سے روزہ میں مدد ملتی ہے اور وسوسے دُور ہو جاتے ہیں) اور اسی حقیقت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے :۔

من رأى منكم امرأة تعجبه فليأت اهله فان الذى معها مثل الذى معها او كما قال۔	جو کوئی کسی اجنبی عورت کو (اچانک) دیکھ لے اور وہ اسکو پسند آجائے تو اُسی وقت اپنی بیوی کے پاس پہنچ جائے اور اُس سے ہمبستری کرے، کیونکہ اسکے پاس بھی ویسی ہی چیز ہے جیسی اُس کے پاس ہے۔

کیونکہ اجنبی عورت کو دیکھ کر شہوت کو جوش ہوتا ہے جو اُس کو دل میں گناہ کے وسوسے ڈالتی ہے۔ اب اگر یہ اپنی بیوی کے پاس چلا جائے تو وہ جوش فرو ہو جائے گا اگرچہ وہ اجنبی عورت حسن و جمال میں اس کی بیوی سے زیادہ ہی ہو پھر بھی بیوی سے ہمبستری کے بعد نفس میں وہ ہیجان نہ رہے گا جو پہلے تھا اور تھوڑا سا جو رہے گا اُس کو آسانی سے دفع کر سکے گا۔

اسی طرح صبح کے قریب سحری کھانے سے اُس کو غذا کی زیادہ خواہش دن بھر نہ ہوگی اور تھوڑی سی ہوگی تو اُس کو آسانی سے دفع کر سکے گا اور اگر سحری نہ کھائے گا

تو وہ حال ہوگا جو اُوپر بیان کیا گیا اور یہ بڑا نقصان ہے خصوصاً رمضان میں جس کی فضیلت معلوم ہے (اس ناقص حالت سے بچنا چاہیئے) انسان کو رمضان میں سکونِ خاطر کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی طرف دل سے متوجہ ہونا چاہیئے۔ مبادا اس کا ایک دن ضائع ہو جائے جس کی مانند دُوسرا دن میسر نہ ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اصحاب کے ساتھ سحری کھانا آپ کی تواضع پر دلیل ہے۔ کیونکہ آپ کی جو شانِ رفیع ہے، معلوم ہے۔ مگر پھر بھی آپ تو اضعاً صحابہ کے ساتھ کھانا کھاتے تاکہ اُن کی دلجوئی ہو جائے۔

(تنبیہ) شرحِ حدیث کا مضمون عجیب تھا اس لیے پورا ترجمہ کر دیا گیا اگر غور کیا جائے گا تو اس میں تصوف کے بہت سے مسائل پر تنبیہ معلوم ہوگی۔ میں نے حضرت سیدی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کو (اسی) حدیث کے موافق عمل کرتے ہُوئے دیکھا ہے۔ حضرت بالکل صبح کے قریب طلوعِ فجر سے چار پانچ منٹ پہلے سحری سے فارغ ہوتے تھے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سحری کھانے کے بعد فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ بظاہر اس سے صبح کی نماز مراد ہے تہجد مراد نہیں۔ کیونکہ راوی حدیث بتلاتے ہیں کہ سحری سے فراغت اور صبح کی اذان میں چار پانچ منٹ کا وقفہ تھا اور یقیناً حضورؐ کا تہجد اس سے بہت طویل ہوتا تھا خصوصاً رمضان میں تو آپ بہت زیادہ مجاہدہ فرماتے تھے۔

پس میرے نزدیک رمضان میں حنفیہ کو نمازِ فجر اس حدیث کے موافق غلس میں پڑھنی چاہیے۔ اسفار نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ رمضان میں اسفار کرنے سے سحری کے بعد لوگ سو جائیں گے اور صبح کی نماز باجماعت فوت ہوگی اور سحری آخر وقت میں کھانے سے سب نمازی صبح کی اذان کے وقت بیدار ہوں گے تو اذان کے بعد جلدی نماز پڑھنے سے کسی کی نماز باجماعت فوت نہ ہوگی۔ میرے خیال میں احادیث غلس اور احادیث اسفار میں تطبیق کی بہترین صورت یہ ہے کہ احادیث غلس کو رمضان پر اور احادیثِ اسفار کو غیر رمضان پر محمول کیا جائے کیونکہ

غیر رمضان المبارک میں اسفار کے افضل ہونے کی جو علت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں تکثیر جماعت ہے وہ علت رمضان میں اسفار پر صادق نہیں آتی بلکہ غلس پر صادق آتی ہے جیسا اُوپر بتلا دیا گیا ہے۔

(۲۲۳) حضرت صحابہ کا زمانہ کی مقدار کو پچاس آیتوں (کی تلاوت) سے اندازہ کرنا یہ بتلاتا ہے کہ ان حضرات کے اوقات عبادت ہی میں مستغرق تھے۔ اگر (تلاوتِ قرآن اور) عبادت کے سوا کوئی اور عادت ان پر غالب ہوتی تو اسی سے زمانے کا انداز بتلاتے مگر چونکہ ان کے اوقات انواع و اقسام کی عبادات میں گھرے ہوئے تھے۔ اُن کے دلوں کو اسی سے لگاؤ تھا تو اُنہوں نے تلاوتِ قرآن سے وقت کی مقدار بتلائی۔

اس سے معلوم ہُوا کہ یہ حضرات ہمیشہ عبادت ہی میں رہتے تھے اگر وہ کسی اور شغل میں بھی مشغول ہوتے تو دل عبادت ہی میں اٹکا ہُوا رہتا تھا اس شغل سے نہیں۔ قاعدہ یہی ہے کہ جو شغل انسان پر غالب ہوتا ہے جس سے دل کا لگاؤ ہوتا ہے زمانے کی مقدار کا اُسی سے اندازہ کرتا ہے کہ یہی اُس کو آسان بھی ہوتا ہے۔

جو لوگ قرآن نہیں پڑھتے اگر اُن کے سامنے زمانے کا انداز قرأت قرآن سے بیان کیا جائے اُن کو اُس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ وہ اس سے کچھ بھی اندازہ نہ کر سکیں گے۔ ہر شخص سے اُس کی سمجھ کے موافق ہی گفتگو کی جاتی ہے تاکہ اُس کو فائدہ پہنچ سکے۔ سب سے ایک طرح کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طریقہ غلط ہے۔ مثلاً اگر ہم کو یہ معلوم ہو کہ مخاطب درزی کا کام کرتا ہے۔ یا بڑھئی ہے تو اُس سے یہ کہا جائے گا کہ جتنی دیر میں تم فلاں کپڑا (کرتہ یا ٹوپی) سی لیتے ہو یا جتنی دیر میں تم اتنی مقدار لکڑی چیر لیتے ہو (اتنی دیر میں یہ واقعہ ہو گیا. یا اگر وہ کپڑا بُننے والا ہے تو اُس سے کہا جائے گا کہ جتنی دیر میں تم اتنا کپڑا بُن لیتے ہو (اتنی دیر میں یہ کام ہُوا) اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضرات صحابہ کے زمانہ

جن لوگوں پر عبادت غالب تھی تو وہ کسی کام کے وقت کا اندازہ اسی سے بتلانے تھے کہ اتنی آیت پڑھنے یا اتنی رکعتیں پڑھنے کی مقدار وقفہ ہوا)۔

قولہ وتقدیرھم الزمان بجمسین آیۃ فیہ دلیل علی ان الصحابۃ رضی اللہ عنھم کانت اوقاتھم مستغرقۃ فی التعبد الی قولہ او تنسیج کذا ان کان قراءۃ۔

ف ۔ بات تو ظاہر ہے مگر اس لفظ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سحری اور اذان میں بقدر پچاس آیتوں کی تلاوت کے وقفہ تھا اس مسئلہ کی طرف ذہن کا منتقل ہونا صوفیاء ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ علماء ظاہر کو یہ استنباطات دشوار ہیں۔ و ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

باب ہشت و نہم

حدیث

من افطر یوماً فی رمضان من غیر عذر

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رمضان المبارک میں ایک دن بلا عذر اور بدون مرض کے روزہ نہ رکھے اُس کی قضاء زمانہ بھر کے روزہ سے بھی نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ عمر بھر روزہ رکھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ جو شخص رمضان میں عمداً بلا عذر کے افطار کرے اُس کے گناہ کا کفارہ کچھ نہیں۔ کیونکہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ اُس کی تلافی سارے زمانہ کے روزوں سے بھی نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ عمر بھر روزہ رکھ دے اور ظاہر ہے کہ عمر بھر کا روزہ تو بڑی قضا ہے اس سے بڑھ کر قضا کیا ہوگی جب یہ بھی اس ایک دن کی تلافی نہ کر سکا تو اور کفارے کیا فائدہ دیں گے؟ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کھانے پینے سے اگر رمضان کا روزہ افطار کیا جائے جماع سے نہیں تو اس پر کفارہ ہے یا نہیں؟

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ اس پر کفارہ نہیں اور یہ حدیث اُن کے قول کی مؤید ہے۔ مگر وہ قضاء کو واجب کہتے ہیں اور یہ حدیث اُن کی اس بات کو رد کر رہی ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں لم یقضہ صیام الدھر کہ ساری عمر کے روزے اس کی قضاء نہیں کر سکتے۔ پھر ایک دن کی قضاء سے کیا ہوگا؟ اور امام

مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفارہ (اور قضا) واجب ہے انہوں نے اس افطار کو جماع سے افطار پر قیاس کیا اور اُس میں شارع علیہ السلام نے تصریحاً کفارہ کو واجب فرمایا ہے تو کھانے پینے میں بدرجۂ اولیٰ کفارہ ہونا چاہیئے اور ظاہر یہ ہے واللہ اعلم کہ یہ حدیث ان دونوں حضرات کو نہیں پہنچی۔ اگر پہنچی ہوتی تو ضرور اسی کو اپنا مذہب بناتے یا اس میں کچھ تاویل فرماتے۔ جب ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں تو غالب گمان یہی ہے کہ ان کو حدیث نہیں پہنچی۔ بالخصوص امام مالک کا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ بہت سی حدیثوں کو روایت کرتے ہیں اور عمل متواتر کی وجہ سے اُن پر عمل نہیں کرتے تو اس حدیث کا نقل کرنا اُن پر بہت زیادہ ضروری تھا کیونکہ یہاں کے مذہب کے معارض اور خلاف ہے (پس غالب یہ ہے کہ حدیث اُن کو نہیں پہنچی) اور ظاہر قیاس یہ چاہتا ہے کہ رمضان میں عمداً بلا عذر افطار کرنے کا کفارہ نہ ہو۔ جیسے یمین غموس کا (یعنی جھوٹی قسم کا جو زمانہ ماضی کے متعلق قصداً جان بوجھ کر کھائی جائے) کفارہ نہیں ہے اور یہ حدیث اس قیاس کی مؤید ہے۔

مگر راوی کا یہ کہنا کہ عبد اللہ بن مسعود کا یہی قول ہے؛ بتلاتا ہے کہ اُن کے سوا بقیہ اصحاب کا یہ قول نہیں اگر کسی اور کا قول بھی حدیث کے موافق ہوتا تو راوی صرف اُن کا نام تنہا نہ لیتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مشہور تھی اور سب کو معلوم تھی مگر اس کے ظاہر پر بجز ابنِ مسعود کے اور کسی نے عمل نہیں کیا اُن کو دُوسری حدیث کی ترجیح واضح ہو گئی تھی (جس میں جماع کے ساتھ افطار کرنے پر کفارہ واجب کیا گیا ہے) تو اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث ائمہ فقہا۔ کو بھی پہنچی ہو گی مگر اُنہوں نے کسی مصلحت سے اس کو روایت نہیں کیا نہ اُس پر کچھ کلام کیا۔ یا تو اس لیے کہ یہ حدیث متروک العمل ہے۔ کہ صحابہ میں سے بجز ایک صحابی کے کسی نے بھی اس کے ظاہری مفہوم پر عمل نہیں کیا یا اور کوئی وجہ ہو اور ممکن ہے اُن کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہو کہ صیام الدہر اس دن کی فضیلت کی قضا نہیں کر سکتا۔ زمانہ بھر کے روزہ سے اس دن کی فضیلت جو فوت ہو گئی ہے حاصل نہیں ہو سکتی اگرچہ کفارہ

(ادر قضا) سے گناہ معاف ہو جائے گا مگر اس خسارہ کی تلافی نہ ہو سکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس کام میں جو فضیلت رکھ دی ہے بندہ اُس کی جگہ اُس کے بدلہ میں کتنا ہی کام کرے گو اُس کا ثواب کتنا ہی زیادہ ہو وہ خاص فضیلت حاصل نہ ہو سکے گی۔ مثلاً کوئی شخص قربانی کے دن میں قربانی نہ کرے اور ہزار درہم یا ہزار دینار اُس کے بدلہ میں صدقہ کرے تو اُس سے کہا جائے گا کہ قربانی کی فضیلت اور اُس کا ثواب تم کو حاصل نہیں ہوا اگرچہ تم نے ہزار دینار صدقہ کرنے میں قربانی کے عوض کا قصد کیا مگر اس عوض سے قربانی کا ثواب نہ ہوگا اور اگر تم ایک دینار سے ایک بکری خرید کر ذبح کر دیتے وہ اُن ہزار دینار کے صدقہ سے افضل تھی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قربانی کے دن میں انسان کا کوئی عمل بھی قربانی سے افضل نہیں۔ اور تم اپنی رائے سے اُس چیز کو فضیلت دینا چاہتے ہو جس کو شارع علیہ السلام نے فضیلت نہیں دی۔ سو یہ معاملہ تمہارے خیال کے موافق نہیں ایسا کبھی نہ ہوگا کہ تم اپنی رائے سے شارع کی بتلائی ہوئی فضیلت کے مقابل دوسری شئے میں فضیلت ثابت کر سکو اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ علیہ مسافر کو سفر میں روزہ کی ترغیب دیا کرتے تھے اگرچہ شرعاً اُس کو افطار جائز ہے اور امام مالک بھی اس کو جائز فرماتے ہیں مگر وہ بھی یہ فرماتے ہیں کہ ایام رمضان کی فضیلت دوسرے ایام میں نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے غالباً اسی حدیث پر نظر کر کے ایسا فرمایا ہے اور زیادہ احتیاط اسی میں ہے۔

ف ۔ یہاں سے اُس فتنہ کا حال معلوم ہو گیا ہو گا جو ایک زمانہ میں ہندوستان میں برپا ہوا تھا کہ بعض علماء نے سلطنت ترکی کی امداد کے لیے فتویٰ دیدیا تھا کہ اس سال مسلمانانِ ہند قربانی موقوف کر کے اس کی رقم سلطنتِ ترکی کو بھیج دیں۔ ان لوگوں نے صدقہ کو قربانی کا قائم مقام قرار دیا۔ مگر ہمارے اکابر نے اس کی سخت مخالفت کی اور فرمایا کہ اپنی رائے سے کسی عمل کو قربانی کا قائم مقام بنانا غلط ہے۔ الحمدللہ ہمارے اکابر کے علوم سلف صالح کے علوم سے موافق ہیں۔ یہی حضرات ہیں جن کے متعلق حدیث میں وارد ہے لایزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق میری اُمت میں

ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی اور غالب رہے گی ۔

(۲۲۴) عبادات میں سب سے افضل اتباع سُنّت ہے زیادہ مشقت مطلوب نہیں

حدیث سے معلوم ہُوا کہ عبادات میں سب سے افضل اتباع ہے زیادہ مشقت میں فضیلت نہیں ۔ دیکھو عمر بھر روزہ رکھنا بہت مشقت طلب ہے مگر وہ رمضان کے ایک روزہ کے بھی برابر نہیں (اور وہ جو ایک حدیث میں آیا ہے افضل الاعمال احمزھا ادا شقھا ۔ کہ اعمال میں زیادہ افضل وہ ہے جو نفس پر زیادہ شاق ہو ۔ یہ اس مقام پر ہے جہاں عمل کے ہر پہلو میں اتباع (سُنّت) موجود ہو جیسے رمضان کے سفر میں روزہ رکھنا اور افطار کرنا دونوں میں اتباع سنت ہے مگر روزہ رکھنا زیادہ شاق ہے تو وہی افضل ہے اور جہاں کسی عمل کے ایک پہلو میں اتباع ہو دوسرے میں اتباع نہ ہو گو مشقت زیادہ ہو وہاں اتباع ہی افضل ہے ۔ جیسے ساری رات جاگ کر نماز پڑھنا اور رات کے پہلے حصہ میں سونا پچھلے حصہ میں اُٹھ کر نماز پڑھنا ۔ یہاں دُوسری صُورت افضل ہے کیونکہ اسی میں اتباع سُنّت ہے ۔ پہلی صُورت میں گو مشقت زیادہ ہے مگر افضل نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام رات جاگنا ثابت نہیں فافہم) ۔ اس میں صُوفیاء کی بھی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ عارف کی طاعت تو حکم کی تعمیل ہے اور جاہل کی طاعت شہوت (کے تابع) ہے (مطلب یہ ہے کہ عارف صرف تعمیلِ حکم کے لیے عبادت کرتا ہے کسی کیفیت یا کرامت و کشف یا لذات باطنی کے لیے نہیں کرتا اور جاہل تعمیل حکم کے سوا دُوسری اغراض کے لیے بھی عبادت کرتا ہے اس لیے جب کوئی کیفیت اور لذت نہ ہو ذکر و شغل وغیرہ چھوڑ دیتا ہے) ۔ دیکھو شہوت ہی تو روزہ میں حمزہ کھانے پر برانگیختہ کرتی ہے (تو جاہل شہوت نفس کا اتباع کر کے ۔ روزہ توڑ دیتا ہے) پھر اُس کے بدلہ میں کفارہ دیتا ہے جو نفس پر شاق ہے اور عارف کو تعمیل حکم (کا اہتمام) ادب کے التزام پر برانگیختہ کرتا ہے کہ حکم کو پوری طرح بجا لانا چاہیئے اُس کا اور کچھ مقصود نہیں ۔ قولہ وفیہ دلیل علیٰ ان افضل العبادات ھی الاتباع الیٰ قولہ

علی التزام الادب فی توفیق الامر لاغیر -

ف - یہ وہ بات ہے جس کے فقدان سے اہل سلوک پریشان ہوتے ہیں - بہت لوگ اوراد و وظائف سے دنیوی اغراض یا باطنی کیفیات کے طالب ہوتے ہیں جب وہ حاصل نہیں ہوتیں سب کام چھوڑ بیٹھتے ہیں - یہ لوگ اصل حقیقت سے جاہل ہیں - عارف وہ ہے جو صرف تعمیل حکم کے لیے کام کرے اور کوئی غرض نہ ہو اسی کا نام اخلاص ہے - اور صاحب اخلاص کبھی ناکام نہیں ہوتا - ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین -

(۲۳۵) توبہ سے اُس گناہ کی تلافی نہیں ہوسکتی جو گناہ اُس سے ہوچکا ہے گو وہ معاف ہوجاتا ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقی مخالفت عہ (یعنی مرتکب گناہ) کرنے والا گو اُس میں کتنی ہی فضیلت موجود ہو اُس نقصان کی تلافی نہیں کرسکتا جو معصیت سے ہوچکا ہے اگرچہ وہ توبہ بھی کرلے - اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے و ان صامہ (اگرچہ وہ عمر بھر روزہ رکھے) کیونکہ ظاہر ہے کہ عمر بھر روزہ رکھنے والا توبہ ضرور کرے گا - امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کے ذمے توبہ ہے اور ایک دن کا روزہ - غرض یہ توبہ اور ایک دن کا یا عمر بھر کا روزہ بہت سے بہت عذاب (اور گناہ) کو رفع کرسکتا ہے - لیکن گناہ سے بچنے کا جو نفع ہے وہ حاصل نہ ہوگا (اور گناہ سے جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی نہ ہوسکے گی) ہاں حق تعالیٰ کا فضل ہوجائے تو اور بات ہے ورنہ ظاہر (قانون) پر وہ نفع نہیں لوٹ سکتا - اور یہ حدیث میں آیا ہے التوبۃ تجب ما قبلہا کہ توبہ پہلی حالت کو ختم کردیتی ہے - اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ گناہ اور عذاب کو توبہ ختم کرے -

---

عہ یہ قید اس لیے لگادی تاکہ خلاف اجتہادی سے احتراز ہوجائے نیز اُن گناہوں سے بھی جن کا گناہ ہونا مختلف فیہ ہے یقینی نہیں کہ صورت اول میں تو نقصان ہی نہیں ہوتا اور دوسری صورت میں نقصان ہوتا ہے مگر اسکی تلافی اعمال صالحہ سے ہوجاتی ہے - ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم و ان الحسنٰت یذھبن السیئات - ۱۲ ظ

دیتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ گناہ سے جو خیر فوت ہو چکی ہے اُس کی تلافی ہو جائے گی۔
اسی لیے اصحاب معاملات (یعنی صوفیائے کرام) نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مولی کے دروازے پر عمر بھر کھڑا رہے اور ایک ساعت غفلت کر جائے تو اس ایک ساعت میں جو خیر اُس سے فوت ہو گئی وہ اس سے بڑھ کر ہے جو عمر بھر میں اُس نے حاصل کی۔ کیونکہ ممکن ہے وہ ساعت لنفحۃ الٰہیہ (اللہ تعالےٰ کی خاص عنایت) کی ساعت ہو اور جس سے یہ عنایت فوت ہو جائے دوسری اُس کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ اس کو دوسری ساعت ان کو بھی نصیب ہو جائے۔ کیونکہ جو ساعت عنایت فوت ہو گئی اُس سے تو حصہ نہ ملا۔ واویلاہ من تخلف عن باب مولاہ اس شخص کی بڑی مصیبت ہے جو اپنے مولیٰ کے دروازے سے ہٹ گیا۔ قولہ وفیہ دلیل علی ان ما یقع من المخالفۃ حقیقۃ الیٰ قولہ من تخلف عن مولاہ۔

ف۔ مگر ایک حدیث میں آیا ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا اُس سے گناہ ہوا ہی نہیں اور قرآن میں ہے الا من تاب واٰمن وعمل عملا صالحا فاولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کرے گا اللہ تعالےٰ اُس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے۔ پھر احادیث میں توبہ اور اسلام کا ایک ہی رتبہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح اسلام سے کفر و شرک سابق کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح توبہ سے گناہ کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ بعض دفعہ وہ لوگ جو پہلے کفر و شرک میں مبتلا تھے بعد میں ایمان لانے اُن لوگوں سے بڑھ جاتے ہیں جنہوں نے کبھی کفر و شرک نہیں کیا۔ چنانچہ بالاجماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں حالانکہ ان حضرات نے کسی وقت بھی کفر و شرک نہیں کیا اور حضرت عمرؓ بعد شرک کے اسلام لائے تھے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک شخص گناہ سے توبہ کر کے اتنے بلند درجے پر پہنچ جائے جہاں وہ لوگ نہیں پہنچ سکے جنہوں نے کبھی گناہ نہیں کیا ۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

اس میں شک نہیں کہ یہ بھی فی نفسہٖ ایک بڑی فضیلت ہے کہ انسان سے عمر بھر گناہ کا ارتکاب بالکل نہ ہو۔ یہ لازم نہیں کہ گناہ کرکے توبہ کرنے والا اُس سے پیچھے ہی رہے اور آگے نہ بڑھ سکے۔ حضرات صحابہ میں بعض وہ بھی تھے جن سے زنا، اور شرب خمر کا ارتکاب ہُوا ہے مگر توبہ کے بعد وہ اُس مقام پر پہنچے جہاں کوئی ولی اور غوث و قطب نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان اس نقصان کی تلافی خود نہیں کر سکتا جو معصیت سے اُس کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن توبۂ خالص کے بعد اللہ تعالیٰ تلافی فرما دیتے اور ایسے بلند مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں اس گناہ سے پہلے نہیں پہنچا تھا۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہُوا کہ رمضان کے ایام کی برابر دوسرے ایام نہیں ہیں۔ رمضان کے ایک دن کا روزہ بلا عُذر کے عمداً توڑنا اتنا سنگین جرم ہے کہ انسان عُمر بھر کے روزوں سے بھی اُس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ رہا یہ کہ توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ اس نقصان کی تلافی کر دیتا ہے یا نہیں؟ یہ حدیث اس سے ساکت ہے اور دوسرے نصوص امید دلاتی ہیں۔ واللّٰہ اعلم فانہ الغفور الرحیم و انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ماشاء والسلام۔



باب ۷۰

حدیث

وصیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابی ھریرۃ بثلاثۃ اعمال من البر

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کاموں کی وصیت فرمائی ہے۔ ہر مہینہ میں تین روزہ نفل رکھنا اور چاشت کی دو رکعتیں پڑھنا اور سونے سے پہلے وتر پڑھنا۔

شرح ظاہر حدیث ہر مہینہ تین روزہ رکھنا اور چاشت کی دو رکعت پڑھنے اور سونے سے پہلے وتر ادا کرنے کی ترغیب دے رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان کی وصیت فرمائی ہے اور جس بات کی آپ وصیت فرمائیں اُس میں تاکیدی امر ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ حضورؐ نے ابوہریرہؓ کو خصوصیت کے ساتھ یہ وصیت کیوں فرمائی؟ حضرات شیخین وغیرہ خلفاء راشدین کو کیوں نہ فرمائی؟ تو بات یہ ہے کہ حضرات خلفاء راشدین کو وصیت کی ضرورت نہ تھی وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث کامل اور آپ کے بعد نبوت کے کام کو سنبھالنے والے تھے اور جن کا یہ درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہو وہ تو اس قابل ہیں کہ لوگ اُن سے وصیت حاصل کریں، اُن کو کسی وصیت کی حاجت نہ تھی کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم آپ کے راستہ پر رسیدھے چلنے والے اور قرب الٰہی کے اسباب کی طرف سبقت کرنے والے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے یبتغون الی ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب۔ وہ اپنے رب کی طرف ذریعہ قرب کے طالب

رہتے ہیں کہ کون زیادہ قریب ہے۔ وہ ہر دم حکم کی بجا آوری میں لگے رہتے تھے۔ مثلاً یہ حضرات چاشت کی رکعتیں نہیں پڑھتے تھے مگر وہ اس وقت مسلمانوں کی خدمت اور اُن کی مصالح پر نظر کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت باتیں ہیں جو اُن کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔

(۲۲۶) ہر شخص کو اُس کی حالت کے مناسب وصیت کی جاتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کو اُس کی حالت کے مناسب وصیت فرمایا کرتے تھے چنانچہ ایک شخص کو اُس کی درخواست کے بعد یہ وصیت فرمائی کہ والدین کی خدمت کیا کرو۔ ایک شخص کو یہ وصیت فرمائی کہ نماز یہ سمجھ کر پڑھا کرو کہ بس یہ آخری نماز ہے (شاید اس کے بعد پھر نماز کی مہلت نہ ملے اور موت آ جائے)، اور لوگوں کے پاس جو کچھ بھی ہے اُس سے امید قطع کر دو (کسی سے کچھ توقع نہ رکھو) اور عبداللہ بن عمرؓ کے بارہ میں فرمایا وہ بہت اچھے آدمی ہے اگر رات کو اُٹھا کریں) اور بہت واقعات ہیں جن میں حضورؐ نے ہر شخص کو اُس کے مناسبِ حال وصیت فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے وصیت کی درخواست کی تو فرمایا غصہ نہ کیا کرو) اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کو اُن کی حالت کے مناسب وصیت فرمائی۔ کیونکہ وہ عبادت کے لیے (سارے کام چھوڑ کر) یکسو ہو چکے تھے تو آپ نے اُن کو ایسے اعمال کی وصیت کی جو عابدین کا ہمیشہ سے شعار ہیں (یعنی نماز، نفل اور روزہ اور تہجد کا اہتمام) مگر ان کاموں میں آپؐ نے کم سے کم درجہ کی وصیت فرمائی۔ اگر آپ زیادہ کی وصیت فرماتے تو وہ اسی کا التزام کرتے جیسا اس وصیت کا التزام کر لیا تھا۔

چنانچہ ایک روایت میں اُن کا یہ قول وارد ہے کہ مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی وصیت فرمائی ہے میں اُن کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ آپ سے مل جاؤں۔ پھر ان تین باتوں کا ذکر فرمایا جو یہاں مذکور ہیں۔ اگر زیادہ کی وصیت کی جاتی وہ اُس کا بھی التزام کرتے پھر شاید کسی وقت مشقت ہوتی۔ اس لیے حضورؐ نے

اعمال کی نوع کو بیان فرمادیا جو اُن کے لیے زیادہ موجب قرب ہیں اور زیادہ کو اُن کی ہمت و قدرت پر چھوڑ دیا۔ آپ نے کم سے کم درجہ بتلا دیا۔ زیادہ سے سکوت فرمایا (رہا یہ کہ ہر شخص کے لیے قرب کا ذریعہ مختلف کیوں ہے؟ سب کے لیے ایک ہی راستہ کیوں نہیں تو) بات یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ میں سب کی حالت یکساں نہیں ہے۔ ایک شخص کے لیے عبادت میں مشغول ہونا مناسب ہوتا ہے دوسرے کے لیے علماء کی صحبت میں رہ کر پڑھنا پڑھانا بہتر ہوتا ہے۔ کسی کے لیے سفر کرنا اور جہاد کرنا اولیٰ ہے وغیرہ وغیرہ۔

جس کو علم سے مناسبت ہو اُس کے حق میں شغلِ علم ہی بہتر ہے۔ کیونکہ علم تمام اعمال سے افضل ہے۔ جیسا شارع علیہ السلام کے ارشادات سے معلوم ہو چکا ہے۔ تو اُس کے لیے عبادت میں مشغول ہو کر شغلِ علمی کو چھوڑ دینا موجبِ نقصان ہے خصوصاً اس زمانے میں تو جس کو علم سے مناسبت اور اہلیت حاصل ہو اُس پر علم میں مشغول ہونا واجب ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جب دین میں بدعتیں داخل ہونے لگیں دین پر آفت آ جائے گی۔ اُس وقت معالمِ دین کو مضبوط پکڑ لو اور اللہ سے رزق طلب کرو"۔

صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! معالمِ دین سے کیا مُراد ہے؟ فرمایا حلال و حرام (بیان کرنے) کی مجلسیں تو اس زمانہ میں علم (شرعی) تمام اعمال سے زیادہ موجب قربِ الٰہی ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ (جس کو علم سے مناسبت ہو اُس پر) اُسی میں مشغول ہونا واجب ہے۔ دلیل یہی حدیث ہے جو ہم نے بیان کی۔ ہاں جس شخص میں علم کی اہلیت نہ ہو اُس کو عبادت میں مشغول ہونے کا امر کیا جائے گا کیونکہ اُمید ہے کہ وہ عبادت میں مشغول ہو کر اپنے کو بھی نفع دے اور دُوسرے بھی اُس کی دُعا سے نفع حاصل کریں۔ اسی طرح تمام اعمال میں غور کیا جائے جس شخص کے مناسب جو عمل ہو اُسے دُوسرے اعمال پر مقدم کیا جائے۔ نفسِ عمل کی فضیلت کو نہ دیکھا جائے بلکہ عمل کرنے والے کی حالت کو دیکھنا چاہیئے (ثواب کے کام تو بہت ہیں جس عمل کے بھی ثواب کو دیکھو وہی اپنی طرف

کھینچا ہے۔ مگر تمام مستحبات و فضائل کا احاطہ دشوار ہے۔ اس لیے عمل کرنے والے کی حالت کے مناسب کسی عمل کو ترجیح دی جاتی گی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو ایک ہی عمل کی وصیت نہیں کی بلکہ ہر ایک کے لیے جُدا عمل تجویز فرماتے تھے۔ جس کی اس میں (زیادہ) اہلیت تھی اور مطلب یہ ہوتا تھا کہ اعمال مستحبہ اور فضائل میں اس کا اہتمام زیادہ کیا جائے۔ یہ مطلب نہ تھا کہ اس کے سوا اور اعمال مستحبہ کو بالکل نہ کیا جائے)۔

وصیت تو اوّل درجہ کی کرنا چاہیئے اور زیادہ کی ترغیب دی جائے

رہا یہ کہ حضورؐ نے ان اعمال میں اوّل درجہ کی وصیت کیوں کی (زیادہ کی کیوں نہ کی؟) تو اس کی وجہ ہم بتلا چکے ہیں کہ اگر زیادہ کی وصیت کی جاتی تو اندیشہ تھا کہ وہ اُس کا التزام کر لیتے (اور کسی وقت دشواری پیش آتی اس لیے زیادہ کو اُن کی ہمت اور قدرت پر چھوڑ دیا گیا۔ دُوسرے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہی تھی کہ تاکید تو اوّل درجہ کی ہی فرماتے تھے پھر زیادہ کی ترغیب دیا کرتے تھے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کے ساتھ قیام کرے (یعنی عشاء کے بعد دو رکعتوں میں اُن کو پڑھ لیا کرے) تو یہ اُسے کافی ہیں پھر اس کے بعد زیادہ کی ترغیب دی اور ہر ایک مقدار کا الگ الگ ثواب بیان کیا۔ یہاں تک کہ (آخر میں) فرمایا کہ جو شخص ہزار آیتیں قیام لیل میں پڑھے اُس کا لقب آسمانوں میں مقنطر ہوگا (یعنی بڑے خزانے والا) اور رات کے آخری تہائی حصّہ کی بہت فضیلت بتلائی (تاکہ لوگ قیام لیل بریں اکتفا نہ کریں جو عشاء کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے بلکہ تہجد کا اہتمام کریں جس کا بہترین وقت رات کا پچھلا حصّہ ہے) اور خود آپ رات کو اتنی لمبی نماز پڑھتے تھے کہ پیر درما پر ورم آجاتا تھا (ظلمت سنۃ من۔ احی الظلام الی ان اشتکت قدماہ الضرمن ورم ۱۲) اسی طرح آپ نے اس وصیت میں عمل کیا (چاشت کی) دو رکعتوں

کی وصیت فرمائی - پھر خود آٹھ رکعتیں پڑھیں - ایک روایت میں بارہ رکعت بھی وارد ہے اور فرمایا جو شخص چاشت کے وقت بارہ رکعتیں پڑھے اللہ تعالے اُس کے لیے جنت میں عالی شان محل تیار کر دیں گے - اس طرز کا منشاء اُمت پر شفقت اور مہربانی تھی کہ مبادا وصیت کے التزام میں مشقت لاحق ہو وہاں بدون وصیت کے آپ زیادہ عمل کی ترغیب دیا کرتے اور ثواب بیان کیا کرتے تھے اس کی تائید سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے واعلموا ان خیر اعمالکم الصلوٰۃ - (اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے افضل نماز ہے) مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ پر جمے رہو ان کو گنتی سے یا تخمینہ سے محدود نہ کرو بلکہ جس قدر بھی ہو سکے زیادہ کام کرو - زیادہ کی رغبت کرو (مجھے معاف کیا جائے کہ یہ تفسیر حدیث کی صحیح نہیں حدیث میں و لا تحصوا ہوتا تو یہ معنی بن سکتے تھے - مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ اُس میں و لن تحصوا وارد ہُوا ہے - اس کا مطلب وہی ہے جو حضرت جیل القوسین ترجمہ میں واضح کر دیا ہے کہ استقامت کے ساتھ کام کئے جاؤ تم سے سب اعمال کا احاطہ ہرگز نہ ہو سکے گا - یعنی فرائض و واجبات کے بعد اعمال مستحبہ میں اعتدال سے کام لو اتنا عمل کرو جس کو ہمیشہ نباہ سکو کہ یہی استقامت ہے -

اس حدیث میں تکثیر عمل کا امر نہیں ہے بلکہ استقامت اور مداومت کا امر ہے) -

مفسرین نے و لا اقسم بالنفس اللوامۃ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ دیہاں قیامت کا ذکر ہے اور نفس لوامۃ سے قیامت میں اپنے کو ملامت کرنے والا نفس مراد ہے اور) قیامت میں ہر شخص ہی اپنے کو ملامت کرے گا - خواہ مومن ہو یا کافر کیونکہ کافر جب کفر کا عذاب دیکھے گا اپنے کو ملامت کرے گا کہ میں مومن کیوں نہ ہُوا ؟ اور مومن گنہگار گنہگار ہوں کی سزا دیکھ کر اپنے کو ملامت کرے گا کہ میں نے دُنیا میں یہ اعمال کیوں کئے تھے اور مومن نیکوکار نیک اعمال کا ثواب دیکھ کر اپنے کو ملامت کرے گا کہ میں نے زیادہ کام کیوں نہ کیا تاکہ ثواب زیادہ ملتا دیگر زیادہ عمل کرنے کا طریقہ استقامت اور مداومت ہی ہے طاقت سے زیادہ

اتنا کام کرنا جس پر دوام نہ ہوسکے تعطل کا سبب ہوجاتا ہے اور تھوڑا کام بقدرِ ہمت ہمیشہ ہوتا رہے تو آخر میں اُس کی مقدار بہت ہوجاتی ہے ۔ قطرہ قطرہ بہم شود سیل۔

قولہ وایضا فقد کان علیہ السلام یوصی لکل شخص بحسب مایقتضیہ حالہ الیٰ قولہ حتی یکون لہ الثواب اکثر ۔

ف ۔ محققین مشائخ کا یہی طریقہ ہے کہ سب کو ایک لاٹھی نہیں ہانکتے ہر شخص کو اُس کے مناسب حال کام بتلاتے ہیں ۔ اگر طالب کو شیخ پر اعتماد ہے وہ اُس کے بتلاتے ہوئے کام پر دل جمعی سے مداومت کرلیتا اور سمجھ لیتا ہے کہ میری کامیابی کا یہی راستہ ہے کتابیں دیکھنے سے جو مختلف اعمال کی طرف دل چلتا تھا کہ یہ کروں یا وہ کروں یا سب کروں تو کیسے کروں اس اُلجھن سے اُس کو نجات مل جاتی ہے اور حصولِ قرب میں دلجمعی کی بڑی ضرورت ہے اور طریق میں اتباعِ شیخ پر اسی لیے زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اُس کی تعلیم سے اُلجھن دُور ہوجاتی اور جمعیت قلب کی دولت نصیب ہوجاتی ہے ۔ مگر یہ ضرور ہے کہ شیخ محقق متبع سنت ہو ورنہ اُلجھن دُور نہ ہوگی بلکہ پریشانی بڑھے گی ؎

کارِ مرداں روشنی وگرمی است

کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی ست

روشنی سے مُراد طمانینت و نورانیت قلب ہے اور گرمی سے محبت وعشق یہ دولت مرداں کامل ہی کے پاس ملتی ہے ۔

ف ۔ حضرت شارح کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کے لیے طریقِ عبادت اور شعار عابدین کو اختیار فرمایا تھا ۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ حضورؐ نے اُن کے لیے طریق علم کو اختیار فرمایا تھا اُن کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتوں کو سُننا اور یاد کرنا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے زیادہ روایت حدیث کرنے والا صحابہ میں کوئی نہیں مگر اس کے ساتھ ہی حضورؐ نے یہ بھی بتلادیا کہ علمی شغل والوں کو کسی قدر عبادت نافلہ کا بھی اہتمام کرنا چاہیئے

صرف فرائض و واجبات وسنن پر ہی کفایت نہ کرنا چاہیئے اسی لیے چاشت کی دو رکعتیں بتلائیں اور ہر مہینہ میں تین روزے اور یہ کہ سونے سے پہلے تہجد پڑھ لیا کریں۔ وتر سے مراد صرف نماز وتر نہیں بلکہ تہجد مع الوتر ہے کیونکہ تنہا وتر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اُس سے پہلے یا پیچھے کچھ نوافل بھی ہوتے ہیں۔ صحابہ عام طور پر وتر کا اطلاق نماز تہجد پر کرتے ہیں کہ وتر سے مل کر سب ہی وتر ہو جاتی ہے۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ عشاء کے بعد دن بھر کی سُنی ہوئی حدیثوں کو یاد کرتے تھے جس کی وجہ سے دیر میں سونا ہوتا تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اُن کو یہ وصیت فرمائی کہ سونے سے پہلے تہجد پڑھ لیا کرو۔

پس اہل علم کو ان تینوں پر پابندی سے کاربند ہونا چاہیئے کہ اس سے زیادہ کی اُن کو فرصت نہیں مل سکتی واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ (اس حدیث میں امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی دلیل بھی ہے کہ نفل دو رکعت سے کم نہیں ہو سکتے (اگر اس سے کم ہو سکتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر اُسی کو بیان فرماتے کیونکہ آپ نے کم سے کم مقدار یہاں بتلائی۔ مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ روزہ نفل بالاجماع تین سے کم ہو سکتا ہے اور یہاں تین سے کم نہیں بتلایا نہیں گیا تو ماننا پڑے گا کہ حضورؐ نے دقت کے ساتھ فضیلت پر بھی نظر فرمائی ہے اور جو لوگ ایک رکعت نفل کو جائز کہتے ہیں وہ بھی دو کی افضلیت کے قائل ہیں)۔

(۲۲۷) منقطع الدُنیا کو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں قدرِ ضروری اور قدرِ قلیل مستحبات پر قناعت کی اجازت ہے

یہاں ایک اور بھی عجیب بات ہے جس پر عاقل کو اچھی طرح غور کرنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس دُنیا کا کوئی سامان نہ تھا نہ وہ دُنیا کمانے میں مشغول تھے (بلکہ اصحاب صفہ میں شامل تھے جن کا مقصد صرف حضورؐ کی خدمت میں رہنا آپ کی باتوں کو سُننا اور علم حاصل کرنا تھا) تو اُن سے قلیل

عمل کا مطالبہ کیا گیا۔ کیونکہ اُنھوں نے دُنیا کے قلیل حصہ پر ہی قناعت کی تھی۔ اسی سے صوفیاء نے یہ قاعدہ اختیار کیا ہے کہ جو شخص سب سے یکسو ہو کر اُن کے یہاں آپڑے، وہ اُس کی یکسوئی اور انقطاع ہی پر قناعت کرتے ہیں اور تھوڑا سا کام بتلا دیتے ہیں۔ اور جو دنیوی اسباب میں مُبتلا ہو اُس کو بہت کام بتلاتے اور نیک اعمال کی طرف سبقت کرنے کی تاکید کرتے ہیں یہاں تک کہ جو شخص معمول سے زیادہ کھاتا ہو اُسے رات کو زیادہ بیدار رہنے کا امر کرتے ہیں جس کا سبب یہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کیونکہ جو شخص عبادت کے لیے اپنے کو فارغ کر لیتا ہے اُس کا دل دُنیا کمانے کی فکر سے خالی ہوتا ہے اور پُوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انسان سے اسی چیز کا مطالبہ ہے کہ اکثر اوقات میں اُس کو حضورِ حق حاصل رہے۔ چنانچہ ایک بزرگ سے ہاتف رغیب نے کہا گھر کو خالی کر دو تاکہ اُس کا مالک اُس میں رہے۔ مطلب یہ کہ اپنے دل کو ما سوائے اللہ سے خالی کر دو اسی وقت خالق (جل وعلا) اس میں رہے گا (یعنی حضورِ حق اُسی وقت قلب کو حاصل ہوگا) اور جب دل میں خالق کے سوا کوئی نہ ہو تو یہی غایت ہے۔ مطلوب ہے یہی غنیمت کبریٰ ہے، بخلاف اس کے جو اسباب میں مشغول ہوتا ہے اُس کا دل کسبِ معاش میں ضرور مشغول ہوگا خواہ تھوڑی ہی دیر کے لیے ہو اسی لیے اُس کو اعمالِ صالحہ کی کثرت کا حکم کیا جاتا ہے۔

یہی حال اُس کا ہے جو پیٹ بھر کر کھاتا ہے کیونکہ اُس کا بدن عبادت میں سُستی کرتا ہے وہ پیٹ بھر کر آرام کرنا چاہتا ہے تو اُس کو اس کی ضد کا حکم دیا جاتا ہے کہ شب بیداری زیادہ کرے تاکہ کھانے کا ثقل دُور ہو جائے اور عبادت میں نشاط حاصل ہو۔ کیونکہ دل کی حالت یہ ہے کہ ہاتھ پیروں سے جو کام کیا جاتا ہے اسی کا طرف اُس کا میلان زیادہ ہوتا ہے اور صوفیاء کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دل کی تعمیر کا اہتمام کرتے ہیں تو جو لوگ اسباب میں مشغول ہوتے ہیں اُن کو زیادہ عبادت بتلاتے ہیں تاکہ کسبِ معاش کے شغل سے

عبادت بڑھ جائے اور قلب کا میلان اعمال صالحہ کی طرف زیادہ ہو جبکہ ہاتھ پیروں سے عبادت زیادہ ہو جائے گی دل کا میلان بھی اس کی طرف زیادہ ہو گا اور جو شخص عبادت کے لیے فارغ ہو چکا اُس کو شغل اسباب سے کچھ واسطہ نہ ہو گا تو اُس کو زیادہ اعمال کی ضرورت نہیں)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو صبح کے قریب سوتا ہوا پایا فرمایا اے شخص کھڑا ہو جا کہ عابدین تجھ سے آگے بڑھ گئے۔ اُس نے کہا اے روح اللہ! مجھے (اسی حال میں) چھوڑ دیجئے کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر رہا ہوں کہ جو سب سے زیادہ اُس کو محبوب ہے۔ پوچھا وہ کیا طریقہ ہے؟ اُس نے کہا میں دُنیا سے بے رغبت ہو چکا ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا سوتا رہ تو عابدین سے بڑھ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دُنیا سے بے رغبتی قلب اور بدن دونوں کو راحت دیتی ہے۔ اس میں بھی اُسی مضمون پر اشارہ ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ قلب کو راحت دینے کا مطلب یہ ہے کہ زاہد کے دل کو اسباب دُنیا میں فکر و تدبیر سے راحت ملتی ہے اور جب دل اس سے خالی ہو گا تو وہ (اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر) آباد ہو جائے گا۔ کیونکہ دل کسی خیال سے خالی کبھی نہ ہو گا ایک نہ ایک خیال ضرور اُس میں ہو گا (خواہ دُنیا کا یا آخرت کا) ایک نہ ہو گا تو دُوسرا ضرور ہو گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں کا خیال ساتھ ساتھ ہو مگر ایسا نادر ہے۔

قولہ وفیہ معنی دقیق الیٰ قولہ لکن ذالک النادر ۔

ف ۔ یہاں سے ناظرین کو مقصد تصوف معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس طریق کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ دل میں اللہ کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہی وہ نسبت صوفیاء ہے جس کو غنیمت کبریٰ کہا جاتا ہے۔ جملہ اذکار و اشغال و نوافل اسی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن اگر یہ مقصد اتباع سنت کے ساتھ حاصل ہو تو نسبت مقبولہ محمودہ ہے بدعات کے ذریعے حاصل ہو تو نسبت غیر مقبولہ مظلمہ ہے ۔

دل ہو وہ جس میں کچھ نہ ہو جلوۂ یار کے سوا
میری نظر میں خاک بھی جام جہاں نما نہیں

ف۔ جو لوگ مشائخ کی خدمت میں دُنیا کے انکار سے فارغ ہو کر جا پڑتے ہیں اُن کو زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی صحبت شیخ کی برکت ہی سے یہ نسبت اُن کو جلد حاصل ہو جاتی ہے بشرطیکہ صحبت سے مقصود خلوصِ قلب کے ساتھ صرف یہی ہو کہ تعلق مع اللہ حاصل ہو جائے۔ کوئی دنیوی مقصد حصولِ جاہ وغیرہ نہ ہو۔ زہد فی الدنیا یعنی دُنیا کی محبت سے دل کا خالی ہو جانا تصوف کا پہلا قدم ہے اگر یہ حاصل نہیں تو صحبتِ شیخ نافع نہیں۔

(۲۳۸) انسان اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے جو طریقہ پر نہ ہو وہ دوستی کا دعویٰ نہیں کر سکتا یہاں ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھوک اور فاقہ کو اپنے اختیار سے پسند کیا۔ اسباب (معاش میں اشتغال) کو ترک کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ پڑے کسی وقت آپ سے جُدا نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بھوک اور فاقہ پر صابر ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ بھوک کی شدت سے بے ہوش ہو جاتے اور کسی کو اُن کے حال کی خبر نہ ہوتی۔ اس حالت میں اُن کو (ایک گونہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت حاصل تھی۔ کیونکہ حضورؐ نے بھی غنا پر فقر کو ترجیح دی تھی اور آپؐ بعض دفعہ بھوک کی شدت میں اپنے پیٹ پر تین تین پتھر باندھتے تھے (تاکہ کمر سیدھی رہے اور کسی کو فاقہ کی خبر نہ ہو) اور فرماتے تھے الا رب مکرم نفسه وهو لها مهين۔ سُن لو! بعض آدمی اپنے نفس کا اکرام کرتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ اس کو ذلیل کرتا ہے، دکما قال علیہ السلام (غالباً مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ فقر و افلاس کے وقت لوگوں سے سوال کر کے اپنی بھوک پیاس بجھا کر نفس کی خواہش کو پورا

کرتے ہیں جو بظاہر نفس کا اکرام ہے مگر واقعہ میں اُس کو ذلیل کرنا ہے) غرض چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جم کر رہ پڑے تھے اور اُسی حالت کو اختیار کئے ہونے تھے جو حضورؐ نے اپنے واسطے اختیار کی تھی۔ اس لیے حضورؐ نے خصوصیت کے ساتھ اُن کو یہ وصیت کی۔ اور اسی بنا پر ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خلیل کہا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہر شخص اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ پس دیکھ لو تم کس سے دوستی کر رہے ہو؟ (اس لیے) ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خلیل کہا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی (اور محبت) کا دعوے کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ اشکال نہ کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا کیونکہ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ابوہریرہؓ کو اپنا خلیل بنایا تھا۔ مگر آپ کے خلیل نہ بنانے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ صحابہ کو بھی حضورؐ سے تعلق خلت نہ ہو کیونکہ خلت کے لیے یہ لازم نہیں کہ اعلیٰ بھی ادنیٰ کو خلیل بنائے بلکہ کبھی یہ تعلق طرفین سے ہوتا ہے کبھی ایک ہی طرف سے ہوتا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ سے خلت ہو گو اعلیٰ کو ادنیٰ سے نہ ہو) خلت کی شرط وہی ہے جو اُوپر بیان کی گئی کہ انسان اپنے خلیل کے طریقہ پر ہو اور یہ شرط حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں موجود تھی تو اُن کو دعوے خلت جائز تھا۔

قولہ وفیہ معنی آخر الی قولہ فساغ لہ ادعاء الخلۃ لاجل ذلک

ف۔ خلیل کا ترجمہ عام طور سے دوست کیا جاتا ہے حالانکہ خلیل وہ ہے جس کی محبت سویدا قلب میں جاگزین ہو۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا تعلق تو صرف اللہ تعالیٰ سے تھا ویسے محبت کا تعلق خلفاء راشدین اہل بیت حضرت فاطمہ حضرات حسنینؓ ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ بہت تھا لیکن یہ سب محبتیں اطراف قلب میں تھیں قلب کے اندر اللہ کے سوا کچھ نہ تھا ؎

عذل العواذل حول قلب التائہ وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ مترجم

(۲۳۹) زندگی کی لمبی اُمیدیں نہ باندھنا چاہیئے

اب یہ بات باقی رہی کہ حضورؐ نے (اعمالِ مستحبہ) میں اُن کو چاشت کی دو رکعت اور ہر مہینہ میں تین روزے اور سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی وصیت پر کیوں اکتفا کیا؟ تو چاشت کی دو رکعت تو اس لیے کہ اس سے کم ممکن نہیں۔ آپ نے اوّل درجہ پر کفایت کی اور ہر ماہ میں تین روزے اس لیے کہ یہ بھی اوّل درجہ ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے اور مہینے کے تیس دن ہوتے ہیں تو انسان کو چاہیئے کہ ہر مہینے میں کم از کم تین روزے رکھ لے تاکہ پورے مہینہ کے روزوں کا ثواب مل جائے اور یہ شخص صائم الدہر کے حکم میں ہو جائے (اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد رمضان کے علاوہ گیارہ مہینے ہیں کیونکہ رمضان میں تو پورے مہینہ کے روزے فرض ہیں اور یہاں فرائض کی وصیت مقصود نہیں بلکہ فرائض واجبات و سنن کے علاوہ چند مستحبات کی وصیت مطلوب ہے) رہا سونے سے پہلے وتر پڑھ لینے کی وصیت اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اُن کو اعمال میں سبقت کی تاکید فرما رہے ہیں مبادا موت آجائے (اور کام رہ جائے) کیونکہ اگر وتر کے بغیر سوگئے تو شاید سوتے ہی میں رات کو موت آجائے (نیند بھی تو ایک قسم کی موت ہے) تو وتر کا ثواب رہ جائیگا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ آپ نے سونے سے پہلے وتر کی وصیت اس لیے کی ہے کہ وتر قضاء نہ ہو جائے مبادا صبح تک آنکھ نہ کھلے اور صبح کے بعد وتر پڑھا جائے حالانکہ وتر کا رات میں پڑھنا افضل (اور حنفیہ کے نزدیک واجب) ہے تو جواب میں کہا جائے گا کہ یہ بات نہیں ہے کیونکہ حضورؐ کا ارشاد ہے رفع القلم عن ثلاث فذکر النائم حتی یستیقظ کہ تین شخصوں سے قلم مرفوع ہو چکا ہے جن میں سے ایک سونے والا ہے یہاں تک کہ بیدار ہو۔ تو اگر نیند کی وجہ سے وتر قضاء ہو جائے کچھ گناہ نہ ہوگا اور صبح کے بعد وتر پڑھنے سے وہیؔ ثواب ہوگا جو رات میں پڑھنے سے ہوتا) بلکہ علت

ؔ بشرطیکہ اس نے جاگنے کا اہتمام بھی کیا ہو۔ ۱۲ ظ۔

وہی ہے کہ شاید موت آجائے اور وتر بالکل ہی فوت ہوجائے اس کی تائید دُوسری حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے وصیت کی درخواست کی تو فرمایا صل صلوٰۃ مودع نماز اس طرح پڑھو جیسے دُنیا کو الوداع کہنے والے پڑھتا ہے۔ آپ نے اس شخص کو قصر امل کی ترغیب دی کہ زندگی کی لمبی اُمید نہ باندھو بلکہ یہ بات پیش نظر رکھو شاید ہیچ نفس نفس واپسیں بود۔ اسی حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے آپؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کو سونے سے پہلے وتر کی وصیت فرمائی کہ یہ اُمید نہ باندھو کہ صبح تک زندہ رہوگے، اس کی تائید ایک دُوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے پوچھا کیف اصبحت۔ تم نے کس حال میں صبح کی؟ انہوں نے کہا اصبحت مؤمنا حقا۔ کہ میں نے سچے مومن کی طرح صبح کی۔ حضورؐ نے فرمایا ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ (بیان کرو) کہا یا رسول اللہؐ میں نے اس حال میں صبح کی ہے کہ ہر قدم پر یہ گمان ہوتا ہے شاید دُوسرا قدم نہ اُٹھا سکوں (اور موت آجائے) اور گویا قیامت میرے سامنے کھڑی ہے۔ ہر اُمت کو اُس کے نامۂ اعمال کی طرف پکارا جارہا ہے جنتی جنت میں راحت کررہے ہیں دوزخی دوزخ میں عذاب دیئے جارہے ہیں حضورؐ نے فرمایا ھنیئا لک العلم تم کو یہ علم مبارک ہو۔ قولہ ولکن بقی بحث الیٰ قولہ ھنیئا لک العلم۔

(۲۴۰) صوفیا کے یہاں اپنی ذات کے لیے کوئی وقت نہیں اُن کا ہر وقت عبادت میں گزرتا ہے

ان ہی احادیث کے معنی اور مقتضا پر نظر کرکے حضرات صوفیاء کے یہاں اپنی ذات کے لیے کوئی وقت نہیں رہا بلکہ اُن کی عمریں ہمیشہ قسم قسم کی عبادات میں مشغول رہ کر ختم ہوتی ہیں کیونکہ اُن کو اعمال کے فوت ہوجانے اور موت آجانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے اس لیے وہ اعمال کی طرف سبقت کرتے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید یہی عمل آخری عمل ہو اس لیے جب دُوسرے اُن کی عبادات کو گنتے ہیں اُن کو

بڑا تعجب ہوتا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کی قدرت سے اتنی عبادت باہر ہے اور اگر یہ مسکین اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے جو ان کے پیشِ نظر ہے تو ان کے پاس بھی ویسے ہی اعمال ہوتے جیسے صوفیاء کے پاس ہیں۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ جس کو ہر سانس پر یہ گمان ہو کہ شاید یہی آخری سانس ہے تو یقیناً اُس کو غفلت نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ حال قائم و دائم ہے۔ ان کو حیرت اس لیے ہوتی ہے کہ یہ لوگ طول امل کی وجہ سے دُنیا کی تدبیر اور کسبِ معاش میں مشغول ہیں۔ ایسا شخص اگر چہ کتنی ہی قوت اور تمکین والا ہو ضرور اپنے سب سے کسی قدر غافل ہو کر اپنے کاموں کی تدبیر کرے گا۔ کیونکہ طولِ امل کا قطعی تقاضا ہے اور حضرات صوفیاء کی حالت اُس کی ضد ہے وہ تو جب کوئی لباس پہنتے ہیں گمان ہوتا ہے کہ شاید یہی آخری لباس ہو جس کو لے کر قبر میں جائیں۔ جب کوئی لقمہ کھاتے ہیں گمان ہوتا ہے کہ شاید یہی آخری رزق ہے جو دُنیا میں اُن کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ جس شخص کا یہ حال ہو اگر چہ وہ سب سے زیادہ کمزور ہو۔ غفلت اور سُستی اُس کے پاس بھی نہیں آسکتی۔ اس لیے ان جیسوں کے بارے میں کہا گیا ہے الوقت سیف۔ وقت ایک تلوار ہے (جو کاٹ کرر ہتا ہے اس کا وار خالی نہیں جاتا یا تمہارے واسطے وار کرے گا۔ اگر اس کو نیکی میں گزار دیا یا تمہارے اُوپر وار کرے گا اگر معصیت یا غفلت میں گزار دیا)۔

مطلب یہ ہے کہ اپنے وقت کی ہر ساعت پر نظر رکھو کہ اس وقت تم پر کیا لازم ہے اس کو بجالاؤ اور وقت کو عمل میں گزارو تاکہ عمل سے پہلے دفعۃً موت نہ آجائے یا (اگر ایسا نہ کیا تو) تاخیر کی وجہ سے وقت تم کو کاٹ دے گا۔ اگر موت نہ بھی آئی کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ انسان کی عمر کا جو دن بھی گزرتا ہے اُس کی جگہ دُوسرا دن نہیں لے سکتا اور گئے وقت کو لوٹانا بھی ممکن نہیں۔ اب اگر وقت اس حال میں گزرا کہ تم نے اس میں کوئی نیک عمل کر لیا ہے تو کامیابی ہے اور اگر نیک عمل سے خالی گزر گیا تو خسارہ۔ ہم اس کی جگہ دُوسرا وقت

نہیں سکتا ۔ احمق اور مسکین وہ ہے جو اپنے اوقات کو امروز و فردا میں گزارتا ہے کہ کچھ کام کروں گا آج نہیں تو کل کروں گا اور اس ٹال مٹول کے ساتھ بھی اپنے کو صاحبِ فلاح سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ سراسر خسارہ میں ہے۔ کیا جس سن میں وہ پچھلی کوتاہی کی تلافی کرنا چاہتا ہے اگر (اس میں اور پہلے میں) دونوں میں برابر عمل ہوتا تو زیادہ بہتر اور کامیابی کا سبب نہ ہوتا ؟ اللہ تعالیٰ نے زبور میں داؤد علیہ السلام پر وحی نازل کی ہے کہ اے داؤد ! تم کو لعل اور سوف اور الیٰ عمل سے نہ روکے اور کہ امید ہے کل تک یہ کام ہو جائے گا۔ عنقریب ایسا کروں گا۔ فلاں دن تک ضرور یہ کام کر لوں گا وغیرہ وغیرہ)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے اور یہ آخری کلام ہے جو اُن کی زبان سے نکلا۔ اے شخص : کل کی فکر آج نہ کر۔ کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو کل کو پائیگا یا نہ پائے گا۔ اگر پا لیا تو اللہ تعالیٰ اُس میں نیا رزق دے گا اور اگر نہ پایا تو ایسے دن کی فکر سے کیا فائدہ جس کو تم نہیں پا سکتے ۔"

شارح علیہ السلام کے ارشادات اور بزرگانِ سلف کے اقوال و افعال اس معنی میں بکثرت وارد ہیں۔ پس جس کو فلاح (اور کامیابی) و ترقی مطلوب ہو وہ ان احادیث و اقوال میں غور کرتا رہے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور اُن پر عمل کرتا رہے اس کے بعد ترقی اور کمال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے اُس کی طرف عاجزانہ متوجہ رہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ مطلوب تک پہنچ جائے گا۔

قولہ ولاجل النظر الی معنی ھذہ الاحادیث الی قولہ یصل عند ذلک انشاء اللہ الی المرغوب ۔

(۲۴۱) اہلِ اللہ کی صحبت حاصل ہونے پر فخر کرنا جائز ہے جبکہ بطور شکر کے ہو تکبر کے لیے نہ ہو ۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل برکت

کی صحبت (حاصل ہونے) پر فخر کرنا جائز ہے بشرطیکہ اُن سے یہ نسبت (اور تعلق) بھی حاصل ہو جائے خواہ کسی درجہ کا ہو (بدون نسبت اور تعلق کے محض نری صحبت سے کچھ نہیں ہوتا) اور فخر بھی شکر کی نیت سے ہے۔ مباہات اور رفعت (اور تکبر) کی بنا پر نہ ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ذکر النعم شکر نعمتوں کا تذکرہ بھی شکر ہے۔ یہ اس سے مفہوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے اوصانی خلیلی۔ مجھے میرے خلیل نے وصیت کی (جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی خلت و محبت کو ثابت کر کے صحبت رسول پر فخر کا اظہار ہے)۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان اپنے اور اہل فضل کے درمیان کوئی رشتہ (اور تعلق) ثابت کر سکتا ہے اور اُن کی طرف اس تعلق سے اپنی نسبت بھی کر سکتا ہے اگرچہ اُنھوں نے اس کے لیے اس تعلق کا نام نہ لیا ہو۔ کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا خلیل کہا حالانکہ حضور نے اپنی ذات مقدسہ سے تمام انسانوں کی خلت کی نفی کر دی ہے (چنانچہ اُوپر یہ حدیث گزر چکی کہ اگر میں اللہ تعالے کے سوا کسی کو دوست بناتا تو ابو بکر کو بناتا جس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالے کے سوا آپ کا کوئی خلیل نہیں ہے) اور کہا گیا ہے ؎

ان التشبہ بالکرام فلاح بزرگوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا بھی فلاح ہے۔

قولہ وفیہ انہ یجوز الافتخار بصحبۃ المبارکین الیٰ قولہ فلاح۔

ف۔ شاید کسی کے دل میں اس مقام پر یہ سوال پیدا ہو کہ حدیث میں تو آیا ہے ان لنفسک علیک حقا کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے۔ پھر یہ کیسے کہا گیا کہ صوفیاء کے یہاں اپنے نفس کے لیے کوئی وقت نہیں۔ جس ساعت میں نفس کا حق ادا کیا جائے گا وہ تو نفس کا وقت ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ وہ نفس کا

حق بھی اس نیت سے ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کا حق واجب کیا ہے تو یہ
بھی نفس کا وقت نہ ہوا بلکہ حکم الٰہی کی تعمیل کا وقت ہوا جو عین عبادت ہے۔ اسی طرح
بیوی بچوں کا حق بھی اسی نیت سے ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کا حق واجب
کیا ہے۔ تجارت اور ملازمت اور زراعت بھی اس نیت سے کرتے ہیں کہ کسب
الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ۔ حلال روزی حاصل کرنا بھی فرائض کے بعد ایک
فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے تو اُن کا یہ وقت بھی حکم الٰہی کی تعمیل میں گزرتا
ہے جو کہ عبادت ہے۔

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان کو زیادہ تر خسارہ نیت سے غفلت کی بنا پر
ہوتا ہے اگر وہ تمام مباحات میں اپنی نیت کو درست رکھے تو اُس کے سارے
اوقات عبادت میں مشغول ہو سکتے ہیں، کیونکہ مباحات تو بہرحال کسی نہ کسی درجے میں
دین سے تعلق ہوتا ہے۔



حدیث

الامر بترک مالم یسم علیہ من الصید

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں اپنے (شکاری) کتے کو چھوڑتا ہوں اور بسم اللہ کہتا ہوں۔ پھر اس کے ساتھ شکار پر دوسرا کتا پاتا ہوں جس پر میں نے بسم اللہ نہیں کہی اور مجھے معلوم نہیں کہ دونوں میں سے کس نے شکار کو پکڑا ہے۔ فرمایا (اس شکار کو) نہ کھاؤ کیونکہ تم نے اپنے کتے کو بسم اللہ کے ساتھ چھوڑا ہے دوسرے پر تو بسم اللہ نہیں کہی۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ شکار پر بسم اللہ کہنا واجب ہے۔ اگر بسم اللہ نہ کہی جائے تو شکار کے کھانے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ جب صحابی نے حضور سے عرض کیا کہ مجھے معلوم نہیں کس کتے نے شکار کو پکڑا تو آپ نے باوجود اس کے اُن کو اس شکار کے چھوڑ دینے کا حکم دیا (اور کھانے سے منع فرمایا) تو جس پر بالیقین بسم اللہ نہیں کہی گئی بلکہ عمداً بسم اللہ کو ترک کیا گیا ہو اُس کا حرام ہونا بدرجہ اولیٰ معلوم ہو گیا۔

ف۔ یہی امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ جس شکار یا جانور پر بسم اللہ ترک کر دی گئی اُس کا کھانا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ اُس کا کھانا جائز ہے کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ بسم اللہ ہر مسلمان کے دل میں ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے

اور جس ذبیحہ پر بسم اللہ نہ کہی گئی ہو اُس کا حرام ہونا قرآن میں منصوص ہے ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ و انہ لفسق ۔

اور یہ حدیث صحیح بھی اُس کی حُرمت کو بتلا رہی ہے اس لیے اس بات میں حنفیہ اور مالکیہ کا مذہب قوی ہے ۔

ف ۔ اس حدیث سے شارح نے کوئی مسئلہ تصوف کا استنباط نہیں کیا میرے خیال میں وہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اسباب معاش کا اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ۔ کیونکہ صحابہ سے بڑھ کر متوکل کون ہوگا ؟ اور اکثر صحابہ نے اسباب معاش کو اختیار کیا ہے ۔ سب حضرت ابوہریرہؓ کی طرح تارکِ اسباب نہ تھے پس جو اولیاء اسبابِ معاش میں مشغول ہوں اُن پر اعتراض نہیں ہو سکتا ۔



حدیث

النهی عن الصرف الا یدًا بید

حضرت براء بن عازبؓ اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیع صرف کو دریافت کیا (بیع صرف چاندی سونے کی خرید فروخت کو کہتے ہیں) حضورؐ نے فرمایا اگر ہاتھ در ہاتھ ہو تو کچھ حرج نہیں اور اگر ادھار ہو تو درست نہیں۔

شرح ظاہر حدیث سے بیع صرف کا جواز معلوم ہوا کہ جب ہاتھ در ہاتھ ہو اور ممانعت معلوم ہوئی جبکہ اُدھار ہو چاہے تھوڑی ہی دیر کا اُدھار ہو چنانچہ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے اگر (بیع صرف میں) ایک شخص تم سے اتنی مہلت مانگے کہ گھر کے اندر جاکر چیز لے آئے تو اتنی مہلت بھی نہ دو (بلکہ مجلس بیع ہی میں تبادلہ ہو جانا چاہیئے)۔

ف۔ شارح نے یہاں بھی کوئی مسئلہ تصوف کا استنباط نہیں کیا۔ میرے خیال میں اس سے بھی مقصود وہی ہے کہ اسبابِ معاش میں مشغول ہونا خلافِ توکل اور خلافِ ولایت نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں صحابی چاندی سونے کا کاروبار کرتے تھے اور حضورؐ نے اُن کو منع نہیں کیا اور صحابہ سے بڑھ کر متوکل اور صاحبِ ولایت کون ہو سکتا ہے ؟



باب ۹۳

حدیث

الحث علی العمل وفضل عمل الیــد

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی نے اس شخص سے بہتر (حلال) کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کے عمل سے (کماکر) کھاتا ہو اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے عمل سے (کماکر) کھاتے تھے (وہ لوہے کی زرہ بہت عمدہ بناتے تھے جو لڑائی کے وقت فوجی پہنتے ہیں) اور اسی کو بیچ کر اپنی گزر کرتے تھے (باوجود عظیم الشان سلطنت کے شاہی خزانہ سے کچھ نہ لیتے تھے وہ سب کا سب رعایا پر خرچ ہوتا تھا ۱۲ مترجم) ۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ بہترین غذا وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کے عمل سے کماتا ہے اور اسی کے ضمن میں کسب پر ترغیب بھی ہے جس کی چند شرطیں ہیں (جو آگے بیان ہوں گی) ۔

(۲۴۲) اسبابِ معاشش کا اختیار کرنا سُنت ہے اور اس میں حکمت ہے

اس خیریت (اور بہتری) سے کیا مراد ہے ؟ اور یہ فضیلت مومن وکافر سب کو عام ہے یا مومن کے ساتھ خاص ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف داؤد علیہ السلام کی مثال کیوں بیان فرمائی حالانکہ اکثر انبیاء علیہم السلام اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے ؟ جواب یہ ہے کہ اگر بہتری کی علت یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے

والا دوسروں سے مستغنی ہوتا ہے اور کسب کی وجہ سے کسی پر اس کا بار نہیں ہوتا کیونکہ (مثل مشہور ہے کہ) جس کی طرف تم کو احتیاج ہو وہ تمہارا امیر وہ ہے اور جس سے تم مستغنی ہو تم اس کے سردار ہو۔ اگر خیر ہونے کا یہ مطلب ہے تو اس میں مومن اور کافر سب داخل ہیں اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس میں کسب کی ترغیب بھی ہے درست ہے لیکن اس کے لیے چند شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ ذریعۂ کسب شرعاً جائز ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کا عمل بھی شریعت کے موافق ہو کیونکہ بعض دفعہ ذریعۂ کسب تو جائز ہوتا ہے مگر عمل شریعت کے خلاف ہوتا ہے (مثلاً سنار کا پیشہ شرعاً جائز ہے مگر عمل کے وقت سنار خالص سونے میں کھوٹ ملانے لگے تو اس کا عمل شریعت کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح درزی کے پیشے کو اور ہر پیشے کو سمجھ لیا جائے ۱۲) ۔

اور اگر خیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذریعۂ معاش میں کام کرنے پر ثواب ہوتا ہے اور اس کی خیر متعدی ہوتی ہے (کہ دوسروں کی بھی مدد کرتا ہے غریبوں محتاجوں پر صدقہ کرتا ہے) جیسا ایک حدیث میں ہے من بات تعبا من طلب الحلال بات مغفورا له واصبح والله راض عنه۔ جو شخص کسب حلال سے تھک کر رات گزارے اُس کی مغفرت ہو جاتی ہے اور صبح کو اس حال میں اُٹھتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُس سے راضی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ فضیلت مُسلمانوں کے ساتھ خاص ہوگی اور مُسلمانوں کو کسب معاش پر ترغیب دینے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے موافق کمانے کا ذریعہ اختیار کریں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کا یہ مطلب ہو کہ پیشہ ور کا رزق بواسطہ اُس کے عمل کے غیب سے آتا ہے۔ یہ بات اُسی پیشہ کے ساتھ خاص ہے جو ہاتھ سے کیا جاتا ہے دوسرے اسباب کسب اس میں داخل نہ ہوں گے۔ اسی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی مثال بیان کی گئی۔ دوسرے انبیاء کی نہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ صنعت (وحرفت) اللہ تعالےٰ کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے جس سے صاحب

صنعت پہ خرچ کرتا رہتا ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث تعلیم صنعت کی ترغیب دے رہی ہے کہ یہی سنت ہے اس میں کچھ عار نہیں کیونکہ جس کام کو انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی نے کیا ہو اس میں عار نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کی علت یہ ہو کہ ہاتھ سے پیشہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حق واجب نہیں ہوتا۔ دوسرے اسباب معاش میں حق اللہ واجب ہوتا ہے جو کبھی پورا ادا ہو جاتا ہے اور کبھی قصداً یا بلا قصد کچھ ادا ہونے سے رہ جاتا ہے تو اور اسباب معاش میں زکوٰۃ اور دیگر حقوق واجب ہوتے ہیں اور احتمال رہتا ہے کہ وہ ادا ہوئے یا نہیں؟ اور ہاتھ سے جو پیسے کئے جاتے ہیں اگر شریعت کے موافق کام کیا جائے تو اس میں کوئی حق اللہ یقینی طریقہ پر واجب نہیں ہوتا اور تو اس میں کوتاہی کا بھی احتمال نہیں) اور جس میں کوتاہی کا احتمال نہ ہو وہ اس سے بہتر ہے جس میں احتمال ہو۔

یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کی صنعت وحرفت میں دوسرے ذرائع معاش سے زیادہ برکت ہوتی ہے۔ پھر یہ برکت کبھی حسی ہوتی ہے کبھی معنوی۔ برکت حسیہ تو یہ ہے کہ کھانے میں تھوڑی مقدار زیادہ مقدار کے قائم مقام ہو جائے اور برکت معنویہ یہ ہے کہ اس کھانے سے قوت ونشاط دوسرے کھانوں سے زیادہ حاصل ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ معاش کے لیے کوئی ذریعہ اختیار کرنا سنت ہے اس میں سنت کا اتباع ہے کیونکہ اس میں حکمت (الٰہیہ) کا ایک نشان ہے۔ اسی لیے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے لوگوں نے اُن کو تلاش کیا تو بازار میں تجارت کرتے ہوئے ملے۔ لوگوں نے کہا کہ خلیفہ ہونے کے بعد بھی تجارت؟ فرمایا تو کیا میں اپنے اہل وعیال کے ذریعۂ معاش کو چھوڑ دوں؟ (اس کے بعد اُن کی تنخواہ بیت المال سے مقرر کی گئی جو آجکل کے حساب سے سوا سو روپیہ ماہوار کے قریب تھی)۔

اس بنا پر مطلقاً اسباب معاش کا اختیار کرنا باعث برکت ہے بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو خواہ صنعت ہو یا زراعت یا تجارت وغیرہ سب ہی میں برکت ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اسی طرح اس دُنیا کی آبادی کا ارادہ کیا ہے۔ (حکمتِ الٰہیہ کا یہی تقاضا ہے کہ لوگ اسباب کے ذریعہ معاش طلب کریں بغیر اسباب کے شاذ و نادر ہی کسی کو روزی ملتی ہے) اسی لیے میرے ایک شیخ جو زہد و علم دونوں کے جامع تھے درس و تدریس سے فارغ ہو کر اپنے ہاتھ سے اپنے باغ میں کام کرتے تھے۔ بعض دفعہ تدریس کے ساتھ مجاہدہ (و ریاضت) بھی کرتے۔ پھر بھی پھاوڑہ سے کام کرنا نہ چھوڑتے اور فرماتے تھے کہ دُوسروں نے بویا تھا ہم نے کھایا ہم بوئیں گے تو دُوسرے کھائیں گے تاکہ اللہ تعالےٰ کی حکمت ظاہر ہو جس وقت اُن کا باغ تیار ہو گیا انتقال فرما گئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)۔

اب ہم اُن اعتراضات کو بیان کرتے ہیں جو اس مقام پر وارد ہوتے ہیں اور اُن کا جواب بھی دیں گے۔ اُوپر کہا گیا ہے کہ کسبِ معاش کے ذریعہ لوگوں سے استغنا ہو جاتا ہے۔ اس پر قرآن و حدیث سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔ قرآن کی تو یہ آیت ہے رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله و اقام الصلوة و ايتاء الزكوة۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی۔

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت اور اہلِ صفہ کی حالت وارد ہے (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسبِ معاش کا کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا بلکہ تارکِ اسباب تھے اور یہی حالت اہلِ صفہ کی تھی) اور حضورؐ نے اہلِ صفہ کو اُن کے حال پر قائم رہنے دیا بلکہ بعض دفعہ اُن کو دُوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ قرآن کی آیت کا تو یہ جواب ہے (کہ اُس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگ تجارت اور بیع و شراء نہیں کرتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کام اُن کو اللہ تعالےٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتے وہ بدن سے کسبِ معاش کرتے ہیں اور دل اللہ تعالےٰ کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ چنانچہ

اس آیت کے شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ صحابہ میں ایک درزی کی عادت تھی کہ اذان کے وقت اگر کپڑے میں سوئی ہوتی اُس کو نکالتا نہ تھا اور نکال چکتا تو پھر کپڑے میں نہ لگاتا بلکہ فوراً کھڑا ہو جاتا اور فرض ادا کرنے چلا جاتا۔ اسی طرح لوہار کی یہ حالت تھی کہ اگر ہتھوڑا اُٹھا لیتا اور اذان کی آواز کان میں آجاتی تو اُس کو لوہے پر نہ مارتا بلکہ ہاتھ سے پھینک دیتا اور اگر مار چکنے کے بعد اذان سُنتا تو پھر نہ اُٹھاتا بلکہ فوراً عمل آخرت (نماز وغیرہ) کے لیے کھڑا ہو جاتا، یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بندہ سے (شریعت کو) مطلوب یہ ہے کہ اس کا دل اسی کے ساتھ وابستہ رہے جس کے پاس جانے والا اور پہنچنے والا ہے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں کسبِ معاش وغیرہ میں لگے ہوں۔ مجھ سے ایک بزرگ نے بیان کیا کہ افریقہ میں ایک گھاس کھودنے والا حماموں کے لیے گھاس لاتا تھا اور وہ اپنے وقت کے بڑے اولیاء میں سے تھا صبح کی نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کے قریب تک یہ کام کرتا۔ پھر وہ کپڑے (جن میں گھاس کھودتا) اُتار دیتا اور حمام میں جا کر غسل کرتا دُوسرے کپڑے پہنتا اور جو کچھ مزدوری ملتی اس میں سے تھوڑی مقدار اپنے واسطے رکھ کر فقراء، عابدین اور مساکین کو باقی رقم تقسیم کر دیتا۔ خود دن بھر روزہ رکھتا اور مغرب کے وقت اس قلیل مقدار سے افطار کرتا جو اپنے واسطے رکھ لی تھی۔ یہ شخص صاحبِ احوالِ رفیعہ تھا اس کو بڑے بڑے بزرگ ہی پہچانتے تھے کیونکہ وہ اپنے حال کو لوگوں سے چھپاتا تھا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ صفہ کی حالت سے جو اعتراض کیا گیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سب سے بڑھ کر ہے آپ کے نفس کو دُنیا کی طرف اصلاً توجہ نہ تھی (تو جس کی یہ حالت ہو اُس کے لیے حضور کی طرح تارکِ اسباب ہونا ہی بہتر ہے لیکن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ (دُوسروں کے ساتھ) نرمی کرنا ہے۔ کیونکہ بعض بلکہ اکثر لوگ ضعیف ہیں (وہ حضورؐ کی اس حالت کا اتباع نہیں کر سکتے۔ تو ان کے لیے آپؐ نے اسباب معاش کو اختیار کرنا مشروع کیا) جیسا مجذوم کے بارہ میں (دوسروں کو) تو آپؐ نے یہ فرمایا فرمن المجذوم

کما تفر من الاسد۔ کوڑھی سے ایسا بھاگو جیسا شیر سے بھاگتے ہو۔

اور خود آپ نے مجذوم کے ساتھ ایک برتن میں کھانا کھایا اور یہ دُعا پڑھی بسم اللہ قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ اللہ کے نام سے کھاتا ہوں کہو کہ ہم کو ہرگز کوئی مصیبت آ سکتی۔ سوا اس کے جو اللہ تعالےٰ نے ہمارے واسطے مقدر کی ہے تو آپ نے (دُوسروں کے لیے) آسان اور سہل طریقہ مشروع فرمایا کیونکہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج۔ اللہ نے تمہارے اُوپر دین میں ذرا بھی تنگی نہیں کی اور اپنی حالت (اور عمل) سے اہل قوت کے لیے (جن کے دل تعلق مع اللہ سے مضبوط ہو چکے ہیں) اعلیٰ درجہ کے اختیار کرنے کا اشارہ بھی فرما دیا۔ مثلاً مجذوم ہی کے مسئلہ میں دو راستے ہیں جس کا نفس ضعیف ہو اُس کو سنت کا اتباع کر کے مجذوم سے بھاگنا چاہیئے اس میں اس پر کوئی گنا ہ نہ ہوگا اور اگر نفس قوی ہو تو اُس سے ملے اور اُس کے ساتھ کھائے اور اس میں وہ آپ کے حال کا متبع ہوگا۔ چونکہ اہلِ صفہ نے (اور اُن کے بعد صُوفیا ء نے) بلند حالت کو اختیار کیا (وہ حضورؐ کی طرح تارکِ اسباب ہو گئے اور توکل کا اعلیٰ درجہ لے لیا) تو حضورؐ اُن کو دُوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔

اُوپر کہا گیا ہے کہ کسبِ معاش (کے ذرائع و اسباب اختیار کرنے) میں ثواب ہے اس پر ایک حدیث سے (بظاہر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے:

لو انکم توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا و تروح بطانا۔ اگر تم اللہ تعالےٰ پر پُوری طرح توکل کرتے جیسا توکل کا حق ہے تو اللہ تعالےٰ تم کو اس طرح روزی دیتے جس طرح پرندوں کو روزی دیتے ہیں کہ وہ صُبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توکل کا اعلیٰ درجہ ترکِ اسباب ہے اور جب اعلیٰ درجہ یہ ہے تو ثواب بھی اسی میں زیادہ ہے کیونکہ اعمال میں فضیلت ثواب ہی کی قلت و کثرت سے ہے) جواب یہ ہے کہ دونوں میں کچھ تعارض نہیں، تطبیق

یہ ہے کہ جس کو توکل حقیقی حاصل ہو (اس کے لیے ترک اسباب ہی افضل ہے) اور توکل حقیقی کی شان یہ ہے کہ اس شخص کا دل کسی مخلوق سے وابستہ نہ ہو اور اگر اس کو کسی کے ہاتھ سے کوئی خیر حاصل ہو تو اُس کا دل اللہ تعالٰے ہی سے وابستہ رہے۔ کسی دوسرے سے وابستہ نہ ہو۔ اور جو چیز بغیر انتظار نفس کے اس کے پاس آئے اول شریعت پر اُس کو جانچے۔ اگر شریعت کے لحاظ سے درست ہو تو پھر طریقت کی رُو سے دیکھے۔ اگر اس پر بھی ٹھیک اُترے اب اللہ تعالٰے سے دُعا کرے کہ اس کو بہترین صورت کی ہدایت کریں کہ اس کو لے یا چھوڑ دے (یہ ہدیہ قبول کرے یا نہ کرے) جب اُس کو بہترین صورت کی توفیق ہو جائے تو اگر لینے میں خیر ہو لے لے اور اس شان سے لے کہ دل اللہ تعالٰے ہی کے ساتھ وابستہ ہو' اس کے بعد اس کی ضرورت ہے کہ حق تعالٰے سے دُعا کرے کہ اس کو اچھی جگہ صرف کرنے کی توفیق ہو اور تمام حالات میں کسی کے ساتھ دل کو تعلق نہ ہو۔ ویکون ذلك بمعرفة غیرہ فی التصرف فی ذلك بما یزیدہ الی اللہ قربا وفی حالہ حسنا (اس عبارت کے ترجمہ و مطلب میں شرح صدر نہیں ہُوا) پھر اس تمام معاملہ میں اللہ تعالٰے کے احسان کا مشاہدہ کرے اور اتباع سنت کی بنا پر اس شخص (کے احسان کا بدلہ دے اگر یہ نہ ہو سکے تو اُس) کے لیے دُعا کرے جس کو حق تعالٰے نے اس کے لیے مسخر کیا (اور اس کے ہاتھ سے خیر پہنچائی) ہے اور دعا (وغیرہ) بھی محض اتباع امر کے لیے ہو اس سے زیادہ کچھ نہ ہو۔

حدیث میں ہے من والاك معروفا فكافئه فان لم تجد فادع اللہ له حتى تعلم انك قد كافأته (جو شخص تم پر کوئی احسان کرے اس کا بدلہ دو اگر یہ نہ ہو سکے تو اللہ تعالٰی سے اس کے لیے دُعا کرو یہاں تک کہ دل گواہی دیدے کہ تم نے اُس کا بدلہ کر دیا) نیز ایک حدیث میں دُعا کی حد یہ بتلا دی گئی کہ جب تم نے احسان کرنے والے سے یہ کہہ دیا جزاك اللہ خیرا۔ اللہ تجھے جزائے خیر دے۔ تو تم نے اُس کی تعریف میں مبالغہ کر دیا۔

اور اگر (اس شخص کو کسی نے ذریعہ سے خبر نہیں پہنچی بلکہ) یہ اُن لوگوں میں سے ہے
جن کو خرقِ عادت (اور کرامت) کے طور پر (بلا واسطہ غیبی) فتوحات پہنچتی ہیں اس کو
چاہیئے کہ ان فتوحات کو اللہ تعالےٰ کی طرف محتاج بن کر شکر کے ساتھ لے اور
اپنے کو اس کا اہل نہ سمجھے ادب کو ملحوظ رکھے اور اپنے دل کو اس کرامت سے
وابستہ نہ کرے اگرچہ وہ کرامت ربانی ہو (اللہ ہی کی طرف سے ہو) اُس کے
تصرف کو (اس میں اصلاً دخل نہ ہو پھر بھی اُس پر توجہ نہ کرے) کیونکہ یہ بھی شغلِ خاطر
کا سبب ہوگا۔

نیز تصرف کے وقت اپنی احتیاج کو پیشِ نظر رکھے اور اللہ تعالےٰ سے دعا
کرے کہ اس کو ایسی جگہ خرچ کرنے کی ہدایت فرمائیں جو اُس کی مرضی کے موافق ہو
اور اپنے حال کو چھپائے کسی سے (غیبی فتوحات کا) تذکرہ نہ کرے مگر یہ کہ اُس
کو اظہار کا حکم ہو تو حکم کے موافق ظاہر کرے اور کوئی دریافت کرے تو (فتوحات
کا انکار نہ کرے کیونکہ یہ بھی منجملہ نعمتوں کے (بڑی نعمت) ہے اور نعمت کا انکار
مناسب نہیں کہ ناشکری ہے) اور اگر کوئی دریافت نہ کرے تو اس کا تذکرہ نہ کرے
اور جب کوئی دریافت کرے تو صراحۃً خبر نہ کرے سوا اس کے جس سے (صراحۃً)
ذکر کرنے کا حکم کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ (غیبی فتوحات) قدرت کے اسرار میں سے ہیں
اور جو شخص اسرارِ قدرت کو بغیر اجازت اور ضرورت کے ظاہر کرتا ہے وہ بہت
کم اُس کے پاس رہتی ہیں اور بہت کم باقی رہتی ہیں۔ ضرورت کی صورت یہ
ہے کہ اظہار پر مجبور ہو جائے چھپانے پر قادر نہ ہو۔

مجھ سے ایک ثقہ نے بیان کیا کہ ایک متّقی کے اہل وعیال بہت تھے اور اُس
کے پیشہ کی آمدنی کافی نہ تھی (پڑھنے والے بچے جو کچھ لاتے وہ اُس کے خرچ کیلئے
کافی نہ ہوتا) اس کا ایک بھائی بڑا مالدار تھا مگر وہ اس کی خدمت نہ کرتا تھا
اور اس نے اپنے بھائی سے یا اور کسی سے اپنا حال ظاہر نہیں کیا تھا تو اللہ تعالےٰ
نے خرقِ عادت (یعنی کرامت) کے طور پر یہ صورت جاری کر دی کہ روزانہ جب

وہ مکتب کھولتا بچوں کے آنے سے پہلے اپنی دوات میں اتنی رقم موجود پاتا جو اُس دن کے لیے کافی ہوتی اس طرح اس کی حالت درست ہوگئی (تنگی اور افلاس سے نجات مل گئی) ایک مدت اسی حال میں گزر گئی تو اُس کے بھائی کو تعجب ہُوا کہ مکتب کی آمدنی تو اس کو کافی نہ ہوتی تھی (پھر یہ خوشحالی کہاں سے آئی ؟) بالآخر اُس نے دریافت کیا کہ تیری آمدنی کہاں سے ہونے لگی تو اُس نے اُس سے ساری حقیقت بیان کر دی ۔ اس کے بعد یہ فتوحات بند ہوگئیں (یہ تو اُس کا حکم ہے جس کا توکل قوی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں وہ حدیث وارد ہے لو انکم توکلتم علی اللّٰہ حق توکلہ (الخ)

اور جس کا توکل ضعیف ہو اُس کو اسبابِ معاش کا اختیار کرنا ہی بہتر ہے ۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جس کا توکل قوی ہے اُس کا ایمان قوی ہے وہ ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہتا ہے بندگی پر جما رہتا اور (کسی وقت بھی) اللہ تعالیٰ پر (اور اُس کی تقدیر پر) اعتراض نہیں کرتا نہ کسی چیز کی طرف نظر اُٹھاتا ہے اور جس کا توکل ضعیف ہے اُس کا ایمان ضعیف ہے ۔ اس کا دل (ہر حال میں) اللہ تعالےٰ سے خوش نہیں رہتا گو زبان سے کچھ نہ کہے اُس کا نفس اِدھر اُدھر نظر رکھتا ہے ۔ بعض چیزوں کی تمنا بھی کرتا ہے اور کبھی بعض باتوں پر (دل میں) اعتراض بھی آتا ہے (گو عمداً نہو وسوسہ ہی کے طور پر ہو) اور یہ عین ہلاکت ہے تو اُس کے لیے اسباب میں مشغول ہونا ہی رحمت ہے ۔ کیونکہ اس کا دل اسباب میں غور و فکر کر کے اللہ تعالےٰ سے راضی رہتا ہے ۔ اگر اس کی مراد کے پورا ہونے میں کچھ نقصان بھی ہُوا تو اُس کو یہ فکر ہوتی ہے کہ کس طرح کام کرے جس سے امید بر آئے (نقصان کو اپنی تدبیر کے ناقص ہونے کی طرف منسوب کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتا) اس صورت میں اس کے لیے بھلائی کی امید کی جا سکتی ہے کیونکہ اُس نے اپنے مولیٰ کے خوف سے اپنے نفس کی تجویز پر مقدم کیا ہے (جبکہ شریعت کی پابندی کے ساتھ اسبابِ معاش میں کام کر رہا ہے خلافِ شریعت سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے)

اور اگر یہ ذریعۂ معاش اس نیت سے اختیار کیا ہو کہ اس سے طاعت میں مدد ملے تو اس صورت میں خیر زیادہ ہو جائے گی اور اپنے صدقِ یقین کی بنا پر اس کے دل میں تواضع و انکسار پیدا ہوگا اور (سمجھے گا کہ میں تو دُنیا دار ہوں) یقین والے مجھ سے آگے بڑھ گئے ہیں تو اُس کا ثواب بڑھتا رہے گا (کم نہ ہوگا) اور خبردار دل میں یہ خیال نہ آنے پائے کہ میں اُن لوگوں سے افضل ہوں جو اپنے مولیٰ کے ساتھ معاملہ رکھتے اور اُس کے وعدہ کو جو رزق کی ضمانت میں کیا ہے سچا سمجھتے اور اُس کی عبادت میں جس کا حکم دیا گیا ہے اسبابِ معاش کو چھوڑ کر مشغول ہو گئے ہیں (کہ یہ تو اپاہج ہیں تدبیر کو چھوڑ کر تقدیر پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ دُوسروں کے محتاج ہیں ہم دُوسروں کے محتاج نہیں بلکہ اپنا بھی خرچ اُٹھاتے ہیں اور دُوسروں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اگر ایسا خیال دل میں لایا گیا تو) یہ بدترین حالت ہو گی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی (اپنے منہ سے) اپنی تعریف نہ کرو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ متقی کون ہے ؟ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کے مناسبِ حال صورت پر نظر کرنا چاہیئے (سب کو ایک لاٹھی نہ ہانکنا چاہیئے) اسی کو فقہ حال کہتے ہیں اسی سے نفع زیادہ ہوتا ہے اور چونکہ اکثر لوگوں پر ضعف ہی غالب ہے تو حکم وہی دیا گیا جو اکثر کے مناسبِ حال ہے ۔

قولہ وملکلام علیہ من وجوہ منھا ان معنی ھذہ الخیریۃ الیٰ قولہ جاء الحکم علی الغلب من حکم الناس ۔

ف ۔ والبتہ حضورؐ نے خود اپنے لیے اعلیٰ حال کو اختیار فرمایا کہ ترکِ اسباب کے ساتھ توکل کیا ۔ یہاں سے ان لوگوں کا جواب ہو گیا جو صوفیاء تارکینِ اسباب پر اعتراض کرتے اور کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے اسلام میں رہبانیت داخل کر دی ۔ حالانکہ اسلام میں رہبانیت نہیں ۔ میں کہتا ہوں اگر ترکِ اسباب معاش کا نام رہبانیت ہے تو وہ بتلائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سا ذریعۂ معاش اختیار فرمایا تھا ؟ اگر آپ کا ذریعۂ معاش کچھ نہ تھا بجز اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے تو گویا سب سے پہلے

آپ ہی نے اسلام میں رہبانیت کو داخل فرمایا ہے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ رہبانیت نہیں بلکہ نکاح نہ کرنے اور اہل و عیال نہ رکھنے کا نام رہبانیت ہے تو صوفیاء نے یہ طریقہ کب اختیار کیا ہے؟ جس قدر صوفیاء تارکین اسباب ہوئے ہیں سب بیوی بچوں والے تھے۔

رہا یہ اعتراض کہ صوفیاء متوکلین دوسروں کے سہارے پر رہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے صوفیاء کو نہیں دیکھا۔ مکاروں کو دیکھا ہوگا جو تصوف کا جھوٹا دعوے کرنے والے ہیں تو ایسے مکار ہر جماعت کے اندر موجود ہیں۔ علماء میں بھی اور علماء و طلباء اور فارغین اور اساتذہ میں بھی۔ امراء و رؤسا اور وزراء میں بھی۔ سلاطین وخلفاء میں بھی۔ اگر ان مکاروں کی وجہ سے کسی جماعت کو بدنام کیا جاسکتا ہے تو کوئی جماعت بھی اچھی نہیں کہی جاسکتی۔ اور اس کا عین حماقت ہونا ظاہر ہے۔ جس نے سچے صوفیاء کو دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ حضرات دوسروں کے سہارے پر نہیں ہوتے بلکہ سلاطین وامراء سے زیادہ مستغنی ہوتے ہیں بڑے بڑے ہدایا کو جو شریعت اور طریقت کی کسوٹی پر پورے نہ اتریں ٹھکرا دیتے اور واپس کر دیتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپیوں کا واپس کر دینا کچھ آسان کام نہیں جو علماء یا روشن خیال لوگ صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں اگر ان کے سامنے بڑی بڑی رقمیں پیش کی جائیں تو کسی نہ کسی تاویل سے فوراً قبول کر لیں گو وہ ہدیہ شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ۱۲ مترجم۔

ف۔ کرامت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں صاحب کرامت کے قصد و ارادہ اور تصرف کو اصلا دخل نہ ہو یہ ربانی ہے ایک وہ جس میں اس کے ارادہ و تصرف کو دخل ہو وہ روحانی ہے۔ مگر تصرف بدون اذن الٰہی کے نہ کرنا چاہیئے کہ خلاف توحید اور خلاف کمال معرفت ہے اور جس کو آج کل دست غیب کہا جاتا ہے، وہ کرامت میں داخل نہیں نہ وہ ربانی ہے نہ روحانی بلکہ شیطانی ہے کیونکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی عمل یا نقش کے ذریعہ سے جنات کو تابع کیا جاتا اور ان سے روپیہ منگایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جنات خوشی سے تابع نہیں ہوتے بلکہ جبر و قہر سے تابع ہوتے

ہیں اور بغیر حق تعالےٰ کے حکم کے کسی پر جبر و قہر کرنا جائز نہیں۔ پس عاملوں کا اپنے
اس عمل تسخیر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر پر قیاس کرنا غلط ہے کہ وہاں جنات
کو اللہ تعالےٰ نے اُن کے تابع کیا تھا تم کو کس نے اجازت دی کہ اس طرح اُن کو
تابع بناؤ۔ اللّٰھم الا ان یکون الجن کافراً من الحاربین فیجوز تسخیرہ
کما یجوز تسخیر الکافر الحربی من الانس لہ ادعاء من یجانا ولکنہ مقتضیٰ
القواعد ولا یجوز اخذ الخراج منہ الا بعد التیقن بانہ لا یاخذہ من اموال
المسلمین و لا من اموال اھل الذمۃ فافھم ۱۲ مترجم۔

بقیہ اعتراضات کا جواب جو اس مقام پر وارد ہوتے ہیں

اُوپر کہا گیا ہے کہ صنعت و حرفت کے بہتر ہونے کی یہی وجہ ہے کہ یہ شخص
بواسطہ صنعت کے غیب سے روزی لیتا ہے۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا
واقعہ وارد ہوگا کہ اُنہوں نے آسمان سے مائدہ (خوان) نازل کرنے کی دُعا کی
تھی اور یہ بلا واسطہ غیب سے روزی تھی (اگر یہ صُورت افضل نہ ہوتی تو حضرت
عیسیٰ علیہ السلام اُس کے لیے کیوں دُعا کرتے۔ جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے
یہ دُعا از خود نہیں کی بلکہ اپنی قوم کی درخواست پر کی تھی جو اُنہوں نے بطور معجزہ تصدیق
رسول کے واسطے کی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ صُورت افضل تھی) نیز یہ واقعہ
بھی وارد ہوتا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گھر سے نکلے حضرت
علیؓ بھی آپ کے پاس پہنچے۔ پوچھا تم کو اس وقت گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت پیش آئی
کہا بھُوک کی وجہ سے نکلا ہوں، حسنؓ اور حسینؓ بھی بھُوک کی وجہ سے رو رہے ہیں رضی
اللہ تعالےٰ عنہم۔ فرمایا جس چیز نے تم کو گھر سے نکالا اُس نے مجھے نکالا ہے (میں بھی
بھوکا ہوں) پھر آپ کے پاس چند صحابہ اور بھی آئے وہ بھی بھوک کی شکایت کر رہے
تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ دیکھو اُس کھجور کے درخت
کے پاس جاؤ (اور یہ زمانہ کھجور کے کا نہ تھا، موسم ختم ہو چکا تھا) اور اُس سے کہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تازہ کھجور ہم کو دو۔ اُسی وقت کھجور پر تازہ پھل لگ گیا اور حضرت علیؓ (بہت مقدار) کھجور (کی) لائے جو سب حضرات نے کھائی اور ہر شخص اپنے گھر والوں کے واسطے بھی بقدر کفایت بلکہ کچھ زیادہ لے گیا۔ (جواب یہ ہے کہ یہ بھی بطور معجزہ کے ہُوا جو کبھی کبھی ہوتا تھا ہمیشہ نہ ہوتا تھا دوسرا جواب حضرت موسےٰ علیہ السلام وحضرت خضر علیہ السلام کے قصّہ سے ظاہر ہوگا کہ یہ دونوں حضرات جب باہم ملے اور ساتھ ساتھ چلے جیسا اللہ تعالےٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے تو (بعض روایات میں ہے کہ) دونوں کو بھوک لگی تو اُن کے پاس (غیب سے) بکری کا بچہ آیا جس کا آدھا حصّہ تو بُھنا ہُوا تھا اور آدھا حصّہ کچا گوشت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھُنا ہُوا گوشت کھانا چاہا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا یہ آپ کے طریق کے مناسب نہیں کیونکہ آپ اسباب سے کام لیتے ہیں اور میرا طریقہ تفویض ہے (میں تارک اسباب ہوں) تو آپ جائیے لکڑیاں جمع کیجئے آگ جلایئے اور کچے گوشت کو بھُون کر کھایئے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور خضر علیہ السلام نے بُھنا ہوا کھایا (یہ روایت نظر سے نہیں گزری اور غالباً ضعیف ہے۔ قرآن میں جو قصّہ مذکور ہے وہ تو یہ ہے کہ دونوں حضرات ایک بستی میں پہنچے اور بستی والوں سے ضیافت کا کھانا طلب کیا اُنھوں نے مہمانداری سے انکار کیا وہاں ایک دیوار جھکی ہوئی بوسیدہ کھڑی تھی جو گرنے کے قریب تھی خضر علیہ السلام نے اُس پر ہاتھ پھیر دیا تو سیدھی ہوگئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم چاہتے اس پر مزدوری لے سکتے تھے۔ ایسے بے ہودہ لوگوں کی دیوار کو مُفت سیدھا کرنا کیا ضرور تھا اور اگر یہ روایت تسلیم کر لی جائے تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ترک اسباب افضل نہیں بلکہ اسباب کا اختیار کرنا افضل ہے کیونکہ اوّل طریقہ خضر ہے اور دوم طریقہ موسیٰ علیہ السلام اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے افضل و اعلیٰ ہیں تو ان کا طریقہ بھی افضل ہوگا واللہ تعالیٰ اعلم)۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہاں کسی صُورت کی افضلیت عام نہیں۔ فضیلت تو اُسی میں ہے جو شریعت نے مشروع کیا ہے۔ کیونکہ یہ حالت رفیعہ (یعنی بلاواسطہ غیبی فتوحات) جس کو حاصل ہوتی ہے بعض دفعہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اُس کی شرطیں پُوری کردی ہیں

حالانکہ اُس نے سب شرطیں پُوری نہیں کیں۔ اب اگر کسی وقت اُس کو کوئی ناگوار صُورت
پیش آتی ہے اللہ تعالےٰ پر (الزام اور تہمت رکھتا ہے (گو عمدًا نہ ہو بطور وسوسہ کے
ہی ہو) اور یہ بڑی خطرناک حالت ہے یا مراد پُوری ہو گئی تو دھوکہ میں پڑ جاتا ہے (اپنے
کو ولی اور قطب وغوث سمجھنے لگتا ہے) اور یہ بھی بڑا خطرناک حال ہے پس ایسے لوگوں
کے لیے صنعت وحرفت ہی افضل ہے کہ اس طریق میں سلامتی افضل ہے۔ جیسا نماز کے
بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ انسان کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے سوائے
فرض نماز کے (کہ وہ مسجد میں افضل ہے) کیونکہ گھر کی نماز میں ریا وغیرہ کی آمیزش سے
سلامتی زیادہ ہے اور سلامتی کا طریق ہی افضل ہے اگرچہ دُوسرے طریق کا فائدہ بڑا
ہے۔ مگر اُس فائدہ کے ساتھ خطرات بھی لگے ہوئے ہیں جن سے بہت کم لوگ بچ
کر نکلتے ہیں۔ اسی لیے بعض بزرگوں کا ارشاد ہے کہ کہیں سلامتی کے برابر کسی حالت کو
نہیں سمجھتا۔ مقاماتِ عالیہ کے لیے دُوسرے حضرات ہیں جو اُن ہی کے لیے پیدا کئے
گئے اور اُن ہی کے موافق عمل کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اولیاء کاملین کے لیے جن کا ایمان
اور توکل قوی ہو ترک اسباب افضل ہے اور ناقصین کے لیے اسباب کا اختیار کرنا
افضل ہے اور بعض دفعہ اولیاء کاملین بھی خطرات سے سلامتی کے لیے اسباب کو
اختیار کرتے ہیں۔ جیسا اکثر صحابہ کے حالات سے ظاہر ہے اور چونکہ انبیاء علیہم السلام
خطرات سے محفوظ ہیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض انبیاء تارک
اسباب تھے (۱۲ مترجم)۔

اُوپر کہا گیا ہے کہ صنعت وحرفت میں کوئی حق اللہ متعین نہیں اس لیے وہ دُوسرے
اسباب معاش سے جن میں حق اللہ واجب ہے افضل ہے۔ کیونکہ احتمال ہے کہ حق اللہ
کے ادا کرنے میں کچھ کمی رہ گئی ہو۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ بعض
دفعہ دُوسرے اسباب معاش میں بھی کوتاہی کا احتمال نہیں رہتا۔ جیسا ایک تاجر کی
حکایت ہے کہ وہ سمندر میں (مالِ تجارت لے کر) جا رہا تھا کہ جہاز ٹوٹ گیا یہ بھی
دُوسرے مسافروں کے ساتھ پانی سے باہر آیا تو ایک شخص نے کہا آؤ اس آبادی میں

چلیں جو یہاں سے قریب (نظر آرہی) ہے کہا نہیں تو (کنارہ) سے نہ ہٹوں گا جب تک میرا مال باہر نہ آئے۔ ساتھی نے اس کو بے وقوف بنایا (کہ بھلا سمندر کے اندر سے بھی کہیں مال خود بخود باہر آیا ہے) پھر وہ اس کے ساتھ کچھ دیر تک کنارے پر بیٹھا رہا کہ دفعتہً سمندر کی موجوں نے ایک گٹھڑی باہر پھینکی دیکھا تو اس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا اسی طرح ایک ایک کر کے اس کا تمام سامان باہر آگیا سمندر میں کچھ بھی نہ رہا تو ساتھی نے پوچھا۔ اللہ تعالےٰ کے ساتھ تیرا کیا معاملہ ہے جو تمام مسافروں میں سے تجھے ہی اس کرامت کے ساتھ خاص کیا۔ کہا اللہ تعالےٰ نے مجھے جو بھی حکم دیا میں اس کو بجا لایا پھر مجھ سے وہ چیز کیونکر لے سکتا ہے جو مجھے عطا فرما چکا ہے حالانکہ اس نے مجھے اپنے احکام بجالانے کی توفیق عطا فرمائی ہے ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ جواب یہ ہے کہ (دیگر اسبابِ معاش میں) ایسی صورت شاذ و نادر ہے اور حکم غالبِ حال پر مبنی ہوتا ہے (غالب حال یہی ہے کہ صنعت و حرفت میں کوتاہی کا احتمال نہیں اور دوسرے اسبابِ معاش میں کوتاہی کا احتمال رہتا ہے)۔ جیسا بعض اہلِ صنعت بھی اپنے پیشہ میں خیانت کرتے ہیں جس سے وہ بدترین پیشہ ہو جاتا ہے مگر صنعت و حرفت میں ایسا شاذ و نادر ہے اور اگر کوئی کھوٹ ملاتا بھی ہے تو چھپا نہیں رہتا جیسا دوسرے ذرائع معاش میں چھپا رہتا ہے کیونکہ اموال میں زکوٰۃ واجب ہے اور اس کے سوا دوسرے حقوق بھی ہیں جیسے بیع میں خیر خواہی واجب ہے، دھوکہ بازی اور خیانت سے احتراز لازم ہے اور بہت سی باتیں ہیں جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں جن کو بہت سے تجار جانتے بھی نہیں اُن پر عمل تو کیا کریں گے۔ اسی لیے صنعت و حرفت اُن سے بہتر ہے کہ اس میں ایک ہی احتمال ہے کہ صنعت میں کاری گری کا حق پورا نہ کرے اگر ایسا کرے گا تو اُس کا عیب ظاہر ہو جائے گا جو پسند نہ کرے گا رد کر دے گا۔

اسی لیے ایک عالم باعمل زیتون کے تیل کا کاروبار کرتے تھے پھر یا تو میں نے

پُوچھا یا خود ہی فرمایا کہ میں نے یہ کاروبار اس لیے اختیار کیا کہ اس میں نفس کو دھوکہ دینے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر ایک مٹکے میں عمدہ تیل ہو اور اس میں تھوڑا سا خراب تیل علیٰحدہ جائے تو سارا مٹکا خراب ہو جاتا ہے۔ بخلاف اور چیزوں کے کہ اُن میں دھوکہ چل جاتا ہے جب مَیں نے دیکھا کہ زیتون کے تیل میں دھوکہ نہیں چل سکتا اور اس سے مال میں نقصان ہو جاتا ہے تو میں نے اسی کا کاروبار اختیار کیا۔ کیونکہ اہل توفیق نفس کے غوائل اور شرارت) سے بے فکر نہیں رہتے اگرچہ اُن کے نفوس با برکت (اور پاکیزہ) ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالےٰ نے (یوسف علیہ السلام کی طرف سے) ارشاد فرمایا ہے وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا مارحم ربی اور مَیں اپنے نفس کو بری نہیں کہتا کیونکہ نفس تو (اپنی فطرت سے) برائی کا حکم دینے والا ہے۔ ہاں جس پر میرا پروردگار رحمت نازل فرمائے (وہ اس کی شرارت سے بچارہتا ہے)۔

اوپر کہا گیا ہے کہ صنعت و حرفت کی روزی میں دیگر ذرائع معاش سے زیادہ برکت ہے تو اگر یہ بات قیاسی نہیں محض نقلی ہے جس کی علت معلوم نہیں تو بحث کی ضرورت نہیں اور اگر علت یہ ہے کہ اس میں حکمت الٰہی کا اظہار ہے تو یہاں وہی گفتگو ہے جو اُوپر گزر چکی اور اعتراض کا جواب بھی وہی ہے جو اُوپر دیا گیا۔

پہلے کہا گیا ہے کہ اسباب معاش کا اختیار کرنا سنت (انبیاء) ہے اس کے اختیار کرنے میں سنت کا اتباع ہے کیونکہ شریعت نے اسباب معاش اختیار کرنے ہی کو بتلایا ہے تاکہ کسی کو یہ گمان پیدا نہ ہو کہ کسب معاش کے ساتھ عبادت نہیں ہو سکتی۔ شریعت نے اسی قسم کے خیالات کو باطل کرنے کے لیے صنعت و حرفت (اور دیگر اسباب معاش) کی ترغیب دی ہے اور بتلا دیا ہے کہ عابد بننا ترک اسباب پر موقوف نہیں۔ اگر عابد بننے کے لیے ترک اسباب ضروری ہوتا تو کوئی نبی بھی سبب معاش اختیار نہ کرتا اور بالاتفاق انبیاء علیہم السلام سب سے بڑھ کر عابد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی علت کو دُور کرنے کے لیے داؤد علیہ السلام کی مثال بیان فرمائی (کہ بالاتفاق وہ بہت بڑے عابد تھے اور اُن کے عابد ہونے

پر تمام اہل کتاب کا اتفاق ہے اس پر وہ اسبابِ معاش میں بھی مشغول تھے بادشاہت کے فرائض بھی ادا کرتے تھے)۔

یہاں سے ایک علمی مسئلہ یہ معلوم ہُوا کہ عالم جب احکام بیان کرے تو اپنے قول کو واضح دلائل شرعیہ سے مؤید کردے اگرچہ اس کے علم و معرفت میں کسی کو شک بھی نہ ہو کیونکہ اس سے نفوس (سامعین) پر بات زیادہ واضح ہو جاتی اور احکام کو پختگی حاصل ہوتی ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صنعت و حرفت کی فضیلت بیان کر کے داؤد علیہ السلام کی حالت کو بطور حجت کے پیش فرمایا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ پہلی شریعتوں کے جو احکام منسوخ نہیں ہوئے وہ ہماری شریعت میں داخل ہیں (جبکہ رسول اللہ نے ان کو بلا انکار کے بیان فرمایا ہو محض توراتؔ و انجیل میں مذکور ہونا کافی نہیں کہ اُن میں تحریف ہُوچکی ہے۔ قرآن و حدیث میں کسی بات کے مذکور ہونے سے اطمینان ہو جائے گا کہ اس حکم میں تحریف نہیں ہوئی)۔

یہ حدیث ان لوگوں پر حجت ہے جو اسبابِ معاش میں مشغول ہیں حجت ہے کہ وہ اس شغل کی وجہ سے عبادت چھوڑنے کا بہانہ نہ کریں۔ جیسا بہت لوگوں کو یہ کہتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ شغلِ معاش عبادت سے مانع ہے اور قرآن کی یہ آیت ولقد ارسلنا رسلا من قبلک وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ (ہم نے آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے ہیں سب کے بیویاں بھی تھیں اور بچے، عیالدار وں پر حجت ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اہل و عیال اور اُن کے لیے کسبِ معاش عبادت سے اور کسب میں تقوی کی رعایت سے مانع ہے۔

بعض لوگوں کو جب نصیحت کی جاتی اور عبادت کی ترغیب دی جاتی ہے صاف کہہ دیتے ہیں کہ اگر تمہارے بھی بال بچے ہوتے تو ہم سے اس قسم کی باتیں نہ کرتے اور نہ تم ویسے ہوتے جیسے اب ہو (بلکہ ہم جیسے ہی ہوتے) ان لوگوں کی حجتیں اس آیت سے ختم ہوگئیں کیونکہ (انبیاء علیہم السلام جو) سب سے افضل اور سب سے بڑھ کر عابد تھے عیالدار بھی تھے تو اب کسی کو بہانہ کرنے کا کیا موقع ہے؟ (اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو

نمونہ بنا کر ہی تو بھیجا ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ تو اب یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ صاحب رسولوں کی کیا بات ہے اُن کی ریس کون کر سکتا ہے ؟ اگر رسول اللہ کی ریس نہ کی جائے گی تو پھر کس کی ریس کی جائے گی ؟ کیا خدا تعالیٰ نے اُن کو فضول ہی بھیجا ہے ؟ ہرگز نہیں اُن کو اسی لیے بھیجا ہے تاکہ مخلوق کے سامنے ایک نمونہ ہو جس کے موافق اپنے کو بنانے کی کوشش کریں وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ) اس تقریر کے بعد (نصوص و احادیث میں) کوئی بھی تعارض باقی نہیں رہا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ حکم سب کے لیے عام نہیں بلکہ ہر شخص کی حالت کے مناسب جُدا حکم ہے نکاح ہی کو لے لو کہ نہ ہر شخص کے لیے ترکِ نکاح سُنت ہے نہ ہر ایک کے لیے نکاح کرنا سنت ہے۔ جب تک قدرت نہ ہو اور اس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں مدد اور جمعیت قلب حاصل نہ ہو (اگر کسی کو بیوی کے نان و نفقہ اور مہر پر قدرت نہ ہو اور نکاح سے عبادت میں جمعیت قلب حاصل ہونے کی امید نہ ہو بلکہ پریشانی کا خطرہ ہو اُس کے لیے نکاح سُنت نہیں بلکہ کثرت سے روزہ رکھنا سنت ہے تاکہ شہوت قابو میں رہے)۔

چنانچہ ایک صحابی سے روایت ہے وہ فرماتے تھے مجھے یہ پسند نہیں کہ مسجد کے دروازے پر میری دکان ہو جس میں تجارت کرنے سے جماعت کی نماز بھی فوت نہ ہو اور ہر دن مجھے ایک دینار کا نفع ہو جسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کر دیا کروں میں اس حالت کو فقر سے بہتر نہیں سمجھتا۔ یہی فقہ حال ہے (کہ ہر شخص کو اُس کے حال کے مناسب کلام بتلایا جائے) تو ممکن ہے ان صحابی کو لوگوں سے اختلاط کرنے میں جمعیت قلب حاصل نہ ہوتی ہو یہ خاص دولت اختلاط میں فوت ہو جاتی ہو اگرچہ (دکان کرنے اور صدقہ کرنے سے) نفع متعدی حاصل ہو جاتے کیونکہ نفع خاص مقدم ہے جیسے جان بچانا پہلے اپنی لازم ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا (اور جس نے ایک جان کو بچایا گویا اُس نے تمام آدمیوں کو زندہ کر دیا) تم کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ دُوسروں کے بچانے

اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا قصد کرو۔ جہاد کے سوا کسی وقت اس کی اجازت نہیں اگر ایسا کر دیئے گنہگار ہو گے (البتہ جہاد میں یہ جائز ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بچانے کے لیے تم دشمن کے مقابلے میں آگے بڑھ جاؤ یا ڈوبنے والے کو بچانے کے لیے خود پانی نہ پیو پیاسے رہو اور ان کی جان بچاؤ جیسا بعض صحابہؓ سے منقول ہے) یہی حکم نفقہ کا ہے کہ پہلے تم اپنے نفقہ کے مکلف ہو پھر بیٹے کے پھر زوجہ کے۔ اگر تمہارے پاس ایک روٹی ہو تو تم پر کسی کا نفقہ واجب نہیں۔ اگر دو روٹیاں ہوں تو اہل وعیال میں سے ایک کا نفقہ لازم ہوگا جن میں مقدم وہ ہے جس کا نفقہ نص سے ثابت ہے کہ تمہارے اختیار سے ساقط نہیں ہو سکتا یعنی اولاد پھر زوجہ کا لازم ہوگا پھر جس قدر عیال زیادہ ہوں اسی ترتیب پر اہم کو مقدم کیا جائے گا (غرض انسان کو سب سے پہلے اپنی خاص حالت کا لحاظ ضروری ہے۔ اپنی تکمیل واصلاح کے بعد دوسروں کی فکر جائز ہے نفع لازم نفع متعدی سے مقدم ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بزرگ نے وصیت کی تھی کہ دوسروں کی اشرفیوں کی حفاظت میں اپنی گٹھڑی کو ضائع نہ کر دینا ان کا یہی مطلب تھا کہ اپنی تکمیل کی فکر دوسروں سے پہلے کرنا چاہیئے۔) پس اگر کوئی شخص صنعت (و حرفت) اور اسباب معاش میں مشغول (ہو کر جمعیت قلب حاصل نہ کر سکتا ہو اور یہ خاص حال سب کو اس طرح میسر) نہ ہو سکتا ہو تو اس کے حق میں اس قسم کی کوشش مناسب نہ ہوگی۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ قدرت کے ساتھ ترک اسباب کا طریقہ اختیار نہ کرے بلکہ عبادت کے ساتھ شغل معاش کو بھی جمع کرے لیکن وہ راستہ اختیار کرے جو شریعت کے موافق قرب الٰہی حاصل کرنے میں اس کے لیے زیادہ بہتر ہو۔ اگر قدرت ہی نہ ہو تو اس وقت اس کے حق میں شغل معاش کا اختیار کرنا ممنوع ہوگا۔ میں نے دیکھا ہے کہ شیخ جلیل ابوالربیع بن عجلان کی خدمت میں ایک عابد حاضر ہوا جس کے اہل وعیال بہت تھے جن کے لیے وہ کچھ شغل معاش بھی کرتا تھا جو اس کے خرچ کو کافی نہ ہوتا اور یہ خود بھی کمزور تھا کہ شغل معاش اور عبادت دونوں کو جمع کرنے سے عاجز تھا) عیال کثیر تھی جن کی وجہ سے تشویش

بھی زیادہ تھی تو شیخ ابوالعباسؒ نے جو علم اور حال دونوں طریق کے جامع تھے اُس سے فرمایا کہ تم کو شغلِ معاش کا اختیار کرنا حرام ہے۔ بس تم علم ہی میں مشغول رہو تم اور تمہارے اہل وعیال اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہیں۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ پھر تو اُس کی یہ حالت ہوئی کہ مہینہ میں دو اردب گیہوں کا آٹا اس کے گھر میں خرچ ہوتا تھا اور اس وقت ایک قفیز گیہوں کی قیمت دس دینار یا اس سے بھی زیادہ تھی اس کے علاوہ کپڑے وغیرہ کا اور اہل وعیال کا اور بھی خرچ تھا سب غیب سے پورا ہوتا اور وہ کسی سے کچھ نہ مانگتا، علم اور عبادت ہی میں مشغول رہتا تھا۔ یہ نفقہ حال ہے جس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ان بزرگ جیسا ہو کہ کس کے لیے کون سا طریق مناسب ہے چنانچہ ایک درویش نے علماء وقت کے سامنے ایک فتویٰ پیش کیا (جس کا مضمون یہ تھا) کیا فرماتے ہیں حضرات علماء دین اس درویش کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے اُس پر شغلِ معاش کا اختیار کرنا واجب ہے یا نہیں؟ افتونا یرحمکم اللہ۔ تمام علماء نے اس کے جواب سے پہلوتہی کی صرف ایک فقیہہ نے جواب دیا جس کو اللہ تعالیٰ نے نورِ بصیرت عطا فرمایا تھا۔ اُس بابرکت بزرگ نے لکھا کہ اگر یہ شخص ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے جس میں کسی وقت فتور نہیں آتا تو اُس پر شغلِ معاش کا اختیار کرنا حرام ہے اور اگر کسی وقت اس میں فتور بھی ہوتا ہو تو کسبِ معاش واجب ہے۔

اس جواب کی خوبی میں غور کرو کیسا عجیب جواب ہے اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہو رہی ہے ان اللہ تکفل برزق طالب العلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سمجھو اس میں ایک راز ہے جس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کا فتویٰ ان بزرگ جیسا ہو جن کا اُوپر ذکر ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ساری مخلوق کے رزق کا ذمہ لیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔ زمین میں جتنے بھی جاندار ہیں سب کی روزی اللہ کے ذمے ہے۔ نیز ارشاد لا نسألک رزقا نحن نرزقک والعاقبۃ للتقویٰ

رلے مخاطب! ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے - ہم خود تجھ کو روزی دیتے ہیں اور اچھا
انجام تقویٰ کا ہے) اور جب ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالےٰ سے عرض کیا رب
اجعل ھذا البلد آمنا وارزق اھلہ (اے پروردگار! اس شہر کو پُرامن بنا دے
اور اُس کے باشندوں میں جو اللہ تعالےٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھے اُس کو
ہر قسم کے پھل اور میوے مرحمت فرما - تو حق تعالےٰ نے جواب میں فرمایا ومن کفر
فامتعہ قلیلا - کہ میں تو کافروں کو بھی دُنیا کی قلیل مُدت تک راحت و آرام دوں گا
پھر ان کو زبردستی جہنم کے عذاب میں داخل کروں گا - جب اللہ تعالےٰ نے تمام جانداروں
کی روزی کا ذمہ لیا ہے تو وہ کون سی صورت ہے جس کی طالب علم (دین) کے لیے
اللہ تعالےٰ نے اس سے زیادہ کفالت فرمائی ہے؟ اگرچہ ہم اشارۃً اُس کو
بتلا چکے ہیں کہ لیکن حالت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس کو دوبارہ تفصیل سے بیان کر دیا جائے
تو سنو! کہ جس رزق کو اللہ تعالےٰ نے اپنے ذمہ لیا اور بندوں کے لیے مقدر فرمایا
ہے اُس کی دو قسمیں ہیں -

ایک وہ جو سبب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جس کو بندہ سبب ہی سے حاصل
کر سکتا ہے اور ایک وہ جو بلا سبب کے حاصل ہوتا ہے جیسے کسی نے کوئی چیز ہبہ
کر دی (یا ہدیہ کر دی) یا میراث میں مال (جائداد مکان وغیرہ) مل گیا - پھر ہبہ کی بھی
مختلف قسمیں ہیں (کبھی کوئی تعلق قرابت کی وجہ سے کچھ دیتا ہے کبھی دوستی یا محبت و
عقیدت سے ہدیہ دیتا ہے) اور ہم نہیں جانتے کہ کس کو سبب سے رزق حاصل ہوگا
اور کس کو بلا سبب - تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اس کو
بتلا دیا اذا ابتدع فی الدین بدعة کید الدین فعلیکم بمعالم الدین واطلبوا
من اللہ الرزق قالوا وما معالم الدین قال مجالس الحلال والحرام -
جب دین میں بدعت داخل ہو جائے دین پر آفت آجائے گی تو (اُس وقت)
دین کے) نشانات کو پکڑے رہیو اور روزی اللہ تعالےٰ سے طلب کرو - صحابہ نے
عرض کیا دین کے نشانات کیا ہیں؟ فرمایا حلال و حرام کی مجلسیں (جہاں احکامِ شرعیہ)

کا تذکرہ ہوتا ہو (حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رزق کے لیے کسبِ معاش میں مشغول ہونا تم کو طلب علم سے نہ روکے ورنہ دین بدعات و جہل کی وجہ سے مٹ جائے گا۔ اس وقت علم (دین) میں مشغول رہو (پڑھتے پڑھاتے رہو) اور اللہ تم کو رزق دے گا۔ جب وہ عالم جس نے اللہ کا علم حاصل کیا ہے (یعنی علم دین) آخرت کے اسباب میں مشغول ہے کہ اسبابِ آخرت میں سب سے بڑا وسیلہ علم ہے جبکہ وہ اللہ کے لیے (اور اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات و احکام سے متعلق) ہو اور قاعدہ کے موافق ہو (بے قاعدہ نہ ہو) تو اللہ تعالےٰ اسکے۔ لیے بلا واسطہ اسباب کے رزق کو آسان کر دیتے ہیں اور اس کو مخلوق میں سے کسی کا بھی محتاج نہیں بناتے (بلکہ مخلوق اُس کی محتاج ہوتی ہے) اس سے صاحبِ علم کا رزق بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اگر وہ آخرت کا طالب ہو اور قاعدہ کے موافق شغل علم میں لگا ہوا ہو کیونکہ یہ شخص اپنے تمام اوقات اور پوری عمر کو علم میں مشغول کر دیتا ہے تو اللہ تعالےٰ اُس کو طلب رزق اور اسبابِ معاش کی فکر سے مستغنی کر دیتے ہیں اور اس قسم کی احادیث پر قلت اعتماد کی وجہ سے ہی بعض علماء اور طلباء پریشانی میں مبتلا ہیں اُن کی عمریں خسارہ میں ہیں نہ وہ دنیا کے رہے نہ آخرت کے ہوئے۔ ہم اللہ جل جلالہٗ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو اپنی سمجھ عطا فرمائے اور اُس پر عمل کی سعادت و توفیق دے۔ اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔

قوله واما الاعتراض على الوجه الثالث الذى الخيرية فيه لكونه يانا من الغيب بواسطة الصنعة الى قوله لا دب سواه۔

ف ۔ کاش ہمارے زمانہ کے علماء و طلباء ان احادیث پر وثوق و اعتماد کر کے اہلِ دنیا سے مستغنی اور اللہ پر متوکل ہو جائیں تو اُن کی تمام پریشانیاں دُور ہو جائیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سے مدارس ہندوستان کی حالت ناگفتہ بہ ہے آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے۔ حضرات علما۔ مدارس کو ان احادیث

پر اعتماد کرنا، اور اپنے دلوں میں خلوص پیدا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ خالصاً للہ لوجہ اللہ خدمت دینی میں مشغول رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ غیب سے اُن کی امداد فرمائیں گے۔

ادھر مسلمانانِ ہندوستان اور پاکستان کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کی بقاء کا دارومدار مدارس اسلامیہ عربیہ کی بقاء پر ہے۔ اگر یہ مدارس مٹ گئے تو اسلام کے مٹ جانے کا خطرہ ہے۔ خدا نخواستہ سب مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ ان مدارس کی خدمت پر توجہ کرنا چاہیئے ورنہ آخرت میں باز پرس کا اندیشہ ہے۔ حکومتِ پاکستان کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اکثر مدارس ہندوستان کی امداد اسلامی ریاستوں کے وظائف سے ہوتی تھی جواب غالباً بند ہو گئی ہیں تو ان وظائف کو حکومت پاکستان جاری کر دے اور مدارس کو مٹنے نہ دے تاکہ اسلام ہندوستان میں فنا نہ ہو۔ فافہم واللہ یتولی ھداک۔

(۲۴۳) کسبِ معاش اور عبادت دونوں کے لیے علمِ دین کا حاصل کرنا ضروری ہے

اس حدیث کا فائدہ یہ بھی ہے کہ کسبِ معاش اور عبادت دونوں کے لیے شریعت کا علم ضروری ہے بغیر اُس کے نہ کسبِ معاش درست ہے نہ عبادت۔ جس میں علم کی صلاحیت ہو وہ عالم بننے کی کوشش کرے اور جس میں اس کی صلاحیت نہ ہو وہ احکامِ شرعیہ (مطالعہ کتب اور) علماء کی صحبت میں رہ کر اُن سے دریافت کر کے معلوم کرے اور اُن کا اتباع کرے بشرطیکہ وہ علماء واقعی علماء ہوں محض دعویٰ ہی دعویٰ نہ ہو کیونکہ دعویٰ سے بہت لوگ تباہ ہو گئے اور اپنے ساتھ ایک بڑی جماعت کو بھی برباد کیا۔

جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے (کہ آخر زمانہ میں) بہت لوگ جہنم کی طرف بلانے والے ہوں گے جو اُن کی بات مانے گا اُس کو جہنم میں جھونک دیں گے۔ بعض لوگ علوم میں کمال کا دعوےٰ کرتے ہیں حالانکہ وہ علوم اُن کے

حق میں بھی اور ان کے متبعین کے حق میں بھی وبال ہی ہیں۔ کیونکہ اُن کے علوم کی بنیاد طلب دُنیا اور طلب جاہ پر ہے (یہی اُن کا اصلی مقصد ہے اور اس حالت میں بجز علم لفظی کے حقیقی علم حاصل نہیں ہوسکتا اور جس کو علم حقیقی حاصل نہ ہو وہ شریعت کے مقاصد ومطالب کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اب وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے) اور یہی اصلی خسارہ ہے اور بڑی بدنصیبی بھی۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل وکرم سے اتباع سنت بلکہ تمام سنتوں کے اتباع کی توفیق دیں اور خسارہ سے بچائیں ایک بابرکت بزرگ نے کہا ہے ؎

حب دنیا وحب اخری جیبان فی القلب لا یجتمعان

دُنیا سے بھی محبت کرتے ہو اور آخرت کی محبت بھی چاہتے ہو۔ دو محبوب ایک دل میں جمع نہیں رہ سکتے۔

ایک فارسی شاعر نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ؎

ہم خدا خواہی وہم دُنیائے دوں

ایں خیال ست ومحال ست وجنوں

قولہ وفائدۃ هذا الحدیث انہ لا یعلم کسب ولا تعبد الا بمعرفۃ السنۃ الی قولہ فی القلب لا یجتمعان۔

ف۔ آج کل علم کے مدعی بہت پیدا ہوگئے ہیں۔ اسی طرح تصوف کا دعوے کرنے والے بھی بہت ہیں اور ان مدعیوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ عوام پر لازم ہے کہ جس طرح وہ اچھے طبیب اور ڈاکٹر کو علاج کے واسطے تلاش کرتے ہیں اور ہر مدعی کا علاج نہیں کرتے اسی طرح سچے علماء اور صوفیاء کو تلاش کریں۔

سچا عالم وہ ہے جو باعمل متبع سنت ہو۔ باقاعدہ محقق علماء سے علم حاصل کیا ہو۔ دُنیا کا حریص نہ ہو۔ مولود اور وعظ کہہ کر روپیہ نہ لیتا ہو۔ روپیہ کے کر فتوے نہ دیتا ہو اور سچا صُوفی وہ ہے جس کی تعلیم اور صحبت سے اللہ تعالیٰ کی یاد دل

میں بڑھتی ہو۔ دل کو سکون و اطمینان ہوتا ہو۔ بقدرِ ضرورت علم شریعت اُسے حاصل ہو، متبعِ سُنت ہو اور کسی محقق صوفی کی خدمت میں مدت تک رہا ہو۔ صوفیاء زمانہ اُس کی ولایت کو تسلیم کرتے ہوں۔ یعنی وہ صوفیاء جن کو کسی وجہ سے اُس کے ساتھ حسد نہیں ہے اسے مانتے ہوں اور اس کی طرف زیادہ تر دین داروں کا رجوع ہو دُنیاداروں کا رجوع زیادہ نہ ہو۔

خوب سمجھ لو کہ محض کسی مدرسہ کی سند اور دستار مل جانے سے آدمی عالم نہیں بن جاتا نہ چند جاہلوں کو مُرید کرنے اور شعبدے دکھلانے سے صوفی ہو جاتا ہے۔ علم اور تصوف کی علامات وہ ہیں جو اُوپر بیان کی گئیں۔ جو اس معیار پر پُورا نہ اترے اُس سے دور رہنا چاہیئے۔

والسلام



باب ۹۴

حدیث

البیعان بالخیار مالم یتفرقا

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بائع مشتری (دونوں) کو اختیار ہے جب تک وہ متفرق نہ ہوں بس اگر دونوں نے سچائی سے معاملہ کیا اور (مبیع وثمن کی اصلی حالت کو) بیان کردیا تو اُن کی بیع (وشراء) میں برکت دی جائے گی اور اگر (اصلی حالت کو) چھپایا اور جھوٹ بولا تو بیع کی برکت مٹا دی جائے گی۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ بائع ومشتری دونوں کو افتراق سے پہلے اختیار ہے اور برکت سچائی کے ساتھ ہے۔ خیانت اور جھوٹ سے برکت جاتی رہتی ہے۔

یہاں افتراق سے کیا مراد ہے؟ بات چیت سے (فارغ ہونا اور ایجاب وقبول تمام کرنا) یا بدن سے الگ الگ ہو جانا (کہ مجلس بدل جائے تو اختیار نہ رہے گا مجلس نہ بدلنے سے پہلے دونوں میں ہر اک کو اختیار ہے کہ بیع کو باقی رکھے یا فسخ کردے) کیونکہ لفظ افتراق کتاب اللہ میں دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ افتراق بالابدان تو اس آیت میں ہے وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعتہ اگر میاں بی بی الگ ہو جائیں گے تو اللہ تعالےٰ ہر ایک کو اپنی وسعت (رزق) سے غنی کر دے گا اور افتراق بالاقوال اس آیت میں ہے ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا جو الگ الگ راستہ پر ہو گئے اور (…)

احکام آنے کے بعد اختلاف کرنے لگے (یہ افتراق جسمانی نہ تھا بلکہ عقائد و خیالات کا اختلاف تھا چنانچہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے افترقت بنو اسرائیل علیٰ اثنین و سبعین و ستفترق امتی علی ثلث و سبعین فرقۃ۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں متفرق ہو گئے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔

علماء میں اختلاف ہے کہ حدیث البیعان بالخیار مالم یتفرقا میں افتراق بالابدان مراد ہے یا بالاقوال؟ امام شافعیؒ اور اُن کے متبعین پہلے کے قائل ہیں اور امام مالکؒ اُن کے متبعین افتراق بالاقوال کے قائل ہیں (امام ابو حنیفہ بھی امام مالکؒ کے موافق ہیں اور یہی زیادہ ظاہر ہے کیونکہ عبداللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اُنھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک باغ فروخت کیا جو حضرت عثمانؓ کے گاؤں میں تھا (یا اُن کی زمین کے پاس تھا) عبداللہ بن عمر چاہتے تھے کہ بیع پختہ ہو جائے تو وہ اسی وقت (ایجاب و قبول کرتے ہی) کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ بھی اسی حدیث کے ایک راوی ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ تم نے (مجلس سے اٹھ کر) بیع کو تمام کرنا چاہا ہے یہ سنت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ (یا تو حدیث میں) افتراق بالابدان (مراد ہی نہیں یا وہ منسوخ ہو چکا ہے۔ اور یہ بیع و شراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوئی تھی پھر عبداللہ بن عمر نے حضرت عثمانؓ کے قول کی طرف رجوع کیا (اور سمجھ گئے کہ بیع ایجاب و قبول سے تمام ہو جاتی ہے مجلس سے جُدا ہونے کی ضرورت نہیں) اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے جب دو حدیثیں (ظاہر میں مختلف ہوں اور دونوں) صحیح ہوں اور ثابت ہو جائے کہ خلفاء (راشدین) نے یا اُن میں سے کسی ایک نے ایک پر عمل کیا اور دوسری کو چھوڑ دیا ہے تو یہ اُس کے منسوخ ہونے کی دلیل ہے اور جب ایک حدیث میں دو معنی کا احتمال ہو اور کسی خلیفہ (راشد) نے ایک معنی کے ساقط ہونے کی تصریح کر دی ہو تو بدرجہ اولیٰ وہی معنی مراد ہوں گے جو خلفاء نے یا کسی ایک خلیفہ نے سمجھے ہیں۔ بعض علماء زمانہ نے امام شافعیؒ کی حمایت میں حضرت عثمانؓ کی اس حدیث کا انکار کیا ہے (یعنی اُس کو

صحیح ؓمیں ملتا) حالانکہ جس نے اُس کو نقل کیا ہے، اُس کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے جس میں کچھ شبہ نہیں اور ۵ء ابو الولید بن رشد الجد ہیں جو البیان والتحصیل کے مصنف ہیں انہوں نے اس حدیث کو مقدمات میں ذکر کیا ہے جو فقہ میں ان کی مشہور کتاب ہے۔

ف۔ اگرچہ یہ مسئلہ تصوف کا نہ تھا مگر فقہ کا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے جس میں بڑا اختلاف ہے اور طرفین سے بکثرت دلائل پیش کئے جاتے ہیں اس لیے میں نے اس کا ترجمہ کر دیا کہ علماء کے کام کی بات ہے۔ مترجم

(۱۴۲) مسلمان کی دُنیا بھی بغیر آخرت کے نہیں بنتی (مسلمان کو، دُنیا بھی بغیر حدیث سے معلوم ہُوا کہ آخرت کے نہیں ملتی دیکھو بائع و مشتری کو برکت سچائی سے حاصل ہوتی ہے جو عیان آخرت میں سے ہے جس میں انسان کو ثواب ملتا ہے بلکہ یہ تو دیانت کا کامل ترصفت ہے۔ (مومن مجھی نہیں ہوتا) اسی لیے اہل تحقیق (یعنی محقق علماء وصوفیاء) نے فرمایا ہے من صدق وصدق قرب لا محالۃ (جو اپنے ہر قول و فعل میں سچائی کا پابند ہو، وہ لامحالہ قرب خداوندی حاصل کرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس کو واضح طور سے بیان فرمایا ہے لا ینال ما عند اللہ الا بطاعۃ اللہ اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی خیر و برکت) وہ بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

گناہوں کی شامت سے دُنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ گناہوں کی نحوست سے دُنیا و آخرت دونوں کی خیر جاتی رہتی ہے دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر وہ (عیب کو) چھپائیں گے اور جھوٹ بولیں گے تو بیع کی برکت مٹا دی جائے گی۔ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے اور (عیب کو) چھپانا خیانت ہے۔ وہ بھی بڑا گناہ ہے حدیث میں ہے من غشنا فلیس منا جس نے ہم سے خیانت کی وہ ہم میں سے نہیں اور جھوٹ بولنے والے کے متعلق ایک حدیث اُوپر گزر چکی ہے کہ اس کی باچھیں لوہے کے کانٹے

سے چیری جائیں گی۔ قیامت تک اس کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا رہے گا۔ تو دُنیا کا بھی خسارہ ہُوا کہ جب مال میں برکت نہ ہُوئی تو وہ ضائع ہو گیا اور آخرت کا بھی خسارہ ہُوا کہ عذاب کا مستحق ہو گیا اور اہلِ توفیق دُنیا و آخرت دونوں میں سود مند ہیں۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے پاس اس قدر مال کیونکر آیا (وہ بڑے تاجر اور بڑے مالدار تھے) فرمایا میں نے تجارت میں کبھی جھوٹ نہیں بولا نہ (مال کا عیب چھپایا نہ ادھار بیچا نفع کو زیادہ چاہا بلکہ) کتنا ہی (قلیل) ہو۔ چنانچہ ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک دفعہ کُوفہ سے بہت سے اونٹ خریدے تو لوگوں نے کہا (مال اچھا نہیں) آپ کو نفع میں صرف نکیلیں ملیں گی (جن سے اونٹ کو چلایا جاتا ہے) آپ نے اتنے ہی نفع پر اونٹوں کو بیچ دیا۔ جب خریدار اُونٹ خرید کر چلا گیا تب اس کو رسّی کی تلاش ہوئی جس کی نکیلیں بنائے۔ تو (اتفاق سے) اس کو رسّی نہ ملی۔ وہ پھر حضرت عبدالرحمن کے پاس واپس آیا اور نکیلیں رجو اُن کے پاس نفع میں رہ گئی تھیں بہت مال دے کر خریدیں (اس طرح اُن کو رسّی مال میں بھی بہت نفع مل گیا)۔ قولہ فیہ دلیل علیٰ ان لا تحصل الدنیا الا بالاٰخرۃ الیٰ قولہ بجملۃ مال ۔

ف مسلمان تاجروں کو ان اصول پر عمل کرنا چاہیئے جو عبدالرحمن بن عوف صحابی نے بیان فرمائے ہیں کہ ترقی تجارت اور برکت کی بُنیاد ان ہی پر ہے۔ آجکل اکثر تجار زیادہ نفع کے انتظار میں رہتے ہیں۔ یہ بہت بُری بات ہے جس سے مخلوق کو تکلیف ہوتی ہے اور ان کے مال میں برکت نہیں ہوتی۔ برکت اسی میں ہے کہ مال کو جلد نکالی دو اور زیادہ نفع کا انتظار نہ کرو۔ پھر دُوسرا مال جلدی خریدلو اور اس کو بھی تھوڑے سے نفع پر نکال دو پھر اور مال خریدلو۔ مال کا مُدت تک روکنا اچھا نہیں۔ ذخیرہ اندوزی کا آج کل عام مرض ہے لوگ ایک روپیہ کے مال پر دس گُنا نفع چاہتے ہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ باوجود کثرت پیداوار کے ملک میں سخت گرانی ہے اور عام طور سے سب لوگ پریشان ہیں۔ خریدار گرانی سے اور تجار ٹیکس کی بھرمار سے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے۔

(۲۴۵) تجارتِ آخرت بھی سچائی اور صاف گوئی سے کامیاب ہوتی ہے

کیا یہ حکم بیع ہی کے ساتھ خاص ہے (جس میں مال کا مبادلہ مال سے ہوتا ہے) یا ہر معاملہ کو عام ہے جس پر بیع کا اطلاق آتا ہو (گو اُس میں مال کا مبادلہ نہ ہو) ظاہر لفظوں کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہر معاملہ کے لیے اُس کو عام کہا جائے کہ سب میں عیوب سے پرہیز کیا جائے جو معاملہ کو بگاڑنے والے یا برکت کو برباد کرنے والے ہیں اور اُن خوبیوں میں رغبت کی جائے جو برکت کی موجب ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (بیع و شراء کا اطلاق ایک اور جگہ بھی کیا ہے) فرمایا ان اللّٰہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللّٰہ فیقتلون و یقتلون وعدا علیہ حقا "بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اُن کی جان و مال کو خرید لیا ہے اس چیز کے عوض کہ اُن کے واسطے جنت ہے وہ اللہ کے راستے میں قتال کریں پھر قتل کریں اور قتل کئے جائیں اللہ کا وعدہ سچا ہے" تو جو شخص اس بیع میں سچا (اور ثابت قدم) رہے۔ حق کو نہ چھپائے، اللہ اور رسول پر جھوٹ نہ لگائے نہ احکام دین میں گھڑ بڑ کرے کہ بدعت ایجاد کر کے اس کو دین بتلانے لگے اور اللہ و رسول کے ساتھ سچائی کا معاملہ رکھے جیسا واجب ہے اور احکام الٰہیہ کو قواعدِ شرعیہ کے موافق بیان کرے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرے اس کی بیع میں برکت دی جائے گی مگر اس بیع میں ایک زیادتی ہے جو پہلی میں نہیں۔ دونوں جگہ ثمن اور بیع میں جو برکت ہوتی ہے وہ تو بندہ ہی کے لیے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہم سے مستغنی ہیں۔ یہ دوسری بیع بھی ہمارے ہی واسطے تجارت ہے چنانچہ ارشاد ہے ھل ادلکم علٰی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم تؤمنون باللّٰہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللّٰہ باموالکم و انفسکم ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ کیا میں تم کو ایسی تجارت نہ بتلاؤں جو دردناک عذاب سے تم کو نجات دے (وہ یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں

اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے واسطے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو، اور خسارہ بھی دونوں پر عائد ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس دُوسری تجارت کو خسارہ سے بچانے کا زیادہ اہتمام کیا جائے (کیونکہ اس کا نفع اور خسارہ دائمی ہے اور دنیوی تجارت کا نفع اور خسارہ چند روزہ ہے) چنانچہ حضرات انصار نے جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو دریافت کیا اگر ہم اس بیعت کو پُورا کریں تو ہمارے لیے کیا ہے؟ فرمایا جنت ہے۔ صحابہ نے عرض کیا ہم راضی ہیں اور اس بیعت کو (پورا کریں گے) توڑیں گے نہیں۔ پھر ان حضرات نے بیعت کو پورا کیا تو اللہ تعالے نے بھی اُن سے اپنا وعدہ پُورا کیا کہ اُن کے لیے وفاء عہد کی شہادت دی جس کی حقیقت ایمان ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا ہے والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولٰئک ھم المؤمنون حقا۔ اور جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ تعالے کے راستہ میں انھوں نے جہاد کیا اور جنہوں نے (مہاجروں کو) جگہ دی اور (دین کی) نصرت کی یہی سچے مومن ہیں لھم مغفرۃ و رزق کریم۔ اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی) اسی لیے اہلِ توفیق نے اپنے لیے ایک ہی فکر کو اختیار کر لیا (یعنی فکر آخرت) اور ادھر ادھر التفات نہ کیا تو وہ کامیاب اور سودمند ہو گئے کسی نے (خوب) کہا ہے ؎

لما رأیت القوم قد ساروا وخلفوا مثقلا مثلی ولم یعرجوا

؎ جھدت فی نوح والبکا علی اخلفت ! !

من بعدھم توبۃ تجبر من حیث عرجوا

واستأنف بیعۃ لعلی مثلھم لا اخلفت

وھادی فوقی بقول دعد لا یلھو لای یخلف

انا الضعیف ببابکم وھو خیر من تعب وتقفوا

فاحملوا الضعیف ببابکم فبحیاتکم لا بغیر کم رتقت

تیزی کے ساتھ چلی گئی، تو میں نے خوب گریہ وزاری کی کہ شاید اُن کے بعد مجھے توبہ نصیب ہو جائے جو اس مقام تک پہنچا دے جہاں وہ پہنچے ہیں اور بیعت کی تجدید کی تاکہ میں بھی اُن کی طرح (آگے بڑھ جاؤں) پیچھے نہ رہوں اور میری ناقہ کا چلانے والا کہہ رہا تھا اے میرے مولا: تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ تمہارے دروازہ پر میں کمزور مسکین کھڑا ہوں اور یہی سب سے اچھی جگہ کھڑے ہونے کی ہے تو اس کمزور کو بھی اُٹھالو جو تمہارے دروازہ پر ہے تمہاری زندگی کی قسم میں تمہارے سوا کسی پر توجہ نہ کروں گا۔ قولہ ھل یقتصر ھذا البیع الی قولہ کا بغیر کم اتفت۔

ف۔ مطلب تو ظاہر ہے مگر یہ معلوم نہ ہُوا کہ یہ اشعار کس بحر میں ہیں اور یہ اشعار ہیں یا نثر مقفیٰ مگر بزرگوں کے اس کلام میں اس چیز کے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ معنی اور مطلب کو دیکھنا چاہیئے ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من گویدم مندیش جز دیدار من

واللہ اعلم ۱۲ مترجم

ف۔ مشائخ طریقت سے جو بیعت کی جاتی ہے وہ بھی تجارتِ آخرت میں داخل ہے جس میں مرید کی طرف سے اپنے نفس کو شیخ کے حوالے کیا جاتا ہے اور شیخ اس کے عوض میں اُس کو اپنی باطنی دولت یعنی نسبت مع اللہ عطا کرتا ہے۔ وہاں بھی دونوں کو سچائی سے معاملہ کرنا واجب ہے۔ مرید کو اپنے نفس کے عیوب و امراض صاف صاف بیان کرنا چاہیئے ؎

ما مالِ دل را با یار گفتیم نتواں نہفتن درد از طبیباں

اور شیخ کو اگر مرید سے مناسبت نہ ہو اور اس سے فائدہ کی امید نہ ہو تو صاف کہہ دے کہ تمہارا حصہ میرے پاس نہیں ہے تم کسی اور شیخ سے رجوع کرو۔ مرید کو اگر شیخ سے کسی وقت اعتقاد نہ رہے تو اُس کو بھی ادب کے ساتھ اُس سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے اور دھوکہ نہ رہے۔

باب ۹۵

حدیث

جواز اخذ الزوجة ما يكفيها من مال زوجها اذا كان شحيحاً

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت معاویہ کی والدہ ہندہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ابو سفیان بخیل مرد ہے تو اگر میں اُن کے مال میں سے چھپا کر کچھ لے لوں تو کیا مجھ پر گناہ ہوگا؟ فرمایا تم اور تمہاری اولاد اتنا لے لو جو عام عادت کے موافق تمہیں کافی ہو جائے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ جس شخص پر کسی کا حق ہو اور وہ نہ دیتا ہو تو اُس کی غیبت میں اُس کے مال سے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے اس کی تفصیل میں علماء کا اختلاف ہے کہ جنس حق سے ہی لینا جائز ہے یا غیر جنس سے بھی لے سکتے ہیں (اس کو کتب فقہ سے معلوم کر لیا جائے)۔

(۲۴۶) ضرورت شرعیہ کے موقعہ پر غیبت جائز ہے حضرت ہندہ کے اس قول سے کہ ابو سفیان بخیل آدمی ہے۔ معلوم ہوا کہ حاکم کے سامنے ضرورت کے وقت (مدعا علیہ کی) غیبت کرنا جائز ہے اور وہ حقیقت میں غیبت نہیں کیونکہ اس سے دوسرے کی تنقیص (یا عیب جوئی) کا قصد نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقتِ حال اور بیان واقعہ کا قصد ہوتا ہے (تاکہ حاکم واقعہ کی تفصیل وحقیقت سے واقف ہو کر فیصلہ کرے) اور حضرت ہندہ نے جو کچھ کہا تھا وہ حقیقت میں غیبت نہیں تھی بلکہ عادتِ عرب کے موافق ابو سفیان کی

مدح تھی کیونکہ اُن کے یہاں اپنے اہل وعیال کے ساتھ انسان اس لیے بخل کرتا تھا کہ اُس کو مہمانوں کی خاطر تواضع کا اہتمام زیادہ ہوتا تھا جس سے اہل وعیال کو تنگی پیش آتی تھی تو یہ ایسا لفظ ہے جس کا باطن ظاہر کے خلاف تھا (ظاہر میں مذمت تھی مگر حقیقت میں بڑی مدح تھی کہ وہ بہت مہمان نواز ہیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں اتنا خرچ کر دیتے ہیں کہ گھر والوں کو تنگی سے پریشانی ہوتی ہے)۔ قولہ ظاهر اللفظ يعطى جواز الغيبة عند الحاكم الى قوله فهى لفظة باطنها خلاف ظاهر۔

ف ۔ علامہ ابن ابی جمرہؒ نے عجیب بات کہی ہے جو واقع میں صحیح ہے کیونکہ اہلِ عرب کے یہاں سردار میں چار اوصاف کا ہونا اور اُن میں دوسروں سے ممتاز ہونا شرط تھا۔ نجابت، سخاوت، فصاحت، شجاعت اور ابوسفیان سردار مکہ تھے تو وہ بخیل کیسے ہو سکتے تھے۔ اگر وہ بخیل ہوتے تو سردار نہیں بن سکتے تھے۔ پس یقیناً ہندہ کا مطلب وہی تھا جو علامہ نے بیان فرمایا کہ وہ اپنی سخاوت اور مہمان نوازی کی وجہ سے گھر والوں کو تنگی دیتے تھے حضورؐ نے اُن کو اجازت دیدی کہ قاعدہ کے موافق چھپا کر اپنے حقوق وصول کر سکتی ہو حق سے زیادہ نہیں۔ پس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط نہیں ہو سکتا کہ ضرورت کے وقت حاکم کے سامنے مدعی علیہ کی غیبت جائز ہے۔ اس کے لیے دوسرے دلائل ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لا يحب الله الجهر بالسوء من القول الا من ظلم۔ (اللہ تعالیٰ بُری بات کا اعلان پسند نہیں کرتا مگر جو مظلوم ہو (وہ ظالم کی بُرائی کر سکتا اور اُس کے ظُلم کا اعلان کر سکتا ہے)۔



باب ۹۶

حدیث

النہی عن التصویر

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جو شخص کوئی صُورت (جان دار کی) بنادے تو اللہ تعالےٰ اُس کو عذاب دیں گے۔ یہاں تک کہ اُس میں رُوح پھونک دے اور وہ اُس میں کبھی بھی رُوح نہیں پھونک سکتا۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ جو شخص (جان دار کی) تصویر بنادے گا اُس کو ہمیشہ عذاب ہوتا رہے گا اور ظاہر لفظ سے واضح ہو رہا ہے کہ مراد جاندار کی تصویر ہے۔ کیونکہ رُوح پھونکنے کا مطالبہ اُسی میں ہو سکتا ہے۔ اور (عبداللہ بن عباس اور) عبداللہ بن عمر سے اس کی تصریح بھی منقول ہے کہ بے جان کی تصویر جائز ہے جیسے درختوں اور مکانات وغیرہ کی۔ واللہ اعلم۔

ف ۔ فوٹو لینا بھی تصویر بنانے کے حکم میں ہے۔ بعض علماء مصر و ہندوستان نے اس کو تصویر میں داخل نہیں کیا۔ کیونکہ تصویر ہاتھ سے بنائی جاتی ہے اور فوٹو کیمرہ کے آئینہ سے لیا جاتا ہے مگر طریق کے اختلاف سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اگر پہلے زمانے میں شراب ہاتھ سے بنائی جاتی تھی اور آج کل مشین سے کشید کی جانے لگی تو حکم نہیں بدلے گا۔ کیونکہ حقیقت دونوں جگہ متحد ہے۔ اسی طرح فوٹو اور تصویر کو سمجھنا چاہئیے۔

ف - ظاہر حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ تصویر بنانے والے کو ہمیشہ عذاب ہوتا ہے
مگر اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک
لمن یشاء اللہ تعالیٰ اس کو تو معاف نہ کریں گے کہ اُن کے ساتھ دُوسرے کو شریک
کیا جائے اور اُس کے سوا (اور گناہوں) کو جسے چاہیں گے معاف کر دیں گے۔ اس کے
معارض ہے کیونکہ یہ گُناہ شرک و کفر سے کم ہے تو وہ بھی مشیت کے تحت میں ہے۔ اگر
اللہ تعالےٰ نے چاہیں گے معاف فرماویں گے اور یہ وعید ویسی ہی ہے جیسی عمداً مسلمان
کو قتل کرنے کی وعید ہے فجزاءہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ کہ اُس کی
سزا جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہے گا اور اُس پر اللہ کا غضب ہے۔ اہل سُنّت نے
اُس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اُس کی سزا تو یہی ہے اگر اللہ تعالےٰ سزا دینا چاہیں مگر
آخر میں ارحم الراحمین کی شفاعت سے یہ لوگ جنت میں پہنچ جائیں گے۔ جیسا حدیث
میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے فرشتوں نے شفاعت کر لی رسولوں اور نبیوں نے
بھی شفاعت کر لی اب ارحم الراحمین کی شفاعت رہ گئی۔ پھر اللہ تعالےٰ (دو تین بار)
جہنم میں سے مٹھی بھر کر اُن لوگوں کو نکالیں گے جن کو قرآن (کے قانون) نے جہنم میں
محبوس کر رکھا تھا اور قانون قرآن دو قسم کے لوگوں کو جہنم میں محبوس کرے گا۔ ایک
تو کفار کو دُوسرے ان گنہگاروں کو جن کے بارہ میں عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کی
مغفرت نہ کی جائے تو کفار کی تو مغفرت نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالےٰ صاف فرما چکے ہیں
کہ یہ لوگ مغفرت کے مستحق نہیں ہیں۔ آیات و احادیث اس کے متعلق بکثرت وارد ہیں
اور امت کا اجماع بھی اس پر منعقد ہو چکا ہے۔ اب دُوسری ہی جماعت رہ گئی
جن کو رحمت الٰہیہ سے حصّہ مل گیا اور مراحم خسروانہ سے اُن کو جنت میں پہنچا دیا جائیگا
یہ ایسی توجیہ ہے جس سے تمام آیات و احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے اور
کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ علامہ ابن ابی جمرہ نے اسی مضمون کو شرح میں بیان
فرمایا ہے مگر چونکہ مسئلہ تصوف کا نہ تھا اس لیے فوائد میں داخل کیا گیا کہ علماء
کے کام کی بات ہے ۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں علماء بعض اسلامی فرقوں کی تکفیر کا فتوے دینا چاہتے تھے اور مولانا اُن کے اقوال کی تاویل فرما رہے تھے۔ علماء اُس تاویل میں کلام کر رہے تھے جب دیر تک بحث ہوتی رہی تو فرمایا کہ تم لوگ کس خیال میں ہو۔ خدا کی قسم! قیامت میں جب رحمت کو جوش ہوگا بہت سے ایسوں کو بخش دینگے جن کو ملائکہ اور انبیاء نے بھی کافر سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیا ہوگا۔ اُن کا ایمان اسقدر ضعیف تھا کہ ملائکہ و انبیاء و رسل اور سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُس کو پہچان سکیں گے تو جن کے ایمان کو وہ نہ پہچان سکے تم تو اُن کو قطعی کافر کہو گے اس لیے تم جن لوگوں کی تکفیر کرنا چاہتے ہو قیامت میں دیکھو گے کہ اُن کی مغفرت ہو رہی ہے۔ ہاں انتظام شریعت کے لیے اُن کو دھمکانے کے طور پر کفر کا فتوے دیدو تو مضائقہ نہیں مگر واقع میں کافر نہ سمجھو۔ سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ قدس سرہٗ۔

(۲۴۷) دعویٰ کرنا بُرا ہے گو سچا ہی کیوں نہ ہو: اس میں صوفیاء کے اس مسئلہ کی دلیل ہے کہ وہ دعوے کو بُرا سمجھتے ہیں گو سچا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ اندیشہ (ہر وقت) ہے کہ مدعی کے اندر کچھ نقص ہو جس کی اُسے خبر نہ ہو تو دعوے اُس کی محرومی کا سبب ہوگا۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تصویر بنانے والوں سے کہا جائیگا اس میں روح پھونکو اور وہ کبھی روح نہ پھونک سکیں گے۔

دُوسری حدیث میں ہے کہ اُن سے کہا جائے گا تم نے جو صُورت بنائی تھی اس کو زندہ کر دیں اُن سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اپنے دعوے کو پُورا کرو۔ وہ اس کو پُورا نہ کر سکیں گے تو جھوٹے دعوے پر عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ جب اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مخلوق کی تصویر بنائی تو زبانِ حال سے اپنے خالق ہونے کا دعوے کیا۔ اُن سے کہا جائے گا کہ پُورا دعویٰ تو یہ ہے کہ اس تصویر میں جان بھی ڈال دو ورنہ تم اپنے دعوے میں جھوٹے ہو جس کی سزا دردناک ہے۔

حدیث سے صدر اوّل (صحابہؓ اور تابعینؒ) کے طریق کی بھی تائید ہو رہی ہے

اور دہی حق ہے کہ وہ حضرات انسان کے حال کو دیکھتے تھے اقوال کو نہ دیکھتے تھے۔ دیکھو تصویر بنانے والا زبان سے تو اپنے خالق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا مگر اُس کا عمل (زبانِ حال سے) اس دعویٰ کو بتلا رہا ہے تو اُس کی بات کا لحاظ نہیں کیا گیا اگرچہ وہ عمر بھر یہ کہتا رہے کہ یہ حقیقی تصویر نہیں ہے (محض دیکھنے کی تصویر ہے) اس بات سے اُس کو کچھ نفع نہ ہوگا بلکہ زبانِ حال سے جو دعوے ظاہر ہو رہا تھا اُس پر مواخذہ کیا جائے گا۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو اللہ والوں سے ملنا چاہے وہ اُن کا اتباع کرتا رہے اپنی طرف سے (راستہ) ایجاد نہ کرے وہیں پہنچ جائے گا، جہاں وہ پہنچے ہیں اگرچہ دعویٰ نہ کرے اور اگر دعوے کرتا رہا اور اتباع نہ کیا اس کو خسارہ اور دھکی نصیب ہوگی۔ ابابِ توفیق نے فرمایا ہے کہ جو اُس چیز کا دعوے کرے جو اُس میں نہیں ہے امتحان کے وقت رسوا ہو جاتا ہے کسی نے (خوب) کہا ہے ؎

نفسك على الدعوىٰ فحاسبها ولا تدع ذالك فتضيعها

جب تمہارا نفس کوئی دعوے کرے اُس کا محاسبہ کرو اور دعوے کر کے اپنے کو برباد نہ کرو۔ قوله فيه دليل لطريق اهل الصوفية فى ذمهم الدعوىٰ الىٰ قوله فتضيعها۔

باب ۹

حدیث

جواز اخذ الاجر علی کتاب اللہ عزوجل

حضرت (عبداللہ) بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جن چیزوں پر تم معاوضہ لیتے ہو اُن میں سب سے زیادہ اس کی مستحق کتاب اللہ ہے۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہُوا کہ کتاب اللہ (کی تعلیم) پر اُجرت لینا جائز ہے اور وہ سب سے زیادہ حلال ہے۔ اس کے معارض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث ہے کہ ایک شخص نے کسی کو کچھ قرآن پڑھایا اُس نے اس کو ایک کمان ہدیہ میں دی کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرنا۔ اس شخص نے جس کو یہ ہدیہ دیا گیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا یہ دوزخ کا ایک ٹکڑا ہے یا فرمایا دو ٹکڑے ہیں۔

اس حدیث سے بظاہر (کتاب اللہ کی تعلیم پر معاوضہ لینے کی) ممانعت معلوم ہوتی ہے اسی لیے علماء میں اختلاف ہوگیا۔ بعض تو اُس حدیث کی وجہ سے جس کی ہم شرح کر رہے ہیں مطلقاً جواز کے قائل ہوگئے اور بعض علماء دوسری حدیث کی وجہ سے مطلقاً ممانعت کے قائل ہوگئے اور بعض نے دونوں کو جمع کر دیا (کہ بعض حالات میں جواز کے اور بعض حالات میں ممانعت کے قائل ہوئے ہیں) یا امام مالکؒ کا مذہب ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو عمل فرض ہے اُس پر اُجرت لینا جائز نہیں اور جو فرض نہیں اُس پر اُجرت لینا جائز ہے مثلاً کوئی شخص سورۃ فاتحہ سیکھنا چاہے تو اُس پر اجرت لینا جائز نہیں جبکہ وہ بالغ ہو کیونکہ سورۃ فاتحہ کا سیکھنا اُس پر فرض ہے کہ اسکے بغیر نماز صحیح نہیں (تو اس کا سکھلانا

بھی فرض کفایہ ہے) اور فاتحہ کے سوا کچھ اور بھی پڑھنا چاہے تو اُس سے اُجرت لینا جائز ہے۔ اسی پر تمام احکامِ دین کو سمجھ لو کہ جو عمل اس وقت طالب کے ذمہ فرض ہو اُس پر مطلوب کو اُجرت لینا جائز نہیں اور جو (اس وقت) فرض نہیں اُس میں اختیار ہے اور تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کے جواز میں دین کا بڑا فائدہ ہے جس کی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے ہیں یا وہ (علماء و فقہاء) جن پر اس حقیقت کا کچھ حصہ منکشف ہوگیا ہے کیونکہ اُجرت تعلیمِ قرآن کے جواز سے قرآن کی تعلیم مسلمانوں میں پھیل جائے گی۔ اگر یہ اُجرت جائز نہ ہوتی تو کوئی شاذ و نادر ہی پڑھاتا کیونکہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو بچوں کی تعلیم کی مشقت (اور اُن کی تربیت کی مصیبت) کو بلا معاوضہ برداشت کرسکیں۔ پھر اُس کو بھی تو انسانی مجبوریاں درپیش ہیں (اُن سب کو بالائے طاق رکھ کر) تعلیمِ قرآن کی پابندی ہر شخص سے نہیں ہوسکتی۔ دیکھو باوجود اُجرت لینے اور اس کے علاوہ مزید احسان کے بھی تم کسی کو تعلیم کا حق ادا کرتا ہوا نہ پاؤگے سوا اُن کے جو اہلِ توفیق (اور صاحبِ دل) ہیں (اب اگر تعلیمِ قرآن پر معاوضہ لینے کو حرام کردیا جاتا تو کون تعلیم دیتا اور اس طرح یقیناً قرآن کی اشاعت بلادِ اسلام میں بند ہوجاتی)۔

غرض شریعت میں بہت چیزیں ایسی ہیں جو اصول و قواعد کی رُو سے ممنوع ہیں مگر کسی منفعت کی وجہ سے اُن کو جائز کردیا گیا ہے حالانکہ وہ منفعت اس سے بدرجہا کم درجہ کی ہے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے رحمت اور وسعت ہے ما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ اللہ تعالےٰ نے تمہارے اُوپر دین میں ذرا تنگی نہیں کی۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حد سے زیادہ اُمّت کے خیرخواہ ہیں کیونکہ حضورؐ نے یہ حکم اور اس جیسے بہت سے احکام از خود بیان فرمائے ہیں۔ کسی کے پُوچھنے پر نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے حضورؐ کو سب سے بہتر جزا عطا فرمائے جو کسی نبی کو اس کی اُمّت کی طرف سے دی گئی ہو۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں اس کی تصریح بھی فرمائی ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین

رؤف رحیم ۔ بے شک تمہارے پاس تمہارے ہی میں سے رسول آئے ہیں جن پر تمہاری پریشانی شاق ہے اور وہ تم پر (یعنی تمہاری راحت) پر حریص ہیں، مسلمانوں پر بہت مہربان ہمدردی کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نعمت عظیمہ کے شکر کی ہم کو توفیق دیں اور اس کو ہم پر کامل کر دیں۔ آمین۔

ف ۔ اس حدیث میں بظاہر تصوف کا کوئی مسئلہ نہیں مگر بہت سے اہل اللہ قرآن کی تعلیم اور بچوں کی تربیت و تادیب میں مشغول تھے اور بچوں کے والدین اُن کی خدمت کرتے تھے یہی اُن کا ذریعۂ معاش تھا تو غالباً شارح کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی طالب طریق کو ترکِ اسباب دشوار ہو تو وہ قرآن اور حدیث اور علم دین پڑھانے کا شغل اختیار کرے کہ اس کی آمدنی سب سے زیادہ حلال ہے واللہ تعالیٰ اعلم اور اہل علم کے لیے تو اس سے بہتر کوئی شغل ہے ہی نہیں۔ خصوصاً اس زمانے میں کہ لوگوں کو علم دین کی طرف توجہ بہت کم ہے اگر علماء و طلباء دوسرے مشاغل اختیار کریں گے تو دین کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے اُن کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ سلسلۂ تعلیم و درس برابر جاری رہے کہ اسی سے دین کی بقاء ہے ۔ والسلام

❖

باب ۹۸

حدیث

جواز الرقی والاجر علیہا

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک جماعت کسی سفر میں گئی اور عرب کے ایک قبیلہ کی بستی میں ٹھہری اُن سے مہمانی کا حق طلب کیا۔ اُنھوں نے مہمانداری سے انکار کیا تو اس قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا۔ اُنھوں نے ہر قسم کی کوشش کی (تاکہ وہ اچھا ہو جائے) کسی تدبیر سے نفع نہ ہُوا تو ایک نے کہا ذرا ان لوگوں کے پاس بھی تو جاؤ جو ہماری بستی میں اُترے ہیں شاید اُن میں سے کسی کے پاس کوئی چیز ہو (جس سے سانپ کا زہر اُتر جائے) چنانچہ وہ ان کے پاس آئے اور کہا اے صاحبو! ہمارے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے، ہم نے ہر قسم کی تدبیر کر لی مگر اُسے کسی چیز سے فائدہ نہ ہُوا تو کیا تم میں سے کسی کے پاس کوئی چیز ہے؟ ایک صحابی نے کہا ہاں بخدا میں جھاڑ نا جانتا ہوں، لیکن بخدا تم سے ہم نے مہمانی کا حق طلب کیا تھا تو تم نے انکار کر دیا اب جب تک تم کچھ معاوضہ نہ دو میں نہیں جھاڑوں گا تو اُنھوں نے بکریوں کے ایک گلہ پر صلح کی (کہ تم کو یہ گلہ بکریوں کا دیا جائے گا) وہ صحابی گئے اور اس پر دم کرنے اور تھتکارنے لگے اور الحمد للہ رب العالمین (سورۂ فاتحہ اخیر تک) پڑھنے لگے۔ وہ تو ایسا ہو گیا جیسے اونٹ کو رسّی سے کھول دیا جائے۔ بے تکلف چلنے پھرنے لگا۔ بیماری کا ذرا بھی اثر نہ رہا۔ بستی والوں نے اپنا وعدہ پُورا کیا اور جو ٹھہرا تھا اُن کے حوالہ کیا۔ صحابہ میں

سے بعض نے کہا کہ اس کو تقسیم کرلو۔ جھاڑ پھونک کرنے والے نے کہا ابھی ایسا نہ کرو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کریں پھر دیکھیں آپ کیا فرماتے ہیں (اگر اس کو جائز قرار دیا تقسیم کریں گے ناجائز قرار دیا تو واپس کر دیں گے)۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے واقعہ بیان کیا۔ حضور نے فرمایا تمہیں کس نے بتلایا کہ سورۂ فاتحہ سے جھاڑ پھونک بھی ہو سکتی ہے۔ پھر فرمایا تم نے ٹھیک کیا اس معاوضہ کو تقسیم کرلو اپنے ساتھ میرا بھی حصہ لگالو پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہنسنے لگے۔

شرح بظاہر حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ جھاڑ پھونک پر معاوضہ لینا جائز ہے۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے جھاڑ پھونک کی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ کلام اللہ کے سوا اور کسی چیز سے بھی جھاڑ پھونک جائز ہے؟ اس حدیث میں تو اس پر دلالت نہیں مگر دوسری حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے علاوہ اور بھی پاکیزہ کلام دم کیا کرتے تھے جیسے اللھم انت الشافی لا شفاء الا شفاءک یا رب العالمین اللھم اشف شفاء لا یغادر سقما اور اس جیسی اور بھی دعائیں ہیں۔ کتاب اللہ اور اسماء الٰہی اور پاکیزہ کلام کے سوا دیگر کلمات سے جھاڑ پھونک کی ممانعت بھی آتی ہے نیز اہل کتاب کی جھاڑ پھونک سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اسی لیے علماء نے تعویذ کی اُن انگوٹھیوں سے منع کیا ہے جس میں عبرانی الفاظ منقوش ہوتے ہیں جن کے معنی معلوم نہیں۔ ایسے ہی ہر وہ زبان جس کے معنی معلوم نہ ہوں اس کا تعویذ پہننا ممنوع ہے۔ کیونکہ ممکن ہے اس کے معنی میں شرعاً کوئی خرابی ہو تو تعویذ پہننے والا گناہ میں مبتلا ہو گا۔ (جھاڑ پھونک اور تعویذات پر معاوضہ لینا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ ایک یہ کہ اس شخص نے باقاعدہ اس فن کو حاصل کیا ہو اور محض کتابیں دیکھ کر تعویذ نہ لکھتا ہو۔ دوسرے اس کو تجربہ بھی ہو کہ اس سے نفع ہوتا ہے۔ تیسرے معاوضہ صاف طور سے طے کیا جائے۔ زکوٰۃ کہہ کر نہ لیا جائے جیسا عام طور سے رواج ہے بقیہ شرائط علماء کے کلام میں مذکور ہیں۔ ۱۲ مترجم)۔

(۲۴۸) رزقِ مقدر کو کوئی نہیں روک سکتا: حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو رزق تمہارے واسطے مقدر ہو چکا ہے اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ تم کو مل کر رہے گا خواہ روکنے والا چاہے یا نہ چاہے۔ دیکھو صحابہ نے جس بستی والوں سے ضیافت طلب کی اور اُنہوں نے انکار کیا تو سانپ نے زمیندار کو ڈس لیا اور اس طرح وہ رزق جو مقدر تھا صحابہ کے پاس پہنچ کر رہا۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی مدد کمزور کو جلد پہنچتی ہے۔ دیکھو جب بستی والوں نے اپنی قوت کی بنا پر اس جماعت کو قلیل اور کمزور سمجھ کر ضیافت سے انکار کیا تو اللہ کی مدد (سانپ کے ڈسنے کی صورت میں) بہت جلد پہنچ گئی۔ حدیث میں اس پر بھی اشارہ ہے کہ عادت الہٰی کا بدلنا بھی عذاب ہے۔ دیکھو بستی والوں نے صحابہ کی ضیافت سے انکار کیا جو اُن کا حق تھا تو اُن کی وہ تمام تدبیر ناکام ہوگئیں جن سے سانپ کے ڈسنے کا علاج کیا کرتے تھے اور اچھے ہو جاتے تھے (ان تدابیر کے متعلق عادتِ الٰہیہ جو اب تک تھی وہ اس نازیبا حرکت کی وجہ سے بدل گئی) یہاں تک کہ انہوں نے وہ حق ادا کیا جس کو روک لیا تھا (تو پھر خدا نے مریض کو شفا دے دی) ایک حدیث میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے بیان فرمایا گیا ہے اذا ابغض اللہ قوما امطر صیفھم واصحی شتاءھم۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے نفرت کرتے ہیں گرمی کے زمانے میں اُن پر بارش نازل کرتے ہیں اور سردی میں آسمان کو صاف کر دیتے ہیں کہ بارش کا ایک قطرہ نازل نہیں ہوتا۔ یہ تو اُن ممالک کے واسطے ہے جن کو سردی میں بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور جن کو گرمی اور برسات میں ضرورت ہوتی ہے اُن پر جب اللہ تعالیٰ کا غضب ہوتا ہے گرمی اور برسات میں بارش بند کر کے جاڑوں میں برسات کر دیتے ہیں) غرض عادۃ اللہ کا بدلنا غضب کی نشانی ہے۔ اسی لیے اہلِ سلوک جب اپنی کسی حالت محمودہ میں تغیر پاتے ہیں جس کے عادی تھے فوراً گریہ و زاری اور التجا میں مشغول ہو جاتے اور نفس کی پوشیدہ شرارتوں میں غور کرتے۔ یہاں تک کہ اس کوتاہی کا پتہ لگا لیتے جہاں سے یہ تغیر

آیا ہے تو اس کی تلافی کرتے۔ اس کی تائید اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ اللہ تعالےٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک خود وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔

حدیث میں اللہ تعالےٰ کی ایک بہت بڑی حکمت پر بھی اشارہ ہے کہ بستی والوں میں سے عذاب اُسی پر آیا جس کا جُرم سنگین تھا۔ کیونکہ ضیافت سے انکار کرنے میں سردارِ قبیلہ اصل تھا۔ عرب کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے سردار کے اشارہ پر چلتے ہیں جب وہ اس حرکت میں اصل تھا تو عذاب بھی اُسی پر آیا کہ سانپ نے اُسی کو ڈسا، سزا جُرم کے موافق دی گئی۔ قولہ فیہ اشارۃ الی انہ ما قدر لک من الرزق لا یمنعہ عنک مانع الی قولہ جزاء وفاقا۔

ف۔ ان سب فوائد پر صوفیائے کرام کا عمل سب سے زیادہ ہے اُن میں جو مقتدا اور مشائخ ہیں وہ دُوسروں سے زیادہ ڈرتے اور غوائل نفس پر نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی کوتاہیوں کا دوسروں پر اثر پڑتا ہے اور غیب سے اُن کو زیادہ تنبیہ ہوتی ہے اسی طرح تقدیر پر اور نصرۃ الٰہی کے جلد آنے پر اُن کو زیادہ بھروسہ ہوتا ہے کہ یہی حضرات ہر زمانہ میں صحابہ کے نمونے ہیں۔

(۲۴۹) بزرگوں کو جب حق بات بتلائی جاتی ہے فوراً قبول کر لیتے ہیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اہلِ فضل دینداروں کو جب حق کی ہدایت کی جاتی ہے (فوراً) اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ عزت نفس (اور تکبر و نخوت) ان پر غلبہ نہیں کرتی۔ دیکھو جھاڑ پھونک کرنے والے نے جب صحابہ سے کہا کہ ابھی تقسیم نہ کرو جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچ جاؤ۔ سب نے اس کی بات مان لی اور بحث نہیں کی۔ قولہ فیہ دلیل علی ان اھل الدین والفضل اذا ارشد والی الحق قبلوہ الی قولہ ولم یحاجوا۔

ف۔ حق بات کو فوراً مان لینا تصوف کے مقاصد میں داخل ہے۔ صوفیاء کو سب سے

زیادہ اس کا اہتمام ہے وہ علماء ظاہر کی طرح بحث و تکرار نہیں کرتے۔

(۲۵۰) محبوب کی توجہ اور نظرِ لطف سے جذبات میں ہیجان پیدا ہوجاتا ہے

یہاں ایک اور بھی اشارہ ہے کہ محبوب کی توجہ عاشق کے جذباتِ محبت کو بھڑکاتے اور اُس کے دل میں مسرت کی لہریں دوڑا دیتی ہے۔ دیکھو جب اللہ تعالے نے حضورؐ کے اصحاب کی مدد کی (اُن کے حال پر توجہ فرمائی) تو حضورؐ کو ہنسی آگئی اور فرمایا اس مال میں میرا بھی حصہ لگالو (حالانکہ آپ جانتے تھے کہ صحابہ خود ہی ایسے موقع پر آپ کو ہدیہ پیش کرتے ہیں مگر حضرت حداوندی پر اپنی مسرت و فرحت ظاہر کرنے کے لیے آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ میرا بھی حصہ لگاؤ تاکہ وہ بھی خوش ہوں اور اللہ تعالے کی مزید پر مسرت وطرب کا اظہار کریں۔

قولہ وھنا اشارۃ وھی عطف الحبیب یھیج قلب المحب ویفرحہ ویلہیہ ویضحکہ الی قولہ اظہار الذات کلا نہ معنا یونسھم ویسرھم وفیہ تقدیم وتاخیر۔

(۲۵۱) دُنیا سے زیادہ آخرت کا اہتمام کرنا چاہیئے حدیث میں اہل قلوب کے لیے

ایک خاص اشارہ ہے کہ بستی والوں نے اپنے مردار کے لیے ہر ممکن کوشش کی صرف اس لیے کہ اُس کے بدن کو راحت مل جائے جو خود بھی فنا ہونے والا ہے اور یہ جہان بھی فنا ہونے والا ہے (جس کی یہ بدن پیداوار ہے) تو اُس شخص کی ہمت کا کیا حال ہونا چاہیئے جو غیر فانی عالم کے لیے کوشش کر رہا ہو جس کی نعمتیں غیر فانی ہوں گی اور اس میں رہنے والا بھی نہ کمزور ہو گا نہ بُرا ہو گا (ہمیشہ جوان ہی رہے گا) تو جہاں زیادہ جستی اور رغبت کی ضرورت ہے وہیں سستی اور کمزوری ہو (بڑے تعجب کی بات ہے اہلِ قلوب کو آخرت کے لیے دُنیا داروں سے زیادہ کام کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ دُنیائے فانی مردار کے لیے ہر وقت مرتے کھپتے رہتے ہیں۔ طالبانِ آخرت کو اُن سے کم نہ رہنا چاہیئے اور جس طرح اہل

دُنیا اپنے سرداروں کی خدمت دل و جان سے کرتے اور اُن کی راحت کا اہتمام کرتے ہیں طالبانِ آخرت کو اپنے مشائخ کے لیے اُن سے زیادہ کرنا چاہیئے)۔

ایک مشہور بزرگ کو لوگوں نے کثرتِ مجاہدہ (و ریاضت) پر ملامت کی تو فرمایا مجھے (میرے حال پر) چھوڑ دو۔ کیونکہ میرے سامنے ایک سخت گھاٹی ہے جس سے وہی گھوڑے پار ہو سکتے ہیں جو دبلی پتلی کمر والے ہیں۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے: بالجد خذ لا بالکسل فان امامک عقابک واعی عقاب۔ ہمت اور کوشش سے کام کرو سستی سے نہیں کیونکہ تمہارے سامنے عذاب بھی ہے اور کیا عذاب؟ (جس سے بچنے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سستی اور غفلت کے ساتھ اُس سے نہیں بچ سکتے)۔

قوله في الحديث اشارة لاهل القلوب الى قوله واعی عقاب۔

ف ۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ یہ تو تصوف و سلوک کا پہلا قدم ہے کہ آخرت کو دُنیا سے معظم و مقدم سمجھے۔ والسلام۔



باب ۹۹

حدیث

لاحمیٰ الا للہ ولرسولہ

صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حمیٰ کسی کے لیے نہیں بجز اللہ کے اور اُس کے رسول کے۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ حمیٰ سب کی سب اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ اب رہا یہ کہ حمیٰ سے کیا مراد ہے؟ اور وہ بطریق وجوب کے ہے یا بطور استحباب کے؟ اور کون اس کا ذمّہ دار ہے؟ اس کی شرطیں کیا ہیں؟ سو اس کو معلوم کرنا چاہیئے۔ پس سنو! کہ حمیٰ کے پانچ معنی (لغت میں) ہیں۔ ایک تو روک ٹوک کرنا۔ بعض امور سے روکنا اور بعض کی اجازت دینا یہ تو احکام کا مقرر کرنا ہے۔ تو جسے اللہ نے روکنے کا حق دیا ہے وہ روک سکتا ہے اور جس کو حق نہیں دیا وہ نہیں روک سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہے ان الحکم الا للہ حکم (اور حکومت) صرف اللہ کے لیے ہے۔ دوسرے معنی عزت اور شوکت ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین عزت تو اللہ تعالےٰ ہی کے لیے ہے اور اُس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے بالایمان اعتزفنا ہم صرف ایمان کی وجہ سے معزز ہوئے ہیں۔ حمیٰ کے ایک معنی حفاظت اور بچاؤ کے ہیں تو جو شخص اپنی حفاظت اور بچاؤ کا طالب ہو اس کو حقیقی حفاظت اور بچاؤ اللہ اور رسول ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے یعنی اللہ اور رسول کے اتباع اور تعمیلِ احکام

سے۔ کیونکہ حق تعالٰے فرماتے ہیں ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ اگر تم اللہ کی مدد کروگے اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور اللہ کی مدد سے مراد اُس کے احکام کی بجاآوری اور منہیات سے اجتناب ہے اور سنتِ رسول کی پیروی۔ کیونکہ حق تعالٰے فرماتے ہیں من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ نیز ارشاد ہے یاایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المؤمنین اے نبی تم کو اللہ کافی ہے اور وہ مؤمنین جو آپ کے متبع ہیں۔

حمی کے ایک معنی تعصب (اور حمیت) اور مدافعت بھی ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کے بارے میں دریافت کیا کہ بعض لوگ محض حمیت کی بنا پر قتال کرتے ہیں۔ جیسا عرب کی عادت تھی (کہ اپنے قبیلہ کی طرفداری میں دُوسرے قبائل سے لڑتے تھے جس کا منشا بجز قومی تعصب اور حمیت کے کچھ نہ تھا)۔

اب حدیث کا مطلب یہ ہُوا کہ حمیت اور تعصب صرف اللہ اور رسول کے لیے ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہے کونوا انصار اللہ۔ تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہ کریں۔ اگر شریعت کے موافق ایک دوسرے کی مدد کریں وہ بھی اللہ ہی کے لیے ہے جیسا حدیث میں آیا ہے انصر اخاک ظالما او مظلوما۔ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ مظلوم کی مدد تو ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے لیے ہے اور ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو اللہ کے لیے ظلم سے روک دو۔ یہ بھی اللہ کی مدد ہے (کیونکہ اس میں حکمِ شرعی کی تعمیل ہے اور اللہ کی مدد سے یہی مراد ہے کہ اس کے احکام کی تعمیل کرو)۔

حمی کے ایک معنی تقدیر اور قسمت کے ہیں تو حقیقت میں صاحب نصیب وہی ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول اپنی پناہ میں لے لے۔ چنانچہ ارشاد ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ کہہ دیجئے ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی سوا اُس کے جو اللہ نے ہمارے واسطے مقدر کر دی ہے تو جس کو اللہ اور رسول نے اپنی پناہ میں

لے لیا اُس پر کوئی قابو نہیں پاسکتا اور دوسروں کی پناہ کوئی چیز نہیں اور اگر اتفاقاً کسی کی حمایت سے نفع بھی ہو جائے تو وہ ختم ہونے والی ہے اور اللہ کی حمایت منقطع نہیں ہو سکتی۔ (پس یہاں اُن معانی میں سے کوئی ایک مُراد ہے یا) ہو سکتا ہے کہ سب ہی مُراد ہوں اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ جس جگہ ان معانی میں سے کسی ایک کا تحقق ہو، وہاں اصل استحقاق اللہ اور رسول کے لیے ہے (اُن ہی کی حمی اصل حمی ہے) چنانچہ اسی قبیل سے حق تعالیٰ کا یہ قول ہے من کان یرید العزۃ فللّٰہ العزۃ جمیعا جو کوئی عزت چاہتا ہو تو عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنٰفقین لا یعلمون۔ عزت اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے لیکن منافق نہیں جانتے۔ اس حدیث کے مناسب اسی کے معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ان اللہ اذھب عنکم عبادۃ الجاھلیۃ وافتخارھا بالانساب مؤمن تقی او فاجر شقی۔ سُن لو! اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی حماقت اور نسب پر فخر کرنے کو دُور کر دیا (پس اب دو ہی قسم کے آدمی ہیں) یا مومن متقی ہے یا فاجر بدبخت۔ نیز اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی (اسی کے مناسب) ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز (وکرم) وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو تو اس (یہ علمی مسئلہ معلوم ہوا کہ جاہلیت والے جو کچھ کرتے تھے خواہ نسب پر فخر ہو یا کسی کی حمایت یا قومی عصبیت اور نئے نئے احکام (وقوانین) بنانا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا اور کسی کو پناہ دینا یا اپنی حفاظت کرنا۔ اس کے علاوہ دیگر امور جن میں نفس کے حظوظ (اور لذات) تھے۔ ایمان نے اُن میں سے کسی چیز کو باقی نہیں رکھا بجز اس کے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔

جو شخص بغیر کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے ان امور کو اختیار کرے اُس نے طریقۂ جاہلیت اختیار کیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے تحت میں ہوگا ثلاثۃ یبغضھم اللہ وعد فیھم من استن

فی الاسلام سنة الجاهلية ۔ تین شخصوں سے اللہ تعالےٰ کو نفرت ہے۔ اُن میں سے ایک وہ ہے جو اسلام میں جاہلیت کا طریقہ رائج کرے۔ اور یہ حکم خاص وعام قریب و بعید سب کے لیے عام ہے جس کی تائید حق تعالےٰ کے اس قول سے ہوتی ہے قل ان کان اٰباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم ۔" فرما دیجئے اگر تمہارے باپ بیٹے بھائی اور بیبیاں اور خاندان اور وہ مال جو تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہونے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ گھر بار جو تم کو پسند ہیں۔ اللہ سے اور رسول سے اور اللہ تعالےٰ کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو انتظار کر دیہاں تک کہ اللہ تعالےٰ اپنا (دوسرا) حکم بھیجیں۔ اس میں عوام اور خواص سب مشترک ہیں (سب کو حکم الٰہی کا اپنی تجویز پر مقدم کرنا واجب ہے)۔

(۲۵۲) خواطر میں صرف ربانی اور ملکوتی کی حمایت کی جائے گی خواص کے لیے (اس حدیث میں) ایک خاص بات ہے اور وہ خواطر (کی نگہداشت) ہے کیونکہ خواطر (نفس) کی چار قسمیں ہیں۔ ربانی، ملکوتی، نفسانی، شیطانی ہے۔ ان میں دو کی تو حمایت کی جائے گی یعنی خاطر ربانی اور ملکوتی کی اور دوسے جنگ کی جائے گی یعنی نفسانی اور شیطانی سے (پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ دل میں جو باتیں تقاضے کے ساتھ آتی ہیں اور ان کو اصطلاح صوفیاء میں خاطر کہا جاتا ہے۔ اُن میں سے حمایت صرف اُن کی ہوگی جو اللہ و رسول کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں اور جن خواطر کو اللہ و رسول سے علاقہ نہ ہو بلکہ محض نفسانی تقاضا یا شیطانی دھوکہ ہو ان کی حمایت نہیں کی جاسکتی بلکہ اُن کو روکنا چاہیئے) اس طرح یہ شخص اس جماعت میں شامل ہوگا جس کے متعلق ارشاد ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ جو لوگ ہمارے واسطے مجاہدہ کرتے ہیں اُن کو ہم اپنے راستوں پر ڈال دیتے (اور مقصود تک پہنچا دیتے) ہیں یہ تو منتہی کے لیے ہے جو نظر میں تمیز کر سکتا ہے اور مبتدی پر جب کوئی خاطر وارد ہو اُسے چاہیئے کہ قرآن و حدیث پر اُسے پیش کرے اُس وقت اسے معلوم

ہو جائے گا کہ یہ خاطر کس قسم میں داخل ہے تو کتاب و سُنّت کے موافق عمل کرے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان فصاحت (و بلاغت) پر بھی دلالت ہے کہ ایک لفظ میں آپ نے شریعت و حقیقت کے تمام احکام کو جمع کر دیا۔

قولہ ویختص اھل الخصوص۔ بالاعراض وھو الخو الطرائی قولہ جمعت احکام الشریعۃ والحقیقۃ کما یحذت بعض المسائل المتعلقہ بالفقہ۔

ف ۔ علامہ ابن ابی جمرہؒ نے اس مقام پر حمٰی کے سب معنی بیان فرمائے مگر جو معنی فقہاء کے یہاں مشہور ہیں اُس کو چھوڑ دیا۔ فقہاء نے حمٰی کی تفسیر میں یہ بیان کیا ہے کہ کسی زمین کی خود رو گھاس کو روک دیا جائے کہ اس میں دوسروں کے جانور نہ چریں۔ صرف سردار اور زمینداری کے جانور چرا کریں۔ حدیث نے اس رواج کو باطل کیا ہے کہ زمین کی خود رو گھاس سب کے لیے مباح ہے کسی کو اُس کو روکنے کا حق نہیں۔ صرف اللہ اور رسول کو حق ہے۔ خلیفہ کو بھی اپنے ذاتی جانوروں کے لیے کسی زمین کی گھاس روکنے کا حق نہیں صرف بیت المال کے جانوروں کے لیے روکنے کا حق ہے کہ اس میں دراصل سب مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ جیسا حضرت عمرؓ نے بیت المال کے اونٹ گھوڑوں کے لیے بعض دیہات کی زمین مخصوص کر دی تھی کہ اُس میں بیت المال کے جانوروں کے سوا دوسروں کے جانور نہ چریں۔ بس لا حمی الا للہ و رسولہ کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیزیں سب کے لیے مباح ہیں اُن کو اپنے لیے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہاں خلیفۂ اسلام بیت المال کے لیے روک سکتا ہے کیونکہ بیت المال کو اللہ اور رسول سے تعلق ہے۔ اس کی منفعت عام مسلمانوں کی منفعت ہے کسی خاص کی منفعت نہیں۔ اگر بیت المال کے لیے کسی زمین کی گھاس وغیرہ کو نہ روکا جائے تو جہاد کے اُونٹ گھوڑے پرورش نہیں پا سکتے اور جہاد کا موقوف ہو جانا مسلمانوں کے حق میں سخت مضر ہے۔ دُنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جسکے پاس اپنی حفاظت کا پورا سامان ہو۔ کسی قوم کا کمزور ہونا دوسروں کو اپنے ہضم کرنے کی دعوت دینا ہے۔ جیسے بکری کی کمزوری بھیڑیئے کو اُس پر حملہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ خوب سمجھ لو۔



حدیث

من لم یشرک باللہ دخل الجنۃ

ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک بار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ جب آپ نے جبل احد کو دیکھا فرمایا میں پسند نہیں کرتا کہ یہ پہاڑ میرے واسطے سونا بن جائے اور میرے پاس تین دن سے زیادہ اس میں سے ایک دینار بھی رہے سوائے اُس دینار کے جسے قرض (ادا کرنے) کے واسطے رکھ چھوڑوں پھر فرمایا زیادہ مال والے ہی زیادہ کمی والے ہیں مگر وہ جو مال کو اس طرف اور اُس طرف (خرچ) کرتا ہے ابو شہاب (راوی حدیث) نے (اس وقت) اپنے سامنے اور دائیں بائیں اشارہ کیا (حضورؐ نے فرمایا) اور ایسے لوگ کم ہیں (زیادہ وہی ہیں جو سرمایہ دار بن کر مال پر سانپ کی طرح جم جاتے ہیں غریبوں کو نہیں دیتے) پھر فرمایا (اے ابو ذر!) جب تک میں نہ آؤں تم اسی جگہ رہنا اور (یہ فرما کر) آپ کچھ دُور آگے بڑھ گئے میں نے ایک (اجنبی) آواز سُنی تو حضورؐ کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا پھر مجھے آپ کی بات یاد آگئی کہ تم اسی جگہ رہنا (اس لیے میں اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکا) جب آپ واپس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! (کیا چیز تھی یہ) جو میں نے سُنی یا یہ کیسی آواز تھی جو میں نے سُنی (راوی کو شک ہے کہ ان دو لفظوں میں سے کون سا لفظ صحابی نے کہا ہے) فرمایا کیا تم نے بھی (آواز) سنی؟ میں نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا میرے پاس جبرائیل (علیہ السلام) آئے تھے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کی اُمت میں سے جو شخص اس

حال میں مرے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک (خدائی) نہ کرتا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے کہا اگرچہ اُس نے ایسے ویسے (گناہ کے) کام کئے ہوں۔ فرمایا ہاں (اگرچہ اُس نے کیسے ہی کام کئے ہوں)۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص اسلام پر مرے گا جنت میں پہنچ جائے گا اگرچہ اُس نے کیسے ہی کام کئے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ جنت میں پہنچ جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو اصلاً عذاب نہ ہوگا یا یہ مطلب ہے کہ کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور جائے گا اگرچہ عذاب بھی دیا جائے تو جواب یہ ہے کہ ایک حدیث نے اُس کو صاف کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایمان دو طرح کا ہے ایک وہ جس کا صاحب جہنم میں (اصلا) نہ جائے گا۔ دوسرا وہ جس کا صاحب جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

یہ دوسرا ایمان وہ ہے جس کے ساتھ گناہ بھی ہوں اور پہلا ایمان وہ ہے جو احکام کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب کے ساتھ ہو۔ حدیثیں اس معنی میں بہت ہیں اور اہل توفیق گناہوں سے صرف اس لیے ڈرتے ہیں کہ گنا ہگار کی حالت بدل جانے کا اندیشہ رہتا ہے (کہیں ایسا نہ ہو کہ ایمان سلب ہو جائے) کیونکہ گناہ کفر کے قاصد ہیں (جیسے نیک اعمال ایمان کے قاصد ہیں یعنی نیکیوں کا سلسلہ ایمان سے وابستہ ہے اور گناہوں کا رشتہ کفر سے ملا ہُوا ہے)۔

(۲۵۴) مباح چیزوں پر نظر ڈالنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ چلتے پھرتے مباحات میں نظر کرنا جائز ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبل احد کو دیکھا۔ اگر آپ چلتے ہوئے زمین کی عجائبات پر نظر نہ ڈالتے (بلکہ نگاہ نیچی کرکے چلا کرتے) تو احد پہاڑ کو نہ دیکھ سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر دوسروں کی طرح نہیں تھی۔ آپ کی ہر نظر عبادت تھی۔ کیونکہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے ہوتی تھی اور جب اس نیّت سے نظر ڈالی جائے تو کتاب و سنت کے بیان سے وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ کتاب اللہ

میں ہے اولم ینظروا فی ملکوت السموٰت والارض کیا ان لوگوں نے آسمان وزمین کے عجائبات (قدرت) میں نظر نہیں کی (جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظمت ان پر منکشف ہو جاتی۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اس نیت سے زمین و آسمان کی طرف نظر کرنا شرعاً مطلوب ہے) نیز ارشاد ہے ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ماخلقت ھٰذا باطلا سبحٰنک اور (عقلمند لوگ) زمین و آسمان کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں اے پروردگار! تو نے اس کو بیکار نہیں بنایا تو اس سے پاک ہے اور حدیث میں ہے اللھم اجعل نظری عبرۃ۔ اے اللہ! میری نظر کو (مفید) عبرت بنا۔

رہی یہ بات کہ حضورؐ کی نظر عبرت حاصل کرنے کے لیے تھی اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے جبل احد کو دیکھ کر ایک ہی مدہ شرعیہ بیان فرمایا (بلکہ چند قواعد) اگر یہ نظر عبرت کے لیے نہ ہوتی تو کلام کا رنگ دُوسرا ہوتا۔ کیونکہ ہر کلام فکر کا نتیجہ ہے فکر کلام کا مقدمہ ہے اور مقدمہ کے موافق ہی نتیجہ ہُوا کرتا ہے (جب یہاں نتیجۂ فکر اعلیٰ درجہ کا ہے تو یقیناً آپ کی نظر بھی اعلیٰ درجہ کی تھی) حضورؐ نے اس مقام پر جو مقام شرعیہ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ خیر کی (یعنی مال کی) تمنا جائز ہے۔ دُوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اشیاء میں انقلاب ہو سکتا ہے (پہاڑ سونا بن سکتا ہے آخر سونا چاندی پہاڑ ہی میں تو پیدا ہوتا ہے۔ یہی مٹی کسی جگہ سونا بن جاتی ہے کسی جگہ چاندی کسی جگہ یاقوت و زمرد وغیرہ) تیسرے یہ کہ قرض لینا جائز ہے اور تین دن یا اس سے کم مدت تک دنیا کا پاس رہنا دنیا جمع کرنے میں داخل نہیں اور جو رقم قرض ادا کرنے کے لیے رکھی جائے وہ بھی دنیا جمع کرنے میں داخل نہیں چاہے تین دن سے زیادہ عرصہ تک رہے اور دُنیا کو اس لیے حاصل کرنا کہ آخرت کے کاموں میں صرف کی جائے دنیا (داری) نہیں۔ غرض حدیث میں زہد کی ہدایت ہے یہ سب فوائد حضورؐ کے اس ارشاد سے معلوم ہوئے مَیں پسند نہیں کرتا کہ یہ پہاڑ میرے واسطے سونا بن جائے اور میرے پاس تین دن سے زیادہ اس میں سے ایک دینار بھی رہے سوا اُس دینار کے جسے قرض کے واسطے رکھ چھوڑوں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حضورؐ نے مال کی تمنا تو نہیں کی بلکہ اُس کی نفی کی ہے

تو کہا جائے گا کہ حضورؐ نے تین دن سے زیادہ رکھنے کی نفی کی ہے تمنا کی نفی نہیں کی جو لوگ معانی کلام کو سمجھتے ہیں وہ اس سے مطلقاً تمنا کی نفی نہیں سمجھ سکتے (کیونکہ جب کلام میں کوئی قید ہو حکم قیود کی طرف راجع ہوتا ہے نہ مقید کی طرف۔ علماء بلاغت نے اس کی تصریح کی ہے) حدیث سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوا کہ قرض کم کرنا چاہیئے (زیادہ نہ چاہیئے) کیونکہ حضورؐ نے قرض ادا کرنے کے لیے ایک دینار رکھ چھوڑنے کا ذکر فرمایا۔ ایسا لفظ نہیں فرمایا جو قلیل وکثیر سب کو شامل ہو۔ جب آپؐ نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو قلیل ہی کو شامل ہے اور لفظ عام اختیار نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کا مقصود وہی ہے جو ہم نے بیان کیا (کہ قرض زیادہ نہ کرنا چاہیئے) کسی نے کہا ہے اقلل من الدین تعش حرا (اپنے ذمہ قرض کم کرو آزاد جیو گے (زیادہ قرض کرو گے تو آزادی میں خلل پڑے گا)! اور یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ زیادہ مال والے ہی زیادہ کمی والے ہیں اس میں چند احتمالات ہیں، ایک یہ کہ ایسے لوگ (حساب وکتاب وعذاب سے) خلاصی پانے والے کم ہیں کیونکہ اُن کے ذمہ حقوق زیادہ ہوتے ہیں اور (حقوق کی وجہ سے) مناقشات (بازپرس وغیرہ) زیادہ ہوں گے اسی لیے کہا گیا ہے حلالھا حساب وحرامھا عذاب دُنیا کا حلال (محنت حساب (میں مُبتلا کرتا) ہے اور حرام عذاب (میں گرفتار کرتا) ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس نیکیاں کم ہوں گی اگرچہ وہ نیک کام زیادہ بھی کریں۔ مطالبات کی کثرت سے نیکیاں کم ہو جائیں گی۔ کیونکہ میل جول اور لین دین میں ناجائز باتوں اور ممنوعات کا ارتکاب زیادہ ہوتا ہے جن کی اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو (نیک اعمال کی) توفیق کم ہوتی ہے کیونکہ بعض لوگوں کو مال عبادت سے اور نجات کے راستہ پر چلنے سے مانع ہو جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب معانی مراد ہوں۔ اسی لیے حضورؐ نے اس کے بعد فرمایا مگر وہ جو مال کو اِس طرف اور اُس طرف خرچ کرتا رہے (یعنی ہر طرف جہاں محتاج نظر آئیں یا ضرورت معلوم ہو خرچ کرنے میں دریغ نہ کرے۔ ایسا شخص البتہ حساب وکتاب اور طلب سے خلاصی پائے گا اُس کی نیکیاں بھی کم نہ ہوں گی اس کو نیک اعمال کی توفیق

بھی زیادہ ہوگی۔ کیونکہ اس کا دل جب مال سے پاک ہوگا اور اعمالِ خیر سے مال مانع نہیں ہوتا بلکہ اس کی محبت مانع ہوتی ہے)۔

قولہ فیہ دلیل علی جواز النظر فی المباحات الی قولہ ومن احل ھذا اعقبہ بقولہ علیہ السلام الا من قال بالمال ھکذا وھکذا۔

(۲۵۴) صحبت کا ادب یہ ہے کہ ساتھی کو اطلاع کئے بغیر جُدا نہ ہوئے حدیث

معلوم ہُوا کہ صحبت کا ادب یہ ہے کہ اپنے ساتھی سے بغیر اطلاع کے جُدا نہ ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوذر رضی اللہ عنہ سے یہ کہہ کر جُدا ہوئے کہ میرے آنے تک اسی جگہ پر رہنا (بغیر اطلاع کے جُدا نہیں ہوئے)۔

قولہ فیہ دلیل علی من ادب الصحبۃ ان لا یغفوا الصاحب الی قولہ مکانک حتی آتیک۔

ف:- صوفیا نے آدابِ صحبت میں اس کی تصریح کی ہے اور یہ مسئلہ آدابِ معاشرت میں سے ہے کیونکہ بغیر اطلاع کے ساتھی سے الگ ہو جانا اُس کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔ اور مُسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔

(۲۵۵) عاشق بدگمان ہوتا ہے اور حکم کی بجا آوری سب سے بڑی اطاعت ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ عاشق بدگمان ہوتا ہے (عشق است وہزار بدگمانی) دیکھو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوذر سے کچھ دُور آگے بڑھ گئے اور انھوں نے (اجنبی) آواز سُنی تو اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (خطرہ کا) اندیشہ ہوا اور چاہا کہ فوراً آپ کے پاس پہنچیں مگر آپ کا حکم یاد کر کے رک گئے اور اس سے معلوم ہُوا کہ احکام کی بجا آوری سب سے بڑی طاعت ہے کیونکہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہی سمجھ کر اپنی جگہ پر جمے رہے کہ حکم کی تعمیل سب سے زیادہ مقدم ہے۔ انھوں نے تعمیلِ حکم کو اپنے اس جذبہ پر ترجیح دی جو محبت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ اجنبی آواز سنتے ہی حضور کے پاس

پہنچیں) یہ عارفین کا مقام ہے کہ اُن کی طاعت بجاآوری حکم کے لیے ہے اپنی خواہش سے نہیں اور جاہل کی حالت اُس کے برعکس ہے کہ وہ اپنی خواہش کے موافق طاعات بجا لاتا ہے اتباع حکم کی پابندی نہیں کرتا)۔

قولہ فیہ دلیل علی ان المحب بسوء الظن مولع الخ قولہ والجاہل بضد ذلک۔

(۲۵۶) بدوں تحقیق حال کے احکام نہ بیان کئے جائیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ جہاں تحقیق کی ضرورت ہو وہاں بغیر تحقیق حال کے احکام (شرعیہ) بیان نہ کئے جائیں۔ اگرچہ واقعہ معلوم بھی ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر سے اُن کے اس کہنے کے بعد کہ یہ کیا آواز تھی جو میں نے سُنی پھر دریافت فرمایا کیا تم نے یہ آواز سنی؟ انھوں نے کہا ہاں اس کے بعد آپ نے بتلایا کہ یہ آواز جبریل کی تھی وہ مجھ سے یہ کہہ گئے ہیں۔ آپ کا دوبارہ پوچھنا حالانکہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ ابوذر نے آواز سُنی ہے اس بات کو بتلا رہا ہے کہ احکام الٰہیہ کو اہتمام کرنا چاہیئے اور تقریر احکام کے وقت تحقیق سے کام لینا چاہیئے۔ اس وقت جبریل نے جو کچھ کہا تھا وہ احکام الٰہیہ میں سے ایک (عظیم الشان) حکم تھا، تو حضور نے اُس کو سرسری طور سے بیان نہیں کیا بلکہ اہتمام اور تحقیق کے ساتھ بیان فرمایا۔

قولہ فیہ دلیل علی ان الاحکام لا تذکر الا بعد التثبت الی قولہ ارشاد الی الاہتمام بامر الاحکام۔

(۲۵۷) اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت بڑی ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت بڑی ہے وہ جس کو چاہتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں (فرشتوں کی آواز وغیرہ) سُنا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں سُننے سے روک دیتے ہیں۔ دیکھو بہت احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صحابہ کے درمیان (بیٹھے ہوئے) وحی نازل ہوتی تھی پھر فرشتہ چلا جاتا اور صحابہ میں سے کوئی بھی کچھ نہ سُنتا اور ابوذر رضی اللہ عنہ کو

دُور سے آواز سُنادی گئی تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

قولہ فیہ دلیل علیٰ عظیم قدرۃ القادر الیٰ قولہ لیعلم ان اللہ علیٰ کل شیئٍ قدیر۔

ف۔ یہ بھی تصوف کا بڑا مسئلہ ہے اگرچہ متکلمین بھی اس کو بیان کرتے ہیں اور یہ مسئلہ عقائد میں داخل ہے۔ مگر اس کا پُورا انکشاف صوفیاء کرام ہی کو نصیب ہے اسی لیے وہ نصوص میں تاویل کم کرتے ہیں اگرچہ بظاہر عقل سے بعید ہوں کیونکہ وہ قدرتِ خداوندی سے کسی چیز کو بعید نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالےٰ ہم کو بھی بزرگوں کی اس دولت سے حصہ عطا فرمائیں۔ آمین۔

الحمد للہ! آج بروز شنبہ ۱۰ شوال المکرم ۱۳۶۸ھ کو رحمۃ القدوس ترجمہ بہجۃ النفوس کا دوسرا حصہ ان التزامات کے ساتھ جو دیباچہ حصہ اول میں مذکور ہیں تمام ہوا۔ حالانکہ اس وقت اس کی کچھ اُمید نہ تھی کیونکہ ۹ ماہ کی مسلسل علالت نے مجھے تصنیف و تالیف سے روک دیا تھا۔ رمضان سے پہلے ضعف زیادہ تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ رمضان میں روزہ و تراویح کی وجہ سے ضعف بڑھ جائے گا مگر الحمد للہ کہ رمضان و اعمالِ رمضان کی برکت سے صحت پہلے سے اچھی ہو گئی اور شوال میں اس قابل ہو گیا کہ ترجمہ حصہ دوم پُورا کر دوں۔

بہجۃ النفوس کے حصہ اوّل و دوم میں کل سو حدیثیں ہیں اور دیباچہ مصنف سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بخاری کی تین سو حدیثوں کی شرح کی ہے۔ عزیزی مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلوی سلمہ اللہ تعالےٰ محدث و مفسر دار العلوم دیوبند سے معلوم ہُوا کہ بہجۃ النفوس کے دو حصے اور بھی طبع ہو گئے ہیں جو اُن کے پاس پہنچ گئے ہیں مگر میرے پاس اب تک نہیں پہنچے۔ اگر وہ دو حصے بھی مل گئے اور صحت و طاقت اور توفیق نے یاوری کی تو انشاء اللہ اُن کا ترجمہ بھی اسی طرز پر ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا ورنہ اسی قدر پر کفایت ہے اور کیا عجب ہے کہ کوئی اور صاحبِ دل بقیہ جلدوں کا ترجمہ اسی طرز پر مجھ سے اچھا کر دیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ سید الانبیاء والرسل و اصحابؓ و اہل بیتؓ کرام کے طفیل اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ کے انفاس قدسیہ کی برکت سے اس خدمت کو قبول فرمائیں اور میرے اور جملہ احباب و اصحاب و برادرانِ

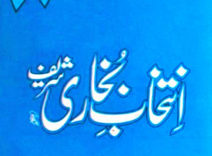
اسلام کے لیے اس کو نافع بنائیں اور میرے لیے یہ کتاب ذخیرۂ اور ذریعۂ نجات
بن جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔
ناشکری ہوگی اگر برادر مہربان مولوی شبیر علی صاحب تھانوی سلمہٗ کا شکریہ ادا نہ
کروں کہ انھوں نے بہت محنت و اہتمام اور صرف زر کثیر سے اس کتاب کو طبع کیا۔
اللہ تعالیٰ نے تمام دعاؤں کو اُن کے بھی حق میں قبول فرمائیں اور ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

نہ بہ نقش بستہ مشوشم نہ بحرف ساختہ سرخوشم
نفسے بیاد تو می کشم چہ عبارت وچہ معانیم

——— تمت بالخیر ———

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات وصلی اللہ تعالیٰ
علی سید الکائنات واشرف المخلوقات سیدنا محمد وعلی آلہ
واصحابہ وذریتہ واھل بیتہ وازواجہ الطیبات الطاھرات وسلم
تسلیما کثیرا کثیرا ۔۔

احقر ظفر احمد عثمانی تھانوی عفی عنہ
۱۰ر شوال المکرم ۱۳۶۸ھ مطابق ۶ر اگست ۱۹۴۹ء عیسوی
بمقام ڈھاکہ مشرقی پاکستان۔



عربی شرح
علامہ ابن ابی جمرہ مالکی اندلسیؒ
۶۹۹ھ

اردو ترجمہ و تشریحی فوائد
حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ
۱۳۹۴ھ

زیر نگرانی
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳۶۲ھ

(ترجمہ و تشریح)

تخریج احادیث

امام بخاری قدس اللہ سرہ العزیز ۲۵۶ھ

جلد دوم

ناشر ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور ۲ پاکستان
۷۳۵۳۲۵۵ — ۷۳۲۳۹۹۱ — ۷۳۲۲۴۸۵